عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

۱۴

- وقف کے احکام و مسائل
- موجودہ اہم سماجی مسائل کے حل کے لئے وقف کی اہمیت اور طریقۂ کار
- مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دار الاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 14

وقف کے احکام و مسائل

موجودہ اہم سماجی مسائل کے حل کے لئے وقف کی اہمیت اور طریقہ کار

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات وکمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے۔ جزاك الله

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

﴿.........ملنے کے پتے.........﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم اردو بازار کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انار کلی لاہور و اردو بازار کراچی
مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد
دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

اوقاف کے احکام و مسائل

پیش لفظ/ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۱۹
ابتدائیہ/ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ ۲۱

پہلا باب تمہیدی امور ۲۴

سوالنامہ ۲۴
اکیڈمی کا فیصلہ ۲۶
تلخیص مقالات ۲۹
عرض مسئلہ ۳۲
سوال ۱، ۲، ۳، ۴، ۷، ۹ / مولانا عتیق احمد بستوی ۳۲
سوال نمبر ۵ اور نمبر ۶ / مولانا محمد ظفر عالم ندوی ۴۴
سوال نمبر ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۳ / مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی ۴۸

دوسرا باب تعارف مسئلہ ۵۱

قانون وقف: تاریخ، مقاصد اور اہم نکات کا مختصر جائزہ/ جناب محمد عبد الرحیم قریشی ۵۱
ہندوستان میں وقف بورڈس کا نظام۔ ایک رپورٹ/ جناب سالار محمد خان ۶۵

تیسرا باب تفصیلی مقالات ۷۲

وقف سے متعلق احکام و مسائل/ مولانا مفتی محمد حنیف ۷۲
مساجد اور دوسرے اوقاف میں فرق، احکام اور مسائل/ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۹۸
اوقاف کا تحفظ اور آمدنی کا صحیح استعمال/ مفتی عبید اللہ اسعدی ۱۰۶
اوقاف اور ترقیاتی سرگرمیوں کا معیار/ شیخ عبد المحسن محمد العثمان ۱۱۶
قدیم قبرستان میں مسجد کی تعمیر کا حکم/ مولانا نذیر احمد قاسمی ۱۲۴
ناقابل استعمال اوقافی جائداد فروخت کر کے نئے اوقاف قائم کرنا/ مولانا ابوسفیان مفتاحی ۱۲۹
تقسیم ہند کے بعد ویران شدہ اوقاف/ مفتی شبیر احمد قاسمی ۱۳۹
موقوف علی المساجد اراضی کا دوسرے مقاصد کے لئے استعمال/ مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی ۱۴۸
قاضی کی عدم موجودگی میں استبدال وقف کا مسئلہ/ مفتی جمیل احمد نذیری ۱۵۳
وسیع قبرستان میں واقع مسجد کی توسیع کا حکم/ مفتی نسیم احمد قاسمیؒ ۱۵۹
ویران اوقاف کو نفع بخش بنانے سے متعلق اصول/ مفتی جنید عالم ندوی قاسمی ۱۶۹
ویران مساجد کا حکم اور استبدال وقف/ مولانا انیس الرحمن قاسمی ۱۸۳
اوقاف/ مولانا ظفر عالم ندوی ۱۹۳
اوقاف کی خرید و فروخت اور اس میں تبدیلی کا شرعی حکم/ مولانا ابوبکر قاسمی ۱۹۸
دوسرے مصارف میں اوقاف کی آمدنیاں صرف کرنا/ مولانا محمد ارشد فاروقی ۲۱۴
ختم شدہ مصارف اوقاف کے احکام/ مولانا نذر توحید مظاہری ۲۲۳
استبدال وقف کے شرائط و احکام/ مولانا محمد ارشاد القاسمی ۲۲۸
غیر آباد مساجد سے متعلق احکام/ مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری ۲۳۹
تدفین پر پابندی لگائے گئے قبرستان سے انتفاع کی شکل/ مولانا محمد نور القاسمی ۲۵۷
زائد از ضرورت اوقافی جائداد کا حکم/ مولانا قمر الزماں ندوی ۲۶۵

عنوان	صفحہ
استبدال وقف کے احکام ومسائل/ مولانا ابرار خاں ندوی	۲۷۰
مخدوش اوقافی عمارتوں کی تعمیر نو کا مسئلہ/ مولانا تنویر عالم قاسمی	۲۷۸
وقف کی حیثیت اور استعمال کی شرعی ضابطہ/ مولانا سمیع اللہ قاسمی	۲۸۳
قبرستان کے کنارے دوکانوں کی تعمیر کا مسئلہ/ مولانا اسعد اللہ قاسمی	۲۹۱
چوتھا باب مختصر تحریریں	۲۹۹
وقف کی حقیقت اور شرعی حکم/ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب	۲۹۹
متبادل اوقاف کا قیام اور مساجد کی فاضل آمدنی کا مصرف/ مولانا عتیق احمد بستوی	۳۰۰
محکمہ آثار قدیمہ کے تحت داخل شدہ مسجد کا حکم شرعی/ مولانا محمد رضوان القاسمیؒ	۳۰۱
مساجد کی فاضل آمدنی بطور قرض دوسرے مصرف کے لئے لینا/ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی	۳۰۵
مساجد پر وقف اراضی پر تعلیمی ادارے کا قیام/ مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی	۳۰۸
ویران اوقاف کی جگہ نئے اوقاف کا قیام/ مفتی محمد حبیب اللہ قاسمی	۳۱۲
بہتر مقاصد کے لئے وقف کی تبدیلی کا حکم/ مفتی محبوب علی وجیہی	۳۱۴
اوقافی جائداد کی خرید وفروخت، احکام ومسائل/ مولانا ڈاکٹر سعود عالم قاسمی	۳۱۷
اوقاف کی آمدنی دوسرے نوع کے مصارف میں صرف کرنا/ مولانا اخلاق حسین قاسمی	۳۲۰
اوقاف میں واقف کے مقاصد کی پابندی/ مولانا شمس پیرزادہؒ	۳۲۳
وقف جائداد کے تبادلہ کا حکم اور آمدنی کا مصرف/ مفتی شیر علی گجراتی	۳۲۵
مسجد کی اراضی کا تعلیمی اور رفاہی مقاصد کے لئے استعمال/ مولانا سلطان احمد اصلاحی	۳۲۹
اوقاف کی آمدنی کے مصارف اور استعمال/ مفتی شکیل احمد سیتاپوری	۳۳۰
مساجد ومدارس اور اوقاف کی آمدنی عصری تعلیم پر خرچ کرنا/ مفتی عبدالرحیم قاسمی	۳۳۱
مساجد کی فاضل آمدنی دوسرے مصرف میں صرف کرنا/ مولانا ایوب ندوی	۳۳۵
واقف کے منشاء کی رعایت کا دائرہ/ ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی	۳۳۶
مخدوش اوقاف اور واقف کے مقاصد/ ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۳۳۷
ویران اوقاف کی جگہ متبادل اوقاف کا قیام/ مفتی عبداللطیف پالنپوری	۳۳۹
اوقاف کی آمدنی مدارس ومساجد میں صرف کرنا/ مولانا عبدالقیوم پالنپوری	۳۴۲
حکومت یا فرد کو خستہ حال اوقاف حوالہ کر کے دوسرا حاصل کرنا/ مولانا ابراہیم گجیا فلاحی	۳۴۶
محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی مساجد کے احکام/ مولانا محمد صدر عالم قاسمی	۳۵۰
اوقاف/ مولانا عطاء اللہ قاسمی	۳۵۴
پانچواں باب: اختتامی امور	۳۵۸
[illegible] اوقاف	۳۵۸
خطبۂ افتتاحیہ/ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی	۳۵۹
مقالہ عبدالمحسن عثمان صاحب	۳۶۰

وقف کی اہمیت اور طریقہ کار

	۳۹۱
ابتدائیہ/ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۳۹۳
اکیڈمی کا فیصلہ	۳۹۵
سوال نامہ: سماج کے سنگین مسائل کے حل کے لئے اوقاف کا قیام	۳۹۶
اوقاف سے متعلق شرعی احکام میں اجتہاد کی ضرورت/ ڈاکٹر محمد عبدالغفار شریف	۳۹۸
نئے اوقاف کا قیام: مسائل اور عملی تدابیر/ مولانا بدر الحسن القاسمی، کویت	۴۰۱
وقف نقدی: ہماری موجودہ زندگی میں وقف کے کردار کا احیاء/ ڈاکٹر شوقی احمد دنیا	۴۰۳
وقف کا مقام اور سماجی مسائل کے حل میں اس کا کردار/ عبدالرحمن بن سلیمان المطر ودی	۴۱۳
مبحث اول-فقہ الوقف	۴۱۵
مبحث دوم سماج کی ترقی میں رفاہی اوقاف کی اہمیت اور ان کا مقام	۴۲۲
مبحث سوم: مطلقہ عورتوں، یتیموں، بیماروں اور بیواؤں کی خبر گیری میں اوقاف کی اہمیت	۴۲۶
مبحث چہارم: تعلیم اور دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں اوقاف کی اہمیت	۴۳۰

تفصیلی مقالات

سماج کے سنگین مسائل کے حل کے لئے اوقاف کا قیام/ مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی	۴۳۵
اوقاف کا قیام، کئی مسائل کا بہترین شرعی حل/ مولانا راشد حسین ندوی	۴۳۸
اوقاف کی فضیلت، تاریخ اور موجودہ دور میں ان کے قیام کی بعض عملی صورتیں/ مولانا عبدالسبحان ندوی	۴۴۱
معاشی مسائل کے حل میں اوقاف کا کردار/ مولانا بلال احمد القاسمی	۴۴۷
متنوع سماجی ومعاشی مسائل کے حل میں اوقاف کا کردار/ مولانا محمد ارشد مدنی چمپارنی	۴۴۹
موجودہ دور میں اوقاف کے شرعی مصارف/ مولانا نیاز احمد عبدالحمید مدنی	۴۵۱
اوقاف کا قیام-ضروریات اور دائرہ کار/ مولانا اقبال احمد قاسمی	۴۵۲

تحریری آراء

	۴۵۴
مختلف دینی مقاصد کے لئے اوقاف کا قیام/ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی	۴۵۴
تعلیمی، رفاہی اور دینی مقاصد کے لئے اوقاف کا قیام وقت کی اہم ضرورت/ مولانا محمد ارشاد القاسمی	۴۵۵
نئے اوقاف کے قیام کے لئے پیش بندی کی ضرورت/ مولانا سلطان احمد اصلاحی	۴۵۶
اوقاف کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے جامع منصوبہ بندی کی ضرورت/ مفتی محبوب علی وجیہی	۴۵۷
نئے اوقاف کے قیام سے متعلق تجاویز پر غور/ مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری	۴۵۸
نئے اوقاف کا منصوبہ دیہات تک وسیع ہو/ مفتی نعمت اللہ قاسمی	۴۶۰

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

	۴۶۱
پیش لفظ/ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۴۶۳
اکیڈمی کا فیصلہ	۴۶۴
سوالنامہ	۴۶۶
تلخیص مقالات	۴۶۹
مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مفتی محمد ہارون رشید ندوی	۴۶۹
عرض مسئلہ: مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی	۴۸۶
سوال۔ ۲ (الف، ب، ج)/ مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی	۴۹۴
سوال نمبر ۳/ مولانا خورشید احمد اعظمی	۴۹۸

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی ۵۰۴

مختلف شعبوں میں ملازمتوں کے شرعی احکام/ مفتی سہیل احمد قاسمی ۵۲۰

مختلف نوع کی ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مولانا خورشید احمد اعظمی ۵۳۰

مختلف سیکٹروں میں ملازمتوں کے شرعی احکام/ مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ۵۵۰

مختلف اقسام کی ملازمتیں اور ان کے احکام/ مولانا بدر احمد مجیبی ندوی ٦۵۸

مختلف محکموں میں ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مولانا ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی ۵٦٦

مختلف النوع ملازمتیں اور شرعی احکام ومسائل/ مفتی اقبال محمد ٹنکاروی ۵۷۵

مختلف پیشے اور ان کے شرعی احکام/ مولانا اشتیاق احمد اعظمی ۵۸۷

ملازمتوں کے مختلف اقسام اور ان کے شرعی احکام/ مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی ۵۹۸

حکومت کے مختلف اداروں میں ملازمت کا شرعی حکم/ مولانا سلمان پالنپوری قاسمی ٦۰۷

مختلف ملازمتوں کے شرعی احکام/ مولانا محمد فاروق ٦۱۵

حکومت کے محکموں میں ملازمتوں کے شرعی احکام/ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ٦۲۵

مختلف شعبوں میں ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مولانا شمس الدین مظاہری ٦۳۴

حکومت کے مختلف اداروں میں ملازمت کرنے کا شرعی حکم/ مولانا عبد الرشید قاسمی ٦۴۴

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مولانا محمد نور الدین بھاگل پوری ٦۵۵

مختلف شعبوں میں ملازمتوں کے شرعی احکام/ مولانا محمد جاوید کوثر ٦٦۲

تیسرا باب: مختصر تحریریں ٦۷۱

مختلف ملازمتوں کے احکام/ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ٦۷۱

مختلف ملازمتوں کے احکام ومسائل/ مولانا اختر امام عادل قاسمی ٦۷۵

مختلف قسم کی ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مولانا محمد ظفر عالم ندوی ٦۸۰

ملازمتوں کے اقسام واحکام/ ڈاکٹر بہاء الدین ندوی ٦۸۴

حکومت کے بعض اداروں میں ملازمت کرنے کا شرعی حکم/ مفتی عبد اللہ کاوی ٦۸۵

مختلف محکموں میں ملازمتوں کے شرعی احکام/ مفتی رضوان الحسن مظاہری ٦۸۹

مختلف ملازمتوں کے شرعی احکام/ مولانا محمد قمر عالم قاسمی ٦۹۴

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام/ مولانا عبد التواب اناوی ٦۹۵

مختلف قسم کی ملازمت سے متعلق شرعی احکام/ مولانا محمد منصف بدایونی ۷۰۰

چوتھا باب: اختتامی امور ۷۰۴

مناقشہ: مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام ۷۰۴

تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کر رہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پایا۔ ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہو کر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کر سکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کر دیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار و مقاصد کے مطابق ہو جائے بہر حال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت و اخراجات کر کے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱......اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کر دیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲......پورے علمی ذخیرے کو از سرِ نو بڑے سائز میں کمپوزوسیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳......پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ نمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴......ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جا سکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵......بحمد للہ! اب ''سلسلۂ جدید فقہی مباحث'' کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

۶......اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع بنادیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا دارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی پاکستان

''مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کرسکے۔......فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

تقدیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبۂ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدر آباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل وکرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگر چہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہوسکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض ومقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض ومقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

”اذا جاء نا امر ليس فيه أمر و لانهى فما ذا تأمرنا فيه“

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه برای خاص“

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنا لے، اس کے حکم بیان کر دے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

"کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔"

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہو جانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہو جانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہو جاتا جو نبی کریم ﷺ نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگا دی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آوازہ بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم وتشریح کیوں نہیں کر سکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر یہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کر سکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم وتعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم ﷺ نے کہ یہ تشریح وتعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن وسنت کے احکام کی صحیح تفسیر وتشریح نہیں کر سکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم وفن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کر سکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کر دے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم ﷺ کو ساتھ بھیجا تاکہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم ﷺ سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن وسنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہوسکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہوسکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہو گیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کرلیں...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جو نئی وبا مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کر لیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ...... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعتِ نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل وکرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات وفلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہوسکتا ہے۔اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور وشغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آگئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلویٰ کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جونکتہ ہے جو بسا اوقات افراط وتفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباعِ ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور تلفیق بین المذاہب کا راستہ اختیار کر لیا...... اتباعِ ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباعِ ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوٰتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہوسکتی۔ ان کے نزدیک مدتِ قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدتِ سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا...... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مدنظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مدنظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاھب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہوئی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعۃً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہوئی، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیراً اور تکراراً عرض کر دی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو...... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر نئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ...... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یاکلھن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتا دیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتا دیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی ...... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کیے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمدللہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور وتوجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

اوقاف
احکام و مسائل

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارُالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

مجلس ادارت

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اچھے کام انجام دینے اور خدمت کرنے کا ایک فطری جذبہ رکھا ہے، ایک ایسا انسان جس کے اندر حقیقی انسان زندہ ہو اور جس کا ضمیر بالکل مردہ نہ ہو چکا ہو، وہ جب کسی انسان کو نفع پہنچاتا ہے تو اندر سے ایک خوشی محسوس کرتا ہے، یہ خدا کی بنائی ہوئی فطرت کی آواز ہے، رسول اللہ نے فرمایا کہ انسان کے قلب کے ساتھ ایک ایسی ملکوتی طاقت لگی ہوئی ہے، جو اسے بھلائی کی طرف بلاتی ہے اور برائی سے روکتی ہے، (الدر المنثور فی تفسیر المأثور عن ابن عباس موقوفاً: ۶ / ۴۶۸) انسان خواہ کسی مذہب کا ماننے والا ہو یا سرے سے مذہب کا باغی ہو، وہ خیر و احسان کے اس جذبے سے خالی نہیں ہوتا، اسی جذبہ کے تحت انسان حسن سلوک اور نفع رسانی کا کام کرتا ہے اور اگر دینی مزاج رکھتا ہو تو یہ داد و دہش مذہبی کاموں کے لئے بھی سامنے آتی ہے۔

عام طور پر یہ حسن سلوک وقتی اور عارضی نوعیت کا ہوتا ہے، جیسے آپ نے کسی کو کھانا کھلا دیا، کسی شخص کو کپڑے کی ضرورت تھی، آپ نے اسے کپڑے بنوا دیئے، اس طرح کی خدمت کا فائدہ عارضی ہوتا ہے، شریعت اسلامی کے امتیازی احکام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے بر و احسان اور خدمت خلق کی ایک دائمی صورت کو وجود بخشا ہے، جس کو حدیث میں 'صدقہ جاریہ' کہا گیا ہے، یعنی ایسا خیراتی کام جس کا نفع دیر تک قائم رہے، (أبوداؤد، باب ماجاء في الصدقة عن الميت، حدیث نمبر: ۲۴۹۴) اسی کو فقہ کی اصطلاح میں ''وقف'' کہتے ہیں، وقف کا بنیادی حکم یہ ہے کہ جب کوئی شئ کسی کار خیر کے لئے وقف کی جاتی ہے تو وہ واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے اور اب کوئی خاص فرد اس کا مالک باقی نہیں رہتا، وقف کے سلسلہ میں دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وقف متنوع مقاصد کے لئے ہو سکتا ہے، جیسے مسجد اور مدرسہ کے لئے کوئی جائداد وقف کی جاسکتی ہے، اسی طرح مریضوں، تیمارداروں، مسافروں، بے سہارا لوگوں؛ یہاں تک کہ خود اپنی اولاد اور اپنی نسل پر بھی وقف کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک بھی اجر و ثواب کا کام ہے۔

رسول اللہؐ نے اپنے تمام ترکہ کو وقف فرما دیا تھا، آپؐ کے علاوہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور متعدد صحابہ نے خیر کے کاموں میں اپنی جائیدادیں وقف کی تھیں؛ چنانچہ مسلمان سلاطین، اصحاب ثروت عوام اور مشائخ و صوفیاء کی جانب سے ہر دور میں بکثرت جائیدادیں وقف کی گئی ہیں؛ یہاں تک کہ پرندوں کی خوراک کے لئے بھی جائیداد وقف کی جاتی تھی، خود ہمارے ملک ہندوستان میں اتنے زیادہ اوقاف ہیں کہ اگر حکومت دیانتداری کے ساتھ مسلمانوں کو ان کے اوقاف حوالے کردے اور ان کو نفع آور بنا کر مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ کیا جائے تو اندازہ کیا جاتا ہے کہ کوئی مسلمان بچہ تعلیم سے محروم نہیں رہے گا اور کسی مسلمان نوجوان کو بے روزگاری اور معاشی مجبوری کا سامنا نہیں ہوگا، اس وقت اوقاف کو جو نقصان پہونچ رہا ہے، اس میں ایک طرف حکومت ذمہ دار ہے، جس نے بہت سے اوقاف پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور مسلمانوں کو ان کا کرایہ تک نہیں ملتا، حکومت کی زیادتی ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گورنمنٹ وقف کے قانون کو قصداً غیر مؤثر بنا کر رکھنا چاہتی ہے، اوقاف کو وہ حقوق نہیں دیئے جاتے جو پبلک پراپرٹی کو حاصل ہیں، وقف بورڈ کو عاملانہ اختیارات نہیں دیئے جاتے کہ وہ ناجائز قابضین کے خلاف کوئی کاروائی کر سکے اور وقف بورڈ کی ہیئت ترکیبی ایسی رکھی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے نمائندے اس میں بے اثر ہو جائیں اور حکومت کے چشم و آبرو کے اشارہ پر کام کرنے والے سرکاری نمائندوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے، ایسا لگتا ہے کہ حکومت منصوبہ بند طریقہ پر مسلمانوں کو ان کے اوقاف سے محروم کرنے پر تلی ہوئی ہے؛ چنانچہ 'آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' اس سلسلہ میں مسلسل کوشاں ہے، خدا کرے کہ اس کی جد و جہد ثمر آور ہو۔

اوقاف کو دوسرا بڑا نقصان خود مسلمانوں سے پہونچ رہا ہے؛ بلکہ یہ کہنا مشکل ہے کہ حکومت اور مسلمانوں میں سے کون اس کا زیادہ قصوروار ہے؟ متولی حضرات وقف کی جائیداد کو اپنی ذاتی املاک کی طرح فروخت کر رہے ہیں، وقف کی عمارتوں کے کرایہ داروں کا حال یہ ہے کہ جس عمارت کا کرایہ دس ہزار ہونا چاہیے، اس کا کرایہ سو دو سو روپے ادا کیا جا رہا ہے؛ بلکہ یہ کرایہ بھی ادا نہیں کیا جاتا اور وقف کی جائیدادوں کے قابضین کسی قیمت پر اس کو خالی کرنے کو تیار نہیں ہیں، جب تک مسلمانوں میں خود دینی غیرت پیدا نہ ہو اور وہ اپنے نظام کو خود بہتر نہ بنائیں، یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ دوسرے لوگ ان کے مسائل کو حل کریں گے۔

وقف کے کچھ مسائل شرعی اور فقہی نقطۂ نظر سے اہمیت کے حامل ہیں، خاص کر وہ اوقاف جو اب ویران ہو چکے ہیں یا ایسے مقبوضہ ہیں کہ ان کا تحفظ دشوار ہے یا وہاں مسلم آبادی باقی نہیں رہی ہے، ایسے اوقاف کا تحفظ کس طرح کیا جائے گا اور انہیں کس طرح ثمر آور بنایا جاسکتا ہے؟ یہ بہت اہم مسئلہ ہے، فقہاء نے ایک طرف اوقاف کی حفاظت کے لئے اس کی فروخت اور تبدیلی پر روک لگانے کی کوشش کی ہے، جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، دوسری طرف یہ بھی کہا ہے کہ ہمیشہ وقف کے مفاد کو ترجیح دیا جائے، اگر کہیں وقف کا تحفظ اس کو تبدیل کرنے ہی میں ہو تو یقیناً اس کا استبدال ہی شریعت کے منشأ اور وقف کے مفاد کا تقاضا ہوگا، اسی طرح وقف کی اراضی کو ڈیولپ کرانے کا مسئلہ ہے، بعض ملکوں میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے اور اس سے اوقاف کی آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے، ایک اہم مسئلہ ان اوقاف کا بھی ہے، جن کے متعینہ مصارف باقی نہ ہوں، مسجد کے علاوہ جتنے اوقاف ہیں، ان کا بنیادی مصرف غریب مسلمانوں کی اعانت ہے؛ اسی لئے وقف کا اصول ہے کہ ہر وقف کا آخری مصرف فقراء ہیں، گذشتہ ادوار میں فقراء کے تعاون کا دائرہ محدود تھا، یعنی کھانے اور کپڑے کی فراہمی ہی فقراء کی ضرورت سمجھی جاتی تھی؛ لیکن موجودہ عہد میں خوراک و پوشاک سے بڑھ کر انسان کی ضرورت تعلیم ہے، تعلیم کے بغیر کوئی قوم باعزت زندگی گذار نہیں سکتی، تعلیم سے محروم قوم چاہے کتنی ہی بڑی تعداد میں ہو، وہ مٹی کا ڈھیر ہے، جس کو قدموں سے روندا اور پامال کیا جاتا ہے، پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہے کہ پہلے تعلیم ایک خدمت تھی، اور اب تعلیم ایک تجارت بن چکی ہے؛ اس لئے موجودہ حالات میں غریب بچوں کی تعلیم اور غریب بے روزگار نوجوانوں کے لئے ووکیشنل تربیت بھی فقراء کی اعانت کی ایک اہم صورت ہے، جو خورد و نوش اور لباس و پوشاک سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہے؛ کیوں کہ کسی قوم کے لئے تنگ دست ہونے سے زیادہ عار کی بات یہ ہے کہ وہ جاہل و ناخواندہ ہو، اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے دسویں سیمینار منعقدہ ممبئی کے لئے وقف کا موضوع منتخب کیا تھا، بیت الحجاج ممبئی کی پرشکوہ عمارت میں یہ سیمینار منعقد ہوا، کویت کی وزارت اوقاف کے ایک بھرپور وفد نے بھی سیمینار میں شرکت کی، اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ بنفس نفیس شروع سے اخیر تک سیمینار میں شریک رہے، وقف کے مختلف پہلوؤں پر غالباً پہلی بار اس تفصیل کے ساتھ بحث ہوئی اور ایسی تجاویز پاس ہوئیں جو خاص کر ہندوستان کے پس منظر میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

سیمینار کے مقالات، فیصلے اور مناقشات کا یہ مجموعہ بانی اکیڈمی کی زندگی ہی میں طبع ہو گیا؛ لیکن ایک تجربہ یہ کیا گیا کہ بجائے اس کے کہ شرکاء کے مکمل مقالات شائع کئے جائیں، ہر سوال کے جوابات ایک جگہ مرتب کردئے جائیں، اس کے لئے مقالہ نگاروں کی تحریروں سے جوابات سے متعلق اقتباسات لے لئے گئے، اس سے ایک فائدہ تو ہوا کہ ایک سوال پر تمام لوگوں کے جوابات ایک جگہ آگئے؛ لیکن ایک مکمل مقالہ کے پڑھنے سے جو علمی نفع ہوتا ہے اور باہمی ارتباط کی وجہ سے بات سمجھ میں آتی ہے، وہ کیفیت اس مجموعہ سے پیدا نہ ہوسکی، خود حضرت قاضی صاحبؒ کو بھی اس کا احساس تھا؛ چنانچہ اس کے بعد جو مجموعے شائع ہوئے، ان کو آپ نے سابق نہج پر ہی مرتب کرایا، اصحاب ذوق کا تقاضا تھا کہ اس مجموعہ کو بھی دوسرے مجلات کے نہج پر ہی مرتب کردیا جائے، جس سے استفادہ آسان بھی ہوتا ہے اور جو مروج طریقہ کے مطابق ہونے کی وجہ سے لوگوں کے لئے زیادہ مانوس منہج بھی ہے، موجودہ ایڈیشن اسی خواہش کی تکمیل ہے۔

اس کے طبع اول کی ترتیب کا کام محب عزیز مولانا صفدر زبیر ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور ظاہر ہے کہ انہوں نے اس کام کو بہت محنت سے انجام دیا تھا؛ کیوں کہ مختلف مقالات سے اقتباس کو جمع کرنا ایک مشکل کام ہے، اب دوبارہ اس کی ترتیب کا کام عزیز گرامی مولانا احمد نادر القاسمی رفیق شعبہ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ازسرنو انجام دیا ہے، بکھرے ہوئے اقتباسات کو پھر یکجا کرنا بھی کچھ کم دشوار کام نہیں ہے؛ اس لئے ان کا یہ کام بھی ترتیب اور ایڈیٹنگ کا ایک معرکہ سر کرنے کے مترادف ہے، اوقاف سے متعلق مقالات چوں کہ بہت زیادہ اور بہت مفصل تھے اور ان کی ضخامت بہت بڑھ رہی تھی؛ اس لئے مختلف مقالات سے الگ الگ ذیلی موضوعات لے لئے گئے؛ تاکہ تمام موضوعات شامل رہیں اور مجلہ کی ضخامت بھی بہت بڑھ نہ جائے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی اس کاوش کو قبول فرمائیں اور علماء اور ارباب افتاء کے لئے نافع بنائیں۔ وباللہ التوفیق

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۱۴ر محرم ۱۴۳۳ھ/ ۱۰ر دسمبر ۲۰۱۱ء

ابتدائیہ

انسانی فلاح، مصیبت زدوں کی مدد، سماج سے فقر و افلاس کو دور کرنے کی کوشش، فاقہ کشوں تک روٹی پہنچانا، بیماروں کی تیمارداری اور ان کا علاج، یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کی سرپرستی اور کفالت، لاوارث اموات کی عزت کے ساتھ تجہیز اور تدفین، مساجد کے نظام کو استوار رکھنا اور اس کے اخراجات کی کفالت کا مستقل نظم، قوم کے بچوں کو تعلیم اور ہنر سے آراستہ کرنا، مدارس و مکاتب اور صنعتی تربیت گاہوں کا قیام، اسپتال اور شفاخانوں کا جاری کیا جانا، قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو قرض کی قید سے نجات دلانا وغیرہ، ایسے سیکڑوں کام ہیں جن کو منظم اور مربوط طریقے پر انجام دیا جانا کسی بھی سماج کی فلاح کے لئے بنیادی ضرورتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

(الف) ''وما أدراك ما العقبة فك رقبة أو إطعام في يوم ذي مسغبة، يتيماً ذا مقربة أو مسكيناً ذا متربة، ثم كان من الذين آمنوا وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمة'' (سورۂ بلد: ۱۲-۱۷)۔

(اور تو کیا سمجھا، کیا ہے وہ گھاٹی، چھڑانا گردن کا، یا کھلانا بھوک کے دن میں، یتیم کو جو قرابت والا ہے، یا محتاج کو جو خاک میں رل رہا ہے، پھر ہووے ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کی)۔

(ب) ''كلا بل لا تكرمون اليتيم ولا تحاضون على طعام المسكين'' (سورۂ فجر: ۱۷-۱۸)۔

(کوئی نہیں! پر تم عزت سے نہیں رکھتے یتیم اور تاکید نہیں کرتے آپس میں محتاج کے کھلانے کی)۔

(ج) ''فأما اليتيم فلا تقهر'' (سورۂ ضحیٰ: ۹)۔

(سو جو یتیم ہو اس کو مت دبا)۔

(د) ''فذلك الذي يدع اليتيم'' (سورۂ ماعون: ۲)۔

(سو یہ وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو)۔

(ھ) ''لا تعبدون إلا الله وبالوالدين إحسانا وذي القربى واليتامى والمساكين'' (سورۂ بقرہ: ۸۳)۔

(عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی اور ماں باپ سے سلوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے)۔

(و) ''وآتى المال على حبه ذوي القربى واليتامى والمساكين'' (سورۂ بقرہ: ۱۷۷)۔

(اور دے مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو)۔

(ز) ''وأن تقوموا لليتامى بالقسط'' (سورۂ نساء: ۱۲۷)۔

(اور یہ کہ قائم رہو یتیموں کے حق میں انصاف پر)۔

(ح) ''وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل'' (سورۂ توبہ: ۶۰)۔

(اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور راہ کے مسافر کو)۔

اسی طرح حدیث نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام کے وسیع اور عظیم الشان ذخیرہ کے اندران تمام فلاحی اور انسانی خدمات کا ذکر موجود ہے، جناب رسول اللہ ﷺ نے صدقہ جاریہ کی ترغیب دی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان ایسی مفید خدمت انجام دے جس کا فائدہ محض وقتی نہ ہو، بلکہ اس کے گذر جانے کے بعد بھی وہ فائدہ رسانی جاری ہے اور اس کا اجر وثواب بلا انقطاع اس کو مسلسل ملتا رہے۔

جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۱۔ ''وإذا مات ابن آدم انقطع عمله إلا من ثلاث: صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعوله'' (نيل الاوطار ۶،۱۲۷)۔

(جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین عمل کے: ۱۔صدقہ جاریہ، ۲۔ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جاتا رہے، ۳۔اور صالح اولاد جو اس کے لئے دعا کرے)۔

۲۔ ''وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ أن عمر أصاب أرضاً من أرض خيبر فقال: يا رسول الله! أصبت مالاً بخيبر لم أصب قط مالاً أنفس منه، فبما تأمرني، فقال: ''إن شئت حبست أصلها وتصدقت بها، غير أنه لا يباع أصلها ولا يبتاع ولا يوهب ولا يورث'' فقال: فتصدق بها عمر على ألاتباع ولا توهب ولا تورث وتكون في الفقراء وذوي القربى والرقاب والضيف وابن السبيل ولا جناح على من وليها أن يأكل منها بالمعروف ويطعم غير ممول'' (رواه الجماعة)۔

(حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیبر کی ایک زمین ملی تو انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے خیبر میں ایک مال ملا ہے جس سے بہتر مال مجھے کبھی نہیں ملا، تو آپ ﷺ مجھے کس چیز کا حکم کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو اس کے اصل کو باقی رکھ کر اس (کی پیداوار) کو صدقہ کردو، مگر یہ کہ اس کی اصل نہ بیچی جاسکتی ہے، نہ خریدی جاسکتی ہے، نہ ہبہ کی جاسکتی ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہوسکتی ہے، ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اس کو صدقہ کردیا اس شرط کے ساتھ کہ نہ وہ فروخت کی جائے گی، نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ اس میں وراثت جاری ہوگی، اور (اس کی منفعت) فقراء، اہل قرابت، غلام کی آزادی، مہمان اور مسافر کے لئے ہوگی، اور اس کے متولی کے لئے کوئی حرج نہیں کہ اس میں سے معروف طریقے پر کھائے اور کھلائے، اس کو اپنے لئے مال نہ بنائے)۔

۳۔ ''وعن عثمان رضى الله عنه أن النبي ﷺ قدم المدينة وليس بها ماء يستعذب غير بئر (رومة) فقال: ''من يشتري بئر رومة فيجعل منها دلوه مع دلاء المسلمين بخير له منه في الجنة''. فاشتريتها من صلب مالي فجعلت دلوى فيها مع دلاء المسلمين'' (رواه النسائى والترمذى، وقال: حديث حسن)۔

(حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے، وہاں رومہ کے کنواں کے علاوہ کوئی میٹھا پانی نہیں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: کون بئر رومہ کو خرید کر اپنے ڈول کے ساتھ اس میں مسلمانوں کے ڈول کو بھی شریک کرے گا کہ اس کی وجہ سے جنت میں اس کے لئے خیر ہو؟ تو میں نے اپنے اصل مال سے اسے خرید لیا اور اس میں اپنے ڈول کے ساتھ مسلمانوں کے ڈول کو بھی شریک کرلیا)۔

۴۔ ''وأول وقف خيري عرف في الإسلام هو وقف النبي ﷺ لسبع حوائط (بساتين) بالمدينة كانت لرجل يهودي اسمه مخيريق قتل على رأس اثنين وثلاثين شهراً من مهاجر رسول الله ﷺ وهو يقاتل مع المسلمين في واقعة أحد، وأوصى: إن أصبت- أي قتلت- فأموالي لمحمد يضعها حيث أراه الله تعالى، فقتل يوم أحد- وهو على يهوديته- فقال النبي ﷺ: (مخيريق خير يهود)، وقبض النبي ﷺ تلك الحوائط السبعة فتصدق بها- أى وقفها- ثم تلاه وقف عمر، ثم تتابعت بعد ذلك أوقاف الصحابة'' (الإسعاف فى أحكام الاوقاف، لبرهان الدين بن إبراهيم بن أبي بكر الطرابلسى ص۹-۱۰)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں سات باغوں کو وقف کیا جو اسلام میں پہلا وقف خیری تھا، یہ باغ مخیریق نامی ایک یہودی کے تھے جو ہجرت نبوی کے بتیسویں ماہ کے آغاز میں اس وقت مارا گیا جب وہ غزوہ احد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک قتال تھا، اس نے وصیت کی کہ اگر میں مارا جاؤں تو میرے اموال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے ہوں گے، وہ انہیں اللہ کی مرضی سے صرف کریں گے، احد کے دن یہودیت پر ہی وہ مارا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مخیریق اچھا یہودی تھا''، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ساتوں باغ کو قبضہ میں لیا پھر انہیں صدقہ (یعنی وقف) کردیا، پھر اس کے بعد حضرت عمرؓ کا وقف ہوا، پھر صحابہ کرام کے اوقاف مسلسل ہوتے گئے)۔

وقف کی روح بھی یہی ہے کہ کوئی بھی جائداد اس طرح رضائے ربانی کی خاطر کسی مصرف خیر کے لئے محبوس کردی جائے کہ اصل شئ محفوظ رہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی متعین مصارف خیر پر صرف ہوتی رہے، لیکن وہ شئ جس کی اصل محفوظ نہ رکھی جاسکے بیع اور اجارہ وغیرہ کے ذریعہ جس کی ملکیت بدلتی رہے تو اس کا نفع پائیدار نہیں ہوگا، وقف کا ثبوت خود عہد نبوی اور عہد صحابہ میں ملتا ہے اور پورے عالم اسلامی میں اور جملہ بلاد اسلامی میں اتنی جائدادیں وقف کی گئیں کہ وقف کا ایک وسیع نظام وجود میں آ گیا، اور اسی لئے وقف سے متعلق بہت سے سوالات ہر دور میں پیدا ہوتے رہے جن کا تعلق املاک وقف کے تحفظ، ان کی افادیت میں اضافہ اور ان کے بہتر انتظام سے تھا، یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی کا بہت بڑا ذخیرہ احکام وقف سے متعلق ہے۔

اس دور میں بھی اوقاف سے متعلق بہت سارے سوالات روز پیدا ہورہے ہیں، جن میں سے کچھ سوالات کا تعلق اصحاب حرص وہوس سے وقف کی حفاظت سے ہے۔ اس طرح وقف کے بہتر انتظام، وقف کی افادیت میں اضافے اور ویران اوقاف کو مفید بنانے کی صورتیں، ان اہم موضوعات پر ''مجمع الفقہ اسلامی الہند'' نے ایک اہم سمینار مورخہ ۲۴/ ۲۵/ ۲۶/ ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ممبئی کے حج ہاؤس میں منعقد کیا۔ اس لحاظ سے یہ سمینار بہت اہم تھا کہ اس میں ملک اور بیرون ملک سے صاحب نظر علماء اور دانشور شریک ہوئے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس سمینار میں پیش کئے جانے والے مباحث اور مناقشات کے فیصلوں کی یہ مفصل روداد ہم آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں، اس میں وقف کے بنیادی اصول واحکام پر قیمتی تحریروں کے علاوہ اکیڈمی کی طرف سے بھیجا گیا سوالنامہ، مقالات کی تلخیص، عرض مسئلہ، نیز استبدال وقف، ناقابل انتفاع اوقاف پر تعلیمی اور رفاہی اداروں کا قیام، مساجد اور قبرستان کی زائد اراضی کا تعلیمی اور رفاہی مقاصد کے لئے استعمال، اوقاف کی زائد آمدنی کا مصرف وغیرہ دیگر اہم ترین سوالات پر علماء کے جوابات کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں اوقاف کے موضوع پر ایک اہم تعارفی تحریر شائع کی جارہی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ فقہ اسلامی اور خاص کر فقہ اوقاف کے لٹریچر میں ایک اہم اضافہ ہوگا اور اس کی افادیت دیر اور دور تک محسوس کی جاتی رہے گی، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمالے اور ہم سب کو خیر کی توفیق عطا فرمائے۔

واللہ الموفق

مجاہد الاسلام قاسمی

۴/ ۲/ ۱۹۹۹ء مطابق ۱۷/ شوال ۱۴۱۹ھ

پہلا باب تمہیدی امور

سوال نامہ:

ہندوستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں مختلف مقاصد کے لئے بے شمار اوقاف ہیں جو زمانہ قدیم سے چلے آرہے ہیں، اوقاف کی دیکھ بھال کے لئے حکومت نے سنٹرل وقف بورڈ اور صوبائی وقف بورڈس بھی قائم کررکھے ہیں، مختلف صوبوں کے مختلف وقف ایکٹ ہیں اور مرکزی حکومت نے ۱۹۹۵ء میں نیا وقف ایکٹ بنایا، اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے کہ مختلف ریاستوں میں نافذ قانون وقف اور سنٹرل وقف ایکٹ کا جائزہ وقف کے شرعی احکام کی روشنی میں لیا جائے، اس سلسلہ میں مختلف ریاستوں میں نافذ قوانین وقف اور سنٹرل قانون وقف کے جائزہ کے لئے ماہرین قانون کو زحمت دی جارہی ہے، ان کی رپورٹس آنے کے بعد انشاء اللہ کچھ متعین سوالات آپ حضرات کی خدمت میں شرعی نقطہ نظر معلوم کرنے کے لئے ارسال کئے جائیں گے، فی الوقت اوقاف سے متعلق چند اہم سوالات جو بار بار اوقاف کے ذمہ داروں اور قانون وقف کے ماہرین کی طرف سے علماء کی خدمت میں وقتاً فوقتاً پیش کئے جاتے رہے ہیں، انہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے، ان مسائل پر آپ کی واضح و مدلل رائے مطلوب ہے:

۱۔ بہت سے اوقاف (خصوصاً پنجاب وہریانہ اور دہلی ومغربی یوپی میں) ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی طرف مسلمانوں کی آبادی منتقل ہوجانے کی وجہ سے ویران ہوچکے ہیں، اور جن مقامات پر وہ اوقاف ہیں وہاں دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہوگیا ہے۔ اس میں قبرستان، مدارس وخانقاہیں ہر قسم کے اوقاف ہیں، ایسے اوقاف پر حکومت یا غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جارہا ہے، اس سلسلہ میں درج ذیل سوالات ہیں:

الف۔ ایسے اوقاف کو فروخت کرکے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے؟

ب۔ کیا ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالے کرکے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کرکے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے؟

ج۔ کیا شرعاً اس کی گنجائش ہے کہ ایسے ویران، ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کرکے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کردئے جائیں۔

۲۔ بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں مساجد ومدارس یا مقابر کے بڑے بڑے اوقاف ہیں، اور مسلمانوں کی آبادی وہاں بہت معمولی رہ گئی ہے، مثلاً ایک مسجد ہے، اس کے لئے بہت سی زمینیں اور مکانات وقف ہیں، مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے زیادہ ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں دریافت طلب ہیں:

الف۔ کیا مسجد پر وقف اراضی میں جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہے، مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے؟

ب۔ کیا مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے؟ جب کہ واقف نے ان زمینوں اور مکانات کو مسجد ہی کے لئے وقف کیا تھا۔

۳۔ بہت سے اوقاف کی آمدنی ان کے لئے متعین مصارف سے بہت زیادہ ہے، جو سال بسال جمع ہوکر ایک بڑا سرمایہ بنتی جارہی ہے۔ جس کی طویل عرصہ تک حفاظت ایک دشوار مسئلہ بلکہ خالی از خطرہ نہیں، یہ خطرہ حکومت کی دست درازی کا بھی ہے اور منتظمین وغیرہ کی طرف سے بھی، اور نہ ہی روزمرہ کی ضروریات کے اندر اس کے صرف کو سوچا جاسکتا ہے، اور نہ آئندہ حفاظت یا اصلاح ومرمت وغیرہ کے کاموں کے لئے، تو کیا ایسی فاضل آمدنی کا دوسرے مواقع میں صرف کرنا درست ہوگا مثلاً:

الف۔ اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں؟ ب۔ دیگر ملی، دینی و علمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں؟

۴۔ بہت سے اوقاف اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہیں، مثلاً کسی مسجد یا مدرسہ پر کوئی مکان وقف ہے، جو محلہ کے اندر واقع ہے، اس کا معمولی کرایہ ملتا ہے جس سے مسجد یا مدرسہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ اور اس کو فروخت کر کے کسی تجارتی مقام پر کوئی دوکان خرید لی جائے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی مکان موقوفہ کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ کیا ایسا کیا جاسکتا ہے کہ مکان موقوفہ کو فروخت کر کے ایسی کوئی بھی شکل اختیار کی جائے جس میں وقف کی آمدنی زیادہ ہو جائے؟

۵۔ بہت سے اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے ہیں، مثلاً کوئی جاگیر، کسی خاص خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی، وہ خاندان ختم ہو گیا، یا اس کے افراد دوسری جگہ منتقل ہو گئے، یا کسی مسجد و مدرسہ کے لئے وقف تھا اور اب نہ وہ مسجد ہے نہ مدرسہ۔ تو ان اوقاف کی آمدنی کا کیا مصرف ہوگا؟

۶۔ الف۔ بعض اوقاف کی عمارتیں مخدوش حالت میں ہیں، اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ نہیں ہے۔ اور کوئی بلڈر اس کے لئے تیار ہے کہ اس مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط کے ساتھ تعمیر کر دے کہ اس کی ایک یا دو منزل اس کی ملکیت ہوگی، جس میں اس کو ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا، اور بقیہ وقف کے مصارف کے لئے، کیا شرعا ایسا معاملہ درست ہے۔ اسی طرح وقف کی ایک زمین ہے جس پر کسی طرح کی کوئی عمارت نہیں، اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی صورت ہے۔ اس زمین سے فائدہ اٹھانے کے لئے اگر کسی بلڈر سے اسی طرح کا معاملہ کر لیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

ب۔ اسی طرح کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے، وقف شدہ زمین و جائداد کا کوئی حصہ فروخت کر کے اس سے نئی تعمیر کی جاسکتی ہے، جبکہ اس کا مقصد وقف کی حفاظت ہے اور اس کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے؟

۷۔ مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین۔ جو کہ ضرورت سے زائد ہے۔ اس پر مدرسہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے کہ وہ زمین ایک کار خیر میں استعمال ہو؟

۸۔ جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان ہو رہا ہے، یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا، اس کی وجہ سے اب اس کے استعمال اور اس میں تدفین پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، اور اس کی وجہ سے ان پر قبضہ کا خطرہ ہے۔ بلکہ قبضہ ہو رہا ہے۔ تو ان قبرستانوں کے لئے کیا حکم ہوگا۔ اور ان سے انتفاع کو باقی رکھنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جاسکتی ہے؟

۹۔ بہت سی قدیم مساجد اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں۔ ایسی بعض مساجد میں حکومت نے نماز کی ادائیگی کو منع کر دیا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے، کیا حکومت کو اس طرح کا کوئی حق ہے؟

۱۰۔ قبرستان کی حفاظت کے لئے جب کہ صرف باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرا دی جائے۔ جس کے لئے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے لی جائے اور اس سے یہ کام کرایا جائے۔ جس میں قبرستان کے اطراف کا چند فٹ دوکانوں میں چلا جائے گا، کیا یہ درست ہوگا؟ اور بعد میں فاضل آمدنی مناسب مصارف خیر میں لگا دی جائے۔

۱۱۔ آج کل بعض بڑے شہروں میں مسلمان اس صورت حال سے دوچار ہیں کہ وسیع قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جو ممکن ہے کسی زمانہ میں یہ تدفین کے لئے آنے والوں کی رعایت سے بنائی گئی ہو کہ وہ وہاں نماز ادا کر سکیں، اب اس علاقہ میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مسجد کی توسیع ضروری ہو گئی ہے، نیز قبرستان میں بھی تدفین کا سلسلہ جاری ہے، تو کیا قبرستان کے حصہ میں مسجد کی توسیع کی جاسکتی ہے؟ اور کیا اس میں ویران اور زیر استعمال قبرستان اور جدید و قدیم قبروں کے حکم میں فرق ہے؟

۱۲۔ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد پر بھی اراضی وقف کی ہیں، اور شائد واقف کے ہندو ہونے کے باعث یہ مساجد اب ہندو اوقاف کے تحت ہیں، اور ہندو وقف بورڈ ہی مسجد سے متعلق تمام نظم و نسق انجام دیتا ہے، تو کیا مساجد و مقابر اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا درست ہے؟

☆☆☆

اکیڈمی کا فیصلہ

مسائل اوقاف

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا دسواں فقہی سمینار ہندوستان کے شہر عروس البلاد ممبئی میں بمقام حج ہاؤس منعقد ہوا، اس سمینار میں چند دوسرے موضوعات کے ساتھ اوقاف کے چند اہم مسائل پر بھی غور وخوض اور مذاکرہ کیا گیا، اس موضوع پر فقہ اکیڈمی کے سوالنامہ کے جواب میں جو مقالات اور تحریریں آئیں اور شرکاء سمینار کی جو آراء سامنے آئیں ان سب کو پیش نظر رکھ کر دسویں فقہی سمینار کے شرکاء نے درج ذیل فیصلے کئے:

۱۔ اسلام میں نیکی کے کاموں اور خیراتی مقاصد کے لئے زمین، جائداد اور مال وقف کرنا بہت بڑا کار ثواب اور صدقۂ جاریہ ہے، اس لئے مسلمان جس ملک اور جس علاقہ میں بھی آباد ہیں، نیک کاموں کے لئے زمین، جائداد اور مال وقف کرتے ہیں، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ بہت پرانی ہے، سیکڑوں سال سے ہندوستان کے ہر علاقہ میں آباد ہیں، اس لئے ہندوستان کے ہر صوبہ اور علاقہ میں مختلف دینی اور رفاہی وخیراتی مقاصد کے لئے مسلم اوقاف موجود ہیں، ان اوقاف کی حفاظت، انہیں ترقی دینا اور ان کی آمدنی وقف کرنے والوں کے مقاصد کے مطابق خرچ کرنا نیز اوقاف کی املاک سے غاصبانہ قبضہ ختم کرنا ہندوستانی مسلمانوں اور حکومت ہند کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

۲۔ اوقاف کے بارے میں اسلام کا اصل نقطہ نظر یہ ہے کہ اوقاف دائمی ہوتے ہیں، اس لئے عام حالات میں ان کو فروخت کرنا یا منتقل کرنا جائز نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقف کے بارے میں ارشاد ہے: ''لا تباع ولا توهب ولا تورث'' (نہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ ہبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہوسکتی ہے) لہذا اوقاف کی جائدادوں کو حسب سابق باقی رکھتے ہوئے انہیں نفع آور اور مفید بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہئے اور اس سلسلہ میں ایسے قانون بننے چاہئیں جس سے اوقاف کی جائداد کا پورا تحفظ ہو اور وقف کرنے والوں کے مقاصد کی رعایت کے ساتھ اوقاف کی افادیت اور نافعیت میں اضافہ ہو۔

۳۔ دوسرے اوقاف کے مقابلہ میں مساجد کو زیادہ تقدس واحترام حاصل ہے، مساجد کی فروخت اور منتقلی کسی حال میں درست نہیں، حتی کہ اگر مسجد ویران ہوجائے اور وہاں نماز ادا کرنے کا سلسلہ موقوف ہوجائے تو بھی وہ زمین جہاں مسجد کی عمارت تھی مسجد ہی رہتی ہے، اور اسے مسجد کا تقدس اور احترام حاصل ہوتا ہے وہاں مسجد بنانے اور اسے آباد کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''ان المساجد لله فلا تدعوا مع الله أحداً'' (سورۂ جن ۱۸)۔

''إنما يعمر مساجد الله من آمن بالله واليوم الآخر'' (سورۂ توبہ ۱۸)۔

۴۔ مساجد میں نماز کی ادائیگی سے روکنا بدترین ظلم اور گناہ ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى فى خرابها'' (سورۂ بقرہ/۱۱۴)۔

کسی مسجد میں مسلمانوں کو خواہ کتنے طویل زمانہ سے نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا ہو یا اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا گیا ہو یا عمارت منہدم کردی گئی ہو، اسلامی شریعت کی نظر میں وہ مسجد ہی رہتی ہے۔

۵۔ آثار قدیمہ کے تحت جو مساجد ہیں ان میں نماز کی ادائیگی کو روکنا شرعاً ظلم ہے، ارشاد باری ہے:

''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها'' (سورۂ بقرہ ۱۱۴)۔

۶۔ تقسیم ہند کے موقع پر ہندوستان کے بعض علاقوں (خصوصاً پنجاب، ہریانہ، دہلی اور مغربی یوپی کے بعض علاقے) سے بڑے پیمانے پر مسلمان پاکستان منتقل ہو گئے، ان علاقوں میں مسلمانوں کے مختلف النوع بڑے بڑے اوقاف (مساجد، مدارس، خانقاہیں، قبرستان، سرائے وغیرہ) ہیں، ان علاقوں میں اگر کچھ بھی مسلمان آباد ہیں تو ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ان اوقاف کے تحفظ اور انہیں نفع آور بنانے کی جدوجہد کریں، جو آبادیاں مسلمانوں سے کلیۃً خالی ہو چکی ہیں، وہاں کے اوقاف کا تحفظ وہاں کے وقف بورڈ کی ذمہ داری ہے، اور قریبی مسلم آبادی کو ان کے تحفظ کی جدوجہد کرنی چاہئے۔

۷۔ مساجد کے علاوہ دوسرے وہ اوقاف جو ان مقامات میں واقع ہیں جہاں پر دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہو گیا اور ان اوقاف پر قبضہ غاصبانہ کا پورا خطرہ ہے، ایسے اوقاف کو فروخت کر کے دوسرے مقامات پر اسی نوع کے اوقاف قائم کرنا درج ذیل شرطوں کے ساتھ درست ہے:

الف: اس بات کی تحقیق کر لی گئی ہو کہ مسلمانوں کی آبادی ان مقامات سے کلیۃً ختم ہو چکی ہے، اور مستقبل قریب میں وہاں مسلمانوں کے آباد ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

ب: وقف جائداد کی فروختگی مناسب قیمت پر مارکیٹ ویلو کا لحاظ کرتے ہوئے کی جائے، اتنی کم قیمت پر اسے فروخت نہ کی جائے جتنی کم قیمت قیمتوں کے ماہرین نہیں لگا سکتے۔

ج: وقف کو فروخت کرنے والا متولی یا وقف افسر اس کی فروختگی اپنے کسی قریبی رشتہ دار یا کسی ایسے شخص کے ہاتھ نہ کرے جس سے اس کا مفاد وابستہ ہو، اسی طرح کسی ایسے شخص کے ساتھ فروختگی نہ کرے جس کا قرض یا مالی دَین فروخت کرنے والے کے ذمہ لازم ہے۔

د: وقف جائداد کی فروختگی روپیہ پیسہ کے بجائے جائداد سے کی جائے اور اگر کسی قانونی یا عملی دشواری کی وجہ سے نقد روپیوں سے فروختگی کی جائے تو جلد سے جلد اس کے ذریعہ جائداد خرید کر متبادل وقف قائم کر دیا جائے۔

ھ: وقف کے تبادلہ اور فروختگی کی اجازت شرائط استبدال کی تحقیق کے شرعی قاضی یا اوقاف کی ایسی شرعی کمیٹی دے جس میں مسائل اوقاف سے واقف متقی وخدا ترس علماء، مسلمان متدین ماہرین قانون ضرور شامل ہوں، موقوفہ جائداد کی فروختگی اور تبادلہ کے لئے وقف بورڈ یا وقف آفیسر کی اجازت شرعاً کافی نہیں ہے، اس سلسلہ میں وقف ٹریبونل (Tribunal) کی اجازت شرعاً اس وقت معتبر ہوگی جب اس نے کم سے کم تین مستند مفتیان کرام کی رائے لینے اور مشورہ طلب کرنے کے بعد ان کے مشورہ کے مطابق فیصلہ کیا ہو۔

نوٹ: یہ وضاحت ضروری ہے کہ موقوفہ دوکان، زمین، جائداد کو فروخت کر کے جو دوکان، مکان، زمین، جائداد خریدی جائے گی وہ بھی انہیں مقاصد کے لئے وقف ہوگی، جن کے لئے پہلا وقف پراپرٹی وقف تھی۔

۸۔ الف: ویران غیر آباد اوقاف کی آمدنی مقاصد واقف کی رعایت کرتے ہوئے وقف نامہ میں مذکور مدات پر کی جائے اور اگر یہ مدات موجود نہ ہوں تو اس سے قریب ترین مدات پر صرف کیا جائے، منشاء واقف کا لحاظ کئے بغیر دیگر مصارف پر صرف کرنا درست نہ ہوگا۔

ب: اگر ویران غیر آباد اوقاف فروخت کرنے پڑیں تو ان کا متبادل وقف قائم کرنا ضروری ہوگا۔

۹۔ مسجد پر وقف زائد اراضی جن کی نہ مسجد کو فی الحال ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت پیش آنے کی امید ہے، ان اراضی پر دینی تعلیم کا مدرسہ یا مکتب قائم کرنا درج ذیل صورتوں میں درست ہوگا:

الف: مسجد آباد نہ ہو اور مدرسہ یا مکتب قائم ہونے میں مسجد کے آباد ہونے کی امید ہو۔

ب: مسجد پر موقوف زائد اراضی پر قبضہ غاصبانہ کا شدید خطرہ ہے اور دینی مدرسہ یا مکتب قائم ہونے کی صورت میں قبضہ کا خطرہ ٹل جائے گا۔

ج: جس آبادی یا محلہ میں مسجد واقع ہے وہاں مسلمان بچوں کے لئے کوئی دینی مدرسہ یا مکتب نہیں، دینی مدرسہ یا مکتب قائم کرنے کے لئے کوئی مستقل بندوبست بھی نہ ہو تو مسجد پر وقف زائد اراضی میں دینی مدرسہ یا مکتب قائم کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے لئے مسجد کے متولی یا منتظمہ کمیٹی سے اجازت لے لی جائے، بہتر یہ ہے کہ خود مسجد کی کمیٹی ہی اس مکتب یا مدرسہ کا بندوبست کرے۔

۱۰۔ مساجد پر وقف اراضی جن کا مقصد مساجد کے لئے آمدنی فراہم کرنا ہے، ان کو مناسب کرایہ پر مسلمانوں کی دینی، عصری یا ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے قائم کرنے کے لئے دیا جاسکتا ہے، لیکن معاملات اس طرح طے کئے جائیں کہ مساجد کی مالکانہ حیثیت مجروح نہ ہو۔

۱۱۔ جن مساجد کے پاس ان کے مصارف سے کہیں زیادہ آمدنی ہے اور یہ آمدنی سال بہ سال جمع ہو کر بڑا سرمایہ بنتی جارہی ہے، مستقبل قریب میں بھی مساجد کو اس زائد سرمایہ کی ضرورت پیش آنے کی امید نہیں ہے، تو مساجد کی ایسی زائد آمدنی کو دوسرے مقامات پر (جہاں ضرورت ہو) مساجد تعمیر کرنے یا محتاج مساجد کی امداد میں صرف کیا جائے، کیونکہ ہندوستان میں اب بھی ایسی بہت سی آبادیاں ہیں جہاں کوئی مسجد اور دینی مکتب نہیں ہے، مسلمان اذان کی آواز کو ترستے ہیں، مالدار مساجد کی فاضل آمدنی سے ایسی آبادیوں میں مساجد قائم کی جائیں۔

۱۲۔ مساجد کے مصارف کے لئے موقوفہ اراضی اور جائدادوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک اہم مصرف مساجد کے ائمہ، مؤذنین اور دوسرے خدام بھی ہیں، شرکاء سمینار کا احساس ہے کہ بسا اوقات مساجد کی آمدنی میں گنجائش ہونے کے باوجود ائمہ ومؤذنین وغیرہ کی تنخواہیں بہت کم رکھی جاتی ہیں جو ان کی ضروریات کے لئے بالکل ناکافی ہوتی ہیں، اس لئے سمینار سفارش کرتا ہے کہ متولیان اور مساجد کے ذمہ داران ائمہ ومؤذنین وخدام مساجد کو بہتر سے بہتر اکرامیہ پیش کریں، اور ان کی تنخواہوں کے مسئلہ کو مساجد کے ضروری مصارف میں شمار کریں۔

۱۳۔ دیگر اوقاف کی زائد آمدنی جن کی اوقاف کو نہ فی الحال ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت پیش آنے کی امید ہے اور اس کی حفاظت متولیان کے لئے بہت مشکل ہے، حکومت یا بددیانت افراد کی طرف سے دست اندازی یا قبضہ غاصبانہ کا خطرہ ہے، اوقاف کی ایسی زائد آمدنی کو اسی نوع کی مدات میں صرف کیا جائے مثلاً مدارس کی زائد آمدنی کو مدارس میں، مسافر خانوں کی زائد آمدنی کو مسافر خانوں میں صرف کیا جائے۔

۱۴۔ اگر کسی وقف کی آمدنی معقول ہو تو محض زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے اس کی فروختگی درست نہیں کہ اصل وقف کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، البتہ اگر موقوفہ جائداد کی آمدنی اتنی قلیل ہو کہ وقف پراپرٹی کے ضروری اخراجات اس سے پورے نہ ہوتے ہوں بلکہ اس کے لئے قرض لینا پڑتا ہو اور اس موقوفہ جائداد کی آمدنی بڑھانے کی کوئی شکل نہ ہو، ایسی صورت میں تجویز (۷) میں ذکر کردہ شرائط (ب، ج، د، ھ) کی پابندی کے ساتھ موقوفہ جائداد کو فروخت کر کے زیادہ منفعت بخش جائداد خریدنا درست ہوگا، اگر واقف زندہ ہو تو اس سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔

۱۵۔ جن اوقاف کی عمارتیں مخدوش حالت میں ہیں اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ موجود نہیں ہے، اور نہ ہی مستقبل قریب میں حاصل ہونے کی امید ہے، ایسے اوقاف کے متولیان کسی بلڈر سے ایسا معاملہ کرسکتے ہیں کہ بلڈر اس شرط کے ساتھ عمارت تعمیر کرے کہ ایک خاص مدت تک وہ پوری عمارت یا اس کا ایک حصہ اس کے پاس بطور کرایہ رہے گا، اور اس طرح اسے سرمایہ کاری کا فائدہ حاصل ہوجائے گا، اس طرح معاملہ کرنا درست نہیں کہ چند منزلہ عمارت کی ایک منزل یا دو منزل کی ملکیت بلڈر کی طرف ہوجائے۔

۱۶۔ قبرستان کی حفاظت کے لئے اس کے اردگرد چہار دیواری تعمیر کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، ایسا کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرادی جائے، لیکن دوکانوں کا راستہ قبرستان کے باہر سے ہونا چاہئے، اس کے لئے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے کر دوکانوں کی تعمیر کرائی جائے، دوکانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی قبرستان کی حفاظت وضروریات میں صرف کی جائے، لیکن اس کا لحاظ رکھا جائے کہ دوکانیں تعمیر کرنے میں ایسی قبریں متاثر نہ ہوں جن کے نشانات باقی ہیں۔

۱۷۔ حکومت ہند نے مسلم اوقاف کے لئے جو پارلیمانی کمیٹی بنائی ہے اس کے سامنے وقف ایکٹ میں ضروری ترمیمات کا مسودہ پیش کرنے اور مفید تجاویز کے لئے یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی کے سکریٹری جنرل قاضی مجاہد الاسلام قاسمی سے سفارش کرتا ہے کہ اس کام کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دیں، جو جلد از جلد ضروری ترمیمات اور تجاویز مرتب کر کے پارلیمانی کمیٹی کے سامنے پیش کرے، اور اس مسئلہ میں فقہ اکیڈمی کی نمائندگی کرے۔

☆☆☆

تلخیص مقالات

مسائل اوقاف

۱۔الف: جو اوقاف مسلمانوں کی آبادی وہاں سے منتقل ہو جانے کی وجہ سے ویران ہو چکے ہیں، اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہو گیا ہے، نیز ان پر حکومت یا غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہے، ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر متبادل وقف قائم کرنے کے جواز پر تقریباً تمام مقالہ نگار علماء کرام کا اتفاق ہے، کیونکہ وقف کا مقصد ہی اس کی نافعیت کو برقرار رکھنا ہے، موجودہ صورت میں یہ مقصد متبادل وقف قائم کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے تو خواہ واقف نے اس کی اجازت دی ہو، یا نہ دی ہو، یا واقف کی کوئی صراحت نہ ہو، استبدال جائز ہوگا۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں: ''قال هشام: سمعت محمداً يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره، وليس ذلك إلا للقاضي'' (البحر الرائق ۵.۲۱۹)۔

متعدد حضرات نے استبدال وقف کی اجازت کے لئے علامہ شامی وغیرہ کی عائد کردہ شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری قرار دیا ہے جن میں اہم ترین یہ ہیں:

۱۔ اراضی وقف معمولی قیمت پر فروخت نہ کی جائیں، بلکہ مروجہ قیمت حاصل کی جائے۔

۲۔ تبادلہ اوقاف کا مجاز عام متولیوں کے بجائے دیانتدار و ذمہ دار ادارہ کو بنایا جائے، یا معتمد منتظمین صاحب نظر علماء سے رجوع کر کے قدم اٹھائیں (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی جنید عالم ندوی، مولانا نازبیر احمد قاسمی وغیرہ)

ب: ایسے ویران اوقاف کو حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کرنا بھی مذکورہ نقطہ نظر اور اس کے دلائل کے تحت تمام حضرات کے نزدیک جائز ہے۔

ج: لیکن ایسے ویران اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی نہ کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنے کے مسئلہ میں مقالہ نگار علماء کرام کی آراء مختلف ہیں۔ بیشتر حضرات کی رائے میں مقاصد واقف کی رعایت ضروری ہے، فقہاء کرام نے اس کی صراحت فرمائی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: ''إنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة'' (رد المحتار ۴، ۴۴۵) (مولانا نازبیر احمد قاسمی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا ایوب ندوی، مولانا شکیل احمد وغیرہ)

بعض حضرات نے مقاصد واقف کی رعایت کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے دینی تعلیم کے ادارے یا ایسے عصری تعلیمی ادارے جہاں دینیات و دینی تربیت کا بھی نظم ہو، قائم کرنے کی گنجائش ذکر کی ہے (مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی محبوب علی وجیہی وغیرہ)۔

۲۔الف: مسجد پر وقف اراضی جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہیں، ان میں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کے ادارے کے قیام کے مسئلہ میں بیشتر حضرات کے نزدیک دینی تعلیم کے ادارے اور مدارس قائم کئے جا سکتے ہیں، ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ بالخصوص موجودہ زمانہ میں مسجد کی آبادکاری اور تحفظ کا سب سے اہم ذریعہ مدرسہ کا قیام ہے، لہٰذا مدرسہ کے قیام میں خود اراضی وقف کا تحفظ ہے، اور مقاصد واقف کی تکمیل بھی، دوسری جانب مسجد اور مدرسہ کا تصور تقریباً لازم و ملزوم سا اس زمانہ میں ہو چکا ہے۔ (مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا حبیب اللہ قاسمی)۔

جواز کے قائلین میں متعدد حضرات نے دینی ادارے کی قید نہیں لگائی ہے، بلکہ دینی یا عصری دونوں کے قیام کی اجازت دی ہے۔ (مفتی محبوب علی وجیہی، حکیم ظل الرحمن، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا ایوب ندوی، مولانا عتیق احمد قاسمی)

دوسری رائے کی رو سے ایسی اراضی پر تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ زائد آمدنی اسی نوع کے دیگر اوقاف پر صرف کی جا سکتی ہے۔

(مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا شکیل احمد وغیرہ)۔

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب نے اس مسئلہ پر معاصر اور ماضی قریب کے اکابر مفتیان کرام کے دونوں طرح کے فتاوے ذکر کر کے ان پر سیر حاصل تنقیدی گفتگو کی ہے، اور آخر میں ایسی اراضی پر دینی اداروں کے قیام کی رائے کو ہی راجح قرار دیا ہے۔

مسجد کے لئے وقف زمینوں اور مکانات کی زائد از ضروریات آمدنی بعض حضرات کی رائے میں دینی تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔

(مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا حبیب اللہ قاسمی)۔

بعض لوگوں نے دینی تربیت کے ساتھ عصری تعلیم کے لئے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

(مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا شمس پیرزادہ)

لیکن متعدد حضرات نے اس جواز سے اختلاف کرتے ہوئے ایسی زائد آمدنی کو اسی جنس کے مصارف یا باعتبار اقرب مصارف میں خرچ کرنے کی رائے دی ہے (مولانا ظفر الاسلام، مولانا جنید عالم ندوی)۔

۳۔ الف: اوقاف کی زائد از ضرورت آمدنی کو اسی نوع کے دیگر اوقاف میں صرف کے جواز پر تمام مقالہ نگار علماء کرام کا اتفاق ہے۔

ب: دیگر ملی دینی وعلمی کاموں میں ایسی آمدنی کے صرف کی بابت متعدد حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر ضرورت درپیش ہو تو یہ رقم ان کاموں میں خرچ کی جاسکتی ہے (ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا ایوب ندوی)۔

دوسری رائے کی رو سے ایسے کاموں میں وہ رقم خرچ نہیں کی جاسکتی (مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا جنید عالم ندوی، مولانا عتیق احمد، مولانا ظفر احمد وغیرہ)۔

۴۔ کم منفعت بخش اوقاف کو فروخت کر کے ایسا متبادل وقف قائم کرنا جس سے زائد آمدنی حاصل ہو، بیشتر حضرات کے خیال میں درست ہے۔

بعض حضرات کی رائے میں جب تک کوئی وقف کسی بھی درجہ میں منفعت بخش ہے، محض زائد آمدنی کی نیت سے اس کی فروختگی جائز نہیں ہوگی۔

(مفتی محبوب علی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا ایوب ندوی، مولانا شکیل احمد، مولانا عتیق احمد بستوی)۔

۵۔ جن اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے ہیں، ان کی آمدنی کا مصرف اسی نوع کے دوسرے اوقاف یا قریب ترین نوع کے اوقاف ہوں گے۔ بعض حضرات نے مزید یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اگر اسی نوع کے اوقاف نہ ہوں تو فقراء مصرف ہوں گے، کچھ لوگوں نے صدقات جاریہ کے کاموں میں صرف کرنے کی بات کہی ہے۔

۶۔ اوقاف کی مخدوش عمارتوں کی از سر نو تعمیر کے لئے کسی بلڈر سے ایسا معاملہ کہ ایک دو منزل اس کی ملکیت ہوگی اور بقیہ وقف کے مصارف کے لئے ہوں گی، متعدد حضرات کی رائے میں درست ہے

(مولانا فضیل الرحمن، مولانا ظفر الاسلام، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عتیق احمد)

جبکہ بعض حضرات نے ایک دو منزل بلڈر کی ملکیت میں دینے کے بجائے اس سے کرایہ داری کا معاملہ کرنے کی رائے دی ہے، یعنی ایک محدود مدت تک عمارت کے مخصوص حصہ پر اس کا قبضہ رہے گا، جس دوران وہ اپنا خرچ وصول کرسکتا ہے، مالکانہ حقوق وقف ہی کے رہیں گے۔

(مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، حکیم ظل الرحمن، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی وغیرہ)۔

۷۔ وقف کی حفاظت کے لئے وقف کا کوئی حصہ فروخت کر کے آمدنی سے نئی تعمیر کرنے کے مسئلہ میں بھی بیشتر حضرات نے یہ رائے دی ہے کہ اگر حفاظت کی کوئی دوسری شکل نہ ہو تو ایسا کیا جاسکتا ہے۔

بعض حضرات نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے، اور وقف کی زمین فروخت کرنے کو درست قرار نہیں دیا ہے (مفتی حبیب اللہ قاسمی، حکیم ظل الرحمن، مولانا عبد القیوم پالنپوری)۔

۸۔ مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین پر جو ضرورت سے زائد ہے، مدرسہ کی تعمیر کو متعدد حضرات نے درست قرار دیا ہے (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، جناب شمس پیرزادہ)۔

بعض حضرات نے کرایہ داری کا معاملہ کرنے کی رائے دی ہے، تاکہ مسجد یا قبرستان براہ راست مستفید بھی ہوتے رہیں (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا فضیل الرحمن، مولانا عتیق احمد)

دوسرے متعدد حضرات نے اسے درست نہیں قرار دیا ہے (مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، حکیم ظل الرحمن)

۹۔ ایسے غیر مستعمل قبرستان سے خواہ وہاں سے مسلم آبادی ختم ہوجانے یا آبادی کے اندر آجانے کی وجہ سے استعمال متروک ہو، انتفاع کو باقی رکھنے کے لئے مختلف حضرات نے مختلف شکلیں تجویز فرمائی ہیں:

ایک رائے یہ ہے کہ ایسے قبرستان کے گرد دیواریں اٹھا کر انہیں محفوظ کردیا جائے (مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی عبدالرحیم)۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اسے فروخت کردیا جائے اور آمدنی سے دوسری جگہ قبرستان بنالیا جائے (۔

مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن، مولانا عتیق احمد، جناب شمس پیرزادہ، مولانا ایوب ندوی، مولانا شکیل احمد)۔

تیسری رائے کے اندر یہ تفصیل ہے کہ اگر چہار دیواری سے تحفظ یقینی نہ ہو تو فروخت کرکے دوسری جگہ قبرستان بنایا جائے، اور تحفظ کے لئے مسجد یا مدرسہ یا رفاہی ادارہ بھی اس میں قائم کیا جاسکتا ہے (مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری)۔

۱۰۔ اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ کسی بھی مسجد میں، خواہ آثار قدیمہ کے تحت آتی ہو، نماز کی ادائیگی سے روکنے کا حکومت کو ہرگز اختیار نہیں ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اس پابندی کو ختم کرائیں۔

۱۱۔ قبرستان کے تحفظ کے لئے پیشگی کرایہ کی رقم لے کر اطراف میں دوکانیں بنادی جائیں جن میں قبرستان کی چند فٹ زمین دوکان میں چلی جائے گی، بیشتر حضرات کے نزدیک یہ درست ہے۔

قائلین جواز میں سے بعض حضرات نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ یہ دوکانیں وقف ہوں گی (مولانا زبیر احمد قاسمی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی)۔ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، جناب شمس پیرزادہ اور حکیم ظل الرحمن نے اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اسے درست قرار نہیں دیا ہے۔

۱۲۔ قبرستان کے حصہ میں مسجد کی توسیع کے جواز سے اکثر حضرات نے اتفاق کیا ہے، ان میں سے متعدد حضرات نے یہ تفصیل بھی کی ہے کہ قبرستان بہت کشادہ ہو یا ویران ہو، زیر استعمال قبرستان یا تنگ قبرستان میں اگر مسجد کی توسیع کی ضرورت درپیش ہو تو ستون اٹھا کر اوپر مسجد بنالی جائے تاکہ نیچے تدفین کا سلسلہ جاری رہے (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مفتی محبوب علی وجیہی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی وغیرہ)۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی اور مولانا اخلاق الرحمن قاسمی کا خیال ہے کہ قبرستان کے اندر مسجد کی توسیع درست نہیں ہوگی، کیونکہ قبرستان کے لئے وقف زمین میں مسجد بنانا درست نہیں، جو جگہ نماز پڑھنے کے لئے متعین کردی گئی ہے اس میں نماز تو ہوجاتی ہے، لیکن شرعاً وہ مسجد ہی نہیں ہے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب نے بھی قبرستان میں مسجد کی توسیع کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔

۱۳۔ مساجد و مقابر اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے میں یہ درست ہے، کیونکہ تولیت اوقاف کے لئے اسلام شرط نہیں ہے۔

ان میں سے متعدد حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر غیر مسلم ادارہ مناسب طریقہ پر دیکھ ریکھ انجام دے رہا ہو تو بہتر ہے، ورنہ وہاں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ چونکہ تولیت کے لئے امانت شرط ہے، اور امانت کا تصور بغیر اسلام ممکن نہیں لہذا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا درست نہیں ہے (مولانا ظفر عالم ندوی، جناب شمس پیرزادہ)۔

حکیم ظل الرحمن صاحب نے وضاحت کی ہے کہ کسی ہندو وقف بورڈ کا وجود میرے علم کے مطابق نہیں ہے، البتہ بعض مساجد کا انتظام غیر مسلم ادارے یا اشخاص کرتے ہیں، اور جب تک ان کا نظم ونسق درست ہے ان کی تولیت میں رکھا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ

سوال ۱، ۲، ۳، ۴، ۷، ۹

مولانا عتیق احمد بستوی[1]

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد وعلى آله و أصحابه أجمعين

"مجمع الفقہ الاسلامی الہند" نے دسویں فقہی سمینار (منعقدہ بمبئی) کے لئے جو سوالنامہ جاری کیا اس کے پہلے محور میں اوقاف سے متعلق چند اہم سوالات ہیں، اوقاف سے متعلق سوالات میں سے سوال ۱، ۲، ۳، ۴، ۷، ۹ کا عرض مسئلہ میرے ذمہ کیا گیا ہے۔ اسی خدمت کو انجام دینے کے لئے کھڑا ہوا ہوں، یہ سوالات بنیادی طور پر اوقاف کے استبدال اور ایک وقف کی زائد زمین یا آمدنی دوسرے وقف پر صرف کرنے کے بارے میں ہیں۔

اوقاف کے موضوع پر مورخہ ۱۲ رستمبر ۱۹۹۷ء تک فقہ اکیڈمی کے آفس کو چالیس مقالات اور مختصر جوابات موصول ہوئے، بتیس مقالات وجوابات علماء اور اصحاب افتاء کے ہیں۔ ۶ رمقالات ان ہونہار فضلاء مدارس کے ہیں جو "دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد" کے شعبہ تخصص فی الفقہ میں زیر تربیت ہیں۔ ایک مقالہ جناب عبدالرحیم قریشی ایڈوکیٹ سکریٹری مسلم پرسنل لابورڈ کا ہے جس میں انہوں نے نئے وقف ایکٹ کا جائزہ لے کر اوقاف کے زیر بحث مسائل میں غور وفکر کے چند پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے، ایک تحریر جناب حکیم ظل الرحمن صاحب دہلی کی ہے جس میں انہوں نے مسائل اوقاف کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

۳۲ علماء واصحاب افتاء جن کی تحریریں اوقاف کے موضوع پر اکیڈمی کو موصول ہوئیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب (دار العلوم دیوبند)، مولانا زبیر احمد قاسمی (سیتا مڑھی بہار)، مفتی محبوب علی وجیہی (رامپور)، مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی (ہتھورا باندہ)، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (حیدرآباد)، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی (پنجاب)، مفتی شکیل احمد سیتاپوری (دار العلوم اسلامیہ بستی)، مولانا شمس پیرزادہ (ممبئی)، مولانا ظفر عالم ندوی (ندوۃ العلماء لکھنؤ)، مولانا ابوبکر قاسمی (شکر پور بھروارہ بہار)، مولانا عبدالقیوم پالنپوری (گجرات)، مولانا محمد ایوب ندوی (بھٹکل)، مفتی حبیب اللہ قاسمی (اعظم گڑھ)، مولانا تنویر عالم قاسمی (سیتامڑھی بہار)، مولانا ابراہیم گجیافلاحی (گجرات)، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی (علی گڈھ)، ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی (میسور کرناٹک)، مولانا سمیع اللہ قاسمی (سیتا مڑھی بہار)، مولانا اسعد اللہ قاسمی (ٹانڈہ بادلی رامپور)، مولانا عبداللطیف پالنپوری (گجرات)، مولانا اقبال احمد قاسمی (شکر پور بھروارہ بہار)، مولانا محمد نور القاسمی (جے پور راجستھان)، مولانا عطاء اللہ قاسمی (کوپا گنج مئو)، مولانا ابرار خاں ندوی (جے پور راجستھان)، مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری (شکر پور بھروارہ، بہار)، مولانا صدر عالم قاسمی (مئو)، مفتی جمیل احمد نذیری (مبارکپور)، مولانا ابوسفیان مفتاحی (مئو)، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (مئو)، مولانا قمر الزماں ندوی (پرتاپ گڈھ)، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی (اکل کوامہاراشٹر)، مولانا عتیق احمد بستوی (دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)۔

"دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد" میں زیر تربیت فضلاء مدارس جن کے مقالات اوقاف کے موضوع پر موصول ہوئے ہیں ان کے اسماء یہ ہیں:

مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد مستفیض الرحمن قاسمی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا محمد شاہد سہرساوی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا سید محمد ایوب سبیلی۔

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد میں زیر تربیت فضلاء مدارس کے مقالات کے بارے میں اس تاثر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مقالات کافی محنت اور مطالعہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں، ان میں تحقیق وتحریر دونوں کا سلیقہ پایا جاتا ہے اور مقالہ نگاروں کے روشن مستقبل کی غمازی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان ہونہار فضلاء مدارس کو دین کا خادم ومجاہد اور میدان تحقیق وتصنیف کا شہسوار بنائے۔ جناب مولانا محمد رضوان القاسمی اور جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی قابل مبارکباد ہیں جن کی توجہات اور کوششوں سے فضلاء مدارس کی تربیت کا مفید تر کام "دار العلوم سبیل السلام" میں انجام پا رہا ہے۔

---

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

عرض مسئلہ بابت سوال نمبر ۱

اوقاف کے سوالنامہ کا سوال نمبر ۱۔ یہ ہے:

بہت سے اوقاف (خصوصاً پنجاب، ہریانہ، دہلی و مغربی یوپی میں) ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی طرف مسلمانوں کی آبادی منتقل ہونے کی وجہ سے ویران ہو چکے ہیں، اور جن مقامات پر وہ اوقاف ہیں وہاں دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہو گیا ہے، اس میں مساجد، قبرستان، مدارس و خانقاہیں ہر قسم کے اوقاف ہیں، ایسے اوقاف پر حکومت یا غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہے، اس سلسلے میں درج ذیل سوالات ہیں:

الف۔ کیا ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے؟

ب۔ کیا ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کی جا سکتی ہے؟

ج۔ کیا شرعاً اس کی گنجائش ہے کہ ایسے ویران، ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کر دئے جائیں؟

اس سوال کے تمام اجزاء کا تعلق ان صوبوں اور علاقوں کے اوقاف سے ہے جہاں تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی بڑی آبادیاں تھیں، بڑے بڑے آباد اوقاف تھے، لیکن تقسیم ہند کا حادثہ پیش آنے پر وہ صوبے اور علاقے مسلمانوں سے خالی ہو گئے، مساجد و مدارس ویران ہو گئے، ان پر دوسروں کا قبضہ ہوتا گیا، خانقاہیں اور ان کے اوقاف اجاڑ ہو گئے، سب سے برا حال طویل و عریض قبرستانوں کا ہوا، ان کا کوئی پرسان حال نہیں رہا، ناجائز قبضے بڑھتے گئے اگر ہمارے سامنے پنجاب، ہماچل پردیش، ہریانہ، دہلی کے اوقاف کا جائزہ ہو، تاکہ تقسیم ہند سے پہلے وہاں کتنے اور کیسے کیسے اوقاف تھے اور تقسیم کے بعد ان کا کیا حشر ہوا، کتنے اوقاف باقی ہیں، کتنے ناپید ہو گئے اور کتنے معرض خطر میں ہیں تو صورت حال کی سنگینی سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔

سوال نمبر ۱۔ جز الف۔ ب کے جواب میں تمام حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ مساجد کے علاوہ دوسرے ویران اوقاف جن کی آبادکاری مستقبل میں بھی ممکن نظر نہیں آتی اور ان پر قبضہ غاصبانہ کا پورا خطرہ ہے تو انہیں فروخت کر کے متبادل اوقاف قائم کرنا یا دوسری زمین یا مکان و دوکان سے ان کا تبادلہ جائز ہے، اس بارے میں، بہت سے حضرات نے ائمہ مذاہب کی تصریحات اور مختلف فقہاء اور اصحاب افتاء کی عبارتیں اور فتاوی پیش کئے ہیں۔

سوال نمبر ۱۔ (الف، ب) میں ذکر کردہ صورتوں میں استبدال کی اجازت دینے کے بعد متعدد حضرات نے یہ بنیادی سوال اٹھایا ہے کہ اوقاف کے استبدال میں عام طور پر فقہاء اذن قاضی کی شرط لگاتے ہیں۔ بعض فقہاء نے اس سے بڑھ کر قاضی الجنۃ ہونے کی شرط لگائی ہے، ہر قاضی کے اذن کو کافی نہیں سمجھا ہے، ہندوستان میں، بہت کم علاقوں میں نظام قضاء قائم ہے تو اذن قاضی کی شرط کس طرح پوری ہوگی، کیا وقف بورڈ کی اجازت اذن قاضی کی جگہ لے سکتی ہے؟

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی اپنے مقالہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

اوقاف کے تعلق سے سوالات کے جوابات سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ: وقف کے مصرف میں تبدیلی، وقف کے تحفظ کے لئے اس کی فروخت اس طرح کے تمام معاملات میں قاضی اسلامی عدالت کے فیصلے کی شرط رکھی گئی ہے۔ ہمیں ہندوستان کے موجودہ نظام میں اس کا بدل تلاش کرنا ہوگا، اتنے اہم معاملے کو وقف بورڈ کے ارکان یا افسران کی صوابدید پر چھوڑ نا مناسب نہ ہوگا، وقف بورڈ کی رکنیت میں سیاسی مصلحتوں کو اہمیت دی جاتی ہے نہ کہ اہلیت و صلاحیت کو۔ قاضی یا اسلامی عدالت کا بدل کیا ہو اس کے لئے ایک صورت ''اوقاف کی شرعی کمیٹی'' ہو سکتی ہے، جس میں سرکردہ ماہرین قانون اور علمائے دین شامل ہوں۔

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی صاحب اذن قاضی کی شرط کے بابت لکھتے ہیں:

''رہ جاتی ہے یہ بات کہ وقف میں تبادلہ وغیرہ کے تصرف کے لئے فقہاء نے قاضی کی شرط یعنی قاضی کے فیصلہ و نظر و حکم کی قید لگائی ہے، لیکن معروف ہے کہ ایسے بہت سے مسائل میں توسع اختیار کر لیا گیا ہے، معتمد و دیانتدار علماء و ذمہ داران اور ارباب حل و عقد کو قاضی کی حیثیت ضرورتاً دی گئی ہے، لہذا ہندوستان میں اوقاف کے مسائل میں معتمد منتظمین کا فیصلہ معتبر ہوگا، مناسب ہوگا کہ یہ قید لگائی جائے اور توجہ دلائی جائے کہ وقف کے ذمہ داران ایسا فیصلہ کرنے میں

صاحب نظر علماء سے رجوع کریں، ان کو شامل کریں یا کم از کم رابطہ و استفتاء کریں، شامی نے بعض معاملات میں محلہ کے مسلمانوں کی رائے کا ذکر کیا ہے، اور ہمارے ارباب افتاء نے ایسے مسائل میں عموماً اس کا ذکر کیا ہے کہ ارباب حل وعقد و منتظمین جب مناسب سمجھیں یعنی ضروری و بہتر خیال کریں تو ایسے اقدام کریں، ''امداد الفتاوی'' (۲/ ۶۳۷) میں بھی کچھ اس بابت تفصیل آئی ہے کہ قاضی نہ ہو تو کیا کیا جائے''۔

بہرحال یہ مسئلہ کافی اہم اور نازک ہے کہ قاضی نہ ہونے کی صورت میں استبدال وقف کی اجازت کون دے سکتا ہے، جن صوبوں اور علاقوں میں مسلمانوں نے نظام قضاء قائم کر رکھا ہے وہاں کا مسئلہ تو کسی حد تک آسان ہے لیکن ہندوستان کے اکثر صوبے نظام قضاء سے محروم ہیں، متولی خواہ کتنا دیانت دار ہو، اسے اپنی صوابدید سے استبدال کی اجازت دینا درست نہیں۔ اگر استبدال وقف متولی کے دائرے کا عمل ہوتا تو فقہاء نے اذن قاضی کی شرط نہ لگائی ہوتی۔ متولیوں کو استبدال اوقاف کا اختیار دینے میں (خواہ یہ اختیار کتنی پابندیوں کے ساتھ دیا جائے) اوقاف کی تباہی اور بربادی ہے۔ وقف بورڈوں کی صورت حال محتاج بیان نہیں۔ عیاں راچہ بیان۔ وقف بورڈ کے افسران یا ارکان کی اجازت کو بھی اذن قاضی کا قائم مقام قرار نہیں دیا جاسکتا، ورنہ اوقاف کی صورت حال مزید بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی۔

حاکم مسلم اور قاضی کی عدم موجودگی میں فقہاء نے متعدد مسائل میں عامۃ المسلمین یا ارباب حل وعقد کو قاضی کے قائم مقام مانا ہے، مثلاً متولی کے عزل و نصب کے مسئلہ میں فقہاء کی ایسی صراحتیں ملتی ہیں، علامہ شامی نے ''فتاوی تاتارخانیہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

''إن أهل المسجد لو اتفقوا على نصب رجل متوليا لمصالح المسجد فعند المتقدمين يصح، ولكن الأفضل كونه بإذن القاضي ثم اتفق المتأخرون أن الأفضل أن لا يعلموا القاضي في زماننا لما عرف من طمع القضاة في أموال الأوقاف'' (رد المحتار ۳،۶۲۲)۔

مفتی جمیل احمد نذیری لکھتے ہیں: ''موجودہ زمانہ میں جب کہ قاضی موجود نہیں ہے، اکثر علاقوں کا یہی حال ہے، لہذا عوام بمنزلہ قاضی قرار پائیں گے، مساجد و مدارس اور اداروں کی کمیٹیاں عوام کی نمائندہ مانی جاتی ہیں، لہذا سارے عوام کو اکٹھا کرنے کے بجائے ان کمیٹیوں کا غور و خوض اور فیصلہ عوام کے فیصلہ کے درجہ میں ہوگا''۔

لیکن حالات سے باخبر اصحاب بصیرت سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ آج کل عموماً کمیٹیاں عوام کی نمائندہ کم ہوتی ہیں، اوقاف کے متولی اور اداروں کے ذمہ دار ایسی کمیٹیاں تشکیل دے لیتے ہیں جن میں عوام کی نمائندگی کا لحاظ کم سے کم ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو کمیٹی کا ممبر بنایا جاتا ہے جو متولیان کے ہر فیصلہ اور رائے کی تصدیق و تصویب کریں، اس لئے میرے خیال میں استبدال وقف جیسے نازک مسئلے میں کمیٹی پر اعتماد کرنا اوقاف کے مفاد میں نہیں ہوگا، مناسب اور محتاط بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر صوبہ یا ہر ضلع میں ایک کمیٹی بنادی جائے جس میں بالغ نظر علماء و اصحاب افتاء، متدین و امانت دار ماہرین قانون شامل ہوں، یہ کمیٹی استبدال اوقاف کے مسائل کو دیکھے، اس کمیٹی کی تحقیق و تفتیش اور فیصلہ و اجازت کے بعد ہی متولی کو استبدال کا حق حاصل ہو، یہ کمیٹی تحقیق کرتے وقت اس علاقہ کے چند سرکردہ، دیانت دار مسلمانوں کو بھی شریک کار کرلے جہاں متعلقہ وقف واقع ہے۔

ہندوستان کے علماء کا اجماعی فیصلہ ہے کہ مسجد کی مسجدیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، اس لئے مسجد کے استبدال کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آل انڈیا پرسنل لا بورڈ کے فیصلے کا حوالہ اس سلسلہ میں دیا جاسکتا ہے۔

فقہاء مجتہدین کی غالب اکثریت اسی رائے پر ہے، اس سلسلے میں مختلف فقہی مسالک کے مصنفین کی چند عبارتیں درج کی جاتی ہیں:

علامہ ابن ہمام ''فتح القدیر'' میں لکھتے ہیں: ''استغنى عن الصلاة فيه أهل تلك المحلة أو القرية بأن كان في قرية فخربت وحولت مزارع يبقى مسجدا على حاله عند أبي يوسف وهو قول أبي حنيفة ومالك والشافعي'' (فتح القدير ۵،۴۴۶)

علامہ حصکفی الدر المختار میں تحریر فرماتے ہیں: ''ولو خرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الإمام الثاني أبدا إلى قيام الساعة وبه يفتى'' (الدر المختار مع الشامی جلد ۳،۳۵۸)۔

امام نووی شافعی ''شرح المہذب'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''وإن وقف مسجداً فخرب المكان وانقطعت الصلوة فيه لم يعد

إلى الملك ولم يجز التصرف فيه'' (شرح المهذب ۱۵،۳۶۰)۔

مشہور شافعی فقیہ امام قفال شاشی ''حلیۃ العلماء فی معرفۃ مذاہب الفقہاء'' میں لکھتے ہیں: ''فإن وقف مسجدا فخرب أوخرب المكان الذى كان خليه وانقطعت الصلاة فيه لم يعد إلى الملك ولم يجز التصرف فيه ولا يجوز نقصه ولا نقله الى غيره وبه قال مالك (جلد ۶،۳۷)۔

علامہ احمد بن یحیی الونشریسی مالکی ''المعیار المعرب عن فتاوی علماء افریقیہ والاندلس وبلاد المغرب'' میں لکھتے ہیں:

سئل (سيدى عبد الله المعبدوسى) عن مسجد قائم معطلت منفعة وخرب ما حوله من الدور لمن يصرف وقفه المجلس عليه والمسجد ما ترجى له عمارة فى الوقت أصلا وربعه أما أرض ارجزاء لمن يكون معل للجامع الأعظم أو لا ثوب المساجد إليه أو يبقى موقوفا؟ فأجاب أما المسجد المصكور. فإن احتاج إلى بناء يقام به رسمه و تبقى عليه به حرمة المسجد مخافة دثوره. فإنه يبنى من غلة إحباسه وما فضل من ذلك فقيل يصرف إلى أقرب المساجد إليه وقيل إلى أحو جها وأن بعد وبه أفتى (۷،۵۶)۔

فقہ حنبلی کے بارے میں معروف بات تو یہی ہے کہ حنابلہ کے نزدیک ویران مساجد جن کے آباد ہونے کی کوئی امید نہ ہوان کی فروختگی جائز ہے لیکن ابن حنبل کا دوسرا قول جسے بعض حنبلی فقہاء نے راجح قرار دیا ہے یہ ہے کہ مسجد کی زمین کی بیع جائز نہیں ہے ہاں اگر مسجد کی عمارت کے بارے میں چوروں ڈاکوؤں وغیرہ کا خطرہ ہوتو اسے منتقل کیا جاسکتا ہے یا فروخت کیا جاسکتا ہے۔

ہریانہ و پنجاب وغیرہ کے ویران اوقاف خصوصاً ویران مساجد کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے اس پہلو پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس دور میں کسی علاقہ سے آبادی ختم ہونا پھر دوبارہ آباد ہوجانا پہلے زمانوں کی طرح مشکل نہیں رہا، پنجاب اور ہریانہ کے جو شہر تقسیم ہند کے وقت مسلمانوں سے کلیۃً خالی ہو چکے تھے وہاں اب دوبارہ مسلمان رفتہ رفتہ آباد ہورہے ہیں، ملازمت اور تجارت کے سلسلے میں مسلمان وہاں آباد ہورہے ہیں، پنجاب و ہریانہ کی زرعی، صنعتی ترقیات نے مزدوروں کا رخ اس علاقہ کی طرف موڑ دیا ہے، اس میں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے، پنجاب و ہریانہ کی فیکٹریوں اور کھیتوں میں مسلمان مزدور بھی کام کررہے ہیں، اسی طرح شہروں ہی میں نہیں، بلکہ قصبات اور دیہاتوں میں مسلمان کچھ نہ کچھ آباد ہورہے ہیں اور جہاں بھی چند مسلمان جمع ہوجائیں مسجدان کی سب سے پہلی دینی ضرورت ہے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں ہمارے غور وفکر کا رخ یہ ہونا چاہئے کہ ان ویران مساجد کو کس طرح آباد کیا جائے اوران کے تحفظ کے لئے کیا کیا قانونی اور عملی تدبیریں اختیار کی جائیں، اس پہلو کی طرف جناب عبدالرحیم قریشی صاحب سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے مقالہ میں متوجہ کیا ہے۔

میرے خیال میں فقہ اکیڈمی کو پوری صراحت اور قوت سے اس بات کا اعلان واظہار کرنا چاہئے کہ مساجد کی فروختگی اور استبدال کسی حال میں جائز نہیں ہے، کیونکہ دلائل کے اعتبار سے یہ موقف مضبوط اور پختہ ہے، مصالح وحالات کے مطابق بھی ہے۔ ہندوستان میں مساجد پر غاصبانہ قبضہ کرنے اور انہیں مندروں میں تبدیل کرنے کی منظم اور طاقتور تحریک چل رہی ہے، ایسے حالات میں استبدال مساجد کی گنجائش پیدا کرنا تمام مساجد واوقاف کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔

سوال نمبر ا۔(ج) میں دریافت کیا گیا تھا: کیا شرعاً اس کی گنجائش ہے کہ ایسے ویران ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کرکے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کردئے جائیں؟

اس سوال کے جواب میں اکیس حضرات نے لکھا ہے کہ واقف کے مقاصد کی پابندی ضروری ہے، اس کی پابندی کئے بغیر مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم نہیں کئے جاسکتے، چند حضرات نے کچھ گنجائش ذکر کی ہے، لیکن ان حضرات کا منشا یہ نہیں ہے کہ فروخت شدہ اوقاف کی قیمت صرف کرنے میں

واقف کے مقاصد کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی لکھتے ہیں: تبادلہ میں اس کا لحاظ کیا جائے کہ اصل وقف کی جو جہت ہو اس کا نظم کیا جائے، اس لئے کہ اس قسم کی ضرورت دوسرے مواقع میں پائی جاتی ہے...... استبدال اور تبادلہ کی اجازت ضرورت میں اور پابندیوں کے ساتھ ہے، اور ضرورت کی رعایت میں واقف کی عدم اجازت کا بھی خیال نہیں کیا گیا ہے، مگر مقصد اہم ہے، مدارس، مسافر خانے اور اسپتال آج بھی بنائے جاسکتے ہیں، ان سے واقف کے مقصد کی کسی نہ کسی درجہ میں بہر حال تکمیل ہوگی، یتیم خانہ بھی ایک اہم ضرورت ہے، نیز چھوٹے پیمانے کے ٹیکنکل ادارے جن سے معمولی گھرانے کے بچے اور بچیاں اور عورتیں ہنر سیکھ کر اپنی معیشت کا نظم کرسکیں، خالص عصری تعلیم کے اداروں کا قیام اپنے حالات کے اعتبار سے وقف اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں۔

مفتی محبوب علی وجیہی لکھتے ہیں: واقف کی شرائط نص شارع کے حکم میں ہیں، لہٰذا ان کی مکمل پابندی کی جائے، البتہ جہاں مصارف وقف موجود نہ ہوں یا ان کی تکمیل کے بعد کچھ رقم فاضل رہتی ہے تو وہ مسلمانوں کے تعلیمی اور رفاہی کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں، اور ایسے پرانے اوقاف جن کی شرائط معلوم نہ ہوں ان کی آمدنی پہلے غرباء و مساکین اور پھر دینی و ملی ضروریات پر خرچ کی جاسکتی ہیں۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی لکھتے ہیں: حتی الامکان واقف کے مقاصد کی پابندی ضروری ہے، تاہم مجوزہ شرعی کمیٹی یا قاضی کی اجازت سے مسلمانوں کے ایسے رفاہی اور تعلیمی اداروں پر خرچ کرنے کی گنجائش ہے جہاں دینی تربیت ہو۔

مولانا اخلاق الرحمن قاسمی لکھتے ہیں: اس شرط کے ساتھ گنجائش ہے کہ واقف کے مقاصد کی پابندی دشوار ہو۔

مولانا ظفر عالم ندوی لکھتے ہیں: قاضی شریعت یا جماعت مسلمین کے فیصلہ سے تعلیمی یا رفاہی ادارہ قائم کرنے کی گنجائش ہے۔

مولانا عبد العظیم اصلاحی لکھتے ہیں: ویران اور نا قابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے اگر مصلحت متقاضی ہو ان کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے تعلیمی و رفاہی ادارے قائم کرنے میں حرج معلوم نہیں ہوتا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ تقریباً تمام ہی شرکاء ویران اوقاف کی قیمتوں کے صرف کرنے میں مقاصد وقف کی رعایت ضروری قرار دیتے ہیں اور اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ مقاصد وقف کا خیال کئے بغیر ''کیف ما اتفق'' کوئی بھی تعلیمی یا رفاہی ادارہ قائم کر دیا جائے۔ مقاصد واقف کی پابندی دشوار ہو یا اس کے بعد فاضل رقم بچ جاتی ہو تو ایسی صورت میں کسی اور نیک کام میں صرف کرنا علیحدہ مسئلہ ہے جو یہاں زیر بحث نہیں ہے، قاضی شریعت یا شرعی کمیٹی بھی اجازت دینے میں اس بات کی پابند ہوگی کہ مقاصد وقف کا خیال رکھے، کسی انتہائی مجبوری اور ضرورت ہی میں مقاصد وقف سے باہر صرف کرنے کی اجازت دے۔

سوال ۲ کا متن یہ ہے:

بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں مساجد و مدارس یا مقابر کے بڑے بڑے اوقاف ہیں اور مسلمانوں کی آبادی وہاں بہت معمولی رہ گئی ہے، مثلاً ایک مسجد ہے اس کے لئے بہت سی زمینیں اور مکانات وقف ہیں، مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے زیادہ ہے اس سلسلے میں دو باتیں دریافت طلب ہیں

الف۔ کیا مسجد پر موقوف اراضی میں جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہے مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ کیا مسجد کی زائد آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے جب کہ واقف نے ان زمینوں اور مکانات کو مسجد ہی کے لئے وقف کیا تھا۔

سوال ۲ (الف) کے جواب میں علماء اور اصحاب افتاء کے کئی موقف سامنے آئے ہیں:

ایک موقف یہ ہے کہ مسجد کی زائد اراضی میں نہ دینی تعلیم کے ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں نہ عصری تعلیم کے ادارے، یہ موقف درج ذیل حضرات کا ہے:

مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبد اللطیف پالن پوری، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا نور القاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی۔

ان حضرات نے بطور استدلال فقہاء کی وہ عبارتیں پیش کی ہیں جن میں واقف کے مقاصد و شرائط کی پابندی لازم قرار دی گئی ہے اور ایک وقف کی فاضل آمدنی کو اسی جنس کے اوقاف میں لگانے کا حکم دیا گیا ہے، اس سلسلے میں حضرت تھانوی کا ایک فتوی بھی پیش کیا گیا ہے، حضرت تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں

لکھتے ہیں: "مدرسہ جنس مسجد سے نہیں، اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے۔ اگر اس شہر میں حاجت نہ ہوتو دوسرے شہروں کی مساجد میں صرف کریں، جو زیادہ قریب ہو اس کا حق مقدم ہے اسی طرح بہ ترتیب" (امداد الفتاوی ۲/ ۵۹۷)۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ مسجد کی زائد اراضی جن کی مسجد کو فی الحال ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کی ضرورت ہوگی اس پر دینی تعلیم کے ادارے تو قائم کئے جاسکتے ہیں۔ عصری تعلیم کے ادارے قائم نہیں کئے جاسکتے، یہ موقف درج ذیل حضرات کا ہے:

حضرت مولانا نظام الدین صاحب۔ دار العلوم دیوبند، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی (۱) مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا صدر عالم قاسمی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا اسعد اللہ قاسمی۔

یہ موقف اختیار کرنے والوں کا استدلال سمجھنے کے لئے مولانا زبیر احمد قاسمی کے مقالہ کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں، موصوف لکھتے ہیں: یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عمارۃ مسجد اور مصالح مسجد دونوں ایک ہی درجہ کے مساوی مصارف ہیں: "والأصح ما قال الإمام ظهير الدين إن الوقف على عمارة المسجد ومصالح المسجد سواء، كذا في فتح القدير" (فتاوی ہندیہ ۲/۴۶۲)، اب اگر مصالح مسجد کے مصداق ومفہوم میں کچھ مزید عموم کردیا جائے اور کہا جائے کہ ہر وہ کام جس سے مسجد کی حفاظت، اس کی موقوفہ اراضی کو دوسروں کی دست برد سے بچانا اور مسجد کی آبادی میں آج یا کل اضافہ ہونا متوقع ہو سب ہی مصالح مسجد میں داخل ہیں تو پھر ہمارے خیال میں مسجد کی موجودہ ضروریات سے زائد زمین پر دینی مدرسہ کے قیام کی اجازت دی جاسکتی ہے، کیونکہ دینی ادارے سے دینی تعلیم کے نتیجے میں بہ ظن غالب عام طور پر مسجد کے محافظ، مصلی، امام، موذن اور دیگر صالح قسم کے خدام ہی پیدا ہوا کرتے ہیں جو یقینا مسجد کی آبادی میں دخیل وموثر ہوتے ہیں اور انہیں لوگوں سے مساجد آباد رہا کرتے ہیں، لیکن عصری تعلیم کے ادارے سے مساجد کے آباد کرنے والے افراد شاذ ونادر ہی نکلا کرتے ہیں۔ اس لئے خواہ مسجد کی موقوفہ زمین زائد از ضرورت ہو یا اس کی آمدنیاں، کسی کو عصری تعلیم کے ادارے کے قیام میں صرف کرنا جائز نہیں کہا جاسکتا، یہ مصالح مسجد سے بھی خارج ہیں، چنانچہ حال وماضی قریب کے بعض اکابر مفتیان کرام کے فتاوی بھی کچھ اس طرح کے ملتے ہیں۔

اس موقف کی تائید میں حضرت مفتی محمود الحسن صاحب، مفتی عبد الرحیم صاحب، حضرت مفتی نظام الدین صاحب کے فتاوی بھی مختلف حضرات نے پیش کئے ہیں۔

بعض حضرات نے مسجد کی فاضل اراضی میں دینی تعلیم اور عصری تعلیم دونوں کے ادارے قائم کرنے کو درست قرار دیا ہے۔

مولانا عبد العظیم اصلاحی، مولانا شمس پیرزادہ بمبئی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: مسجد پر وقف اراضی اگر کافی وسیع ہو اور بہ ظاہر طویل عرصہ تک مسجد کی توسیع کی ضرورت پڑنے کا امکان نہ ہو تو زائد اراضی میں دینی درسگاہ یا مسلمانوں کیلئے (بنیادی دینی تعلیم وتربیت کے ساتھ) مخصوص عصری تعلیمی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے، البتہ ادارہ سے مسجد کو کچھ کرایہ بھی دلانا چاہئے تاکہ اس زمین کا نفع مسجد کی طرف لوٹے اور واقف کا منشا بھی پورا ہو۔

اسی سے ملتی جلتی رائے مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے بھی ظاہر کی ہے، موصوف لکھتے ہیں: زائد اراضی کرایہ پر لے کر اس میں دینی تعلیم یا عصری تعلیم کا ادارہ جس میں دینی تربیت ہو قائم کیا جاسکتا ہے، مولانا ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی کی رائے ہے کہ ان اراضی کو دینی تعلیم کیلئے استعمال کی کوشش کی جائے، بصورت دیگر عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اگر مدرسہ کی تعمیر کرکے اس کا کرایہ مسجد کو دیا جارہا ہے تو مسئلہ زیادہ اختلافی نہیں رہ جاتا، خواہ دینی مدرسہ ہو یا عصری تعلیم گاہ، جن حضرات نے مسجد کی زائد اراضی میں دینی مدرسہ اور عصری تعلیم گاہ دونوں کے قیام کی اجازت دی ہے ان کا استدلال یہ ہے کہ عہد نبوی میں مسجد تعلیم گاہ بھی تھی اور مسجد کے احاطہ میں مدرسہ کا ہونا ایک معروف بات ہے، اس کے لئے واقف کی طرف سے صراحت کی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ دونوں باتیں ان لوگوں کے حق میں جاتی ہیں جو مساجد کی زائد اراضی پر صرف دینی تعلیم کے ادارے قائم کرنے کے حق میں ہیں، کیونکہ عہد نبوی میں مساجد میں دین ہی کی تعلیم ہوتی تھی، اور مساجد کے احاطہ میں اگر مدارس کا ہونا معروف ہے تو وہ دینی مدارس ہیں نہ کہ عصری تعلیم کے مدارس۔

مساجد کی فاضل اراضی کا مسئلہ مساجد کی فاضل آمدنی کی طرح ہے، دونوں کی نوعیت تقریبا یکساں ہے، اوقاف کی زائد آمدنی کے مسئلہ پر سوال ۳ (ب)

کے تحت گفتگو آئے گی، وہاں اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

سوال ۲ کا جز (ب) تھا: کیا مسجد کی زائد آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے، جبکہ وقف نے ان زمینوں اور مکانات کو مسجد ہی کیلئے وقف کیا تھا؟

اس سوال کے جواب میں درج ذیل حضرات نے لکھا ہے کہ مسجد کی زائد آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کی جاسکتی۔

مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ایوب ندوی بھٹکلی، مولانا ابراہیم فلاحی۔ گجرات، مولانا عبدالقیوم پالن پوری، مولانا عبداللطیف پالن پوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا قمرالزماں ندوی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا نورالقاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا صدر عالم قاسمی۔

چند حضرات علماء کی رائے یہ ہے کہ مسجد کی فاضل آمدنی جس کی مستقبل قریب میں بہ ظاہر مسجد کو ضرورت نہ ہوگی دینی تعلیم اور مدرسہ میں صرف کی جاسکتی ہے۔

مفتی محمد عبیداللہ اسعدی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا اسعد اللہ قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی۔

مفتی محبوب علی وجیہی لکھتے ہیں: دینی ادارہ یا عصری تعلیم کا مرکز جس میں دینیات بھی پڑھائے جاتے ہوں ان پر مساجد کی فاضل آمدنی خرچ کی جاسکتی ہے لیکن اگر کسی وقت مسجد کو اس فاضل رقم کی ضرورت پڑے تو پھر مسجد ہی میں خرچ کی جائے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں: مسجد کی فاضل آمدنی دوسری مساجد اور جہاں مساجد نہیں ہیں وہاں مساجد کی تعمیر پر صرف کی جانی چاہئے، کیونکہ ہندوستان میں ابھی ہزار ہا ہزار دیہات اور قریہ جات ایسے ہیں جو مسجد کو ترس رہے ہیں...... وہاں مسجدوں کی تعمیر اور ان میں بنیادی دینی تعلیم کے لئے مکاتب کا انتظام مدارس اور عصری درسگاہوں کے قیام سے زیادہ اہم ہے۔

مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی کی رائے ہے: مسجد کی فاضل آمدنی بہ طور قرض لی جاسکتی ہے اور اس سے مسلمانوں کے مذہبی تعلیم کے ادارے یا عصری تعلیم اور ٹیکنیکل تعلیم کا ادارہ جس میں دینی تربیت ہو قائم کیا جاسکتا ہے۔

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (مئو) لکھتے ہیں: قاضی یا جماعت مسلمین کی اجازت سے سارے فاضل پیسوں کو جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے الاقرب فالاقرب کا لحاظ کرتے ہوئے اس طرح کے دیگر مصارف پر جن میں احتیاج ہو خرچ کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی کی رائے ہے: مساجد کی فاضل آمدنی بہتر ہے دوسری مساجد پر خرچ کریں، اگر ضرورت نہ ہو تو دوسرے تعلیمی ورفاہی مقاصد میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

جناب شمس پیرزادہ صاحب لکھتے ہیں: مسجد کی فاضل آمدنی کسی دوسری مسجد پر صرف کی جائے، اگر ایسی صورت ممکن نہ ہو تو البتہ تعلیمی یا رفاہی مقاصد میں استعمال کی جائے۔

مساجد کی فاضل آمدنی کو دینی تعلیم اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ کرنے کا مسئلہ پہلے دور میں بھی کافی معرکۃ الآراء رہا ہے، اس سلسلے کے مختلف سوالوں کے جواب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے مساجد کی فاضل آمدنی کو تعلیمی یا رفاہی کاموں میں صرف کرنے سے منع کیا ہے اور دوسری مساجد پر صرف کرنے کا حکم دیا ہے، اس کے برخلاف اس موضوع پر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے ایک مفصل فتوی لکھا اور فتوی کے آخر میں بطور خلاصہ لکھا: ''مذکورہ بالا تحقیق کی بنا پر ایسی حالت میں کہ مسجد کے اموال کثیرہ جمع ہوں اور مسجد کو نہ فی الحال ان کی حاجت ہو اور نہ بظن غالب فی المآل، اور ان اموال کے اس طرح جمع رہنے میں ضائع ہوجانے اور متغلبین کے کھا اڑا جانے کا اندیشہ ہو تو یہ زائد از حاجت اموال جمع شدہ کسی دوسری محتاج مسجد میں خرچ ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے دینی مدرسہ میں جو علوم شریعت، تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم دیتا ہو خرچ کرنا جائز ہے'' (کفایت المفتی ۷/ ۲۷۵)۔

اس فتوی پر دیوبند اور دہلی کے اٹھارہ علماء کے تصویبی دستخط ہیں، ان میں مفتی عزیز الرحمن صاحب، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد نعمانی، مولانا اعزاز علی صاحب جیسی بلند پایہ شخصیات بھی ہیں، لہذا اس فتوی کی حیثیت انفرادی نہیں، بلکہ اجتماعی اور دستاویزی ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب نے اپنے بعض دوسرے فتاوی میں مساجد کی فاضل رقم کو بعض دوسرے دینی اور رفاہی کاموں میں صرف کرنے کی بھی اجازت دی ہے، مثلاً مدارس دینیہ کے طلبہ کو وظائف دینا، جائز ومباح علوم معاشیہ کے نادار وغیر مستطیع طلبہ کو وظائف دینا، مساجد میں مدارس دینیہ کا اجراء، دینی ضرورتوں

کے تحت دار المطالعہ کا قیام، ترک مجاہدین ومجروحین کی امداد وغیرہ۔

ماضی قریب اور حال کے ممتاز اصحاب افتاء میں سے مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ، مفتی عبدالرحیم لاجپوری ومفتی نظام الدین صاحب نے مساجد کی فاضل رقم کو دینی مدارس کے اجراء وامداد میں صرف کرنے کا بار بار فتوی دیا ہے۔

میرے خیال میں مساجد کی فاضل آمدنی اگر ضرورت ہو تو سب سے پہلے خود ان مساجد کو آباد کرنے میں صرف کی جائے، مثلاً جن مساجد کے آس پاس مسلمانوں کی آبادی نہیں ہے یا بہت معمولی ہے اس کی وجہ سے مسجد ویران رہتی ہے، بعض اوقات مسجد میں اتنے لوگ بھی نہیں ہوتے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جاسکے ایسی مساجد کی فاضل اراضی پر فاضل آمدنی سے دینی مدارس قائم کردئے جائیں، تاکہ مساجد اچھی طرح آباد ہوجائیں اور مساجد کی اراضی اور جائدادوں پر غاصبانہ قبضہ کا خطرہ بھی کم ہوجائے۔

جو مساجد ہر طرح آباد ہیں اور ان کے پاس اتنی بڑی مقدار میں فاضل آمدنی ہے کہ مساجد کو مستقبل میں بھی اس کی ضرورت پیش آنے کی امید نہیں ہے، نیز اتنی بڑی رقم جمع رہنے کی صورت میں اس کے خرد برد ہونے کا بھی قوی اندیشہ ہے ایسی مساجد کی فاضل آمدنی کو دوسری مساجد کی تعمیر یا محتاج مساجد کی امداد میں صرف کیا جائے۔ ہندوستان میں اب بھی بے شمار گاؤں ہیں جہاں مسلمانوں کی تھوڑی بہت آبادی ہونے کے باوجود کوئی مسجد یا مکتب نہیں ہے، ان مسلمانوں کے کان اذان کی آواز سے ناآشنا ہیں اور وہاں کے مسلمان اور ان کے بچے بچیاں کلمہ، ایمان، روزہ، نماز اور دین کے مبادی سے ناواقف ہیں، مساجد کی فاضل آمدنی سے ایسے گاؤں میں مساجد کی تعمیر کی جائے اور بنیادی دینی تعلیم کے مکاتب قائم کئے جائیں۔

کسی قانونی یا عملی دشواری کی وجہ سے اگر کسی مسجد کی فاضل آمدنی کو دوسری مساجد کی تعمیر یا امداد میں صرف کرنا ممکن نہ ہو یا ان پر صرف کرنے کے بعد بھی فاضل بچ رہی ہو تو اسے دوسرے دینی اور رفاہی کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

عرض مسئلہ بابت سوال نمبر ۳ (الف، ب)

سوال ۳ کا متن یہ ہے:

بہت سے اوقاف کی آمدنی ان کے لئے متعین مصارف سے بہت زیادہ ہوتی ہے، جو سال بہ سال جمع ہوکر ایک بڑا سرمایہ بنتی جارہی ہے، جس کی طویل عرصہ تک حفاظت ایک دشوار مسئلہ، بلکہ خالی از خطرہ نہیں، یہ خطرہ حکومت کی دست درازی کا بھی ہے اور منتظمین وغیرہ کی طرف سے بھی، اور نہ ہی روزمرہ کی ضروریات کے اندر اس کے صرف کو سوچا جاسکتا ہے اور نہ آئندہ حفاظت یا اصلاح ومرمت وغیرہ کے کاموں کے لئے، تو کیا ایسی فاضل آمدنی کو دوسرے مواقع میں صرف کرنا درست ہوگا مثلاً

الف۔ اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں۔

ب۔ دیگر ملی، دینی وعلمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں۔

سوال ۳ (جز۔ الف) کے جواب میں تمام حضرات متفق ہیں کہ اوقاف کی فاضل آمدنی اسی نوع کے اوقاف میں صرف کی جاسکتی ہے، مثلاً مساجد کی فاضل آمدنی مساجد میں، مدارس کی فاضل آمدنی مدارس میں، مسافر خانوں کی فاضل آمدنی مسافر خانوں میں، لیکن (جز۔ ب) کے جواب میں اختلاف ہے۔

اوقاف کی فاضل آمدنی دیگر ملی، دینی، علمی کاموں میں صرف کی جاسکتی ہے یا نہیں اس سلسلے میں کچھ حضرات کا جواب صریح نفی میں ہے، ان کے نام یہ ہیں:

مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا ناصر عالم قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا عبداللطیف پالن پوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری۔

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ اگر اس نوع کے اوقاف کی ضرورت نہ ہو یا اس نوع کے اوقاف میں صرف کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تب دوسرے دینی، ملی کاموں پر فاضل آمدنی صرف کی جاسکتی ہے، اس میں بھی الاقرب فالاقرب، الانسب فالانسب کا لحاظ کیا جائے، یہ رائے درج ذیل حضرات کی ہے:

مفتی محمد عبیداللہ اسعدی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا عبدالقیوم پالن پوری، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا ایوب بھٹکلی ندوی۔

تیسری رائے یہ ہے کہ اوقاف کی فاضل آمدنی کو دوسری نوع کے ملی، دینی اور تعلیمی کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے، خصوصا دینی تعلیم کے اجراء وفروغ میں، اس رائے کے حاملین یہ حضرات ہیں:

مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا نورالقاسمی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا قمرالزماں ندوی۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی لکھتے ہیں: قاضی یا مجوزہ شرعی کمیٹی کی اجازت سے دوسرے دینی، ملی کاموں میں اوقاف کی فاضل آمدنی صرف کی جاسکتی ہے۔

مولانا ڈاکٹر ظفرالاسلام صدیقی (مئو) کی رائے ہے: مسجد کی زائد آمدنی تو مسجد ہی میں صرف ہوگی، دوسرے اوقاف کی زائد آمدنی دیگر ملی ورفاہی اداروں میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: اگر اس نوع کے اوقاف میں ان کا استعمال ممکن نہ ہو تو ایسے رفاہی اور تعلیمی کاموں میں ان کا استعمال ہونا چاہئے جو غریب مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوں کیونکہ ہر وقف کا آخری مصرف فقراء ہیں۔

مولانا ابوبکر قاسمی اور مولانا ابراہیم فلاحی کے نزدیک ضرورۃً اوقاف کی فاضل آمدنی دوسرے ملی اور رفاہی کاموں پر صرف کی جاسکتی ہے۔

عرض مسئلہ بابت سوال نمبر۔ ۴

سوال نمبر ۴ کا متن ہے:

بہت سے اوقاف اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہیں، مثلاً کسی مسجد یا مدرسے پر کوئی مکان وقف ہے جو محلہ کے اندر واقع ہے، اس کا معمولی کرایہ ملتا ہے جس سے مسجد یا مدرسے کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں اور اس کو فروخت کر کے کسی تجارتی مقام پر کوئی دوکان خرید لی جائے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی مکان موقوفہ کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہوگی، کیا ایسا کیا جاسکتا ہے کہ مکان موقوفہ کو فروخت کر کے ایسی کوئی بھی شکل اختیار کی جائے جس میں وقف کی آمدنی زیادہ ہو جائے؟

استبدال بالانفع کا مسئلہ فقہاء عہد قدیم میں بھی مختلف فیہ رہا ہے، اکثر فقہاء اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام محمد کی یہی رائے ہے، ہاں امام ابویوسفؒ کے پیش نظر اوقاف کو زیادہ نفع پہنچانا ہے، جمہور فقہاء کا استدلال دو باتوں سے ہے:

۱۔ اوقاف میں اصل تابید اور عدم بیع ہے، استبدال کی گنجائش انتہائی مجبوری میں ہوتی ہے جب اوقاف کو خطرہ لاحق ہو یا اس کی منفعت کلیۃً ختم ہو چکی ہو اور یہاں اس درجہ کی ضرورت اور مجبوری نہیں ہے، وقف فی الجملہ منفعت بخش ہے اور اس سے واقف کے مقاصد کسی نہ کسی درجہ میں پورے ہو رہے ہیں۔

۲۔ استبدال بالانفع کی اجازت سے اوقاف کی تباہی کا راستہ کھلتا ہے، بددیانت متولیان اس بہانہ اوقاف کو کھا لیتے ہیں جیسا کہ ماضی میں ایسا بہت ہوا اور فقہاء نیز اصحاب افتاء نے اس پر خون کے آنسو بہائے۔ فقہ حنفی میں اوقاف کے مختلف فیہ مسائل میں عموماً امام ابویوسف کے قول پر فتویٰ ہوتا ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ جو قول وقف کے لئے زیادہ نفع بخش ہو اس پر فتویٰ ہوتا ہے، لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ استبدال بالانفع کی اجازت دینے میں اوقاف کا زیادہ فائدہ ہے یا اس پر بندش لگانے میں، فتاویٰ قاری الہدایۃ میں امام ابویوسفؒ کے قول کو مفتی بہ کہا گیا ہے، لیکن علامہ ابن ہمام اور علامہ شامی وغیرہ استبدال بالانفع کے جائز نہ ہونے کو راجح قرار دیتے ہیں۔ جوں جوں متولیان اوقاف اور قاضیوں میں دیانت وامانت کی کمی آتی گئی متاخرین فقہاء احناف نے استبدال بالانفع کو ناجائز قرار دینا ہی اوقاف کے لئے مجموعی طور پر مفید سمجھا۔

اوقاف کے موضوع پر جن حضرات علماء واصحاب افتاء کے مقالات اور تحریریں موصول ہوئی ہیں ان کے درمیان بھی دو رائیں پائی جاتی ہیں۔

استبدال بالانفع کو ناجائز قرار دینے والے حضرات یہ ہیں:

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا عبدالقیوم پالن پوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مولانا ایوب بھٹکلی ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا اقبال قاسمی، عتیق احمد بستوی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا صدر عالم قاسمی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی رائے ہے: کوئی دیانت دار ادارہ ہو تو گنجائش ہے، لیکن حکومت کے وقف بورڈ کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

مولانا جمیل نذیری لکھتے ہیں: محتاط طریقہ سے گنجائش نظر آتی ہے، لیکن سدّ اللذرائع جواز کا عام فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ مولانا نورالقاسمی نے بھی اسی طرح

کی رائے ظاہر کی ہے۔

درج ذیل حضرات نے استبدال بالانفع کو جائز قرار دیا ہے:

مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی مئو، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا اسعد اللہ قاسمی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا قدرت اللہ باقوی، مولانا قمر الزماں ندوی۔

میرے نزدیک درج ذیل وجوہ کی بنا پر استبدال بالانفع کی اجازت نہ دینا ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اوقاف میں اصل یہی ہے کہ انہیں فروخت نہ کیا جائے، بلکہ حتی الامکان باقی رکھا جائے استبدال کی اجازت انتہائی ضرورت ومجبوری کی بنا پر ہوتی ہے، استبدال بالانفع میں ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔

۲۔ جمہور فقہاء کا مذہب استبدال بالانفع کی ممانعت کا ہے۔

۳۔ استبدال بالانفع کی اجازت دینے میں، خواہ یہ اجازت کتنی شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ ہو اوقاف کو بیچ کھانے اور ان میں خرد برد کرنے کے مواقع بڑھ جائیں گے، موجودہ دور میں امانت ودیانت کا شدید قحط ہے، وقف بورڈوں کا نظام صحیح نہ ہونے اور غلط ہاتھوں میں چلے جانے کی وجہ سے دیانت دار افراد کا اوقاف کا متولی بننا اور رہنا مشکل ہو رہا ہے، دن بہ دن حالات بدتر ہوتے جارہے ہیں، ان حالات میں استبدال بالانفع کی اجازت اوقاف کی ابتری میں اضافہ کرے گی، استبدال بالانفع کی اجازت دینے میں جلب منفعت بلکہ ازدیاد منفعت ہے اور اجازت نہ دینے میں دفع ضرر ہے اور دفع ضرر جلب منفعت سے مقدم ہے۔

استبدال بالانفع کی بحث ختم کرنے سے پہلے دو باتوں کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ جن اوقاف کو کم منفعت سمجھ کر بیچنے کی بات سوچی جاتی ہے ان کے کم منفعت بخش ہونے میں اکثر خود ہمارا دخل ہوتا ہے، پچیس پچاس سال پہلے وقف کی کوئی جائداد کرایہ پر دی گئی، اس وقت جو کرایہ (مثلاً دس بیس روپیہ) طے ہوا تھا وہی کرایہ اب بھی چل رہا ہے، حالانکہ مارکیٹ میں اس جیسی جائداد کا کرایہ بیس گنا ہو چکا ہے، اولاً تو کسی انتہائی مجبوری کے بغیر اتنے طویل زمانے کے لئے وقف کی جائداد کرایہ پر دینا درست نہیں ہے، اور اگر کسی مجبوری میں ایسا کرنا پڑا ہے تو متولیان اور کرایہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ کرایہ میں بھی اضافہ کریں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نہ مسلمان کرایہ دار کے دل میں خوف خدا پیدا ہوتا ہے کہ میں وقف کی دوکان یا مکان کتنے معمولی کرایہ میں استعمال کر رہا ہوں، نہ متولی کو فکر ہوتی ہے کہ کہہ سن کر معقول کرایہ مقرر کرائے۔ اوقاف کا کرایہ معقول اور مناسب کرنے میں اگر کچھ سرکاری قوانین حائل ہیں تو انہیں بدلوانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

۲۔ کسی وقف پراپرٹی کی آمدنی اگر اتنی قلیل اور مختصر ہے کہ خود اس وقف کے اخراجات اس آمدنی سے پورے نہیں ہوتے، بلکہ قرض لے کر وقف کے اخراجات پورے کئے جارہے ہیں اس طرح وقف پر قرض کا بار بڑھتا جارہا ہے، اور متولی کی فکر وتدبیر اور جدوجہد کے باوجود اس وقت کی آمدنی بڑھنے کی مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں ہے، ایسی وقف پراپرٹی کو فروخت کر کے دوسری زیادہ منفعت بخش جائداد خریدنا استبدال بالانفع کے قبیل کی چیز نہیں ہے بلکہ فائت النفع وقف کا استبدال ہے، اس لئے شرائط استبدال کی پابندی کے ساتھ اس وقف کے استبدال کی اجازت ہونی چاہئے۔

سوال نمبر ۷ کا متن ہے:

کیا کسی وقف شدہ مخدوش عمارت نئی تعمیر کیلئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کیلئے وقف شدہ زمین وجائداد کا کوئی حصہ فروخت کر کے اس سے نئی تعمیر کی جاسکتی ہے، جبکہ اس کا مقصد وقف کی حفاظت ہے اور اس کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے؟

اس صورت معاملہ کو ان حضرات نے جائز کہا ہے:

مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ظفر الاسلام۔ مئو، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مولانا ایوب ندوی بھٹکلی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اسعد اللہ قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ابرار خاں ندوی۔ درج ذیل حضرات نے اس صورت معاملہ کو ناجائز قرار دیا ہے:

مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا جمیل احمد نذیری، مولانا صدر عالم قاسمی، مولانا عبدالقیوم پالن پوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا نور القاسمی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا

ابوبکر قاسمی، مولانا عبداللطیف پالن پوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا قدرت اللہ باقوی۔

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی لکھتے ہیں کہ فقہ حنفی میں گنجائش نہیں ہے، ہاں انتہائی مجبوری اور ضرورت میں فقہ حنبلی سے اس کی گنجائش اختیار کی جاسکتی ہے۔

فقہ مالکی اور فقہ شافعی کے مطابق تعمیر وقف کی کوئی شکل نہ نکلنے پر بھی وقف کے بعض حصہ کو باقی کی تعمیر کے لئے فروخت کرنا درست نہیں ہے، فقہ حنبلی کے مطابق اس کی اجازت ہے جیسا کہ المغنی وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''إن الوقف إذا خرب وتعطلت منافعه كدار انهدمت أو أرض خربت وعادت مواتا ولم تمكن عمارتها ...... إلا ببيع بعضه جاز بيع بعضه لتعمر به بقيته'' (المغني ۵،۶۳۱،۶۳۲)۔

فقہ حنفی کے معروف واصح قول کے مطابق ویران وقف کی تعمیر کے لئے اس کے بعض حصہ کی فروختگی جائز نہیں ہے، ناجائز کہنے والوں نے عام طور پر فتاوی عالمگیریہ کی اس عبارت کو پیش کیا ہے:

''وإذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضا منها ليرمّ الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك'' (فتاوی عالمگیری ۲،۴۱۶)۔

بعض حضرات نے جامع الرموز کی یہ عبارت پیش کی ہے: ''ولا يملك الواقف بالبيع ونحوه ولو لإحياء الباقي''۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے سوال نمبر ۷ کے جواب میں لکھا ہے: ''تحفظ وقف کے لئے اس کی بھی گنجائش ہے مگر باجازت قاضی''۔ پھر جامع الرموز کی مذکورہ بالا عبارت نقل کی ہے، حالانکہ یہ عبارت گنجائش کے بجائے عدم گنجائش پر دلالت کرتی ہے۔

علامہ صدر الشریعہ صاحب ''شرح وقایہ'' کی صراحت کے مطابق بعض متاخرین فقہاء احناف نے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ مجبوری کی صورت میں وقف کے کچھ حصہ کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے باقی وقف کی تعمیر و مرمت کرائی جائے، صدر الشریعۃ کی عبارت ہے:

''اعلم أن بعض المتاخرين جوزوا بيع بعض الوقف إذا خرب لعمارة الباقي والأصح أنه لا يجوز'' (شرح وقایہ ۲،۳۵۴)

مولانا عبدالحی فرنگی محلی عمدۃ الرعایۃ میں اس عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''يعني إذا خرب الموقوف ولم يكن في غلته ما يعمر به جاز أن يبيع بعضا منه فيعمر الباقي بثمنه؛ لأن في بيع البعض إبقاء البعض وفي تركه ذهاب كله واعدام انتفاء به ومن ابتلي ببليتين يختار أهونهما'' (شرح وقایہ ۲،۳۵۴، حاشیہ ۱۰)

اوقاف کے مسائل میں فقہاء کی صراحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اوقاف کے تابید کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے کلاً یا جزئاً اوقاف کی فروختگی کی اجازت بالکل آخری درجہ کی مجبوری میں دی ہے، عام حالات میں یا معمولی پریشانیوں میں اس کی اجازت نہیں دی ہے، اس لئے ویران یا محتاج تعمیر وقف کی تعمیر یا مرمت کی ضرورت پر کوئی اور راستہ نہ ہونے کی صورت میں فقہاء نے یہ مشورہ دیا ہے کہ وقف جائداد مختصر یا طویل عرصہ کے لئے کسی کو کرایہ پر دے دی جائے اور اس کرایہ سے اس کی تعمیر یا مرمت کی جائے، فقہاء احناف نے مجبوری کی صورت میں مسجد کی چھت کو کرایہ پر اٹھانے کی اجازت دی ہے، یہ سب اسی لئے کیا ہے کہ اصل وقف پورا پورا کا برقرار رہے، اس لئے میرے خیال میں عام حالات میں تو اس کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے کہ وقف کا ایک حصہ بیچ کر باقی کی تعمیر کر لی جائے، لیکن جہاں آخری درجہ کی مجبوری ہو، جد وجہد کے باوجود تعمیر وقف کی کوئی صورت نہ بن پا رہی ہو، نہ اہل خیر متوجہ ہو رہے ہوں، نہ کرایہ پر اٹھا کر تعمیر کی کوئی شکل پیدا ہو رہی ہو اور نہ قرض پر تعمیر کے بہ قدر رقم مل پا رہی ہو، اور وقف کے ویران پڑے رہنے میں اس کے لئے خطرہ ہو، ایسی مجبوری کی صورت حال میں فقہ حنبلی کے مطابق اور بعض متاخرین احناف کی رائے کے مطابق اس کی اجازت دی جانی چاہئے کہ وقف پراپرٹی کا کچھ حصہ فروخت کر کے باقی وقف کی تعمیر یا مرمت کر لی جائے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ براہ راست وقف کی ہوئی زمین وجائداد اور وقف کی آمدنی سے خریدی ہوئی زمین وجائداد کے حکم میں بڑا فرق ہے۔ پہلی قسم کی زمین وجائداد کو فروخت نہیں کیا جاسکتا، اور دوسری قسم کی زمین وجائداد کو اصل وقف کی ضرورت ومصلحت سے فروخت کیا جاسکتا ہے، مثلاً مسجد کی آمدنی سے ایک زمین خریدی گئی، اور اب مسجد کی تعمیر نو کی ضرورت ہے تو اس خرید کردہ زمین کو فروخت کر کے مسجد کی تعمیر میں لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ''أما إذا اشتراه المتولی من مستغلات الوقف، فإنه یجوز بیعه بلا هذا الشرط (أی تعذر الانتفاع)، لأن فی صیرورته وقفاً خلافا والمختار أنه لا یکون وقفاً فللقیم أن یبیعه متی شاء لمصلحة عرضت''
(رد المحتار ۴۱۹،۳)۔

عرض مسئلہ بابت سوال نمبر ۹

سوال نمبر ۹ کا متن یہ ہے:

جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہوجانے کی وجہ سے ان کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہورہا ہے یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا، اس کی وجہ سے اب اس کے استعمال اور اس میں تدفین پر پابندی عائد کردی گئی ہے اور اس کی وجہ سے ان پر قبضہ کا خطرہ ہے بلکہ قبضہ ختم ہورہا ہے تو اب ان قبرستانوں کے لئے کیا حکم ہوگا اور ان سے انتفاع کو باقی رکھنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جاسکتی ہے؟

اس سوال میں دو طرح کے قبرستانوں کی بابت دریافت کیا گیا ہے:

۱۔ جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہوجانے کی وجہ سے ان کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہورہا ہے۔

۲۔ جو قبرستان آبادی کے اندر آ گیا اور اس میں تدفین پر پابندی عائد کردی گئی جس کی وجہ سے قبرستان کی اراضی پر ناجائز قبضہ ہورہا ہے۔

جواب تحریر کرنے والے بعض حضرات نے دونوں قسم کے قبرستان کو نفع بخش بنانے کی تدبیریں لکھی ہیں، بعض حضرات نے جواب لکھتے وقت صرف ایک قسم کے قبرستان کو پیش نظر رکھا اور اسی کو نفع بخش بنانے کا طریقہ بتایا۔

پہلے قسم کا قبرستان (جس کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہوجانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہورہا ہے) سوال نمبر ۱ (الف، ب) کے ذیل میں آ گیا، اس کا جواب وہی ہوگا جو سوال نمبر ۱ (الف وب) کے تحت دیا گیا یعنی اس قبرستان کو فروخت کر کے دوسری جگہ جہاں مسلمانوں کو قبرستان کی ضرورت ہو متبادل قبرستان بنادیا جائے، خصوصاً اس وقت جب کہ قبرستان کی اراضی پر قبضہ غاصبانہ کا پورا خطرہ ہو، خطرہ نہ ہونے کی صورت میں اور نگہداشت ممکن ہونے کی صورت میں ایسا بھی کیا جاسکتا ہے کہ قبرستان کو کرایہ پر اٹھادیا جائے یا اس میں باغبانی یا کاشت کی جائے اور اس کی آمدنی سے دوسرا قبرستان بنایا جائے یا دوسرے قبرستان پر اس آمدنی کو صرف کیا جائے۔

دوسرے قسم کے قبرستان کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ تر جوابات تحریر کئے گئے ہیں، ان جوابات میں قبرستان کو نافع بنانے کے لئے مختلف تجویزیں پیش کی گئی ہیں، مثلاً:

۱۔ قبرستان کا احاطہ کروادیا جائے اور اس میں دفن پر عائد پابندی ختم کرانے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ اسے فروخت کر کے دوسرا قبرستان بنالیا جائے۔

۳۔ اس قبرستان میں مسجد، مدرسہ یا کوئی رفاہی ادارہ قائم کرلیا جائے۔

۴۔ اس میں باغبانی یا زراعت کی جائے اور اس کی آمدنی دوسرے محتاج قبرستانوں پر صرف کی جائے یا مسجد مدرسہ وغیرہ میں صرف کی جائے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ

سوال نمبر ۵ اور نمبر ۶

مولانا محمد ظفر عالم ندوی[1]

مسئلہ اوقاف سے متعلق میرے ذمہ سوال نمبر ۵ اور ۶ کا عرض مسئلہ ہے، سب سے پہلے ہم مقالہ نگاروں کے نام، آراء اور دلائل ذکر کریں گے، پھر اپنی بات پیش کریں گے، میرے پاس جن حضرات کے مقالے آئے ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:

مفتی نظام الدین صاحب۔ صدر مفتی دار العلوم دیوبند، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا محمد ایوب ندوی شافعی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، جناب حکیم ظل الرحمن، ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی شکیل احمد۔ دار العلوم اسلامیہ بستی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی فضیل الرحمن عثمانی، مولانا شمس پیرزادہ، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا اسعد اللہ قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا صدر عالم قاسمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا ابراہیم گجیافلاحی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا شاہد سنبھلی، مولانا قمر عالم سنبھلی، مولانا مستفیض الرحمن سنبھلی، مولانا سید محمد ایوب سنبھلی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مولانا تنویر عالم قاسمی۔

ان علماء اور ارباب افتاء کی آراء اور دلائل ذکر کرنے سے قبل ہم سوال پڑھ دیتے ہیں تاکہ صورت مسئلہ ذہن میں تازہ رہے۔

سوال نمبر ۵: بہت سے اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے ہیں، مثلاً کوئی جاگیر کسی خاص خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی، وہ خاندان ختم ہو گیا یا اس کے افراد دوسری جگہ منتقل ہو گئے یا کسی مسجد و مدرسہ کے لئے وقف تھا اور اب نہ وہ مسجد ہے نہ مدرسہ تو ان اوقاف کی آمدنی کا کیا مصرف ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اسی نوع کے مصارف پر وہ آمدنی صرف ہوگی۔ یعنی اگر کسی خاص خاندان کے فقراء پر کوئی جائداد وقف تھی اور وہ خاندان ختم ہو گیا یا اس کے افراد دوسری جگہ منتقل ہو گئے تو اس کی آمدنی عام فقراء پر صرف ہوگی۔ اگر مسجد یا مدرسہ کے لئے وقف تھی تو اس مسجد کے نہ ہونے کی صورت میں اس سے قریب تر مسجد اور اس مدرسہ کے نہ ہونے کی صورت میں اس سے قریب تر مدرسہ پر صرف ہوگی۔

اس رائے کے حاملین درج ذیل حضرات ہیں: مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محمد عبد اللہ الاسعدی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا قمر عالم سنبھلی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا صدر عالم قاسمی، مولانا ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا مستفیض الرحمن قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا ظفر الاسلام اعظمی، مولانا شاہد سہرسادی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری، جناب شمس پیرزادہ، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی۔

دلائل:

ان حضرات نے جو دلائل دیئے ہیں ان میں عام طور پر ''رد المحتار'' کے حوالہ سے ''شرح الملتقی'' کی یہ عبارت ہے: ''يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (رد المحتار ۳/ ۳۷۲)۔ دوسری دلیل ''رد المحتار'' ہی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے: ''وحكى أنه وقع مثله في زمن الإمام الأجل في رباط بعض الطرق خرب ولا ينتفع المارة وله أوقاف عامرة فسئل هل يجوز نقلها إلى رباط آخر لينتفع الناس به؟ قال نعم! لأن غرض الواقف انتفاع المارة ويحصل ذلك بالثاني'' (رد المحتار ۲/ ۳۷۱)، بعض حضرات نے قاضی خاں کے حوالہ سے یہی

---

[1]

دلیل اس عبارت میں پیش کی ہے:

''رباط في طريق بعيد استغنى عنه المارة و بجنبه رباط آخر قال السيد الإمام أبوشجاع: يصرف عنه إلى الرباط الثاني كالمسجد إذا خرب واستغنى أهل القرية فرفع ذلك إلى القاضي فباع الخشب و صرف الثمن إلى مسجد آخر جاز'' (قاضی خاں علی الهندیه ۲،۳۱۵)۔

کچھ حضرات نے ''البحر الرائق'' کی یہ عبارت بھی درج کی ہے: ''ولو وقف على إنسان بعينه أو عليه وأولاده أوعلى قرابته وهم يحصون أو على أمهات أولاده فمات الموقوف عليه فعلى الأول يعود إلى ورثة الواقف، قال الناطقي: إلى الاجناس وعليه الفتوى'' (البحر ۵،۲۰۳)۔

بعض حضرات نے مزید جزئیات بھی درج کئے ہیں، لیکن حاصل استدلال ایک ہی ہے۔

مذکورہ رائے کے علاوہ بعض حضرات نے کچھ اور رائیں دی ہیں جو قدرے جدا ہیں، ہم ہر ایک کو ان کے ضروری دلائل کے ساتھ مختصراً ذکر کر رہے ہیں۔

مولانا اسعد اللہ قاسمی کی رائے ہے کہ جن لوگوں پر یہ جائداد وقف تھی ان میں سے اگر کوئی بھی زندہ ہوگا تو ان کے لئے ان کا حصہ الگ کردیا جائے گا اور جو آمدنی بچ جائے گی وہ فقراء پر صرف ہوگی۔ انہوں نے ''معارف السنن'' کے حوالہ سے مزید یہ بات بھی کہی ہے کہ فقراء پر صرف کرنے کے بجائے اس آمدنی سے اگر مدارس قائم کئے جائیں یا وہ آمدنی اشاعت علم میں صرف کی جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے مماثل مصارف پر خرچ کرنے کے ساتھ فقراء پر صرف کرنے کی دو شکلیں پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ آمدنی براہ راست فقراء پر صرف ہو، دوسری یہ کہ اس آمدنی کو کسی ایسے رفاہی کام کے لئے استعمال کیا جائے جس سے استفادہ فقراء ہی کیلئے مخصوص ہو۔

ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی کی رائے ہے کہ یہ آمدنی قومی ورفاہی کام کے لئے صرف کی جاسکتی ہے۔ مولانا ایوب صاحب ندوی شافعی کا خیال ہے کہ اس آمدنی کو واقف کے غریب رشتہ داروں پر صرف کیا جائے گا، چاہے عصبہ ہوں یا ذوی الارحام اگر وہ بھی مفقود ہوں تو اس آمدنی کو مصالح مسلمین پر صرف کیا جائے گا۔ جناب حکیم ظل الرحمن صاحب کی رائے ہے کہ اس طرح کی آمدنی کو جس کے مصارف ختم ہو چکے ہوں دیگر صدقات جاریہ پر صرف کر سکتے ہیں۔ جناب مفتی محبوب علی وجیہی نے اپنی رائے یہ پیش کی ہے کہ اگر ان اوقاف کے شرائط معلوم ہوں تو شرائط کے مطابق آمدنی صرف کی جائے گی۔ ورنہ مسلمان غرباء، تعلیم، علاج، مساجد ومدارس وغیرہ پر صرف کی جائے گی۔

جناب ابرار خاں ندوی نے ہم جنس مصارف پر صرف کرنے کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس نوٹ کا بھی اضافہ کیا ہے کہ اگر اس خاندان کے فقراء ایسی جگہ منتقل ہو گئے ہیں جو سابق بستی ہی میں شمار ہوتی ہے تو وہ اپنے حصے سے محروم نہیں کئے جائیں گے اور اگر اس جگہ کا شمار سابق بستی میں نہ ہو تو وہ حصے سے محروم ہونگے۔ انہوں نے ''فتاوی بزازیہ'' کے حوالہ سے یہ جزئیہ بھی نقل کیا ہے:

''وقف على فقراء أقربائهم المقمين بخوارزم فانتقلو إلى بلد آخر إن كان مما يحصون لا تنقطع وظيفتهم وإن كان لا يحصون تنقطع ثم إن بقي هناك منهم أحد يصرف الكل إليه وإن لم يكن صرف الكل إلى الفقراء'' (بزازیه علی الهندیه ۶،۲۷۶)۔

جناب مولانا مصطفی صاحب قاسمی نے تقریباً اسی طرح کا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر موقوف علیہ فقراء کسی دوسرے گاؤں میں منتقل ہو گئے ہوں تو وہ رقم ان فقراء تک پہنچانے کی سعی بلیغ کرنی چاہئے۔

جناب سید محمد ایوب سبیلی کا خیال ہے کہ اس آمدنی کو دوسرے مدارس، دینی، ملی ورفاہی کاموں پر صرف کر سکتے ہیں، البتہ ہم جنس پر صرف کرنا بہتر ہے۔

جناب مستفیض الرحمن صاحب نے ایک نکتہ یہ واضح کیا ہے کہ یہاں منشاء واقف ومنشاء شارع دونوں یکساں ہیں اس لئے اس وقف کی آمدنی کو ہم جنس مصارف پر بھی صرف کر سکتے ہیں اور دینی وعصری تعلیم گاہ پر بھی، اور ذمہ داران وقف کو اپنی صوابدید سے صرف کرنے کا بھی اختیار رہے گا۔ اگر وہاں وقف بورڈ ہو تو اس کے بھی حوالہ کیا جاسکتا ہے۔

ان تمام آراء اور دلائل کو اختصار سے ذکر کرنے کے بعد ناچیز اپنی بات بھی چند جملوں میں ظاہر کردینا مناسب سمجھتا ہے، میرے نزدیک اس طرح کے اوقاف کی آمدنی اسی نوع کے مصارف پر صرف کی جائے گی جیسا کہ اکثر مقالہ نگاروں کی رائے ہے۔ جن حضرات نے دوسری رائیں دی ہیں ان کی آراء اور دلائل سے محسوس ہوتا ہے کہ اوقاف اور ان کے مصارف کو عام صدقات اور کار خیر کی طرح تصور کیا ہے، حالانکہ عام صدقات وکار خیر اور اوقاف میں بڑا فرق ہے، باب وقف میں منشاء واقف کو بڑی اہمیت حاصل ہے اسی لئے فقہاء نے صراحت کی ہے: ''قول الواقف كنص الشارع'' أو ''شرط الواقف كنص الشارع''اگر ہم اس بنیادی نکتہ کو سامنے رکھیں تو بات واضح ہوجاتی ہے کہ واقف کی منشاء جس مصرف میں صرف کرنے کی ہو اس وقف کی آمدنی کو اسی مصرف میں صرف ہونا چاہئے اور منشاء واقف کی رعایت اسی وقت ہوسکے گی جبکہ ہم جنس مصرف پر وہ آمدنی صرف ہو۔ اس باب کے تمام جزئیات وفتاوی اور فقہاء کی تصریحات کا احاطہ کرنے سے اسی رائے کی تائید ہوتی ہے (هذا ما عندي والله اعلم بالصواب)۔

آیئے! اب سوال نمبر ٦ کو ذہن میں تازہ کرلیں:

بعض اوقاف کی عمارتیں مخدوش حالت میں ہیں، اوقاف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ نہیں ہے اور کوئی بلڈر اس کے لئے تیار ہے کہ اس مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط کے ساتھ تعمیر کردے کہ اس کی ایک یا دو منزل اس کی ملکیت ہوگی جس میں اس کو ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا اور بقیہ وقف کے مصارف کے لئے۔ کیا شرعاً ایسا معاملہ درست ہے؟ اسی طرح وقف کی ایک زمین ہے جس پر کسی طرح کی کوئی عمارت نہیں ہے اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی صورت ہے، اس زمین سے فائدہ اٹھانے کیلئے اگر کسی بلڈر سے اسی طرح کا معاملہ کرلیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاروں کی رائیں مختلف ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ بلڈر کی ملکیت میں ایک یا دو منزل کا دینا درست نہیں ہے، البتہ بلڈر کو بقدر اخراجات ایک خاص مدت تک کے لئے کچھ حصوں سے انتفاع کی اجازت دی جاسکتی ہے جو کرایہ کی شکل ہوگی۔

اس رائے کے حاملین میں درج ذیل حضرات ہیں: مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، جناب ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا اسعد اللہ قاسمی، جناب حکیم ظل الرحمن، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا صدر عالم قاسمی، مولانا ارشد قاسمی۔

ان حضرات نے عام طور پر درج ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

۱۔ ''وإذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضا منها ليرمّ الباقي بثمن ماباع ليس له ذلك'' (هنديه ۲،۴۱۷)۔

۲۔ ''انهدم الوقف وليس له من الغلة ما يعاد به بناؤه دفع النقض إلى الواقف أو وارثه'' (بزازيه على الهنديه ۶،۲۷۲)۔

۳۔ ''أن الخان لو احتاج إلى المرمة آجر بيتاً أو بيتين وأنفق عليه'' (رد المحتار ۳،۳۷۶)۔

۴۔ شجرة جوز في دار وقف فخربت الدار لم يبيع القيم الشجر لأجل عمارة الوقف لكن يكرى الدار و يعمرها ويستعين بالجوز على العمارة لا بنفس الشجرة'' (فتاوى هنديه ۲،۴۱۷)۔

۵۔ بعض حضرات نے شرح وقایہ کے حوالہ سے یہ عبارت بھی درج کی ہے، جس میں مفتی بہ قول کی بھی صراحت ہے:

''إعلم أن بعض المتأخرين جوزوا بيع بعض الوقف إذا خرب لعمارة الباقي والأصح أنه لايجوز. فإن الوقف بعد الصحة لا يقبل الملك كالحر لا يقبل الرقبة'' (شرح وقايه ۲،۳۵۴)۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ بلڈر سے اس طرح کا معاملہ وقف کے تحفظ ہی غرض سے کیا جارہا ہے اس لئے اس کی اجازت ہوگی، یہ رائے درج ذیل حضرات کی ہے:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا محمد ایوب ندوی شافعی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ابراہیم فلاحی، مفتی شکیل احمد [illegible] بستی، مولانا مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا محمد شاہد سبیلی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا سید محمد ایوب سبیلی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا

مستفیض الرحمن قاسمی، مولانا محمد شاہد سہرساوی۔

ان حضرات نے اپنی رائے کی تائید میں درج ذیل دلائل ذکر کئے ہیں:

۱۔ ''إن الوقف إذا خرب و تعطلت منافعه كدار انهدمت أو أرض خربت و عادت مواتا ولم تكن عمارتها أو مسجدا انتقل أهل القرية عنه صار في موضع لا يصلي فيه أو ضاق بأهله ولم يكن توسيعه في موضعه و تشعب جميعه فلم تكن عمارته، ولا عمارة بعضه إلا ببيع بعضه، جاز بيع بعضه لتعمر به بقيته وإن لم يكن الإنتفاع بشئ منه بيع جميعه'' (المغنی ۵،۶۳۲)۔

۲۔ ''وإن باع بعضه لإصلاح باقيه لخراب كله جاز'' (فتاوی بزازیہ علی الهندیه ۶،۲۷۲)۔

۳۔ ''الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره'' (البحر ۵،۶۳۲)۔

۴۔ مفتی عبدالقیوم پالنپوری نے فتاوی ہندیہ کی یہ عبارت بھی درج کی ہے:

''وكذا وقف صحيح إذا خرب ولا ينتفع به وهو بعيد عن القرية لا يرغب أحد في عمارته ولا يستأجر أصله يبطل الوقف ويجوز بيعه، وإن كان أصله يستأجر بشئ قليل يبقى أصله وقفا، وهذا الجواب صحيح على قول محمد فاما عند أبي يوسف ففيه نظر'' (ہندیہ ۲،۳۶۵)، آگے ردالمحتار کی اس عبارت ''ويفتى بكل ما هو أنفع للوقف فيما اختلف العلماء فيه'' سے اس مختلف فیہ قول میں انفع جواز کے پہلو کو بتایا ہے۔ مفتی محبوب علی وجیہی نے ''قانون العدل وال انصاف'' کے حوالہ سے جواز کی یہ دلیل بھی دی ہے:
''ولا تباع إلا إذا تعذر الانتفاع بها'' (ص ۱۷، مادہ ۳۶)۔

بعض حضرات نے کچھ جزوی شرطوں کے ساتھ جواز کی رائے کو ترجیح دی ہے اور دلائل بھی دیئے ہیں۔ لیکن سب کا حاصل یہی ہے کہ بلڈر سے اس طرح کا معاملہ کیا جاسکتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ عمارت کے کچھ حصے یا منزل کو مستقل طور پر بلڈر کی ملکیت میں دینا صحیح نہیں ہے، ہاں! جس قدر رقم اس کی تعمیر یا مرمت میں صرف ہو اس کے عوض ایک خاص مدت تک انتفاع کیلئے کچھ حصے دیئے جاسکتے ہیں، البتہ اگر کوئی بھی بلڈر اس کیلئے تیار نہ ہو اور نہ ہی کوئی اور صورت مرمت یا تعمیر کی ہو اور مخدوش عمارت کے اس طرح رہنے سے وقف کا نقصان ہو تو ایسی صورت میں قاضی شریعت یا دیندار مسلمانوں کی جماعت جس میں عالم دین بھی ہو، کی اجازت سے اس مخدوش عمارت یا غیر نفع بخش زمین کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے دوسری عمارت یا کارآمد زمین وقف کے لئے خریدی جاسکتی ہے۔ فقہاء کی تصریحات اس سلسلہ میں بکثرت ملتی ہیں، ہم یہاں چند ضروری عبارتوں کی نقل پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ اختصاراً مسئلہ کی وضاحت ہوجائے۔

علامہ شامیؒ ردالمحتار میں تحریر فرماتے ہیں: ''الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضي فالحاصل أن الموقوف عليه السكنى إذا امتنع من العمارة ولم يوجد مستأجر باعها القاضي واشترى بثمنها ما يكون وقفا'' (رد المحتار ۳،۳۸۲)۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں نقل کرتے ہیں: ''سئل عن وقف إنهدم ولم يكن له شئ يعمر منه ولا أمكن إجارته ولا تعميره هل تباع أنقاضه من حجر و طوب وخشب؟ أجاب: إن كان الأمر كذلك صح بيعه بأمر الحاكم ويشتري بثمنه وقف مكانه'' (رد المحتار ۴،۳۷۶ جدید نسخہ)۔

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وقف کی مخدوش عمارت یا زمین بلڈر کے حوالہ کر کے مرمت یا تعمیر کا کام کرانا اور اس کے عوض چند منزلیں بلڈر کی ملکیت میں دے دینا صحیح نہیں ہے، ہاں جب کرایہ کی شکل ممکن نہ ہو تب استبدال کی شکل باذن قاضی یا باذن جماعت اہل حل وعقد اختیار کی جاسکتی ہے (هذا ما عندي والله اعلم بالصواب)۔

عرض مسئلہ

سوال نمبر ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۳

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی[1]

حضرات علماء کرام! ہم سب جانتے ہیں کہ قانون میں سب سے اہم چیز اس کا مقصد ہوتا ہے، مقصد کو پورا کرنے کے لئے اصول مقرر کئے جاتے ہیں اور اصولوں کے تحت احکامات دیے جاتے ہیں۔

قانون وقف کا مقصد آخرت کا اجر و ثواب اور دنیا میں مخلوق کی نفع رسانی ہے۔ وقف کے ذریعے انسان اپنی عارضی ملکیت کو جو اس دنیا میں تصرف کرنے کے لئے اس کے خالق و مالک نے عطا کی ہے، مالک حقیقی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ الوقف لا یملك۔ وقف کا کوئی انسان مالک نہیں ہوتا، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اسی لئے وقف کو بیچا نہیں جاسکتا، اس میں میراث جاری نہیں ہوتی، اور اس کا تحفظ اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ وقف کرنے والے کے لئے صدقہ جاریہ بنا رہے جس مقصد کے لئے وقف کیا گیا ہے وہ مقصد پورا ہوتا رہے اور اس کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہے۔

اس وقت میں آپ کی خدمت میں وقف کے موضوع پر عرض مسئلہ کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ وقف کے متعلق سوالات میں سے سوال نمبر ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۳ یہ چار سوال میرے سامنے ہیں۔

سوال نمبر ۸ یہ ہے کہ مسجد یا قبرستان کیلئے وقف زمین جو کہ ضرورت سے زائد ہے اس پر مدرسہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے کہ وہ زمین ایک کار خیر میں استعمال ہو۔

اس سوال کے جوابات ۳۸ علماء کرام کی طرف سے دیئے گئے ہیں جن میں سے ۲۴ علماء نے مسجد یا قبرستان کی وقف زمین پر مدرسہ کی تعمیر کو درست اور جائز قرار دیا ہے:

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا محمد صدر عالم قاسمی، مولانا عبد العظیم اصلاحی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا ابو بکر قاسمی، مولانا اسعد اللہ قاسمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا قمر عالم سنبھلی، مولانا سید محمد ایوب سنبھلی، ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، مولانا محمد ایوب ندوی، مفتی نظام الدین۔ دار العلوم دیوبند۔

دس علماء کرام نے اس کو ناجائز فرمایا ہے: مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، حکیم ظل الرحمن، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا محمد مطیع الرحمن، مولانا محمد شاہد سہرساوی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری۔

اور چار حضرات نے مسجد اور قبرستان کی زمین میں فرق کرتے ہوئے ناجائز قرار دیا ہے۔

مولانا نور القاسمی صاحب لکھتے ہیں کہ مسجد کی زمین پر جائز نہیں ہے قبرستان کی زمین پر جائز ہے۔

مولانا محمد اقبال قاسمی صاحب لکھتے ہیں کہ قبرستان کی زمین پر جائز نہیں ہے مسجد کی زمین پر درست ہے۔

مولانا مصطفی قاسمی صاحب لکھتے ہیں مسجد کی زمین پر جائز نہیں ہے قبرستان کی زمین پر جائز ہے۔

مولانا عبداللطیف پالنپوری کے نزدیک جائز نہیں ہے، بوقت ضرورت کرائے کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔

جن حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے ان میں سے اکثر کی دلیل علت مشترکہ ہے، کیونکہ مسجد اور قبرستان بھی وقف ہے اور دینی مدرسہ بھی وقف ہوتا ہے، اس لئے اس پر مدرسہ کی تعمیر جائز ہونی چاہئے۔ اس سلسلہ میں سب سے محتاط رائے یہ ہے کہ مسجد یا قبرستان کے متولی یا اس کی انتظامیہ اس جگہ کو مدرسہ کی تعمیر کیلئے کرائے پر دے دے، تاکہ واقف کا منشاء بھی فوت نہ ہو اور اس کا فائدہ بھی زیادہ عام ہو جائے جس سے واقف کے اجر و ثواب میں مزید ترقی کی امید ہے۔

جن حضرات نے اس کو جائز قرار نہیں دیا ان کے پیش نظر یہ بات ہے کہ وقف کے مصرف کو بدلا نہیں جاسکتا۔

جن حضرات نے مسجد اور قبرستان کے وقف میں فرق کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ مدرسہ جنس مسجد سے نہیں ہے، البتہ قبرستان کی جائز زمین پر مدرسہ کی تعمیر کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

تمام دلائل کا وزن اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے اور آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وقف کے سلسلے میں منصوص احکام بہت کم ہیں اور زیادہ تر مسائل کا تعلق اجتہاد اور مصالح عامہ سے ہے، اور غالباً اسی لئے وقف کے مصرف کو بدلنے کے سلسلے میں بہت ہی اہم شرط قضائے قاضی کی ہے، قاضی وقت مفاد عامہ کا نگراں ہوتا ہے، اسی لئے شریعت نے اس کو ترجیحی اختیارات دیئے ہیں۔

اس ملک میں اس سہولت سے محروم ہونے کی وجہ سے اور قوت نافذہ نہ ہونے کی وجہ سے جو مشکلات پیش آتی ہیں ہمیں اس مؤقر مجلس میں اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ کیا اس کا حل ایک باوقار اور معتبر وقف کونسل کی صورت میں ممکن ہے یا نہیں ہے۔

وقف کے تعلق سے سوال ۱۱ یہ ہے:

قبرستان کی حفاظت کے لئے جب کہ صرف باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرادی جائے جس کے لئے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے لی جائے اور اس سے یہ کام کرایا جائے۔ جس میں قبرستان کے اطراف کا چندفٹ دوکانوں میں چلا جائے گا کیا یہ درست ہوگا، اور بقیہ میں فاضل آمدنی مناسب مصارف خیر میں لگادی جائے؟

اس سوال کا جواب ۳۷ علماء کرام نے دیا ہے، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب نے براہ راست جواب نہیں دیا، بلکہ وقف کے متعلق بنیادی امور کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ۳۷ میں سے ۳۳ حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور ۴ نے اس کو ناجائز کہا ہے۔

جواز کے قائلین یہ ہیں: مفتی محمد عبیداللہ اسعدی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا محمد صدر عالم قاسمی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا نور القاسمی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اسعد اللہ قاسمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد مطیع الرحمن، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا محمد شاہد سہرساوی، قمر عالم سبیلی، مولانا سید محمد ایوب، ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، مولانا محمد ایوب ندوی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری۔

جن ۴ حضرات نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، حکیم ظل الرحمن، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا محمد اقبال قاسمی۔

جن حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے ان کے سامنے وقف کا تحفظ اور اس کو ناجائز قبضوں سے بچانے کی یہ ایک مناسب صورت ہے، اور جن حضرات نے اس کو ناجائز فرمایا ہے ان کے پیش نظر یہ بات ہے کہ اس طرح قبرستان کے گرد دوکانیں بنانے سے نہ صرف یہ کہ اس کی شکل تجارتی ہو جائے گی، بلکہ قبرستان کا سوگوار ماحول بھی متاثر ہوگا۔

وقف کے تعلق سے سوال نمبر ۱۲ یہ ہے:

آج کل بعض بڑے شہروں میں مسلمان اس صورت حال سے دوچار ہیں کہ وسیع قبرستان میں ایک چھوٹی سے مسجد ہے جو ممکن ہے کسی زمانہ میں یہ تدفین کے لئے آنے والوں کی رعایت سے بنائی گئی ہو کہ وہ وہاں نماز ادا کرسکیں، اب اس علاقہ میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مسجد کی توسیع ضروری ہوگئی ہے، نیز قبرستان میں بھی تدفین کا سلسلہ جاری ہے، تو کیا قبرستان کے حصہ میں مسجد کی توسیع کی جاسکتی ہے؟ اور کیا اس میں ویران اور زیر استعمال قبرستان اور جدید و قدیم قبروں کے

حکم میں فرق ہے؟

اس سوال کے جوابات بھی ۳۸ علماء کرام سے موصول ہوئے ہیں جن میں ۳۵ علماء نے مسجد کی توسیع کو جائز قرار دیا ہے، اور صرف ۳ حضرات ہیں جنہوں نے اس سے اتفاق نہیں فرمایا۔ قائلین جواز کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، حکیم ظل الرحمن، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، محمد صدر عالم قاسمی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا نور القاسمی، محمد ابرار خاں ندوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا ابراہیم فلاحی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اسعد اللہ قاسمی، محمد ارشد قاسمی، محمد مطیع الرحمن، محمد طاہر مظاہری، محمد شاہد سہر ساوی، قمر عالم سبیلی، سید محمد ایوب سبیلی، ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، محمد ایوب ندوی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مفتی نظام الدین صاحب دیوبند۔

قائلین عدم جواز کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ۔

بعض حضرت نے نئی اور پرانی قبروں میں بھی فرق کیا ہے اور بعض حضرت نے یہ صورت تجویز کی ہے کہ مسجد کی توسیع اس طرح کی جائے جس میں نیچے تدفین ہوتی رہے اور چھت ڈال کر اوپر سے مسجد کا کام لیا جائے۔ اس سلسلے میں نئی پرانی قبروں کے فرق کے علاوہ غالباً وارثوں کے جذبات سے بھی اس کا تعلق ہے اس لئے ان کی اجازت اور مرضی کے پہلو کو بھی ضرور سامنے رکھنا چاہئے۔

وقف کے سلسلے میں سوال نمبر ۱۳ یہ ہے:

ہندوستان کی بعض ریاستوں میں ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد پر بھی اراضی وقف کی ہیں اور شاید واقف کے ہندو ہونے کے باعث یہ مساجد اب ہندو اوقاف کے تحت ہیں اور ہندو وقف بورڈ ہی مسجد سے متعلق تمام نظم ونسق انجام دیتا ہے، تو کیا مساجد و مقابر اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا درست ہے؟

اس سوال کے بھی ۳۷ علماء کرام نے جوابات عنایت فرمائے ہیں، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب نے اس سوال کا جواب براہ راست تحریر نہیں فرمایا۔ ۳۷ میں سے ۲۲ حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور پندرہ نے اس کو ناجائز فرمایا ہے۔

جنہوں نے جائز قرار دیا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، حکیم ظل الرحمن دہلی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا نور القاسمی، محمد ابرار خاں ندوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، مولانا محمد ایوب ندوی۔

جائز قرار دینے والوں نے اپنے موقف کی یہ دلیل دی ہے کہ جس طرح غیر مسلم کا وقف کرنا درست ہے اسی طرح اس کا متولی بننا بھی ناجائز نہیں ہے، البتہ بہتر یہی ہے کہ دیانت دار مسلم کو تولیت کا حق دیا جائے۔

جنہوں نے ناجائز قرار دیا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا محمد صدر عالم قاسمی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا شمس پیر زادہ، مولانا ابراہیم فلاحی بارڈولی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اسعد اللہ قاسمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد مطیع الرحمن، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا محمد شاہد سہر ساوی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا سید محمد ایوب، مفتی شکیل احمد سیتاپوری۔

جن حضرات نے اس کو ناجائز کہا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ متولی ہونا بھی ایک طرح کی ولایت ہے اور مسلم پر غیر مسلم کو ولایت کا حق نہیں ہے۔

لیکن سوال جہاں تولیت اور ولایت کے فرق کا ہے وہاں یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ یہ سوال ان اوقاف کے بارے میں ہے جو غیر مسلموں نے ہی وقف کی ہیں، اس لئے اگر وہ وقف کے مقصد کے مطابق دیانت وامانت کے ساتھ یہ خدمت انجام دے رہے ہیں تو ان کو اس سے محروم کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

☆☆☆

دوسرا باب تعارف مسئلہ

قانون وقف

تاریخ، مقاصد اور اہم نکات کا مختصر جائزہ

جناب محمد عبدالرحیم قریشی [1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کے اس سمینار میں غور وفکر کا ایک اہم موضوع وقف ہے اور اوقاف سے متعلق کئی سوالات اس سمینار میں زیر غور ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں رائج قانون وقف کا جائزہ لیا جائے۔ اس جائزہ میں اس قانون اور اس قانون کے بارے میں عدالتی نکتہ آفرینیوں کے ایسے پہلو بھی سامنے آئیں گے جن سے ان سوالات پر غور وبحث میں مدد ملے گی جو اس سمینار کے موضوعات میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ وقف سے متعلق اہم مسائل کو سمجھا جاسکے گا۔

قانون وقف کے ارتقاء کی تاریخ:

وقف کا نظریہ کہ کسی مال متعین کو روک کر اس کی منفعت کو خیر کے کاموں میں صرف کیا جائے، یہ اسلام ہی کی دین ہے، اور ایسا کوئی نظریہ یا ادارہ دنیا کے کسی اور قانون میں نہیں پایا جاتا۔ وقف کا مقصد قرب الٰہی کا حصول ہے اور یہ ثواب جاریہ ہے، اس لئے مسلم معاشروں میں مال وجائداد کو وقف کرنے کی روایت چلی آرہی ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی آمد کے بعد اوقاف کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا اور لاکھوں لاکھ اوقاف قائم ہوئے جن کی نگرانی حکومت کے مقرر کردہ قاضی کیا کرتے تھے اور ہر مملکت کے اندر واقع اوقاف کی عام نگرانی صدر الصدور کی ذمہ داریوں میں شامل تھی۔ قاضی اور دیگر خدمات شرعیہ پر مامور اصحاب صدر الصدور کے تحت اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور ملک میں افراتفری نے اوقاف کے اس نظام کو متاثر کیا۔ انگریزوں کے قبضہ کے ساتھ ساتھ یہ صورتحال ابتر ہوتی چلی گئی۔

ا۔ انگریز کے غلبہ کے بعد صورت حال:

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے شاہ عالم ثانی کے دور حکومت میں ۱۸۰۳ء [2] میں ہو چکا تھا۔ انگریزوں کی مدد سے ہی شاہ عالم ثانی نے دہلی کا تخت حاصل کیا تھا اور اس کے بعد اکبر شاہ ثانی انگریزوں کا صرف وظیفہ خوار تھا۔ ان حالات میں اوقاف کی صورتحال مزید ابتر ہونے لگی، انگریزوں نے بھی اس میں مداخلت سے احتراز کیا۔ لیکن ۱۸۱۰ء میں انگریزوں نے جب اس ابتری کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو اوقاف اور عطیات کے تحفظ کے مقصد سے فورٹ ولیم (کلکتہ) کے ماتحت تمام علاقوں کیلئے ایک قانون وریگولیشن Regulation XIX of 1810 پاس کیا، اس کے ابتدائیہ میں یہ مقاصد بیان کئے گئے۔

> ".....کہ انڈومینٹس کو معطی کے حقیقی منشاء اور مرضی کے مطابق استعمال کیا جائے اور.....عوام کے استعمال اور سہولت کیلئے پلوں، سرایوں، کٹھروں اور دیگر عمارات کی جو حکومت یا افراد کے صرفہ سے تعمیر کئے گئے ہوں، نگہداشت اور مرمت کی جائے......"

انڈومینٹس کے بارے میں اس ابتدائیہ میں یہ وضاحت کردی گئی کہ اس سے مراد مساجد، ہندو منادر، تعلیمی اداروں (کالجز) کی مدد اور دیگر مقدس اور

---

[1] صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔

[2] انگریزوں کے دہلی پر ۱۸۴۷ء سے پہلے مکمل قبضہ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ۳۰؍جون ۱۸۰۷ء کو ایک درخواست دہلی کے انگریز ریذیڈینٹ کے توسط سے سکریٹری پولیٹکل ڈپارٹمنٹ کو دی تھی کہ دہلی میں ان کی جائداد ضبط ہو چکی ہے وہ واگذاشت کی جائے۔ ۱۰؍جولائی ۱۸۰۷ء کو سکریٹری پولیٹکل ڈپارٹمنٹ نے ریذیڈینٹ کو جائزہ واگذاشت کرنے کی درخواست کی منظوری کی اطلاع دی اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو دہلی میں دوبارہ رہنے کی اجازت مل گئی۔

منفعت بخش اغراض کے لئے سابقہ حکومتوں یا افراد کی جانب سے دی گئی اراضیات ہیں۔

اس ابتدائیہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۱۰ء تک تعلیمی اداروں کی اوقافی جائدادیں بڑی تعداد میں موجود تھیں اور پلوں، سراؤں، کٹھروں وغیرہ کی قابل لحاظ تعداد ایسی تھی جو وقف تھے۔ ۱۸۱۷ء میں ایسا ہی قانون فورٹ سینٹ جارج (مدراس) کے تحت کے علاقوں میں نافذ کیا گیا (ریگولیشن ۷ بابت ۱۸۱۷، مدراس) ان قوانین کے ذریعہ ان تمام اوقاف کی عام نگرانی ونگہداشت بورڈ آپ ریوینو اور بورڈ آف کمشنرس کے تحت کردی گئی۔

۲۔ کمپنی حکومت کی پالیسی:

۱۹۶۳ء میں یہ پالیسی بدل دی گئی اور اس نظریہ کے تحت کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اداروں کے ساتھ ایک عیسائی حکومت کا تعلق بے قاعدہ اور خلاف مصلحت ہے، برطانوی حکومت ہند نے قانون ACt XX of 1863 کے ذریعہ ۱۸۱۰ء اور ۱۸۱۷ء کے قوانین منسوخ کردیئے گئے اور ہندو مسلم مذہبی اوقاف کو حکومت کی نگرانی سے خارج کردیا گیا لیکن حکومت نے ان تمام اوقاف کو اپنے تحت رکھا جن کے مقاصد بالکلیہ مذہبی نوعیت کے نہیں تھے۔ اس قانون کے ذریعہ مذہبی اوقاف اور خیراتی "Charitable" اوقاف کے درمیان فرق پیدا کیا گیا۔ خیراتی اوقاف کو حکومت نے اپنے تحت رکھا، اور مذہبی اوقاف کو مکمل طور پر متولیوں کے حوالے کرنے کے لئے شرط یہ قرار دی گئی کہ یہ وقف صرف مذہبی اغراض کے لئے قائم کیا گیا ہو۔ یہ قانون اوقاف کی بڑی تباہی کا باعث بنا۔ سرکاری نگرانی کے اٹھ جانے سے متولیوں نے من مانی شروع کردی اور اوقاف کو اپنی ذاتی جائداد کی طرح بیچنا اور منتقل کرنا شروع کردیا، اور انگریزوں نے ان اوقاف کو جو تعلیمی اغراض کے لئے قائم کئے گئے تھے اور ملک کے گوشے گوشے بلکہ تقریباً ہر بڑے شہر میں پائے جاتے تھے، اپنے تحت لے کر ایک پالیسی کے تحت ان کو ختم اور ہڑپ کرنا شروع کیا جس سے مسلمانوں کی تعلیم کا اس وقت کا نظام ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا اور جس ملت میں تعلیم وخواندگی، مرد وخواتین میں عام تھی، اس میں ناخواندگی بڑھتی گئی، اور یہی کیفیت پیدا کرنا انگریزوں کی پالیسی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں خیراتی اوقاف کے لئے خیراتی اوقاف قانون Charitable Endowment Act 1890 پاس کیا گیا لیکن اس وقت تک کئی اوقاف ختم ہوچکے تھے۔ ان کی وقف کی حیثیت ختم کردینے سے خیراتی اوقاف ٹرسٹ بن گئے اور ختم ہوتے گئے، کیونکہ ٹرسٹ میں دوامی برقراری کا کوئی تصور نہیں ہے۔

۳۔ وقف علی الاولاد:

قانون اسلامی کے تحت ایک شخص اپنی جائداد و مال کو نسلِ بعد نسلاً اپنی اولاد کی منفعت کے لئے وقف کرسکتا ہے کیونکہ اہل خانہ اور اولاد کی کفالت اور پرورش بھی کار خیر اور کار ثواب ہے، لیکن اولاد کی کفالت اور پرورش کو دیگر قوانین اور بالخصوص برطانوی قانون میں کار خیر (Charity) نہیں گردانا جاتا۔ برطانوی حکومت ہند میں عدالتیں چونکہ برطانوی قانون کے نظریات اور اصولوں کی پیروی کرتی تھیں اس لئے وقف علی الاولاد کا مسئلہ ایک قانونی نزاع بن گیا اور ۱۸۹۴ء میں ابوالفتح محمد اسحق بنام رساموئے دھر چودھری کیس میں پریوی کونسل نے وقف علی الاولاد کو وقف تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس فیصلہ کے خلاف مسلمانوں میں ناراضگی پیدا ہوئی۔ ملکہ وکٹوریہ اور وائسرائے کے نام مسلسل اور متعدد نمائندگیوں کے بعد پریوی کونسل کے اس فیصلہ کو زائل کرنے کے لئے ''مسلمان وقف جواز قانونی'' قانون The Musalman Wakf Validating Act of 1913 پاس کیا گیا جس کے ذریعہ وقف علی الاولاد کو وقف کی حیثیت میں تسلیم کیا گیا اور اس قانون کو استقدامی اثر (Retrospective Effect) دیا گیا۔

۴۔ قوانین اوقاف قبل آزادیٔ ملک:

۱۹۲۰ء میں خیراتی اور مذہبی ٹرسٹوں کے لئے ایک قانون The Charitable Religious Trust Act پاس کیا گیا، لیکن اس کے ذریعہ اوقاف کے انتظام ونگرانی کا کوئی نظم قائم نہیں کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں مسلمان وقف ایکٹ پاس کیا گیا جس کے ذریعہ متولیوں کو پابند کیا گیا کہ وہ ڈسٹرکٹ جج کو سالانہ آمدنی واخراجات کی تفصیلات پیش کیا کریں۔ ان عدالتوں کو حسابات کی تنقیح کے اختیارات بھی دیئے گئے، ملک میں مرکزی اور صوبائی سطح کے کئی قوانین بنائے گئے۔ دیسی ریاستوں میں مختلف قوانین رائج رہے، ان میں قابل ذکر یہ ہیں:

بنگال واڑیسہ مسلمان وقف ایکٹ (۱۹۲۶ء)

بنگال وقف ایکٹ (۱۹۳۴ء)

بمبئی مسلمان وقف ایکٹ (۱۹۳۵ء)

یوپی مسلم وقف ایکٹ (۱۹۳۶ء)

دہلی مسلم وقف ایکٹ (۱۹۴۳ء)

بمبئی مسلمان وقفس (ترمیمی) ایکٹ (۱۹۴۵ء)

بہار وقف ایکٹ (۱۹۴۷ء)

ملک کی سب سے بڑی دیسی ریاست مملکت آصفیہ نظام حیدرآباد میں ۱۳۴۹ فصلی کے دستور العمل کے تحت حکومت نے ہندو مسلم اوقاف کے انتظام و نگہداشت کو اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اس کے لئے محکمہ امور مذہبی قائم تھا اور جس طرح اس ریاست میں مذہبی وخیراتی اوقاف کا انتظام اور ان کی نگہداشت ہوتی رہی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے، یہ قانون ریاست حیدرآباد میں جنوری ۱۹۵۵ء تک نافذ العمل رہا۔

۵۔ آزادیٔ ملک کے بعد قوانین وقف:

ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۵۳ء میں اوقاف کے تحفظ اوران کی نگہداشت ونگرانی کے لئے پارلیمنٹ میں مشہور مسودہ قانون ''کاظمی بل'' پیش ہوا۔ اس بل پر عوامی رائے جاننے کے لئے ایک سلیکٹ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں قانون وقف بابت ۱۹۵۴ء کی پارلیمنٹ نے تدوین کی۔ اس قانون کی بعض دفعات اور بعض فقروں کی عدالتوں کی جانب سے قانون کے منشاء کے خلاف تشریحات اور فیصلوں کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ترمیمات کا مطالبہ ہوتا رہا ہے، اور چند مطالبات کو قبول کرتے ہوئے ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۹ء میں ترمیمات کی گئیں، لیکن اس قانون پر اعتراضات ہوتے رہے، اور اس قانون کے تحت قائم وقف بورڈس، اوقاف کے تحفظ ونگہداشت میں ناکام رہے۔ ۱۹۵۴ء کے مرکزی قانون کے باوجود مغربی بنگال میں بنگال وقف ایکٹ بابت ۱۹۳۴ء، یوپی میں یوپی مسلم وقفس ایکٹ بابت ۱۹۳۶ء اور اس کے بعد یوپی مسلم وقفس ایکٹ ۱۹۶۰ء نافذ العمل رہے۔ گجرات میں کچھ کے علاقہ میں اور مہاراشٹرا میں مرہٹواڑہ کے علاقہ میں قانون بابت ۱۹۵۴ء نافذ کیا گیا۔ ان دونوں ریاستوں کے باقی علاقوں میں بمبئی پبلک ٹرسٹ ایکٹ بابت ۱۹۵۰ء کا نفاذ کیا جاتا رہا ہے۔

اوقاف کے تحفظ میں ان قوانین کے تحت قائم بورڈس اور عہدہ داروں کی ناکامی پر مسلسل توجہ دلانے کے بعد مرکزی حکومت نے ۱۹۷۰ء میں وزارت قانون، انصاف وکمپنی امور کے تحت وقف انکوائری کمیٹی قائم کی۔ جس نے ۱۹۷۳ء میں ایک عارضی رپورٹ اور ۱۹۷۶ء میں آخری رپورٹ ایک نئے قانون کے مسودہ کے ساتھ پیش کی۔ ان رپورٹس اور سفارشی مسودہ کے جائزے کے لئے مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ بالآخر ۱۹۸۴ء میں ایک نئے قانون کا بل پارلیمنٹ میں پیش اور منظور ہوا۔ اس پر صدر جمہوریہ نے بھی دستخط کردیئے، لیکن کئی گوشوں سے اس کی مخالفت ہوئی۔ چنانچہ حکومت ہند نے اس قانون کے نفاذ کو روکنے کا اعلان کیا۔ بعد میں اس قانون کے صرف دو دفعات کو نافذ کیا گیا جن میں سے ایک تخلیہ کنندگان کے چھوڑے ہوئے اوقاف کو وقف بورڈ کے تحت کرنے سے متعلق ہے، اور دوسری دفعہ کے ذریعہ قبضہ مخالفانہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی معیاد بڑھا کر (۳۰) سال کردیا گیا۔

۶۔ قانون وقف بابت ۱۹۹۵ء:

ایک نئے قانون وقف کے لئے مسلسل مطالبہ ہوتا رہا چنانچہ ۱۹۹۳ء میں حکومت نے پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا اور جو بالآخر قانون وقف بابت ۱۹۹۵ء کی شکل میں منظور ہوا اور اس کو سارے ملک میں نافذ العمل قرار دیا گیا۔ حکومت ہند نے ۲۷ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو بجز جموں وکشمیر سارے ملک میں یکم جنوری ۱۹۹۶ء سے اس قانون کے نفاذ کا اعلان کیا۔ البتہ اس قانون کا اطلاق درگاہ حضرت خواجہ صاحب اجمیر پر نہیں ہوگا جس کے لئے علیحدہ ۱۹۵۵ء کا قانون موجود ہے۔

قانون بابت ۱۹۹۵ء کے اہم نکات:

{FR 5832} اس قانون کے ذریعہ تمام ریاستوں میں اوقاف پر یکساں قوانین کا نفاذ ہوگا اور پچھلی صورت حال جو بعض ریاستوں میں الگ قوانین اور بعض ریاستوں کے دو مختلف حصوں میں دو قوانین نافذ تھے ختم ہوجائے گی۔

اس قانون میں بھی کئی نقائص ہیں، جن کے تعلق سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے اجلاس اور کمیٹیوں میں غور کیا، اور ترمیمات کے لئے حکومت سے نمائندگی کی ہے، سطور ذیل میں ان ہی نکات کا ذکر ہے جو اس سمینار کے موضوع سے متعلق ہیں۔

۱۔ ٹرسٹ اور وقف: جس کے مستفید لہ میں غیر مسلم بھی شامل ہوں کیا اس کو وقف قرار دیا جا سکتا ہے؟

سپریم کورٹ نے کیس نواب زین یار جنگ بنام ڈائرکٹر آف انڈومنٹ (آندھرا پردیش) و دیگر (985.SCAIR 1963) میں اس سوال پر غور کیا کہ آیا نظام کی جانب سے قائم کردہ چیریٹیبل ٹرسٹ وقف ہے جس پر قانون وقف کا اطلاق کیا جاسکے یا اس قانون کے حیطہ اختیار سے باہر ایک عوامی خیراتی ٹرسٹ ہے۔ جسٹس گجیندر گڈکر نے پانچ ججوں کے اجلاس کی جانب سے یہ فیصلہ سنایا کہ:

(الف) ٹرسٹ، وقف سے بالکل مختلف ہے۔ ٹرسٹ میں ٹرسٹ قائم کرنے والا، ٹرسٹ جائداد ٹرسٹیوں کو منتقل کرتا ہے جب کہ وقف میں موقوفہ شئے اللہ تعالی کی ملک میں دی جاتی ہے اور واقف کا حق ملکیت ختم ہو جاتا ہے۔

(ب) وقف کے مستفید لہ (Beneficiaries) افراد کے علاوہ اغراض بھی ہو سکتے ہیں، یہ اغراض قانون وقف ۱۹۵۴ء کی رو سے مسلم فرقہ کے فائدے سے متعلق ہونا چاہئے۔ نظام س چیریٹیبل ٹرسٹ عوام کو بلا لحاظ مذہب و ذات وعقیدہ فائدہ پہنچانے کے لئے قائم کیا گیا اس لئے یہ ٹرسٹ وقف نہیں ہے۔

اس فیصلہ کے اثر کو زائل کرنے کے لئے قانون میں لفظ مستفید لہ کی تعریف میں تبدیلی کر کے الفاظ ''مسلم فرقہ کے فائدے کے لئے'' کے بجائے ''مسلم لا میں تسلیم شدہ'' کے الفاظ داخل کرنے کی تجویز رکھی گئی، اور یہ ترمیم ۱۹۶۴ء کے ترمیمی قانون کے ذریعہ کی گئی۔ لیکن اہم مسئلہ یہ تھا کہ مذہبی اور خیراتی اغراض کے لئے مسلمانوں کی جانب سے قائم ٹرسٹ کو بھی وقف کی تعریف میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ یہ تجویز رکھی گئی اور وقف انکوائری کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ متولی کی تعریف میں ٹرسٹ اور سوسائٹی کو شامل کیا جائے۔ مسلسل کوشش اور کئی کمیٹیوں کی سفارش کے باوجود حکومت نے اسکو قبول نہیں کیا ہے اور ایسے ٹرسٹ اب بھی نئے قانون وقف کے دائرہ سے باہر ہیں۔

۲۔ فہرست اوقاف کی قبضہ مخالفانہ کے خلاف قطعیت:

قانون وقف کی رو سے ریاستی حکومت سروے کمشنر کا تقرر کرتی ہے، اور سروے کمشنر قانون وقف کے آغاز نفاذ کی تاریخ پر ریاست میں موجود اوقاف کا سروے کرتا ہے (دفعہ ۴)۔ سروے کمشنر کی رپورٹ وصول ہونے پر حکومت یہ رپورٹ وقف بورڈ کو روانہ کرتی ہے اور وقف بورڈ جانچ کے بعد اس کو سرکاری گزٹ میں شائع کرواتا ہے (دفعہ ۵)۔ سرکاری گزٹ میں اشاعت کے ایک سال بعد فہرست میں شامل کسی جائداد وقف ہونے کے سوال پر وقف بورڈ یا متولی یا اس میں مفاد رکھنے والے شخص کا کوئی مقدمہ ٹریبونل میں سماعت کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا۔

(الف) گذشتہ سال کرناٹک ہائی کورٹ نے کرناٹک وقف بورڈ بنام ریاست کرناٹک کیس (Kantk.55.AIR1996) میں یہ فیصلہ دیا کہ ایک سال کے اندر فہرست اوقاف میں اندراج کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی تحدید کا اطلاق حکومت پر نہیں ہوتا اور حکومت بحیثیت مدعی اس تحدید کی پابند نہیں ہے۔ اس فیصلہ نے بڑے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ملک کے اکثر علاقوں میں، ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی دیسی ریاستیں تھیں اور بالخصوص آندھرا پردیش کے علاقہ تلنگانہ، مہاراشٹرا کے علاقہ مرہٹواڑہ اور کے علاقہ حیدرآباد کرناٹک میں قبرستانوں اور عیدگاہوں کی زمینوں کو ریونیو ریکارڈس میں سرکاری ملک بتایا گیا ہے، اور ایسے اکثر علاقوں میں اوقاف کا سروے ہو چکا ہے اور فہرستیں سرکاری گزیٹوں میں شائع ہو چکی ہیں اور کئی مرتبہ نمائندگیوں کے باوجود ریونیو ریکارڈس میں گزٹ کے مطابق اندراجات نہیں کئے گئے۔ اس صورت حال کا استحصال کرتے ہوئے بعض بددیانت اور فرقہ پرست عہدہ داروں نے وقف کی ایسی اراضیات کو بے زمین و بے مکان غریبوں کی بہبودی کی اسکیمات کے تحت دلتوں اور دیگر پس ماندہ طبقات میں تقسیم کر دیا۔ موجودہ دور کی زمینیں ہڑپ کرنے کے حرص کے مارے اور مسلمانوں سے عناد رکھنے والے بھی ایسے بددیانت عہدہ داروں کی ملی بھگت سے ایسی جائدادوں کو حاصل کر رہے ہیں۔ آندھرا پردیش اسمبلی میں اوقاف کے اطلاق پر تیز و تند بحث کے بعد ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے جنوری ۱۹۹۷ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس میں ضلع حیدرآباد کے ایک سابق کلکٹر و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بارے میں باوثوق حوالوں سے بتایا گیا کہ اس نے قبرستانوں کی زمینوں پر عمداً دلتوں کو بسایا۔ اس لئے ریاستی حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا جانا چاہئے کہ اراضی اور جائدادوں سے متعلق وہ اپنے تمام ریکارڈس کو گزٹ شدہ فہرست ہائے اوقاف کے مطابق بنائے، اور مرکزی حکومت سے ایسی ترمیم کا مطالبہ کرنا چاہئے کہ کرناٹک ہائیکورٹ کے اس فیصلہ کا اثر زائل ہو اور تحدید کا اطلاق حکومتوں پر بھی ہو۔

(ب) فہرست وقف میں شامل کسی جائداد کے، اس کے وقف ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں نزاع ہوتو اس تعلق سے عذرداری کا حق وقف بورڈ یا متولی یا اس میں مفاد رکھنے والے ہر شخص کو حاصل ہے۔ یہی بات ۱۹۵۴ء کے قانون میں بھی تھی۔ تعریفات کی دفعہ میں 'وقف میں مفاد رکھنے والے شخص' کی تعریف موجود ہے۔

راجستھان ہائیکورٹ نے رادھا کرشنن بنام راجستھان وقف بورڈ کیس میں (RAJAIR 1967.) یہ فیصلہ دیا کہ سروے کمشنر کے فرائض تاریخ آغاز قانون نیز 'موجود اوقاف' تک محدود ہیں۔ اس لئے یہ سوال کہ ایک جائیداد وقف ہے یا نہیں کمشنر طے نہیں کرسکتا۔ اس فیصلہ کے خلاف مرافعہ میں سپریم کورٹ نے (289.ScAIR 1979) فیصلہ کے اس حصہ کو رد کردیا کہ جب کمشنر کو سروے کرنے کا اختیار حاصل ہے تو اس میں یہ بات مخفی ہے کہ ان اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے وہ اس کی چھان بین کرے گا کہ آیا ایک وقف موجود ہے، ہائیکورٹ نے صاف طور پر غلطی کی ہے۔ راجستھان ہائیکورٹ نے یہ فیصلہ بھی دیا تھا کہ فہرست وقف صرف ان کے خلاف قطعیت پاتی ہے جنہیں عذرداری کا حق ہے یعنی وقف بورڈ یا متولی یا اس میں مفاد رکھنے والے شخص کے خلاف یہ فہرست قطعی قرار پائے گی، اور اجنبی پر یعنی جس کو قبضہ مخالفانہ حاصل ہے اور جو اس کو وقف ہی نہیں مانتا، اس پر اس تحدید کا اطلاق نہیں ہوگا۔ مرافعہ میں سپریم کورٹ نے فیصلہ کے اس جز کی توثیق کردی۔

اس فیصلہ کے اطلاق کو بے اثر کرنے کیلئے ۱۹۸۴ء کے قانون کے ذریعہ وضاحت کا اضافہ کیا گیا کہ الفاظ "اس میں مفادر کھنے والے ہر شخص" میں ہر وہ شخص شامل ہے جو متعلقہ وقف میں مفاد نہ رکھتا ہو، لیکن ایسی جائداد میں مفاد رکھتا ہو اور جس کو سروے میں انکوائری کے دوران نوٹس کی تعمیل کے ذریعہ اپنے کیس کی نمائندگی کا معقول موقع دیا گیا ہو۔ یہ وضاحت ۱۹۹۵ء کے نئے قانون میں بھی موجود ہے، اس کے باوجود مخالف قابضین کے تعلق سے اس قانون میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے دو ترمیمات کی تجویز پیش کی گئی تھی کہ تعریفات کی دفعہ میں 'وقف میں مفادر کھنے والے شخص' کی تعریف میں ان اشخاص کو جو قانون وقف کے تحت وقف بورڈ یا اس کی جانب سے مجاز کردہ کسی افسر کے جاری کردہ نوٹیفکیشن یا حکم سے شاکی یا متاثر ہوں، اور ایسے اشخاص کو جو جائداد وقف ہیں حقیت ملک یا کسی حق کا ادعاء رکھتے ہوں شامل کیا جائے۔ اس ترمیم کے علاوہ سروے کمشنر کے فرائض کی دفعہ ۴ ذیلی دفعہ ۳، میں انکوائری میں کسی جائداد کے وقف ہونے یا نہ ہونے کی انکوائری کو اس شرط کے ساتھ شامل کیا جائے کہ اس سے متاثر ہونے والے تمام فریقین کو ان کے عذرات کی سماعت کا معقول موقع دیا جائے گا۔ یہ ترمیمات قانون میں موجود ابہام کو دور کریں گی۔

۳۔ غیر مسلم اشخاص کے قائم کردہ اوقاف:

ہندوستان کے طول وعرض میں ایسے اوقاف بڑی تعداد میں موجود ہیں جن کو غیر مسلم اصحاب نے قائم کیا، جب کہ مسلم فرمانرواؤں نے غیر مسلم رعایا کیلئے منادر، گردوارے، گرجا گھروں کی تعمیر میں مدد دی اور ان کو رقمیں اور اراضی کے عطیات وجاگیریں دیں۔ اسی طرح ہندو راجا، والیان ریاست، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں نے اپنی رعایا کے لئے مسجدیں، عاشور خانے اور عیدگاہیں بنوائیں اور زندہ وگذرے ہوئے بزرگان کے لئے خانقاہیں بنوائیں اور ان کے مزارات ومقبرے اور ان کے اطراف زائرین کی سہولتوں کے لئے عمارتیں تعمیر کروائیں اور ان کو وقف کیا۔ اسی طرح دیگر مخیر غیر مسلموں نے بھی اس نوعیت کے کام کئے۔ یہ ان کاموں کو اپنے اعتقاد کے لحاظ سے بھی نیکی اور پُن کا کام جانتے تھے، ان اوقاف میں مذہبی فرائض یا متعلقہ رسومات کی انجام دہی کے لئے مشروط الخدمت معاشیں بھی دیں اور اکثر یہ معاشیں اراضی کی صورت میں دی گئی تھیں۔

قانون وقف ۱۹۵۴ء کی رو سے اسلام کو ماننے والے اشخاص یعنی مسلمانوں کے قائم کئے ہوئے اوقاف ہی وقف متصور ہوں گے (دفعہ ۳ تعریفات شق 'ایل')۔ اس تعریف کی رو سے غیر مسلم اشخاص کے قائم کردہ اوقاف قانونی اعتبار سے اوقاف نہیں ہیں۔ ۱۹۸۴ء کے ترمیمی قانون کے ذریعہ 'اسلام کو ماننے والے شخص' کے الفاظ کے بعد 'یا کسی اور شخص' کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا جس سے وقف کی تعریف میں وسعت پیدا ہوگئی، البتہ یہ شرط لگائی گئی کہ اگر وقف کرنے والے غیر مسلم کی وفات کے بعد، اس کے قانونی نمائندگان میں سے ایک یا زیادہ اس وقف کے قیام پر اعتراض کریں تو یہ وقف کالعدم ہوگا۔ اس وقت ایسے اوقاف کی بڑی تعداد ایسی ہے جن پر اس شرط کا اطلاق ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ان کے واقفین کو فوت ہوئے عرصہ گذر چکا ہے۔ ۱۹۸۴ء کی یہ ترمیم بہت موزوں اور مناسب تھی۔ لیکن اس کو نافذ نہیں کیا گیا اور ۱۹۹۵ء کے نئے قانون میں اس کو شامل بھی نہیں کیا گیا، چنانچہ ۱۹۵۴ء کے قانون والی صورتحال ہی برقرار ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ 'اسلام کو ماننے والے' کی شرط لگائی نہ گئی تو دوسرے فرقوں کے تمام خیراتی اور کئی مقدس انڈومینٹس قانون وقف کے تحت آجائیں گے کیونکہ ایسے خیراتی اور مقدس مقاصد کو مسلم لاء میں بھی کار خیر اور کار ثواب گردانا جاتا ہے اور ان کو قانون وقف کے تحت لانا اس قانون سازی کا منشا نہیں ہے، لیکن یہ

خیال زیادہ قابل اعتناء نہیں ہے، کیونکہ جہاں تک دوسرے فرقوں کے 'مقدس' اغراض کا سوال ہے ان کو اسلامی قانون میں قطعاً 'مقدس' نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں تک خیراتی مقاصد کا تعلق ہے اگر وہ مسلمانوں یا اوقاف سے وابستہ نہ ہوں تو ان کو موزوں الفاظ کے ذریعہ قانون وقف کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا جاسکتا ہے۔ بہر حال غیر مسلم اشخاص کے قائم کردہ اوقاف کو قانون وقف کے تحت لانے کے لئے ترمیم ضروری ہے۔

۱۹۶۴ء میں قانون وقف ۱۹۵۴ء میں جو ترمیمات کی گئیں ان میں ایک نئی دفعہ ۶۶ (ج) کا اضافہ ہے جس کے ذریعہ قانون یہ بنایا گیا کہ "اسلام کو نہ ماننے والے کسی شخص" نے اگر ایک وقف کی مدد کے لئے کسی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کا عطیہ دیا ہو تو یہ عطیہ اس وقف کا جز متصور ہوگا۔ یہ وقف (الف) مسجد، عیدگاہ، امام باڑہ، درگاہ، خانقاہ یا مقبرہ یا (ب) مسلم قبرستان یا (ج) سرائے یا مسافر خانہ ہونا چاہئے۔ ۱۹۶۴ء میں داخل کی گئی دفعہ ۶۶ (ج) اب نئے قانون وقف بابت 1995 میں دفعہ ۱۰۴ ہے، اس دفعہ کی رو سے کوئی غیر مسلم کوئی مسلم وقف قائم نہیں کرسکتا، اور اگر وہ کرے تو اس پر قانون وقف کا اطلاق نہیں ہوگا۔ البتہ کسی مسجد، عیدگاہ، امام باڑے، درگاہ، مقبرے، قبرستان، سرائے یا مسافر خانہ کی مدد وسہارے کے لئے قابل انتقال یا ناقابل انتقال جائداد کا عطیہ دے سکتا ہے جس پر قانون وقف کا اطلاق ہوگا۔

اس تعلق سے وقف انکوائری کمیٹی کی آخری رپورٹ میں کئے گئے اس تبصرے کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ:

"جب کہ غیر مسلم کی جانب سے اس دفعہ کی فہرست میں درج وقف کی مدد کے مقصد سے عطیہ میں دی گئی قابل انتقال یا ناقابل انتقال جائداد، جائداد وقف متصور ہوگی، ایک غیر مسلم کی طرف سے عطا کردہ یا مختص کردہ وقف، وقف متصور نہیں۔ صاف طور پر قانون کا یہ بھونڈا نظریہ ہے...... یہ ہماری تاریخ کی منفرد خصوصیت ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے منادر، آشرم، گوشالے اور گردوارے بنائے یا ان کے لئے نگہداشت کی جاگیریں عطا کیں، اور ہندو اور سکھ حکمرانوں نے نہ صرف مساجد، درگاہوں، امام باڑوں وغیرہ کی مدد کے لئے زمین اور جائدادیں عطا کیں بلکہ درحقیقت اس طرح کی مقدس جائدادیں عطا کیں اور ان کی تعمیر کروائی"۔

اس لئے ان کو وقف کی تعریف میں شامل کرنے کی تجویز مسلم پرسنل لا بورڈ نے پیش کی تھی۔ اس کے لئے نمائندگیوں کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔

۴۔ وقف تعامل: Waqf By User

ایسے اوقاف کو جن کے وقف کئے جانے کا کوئی ثبوت موجود نہ ہو، لیکن جن کا استعمال وقف کی حیثیت میں کیا جاتا رہا ہو ان کو قانوناً وقف کی تعریف میں شامل کیا گیا ہے۔ قانون کا تحفظ ایسی جائدادوں کو حاصل ہے۔ ملک میں موجود اوقاف کی ایک بڑی بھاری تعداد اس نوعیت کے اوقاف پر مشتمل ہے۔ جگہ جگہ موجود مساجد، قبرستانوں، مقبروں وغیرہ کے وقف کئے جانے کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا، لیکن ان کا سابقہ یا موجودہ استعمال ہی ان کی نوعیت وقف کو ظاہر کرتا ہے، اس لئے ۱۹۵۴ء کے قانون میں وقف تعامل یا وقف بالاستعمال کو وقف کی تعریف میں شامل کیا گیا۔ مساجد، مقبرے، خانقاہیں، امام باڑے جیسے اوقاف تو اپنی عمارت یا اس کے باقیات وآثار ہی سے ظاہر ہوجاتے ہیں کہ یہ اوقاف ہیں۔ لیکن ان قبرستانوں کی صورت حال جو مدت سے ممنوع التدفین ہوں یا کسی وجہ سے جن کا استعمال نہ ہو رہا ہو اور مرور زمانہ کی وجہ سے قبروں کے نشان زیادہ نمایاں نہ ہوں، مختلف ہے۔ قبرستانوں کے وقف تعامل پر اہم فیصلہ پریوی کونسل کا بلبھ داس بنام نور محمد (LUCK.85AIR 1936) کیس میں ہے کہ دستاویزی ثبوت کے طور پر خسرہ (KHASRA) میں اس زمین کا بحیثیت قبرستان اندراج کافی ہے، اور خسرہ یا ریونیو ریکارڈ میں ایسے اندراج کی عدم موجودگی میں اس زمین کے بطور قبرستان استعمال کے بارے میں تدفین کے کئی واقعات کی شہادت ضروری ہوگی اور اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ زمین قبرستان ہے۔ تاہم اس فیصلہ میں یہ بھی کہا گیا کہ کسی زمین میں ایک فرد کی تدفین اس کو فوری اور لازمی طور پر قبرستان نہیں بنادیتی۔ پنجاب ہائیکورٹ نے کیس پنجاب وقف بورڈ بنام پنچایت گڑھی برہمن (482.PUNJAIR 1971) میں یہ فیصلہ دیا کہ ایسا وقف تعامل، جس کا ایک عرصہ سے اس حیثیت میں استعمال ترک کردیا گیا ہو وقف باقی نہیں رہے گا۔

اس کیس میں دستاویزی اور زبانی شہادتیں موجود تھیں کہ زیر نزاع زمین قدیم قبرستان تھی۔ لیکن اس فیصلہ میں ایک ایسا نکتہ پیدا کیا گیا جس کا کوئی جواز قانون شریعت میں نہیں ہے اور جس کو اس سے پہلے کسی عدالت نے قابل اعتناء نہیں سمجھا کہ اگر تعامل ترک ہوجائے تو نوعیت وقف بھی ختم ہوجائے گی۔ چونکہ اس سمینار میں ہریانہ اور مغربی یوپی کے اوقاف کا مسئلہ زیر غور ہے اس لئے اس فیصلے کے بعض حصوں کو نقل کرنا مناسب ہوگا۔

فیصلہ میں کہا گیا ہے کہ:

"اکثر پیش کردہ نظائر...... تقسیم ملک کے پہلے برسوں کے ہیں یا ان دور دراز کی ریاستوں کے ہیں جو ۱۹۴۷ء کی ملک کی تقسیم میں اس طرح راست متاثر نہیں ہوئیں جس طرح کہ ملک کا یہ حصہ متاثر ہوا ہے۔ ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ حالات کی پیش بینی یا پیش قیاسی وہ عدالتیں نہیں کر سکتی تھیں جنہوں نے یہ فیصلے دیئے جن کا حوالہ (بطور نظیر) دیا گیا ہے۔ ان نظائر میں ظاہر کئے گئے کسی خیال کا مقصد زیر تصفیہ مقدمہ کو طے کرتا تھا اور اس اظہار خیال کو اس کے اپنے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ عدالتیں ان غیر معمولی اور غیر متوقع حالات یا قانون ونظم کی صورتحال کی ابتری کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھیں جو ملک کی تقسیم کے بعد پیدا ہوئی...... یہ صحیح ہے کہ چند میتوں کی تدفین ایک قطعہ زمین کو قابل احترام بنا دیتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس نقطہ نظر کے اختیار کرنے میں اس حقیقت پر غور نہیں کیا گیا کہ اس زمین پر تعمیرات کھڑی ہو چکی ہیں۔ اس فیصلہ میں تعامل کے بارے میں یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ...... جب ایک فریق تعامل پر اس جائداد کے وقف ہونے کی شہادت کے طور پر اعتبار کر رہا ہے تو ہم کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہ تعامل ایک خاص وقت سے ترک ہو گیا تھا"۔

اس فیصلہ میں یہ بھی کہا گیا کہ:

......اگر زمین برسوں کے عرصہ پر پھیلے ہوئے تعامل سے ایک کردار اختیار کر لیتی ہے تو ایک خاص وقت پر اس تعامل کا ترک ایک وقت کی حیثیت میں اس زمین کے حرمت والے کردار کا ازالہ کر سکتا ہے جس سے گرام پنچایت کو دیہات کے موجودہ باشندگان کے فائدے کے لئے اپنی زمین قرار دینے کا جواز فراہم ہوتا ہے۔ اقلیتی فرقہ کی جانب سے اس کے استعمال کو ترک کر دینے کی وجہ سے اب زمین کا بحیثیت قبرستان انتظام ونگہداشت کرنے کے لئے کوئی نکتہ باقی نہیں رہا۔"

اس فیصلہ سے پیدا شدہ مشکلات پر وقف انکوائری کمیٹی نے غور کیا اور اس پیچیدگی کو ختم کرنے کی سفارش کی، چنانچہ ۱۹۸۴ء کے ترمیمی قانون کے ذریعہ ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا کہ:

"لیکن ایسے وقف کی نوعیت وقف محض اس سبب سے ختم نہ ہوگی کہ اس کا تعامل ختم ہو چکا ہے۔ بلا لحاظ مدت عدم تعامل"۔

۱۹۹۵ء کے قانون وقف میں بھی یہ صراحت موجود ہے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس صراحت سے پنجاب ہائیکورٹ کے فیصلہ کے اس جز کا قانونی اثر ختم ہو جائے گا کہ اکا دکا قبروں کی موجودگی کی شہادت قیام وقف کی واضح شہادت کی عدم موجودگی میں، وقف تعامل کو ثابت نہیں کرتی۔ جہاں ایک وسیع قطعہ زمین میں ایک قبر یہاں اور ایک قبر وہاں دور دور موجود ہوں، قبروں کا کسی جگہ جم گھٹا نہ ہو تو یہ قرائنی شہادت وقف تعامل کو ثابت نہیں کرتی۔ تاہم وقف تعامل کے بارے میں یہ وضاحت کہ بلا لحاظ مدت ترک تعامل، یہ وقف قرار پائیں گے، اور اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دفعہ (۱۰۷) کی رو سے کسی وقف کی ناقابل انتقال جائداد کا قبضہ لینے کے لئے، مقدمہ دائر کرنے کے لئے اب کسی مدت کی تحدید نہیں رہی۔ قانون تحدید معیاد کا اطلاق ختم کر دیا گیا ہے۔ پہلے یہ معیاد ۲۰ سال تھی جس کا شمار قبضہ مخالفانہ کی تاریخ سے ہوتا تھا، وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ کیا جاتا رہا۔ وقف انکوائری کمیٹی نے تحدید (Limitation) کے قانون سے اوقاف کو مستثنیٰ کرنے کی تجویز رکھی تھی کیونکہ ایسا استثناء بمبئی پبلک ٹرسٹ، ایکٹ بابت ۱۹۵۰ء میں دیا گیا ہے۔ ۱۹۹۵ء کے قانون میں ان دفعات کی موجودگی سے ان اوقاف کو واگذاشت کرانے اور ان کا قبضہ حاصل کرنے کے مواقع نکلتے ہیں جن کی پنجاب، ہریانہ اور مغربی یوپی میں ویرانی سے فائدہ اٹھا کر حکومت یا غیر مسلم قبضہ کر چکے ہیں یا اس طرح کا اندیشہ جن کے تعلق سے پیدا ہو چکا ہے، ان اوقاف سے متعلق سوال پر غور کے دوران ان نکات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

۴۔ وقف اراضی پر ترقیاتی تعمیر:

قانون وقف بابت ۱۹۹۵ء کی دفعہ (۳۲) ایک طویل دفعہ ہے جس کی کئی ذیلی دفعات اور ان میں شقیں ہیں۔ یہ دفعہ بورڈ کے اختیارات اور فرائض سے متعلق ہے۔ ذیلی دفعات (۴) تا (۶) اراضی وقف سے متعلق ہیں۔ ذیلی دفعہ (۴) میں کہا گیا ہے کہ جہاں وقف بورڈ مطمئن ہو کہ کسی وقف اراضی کو شاپنگ سنٹر، مارکٹ، رہائشی فلیٹس یا ایسی ہی کسی نوعیت میں ترقی دینے کے قابل عمل امکانات موجود ہیں تو متعلقہ وقف کے متولی پر ایک نوٹس کی تعمیل کر کے اس کو ایسی مدت کے اندر جس کا ذکر نوٹس میں کر دیا جائے اور جو (۶۰) دن سے کم نہ ہو، یہ جواب دینے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ آیا وہ نوٹس میں صراحت کردہ ترقیاتی کام کو انجام دینے پر راضی ہے۔ دفعہ (ن) میں ہے کہ اگر کوئی جواب وصول ہوا اور اس پر غور کرنے کے بعد بورڈ اس پر مطمئن ہو کہ متولی رضامند نہیں ہے یا اس کام کو روبہ عمل لانے کا اہل نہیں ہے تو حکومت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد بورڈ اس جائداد کو لے سکتا ہے، اس کی عمارت اور اس کی تعمیرات کو منہدم کر سکتا ہے اگر اس کی

رائے میں یہ انہدام ترقیاتی کام پر عمل آوری کے لئے ضروری ہو، اور اس ترقیاتی کام کو انجام دے سکتا ہو، اس کے لئے سرمایہ وقف فنڈ سے یا متعلقہ وقف کی جائدادوں کی ضمانت پر حاصل کیا جاسکتا ہے، ان جائدادوں پر بورڈ اپنا کنٹرول اور انتظام، اس پر کئے گئے اخراجات اور اس پر سود، ان تعمیرات کی نگہداشت کے اور دیگر جائز اخراجات کی اس جائداد کی آمدنی سے پابجائی ہونے تک رکھ سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ بورڈ متولی کو ہر سال، تحویل میں لینے سے پہلے کے تین سالوں کی آمدنی کی سالانہ اوسط کے حساب سے معاضہ ادا کرتا رہے۔ ذیلی دفعہ (۶) کہتا ہے کہ ترقی یافتہ جائداد کی آمدنی سے صراحت کردہ اخراجات کی پابجائی کے بعد یہ جائداد متولی کو منتقل کردی جائے گی۔

قانون وقف بابت ۱۹۹۵ء میں اس اضافہ کا مقصد وقف کی آمدنی میں اضافہ ہے، اس مقصد سے اتفاق کے باوجود بعض سوالات کا جواب تلاش کرنا ضروری ہے اور ان ہی جوابات کی روشنی میں قانون وقف کے اس جز کے بارے میں ملت کے موقف کو طے کرنا ہوگا، سوالات یہ ہیں:

الف) کیا وقف کو ترقی دینے کے لئے سود پر رقم حاصل کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟

ب) کیا اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ شاپنگ سنٹر، مارکٹ، رہائشی فلیٹس وغیرہ کے کرایہ دار اگر زیادہ تر غیر مسلم ہوں تو آئندہ کسی وقت وقف کے لئے مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔ اگر یہ نئی تعمیریں مسجد کے اطراف ہوں تو اذان پر اعتراضات کے علاوہ بھی کئی اور مشکلات پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اور ایسی مشکلات کو دور کرنے میں وقف بورڈ بھی بے بس ہوسکتا ہے، جبکہ قانون وقف اس کی اجازت دیتا ہے بورڈ کے کسی فیصلے کے چیف ایکزیکٹیو آفیسر اس عذر پر تعمیل نہ کرے اگر اس کے خیال میں ایسی تعمیل سے فساد یا نقض امن کا خطرہ ہے یا کسی انسانی جان، صحت وسلامتی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے (دفعہ ۲۶ (ج) شق iii) وقف بورڈ کے فیصلہ کی عدم تعمیل کے تعلق سے سیاسی اثر ونفوذ رکھنے والے ارکان اسمبلی یا دیگر سیاسی لیڈروں کے ذریعہ حکومت کی توثیق حاصل کرنا چیف ایکزیکٹیو آفیسر کے لئے مشکل نہیں ہے۔ اگر اس نوعیت کے اندیشے بے بنیاد نہیں ہیں تو کیا یہ شرط عائد کرنا ضروری نہ ہوگا کہ ان نئی تعمیروں کے کرایہ داروں کی اکثریت مسلمانوں کی ہو اور ان کو پابند کیا جائے کہ وہ کسی صورت کسی غیر مسلم کو اس کا قبضہ نہیں دیں گے۔

ج) قانون میں اس کی کوئی پابندی نہیں ہے، اس لئے کوئی وقف بورڈ، شاپنگ سنٹر یا مارکیٹ یا رہائشی فلیٹس تعمیر کر کے حق ملکیت کے ساتھ قیمت کی بالاقساط ادائیگی پر یا ایک مشت رقم کی ادائیگی پر دوکانیں اور رہائشی مکانات فروخت رک سکتا ہے۔ اس سے رقم تو حاصل ہوجائے گی، لیکن ایک ناقابل انتقال جائداد وقف ختم ہوجائیگی۔ کیا اس طرح کے عمل سے اوقاف کا اتلاف نہیں ہوگا؟

د) ۱۹۹۵ء کا نیا قانون بھی اوقاف کے حقیقی مفادات کو پیش نظر رکھنے والے افراد کو بورڈ کا رکن بنانے میں ناکام رہا۔ آندھرا پردیش کے تجربے سے واضح ہوگیا کہ کاغذی مسلم تنظیموں کے ذریعہ برسر اقتدار جماعت اپنے ارکان کو نامزد کرسکتی ہے، اور متولیوں کے زمرے سے بھی اپنے ارکان یا اپنی پسند کے افراد کو منتخب کرواسکتی ہے۔ اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ نئے قانون کے تحت بھی وقف بورڈ میں برسر اقتدار پارٹی سے تعلق رکھنے والے یا ان کے پسندیدہ سیاسی افراد کی اکثریت رہے گی، اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کئی فیصلے محض سیاسی مفادات کے تحت ہوں گے۔ آج کل شہر کی زمینوں پر کثیر منزلہ کمرشیل یا رہائشی کامپلیکس کی تعمیر دولت پیدا کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ جائدادوں کی ترقیات دینے والوں (Builders and Estate Developers) کے لئے سیاست کاروں اور علاقے کے غنڈوں اور دھونس بازوں کا تعاون لینا ضروری ہوتا ہے، اس دھندے میں سیاست کار بھی شریک ہوتے ہیں اور اس پورے گروہ کی نظریں شہر کی خالی جائدادوں پر چیل کی طرح لگی ہوتی ہیں۔ ایسی صورتحال میں اگر وقف بورڈ کے اختیارات پر کوئی پابندی عائد نہ کی گئی تو خالی زمینوں پر ان ترقیات کا مقصد مفاد وقف نہیں بلکہ سیاسی مفاد ہوگا۔

ھ) تقریباً ہر شہر میں عام آبادی کے ساتھ مسلمانوں کی آبادی میں بھی اضافہ ہورہا ہے جس کی وجہ سے قدیم مسجدیں ناکافی ثابت ہورہی ہیں، یا اب کافی ہیں تو امکان یہ ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ناکافی محسوس ہوں۔ ایسی ہی کیفیت دیگر اوقاف کے بارے میں پیدا ہوسکتی ہے، اس کیفیت میں وقف کا مفاد اس میں ہوگا کہ اس خالی اراضی کو آئندہ توسیع کیلئے خالی رکھا جائے، اس صورت میں متولی کا انکار واجب ہوگا۔ "ہر متولی کو بددیانت اور خائن قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن قانون وقف ۱۹۹۵ء کے اکثر نکات کے پیچھے یہی ذہن کارفرما نظر آتا ہے کہ ہر متولی خائن اور بددیانت ہے"۔ اس لئے وقف بورڈ کو ہر صورت میں متولی کے انکار پر اوقاف کو اپنی تحویل میں لینے کا حق واختیار حاصل نہیں ہونا چاہئے۔

مختصر یہ کہ ۱۹۹۵ء کے قانون میں وقف بورڈ کے اختیارات ترقیاتی تعمیرات سے متعلق پہلو غور طلب ہے۔

۵۔غیر درج فہرست اوقاف:

قانون وقف بابت ۱۹۹۵ء میں اوقاف کے رجسٹریشن کو لازمی قرار دیا گیا اس کی ذمہ داری متولی پر عائد کی گئی (دفعہ ۳۶)، لیکن جو اوقاف رجسٹرڈ نہ ہوں ان کو اس قانون نے تمام حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ دفعہ (۸۷) میں کہا گیا ہے کہ جو وقف رجسٹرڈ نہ ہوں اس کے کسی حق کے استقرار اور نفاذ کے لئے کوئی دعویٰ، کوئی مرافعہ، کوئی قانونی ادعاء، کسی عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکے گا۔

یہ دفعہ ان اوقاف کے لئے مضر اور نقصان دہ ہے جو وقف تعامل یا وقف بالاستعمال ہیں اور جن کا کوئی متولی یا سجادہ یا مجاور نہیں ہے۔ ایسے اوقاف بھی کافی تعداد میں ہیں۔ اس دفعہ میں ترمیم کی تجویز آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے پیش کی گئی تھی اور اس پر نمائندگیاں کی جاتی رہی ہیں۔ اس کے نقصان سے بچنے کی ایک شکل یہ ہے کہ عوام اور ایسے اوقاف کی خدمت کرنے والوں سے اپیل کی جائے کہ وہ ہر وقف کو درج رجسٹر کروائیں۔ درج رجسٹر کرنے کی درخواست ہر وہ شخص جو مسجد میں نماز پڑھتا ہو، عاشور خانہ یا امام باڑے میں عزاداری کے لئے جاتا ہو، درگاہ پر فاتحہ خوانی یا گل افشانی کرتا ہے غرض یہ کہ جو بھی مستفیدلہ (Beneficiary) کی تعریف میں آ سکتا ہے دے سکتا ہے۔

اس تحریر میں قانون وقف بابت ۱۹۹۵ء کے ان نکات کا جائزہ لیا گیا ہے جن سے اس فقہی سمینار میں زیر بحث سوالات پر غور کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس قانون میں کئی اور مفید و مضر دونوں طرح کے پہلو ہیں ان کو اس تحریر میں زیر بحث نہیں لایا گیا ہے۔

قانون وقف بابت ۱۹۹۵ء کا ایک خاکہ

باب (۱)

مراتب ابتدائی

دفعہ۔۱	مختصر نام، وسعت اور تاریخ نفاذ
”۔۲	قانون کا اطلاق
”۔۳	تعریفات۔ اس دفعہ میں اصطلاحات کے علاوہ ان الفاظ کی تعریف شامل ہے جو اپنے مخصوص معنی میں استعمال کئے گئے ہیں۔ جیسے مستفیدلہ، متولی، وقف میں مفاد رکھنے والا شخص، وقف تعامل، وقف علی الاولاد۔

باب (۲)

اوقاف کا سروے

دفعہ۔۴	اوقاف کا ابتدائی سروے
”۔۵	فہرست اوقاف کی اشاعت
”۔۶	اوقاف کی نسبت نزاعات
”۔۷	اوقاف کی نسبت نزاعات طے کرنے کے ٹریبونل کے اختیارات
”۔۸	سروے کے اخراجات کی وصولی

باب (۳)

مرکزی وقف کونسل

دفعہ۔۹	مرکزی وقف کونسل کا قیام اور اس کا دستور

"۔۱۰ کونسل کا مالیہ

"۔۱۱ حسابات اور تنقیح

"۔۱۲ قواعد بنانے کا مرکزی حکومت کا اختیار

باب (۴)

بورڈ کا قیام اور اس کے فرائض

دفعہ۔۱۳ تشکیل

"۔۱۴ بورڈ کی ترکیب

"۔۱۵ عہدہ کی میعاد

"۔۱۶ بورڈ کے رکن کی حیثیت سے تقرر کئے جانے یا برقرار رہنے کی نااہلیت

"۔۱۷ بورڈ کے اجلاس

"۔۱۸ بورڈ کی کمیٹیاں

"۔۱۹ صدرنشیں اور ارکان کا استعفی

"۔۲۰ صدرنشین اور ارکان کی علیحدگی

"۔۲۱ خالی جگہ کا پر کرنا

"۔۲۲ خالی جگہیں وغیرہ۔۔۔۔بورڈ کی کاروائیوں کا بے ضابطہ قرار نہ پانا

"۔۲۳ چیف ایگزیکٹیو آفیسر کا تقرر اور اس کے عہدہ کی معیاد اور خدمت کے دیگر شرائط

"۔۲۴ بورڈ کے عہدیدار اور دیگر ملازمین

"۔۲۵ چیف ایگزیکٹیو آفیسر کے فرائض واختیارات

"۔۲۶ بورڈ کے احکام یا قراردادوں کے بارے میں چیف ایگزیکٹیو آفیسر کے اختیارات

"۔۲۷ بورڈ کی جانب سے تفویض اختیارات

"۔۲۸ چیف ایگزیکٹیو کا کلکٹر کی وساطت سے اختیارات کا استعمال کرنا وغیرہ

"۔۲۹ ریکارڈ، رجسٹر وغیرہ کے معائنہ کے چیف ایگزیکٹیو آفیسر کے اختیارات

"۔۳۰ ریکارڈ کا معائنہ

"۔۳۱ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے عدم قابلیت کا انسداد

"۔۳۲ بورڈ کے اختیارات وفرائض

"۔۳۳ چیف ایگزیکٹیو آفیسر کی یا اس کے مجاز کردہ اشخاص کی جانب سے معائنہ کے اختیارات

" ۔ ۳۴ دفعہ ۳۳ کے تحت متعینہ رقم کی وصولیابی

" ۔ ۳۵ ٹریبونل کی جانب سے مشروط قرقی

باب (۵)

اوقاف کی رجسٹری

دفعہ ۔ ۳۶ رجسٹری

" ۔ ۳۷ اوقاف کا رجسٹر (کتاب الاوقاف)

" ۔ ۳۸ ایگزیکٹیو آفیسر کے تقرر کا بورڈ کو اختیار

" ۔ ۳۹ ان اوقاف کی نسبت بورڈ کے اختیارات جن کا وجود ختم ہو چکا ہے۔

" ۔ ۴۰ اس امر کا فیصلہ کہ کوئی جائداد موقوفہ جائداد ہے۔

" ۔ ۴۱ وقف کی رجسٹری کرنے اور (اوقاف کے) رجسٹر میں ترمیم کا اختیار

" ۔ ۴۲ اوقاف کے انتظامیہ میں تبدیلی کی اطلاع

" ۔ ۴۳ قانون ہذا کے آغاز کی تاریخ سے قبل درج رجسٹر اوقاف درج رجسٹر متصور ہوں گے۔

باب (۶)

اوقاف کے حسابات کا رکھنا

دفعہ ۔ ۴۴ میزانیہ (بجٹ)

" ۔ ۴۵ بورڈ کے راست زیر انتظام اوقاف کے میزانیہ کی تیاری

" ۔ ۴۶ اوقاف کے حسابات پیش کرنا

" ۔ ۴۷ اوقاف کے حسابات کی تنقیح

" ۔ ۴۸ تنقیح ساز (آڈیٹر) کی رپورٹ پر بورڈ احکام صادر کرے گا۔

" ۔ ۴۹ مصدقہ وصول طلب رقم مثل بقایا زر مالگزاری اراضی قابل وصول۔

" ۔ ۵۰ متولی کے فرائض

" ۔ ۵۱ بورڈ کی منظوری کے بغیر موقوفہ کی جائداد کی منتقلی کا کالعدم قرار پانا

" ۔ ۵۲ دفعہ ۵۱ کی خلاف ورزی میں منتقل کی ہوئی موقوفہ جائداد کی بازیابی

" ۔ ۵۳ وقف کی جانب سے جائداد کی خرید پر پابندی

دفعہ ۔ ۵۴ موقوفہ جائداد سے غاصبانہ قبضہ ہٹانا

" ۔ ۵۵ دفعہ نمبر ۵۴ کے تحت صادر احکام کا نفاذ

"۔۵۶ موقوفہ جائداد کو نزول (لیز) پر دینے پر پابندی

"۔۵۷ جائداد موقوفہ کی آمدنی سے بعض اخراجات کی ادائیگی کا متولی کو اختیار

"۔۵۸ متولی کے ادانہ کرنے کی صورت میں بقایا ادا کرنے کا بورڈ کو اختیار

"۔۵۹ محفوظ فنڈ (ریزروفنڈ) کا قیام

"۔۶۰ مدت میں توسیع

"۔۶۱ سزائیں

"۔۶۲ متولی اپنی ذات کی مدافعت کے لئے وقف کی کسی رقم کو خرچ نہ کرے۔

"۔۶۳ بعض صورتوں میں متولیوں کے تقرر کا اختیار

"۔۶۴ متولی کی علیحدگی

"۔۶۵ بورڈ کی جانب سے بعض اوقاف کے راست انتظام کی ذمہ داری

"۔۶۶ متولی کے تقرر اور علیحدگی کے اختیارات ریاستی حکومت کی جانب سے کب استعمال ہوں

"۔۶۷ انتظامی کمیٹی پر نگرانی اور ان کی منسوخی

"۔۶۸ ریکارڈ وغیرہ کا قبضہ دینے کا متولی یا کمیٹی کا فرض

"۔۶۹ وقف کے نظم و نسق کے لئے اسکیم مرتب کرنے کا بورڈ کو اختیار

"۔۷۰ وقف کے نظم و نسق سے متعلق تحقیقات

"۔۷۱ تحقیقات منعقد کرنے کا طریقہ

باب (۷)

بورڈ کا مالیہ

دفعہ۔۷۲ بورڈ کو واجب الادا سالانہ حصہ رسیدی

"۔۷۳ بینکوں اور دیگر اشخاص کو ادائیگی کرنے کی ہدایت دینے کا چیف ایکزیکیٹو آفیسر کو اختیار

"۔۷۴ وقف کو قابل ادائیگی دوامی سالیانہ سے حصہ رسیدی کی منہائی

"۔۷۵ قرض لینے کا بورڈ کو اختیار

دفعہ۔۷۶ بغیر منظوری متولی نہ قرض لے نہ قرض دے

"۔۷۷ وقف فنڈ

"۔۷۸ بورڈ کا میزانیہ (بجٹ)

"۔۷۹ بورڈ کے حسابات

”۔۸۰ بورڈ کے حسابات کی تنقیح

”۔۸۱ تنقیح ساز (آڈیٹر) کی رپورٹ پر ریاستی حکومت کا احکام صادر کرنا

”۔۸۲ بورڈ کو وصولی طلب رقم کی مثل بقایا زر مالگزاری اراضی وصول

باب (۸)

عدالتی کارروائیاں

دفعہ۔۸۳ ٹریبونل وغیرہ کی تشکیل

”۔۸۴ ٹریبونل کا تیزی سے کارروائی چلانا اور فریقین کو اپنے فیصلے کی نقلیں فراہم کرنا۔

”۔۸۵ دیوانی عدالتوں کے دائرہ اختیار پر امتناع

”۔۸۶ بعض کیسوں میں ریسیور کا تقرر

”۔۸۷ غیر درج رجسٹر اوقاف کی جانب سے حق کے نفاذ پر امتناع

”۔۸۸ کسی نوٹیفیکیشن وغیرہ کے جواز کو چیلنج کرنے پر روک

”۔۸۹ بورڈ کے خلاف مقدمہ کی فریقین کی جانب سے نوٹس

”۔۹۰ مقدموں وغیرہ کی نوٹس عدالتوں کی جانب سے

”۔۹۱ لینڈ اکویزیشن ایکٹ ۱۹۸۴ء کے تحت کارروائیاں

”۔۹۲ مقدمہ یا کارروائی میں بورڈ کا فریق بننا

”۔۹۳ متولی کے یا اس کے خلاف مقدمہ میں مصالحت پر امتناع

”۔۹۴ فرائض کی انجام دہی میں متولی کی ناکامی کی صورت میں ٹریبونل میں درخواست گذاری کا اختیار

”۔۹۵ متعینہ مدت کے ختم ہونے کے بعد مرافعہ (اپیل) کو (مہلت) کے لئے قبول کرنے کا مقتدر ادارہ مرافعہ کو اختیار

باب (۹)

متفرقات

دفعہ۔۹۶ اوقاف کی سیکولر سرگرمیوں کو باقاعدہ بنانے کا مرکزی حکومت کو اختیار

”۔۹۷ ریاستی حکومت کی ہدایت

”۔۹۸ ریاستی حکومت کی سالانہ رپورٹ

”۔۹۹ بورڈ کی معزولی کا اختیار

”۔۱۰۰ نیک نیتی سے کی گئی کاروائی کا تحفظ

”۔۱۰۱ سروے کمشنر، بورڈ کے ارکان وعہدیداروں کا سرکاری ملازم متصور ہونا

”۔۱۰۲ بعض بورڈ کی دوبارہ تنظیم کے لئے خصوصی قانونی گنجائش

”۔۱۰۳ کسی ریاست کے حصہ کے لئے بورڈ کے قیام کے لئے خصوصی قانونی گنجائش

”۔۱۰۴ اسلام کو نہ ماننے والے اشخاص کی جانب سے اوقاف کی مدد کے لئے دیئے ہوئے یا عطا کئے ہوئے جائدادوں پر قانون کا اطلاق

”۔۱۰۵ دستاویزات کی نقلیں وغیرہ فراہم کرنے کا حکم دینے کا بورڈ اور چیف ایکزیکٹیو آفیسر کو اختیارات

”۔۱۰۶ مشترکہ بورڈ کی تشکیل کا مرکزی حکومت کو اختیار۔

”۔۱۰۷ موقوفہ جائدادوں کی بازیابی کے لئے قانون ۳۶ بابت ۱۹۶۳ء کا عدم اطلاق

”۔۱۰۸ تخلیہ کنندگان کی موقوفہ جائدادوں کی نسبت خصوصی قانونی گنجائش

”۔۱۰۹ قواعد بنانے کا اختیار

”۔۱۱۰ بورڈ کی جانب سے ضابطہ بنانے کا اختیار

”۔۱۱۱ قواعد وضوابط کو ریاستی قانون سازیہ (لیجسلیچر) کے آگے پیش کرنا۔

”۔۱۱۲ تنقیح وتحفظ

”۔۱۱۳ مشکلات کو دور کرنے کا اختیار

☆☆☆

ہندوستان میں وقف بورڈس کا نظام۔ ایک رپورٹ

جناب سالار محمد خان[1]

ہندوستان میں اوقاف کا انتظام اور دیکھ بھال مختلف وقف قوانین کے مطابق صوبائی سطح پر وقف بورڈ کے ذریعہ عمل میں لایا جارہا ہے، حکومت ہند نے وقف ایکٹ ۱۹۹۵ کے ذریعہ اوقاف کے انتظام میں یکسانیت لانے کی کوشش کی ہے لیکن اب تک کئی صوبوں میں ۱۹۹۵ کے ایکٹ کو نافذ نہیں کیا گیا ہے۔ نتیجہ میں بیشتر صوبوں میں وقف ایکٹ ۱۹۸۴ء کے تحت اوقاف کا انتظام اور دیکھ بھال کیا جارہا ہے، درج ذیل وقف بورڈس یہ کام انجام دے رہے ہیں:

۱۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ وقف بورڈ	۲۔ آسام بورڈ آف وقف	۳۔ بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ
۴۔ کرناٹک بورڈ آف وقف	۵۔ کیرالہ بورڈ آف وقف	۶۔ کچھ وقف بورڈ
۷۔ مدھیہ پردیش وقف بورڈ	۸۔ منی پور وقف بورڈ	۹۔ مراٹھواڑا وقف بورڈ
۱۰۔ اڑیسہ وقف بورڈ	۱۱۔ پنجاب وقف بورڈ	۱۲۔ راجستھان وقف بورڈ
۱۳۔ تمل ناڈو وقف بورڈ	۱۴۔ تری پورہ وقف بورڈ	۱۵۔ دہلی وقف بورڈ
۱۶۔ انڈمان نکوبار وقف بورڈ	۱۷۔ دادرہ اور نگر حویلی وقف بورڈ	۱۸۔ لکشدیپ وقف بورڈ
۱۹۔ پانڈیچری وقف بورڈ	۲۰۔ یوپی سنی سینٹرل بورڈ آف وقف	۲۱۔ بورڈ آف ویسٹ بنگال

اس کے علاوہ کچھ صوبوں میں الگ شیعہ وقف بورڈ ہیں۔

اوقاف کے انتظام اور دیکھ بھال اور فروغ (Development) کے راستہ میں متعدد رکاوٹیں ہیں، ان میں سب سے سنگین ترین مسئلہ اوقاف کی جائداد پر ناجائز قبضوں کا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں انٹر اسٹیٹ وقف کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اس وقت کے مرکزی وزیر برائے آبپاشی بجلی اور اوقاف جناب حافظ محمد ابراہیم نے کہا تھا: ''وقف سے متعلق آج کے سنگین مسائل میں سب سے مشکل اور پیچیدہ مسئلہ جائداد اوقاف پر غاصبانہ قبضہ ہے، یہ بھی تقسیم ملک کے نتائج میں ایک ہے جس کی وجہ سے متعدد افراد اوقاف کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے یا جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ ایسی متعدد جائداد کسٹوڈین کے قبضہ میں چلی گئی۔ حالانکہ اب عبادت گاہ اور دوسرے مقدس مقامات وقف بورڈ کے حوالہ کئے جارہے ہیں۔ لیکن اب بھی متعدد ایسی جائدادیں ہیں جو غیر قانونی قبضہ میں ہیں اور جنہیں حاصل کرنے کے لئے مقدمہ بازی ناگزیر ہے۔'' (۱)

تقریباً ۳۰ سال بعد بھی درج بالا جملے کم وبیش صادق سمجھے جاسکتے ہیں۔ نہ صرف ملک کی تقسیم کی وجہ سے اوقاف کی جائداد پر غاصبانہ قبضے ہوئے بلکہ مختلف دوسری وجوہات کی بنا پر اس طرح کے قبضے ہوئے ہیں، اور اب بھی یہ عمل جاری ہے۔ اس کی وجوہات میں اوقاف کی جائدادوں کا آبادی کے درمیان آجانا، زمین کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ، اوقاف کی دیکھ بھال کے لئے درکار وسائل کی کمی، اور متولیان کی بددیانتی اہم ترین ہیں۔

ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش، اور مرکز کے زیر انتظام علاقہ چنڈی گڈھ میں ۳۵۵۸۹ جائداد اوقاف ہیں (۲)۔ دراصل اس علاقہ سے تقسیم ہند کے وقت بڑی تعداد میں مسلمانوں نے پاکستان ہجرت کی تھی جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں جائداد اوقاف ناجائز قبضوں میں چلے گئے۔ متعدد

[1] ایڈوکیٹ، دہلی۔

اوقاف کو بشمول مساجد کو رہائش گاہوں، گرودواروں، گوداموں میں تبدیل کردیا گیا، مثلاً ہریانہ کے انبالہ ضلع میں ۹۱ مساجد ہیں۔لیکن ان میں سے صرف ۸ مساجد پنجاب وقف بورڈ کے پاس ہیں، باقی تمام مساجد ناجائز قبضہ میں ہیں (۳)۔حالات کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹٦۵ء کے سروے کے مطابق ہریانہ پنجاب، ہماچل پردیش، اور چنڈی گڈھ میں ۳۴۲۲۳ وقف کی جائدادیں تھیں اور پنجاب وقف بورڈ کے مطابق یہ سروے قابل اطمینان نہیں تھا۔اور تقریباً ۴۰ فیصد اوقافی جائدادوں کو اس سروے میں شامل نہیں کیا گیا۔اس کے علاوہ سروے میں جن جائداد کو اوقاف کی جائداد تسلیم کیا گیا تھا ان میں سے اب تک ۴۰ فیصد ایسی ہیں جو کہ پنجاب وقف بورڈ کے زیر انتظام ہیں۔تقریباً ۳۰ فیصد اوقافی جائدادیں حکومتی اداروں، پرائیویٹ اداروں اور دیگر افراد کے قبضے میں ہیں۔ جبکہ ۲۰ فیصد جائداد اوقاف ان صوبوں کے کسٹوڈین اور (Rehabilitation departments) نے فروخت کردئے ہیں ان صوبوں میں ۵۸۸ اوقافی جائدادیں حکومت کے ناجائز قبضوں میں ہیں، اس وقت پنجاب وقف بورڈ تقریباً ۱۴۳٦۲ مقدموں میں الجھا ہوا ہے۔جس میں غاصبانہ قبضوں کو ہٹانا، جائداد سے غیر قانونی غاصبین کا انخلاء، اور کرایہ کی وصولی شامل ہیں (۴)۔

اترپردیش سنی وقف بورڈ کے زیرنگرانی تقریباً ٦ ہزار اوقاف ہیں۔اس صوبے میں بھی اوقاف کی جائداد پر ناجائز قبضوں کا مسئلہ سب سے سنگین ہے۔بورڈ کی رپورٹ کے مطابق وقف کی جائداد پر ناجائز قبضوں کی شکایتیں تقریباً روزانہ موصول ہوتی ہیں۔اس وقت الٰہ آباد ہائی کورٹ کی الٰہ آباد بنچ کے زیر سماعت ۲۱۸ مقدمے ہیں، جبکہ لکھنؤ بنچ کے زیر سماعت ۸۸ مقدمے ہیں، مختلف ضلعی عدالتوں میں ۵۳۲ مقدمے اور دیوانی عدالتوں میں ۸۵۵ اور منصف کی عدالتوں میں ۱۰۹۸ مقدمے زیر سماعت ہیں (۵)۔

دہلی میں وقف کمشنر کے سروے کے مطابق ۱۹۵۷ اوقاف کی جائدادیں ہیں، ان میں سے ۱۰۴٦ دہلی وقف بورڈ کے زیر انتظام ہیں۔دہلی وقف بورڈ کے مطابق دہلی میں اوقاف کا ایک بڑا مسئلہ اوقاف کی جائداد، قبرستانوں، خانقاہوں، مساجد اور دیگر جائداد پر غاصبانہ قبضہ ہے (٦)، دہلی میں اوقاف کی جائداد سے متعلق مسئلہ ایک منفرد مسئلہ ہے۔انگریز حکومت کے خلاف مسلمانوں کی پہلی جنگ آزادی میں سرگرمی سے شرکت کی وجہ سے سزا کے طور پر جائدادوں کو انگریز حکومت نے زبردستی قبضہ کرلیا تھا۔جن میں متعدد اوقافی جائدادیں بھی شامل ہیں، اس مسئلہ کے حل کے لئے ۲۳ رمئی ۱۹۵٦ کو ایس ایم ایچ برنی کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔اس کمیٹی نے ۲۰۴ ایسی جائدادوں کی نشاندہی کی جن کے متعلق سرکاری محکموں اور دہلی وقف بورڈ کے درمیان مقدمے چل رہے تھے، ان میں سے ۱۲۳ جائدادیں دہلی وقف بورڈ کو منتقل کرنے کی سفارش کی گئی، جس کے نتیجے میں ۱۹۸۴ء میں یہ دہلی وقف بورڈ کو (Lease) پر منتقل کردئے گئے، لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ ان جائدادوں کی اصل ملکیت قانونی طور پر حکومت کے پاس رہے گی (۷)۔اس کے علاوہ مختلف اوقاف بشمول مساجد دیگر افراد کے غاصبانہ قبضوں میں ہیں، اور زمین کی قیمتوں میں اضافہ اور آبادی بڑھنے کی وجہ سے اوقاف کی جائداد پر قبضوں کا عمل جاری ہے۔

مدھیہ پردیش میں اوقاف کی زمینوں پر ناجائز قبضوں کا مسئلہ کافی سنگین ہے، مدھیہ پردیش وقف بورڈ کے چیرمین ڈاکٹر نظام الدین صاحب کے مطابق اس صوبہ میں تقریباً ۷۵ فیصد اوقاف کی زمینیں سرکاری قبضوں میں ہیں (۸)۔ان کے علاوہ متعدد افراد نے بھی اوقاف کی جائداد پر ناجائز قبضے کرلئے ہیں۔ایسی جائداد میں بھوپال شہر میں (Capital Hotel) کے پیچھے ایک بڑا قبرستان بھی شامل ہے، اس قبرستان پر ایک بلڈر نے (oprative society_Co) کی آڑ میں کئی منزل کا شوپنگ کمپلیکس بنانا شروع کردیا ہے۔اس قبرستان کو بچانے کے لئے مقامی مسلمانوں کی طرف سے کوشش کی جارہی ہے لیکن ہائی کورٹ تک جانے کے باوجود کوئی قابل غور کامیابی نہیں مل سکی (۹)۔مدھیہ پردیش میں اوقافی جائدادوں کی کل تعداد پندرہ ہزار ایک سو پچاس ہے، جن میں سے چودہ ہزار سات سو اکتالیس سنی اور چار سو شیعہ اوقاف ہیں (۱۰)۔صوبہ میں اوقاف کی جائدادوں پر ناجائز قبضوں یا مقدموں کے متعلق کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔کیونکہ اوقاف کے مسائل پر تمام تر مقدمے مقامی مسلمان یا متولین اپنے طور پر لڑتے ہیں، اس ضمن میں ایک اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ مدھیہ پردیش وقف بورڈ نے صوبے میں ۷۵ فیصد اوقاف کی زمین حکومتی یا نیم حکومتی اداروں کے قبضے میں چلے جانے کے باوجود اس معاملہ میں کسی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش نہیں کیا ہے، جس کی وجہ سے ایسی تمام جائدادیں مکمل طور پر حکومت کے قبضہ میں چلے جانے کا خدشہ ہے (۱۱)۔

آندھرا پردیش میں اوقاف کی دیکھ بھال آندھرا پردیش وقف بورڈ کے ذریعہ عمل میں لایا جاتا ہے۔آندھرا پردیش میں اوقافی جائدادوں کی کل

تعداد تقریباً ۵ ۳ ہزار سات سونوے ہے۔ جن کی زمین کا رقبہ ایک لاکھ ۳۳ ہزار ایکڑ ہے (۱۲)۔ ناجائز قبضوں میں چلے گئے اوقاف اور ان سے متعلق مقدموں کے بارے میں وقف بورڈ نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ چند اوقاف کے بارے میں مقامی طور پر کچھ شکایتیں موصول ہوئی ہیں جن کے مطابق ان اوقاف کی جائداد متولین غیر قانونی طور پر فروخت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی جائدادیں حکومت کے اداروں کے قبضوں میں ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق پچاس ایسی جائدادیں ہیں جن کے بارے میں وقف بورڈ اور حکومت کے اداروں کے درمیان مقدمے چل رہے ہیں۔

اڑیسہ میں اوقاف کی دیکھ بھال صوبائی وقف بورڈ کے زیر اہتمام ہے، اس صوبے میں تین ہزار چھ سوبیس اوقافی جائدادیں ہیں۔ وقف بورڈ کی اطلاع کے مطابق صوبہ میں پندرہ اوقافی جائدادوں پر ناجائز قبضہ ہو چکا ہے (۱۳)۔

آسام میں صرف ٦٧ اوقافی جائدادیں ہیں جن میں سے تین جائدادوں پر ناجائز قبضے ہو چکے ہیں۔ صوبے میں صرف سات اوقاف کی آمدنی پچاس ہزار سالانہ سے زائد ہے (۱۴)۔

بہار میں سنی اوقاف کی دیکھ بھال بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ کرتا ہے، اس صوبے میں آج تک اوقاف کی جائداد کا سروے نہیں کیا گیا ہے۔ بحر حال اس وقت صوبے میں ۲۲۸۰ اوقافی جائدادیں سنی وقف بورڈ میں رجسٹرڈ ہیں۔ اس صوبے میں تین اوقاف صوبائی سنی وقف بورڈ کے انتظام میں ہیں۔ اس صوبے میں چار اوقاف پر ناجائز قبضے کی اطلاع صوبائی سنی وقف بورڈ کے دفتر سے ملی، ان میں سے ایک صوبائی بورڈ کے سیدھے انتظام میں تھا۔ اس صوبے میں ۱۳۵۱ اوقافی جائدادیں شہری علاقوں میں ہیں جہاں ناجائز قبضوں کو روک پانا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ کئی اوقاف کے مقدمے مختلف عدالتوں میں زیر غور ہیں (۱۵)۔

مغربی بنگال میں اوقاف کی دیکھ بھال صوبائی وقف بورڈ کرتا ہے۔ اس صوبے میں اب تک اوقاف کا سروے نہیں کیا گیا ہے۔ حال ہی میں یہ سروے شروع کیا گیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس صوبے میں تقریباً ۸۰۰ اوقاف کی جائدادیں شہری علاقوں میں ہیں۔ اس صوبے کے وقف بورڈ کے پاس ناجائز قبضوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ہے۔ حالانکہ وقف بورڈ یہ اعتراف کرتا ہے کہ صوبے میں اوقاف کی جائدادوں کا ناجائز قبضہ ہوا ہے۔ صوبے میں ۵۴ ایسی جائدادیں ہیں جنہیں غیر قانونی طور پر مختلف افراد کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اوقاف کی ۲۸ جائدادیں دوسری جائدادوں سے ادلا بدلی کی گئی ہیں جس سے ایک اندازہ کے مطابق ۱۵ کروڑ روپے سے زیادہ کا نقصان ہوا ہے، ان میں سے زیادہ تر جائدادیں کلکتہ اور ہوڑہ شہر کی ہیں (١٦)۔

کرناٹک میں اوقاف کی دیکھ بھال کرناٹک وقف بورڈ کے زیر انتظام ہے، کرناٹک میں تقریباً ۲۲ ہزار وقف کی جائدادیں ہیں (۱۷) پوری کوشش کے باوجود کرناٹک وقف بورڈ سے ان اوقاف کے متعلق اطلاعات حاصل نہیں کی جاسکی ہیں، لیکن دوسرے ذرائع سے موصول اطلاعات کے مطابق اس صوبے میں بھی اوقاف کی جائداد پر ناجائز قبضوں کا عمل جاری ہے، اطلاعات کے مطابق صرف چتر درگ ضلع میں ۱۲ اوقاف کی جائداد کو غیر قانونی قبضہ میں کر لیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ غاصبین حکومت کے ادارے ہیں، جبکہ مختلف افراد بھی یہ قبضے کرنے میں شامل ہیں (۱۸)۔

کسی بھی جائداد کی دیکھ بھال، انتظام اور ترقی کے لئے مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، وسائل کی کمی کی وجہ سے نہ تو اطمینان بخش دیکھ بھال ہو سکتی ہے اور نہ ترقی۔ ہندوستان میں اوقاف کے انتظام اور ترقی میں دوسرا بڑا مسئلہ وسائل کی قلت کا ہے۔ اوقاف کی آمدنی کے ذرائع کافی محدود ہیں، عام طور پر اوقاف کی واحد آمدنی کا ذریعہ جائداد کا کرایہ ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ اوقاف ہیں، ان میں سے بیشتر اوقاف کی کوئی آمدنی نہیں ہے۔ عام طور پر اوقاف کی دیکھ بھال اور انتظام کا کام مقامی طور پر متولین یا مقامی طور پر تشکیل شدہ کمیٹیاں انجام دیتی ہیں۔ مختلف وقف قوانین کے تحت تشکیل شدہ وقف بورڈ اپنے دائرۂ اختیار میں موجود اوقاف کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وقف بورڈ کچھ مخصوص حالات میں اوقاف کا براہ راست انتظام کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ وقف بورڈ کی آمدنی کے دو اہم ذرائع ہیں۔ ایک ان کے براہ راست انتظام میں موجود اوقاف کی جائداد کو کرایہ پر دینے سے ہونے والی آمدنی، اور دوسرا ان کے دائرۂ اختیار میں موجود ۵ ہزار سالانہ سے زائد آمدنی والے اوقاف سے چھ فیصد سالانہ کی در سے وصولی کیا جانے والا (Contribution) ہے، اس کے علاوہ سنٹرل وقف کونسل مختلف ترقیاتی منصوبوں کے لئے وقف بورڈ کو قرض دیتی ہے۔ سینٹرل وقف کونسل کی آمدنی کا ذریعہ صوبائی وقف بورڈ سے حاصل کردہ ان کی آمدنی کا ایک فیصد (Contribution) اور

مرکزی حکومت سے ملنے والی امداد ہوتا ہے۔

ہندوستان میں پنجاب وقف بورڈ کے براہ راست انتظام میں تقریباً پندرہ ہزار اوقاف ہیں۔ ملک کے کسی دوسرے وقف بورڈ کے براہ راست زیر انتظام میں اتنی بڑی تعداد میں اوقاف نہیں ہیں۔ پنجاب وقف بورڈ کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ان جائداد اوقاف سے ملنے والا کرایہ ہے۔ ۱۹۹۵/۹۶ کے مالی سال کے دوران اس وقف بورڈ کی آمدنی اس ذریعہ سے تقریباً چھ کروڑ روپے تھی، جب کہ مختلف اوقاف سے حاصل ہونے والے چھ فیصد سالانہ (Contribution) سے تقریباً ۴۲ لاکھ روپے حاصل ہوئے۔ پنجاب وقف بورڈ ہندوستان کا سب سے دولت مند وقف بورڈ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس وقف بورڈ کی یہ آمدنی پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش، اور چنڈی گڈھ میں موجود اربوں روپے کی جائداد اوقاف کو دیکھتے ہوئے کافی کم ہے (۱۹)۔

دہلی وقف بورڈ کے براہ راست زیر انتظام ایک ہزار ۴۶ جائدادیں ہیں اتنی بڑی تعداد میں جائداد ہونے کے باوجود ۱۹۹۴/۹۵ کے دوران دہلی وقف بورڈ کی آمدنی صرف ۶۱ لاکھ روپے تھی (۲۰)۔ اور مقامی متولین کے زیر انتظام اوقاف مین صرف چار اوقاف ایسے ہیں جن کی آمدنی ۵۰ ہزار سالانہ سے زائد ہے، دہلی وقف بورڈ کی اتنی کم آمدنی ہونے کی ایک بڑی وجہ جائداد کا کرایہ معمولی ہونا اور جائداد پر ناجائز قبضے ہونا ہے، دہلی وقف بورڈ کرائے پر دی گئی جائدادوں کا کرایہ بھی پوری طرح وصول نہیں کر پاتا ہے (۲۱)۔

بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ کی آمدنی ۱۹۹۵/۹۶ کے مالی سال کے دوران تقریباً ۱۶ لاکھ روپے تھی جس میں سے اس کی اپنی آمدنی تقریباً ساڑھے چھ لاکھ روپئے تھی، جب کہ ۱۰ لاکھ روپئے حکومت کی طرف سے امداد کے طور پر ملا، ۱۹۹۶/۹۷ کے مالی سال کے دوران اس وقف بورڈ کی اپنی آمدنی تقریباً ۵ لاکھ ۷۰ ہزار روپئے جو گذشتہ مالی سال سے ۵۰ ہزار روپئے کم تھی، اس مالی سال کے دوران صوبائی حکومت نے پندرہ لاکھ روپئے کی امداد اس وقف بورڈ کو دی اس کے باوجود بورڈ کے اخراجات پورے نہیں ہو سکے۔ مارچ ۱۹۹۷ تک اس بورڈ پر تقریباً ۵۰ لاکھ روپئے کا قرض تھا، نتیجۃً مئی ۱۹۹۷ میں موصول ایک اطلاع کے مطابق وقف بورڈ کے ملازمین کو گذشتہ بارہ مہینوں سے تنخواہ نہیں دی جا سکی ہے (۲۲)۔

اڑیسہ وقف بورڈ کی آمدنی ۱۹۹۵/۹۶ کے مالی سال کے دوران تقریباً ۵۸ ہزار روپئے تھی۔ جب کہ پورے صوبے میں صرف سات اوقاف ایسے ہیں جن کی آمدنی ۵۰ ہزار روپیہ سالانہ سے زائد ہے۔ صوبے میں شہری علاقوں میں ۳۰۰ اوقافی جائدادیں ہیں، ان اوقاف میں سے متعدد اوقاف کی آمدنی بڑھائی جا سکتی ہے (۲۳)۔

اتر پردیش سنی وقف بورڈ کی اپنی آمدنی ۱۹۹۵/۹۶ کے مالی سال کے دوران تقریباً ایک کروڑ ۶۳ لاکھ روپئے تھی، جبکہ صوبائی حکومت نے دو کروڑ پچاس لاکھ روپئے امداد فراہم کی تھی، اس کے باوجود بورڈ اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکا، جسکے نتیجے میں ۱۹۹۴/۹۵ اور ۱۹۹۵/۹۶ کے مالی سال کے دوران ملازمین کی تنخواہیں اور بونس وغیرہ ادا نہیں کئے جا سکے۔ ٹیلیفون اور بجلی کے بل، وکلاء کی فیس، اسٹیشنری وغیرہ کے بل بھی اس دوران ادا نہیں کئے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے صوبے میں موجود ایک لاکھ ایک سو ستائیس اوقاف میں سے بیشتر اوقاف کی کوئی آمدنی نہیں ہے، بورڈ کے مطابق ۷۴ اوقاف ایسے ہیں جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپئے سے زائد ہے، جب کہ ۴۴ اوقاف ایسے ہیں جن کی آمدنی ۵۰ ہزار روپئے سے زائد مگر ایک لاکھ سے کم ہے (۲۴)۔

آندھرا پردیش وقف بورڈ کی آمدنی ۱۹۹۵/۹۶ مالی سال کے دوران تقریباً ۹۰ لاکھ روپئے تھی، جب کہ ۱۹۹۶/۹۷ مالی سال کے دوران یہ آمدنی ایک کروڑ گیارہ لاکھ روپئے تھی، یہ آمدنی اس صوبے میں موجود تقریباً ۳۵ ہزار سے زائد اوقاف کو دیکھتے ہوئے کافی کم ہے۔ اس وقف بورڈ کے براہ راست انتظام میں چار سو ستائیس اوقاف ہیں۔ یہ جائداد اوقاف مختلف افراد کو کرائے پر دی گئی ہے جنکا ماہانہ کرایہ ۵ روپیہ سے لے کر چار ہزار روپئے تک ہے، سب سے زیادہ کرایہ دار سو روپئے ماہانہ سے کم کرایہ ادا کرتے ہیں۔ ۳ ہزار ماہانہ سے زائد کرایہ دینے والے صرف چار کرایہ دار ہیں۔ پورے صوبے میں صرف ایک سو چودہ اوقاف ایسے ہیں جن کی آمدنی ۵۰ ہزار سالانہ سے زائد ہے (۲۵)۔

منی پور وقف بورڈ کی اپنی آمدنی ۱۹۹۴/۹۵ کے مالی سال میں تقریباً ۷ ہزار ہی ہے، جبکہ اس صوبے میں نامکمل سروے کے مطابق ۱۶۶ اوقاف ہیں، یہ وقف بورڈ اپنے اخراجات کے لئے صوبائی حکومت پر منحصر ہے (۲۶)۔

پانڈیچیری وقف بورڈ کا بھی کم وبیش یہی حال ہے۔ ۹۴/ ۱۹۹۳ کے مالی سال کے دوران اس وقف بورڈ کی آمدنی تقریباً ۲۲ ہزار روپے تھی، جبکہ صوبائی حکومت نے ۱۴۰ ہزار روپئے کی امداد فراہم کی (۲۷)۔

کیرالہ وقف بورڈ کی اپنی آمدنی ۹۷/ ۱۹۹۶ کے مالی سال کے دوران تقریباً ۳۵ لاکھ روپے تھی، جب کہ صوبائی حکومت ۱۵ لاکھ روپئے سالانہ کی امداد فراہم کرتی ہے، جب کہ صوبہ میں ۶ ہزار ۷۹۲ اوقاف ہیں جن کے تحت زمین کا رقبہ ۲۲ ہزار چار سو ساٹھ ایکڑ ہے۔ پورے صوبے میں تقریباً ۲۰۰ اوقاف ہی ایسے ہیں جن کی آمدنی ایک لاکھ سالانہ سے زائد ہے (۲۸)۔

مدھیہ پردیش وقف بورڈ کی آمدنی ۹۶/ ۱۹۹۵ کے مالی سال کے دوران تقریباً ۱۲ لاکھ ۵۴ ہزار روپئے تھی جبکہ ۱۵ لاکھ روپئے کی امداد صوبائی حکومت سے اس وقف بورڈ کو حاصل ہوئی (۲۹)۔

آسام وقف بورڈ کی ۹۶/ ۱۹۹۵ کے مالی سال کے دوران آمدنی صرف ۵۷ ہزار روپئے تھی۔ جبکہ ایک لاکھ روپئے کی امداد صوبائی حکومت نے فراہم کی اس صوبے میں صرف ۶۷ اوقاف ہیں اور ان میں سے صرف سات اوقاف کی آمدنی ۵۰ ہزار روپئے سالانہ سے زائد ہے۔ اس صوبے میں ۲۳ جائداد اوقاف شہری علاقوں میں ہیں (۳۰)۔

اس طرح کم وبیش ملک کے تمام وقف بورڈ کی آمدنی اور اخراجات کی حالت یکساں ہے، آمدنی اور اخراجات کا موازنہ منسلک ٹیبل کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے، ان وقف بورڈوں کی آمدنی ان کے اخراجات سے یا تو کافی کم ہے، یا اگر زیادہ ہے تو بھی اتنی زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی ترقیاتی منصوبہ ہاتھ میں لیا جا سکے۔ اس کے علاوہ متولین کی بد دیانتی اور قانونی پیچیدگیاں اوقاف کے انتظام اور ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں، متولین کی بد دیانتی سے ہونے والے نقصان کو روکنے کے لئے وقف ایکٹ ۱۹۹۵ میں قانونی حل موجود ہے۔ جس کا سہارا لے کر مقامی مسلمان اس مسئلہ سے نپٹ سکتے ہیں۔ دیگر قانونی پیچیدگیوں میں صوبائی سطح پر موجود کرایہ داری سے متعلق قوانین، زمینوں سے متعلق حد بندی کے قوانین، میونسپلٹی کے نافذ کردہ ٹیکس اور شہری ترقیاتی منصوبے قابل ذکر ہیں، ان مشکلات کے حل کے لئے سیاسی اور قانونی راستے موجود ہیں لیکن اس کے لئے مسلمانوں مین سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ وسائل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح وسائل کی قلت بذات خود ایک بڑا مسئلہ ہے، اس مسئلے کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اوقاف کی جائداد کی بازاری قیمت عموماً کافی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے ان جائداد پر قبضہ کرنے والے لوگ بڑی رقومات اپنے قبضے کو بنائے رکھنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ عام طور پر سماج کے بااثر لوگ ہوتے ہیں جو اپنا اثر ورسوخ بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں، اس طرح اوقاف کی جائداد کو ناجائز قبضوں سے بچانے کے لئے بہتر دیکھ بھال کا متبادل نہیں ہے۔ بہتر دیکھ بھال کے لئے مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مالی وسائل یکجا کرنے کے لئے اوقاف کی آمدنی کو بڑھانے کے لئے ترقیاتی منصوبے اپنانے کی ضرورت ہے۔ ایسے ترقیاتی منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے مالی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے۔

آج ملک میں بیشتر اوقاف کی آمدنی بہت کم ہے، کئی اوقاف کی کوئی آمدنی ہی نہیں ہے، اوقاف پوری طرح عوامی عطیات پر منحصر ہیں، چونکہ بیشتر اوقاف کی آمدنی بہت کم ہے اس لئے ان اوقاف کی دیکھ بھال نہیں ہو پاتی جس کی وجہ سے غاصبین کو ناجائز قبضہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ناجائز قبضہ ہو جانے کے بعد ان جائداد کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بھی مالی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، اس کی وجہ سے ان جائداد کو دوبارہ حاصل کرنا نہ صرف مشکل ہو جاتا ہے بلکہ بعض حالات میں صرف مالی مشکلات کی وجہ سے یہ جائداد وقف کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں، اگر قانونی چارہ جوئی سے ایسی جائداد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو وقف کی تھوڑی سی آمدنی پر اور برا اثر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے اس وقف کی جائداد کی دیکھ بھال مزید متاثر ہوتی ہے جس سے بقیہ جائداد پر ناجائز قبضہ ہونے کے خطرات بڑھتے ہیں۔

☆☆☆

Table

نمبرشمار	نام وقف بورڈ	اوقاف کی تعداد	ناجائز قبضے میں چلی گئی جائداد وقف	آمدنی ۹۵/۱۹۹۴ مالی سال بورڈ کی اپنی آمدنی	سرکاری امداد	اخراجات مالی سال ۹۵/۱۹۹۴
۱۔	آسام وقف بورڈ	۶۷ رجسٹرڈ وقف	۶	۲۳۸۲۹	۱،۰۰۰۰۰	۱۵،۳۵۷۸/۶۰
۲۔	بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ	کل تعداد دستیاب نہیں لیکن بورڈ میں ۲۲۸۰ اوقاف رجسٹرڈ ہیں	تعداد دستیاب نہیں	۵۵۴۵۵۱/۷۵	۱۰،۰۰۰۰۰	۱۵۲۹۸۲۸/۸۵
۳۔	کرناٹک بورڈ آف وقف	۲۱۱۳۳	تعداد دستیاب نہیں	۲۵،۰۰۰۰۰	۶۷،۲۰۰۰	۸۰،۰۰۰۰۰
۴۔	کیرالہ وقف بورڈ	۶۷۹۲	کل تعداد ۹ جن کا رقبہ ۱۹۶۱ یکڑ	۴۰،۹۹۸۸۱/۷۵	۱۵،۰۰۰۰۰	۱۷،۶۸۰۶۱/۰۰
۵۔	مدھیہ پردیش وقف بورڈ	کل تعداد ۱۵،۱۵۰	تقریباً ۷۵ فیصد جائداد اوقاف ناجائز قبضے میں	۱۰،۲۹۵۲۹	۱۱،۵۵۶۶۴	۲۴،۱۴۰۹۲
۶۔	مراٹھوارا وقف بورڈ	تعداد دستیاب نہیں	تعداد دستیاب نہیں	۰۰/۰۳۰_۰۱_ـ۱ـ	ـــــــ	۱۹_۰۴۱۴۴/۰۰
۷۔	منی پور وقف بورڈ	کل تعداد ۱۶۶ (سروے مکمل نہیں)	تعداد دستیاب نہیں	۳۷_۳۲۷	۵۰_۰۰۰	۵۷_۸۴۵/۱۵
۸۔	اڑیسہ وقف بورڈ	کل تعداد ۳۶۲۰	۱۵	۱۴_۹۴۱۸۵/۷۴	۲_۰۰۰۰	۴_۹۳۹۴۱
۹۔	پنجاب وقف بورڈ	کل تعداد ۳۵۵۸۹	تقریباً ۶۰ فیصد جائداد اوقاف	۲۴۹۰_۳۱۱/۴۵	ـــ۷ـ	۴_۲۴۷۳۱۴۴/۹۸
۱۰۔	راجستھان وقف بورڈ	تقریباً ۲۵ ہزار	تعداد دستیاب نہیں	۲۷۱۰_۰۰۰	ــــــ	۴۰_۶۶۰۰۰
۱۱۔	تری پورہ وقف بورڈ	دستیاب نہیں	تعداد دستیاب نہیں	ــــــ	۹_۸۰_۰۰۰	۲۶_۱۱۰۰۰
۱۲۔	یوپی سنی سینٹرل وقف بورڈ	۱۰۰_۰۳۱	تعداد دستیاب نہیں	۲۰_۵۷۸۹۶/۷۹	ـــ	۶۰_۳۸۰۰۰

۱۳۔	وقف کمشنر مغربی بنگال	کل دستیاب نہیں	تعداد ۵۴		۱۱۔۴۲۴۴		۲۵۔۴۸۵۶۶/۴۴۲۴۔۰۰۰۰۰
۱۴۔	انڈمان نکوبار وقف بورڈ	تعداد ، نہیں	دستیاب	کل تعداد دستیاب نہیں	۱۰،۸۶۲	۳۰۲۰۰۰	۳۔۲۶۱۰۲/۲۰
۱۵۔	دہلی وقف بورڈ	کل ۱۹۵۷	تعداد	کل تعداد دستیاب نہیں لیکن کم از کم سات جائداد اوقاف مرکزی حکومت اور ۹۲ مساجد دیگر افراد کے ناجائز قبضے میں ہیں	۶۱۔۱۷۱۲۴	-----	۴۹۔۱۶۹۱۱/۲۵
۱۶۔	لکشدیپ وقف بورڈ	تعداد نہیں	دستیاب	کل تعداد دستیاب نہیں	۱۳۔۱۷۰۳۴	-----	۹۔۸۵۶۷۱
۱۷۔	پانڈیچری وقف بورڈ	دستیاب نہیں		تعداد دستیاب نہیں	۲۶۔۶۶۷	۱۔۰۰۰۰۰	۱۔۱۶۳۳۹/۸۰
۱۸۔	آندھرا پردیش وقف بورڈ	۳۵۔۷۰۰		تعداد دستیاب نہیں لیکن کم سے کم ۵۰ جائداد اوقاف حکومتی اداروں کے قبضوں میں ہونے کی اطلاع ہے۔	۷۵۔۶۶۴۲۰	------	۷۴۔۶۵۴۵۴/۲۷

95 and -Source: Various reports. Central Waqf Council 94

States Waqf Boards

تیسرا باب تفصیلی مقالات

وقف سے متعلق احکام ومسائل

مولانا مفتی محمد حنیف صاحب [۱]

الوقف فی اللغۃ: وقف کے معنی لغت میں روکنے کے ہیں، پھر اسم مفعول یعنی موقوف کے معنی میں مشہور ہوگیا۔

''الوقف لغة الحبس وهو مصدر ثم اشتهر في الموقوف'' (الدر مع الرد ۳،۳۵۷)۔

الوقف فی الشرع: وقف کی شرعی تعریف میں حضرات صاحبین اور امام صاحب کا اختلاف ہے:

امام صاحب کے نزدیک ملکیت باقی رکھتے ہوئے منافع کو صدقہ کردینے کا نام شریعت میں وقف ہے:

''وشرعاً حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة عنده'' (درمختار ۳،۳۵۷)۔

اور حضرات صاحبین اور اکثر علماء کے نزدیک کسی چیز کو اللہ رب العزت کی ملکیت میں دے کر اس کے منافع کو اپنے پسندیدہ جائز مصارف پر صرف کرنے کا نام شریعت میں وقف ہے:

''وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من أحب'' (درمختار ۳،۳۵۸)۔

حکمہ عند الامام: امام صاحب کے نزدیک صیغۂ وقف استعمال کرنے سے شئ موقوف وقف ہوجاتی ہے، لیکن ملک ید واقف کی باقی رہتی ہے، اسی وجہ سے ملکیت کے احکام، یعنی بیع، ہبہ، وراثت وغیرہ جاری ہوں گے، اور ملکیت سے اخراج کے لئے چار چیزوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔

''والصحيح أنه جائز عند الكل وإنما الخلاف بينهم في اللزوم وعدمه فعنده يجوز جواز الإعارة، فتصرف منفعة إلى جهة الوقف مع بقاء العين على حكم ملك الواقف، ولو رجع عنه حال حياته جاز مع الكراهة ويورث عنه'' (ردالمحتار: ۳۵۸) ''وقال: فالرقبة باقية على ملكه في حياته وملك للورثة بعد وفاته فانه بحيث يباع ويوهب'' (ردالمحتار: ۳۵۷)۔

اسباب خروج: چار جہتوں سے امامؒ کے نزدیک شئ موقوف بے واقف کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے:

(۱) موقوف اگر مسجد ہے تو اسکو الگ کردینے (حد بندی) سے واقف کی ملکیت ختم ہوکر اللہ رب العزت کی ملکیت میں داخل ہوجائے گی۔

(۲) قاضی لزومیت وقف کا فیصلہ کر کے متولی وغیرہ کے سپرد کردے۔

(۳) وقف کو اپنی وفات پر معلق کرنے کی صورت میں شئ موقوف ترکہ کے تہائی حصہ سے واقف کی ملکیت سے بعد وفات نکل جائے گی، اس تہائی موقوفہ حصہ میں وراثت جاری نہ ہوگی۔

الحاصل: یہ بعینہ وصیت کے حکم میں ہے، لہذا اسکو اپنی زندگی میں رجوع کا اختیار ہوگا (تنبیہ: تعلیق بالوفات حقیقت میں زوال ملک کا سبب نہیں ہے)۔

---

[۱] صدر شعبہ افتاء، جامعہ ریاض العلوم جونپور۔

(۴) کسی چیز کو اپنی زندگی اور بعد وفات دونوں میں ہمیشہ کے لئے وقف کردینے سے واقف کی ملکیت بعد وفات شئ موقوف سے ترکہ کے تہائی حصہ کے اعتبار سے ختم ہوجائے گی، اگر رجوع نہ کیا تو اس پر وراثت بھی جاری نہ ہوگی، اور زندگی میں اس کی آمدنی تصدق کی نذر ہوگی جس کو پورا کرنا واجب ہے یعنی اس کی آمدنی کا صدقہ کرنا بوجہ نذر واجب ہے۔

''والملك يزول عن الموقوف بأربعة: (۱) بإفراز مسجد كما سيجئ (۲) وبقضاء القاضي، لأنه مجتهد فيه وصورته أن يسلمه إلى المتولي (۳) أو بالموت إذا علقه به أي بموته كإذا متّ فقد وقفت داري على كذا. فالصحيح أنه كوصية تلزم من الثلث بالموت لا قبله (۴) أو بقوله وقفتها في حياتي وبعد وفاتي مؤبداً. فإنه جائز عندهم لكن عند الإمام ما دام حيا هو نذر بالتصدق بالغلّة فعليه الوفاء وله الرجوع ولو لم يرجع حتى مات جاز من الثلث'' (الدرالمختار ۳، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳)۔

خلاصہ: حضرت امام صاحب کے نزدیک زوال ملکیت کے ذکر کردہ اسباب اربعہ میں سے دو سبب یعنی افراز مسجد اور قضاء قاضی ایسے ہیں جن سے فی الحال واقف کی ملکیت شئ موقوف سے ختم ہوجاتی ہے اور دو سبب ایسے ہیں جن سے فی الحال واقف کی ملکیت ختم نہیں ہوتی، بلکہ علی حالہ اس کی ملکیت پر باقی رہتی ہے جس کی وجہ سے اپنی زندگی میں واقف کو حق رجوع حاصل رہتا ہے، البتہ بعد وفات، یعنی فی الحال رجوع نہ پائے جانے کی صورت میں شئ موقوف ترکہ کے ثلث کے بقدر ملکیت نکل جائے گی، جس پر وراثت جاری نہ ہوگی (کمافی الرد ۳؍۳۶۴)۔

وحكمه عند الصاحبين: صاحبین اور اکثر علماء کے نزدیک صیغۂ وقف کے استعمال کرنے اور وقف کے تمام ہونے کے بعد وقف ہوکر واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور اللہ رب العزت کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے، اسی وجہ سے شئ موقوف کا ہبہ، وصیت اور اس کی بیع وغیرہ باطل ہے اور وراثت کے احکام اس پر جاری نہ ہوں گے، البتہ تمامیتِ وقف میں حضرت امام محمدؒ اور حضرت امام ابو یوسفؒ کا اختلاف ہے۔

''وعندهما: هو حبسها على ملك الله تعالى و صرف منفعتها على من أحب فيلزم. فلا يجوز له إبطاله ولا يورث عنه و عليه الفتوى، وفي الحاشية: وعندهما يلزم بدون ذلك وهو قول عامة العلماء وهو الصحيح. ثم إن أبا يوسف يقول: يصير وقفا بمجرد القول؛ لأنه بمنزلة العتاق عنده وعليه الفتوى، و عند محمد: لا إلا بأربعة شروط ستأتي'' (الدرمع الرد ۳، ۳۵۸)۔

شروط تمامیتِ وقف:

وعند محمد: حضرت امام محمدؒ کے نزدیک وقف کے تام ہونے کے لئے چار شرطیں ہیں، مندرجہ ذیل چاروں شرطیں جب پائی جائیں گی تو واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ رب العزت کی ملکیت میں داخل ہوجائے گی پھر اس کی بیع، ہبہ وغیرہ ناجائز ہوجائے گا۔

''قال محمد: إنما يجوز بأربع شرائط'':

۱۔ واقف اپنے قبضہ سے نکال کر متولی کے سپرد کردے۔ ''أحدها: أن يخرجه من يده ويسلمه إلى المتولي''۔

۲۔ شئ موقوف مشترک نہ ہو بلکہ الگ ہو۔ ''والثاني: أن يكون في المفروز دون المشاع''

۳۔ شئ موقوف کے منافع میں سے اپنے لئے کوئی شرط نہ لگائے۔ ''والثالث: أن لا يشترط لنفسه شيئا من منافع الوقف''۔

۴۔ ہمیشہ کے لئے وقف کردے۔ ''والرابع: أن يكون مؤبدا بأن يجعل آخره إلى فقراء المسلمين'' (تحفة الفقهاء ۳، ۳۷۷)

''وهكذا في الدر المختار: ولا يتم الوقف حتى يقبض ويفرز فلا يجوز وقف المشاع ويجعل آخره لجهة لا تنقطع. هذا بيان شرائطه الخاصة على قول محمد لأنه كالصدقة'' (در مختار ۳، ۳۶۴۔۳۶۵)۔

مذہب ابو یوسف: حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک شرائط مذکورہ میں سے تمامیت وقف کے لئے کوئی شرط نہیں ہے، ان کے نزدیک وقف، اعتاق کی طرح ہے جو صرف الفاظ وقف کے استعمال سے لازم وتام ہوجاتا ہے۔

''علی قول أبي یوسف ولا یشترط شئ من هذه الأشیاء'' (تحفة ۳،۳۷۷) ''وفی الدر: وجعله أبو یوسف کالاعتاق'' (در مختار ۳، ۳۶۵)۔

القول المفتی به: احتیاطاً فتوی کے لئے حضرت امام ابویوسفؒ کا قول اختیار کیا گیا ہے، باوجودیکہ امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ دونوں حضرات کے قولوں پر حضرات متقدمین کی جانب سے فتوی کی تصریح موجود ہے لیکن احتیاط وآسانی حضرت امام ابویوسفؒ کے قول میں ہے اس لئے حضرات فقہاء نے ان ہی کے قول کو راجح کہا ہے۔

''واختلف الترجیح والأخذ بقول الثاني أحوط وأسهل بحرو فی صدر الشریعة والدر وبه یفتی (قوله واختلف الترجیح) مع التصریح فی کل منهما بأن الفتوی علیه، لکن فی الفتح إن قول أبي یوسف أوجه عند المحققین'' (در مختار ۳،۳٦٦)۔

خلاصہ: عبارت مذکورہ کا حاصل صرف اتنا ہے کہ مفتی بہ قول کے مطابق الفاظ کے استعمال کرنے سے وقف تام اور لازم ہوجاتا ہے، اس کی بیع، ہبہ وغیرہ ناجائز اور حرام ہوجاتی ہے۔

وقف جبری: اگر کسی شخص نے کوئی چیز وقف تو نہیں کیا، لیکن دوسرے کے قبضہ میں کوئی چیز دیکھی اور اسکو اس نے وقف کی چیز کہا اور قابض اس کے وقف ہونے سے انکار کرتا رہا، پھر وہی شخص جس نے وقف کی چیز کہا تھا اس کا مالک ہوگیا، خواہ بیع وشراء و ہبہ سے یا وصیت ووراثت سے مالک ہوا ہو، اس شخص کے ملک میں داخل ہونے کے بعد وہ چیز اگر وقف ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے تو بغیر وقف کئے اس کی ملکیت میں دخول سے وقف ہوجائے گی۔

''أقر بأرض فی ید غیره أنها وقف وکذّبه ثم ملکها صارت وقفا'' (در مختار ۵۵۹) ''قوله ملکها أی المقر ولو بسبب جبری قوله صارت وقفا مواخذة له بزعمه'' (شامی ٦،۵۵۹)۔

مثلاً اشیاء غیر منقولہ اور وہ اشیاء منقولہ جن کے وقف کرنے کا عرف ہو جیسے کتب وغیرہ، اگر ان کو کسی کے قبضہ میں دیکھ کر موقوفہ کہے اور قابض انکار کرے تو ایسی صورت میں جس نے وقف کی کہا ہے اگر وہ اس کا مالک ہوجائے تو وہ چیز وقف کی ہوجائے گی۔

جہات اوقاف: جن کے لئے وقف صحیح ودرست ہوتا ہے وہ تین ہیں:

۱۔ صرف فقراء کے لئے وقف ہو۔

۲۔ اولاً اغنیاء کے لئے بعدہ فقراء کے لئے وقف ہو۔

۳۔ ایسا وقف ہو جس میں اغنیاء وفقراء دونوں برابر ہوں (در مختار ٦، ٦۰۳)۔

ایسے اوقاف جس میں دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں وہ مساجد اور دیگر رفاہی کام ہیں، مثلاً مساجد، مسافر خانہ، قبرستان، پل، نہر وغیرہ، یعنی ہر وہ چیز جس کی ضرورت فقراء واغنیاء دونوں کو پڑتی ہو اور دونوں کے لئے وقف کرنے کا عرف ہو، تو ایسی صورت میں اگر واقف کسی کی تخصیص نہ کرے کہ یہ مدرسہ صرف غریبوں کے لئے ہے یا مسافر خانہ صرف محتاجوں کے لئے ہے بلکہ مطلق رکھے تو ایسی صورت میں المعروف کالمشروط کی بنا پر ان چیزوں کو اغنیاء اور فقراء دونوں کے لئے برابر مشترک سمجھا جائے گا، بغیر تخصیص کے تخصیص نہ ہوگی۔

''فی الدر کرباط وخان ومقابر وسقایات وقناطر ونحو ذلك کمساجد وطواحین طست لاحتیاج الکل لذلك'' (درمختار ٦،٦۰۳)۔

''وزاد فی الهدایة أن الفارق بین الموقوف للغلة و بین هذا هو العرف، فإن أهل العرف یریدون بذلك فی الغلة للفقراء وفی غیرها التسویة بینهم وبین الأغنیاء'' (شامی ٦۰۳)۔

اور اگر ایسی چیز کے لئے وقف کیا جس کی ضرورت اغنیاء وفقراء دونوں کو برابر نہیں پڑتی ہے اور دونوں کے لئے مشترک طور پر وقف کرنے کا عرف بھی نہیں ہے تو ایسے وقف میں اغنیاء صرف اس صورت میں داخل ہونگے جب واقف صراحت کے ساتھ اغنیاء کے شریک ہونے کو بیان کردے، یا عمومیت کی تصریح کر

دے کہ سب کے لئے ہے تو اغنیاء بھی فقراء کے تابع ہو کر داخل ہو جائیں گے، اور اگر اغنیاء کی تصریح یا عمومیت کی وضاحت نہ کرے تو اغنیاء ایسے وقف میں شریک نہ ہوں گے، مثلاً دوا کے لئے وقف ہو تو اگر اغنیاء کی تصریح یا عمومیت ہو تو اغنیاء علاج کرواسکتے ہیں ورنہ نہیں۔

''بخلاف الأدوية فلم يجز لغني بلا تعميم أو تنصيص، فيدخل الأغنياء تبعاً للفقراء قنية، قوله بخلاف الأدوية۔ أي الموقوفة في التيمارخانة، فإن الحاجة إليها دون الحاجة إلى السقاية، فإن العطشان لو ترك شرب الماء يأثم، ولو ترك المريض التداوي لا يأثم'' (شامی ۶۰۳)۔

شرائط صحت وقف: وقف کے صحیح ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں:

۱۔ فسق وفجور میں وقف نہ ہو۔

۲۔ صرف اغنیاء پر نہ وقف ہو۔

کیونکہ وقف ایک عبادت ہے جو شئ موقوف کو اپنی ملک سے نکال کر منافع کو علی الدوام صدقہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے اگر کار خیر میں وقف نہ کرے بلکہ فسق وفجور کے لئے وقف کرے یا صرف اغنیاء پر وقف کرے تو صدقہ وعبادت ہونے کی وجہ سے وقف درست نہ ہوگا (کمافی الشامیہ)۔

''ويشترط أن يكون قربة في ذاته'' (شامی ۶،۵۲۱) ''ولو وقف على الأغنياء وحدهم لم يجز لأنه ليس بقربة'' (شامی ۶،۵۱۹)۔

حالات وقف: شئ موقوف کی پانچ حالتیں بنتی ہیں، لہذا پہلے ان کو ذکر کیا جاتا ہے بعدہ انشاء اللہ ان کے بیع واستبدال کا حکم مع شرائط ذکر کیا جائے گا:

۱۔ شئ موقوف ایسی ہو جس کے بدلنے کی واقف نے اپنے لئے یا دوسرے کے لئے شرط لگائی ہو۔

''الأول: أن يشترط الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره''۔

۲۔ شئ موقوف ایسی ہو جس کے بدلنے کی واقف نے شرط تو نہ لگائی ہو (یعنی سکوت ہو یا عدم استبدال کی شرط ہو) لیکن وہ اس طرح ہو جائے کہ اس سے انتفاع کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ انقطاع انتفاع بالکلیہ، خواہ آبادی کے منتقل ہونے یا انہدام اور لوگوں کی عدم ضرورت کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے۔

''والثاني: أن لا يشرطه سواء شرط عدمه أي سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية، بأن لا يحصل منه شئ أصلا''۔

۳۔ شئ موقوف کا اپنا ذاتی خرچ بھی اس کی آمدنی سے پورا نہ ہو سکے۔ الثالث: ''لا يفي بمؤنته''۔

۴۔ شئ موقوف ایسی ہو جس سے انتفاع تو ہو رہا ہو لیکن بیع واستبدال کی صورت میں نفع زیادہ ہو یعنی اس کا بدل انفع ہو۔

''الرابع: ''أن لا يشرطه أيضا لكن فيه نفع في الجملة و بدله خير منه ريعاً و نفعاً''۔

۵۔ شئ موقوف ایسی ہو جس کے استبدال وبیع کی نہ شرط ہو اور نہ ہی استبدال کی صورت میں نفع زیادہ ہو اور شئ موقوف سے انتفاع ہو رہا ہو (شامی ۶/ ۵۸۳۔۵۸۴)۔

بیع واستبدال: پہلے بیع واستبدال کے شرائط بیان کئے جاتے ہیں پھر ذکر کردہ اشیاء موقوفہ کی قسموں کا حکم لکھا جائے گا۔

شرائط استبدال: وقف کو بدلنے اور فروخت کرنے کی نو شرطیں ہیں:

۱۔ شئ موقوف سے انتفاع کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ الأول: ''أن يخرج عن الانتفاع بالكلية''۔

۲۔ شئ موقوف کا کوئی ایسا فنڈ اور کوئی ایسی آمدنی نہ ہو جس کے ذریعہ اسکو قابل انتفاع بنایا جاسکے۔

الثاني: ''وأن لا يكون هناك ريع للوقف يعمر به''۔

۳۔ بیع واستبدال کھلے ہوئے گھاٹے کے ساتھ نہ ہو۔ الثالث: ''أن لا يكون البيع بغبن فاحش''۔

۴۔ بدلنے والا قاضی الجنۃ، یعنی صاحب علم وتقوی وطہارت ہو اور قاضی کے فقدان کی صورت میں جو بھی بدلنے والا ہو اس کے لئے علم وعمل، تقوی وطہارت کا ہونا ضروری ہے۔ الرابع: ''أن يكون المستبدل قاضي الجنة المفسر بذي العلم والعمل لئلا يحصل التطريق إلى إبطال أوقاف المسلمين كما هو غالب في زماننا''۔

۵۔ مبدل منہ دراہم ودنانیر نہ ہو، یعنی ایسی چیز سے نہ بدلا جائے جس کے ضیاع کا اندیشہ ہو۔

الخامس: ''ويجب في زماننا أن يستبدل بعقار لا بدراهم ودنانير''۔

۶۔ ایسے شخص سے بیع واستبدال نہ کیا جائے جس کے حق میں بائع کی شہادت مقبول نہ ہو، اور مشتری غیر مقبول الشہادۃ ہو بائع کے حق میں۔

السادس: ''وهو أن لا يبيعه ممن لا تقبل شهادته له'' (یعنی اپنے اولاد سے بیع نہ ہو وغیرہ)۔

۷۔ بدل کی جگہ اور محل وقوع مبدل منہ سے ادنی وکمتر نہ ہو۔

السابع: ''يبيع إذا كانتا في محلة واحدة أو محلة أخرى خيرا وبالعكس لا يجوز''۔

۸۔ مشتری بائع کی اولاد صغیرہ نہ ہو۔

الثامن: ''أن لا يبيع من ابنه الصغير، فإنه لا يجوز اتفاقاً كالوكيل بالبيع من ابنه الصغير''۔

۹۔ بیع اپنے قرض خواہ سے اس کے قرض کے بدلے نہ ہو، یعنی وہ وقف کو ایسے شخص سے فروخت نہ کرے جس کا متولی (فروخت کرنے والے) کے ذمہ قرض ہو اور اسی قرض کے بدلے وقف کو فروخت کرے تو یہ جائز نہیں ہے۔

التاسع: ''أن لا يبيع الوقف ممن له على المستبدل دين باعه الوقف بالدين، فإنه لا يجوز على قول أبي يوسف وهلال لأنهما لا يجوز أن البيع بالعروض فبالدين أولى'' (شامی ۶،۵۸۶)۔

تنقیح: شرائط استبدال کو ذکر کرنے کے بعد ان کے تنقیح کی ضرورت معلوم ہوئی اس لئے شرائط مذکورہ میں سے خاص طور سے قاضی اور عقارات سے بدلنے اور اپنے نابالغ بچے سے نہ فروخت کی شرطیں قابل ذکر ہیں، اس لئے فائدہ کے عنوان سے ان شرائط کی تنقیح کی جاتی ہے۔

فائدہ۔۱: امور اوقاف خواہ وہ بیع واستبدال ہوں یا دیگر امور اوقاف، تمام امور میں واقف اور اس کے وصی نہ ہونے کی صورت میں حضرات فقہاء قاضی کی شرط لگاتے ہیں۔ یہ شرط انتظامی ہے، اس شرط کے ذریعہ اوقاف کی حفاظت مقصود ہے، اسی لئے اگر قاضی سے وقف کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں قاضی کو امور اوقاف میں شریک نہیں کیا جائے گا، حضرات فقہاء نے اس زمانہ میں قاضیوں کی خیانت کی وجہ سے قاضی کو امور اوقاف میں شریک نہ کرنے کا فتوی دیا ہے، لہٰذا قاضی کے خائن یا اس کے نہ ہونے کی صورت میں دیندار عامۃ المسلمین کے مشورہ اور انتظام سے امور اوقاف انجام دیئے جائیں گے۔ کما فی الشامیۃ وحاشیۃ البحر وغیرہ۔

''وفي منحة الخالق: قوله فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره الخ''۔

''قال الرملي: لا تنس ما قدمه بأسطر عن شمس الأئمة الحلواني بنقل الذخيرة حين سئل عن أوقاف المسجد إذا تعطلت، هل للمتولي أن يبيعها ويشتري مكانها أخرى قال: نعم، ولقولهم الولاية الخاصة أقوى من الولاية العامة ولاتفاق المشائخ المتأخرين على أن الأفضل لأهل المسجد أن ينصبوا متوليا ولا يعلموا القاضي في زماننا لما علم من طمع القضاة في أمور الأوقاف، صرح به في التتارخانية وغيرها في كثير من كتب المذهب'' (منحة الخالق ۲۱۷)۔

''وفي الشامية: ذكر عن التتارخانية ما حاصله أن أهل المسجد لو اتفقوا على نصب رجل متوليا لمصالح المسجد فعند المتقدمين يصح ولكن الأفضل كونه بإذن القاضي ثم اتفق المتأخرون أن الأفضل أن لا يعلموا القاضي

فی زماننا لما عرف من طمع القضاة فی أموال الوقف'' (شامی ۶،۶۴۳)۔

فائدہ۔۲: اسی طرح عقارات سے بدلنے کی شرط حضرات فقہاء متاخرین نے اوقاف کی حفاظت کے لئے لگائی ہے، لہذا اگر دراہم ودنانیر سے فروخت کرکے دوسرا وقف خرید لیا جائے تو یہ جائز ہے۔

''قال فی البحر: ولو شرط أن یبیعها ویشتری بثمنها أرضا أخری ولم یزد صح استحسانا وصارت الثانیة وقفا بشرائط الأولی'' (شامی ۵۸۵)۔

عقارات سے بدلنے کی شرط فقہاء متاخرین نے تغیر عرف وزمانہ کی بنا پر لگائی ہے کہ دراہم ودنانیر سے بدلنے میں اس زمانہ میں وقف کے ضیاع کا اندیشہ ہے کہ متولی خود کھا جائے دوسرا وقف نہ خریدے، ضیاع سے بچانے کے لئے متاخرین نے یہ شرط لگائی، چنانچہ قاضی خان سے جواز کی صراحت منقول ہے۔

''قال الرملی: کیف یخالف قاضی خان مع صراحته بالجواز الخ'' (منحة الخالق ۲۲۲) ''ویجب أن یزاد آخر فی زماننا وهو أن یستبدل بعقار لا بالدراهم والدنانیر، فإنا قد شاهدنا النظار یأکلونها وقل أن یشتری بها بدل ولم نر أحدا من القضاة یفتش علی ذلك مع کثرة الاستبدال فی زماننا'' (ص ۲۲۳)۔

فائدہ۔۳: اپنے نابالغ بچے سے فروخت کرنے میں روایتیں مختلف ہیں:

ایک روایت میں یہ ہے کہ موکل کی اجازت کے باوجود وکیل کے لئے اپنے چھوٹے نابالغ بچے سے فروخت کرنا جائز نہیں، کیونکہ والد ہی اپنے نابالغ بچے کا وکیل ہوتا ہے اور متولی ہونے کی وجہ سے اوقاف کا وکیل ہوتا ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ بیوع میں کوئی شخص جانبین کا وکیل نہیں ہوسکتا ہے (بحر/۲۵۸)۔

''وفی السراج: لو أمره بالبیع من هؤلاء، فإنه یجوز إجماعا لا أن یبیعه من نفسه أو ولده الصغیر أو عبده ولا دین علیه فلا یجوز قطعا وإن صرح به المؤکل'' (شامی ۴،۴۰۷)۔

دوسری روایت میں ہے کہ اگر موکل اجازت دے دے تو اپنے چھوٹے بچے سے فروخت کرنا جائز ہے۔

''وإن أمره الموکل أن یبیعه من نفسه وأولاده الصغار أو ممن لا تقبل شهادته فباع منهم جاز'' (شامی ۴،۴۰۷)،

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں دونوں قول میں تعارض ظاہر ہے تو معلوم ہوا کہ مسئلہ مذکورہ میں دو قول ہیں۔

''ولا یخفی ما بینهما من المخالفة و ذکر مثل ما فی السراج فی النهایة عن المبسوط، ومثل ما فی البزازیة فی الذخیرة عن الطحاوی وکان فی المسئلة قولین'' (شامی ۴، ۴۰۷)۔

لہذا اگر عامۃ المسلمین متولی کو اجازت دیں تو ایک روایت کے مطابق درست ہے دوسرے کے مطابق نہیں۔

مذکورہ تینوں شرطوں کے علاوہ بقیہ جو شرائط ہیں وہ بھی وقف کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ہیں، جیسا کہ شرائط استبدال میں غور کرنے سے واضح ہے۔

احکام حالات وقف: اب اشیاء موقوفہ کے احکام شروع کئے جاتے ہیں، جیسا کہ حالات وقف کے تحت ان کا وعدہ کیا گیا تھا۔

(۱) شئ موقوف ایسی ہو جس کے بدلنے کی واقف نے اپنے لئے یا دوسرے کے لئے بدلنے کی شرط لگائی ہو، اس شرط کی بنا پر حق استبدال کے حاصل ہونے اور نہ ہونے کے سلسلے میں امام صاحب اور حضرات صاحبین کا اختلاف ہے، جو متفرع ہے اس مسئلہ مختلف فیہ پر جس میں واقف نے اپنے لئے تولیت وقف یا پیداوار وقف کی شرط لگائی ہو، تو امام محمدؒ کے نزدیک شرط تسلیم اور عدم تخصیص منافع کی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے وقف درست نہیں۔ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چونکہ صحت وقف کے لئے کوئی شرط نہیں ہے، اس لئے وقف جائز ودرست ہے۔

''کما فی الدر: وجاز جعل غلة الوقف أو الولایة لنفسه عند الثانی وعند محمد لا یجوز بناء علی اشتراطه التسلیم إلی متول'' (الدر المختار مع الرد ۵، ۵۸۳، ۵۸۴)۔

اسی اختلاف پر شرط استبدال لنفسہ کا مسئلہ بھی متفرع ہے۔ لیکن اس شرط کی بنا پر امام محمدؒ کے نزدیک وقف صحیح ہوجاتا ہے اور شرط باطل ہوجاتی ہے،

''وأبطل محمد الشرط وصحح الوقف'' (بحر ۲۸۱)۔اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک شرط استبدال لنفسہ میں بھی وقف اور شرط دونوں صحیح ہیں۔

''وفرع في الهداية على الاختلاف بين الشيخين شرط الأستبدال لنفسه، فيجوزه أبو يوسف وأبطل محمد الشرط وصحح الوقف'' (بحر ۲۲۳، شامی ۲،۵۸۴)۔

القول المفتی بہ: شرط استبدال کی وجہ سے شئ موقوف کوفروخت کرنے کے سلسلے میں فتوی حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے، لہذا شرط استبدال کی وجہ سے مذکورہ شرائط استبدال میں سے قاضی، خروج عن الانتفاع، عدم قدرت تعمیر، ان تینوں کے علاوہ بقیہ تمام شرائط استبدال کے ساتھ حضرت امام ابو یوسفؒ کے مذہب کے مطابق شئ موقوفہ کوایک مرتبہ بدلنا جائز ہوگا، اگر دوسری مرتبہ بدلنے کی شرط سے سکوت ہو، اور اگر دوسری مرتبہ بھی بدلنے کی شرط مذکور ہوتو دوسری مرتبہ بھی بدلنا جائز ہے۔

(۱) ''جاز جعل غلة الوقف لنفسه عند الثاني، وعليه الفتوى، قوله: وعليه الفتوى، كذا قاله الصدر الشهيد، وهو مختار أصحاب المتون ورجحه في الفتح واختار مشائخ بلخ، وفي البحر عن الحاوي أنه المختار للفتوى ترغيبا للناس في الوقف وتكثيرا للخير'' (شامی ۵۸۳)۔

(۲) ''ولو شرطه لا يلزم خروجه عن الانتفاء ولا مباشرة القاضي له وعدم ريع يعمر به كما لا يخفى'' (شامی ۵۸۶)۔

نوٹ: اگر واقف نے شئ موقوفہ کوفروخت کر کے اس کے ثمن سے دوسرا وقف خریدنے کی شرط لگائی تو یہ بھی جائز ہے۔

''قال في البحر: ولو شرط أن يبيعها و يشتري بثمنها أرضا أخرى ولم يزد صح استحسانا وصارت الثانية وقفا بشرائط الأولى'' (شامی ۶، ۵۸۵)۔

(۲) شئ موقوفہ ایسی ہوجس سے انتفاع کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اس کی چار قسمیں ہوتی ہیں، کیونکہ وہ شئ موقوفہ یا تو منقولہ ہوگی، یا غیر منقولہ، اگر غیر منقولہ ہے تو اس کی دو قسمیں ہیں (۱) وہ آمدنی کے لئے وقف ہو (۲) آمدنی کے لئے وقف نہ ہو۔ اور اگر منقولہ ہے تو اس کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) عمارت موقوفہ کا ملبہ ہو (۲) عمارت موقوفہ کے آلات ہوں۔ تو اس طرح سے چار شکلیں بنتی ہیں:

اقسام:

(۱) آمدنی کے اوقاف ہوں جو ویران ومنہدم ہوجائیں، جیسے دوکانیں اور زراعت کی زمین جو نا قابل کاشت ہوجائے۔

(۲) غیر آمدنی کے اوقاف ہوں، مثلاً مدارس، مساجد، مقابر وغیرہ۔

(۳) ملبہ اوقاف ہو، یعنی عمارت موقوفہ کے وہ اجزاء جن کی ضرورت نہ رہ جائے ان کے خراب ہوجانے کی وجہ سے یا عمارت کے ویران ومنہدم ہوجانے کی وجہ سے، مثلاً اینٹ، پتھر وغیرہ۔

(۴) آلات وقف یعنی وہ چیزیں جو وقف کی ضروریات کے لئے ہوں، مثلاً فرش، چٹائی، پنکھا وغیرہ۔

اختلاف علماء: اقسام مذکورہ سے جب انتفاع نہ ہوسکے ان اوقاف کے ویران ومنہدم ہوجانے کی بنا پر، اور لوگوں کی عدم ضرورت کی وجہ سے، یا اس جگہ سے مسلمانوں کے ہجرت کرجانے کی بنا پر اوقاف معطل غیر منتفع ہوجائیں تو ان کے حکم میں حضرات صاحبین کا اختلاف ہے، اور امام صاحبؒ سے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں کے قولوں کے مطابق روایت ہے۔

امام محمدؒ سے دو روایتیں منقول ہیں:

(۱) بطلان وقف ورجوع الی الواقف کی ہے، یعنی وقف باطل ہوجائے گا اور واقف کی ملکیت میں چلا جائے گا۔

(۲) دوسری روایت عدم بطلان وقف وعدم رجوع الی الواقف کی ہے۔ پہلی روایت کو ضعیف کہا گیا ہے۔

''قال في الذخيرة: وفي المنتقى قال هشام: سمعت محمدا يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين

فللقاضی أن يبيعه فيشتری بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضی، وأما عود الوقف بعد خرابه إلى ملك الواقف أو ورثته فقد قدمنا ضعفه'' (شامی ۵۴۷)۔

قول ابن ہمام: علامہ ابن ہمام امام محمدؒ کے قول کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ویران اور منہدم ہونے والے اوقاف دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) ایک تو جس کی ویرانی اور انہدام کی وجہ سے واقف کا مقصود بالکل فوت ہوجاتا ہے، اور کوئی ایسی صورت نہیں ہوتی جس کے ذریعہ واقف کے مقصود کو بحال کیا جاسکے، مثلاً دکان جو منہدم ہوجائے اور اس کے تعمیر کی کوئی صورت نہ ہو اور وہ خالی زمین کرایہ پر بھی نہ نکل سکتی ہو، یا مسافر خانہ، مدرسہ، یا حوض، تالاب وغیرہ جو کسی وجہ سے اس طرح ویران ہوجائے یا منہدم ہوجائے کہ ان کو دوبارہ آباد کرنے پر قدرت نہ ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی حالت میں یہ سب اوقاف واقف کی ملک میں لوٹ جائیں گے۔

(۲) اور دوسرے اوقاف وہ ہوتے ہیں جن کی ویرانی اور انہدام سے واقف کا مقصود بالکل فوت نہیں ہوتا ہے، بلکہ ویران اور منہدم ہونے کے بعد بھی ان کے ذریعہ سے کسی نہ کسی درجے میں واقف کے مقصود کو باقی رکھا جاسکتا ہے، مثلاً کوئی زمین وقف کی ہو اور لوگ ہجرت کرجائیں، یا کرایہ کے ہوٹل وغیرہ ہوں، منہدم ہونے کے بعد ان سے انتفاع ممکن ہے، مثلاً زمین میں پودے لگوادیئے جائیں یا کسی کو کرایہ پر دے دے جو اس زمین اور جگہ پر تعمیر وغیرہ کرکے آمدنی حاصل کرکے زمین کا کرایہ ادا کرتا رہے، تو ایسے اوقاف جو منہدم ہونے کے بعد بھی واقف کے مقصود سے بالکل نہیں نکلتے ہیں ان کا حکم یہ ہے کہ وقف باطل نہیں ہوگا اور جو آمدنی حاصل ہوگی واقف کے بیان کردہ مصرف میں صرف کردی جائے گی، ایسے اوقاف واقف کے ملک میں واپس نہ ہوں گے۔

''كما فی الشامية نقلا عن الفتح، ذكر فی الفتح: ما معناه أنه يتفرع على الخلاف المذكور ما إذا انهدم الوقف وليس له من الغلة ما يعمر به فيرجع إلى البانی أو ورثته عند محمد، خلافا لأبی يوسف، لكن عند محمد إنما يعود إلى ملكه ما خرج عن الانتفاع المقصود الواقف بالكلية كحانوت احترق ولا يستأجر بشئ، ورباط وحوض محلة خرب وليس له ما يعمر به، فأما كان معدا للغلة فلا يعود إلى الملك إلا نقضه وتبقى ساحته وقفا توجر ولو بشئ قليل بخلاف الرباط ونحوه، فإنه موقوف للسكنى وامتنعت بانهدامه، أما دار الغلة فإنها قد تخرب وتغيركوما وهی بحيث لو نقل نقضها ليستأجر أرضها من يبنی أو يغرس ولو بقليل فيغفل عن ذلك وتباع لواقفها مع أنه لا يرجع إليه منها إلا النقض واستند فی ذلك للخانية وغيرها ظاهر كلامه واعتمده'' (شامی ۶،۵۴۹)۔

عند ابی یوسفؒ: امام ابو یوسفؒ سے اس سلسلے میں روایت یہ ہے کہ وقف ہوجانے کے بعد وقف کبھی باطل نہیں ہوتا، خواہ انتفاع کی کوئی صورت باقی رہے یا نہ رہے۔

''واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الإمام والثانی قوله عند الإمام والثانی فلا يعود ميراثا، فلا يجوز نقله و نقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أولا'' (در مختار مع الرد ۶،۵۴۸)۔

البتہ اس صورت میں اشیاء موقوفہ سے انتفاع نہ ہو، اس کی بیع کے سلسلے میں امام ابو یوسفؒ سے دو روایتیں منقول ہیں:

(۱) ان کو علی حالہ چھوڑ دینا واجب ہے، اس کو فروخت کرنا یا بعینہ ان اوقاف کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں۔

''لا يجوز نقله و نقل ماله إلى مسجد آخر'' (شامی ۶،۵۴۸)۔

(۲) ایسی اشیاء موقوفہ کو منتقل کرنا اس کی قیمت فروخت کرکے اسی جیسے دوسرے اوقاف میں استعمال کرنا واجب ہے۔

''ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف، عند أبی يوسف: ويباع نقضه بإذن القاضی ويصرف ثمنه إلى بعض المساجد'' (شامی ۵۴۹)۔

عند الامام: حضرت امام ابو حنیفہؒ سے حضرت امام محمدؒ کی روایت کے مطابق عدم انتفاع کی صورت میں بطلان وقف کی روایت، اور حضرت امام ابو یوسفؒ کی روایت کے مطابق عدم بطلان وقف کی روایت منقول ہے۔

’’قال في الإسعاف: ذكر بعضهم أن قول أبي حنيفة كقول أبي يوسف وبعضهم ذكره كقول محمد‘‘ (شامی ۶،۵۴۸)۔

حاصل: امام محمدؒ کی دونوں روایتوں اور ابن ہمام کی توضیح کا یہ حاصل نکلتا ہے کہ بطلان وقف کی روایت ایسے اوقاف پر محمول ہے جن کے ویران اور انہدام یا لوگوں کے استغناء کی وجہ سے واقف کا مقصد بالکل ختم ہوجائے تو ایسے اوقاف ویران اور لوگوں کے مستغنی ہوجانے کی صورت میں واقف کی ملک میں لوٹ جائیں گے، خواہ اشیاء منقولہ کی قبیل سے ہوں یا غیر منقولہ کی قبیل سے ہوں، مثلاً مدارس، جہاد کے لئے وقف کی ہوئی سواری، مسجد کی چٹائی، پنکھا وغیرہ اور جیسے اوقاف کے ملبے وغیرہ۔ اور عدم بطلان کی روایت جو بروایت ہشام ہے ایسے اوقاف پر محمول ہے جن کے تعطل اور لوگوں کے استغناء سے واقف کا مقصود نہیں فوت ہوتا ہے، مثلاً زراعت کی زمین اور باغات، یعنی ایسے اوقاف جو حصول آمدنی کے لئے ہوں تو ان کے انہدام اور تعطل کے باوجود کسی نہ کسی درجہ میں واقف کا مقصود باقی رہتا ہے، لہذا ایسے اوقاف کا وقف باطل نہ ہوگا بلکہ اگر آمدنی بہت کم ہوجائے تو اسکو فروخت کر کے نیا وقف آمدنی کے لئے تیار کیا جائے، اگر چہ اس کی آمدنی پہلے والے سے کم ہو، البتہ اگر اس کی قیمت سے نیا وقف بھی تیار نہ ہوسکے تو اس صورت میں مقصود ختم ہوجانے کی وجہ سے واقف کی ملک میں لوٹ جائے گا۔

’’والحال أنه إن أمكن شراء شئ يستغل ولو قليلا أوإجارة الأرض بشئ ولو قليلا فعل وحفظ لعمارة مابقي ولوخرب الكل و تعذر أن يشترى بثمنه مستغل ولو قليلا حينئذ يرجع إلى الواقف‘‘ (فتح القدير ۶،۲۳۸)۔

لہذا امام محمدؒ کی روایت کے مطابق غیر آمدنی کے اوقاف اور اوقاف کے ملبے جو کار آمد نہ ہوں اور اوقاف کے دوسرے سامان تعطل یا استغناء کی صورت میں واقف کی ملک ہوجائیں گے، اسی طرح آمدنی کے وہ اوقاف بھی واقف کی ملک ہوجائیں گے جن کے انہدام و تعطل سے مقصد ختم ہوجائے اور اس کی قیمت سے بھی دوسرے وقف کی تیاری ممکن نہ ہو، البتہ آمدنی کے وہ اوقاف جن کی اجرت و قیمت سے مقصد کی بحالی ممکن ہو ایسے اوقاف کا وقف باطل نہ ہوگا بلکہ اس کے مقصد کو بحال کیا جائے گا۔

اور امام ابو یوسفؒ کی روایت کے مطابق وقف باطل نہ ہوگا، اور جواز بیع والی روایت کی بنا پر بیع و استبدال جائز ہے۔ لہذا تمام اوقاف جو منہدم یا مستغنی ہو جائیں ان کی بیع یا نقل واجب ہے۔

القول المفتی بہ: اقسام مذکورہ میں سے قسم رابع بھی وقف کے آلات (سامان ضرورت وغیرہ) کے سلسلہ میں فتوی امام محمدؒ کے قول پر ہے کہ اگر آلات نا قابل انتفاع ہوجائیں تو اگر واقف یا اس کے ورثاء کو معلوم ہو تو ان کی ملکیت میں لوٹ جائیں گے ورنہ بحکم لقطہ ہیں، ’’كما صرح به في فتح القدير‘‘ (۶،۲۳۸)

’’إن الفتوى على قول محمد في آلات المسجد والمراد بآلات المسجد نحو القنديل والحصير‘‘ (شامی ۵۴۹)

’’وهكذا في البحر‘‘ (۵،۲۵۲)۔

آمدنی کے یا غیر آمدنی کے اوقاف وملبۂ وقف میں قول مفتی بہ:

فرش اور چٹائی وغیرہ، یعنی آلات وقف کے علاوہ وقف کی دوسری تمام چیزوں میں فتوی امام ابو یوسفؒ کی دونوں روایتوں پر مصرح ہے، متقدمین کا فتوی عدم جواز بیع ونقل پر ہے، یعنی ان لوگوں کے نزدیک وقف کے سامان کو فروخت کرنا یا بغیر فروخت کئے اس سامان کو ضرورت نہ ہونے کے وقت دوسرے وقف میں صرف کرنا جائز نہیں۔

’’(عند الثاني) لا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أولا، وهو الفتوى حاوى القدسي وأكثر المشائخ عليه مجتبى، وهو الأوجه فتح‘‘ اھ (شامی ۵۴۸)۔

اور متاخرین نے امام ابو یوسفؒ کی دوسری روایت پر فتوی دیا ہے، یعنی جب وقف ویران اور منہدم ہوجائے اور لوگوں کو اس کی ضرورت نہ رہے تو اس کے سامان کو یا اس کی قیمت کو قریبی جہت کے دوسرے وقف میں صرف کردیا جائے گا۔

’’ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف، فيباع نقضه بإذن القاضي ويصرف ثمنه إلى المساجد‘‘ (شامی ۵۴۹) ’’وفي الدر: فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر إلى أقرب مسجد أو

رباط أو بئر عليه تفريع إلى قولهما، هذا التفريع إنما يظهر على ما ذكره الشارح من الرواية الثانية عن أبي يوسف، وقدمنا أنه جزم بها في الإسعاف'' (در مختار مع الرد ۵۴۹)۔

نوٹ: لیکن حضرات متاخرین مسجد کے سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ کی روایت اولی کو ترجیح دیتے ہیں۔

حاصل: مسجد اور اسی طرح دوسری موقوفہ عمارتوں کے ملبے، یعنی اینٹ، پتھر، کڑی وغیرہ کا حکم یہ ہے کہ اگر اسی موقوفہ کو تعمیر کرنا ممکن ہو تو اس کی تعمیر میں ان کو یا ان کی قیمتوں کو صرف کر دیا جائے گا، اور اگر اس وقف کی تعمیر ممکن نہ ہو تو اسی جہت کے کسی دوسرے قریبی وقف میں وہ اشیاء اگر قابل استعمال ہوں ورنہ ان کی قیمتوں کو لگا دیا جائے گا۔ دوسری جہت کے اوقاف میں صرف کرنا جائز نہیں۔

''سئل شيخ الإسلام عن أهل قرية رحلوا أو تداعى مسجدها إلى الخراب وبعض المتغلبة يستولون على خشبه و ينقلونه إلى دورهم، هل لواحد لأهل المحلة أن يبيع الخشب بأمر القاضي ويمسك الثمن ليصرفه إلى بعض المساجد أو إلى هذا المسجد؟ قال: نعم، وحكى أنه وقع مثله في زمن سيدنا الإمام الأجل في رباط في بعض الطرق خرب ولا ينتفع المارة به، وله أوقاف عامرة فسئل هل يجوز نقلها إلى رباط آخر ينتفع الناس به، قال: نعم، لأن الواقف فرضه انتفاع المارة ويحصل ذلك بالثاني'' (شامی ۶،۵۵۰)۔

(۳) تیسری قسم، یعنی جب موقوفہ اشیاء ایسی ہو جائیں کہ ان سے ان پر ہونے والا خرچ بھی حاصل نہ ہو سکے، چاہے وہ جائداد ہو یا دیگر اوقاف مستغلہ، ان کا حکم دوسری قسم کا حکم ہے کہ یہ انتفاع سے بالکلیہ خارج ہیں، لہذا اس کی بیع واستبدال جائز ہے۔

''أولا يفي بمؤنته فهو جائز على الأصح'' (شامی ۶،۵۸۴)۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ شئ موقوفہ سے انتفاع ہو رہا ہو، لیکن بیع واستبدال کی صورت میں نفع زائد ہو، یعنی بدل انفع ہو، اس کے حکم میں حضرات علماء کے دو قول ہیں:

۱۔ استبدال کی صورت میں اگر نفع زیادہ ہو تو بیع واستبدال جائز ہے۔

''الرابعة: أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن صقعا فيجوز على قول أبي يوسف وعليه الفتوى'' (شامی ۳،۳۸۹)

۲۔ اگر شئ موقوفہ سے انتفاع ہو رہا ہو تو اس کی بیع واستبدال جائز نہیں اگرچہ بدلنے میں نفع زائد ہو۔

''والعمل على قول أبي يوسف معارض بما قاله صدر الشريعة نحن لا نفتي به، وقد شاهدنا في الاستبدال ما لا يعد ويحصى فإن ظلمة القضاة جعلوه حيلة لإبطال أوقاف المسلمين الخ'' (شامی ۳،۳۸۹)۔

ترجیح: علامہ شامیؒ نے قول ثانی کو راجح قرار دیا ہے کیونکہ بیع واستبدال اگر شرط واقف کی بنا پر نہ ہو تو بغیر ضرورت کے جائز نہیں اس بنا پر کہ وقف میں اصل اشیاء موقوفہ کو علی حالہ باقی رکھنا ہے اصل کے خلاف بغیر ضرورت کے نہ کیا جائے گا اور جب انتفاع بالکل ختم ہو جائے تو مجبوراً وضرورتاً بیع جائز ہے، اور جب نفع بالکل ختم نہ ہو، بلکہ انتفاع ہو رہا ہو اور بدلنے میں نفع زائد ہو تو اس صورت میں بیع واستبدال صرف نفع کو زائد کرنے کے لئے مقصد وقف کے بالکل خلاف ہے، لہذا بیع ناجائز ہوگی۔

''قال العلامة البيري بعد نقله: أقول وفي فتح القدير: والحاصل أن الاستبدال إما عن شرط الاستبدال أولا عن شرطه فإن كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف عليهم، فينبغي أن لا يختلف فيه وإن كان لا لذلك بل اتفق أنه أمكن أن يؤخذ بثمنه ما هو خير منه مع كونه منتفعا به، فينبغي أن لا يجوز لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة، ولأنه لا موجب لتجويزه، لأن الموجب في الأول الشرط، وفي الثاني الضرورة، ولاضرورة في هذا إذ لا تجب الزيادة بل نبقيه كما كان الخ، أقول ما قاله هذا المحقق هو الحق والصواب'' (شامی ۳،۳۸۹)

(۵) پانچویں قسم وہ اوقاف جن سے آمدنی جاری ہو اور واقف نے بدلنے کی شرط نہ لگائی ہو اور نہ ہی استبدال میں نفع زیادہ ہو تو ایسے اوقاف کی بیع باطل ہے۔ بیع کے بعد مشتری اگر اس سے نفع اٹھائے اور پھر بیع کو لوگ ختم کر دیں اور مشتری کو اس کا ثمن واپس کر دیں تو ایسی صورت میں جتنے دن مشتری نے اس وقف سے

فائدہ حاصل کیا ہے اتنے دن کی اجرت مثل لازم ہوگی۔

''وإذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه'' (هدايه ۶۲۰) اگر چہ وہ اوقاف آمدنی حاصل کرنے کے نہ ہوں، مثلاً مسجد ہو یا مدرسہ، کما صرح۔

''ودخل ما لو كان الوقف مسجداً أو مدرسة سكن فيه فتجب فيه أجرة المثل'' (شامی ۶۱۵)۔

بطلان بیع وقف سے انتفاع کا حکم: پانچویں قسم جس کا بیان سطور بالا میں ہوا اس سے انتفاع بیع کے باطل ہونے کی وجہ سے حرام ہے اور بیع کو ختم کر دینا واجب ہے، اگر بیع کو فوراً ختم نہ کیا اور وقف سے نفع اٹھاتا رہا تو جب لوگ بیع کو ختم کر کے مشتری کا پیسہ واپس کریں گے تو جتنے دن فائدہ حاصل کیا ہے اتنے دن کی اجرت مثل لازم ہوگی۔

''كما فی الشامی حتى لو باع المتولی دار الوقف فسكنها المشتری ثم أبطل القاضی البيع كان على المشتری أجرة المثل (فتح) وبه أفتى الرملی وغيره كما قدمناه وما فی الإسماعيلية من الإفتاء بخلافه تبعا للقنية فهو ضعيف كما صرح به فی البحر'' (شامی ۶۱۵-۶۰)۔

خلاصہ: بیع واستبدال کی سب پانچ صورتیں بنتی ہیں: (۱) واقف نے بدلنے کی شرط لگائی ہو، (۲) وقف سے انتفاع بالکل ختم ہو جائے، خواہ وقف کی آمدنی صرف اتنی ہو جس سے وقف کا اپنا ذاتی خرچ بھی پورا نہ ہو سکے، (۳) کسی ایسے غاصب نے غصب کر لیا جس سے واپس لینا ناممکن ہو اور غاصب اس کا عوض دینے پر راضی ہو، (۴) وقف سے انتفاع جاری ہو، لیکن بیع واستبدال کی صورت میں واقف کی آمدنی زیادہ ہو جائے اور بدل مبدل عمدہ وانفع ہو، (۵) وقف سے انتفاع جاری ہو اور بدلنے کی صورت میں کوئی نفع بھی نہ ہو۔

حکم: مذکورہ صورتوں میں سے تین صورتوں میں مفتی بہ قول کے مطابق بیع واستبدال ذکر کردہ شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ اور چوتھی صورت میں حضرات علماء کا اختلاف ہے۔ بہت سے علماء نے حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق بیع کو جائز کہا ہے اور اسی کو قول مفتی بہ بھی بتلایا ہے، اور بہت سے علماء نے بیع ناجائز وحرام کہا ہے، علامہ شامیؒ نے استدراک قائم کر کے صاحب فتح کے قول کے ذریعہ عدم جواز کو ترجیح دیا ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اگر بیع واستبدال کو جائز کہا جائے تو اس کے ذریعہ ابطال اوقاف کا دروازہ کھلے گا، نیز یہ استبدال بلاضرورت ہے، کیونکہ اوقاف کا مقصود آمدنی کا بڑھانا نہیں، بلکہ ان کو حالت سابقہ پر باقی رکھنا ہے تو خلاف مقصود کے ذریعہ بلاضرورت اس کے ضیاع کا اندیشہ کیوں پیدا کیا جائے، لہٰذا راجح عدم جواز ہے۔ پانچوں قسم کی بیع واستبدال بالاتفاق باطل ہے۔

نوٹ: بیع کے جواز وعدم جواز کا مدار صرف دو چیزوں پر ہے: ۱۔ شرط واقف، ۲۔ ضرورت، ان دونوں میں سے کوئی ایک پائی جائے تو بیع واستبدال جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔

''إلا فی أربع الأولى لو شرطه الواقف، الثانية إذا غصبه غاصب وأجرى عليه الماء حتى صار بحرا فيضمن القيمة ويشتری المتولی بها أرضا بدلا، الثالثة أن يجحده الغاصب ولا بينة أی وأراد دفع القيمة فللمتولی أخذها يشتری بها بدلا، الرابعة أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن صقعا، فيجوز على قول أبی يوسف وعليه الفتوى كما فی فتاوى قاری الهداية، قال صاحب النهر فی كتابه إجابة السائل: قول قاری الهداية والعمل على قول أبی يوسف معارض، فما قال صدر الشريعة: نحن لا نفتی به وقد شاهدنا فی الاستبدال مالا يعد و يحصى فإن ظلمة القضاة جعلوه حيلة لإبطال أوقاف المسلمين وعلى تقديره فقد قال فی الإسعاف: المراد بالقاضی هو قاضی الجنة المفسر بذی العلم والعمل ولعمری إن هذا أعز من الكبريت الأحمر وما أراه إلا لفظا يذكر فالأقوى فيه السدّ خوفا من مجاوزة الحد والله سائل كل إنسان''۔

وقف کے بدل کے احکام:

بدل کی سب پانچ صورتیں بنتی ہیں، کیونکہ جس کو بدلا جائے گا دو حال سے خالی نہیں: (۱) یا تو وہ وقف کا ملبہ، یعنی انقاض وقف ہوگا (۲) یا تو اوقاف ہوں گے، اگر اوقاف ہوں تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں: (۱) یا تو آمدنی کے لئے اوقاف ہوں گے (۲) یا تو آمدنی کے لئے نہ ہوں گے۔ پھر یہ بھی دو حال سے خالی

نہیں: (۱) اصل وقف کو قائم کرنے کی ضرورت ہوگی (۲) یا نہ ہوگی۔

(۱) انقاض: اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ان کے اوقاف موجود ہوں تو ان کو اگر قابل استعمال ہیں، ورنہ اس کی قیمت کو ان کے اوقاف میں صرف کیا جائے گا۔

''فإن احتاج الوقف إلى عود النقض أعاده الحصول المقصود به، وإن استغنى عنه أمسكه إلى أن يحتاج إلى عمارته (ولا يجوز) وإن تعذر إعادة عينه إلى موضعه بيع وصرف ثمنه إلى المرمة صرفا للبدل إلى مصرف المبدل۔ ملخصاً'' (بحر الرائق ۲۲۰)۔

غیر آمدنی کے اوقاف:

(۲) غیر آمدنی کے جس وقف کو بدلنا ضروری ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے بدلے میں اسی نوع کا دوسرا وقف قرب وحسن مکانی کی رعایت کرتے ہوئے قائم کیا جائے جو بعینہ پہلے والے وقف کے درجہ میں وقف ہوگا۔

''وفي الخانية الصحيح قول أبي يوسف، لأنه شرط لا يبطل حكم الوقف، لأن الوقف يحتمل الانتقال من أرض إلى أرض أخرى ويكون الثاني قائما مقام الأولى الخ'' (بحر الرائق ۲۲۱)۔

(۳) غیر آمدنی کے جس وقف کو بدلنے اور فروخت کرنے کے علاوہ کوئی صورت نہ ہو اور اس کے بدلے دوسرے وقف کا قیام عدم ضرورت یا کسی اور وجہ سے متعذر ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسی جہت کے دوسرے اوقاف میں اس کی قیمت اور بدل کو استعمال کیا جائے۔

''رباط بعيد و استغنى عنه المارة و بجنبه رباط آخر، قال السيد الإمام أبو الشجاع: تصرف غلته إلى الرباط الثاني كالمسجد إذا خرب واستغنى عنه أهل القرية فرفع ذلك إلى القاضي فباع الخشب وصرف الثمن إلى مسجد آخر جاز'' (شامی ۵۵۰)۔

آمدنی کے اوقاف:

(۴) آمدنی کے جس وقف کو بدلنے اور بیع کرنے کے علاوہ اور کوئی صورت نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے بدلے یا اس کی قیمت کے بدلے ایسا وقف حاصل کیا جائے جو پہلے وقف سے انفع یا کم سے کم اس کے مساوی ہو، اور اس کی آمدنی کو موقوف علیہم پر اگر موجود ہوں ورنہ اسی نوع کے دوسرے اوقاف میں استعمال کیا جائے۔

''وإذا كانت موقوفة الاستغلال فالظاهر عدم اشتراط اتحاد الجنس على المنظور فيها كثرة الريع وقلة المرمة وقابلية البقاء۔ شرط آخر وهو اتحاد المحلة أوكون الثانية أحسن'' (منحة الخالق ۲۲۲) ''لو اشترى ببدل الوقف فإنه يصير وقفا كالاولى على شروطه وإن لم يذكر شيئاً'' (شامی ۶۲۷) في الخلاصة قال المسجد إذا خرب أو الحوض إذا خرب ولم يحتج إليه لتفرق الناس عنه صرفت أوقافه في مسجد آخر أو حوض آخر'' (شامی ۶۳۶)۔

(۵) آمدنی کے جس وقف کو بدلنا لازم ہو اور اسی جیسے دوسرے وقف کا قیام ناممکن ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا بدل اور اس کی قیمت موقوف علیہم ورنہ اسی جیسے دوسرے اوقاف میں استعمال کیا جائے۔

''ونقل في الذخيرة عن شمس الائمة الحلواني أنه سئل عن مسجد أو حوض خرب ولا يحتاج إليه لتفرق الناس عنه هل للقاضي أن يصرف أوقافه إلى مسجد أو حوض آخر فقال: نعم، و مثله في البحر عن القنية'' (شامی ۵۵۰)۔

اقسام اوقاف عامرہ: آباد اوقاف کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وقف حصول آمدنی کے لئے ہوں یا حصول آمدنی کے لئے تو نہ ہوں، لیکن ان اوقاف کے لئے آمدنی کے اوقاف ہوں۔

(۲) اوقاف حصول آمدنی کے نہ ہوں اور نہ ہی ان کے لئے آمدنی کے اوقاف ہوں۔

احکام: پہلی قسم کا حکم: جس وقف کے پاس آمدنی ہو خواہ وہ آمدنی اسی وقف سے حاصل ہو یا ان پر موقوفہ اوقاف سے حاصل ہو تو اس سلسلہ میں کچھ تفصیل ہے:

(۱) کہ اگر واقف نے اس وقف کے اخراجات کے لئے آمدنی کا کوئی حصہ متعین نہیں کیا ہے تو آمدنی میں سب سے پہلے اس وقف کے اخراجات ضروریہ نکالے جائیں گے اگر ضرورت ہو ورنہ اسکو موقوف علیہم کے اخراجات میں صرف کیا جائے گا۔

۱۔ ''الثانی عشر لو وقف علی المساکین ولم یذکر العمارة یبدأ من الغلة بالعمارة وبما یصلحها وبخراجها ومؤنتها ثم یقسم الباقی علی المساکین'' (۵،۲۱۶)۔

۲۔ ''فالمراد بالوقف الذی یبدأ من غلته بعمارته العین الموقوفة للغلة والعین الموقوف علیها کالمسجد إذ لا شك أن کلا موقوف علیه الغلة بمعنی أنهما مشروط صرف الغلة إلی عمارتها'' (تقریرات رافعی ۸۱) (شامی ۶،۵۵۹)۔

(۲) اور اگر واقف نے آمدنی سے اوقاف کے ذاتی اخراجات کے لئے حصہ مقرر کیا ہے یا مقرر نہیں کیا ہے، لیکن آمدنی سے اخراجات وقف کی شرط لگائی ہے تو پہلے آمدنی سے اوقاف کے اخراجات کے لئے حصہ متعینہ یا جتنی ضرورت پڑ سکتی ہو نکال لیا جائے گا اگرچہ فی الحال کوئی ضرورت نہ ہو، کیونکہ آئندہ ضرورت پڑنے کا امکان ہے اور یہ ہوسکتا ہے کہ جب ضرورت ہو اس وقت آمدنی نہ رہے تو اسی وضع کردہ واقف کے ذکر کردہ مصارف میں شرائط واقف کی رعایت کے ساتھ صرف کیا جائے گا۔

''لو شرط الواقف تقدیم العمارة ثم الفاضل للفقراء أو للمستحقین لزم الناظر إمساك قدر العمارة کل سنة وإن لم یحتجه الان لجواز أن یحدث حدث ولا غلة بخلاف ما إذا لم یشترطه فلیحفظ الفرق بین الشرط وعدمه'' (درمختار ۵۶۶،۵۶۵،۶) ''وکذا فی البحر لو اجتمع من الغلة مقدار ما یحتاج الأرض والمسجد إلی العمارة ویمکن العمارة بها و یفضل تصرف الزیادة إلی الفقراء علی ما شرط الواقف'' (بحر الرائق ۲۱۶،۲۱۵،۵)۔

(۳) اوقاف کا خرچ نکالنے کے بعد اگر موقوف علیہم افراد اور جماعت متعینہ نہ ہوں تو اخراجات ضروریہ کے بعد سب سے پہلے ان چیزوں پر صرف کیا جائے گا جو تعمیر سے معنوی طور پر زیادہ قریب ہیں، یعنی جن کے نہ ہونے کی صورت میں تعطل وقف ہوجاتا ہے تو یہ بھی حقیقت میں عمارت سے ملحق ہیں پھر دوسرے مصالح میں صرف کیا جائے گا، مثلاً مسجد و مدرسہ پر وقف ہو تو اس صورت میں پہلے آمدنی سے اخراجات عمارت نکالے جائیں گے پھر امام و مؤذن اور معلمین مدرسہ کو ان کی کفایت کے بقدر دیا جائے گا، پھر چٹائی، روشنی، و دیگر مصالح وقف میں صرف کیا جائے گا۔

''ویبدأ من غلته بعمارته ثم ما هو أقرب لعمارته کإمام مسجد ومدرس مدرسة یعطون بقدر کفایتهم ثم السراج والبساط کذلك إلی آخر المصالح'' (در مختار ۶۶۱،۶۶۰،۵۵۹)۔

''قوله ثم ما هو أقرب لعمارته الخ أی فإن انتهت عمارته و فضل من الغلة شئ یبدأ بما هو أقرب للعمارة وهو عمارته المعنویة التی هی قیام شعائره'' (شامی ۵۶۰) ''إلی قوله هذا إذا لم یکن معینا یعنی أن الصرف إلی ما هو أقرب إلی العمارة کالإمام ونحوه إنما هو فیما إذا لم یکن الوقف معینا علی جماعة معلومین کالمسجد والمدرسة'' (شامی ۶،۵۶۱)۔

(۴) اور اگر موقوف علیہم افراد و جماعت متعینہ ہوں تو اس کے اخراجات نکالنے کے بعد آمدنی ان لوگوں پر صرف کردی جائے گی بغیر تقدم و تاخر کی رعایت کے، جیسے وقف علی الأولاد یا وقف علی الفقراء۔

''أما لو کان معینا کالدار الموقوفة علی الذریة أو الفقراء، فإنه بعد العمارة یصرف الریع إلی ما عینه الواقف بلا تقدیم لأحد علی أحد. فاغتنم هذا التحریر'' (شامی ۵۶۱)۔

اگر واقف نے وقف حصول آمدنی کے لئے کیا، لیکن موقوف علیہم اس کو اپنی دوسری ضرورتوں میں استعمال کریں تو جائز ہے۔ ان کے ذمہ اجرت بھی نہیں لازم ہوگی، البتہ اخراجات وقف ان کے ذمہ ہوں گے، اور موقوف علیہم کا آمدنی کے علاوہ دوسری ضرورتوں میں استعمال کرنا جائز ہے۔

"فلا عمارة على من له الاستغلال، لأنه لا سكنى له فلو سكن بل تلزمه الأجرة الظاهر لا لعدم الفائدة إلا إذا احتيج للعمارة فيأخذها المتولي ليعمر بها" (در مختار ۶؍۵۷۱،۵۷۰)۔

"قوله: لأنه لا سكنى له قال في البحر وظاهر كلام المصنف وغيره أن من له الاستغلال لايملك السكنى ومن له السكنى لا يملك الاستغلال إلى قوله: قلت ويؤيده أن الخصاف سوى بين المسئلتين لكنه فرق بينهما في محل آخر بأن من له الاستغلال له السكنى، لأن سكناه كسكنى غيره بخلاف العكس، لأنه يوجب فيها حقا لغيره ومن له الاستغلال إذا سكن لايوجب حقا لغيره وادعى الشرنبلالي في رسالته أن الراجح هذا" (شامی ۶؍۵۷۱،۵۷۰)۔

نوٹ: اور اگر رہائش کے لئے وقف کیا تو اس کو حصول آمدنی کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔

(۶) اور اگر واقف نے حصول آمدنی کے لئے وقف کیا اور اس کے اخراجات کی شرط موقوف علیہم کے ذمہ رکھا تو یہ شرط کالعدم ہے۔

"ولو شرط الواقف غلتها له و مؤنتها عليه صحّا و هل يجبر على عمارتها؟ الظاهر لا" (در مختار ۶؍۵۷۲،۵۷۱) "وفي الرد قلت علمت أن صحة الشرط غير صحيحة في عبارة التاتارخانية و تعليل الهداية شامل للشرط وغيره فهو دليل على عدم صحته إلى قوله؛ لأن كلام الواقف لا يصح ملزما له بتعميرها إذ لا ولاية له على المستحق" (شامی ۶؍۵۷۲)۔

حاصل یہ ہے کہ اگر وقف سے آمدنی ہو رہی ہو یا اس وقف کے پاس آمدنی کے دوسرے اوقاف ہوں تو اس کے اخراجات اسی کی آمدنی سے پورے کئے جائیں گے اگر چہ واقف نے اخراجات کی ذمہ داری موقوف علیہم کے ذمہ رکھی ہو۔

ابقاء وقف: واقف نے آمدنی کے اوقاف کو جس عمل میں وقف کیا تھا اس کو اسی طرح باقی رکھا جائے گا، اگر باغات ہیں تو سوکھنے والے پودوں کی جگہ دوسرے نئے پودے لگائے جائیں گے، زراعت کی زمین ہے تو اس کو قابل زراعت رکھنے کی پوری کوشش کی جائے گی، اگر دوکان و مکانات ہیں تو ان کی اصلاح و مرمت وغیرہ، یہ سب اسی وقف کی آمدنی سے اپنی اسی حالت پر باقی رکھے جائیں گے، مکانات میں رنگ و روغن وغیرہ نہیں کرتا تھا تو بغیر موقوف علیہم کی اجازت کے نہیں کئے جائیں گے۔

وقف میں زیادتی: اور اگر اس وقف میں ایسی زیادتی کی ضرورت پڑے جس سے وقف کی آمدنی بڑھ جائے اور وقف کا اپنا خرچ کم ہو جائے جس میں موقوف علیہم کا فائدہ ہو تو ایسی زیادتی جس میں موقوف علیہم کا فائدہ ہو، بغیر اجازت کے بھی جائز ہے۔ آمدنی میں اضافہ کرنے والی زیادتی ممنوع نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے اجازت شرط ہے۔

"ولو كان الوقف على معين فالعمارة في ماله بقدر ما يبقى الموقوف على الصفة التي وقفه. فإن خرب يبنى كذلك ولا تجوز الزيادة بلا رضاء، ولو كان على الفقراء فكذلك وعند البعض تجوز والأول أصح (هدايه ملخصا) وبه علم أن عمارة الوقف زيادة على ما في زمن الواقف لا تجوز بلا رضا المستحقين وظاهر قوله بقدر ما يبقى منع البياض والحمرة على الحيطان من مال الوقف إن لم يكن فعله الواقف وإن فعله فلا منع" (شامی ۵۶۰)۔

"وفي حاشية الشامية مطبوعة مكتبة زكريا: قوله منع البياض الحمرة الخ قال شيخنا: وقد رأيت تقييد ذلك بما إذا لم يورث البياض والحمرة زيادة في الأجرة إن كان كذلك فلا منع ثم قال: وهو تقييد حسن ويظهر أن الزيادة في أماكنه كذلك، حاشية الشامية للمحشي الشيخ عادل أحمد عبد الموجود والشيخ علي محمد مفوض" (ص ۵۶۰)۔

جہت آمدنی کی تبدیلی کا حکم:

موقوفہ زمین میں اگر آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے دوکان یا مکان (ہوٹل) وغیرہ تعمیر کر دئے جائیں یا مزروعہ زمین میں باغ لگا دئے جائیں تو یہ سب امور انفع للوقف ہونے کی وجہ سے جائز ہیں۔ مثلاً شہر کے اندر خالی زمین وقف کی گئی اگر اس پر دوکان یا کرایہ کے مکانات تعمیر کر دئے جائیں، یا مزروعہ زمین ہے جس کی کاشت میں دشواری ہوتی ہے اگر باغ لگا دئے جائیں تو دشواری دور ہو جائے گی اور وقف کی آمدنی میں اضافہ بھی ہو جائے گا تو وقف کے فائدہ کے لئے

جہت آمدنی کا تبدیل کردینا جائز ہے۔

''کما فی البحر: وإن أراد قیم الوقف أن یبنی فی الأرض الموقوفة بیوتا یستغلها بالإجارة لا یکون له ذلك، لأن استغلال أرض الوقف یکون بالزرع ولو کانت الأرض متصلة ببیوت المصر یرغب الناس فی استیجار بیوتها و تکون غلة ذلك فوق غلة الزرع والنخل کان للقیم أن یبنی فیها بیوتا فیواجرها، لأن الاستغلال بهذا الوجه یکون أنفع للفقراء'' (بحر الرائق ۵،۲۱۶)۔

فاضل آمدنی کا مصرف:

ایک وقف کی فاضل آمدنی کو دوسرے جہت کے وقف میں یا اسی جہت کے وقف میں استعمال کرنے کی سب چار صورتیں بنتی ہیں۔ ان میں سے دو جواز کی ہیں اور دو عدم جواز کی ہیں۔ اگر جہت متحد ہو تو ایک کی فاضل آمدنی دوسرے میں استعمال کرنا جائز ہے۔ اور اگر جہت مختلف ہو تو ایک کی فاضل آمدنی دوسرے میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱) واقف اور جہت وقف دونوں متحد ہوں، یعنی ایک ہی شخص نے ایک جہت پر متعدد وقف کئے، ایک وقف ایک مصلحت کے لئے اور دوسرا دوسری مصلحت کے لئے، مثلاً زید نے مدرسہ پر دو زمینیں وقف کیں، ایک زمین معلمین کی تنخواہ کے لئے اور دوسری مدرسہ کی عمارت کے لئے۔

''إن الوقف ومحل الوقف اعنی الجهة إن اتحدت بأن کانا وقفا علی المسجد، أحدهما إلی العمارة والآخر إلی إمامه أو مؤذنه'' (بحر الرائق ۵،۲۱۶)۔

حکم: اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر ایک مصلحت سے آمدنی بچ جاتی ہے تو اسی جہت کی دوسری مصلحت میں فاضل آمدنی صرف کرنا جائز ہے۔

''والإمام والمؤذن لا یستقر لقلة المرسوم للحاکم الدین أن یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة إلی الإمام والمؤذن باستصواب أهل الصلاح من أهل المحلة إن کان الواقف متحدا؛ لأن غرض الواقف إحیاء وقفه و ذلك یحصل بما قلنا'' (بحر الرائق ۲۱۶)۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ واقف مختلف ہوں اور جہت وقف متحد ہوں، یعنی چند لوگوں نے اپنی اپنی زمینوں کو ایک ہی جہت پر وقف کیا، مثلاً زید و عمرو و بکر نے مسجد یا مدرسہ پر اپنی اپنی زمین وقف کیا۔

حکم: اس صورت کا حکم بھی پہلی صورت کے حکم کی طرح ہے، یعنی ایک کے فاضل آمدنی کو دوسرے میں استعمال کرنا جائز ہے۔

''مسجد له أوقاف مختلفة لا بأس للقیم أن یخلط غلتها وإن خرب حانوت فیها لا بأس بعمارته من غلة حانوت آخر اتحد الواقف أو لا'' (بحر الرائق و حاشیہ بحر ۵،۲۱۷)۔

(۳) تیسری قسم یہ ہے کہ واقف ایک ہو اور جہت مختلف ہو، مثلاً زید نے ایک زمین مسجد کے لئے اور ایک زمین مدرسہ کے لئے وقف کیا، یا مکان کی ایک منزل رہائش کے لئے اور ایک منزل کرایہ کے لئے وقف کیا۔

''اتحد الواقف واختلفت الجهة بأن بنی مدرسة و مسجدا وعین لکل وقفا'' (البحر الرائق ۲۱۶) ''فی الحاشیة قال الرملی من اختلاف الجهة: ما إذا کان الوقف منزلین أحد هما للسکنی والآخر للاستغلال'' (حاشیہ بحر ۲۱۶)۔

حکم: اس صورت کا حکم یہ ہے کہ ایک کی فاضل آمدنی دوسرے پر صرف نہیں کی جائے گی، بلکہ واقف کی شرط و مقصد کی اتباع واجب ہے۔

''فلا یصرف أحدهما للآخر وهی واقعة الفتوی، تأمل'' (حاشیہ البحر ۲۱۶) ''وفضل من غلة أحدهما لا یبدل شرط الواقف''۔

(۴) واقف بھی الگ الگ ہوں اور جہت وقف بھی الگ الگ ہو، مثلاً چند لوگوں نے الگ الگ وقف الگ الگ جہت پر کیا، ایک نے مدرسہ پر دوسرے نے

مسجد پر تیسرے نے مسافر خانہ پر۔

حکم: اس صورت کا حکم تیسری صورت کے حکم کی طرح ہے۔ایک کی فاضل آمدنی دوسرے پر صرف کرنا جائز نہیں۔

''وکذا إذا اختلف الواقف لا الجهة يتبع شرط الواقف'' (البحر الرائق ۲۱۷)۔

مذکورہ چاروں صورتوں اور ان کے احکامات سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایک کی فاضل آمدنی کو دوسرے پر استعمال کرنا کس وقت جائز اور کس وقت ناجائز ہے۔
اب اس پر ہم تفریعاً چند مسئلہ ذکر کرتے ہیں۔

''وقد علم بهذا التقرير اعمال الغلتين إحياء للوقف ورعاية شرط الواقف هذا هو الحاصل من الفتاوى'' (البحر الرائق ۲۱۷)۔

تفریع:

(۱) مسئلہ: اگر مسجد کی موقوفہ زمین قابل کاشت نہ رہ جائے اور اس میں مصالح عامہ کے لئے حوض یا تالاب بنا دیا جائے تو لوگوں کے لئے اس کے پانی کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

''أرض وقف على المسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضا للعامة لا يجوز للمسلمين انتفاع بماء ذلك الحوض، قنية'' (هنديه ۲،۴۶۴)۔

(۲) مسئلہ: مسجد کی آمدنی اس کی ضرورت سے زائد ہو تو اس کو فقراء و مساکین پر صرف کرنا جائز نہیں۔

''الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء؟ قيل: لا يصرف وأنه صحيح، لكن اشترى به مستغلا للمسجد'' (هنديه ۲،۴۶۳)۔

(۳) مسئلہ: وضو کے لئے وقف کئے گئے حوض سے پانی پینا جائز نہیں۔ ''إذا وقف للوضوء لا يجوز الشرب منه'' (هنديه ۲،۴۶۵)۔

(۴) مسئلہ: مسجد کی آمدنی سے کپڑا خرید کر مساکین و فقراء کو دینا جائز نہیں اور دینے والے کے ذمہ ضمان آئے گا۔

''ولو اشترى القيم بغلة المسجد ثوبا و دفع إلى المساكين لا يجوز وعليه ضمان ما نقد من مال الوقف'' (هنديه ۴۶۲)۔

زائد آمدنی جس کی حفاظت دشوار ہو: اگر کسی مسجد یا مدرسہ کے ایسے اوقاف ہوں جن کی آمدنی مسجد و مدرسہ وغیرہ کے خرچ سے زائد ہو اور آئندہ کے لئے بھی ضرورت محسوس نہ ہو رہی ہو تو اس آمدنی کو دوسرے مدرسہ یا مسجد یعنی اسی جہت کے دوسرے اوقاف کی ضرورتوں میں خرچ کیا جائے گا۔

''وعند أبي يوسف يباع ذلك ويصرف ثمنه إلى حوائج المسجد فإن استغنى عنه هذا المسجد يحول إلى مسجد آخر'' (بحر الرائق ۵،۲۵۲)۔

اور اگر اسی وقف (موقوف علیہ) کو آئندہ ضرورت پڑنے کا اور آمدنی نہ ہونے کا اندیشہ ہو تو بقدر ضرورت اس وقف کے لئے آمدنی کو محفوظ کیا جائے گا۔

''الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء، قيل: لا يصرف وانه صحيح لكن يشترى به مستغلا للمسجد'' (هنديه ۴۶۳) تا کہ ضرورت کے وقت کام آئے، اور آمدنی کو محفوظ کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کوئی زمین اس وقف کے نام سے خرید لی جائے اور ضرورت کے وقت فروخت کر کے اس کی قیمت استعمال کی جائے۔

''إما فيما اشتراه المتولي من مستغلات الوقف، فإنه يجوز بيعه بلا هذا الشرط إلى قوله والمختار أنه لا يكون وقفا فللقيم أن يبيعه متى شاء لمصلحة عرضت'' (منحة الخالق حاشيه بحر)۔

وقف مجہول الجہتہ :

کسی زمین یا مکان ودوکان کا وقف ہونا لوگوں میں مشہور ہو کہ یہ چیز وقف کی ہے، لیکن جہت وقف کا علم کسی کے پاس نہ ہو کہ یہ چیزیں کس مصرف کے لئے وقف کی گئیں تھیں تو ان کا حکم یہ ہے کہ اس زمین کے سابقہ کاغذات اور پہلے کے منتظمین وقف کی فائلیں دیکھ کر معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ وقف کس مصرف کے لئے تھا، اگر کسی طرح جہت وقف کا علم نہ ہو سکے تو ایسے اوقاف کی آمدنی کو فقراء پر صرف کیا جائے۔

''فی الدر لو انقطع ثبوته فما كان فی دواوين القضاء (قوله انقطع ثبوته الخ) المراد علم أنه وقف بالشهرة ولكن جهلت شرائطه ومصارفه بأن لم يعلم حاله ولا تصرف قوامه السابقين كيف كانوا يعملون وإلى من يصرفونه، فحينئذ ينظر إلى ما فی دواوين القضاة، فإن لم يوجد فيها لا يعطى أحد ممن يدعى فيه حقا لم يبرهن۔ فان لم يبرهن يصرف للفقراء؛ لأن الوقف فی الأصل لهم وقد علم مجرد كونه وقفا ولم يثبت فيه حق لغيرهم فيصرف إليهم'' (شامی ۶،۶۶۸)۔

حکم معلوم الجہتہ ومعدوم المصرف:

اگر وقف کی جہت معلوم ہو اور موقوف علیہم مفقود ہوں یا ان تک آمدنی کا پہونچانا دشوار ہو، مثلاً کسی مدرسہ یا مسجد یا مسافر خانہ کا وقف تھا اور اب وہ سب ختم ہو گئے، یا کسی بستی کے مصالح عامہ پر وقف تھا اور اس بستی کے لوگ معلوم نہیں کہاں گئے، یا ان کی جگہ معلوم تو ہو، لیکن ان لوگوں تک پہونچانا دشوار ہو تو اس کا یہ حکم ہے کہ اسی جہت کے مصارف میں صرف کیا جائے، مدرسہ کا وقف دوسرے مدرسہ پر اور مسجد کا دوسری مسجد پر صرف کیا جائے۔ جہت کے معلوم ہوتے ہوئے دوسری جہت پر صرف کرنا جائز نہیں۔

''فی رد المحتار حاصله أن المنقول عندنا أن الموقوف عليه إذا خرب يصرف وقفه إلى مجانسه فتصرف أوقاف المسجد إلى مسجد آخر وأوقاف الحوض إلى حوض آخر والا رصاد نظير الوقف'' (شامی ۶،۶۳۶)۔

حاصل یہ کہ بقدر ممکن واقف کے مقصد کی رعایت کی جائے گی، اسی لئے اگر موقوف علیہم کو فی الحال یا فی المآل اس فاضل آمدنی کی ضرورت ہو موقوف علیہ کے علاوہ دوسرے پر صرف نہ کیا جائے گا، اور اگر ضرورت نہ ہو تو اسی جہت پر صرف کیا جائے گا، لہذا اگر کسی آبادی کے لوگوں کے لئے وقف تھا تو چونکہ اس وقف کا اصل مقصود فقراء تھے، اس لئے فقراء پر صرف کیا جائے گا۔

وقف کی دوسری قسم:

(۱) وہ اوقاف جو آمدنی کے لئے نہ ہوں بلکہ رہائش وغیرہ کے لئے ہوں تو ان کے اخراجات موقوف علیہم کے ذمہ ہوں گے۔

''ولو كان الموقوف داراً فعمارته على من له السكنى ولو متعدداً من ماله لا من الغلة إذ الغرم بالغنم'' (در مختار ۵۶۸،۵۶۹)۔

(۲) اور اگر موقوف علیہم فقیر ہوں یا خرچ نہ دیں اس وقت وقف کے اتنے حصے کو کرایہ پر دیدیا جائے گا جس سے وقف کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

''ولو بنى خانا واحتاج إلى المرمة روى عن محمد أنه يعزل منه بيت أو بيتان وتواجر و ينفق من غلتها عليه'' (بحر ۲۱۶)۔

(۳) اور اگر غیر آمدنی کے اوقاف کو موقوف علیہم آمدنی کے لئے استعمال کرنا چاہیں تو جائز نہیں، البتہ آمدنی کے اوقاف کو رہائش وغیرہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

''من له السكنى لا يملك الاستغلال بلا خلاف واختلف فی عكسه۔ والراجح الجواز كما حرره الشرنبلالی فی رسالة'' (شامی ۵۶۹)۔

تعمیر ومرمت: اگر موقوف علیہم کے پاس آمدنی ہو، خواہ اسی سے حاصل ہوتی ہو یا اس پر موقوفہ اوقاف سے حاصل ہوتی ہو تو آمدنی کو اگر تعمیر ومرمت کی ضرورت ہو تو

اس پر صرف کیا جائے گا، اگر تعمیر ضروری ہے اور تاخیر کی گنجائش نہیں ہے تو سب سے پہلے تعمیر میں استعمال کیا جائے گا، اگر بچے تو ان لوگوں کو دیا جائے گا جن کو نہ دینے میں وقف کا نقصان ہو، اور اگر نہ بچے بلکہ پوری آمدنی تعمیر ومرمت ہی میں ختم ہو جائے تو کسی کو کچھ بھی نہ ملے گا، اور اگر تاخیر کی گنجائش ہے تعمیر میں جو سب سے زیادہ ضروری ہو اس کو مقدم کیا جائے گا بعدہ بقدر کفایت ان لوگوں کو دیا جائے گا جن کو نہ دینے میں وقف کا نقصان ہو، زمانہ تعمیر میں خواہ ضروری ہو یا ضروری نہ ہو، بلکہ تاخیر کی گنجائش ہو ان لوگوں کو کچھ نہ ملے گا جن کو نہ دینے میں وقف کا نقصان نہ ہو، ایسے لوگوں پر تعمیر ہر حال میں مقدم رہے گی۔

''والحاصل بما تقرر وتحرر أنه يبدأ بالتعمير بالضروري حتى لو استغرق جميع الغلة صرفت كلها إليه ولا يعطى أحد ولو إماما أومؤذنا فإن فضل عن التعمير شئ يعطى ما كان أقرب إليه مما في قطعه ضرر بيّن، وكذا لو كان التعمير غير ضروري بأن كان لا يؤدي تركه إلى خراب العين ولو أخر إلى غلة السنة القابلة فيقدم الأهم فالأهم ثم من لا يقطع يعطى المشروط له إذا كان قدركفايته وإلا يزاد أو ينقص وإن لم يكن في قطعه ضرر بيّن قدمت العمارة ليه وإن أمكن تأخيرها إلى غلة العام القابل كماهومقتضى إطلاق المتون ولا يعطى شئ أصلا'' (شامی ۶،۵۶۵)

آمدنی نہ ہو تعمیر کی ضرورت ہو:

اگر اوقاف کے پاس آمدنی نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ وہ آمدنی کے اوقاف نہ ہوں اور موقوف علیہم تعمیر ومرمت کا خرچ نہ دیں اپنے فقر کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے، یا وہ آمدنی کے اوقاف ہوں یا ان کی آمدنی کے لئے دوسرے اوقاف ہوں، لیکن آمدنی حاصل نہ ہو، یا آمدنی تو ہو، لیکن تعمیر ومرمت اس آمدنی سے نہ ہو سکے، تو ایسے اوقاف کا حکم یہ ہے کہ ان اوقاف کو اتنے دن کے لئے کرایہ پر دیدیا جائے گا جتنے دن کی آمدنی سے تعمیر وغیرہ ہو جائے۔ اور اگر کرایہ پر نہ اٹھے یعنی وہ ایسا ہو کہ لوگ اسکو کرایہ پر نہیں لیتے ہیں یا ایسی جگہ ہو جس کی وجہ سے کرایہ نہ ملے تو قرض لے کر تعمیر کی جائے، اور اگر قرض نہ ملے اور نہ ہی کرایہ حاصل ہو تو بعض کو فروخت کر کے بقیہ وقف کو تعمیر کیا جائے، چونکہ اول اجارہ ہے پھر قرض ہے، پھر بیع ہے، اس لئے پہلے اجارۂ وقف بعدہ استقراض للوقف، اور پھر بیع وقف کو ذکر کیا جائے گا۔

احکام اجارۃ: جب اوقاف کی تعمیر ومرمت کے لئے اتنی آمدنی نہ ہو جس سے وقف کی تعمیر ومرمت کی جائے تو ایسی صورت میں اوقاف کو اتنی مدت کے لئے جس کے کرایہ سے وقف کی تعمیر ومرمت ہو سکے کرایہ پر دینا جائز ہے، کسی خاص مدت کی تعیین ایسی صورت میں نہیں ہے، البتہ کرایہ پر دینے میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے وقف ضائع نہ ہو اور مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد کرایہ دار کو الگ کرنے کا اختیار باقی رہے۔

''وفي فتاوى قارى الهداية: إذا لم تحصل عمارة الوقف إلا بذلك يرفع الأمر للحاكم ليؤجره اكثر اى إذا احتيج إلى عمارته من أجرته يؤجره الحاكم مدة طويلة بقدر مايعمر به'' (شامی ۶۰۶)۔

چونکہ اوقاف کے اجارہ کی مدت فقہاء متقدمین نے متعین نہیں کی تھی، لیکن بعد کے فقہاء نے وقف کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے مدت اجارہ کو متعین کر دیا ہے۔ زراعت کی زمین کے لئے تین سال کی مدت اجارہ اور مکانوں وغیرہ کے لئے ایک سال مدت اجارہ متعین کی گئی ہے، لیکن جب مصلحت کا تقاضا ہو تو ایسی صورت میں کمی بیشی بھی کی جائے گی اور تجدید مدت کی علت وقف کو ضیاع سے بچانا ہے، لہذا اگر بغیر تجدید کے دوسری صورت سے یہ مقصد حاصل ہو جائے تو تجدید لازم نہ ہوگی۔

''إن المختار أنه لا يجوز في الدور أكثر من سنة إلا إذاكانت المصلحة في الجواز وفي الضياع يجوز إلى ثلاث سنين إلا إذا كانت المصلحة في عدم الجواز وهذا أمر يختلف باختلاف الزمان والمواضع الخ، وأشار الشارح إلى أنه لا يخالف مافي المتن، لأن أصل عدول المتاخرين عن قول المتقدمين بعدم التوقيت إلى التوقيت إنما هو بسبب الخوف على الوقف فإذا كانت المصلحة الزيادة أو النقص اتبعت وهو توفيق حسن'' (شامی ۶،۶۰۶)۔

اجرت متقدمہ: جس چیز کو کرایہ پر دے کر کرایہ پیشگی وصول کیا جائے اس کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ کرایہ پر دی جانے والی چیز موجود ہو اور کرایہ وصول کر لینے کے بعد شئ مستاجرہ کرایہ دار کے سپرد کرنے کی شرط ہو۔

۲۔ شئ مستاجرہ موجود ہو اور آئندہ کسی تاریخ معینہ پر سپرد کرنے کا معاملہ ہو اور اجرت کو پیشگی ادا کرنا شرط ہو۔

۳۔ شئ مستاجرہ موجود نہ ہو اور اجرت پیشگی وصول کرکے آئندہ کسی تاریخ میں سپرد کرنے کی شرط ہو۔

احکام: پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ پیشگی اجرت وصول کرکے شئ مستاجرہ کو سپرد کردینا جائز ہے، اور یہ عقد اجارہ لازم و درست ہے۔

''أما إذا شرط فی تعجیلها ملکت بالشرط وجب تعجیلها الخ'' (بدائع ۴،۲۰۲)۔

دوسری صورت، یعنی اجرت پیشگی وصول کرنا اور شئ مستاجرہ کو آئندہ کسی تاریخ میں سپرد کرنے کی شرط لگانا، اسکو اصطلاح فقہ میں اجارۂ مضافہ کہتے ہیں، اور اس کے حکم میں حضرات علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء فرماتے ہیں کہ اجارہ مضافہ لازم ہوجاتا ہے، اور پیشگی اجرت کا وصول کرنا اور اس کی شرط لگانا درست ہے، وصول کرنے کے بعد اجرت کا مالک ہوجائے گا۔ اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ اجارہ لازم نہ ہوگا، لہذا وصول کردہ اجرت بحکم قرض ہوگی، اجارہ کے لازم نہ ہونے کی وجہ سے جانبین کو عقد اجارہ کے ختم کرنے کا اختیار ہوگا۔ اقوال مذکورہ میں سے دونوں اقوال کی تصحیح حضرات علماء نے فرمائی ہے لیکن اول کو صحیح اور ثانی کو اصح کہا ہے اور یہی قول مفتی بہ بھی ہے، اور ضرورت کے وقت قول صحیح یعنی لزوم عقد پر فتوی کی گنجائش ہے۔

''کما ذکر فی الشامیة مطلب فی لزوم الإجارة المضافة تصحیحان۔ وقال: قال قاضی خان. وذکر شمس الائمة السرخسی: إن الاجارة المضافة تکون لازمة فی إحدی الروایتین وهو الصحیح۔ ویؤخذ بروایة الملك هنا للحاجة۔ قلت وقد ذکر الشارح فی أواخر کتاب الإجارة أن روایة عدم اللزوم تأیدت بأن علیها الفتوی أی فتکون أصح التصحیحین، لأن لفظ الفتوی فی التصحیح أقوی۔ لکن أنت خبیر بأن روایة عدم اللزوم هنا لا تنفع، لأنه یثبت للمستاجر الفسخ فیرجع بماعجله من الأجرة، وإن قلنا إنما تملك بالتعجیل فینبغی هنا ترجیح روایة اللزوم للحاجة نظیر ماقاله قاضی خان فی روایة الملك'' (شامی ۶،۶۰۷)۔

تیسری صورت، یعنی شئ مستاجرہ موجود نہ ہو اور عقد اجارہ کے ذریعہ پیشگی اجرت وصول کرلی جائے اور شئ مستاجرہ کو آئندہ کسی تاریخ تک تعمیر وغیرہ کرکے سپرد کرنے کا معاملہ ہو، یعنی غیر موجود کا عقد اجارہ۔ اس کے حکم کی صراحت نظر سے نہیں گذری، البتہ اصول سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ غیر موجود کا عقد اجارہ منعقد نہ ہوگا۔ اور وہ کالعدم ہوگا، اجرت بحکم قرض ہوگی اور مؤجر کو دوسرے سے عقد اجارہ کرنے کا اختیار رہے گا۔ دلیل یہ ہے کہ اجارہ میں معقود علیہ منفعت ہوتی ہے لیکن اس کی جگہ پر اس کے سبب یعنی شئ مستاجرہ کو رکھ کر معاملہ درست ہوجاتا ہے، لہذا جب معقود علیہ نہ ہوگا تو عقد اجارہ کس پر منعقد ہوگا۔

اور صاحب ''بدائع'' عقد اجارہ ہوجانے کے بعد معقود علیہ کے ہلاک ہوجانے کی صورت میں عقد اجارہ کے بقاء اور عدم بقاء پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ جو چیز یقین سے ثابت ہو تو اس کی بقاء کے لئے انتفاع کا وہم بھی کافی ہے، اور جو چیز یقین سے ثابت نہ ہو تو اس کے ثبوت کے لئے وہم کافی نہیں، بلکہ یقین کی ضرورت ہے، لہذا جب معقود علیہ موجود نہ ہو تو صرف وجود کے وہم سے عقد اجارہ کیسے منعقد ہوگا۔

''والأصل فیه أن العقد المنعقد بیقین یبقی لتوهم الفائدة؛ لأن الثابت بیقین لا یزال بالشك کما أن غیر الثابت بیقین لا یثبت بالشك'' (بدائع ۴،۱۹۶)۔

اجارۃ البعض لحفظ الکل: پورے وقف کی حفاظت کے لئے بعض حصہ کو کرایہ پر دینا، مثلاً پورے قبرستان کی حفاظت کے لئے اس کے بعض حصہ پر دوکان تعمیر کردی جائے، تو ایسا کرنا جائز ہے۔

''الثالث عشرة لو بنی خانا واحتاج إلی المرمة روی عن محمد أنه یعزل منه بیت أو بیتان فتواجر و ینفق من غلته علیه'' (بحر ۲۱۶)۔

بعض علماء نے وقف کو ظالم کی دست درازی سے بچانے کے لئے اس کی بیع اور اس کے ثمن کو اس کی مثل میں صرف کرنے کا فتوی دیا، لیکن چونکہ اس فتوی سے ضیاع وقف کا اندیشہ تھا اس لئے اسکو فتوی کے لئے اختیار نہیں کیا گیا۔

''کما فی البحر: وفی الفتاوی قیم وقف خاف من السلطان أو من وارث یغلب علی أرض وقف یبیعها و یتصدق

بثمنها، وكذا كل قيم إذا خاف شيئاً من ذلك له أن يبيعه ويتصدق بثمنها۔ قال الصدر الشهيد: والفتوى على أنه لا يبيع الخ'' (بحر ۵،۲۱۷)۔

جب وقف کو ظالم سے بچانے کے لئے بیع کی اجازت تھی تو اجارہ بعض حکم شرع کے عین مطابق ہے اور شامی وغیرہ میں بھی اجارہ کی اجازت مصرح ہے۔

آمدنی کا حکم: جب وقف کے بعض حصہ پر بغرض حفاظت دوکان تعمیر کردی جائے تو دوکان سے حاصل ہونے والی آمدنی کا حکم یہ ہے کہ اس وقف کو جتنی ضرورت ہو اتنا تو اس کی ضرورت میں صرف کیا جائے۔ اور جو باقی بچے اس کے مثل دوسرے اوقاف میں صرف کیا جائے۔

''يصرف ثمنه إلى حوائج المسجد، فإن استغنى عنه هذا المسجد يحول إلى مسجد آخر'' (بحر ۵،۲۵۲)۔

قبرستان کی دوکان کی آمدنی:

قبرستان کی حفاظت کی غرض سے جب دوکان تعمیر کی جائے تو اس کی آمدنی کا بھی مصرف وہی ہوگا جو چند صفحہ پہلے گذرا، یعنی جتنی ضرورت ہو اس قبرستان میں صرف کی جائے اور بقیہ کو دوسری قبرستانوں کی حفاظت میں خرچ کیا جائے یہی اولی واحوط ہے۔

رفاہی کاموں میں استعمال:

قبرستان کی زمین پر تعمیر شدہ دوکانوں کی فاضل آمدنی کا محتاط مصرف تو دوسرے مقابر کی حفاظت ہے، البتہ علامہ عینیؒ کی قبرستان کے بارے میں ذکر کردہ علت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے رفاہی دینی کاموں میں استعمال کرنا جائز ہے، مثلاً مسجد کی ضروریات میں یا دینی مدارس وغیرہ میں۔

''قال الحافظ العيني: فإن قلت هل يجوز أن تبنى المساجد على قبور المسلمين، قلت: قال ابن القاسم: لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى قوم عليها مسجدا لم أر بذلك بأسا، وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين الخ'' (عمدة القارى ۴،۱۷۹)۔

وقف کے لئے قرض: وقف کی ضرورتوں کے لئے قرض لینا جائز ہے۔

شرائط: دوشرطوں کے ساتھ۔ (۱) قاضی (اوقاف کے منتظمین مسلم دیانتدار) کی اجازت ہو، (۲) وقف کو کرایہ پر دے کر اس سے کرایہ حاصل کرنا اور اس کی اجرت کو ضرورتوں میں استعمال کرنا بہت دشوار ہو۔

''لا تجوز الاستدانة على الوقف إلا إذا احتيج إليها لمصلحة الوقف كتعمير و شراء بذر فيجوز بشرطين۔ الأول إذن القاضي۔ والثاني أن لا تيسر إجارة العين والصرف من أجرتها'' (درمختار ۶،۶۵۷)۔

قرض کی شکلیں اور ان کا حکم:

(۱) وقف کے پاس آمدنی ہو اور متولی اپنے پاس سے وقف کی ضرورتوں میں صرف کردے بغیر منتظم وقف کی اجازت کے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ متولی اپنی خرچ کردہ رقم خود سے لے سکتا ہے دیانۃً، البتہ اگر منتظمین سے مطالبہ کرے گا تو گواہوں کے قیام کے بغیر نہ ملے گی۔

''إن الناظر إذا أنفق من مال نفسه على عمارة الوقف ليرجع فى غلته له الرجوع ديانة لكن لوادعى ذلك لايقبل منه، بل لا بد أن يشهد أنه أنفق'' (شامی ۶،۶۵۸)۔

(۲) وقف میں ٹھیکہ پر تعمیر کروانا۔ مثلاً وقف کے پاس آمدنی نہ ہو اور وقف کو تعمیر کی ضرورت ہو تو متولی یا منتظمین وقف کسی بلڈر سے یہ معاملہ کرلیں کہ اس زمین پر تعمیر کردو، اس کے عوض میں تم کو اتنی رقم ملے گی۔ یا جو مصارف آئیں گے وہ وقف دے گا اور بطور اجرت کے اتنی رقم مزید ملے گی، یا تعمیر ہوجانے کے بعد اس کا اتنا حصہ آپ کو بطور ملک کے ملے گا، یعنی آپ اتنے حصہ کے مالک ہوں گے۔

حکم: مذکورہ صورتوں میں تعمیر پر آنے والے مصارف کے بقدر بلڈر کا وقف مقروض ہوگا اور جتنا خرچ آیا ہے وقف کے ذمہ قرض ہوگا، یا متعینہ رقم قرض ہوگی۔

اور معاملہ میں تعمیر کے بعد بعض حصۂ وقف کے اجارہ یا بیع کی شرط لگانا شرط فاسد ہوگی جو قرض میں باطل ہوجاتی ہے، لہٰذا بیع واجارہ کی شرط غیر معتبر ہوگی۔ اور شرط مذکور کی بنا پر بلڈر کو اجارہ یا بیع کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا اور مطالبہ ناجائز وحرام ہوگا۔ ''کل قرض جر نفعا فهو ربا'' (الحدیث)، بعض حصہ کو بیع کی شرط کیساتھ بلڈر سے معاملہ کرنا ناجائز وحرام ہے کیونکہ اس میں بیع وقف ہے جو ناجائز ہے، اور اگر صرف عمارت کی بیع مانی جائے کہ جب تک اس حصہ کی عمارت موجود رہے گی بلڈر کو اس میں ہر طرح کے تصرفات کا حق ہوگا تو اجرت قفیز طحان کی قبیل سے ہوگی۔

''دفع أرضه ليغرس شجرا على أن تكون الأرض والشجر بينهما نصفين لم يجز والشجر لرب الأرض وعليه قيمة الشجر'' (هنديه۴۴۵)۔

بیع البعض لحفظ الکل: وقف کے بعض حصہ کو یا کسی وقف پر موقوفہ وقف کو پورے وقف کی حفاظت کے لئے فروخت کرنا جائز ہے۔ یعنی کوئی وقف منہدم ہونے کے قریب ہو یا منہدم ہوگیا ہو یا معطل ہوگیا ہو اور اس کی تعمیر اور اس کی حفاظت کا کوئی طریقہ نہ ہو سوائے بعض حصہ کو فروخت کرکے اس کی قیمت سے تعمیر و تحفظ کیا جائے، نہ اجارہ پر اٹھ سکے نہ قرض مل سکے تو بقدر ضرورت وقف کو فروخت کرنا جائز ہے۔

''فی الخیریة إن أمکن عمارة المسجد بغلتها شيئاً فشيئاً ولا يخشى انهدام المسجد يجب عمارته منها وان لم يمكن تباع و يعمر المسجد من ثمنها قال فی التتارخانية نقلا عن فتاوى النسفي سئل عن أهل محلة باعوا وقف المسجد لأجل العمارة قال: يجوز بأمر القاضي وغيره، هو موافق للقاعدة المشهورة إذ اجتمع ضرران قدم أخفهما ولا نعلم أحدا من علمائنا خالف فی هذه المسئلة لاسيما الواقف لهما متحدان'' (فتاوى خيريه۱۲۹، حاشيه البحر منحة الخالق۵،۲۲۰)۔

بیع البعض لمصالح الوقف: وقف کے بعض حصہ کو، موقوفہ جائداد وغیرہ کو وقف کی مصلحت یعنی توسیع، آمدنی میں اضافہ وغیرہ کے لئے فروخت کرنا جائز نہیں۔

''قال الرملي: أقول: قال فی البزازية: بيع عقار المسجد لمصلحته لا يجوز'' (منحة الخالق۵،۲۲۱)۔

معطلہ مقبرہ: وہ قبرستان جو آبادی کے اندر آگئے ہیں اور ان پر دفن کا سلسلہ موقوف ہو خواہ حکومت کے پابندی لگانے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے، جب قبرستان میں دفن کا سلسلہ بالکل ختم ہوجائے تو اس کا حکم انقطاعِ انتفاع بالکلیہ کا حکم ہے، یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ کے مفتی بہ قول کے مطابق اس کے بدلہ دوسرا قبرستان قائم کردیا جائے۔

''وعن الثاني ينقل إلى مسجد آخر بإذن القاضي و مثله حشيش المسجد، وكذا الرباط إلى أقرب مسجد أو رباط الخ'' (درمختار۶،۵۴۹)۔

اور اگر اس کا بدلنا متعذر ہو تو اس قبرستان میں مسجد ومدرسہ اور دینی تعلیمی وتبلیغی مرکز قائم کردئے جائیں۔ البتہ تمام قبروں کو برابر کردیا جائے اور ان کو کھودا نہ جائے، اور بنیاد کی کھدائی میں جو ہڈیاں وغیرہ نکلیں ان کو احترام سے کسی جگہ دفن کردے۔ اور مقبرہ کی زمین پر بیت الخلاء، استنجاخانہ وغیرہ اگر قبریں نئی ہوں تو قائم نہ کیا جائے۔

''فی العمدة أن المقابر وقف من أوقاف المسلمين۔ والمسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين'' (عمدة ۵،۱۷۹)

''وحمل النهي على الجلوس لقضاء الحاجة يراد به نهي التحريم وماذكره غيره من كراهة الوطأ الخ. يراد به كراهة التنزيه في غير قضاء الحاجة وتنتفي الكراهة مطلقاً إذا كان الجلوس للقراءة الخ'' (شامي ۱،۶۰۶)۔

قبرستان کی مسجد:

مقبرہ میں جو مسجد موجود ہے اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ زمین قبرستان کی ہو بعد میں ضرورتاً مسجد تعمیر کرلی گئی ہو۔ (۲) وہ زمین قبرستان کی نہ ہو بلکہ مسجد کی ہو جس کو مسجد بنایا گیا ہو۔

پہلی قسم کا حکم: جو مسجد قبرستان کی زمین میں ضرورتاً تعمیر کی گئی ہو، اور اب اس کی توسیع کی سخت ضرورت ہو تو وہ قبرستان جس میں تدفین جاری ہے اگر فی الحال گنجائش

توسیع کی ہو تو توسیع جائز ہے، اور جب قبرستان تنگ ہوجائے گا تو پوری مسجد کو قبرستان بنادیا جائے گا، یا جتنے کی ضرورت ہو اتنا قبرستان بنادیا جائے گا۔

''وقد قال فی جامع الفصولین: المسجد الذی یتخذ من جانب الطریق لا یکون له حکم المسجد، بل هو طریق بدلیل أنه لو رفع حوائطه کما کان قبله قلت الظاهر أن هذا فی مسجد جعل کله من الطریق'' (۶،۵۷۵)۔

دوسری قسم کا حکم: اگر وہ مسجد قبرستان کی زمین پر نہ ہو بلکہ شروع سے مسجد ہی بنائی گئی ہو تو وہ قبرستان جس میں تدفین جاری ہے اس میں توسیع اسی وقت جائز ہے جب کہ فی الحال اور فی المآل قبرستان میں اتنی گنجائش ہو کہ توسیع کے بعد بھی قبرستان تنگ نہ ہو اور آئندہ مسلمانوں کو توسیع سے ضرر لاحق نہ ہو۔

''جعل شئ أی جعل البانی شیئاً من الطریق مسجدا لضیقه، ولم یضر بالمارین جاز؛ لأنها للمسلمین'' (۶،۵۷۴)۔

تنبیہ: علامہ شامیؒ کے ذکر کردہ مسئلہ سے قبرستان کی مساجد دو طرح کی ہوتی ہیں، اسی وجہ سے توسیع کے حکم میں بھی اختلاف ہوجاتا ہے کہ جب پوری مسجد قبرستان ہو اور بعد میں مسجد بنائی گئی ہو تو ایسی صورت میں وہ حصہ مسجد اسی وقت تک رہے گا جب تک مسجد کی عمارت موجود ہو۔ اور اگر پہلے سے مسجد موجود ہو قبرستان کی زمین پر نہ ہو تو ایسی صورت میں توسیع شدہ زمین کو اصل کے تابع مان کر مسجد شرعی مان لیں گے، جو کبھی مسجدیت سے نکل نہ سکے گی، تو ایسی صورت میں توسیع کے لئے شرط ہوگی کہ وہ حصہ فی الحال اور فی المآل فاضل ہو، لیکن تقریرات رافعی کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو توسیع ہوگی وہ مسجد شرعی نہ بنے گی، البتہ جو کراہت ہے راستہ وغیرہ میں نماز ادا کرنے کی وہ کراہت ختم ہوجائے گی، لہذا جب دیواریں اٹھادی جائیں گی تو وہ حصہ اپنی اصلی حالت میں لوٹ آئے گا، خواہ پوری مسجد وراستہ قبرستان میں ہو یا صرف توسیع شدہ حصہ قبرستان وراستہ ہو، دونوں میں کوئی فرق نہیں (تقریرات رافعی ر ۸۳، ۳۸۳، ۳۸۴)۔

''قوله: قلت: الظاهر أن هذا فی مسجد جعل کله من الطریق الخ۔ الظاهر أن حکم المسجدیة فی صورتی جعل کل الطریق مسجدا أو بعضه متحققة فیهما بدون فرق بین المسئلتین لکن ما دامت حوائطه قائمة وإلا عاد طریقا فیهما کما یأتی ما یفید هذا مما کتبناه عقب هذا'' (تقریر ۸۳)۔

احکام مساجد:

چونکہ مساجد کے احکام دوسرے اوقاف کے احکام سے الگ ہیں، مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسجد کے لئے دوسرے اوقاف کی طرح قاضی کا فیصلہ ضروری نہیں، اور امام محمدؒ کے نزدیک تسلیم الی المتولی کی شرط نہیں ہے اور امام ابویوسفؒ کے یہاں شیوع مانع مسجدیت ہے جب کہ دوسرے اوقاف میں شیوع مانع وقف نہیں، اس لئے ہم مسجد کے احکام کو الگ ذکر کررہے ہیں۔

''اعلم أن المسجد یخالف سائر الأوقاف فی عدم اشتراط التسلیم إلی المتولی عند محمد وفی منع الشیوع عند أبی یوسف وفی خروجه من ملك الواقف عند الإمام وإن لم یحکم به حاکم کما فی الدرر وغیره'' (شامی ۵۴۲)۔

سب سے پہلے مسجد ہونے کی شرائط ذکر کی جائیں گی کہ مسجد ہونے کے لئے کیا شرطیں ہیں اور علماء کا اختلاف کیا ہے اور قول مفتی بہ کیا ہے۔

شرائط:

۱۔ مسجد ہونے کے لئے تمام علماء کے نزدیک سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ بانی مسجد حصہ مسجد کو اپنی ملکیت کی دوسری زمینوں سے بالکل الگ کردے اور حدود مسجد کی حد بندی کردے کہ میں نے اتنے حصہ زمین ومکان کو مسجد بنایا، اگر حد بندی نہ کرے جس کی وجہ سے مسجد کا حصہ اس کی اور زمینوں سے الگ وممتاز نہ ہو تو مسجد نہ بنے گی۔

''إن المسجد لو کان مشاعا لا یصح اجماعا'' (شامی ۵۴۵)۔

۲۔ حضرات طرفین کے نزدیک دوسری شرط یہ ہے کہ جس حصہ کو مسجد کے لئے وقف کرے اس میں نماز ادا کرلی جائے، کیونکہ حضرات طرفین کے نزدیک وقف کو متولی کے حوالہ کردینا ضروری ہے اور وقف مسجد میں نماز ادا کرلینا تسلیم الی المتولی کے قائم مقام ہے۔

''أما الصلوة فیه فلأنه لابد من التسلیم عند أبی حنیفة و محمد فیشترط تسلیم نوعه و ذلك فی المسجد بالصلاة

فیه أو لأنه تعذر القبض یقام تحقق المقصود مقامه'' (بحر ۲۴۸)۔

البتہ ایک شخص کا نماز ادا کر لینا کافی ہے یا اذان وجماعت کے ساتھ نماز کا ادا کرنا مسجد ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اس میں دو روایتیں ہیں اور دونوں ظاہر الروایہ ہیں:

۱۔ حضرات طرفین نے مسجد ہونے کے لئے نماز باجماعت کی شرط لگائی ہے۔

''شرط الإمام و محمد الصلوة بجماعة'' (درمختار ۵۴۶، ۵۴۵)۔

''اشتراط الجماعة؛ لأنها مقصودة من المسجد ولذا شرط أن تكون جهرا بأذان وإقامة وإلا لم يصر مسجداً، قال الزيلعي: وهذه الرواية الصحيحة۔ إلى قوله وصححه في الخانية أيضا وعليه اقتصر فى كافي الحاكم فهو ظاهر الرواية أيضا'' (شامی ۵۴۶)۔

۲۔ حضرات طرفین کی دوسری روایت یہ ہے کہ نماز باجماعت مسجد ہونے کے لئے ضروری نہیں بلکہ واقف مسجد کے علاوہ کسی ایک شخص کا نماز ادا کر لینا کافی ہے۔

''وقيل يكفي واحد و جعله في الخانية ظاهر الرواية'' (درمختار ۶، ۵۴۶)۔

''في الحاشية وعليه المتون كالكنز والملتقى و غيرهما''۔

''ولو صلى الواقف وحده فالصحيح أنه لا يكفي؛ لأن الصلوة إنما تشترط لأجل القبض للعامة و قبضه لنفسه لا يكفي فكذا صلاته فتح واسعاف'' (شامی ۶، ۵۴۶)۔

نوٹ: مسجد کے لئے وقف کردہ زمین میں اگر نماز ادا کی جائے، بلکہ وہ زمین متولی کے حوالہ کردی جائے تو کیا وہ زمین مسجد ہوجائے گی یا نہیں اس مسئلہ میں بھی حضرات علماء سے دو روایتیں منقول ہیں:

۱۔ اگر مسجد کے لئے وقف کردہ زمین متولی یا عامۃ المسلمین کے قبضہ میں دے دی جائے تو اس زمین کے مسجد ہونے کے لئے نماز کی ادائیگی ضروری نہیں بلکہ متولی کے حوالہ کردینے سے مسجد بن گئی اور اسی روایت کو اکثر علماء نے ترجیح دیا ہے۔

''علمت أنه بالتسليم إلى المتولي يكون مسجدا دونها۔ أي دون الصلاة هذا هو الأصح كما في الزيلعي وغيره وفي الفتح وهو الأوجه؛ لأن بالتسليم إليه يحصل تمام التسليم إليه تعالى، وكذا لو سلمه إلى القاضي أو نائبه كما في الأ سعاف'' (شامی ۶، ۵۴۶)۔

دوسری روایت یہ ہے کہ مسجد کے لئے وقف کردہ زمین متولی یا عامۃ المسلمین کے سپرد کرنے سے مسجد نہ بنے گی، بلکہ اس کے مسجد ہونے کے لئے نماز کا ادا کرنا شرط ہے۔

''كما في الشامية: وقيل: لا واختاره السرخسي'' (شامی ۶، ۵۴۶)۔

حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک مسجد کے لئے زمین الگ کرنے کے بعد صرف اتنا کہنے سے بھی مسجد ہوجائے گی کہ میں نے اسکو مسجد بنایا۔ ان کے نزدیک نہ تو نماز کی ادائیگی مسجد ہونے کے لئے شرط ہے اور نہ ہی متولی وعامۃ المسلمین کے سپرد کرنا ضروری ہے۔ صرف اتنا کہہ کر زمین کو الگ کردینے سے مسجد ہو جائے گی۔

''وبقوله جعلته مسجداً عند الثاني'' (درمختار ۶، ۵۴۵)۔

قول راجح: حضرت امام ابویوسفؒ کا قول راجح ہے، لہذا کسی زمین کے مسجد ہونے کے لئے نماز کی ادائیگی یا تسلیم الی المتولی وعامۃ المسلمین ضروری نہیں، بلکہ صرف مسجد کی حدبندی کردینے سے مسجد ہوجائے گی۔

''قدم في التنوير والدرر والوقاية وغيرها قول أبي يوسف و علمت أرجحيته في الوقف والقضاء'' (شامی ۶، ۵۴۶)۔

عیدگاہ وجنازہ گاہ: عیدگاہ اور جنازہ گاہ کے سلسلے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں جن کو مختصر طور پر ذکر کیا جارہا ہے:

جنازہ گاہ: جنازہ کی نماز پڑھنے کے لئے اگر کوئی شخص زمین وقف کردے تو اس کا حکم مسجد کا حکم ہے، واقف کی ملکیت سے نکل جائے گی جس کی وجہ سے اس کی بیع اور اس کی وراثت کوئی چیز نافذ نہیں ہوگی۔

''فی الدر: ویزول ملکه عن المسجد والمصلی قوله والمصلی شمل مصلی الجنازة ومصلی العید، قال بعضهم: یکون مسجدا حتی إذا مات لا یورث عنه وقال بعضهم هذا فی مصلی الجنازة'' (شامی ۶،۵۴۵)۔

عیدگاہ: عیدگاہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ عیدگاہ کے لئے اگر کوئی شخص زمین وقف کرے تو وہ واقف کی ملکیت سے نکلے گی یا نہیں اس کے احکام میں چند اقوال ہیں:

۱۔ بعض لوگوں نے کہا کہ واقف کی ملکیت سے نکل جائے گی، اور اس پر مسجد کے احکام جاری ہوں گے۔ اس میں نہ تو وراثت جاری ہوگی اور نہ ہی اس کی بیع جائز ہوگی اور اس میں حائضہ ونفساء کا دخول بھی حرام ہوگا اور یہ مسجد ہوگی۔

۲۔ اور بعض لوگوں نے یہ کہا کہ عیدگاہ کو مسجد کا حکم بالکل نہیں دیا جائے گا، البتہ امام کی اقتداء کے سلسلہ میں مسجد کے حکم میں ہوگی کہ اگر عید کی نماز میں عیدگاہ کے باہر کوئی شخص امام کی اقتداء کرلے اور صفوں کے اور مقتدی کے درمیان اگرچہ فصل ہو اقتداء درست ہوجائے گی اور باہر سے اقتداء کرنے والے کی نماز صحیح ہوجائے گی۔

''أما مصلی العید لا یکون مسجدا مطلقا وإنما یعطی له حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالإمام وإن کان منفصلا عن الصفوف وفیما سوی ذلك فلیس له حکم المسجد'' (شامی ۶،۵۴۵)۔

''وقال بعضهم: یکون مسجدا حال أداء الصلوة لا غیر وهو والجبانة سواء'' (شامی ۶،۵۴۵)۔

حکم: اس اختلاف کی بنا پر حضرات علماء نے فرمایا کہ مسجد کا حکم احتیاطا دیا جائے گا کہ اس سے جنبی اور حائضہ کو دور رکھا جائے گا۔

''ویجنب هذا المکان عما یجنب عنه المساجد احتیاطا الخ (خانیة واسعاف)'' (شامی ۶،۵۴۵)۔

قول راجح: علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ قول اول یعنی عیدگاہ اور جنازہ گاہ کا مسجد ہونا راجح ہے کیونکہ قاضی خاں قول اشہر کو مقدم رکھتے ہیں اور قول اول مسجد ہونے کا ہے۔

''والظاهر ترجیح الأول؛ لأنه فی الخانیة یقدم الأشهر'' (شامی ۶،۵۴۵)۔

مساجد کی فاضل آمدنی رفاہی کاموں میں صرف کرنا:

اوقاف کا مقصود مخلوق کو نفع رسائی ہے۔ وہ کسی کی مملوک نہیں ہوتے ہیں، بلکہ وہ ملکیت سے حُر کی طرح سے آزاد ہوتے ہیں، اسی لئے اوقاف پر ملکیت کے آثار، بیع، ہبہ، وراثت وغیرہ جاری نہیں ہوتے، البتہ مقصود یعنی انتفاع کے ختم ہونے کی صورت میں دوبارہ اس کے نفع کو جاری کرنے کے لئے بیع واستبدال کی اجازت حضرات فقہاء شروط وقیود کے ساتھ دیتے ہیں، اور ان شروط وقیود کا اہم مقصد وقف کی ضیاع سے حفاظت ہے، لہذا حتی الامکان فقہاء کی ذکر کردہ شرائط کی پابندی واجب ہے۔ انہی شرائط میں سے ایک شرط منقولات سے عدم استبدال کی ہے، لہذا بقدر ممکن اس کی رعایت کرتے ہوئے روپیہ پیسہ سے وقف کو ہرگز نہ بدلا جائے، البتہ نفع کے بالکلیہ معدوم ہونے کی صورت میں وقف کو غیر منقولات زمین ومکان وغیرہ سے بدل کر اسی وقف کو دوبارہ جاری کرنے کی اجازت ہے۔ اور اگر اسی وقف کو کسی وجہ سے جاری کرنا ممکن نہ ہو تو نوع سابق کے قریبی اوقاف میں صرف کرنا جائز ہے دوسرے مصرف میں استعمال ناجائز ہے۔ بیع واستبدال کے سلسلے میں مسجد کے علاوہ بقیہ تمام اوقاف خواہ وہ اوقاف مسجد ہوں یا دوسرے اوقاف سب کا حکم ایک ہے۔

''الظاهر أن حکم عمارة أوقاف المسجد والحوض والبئر وأمثالها حکم الوقف علی الفقراء'' (شامی ۶،۵۶۳)۔

الف۔ روپئے سے فروخت کرنے میں وقف کے ضیاع کا اندیشہ ہے اس لئے بقدر ممکن احتراز واجب ہے۔

ب۔ کی جاسکتی ہے۔ نفس مسجد کے علاوہ بقیہ تمام اوقاف کا حکم ایک ہے۔

نہیں۔ مقصود واقف کی رعایت بہر حال واجب ہے۔

اوقاف غیر محتاج الیہ یعنی وہ اوقاف جن کی موقوف علیہم کو حاجت وضرورت باقی نہ رہ جائے، خواہ موقوف علیہم کے فقدان کی وجہ سے یا ازدیاد وقف اور تقلیل موقوف علیہم کی وجہ سے، توان اوقاف کا حکم اوقاف غیر منتفعہ کا حکم ہے، کیونکہ غیر انتفاع کی توضیح حضرات فقہاء نے تفرق ناس وعدم حاجت سے فرمائی ہے، اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر انتفاع کا مدار یعنی اصل علت عدم حاجت پر ہے، لہذا اشتراک علت کی وجہ سے حکم کا تعدیہ لازم ہے۔

''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه الخ (قوله ولو خرب ما حوله) أى ولو مع بقائه عامرا، وكذا لو خرب وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه'' (شامی ۶،۵۴۸)۔

عبارت مذکورہ سے ظاہر ہے کہ غیر انتفاع کا مدار استغناء پر ہے، لہذا جس موقوف علیہ کے پاس وقف اس کی ضرورت سے اتنے زیادہ ہوں جن کی ضرورت موقوف علیہ کو نہ تو فی الحال ہو اور نہ آئندہ ضرورت پڑنے کی کوئی امید ہو، تو اس کا حکم وقف غیر منتفع کا ہے، یعنی اگر وقف سے آمدنی ہو رہی ہو تو اس کی آمدنی کو اسی نوع کے دوسرے اوقاف میں استعمال کیا جائے گا، اور اگر آمدنی نہ ہو رہی ہو یا آمدنی ہو رہی ہو، لیکن عدم ضرورت کی وجہ سے حفاظت دشوار ہو تو اس کو بدل کر کے اسی نوع کا دوسرا وقف قائم کیا جائے، ورنہ اسی نوع کے دوسرے اوقاف میں استعمال کیا جائے۔

''وحكى أنه وقع مثله فى زمن سيدنا الإمام الأجل فى رباط فى بعض الطرق خرب ولا ينتفع المار به وله أوقاف عامرة فسئل هل يجوز نقلها إلى رباط آخر ينتفع الناس به قال: نعم؛ لأن الواقف غرضه انتفاع المارة ويحصل ذلك بالثانى'' (شامی ۳،۳۷۲)۔

اوقاف غیر منتفع کی آمدنی اور اس کی قیمت کو دوسرے اوقاف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

''لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه'' (شامی ۶،۵۴۹)۔

اوقاف غیر محتاج الیہ (وقف مستغنی عنہ) کو دوسرے نوع کے اوقاف میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

''أرض وقف على المسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضا للعامة لا يجوز للمسلمين انتفاع بماء ذلك الحوض۔ قنية'' (ہندیہ ۲،۴۶۴)۔

لہذا مسجد پر موقوفہ اوقاف کو جو مسجد کی ضرورت سے فاضل ہو دوسرے رفاہی کاموں میں استعمال کرنے کی گنجائش نہیں۔

الف۔ مسجد پر وقف اراضی میں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنے کی بالکل گنجائش نہیں۔

ب۔ مسجد کی آمدنی کو رفاہی مقاصد میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

وقف کی وہ فاضل آمدنی جس کی وقف کو نہ تو فی الحال ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت پڑنے کی امید ہے، مزید برآں اس کے ضیاع کا بھی اندیشہ ہو تو اس کا حکم اوقاف مستغنی عنہ کا حکم ہے، یعنی اس آمدنی کو اسی نوع کے دوسرے اوقاف کی ضرورتوں میں استعمال کیا جائے۔

''وعند أبى يوسف يباع ذلك و يصرف عنه إلى حوائج المسجد، فإن استغنى عنه هذا المسجد يحول إلى مسجد آخر'' (بحر الرائق ۵،۲۵۲)۔

الف۔ اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں استعمال کرنا جائز ہے۔ ب۔ دیگر ملی دینی علمی کاموں میں صرف کرنا جائز نہیں۔

اوقاف کا مقصود ان کو علی حالہ باقی رکھ کر اس کی آمدنی سے انتفاع کرنا ہے، آمدنی، خواہ کم ہو یا زائد، جب تک آمدنی ہو رہی ہے اس وقت تک آمدنی بڑھانے یا کسی دوسرے غرض کے لئے مفتی بہ اور قول راجح کے مطابق بیع واستبدال جائز نہیں، البتہ بوقت مجبوری حضرت امام ابو یوسف ؒ کے قول پر عمل کر کے استبدال کی گنجائش ہے۔

''الثالث أن لايشترطه أيضا و لكن فيه نفع فى الجملة وبدله خير منه ريعا و نفعا هذا لا يجوز استبداله على

الأصح المختار'' (شامی ۵۸۴)۔

اوقاف دوطرح کے ہوتے ہیں: (۱) موقوفہ علی الافراد (۲) موقوفہ علی غیر الافراد، مثلاً مساجد وغیرہ، تو اگر افراد موقوف علیہ ختم ہوجائیں تو ان پر موقوفہ اوقاف کی آمدنی فقراء پر صرف کی جائے گی۔

''وفیه ما فی الخانیة وقف علی ولدیه ثم علی أولادهما أبدا ما تناسلوا قال ابن الفضل: إذا مات أحدهما عن ولد یصرف نصف الغلة إلی الباق والنصف إلی الفقراء'' (شامی ۶۴۵)۔

اور اگر موقوف علیہ غیر افراد ہوں، بلکہ رفاہی کام ہوں تو ان پر موقوفہ آمدنی اسی نوع کے دوسرے قریبی وقف میں استعمال کرنا واجب ہے:

''فإن لم یبرهن یصرف للفقراء الخ''۔

''فی الدرالمختار: حاصله أن المنقول عندنا أن الموقوف علیه إذا خرب یصرف وقفه إلی مجانسه، فتصرف أوقاف المسجد إلی مسجد آخر وأوقاف الحوض إلی حوض آخر الخ'' (شامی ۶،۶۶۶)۔

الف، ب۔ وہ اوقاف جن کا انتفاع بالکلیہ ختم ہوجائے اور انتفاع کو جاری کرنے کے لئے نہ تو وقف مذکور کو کرایہ پر دینا ممکن ہو اور نہ قرض حاصل ہو تو اس پر موقوفہ اوقاف کی آمدنی کے بعض حصہ کو فروخت کرنا جائز ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ کا اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

''أهل المحلة باعوا وقف المسجد لأجل العمارة قال: یجوز بأمر القاضي وغیره، هو موافق للقاعدة المشهورة إذا اجتمع ضرر ان قدم أخفهما الخ'' (فتاوی خیریہ ۱۲۹)۔

البتہ آمدنی کو بڑھانے کے لئے فروخت کرنا جائز نہیں۔

''قال الرملي أقول قال فی البزازیة: بیع عقار المسجد لمصلحته لا یجوز'' (منحۃ الخالق ۵،۲۲۰)۔

مسجد پر موقوفہ زمین جو ضرورت سے زائد ہے اس پر مدرسہ کی تعمیر جائز نہیں۔ ''أرض وقف علی المسجد صارت بحال لا تزرع، فیجعلها رجل حوضا للعامة لا یجوز للمسلمین انتفاع بماء ذلك الحوض'' (ہندیہ)۔

البتہ قبرستان پر موقوفہ زمین جو ضرورت سے زائد ہو اگر آئندہ اس کی ضرورت پڑنے کی امید ہو تو عارضی دینی مدرسہ اور اگر اس کی ضرورت پڑنے کی کوئی امید نہ ہو تو دینی مدرسہ بنانا جائز ہے۔ "لأنهما للمسلمین" (بحوالہ عمدہ ۴/۱۷۹ام، امداد الفتاوی ۲/۵۷۹)۔

جن مقابر میں مردوں کو دفن کرنا بند ہو اس میں مسجد یا دینی مدارس یا ان کے لئے باغات لگوانے کی اجازت ہے (امداد الفتاوی ۲/۵۷۹)۔

بقدر استطاعت مسلمانوں کو ایسی مساجد میں نماز باجماعت پڑھنے کی کوشش کرنا واجب ہے، حکومت کو روکنے کا کوئی حق نہیں، یہ بہت بڑا ظلم ہے، کما قال اللّٰہ تعالی: ومن أظلم ... إلی آخر الآیة (سورہ بقرہ: ۱۱۴)۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے اس کے کنارے دوکانیں بنوانا جائز ہے، اور اس کی آمدنی دینی رفاہی کاموں میں استعمال کیا جائے۔

اگر فی الحال گنجائش ہو تو توسیع کی اجازت ہے۔

ذمی کو متولی بنانا جائز ہے کیونکہ حکومت اسلامیہ کو اس پر قابو ہوگا جیسا کہ کتب فقہ میں مصرح ہے، حربی کو بنانا جائز نہیں، ہندستان میں غیر مسلم کو متولی بنانا جائز نہیں، اس لئے اس کی تولیت میں رہنا درست نہیں۔

☆☆☆

مساجد اور دوسرے اوقاف میں فرق، احکام اور مسائل

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی [1]

الف۔ وقف کی چیز کو بیچ کر دوسری چیز اس سے خرید کرنی یا خود موقوفہ شئی کا دوسری شئی سے تبادلہ کرنا فقہاء کے یہاں ''استبدال وقف'' کہلاتا ہے۔

اوقاف میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ایک وقف کرنے والے کی شرط، دوسرے خود وقف کی مصلحت، فقہاء نے واقف کی شرط کو شریعت کی شرط کے مماثل سمجھا ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع بات نہ ہو، وقف کی مصلحت سے مراد ہے مقاصد وقف کو باقی رکھنا، ان کو تقویت پہنچانا، اور ان کی نافعیت میں اضافہ کرنا، اس لئے مصالح وقف کی اہمیت اور احکام وقف کی بابت اس کے اثرات محتاج اظہار نہیں۔ وقف کی تبدیلی کا مسئلہ بھی انہی دو جہتوں سے متعلق ہے۔

چنانچہ اگر خود وقف کرنے والے نے اپنے لئے یا کسی اور شخص کے لئے حق استبدال کی شرط لگادی تھی اور وقف میں تبدیلی کا حق باقی رکھا تھا، تب تو بالاتفاق متعلق شخص کو اس کا حق حاصل ہوگا، کیوں کہ یہ ایک جائز اور معتبر شرط ہے، اور استبدال کا عمل واقف کی شرائط کے دائرہ میں رہتے ہوئے کیا جارہا ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری کا بیان ہے:

''وأجمعوا أنه إذا شرط الاستبدال لنفسه من أصل الوقف أن الشرط والوقف صحيحان ويملك الاستبدال'' (البحر الرائق ۵٫۲۲۲)۔

اگر وقف کرنے والے نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تو اس صورت میں اصولی طور پر وقف کا تبادلہ ممکن نہیں، کہ ایک تو اس سلسلے میں واقف کا منشا مؤید نہیں، دوسرے خود رسول اللہ ﷺ نے وقف کے بارے میں جو اصول متعین فرمایا ہے، وہ یہی کہ اس کی خرید وفروخت نہیں ہوگی، نہ کسی اور کو مالک بنایا جائے گا، بلکہ اصل شئی کو باقی رکھتے ہوئے اس کی منفعت کو مقررہ مصارف پر خرچ کیا جائے، ''أن لا يباع أصلها ولا تبتاع ولا توهب ولا تورث'' لیکن اگر مقاصد وقف کو جاری اور باقی رکھنا اس کے استبدال ہی پر موقوف ہو تو پھر یہ صورت استبدال کی ممانعت کے دائرہ میں نہیں آتی، کیونکہ جب واقف نے اپنے وقف کا ایک منشا متعین کردیا ہے تو گویا یہ نگراں وقف کے لئے اس بات کی ہدایت ہے کہ وہ اس وقف کو ان مقاصد کے لئے مفید اور کارآمد بنائے رکھے، اور وقف کی افادیت، استبدال پر موقوف ہے تو گویا خود صاحب وقف کی طرف سے معنیً اور دلالۃً استبدال کی اجازت ہے، نیز منشاء نبوی بھی یہی ہے کہ اصل وقف کو باقی رکھ کر اسکے نفع کو دیرپا بنایا جائے اور اس کی حفاظت یقینی ہوسکے، اب اگر وقف کی حفاظت اور اس کی نافعیت ہی استبدال پر موقوف ہو تو ظاہر ہے کہ استبدال وقف، ہی سے منشاء نبویؐ کی تکمیل ہوسکے گی، لہذا وقف کی مصالح کی بناء پر استبدال، شارع علیہ السلام اور واقف کے مقصد ومنشاء کے موافق ہی ہے نہ کہ اس کے خلاف۔

یہ تو اس سلسلے میں اصولی گفتگو تھی، فقہی جزئیات بھی اسی سمت میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں، علامہ ابن ہمام نے اس سلسلے میں فقہاء کے مباحث کا تجزیہ یوں کیا ہے کہ اگر واقف کی طرف سے استبدال کی شرط ہو تب تو استبدال جائز ہے ہی، اگر واقف نے ایسی شرط نہ لگائی ہو تو ایک صورت تو یہ ہے کہ استبدال کے بغیر وقف سے نفع اٹھانا ہی ممکن نہ ہو، اس صورت میں بالاتفاق استبدال جائز ہے، ''فينبغي أن لا يختلف فيه''، دوسری صورت یہ ہے کہ وقف تو اب بھی قابل انتفاع ہے لیکن استبدال کے ذریعہ اس کی نافعیت میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے، ابن ہمام کا خیال ہے کہ یہ صورت جائز نہیں ہوگی۔

''إنه أمكن أن يؤخذ بثمنه ما هو خير منه مع كونه منتفعا به، فينبغي أن لا يجوز'' (رد المحتار ۶٫۵۸۹ مع تحقیق شیخ عادل وشیخ علی بحوالہ فتح القدیر)۔

تاہم علامہ حصکفی نے چار صورتوں میں ایسی زمین کے استبدال کی اجازت دی ہے جو آبادکاری کے لائق ہو، اور ان میں سے ایک اس صورت کو بھی شمار کیا

---

[1] جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

ہے کہ ارض وقف کی منفعت تو باقی ہو، لیکن استبدال وقف کے ذریعہ اس کو زیادہ نفع خیز بنایا جاسکتا ہو، حصکفی کا بیان ہے: لا يجوز استبدال العامر إلا في الأربع۔

شامی نے ان چار صورتوں کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''الأولی: لو شرطه الواقف، الثانية: إذا غصبه غاصب وأجرى عليه الماء حتى صار بحراً فيضمن القيمة، ويشتري المتولي بها أرضا بدلاً، الثالثة: أن يجحده الغاصب ولا بينة أي وأراد دفع القيمة: فللمتولي أخذها ليشتري بها بدلا، الرابعة: أن يرغب إنسان فيه يبدل أكثر غلة وأحسن صقعا، فيجوز على قول أبي يوسف وعليه الفتوى كما في فتاوى قاري الهداية'' (رد المحتار ۶،۵۸۸)۔

پس ابن ہمام کے بیان کے مطابق ایسے اوقاف کا استبدال بالاتفاق جائز ہے، فقہاء کے یہاں اس طرح کی بہت سی جزئیات موجود ہیں، علامہ ابن ہمام رقمطراز ہیں: ''قال هشام: سمعت محمداً يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه و يشتري بثمنه غيره، وليس ذلك إلا للقاضي'' (البحر الرائق ۵،۲۱۹)۔

ابن نجیم ہی نے شمس الائمہ حلوانی کا نقطۂ نظر یوں نقل کیا ہے: ''سئل عن شمس الائمة الحلواني من أوقاف المسجد إذا تعطلت وتعذر استغلالها هل للمتولي أن يبيعها ويشتري مكانها أخرى قال: نعم'' (حوالہ سابق)۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: ''لكن لا يبيعها إلا بإذن الحاكم و ينبغي للحاكم إذا رفع إليه ولا منفعة في الوقف أن يأذن في بيعها إذا رآه أنظر لأهل الوقف'' (فتح القدير ۶،۲۲۸)۔

تاہم علامہ شامیؒ وغیرہ نے استبدال کی اجازت کے لئے جو شرطیں عائد کی ہیں ان کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ان میں سے تین شرطیں فی زمانہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ اراضیٔ وقف معمولی قیمت پر فروخت نہ کی جائیں، بلکہ ان کی مناسب اور مروجہ قیمت حاصل کی جائے، ''أن لا يكون البيع بغبن فاحش''۔ دوسرے بیع کی اجازت دیانت دار اور ذمہ دار ادارہ کو حاصل ہوگی، اگر عام متولیوں کو استبدال کا مجاز ٹھہرایا جائے تو تحفظ کے بجائے یہ اوقاف کا ضیاع ہوگا، فقہاء نے اس کے لئے ''قاضی جنت'' کی شرط لگائی ہے، اور قاضی جنت سے ایسا قاضی مراد لیا ہے جو علم اور عمل صالح دونوں کا حامل ہو، ''أن يكون المستبدل قاضي الجنة''۔ تیسرے موقوفہ اراضی اور مکانات کے بدلے، مکانات اور اراضی ہی حاصل کی جائیں، روپئے، پیسے سے تبادلہ نہ ہو، یا اگر ہو تو فوراً ہی اس سے غیر منقولہ جائداد خرید لی جائے، ''أن يستبدل بقعار لا بدراهم ودنانير'' (ردالمحتار ۶،۵۸۶)۔ کیوں کہ تجربہ ہے کہ جہاں کہیں موقوفہ اراضی کے بدلے نقد رقم ملتی ہے، نقد رقم ناجائز تصرف اور تغلب میں آجاتی ہے۔ وإلى الله المشتكى۔

فقہاء حنفیہ کے علاوہ فقہاء حنابلہ کی رائے بھی یہی ہے کہ ناقابل انتفاع اوقاف کا استبدال جائز ہے، ابن قدامہ رقمطراز ہیں:

''إذا خرب الوقف ولم يرد شيئاً واشتري بثمنه ما يرد على أهل الوقف وجعل وقفا كالأول:... إن الوقف إذا بيع فأي شئ اشترى بثمنه مما يرد على أهل الوقف جاز سواء كان من جنسه أو من غير جنسه'' (المغنی ۵،۳۶۸،۳۶۹)۔

ابن ہمام نے جو اس صورت میں استبدال پر فقہاء کا اتفاق نقل کیا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس پر تمام ہی فقہاء متفق ہیں، غالباً ابن ہمام کا منشا فقہاء حنفیہ کا اتفاق کرنا ہے؛ چنانچہ ابن قدامہ نے امام مالک اور امام شافعی سے مطلقاً استبدال کا ناجائز ہونا نقل کیا ہے، ''قال مالك والشافعي لا يجوز بيع شئ من ذلك'' (المغنی ۵،۳۶۸)۔ شوافع کے مسلک کی خود فقہاء شوافع کی کتب میں صراحت نہیں مل پائی، البتہ مالکیہ کی صراحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں امام مالک کے دو اقوال ہیں، ایک روایت ابوالفرج کی ہے:

''عن مالك إن رأى الإمام بيع ذلك لمصلحة جاز ويجعل ثمنه في مثله وهو مذهب أبي حنيفة أيضا فعندهم بيع عقار الوقف إذا خرب يجعل ثمنه في مثله'' (الشرح الكبير مع الدسوقي ۴،۹۱)۔

دوسرا قول عدم جواز کا ہے جو فقہ مالکی کی بنیادی ماخذ ''المدونہ'' میں منقول ہے، اور اہل علم پر مخفی نہیں کہ فقہاء مالکیہ عام طور پر امام مالک کی مدونہ کی روایت کی طرف رجحان رکھتے ہیں، اسی لئے اس مسئلہ میں بھی مالکیہ کا رجحان عدم جواز کی طرف محسوس ہوتا ہے (دیکھئے: حاشیہ الدسوقی مع الشرح الکبیر ۴،۹۱)۔

زمین کے بدلہ زمین:

ب۔ وقف کا استبدال، خواہ اس طرح ہو کہ فروخت کر کے اس سے دوسری چیز حاصل کر لی جائے یا دوسری زمین ہی اس زمین کے بدلے لے لی جائے دونوں ہی صورتیں درست ہیں اور دونوں کا حکم ایک ہی ہے، بلکہ یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس میں اوقاف کے ضائع ہونے کا خطرہ کم ہے، اور یہ علامہ شامیؒ کے منشا کے عین مطابق ہے کہ اوقاف کا تبادلہ اراضی یا مکانات سے ہونا چاہئے، نہ کہ درہم و دینار سے۔

مساجد اور دوسرے اوقاف میں فرق:

فقہاء نے مساجد اور دوسرے اوقاف کے درمیان کچھ فرق کئے ہیں، ان میں بعض کا تعلق وقف کے ثبوت اور اس کی تکمیل سے ہے اور بعض کا تعلق مال وقف کے حکم اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات سے، مجموعی طور پر چار فروق کا ذکر آتا ہے:

۱۔ امام محمدؒ کے یہاں مشاع کا وقف مطلقاً درست نہیں، امام ابو یوسفؒ مشترک و مشاع چیز کے وقف کرنے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن مساجد کی بابت امام ابو یوسفؒ بھی متفق ہیں کہ وقف مشاع درست نہیں ہے۔

۲۔ امام ابو یوسفؒ کے یہاں وقف کے درست ہونے کے لئے متولی کے حوالہ کرنا ضروری نہیں، امام محمدؒ کے یہاں ضروری ہے، لیکن مساجد کی حد تک امام محمد بھی متولی کو سپردگی ضروری خیال نہیں کرتے۔

۳۔ امام ابوحنیفہ کے یہاں وقف کی دوسری شرائط کے پائے جانے کے بعد بھی جب تک حاکم اس کے بارے میں وقف کے درست و نافذ ہونے کا فیصلہ نہ کر دے تو وقف پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا، فیصلہ کے بعد ہی وقف کی ہوئی شئی سے واقف کی ملکیت ختم ہوتی ہے، لیکن مساجد کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ بھی اس کے قائل ہیں کہ حاکم کے فیصلہ کئے بغیر بھی مسجد ہونے کا تحقق ہو جاتا ہے، اور مسجد کی موقوفہ زمین وقف کرنے والے کی ملکیت سے نکل جاتی ہے۔

یہ تینوں شرطیں وقف کے ثبوت اور تکمیل سے متعلق ہیں، اور علامہ شامیؒ نے اس کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:

''اعلم أن المسجد يخالف سائر الأوقاف في عدم اشتراط التسليم إلى المتولي عند محمد وفي منع الشيوع عند أبي يوسف وفي خروجه عن ملك الواقف عند الإمام وإن لم يحكم به حاكم'' (ردالمحتار ۳/۳۶۹، نیز دیکھئے: فتح القدیر ۶/۲۳۲-۲۳۳)۔

مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد:

۴۔ اہم اور اساسی فرق مساجد اور دوسری موقوفہ اراضی کے درمیان یہ ہے کہ مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد بن جاتی ہے، خواہ مسجد ویران اور نا قابل استعمال ہوگئی ہو یا اس پر ظلماً قبضہ کر لیا گیا ہو، بہر صورت وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، چنانچہ علامہ ابن نجیم رقمطراز ہیں:

''في الخلاصة وفي فتاوى النسفي بيع عقار المسجد لمصلحة المسجد لا يجوز وإن كان بأمر القاضي وإن كان خرابا'' (البحر الرائق ۵،۲۲۳)۔

یہی رائے فقہاء شوافع کی ہے، علامہ نووی کا بیان ہے: ''أما المسجد فإنه إذا انهدم وتعذرت إعادته، فإنه لا يباع بحال لإمكان الانتفاع به حالا بالصلوة في أرضه'' (شرح مہذب ۱۵/۳۶۱)۔

اس سے بھی زیادہ واضح اور صریح نووی کی یہ عبارت ہے: ''وإن وقف مسجدا فخرب المكان وانقطعت الصلوة فيه لم يعد إلى الملك ولم يجز التصرف فيه'' (شرح مہذب ۱۵/۳۶۰)۔

فقہ حنبلی کے ترجمان عالی مقام ابن قدامہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے: ''إن المساجد لا تباع وإنما تنقل آلاتها'' (المغنی ۵،۳۶۷)۔

اوقاف کا مقصد مسلمانوں کے فلاح و بہبود کی عمومی خدمت نہیں، بلکہ واقف کی شرط کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور اس کے منشا کی تکمیل کرتے ہوئے فلاحی کام کرنے کی گنجائش ہے، لہذا ضروری ہوگا کہ استبدال وقف کے بعد متبادل وقف کو انہی مقاصد میں استعمال کیا جائے، جن مقاصد کے لئے اسے وقف کیا گیا تھا، علامہ شامی نے اس سلسلے میں یہ اصول بیان کیا ہے:

''وحاصله: أن المنقول عندنا أن الموقوف عليه إن خرب يصرف وقفه إلى مجانسه فتصرف أوقاف المسجد إلى مسجد آخر وأوقاف الحوض إلى حوض آخر'' (ردالمحتار ۵.۳۶۵)۔

لہٰذا واقف کے مقصد و منشا کو نظر انداز کرتے ہوئے وقف کا استعمال درست نہیں، بلکہ مساجد سے متعلق اوقاف کو مساجد پر اور قبرستان کے اوقاف کو قبرستان ہی پر استعمال کرنا ضروری ہوگا، ہاں ویران مدارس اور تعلیم گاہوں کے اوقاف تعلیمی اغراض کے لئے استعمال ہوں گے، لیکن ان میں بھی یہ ضروری ہوگا کہ دینی درس گاہوں کے اوقاف دینی تعلیم ہی کے لئے خرچ ہوں، کیونکہ عام طور پر جو لوگ دینی تعلیمی ادارہ پر کوئی چیز وقف کرتے ہیں وہ اسی مقصد میں اس کے استعمال کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

دوسرے فقہاء کا بھی یہی نقطہ نظر ہے، فقہاء مالکیہ میں علامہ علیش مالکی کا بیان ہے:

''(شرطه) أي الواقف وجوبا (إن جاز) الشرط فيجب العمل به ولا يجوز العدول عنه إلا ان يتعذر فيصرف في مثله كما تقدم في القنطرة ونحوها'' (شرح منح الجليل ۴.۶۲)۔

مساجد کی اراضی اور آمدنی سے تعلیمی ادارہ کا قیام:

جیسا کہ مذکور ہوا، اصولی طور پر حتی المقدور واقف کے منشا کی رعایت ضروری ہے، اسی پس منظر میں علامہ حصکفی نے لکھا ہے: ''حشيش المسجد وحصيره مع الاستغناء عنها، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما، فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض''۔

علامہ شامیؒ نے اس پر اس نوٹ کا اضافہ کیا ہے: ''فظاهره، أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار ۶.۵۴۹)۔

غالباً یہی نقطۂ نظر دوسرے فقہاء کا بھی ہے، فقہ مالکی کے ترجمان علامہ دسوقی کا بیان ہے: ''منقوض الحبس من الأحجار والآجر... لا يجوز بيعه، فإذا لم يمكن عودها فيما حبست فيه جاز نقلها في مثله'' (حاشیۃ الدسوقی ۴/۹۱، نیز دیکھئے: شرح منح الجلیل ۴/۶۱-۶۲)۔

فقہاء شوافع میں امام نووی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوافع بھی یہی رجحان رکھتے ہیں: ''أما غير المنهدم فما فضل من غلة الموقوف على مصالحه يشترى به عقار ويوقف عليه'' (شرح مہذب ۱۵/۳۶۱)۔

ابن قدامہ حنبلی نے ایسی فاضل آمدنی کو اسی کے مماثل مصرف میں خرچ کرنے کے علاوہ فقراء پر بھی خرچ کرنے کی اجازت دی ہے: ''ما فضل من حصر المسجد وزيته ولم يحتج إليه جاز أن يجعل في مسجد آخر ويتصدق من ذلك على فقراء جيرانه وغيرهم'' (المغنی ۵.۲۷۰)

یہ اجازت غالباً اس اصول پر مبنی ہے کہ ہر وقف کا آخری مصرف فقراء ہی ہوا کرتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ نے حنابلہ کے مسلک کو مزید وضاحت سے اس طرح بیان کیا ہے:

''كما يقول مثل ذلك في زيت المسجد و حصيره إذا استغنى عنها المسجد تصرف إلى مسجد آخر يجوز صرفها عنده في فقراء الجيران واحتج على ذلك بأن عمر ابن الخطاب ﷺ كان يقسم كسوة الكعبة بين المسلمين فكذلك كسوة سائر المساجد'' (مجموعة الفتاوى ۳۱.۲۱۳)۔

پھر اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ تعلیم کسی بھی سماج کی نہایت اہم ضرورت ہے، اور قوموں اور ملتوں کے تحفظ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، اس لئے فقہاء نے جس زمانہ میں اپنی کتابیں لکھیں اور نئے پیش آمدہ واقعات پر شرعی احکام کا انطباق کیا، اس وقت طاقتور یا کمزور اور اچھی یا بری مسلم حکومت موجود تھی، جس نے تعلیمی نظام قائم کر رکھا تھا، اور عام مسلمان بڑی حد تک تعلیمی اداروں کے قیام سے مستغنی تھے، اب ہندوستان، جیسے ممالک میں مسلمانوں کو خود ہی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا، اور عام طور پر مسلمانوں کی معاشی پسماندگی ایک ایسا کھلا راز ہے جس سے دوست و دشمن سبھی واقف ہیں۔

پس فقہاء کے مقرر کئے ہوئے اصول اور موجودہ زمانہ کے مصالح کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ:

الف۔ مسجد پر وقف اراضی اگر کافی وسیع ہو اور بظاہر طویل عرصہ تک مسجد کی توسیع کی ضرورت پڑنے کا امکان نہ ہو تو فاضل اراضی میں دینی درسگاہ یا مسلمانوں کے لئے مخصوص عصری تعلیمی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے، البتہ ادارہ سے مسجد کو کچھ کرایہ بھی دلانا چاہئے تاکہ اس زمین کا نفع مسجد کی طرف بھی لوٹے، اور واقف کا منشا بھی پورا ہو۔

ب۔ مسجد کی فاضل آمدنی دوسری مساجد اور جہاں مساجد نہیں ہیں وہاں مساجد کی تعمیر پر صرف کی جانی چاہئے، کیونکہ ہندوستان میں ابھی ہزارہا ہزار دیہات و قریہ جات ایسے ہیں جو مسجد کو ترس رہے ہیں، اور جہاں لوگوں کے کان اب بھی اذان کی آواز سے ناآشنا ہیں، وہاں مسجدوں کی تعمیر اور ان میں بنیادی دینی تعلیم کے لئے مکاتب کا انتظام مدارس اور عصری درسگاہوں کے قیام سے زیادہ اہم ہے۔

الف، ب۔ سوال نمبر (۲) کے جواب میں اوقاف کی زائد آمدنی کے مصرف کی بابت اصولی بات آچکی ہے، وہی اصول اوقاف کی زائد آمدنی کے بارے میں جاری ہوں گے، یعنی اس زائد آمدنی کو ضیاع اور تغلب سے بچانے کے لئے اس کا استعمال اولاً اسی نوع کے اوقاف میں ہو، اور اگر اس نوع کے اوقاف میں اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پھر چونکہ ہر وقف کا آخری مصرف فقراء ہیں، اس لئے ایسے رفاہی اور تعلیمی کاموں میں ان کا استعمال ہونا چاہئے جو غریب مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوں، واللہ اعلم۔

کم آمدنی کے وقف کا استبدال:

کم آمدنی کے حامل وقف کو فروخت کر کے زیادہ آمدنی دینے والے متبادل وقف کا حصول کے سلسلے میں مشائخ احناف کا اختلاف ہے، اور علامہ شامی نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ابن ہمام کا خیال ہے کہ جو وقف قابل انتفاع ہو زیادہ نفع کے لئے اس کا استبدال درست نہیں، شارح "اشباہ" علامہ البیری نے اسی کو حق و صواب قرار دیا ہے، اور اسی پر صدر الشریعہ کا فتوی ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ صورت درست ہے، اور بعض اہل علم نے اسی پر فتوی دیا ہے (دیکھئے: رد المحتار ۶/۵۸۹)۔

لیکن اگر فقہاء کی عبارت میں غواصی کی جائے اور عبارتوں کی تہہ میں اتر کر ان کے مقصد و منشا کو سمجھا جائے تو محسوس ہوگا کہ ہر دو رائے کے حاملین نے مصالح وقف کو ملحوظ رکھا ہے، جن حضرات نے زیادہ آمدنی کے لئے استبدال کی اجازت دی ہے، ان کا نقطۂ نظر تو واضح ہی ہے کہ اس صورت میں وقف کا مفاد ہے، اور جن حضرات نے منع کیا ہے انہوں نے بچشم سر اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ خدا ناترس قضاۃ اور حکام نے اس کو وقف کی جائدادوں میں خرد برد اور تغلب کے لئے ایک حیلہ بنالیا ہے، اسی لئے ان حضرات نے ممانعت فرمائی کہ کم نفع آور صحیح وقف باقی تو رہے گا، ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ سرے سے وقف ہی کا وجود باقی نہ رہے، اسی لئے شامی نے صدر الشریعہ کا قول نقل کیا ہے: "نحن لا نفتي به وقد شاهدنا في الاستبدال ما لا يعد ولا يحصى فإن ظلمة القضاة جعلوه حيلة لإبطال أوقاف المسلمين" (رد المحتار ۶، ۵۸۹–۵۸۸)۔

لہٰذا یہ مصالح پر موقوف ہے، اگر کوئی دیانتدار ادارہ اس کا ذمہ دار ہو تو ضرور اس کی گنجائش ہے، لیکن اگر حکومت کے وقف بورڈ کو اس کی اجازت دے دی جائے تو غالباً وہی کچھ ہوگا جس کا صدر الشریعہ نے رونا رویا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر دوسرے فقہاء کا رجحان عام طور پر اس کے جائز نہ ہونے کی طرف ہے، علامہ شمس الدین دسوقی مالکی رقمطراز ہیں: "(لا عقار) حبس من دور وحوانيت وحوائط وربع فلا يباع ليستبدل به غيره" (حاشية الدسوقي ۴، ۹۱)

فقہاء حنابلہ میں ابن قدامہ کا بیان ہے: "إن لم تتعطل مصلحة الوقف بالكلية لكن قلت: وكان غيره أنفع منه وأكثر رد على أهل الوقف لم يجز بيعه" (المغني ۵، ۳۶۹)۔

جن اوقاف کے مصارف ختم ہوجائیں:

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ اگر عین مسجد کے سوا کوئی وقف ناقابل استعمال ہوجائے تو اس کو اسی کے مماثل مصرف میں استعمال کیا جائے گا، ایک مسجد کی آمدنی دوسری مسجد میں، ایک مدرسہ کی آمدنی دوسرے مدرسہ میں، ایک خاندان کے فقراء کا وقف عام فقراء مسلمین میں، اور جو مصرف بالکلیہ ختم ہوجائے اس کے مماثل کوئی وقف ہی موجود نہ ہو تو پھر آخری مصرف فقراء و مساکین ہیں، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے:

"فإذا خرب المسجد وخوى عن أهله فالغلة إلى الفقراء، فيجوز" (فتاوى بزازيه على هامش الهنديه ۶، ۲۷۳)۔

فقراء پر خرچ کرنے کی صورت یہی ہے کہ یہ آمدنی ان پر تقسیم کردی جائے اور یہ بھی ہے کہ کسی ایسے رفاہی کام کے لئے اس آمدنی کو استعمال کی جائے جس سے استفادہ فقراء ہی کے لئے مخصوص ہو۔

کچھ عمارت کے بدلہ نئی عمارت کی تعمیر:

الف۔ وقف کی مخدوش عمارت کی تعمیر نو کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ عمارت کا کچھ حصہ تعمیر کنندہ لے لے اور بقیہ مقصد وقف میں استعمال ہو، کیونکہ اس میں وقف کا تحفظ اور مقصد وقف کی تکمیل ہی مقصود ہے، فقہاء کے یہاں اس طرح کی بہت سی صراحتیں موجود ہیں، کہ وقف کو کارآمد بنانے کے لئے اس کے کچھ حصے کو کرایہ پر لگانا، اس کے ملبہ کو فروخت کرنا بلکہ خود اس زمین کو فروخت کرنا درست ہے، فتاوی بزازیہ میں اس بات کو بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے: ''بيع عقار المسجد لمصلحة لا يجوز وان بأمر القاضي وإن باع بعضه لإصلاح باقيه لخراب كله جاز'' (فتاوی بزازیہ ۶،۲۸۱)۔

نیز فقہاء حنابلہ میں علامہ ابن قدامہ کا بیان ہے: ''فلم تمكن عمارته ولا عمارة بعضه إلا ببيع بعضه جاز بيع بعضه لتعمر به بقيته'' (المغنی ۵،۳۶۸)۔

ب: یہی حکم اُن صورت کا بھی ہے جب عمارت کے بجائے خود زمین کا کچھ حصہ تعمیر نو کے لئے فروخت کرنا پڑے، البتہ اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ مسجد کی تعمیر نو میں خاص اس جگہ میں سے کوئی حصہ فروخت نہ کیا جائے جسے نماز کی ادائیگی کے لئے مخصوص کیا گیا تھا اور جو مسجد کے حکم میں داخل ہو گیا تھا۔

یہ سوال غالباً مکرر ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بظاہر مستقبل میں بھی مسجد یا قبرستان کو وہ زمین مطلوب ہو تو مدرسہ کی تعمیر کی گنجائش ہے، لیکن مدرسہ پر اس کا کچھ کرایہ بھی عائد کردیا جائے گا کہ یہ کرایہ مسجد اور قبرستان ہی کی ضروریات پر صرف ہو اور اسی طرح واقف کے منشاء کی بھی تکمیل ہو اور مسلمانوں کے مصالح کی رعایت بھی۔

قبرستان نا قابلِ استعمال ہو جائے:

اگر قبرستان کے اطراف مسلمان آبادی کے ختم ہو جانے یا تدفین پر پابندی کی وجہ سے قبرستان قابل استعمال نہ رہا یا اس پر ناجائز قبضہ کا خطرہ ہو۔ اور عام طور پر ایسا قدیم قبرستان ہی میں ہوتا ہے۔ تو بوسیدہ ہڈیاں حتی المقدور جمع کر کے ایک جگہ دفن کردی جائیں اور اس حصہ کو احاطہ بندی کے ذریعہ محفوظ کردیا جائے، بقیہ حصہ فروخت کردیا جائے اور بہتر ہے کہ جہاں مسلمانوں کو قبرستان کی ضرورت ہو وہاں اس کی قیمت سے قبرستان فراہم کیا جائے تاکہ منشاء وقف کی ممکن حد تک رعایت ہو سکے، اور اگر یہ مصرف موجود نہ ہو یا کم سے کم قریب کی مسلم آبادیوں میں اس کی حاجت نہ ہو تو فقراء پر خرچ کردی جائے۔ ہشام کے واسطہ سے امام محمد کا قول گذر چکا ہے: ''الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره'' (البحر الرائق ۵،۲۰۷)

نیز ابن نجیم کا بیان ہے: ''قيم خاف من السلطان أو من وارث يغلب على أرض وقف يبيعها ويتصدق بثمنها، وكذا كل قيم إذا خاف شيئاً من ذلك له أن يبيع ويتصدق بثمنها'' (حوالہ سابق)۔

دیگر مکاتب فقہ کا بھی یہی رجحان معلوم ہوتا ہے، ابن قدامہ لکھتے ہیں: ''وإذا خرب الوقف ولم يرد شيئاً بيع واشتري بثمنه ما يرد على أهل الوقف وجعل وقفا كالأول'' (المغنی ۵،۳۶۸)۔

آثار قدیمہ کی مساجد:

شرعاً مسجد ہمیشہ کے لئے ہے، یہی رائے امام ابوحنیفہؒ، قاضی ابو یوسفؒ اور جمہور فقہاء کی ہے اور اسی پر فتوی ہے، حصکفی رقمطراز ہیں: ''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام والثاني أبداً إلى يوم الساعة وبه يفتى'' (الدر المختار ۶،۵۴۸، فتاوی ہندیہ ۲،۴۵۸)۔

امام نووی فرماتے ہیں: ''أما المسجد، فإنه إذا انهدم وتعذرت إعادته، فإنه لا يباع بحال لإمكان الانتفاع به حالا بالصلوة في أرضه'' (شرح المہذب ۱۵،۳۶۰)۔

اس لئے ان مساجد کا حکم بھی وہی ہے جو دوسری مساجد کا ہے، حکومت کا اس میں نماز کی ادائیگی سے روکنا ظلم اور مسلمانوں کے مذہبی حقوق میں مداخلت ہے اور بدنیتی پر مبنی ہے، اس لئے کہ اگر مسجد آباد رہی اور نماز کا سلسلہ جاری رہا تو زیادہ بہتر طور پر مسجد کا تحفظ ہوسکتا ہے، آباد عمارتوں کی عمر ویران عمارتوں سے زیادہ ہوتی ہے، اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ قانون وآئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے حکومت سے ان مساجد کو کھولنے اور ان میں نماز کی اجازت دینے کا مطالبہ کریں۔

قبرستان کے تحفظ کے لئے دوکانوں کا حصار:

وقف کے احکام میں وقف کے مصالح کے تحفظ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اسی لئے بعض مواقع پر فقہاء نے واقف کی شرائط کو بھی نظر انداز کرنے کی اجازت دی ہے اگر ان شرائط کی رعایت وقف کے مفاد میں نہ ہو، مثلاً واقف نے نااہل شخص کو متولی مقرر کردیا اور شرط لگادی کہ اسے معزول نہ کیا جائے پھر بھی قاضی ایسے شخص کو تولیت سے سبکدوش کرسکتا ہے، یا شرط لگادی کہ وقف کی عمارت ایک سال سے زیادہ عرصہ کے لئے کرایہ پر نہ دی جائے لیکن کرایہ دار اس قلیل مدت کے لئے لینے میں رغبت نہ رکھتے ہوں، تو عدالت اس شرط کی خلاف ورزی کرسکتی ہے (ردالمحتار ۶/ ۵۸۷)۔

قبرستان کے پاس اگر خود اتنے وسائل نہ ہوں کہ احاطہ بندی کا کام ہوسکے تو اس طرح یہ پیشگی رقم لے کر دوکانوں کی تعمیر اور انہی دکانوں کے ذریعہ حصار بندی میں قبرستان کا تحفظ بھی ہے اور اس سے قبرستان کو آمدنی بھی حاصل ہوسکتی ہے جس سے قبرستان کی نگرانی، روشنی اور راستہ کا انتظام یا لاوارث لاشوں کی تدفین وغیرہ کا کام لیا جاسکتا ہے، پس یہ قبرستان کے مفاد میں ہے اور ایسا کرنا جائز ہے۔ فقہاء کے یہاں اس بابت بعض صراحتیں موجود ہیں، صاحب بزازیہ لکھتے ہیں:

”أراد القيم أن يبني في الأرض الموقوفة حوانيت ليستغلها بالإجارة ليس له ذلك لأن استغلال الأرض بالزرع إليهم إلا إذا كانت الأرض متصلة بالمصر“ (فتاوی بزازیہ ۶،۲۵۴)۔

گویا دکان بنانے کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ دیہات وقریہ جات میں دکان بنانے کی ممانعت ہے کیونکہ وہاں اول تو ان کا کرایہ پر لگنا دشوار ہوتا ہے اور اگر کرایہ دار مل جائیں تب بھی کرایہ خاطر خواہ وصول نہیں ہوسکتا، اس لئے وہاں زراعت زیادہ فائدہ بخش ہوتی ہے، شہر میں چونکہ کرایہ دار آسانی سے اور بہتر کرایہ کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں اس لئے صاحب بزازیہ نے یہاں اس کی اجازت دی ہے، پس جب قبرستان کے مفاد میں ایسی دکانوں کا بنانا ہے تو یہ بھی جائز ہوگا۔

قبرستان میں مساجد کی توسیع:

مسجد کی توسیع بھی ایک ضرورت ہے اور مسلمانوں کی قبروں کا احترام بھی ضروری ہے اس لئے نئی اور پرانی قبروں میں فرق کرنا ہوگا، ویران اور متروک قبرستان میں تو قبریں ہوتی ہی ہیں پرانی، جو قبرستان ابھی استعمال میں ہیں ان میں جدید وقدیم کی رعایت کرنی ہوگی، اور ایسے حصہ میں مسجد کی توسیع درست ہوگی جہاں قدیم قبریں ہیں، علامہ عینی فرماتے ہیں:

”لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجدا لم أر بذلك بأساً وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لايجوز لأحد أن يملكها فإذا درست واستغنى من الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لايجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد“ (عمدة القاری ۱۰،۱۵۲)

تاہم یہ شرط مسجد کی پہلی منزل کے لئے ہوگی، اگر مسجد دومنزلہ ہو اور مسجد کی موجودہ حد کے باہر قبروں سے بچتے ہوئے ستون قائم کئے جاسکتے ہوں اور آگے تک چھت ڈالی جاسکتی ہو تو اس طرح آگے تک چھت ڈالنا بھی درست ہوگا، کیونکہ ممانعت کی وجہ سے قبر پر نماز سے بچنا اور قبر کو بے حرمتی سے بچانا ہے اور یہ دونوں باتیں اس صورت میں نہیں پائی جاتیں، یہ حکم تو عام قبرستانوں کے لئے ہے، جو قبرستان کسی شخص یا خاندان کا خصوصی اور مملوکہ قبرستان ہو اس میں مالکان کی اجازت بھی ضروری ہوگی۔

مساجد پر ہندو اوقاف کی تولیت:

بنیادی طور پر فقہاء نے تولیت کے لئے اسلام کی شرط نہیں رکھی ہے، شامی رقمطراز ہیں:

”ويشترط للصحة بلوغه و عقله لا حريته وإسلامه“ (ردالمحتار ۶،۵۷۹)۔

لیکن یہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ نہیں ہے، کیونکہ یہ اشخاص پر نہ سہی، لیکن اسباب واموال پر ایک طرح کی ولایت ہے اور غیر مسلم کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہوسکتی، اسی لئے رافعی کو شامی کے اس اطلاق سے اتفاق نہیں، وہ ابن نجیم کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''ینبغی أن یخص بوقف الذمی، فإن تولیة الذمی علی المسلمین حرام لا ینبغی اتباع شرط الواقف فیھا'' (تقریر الرافعی مع الشامی ۶؍۸۴)۔

ارشادربانی: ''إنما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر...'' (سورۂ توبہ:۱۸) سے بھی ایک حد تک رافعی کے نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے، گو ''عمارۃ'' سے معنوی عمارت بھی مراد ہوسکتی ہے جو نماز اور ذکر وعبادت سے عبارت ہے، اور زیادہ احتمال اسی معنی کا ہے (گنجائش دونوں معنوں کی ہے، دیکھئے: مفاتیح الغیب للرازی ۷؍ ۵۹۴)، کیونکہ اگر تعمیر کے معنی مادی تعمیر کے ہوں تو پھر تعمیر مساجد میں غیر مسلم مزدوروں سے کام لینا بھی نادرست قرار پائے گا۔

زیادہ درست اور قرین جواز یہ معلوم ہوتا ہے کہ تولیت غیر مسلموں کی جائز تو ہے، لیکن مکروہ تحریمی۔ جائز اس لئے کہ تولیت کا اصل مقصود حفاظت ونگہداشت اور انتظام ہے، متولی کو جو بعض تصرفات کے حق حاصل ہیں وہ ضمنی حیثیت رکھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ نظم وحفاظت کا کام غیر مسلموں سے بھی لیا جاسکتا ہے، پھر اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ فتح مکہ کے موقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ کے ہاتھ سے کعبہ کی کلید حاصل کی اور پھر انہیں کو واپس فرمادی، حالانکہ اس وقت تک عثمان دامن اسلام میں نہیں آئے تھے، تو جب ایک غیر مسلم کلید بردار کعبہ ہوسکتا ہے تو عام مساجد کا متولی کیوں نہیں ہوسکتا؟۔۔۔ البتہ یہ کراہت سے خالی نہیں، کیونکہ کسی غیر مسلم سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مساجد کے حقوق کی پوری پوری رعایت کرسکے گا۔

بالخصوص ہندوستان میں مساجد کا غیر مسلم انتظامیہ کے تحت رہنا خطرات وخدشات سے خالی نہیں، اس لئے مسلمانوں پر ایک اجتماعی فریضہ ہے کہ وہ ایسی مساجد کو مسلمان انتظامیہ کے تحت لانے کی سعی کریں۔

☆☆☆

اوقاف کا تحفظ اور آمدنی کا صحیح استعمال

مفتی عبید اللہ اسعدی [1]

اوقاف سے متعلق سوالات کا حاصل یہ ہے کہ اوقاف اور ان کی آمدنی کو کیسے با مقصد بنایا جائے جب کہ بہت سے اوقاف تعطل کا شکار ہیں اور بہت سے کارآمد ہیں، مگر ان کا نفع محدود ہے، جبکہ اس میں وسعت ممکن ہے یا حالات کا تقاضا وسعت دینے کا ہے۔

اوقاف کا معاملہ یہ ہے کہ اوقاف ابدیت و دوام کے حامل ہوتے ہیں، بلکہ اس کے بغیر ان کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا اور اسی لئے وقف اصلاً انہیں اشیاء کا ہوتا ہے جن کے لئے طبعی طور پر دوام واستقلال ہوتا ہے، بایں معنی کہ ایک لامحدود مدت تک ان کا بقا سوچا جاتا ہے اور سوچا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وقف اصلاً زمین، کھیت، باغ و مکان وغیرہ کا ہوتا ہے۔

اور اسی ابدیت و دوام کی مقصدیت واہمیت کی وجہ سے جب کوئی وقف صحیح قرار پاتا ہے تو قیامت تک اس کی اس حیثیت کو ختم نہیں کیا جاسکتا، واقف یا اس کے ورثہ اپنے ارادے و نیت سے رجوع نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی خرید و فروخت کا حق رکھتے ہیں، اسی لئے اوقاف کے لئے اس کے مطابق احکام جاری کئے گئے ہیں اور کئے جاتے ہیں۔

ان کی حفاظت و بقاء کی تدبیر کی جاتی ہے، اس کے لئے مرمت و تعمیر کی راہ بھی اپنائی جاتی ہے اور دوسری صورتیں بھی، وقف کی آمدنی کو اولاً حفاظت کی مد میں صرف کرنے کا حکم ہے، پھر خیر کے مصارف میں جو اسی کے لئے متعین کئے گئے ہوں، اور اگر حفاظت کا کام خود وقف کی آمدنی سے ممکن ہو تو اس کے لئے مختلف مناسب صورتیں تجویز کی گئی ہیں کہ ان سے کام لے کر وقف کی حفاظت بھی ہوتی ہے اور ان کا کام و نفع بھی جاری رہتا ہے۔

وقف کا حاصل یہ نہیں کہ شئ موقوف کو آدمی اپنی ملک سے نکال کر بیکار چھوڑ دے، جیسے جانور چھوڑے جاتے ہیں، بلکہ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اس کا انتفاع اب ذاتی و شخصی نہ رہ کر عام قومی اور ملی ہو گیا، اور اب تک آدمی اس سے اپنی دنیا کی ضرورت کی تکمیل کر رہا تھا، مگر وقف کر کے وہ اپنی آخرت کو سنوارتا ہے، خواہ وقف جس چیز کا اور جس شکل وصورت میں ہو۔

بہر حال وقف اور اس کے احکام کا حاصل و مفاد یہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اوقاف جب تک اپنے مناسب حال پر ہیں اور واقف کے مقصد و شرط کے مطابق فائدہ دے رہے ہیں، خواہ کم ہو یا زیادہ اور کام آرہے ہیں تو ان سے تعرض اور ان میں تصرف ایک بیجا عمل ہے۔ لیکن جب ان کی صورت حال یہ ہو جائے کہ وہ مقصد کے مطابق کام بالکل بند کر دیں، یا برائے نام ان کا کام رہ جائے، جس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں، اور حالت یہ ہو جائے کہ موجودہ صورت حال کے باقی رہتے ہوئے کچھ کرنا، اور ان سے کسی طرح کا انتفاع یا مناسب انتفاع ممکن و متصور نہ ہو تو ان کے کام کو جاری رکھنے و کرنے کے لئے کوئی مناسب شکل واقدام کا اختیار کرنا، تا کہ وقف اور اس کا مقصد زندہ و تابندہ رہے، اس کا کیا حکم ہے؟

اس کے تحت کئی صورتیں آتی ہیں:

۱۔ معطل و بیکار وقف کے حق میں تصرف، ۲۔ کارآمد، مگر ناقص کے حق میں اور مزید آمدنی کے لئے تصرف، ۳۔ مصارف میں توسیع واقف کی طے شدہ صورتوں و مواقع میں وسعت واضافہ کر کے، جیسے ایک مقصد کے لئے وقف زمین کا دوسرے کسی مقصد میں بھی استعمال کرنا، یا آمدنی کا دوسرے مقاصد میں صرف کرنا۔

فقہاء کی تصریحات جہاں وقف کی اس حیثیت کو واضح و نمایاں کرتی ہیں جس کا تذکرہ پیچھے کیا گیا ہے، وہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت حال میں مناسب اقدام و انتظام کی اجازت ہے۔ اور یہی بات معقول بھی ہے اس لئے کہ وقف کی حفاظت اور اس کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا

---

[1] شیخ الحدیث، جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ، یوپی۔

ہے۔ اس اقدام وانتظام میں وقف کی جگہ کا تبادلہ جگہ کے بدلہ جگہ کا معاملہ کرکے یا خرید وفروخت کے ذریعہ، یہ سب شامل ہے، فقہاء نے صراحۃ اس کی اجازت دی ہے، اسی طرح زائد جگہ وآمدنی کو ان دوسرے مواقع ومصارف میں استعمال کرنا جن پر وقف کیا جاتا ہے اور جو عامۃ المسلمین واسلام کے مصالح سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی بھی ضرورت میں اجازت ہے، ضرورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جگہ بالکل خالی پڑی ہے، نہ اب تک اصل مصرف میں لگی نہ آئندہ عرصہ دراز تک متوقع ہے۔ اور یہ بھی کہ جگہ تو خالی نہیں پڑی، کسی شکل میں مستعمل ہے یا آئندہ جلد نوبت آسکتی ہے مگر دوسری ضرورت درپیش ہے جو اہم ہے، جیسے مسجد کی فاضل وزائد زمین پر مدرسہ قائم کرنا، یا قبرستان کی زمین پر مسجد یا مدرسہ کی تعمیر۔

کبھی آمدنی مصارف ومقاصد سے فاضل ہی نہیں، بلکہ بہت زیادہ ہوتی ہے کہ جس کی طویل عرصہ تک حفاظت مسئلہ ہوتی ہے، نہ تو یہ سوچا جاسکتا ہے کہ شئ موقوف کی کسی ضرورت میں اس کو جلد کام میں لیا جاسکے گا اور نہ کسی جگہ کسی صورت میں رکھنے پر اطمینان کیا جاسکتا ہے، نہ عوام نہ حکام، کسی کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا، اور دوسری طرف اسی قبیل کے اوقاف مصارف کے محتاج ہوتے ہیں اور ان کے لئے مناسب آمدنی نہیں پائی جاتی، یا دوسرے دینی وملی کام متقاضی ہوتے ہیں کہ ان کی طرف توجہ کی جائے۔

متدین اور قابل اعتماد متولیان وذمہ داران اگر ضرورت کا احساس کرکے اس طرح کا کوئی اقدام کریں اور کوئی صورت اختیار کریں تو قدیم فقہاء اور ماضی قریب وحال کے بعض فقہاء کی صراحتوں کے مطابق اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے جب کہ مقصد بیجا تصرف واستعمال نہیں بلکہ بیجا دست برد سے بچانا، اور واقف کے مقاصد کی حفاظت کے ساتھ ان کو وسعت دینا، اور اس طرح اس کے لئے ذخیرہ آخرت وثواب کا بڑھانا مقصود ہو۔

ذیل میں فقہاء کی کچھ عبارات وفتاوی ذکر کی جارہی ہیں جن کی روشنی میں احقر نے یہ رائے قائم کی ہے۔

وقف کے احکام: ''الأصح أنه عنده جائز غير لازم كالعارية وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من أحب... وعليه الفتوى'' (درمختار ۹، ۳۳۸، ۲۲۴)۔

صحیح یہ ہے کہ وقف امام صاحب کے نزدیک جائز تو ہے، مگر لازم نہیں، مانند عاریت، اور صاحبین کے نزدیک وقف شئ موقوف کا اللہ کی ملک میں کردینا ہے اور اس کی منفعت کا جہاں طے کرے وہاں صرف کرنا...... اور فتوی اسی قول پر ہے (یعنی صاحبین کے قول پر)۔

''في الدرر: الصحيح أن التأبيد شرط اتفاقا لكن ذكره ليس بشرط عند أبي يوسف و عند محمد لا بد أن ينص عليه... وأما التابيد معنى فشرط اتفاقا على الصحيح و قد نص عليه محققو المشائخ'' (شامی ۴، ۳۴۹)۔

صحیح یہ ہے کہ وقف میں تابید کا پہلو حضرات صاحبین کے نزدیک شرط ہے ہاں صراحت کرنے میں دونوں کے درمیان اختلاف ہے، مگر معنیً اس پر دونوں متفق ہیں۔

''فإذا تم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن'' (درمختار ۴، ۳۵۲)۔

وقف جب صحیح ومکمل ہوجائے تو نہ اس کا کوئی مالک رہ جائے گا اور نہ کسی کو اس کا مالک بنایا جائے گا، نہ اس کو عاریت میں دیا جاسکتا ہے اور نہ رہن میں۔

وقف کی حفاظت اور تعمیر ومرمت:

''ويبدأ من غلته بعمارته ثم ما هو أقرب لعمارته كإمام مسجد ومدرس مدرسة يعطون بقدر كفايتهم ثم السراج والبساط كذلك إلى آخر المصالح... وإن لم يشترطه الواقف... و تقطع الجهات للعمارة إن لم يخف ضرر'' (درمختار ۴، ۳۶۷، ۳۶۸)۔

اور وقف کی آمدنی کو شئ موقوف کی تعمیر میں لگائیں گے، پھر جو چیز اس قبیل کی ہو، جیسے مسجد کا امام اور مدرسہ کا مدرس وغیرہ ان کو بقدر ضرورت دیا جائے گا، پھر روشنی وفرش کے انتظام میں خواہ واقف نے شرط میں ذکر کیا ہو یا نہیں، اور تعمیر کی ضرورت کی وجہ سے دیگر چیزوں (مثلاً اشخاص) پر خرچ کو روک دیں گے (اِلا یہ کہ کوئی اہم جہت ومد ہو)۔

حتی کہ وقف اگر تعمیر ومرمت کا محتاج ہو تو لکھا ہے کہ یہ معاملہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی کے سپرد مال موقوف کو کردیں کہ وہ اپنے خرچ سے بقدر ضرورت اس کی

تعمیر و مرمت کرادے، اور پھر اس کی آمدنی سے اس پیسے کو وصول کرتا رہے۔

اور اگر وقف کسی معین شخص پر ہے، اور تعمیر کی ضرورت ہے اور آمدنی کی کوئی جہت نہیں ہے تو جس کے لئے وقف ہے وہ اپنے ذاتی سرمایہ سے تعمیر کرائے (شامی ۴؍۳۶۷)۔

جو عمارت محض سکونت و رہائش کے لئے وقف کی گئی ہو تو جن لوگوں کے لئے ہے وہ اپنے مال سے اس کا کام کرائیں، اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں یا وسعت نہ رکھتے ہوں تو حاکم اس کو کرائے پر دے کر اس کی تعمیر و مرمت کا کوئی نظام بنائے اور بعد میں اس کو مستحقین کے سپرد کرے (درمختار ۴؍۳۷۳)۔

علامہ شامی نے کافی گفتگو کے بعد اخیر میں فرمایا ہے: ''والحاصل لما تقرر وتحرر أنه يبدأ بالتعمير الضروري حتى لو استغرق جميع الغلة صرفت كلها إليه ولايعطى أحد، ولو إماما ومؤذنا، فإن فضل عن التعمير شئ يعطى ماكان أقرب اليه مما في قطعه ضرر بين وكذالوكان التعمير غير ضروري، بأن كان لا يؤدي تركه إلى خراب العين'' (شامی ۴،۳۷۰)۔

اور سابق تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ آمدنی کو ضروری تعمیر میں پہلے لگایا جائے حتی کہ اگر ضروری تعمیر ساری آمدنی کھا جائے تو سب لگادیں گے اور کسی کو نہ دیں گے نہ امام کو نہ مؤذن کو، جب بچے گا تو قریبی مواقع میں صرف کیا جائے گا کہ جہاں صرف نہ کرنے میں کھلا ہوا نقصان ہو، اسی طرح جو تعمیر ضروری نہ ہو اس میں صرف نہیں کریں گے، مثلاً وہ حصہ کہ جس کو چھوڑ دیں تو اس کی وجہ سے پورا وقف خراب و برباد نہ ہو۔

وقف کا تبادلہ:

''اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه، الأول: أن يشرطه الواقف لنفسه أولغيره أو لنفسه وغيره فالا ستبدال فيه جائز على الصحيح، وقيل اتفاقا۔

والثاني: أن لايشرطه سواء شرط عدمه أوسكت لكن صار بحيث لا ينتفع با لكلية، بأن لا يحصل منه شئ أصلا أولا يفي بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه۔

والثالث: أن لا يشرطه أيضا ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعا و نفعا، وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار'' (شامی ۴،۳۸۴)۔

استبدال کی تین صورتیں ہیں: پہلی یہ کہ واقف اس کی اپنے لئے یا غیر کے لئے یا اپنے اور غیر دونوں کے لئے شرط لگائے تو قول صحیح پر، بلکہ کہا جاتا ہے کہ بالاتفاق جائز ہے۔

دوسری یہ کہ شرط نہ لگائے خواہ خاموش رہے یا یہ کہ منع کی شرط لگائے، اور وقف کا حال یہ ہو جائے کہ اس سے کسی طرح فائدہ نہ اٹھایا جاسکے، یا یہ کہ اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں تو بھی استبدال قول اصح پر جائز ہے۔ بشرطیکہ قاضی مصلحت سمجھے اور اجازت دے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ شرط تو نہیں، اور نہ ہی وقف معطل و بیکار ہے، بلکہ نفع بخش ہے اور تبادلہ و بدلہ میں بہتری دکھائی دیتی ہے تو قول اصح پر استبدال جائز نہیں ہے۔

اس سلسلہ کی شرطوں کی بابت گفتگو کرتے ہوئے شامی فرماتے ہیں:

''لا يخفى أن هذه الشروط فيما لم يشترط الواقف استبداله لنفسه أو غيره فلو شرطه لا يلزم خروجه عن الانتفاع ولا مباشرة القاضي له ولا عدم ريع يعمر به كما لايخفى فاغتنم هذا التحرير'' (شامی ۴،۳۸۶، ۳۸۷)۔

مخفی نہ رہے کہ یہ شرطیں اس وقت ہیں، جبکہ واقف استبدال کی شرط نہ لگائے، اور اگر اس کی طرف سے اس شرط کی صراحت ہے تو جواز کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وقف انتفاع سے نکل جائے اور نہ قاضی کی اجازت اور نہ آمدنی نہ ہونے کی کہ جس سے اس کو آباد کیا جاسکے۔

ایک موقع پر شامی نے وقف کے اندر اس انداز کے بعض تصرفات کے لئے لکھا ہے کہ ذمہ دار محلہ کے اہل صلاح مسلمانوں سے مشورہ کر کے کرسکتا ہے (شامی ۴؍۳۶۰)۔

شامی نے علامہ البیری سے نقل کیا ہے: فتح القدیر میں آیا ہے کہ استبدال یا تو استبدال کی شرط کی وجہ سے اور اس کے بعد ہوگا یا اس کے بغیر ہوگا، تو وقف کے انتفاع کی حد سے نکل جانے کی وجہ سے ہوگا، تو اس میں اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ یہ جائز ودرست ہے۔ اور اگر نہ تو شرط استبدال موجود ہے اور نہ ہی یہ بات کہ وقف سے انتفاع باقی نہ رہ جائے، بلکہ بات صرف یہ ہے کہ اس سے اچھی آمدنی کی جگہ ذریعہ اس کے بدلے میں مل رہا ہے تو اس کو جائز نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ وقف کا اپنے حال پر باقی رہنا ضروری ہے، تبادلہ کے مجوز دو ہی ہو سکتے ہیں، ایک شرط، دوسری ضرورت، اور یہاں دونوں میں سے کوئی موجود نہیں ہے، اس لئے کہ زیادتی ضروری نہیں ہے، اصل کو باقی ومحفوظ رہنا چاہئے (شامی ۴؍۳۸۸)۔

جو وقف آباد وکارآمد ہو، محض احسن وانفع حاصل کرنے کی بات ہو تو اس کو عموماً منع لکھا ہے۔ مگر بعض حضرات نے بشرط مصلحت اس کی گنجائش ذکر کی ہے اس بابت "قاری الہدایۃ" کا فتوی معروف ہے (شامی ۴؍۳۸۷، ۳۸۸)۔

ایک وقف اور آمدنی کا دوسری جگہ صرف:

پچھلے نمبر کے تحت شامی کی جو عبارت ذکر کی گئی ہے اس میں اصل شئی موقوف کے نقل کرنے کے ساتھ اس کے اجزاء، ٹوٹ پھوٹ کو دوسری جگہ استعمال کرنے ومنتقل کرنے کی بات بار بار آئی ہے۔ شامی کی نقل کے مطابق بہت سے حضرات نے اس کا فتوی دیا ہے، درمختار وغیرہ کی عبارت ہے:

"ولو خرب ما حوله و استغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام والثاني أبدا إلى قيام الساعة وبه يفتي۔ وعن الثاني ينقل إلى مسجد آخر بإذن القاضي و مثله۔ حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما وكذا الرباط و البئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه. تفريع على قولهما" (درمختار ۴، ۳۵۸، ۳۵۹)۔

مسجد کا اطراف اگر غیر آباد ہو جائے اور مسجد سے بے نیازی ہو جائے تو بھی وہ حضرات شیخین کے نزدیک ہمیشہ کے لئے مسجد رہتی ہے، اور اسی پر فتوی ہے۔ اور امام ابو یوسف کا قول ہے کہ اس کا سامان دوسری مسجد میں منتقل کر دیا جائے جب کہ قاضی کی اجازت ہو، اسی طرح حکم گھاس وچٹائی کا بھی ہے۔ اور سرائے و کنواں وغیرہ جب کہ بیکار ہو جائے تو ان سب کا وقف قریب کی مسجد یا سرائے یا کنویں وغیرہ میں صرف کیا جائے اور لگایا جائے گا۔

شامی نے لکھا ہے کہ "اسعاف" میں امام ابو یوسف کی دوسری روایت کو ہی اختیار کیا گیا ہے اور اسی کے مطابق خانیہ وغیرہ میں فتاوی آئے ہیں (شامی ۴؍۳۵۹)۔

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ وقف کو تبدیل کرنا اس وقت درست ہے، جبکہ ویران ہو جائے اور لائق انتفاع نہ رہ جائے، خواہ زمین ہو یا عمارت، اور ذخیرہ میں بحوالہ منتقی امام محمد کا قول نقل کیا ہے کہ جب وقف مساکین کے لئے نفع بخش نہ رہ جائے تو قاضی اس کو بیچ کر اس کی جگہ دوسری (زمین ومکان) خرید لے، قاضی کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں ہے۔

شامی نے اس بابت بعض مسائل کی تفصیل کے ضمن میں کہا ہے:

"يباع النقض بموضعين: عند تعذر عوده و عند خوف هلاكه" (بحر، شامی ۴، ۳۷۷)۔

وقف کی ٹوٹ پھوٹ وغیرہ کا بیچنا دو صورتوں میں درست ہے، ایک تو یہ کہ اب اس کا استعمال نہ ہو سکتا ہو، دوسرے ضیاع کا اندیشہ ہو۔

"اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشئ واحد وإن اختلف أحدهما بأن بنى رجلان مسجدين أو رجل مسجدا و مدرسة و وقف عليهما أوقافا لا يجوز ذلك" (درمختار ۴، ۳۶۰)۔

اگر دو وقف ہیں اور واقف اور جہت وقف ایک ہے اور ایک کی آمدنی کم ہوگئی تو حاکم دوسرے وقف کی زائد آمدنی کو اس پر خرچ کرے، اس لئے کہ دونوں کی حیثیت ایک ہے۔ اور اگر واقف دو ہیں یا ایک مگر جہت دو، کہ ایک مسجد ایک مدرسہ، تو ایک کے وقف کا دوسرے کے لئے استعمال درست نہیں ہے۔

"نقل في البحر عن الولوالجية: مسجد له أوقاف مختلفة لا بأس للقيم أن يخلط غلتها كلها وإن خرب حانوت منها فلا بأس بعمارته من غلة حانوت آخر؛ لأن الكل للمسجد و لو كان مختلفا؛ لأن المعنى يجمعهما"

(شامی ۴،۳۶۱)

ولوالجیہ میں آیا ہے کہ کسی مسجد کے اگر کئی اوقاف ہوں تو نگراں سب کی آمدنی کو باہم ملا سکتا ہے، اور اگر اس کی کوئی دوکان بیکار ہو جائے تو دوسری دوکان کی آمدنی سے اس کی تعمیر میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ سب مسجد کے لئے ہے، الگ ہونے کے باوجود دونوں میں ایک اتحاد و اجتماع ہے۔

''فتاوی تاتارخانیہ'' میں فقیہ ابواللیث کا فتوی نقل کیا ہے کہ اگر کسی سرائے تک پہونچنے کے لئے کوئی پل استعمال کیا جاتا ہو اور اس کے بغیر اس کے انتفاع اور اس تک پہنچنا ممکن نہ ہو اور وہ پل ٹوٹ جائے تو سرائے کی آمدنی سے اس پل کو بنایا جا سکتا ہے (تاتارخانیہ ۸۷۷/۵)۔

اسی طرح فقراء پر وقف کی آمدنی وقتی کار خیر میں صرف کی جاسکتی ہے، حتی کہ اس کی وجہ سے وقف کی مرمت وغیرہ مؤخر کی جاسکتی ہے اگر زیادہ نقصان نہ ہو ورنہ فاضل کو صرف کر سکتے ہیں، اسی طرح دیگر اوقاف میں گنجائش ہے، مگر جنس و نوع کا خیال رکھا جائے (تاتارخانیہ ۸۷۸/۵) اس طرح دیگر بعض حضرات سے مسجد کے اوقاف کی آمدنی کے علاوہ دوسرے اوقاف کی آمدنی کو دوسرے مصارف میں لگانے کی اجازت آئی ہے (۸۶۱/۵، ۸۸۰)، لیکن امام ابوالقاسم سے مسجد کے اوقاف کی آمدنی کو بالخصوص مسجد کے استغناء وغیرہ کی صورت میں فقراء پر صرف کرنے کی اجازت نقل کی گئی ہے (۸۵۲/۵، ۸۵۴)۔

یہ بعض فقہاء احناف کے اقوال و فتاوی ہیں جو قول ضعیف کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر ضرورتاً عمل کی اجازت دیدی جاتی ہے۔

وقف کے طویل اجارے واستفادے کے بعض نظائر:

فقہ حنفی کی کتابوں میں ایسی کئی صورتیں ملتی ہیں جن میں وقف سے مستفید ہونے والا خاص حالات وانداز میں وقف پر خرچ کے بعد ایک طویل مدت تک اس سے استفادہ کا حق رکھتا ہے، اگر چہ ان صورتوں میں یہ حکم اتفاقی نہ ہو، لیکن بہرحال اس کو ذکر کیا گیا ہے اور اس کو بہت سے حضرات نے اختیار بھی کیا ہے، اور ان کے لئے اصطلاحات متعین و مستعمل کی گئی ہیں، مثلاً:

۱۔ مرصد: جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک وقف جائداد محتاج تعمیر و مرمت ہوتی ہے اور کوئی سرمایہ اس کے لئے نہیں ہوتا تو ایک آدمی اپنا سرمایہ لگا کر اس سے استفادہ کو تیار ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ بہت معمولی کرایہ دیتا ہے، اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا ہے جب تک کہ مدت پوری کر کے، یا اوقاف کے ذمہ داروں کی طرف سے رقم ادا کر کے حساب نہ ہو جائے۔

۲۔ خلو الحوانیت: یعنی پگڑی کا تذکرہ بھی ان کتابوں میں اسی ضمن میں اور اوقاف کے اجارہ واستفادہ میں آیا ہے۔

۳۔ الحکر والمقاطعۃ: وقف زمین کی مالیت کے برابر رقم ادا کرنے کے بعد ماہانہ ایک کرایہ دے کر اس سے استفادہ۔ خود دینے والا رہے یا دوسرا۔ اس کرایہ میں رد وبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔

۴۔ الکدک: وقف دوکان یا مکان میں ضرورت کے مطابق اپنے سرمایہ سے تعمیر اور پھر اس کے مطابق اس سے مستقل یا طویل مدت تک استفادہ۔

ان سب صورتوں میں ملکیت نہیں ثابت ہوتی، مگر حق استفادہ مستقل یا طویل مدت کے لئے مانا جاتا ہے اور کرایہ بھی ادا کیا جاتا ہے جو عموماً رواجی کرایہ (اجرت مثل) سے کم ہوتا ہے۔

۵۔ کھیتی وغیرہ کی زمین میں بھی اس انداز کی محنت و خرچ کر کے یہ حق حاصل کیا جاتا ہے، شامی میں ان مسائل کا تذکرہ مختلف مواقع میں آیا ہے، مثلاً (۲۵/۶، ۲۶۔ ۴/۴، ۳۶۷، ۳۹۱، ۴۰۲، ۵۲۱ تا ۵۲۴ وغیرہ۔ الفقہ الاسلامی ۲۲۸/۸ حاشیہ)۔

فقہ حنبلی کے بعض توسعات:

''إن الوقف إذا خرب و تعطلت منافعه كدار انهدمت أو أرض خربت و عادت مواتا ولم تمكن عمارتها... ولا عمارة بعضه إلا ببيع بعضه جاز بيع بعضه لتعمر به بقيته۔ وإن لم يمكن الانتفاع بشئ منه بيع جميعه. قال أحمد في رواية أبي داؤد: إذا كان في المسجد خشبتان لهما قيمة جاز بيعهما وصرف ثمنهما عليه... لأن فيما ذكرنا استبقاء الوقف بمعناه عند تعذر إبقائه بصورته فوجب ذلك... وظاهر كلام الخرقي أن الوقف إذا بيع فأي

شئ اشتری بثمنه مما يرد على أهل الوقف جاز سواء كان من جنسه أو عن غير جنسه؛ لأن المقصود المنفعة لا الجنس لكن تكون المنفعة مصروفة إلى المصلحة التي كانت الأولى تصرف فيها؛ لأنه لا يجوز تغيير المصرف مع إمكان المحافظة عليه كما لا يجوز تغيير الوقف بالبيع مع إمكان الانتفاع به......وما فضل من حصر المسجد وزيته ولم يحتج إليه جاز أن يجعل في مسجد آخر أو يتصدق من ذلك على فقراء جيرانه وغيرهم... قال المروزي سألت أبا عبدالله عن بواري المسجد إذا فضل منه الشئ أو الخشبة قال يتصدق به وأرى أنه قد احتج بكسوة البيت إذا تخرقت تصدق بها، وقال في موضع آخر: كان شيبة يتصدق بخلقان الكعبة... وروى أن شيبة جاء إلى عائشة فقال: يا أم المومنين إن ثياب الكعبة تكثر عليها فننزعها فنحفر لها آبارًا فندفنها فيها حتى لا تلبسها الحائض والجنب قالت عائشة: بئس ما صنعت ولم تصب، إن ثياب الكعبة إذا نزعت لم يضرها من لبسها من حائض أو جنب ولكن لو بعتها وجعلت ثمنها في سبيل الله والمساكين فكان شيبة يبعث بها إلى اليمن فتباع فيضع ثمنها حيث أمرته عائشة. وهذه قصة مثلها ينتشر ولم ينكر، فيكون إجماعا، ولأنه من مال الله تعالى لم يبق له مصرف فصرف إلى المساكين كالوقف المنقطع'' (المغنی ۶۳۳، ۶۳۱، ۵، و ۶۳۵، ۶۳۶ حذفاً و اختصاراً)۔

(وقف جب ویران و بیکار ہوجائے، مثلاً کوئی گھر گر جائے یا زمین بیکار ہوکر بنجر ہوجائے، اور اس کا آباد کرنا ممکن نہ رہ جائے، یا ساری عمارت اس طرح مخدوش ہوجائے کہ اس کی نئی تعمیر اس کے کچھ حصے کو بغیر فروخت کئے ممکن نہ ہو تو باقی کو آباد کرنے کے لئے بعض کی فروخت درست ہے، اور اگر اس کے کسی حصے سے بھی انتفاع ممکن نہ رہ جائے تو کل کا بیچنا درست ہے۔ امام احمد نے ایک روایت میں فرمایا ہے کہ کسی مسجد کی اگر دو لکڑیاں قیمتی ہوں تو ان کو بیچ کر ان کی قیمت مسجد میں صرف کی جائے، ہماری دلیل یہ ہے کہ جب صورتاً وقف کا بقاء ممکن نہ رہا تو معنیً اس کے بقاء کی یہی صورت ہے (لہذا ایسے تصرفات درست ہیں)، وقف کو بیچنے پر جو بھی چیز اس کی قیمت سے خریدی جائے اور اس سے اہل وقف کو فائدہ پہونچایا جائے تو جائز ہے، خواہ اس سے اسی کی جنس کی چیز خریدی جائے یا دوسری، اس لئے کہ مقصود تو منفعت ہے خود جنس وصورت تو مقصود نہیں ہے، البتہ یہ منفعت اصل وقف کے محل ومصرف میں لگائی جائے گی، اس لئے کہ جب تک اصل مصرف پر صرف ممکن ہو اس کا بدلنا اسی طرح جائز نہیں جیسے اصل وقف کا بدلنا اور بیچنا جائز نہیں، جبکہ اس سے انتفاع ممکن ہو۔

اور مسجد کی چٹائی اور تیل وغیرہ سے جو کچھ بچے اور مسجد کو اس کی ضرورت نہ ہو تو اس کو دوسری مسجد میں صرف کرنا درست ہے، اسی طرح فقراء پر صرف وصدقہ کرنا بھی، خواہ مسجد کے پڑوسی ہوں یا نہ ہوں۔ امام احمد سے مسجد کی بوریوں کے متعلق پوچھا گیا کہ اگر کچھ زائد ہو یا لکڑی تو فرمایا کہ اس کو صدقہ کردیا جائے۔

اور اس کی دلیل ان کے نزدیک بیت اللہ کے غلاف کا معاملہ ہے کہ بیت اللہ کے کلید بردار حضرت شیبہ نے حضرت عائشہؓ سے آکر عرض کیا کہ بیت اللہ کے کپڑے بہت ہوجاتے ہیں تو ہم اس خیال سے کہ اس کو حیض والی عورتیں اور جنبی نہ پہنیں گڑھے کھود کر ان میں دفن کردیتے ہیں۔ فرمایا کہ تم یہ ٹھیک نہیں کرتے۔ اتار دینے کے بعد جو پہنے حرج نہیں ہے، اگر ایسا کرو کہ بیچ کر قیمت کوئی سبیل اللہ اور مساکین پر صرف کردیا کرو تو اچھا ہے۔ چنانچہ وہ ان کپڑوں کو یمن بھیج دیا کرتے تھے وہاں وہ بکتے تھے پھر ان کی قیمت حضرت عائشہؓ کے حکم کے مطابق صرف کی جاتی تھی، اور یہ قصہ وہاں چھپنے والا تھا نہیں، لیکن کسی نے انکار نہیں کیا، پھر یہ کہ یہ اللہ کا مال ہے جس کا مصرف باقی نہیں رہا تو مساکین پر صرف کیا جائے گا، جیسے وہ وقف جس کی جہت منقطع اور ختم ہوجائے تو اس کو فقراء پر صرف کریں گے)۔

اکابر علمائے ہند ومفتیان دیوبند کے خصوصی فتاوی:

ہندوستان کے اکابر ارباب افتاء اور بالخصوص ممتاز علمائے دیوبند نے وقف کی بابت جہاں عام احکام اور اصل مذہب کے مطابق فتاوی صادر کئے ہیں وہاں حالات اور گنجائشوں پر بھی نظر رکھی گئی ہے اور وسعت کے فتاوی بھی ان سے منقول ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مسجد کی فاضل آمدنی کو ضرورت پر دوسری مساجد میں صرف کرنے و لگانے کی بار بار اجازت دی ہے (امداد الفتاوی ۲؍۶۱۳-۶۲۰) اور اگرچہ مدارس وغیرہ میں لگانے کی اجازت نہیں دی ہے، اور فرمایا ہے کہ علاقہ کی نہ سہی ملک کی دوسری محتاج مساجد موجود ہیں، مگر ایک موقع پر یہ بھی تحریر فرمایا ہے: اب آگے امر اجتہادی ہے کہ ایا وقت استغناء صرف دوسری مساجد میں صرف کرنے کا فتوی دینے سے احتمال ضیاع کا مرتفع ہوسکتا ہے یا

نہیں۔ اگر ہوسکتا ہے تب تو دوسری جہات میں صرف کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ ''لأن اتحاد الجھۃ مرجع کما فی الرسالۃ''، ورنہ بضرورت اجازت دی جائے گی، ''وعلیہ بناء ما فی الرسالۃ'' (امداد الفتاوی ۲/ ۶۱۹) معطل قبرستان میں عوامی انجمن کی اجازت دی ہے۔ بعلت اشتراک معلوم ہوا کہ انجمن کا مکان وقفی نفع عام کے لئے مقبرہ کی جگہ بنانا جائز ہے (امداد ۲/ ۶۰۰)۔

ایک فتوی میں تحریر فرماتے ہیں: روایات بالا سے معلوم ہوا کہ اصل اور راجح تو عدم جواز نقل ہے، لیکن بعض علماء ضرورت میں جواز کے قائل ہوئے ہیں، سو بلا ضرورت شدیدہ تو اصل مذہب کو چھوڑنا جائز نہیں اور ضرورت شدیدہ میں گنجائش ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب ایک مسجد مستغنی عنہ ہوجائے اس کا وقف دوسری مسجد میں صرف کرنا بھی جائز ہے (امداد الفتاوی ۲/ ۷۲۳)۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے ''اعلاء السنن'' میں کافی تفصیل کی ہے، اصل مذہب کی تقویت کے ساتھ ''المغنی'' کی گذشتہ عبارت مزید تفصیل کے ساتھ، نیز بعض اجزاء پر تنقید کے ساتھ نقل کی ہے، اور اصل مسجد کو منتقل کرنے کی تو اجازت نہیں دی ہے، مگر فقہ حنفی کی بعض تصریحات اور آثار کی وجہ سے وسعت بھی ذکر فرمائی ہے، مثلاً راستے کو مسجد میں شامل کرنا، یا مسجد کے کسی حصہ کو راستہ بنانا، نیز مسجد سے متعلق ومتصل صحن یا چبوترہ میں ردوبدل کہ صحن وچبوترہ کو مسجد بنادیا جائے اور مسجد کو صحن وچبوترہ۔

استاذی مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے ضرورت پر مسجد کا سامان منتقل کرنے ولگانے کی اجازت دی ہے، اور مقصود وقف کے فوت ہونے پر تبادلہ وقف کی بھی، نیز معطل قبرستان میں مسجد کی تعمیر کی بھی اجازت دی ہے (فتاوی محمودیہ ۲/ ۱۵، ۴۱۵، ۱۴/ ۱۶۲، ۶/ ۱۹۸)۔

استاذی مفتی نظام الدین اعظمی کے فتاوی میں ایسے مسائل اور وسعت کی بات بار بار آئی ہے، جس میں ضرورتاً موقوفہ زمین کے بیچنے، متروکہ قبرستان میں مسجد کی تعمیر (خواہ نئی ہو) یا توسیع، قبرستان کی حفاظت کے لئے دوکانوں کی چہار دیواری، اس کی فاضل آمدنی کا دوسرے مواقع میں صرف، نیز اس میں مدرسہ کی تعمیر، معطل قبرستان کو کسی طرح کارآمد بناکر اس کی آمدنی سے فائدہ اٹھانا سب کا تذکرہ آیا ہے۔ ایک مفصل فتوی میں فرماتے ہیں: اوقاف کی فاضل آمدنی سے گورستان کی حفاظت ومرمت کی جاسکتی ہے، نیز جو قبرستان تدفین سے متروک ہوچکے ہوں یا قانوناً دفن سے روک دیئے گئے ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس میں دینی ضرورت کے مطابق مسجد یا دینی مدرسہ قائم کرکے یا اس کو کسی ایسے کار خیر میں استعمال کرکے جس سے مسلم عوام اور بچوں کی مذہبی واقتصادی تربیت وترقی کا ایسا کام کیا جائے کہ اصل واقفین کو ثواب پہنچتا رہے (نظام الفتاوی جدید اول/ ۱۸۰، نیز ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۷، ۱۷۴، ۱۷۹)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری کے فتاوی بھی حالات وضرورت کی رعایت میں توسع پر مبنی ہیں، استبدال وتبادلہ کے جواز کے علاوہ (رحیمیہ ۶/ ۷۳)، فاضل آمدنی کی بابت متعدد فتاوی میں فرمایا ہے کہ اگر واقعی موجودہ وآئندہ ضرورت سے فاضل آمدنی ہے اور رکھنے میں ضیاع کا اندیشہ ہے تو دوسرے مواقع میں صرف کریں مگر ایک جنس کی آمدنی اسی میں صرف کریں، نیز یہ بھی فرمایا ہے۔ اور اس مقصد سے کہ آبادی مسجد میں اضافہ ہو اس زائد اور فاضل رقم سے مسجد کے متعلق دینی تعلیم کا مدرسہ بھی قائم کرسکتے ہیں (فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۸۵، ۱۸۷)۔

خلاصہ عبارات وفتاوی:

گذشتہ عبارات وفتاوی کا حاصل یہ ہے کہ اوقاف کا بقاء اہم واقدم ہے، لہذا ان کو ختم کرنے کی کوئی صورت اختیار کرنا درست نہیں ہے، لیکن جب ان کا حال یہ ہوجائے اور حالات ایسے ہوں کہ ان کا بقاء واقف کے مقصد کا ان سے پورا ہونا نیز اس کے لئے حصول ثواب کا سلسلہ جاری رہے، یہ سب وقف میں ردو بدل وتصرف کے ذریعہ ہی ممکن ہو تو مجبوراً اس میں تبادلہ وتصرف کے اقدامات درست ہیں، ان کی حفاظت وبقاء اور ابدیت ودوام کو اولیت واہمیت دینے کی شرط کے ساتھ اصل وقف کے حق میں بھی، اور اس کی آمدنی کے حق میں بھی، اور قبرستان وغیرہ کے حق میں بھی اور مسجد کے حق میں بھی، خود فقہ حنفی میں بھی توسعات ہیں اور ائمہ مذاہب سے منقول ہیں، اس لئے فقہاء احناف اور بعد میں ہمارے اکابر ومفتیان نے بھی ضرورت ومجبوری کے حالات میں اجازت دی ہے اور ساتھ ہی اصل مذہب کو بھی نمایاں کرکے ذکر کیا ہے اور اس کی تقویت بھی کی ہے۔ اور جب مقصد وقف کی بقاء وحفاظت ہو اور اصل صورت ممکن نہ رہ جائے، اور فقہ حنفی میں گنجائش نہ ہو تو فقہ حنبلی کے توسعات سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، مثلاً ہمارے قدیم فقہاء نے تو ایک وقف کی آمدنی کو دوسری جگہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی ہے یا شاذ ونادر ہی دی ہے۔ مگر امام احمد سے مسجد کے وقف کی آمدنی وفاضل اشیاء کو فقراء پر صرف کرنے کی اجازت منقول ہے، اور انہوں نے مسجد کے اوقاف وصدقہ کرنے کے جواز میں بطور دلیل بعض آثار کو ذکر کیا ہے جن کا بعض علماء احناف نے جواب ضرور دیا ہے، مگر وہ جواب احتمالی ہے، کوئی اثر وغیرہ نہیں،

بجز حضرت عمرؓ کی معروف روایت کے جس سے وقف کے اصل حکم میں سب استدلال کرتے ہیں کہ اس کو بیچا نہیں جاسکتا وغیرہ ذلک تو اس کے تو سب قائل ہیں، سوال ضرورت کے مواقع کا ہے، اور اس کا کہ دوسری صورت انتفاع وبقاء کی نہیں بن رہی ہے اور اس صورت کے اختیار کرنے میں واقف اور ملت وامت سب کا فائدہ ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے دار الاسلام ودار الکفر کی نسبت سے جو فرق کا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ دار الکفر میں اوقاف کو واقف وبانی کی ملک میں واپسی قرار دیا جائے، کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ دوسرے ائمہ، بلکہ خود ہمارے بعض فقہاء وعلماء کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ان کو امام ابو یوسف کی رائے پر وقف ہی برقرار رکھا جائے اور صورت بدل دی جائے جو ممکن ہو، مولانا نے مسجد کو چبوترہ بنانے کی بابت صاحب "فتح القدیر" کے قول کو یہ کہہ کر نقل کیا ہے کہ آخر جیسے مسجد کو چبوترہ بنانے کی بات ذکر کی گئی ہے، راستہ بنانے کی بات بھی نقل کی گئی ہے، لیکن اس پر ان کو کوئی اشکال نہیں ہے، اور اس حکم کی تائید مولانا نے ضرورت کے احساس واعتبار کی بنا پر ہی کی ہے تو اسی کے تحت یہ گنجائش بھی ہونی چاہئے جس کی دوسرے حضرات نے صراحت بھی کی ہے۔

بعض حضرات نے مسجد کی زمین وآمدنی کو مدارس کے لئے استعمال کرنے کو منع کیا ہے، حضرت تھانوی کے فتاوی میں بار بار آیا ہے، کچھ شامی وغیرہ کی عبارت بھی نقل فرمائی ہے کہ مدرس کی کیا حیثیت ونوعیت ہے (امداد الفتاوی ۲/ ۶۲۰، شامی ۴/ ۳۶۷، ۳۷۲)، مبنی یہ کہ مدرسہ ومدرس کا مسجد کی آبادی میں کیا دخل، اور اس کے مصالح سے کیا تعلق؟ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور ہندوستان میں اس کا کھلا تجربہ ہے، اور دوسری جگہوں پر بھی محسوس کیا جاسکتا ہے کہ آج مساجد کی آبادی میں بالخصوص مساجد سے متصل ومتعلق مکاتب ومدارس کا بہت بڑا دخل ہے، بچوں کے حق میں بھی اور بڑوں کے حق میں بھی، اور پھر ہمارے ملک کے حالات اور فاضل اوقاف سے انتفاع کا بھی ایک تقاضا ہے اس کو محسوس کرتے ہوئے مفتی نظام الدین صاحب اور مفتی عبد الرحیم صاحب نے فاضل آمدنی کا، نیز فاضل زمین کا مدارس کے لئے استعمال کرنا درست قرار دیا ہے۔

اور حالات کو محسوس کر کے ان حضرات نے جو وسعت دی ہے اس کو دوسری اسی انداز کی چیزوں کے لئے بنیاد بنایا جاسکتا ہے، مثلاً مسجد کی فاضل زمین پر مدرسہ کی تعمیر، زمین تو ہمیشہ مسجد کی رہے گی، اور بہتر صورت یہ ہے کہ مسجد کو زمین کا کرایہ دیا جائے یا عمارت مسجد کی آمدنی سے تعمیر کرائی جائے اور اس عمارت کا کرایہ مسجد کو ملتا رہے، تاکہ براہ راست مسجد کا انتفاع پایا جائے، لیکن ضرورت وحالات کے تحت اگر بغیر کرایہ کے ایسا معاملہ کیا جائے، جبکہ مسجد اس سے مستغنی ہو اور اس کی ضروریات کا پورا نظم بھی ہو تو اس میں کوئی حرج سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ بہتر ہے کہ اس سے مزید مسجد اور اس کے اوقاف کی حفاظت ہوتی ہے، اور واقف کے مقصد کی بااحسن وجوہ تکمیل ہوتی ہے۔

رہ جاتی ہے یہ بات کہ وقف میں تبادلہ وغیرہ کے تصرف کے لئے فقہاء نے قاضی کی شرط، یعنی قاضی کے فیصلہ ونظر وحکم کی قید لگائی ہے، لیکن معروف ہے کہ ایسے بہت سے مسائل میں توسع اختیار کرلیا گیا ہے، معتمد ودیانتدار علماء وذمہ داران اور ارباب حل وعقد کو قاضی کی حیثیت ضرورتاً دی گئی ہے، لہذا ہندوستان میں اوقاف کے مسائل میں معتمد منتظمین کا فیصلہ معتبر ہوگا، اور مناسب ہوگا کہ یہ قید لگائی جائے اور توجہ دلائی جائے کہ وقف کے ذمہ داران ایسا فیصلہ کرنے میں صاحب نظر علماء سے رجوع کریں، ان کو شامل کریں یا کم از کم رابطہ واستفتاء کریں۔ شامی نے بعض معاملات میں محلہ کے مسلمانوں کی رائے کا ذکر کیا ہے اور ہمارے ارباب افتاء نے ایسے مسائل میں عموماً اس کا ذکر کیا ہے کہ ارباب حل وعقد ومنتظمین جب مناسب سمجھیں، یعنی ضروری وبہتر خیال کریں تو ایسے اقدام کریں۔ امداد الفتاوی (۲/ ۶۳۰) میں بھی کچھ اس بابت تفصیل آئی ہے کہ قاضی نہ ہو تو کیا کیا جائے گا۔

قبرستان کی حفاظت کی غرض سے دکانیں بنوانا:

الف۔ ایسے اوقاف جو معطل وبیکار ہیں اور ناجائز قبضوں میں ہیں، ان کو کارآمد بنانے کے لئے دوسری کسی جگہ جہاں فائدہ اٹھایا جاسکے ان کا متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو: عبارات نمبر ۳، نیز فتاوی علمائے دیوبند

ب۔ متبادل صورت کے لئے شخصی معاملہ یا حکومت وادارے سے معاملہ سب درست ہے۔

شرنبلالی وغیرہ کے کہنے کے مطابق مسجد کے ماسوا تمام اوقاف میں نقل کی اجازت دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: عبارات نمبر ۳، نیز فتاوی حضرت تھانوی ومفتی عبد الرحیم۔

تبادلہ میں اس کا لحاظ کیا جائے گا کہ اصل وقف کی جو جہت ہو اس کا نظم کیا جائے اس لئے کہ اس قسم کی ضرورت دوسرے مواقع میں پائی جاتی ہے، اور وہ صورت اپنائی جائے کہ جس میں واقف کے مقصد اور صورت وشرط کی حتی الامکان رعایت پائی جائے۔

اس لئے کہ استبدال وتبادلہ کی اجازت ضرورت میں اور پابندیوں کے ساتھ ہے، اور ضرورت کی رعایت میں واقف کی عدم اجازت کا بھی خیال نہیں کیا گیا ہے مگر مقصد اہم ہے، مدارس، مسافر خانے اور اسپتال آج بھی بنائے جاسکتے ہیں، ان سے واقف کے مقصد کی کسی نہ کسی درجہ میں بہرحال تکمیل ہوگی، یتیم خانہ بھی ایک اہم ضرورت ہے، نیز چھوٹے پیمانے کے ٹیکنیکل ادارے جن سے معمولی گھرانے کے بچے وبچیاں اور عورتیں ہنر سیکھ کر اپنی حیثیت کا نظم کرسکیں۔ جیسا کہ مفتی نظام الدین صاحب کے فتاوی میں ذکر آیا ہے، خالص عصری تعلیم کے اداروں کا قیام اپنے حالات کے اعتبار سے وقف اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں۔

الف۔ مسجد کی ضرورت ومصارف سے زائد وفاضل زمین دینی مدارس واداروں کے قیام میں استعمال کی جاسکتی ہے، دینی مدارس سے مقصد وقف وواقف کی جو تکمیل ہوگی وہ عصری اداروں سے نہیں ہوسکتی۔

ب۔ مسجد کی ضرورت سے فاضل آمدنی جس کا مسجد میں آئندہ صرف کرنا جلدی سوچا نہیں جاسکتا اور حفاظت بھی اہم ہے، اس کو دینی تعلیم ومدرسہ کے لئے استعمال کرنا درست ہے، مسجد ومدرسہ ایک دوسرے سے اس طرح مرتبط ہیں کہ ایک سے دوسرے کی بقا ہے، اس لئے مسجد کی فاضل زمین یا آمدنی کو دینی تعلیم کی نشر واشاعت کے کاموں میں لگانا درست ومناسب ہے، ہر عہد کے مسلمانوں نے مسجد کے ساتھ تعلیم ومدرسہ کا اور مدرسہ کے ساتھ مسجد کا نظام رکھا ہے اور یہ وقف کی حفاظت کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

مفتی عبدالرحیم صاحب نے اس کی صراحت کی ہے، حضرت تھانوی کے کلام میں بھی گنجائش ہے، البتہ اس کا لحاظ کیا جائے کہ اس کی ضرورت اس محلہ و علاقہ میں اہم ہو تو خرچ وصرف میں اس کو ترجیح دیں ورنہ دوسری شدید ضرورتمند مساجد پر صرف کو مقدم رکھیں، اس کے بعد اس کام کو کریں۔

الف، ب: اوقاف کی فاضل آمدنی کو اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں صرف کرنا مقدم ہے، عموماً فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، اور اگر اس جنس کے مصارف موجود نہ ہوں تو پھر ان کاموں ومواقع میں صرف کریں جو اصل وقف سے اقرب اور اس سے زیادہ مناسبت رکھنے والے ہوں، اور اس میں واقف کے لئے بھی ثواب زیادہ ہو۔

مثلاً مسجد کی آمدنی کو محلہ وشہر کی دیگر ضرورتمند مساجد میں، اور ضرورت نہ پائی جائے تو مدارس کے لئے، اسی طرح اس کا عکس بھی ہے، نیز دیگر اوقاف میں بھی اس کا لحاظ کریں گے، اور ضرورت پر اس میں وسعت بھی برتی جاسکتی ہے جیسا کہ جواب نمبر (۱) کے تحت تفصیل آچکی ہے۔

اس کو عموماً پسند نہیں کیا گیا ہے، اور یہی رائے مناسب ہے، اس لئے کہ ہر مرحلہ میں وسعت ہونے پر حدود کا لحاظ بالکل باقی نہیں رہ جائے گا، اس لئے ضرورت کے مواقع میں بھی تبادلہ کی اجازت پابندی کے ساتھ دی گئی ہے۔

پھر یہ کہ مقصد آمدنی کا بڑھانا ہے، اور صورت حال یہ ہے کہ عموماً وقف کے مکانات کا کرایہ بہت معمولی چل رہا ہے، لوگ سالہا سال نہیں دسیوں سال اور پشتہا پشت سے قابض ہوتے ہیں اور بہت معمولی کرایہ ادا کرتے ہیں، جبکہ وقف کا ضابطہ یہ ہے کہ اجرت مثل پر یعنی رواجی اجرت جو ہوتی ہو اس پر معاملہ ہونا چاہئے، اسی لئے وقف کی زمین کو طویل عرصہ تک کے لئے کرایہ پر دینے سے منع کیا گیا ہے، اس لئے تبادلہ کے بجائے صحیح حال پر لانے کی سعی وکوشش کرنی چاہئے، اور اگر واقعتہً مسجد کی ضرورت سے زیادہ ہے اور موجودہ وقف کی آمدنی سے کسی طرح اس کی تکمیل نہیں ہوسکتی تو احسن کے ساتھ تبادلہ کو سوچا جاسکتا ہے، جیسا کہ بعض فقہاء کی رائے ہے۔ یہ ضرورت کی وجہ سے ضعیف روایت پر عمل کے تحت قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ ضرورت پورا نہ ہونے کی بنا پر یہ جواز استبدال کی معروف ومتفق علیہ صورتوں میں داخل ہے۔

سوال نمبر (۱) کے تحت تفصیل آچکی ہے، ایسے اوقاف کا متبادل اختیار کیا جائے۔

الف۔ جب اس عمارت وزمین سے انتفاع کی کوئی مناسب صورت نہ بن سکے، مثلاً یہ کہ زمین کو کرایہ پر دیدیا جائے یہ بھی انتفاع ہے، تو ایسا معاملہ کرنے کی گنجائش سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی بلڈر تعمیر کر کے انتفاع کی شکل پیدا کردے اور وقف کی عمارت سے ہی اپنا معاوضہ حاصل کرلے، اس کے لئے صورت معاملہ اس طرح کی اختیار کی جائے کہ بتدریج زمین وعمارت سے بلڈر کا تعلق ختم ہوجائے بجائے ایک دومنزل کی مستقل ملکیت کے وہ اپنا معاوضہ طے کرلے جس کو عمارت کی تیاری کے بعد اس کی آمدنی سے یکمشت یا بتدریج لے لے۔

اس انداز کے بعض نظائر کا تذکرہ اس سے پہلے گذر چکا ہے ضرورۃً ان صورتوں کو گوارا کیا گیا ہے۔ اگر بلڈر اپنے کام کے عوض طویل اجارہ کا خواہشمند ہو،

معمولی اجرت وکرایہ پر توان صورتوں کے مطابق اس کو بھی گوارا کیا جا سکتا ہے۔

ب- وقف کی آبادی کے لئے اس کے کسی حصہ کو فروخت کرنا، وقف کی اصلاح نہیں، بلکہ اہلاک ہے، اس لئے اس کی اجازت یا اس انداز کی کسی چیز کی صراحت فقہ حنفی کی کتابوں اور علماء سے نہیں مل سکی، البتہ امام احمد سے اس کی اجازت ضرورت پر منقول ہے، جہاں واقعی ضرورت ہو اور کوئی حل نہ نکلے، اور اوپر جو صورت ذکر کی گئی ہے اس طرح کا بھی کوئی معاملہ نہ ہو سکے تو اس صورت کو محض وقف کی حفاظت وبقا اور باز آبادکاری کی نیت سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

مسجد یا قبرستان کی فاضل زمین میں مدرسہ کا قیام آج کل کے حالات میں درست ہے، جیسا کہ مفتی نظام الدین صاحب و مفتی عبدالرحیم صاحب کے فتاوی میں آیا ہے، البتہ بہتر صورت یہ ہے کہ کرایہ کے معاملہ کی کوئی شکل اپنائی جائے تاکہ مسجد وقبرستان براہ راست بھی مستفید ہوتے رہیں، مفتی محمود صاحب نے اپنے فتاوی میں بار بار یہ بات فرمائی ہے، نیز مفتی عبدالرحیم صاحب نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔

پہلے سوال کے تحت جو تفصیل آئی ہے اس کے مطابق تبادلہ یا کارآمد بنانے کی کوئی مناسب ومفید صورت اختیار کی جائے (خواہ قبرستان اس وجہ سے معطل ہوں کہ آبادی نہیں رہی، یا اس لئے کہ پابندی لگ گئی) مفتی نظام الدین صاحب کے فتاوی میں اس بابت کافی وضاحت وصراحت آئی ہے۔

جب قدیم مساجد آج بھی موجود ہیں اور ان میں نماز ادا کی جا سکتی ہے اور آباد کرنے والے بھی اطراف میں اور آس پاس موجود ہیں تو ان کو معطل چھوڑنا کسی طرح درست نہیں اور نہ حکومت کی طرف سے اس بابت پابندی کا لگانا۔ حکومت عمارت کی حفاظت کا نظام بنائے جو ممکن ہو، اور مسلمانوں سے بھی اس میں تعاون لے مگر نماز کی ممانعت کا کوئی حق اس کو نہیں ہے۔

قبرستان کی حفاظت کی غرض سے جب کہ اس کی چہار دیواری کی کوئی دوسری صورت ممکن نہ ہو تو اطراف میں دوکانیں بنا کر گھیرنا، اور دکانداروں سے سرمایہ لیکر اس کام کو کرنا درست ہے، اور اس کے لئے بیچنے کی صورت اختیار نہ کی جائے، بلکہ کرایہ داری اور پیشگی کرایہ لیا جائے، فاضل آمدنی پیچھے آئی ہوئی تفصیل کے مطابق مناسب کار خیر میں لگائی جائے۔ یہ صورت معاملہ بھی ان فقہی نظائر کے تحت آئے گی، اور ان کے مناسب ہے جن کا تذکرہ پانچویں اور چھٹے سوال کے تحت کیا گیا ہے۔

اسی طرح دوکانوں کے بنانے کی اجازت مفتی نظام الدین صاحب نے دی ہے۔

جب مسجد کے لئے دوسری زمین کا حاصل کرنا یا آس پاس جگہ حاصل کر کے دوسری مسجد کا بنانا ممکن نہ ہو تو مجبوراً اس کی گنجائش سمجھ میں آتی ہے، اور بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کھمبے دیکر اوپر مسجد و نماز کی جگہ بنادی جائے اور نیچے دفن کا سلسلہ جاری رہے، اگر قبرستان میں تدفین جاری ہے اور قبرستان بہت کشادہ نہیں ہے اور اگر ویران ہے یا یہ کہ کافی کشادہ ہے تو زمین سے ہی تعمیر کی اجازت ہوگی، ویران میں تو متعدد حضرات نے اجازت دی ہے (ملاحظہ ہو: فتاوی اکابر) اور آباد میں ضرورت سے فاضل ہونے والا مسئلہ ہے جس کے لئے گنجائش وجواز کی تفصیل گذر چکی ہے۔

پھر یہ کہ مسجد وقبرستان دونوں عامۃ المسلمین کے مصالح کے لئے ہیں اور قبرستان کے کسی حصے کا مسجد بنالینا واقف کے مقصد ثواب کے اعتبار سے بھی زیادہ مفید ہے۔ جب عام ضرورت کے تحت راستہ کو مسجد اور مسجد کے کسی حصہ کو راستہ اور چبوترہ کو مسجد اور مسجد کو چبوترہ بنالینے کی گنجائش فقہاء احناف نے، بلکہ ائمہ احناف نے ذکر کی ہے، تو شدید ضرورت کے حال میں اس کی گنجائش عین ان صورتوں واحکام کے مطابق ہے (راستہ وغیرہ کی بابت ملاحظہ ہو: اعلاء السنن ج ۱۳ر)۔

غیر مسلم کے وقف کو جب کہ مسجد وغیرہ کے لئے ہو درست قرار دیا گیا ہے، البتہ وقف کی تولیت وانتظام اس کے سپرد ہو اس بابت احقر کو کوئی چیز نہیں مل سکی، بظاہر تو یہ درست معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مذہب خاص کی وجہ سے نہ وقف کی اہمیت اور نہ موقوف علیہ کی عظمت، کچھ بھی اس درجہ میں نہیں رکھتا جو کہ ایک مسلمان کو ہوتی ہے، اور نہ ہی اس سے شرائط وقف کی تنفیذ میں وہ توجہ واہتمام متصور ہے جو اس کے لئے درکار ہوتا ہے۔

البتہ جو قدیم اوقاف غیر مسلموں کی تولیت وذمہ داری میں چلے آرہے ہیں ان کے حالات کا جائزہ لیکر فیصلہ کرنا مناسب ہے، اگر کام صحیح شرائط واحکام کے مطابق ہو رہا ہے تو ان کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔ ورنہ دوسری کارروائی کی جائے، اس لئے کہ اطلاقاً تصرف وتعرض میں فتنہ پیدا ہو سکتا ہے اور یہاں جو رواداری مطلوب ہے اس کے بھی خلاف ہے۔

☆☆☆

اوقاف اور ترقیاتی سرگرمیوں کا معیار

شیخ عبدالمحسن محمد العثمان[1]

أحمدك اللهم، شاكراً لسابغ فضلك، وأستهديك هادياً قريباً منجياً۔۔۔وأصلي وأسلم على رسولك نبي الرحمة، جاء بعقيدة التوحيد، وشريعة العدل، وحضارة الأخلاق۔۔۔وعلى آله وصحبه ومن سار على هديه إلى يوم الدين۔وبعد...

مجھے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بے انتہا خوشی محسوس ہورہی ہے جس نے مجھے اس اہم سمینار کی سرگرمیوں میں شرکت کی پرخلوص دعوت دی......،امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال کا تقاضایہ ہے کہ ہم ایک اسلامی تہذیبی پروگرام کے آئینہ میں اپنے کو موجودہ زمانہ سے مربوط کرنے کی نوعیت پر غور وفکر کریں جس کے ذریعہ امت اسلامیہ کی وہ عظمت رفتہ پھر بحال ہوجائے جس کا تعلیم و معاشرت کے مختلف میدانوں کے اندر ایک اہم حصہ رہا ہے۔

انسانی تہذیب کی تشکیل میں ہم اگر اپنی معاشرتی سرگرمیوں کے معیار کو بلند کرنے کے لئے کمربستہ ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اصولوں اور اپنے کامیاب تاریخی تجربات سے بھرپور استفادہ کریں، تاکہ ہماری معاشرتی ترقی اور فلاح کو مزید سرگرم بنانے والے مناسب حال اسلامی تہذیبی نقشوں اور طریقہ کار کو درجہ کمال تک پہنچانے والی تدابیر اور راہیں ہم پر آشکارا ہوسکیں، ان تدابیر سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ان ترقیاتی کاوشوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے جو سماج کے مختلف اداروں، خصوصاً ملکی سماجی اداروں کی طرف سے کی جارہی ہیں، اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عالمی سطح پر ترقیاتی عمل کی باگ ڈور بڑی حد تک ان ہی اداروں کے ہاتھوں میں ہے، صورتحال کی اس نزاکت کا تقاضا ہے کہ ہم وقف کی سنت کو ایک مؤثر اسلامی ترقیاتی پروگرام کی حیثیت سے پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کریں۔ اس مسئلہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تین بنیادی عناصر ہیں:

۱۔ ہماری موجودہ زندگی میں اسلام کے بارے میں تصور ۲۔ ترقی کے بارے میں ہمارا موجودہ تصور ۳۔ موجودہ مسلم معاشرہ کے ترقیاتی نظام میں وقف کا مقام

۱۔ ہماری موجودہ زندگی میں ہمارا اسلامی تصور:...... شاید کوئی یہ سوال کرے کہ کیا ہم اسلام کے بارے میں بحث کررہے۔؟ اسلام تو اپنے اصول، مرجعیت، اقدار اور قوانین واحکام کے اعتبار سے معروف و مسلّم ہے۔

یہ سوال درست ہے، لیکن ہمارا موضوع بحث اس وقت وہ وسیع باب ہے جسے شریعت نے فقہ کے لئے چھوڑ دیا ہے...... تاکہ ہم اپنی معاشرتی سرگرمیوں اور طرز زندگی میں اصولی اور فقہی اجتہاد کے ذریعہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرسکیں، ہم لوگ اس بات کو محسوس کررہے ہیں کہ اس وقت مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر دوسروں سے زیادہ فکری انتشار سے دوچار ہیں اور ان کی ایک بڑی اکثریت اس کا شکار ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ انتشار زبردست نقصانات کا سبب بنتا ہے اور ہر ایک الگ الگ مسلم معاشرہ کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردیتا ہے اور پورے عالم اسلام کے لئے بھی ضرررساں بنتا ہے...... یہ ایسا خسارہ ہے جس کا اندازہ ماہرین ترقیاتی پیمانہ کے ان معیاروں کے مطابق آسانی سے لگا سکتے ہیں جو موجودہ انسانی فکر کا ماخذ ہیں، ہمارے ناقص ادراک کے مطابق یہ حقیقت ہمیں مسلسل اسلام کے متعلق گفتگو کرنے پر مجبور کرتی ہے، یہ گفتگو، خواہ مخصوص سمیناروں کی سطح پر ہو یا عام محفلوں اور مجلسوں کی سطح پر...... موضوع کا نازک پہلو یہ ہے کہ ہمیں کس اسلام کے متعلق گفتگو کرنے کی ضرورت ہے؟......

بہت سے ماہرین عصر حاضر کو "انفارمیشن ایج" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ تعبیر بڑی حد تک دقت نظر پر مبنی ہے، تحقیق ومطالعہ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ

---

[1] سکریٹری جنرل الامانۃ العامۃ للأوقاف، کویت۔

ان معلومات کا حجم جو اس وقت صرف ایک سال میں مدون ہوتی ہیں اور جو عالمی سطح پر متداول ہوتی ہیں پوری طویل انسانی تاریخ کے مدون و متداول علوم و معارف سے زائد ہے، ہوسکتا ہے اس تخمینہ میں ہمارے درمیان اختلاف رائے ہو، لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس وقت روزانہ مختلف ذرائع سے علوم و معارف کا بے پناہ ذخیرہ منظر عام پر آرہا ہے، یہ ذرائع ہی ان کی تخلیق کرتے اور ان دلالوں کی ایک بڑی تعداد کے درمیان ان کو رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں جو دانستہ یا نادانستہ ان کو قبول کرتے ہیں۔

عصر حاضر کی اس مخصوص علامت کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ بلاشبہ نشر و اشاعت کے مختلف مراکز، ذرائع ابلاغ اور ارسال و ترسیل کی بے انتہا قوت اور برق رفتاری کا حامل انٹرنیٹ کے ذریعہ انجام دی جانے والی ان علمی سرگرمیوں میں اسلام کا تناسب قابل لحاظ حد تک پایا جاتا ہے۔

چنانچہ اسلام کے حدود اربعہ کی وہ تعیین جس کے متعلق ہم گفتگو کرنا چاہتے اور خوشخبری دینا چاہتے ہیں کہ اسلام اس انفارمیشن ایج میں ایسی اہم ضرورت بن چکا ہے جس کا دعوت الی اللہ کی فطرت تقاضا کرتی ہے...... اور چونکہ جو خود پیاسا ہو وہ دوسروں کی پیاس نہیں بجھا سکتا، اس لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم خود اپنی موجودہ زندگی میں اسلامی تصور اور حیثیت کو اجاگر کریں۔

جب انبیاء علیہم السلام اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فریضہ تبلیغ ادا کیا اور دینی اقدار کی ترسیخ اور اصول شریعت کی تطبیق کا ایک مکمل نمونہ ہمارے سامنے پیش فرمادیا، پھر صحابہ، تابعین اور تبع تابعین نے تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار میں اپنے حالات زمانہ کے مطابق بہتر طور پر اصول شریعت کی تطبیق کے اس مبارک عمل کو جاری رکھا اور جب خدائے بزرگ و برتر کی مشیت یہی ہے کہ دعوت الی اللہ کا عمل تا قیامت جاری رہے...... تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی موجودہ زندگی میں اسلام کے تطبیقی تصورات و مفاہیم کے انتشار کا ازالہ کریں...... اس لئے کہ فہم و تصور کا یہ انتشار ترقیاتی کاوشوں پر بہت ہی واضح اثر ڈالتا ہے بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پسماندگی کی ایک علامت ہے جسے دور کرنا ضروری ہے۔

اگر ہمارے پاس بحیثیت امت مسلمہ اسلام کے واضح تطبیقی تصورات و مفاہیم نہیں ہیں جن پر ہمارے عوام الناس کا ایمان ہو اور اسلامی عدل کی طرف اپنے مقدمات میں وہ رجوع کرتے ہوں، اسلامی اخلاق سے آراستہ ہوں اور اسلامی طریقہ کے مطابق ہی دوسروں کے ساتھ ان کا رہن سہن اور ان کے معاملات ہوں، اور جب ہماری ہی جنس کے غیر مسلموں کے لئے ان تصورات کا احاطہ مشکل ہو تو اس صورت میں میرے اپنے اندازے کے مطابق بسا اوقات مسلم معاشرے سخت داخلی اور خارجی انتشار اور کشمکش میں مبتلا رہیں گے، اور یہ داخلی و خارجی کشمکش ترقیاتی عمل اور ان کے حصول کے لئے سم قاتل ہے۔

اسلامی اصولوں کے لئے موجودہ تطبیقی تصورات کے فقدان کی ایک مثال ہم بیان کرتے ہیں...... شاید اس سے ہمارے موجودہ فکری انتشار کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اور زیر بحث مسئلہ کی ماہیت واضح ہو سکے۔ یہ مثال مفہوم مال کے تعلق سے ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم مال کے مفہوم کے کسی معاصر واضح اور متفقہ نقطہ نظر یا اکثریت کے اتفاق پر مبنی نقطہ نظر کے حامل ہیں، اس طور پر کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا نظریہ شاذ کے درجہ میں ہو۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی کیمپوں کے درمیان سرد جنگ اور جنگ کے نتیجہ میں ہر ایک کو اپنا حمایتی بنانے کی زبردست تگ و دو کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے درمیان ایک فکری تحریک ظہور پذیر ہوئی جس کا خیال تھا کہ اسلام ایک اشتراکی مذہب ہے، اس کے بالمقابل ایک دوسری تحریک منظر عام پر آئی جس کا دعوی تھا کہ اسلام ایک سرمایہ دارانہ مذہب ہے، اور یہ صحیح ہے کہ ان دنوں ایک دوسرا فکری رجحان بڑھ رہا ہے جو اسلام کے حقیقی تصور مال اور سماج اور اداروں سے اس کے رابطہ و تعلق کی نوعیت کو واضح کرنے کی کوشش میں ہے، مگر اس طرز فکر کی خامی یہ ہے کہ یہ عرصہ دراز تک دنیا پر چھائے ہوئے "اشتراکی اور سرمایہ دارانہ" دونوں نظریوں میں سے ہر ایک کو اپنا ہمنوا بنانے والی تحریک کی ناکامی اور کمزوری سے قوت حاصل کرنے کی کوشش میں ہے، اس کی قوت کا سرچشمہ قوت و طاقت کے ذاتی عوامل نہیں ہے۔

ہم زخموں کو کریدنا نہیں چاہتے، بلکہ اسلام کے تصور مال کی آمیزش کی ایک مثال دینا چاہتے ہیں، نویں دہائی کی ابتداء میں اپنے مسلم عرب پڑوسی عراق کی طرف سے کویت پر کیا جانے والا حملہ اس کی ایک واضح مثال ہے، پڑوسی ملک پر حملہ کے دیگر وجوہ جواز کے ساتھ ساتھ ایک وجہ جواز مال کے غلط تصور کا استعمال بھی ہے، کیا بحیثیت امت ہمارے فکری انتشار کی یہ ایک واضح دلیل نہیں ہے؟...... اس انتشار کے ہوتے ہوئے مسلم معاشروں کی ترقی اور ان کی ترقی کو بروئے کار لانے کے تقاضوں کی تکمیل کبھی نہیں ہوسکتی، یہ ملکوں اور ایک ہی سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان بہت سے جھگڑوں کے برپا ہونے کا سبب ہے، اور تباہی،

ہلاکت اور زوال کا باعث ہے، اسلامی اصولوں کے تطبیقی مفاہیم میں خلط و التباس کی زد میں سارے ان فکری عناصر پر پڑتی ہے جن پر ہمیں موجودہ ترقیاتی نظریہ کی بنیاد رکھنی چاہئے — ان میں سے مثال کے طور پر چند یہ ہیں، ملکیت اور حقوق ملکیت کا تصور، استخلاف فی الارض کا تصور، معاشرہ میں وقف اور زکوۃ کا کردار، دعوت اور اجتہاد کا تصور، آزادی اظہار رائے اور حدود اختلاف رائے کا تصور، رفاہی امور کا تصور، فساد فی الارض اور جہاد کا تصور، اقتدار اعلیٰ، شورائیت، اجماع اور اکثریت کے تصورات، اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے امور جن کے لئے ایسے مفاہیم کی تلاش ہے جو شریعت کے مطابق ہوں، ہمارے اس دور میں قابل عمل ہوں، اور جن پر امت کا اتفاق ہو۔

۲۔ ترقی کا موجودہ مفہوم:

ترقی سے ہماری کیا مراد ہے؟ — ماہرین کی اصطلاح سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ہم اس سوال کا جواب دینا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ "ترقی" کا لفظ عربی زبان کے ایک مفرد کی حیثیت سے صرف عصر حاضر میں معروف ہے، اور اگر غیر عربی زبان کے مطابق "ترقی" تغیر اور نمو کے عمل کا نام ہے تو میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ترقی انسانی زندگی کی فطرت کا ایک حصہ اور پوری انسانی تاریخ میں ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، اور لوگوں نے ہر دور میں زمان و مکان اور حالات کے اختلاف کے باوجود ترقی کے لئے ہمیشہ جدوجہد کی ہے۔

چنانچہ آج کا مسئلہ ترقی کے وجود کا نہیں ہے، اس لئے کہ ترقی تو موجود ہے اور ہر ایک تغیر و نمو کے عمل سے گذر رہا ہے، بلکہ آج کا اصل مسئلہ ترقی کے اغراض و مقاصد اور اس کے ذرائع و وسائل کا ہے، ہم کیوں کر نمو و تغیر کو قبول کریں اور کیسے قبول کریں؟ ترقی و تغیر کے لئے مختلف اسالیب کو ہمارے اختیار کرنے کے اسباب کیا ہیں؟ اور پھر ترقی و تغیر کے اس عمل میں نفع و نقصان کی مقدار کیا ہے؟

میرا خیال ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اکثر لوگ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ترقی کا کوئی ایک نمونہ نہیں ہے جس کی تقلید لازمی ہو اس لئے کہ ہر قوم، بلکہ ہر شہر کی کچھ اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اور ان کے تدریجی حالات ہوتے ہیں جن کے زیر اثر وہ اپنی طرف سے تیار کردہ ترقی کے نمونہ کی تشکیل کرتے ہیں، بلکہ بعض کے نزدیک خصوصیت کی رعایت اور تکمیل میں اس کے نفوذ کی وجہ سے معاملہ یہاں تک پہونچ چکا ہے کہ صرف معاشرتی ترقی (یعنی الگ الگ ہر چھوٹے معاشرے کی مقامی ترقی) پر روشنی ڈالی جارہی ہے، جیسا کہ ترقی کا کوئی ایک بنیادی مرکز یا ادارہ ہو جو علاقائی پیمانے پر ہو یا پورے مسلم معاشرے یا ملک یا اسٹیٹ کو شامل ہو۔

میں چاہتا ہوں کہ تمہید کے مسئلہ سے متعلق کچھ بنیادی مفاہیم کی طرف اشارہ کرتا چلوں، وہ یہ ہیں:

(الف) اس بات کی ضرورت کہ مسلمان اسلام کی قیادت کو تسلیم کریں (ب) پسماندگی سے ترقی کے تعلق کی نوعیت کا مسئلہ (ج) ترقیاتی سرگرمیوں کے معیارات

(الف) اس بات کی ضرورت کہ مسلمان اسلام کی قیادت کو تسلیم کریں:

تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ اس بات کی واضح رہنمائی کرتا ہے کہ مسلمانوں کی سرزمین میں اسلام کی جڑیں راسخ ہیں، اور اس کی شدید ضرورت ہے کہ امت کی تمام طاقتیں اور اس کے تمام اجتماعی ڈھانچے ٹھیک ٹھیک اسلام کو قبول کریں۔ اس کی تاریخی مثال یہ ہے کہ سامراجی طاقت جنوبی امریکہ کی اقوام کا اپنی فکری جڑوں سے رابطہ اور تعلق کو توڑنے میں کامیاب ہوگئی ٹھیک اسی وقت قرب مسافت کے باوجود شمالی افریقہ اور بحیرہ روم کے مشرق میں آباد مسلم قوموں کا اسلام سے تعلق توڑنے میں ناکام رہی، لہذا مسلم معاشرے کا اسلام کی سربراہی اور قیادت کو تسلیم نہ کرنا سخت نقصانات کا باعث ہوگا جس کے نتیجہ میں ہمیں ترقی کی سنجیدہ کوششوں کو کمزور کرنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

(ب) ترقی کا پسماندگی سے رابطہ کی نوعیت کا مسئلہ:

یہ بات معلوم ہے کہ ترقی۔ اپنے ایک مفہوم کے اعتبار سے۔ پسماندگی کے ازالہ کا نام ہے، بالفاظ دیگر ہمیں اس پسماندگی کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کا ازالہ اور خاتمہ ہم چاہتے ہیں، اس سوال کا براہ راست، واضح اور صحیح جواب ہی در اصل میرے خیال میں ترقی کے منصوبوں کی مضبوط بنیاد بنے گا، میرا خیال ہے اس جواب کے بغیر ہم خالی خولی دائرہ میں گھومتے پھرتے رہیں گے۔

تہذیبی ادبار اور سماجی و اقتصادی پسماندگی کے اسباب مختلف ہیں اور اس کے پیمانے متعدد ہیں جن میں سے اہم کا احاطہ مندرجہ ذیل امور میں ممکن ہے:

۱۔ مفاہیم میں خلط ملط، فکری حرکیت کا زمانے کے ساتھ چلنے سے باز رہنا، معاشرہ کی اصل اور حقیقی ثقافت سے حاصل شدہ کسی نئے اسلوب سے مسائل زمانہ کا مقابلہ کرنے سے پیچھے ہٹنا۔

۲۔ روایت پرستی اور دوسری تہذیبوں کی تقلید ان دونوں قسم کی انتہاپسندی کے درمیان فکری تحفظ۔

۳۔ سیاسی زندگی میں جاری مفاہیم اور ان کے انطباق میں معاشرہ کے تمام افراد اور جماعتوں کے اندر التباس، خصوصاً ان تطبیقات میں جن کا تعلق حقوق و فرائض کے مفاہیم سے ہے۔

۴۔ معاشرہ کے عمومی نظام میں کمزوری اور اس کی امن وسلامتی کو درپیش بڑھتے خطرات۔

۵۔ معاشرے کے مختلف عام وخاص اداروں کے انتظام وانصرام میں کمزوری، پالیسیوں کی گڑبڑی، کرپشن کا عام ہونا اور افراد و جماعتوں کے باہمی رابطہ اور لین دین پر منفی اقدار کا تسلط۔

۶۔ اجتماعی کفالت ونگہداشت کے فقدان اور غربت ومحرومی سے دوچار طبقوں کے ساتھ مسلسل زیادتی کے باوجود سرمائے اور آمدنیوں کی تقسیم میں پایا جانے والا زبردست تفاوت۔

۷۔ معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان پائے جانے والے سماجی امتیازات کو مٹانے والی اجتماعی حرکت کی مشینوں کا بند ہو جانا۔

۸۔ تعلیم وصحت اور خدمات عامہ کے معیار کی پستی اور بامقصد تفریح کے تصور کا فقدان۔

۹۔ تطبیقی علوم اور ثقافت سے عدم دلچسپی۔

۱۰۔ اقتصادی مساوات کے دونوں پہلوؤں طلب ورسد کے درمیان عدم توازن، جس کے نتیجہ میں سماج مختلف مشاکل میں پھنس کر رہ جاتا ہے جیسے افراط زر، آمدنیوں کی حقیقی قوت خرید کی گراوٹ، داخلی وخارجی قرضوں میں دب جانا جس کا بوجھ سال بسال بڑھتا ہی جاتا ہے، اور سماج کے بہت بڑے حصے میں غربت و افلاس کا عام ہونا۔

۱۱۔ اقتصادی تنوع میں عدم توازن، چنانچہ کبھی اقتصادیات یکرخی آمدنی اور نفع آمیز ہو کر رہ جاتی ہے، آمدنی کا معیار بڑھ جاتا ہے اور سماج میں پسندیدہ اور اختیاری بے روزگاری بڑی حد تک بڑھ جاتی ہے، اور عمومی طور پر کام کرنے والی طاقتوں کی سرگرمیوں کا معیار گھٹ جاتا ہے۔

۱۲۔ مختلف شعبہ جات، پیشوں اور معیارات کے درمیان کام کرنے والے عوامل کی باڈی کی تشکیل میں عدم توازن۔

۱۳۔ بیرونی تجارتی تعلقات کا خام مواد کی برآمدات اور مکمل بنی ہوئی مصنوعات کی درآمدات پر زور صرف کرنا۔

(ج) ترقیاتی سرگرمیوں کے معیارات:

فطری بات ہے کہ ترقیاتی منصوبہ اور اس کی تنظیم کے لئے سرگرمیوں کے معیارات کی ضرورت ہوگی۔ اس موقع پر خود بخود جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کیا خالص اقتصادی تغیرات کے اشارات ہی سے ترقی کے نتائج کو پرکھنا ضروری ہے؟ جیسے: قومی آمدنی کی بڑھوتری کا اوسط اور ہر فرد کا اس میں حصہ، کام کا پروڈکشن، ذخیرہ اندوزی کا رجحان اور اس کا حجم، سرمایہ کاریوں کا حجم، یا اور اس طرح کے دوسرے معیارات جن کا استعمال ہی بعض ملکوں کی اقتصادیات کی درجہ بندی کرتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ یہ اقتصادی طور پر پسماندہ ہیں اور اس [illegible] اس درجہ بندی سے نکلنے کے لئے یہ ممالک خالی خولی دائرے میں چکر لگاتے پھرتے ہیں، یہاں تک کہ اس درجہ بندی کی رو سے غریب ملک کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے "چونکہ فلاں ملک غریب ہے اس لئے وہ غریب ہے"۔

چند دہائیوں سے اکثر ماہرین اقتصادیات ترقی وپسماندگی کی درجہ بندی کے لئے ان معیارات کو استعمال کرتے آئے ہیں، بہت سے غریب اور امیر اور ان ملکوں کے تجرباتی مطالعہ کے بعد جن کو اس درجہ بندی کی رو سے ترقی پذیر ملک قرار دیا گیا تھا حالانکہ وہ مختلف قسم کی پسماندگی کے مظاہر میں مبتلا تھے اس خیال کی غلطی واضح ہو چکی ہے، یہ خیال اس لئے بھی درست نہیں کہ ہمیں اس وقت ایسے معیارات کی ضرورت ہے جو مسئلہ کے وسیع اطراف وجوانب سے ہم آہنگ ہوں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے جب ہم اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے پاس اس کے لئے ایک فکری وعملی دائرہ موجود ہے،

اسلام اصول سازی کرتا ہے اور پھر زمان ومکان کے حالات سے ہم آہنگی کے لئے وسیع میدان چھوڑ دیتا ہے، اسلام اپنے اصولوں کی بنیاد پر ہمیں اس قابل بنادیتا ہے کہ ہم پسماندگی کے آثار کا ازالہ کریں اور ترقی کو بروئے کار لائیں، اور ایسا اس طرح کہ:

۱۔ اسلام تخلیق کی حکمت اور مخلوقات میں انسان کے مقام کے سلسلہ میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، اسلام انسان کو اس پہلو سے بھی تدبر کی دعوت دیتا ہے کہ اسے اپنی ذات اور دیگر انسانوں اور مخلوقات کے تعلق سے بڑی بڑی ذمہ داریوں کا مکلف کیوں بنایا گیا ہے؟ اسی طرح اسلام مکمل طور پر فکری جمود کورد کرتا ہے، اور ہر زمان ومکان میں مسلمانوں کو درپیش مسائل ومشکلات کا حل تلاش کرنے کے مقصد سے قوانین کی تشکیل، مفاہیم کی تجدید اور ان کی تطبیقی شکلوں کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اجتہاد پر ابھارتا ہے۔

۲۔ فرائض کے تعلق سے مسلم معاشرہ کے افراد کے درمیان وحدت فکری انتشار اسلام میں ممنوع ہے، انتہا پسندی اور غلو اعتدال پر مبنی اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، لہذا اس کی تعلیمات کے مطابق فکر، زندگی کے معاملات اور دوسری تہذیبوں سے تال میل میں انتہا پسندی اور غلو سے احتراز کی ضرورت ہے۔

۳۔ اسلام نے درست سیاسی زندگی کے لئے واضح اصول مقرر کئے ہیں، اور ان کے نفاذ کی تفصیلات کو ہر معاشرہ اور ہر زمانہ کے مناسب حال اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے، مسلم معاشروں کی سیاسی زندگی میں کمزوری اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرے کے افراد اور اداروں کی طرف سے اسلامی اصولوں کی غلط تعبیر پیش کی جاتی ہے، خاص طور سے شریعت کے مقرر کردہ حقوق وفرائض کے مفاہیم کے تعلق سے جب کوئی غلط تصور سامنے آتا ہے۔

۴۔ اسلام نے حقوق وفرائض کے مفاہیم کی جو موزوں درجہ بندی کی ہے، اس کے نتیجہ میں معاشرہ کا عمومی نظام درست ہوجاتا ہے اور یہ معاشرہ کے امن کی ضمانت بھی ہے۔

۵۔ جہاں تک انتظامیہ کا تعلق ہے تو اسلام ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحت کے ساتھ حسن سلوک پر ابھارتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اغراض ومقاصد اور پالیسیوں کی واضح تعیین کی جائے۔ فرائض کی بجا آوری کا معیار بلند ہو، فساد اور خرابی کے تمام مظاہر سے دور رہا جائے اور افراد و جماعتوں کے باہمی تعامل میں مثبت اقدار کی حکمرانی اور بالادستی تسلیم کی جائے۔

۶۔ اسلام نے (زکوۃ، وقف اور دیگر صدقات کے حوالے سے) دولت کی تقسیم میں توازن اور عام اقتصادی امور اور تمام ہی محتاج اور کمزور طبقات کی اجتماعی نگہداشت اور کفالت کے عمل کو بروئے کار لانے سے متعلق ایک بیش بہا اور متوازن نظام پیش کیا ہے۔

۷۔ اسلام نے رنگ، قومیت، انسان کی مالی حالت اور انسان اور انسان کے درمیان تفریق کرنے والے دیگر معیارات سے قطع نظر ہر انسان کو اس کے عمل کے مطابق افضل قرار دیتے ہوئے اجتماعی عمل کے ایسے معیارات ترتیب دیئے ہیں جو منتخب افراد کی صفوں میں شمولیت کی تنظیم کرتے ہیں۔

۸۔ اور جہاں تک تعلیم، صحت، جسم وجان کے حقوق، اسی طرح محنت وفرائض کی ادائیگی اور کام کو جاری رکھنے میں معاون تفریح کے درمیان توازن کا مسئلہ ہے..... تو ان تمام امور میں اسلامی تعلیمات واضح اور متعین ہیں...... اسلام ان امور کو کمالیات نہیں بلکہ ضروریات کا درجہ دیتا ہے۔

۹۔ اسلام نے لوگوں کو طلب علم کے لئے جدوجہد اور مختلف قوموں کی تہذیبوں اور ان کے علوم سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی، اسی طرح اسلام نے اپنے پیروؤں کو تلاش رزق، اپنی ضروریات کی تکمیل اور اس سلسلہ میں اسباب و ذرائع کو اختیار کرنے کی ترغیب دی۔۔۔ اور یہی وہ فلسفیانہ بنیاد ہے جو تطبیقی علوم کی تحریک کے پیچھے پوشیدہ ہے۔

۱۰۔ اقتصادی میدان میں اللہ تعالی ہمیں محنت، پیداوار اور اعتدال کے ساتھ بغیر کسی تخریب اور ضیاع کے تمام موجودات اور مسخر اشیاء سے فائدہ اٹھانے کا حکم دیتا ہے..... وہ ہمیں زندگی سے لطف اندوز ہونے کا حکم دیتا ہے لیکن خرچ میں اسراف کے بغیر۔۔۔ یہ حکم اس لئے ہے تاکہ معاشی مساوات کے دونوں پہلوؤں، آمدو خرچ کے درمیان توازن برقرار رہے۔

۱۱۔ اقتصادیات کو متنوع بنانے کے سلسلہ میں مسلمانوں کو اس بات کا مکلف بنایا گیا ہے کہ رزق کے حصول کے لئے سرمایہ کے کسی ایک ذریعہ پر تکیہ کرنے کے بجائے مختلف ذرائع سے تلاش رزق کی کوشش کریں۔

۱۲۔ اسلام میں عمل کی قدریں اور کام کرنے والے کا احترام، اسکے مرتبہ، اختیارات اور کام کی نوعیت سے قطع نظر ایک ایسی طاقتور بنیاد فراہم کرتا ہے، جو کچھ متعین

کاموں پر توجہ مرکوز کرنے اور دوسرے کاموں کو نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں مختلف پیشوں، شعبوں اور معیارات کے درمیان کام کرنے والی قوتوں کے ڈھانچے کی تعمیر میں واقع ہونے والی خرابی کو دور کرتی ہیں۔

۱۳۔ جہاں تک مسلم معاشرے کے بیرونی تجارتی تعلقات کا معاملہ ہے تو اس میں منافع اور اشیاء کے تبادلہ میں بڑی حد تک ممکنہ توازن کا پایا جانا ضروری ہے۔

۳۔ موجودہ مسلم معاشرہ میں ترقیاتی عملی نظام میں وقف کا مقام:

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ترقی بغیر تبدیلی کے ممکن نہیں۔ وقف کا نظام شرعی اصولوں سے مربوط تغیر کے عمل کے لئے موزوں دائرہ کار فراہم کرتا ہے..... اسی طرح یہ سماجی ذرائع اور وسائل کی تشکیل کا سامان فراہم کرتا ہے...... خواہ وہ وسائل مادی ہوں یا بشری اور مخصوص فنی تجربات، اسلام ان ذرائع سے ترقی کے مقاصد کی تکمیل میں کام لیتا ہے، مندرجہ ذیل اہم اشارات سے یہ بات واضح ہوجائے گی۔

۱۔ تاریخ نے وقف اور ترقی کے درمیان گہرے رابطہ کا پتہ دیا ہے، چنانچہ اسلامی تاریخ کے روشن ادوار میں زندگی کے مختلف میدانوں میں انجام دیئے جانے والے بیشتر عظیم تہذیبی اور ترقیاتی کارناموں میں وقف کے نظام کی کارفرمائی نظر آتی ہے...... جو انہیں سرمایہ محنت اور فنی تجربات کے ذریعہ تقویت پہنچایا کرتا تھا۔

۲۔ وقف کے ترقیاتی اقدامات سے واضح طور پر موجودہ اسلامی تہذیبی رجحانات کے اہم خطوط کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وقف کا نظام اسلام کی ترقیاتی اقدار اور عبادت وعقیدہ کی اقدار کے درمیان ہم آہنگی کو ظاہر کرنے کی اصل اور حقیقی شکل ہے۔ ان ہی اقدار کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ دوسرے معاشروں سے ممتاز ہوتا ہے۔

۳۔ نظام وقف کی ترقی سے اسلام کے اعلی اخلاق واقدار کی حقیقت نمایاں ہوتی ہے۔ یعنی اسلام کے انسانی جذبہ کفالت، دوسروں کے ساتھ ہمدردی، ان کی خیر خواہی خواہ وہ ہمارے لئے غیر معروف اور ہم سے دور ہوں، اور اس کے برعکس وہ اقدار بھی ہیں جن سے انسانیت دوچار ہے یعنی مادی فائدے کا حریص ہونا اور افراد کی اپنی شخصی مصلحت کے ساتھ اختیارات کو اپنی حد تک مرتکز کرنے کے سلسلہ میں انتہا پسندی۔ اوقافی پروجیکٹس میں معاونین اہل خیر کی شرکت معاشرے کے مستطیع افراد کی سماجی ذمہ داریوں کے اصول کو واضح کرتی ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے مال اللہ کی ملکیت ہے اور اس نے ہمیں مال کے سلسلہ میں اپنا جانشین بنایا ہے، اور سماجی نقطہ نظر سے اللہ نے صاحب ثروت افراد کو ان کے ماحول اور معاشرہ کے بہت سارے وسائل سے نواز رکھا ہے۔ ایمان کی صداقت انہیں اپنے ماحول اور معاشرہ کے تعلق سے ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کا بہتر طور پر احساس دلاتی ہے، ایمان کی صداقت ہی ان کو اس بات کا شعور عطا کرتی ہے کہ ان کی ترقی واستحکام میں ماحول ومعاشرہ کا کیا کردار ہے؟ وقف کے نظام کے عام ہونے کی وجہ سے سرمایہ پر سے یہ قدیم تاریخی الزام رفع ہوجاتا ہے کہ اس کی وجہ سے انسان انانیت پسند ہوجاتا ہے، یا اپنے شعور کو کھو بیٹھتا ہے، یا اس کے ذریعہ انسان اپنے دوسرے بھائی کا استحصال کرنے کے لئے کچھ اختیارات حاصل کرنا چاہتا ہے..... سرمایہ کی اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کی طرف منتقلی موجودہ دور میں معاشرہ کی ترقی کی ایک نمایاں علامت ہے، اور یہی حال ہر زمانے میں رہا ہے۔

۴۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ وقف کا نظام سرکاری اور عوامی کاوشوں کے درمیان، ہم آہنگی اور تطابق پیدا کرنے، انہیں ایک مشترکہ مقصد پر مرکوز کرنے اور دونوں طرف کے شکوک وشبہات کے ازالہ کا ایک بنیادی اور اہم طریق کار تھا، تاریخ اسلام کے ہر روشن اور زریں عہد میں اوقاف نے دفاعی میدان میں، غریبی دور کرنے میں، علوم وثقافت کی ترقی میں، صحتی خدمات کے میدان میں، مزدوروں کی دیکھ ریکھ کرنے اور راستوں کو پرامن بنانے کے میدان میں، مملکت کی کوششوں کے ساتھ تعاون کیا ہے ان کے علاوہ دیگر اعلی تہذیبی اور معاشرتی فلاح وبہبود کے میدانوں میں بھی اوقاف کی خدمات مسلم ہیں۔

۵۔ وقف کا نظام مسلم معاشرہ کو اپنے مختلف طبقات اور گروہوں سے مربوط رہنے کا حقیقی موقع عطا کرتا ہے، چنانچہ خدمت عامہ کی بنیاد پر جس میں معاشرے کے تمام افراد کے حال و مستقبل کا مشترک مفاد پنہاں ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے سے متحد ہوجاتے ہیں۔

۶۔ جہاں تک وقف کی اسکیموں کی تنفیذ وانتظام میں شرکاء کی رضاکارانہ کوششوں کا تعلق ہے۔ تو یہ شہریوں کے درمیان صحیح جمہوری نظام کو عملی جامہ پہنانے کی بہترین کوشش ہے، اور ہمیں کہنے دیجئے کہ جمہوریت کا مظاہرہ زبانوں اور نعروں سے پہلے عمل اور تعاون میں ہوجاتا ہے۔

۷۔ وقف کی اسکیموں کے ذریعہ خصوصی صلاحیتوں، مادی اور انسانی وسائل کی تنظیم کے نتیجہ میں انفاق عام کو صحیح رخ ملتا ہے، حکومت کے عام بجٹ کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے، نہ صرف رفاہی امور میں انفاق کو مناسب جہت ملتی ہے بلکہ معاشرتی امور کے انتظام میں بھی انفاق کو صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے..... صرف حکومت ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ تمام شہریوں کی ضروریات کی تکمیل کرے اور ان کی ضروری سہولتوں کی فراہمی پر مکمل خرچ کرے۔

۸۔ وقف کے ترقیاتی تجربہ کے تسلسل اور اس سے متعلق صلاحیتوں کے ارتکاز سے اوقافی اداروں کو تقویت حاصل ہوگی اور وہ بحران سے نمٹنے کا بہتر نظام بن جائیں گے، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وقف کے انتظامات میں سرگرم سرکاری اور قومی صلاحیتوں سے مشکلات کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ان سے نمٹنے کے منصوبوں کے سلسلہ میں فائدہ اٹھایا جائے۔۔اور قانونی پیچیدگیوں اور روٹینی طریقوں کو چھوڑ کر بحرانات سے مقابلہ کی ضروری تدابیر اختیار کی جائیں۔

۹۔ وقف اہم سماجی ترقیاتی شعبوں کے لئے مالی استحکام کی بہت معمولی رقم مختص کرتا ہے اور ان شعبوں کو حکومت کے مالیاتی نظام کے تغیرات سے محفوظ رکھتا ہے جو کبھی آمدنیوں کی قلت کی وجہ سے اور کبھی بحران اور ہنگامی صورتحال کے پیش آجانے کے نتیجہ میں زائد اخراجات کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہوجاتے ہیں، اسی طرح کبھی کبھی خصوصی امداد بھی جو رضا کارانہ انفاق میں اضافہ کا ذریعہ ہوتے ہیں اقتصادی کساد بازاری اور بحران کے زمانے میں پیش آنے والے نامساعد حالات میں اپنا اہم رول ادا کرسکتی ہے۔ایسے مواقع پر وقف ہی دکھوں کا مداوا اور معاشی تغیرات وحوادث سے نجات کا ضامن بن کر سامنے آتا ہے۔

۱۰۔ وقف ان افراد کے لئے جو اپنی وفات کے بعد اپنی اولاد کے تحفظ کے خواہشمند ہوتے ہیں اوقافی ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ اجتماعی تحفظ کی مختلف صورتوں میں سے ایک مؤثر صورت ہے، اس اعتبار سے وقف اولاد کے حق میں زندگی کی ضمانت کی ایک بہترین دستاویز ہے، نہ صرف ایک نسل کے لئے بلکہ آئندہ آنے والی تمام نسلوں کے لئے جب تک اس کی پیداوار کی مستحق اولاد دنیا میں موجود رہے گی اس وقت تک کوئی اس میں تصرف کرنے یا اسے اپنے لئے خاص کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔اس طرح اپنی اولاد وذریت کیلئے وقف کی ذخیرہ اندوزی آمدنی کو اس مبارک مقصد کی طرف پھیر دیتی ہے۔۔اور اس طرح مال کے مالک اسراف و تبذیر کے مختلف راستوں سے اپنے سرمایہ کو بچانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

۱۱۔ افراد اور معاشرہ کے وقفی سرمائے سے ترقیاتی اسکیموں میں کام لینے کی صورت میں بڑھتی ہوئی جدید اور ترقی یافتہ مالی قوت حاصل ہوتی ہے جس سے ملکی اقتصادیات کو سپورٹ ملتا ہے۔

۱۲۔ ترقی کے لئے کوشاں مختلف ممالک میں آج عام ہورہا ہے ''پراویٹائزیشن کے عمل'' کے نتیجہ میں ضمناً مرتب ہونے والے سماجی اور اقتصادی اثرات و مشکلات کے حل کی تلاش وجستجو میں وقف پوری سرگرمی کا مظاہرہ کرتا ہے، ان مسائل میں سرفہرست ایک طرف بے روزگاری کی صورتحال ہے اور دوسری طرف نوجوان طبقہ میں کام کی بھرپور طاقت وقوت ہے۔ظاہر ہے کہ بے روزگاری اور نوجوانوں کی بیکاری کے مسائل سرمایہ کاری کے پرکشش میدان نہیں ہیں۔

۱۳۔ ''رضا کارانہ اور رفاہی شعبوں'' کے ذریعہ معاشرتی اساس کی تکمیل میں وقف کا ایک بڑا رول ہے۔۔رضا کارانہ خدمت کا شعبہ دراصل سرکاری اور پرائیویٹ دونوں شعبوں کی تکمیل کرتا ہے اور جو آج پوری دنیا میں معاشرتی ترقی کے کارواں کو آگے بڑھانے میں اساسی حیثیت کا حامل ہوگیا ہے اور ترقیاتی عمل میں توازن پیدا کرنے کا یہ ایک مؤثر ذریعہ ہے۔۔وقف اس تیسرے شعبہ کا اساسی جز بن کر اور اس میں نمایاں کردار ادا کر کے ان مسائل ومشکلات کے حل کا ایک بنیادی اور اہم عنصر بن گیا ہے جو اس شعبہ کی کارکردگی کو متاثر کرتے ہیں۔

اس کے اولین نقاط یہ ہیں:

۱۔ رضا کارانہ اور رفاہی شعبہ کی تحریک کے لئے ایک تنظیمی چھتر سایہ کی فراہمی...... باوجودیکہ بعض غیر سودی اداروں مثلاً کوآپریٹو جمعیتوں کا اپنا وفاق ہے جو ان کی قوتوں کو یکجا رکھتا اور ان کے وسائل سے استفادہ کو وسیع کرتا ہے۔مگر مجموعی حیثیت سے ترقی پذیر ملکوں میں رضا کارانہ رفاہی شعبہ کے لئے تنظیمی وفاق مفقود ہے جو اس شعبہ کو زیادہ نمایاں کرتا اور سرکاری اور پرائیوٹ شعبوں کی تکمیل میں اس کے رول کو طاقتور بناتا۔

۲۔ ان رضا کارانہ اور رفاہی اداروں کے درمیان تعاون اور تال میل کے ذرائع پیدا کرنا کچھ لوگوں کے نزدیک اس وقت رفاہ عامہ کی تنظیموں اور اسلامی رفاہی اداروں کی تقسیم علاحدہ کی جاتی ہے، جب کہ یہ تمام ہی ادارے مسلم معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، اور اپنے پروگرام اور دائرہ کار کے اختلاف کے باوجود مسلم معاشرہ ہی کو اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔

۳۔ ہر ملک میں امور اوقاف کی نگرانی کرنے والے مرکزی ادارے سماجی مسائل اور ترقیاتی ورفاہی کاموں کے مختلف میدانوں سے متعلق معلومات کی کمی پر قابو پانے کی کوشش کررہے ہیں۔۔اس دور میں ہر اسکیم اور منصوبہ کی افادیت کا دارومدار علمی تحقیقات پر ہے، خواہ وہ سرکاری اسکیمیں ہوں یا غیر سرکاری یا رضا کارانہ اور رفاہی، یہ کوئی پسندیدہ بات نہ ہوگی کہ رفاہی سرمائے کو (بشمول اوقاف کے سرمائے) غیر سوچے سمجھے پروجیکٹس پر ضائع کیا جائے...... یا ان کو ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے جو ترجیحات کی فہرست میں کسی نمایاں مقام کے حامل نہیں ہیں، اس سلسلہ میں بنیادی بات معلومات کی فراہمی ہے جن کے ذریعہ وقف

کے نظام کو بہتر سے بہتر شکل دی جاسکتی ہے۔

۴۔ رضا کارانہ رفاہی ادارے کے لئے ایسے مناسب ماحول کی تشکیل جس سے مالیات کی فراہمی کے ذرائع اور نئے نئے رضا کار افراد کی تیاری میں مدد لی جا سکے۔تمام ہی رفاہی تنظیمیں اور رضا کار ادارے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے سلسلہ میں مدوجزر کے مختلف حالات سے گزرتے ہیں...... یا تو مخصوص قائدانہ شخصیات سے وابستہ رہنے کی وجہ سے، یا مخصوص تاریخی حالات کی وجہ سے، یا ازکار رفتہ مقاصد کو اپنا مطمح نظر بنانے کی وجہ سے۔۔اس کے برعکس وقف ایک پائیدار، ہر زمانہ کا مطلوب اور اپنے متعلقہ اغراض کی تکمیل کے ذریعہ تنفیذی حرکیت کا ایک لچکدار نظام ہے، دوسرے الفاظ میں وقف ایک ایسا رفاہی اور رضا کارانہ عمل ہے جس کے اندر ہر زمانہ میں رضا کارانہ محنت کرنے والے اور مالی تعاون کرنے والے افراد پیدا کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔

۵۔ رضا کارانہ اور رفاہی خدمت کے اداروں میں قیادت کی صلاحیت رکھنے والے افراد کے تسلسل کو تقویت پہنچانے کی کوشش اور اس کے انتظامات کے طریقوں کی تجدید...... تسلسل اور دوام کی صفات جن سے وقف کے ادارے متصف ہوتے ہیں، رضا کار افراد کو تسلسل کے ساتھ اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع دیتی ہیں۔۔اسی کے نتیجہ میں عملی قیادت کرنے والے افراد سامنے آتے ہیں۔۔۔یہ خصوصیت صرف وقف کے نظام کی ہے اور وقف کے سوا دوسرے نظاموں کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے، دوسرے نظاموں کا حال یہ ہے کہ کبھی ان میں قیادت موجود ہوتی ہے اور کبھی خدمت کا جذبہ ہوتے ہوئے بھی ان ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی طرف آدمی کا رجحان نہیں جاتا۔

۶۔ وقف کا نظام رضا کار اور رفاہی اداروں کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ حکومت کی ترقیاتی اسکیموں اور ان کے نفاذ کی پالیسیوں کی تشکیل میں شریک ہوں......اور ایسا وقف کی متعدد امتیازی خصوصیات کے پیش نظر ہوتا ہے......جن میں سے کچھ اہم خصوصیات یہ ہیں:

امور اوقاف کی تشکیل حکومت کی انتظامی اور قانونی تنظیم کے ماتحت ہوتی ہے، حکومت ان کی تشکیل اور ان کے نگراں اداروں کے لئے اپنے قوانین لاگو کرتی ہے۔

وقف کے اداروں کے اغراض ومقاصد ایک پائیدار حکمت عملی کے تابع ہوتے ہیں، وقف کی خصوصیت یہ ہے کہ اول روز ہی سے اس کے مقاصد متعین ہو جاتے ہیں۔اور واقف کی وفات کے بعد ان اغراض میں ترمیم نہیں کی جاسکتی۔

وقف کے اداروں کا مالی استحکام......وقف کے سرمائے اپنے مقاصد پر وقف ہوتے ہیں، وقف کا یہ مالی استحکام وقف کے سرمائے کو ہمیشہ اچھے ثمرات عطا کرتا ہے......مالی استحکام ہی کی وجہ سے وقف منصوبہ بندی کرنے والے افراد کی نظر میں خدماتی اور ترقیاتی پروگراموں کو تقویت پہنچانے کا ایک مضبوط سہارا ہے۔

وقفی سرمایوں کے ذرائع واضح ہوتے ہیں......ان کے اغراض ومقاصد اور وسائل میں شکوک وشبہات کے امکانات نہیں ہوتے۔

عوامی توانائیوں کو ایک ایسے رخ پر منظم کیا جاتا ہے جو اغراض ومقاصد کے اعتبار سے حکومت کے ترقیاتی منصوبوں اور پالیسیوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

خاتمہ:......ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اسلام کی ہدایت عطا کی۔اور ایسے طریقہ سے اسے سمجھنے کی توفیق بخشی جس سے ہمارا معاشرہ خیر سے مالا مال ہو جائے اور اس کے ذریعہ ہمیں ہر زمانہ کے حالات وظروف کے مناسب صورتحال کی تبدیلی کے لئے پرامن دائرہ کار اور ترقی کے وسائل فراہم ہوں......ہمارا فرض ہے کہ ہم اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں موجودہ تطبیقی تصورات اور عملی پروگراموں کے ذریعہ ان ربانی تعلیمات کی تنفیذ کا مکلف بنایا ہے۔موجودہ تطبیقی تصورات اور عملی پروگراموں کے عام ضوابط میں ہم متحد ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی پوشیدہ ترقیاتی توانائیوں اور طاقتوں سے استفادہ کے طریقوں میں ہمارے درمیان اجتہاد کی بنیاد پر اختلاف رائے ہوسکتا ہے، اسلام کی خوابیدہ ترقیاتی توانائیوں میں سب سے زیادہ مؤثر اور فعال توانائی وقف ہے۔

آخر میں، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری امت کی فلاح وبہبود کے لئے کی جانے والی کوششوں کو کامیاب فرمائے......اور مختلف اسلامی معاشروں کی تمام سرکاری اور عوامی طاقتوں اور حلقوں سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ حتی الوسع وقف کے ترقیاتی کارواں کو تقویت پہنچانے پر اپنے تمام تر مالی وسائل وذرائع کو صرف کریں......اسی میں مسلم قوموں کا بہتر مستقبل مضمر ہے......اور موجودہ دنیا میں جہاں بے نظیر "گلوبلائزیشن" کی ہوائیں تیزی سے چل رہی ہیں، مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی بقا وتحفظ کا واحد ذریعہ یہی وقف کا نظام ہے۔

☆☆☆

قدیم قبرستان میں مسجد کی تعمیر کا حکم

مولانا زبیر احمد قاسمی [1]

مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اولاً فقہاء کرام کی تصریحات اور فقہی روایات ہی نقل کردی جائیں تا کہ سوالوں کا باضابطہ جواب مدلل ہونے کے علاوہ مختصر انداز کا بھی کافی وشافی بن سکے:

’’الرواية الأولى: قال محمد الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه و يشترى بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضي‘‘ (البحر الرائق ٥،٢١٩)۔ ’’والثانية: إن أهل المسجد لو اتفقوا على نصب رجل متولياً لمصالح المسجد فعند المتقدمين يصح‘‘ (شامی ٣،٤٠٩)۔ ’’والثالثة: قال مولانا أشرف على التهانوى: قلت: لما جاز نصب المسلمين متولياً مع وجود القاضى لبعض العوارض فكيف مع عدم القاضى‘‘ (امداد الفتاوى ٢،٦١٥)۔ ’’والرابعة: والظاهر أن حكم عمارة أوقاف المسجد والحوض والبئر وأمثالها حكم الوقف على الفقراء‘‘ (شامی ٣،٣٨٢)۔ ’’والخامسة: مراعاة غرض الواقفين واجبة‘‘ (شامی ٣،٤٢٣)۔ ’’والسادسة: حاصله أنه يعمل بقول أبي يوسف حيث أمكن وإلا فبقول محمد‘‘ (ايضا، ٥١٩) ’’والسابعة: ولا يملك القاضى التصرف فى الوقف مع وجود الناظر ولو من قبله‘‘ (ايضا، ٣٨١)۔ ’’والثامنة: ولو اشترى ببدل الوقف فإنه يصير وقفا كالأول على شروطه وإن لم يذكر شيئاً‘‘ (ايضا، ٤٠٦)۔ ’’والتاسعة: قوله إلى أقرب مسجد أو رباط، لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه‘‘ (ايضا، ٣٧١)۔

مذکورۃ الصدر فقہی روایتوں کی روشنی میں سوال (ا) کے جوابات حسب ذیل ہیں:

الف۔ مسلمانوں کی آبادی منتقل ہوجانے کی وجہ سے جو اوقاف ویران ہو چکے ہیں اور اب بحالت موجودہ ان کی آبادی اور واقف کے مقصد کی تکمیل ناممکن بن چکی ہے، بلکہ ان اوقاف پر حکومت یا غیر مسلموں کے قبضہ ودخل بڑھتے جانے کے سبب ان اوقاف کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا ہے۔

خواہ وہ اوقاف، مدارس اور مساکین وفقراء پر ہوں، یا عین مدارس اور خانقاہ ومقابر ہی ہوں، تمام ہی قسم کے اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے منشاء ومقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے مقام پر اسی نوع کا دوسرا متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے فروخت کرنے کا حق ہر عام وخاص کو نہیں ہوگا، بلکہ اگر متولی قدیم دیندار وامین موجود ہے تو وہ فروخت کرے گا، ورنہ قاضی شریعت، یہ بھی نہ ہوں تو عامۃ المسلمین جسے نیا متولی بنا کر اختیار دیں گے وہ بھی فروخت کر کے دوسرا متبادل وقف قائم کرسکتا ہے۔

ب۔ بیع نام ہی ہے ایک چیز کے عوض دوسری چیز لینے کا، تو جب مذکورہ بالا مسطورہ جواب سے اوقاف کے ناقابل انتفاع ہوجانے کی صورت میں تبادلہ کا جواز معلوم ہوگیا تو اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ویران اوقاف کو حکومت یا کسی بھی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد اوقاف کی تکمیل کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔

ویران ناقابل استعمال وانتفاع اوقاف کو فروخت کر کے اس کی آمدنی سے واقف کے منشاء ومقصد کی رعایت کئے بغیر مطلقاً تعلیمی ورفاہی ادارے قائم کرنا درست نہیں۔

---

[1]

فقہاء کی صراحت کہ سابق نا قابل انتفاع اوقاف کوفروخت کر کے اس کا جو بدل حاصل ہوگا اس سے جو چیز خریدی جائے گی بعینہ وقف سابق کے حکم میں ہوگی۔

پھر واقفین کے اغراض ومقاصد کی رعایت بھی ضروری ہے، اس لئے اولاً تو کوشش یہی کی جائے گی کہ ویران اوقاف، مثلاً مساجد ومدارس، رباط، کنواں اور حوض وغیرہ کی قیمت سے مسجد ومدرسہ رباط وحوض وغیرہ ہی بنایا جائے، اور اگر حالات وموانعات کے سبب یہ ممکن نہ ہو تو اسی نوع کے دیگر قدیم محتاج اوقاف پر خرچ کیا جائے۔

الف۔ مساجد پر وقف اراضی کا اصل مصرف تو یہی ہے کہ بوقت ضرورت اگر ممکن ہو تو نفس مسجد کی توسیع کی جائے یا اس کی آمدنی سے مساجد کی حقیقتاً تعمیر ومرمت ہو یا حکماً تعمیر وآبادی کی ضرورتیں پوری کی جائیں، مثلاً امام، مؤذن ودیگر خدام مسجد، فرش اور روشنی وغیرہ کا نظم کیا جائے، فقہاء لکھتے ہیں:

''فيقدم أولا العمارة الضرورية ثم الأهم فالأهم من المصالح والشعائر'' (شامی ۳۷۷/۳)، قال أبو نصر للقيم أن يفعل ما فى تركه خراب المسجد كذا فى فتاوى قاضى خان'' (فتاوی ہندیہ ۴۶۲/۲)۔

بہر حال مصارف بالا تو فقہاء کی تصریحات سے ثابت ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ مسجد پر وقف اراضی اگر فی الحال مسجد کی ہر قسم کی ضروریات سے زائد ہوں تو کیا اس زمین پر مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا کوئی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب متقدمین فقہاء اور ماضی قریب کے معروف اکابر مفتیان کرام کی تصریحات وفتاوی سے نفی ہی میں نکلتا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عمارۃ مسجد اور مصالح مسجد دونوں ایک ہی درجہ کے مساوی مصارف ہیں۔

''والأصح ما قال الامام ظهير الدين أن الوقف على عمارة المسجد ومصالح المسجد سواء'' كذا فى فتح القدير'' (أيضا)۔

اب اگر مصالح مسجد کے مصداق ومفہوم میں کچھ مزید عموم کر دیا جائے اور کہا جائے کہ ہر وہ کام جس سے مسجد کی حفاظت اس کی موقوفہ اراضی کو دوسروں کی دست برد سے بچانا اور مسجد کی آبادی میں آج یا کل اضافہ ہونا متوقع ہو، سب ہی مصالح مسجد میں داخل ہیں تو پھر ہمارے خیال میں مسجد کی موجودہ ضروریات سے زائد زمین پر دینی مدرسہ کے قیام کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

کیونکہ دینی ادارے سے دینی تعلیم کے نتیجے میں بظن غالب عام طور پر مسجد کے محافظ مصلی، امام مؤذن اور دیگر صالح قسم کے خدام ہی پیدا ہوا کرتے ہیں جو یقیناً مسجد کی آبادی میں دخیل ومؤثر ہوتے ہیں اور انہیں لوگوں سے مساجد آباد رہا کرتی ہیں۔

لیکن عصری تعلیم کے ادارے سے مساجد کے آباد کرنے والے افراد شاذ ونادر ہی نکلا کرتے ہیں، اس لئے خواہ مسجد کی موقوفہ زمین زائد از ضرورت ہو یا اس کی آمدنیاں۔ کسی کو عصری تعلیم کے ادارے کے قیام میں صرف کرنا جائز نہیں کہا جاسکتا، یہ مصالح مسجد سے بھی خارج ہیں، چنانچہ حال وماضی قریب کے بعض اکابر مفتیان کرام کے فتاوی بھی کچھ اسی طرح کے ملتے ہیں، ''هذا ما عندى والعلم عند الله''۔

ب۔ جب واقف نے اراضی ومکانات مساجد کے لئے وقف کیا ہے تو اس کی آمدنی مسجد کی تعمیر ومرمت اور دیگر ضرورتوں مثلاً امام مؤذن اور دیگر خدام فرش وروشنی وغیرہ کی تکمیل میں خرچ ہونی چاہئے، اگر ان تمام ضروری اخراجات سے بھی زائد آمدنی ہو اور مستقبل قریب میں اس کے خرچ ہونے کی توقع نہ ہو، بلکہ ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو اسے کیف ما اتفق کسی بھی دینی ادارے کے مدد وتعاون میں خرچ نہیں کرنا ہے بلکہ مصالح مسجد کے تحت اس مسجد کی کسی زائد از ضرورت زمین پر دینی مدرسہ قائم کر دیا جائے اور پھر اس مدرسہ میں زائد آمدنیاں خرچ کی جائیں، لیکن دوسرے رفاہی ادارے کا قیام تو کسی تاویل کے تحت ہماری نظر میں صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

الف۔ جب اوقاف کی آمدنی متعینہ مصارف سے بہت زائد ہوں، روزمرہ کی ضروریات میں اس کے خرچ کا امکان ہی نہیں اور آئندہ جمع ہوتے ہوتے ایک بڑا سرمایہ بنکر حکومت یا منتظمین کی دست درازی کا خطرہ پیدا کر دے تو ایسے اوقاف کی زائد آمدنیاں اسی نوع کے دیگر قریب تر اوقاف کی ضروریات میں خرچ کی جاسکتی ہیں، یعنی کسی مسجد کی زائد آمدنی دوسری قریب تر محتاج مسجد پر، اور مدرسہ ومقابر وخانقاہ کی زائد آمدنیاں قریب تر مدرسہ ومقبرہ وخانقاہ پر خرچ کی جاسکتی ہیں۔

''فليصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه'' (شامی ۳۷۱/۳)۔

ب۔ ایک نوع کے اوقاف کی زائد آمدنی دوسری نوع کے اوقاف کے ضروریات میں خرچ نہیں کی جاسکتی، اس لئے دیگر دینی، علمی اور ملی کاموں میں خرچ کی گنجائش نہیں۔

جو اوقاف اپنی موجودہ شکل وحالت میں قابل انتفاع ہیں، مگر ان کی منفعت کم درجہ کی ہے اور آمدنی اتنی قلیل ہوتی ہے کہ موقوف علیہم کی ضروریات کی تکمیل بھی نہیں ہو پاتی، اور اس کے متعلق یہ اندازہ وتوقع ہو کہ اگر اسے فروخت کر کے اس کا متبادل دوسرا وقف حاصل کیا جائے تو اس سے آمدنی بہت بڑھ جائے گی اور پھر موقوف علیہم کی ساری ضرورتیں فراغت وسہولت سے پوری ہوتی رہیں گی، تو ایسی صورت میں ان اوقاف کے تبادلہ وبیع کی اجازت ہوگی؟ تو اس کا جواب کتب فقہ میں اصح اور مختار قول کے مطابق نفی میں مذکور ہے:

''لکن فیه نفع فی الجملة وبدله خیر منه ریعا ونفعاً لا یجوز استبداله علی الأصح'' (شامی ۳،۳۸۷)۔

لیکن صاحب درمختار نے لکھا ہے کہ ایسے مسائل جن میں علماء کا اختلاف ہے، ان میں ایسے قول پر فتوی دیا جانا چاہئے جو وقف کے لئے مفید تر ہو،

''یفتی بکل ما هو أنفع للوقف فیما اختلف العلماء فیه'' (درمختار علی هامش ردالمحتار ۳،۴۰۱)۔

اور اس کی روشنی میں علامہ شامی نے ایک سے زائد مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے مرجوح قول پر فتوی دیا جانا نقل کیا ہے اور آخر میں اسی صورت مسئولہ کا ذکر کیا ہے اور اس کا جواب بھی جائز ہی نکلتا ہے ''منها عدم استبدال ما قل ریعه'' (شامی ۳،۴۰۱)۔

اس لئے اگر واقعتاً مکان موقوفہ کی آمدنی کم تر ہو اور ضروریات کے لئے ناکافی ہو تو متولی یا قاضی اسے فروخت کر کے زائد آمدنی والا دوسرا مکان وغیرہ خرید کر متبادل وقف قائم کر سکتے ہیں۔

جن اوقاف قدیمہ کے متعینہ مصارف ختم ہو چکے ہیں، مثلاً کسی خاص خاندان کے فقراء، کوئی خاص مسجد یا مدرسہ وغیرہ پر وقف شدہ املاک موجود ہیں، لیکن نہ اس خاندان کے فقراء کا وجود اور پتہ ہے نہ مسجد ومدرسہ ہی کا، تو اب ان اوقاف کی آمدنیاں اسی نوع کے مصارف قریبہ پر خرچ کی جائیں گی، فقراء کا حصہ فقراء پر اور مسجد ومدرسہ کا حصہ قریب تر مسجد ومدرسہ پر۔

کیونکہ اس طرح واقف کے اصل مقصد ومنشاء کی تکمیل ہو جاتی ہے جو واجب الرعایت بھی ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ نے ایک غیر آباد رباط کے اوپر اوقاف عامرہ کے متعلق حضرت امام اعظم کا ایک سوال وجواب بھی نقل کیا ہے: ''هل یجوز نقلها إلی رباط آخر ینتفع الناس به قال نعم، لأن غرض الواقف انتفاع المارة ویحصل ذلك بالثانی'' (شامی ۱،۳۷۱)۔

الف۔ اوقاف کی عمارتیں مخدوش ہوں یا محض کوئی خالی زمین ہو اس پر کسی قسم کی کوئی عمارت ہی نہ ہو، اب اس مخدوش عمارت کو ڈھا کر یا خالی زمین پر چند منزلہ نئی عمارت کی تعمیر کی جائے تا کہ منفعت بڑھ جائے، یہ فی نفسہ جائز ہے، کما مر۔

لیکن سوال یہ ہے کہ متولی وقیم کے پاس خود وقف کا اتنا سرمایہ نہیں جس سے عمارت کی تعمیر کی جاسکے اس لئے وہ کسی بلڈر سے معاہدہ کرے جس میں یہ طے پائے کہ وہ بلڈر اپنے ذاتی سرمایہ سے چند منزلہ عمارت بنائے اور اس کے بدلے میں عمارت کی ایک یا دو منزل بلڈر کی ملکیت ہوگی اس میں اس کو ہر قسم کے تصرفات کا حق ہوگا اور بقیہ دیگر منزلیں مصارف وقف کے لئے ہوں گی، تو کیا شرعاً ایسا معاملہ درست ہوگا؟

جہاں تک میں نے غور کیا ہم کو یہی سمجھ میں آیا کہ ہمیشہ کے لئے ایک دو منزل کی مالکانہ حیثیت بلڈر کو دے دینا کسی توجیہ سے درست نہیں ہے، ہاں اگر تحدید اور مدت کی تعیین کر دی جائے کہ اتنی مدت تک یہ ایک یا دو منزل تمہارے آزادانہ تصرف وقبضہ میں رہے گی تم اس سے ہر قسم کا نفع اٹھا سکتے ہو صرف فروخت نہیں کر سکتے ہو، اور اس مدت کے بعد تم کو دست بردار ہونا پڑے گا، تو ایک توجیہ کے تحت یہ معاملہ جائز ہوسکتا ہے۔

اور وہ توجیہ یہ ہوگی کہ متولی کی اجازت سے چونکہ بلڈر نے تعمیر عمارت کے مصارف اپنی ذاتی رقم سے پورے کئے ہیں، اس لئے شرعاً اپنے صرف کردہ رقم کے بقدر رجوع ومطالبہ کا حق اس کو ملے گا، اب چونکہ متولی کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ یکمشت ادا کر دے اس لئے وہ یہ صورت اختیار کر رہا ہے کہ جتنی مدت میں اس ایک یا دو منزل سے بشکل کرایہ وغیرہ بلڈر کی صرف رقم پوری ہو جائے گی اتنی مدت تک کے لئے اسے بلڈر کے تصرف وقبضہ میں چھوڑ دیا جائے اس دوران وہ اس سے جس طرح چاہے نفع حاصل کرے، لیکن مدت گذر جانے پر اس سے دست بردار ہونا ہوگا، یہ دراصل بلڈر کے حق یعنی تعمیر کے اخراجات کی ادائیگی کی ایک

صورت ہوگی اور بس۔

یہاں یہ بات جو تقریباً مسلمہ ہے ضرور مستحضر رہے کہ زمین کے تابع ہو کر عمارات بھی وقف ہوا کرتے ہیں، اور فقہاء کی صراحت ہے:

''إن لم يكن متولياً فإن بنى بإذن المتولى ليرجع فهو وقف وإلا فإن بنى للوقف فوقف وإن لنفسه أو أطلق فله رفعه إن لم يضر'' (شامی ۳،۴۲۹)، ''وإن أضر فهو المضيع ماله فليتربص إلى خلاصه'' (الاشباه والنظائر ۱۹۳)۔

بہر حال جب اذن متولی سے وہ بلڈرز مین موقوفہ پر تعمیر عمارت کرے گا تو وہ عمارت وقف ہی ہوگی اس لئے ''لا يباع ولا يوهب'' کا حکم رہے گا، زیادہ سے زیادہ وہ اپنی رقم کے مطالبہ ورجوع کا حق رکھے گا، اور اگر بلا اذن متولی کے کوئی ارض موقوف پر تعمیر کرے گا تو وہ اس کی نیت کے مطابق وقف اور ذاتی بھی ہوسکتی ہے، مگر ذاتی ہونے کی صورت میں بلا ضرر وقف تعمیر کا رفع ممکن ہو تو خیر، ورنہ وہ اپنے مال کا برباد کرنے والا بھی قرار دیا جاسکتا ہے، كما تدل عليه الرواية السابقة''۔

ب۔ کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے، یا وقف شدہ خالی زمین پر عمارت بنانے کے لئے یا محتاج تعمیر کی جدید تعمیر کے لئے وقف زمین وجائداد کا کچھ حصہ فروخت کر کے تعمیری کام کیا جاسکتا ہے، شرعاً اس کی گنجائش ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ان تعمیرات کا اصل مقصد ومحرک محض ان اوقاف کی حفاظت ہو اور اس کی کوئی سبیل بجز فروختگی وتعمیر کے متصور نہ ہو۔

یہاں ایک خفیف سا شبہ مسجد کی تعمیر کے لئے اس پر وقف زمین کی فروختگی کے متعلق یہ ہوسکتا ہے کہ واقف کا مقصد مسجد پر زمین وقف کرنے سے عموماً یہی ہوتا ہے کہ اس زمین کو باقی رکھ کر اس کی آمدنی سے مسجد کی ضروریات پوری کی جاتی رہے اور فروختگی سے یہ مقصد بظاہر فوت ہوتا ہوا معلوم پڑتا ہے، مگر اس شبہ کا ازالہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ اگر مسجد پر وقف زمین کلاً یا جزءً مأخوذ خطرہ میں ہو اور اس کی حفاظت اور اس سے انتفاع بجز فروختگی کے ممکن نہ ہو تب تو یہ جائز اس لئے کہا جائے گا کہ دوسرا استبدال وقف بشکل مسجد قائم کیا گیا، اور اگر خود یہ زمین خطرہ میں نہ ہو، مگر محتاج تعمیر مسجد کی حفاظت وبقاء بلا تعمیر جدید کے ممکن نہ ہو اور کوئی دوسرا راستہ تعمیر کا سامنے نہ ہو تو گرچہ یہ زمین بظاہر اس مسجد کے مصالح وضروریات کے لئے وقف ہے مگر چونکہ عمارت مسجد اور مصالح مسجد ایک ہی درجہ میں ہیں، كما قال الفقهاء: الوقف على عمارة المسجد ومصالح المسجد سواء''۔ اس لئے اگر اس کی آمدنی سے تعمیر مسجد ممکن نہ ہو تو اس کی فروختگی بھی ان شاء اللہ واقف کے منشاء ومقصد اور غرض کے خلاف نہ ہوگی۔

فقہاء نے قدیم قبرستان میں مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی ہے: ''لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت. فبنى قوم عليها مسجداً لم أر بذلك بأساً؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لايجوز لأحد أن يملكها. فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد'' (عمدة القاری ۶،۴۰۹)۔

مذکورہ بالا روایت میں قبرستان قدیم میں بناء مسجد کے جواز کی جو دلیل بیان کی گئی ہے وہ دونوں کا وقف من اوقاف المسلمین ہونا ہی ہے اور مدارس اسلامیہ بھی وقف من اوقاف المسلمین ہوا کرتے ہیں، اس لئے اشتراک علت کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ مسجد ومقبرہ کی زائد از ضرورت زمین پر مدرسہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔

تعمیر مدرسہ سے آج کے دور میں ان اوقاف علی المساجد والمقابر کی حفاظت کا ایک یقینی سامان بھی ہو جاتا ہے، اور مساجد کے اعتبار سے تو اسے عین مصالح مسجد میں داخل سمجھا جاسکتا ہے جیسا کہ دوسرے سوال کے جواب میں نسبتاً تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔

جن قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہوچکی ہیں یا آبادیوں کے اندر وہ قبرستان گویا مکانوں سے گھر گیا ہے یا کسی دوسرے اسباب وموانع کے سبب اب اس میں میت کی تدفین نہیں ہو رہی ہے اور بہ شکل قبرستان اس کا استعمال ہی بند اور حکومت کی طرف سے ممنوع ہے، اس لئے اس پر غلط عناصر کے قبضہ ودخل کا خطرہ پیدا ہوجائے تو ایسی صورت میں مدرسہ یا کوئی بھی رفاہی ادارہ قائم کر کے اس قبرستان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اور غیر لوگوں کے دست برد سے بچایا جاسکتا ہے، وہ مدرسہ اور رفاہی ادارہ بھی وقف ہی رہیں گے اور اس کا فائدہ عام مسلمانوں کو ہوگا۔

چنانچہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے اسی قسم کے ایک قبرستان کے متعلق ایک سوال کے جواب میں یہی فرمایا ہے کہ انجمن کا مکان وقفی نفع عام کے لئے اس

جگہ بنایا جاسکتا ہے (امداد الفتاوی ۲/۵۷۹)۔

''أن المساجد لله'' (سورہ جن:۱۸) ''في بيوت أذن الله أن ترفع ويذكر فيها اسمه'' (سورہ نور:۳۶) ''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه'' (سورہ بقرہ:۱۱۴) جیسی آیات قرآنی سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مسجدیں اللہ کو یاد کرنے اور اس کی عبادت ہی کے لئے موضوع ہیں، ان میں عبادت سے روکنا سراسر ظلم ہے بلکہ تمام دیگر ظالموں سے بڑھ کر ظالم ہیں وہ لوگ جو مسجدوں میں نماز وعبادت سے لوگوں کو روکیں۔

اس لئے وہ قدیم مساجد جو اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں اور ان میں سے بعض مساجد میں حکومت نے نماز کی ادائیگی کو ممنوع کر دیا ہے یہ حکومت کا صریح ظلم ہے، حکومت کو اس طرح کا کوئی حق نہیں، مگر یہ حکومت ہی نرالی ہے جو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جگہ سارے ہی حقوق کی پامالی کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ ''اللهم خذها أخذ عزيز مقتدر''۔

اگر بعض بڑے شہروں میں کسی آباد قبرستان کے اندر جہاں آج تک تدفین کا سلسلہ جاری ہے کوئی چھوٹی سی مسجد زمانہ قدیم سے بنی ہوئی موجود ہے، مگر آج کثرت آبادی کے سبب اس مسجد کی توسیع ضروری بن چکی ہے، تو دو شرطوں کے ساتھ اس مسجد کی توسیع کے لئے قبرستان کی زمین کا کچھ حصہ لیا جاسکتا ہے، پہلی شرط تو یہ کہ قبرستان کا حلقہ اتنا وسیع وعریض ہو کہ زمین کے اس حصہ کو گویا تدفین میت کی ضرورت سے زائد کہا جاسکتا ہو۔ دوسری شرط یہ کہ اس حصہ زمین پر کوئی تازہ قبر نہ ہو بلکہ اتنی پرانی قبریں ہوں کہ میت کا مٹی میں رل مل جانا یقینی ہو۔

اگر کوئی قبرستان ویران ہو، تدفین کا سلسلہ بند ہو، ایسے قبرستان میں بنی مسجد کی توسیع بلکہ بوقت ضرورت جدید مسجد کی تعمیر بھی جائز ہے، شرط صرف ایک یہ رہے گی کہ قبروں کے نشانات مٹ چکے ہوں اور مدفون مردے مٹی بن چکے ہوں، تازہ قبروں پر توسیع یا جدید تعمیر مسجد درست نہیں۔

لیکن اگر آباد قبرستان جس میں تدفین کا سلسلہ قائم ہے اس میں وسعت کم ہے، تدفین کی ضرورت سے زائد نہیں تو پھر اس میں سابقہ مسجد کی توسیع کے لئے بھی قبرستان کی زمین کو لینا صحیح نہیں رہے گا، کیونکہ قبرستان کے وقف سے واقف کی اصلی غرض تدفین میت کی ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے جس کی رعایت ''مراعاة غرض الواقفين واجبة'' کے تحت لازم ہے۔

چونکہ صحت وقف کے لئے واقف کا اور تولیت وقف کے لئے متولی کا مسلمان ہونا ضروری نہیں، جیسا کہ فقہاء کی صراحت ہے:

''أما الإسلام فليس بشرط'' (فتاوی ہندیہ ۲،۳۵۲)۔

''ويشترط للصحة بلوغه وعقله لا حريته وإسلامه'' (شامی ۳،۳۸۵)۔

اس لئے ہندو راجاؤں نے مساجد پر یا دیگر اسلامی مقاصد کے تحت جو اراضی وقف کئے اور اس کی تولیت اپنے ہی کسی ہم مذہب کے سپرد کیا، سب عمل درست رہا، اور پھر نسلاً بعد نسلٍ یہ تولیت مختلف متولیوں کی طرف منتقل ہوتے ہوئے آج کسی ہندو بورڈ کو حاصل ہے، تو اسے علی حالہ ہندو وقف بورڈ کی تولیت ونگرانی میں بھی چھوڑا جاسکتا ہے، وقف کا کوئی بھی متولی خواہ واقف کا متعین کردہ ہو یا کسی قاضی شریعت وغیرہ ہی کا، جب تک اس میں امانت داری رہے گی معزول نہیں کیا جاسکتا۔

آج مساجد ومقابر یا دیگر اسلامی مقاصد کے تحت جو اوقاف ہندو راجاؤں کی طرف سے قائم وموجود ہیں اور ہندو وقف بورڈ کے تحت اس کا انتظام چل رہا ہے، اگر تحقیقات سے ثابت ہو کہ بورڈ واقف کے شرائط ومنشاء کی رعایت وپابندی کرتے ہوئے سارا نظم ونسق انجام دے رہا ہے تو اس بورڈ یعنی غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں چھوڑ دینا درست ہے، لیکن تحقیقات سے اس ادارہ کی خیانت معلوم ہو جائے، یا پھر عین مساجد ومقابر ہی پر کسی بیجا تصرف کا خطرہ محسوس ہو تو اس کی تولیت سے اوقاف کو نکالنا ضروری ہوگا، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس وقف ہی سے مسجد ومقبرہ کا رشتہ منقطع کر دینا لازم ہوگا۔

☆☆☆

ناقابل استعمال اوقافی جائداد فروخت کرکے نئے اوقاف قائم کرنا

مولانا ابوسفیان مفتاحی [1]

الف۔ وہ اوقاف جہاں کے مسلمانوں کی آبادی کے منتقل ہوجانے کی وجہ سے ویران ہوچکے ہوں اور دور دور تک مسلم آبادی نہ ہونے کی وجہ اس اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہوگیا ہو، اس میں مساجد، قبرستان، مدارس، اور خانقاہیں، ہر قسم کے اوقاف ہیں، ایسے اوقاف کو فروخت کرکے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلم آبادی ہو متبادل اوقاف قائم کئے جاسکنے میں قدرے تفصیل ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

مساجد: جس جگہ مسجد قائم ہے اور جس زمین کا رقبہ کہ مسجد کے نام سے موسوم کردیا گیا ہے اور اس میں نماز ادا ہونے لگی ہے اس کی عمارت قائم رہے یا منہدم ہوجائے، اس وقت اس میں کوئی نماز پڑھے یا نہ پڑھے، اس جگہ کی مسلم آبادی رہے یا ویران ہوجائے اور مسلم آبادی کہیں اور منتقل ہوجائے، بہرحال وہ جگہ تا قیامت مسجد ہی رہے گی، تو اس مسجد کو فروخت کرنا اور فروخت کرکے کسی دوسرے مقام پر جہاں کہ مسلم آبادی ہو، متبادل وقف قائم کرنا، یعنی مسجد منتقل کرنا جائز نہیں ہے، یہی ہمارے شیخین امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کا قول ہے کہ وہ جگہ تا قیامت مسجد ہی رہے گی، نہ اسکو منتقل کرنا جائز ہے اور نہ وہ واقف کے ورثہ کے درمیان میراث بن سکتی ہے، چاہے اس میں لوگ نماز پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں، لہذا صورت مسئولہ میں مسجد کو اپنی حالت پر باقی رکھنے کے لئے پوری کوشش کیجائے اور محفوظ کردیا جائے، تاکہ بے ادبی سے محفوظ رہے، اس باب میں فقہائے کرام کی تصریحات مندرجہ ذیل ہیں:

''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام والثانى أبداً الى قيام الساعة وبه يفتي، حاوى القدسى (وقال الشامى)، ''فلا يعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أولا وهو الفتوى، حاوى القدسى، وأكثر المشائخ مجتبى وهو الأوجه (فتح) وكذا فى البحر'' (۲۵۲، ۵، ۲۵۱) ''وبه علم أن الفتوى على قول محمد فى آلات المسجد، وعلى قول أبي يوسف فى تابيد المسجد'' (درمختار ۳،۴۰۶)۔

یعنی مسجد ویران ہوجائے اور وہاں کے باشندے اس سے بے نیاز ہوجائیں، اور صورت حال ایسی ہوگئی ہے کہ اس میں نماز نہیں پڑھی جاتی ہے یا یہ کہ مسلم آبادی کہیں اور منتقل ہو گئی ہے پھر بھی وہ مسجد ہی رہے گی ہمیشہ کے لئے، اس کا متبادل جائز نہیں ہے۔

''والفتوى على قول أبي يوسف أنه لا يعود إلى ملك مالك أبداً، لأن المسجد وإن خرب واستغنى عنه أهله لا يعود إلى ملك البانى كذا فى المضمرات''، اور نیز (فتاوی ہندیہ ۲/۴۷۰) پر ہے: ''سئل القاضى الإمام شمس الأئمة محمود الاوزجندى عن مسجد لم يبق له قوم وخرب ما حوله واستغنى الناس عنه هل يجوز جعله مقبرة، قال لا''۔

یعنی مسجد کی ویرانی اور لوگوں کی بے نیازی کی صورت میں مسجد کو قبرستان بنانا جائز نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسجد ہی تا قیامت رہے گی۔ کذا فی الحاشیۃ علی حاشی الہندیہ (۲۸۸/۳) وفی البدائع (۲۲۱/۶)۔

خلاصہ کلام:

خلاصہ یہ ہے کہ مفتی بہ قول کے مطابق صورت مسئولہ میں مسجد کو فروخت کرکے اس کی متبادل مسجد بنانا جائز نہیں ہے، جو جگہ مسجد ہوچکی وہ تا قیامت مسجد ہی رہے گی، چاہے مسلمانوں کی آبادی رہے یا منتقل ہوجائے، اس میں لوگ نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں،

---

[1] جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

قبرستان:

صورت مسئولہ میں اس طرح کے قبرستان کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال کر کے کسی دوسری جگہ جہاں مسلم آبادی ہے اس کا متبادل وقف بشکل قبرستان وغیرہ قائم کیا جانا جائز ہے، کیونکہ پہلی قبرستان سے انتفاع کی کوئی بھی شکل نہیں ہے، بلکہ اہانت کی شکلیں موجود ہیں، لہذا اسے فروخت کر کے دوسری جگہ مسلم آبادی میں متبادل وقف قائم کرنے میں خیر محض اور نفع خالص ہے، اس سلسلے میں فقہاء رحمہم اللہ کی عبارتوں سے استدلال کیا جاسکتا ہے، چنانچہ درمختار مع شامی (۱؍۶۶۲) میں ہے:

''ويخير المالك بين إخراجه و مساواته بالأرض والبناء عليه إذا بلى وصار ترابا''۔

اور (۱؍۶۶۷) پر علامہ شامیؒ یہی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''ومقتضاه جواز المشى فوقه، وكذا فى البحر'' (۱،۱۹۵)۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جب قبرستان بوسیدہ ہوجائے اور برابر ہوکر مٹی ہوجائے تو اس پر کھیتی کرنا اور عمارت بنانا جائز ہے اور اس پر چلنا جائز ہے، جبکہ یہاں انتفاع کی شکل موجود تھی کہ مردے دفن کئے جائیں، اور جہاں پر قبرستان سے مسلمانوں کو کسی طرح کے انتفاع کی کوئی شکل نہ ہو، بلکہ اس کو قبرستان باقی رکھنے میں اہانت کا یقین ہو تو ایسی صورت میں اسے فروخت کر کے دوسری جگہ مسلم آبادی میں متبادل وقف قائم کرنا کیونکر ناجائز ہوگا، علامہ عینیؒ ''عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری'' (۴؍۱۷۹) میں تعمیر مسجد نبوی سے متعلق ایک حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''وفيه جواز التصرف فى المقبرة المملوكة بالهبة والبيع. فإن قلت: هل يجوز أن تبنى المساجد على قبور المسلمين ! قلت، قال ابن القاسم لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى قوم عليها مسجداً لم أر بذلك بأساً، وذلك لأن مقابر المسلمين وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لايجوز أحد؛ لأن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تملكها لأحد فمعنابما على هذا واحد، وذكر أصحابنا أن المسجد إذا خرب ودثر ولم يبق حوله جماعة والمقبرة إذا عفت ودثرت تعود ملكا لأربابها فإذا عادت ملكا يجوز أن يبنى موضع المسجد داراً وموضع المقبرة مسجداً وغير ذلك. فإذا لم يكن لها أرباب تكون لبيت المال''۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جو قبرستان لوگوں کی ملکیت ہے اس سے انتفاع کی شکل نہ رہنے کی صورت میں اس کو فروخت کرنا جائز ہے، اور مسجد جب ویران ہوجائے اور اس کے آس پاس مسلم آبادی باقی نہ بچے اور قبرستان کے نشانات جب مٹ جائیں تو اگر مملوک ہے تو مالکین کی ملکیت میں لوٹ آئے گی پھر مسجد کی جگہ گھر بنانا اور قبرستان کی جگہ مسجد وغیرہ بنانا جائز ہے، اور جب مالکین نہ ہوں تو بیت المال کے حوالے ہوجائے گی۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ جب قبرستان کے آس پاس کی مسلم آبادی کہیں دوسری جگہ منتقل ہوگئی ہو اور اس کے سبب قبرستان سے انتفاع کی کوئی شکل باقی نہ رہے، بلکہ غیروں کے تسلط کے سبب اہانت کا یقین ہو تو ایسے قبرستان کو فروخت کر کے مقاصد واقف کی رعایت کرتے ہوئے اس کا متبادل وقف قائم کرنا جائز ہے کہ اسی میں خیر محض اور نفع خالص ہے۔

خلاصہ کلام: یہ کہ ہے صورت مسئولہ میں قبرستان کو فروخت کر کے مقاصد واقف کی رعایت کرتے ہوئے اس کا متبادل وقف قائم کرنا جائز ہے۔

مدارس وخانقاہیں:

صورت مسئولہ میں مدارس وخانقاہیں جہاں واقع ہیں وہاں کی مسلم آبادی منتقل ہوجانے کی وجہ سے دور دور تک مسلم آبادی نہ ہونے کے سبب ویران ہو چکے ہیں جس کے سبب ان پر غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جارہا ہے، بلکہ بڑھ کر ان کو اپنے تصرف میں لاچکے ہیں اور بے حرمتی کررہے ہیں، اور مسلمانوں کے لئے ان سے انتفاع کی کوئی شکل باقی نہیں ہے تو ایسی صورت میں ان مدارس وخانقاہوں کو مقاصد واقف کی رعایت کرتے ہوئے فروخت کر کے دوسری جگہ مسلم آبادی میں ان کا متبادل وقف قائم کرنا جائز ہے، کہ اسی میں خیر محض اور نفع خالص ہے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں ایسی جگہوں کے مدارس وخانقاہیں فروخت کر کے دوسری جگہ مسلم آبادی میں اس کا متبادل وقف قائم کرنا جائز ہے۔

ب۔ صورت مسئولہ میں ایسے اوقاف جن سے مسلمانوں کے انتفاع کی کوئی شکل باقی نہ رہے اسے حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کرنے کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

خلاصہ کلام: ایسے اوقاف کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کرنا درست ہے۔ واللہ اعلم۔

صورت مسئولہ میں تمام ایسے ویران اور ناقابل استعمال اوقاف فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کئے جانے کی شرعاً گنجائش نہیں ہے۔

علامہ عینیؒ شرح بخاری میں لکھتے ہیں: ''وذكر أصحابنا إذا خرب ودثر لم يبق حوله جماعة والمقبرة إذا عفت ودثرت تعود ملكا لأربابها فإذا عادت ملكا يجوز أن يبنى موضع المسجد دارا وموضع المقبرة مسجداً وغير ذلك فإذا لم يكن لها أرباب تكون لبيت المال'' (عمدة القاری ۴،۱۷۹)۔

یعنی مسجد اور قبرستان کے ویران ہونے کی صورت میں اور واقف کی ملک میں آجانے کے بعد خود واقف کے لئے اپنی شئ مملوک میں مسجد کو گھر بنانے اور قبرستان کو مسجد بنانے کی اجازت ہے، اور غیر واقف کے لئے واقف کے مقاصد کی پابندی واجب ہے، اگر واقف کے مقاصد میں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے یا رفاہی ادارے قائم کیا جانا شامل ہے تو بنا سکتے ہیں، ورنہ نہیں، کیونکہ واقف کے مقاصد کی رعایت واجب ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ (۴/ ۴۶۴) میں لکھتے ہیں:

''مراعاة غرض الواقفين واجبة اور (۳،۴۰۵) پر لکھتے ہیں: ''فإن شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله أن يجعله ماله حيث شاء مالم يكن معصية، وله أن يخص صنفاً من الفقراء''۔

اور قواعد الفقہ کے (صفحہ ۸۵) پر ہے: ''شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به وفي المفهوم والدلالة''، اور الاشباہ والنظائر کے (صفحہ ۲۷۵) پر ہے: ''فيجب اتباع شرط الواقفين في أوقافهم یعنی واقف کی شرط کی اتباع واجب ہے اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔

خلاصہ کلام: صورت مسئولہ میں ایسے ویران وناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی ورعایت کے بغیر مسلمانوں کے تعلیمی ادارے یا رفاہی ادارے قائم کرنیکی شرعاً گنجائش نہیں ہے۔

الف۔ مسجد پر وقف اراضی میں جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے فاضل ہیں، پھر بھی اس میں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کے لئے ادارہ قائم کرنا جائز نہیں ہے چند وجوہ سے واقف نے مسجد کے لئے وقف کیا ہے، فی الحال اگرچہ فاضل ہے، لیکن آئندہ اس سے مسجد کی ضرورت متعلق ہوسکتی ہے، تو وقف میں تبدیلی لازم آئیگی، جو ناجائز ہے، اور واقف کا مقصود فوت ہوجائے گا، حالانکہ غرض واقف کی رعایت رکھنا واجب ہے چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں۔

''مراعاة غرض الواقفين واجبة'' (۳،۴۶۴)۔ نیز فرماتے ہیں: ''فإن شرائط الوقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع'' (۳،۳۹۵)۔ اور ''قواعد الفقہ'' میں ہے: ''شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به'' (صفحہ ۸۵)۔ اور ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: ''فيجب اتباع شرط الواقفين في أوقافهم'' (صفحہ ۲۷۵)۔

واقف نے مسجد ہی کے لئے وقف کیا ہے، لہٰذا اگر فی الحال ضرورت مسجد سے فاضل ہے پھر بھی واقف کے مقصد کے خلاف دوسرا کام لینا جائز نہیں ہے، اور ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: وقف مسجد سے فاضل کو فقراء کو دینا درست نہیں ہے، لیکن اس فاضل شئ سے مسجد کی ضروریات کی چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس فاضل زمین پر دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا جائز نہیں ہے، عبارت یوں ہے:

''الفاضل من وقف المسجد قيل يصرف وانه صحيح ولكن تشترى به مشتغلات للمسجد كذافي المحيط. سئل القاضي الإمام شمس الإسلام الأوزجندي عن أهل المسجد تصرفوا في أوقاف المسجد، يعني آجر والمشتغل وله متول، قال: لا يصح تصرفهم ولكن الحاكم يمضي فيه ما فيه مصلحة المسجد أوفي وقف على مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضا للعامة لا يجوز للمسلمين انتفاع ماء بذلك الحوض كذا في القنية'' (۲،۴۶۳-۴۶۴)۔

مسجد پر موقوف زمین قابل کاشت نہ رہنے کی وجہ سے اگر کسی نے عوام کے لئے حوض بنادیا تو مسلمانوں کے لئے اس حوض کے پانی سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، تو اسی طرح صورت مسئولہ میں دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا جائز نہیں ہے۔

خلاصہ کلام: صورت مسئولہ میں مسجد کی فاضل زمین پر دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کو ضروریات مسجد ہی کے لئے استعمال کیا جانا ضروری ہے۔

ب۔ جب کہ واقف نے زمینوں اور مکانات کو مسجد کے لئے وقف کیا ہے تو مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کی جاسکتی، نیز شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ ایک وقف کی رقم و آمدنی دوسرے وقف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، درمختار میں ہے:

''وإن اختلف أحدهما بأن بنى رجلان مسجدين أو رجل مسجدا أو مدرسة ووقف عليهما أوقافا لا يجوز له ذلك أي الصرف المذكور'' (درمختار ۴۰۸،۳)۔

یعنی دو آدمیوں نے الگ الگ مسجد بنوایا، یا ایک ہی آدمی نے مسجد اور مدرسہ بنایا، اور دونوں پر کچھ اوقاف وقف کیا ہے، تو قاضی کو حق نہیں ہے کہ ایک کے وقف کی آمدنی دوسرے پر خرچ کرے، لیکن اگر واقف نے وقف نامہ میں تحریر کیا ہے کہ ضرورت سے زائد آمدنی سے بوقت ضرورت دوسرے غریب حاجتمندوں کی امداد کریں اور کار خیر میں خرچ کریں تو واقف کی شرط کے موافق، یعنی وقف نامہ میں جو تحریر ہے اس کے موافق دوسرے وقف کی امداد کرنا اور کار خیر میں خرچ کرنا صحیح ہوگا، البتہ اگر کوئی وقف بہت مالدار ہو تو وقف کو اچھی طرح جاری رکھتے ہوئے بھی زائد رقم اس قدر ہو کہ وقف کو اس رقم کی ضرورت نہیں ہے فی الحال، اور دوسرا وقف ضرورتمند ہے تو اس کو قرض دے سکتے ہیں۔

چنانچہ ''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے: ''أما المال الموقوف على المسجد الجامع لم تكن للمسجد حاجة فللقاضي أن يصرف في ذلك لكن على وجه القرض، فيكون ديناً في مال الفئ'' (۴۶۳،۲)۔

اگر کسی وقف کے خزانے میں روپئے اس طرح زائد ہوں کہ نہ ان کی فی الحال ضرورت ہے نہ آئندہ ضرورت پڑے گی اور یہ روپئے یوں ہی جمع رہے تو ضائع ہوجائیں گے، یا ناجائز استعمال ہوں گے اور واقف کا مقصد فوت ہوجائے گا، تو ایسی حالت میں قریب کے دوسرے حاجتمند اوقاف کو زائد روپئے امداد کے طور پر بلا قرض دینا جائز ہوگا، مگر اس صورت میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مسجد کی زائد رقم و آمدنی قریبی ضرورتمند مسجد کو اور مدرسہ کی زائد رقم و آمدنی قریبی ضرورتمند مدرسہ کو دیا جائے، یتیم خانہ اور سرائے وغیرہ اوقاف کا بھی یہی حکم ہے، اور اس مقصد سے کہ آبادی مسجد میں اضافہ ہو اس سے زائد اور فاضل رقم سے مسجد سے متعلق دینی تعلیم کا مدرسہ بھی قائم کرسکتے ہیں (فتاویٰ رحیمیہ ۱۸۵/۲)۔

خلاصہ کلام: صورت مسئولہ میں چونکہ یہاں واقف نے زمینوں اور مکانات کو مسجد کے لئے وقف کیا ہے اور واقف کے مقصد کی رعایت رکھنا واجب ہے، اور واقف کی شرط پر عمل کرنا ایسا ہی واجب ہے، جیسے نص شارع پر، لہٰذا مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر واقف نے وقف نامہ میں یہ اجازت بھی تحریر کردی ہو کہ مسجد کی فاضل آمدنی سے دینی مدرسہ یا کوئی اور رفاہی کام کیا جاسکتا ہے تب درست ہے۔

الف۔ صورت مسئولہ میں جب بہت سے اوقاف کی آمدنی ان کے لئے متعین مصارف سے بہت زیادہ ہے تو اگر کسی وقف کے خزانہ میں روپئے اس طرح زائد ہوں کہ نہ ان کی فی الحال ضرورت ہے نہ آئندہ ضرورت پڑے گی، اور یہ روپئے یوں ہی جمع رہ جائیں گے تو ضائع ہوجائیں گے یا ناجائز استعمال ہوں گے اور واقف کا مقصد فوت ہوجائے گا تو ایسے حالات میں قریب کے دوسرے حاجتمند اوقاف کو زائد روپئے امداد کے طور پر دینا جائز ہوگا، مگر اس صورت میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مسجد کی زائد رقم قریبی ضرورتمند مسجد کو اور مدرسہ کی زائد رقم قریبی ضرورتمند مدرسہ کو دیا جائے، یتیم خانہ اور سرائے وغیرہ اوقاف کا بھی یہی حکم ہے، اور اس مقصد سے کہ آبادی مسجد میں اضافہ ہو، اس زائد اور فاضل رقم سے مسجد کے متعلق دینی تعلیم کا مدرسہ بھی قائم کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ''درمختار'' میں ہے:

''وعن الثاني ينتقل إلى مسجد آخر بإذن القاضي۔ ومثله حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما، فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه''۔

اس پر علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''جزم به في الإسعاف حيث قال: ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف فيباع نقضه بإذن القاضي ويصرف ثمنه إلى بعض المساجد. قوله ومثله حشيش المسجد الخ.أي الحشيش الذي يفرش بدل الحصير كما يفعل في بعض البلاد كبلاد الصعيد كما أخبرني به بعضهم، قال الزيلعي وعلى هذا حصير المسجد وحشيشه إذا استغنى عنهما يرجع إلى مالكه عند محمد و عند أبي يوسف ينتقل إلى مسجد آخر وعلى هذا الخلاف الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما وصرح في الخانية بأن الفتوى على قول محمد، وقال في البحر: وبه علم أن الفتوى على قول محمد في آلات المسجد وعلى قول أبي يوسف في تابيد المسجد والمراد بآلات المسجد نحو القنديل والحصير''۔

علامہ شامیؒ کی اس تحریر سے واضح ہوگیا کہ صورت مسئولہ میں اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں فاضل آمدنی کو صرف کرنا جائز ہے، یہی فتوی دیا ہے امام ابوشجاع اور امام حلوانیؒ نے۔اور علامہ شامیؒ اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں نے اسی طرح کی صورت میں عدم جواز کا فتوی دیا تھا،لیکن پھر جب مجھ کو یہ خبر پہنچی کہ بعض ظالموں نے ان پتھروں کو اپنے لئے لے لیا تو میں اپنے فتوی پر شرمندہ ہوا، پھر ذخیرہ میں دیکھا کہ فتاوی نسفی میں مذکور ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ فاضل آمدنی کو اسی نوع کے اوقاف میں صرف کر سکتے ہیں، واللہ اعلم ۔۔اور آلات مسجد اور آمدنی کے باب میں امام محمدؒ کے قول پر فتوی ہے کہ استغناء کی صورت میں اس کو بیچنا جائز ہے اور بیچ کر قریبی ضرورتمند وقف میں لگانا جائز ہے۔

خلاصہ کلام: صورت مسئولہ میں اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں صرف کرنا جائز ہے، یہی مفتی بہ ہے۔

ب۔ صورت مسئولہ میں دیگر ملی، دینی وعلمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں فاضل آمدنی کو صرف کرنا جائز ہوگا، اس تفصیل کے ساتھ کہ مساجد کے اوقاف قریبی ضرورتمند مساجد میں صرف کریں، اور دینی وعلمی کاموں کے اوقاف کو قریبی ضرورتمند علمی کاموں میں صرف کریں اور ملی کاموں کے اوقاف کو قریبی ضرورتمند ملی کاموں میں ہی خرچ کریں۔لیکن علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق ایک وقف کی فاضل آمدنی کو دوسرے ضرورتمند اوقاف میں بغیر تفصیل کے صرف کرنا جائز ہے، اور اسی کو راجح کرنا چاہئے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''والذي ينبغي متابعة المشائخ المذكورين في جواز النقل بلا فرق بين مسجد أو حوض كما أفتى به الإمام أبو شجاع والإمام الحلواني، وكفى بهما قدوة، وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (۳،۴۰۷)۔

خلاصہ کلام: صورت مسئولہ میں ایسے اوقاف کی فاضل آمدنی کو دیگر دینی، ملی وعلمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں صرف کرنا درست ہے۔

صورت مسئولہ میں جو اوقاف دینی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہیں، مثلاً کسی مسجد یا مدرسہ پر کوئی مکان وقف ہے الخ، یہ مکان جو مسجد یا مدرسہ پر وقف ہے وہ ان کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہے، اور اس وقف کی ضرورتیں پوری نہیں ہو پاتیں، اور واقف نے وقف نامہ میں یہ اجازت دے رکھی ہے کہ ضرورت پوری کرنے کے لئے جو چاہیں کرلیں، اور واقف کی شرط پر عمل کرنا واجب ہے، اور اس کے مقصد کی رعایت کرنا بھی لازم ہے، لہذا ایسے وقف کو فروخت کرکے کسی تجارتی مقام پر کوئی دکان خرید لی جائے کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی مکان موقوف کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہوگی تو اسکو فروخت کرکے اس کے تبادلہ میں کوئی ایسی شکل اختیار کرنا جس میں وقف کی زیادہ آمدنی ہوجائے اور ضرورتیں پوری ہوجائیں، جائز ہے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه، الأول أن يشرطه الواقف لنفسه أو لغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح، وقيل: اتفاقا، والثاني أن لا يشرطه الواقف سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار حيث لا ينتفع به بالكلية، بأن لا يحصل منه شئ أصلاً أولا يفي بمؤنته، فهو أيضا جائز على الأصح، إذاكان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه، والثالث: أن لايشرطه أيضا ولكن فيه نفع في الجملة و بدله خير منه ريعا ونفعاً، وهذا لا يجوز استبداله على الأصح''۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ تبادلہ کی تین صورتیں ہیں: (۱) واقف نے تبادلہ کی شرط اپنے لئے یا اپنے غیر کے لئے لگائی ہے تو یہ جائز ہے، (۲) واقف نے عدم کی شرط لگائی ہے یا سکوت اختیار کیا، لیکن وہ وقف بالکل قابل انتفاع نہیں ہے، اس طرح کہ اس وقف سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے، یا اس کی ضرورت بھر حاصل ہو رہا ہے، تو قاضی کی اجازت سے یا بر بناء مصلحت اس کا تبادلہ جائز ہے، تو ہمارا مسئلہ مبحوث عنہا اسی دوسری صورت کی قبیل سے ہے، لہذا اس کو قاضی کی اجازت سے یا مصلحت کی بنا پر فروخت کر کے اس کے تبادلہ میں تجارتی مقام پر دکان خریدی جاسکتی ہے۔

شامی (۳ر ۴۲۴) میں ہے: وفی القنية: مبادلة دارالوقف بدار أخرى إنما يجوز إذا كانتا فى محلة واحدة أو محلة الأخرى خيرا''۔

یعنی ایک مکان موقوف کا تبادلہ دوسرے مکان سے، جبکہ اس میں خیر وبھلائی ہو تو جائز ہے، چاہے دونوں ایک ہی محلہ میں ہوں یا دوسرا دوسرے محلہ میں ہو، اور ظاہر ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں اس کو فروخت کر کے تبادلہ میں دکان لینے میں خیر ہی مقصد ہے، لہذا جائز ہے۔

''فلو استبدل الحانوت بأرض تزرع و يحصل منها غلة قدر أجرة الحانوت كان أحسن؛ لأن الأرض أدوم وأبقى وأغنى عن كافة الترميم والتعمير''۔

وقف دکان کے بدلہ میں زمین خرید لینا بہتر ہے، لیکن ہمارے عہد میں زمین سے زیادہ مفید دکان ہے، لہذا دکان خرید لینا جائز ہے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں واقف کی اجازت کے ساتھ مکان موقوف کو فروخت کر کے تبادلہ میں کسی تجارتی مقام پر کوئی دکان خرید لینا جائز ہے، تاکہ تمام ضرورتیں باآسانی پوری ہو جائیں۔

صورت مسئولہ میں اوقاف کے مصارف ختم ہو جانے کی صورت میں ان اوقاف کی آمدنی کے لئے فقراء ومساکین مصرف ہوں گے، اور امام ابو یوسفؒ سے یہ بھی روایت ہے کہ جب کسی معین آدمی پر وقف ہو تو یہ وقف جائز ہے، اور جب وہ موقوف علیہ مرجائے اور مصرف ختم ہو جائے تو اس صورت میں یہ وقف واقف کے ورثہ کی طرف لوٹ جائے گا اور یہی مفتی بہ قول ہے، چنانچہ علامہ عینیؒ شرح کنز میں لکھتے ہیں:

''عن أبي يوسف إذا كان على رجل بعينه جاز، وإذا مات الموقوف عليه رجع الوقف إلى ورثة الواقف وعليه الفتوى، وقال فى البرامكة: قال أبو يوسف: إذا انقرض الموقوف عليهم يصرف إلى المساكين فحصل عنه روايتان'' (عينى على الكنز ١،٢٧٦)۔

امام ابو یوسفؒ سے دو روایتیں ہو جاتی ہیں، ایک مصرف ختم ہونے کی صورت میں واقف کے ورثہ کی طرف لوٹا دیا جانا، دوسرے مساکین کو مصرف قرار دیا جانا۔ ان دونوں روایتوں میں سے دوسری روایت پر عمل کرنا بہتر ہوگا، کیونکہ وقف سے واقف کا مقصد قربت کا ارادہ ہوتا ہے، تو اس ارادہ کے لئے مناسب فقراء ومساکین ہو سکتے ہیں، کذا فی البحر (۵،۱۹۸)

اور ''شرح وقایہ'' میں ہے: ''قال أبويوسف يصح بدونه أى يصح الوقف بدون ذكر التأبيد، وإذا انقطع صرف إلى الفقراء''۔

یعنی وقف کی وہ جہت جس پر وقف کیا گیا تھا وہ ختم ہو گئی تو اس وقف کے مصارف فقراء ہوں گے گرچہ واقف نے ان فقراء کا نام نہیں لیا ہے۔

اس تقریر سے واضح ہوا کہ اگر معین موقوف علیہم فقراء ہیں تو ان کے نہ ہونے کی صورت میں دوسرے فقراء مصرف ہوں گے، اور اگر موقوف علیہ مسجد ہے یا مدرسہ، تو مسجد ومدرسہ کے نہ ہونے کی صورت میں ان اوقاف کی آمدنی کے لئے مصارف دوسری ضرورتمند مسجد یا مدرسہ ہوگا۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں اوقاف کے مصارف کے ختم ہو جانے کی صورت میں یہ تفصیل ملحوظ رہے گی کہ اگر موقوف علیہم فقراء تھے تو ان کے معدوم ہونے کی صورت میں دوسرے فقراء مصرف ہوں گے، اور اگر موقوف علیہ مسجد یا مدرسہ ہے تو ان کے نہ رہنے کی صورت میں دوسری ضرورتمند مسجد یا ضرورتمند مدرسہ مصرف ہوگا۔

الف۔ صورت مسئولہ میں جب کہ اوقاف کی عمارتیں مخدوش حالت میں ہیں اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ بھی نہیں ہے کہ تعمیر کرائی جاسکے اور کوئی بلڈر

اس کے لئے تیار ہوا کہ اس مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط کے ساتھ تعمیر کردے کہ اس کی ایک یا دو منزل اس کی ملکیت ہوگی، جس میں اسکو ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہوگا، اور بقیہ وقف کے مصارف کے لئے تو شرعاً ایسا معاملہ درست نہیں ہے، کیونکہ وقف پر کسی کی ملکیت نہیں ہوتی شرعاً۔

''فإذا صح الوقف لایملك ولا یملك'' (۲،۳۵۴). یعنی وقف واقف کا مملوک نہیں ہوتا، اور وقف کا بیع وغیرہ کے ذریعے کسی کو مالک نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ وہ قابل تملیک نہیں ہوتا، لہذا اس کی خرید وفروخت اور ھبہ کرنا جائز نہیں ہوگا، اور کسی کو وارث بھی نہیں بنایا جاسکتا۔ پھر لکھتے ہیں:

''اعلم أن بعض المتأخرین جوزوا بیع بعض الوقف إذا خرب لعمارة الباقی والأصح أنه لا یجوز البیع. فإن الوقف بعد الصحة لا یقبل الملك كالحر لا یقبل الرقیة وقد شاهدنا فیه مثل ما شاهدنا فی الاستبدال'' (۲،۳۵۴) یعنی وقف کی بیع جائز نہیں، نہ بعض کی نہ کل کی، کیونکہ وقف صحت کے بعد ملکیت کو قبول نہیں کرتا۔ اور ''عمدۃ الرعایہ'' میں ہے:

''فلا یجوز بیعه ولا تملیکه بوجه من الوجوه وإن تشتمل علی منافع''۔ یعنی وقف کی بیع وتملیک کسی طرح بھی جائز نہیں ہے اگر چہ وہ فوائد ومنافع پر مشتمل ہو، لہذا بلڈر کی یہ شرط لگانا کہ اس کی ایک یا دو منزل اس کی ملکیت ہوگی جس میں اسکو ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا، جائز نہیں ہے، بلکہ باطل ہے، اور اس شرط کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہیں ہوگا، ہاں ثواب کے لئے تبرع کردے تو قابل مبارکباد ہوگا، اسی طرح اس وقف کی زمین کا بھی حکم ہوگا جس پر کسی طرح کی کوئی عمارت نہیں ہے، اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی صورت ہے تو اس زمین سے فائدہ اٹھانے کے لئے کسی بلڈر سے اسی طرح کا معاملہ کیا جانا شرعاً جائز نہیں ہے، ہاں وہ بنیت ثواب بنوادے تو مستحق اجر وثواب ہوگا اور ملکیت کی نیت سے بنوانا جائز نہیں ہے، کیونکہ وقف میں تملیک جائز نہیں ہے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں بلڈر سے ایسا معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، نہ مخدوش عمارتوں کی تعمیر کی وجہ سے نہ زمین سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے، ہاں بنیت ثواب بنوادے تو مستحق اجر وثواب ہوگا۔

الف۔ صورت مسئولہ میں کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے وقف شدہ زمین وجائداد کا کوئی حصہ فروخت کر کے نئی تعمیر کی جاسکتی ہے، ایسا کرنا جائز ہے، اور چونکہ اس فروختگی کا مقصد محض وقف کی حفاظت ہی ہے اور فروختگی کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے، چنانچہ شرح وقایہ میں ہے (۲،۳۵۴) ''اعلم أن بعض المتأخرین جوزوا بیع بعض الوقف إذا خرب لعمارة الباقی''۔ یعنی متاخرین رحمہم اللہ نے وقف شدہ زمین وجائداد کے کسی حصہ کو فروخت کر کے باقی کی تعمیر کے لئے جائز رکھا ہے۔ گو کہ صاحب شرح وقایہؒ نے اس بیع کے ناجائز ہونے کو اصح کہا ہے لیکن صورت مسئولہ میں متاخرینؒ کا قول انفع للوقف ہے، اور اوقاف میں انفع ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، لہذا زیر بحث مسئلہ میں متاخرینؒ کا قول ہی راجح ہونا چاہئے، چنانچہ عمدۃ الرعایہ حاشیہ نمبر (۱) پر ہے:

''إذا خرب الموقوف ولم یكن فی غلة ما یعمر به جاز أن یبیع بعضا منه فیعمر الباقی بثمنه؛ لأن فی بیع البعض إبقاء البعض، وفی تركه ذهاب كله وإعدام انتفاع به ومن ابتلی ببلیتین یختار أهونهما''، یعنی وقف کے کسی حصہ کو فروخت کر کے اس کی قیمت کے ذریعہ باقی کی تعمیر کرنے میں بعض وقف کو باقی رکھنا ہے اور بیع کو ترک کرنے اور ناجائز کرنے میں کل وقف کو ضائع کرنا اور اس کے ذریعہ انتفاع کو بالکلیہ ختم کرنا ہے، لہذا اس مقصد کے تحت وقف کے بعض حصہ کو فروخت کرنا جائز ہوگا اور اس کے ذریعہ نئی تعمیر کیا جانا جائز رہے گا، اور ضابطہ ہے کہ جو شخص دو مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے تو وہ اہون اور ہلکی مصیبت کو اختیار کرے گا۔ اور صورت مسئولہ میں اہون ہے کہ اس بعض حصہ کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے باقی کی نئی تعمیر کی اجازت دیدی جائے اور اس میں واقف کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا، اور واقف کے مقصد کی رعایت رکھنا واجب ہے، چنانچہ علامہ شامی (۳/ ۴۶۴) نے لکھا ہے: "مراعاة غرض الواقفین واجبة"۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے وقف شدہ زمین یا جائداد کا کوئی حصہ فروخت کر کے نئی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنا جائز ہے اسی میں واقف کے مقصد کی رعایت ہے جس کا لحاظ رکھنا واجب ہے اور وقف کو ضیاع سے بچانا بھی ہے۔

صورت مسئولہ میں کہ مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین جو کہ ضرورت سے زائد ہے تو اس زمین کے کار خیر میں استعمال ہونے کی نیت سے اس زمین پر

مدرسہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے، چنانچہ علامہ عینی عمدۃ القاری کے (۱۷۹/۴) پر لکھتے ہیں:

''قال ابن القاسم، لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجداً لم أربذلك باساً وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد''۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ جواب مذکور سے بعلت اشتراک علت معلوم ہوا کہ انجمن کا مکان وقفی نفع عام کے لئے ہے، اس مقبرہ کی جگہ مسجد بنانا جائز ہے (امداد الفتاوی ۵۷۹/۲)۔

تو جب اس قبرستان کی جگہ جس کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے اس طرح کہ اب اس میں مردے دفن نہیں کئے جاتے تو اس علت سے معلوم ہوا کہ جب قبرستان کی زمین ضرورت سے زائد ہے تو اس پر مسجد بھی بنانا جائز ہے اور مدرسہ بھی، اور اسی طرح مسجد کی وقف زمین ضرورت سے زائد ہے تو اس پر مدرسہ تعمیر کرنا جائز ہوگا۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین جو کہ ضرورت سے زائد ہے تو اس زمین کو کار خیر میں استعمال ہونے کی نیت سے اس زائد زمین پر مدرسہ کی تعمیر کرنا جائز ہے۔

صورت مسئولہ میں کہ جس قبرستان کے اطراف سے مسلم آبادی ختم ہوچکی ہے، یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا ہے جس کے سبب اب اس کے استعمال اور اس میں تدفین پر پابندی عائد کردی گئی ہے اور اس کی وجہ سے پھر ان پر قبضہ کا خطرہ ہے، بلکہ قبضہ ہو رہا ہے تو وہ قبرستان ہی کے حکم میں ہوگا اور ان سے انتفاع کو باقی رکھنے کی صورت یہ اختیار کی جاسکتی ہے اس کی چہار دیواری کردی جائے، کیونکہ ہمارے ملک میں بہت سے قبرستان ایسے ملیں گے جو آبادی میں آچکے ہیں تو لوگوں نے اس کی چہار دیواری کرالی ہے جس کے سبب وہ غیروں کے یا اپنوں کے قبضہ تسلط سے مامون ومحفوظ ہیں اور یہ چہار دیواری حفاظت قبرستان کے لئے بہترین شکل ہے، اور جب یہ شکل ممکن نہ ہوسکے تو یا یوں کہا جائے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے ذکر فرمایا ہے کہ اسکو قاضی کی اجازت سے فروخت کر کے اس کی قیمت سے دوسری جگہ قبرستان خرید لیا جائے، تاکہ اس سے انتفاع کی صورت رہے، اسی طرح فتوی دیا ہے امام ابوشجاع اور امام حلوانیؒ نے بھی۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں وہ قبرستان قبرستان کے حکم میں ہوگا، ان سے انتفاع باقی رکھنے کے لئے دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ (۱) یہ کہ آبادی میں ہونے اور قبضہ وتسلط کی صورت میں چہار دیواری کردی جائے۔ (۲) اگر یہ ممکن نہ ہوسکے تو قاضی کی اجازت سے اسے فروخت کر کے اس کی قیمت سے دوسری جگہ قبرستان خرید لیا جائے۔ یہی فتوی دیا ہے امام ابوشجاع، امام حلوانی، اور علامہ شامیؒ نے، انتفاع کی ان دونوں صورتوں میں سے جو ممکن ہو اس پر عمل کرنا جائز ہے، یا ان سے انتفاع کے لئے ان پر دینی مدرسہ یا رفاہی کام مثلاً مسافر خانہ، یا خانقاہ بنائی جاسکتی ہے۔

صورت مسئولہ میں کہ قدیم مساجد اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں تو ایسی مساجد بھی شرعاً مساجد ہی ہیں کسی بھی حکومت کو ان میں نماز کی ادائیگی کو منع کرنا جائز نہیں ہے اور حکومت کو نماز ادا کرنے سے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے اور اللہ تعالی ہی اس کا مالک ہے وہ کسی انسان کی ملک نہیں ہے، قرآن کریم میں ہے: "وأن المساجد لله" (سورہ جن: ۱۸)، تو جب وہ اللہ تعالی کی ملک ہیں اور اسی کی عبادت کے لئے مخصوص ہیں تو کسی حکومت کو ان کے اوپر مخالفانہ تسلط اور قبضہ اور ضبط کرنے کا حق نہیں ہے۔ حکومت انسانی املاک پر قبضہ کرے تو کرلے اللہ تعالی کی ملک پر قبضہ نہیں کرسکتی اور اگر جبر واستبداد سے قبضہ کرے تو وہ قبضہ شرعاً ناجائز اور کالعدم ہوگا، اور اسے لازم ہوگا کہ اسے واگذار کردے اور واگذاری کے عوض میں کوئی رقم وصول کرنی یا کوئی شرط عائد کرنا حکومت کا کوئی حق نہیں ہے (کذا فی کفایۃ المفتی ۳۱/۷)۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ مساجد محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہوں یا نہ ہوں کسی بھی حال میں حکومت کو نماز کی ادائیگی سے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

صورت مسئولہ میں قبرستان کی حفاظت کے لئے اطراف قبرستان میں جب کہ وہاں قبروں کے نشانات نہ ہوں دکان کی تعمیر کرنا درست ہے، اور تعمیر کے لئے سرمایہ نہ ہونے کی صورت میں پیشگی کرایہ کے طور پر لینا جائز ہے اور اس کے ذریعہ تعمیر کا یہ کام کرایا جاسکتا ہے اور دکانوں کی تعمیر کے سلسلے میں قبرستان کے اطراف کا چند فٹ جن پر قبریں نہیں ہیں یا قبریں تھیں لیکن قدیم ہونے کی وجہ سے قبروں کے نشانات مٹ چکے ہیں تو یہ درست ہوگا، چنانچہ ملک العلماء امام کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''فإن امتنع من العمارة ولم يقدر عليها بأن كان فقيراً آجرها القاضي وعمرها بالأجرة؛ لأن استبقاء

الوقف واجب لا يبقى إلا بالعمارة'' (بدائع الصنائع ۶،۳۲۷)۔

اور''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: ''ولو كانت الأرض متصلة ببيوت المصر يرغب الناس فى استيجار بيوتها وتكون غلة ذلك فوق غلة الزرع والنخيل كان للقيم أن يبنى فيها بيوتاً فيواجرها بخلاف ما إذا كانت الأرض الموقوفة بعيدة من بيوت المصر فان ثمة لا يكون للقيم أن يبنى فيها بيوتا يواجرها'' (۲،۴۱۴)۔

اور''فتاوی خانیہ'' میں ہے: ''أرض لأهل قرية جعلوها مقبره واقبروا فيا ثم إن واحدا من أهل القرية بنى فيها بناء لوضع اللبن وآلات القبر وأجلس فيها من يحفظ المتاع بغير رضا أهل القرية أو رضا بعضهم بذلك قالوا: إن كان فى المقبرة سعة بحيث لا يحتاج إلى ذلك المكان فلا باس به، وبعد ما بنى لواحتاجوا إلى ذلك المكان رفع البناء حتى يقبر فيه'' (۳،۳۱۲، فتاوى هنديه ۲،۴۶۷)۔

فاضل آمدنی مصارف وقف سے زائد ہو اور اس کے مماثل کوئی مصرف نہ ہو تو فقراء پر تقسیم کر سکتے ہیں، چنانچہ ''شرح وقایہ'' میں ہے: ''إذا انقطع صرف إلى الفقراء'' (۲،۲۵۴)۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ اطراف قبرستان میں جب کہ قبروں کے نشانات نہ ہوں تو دوکانوں کی تعمیر کرنا درست ہے اور اس کے لئے سرمایہ نہ ہونے کی صورت میں پیشگی کرایہ کے طور پر لینا جائز ہے اور تعمیر میں چندفٹ قبرستان کا چلا جانا جب کہ قبروں کے نشانات نہ ہوں تو درست ہے اور فاضل آمدنی مماثل وقف میں، ورنہ فقراء پر تقسیم کر دیا جانا جائز ہے۔

صورت مسئولہ میں کہ وسیع قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو اب سے پہلے کافی تھی، لیکن اب اس علاقہ میں آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے وہ ناکافی ہوگئی ہے بنابریں اس کی توسیع ضروری ہوگئی ہے، نیز قبرستان میں تدفین کا سلسلہ بھی جاری ہے اور مسجد و قبرستان دونوں اوقاف مسلمین میں ہیں تو اس ضرورت شدیدہ کے سبب قبرستان کے حصہ میں مسجد کی توسیع کی جاسکتی ہے، جائز ہے، لیکن اس میں ویران اور زیر استعمال قبرستان اور جدید و قدیم قبروں کے حکم میں فرق ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ویران قبرستان: ویران قبرستان جس میں مردوں کے دفن کا سلسلہ بند ہو چکا ہے اور قبروں کے نشانات بھی مٹ چکے ہیں تو اس میں مسجد بھی بنائی جاسکتی ہے، اور بنی ہوئی مسجد کی اس کی زمین سے لیکر توسیع بھی کی جاسکتی ہے، جائز ہے، چنانچہ علامہ عینی عمدۃ القاری (۴/۱۷۹) میں لکھتے ہیں:

''قال ابن القاسم لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجدالم أربذلك بأساوذلك لأن مقابر المسلمين وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم ولايجوز لأحد أن يملكها فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لايجوز تمليكه لأحدفمعناهماعلى ذلك واحد''

قبر قدیم: اگر قبر قدیم ہے کہ قبروں کے نشانات مٹ چکے ہیں اور میت کے اجزاء نہ رہنے کا غالب گمان ہو تو قبر پر تعمیر یا زراعت یا اسکو برابر کر دینا یا اس پر مسجد بنانا جائز ہے، چنانچہ ''درمختار'' (۱/۶۶۲) میں ہے: ''إذا بلى الميت وصار ترابا جاز الزرع والبناء عليه''۔

زیر استعمال قبرستان:

تو چونکہ قبر کا احترام باقی رکھنا لازم ہے اس لئے ایسے قبرستان پر نہ کوئی تعمیر جائز ہے اور نہ مسجد کی تعمیر ہی جائز ہے، ہاں اگر زیر استعمال قبرستان میں گنجائش ہے کہ اس جگہ کی ضرورت نہیں پڑے گی تو اس جگہ تعمیر مسجد وغیرہ جائز ہے، اور اگر تعمیر کے بعد اس جگہ کی ضرورت پڑ گئی تو عمارت کو اٹھا دیا جائے گا، تا کہ اس میں مردے دفن کئے جاسکیں، چنانچہ ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''أرض لأهل قرية جعلوها مقبرة واقبروا فيها ثم إن واحدا من أهل القرية بنى فيها بناء لوضع اللبن و آلات القبر وأجلس فيها من يحفظ المتاع بغير رضا أهل القرية أو رضا بعضهم بذلك قالوا: إن كان فى المقبرة سعة بحيث لايحتاج إلى ذلك المكان فلا بأس به، و بعد ما بنى لواحتاجوا إلى ذلك المكان رفع البناء ويقبر فيه كذا فى

تقسیم ہند کے بعد ویران شدہ اوقاف

مفتی شبیر احمد قاسمی[1]

ہندوستان تقسیم ہوجانے کے بعد پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش، دارالسلطنت دہلی وغیرہ کے بے شمار اوقاف ویران ہو چکے ہیں جن میں مساجد، مدارس، قبرستان، خانقاہ غرضیکہ ہر قسم کے اوقاف شامل ہیں، پنجاب وہریانہ میں لاکھوں مساجد میں غیر مسلموں کی فیملی رہتی ہے اور ہزاروں مساجد بند پڑی ہیں سینکڑوں مدارس پر مالکانہ قبضہ ہوچکا ہے قبرستانوں پر آبادیاں بس گئی ہیں نئی دہلی میں سینکڑوں چھوٹی بڑی مساجد بند پڑی ہیں اور جو مسلمان ان مقامات پر جاکر آباد ہوگئے ہیں ان کے لئے ان مساجد کو منجانب حکومت کھلوادینا ضروری ہے، مگر کھولی نہیں جارہی ہیں، اس صورت حال کو دیکھ کر ہر صاحب ایمان کے دل پر کیا اثر پڑتا ہوگا ہر دیکھنے والے کو معلوم ہے، انبالہ شہر میں کافی لمبی چوڑی ایک عمارت کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں باضابطہ سرکاری اسکول چل رہا ہے، معلوم ہوا کہ یہ مسجد تھی اور مسجد کے آثار موجود ہیں اور کئی مساجد جن کے مینار ومحراب سب موجود ہیں، مگر ان میں فیملی رہ رہی ہے جن کو از خود دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، اللہ تعالیٰ غیب سے کوئی شکل پیدا فرمائیں، تمام ہی مسلمانوں کو ان عبادت گاہوں کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

ویران مساجد کا تبادلہ:

جب کسی جگہ مسجد بن کر تیار ہوجاتی ہے اس وقت سے قیامت تک کے لئے وہ مسجد ہی رہتی ہے، اسکو کسی دوسرے امور میں منتقل کرنا کسی بھی انسان کے لئے جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر وہ مقام ویران ہوجائے اور وہاں سے تمام مسلمان دوسری جگہ منتقل ہوجائیں اور پورا علاقہ اجاڑ ہو جائے، مسجد بالکل ویران ہوجائے اور اس پر اغیار کا قبضہ ہونا شروع ہوجائے تب بھی وہ مقام مسجد ہی کے حکم میں رہے گا، قیامت تک اس مقام کو کسی دوسرے امور میں منتقل کرنا جائز نہیں ہوگا، یہی صحیح اور مفتی بہ قول ہے۔

لہذا جو زمین ایک دفعہ مسجد میں داخل ہوجائے تو پھر اس کی عمارت باقی رہے یا نہ رہے، اس میں نماز ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، وہ زمین تا قیامت مسجد ہی رہے گی اس کو عبادت کے علاوہ کسی اور کام میں لانا جائز نہیں، لہذا اس کو بیچنا، کرایہ پر دینا، یا اس کا تبادلہ کرنا کوئی جائز نہیں (مستفاد فتاوی رحیمیہ ۹۰/۶)۔

اشکال: اس پر اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ اگر مسجد کسی دوسری جگہ منتقل نہیں ہوسکتی ہے تو جن مساجد پر اغیار کے تغلب کی وجہ سے ان کا قبضہ ہے اور ان میں فیملیاں رہنے لگ گئیں ہیں اور حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں ان میں رہائش ہوتی ہے جو کہ مسجد کی بے حرمتی ہے اور ان میں سالہا سال سے نماز بھی نہیں ہوتی ہے تو اس کے باوجود ان مسجدوں کو یوں ہی چھوڑے رکھنے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی جگہ ایک دفعہ مسجد بن جاتی ہے تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے اس میں نماز ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، اس کی عمارت باقی ہو یا نہ ہو، وہاں مسلمان ہو یا نہ ہو، اس میں مسجد کا احترام باقی رہتا ہو یا نہ ہو، اس میں اغیار کے تغلب کی وجہ سے مالکانہ قبضہ بھی ہوگیا ہو، اس کو منہدم کرکے اس کی حقیقت بدل دی گئی ہو اور اس میں کھیتی کرنا شروع کردیا ہو وہاں پر دوسری عمارت بنائی گئی ہو، ہر حال میں وہ مسجد ہی رہے گی، اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب کبھی وہ مسلمان کے قبضہ میں آجائے گی تو اس کو اس وقت مسلمان زندہ کرسکیں گے اور نماز کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوجائے گا، اس کو علماء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

---

[1] ۔۔

اور اگر مسجد کا علاقہ اجاڑ ہوجائے اور اس میں اس محلہ اور گاؤں والوں کی نماز کا سلسلہ منقطع ہوجائے کہ اگر وہ کسی گاؤں میں تھی، پھر وہ ویران ہوکر کھیت بن گئی تو علی حالہ مسجد ہی رہے گی، اور یہی حضرت امام ابو یوسف کا مذہب اور امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے (اعلاء السنن ۱۳/ ۲۱۲)۔

ویران قبرستان، مدارس، خانقاہ کا تبادلہ:

اگر قبرستان، مدارس، خانقاہ وغیرہ ویران ہوجائیں، اور وہاں دور دور تک مسلمانوں کی کوئی آبادی نہ ہو، اور ایسی حالت میں حفاظت بھی نہیں ہو پاتی ہے اور حکومت بھی حفاظت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی ہے اور اغیار ان اوقاف پر مالکانہ قبضہ کا سلسلہ شروع کردیں تو اولاً حکومت سے ان کی حفاظت کی مانگ کی جائے، اگر اس میں کامیابی نہ ہوسکے تو ایسی نہایت مجبوری اور ناگزیر حالات میں قبضہ ناجائز سے حفاظت اور واقفین کے اغراض کو زندہ کرنے کیلئے مساجد کے متعلقہ اوقاف اور ملکیت اور افتادہ قبرستان اور مدارس کی وہ عمارتیں اور جائداد جن پر ناجائز قبضہ ہونا شروع ہوگیا ہے ان کو متبادل قیمت پر فروخت کرکے دوسری جگہ جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے اور حفاظت کی بھی ذمہ داری ہے تو وہاں پر اسی جنس کے اوقاف کا سلسلہ جاری کرنا شرعاً جائز اور درست ہوگا، تاکہ افتادہ اوقاف پھر سے غرض واقف کے موافق زندہ ہوکر آباد ہوجائیں، نیز اگر مدرسہ تھا تو اس کی رقم سے مدرسہ، اگر قبرستان تھا تو اس کی رقم سے قبرستان بنادیا جائے، ہاں البتہ ہر ایک کی رقم سے مسجد بنانا بھی جائز ہوسکتا ہے، کیونکہ مسجد اعلی درجہ کا وقف ہے (مستفاد کفایت المفتی ۷/ ۶۲)۔

اس کو ''اعلاء السنن'' میں اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

''وكذلك سائر الوقف عنده إلا أنها إذا خرجت عن انتفاع الموقوف عليهم به جاز استبدالها بإذن الحاكم بأرض أو دور أخرى تكون وقفا مكانها'' (اعلاء السنن ۱۳،۱۱۴)۔

(اور ایسے ہی ہر نوع کے وقف کا حکم حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے، مگر موقوف علیہ کے اس سے فائدہ اٹھانے کے دائرہ سے نکل چکا ہو تو حاکم یا ذمہ داران کی اجازت سے دوسری زمین یا دوسرے مکان کے عوض میں تبادلہ جائز ہے، جبکہ اس زمین یا مکان کو اس کے مقابلہ میں وقف ہی قرار دیا جائے)۔

اور اس کو ''البحر الرائق'' میں علامہ ابن نجیم نے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

''سئل الحلواني عن أوقاف المسجد إذا تعطلت وتعذر استغلالها للمتولي أن يبيعها ويشتري بثمنها أخرى قال نعم الخ'' (البحر الرائق ۵،۲۵۲، فتاوی ہندیہ ۲،۴۷۸)۔

(امام شمس الائمہ حلوانی سے مسجد کے اوقاف کے بارے میں پوچھا گیا جو بالکل معطل اور ویران ہوچکے ہوں اور ان سے آمدنی حاصل کرنا متعذر ہوگیا ہو تو کیا متولی کے لئے ان کو فروخت کرکے ان کی رقم سے دوسرا خرید لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ تو فرمایا جی ہاں جائز ہوگا)۔

''يصرف وقفا لاقرب مجانس لها'' (شامی ۶،۵۴۹)۔

ان کی آمدنی کو ان سے قریب ترین ہم جنس اوقاف میں صرف کیا جائے۔

اسی کو ''عمدۃ القاری شرح بخاری'' میں ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے:

''لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى قوم عليها مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك، لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين'' (عمدۃ القاری ۴،۱۷۹)۔

(اگر مسلمانوں کے قبرستان میں سے کوئی افتادہ ہوجائے پھر اس میں لوگ مسجد بنادیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور یہ اس لئے کہ قبرستان بھی مسلمانوں کے دفن کے کام کے لئے منجملہ اوقاف میں سے ایک وقف ہے، کسی کو اس کا مالک بننے کا حق نہیں ہے، لہذا جب پرانا اور افتادہ ہوجائے تو

اس کو مسجد کے حق میں منتقل کرنا جائز ہے، اس لئے کہ مسجد بھی مسلمانوں کے اوقاف میں سے ایک وقف ہے)۔

اس کو شامی میں اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''الثالثة أن يجحده الغاصب ولا بينة أي وأراد دفع القيمة فللمتولي أخذها يشتري بها بدلا'' (شامی ۶،۵۸۸)۔

(تیسری صورت یہ ہے کہ غاصب انکار کرے اور گواہ بھی نہ ہو اور وہ قیمت دینا چاہتا ہے تو متولی کے لئے قیمت لے کر اس کا متبادل وقف کی زمین خرید لینا جائز ہے)

مساجد و دیگر اوقاف کا فرق اور غیر جنس میں خرچ:

مساجد اور دیگر اوقاف میں بڑا فرق ہے کہ مساجد کو بنیاد سمیت فروخت کرنا اور ان کا تبادلہ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے اور دیگر اوقاف کا ناگزیر حالات میں تبادلہ جائز ہے، نیز جن اوقاف میں تبادلہ جائز ہے ان کا تبادلہ ہم جنس ہی میں جائز ہوتا ہے یا ان سے اعلی اور ارفع اوقاف میں جائز ہوسکتا ہے، مثلاً اگر مدرسہ تھا تو تبادلہ میں مدرسہ ہی ہونا چاہئے یا مسجد، مگر قبرستان یا مسافر خانہ میں تبادلہ جائز نہ ہوگا، غرض کہ اقرب اجناس یا ارفع واعلی اجناس میں جائز ہے ادنی میں نہیں، جیسا کہ فقہاء کی عبارات سے واضح ہوتا ہے، اس کو 'اعلاء السنن' میں اس طرح کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

''والفرق بينها وبين المساجد أن المساجد لا تبطل بخرابها أو خراب ماحولها'' واستغناء عنها الجهة التي عنيت له، لأنها لم تجعل مساجد لأهل المحلة والقرية بل للعامة ولا يشترط، للمسجدية البناء بل العرصة وحدها مسجد كما لا يخفى بخلاف سائر الوقف التي سبلت ثمرتها، فإنها إذا خربت وتعطلت منافعا تبطل الجهة التي عنيت له وهي إعانة الموقوف عليهم بغلتها'' (اعلاء السنن ۱۳،۲۱۴)۔

(مساجد اور دیگر اوقاف میں بڑا فرق ہے کہ مسجدیں ویران ہوجائیں اور اس کے گرد و نواح اجاڑ ہوجائے اور جس مقصد کیلئے متعین کیا گیا ہے اس سے استغناء ہوجانے کی وجہ سے مسجد باطل نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ مساجد صرف محلہ یا ایک گاؤں کے لئے متعین نہیں ہوتیں، بلکہ عامۃ المسلمین کے لئے وقف ہوتی ہیں اور شرعی مسجد کے لئے بناء اور عمارت شرط نہیں، بلکہ تنہا خالی زمین بھی مسجد ہوسکتی ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے، اس کے برخلاف دیگر تمام اوقاف کے جن کے منافع کا سلسلہ ختم ہوگیا ہو، اس لئے کہ جب ایسے اوقاف ویران ہوگئے یا کئے گئے تو وہ مقصد ہی ختم ہوجاتا ہے اور مقصد ان کی آمدنی سے موقوف علیہم کی مدد ہوتی ہے)۔

اس کو علامہ شامیؒ نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''مبادلة الوقف بدار آخر إنما يجوز إذا كانتا في محلة واحدة أو محلة أخرى خيرا وبالعكس لا يجوز'' (درمختار مع الشامی ۶،۵۸۶)، ''وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما، فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر إليه وتحته في الشامية يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (شامی ۶،۵۴۹)۔

(وقف کو دوسرے مکان سے بدلنا اس وقت جائز ہے جب کہ دونوں ایک محلہ میں ہوں یا دوسرے محلہ میں اس سے بہتر ہو، اور اس کے برعکس جائز نہیں ہے اور ایسا ہی موقوفہ چھاؤنی اور کنواں وغیرہ جب قابل انتفاع نہ رہ جائے تو مسجد کی موقوفہ زمین اور موقوفہ سرحدی چھاؤنی اور کنواں اور حوض کو اس کے قریب ترین اجناس میں منتقل کرنا جائز ہے، اور شامی میں ہے کہ ان موقوفہ اشیاء کو اقرب اجناس کی طرف منتقل کردیا جائے)۔

ویران اوقاف کی آمدنی غرض واقف کے خلاف مصرف میں لگانا:

مساجد کے علاوہ دیگر ویران اوقاف کو فروخت کر کے اس کے متبادل اوقاف کا انتظام کرنا جائز ہے، جیسا کہ ماقبل کی سرخیوں کے تحت گذر چکا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ان ویران اوقاف کی رقم سے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر خلاف جنس دینی امور میں، مثلاً تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنا جائز ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غرض واقف کے خلاف عمل کرنا جائز نہیں ہے اس کی پابندی کرنا ذمہ داران وقف پر لازم ہوتا ہے، نیز شریعت نے واقف کی شرطوں کو نصوص شرعیہ کا درجہ دیا ہے اس لئے خلاف جنس کے لئے تصرف جائز نہیں ہوگا، اس کو حضرات فقہاء نے اس

طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''إنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة الخ'' (شامی ۶،۶۶۵)۔

(بے شک فقہاء نے اس کی صراحت کردی ہے کہ وقف کرنے والوں کی غرض اور مقصد کی رعایت کرنا واجب ہوتا ہے)۔

''شرط الواقف كنص الشارع'' (شامی کراچی ۴/ ۴۳۳، شامی دیوبند ۶/ ۶۴۹)۔ واقف کی شرط شارع کی صراحت کے درجہ میں ہوتی ہے اور ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: ''شرط الواقف؛ لأن مخالفته كمخالفة النص'' (الاشباہ والنظائر، ص ۱۹۲)۔

(اور ''الاشباہ'' میں واقف کی شرط کے متعلق لکھا ہے کہ اسکی مخالفت نص شرعی کی مخالفت کے مرادف ہے)۔

اور شامی میں اس سے بھی واضح عبارت موجود ہے: ''وهو أن يكون البدل والمبدل من جنس واحد'' (شامی ۶،۵۸۶)۔

(اور وہ شرط یہ ہے کہ بدل اور مبدل منہ دونوں ایک ہی جنس کے ہوں)۔

ہاں اتنی رعایت ضرور ہے کہ اگر بدل اپنے مبدل منہ سے زیادہ اعلی اور ارفع ہے اور بدل زیادہ پائیدار اور زیادہ آمدنی کا ذریعہ ہے اور مقاصد وقف کے واضح خلاف بھی نہیں ہے تو خلاف جنس میں تبدیلی جائز ہے، مگر اس کی آمدنی ہم جنس میں خرچ کرنا لازم ہوگا، اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''والظاهر عدم اشتراط اتحاد الجنس في الموقوفة للاستغلال؛ لأن المنظور فيها كثرة الريع وقلة المرمة والمؤنة فلو استبدل الحانوت بأرض تزرع، ويحصل منها غلة أقدر أجرة الحانوت كان أحسن؛ لأن الأرض أدوم وأبقى و أغنى عن كافة الترميم والتعمير بخلاف الموقوفة للسكن'' (شامی زکریا دیوبند ۶، ۵۸۶ شامی کراچی ۴، ۳۸۶)۔

(اور ظاہر یہ ہے کہ اس میں اتحاد جنس کی پابندی لازم نہیں، اس لئے کہ اسمیں کثرت نفع اور قلت مرمت اور قلت خرچ پیش نظر ہوتی ہے، لہذا جب دوکان کھیتی سے تبدیل کی جائے گی اور اس میں دوکان کے مقابلہ میں زیادہ مقدار میں آمدنی ہے تو تبدیلی زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ زمین دائمی باقی رہتی ہے اور ترمیم وتعمیر سے بے نیاز ہوتی ہے برخلاف رہائش موقوفہ کے)۔

الف۔ مسجد کی فاضل اراضی میں رفاہی ادارے کا قیام:

مسجد پر وقف شدہ اراضی جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہیں ان میں عصری تعلیم گاہ مثلاً جونیر ہائی اسکول، یا رفاہی ادارے مثلاً ہسپتال وغیرہ قائم کرنا جائز نہ ہوگا، ہاں البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کمیٹی کی اجازت سے ان رفاہی امور کے لئے مناسب کرایہ لیکر یہ ادارے چلائے جائیں اور جائداد مسجد ہی کی ملکیت میں قائم رہے تو ایسی صورت میں جائز ہوسکتا ہے، اور اسی طرح کرایہ پر لے کر اپنی تعلیم گاہ بھی قائم کی جاسکتی ہے، مگر بلا معاوضہ جائز نہیں ہوگا، یہ مسئلہ فقہاء کی اس قسم کی عبارت سے واضح ہوتا ہے:

جامع مسجد پر موقوفہ مال ہے اس کی آمدنی جمع ہوگئی ہے پھر اسلام پر کوئی حادثہ پیش آجائے، جیسا کہ روم کا حادثہ ہے، اور اس حادثہ مین خرچہ کی ضرورت ہے تو اگر جامع مسجد کے وقف شدہ مال کی فی الحال مسجد کو ضرورت نہیں ہے تو حاکم کے لئے جائز ہے کہ اس مال کو اس میں خرچ کردے، لیکن یہ بطور قرض ہوگا، تو گویا کہ یہ مال غنیمت سے قرض لینے کے درجہ میں ہوجائے گا (قاضی خاں علی الہندیہ ۳/ ۲۷۸)۔

ب۔ مسجد کے اوقاف کی فاضل آمدنی کا مصرف:

مسجد کے اوقاف اور اس کی مملوکہ جائداد کی آمدنی اسی مسجد میں خرچ کرنا لازم ہوتا ہے لیکن اگر اس مسجد کی تمام ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد کافی مقدار میں بچ جائے اور یوں ہی رکھی رہ جائے تو ایسی صورت میں اس فاضل آمدنی کو اس کے قریب ترین دوسری مسجد ہی میں خرچ کرنے کی گنجائش ہوتی ہے مگر مسجد کے علاوہ کسی دوسرے ادارے میں خرچ کرنا کسی حال میں جائز نہ ہوگا۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

"يصرف وقفها لأقرب مجانس لها" (شامی ۶،۵۴۹)۔

(مسجد کے وقف کی آمدنی اس کے قریب ترین جنس میں خرچ کرنا چاہئے)۔

ہاں البتہ اگر اس کے پاس میں کوئی مسجد ضرورت مند نہیں ہے تو اس سے دور کی مسجد میں لگائی جائے، اور اگر دور تک بھی کوئی مسجد اور ضرورتمند نہیں ہے تو قریب کے دینی مدارس و مکاتب میں بھی خرچ کی جاسکتی ہے، اور اگر مدارس و مکاتب بھی نہ ہوں تو مصیبت زدہ فقراء میں بھی تقسیم کی گنجائش ہے، مگر اسکولوں، ہسپتالوں میں خرچ کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ اور یہ اس وقت ہے جب کہ واقف نے کوئی شرط نہ لگائی ہو اور متولی کو اختیار دیا ہو، یہ مسئلہ فقہاء کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے:

"في فضل يصرف إلى عمارة المسجد دهنه و حصيره و ما فيه مصلحة المسجد على أن للقيم أن يتصرف في ذلك على ما يرى وإذا استغنى هذا المسجد يصرف إلى فقراء المسلمين فيجوز ذلك" (قاضی خاں علی الہندیہ ۳،۲۸۸)۔

(لہذا جو فاضل رقم بچ جائے اس کو مسجد کی تعمیر اور اس کے تیل اور اس کی چٹائی اور ان امور میں جو مساجد کے مصالح میں سے ہوں خرچ کرے، اس شرط پر کہ جب متولی اور ذمہ دار کو یہ اختیار دیا ہو کہ وہ جہاں چاہے خرچ کرے، اور جب یہ مسجد مستغنی ہو جائے تو مسلمانوں کے ضرورتمند فقراء میں صرف کر دے تو جائز ہے)۔

غیر محفوظ آمدنی کا مصرف:

الف۔ جن اوقاف کی آمدنی ان کے متعین مصارف سے بہت زیادہ ہے جس میں ہر سال اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور اس کی حفاظت بھی نہایت خطرناک ہوگئی ہے اس کو دوسرے مغائر اداروں میں خرچ کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ ہم جنس قریب ترین اوقاف میں صرف کرنا جائز ہوسکتا ہے، مثلاً اگر مسجد کے اوقاف کی آمدنی ہے تو قریب ترین مسجد میں، قبرستان کے اوقاف کی آمدنی ہے تو دوسرے قریب ترین قبرستان میں صرف جائز ہوسکتا ہے، اس کے برخلاف دوسرے اجناس میں جائز نہ ہوگا (مستفاد از کفایت المفتی ۷ / ۶۲، امداد الفتاوی ۲ / ۵۹۳، فتاوی محمودیہ ۱۲ / ۲۵۱)۔

ب۔ اور اگر دوسرے خلاف جنس اداروں کو ضرورت ہے تو بطور قرض لے سکتے ہیں، ہاں البتہ ایسی فاضل آمدنی کو غیر مستطیع نادار دینی طلبہ کو بطور امداد اور وظائف دینے کی گنجائش ہوسکتی ہے (کفایت المفتی ۷ / ۳۰۳)، جیسا کہ قاضی خاں کی عبارت سے واضح ہوتا ہے:

"وإذا استغنى هذا المسجد يصرف إلى فقراء المسلمين، فيجوز ذلك" (قاضی خاں علی الہندیہ ۳،۲۷۸)۔

(اور جب یہ اس سے مستغنی ہو جائے تو مسلم فقراء میں تقسیم کر دیا جائے تو یہ جائز ہے)۔

"وفي الشامية قال: صدقة موقوفة على فلان جاز ويصرف بعده إلى الفقراء" (شامی ۶،۵۳۶)۔

(اور شامی میں ہے کہ کہا کہ فلاں پر بطور صدقہ وقف ہے تو اس کے بعد فقراء کو دیا جائے گا)۔

"فما فضل يصرف إلى الفقراء" (تاتارخانیہ ۵،۷۴۹)۔ (لہذا جو فاضل ہو فقراء کو دیدیا جائے)۔

زیادہ منفعت کے لئے تبادلہ:

اگر وقف کی موجودہ شکل میں منفعت تو ہے، مگر بہت معمولی مقدار میں ہے جس سے مسجد یا مدرسہ کی ضرورت پوری نہیں ہوتی ہے، اور اگر اس کو فروخت کر کے دوسری زمین یا مکان دوسری جگہ لے لیا جائے تو منفعت زیادہ ہوسکتی ہے جس سے ضروریات با آسانی پوری ہوسکتی ہیں تو کیا ایسی صورت میں زیادہ منفعت کے حصول کے لئے استبدال جائز ہوسکتا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وقف کی اراضی عمارتی شکل میں نہیں ہے، بلکہ صرف سادی زمین ہے تو قول ضعیف کے مطابق انفع عوض میں تبدیلی جائز ہے۔ مگر قول راجح اور قول مفتی بہ کے مطابق انفع کے عوض میں بھی تبادلہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ غرض واقف کو حتی الامکان باقی رکھنا لازم ہوتا ہے اور جو وقف کم منفعت کے ساتھ اپنی جگہ باقی رہ سکتا ہے اس میں تبادلہ جائز نہیں ہوگا، اور اگر عمارتی شکل میں مکان یا دوکان وغیرہ ہے اور اس کی

کچھ منفعت بھی باقی ہے تو بالاتفاق تبادلہ جائز نہیں ہے، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''والثالث أن لا يشترط أيضا ولكن فيه نفع في الجملة و بدله خير منه ريعا و نفعا وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار (قوله) أن الخلاف في الثالث إنما هو في الأرض إذا ضعفت عن الاستغلال بخلاف الدار إذا ضعفت بخراب بعضها ولم تذهب أصلا فإنه لا يجوز حينئذ الاستبدال على كل الأقوال'' (شامی زکریا دیوبند ۶،۵۸۴)۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی، لیکن شئ موقوف میں فی الجملہ نفع ہے اور تبادلہ میں زیادہ فائدہ اور زیادہ نفع ہے تو بھی صحیح اور مفتی بہ قول کے مطابق اس کا تبادلہ جائز نہیں ہے، اور بے شک تیسری صورت کا یہ اختلاف صرف زمین کے بارے میں ہے کہ جب آمدنی اس کی کمزور ہو جائے برخلاف دوکان ومکان (عمارت) کے جب کہ اس کے بعض حصہ کے خراب ہونے کی وجہ سے آمدنی کمزور ہوگئی ہے اور کلی طور پر منفعت ختم نہیں ہوئی تو اس وقت بیشک تمام اقوال پر تبادلہ جائز نہیں ہے)۔

مصرف ختم ہوگیا، آمدنی باقی، تو کیا کرے:

مسجد یا مدرسہ کے نام جو اوقاف ہیں ان کی آمدنی بدستور باقی ہے، مگر موقوف علیہ یعنی وہ مسجد یا مدرسہ باقی نہیں ہے، اسی طرح خاندان یا علاقہ کے فقراء پر وقف تھا، مگر وہ خاندان وہاں سے منتقل ہوگیا ہے یا بالکل ختم ہو چکا ہے تو ایسے حالات میں اوقاف کی آمدنی کو کہاں خرچ کیا جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی قسم کے قریب ترین مصرف میں خرچ کرنے کی گنجائش ہے، مثلاً اگر مسجد تھی تو اس کی آمدنی قریب ترین دوسری مسجد میں، یا مدرسہ تھا تو اس کی آمدنی قریب ترین دوسرے مدرسہ میں خرچ کی جاسکتی ہے خلاف جنس میں نہیں، نیز جس خاندان کے فقراء پر وقف کیا گیا تھا اگر وہ خاندان ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلا گیا ہے، یا ان میں کوئی بھی فقیر باقی نہیں ہے، اسی طرح جس علاقہ کے فقراء پر وقف کیا تھا وہ علاقہ اجاڑ ہوگیا، وہاں کوئی مسلمان فقیر نہیں ہے تو ان سب صورتوں میں وہاں سے قریب ترین دوسرے فقراء پر خرچ کر دینا جائز ہے مگر خلاف جنس میں صرف کرنا درست نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ فقہاء کی اس قسم کی عبارت سے واضح ہوتا ہے:

''أفتى به الإمام أبو شجاع والإمام الحلواني وكفى بهما قدوة ولا سيما في زماننا فإن المسجد أو غيره من رباط أوحوض إذا لم ينقل يأخذ أنقاضه اللصوص والمتغلبون كما هو شاهد، وكذلك أوقافه يأكلها النظار أو غيره ويلزم من عدم النقل خراب المسجد الآخر المحتاج إلى النقل إليه'' (شامی، طبع زکریا ۶،۵۵۰)۔

(اس پر امام ابوشجاع اور شمس الائمہ حلوانی نے فتوی دیا ہے اور یہی دونوں قول کے لئے کافی ہے خاص کر ہمارے زمانے میں، اس لئے کہ مسجد اور اس کے علاوہ سرحدی چھاؤنی یا حوض جب انکی فاضل اشیاء منتقل نہ کی جائیں تو چور ڈکیت قبضہ کرلیں گے جیسا کہ مشاہدہ ہے اور ایسا ہی اس کے اوقاف کو خود متولی وغیرہ کھا جائیں گے، اور نقل نہ کرنے میں دوسری ضرورت مند مسجد بھی ویران ہوسکتی ہے)۔

نیز فقہاء کی اس عبارت سے بھی یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے:

''سئل شيخ الإسلام عن أهل القرية افترقوا وتداعى مسجد القرية إلى الخراب وبعض المتغلبة يستولون على خشب المسجد وينقلونه إلى ديارهم هل لواحد لأهل القرية أن يبيع الخشب بأمر القاضي ويمسك الثمن ليصرفه إلى بعض المساجد أو إلى هذا المسجد قال نعم (وقوله) وخرب الرباط واستغنى الناس عنه يربط في رباط آخر هو أقرب الرباط إليه'' (ہندیہ ۲،۴۷۹)، ''إذا قال موقوفة فقط لانصرافه إلى الفقراء عرفا فهو مؤبد'' (شامی زکریا ۶،۵۲۷) ''قال صدقة موقوفة على فلان جاز ويصرف بعده إلى الفقراء'' (شامی زکریا ۶،۵۲۶)، ''وما فضل من حصير وزيته ولم يحتج إليه جاز أن يجعل في مسجد آخر أو يتصدق من ذلك على فقراء جيرانه الخ'' (إعلاء السنن ۱۳،۱۹۹)۔

(شیخ الاسلام اسبیجابی سے سوال کیا گیا ایسی آبادی کے بارے میں کہ جہاں کے لوگوں نے منتشر ہو کر مسجد کو ویران چھوڑ دیا ہے اور بعض مخالف لوگ تغلب سے مسجد کی لکڑیاں اپنے یہاں منتقل کرنے لگے ہیں تو کیا وہاں کے کسی آدمی کے لئے جائز ہے کہ حاکم کی اجازت سے اس کو فروخت کر کے پیسہ کو روک لے تا کہ اس کو اس مسجد میں یا دوسری مسجد میں صرف کر دے تو فرمایا کہ جی ہاں جائز ہے۔ اور سرحدی چھاؤنی ویران ہو جائے اور لوگ اس

سے مستغنی ہو جائیں تو اس کو دوسرے قریب ترین چھاؤنی میں منتقل کر دیا جائے تو جائز ہے، جب صرف یہ کہا کہ وقف ہے، تو وہ فقراء کی طرف عرفاً منتقل ہو جائے گا پھر وہ ہمیشہ رہیگا۔ اور کہا کہ فلاں پر بطور وقف صدقہ ہے تو جائز ہے اور اس کے بعد فقراء کی طرف منتقل ہو جائے گا، اور جو چٹائی اور تیل سے زائد ہوا اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے تو اس کو دوسری مسجد میں منتقل کر دینا جائز ہے یا پڑوس کے فقراء کو صدقہ کر دے)۔

الف۔ بلڈر اور ٹھیکیدار سے تعمیر کرا کے بعض حصہ اس کو دیدینا:

بلڈر اور ٹھیکیدار کے ہاتھ اس طرح سودا کرنا ہرگز جائز نہیں ہے کہ تعمیر کے بعد دو ایک منزل ٹھیکیدار کی ملکیت میں منتقل ہو جائے، اس لئے کہ اس میں اصل وقف کا جز فروخت کرنا لازم آتا ہے، اور خدا کی ملکیت کو ختم کر کے بندہ کی ملکیت میں دینا لازم آتا ہے جو کسی طرح بھی جائز نہیں ہے، اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس میں وقف کی حفاظت ہے، بلکہ بعض اجزاء کو ہلاک کرنا ہے، ہاں البتہ کلی طور پر انتفاع ختم ہو جانے کی صورت میں تبادلہ کر کے کارآمد متبادل زمین یا عمارت حاصل کرنے کی اجازت ہو سکتی ہے جس کی تفصیل ویران اوقاف کے تحت گذر چکی ہے۔

یہ مسئلہ فقہاء کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے: ''فإذا تم و لزم لا یملّك ولا یملك ولا یعار ولا یرهن، وتحته فی الشامیة، لا یکون مملوکا لصاحبه ولا یملّك أی لا یقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیك الخارج عن ملکه'' (درمختار ۴،۳۵۲)۔

(لہذا جب وقف تام ہو کر لازم ہو جائے تو نہ کوئی مالک ہو سکتا ہے اور نہ کسی کو مالک بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی عاریت یا بطور رہن دیا جا سکتا ہے۔ اور شامی میں ہے، نہ واقف کی ملکیت ہو سکتی ہے اور نہ ہی غیر کو بیع وغیرہ کے ذریعہ سے مالک بنانے کی اس میں صلاحیت ہے، اس کی ملکیت سے خارج ہونے کی وجہ سے دوسرے کو مالک بنانا محال ہو چکا ہے)۔

ب۔ وقف کے بعض حصہ کو فروخت کر کے بقیہ کی تعمیر:

اگر وقف کی عمارت مخدوش ہو گئی ہے اور اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے تو بعض حصوں کو فروخت کر کے بقیہ کی تعمیر جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے وقف کی ملکیت کہ جس کو وقف کی ترقیاتی اسکیم کے لئے خریدی گئی تھی یا کسی نے ترقی کے لئے ملکیت میں دے دیا ہے تو ایسی ملکیت میں سے فروخت کر کے اصل وقف کی تعمیر میں لگانا جائز ہے، دوسرا ہے نفس وقف، یعنی شئ موقوف اور اس کے اجزاء تو تعمیر اور ترقی کے لئے اصل وقف کا کوئی جز فروخت کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ موجودہ متولی سے کوئی کام نہیں ہو رہا ہے تو اس کو معزول کر کے دوسرے فعال شخص کا انتخاب لازم ہوگا، مگر وقف کا کوئی جز فروخت نہ ہوگا۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

''وإذا خربت أرض الوقف وأراد القیم أن یبیع بعضا منها لیرمّ الباقی بثمن ما باع لیس له ذلك'' (تاتارخانیه ۵،۷۴۸)۔ (اور جب وقف کی زمین ویران ہو جائے اور ذمہ دار اس میں سے بعض کو فروخت کر کے اس کے پیسے سے بقیہ کی تعمیر کا ارادہ کرے تو اس کے لئے یہ عمل جائز نہیں ہے)۔

البتہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ان سب امور کی اجازت ہے جس پر سعودیہ وغیرہ میں عمل ہو چکا ہے، مگر ہمارے لئے نہ اس کا اختیار کرنا مناسب ہے اور نہ ہی حنفیہ کے مسلک کو چھوڑنے کی گنجائش ہے۔ اس کی تفصیل اعلاء السنن (۱۳/ ۲۰۸) میں موجود ہے۔

مسجد یا مستعمل قبرستان کی فاضل زمین میں یا افتادہ قبرستان میں مدرسہ کا قیام:

مسجد کی ملکیت یا وقف کی زمین میں اس شرط پر مدرسہ بنانا جائز ہے کہ مدرسہ اس زمین کی مناسب قیمت ادا کر دے، بغیر معاوضہ جائز نہ ہوگا (فتاوی محمودیہ ۱۷/ ۲۳۱)۔

''لیس للقیم أن یسکن فیها أحدا بغیر أجر'' (تاتارخانیه ۵،۷۴۹)

(متولی کے لئے موقوفہ زمین میں کسی کو بلا کرایہ پر رکھنا جائز نہیں)۔

اور اگر قبرستان کی فاضل زمین ہے اور آئندہ قبرستان کو اس کی ضرورت نہیں ہے اور لوگوں کے اس پر قبضہ جمانے کا خطرہ ہے یا قبرستان افتادہ ہو چکا ہے اس میں دفن کا سلسلہ باقی نہیں ہے تو اس پر مسجد یا مدرسہ قائم کرنا جائز ہے، اس لئے کہ مسجد ومدرسہ قبرستان کے مقابلہ میں اعلی اور ارفع اوقاف میں سے ہیں، لہذا واقف کی غرض کی درحقیقت مخالفت نہیں ہے۔

اسی وجہ سے ''عمدۃ القاری'' وغیرہ میں افتادہ قبرستان میں مسجد بنانے کو جائز لکھا ہے، نیز حضرت تھانویؒ نے افتادہ قبرستان میں موقوفہ انجمن قائم کرنے کو جائز لکھا ہے (امداد الفتاوی ۲/ ۵۷۹، احسن الفتاوی ۶/ ۴۰۹)۔

''لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى قوم عليها مسجدا لم أر بذلك بأساً (وقوله) فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد، لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين'' (عمدۃ القاری ۴/ ۱۷۹)۔

اگر مسلمانوں کا قبرستان افتادہ ہوجائے پھر اس میں لوگ مسجد بنا لیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں، لہذا جب قبرستان پرانا ہوجائے اور وہاں دفن کی ضرورت نہ رہے تو اس کو مسجد کے کام میں لانا جائز ہے، اس لئے کہ مسجد بھی مسلمانوں کے اوقاف میں سے ایک وقف ہے)۔

قدیم مساجد کو بند کر کے نماز سے روکنا:

مسجدیں چاہے قدیم ہوں یا جدید اللہ کی ملکیت ہیں، اس میں کسی حکومت یا کسی فرد کو مالکانہ اختیار نہیں ہے، اور حکومت ہند نے آثار قدیمہ کے نام سے چھوٹی بڑی ہزاروں مسجدوں کو مقفل کر کے مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روک رکھا ہے یہ حکومت ہند کی طرف سے مسلمانان پر سخت ترین ظلم اور زیادتی ہے، شریعت اسلامیہ میں حکومت کو اس کا کوئی حق نہیں ہے، تمام مسلمانوں کو مل کر حکومت ہند سے احتجاج کر کے ان تمام مساجد کو کھلوانا ضروری ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها'' (سورہ البقرہ: ۱۱۴)۔

(اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں عبادت کرنے سے روک لگاتا ہے اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے)۔

مسجد خدا کا گھر ہے اور وہی اس کا مالک ہے، وہ کسی انسان کی ملک نہیں، ارشاد ربانی ہے: ''وأن المساجد لله'' (سورہ جن: ۱۸)، (یقینا مسجدیں خاص خدا ہی کی ہیں) اور جب یہ خدا کی ملک ہیں تو کسی حکومت کو اس میں نماز پڑھنے سے روکنے کا کسی طرح کا کوئی حق نہیں، اسلامی شریعت میں مسجد کی حیثیت کسی میوزیم یا آثار قدیمہ کی نہیں کہ اسکو محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی دیکر اس میں نماز پڑھنے سے روک دیا جائے، اسلامی قانون کی رو سے جب کوئی جگہ ایک بار شرعاً مسجد کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو تاقیامت وہ مسجد ہی باقی رہتی ہے، حکومت تو کیا خود واقف کو بھی اس میں نماز پڑھنے سے کسی کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام والثاني أبدا إلى قيام الساعة وبه يفتى'' (در مختار ۴/ ۳۵۸)۔

نیز مسجد شعائر اللہ میں داخل ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم کے ساتھ ساتھ مسلمان اس کی حفاظت کے بھی ذمہ دار ہیں، اس لئے اس کی تقدیس وتعظیم کو باقی رکھنے کے لئے مسلم قوم پر ہر ممکن کوشش کرنی ضروری ہے، نیز حکومت کے زیر کنٹرول اسی حالت میں رہنے دینا اور اس سے دست بردار ہوجانا شریعت کے خلاف اور اسلامی روح کے منافی ہے، لہذا حکومت کا اس انداز کا تسلط وقبضہ شرعاً ناجائز اور کالعدم ہوگا جو ناقابل قبول ہی نہیں، بلکہ ناقابل برداشت ہے، اور انڈین قانون کے بھی خلاف اور جمہوریت کا کھلا مذاق ہے۔

قبرستان کے کنارے دوکان بنا کر کرایہ پر دینا اور فاضل آمدنی کا حکم:

قبرستان اگر باؤنڈری کے بغیر محفوظ رہتا ہے تو اس زمین پر دوکانیں بنانا جائز نہ ہوگا، پوری زمین قبرستان ہی کے استعمال میں رہنا ضروری ہے اور بلاوجہ آمدنی بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں البتہ اگر باؤنڈری کے بغیر قبرستان کی حفاظت بہت دشوار ہے، لوگوں کے آہستہ آہستہ قبضہ کر لینے کا خطرہ ہے، اور قبرستان کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ جس سے چہار دیواری کا نظم ہو سکے تو ایسی صورت میں اس کی گنجائش ہے کہ کنارے دوکانیں بنا کر کرایہ پر دیدیا جائے اور کرایہ دار سے پیشگی رقم اس شرط کے ساتھ لینا جائز ہے کہ یہ رقم آئندہ کرایہ میں مجری ہوتی رہے گی۔

''وإذا أراد أن يبنى فيها بيوتا يستغلها بالإجارة إن كانت أرض الوقف متصلة ببيوت المصر يرغب فى استيجار بيوتها وتكون غلة ذلك فوق غلة الأرض والنخيل كان له ذلك'' (تاتارخانیہ۵،۷۴۶)۔

(اور جب وقف کی زمین میں مکانات بنوا کر آمدنی کے لئے کرایہ پر دینے کا ارادہ ہو تو اگر وقف کی زمین آبادی سے متصل ہے اور لوگ اس کے مکانات کو کرایہ پر لینے کے خواہش مند ہو سکتے ہیں اور زمین اور پیڑ کی آمدنی سے ان مکانات کی آمدنی زیادہ ہوسکتی ہے تو مکانات بنا کر کرایہ پر دینا جائز ہے)۔ اور اس کی فاضل آمدنی دوسرے قبرستان میں خرچ کرنا لازم ہوگا اور اگر دوسرا قبرستان دور دور تک نہ ہو تو غیر مستطیع دینی طلبہ اور نادار فقراء میں تقسیم کرنے کی گنجائش ہے (کفایت المفتی ۷/۳۰۲)، نیز ویران اور مستعمل قبرستان میں فرق ہے کہ مستعمل قبرستان کو اپنی جگہ باقی رکھنا لازم ہے اس کا تبادلہ جائز نہیں ہے اور ویران قبرستان کا تبادلہ جائز ہے۔

غیر مسلم کا وقف اور اس کی تولیت:

غیر مسلم اگر کار ثواب سمجھ کر مسجد کے لئے کوئی جائداد وقف کردے تو شرعی طور پر غیر مسلم کا وقف صحیح ہے، اور مسجد اور عبادت گاہوں میں انکی وقف کردہ اشیاء کا استعمال بلا کراہت جائز ہے (مستفاد از احسن الفتاوی ۶/۴۳۹، فتاوی محمودیہ ۱۰/۱۸۷)۔

''لأنه مباح بدليل صحته من الكافر و تحته فى الشامية، بل التقرب به موقوف على نية القربة فهو بدونها مباح حتى يصح من الكافر كالعتق والنكاح (وقوله) فإنه لابد فيه من أن يكون فى صورة القربة'' (درمختار مع الشامی۔ زکریا۶،۵۲۱، شامی۔ کراچی ۴،۳۳۹)۔

اس لئے کہ کافر کی طرف سے صحیح ہونے کی وجہ سے مباح ہے اور اسکے نیچے شامی میں ہے کہ اس کے کار ثواب ہونے کا مدار قربت کی نیت پر ہے، لہذا بغیر نیت کے صرف مباح ہے حتی کہ کافر کی طرف سے بھی صحیح ہوجاتا ہے جیسا کہ عتق اور نکاح صحیح ہوجاتا ہے، اس لئے اس میں ضروری ہے کہ قربت کی صورت میں ہو۔

نیز غیر مسلموں کی تولیت بھی اوقاف میں جائز ہے، اس لئے کہ تولیت کا مدار امانت داری پر ہے نہ کہ ایمان و اسلام پر۔

''مطلب شروط المتولى، ولا تشترط الحرية والإسلام للصحة كما فى الإسعاف ولو كان عبدا يجوز قياسا واستحسانا والذمى فى الحكم كالعبد'' (ہندیہ ۲،۴۶، شامی زکریا ۶،۵۷۹)۔

(متولی کی شرطوں کے تحت لکھا ہے کہ صحت تولیت کے لئے آزاد یا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے جیسا کہ اسعاف میں ہے اور اگر متولی غلام ہو تو قیاساً و استحساناً جائز ہے اور غیر مسلم ذمی حکم میں غلام کی طرح ہے)۔

☆☆☆

موقوف علی المساجد اراضی کا دوسرے مقاصد کے لئے استعمال

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی[1]

الف۔ چونکہ "شرط الواقف کنص الشارع" ہے، اس لئے شرط واقف وجہت وقف ملحوظ رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر (اس موقوفہ کو فروخت کرکے) متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے۔

''قال فی التنویر: و مثله حشیش المسجد وحصیره مع الاستغناء عنها والرباط والبئر إذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر إلی أقرب مسجد أو رباط أو بئر. وقال الشامیة: لا یجوز صرف وقف مسجد خرب إلی حوض وعکسه، وفی شرح الملتقی: یصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (رد المحتار ۳،۵۱۳)۔

تنویر وشامیہ کی عبارت سے جہاں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ موقوف علیہ سے اگر استغناء ہوجائے تو وقف کی آمدنی مجانس اقرب میں خرچ کی جائے گی، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موقوفہ کو فروخت کرکے اس کا متبادل وقف کیا جاسکتا ہے، اسی کی تائید عالمگیری کے اس جزئیہ سے بھی ہورہی ہے:

''سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجد أو حوض خرب ولایحتاج إلیه لتفرق الناس هل للقاضی أن یصرف أوقافه إلی مسجد آخر أو حوض آخر قال نعم'' (فتاوی هندیه ۲،۴۵۲، بنایة ۲،۱۰۰۷)۔

ب۔ ہاں اس کی گنجائش ہے کہ ویران اور نا قابل انتفاع اوقاف کو بیچ کر یا کسی فرد یا حکومت کے حوالے کرکے دوسری جگہ لے لی جائے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ حکومت وہ جگہ ملی ورفاہی مقاصد کے خلاف استعمال نہ کرے، مثلاً اس جگہ اسلحہ وبارود وغیرہ کے کارخانے قائم کردیئے گئے جن کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہو، بہرحال اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ ثلاثہ کی اولاً آراء درج کردی جائیں:

''ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الإمام والثانی أبدا إلی قیام الساعة وبه یفتی... وعاد إلی الملك أی ملك البانی أو ورثته عند محمد'' (درمختار علی هامش رد المحتار ۳،۵۱۳)، اگر مسجد کا گردوپیش ویران ہوجائے اور اس سے مستغنی ہوجایا جائے تو بھی ہمیشہ قیامت تک کے لئے مسجد ہی رہے گی اور اسی پر فتوی ہے۔

دلائل کی رو سے شیخین کی بات میں قوت ہے، جیسا کہ علامہ شامی لکھتے ہیں: ''فلا یعود میراثا ولا یجوز نقله ونقل ماله علی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أولا وهو الفتوی حاوی القدسی، وأکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الأوجه فتح'' (شامی ۳،۵۱۳)۔

علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں: ''وإذا خرب مکان موقوف فتعطل نفعه بیع وصرف ثمنه فی نظیره وکذلك إذا خرب بعض الأماکن الموقوف علیها'' (فتاوی ابن تیمیه ۳۱،۹۲)، علامہ ابن تیمیہ کا توسع مسئلہ مجوثہ پر غالباً اس اصل کے توسع کے باعث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''شرط الواقف کنص الشارع'' اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں نکلتا کہ واقف کے منشاء کے مطابق عمل وجوبی ہے، بلکہ یہ اصل وقف کی مراد پر دلالت کرنے میں مثل نص کے ہے۔

''ومن قال من الفقهاء إن شروط الواقف نصوص کألفاظ الشارع فمراده أنها کالنصوص فی الدلالة علی مراد الواقف لا فی وجوب العمل بها'' (فتاوی ابن تیمیه ۳۱،۴۷)۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''البحر الرائق'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ''وإنما الکلام الآن من شروط الواقفین فقد أفادوا هنا أنه

---

[1] شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم مئو۔

ليس كل شرط يجب اتباعه فقالوا هنا إن اشتراطه أن لا يعزله القاضي شرط باطل مخالف للشرع وبهذا علم أن قولهم شرط الواقف كنص الشارع ليس على عمومه'' (۵،۴۴۳)۔

نیز عالم اسلام کے ایک متبحر عالم قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب اطال اللہ عمرہ نے بحث ونظر کے ایک شمارہ میں بڑی تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد فیصلہ دیا ہے کہ ''موجودہ صورت حال یہ ہے کہ قدیم، مردہ اور غیر آباد قبرستانوں کو اگر لیز پر لگا دیا جائے تو ہزار ہا قبرستان جو ابھی آباد ہیں اور ان کا تحفظ خطرہ میں ہے ایسے قبرستانوں کے تحفظ کی صورت نکالی جا سکتی ہے، لہٰذا میرے نزدیک شرع اسلام کی رو سے ایسے مردہ اور قدیم قبرستانوں کی تعمیرات یا کاشت کے لئے لیز پر دیا جا سکتا ہے، اور اس طرح کی آمدنی کو اولاً دیگر مقابر کے تحفظ، یا ایسے شہروں اور آبادیوں کے لئے قبرستان کی اراضی حاصل کرنے پر خرچ کرنا چاہئے جہاں قبرستان کی ضرورت ہے، اگر اس طرح کے مدات پر خرچ کے بعد رقم بچ جائے تو اسے مدارس، مسافر خانوں، نادار بچوں کی تعلیم اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ کیا جا سکتا ہے (بحث ونظر ۱۰۵/۵، شمارہ ۲۱)۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف غیر مسجد کا بصورت تعطل استبدال باذن قاضی جائز ہے، مفتی موصوف نے شامی کی یہ عبارت استدلالاً پیش کی ہے:

''والثاني أن لا يشترطه سواء عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية، بأن لا يحصل منه شئ أصلا أو لا يفي بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه'' (احسن الفتاوی ۶،۴۶۱)۔

حنبلی مسلک کے ایک بڑے عالم منصور بن یوسف البہوتی اپنی کتاب (شرح الاقناع موسوم کشاف القناع صفحہ ۲۹۴) پر لکھتے ہیں:

''فإن تعذر الإنفاق من الموقوف عليه لعجزه أو غلبته أو نحوهما بيع الوقف وصرف ثمنه في عين أخرى تكون وقفا لمحل الضرورة''۔

اس کی تائید ''فتاوی ابن تیمیہ'' (۲۲۶/۳۱) کے فتوی سے بھی ہوتی ہے: ''قال في ترغيب القاصد: ... الخامس إذا تعطل الوقف فله أحوال الثانية أن يبقى منه بقيته متمولة كالشجرة إذا عطبت والفرس إذا أعجف والمسجد إذا خرب فإن ذلك يباع ويصرفه في تحصيله''۔

ابوالفرج ابن قدامہ مقدسی کی رائے بھی پیش خدمت ہے: ''وجملة ذلك أن الوقف إذا خرب وتعطلت منافعه كدار انهدمت أو أرض خربت وعادت مواتا... جاز بيع بعضه لتعمر به بقيته، وإن لم يمكن الانتفاع بشئ منه بيع جميعه'' (مغنی ابن قدامہ ۶،۲۲۵)۔

مساجد وغیر مساجد کے اوقاف میں فرق ہے جیسا کہ (امداد الفتاوی ۵۹۲/۲) پر حضرت تھانوی نے درمختار وشامی وغیرہ کی عبارتوں کو نقل فرمانے کے بعد لکھا ہے کہ وقف مسجد میں سے صرف انہیں مصارف میں صرف کرنا جائز ہے جن کو مسجد کی آبادی میں دخل ہے، نیز صفحہ مذکورہ کے حاشیہ پر حضرت نے لکھا ہے کہ ''دو سال ہوئے کہ (المشیر جلد ۲ نمبر ۲۶ صفحہ ۱۰ کالم ۲) مورخہ ۱۱ر جولائی ۱۹۱۲ء میں میرا ایک لکھا ہوا جواب اس کے خلاف چھپ گیا سو وہ میری غلطی تھی، صحیح جواب یہ ہے کہ وقف مسجد میں سے مدرسہ میں صرف نہیں ہو سکتا۔ نیز (احسن الفتاوی ج ۶) کتاب الوقف میں کئی ایک استفتاء کے جوابات سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ دونوں کی حیثیت جداگانہ ہے۔

الف۔ اگر وہ موقوفہ علی المسجد زمین زائد از ضرورت ہے تو اس پر مدرسہ یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم نہیں کیا جا سکتا، اس کی تائید ''احسن الفتاوی'' کے ایک سوال وجواب سے ہوتی ہے: ''اگر کسی نے یہ وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرا مکان مسجد میں دیدینا الخ...... اب لوگوں نے یہ کہکر کہ مسجدیں تو دو ہیں اس پر مدرسہ بنوا دیا تو کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟ تو حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے جواب دیا کہ وصیت کے مطابق مسجد ہی میں صرف کرنا ضروری ہے، مدرسہ بنانا جائز نہیں (احسن الفتاوی ۴۲۱/۶)۔

ب۔ مسجد کی آمدنی زائد از ضرورت ہوتے ہوئے بھی درج ذیل عبارت کی روشنی میں کسی ملی ورفاہی کاموں پر حتی کہ دوسری مسجد میں بھی صرف نہیں کی جا سکتی:

''ولو لم يتفرق الناس ولكن استغنى الحوض عن العمارة وهناك مسجد محتاج إلى العمارة، وعلى العكس هل يجوز للقاضي صرف وقف ما استغنى عن العمارة إلى عمارة ما هو محتاج إلى العمارة، قال: لا، كذا في المحيط'' (عالمگیری ۲،۱۰۴۲)۔

لیکن چونکہ فی زمانہ زائد از ضرورت پیسوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ قوی ہے جیسا کہ قیم اور منتظمین کی دیانت کے فقدان پر علامہ شامی اور دیگر محققین علماء اور صاحب افتاء نے قائم کیا ہے، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ قاضی یا اس کے نہ ہونے کی صورت میں باتفاق جماعت مسلمین سارے پیسوں کو اقرب فالاقرب کا اعتبار کرتے ہوئے اسی طرح کے دیگر مصارف پر جن میں احتیاج ہو خرچ کیا جاسکتا ہے۔

الف۔ جی ہاں، اسی طرح کے اوقاف کی ضروریات میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

''الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء؟ قيل لا يصرف وإنه صحيح، ولكن يشترى به مستغل للمسجد'' (محیط ۳،۲۲۱)، ''أرض وقف على مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضا للعامة لا يجوز للمسلمين انتفاع بماء ذلك الحوض'' (القنية ۳،۲۲۱)۔

ب۔ اس کا جواب بین النفی والاثبات ہے، یعنی مسجد کی زائد آمدنی تو مسجد ہی میں خرچ ہوگی لیکن مسجد کے علاوہ کی زائد از ضرورت آمدنی مسجد میں بھی اور دیگر ملی و رفاہی اداروں، مدرسوں و نادار فقراء و یتامیٰ پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

قاضی خاں، نسفی وخلاصہ میں عدم جواز ہے: ''وفي الخلاصة وفي فتاوى النسفي عقار المسجد لمصلحة المسجد لايجوز أن يباع وإن كان بأمر القاضي وإن كان خرابا'' (البحر الرائق ۵،۲۰۶)۔

جب کہ شمس الائمہ حلوانی نے جواز کا فتوی دیا ہے نیز بعضوں نے مثلاً امام ظہیر الدینؒ نے جواز کا فتوی دیکر رجوع فرمالیا ہے، مشائخ میں سے بعض لوگ جواز کا فتوی اس وقت دیتے ہیں جب کہ شئ موقوفہ سے انتفاع بالکل ختم ہوجائے بعض کے نزدیک منفعت من کل الوجوہ معطل ہوجائے یا منفعت کم ہوجائے، بہر دو نوع استبدال جائز ہے۔ حضرت امام محمدؒ سے روایات دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ منفعت کی کمی کی صورت میں متولی کو اس بیع کا اختیار ہے، لیکن تمام یا تعطل کی صورت میں خود قاضی کو اختیار ہے، صاحب قنیہ نے بھی جواز ہی کا فتوی دیا ہے:

''وفي القنية مبادلة دار الوقف بدار أخرى إنما يجوز إذا كانتا في محلة واحدة أو تكون المحلة المملوكة خيرا من المحلة الموقوفة، وفي شرح منظومة ابن وهبان لو شرط الواقف أن لا يستبدل هل يجوز استبداله؟ قال الطرطوسي: إنه لا نقل فيه ومقتضى قواعد المذهب ان للقاضي أن يستبدل إذا رأى المصلحة في الاستبدال'' (البحر الرائق ۵،۲۲۲)۔

(میرے خیال میں فقدان قضا کی صورت میں اتفاق جماعت مسلمین ضروری ہوگا)۔

بہر کیف صورت مسئولہ میں ازدیاد منفعت کی خاطر اوقاف کو فروخت کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ ائمہ کی عبارات مؤید ہیں:

''وقد روى عن محمد إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستغلال والقيم يجد بثمنها أخرى أكثر ريعا كان له أن يبيعها ويشترى بثمنها ما هو أكثر ريعا'' (البحر الرائق ۵،۲۰۶)۔

حضرت امام محمدؒ سے روایت کی گئی ہے کہ جب موقوفہ زمین میں پیداوار زیادہ نہ ہو اور متولی کو ایسی زمین مل رہی ہو جو زیادہ پیداوار والی ہے تو اسے چاہئے کہ اسے فروخت کرکے دوسری زائد پیداوار والی زمین خرید لے۔

''وفي المنتقى قال هشام: سمعت محمدا يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشترى بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضي'' (البحر الرائق ۵،۲۰۷)۔

نیز حضرت امام ابو یوسفؒ نے تو بدون کسی شرط کے استبدال کا فتوی دیا ہے: ''ما في الخلاصة وفي شرح الوقاية: أن أبا يوسف

یجوز الاستبدال فی الوقف من غیر شرط إذا ضعفت الأرض من الریع'' (البحر ۵،۲۰۷)۔

لفظ ضعفت الارض سے معلوم ہوا کہ بتمامہا تعطل کے بغیر بھی اس کو بیچنا صحیح ہے، اس کے قبل بھی ایک دوسرے سوال کے ضمن میں شمس الائمہ حلوانی کا فتوی نقل کیا جا چکا ہے، ''البحر الرائق'' کی عبارت ''وقد شاهدنا فی الاستبدال من الفساد ما لا یعد ولا یحصی الخ'' اور دیگر کتب فقہیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر قیم (متولی) دیندار ہوں تو ایسا کرنا درست ہے ورنہ نہیں، کیونکہ اس رقم کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

مدرسہ ومسجد یا کسی خاندان کے افراد کے ختم ہو جانے کی صورت میں اس کی آمدنی اسی طرح کے مصارف میں خرچ ہوگی اس کے دلائل دوسرے جوابات کے ضمن میں گذر چکے ہیں۔

الف۔ میرے خیال میں بلڈر سے اگر معاملہ یوں کر لیا جائے کہ تم تعمیر کروا دو اور اس میں سے اتنے حجرے یا اتنی دوکانیں تم بطور کرایہ لے لو، جب تمہاری تعمیری رقم پوری ہو جائے گی تو پھر تمہارا اس تعمیر سے کوئی سروکار نہ ہوگا، لیکن شاید بلڈر اس پر راضی نہ ہو، اس لئے دوسری صورت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ پہلے معاہدہ کر کے اس کو وقف سے الگ کر کے جگہ دیدی جائے اور یہ جگہ نہ تو اوپر ہو نہ نیچے بلکہ سائڈ میں ممیز اُو مفرغاً ہو تا کہ آئندہ کے لئے کسی طرح خدشہ نہ رہے۔

ب۔ گو کہ اس کا جواب من وجہٍ کئی ایک جوابات کے ضمن میں آچکا ہے پھر بھی ثانیاً عرض ہے کہ اگر ان کی حفاظت کا کوئی بظاہر ذریعہ نہ ہو، مثلاً چندہ وغیرہ نہ مل سکتا ہو تو ان اوقاف کا کچھ حصہ فروخت کر کے اس کی تعمیر حفاظت کی غرض سے واقف کے منشاء کے مطابق کرائی جا سکتی ہے۔

بندہ کے خیال میں زائد از ضرورت قبرستان ومسجد کی وقف شدہ زمین پر مدرسہ کی تعمیر باتفاق جماعت مسلمین اس شرط کے ساتھ ہو سکتی ہے کہ وہ تابیدانہ ہو، مسجد وقبرستان کو جب ضرورت ہوگی انخلاء ضروری ہوگا (فتاوی ظہیریہ، شامی ۳؍۵۳۰، بحر الرائق ۲۱۶/۵، عمدۃ القاری ۱۷۹/۴ نیز امداد الفتاوی ۵۷۹/۲، احسن الفتاوی ۴۱۴/۶)، مشروط کا وجود تو مذکورہ فتاوی کی کتب میں ہے لیکن شرط کی قید احقر نے احتیاطاً لگا دی ہے۔

ایسے قبرستان جن پر حکومتی سطح پر رکاوٹیں ہو رہی ہوں تو ان پر اس صورت میں اولاً مسجد یا کوئی دینی ادارہ قائم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ یقین ہو جائے کہ موتی کے اجزاء مٹی ہو چکے ہیں۔

''وفی الشامیة عن الزیلعی ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره وزرعه والبناء علیه الخ ومقتضاه جواز المشی فوقه'' (رد المحتار ۱،۸۳۵)۔

اگر میت بوسیدہ ہو کر مٹی ہو جائے تو اس قبر میں دوسرے کو دفن کرنا جائز ہے حتی کہ اس کو بطور کھیتی استعمال کرنا اور اس پر تعمیر کرنا بھی جائز ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ جب اتنی گنجائش ہے تو اس پر چلنا تو بدرجۂ اولی جائز ہوگا۔ شامیہ کی مذکورہ عبارت اس جواز کی دلیل تھی۔

محکمہ آثار قدیمہ کے تحت آجانے کے بعد بھی حکومت کو قطعاً اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھنے پر پابندی لگا دے، یہ عمل واقف کی مرضی کے صریحاً مخالف ہے، اگر خود واقف چاہتا کہ اس میں نماز پڑھنے پر پابندی لگا دے تو بھی اسے کوئی حق نہ تھا چہ جائیکہ قاضی یا حکومت وقت، بہر حال یہ ممانعت غیر شرعی ہے، اس طرح کی مساجد کو واگذار کرانے کے لئے محکمہ اوقاف سے مطالبہ کرنا اور اس کی بھرپور کوشش کرنا چاہئے پھر بھی اگر ناکامی ہو تو دلی طور سے حکومت کے اس رویہ پر نفرت کرے اور کوشش وسعی جاری رکھے۔

ہاں فتاوی وکتب فقہیہ سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے اور اس کا حکم اس جزئیہ پر قیاس کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

''أن یبنی فیها بیوتا فیواجرها؛ لأن الاستغلال بهذا الوجه یکون أنفع للفقراء'' (البحر الرائق ۵،۲۱۶)۔

دوسری دلیل: ''وبنی خانا واحتاج إلی المرمة روی عن محمد أنه یعزل منه بیت أو بیتان فتواجر وینفق من غلتها علیه وعنه روایة أخری إجارة الکل سنة ویسترم منها قال الناطفی قیاسه فی المسجد أن یجوز إجارة سطحه لمرمته کذا فی الظهیریة'' (البحر ۵،۲۱۶، بنایہ ۲،۹۹۹) میں بھی یہی مرقوم ہے۔

نیز ایک اور جزئیہ ہے جس پر مسجد کی زائد از ضرورت زمین پر راستہ بنانے کی گنجائش نکلتی ہے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے ایسی زمین پر ملی یا رفاہی ادارے بھی قائم کئے جا سکتے ہیں۔

''نقل عن العتابية عن خواهر زاده إذا كان الطريق ضيقا والمسجد واسعا لا يحتاجون إلى بعضه تجوز الزيادة فی الطريق من المسجد؛ لأن كلها للعامة'' (رد المحتار ۳،۵۳۰، البحر الرائق ۵،۲۲۰)۔

''درمختار'' کی کتاب الوقف کی عبارت ''وإذا جعل تحته سردا بالمصالح جاز الخ'' کے تحت حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ ''اصل توجیہ ضرورت ہے، چنانچہ ''ہدایہ'' میں صاحبین سے بغداد اور رے میں داخل ہونے کے وقت اجازت کی ایک روایت اس کی شاہد ہے (امداد الفتاوی ۲ر ۶۸۳)، چنانچہ جب مسجد کی زمین کو مصالح کے تحت رفاہ عامہ میں استعمال کیا جاسکتا ہے تو قبرستان کی حفاظت کے لئے اس کی باؤنڈری کی تعمیر کی غرض سے کچھ زمین کے نکل جانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی کا ایک استفتاء ہے جس میں انہوں نے معطل قبرستان میں انجمن اسلام کی تعمیر کی اجازت دی ہے اور علت یہ بیان کی کہ دونوں میں اشتراک علت ہے اس لئے انجمن کا مکان وقفی نفع عام کے لئے اس مقبرہ کی جگہ بنانا درست ہے (البحر الرائق ۵ر ۲۲۰)، پر بھی ایک جزئیہ سے اس کی تائید ہوتی ہے: ''قال فی الهداية: وإن تعذر إعادة عينه إلى موضعه بيع وصرف ثمنه إلى المرمة صرفا للبدل إلى مصرف المبدل''۔

قبرستان میں مسجد کی توسیع اس وقت کی جاسکتی ہے، جبکہ یہ یقین ہوجائے کہ موتیٰ کے اجزاء مٹی ہوچکے ہیں، عینی شرح بخاری میں ہے: ''قال ابن القاسم لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت، فبنى فيها مسجدا لم أر بذلك بأسا'' (عمدة القاری ۴،۱۷۹)۔

اس سے پہلے شامی کی عبارت گزر چکی ہے کہ ''ولو بلي الميت وصار ترابا الخ'' ایسی قبر پر تعمیر اور کاشت تک ہوسکتی ہے تو پھر مسجد کی توسیع کیوں نہیں جائز ہوگی، بندہ کے خیال میں اگر قبرستان وسیع وکشادہ ہو تو اس کی اجازت دینی چاہئے ورنہ عدم جواز میں احتیاط ہے۔

غیر مسلم متولی بن سکتا ہے کیونکہ تولیت کی شرطوں میں سے بلوغ وعقل ہے نہ کہ آزاد و مسلمان ہونا ''ويشترط للصحة بلوغه وعقله لا حريته وإسلامه لما في الإسعاف'' (رد المحتار ۳،۵۲۲)، ہاں اگر خیانت کا ثبوت ہورہا ہے تو قاضی اسے معزول کردے گا ''لا يملك القاضی نصب متول آخر بلا سبب موجب لذلك وهو ظهور خيانة الأول أو شئ آخر'' (شامی ۳،۵۲۴)۔

حضرت قاضی القضاۃ مولانا مجاہد الاسلام صاحب (مدظلہ واطال اللہ عمرہ) نے اپنی کتاب (اسلامی عدالت) میں اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، بہرحال قاضی اگر مصلحت سمجھے تو بغیر خیانت کے بھی متولی کو معزول کرسکتا ہے۔ ''وذكر في البحر كلاما عن الخانية، ثم قال عقبه: وفيه دليل على أن للقاضی عزل منصوب قاض آخر بغير خيانة إذا رأى المصلحة'' (شامی ۳،۵۲۴)۔

لیکن سوال یہ ہے کہ عزل تو اسی وقت ہوگا جب کہ قوت قاہرہ ہو اور یہاں موجودہ ہندوستان میں اس کا فقدان ہے تو اب کیا کیا جائے، بندہ کے خیال میں تین صورتیں سمجھ میں آتی ہیں: (۱) حکومت کو مجبور کیا جائے کہ ان اوقاف کو ''مسلم وقف بورڈ'' کے تحت کردیا جائے۔ (۲) اسے اگر وہ تسلیم نہ کرے تو اس پر زور دیا جائے کہ ''اہل معرفت واصحاب رائے کمیٹی'' کو عزل ونصب کا اختیار دیدے۔ (۳) ہندوستانی عدلیہ کے سامنے ان متولیان کی خیانت ثابت کر کے ان کو معزول ومعطل کرایا جائے۔

☆☆☆

قاضی کی عدم موجودگی میں استبدال وقف کا مسئلہ

مفتی جمیل احمد نذیری[1]

الف، ب۔ ناقابل انتفاع اوقاف کو فروخت کرکے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے، متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کرکے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کرکے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔

''رد المحتار'' میں ہے: ''والثانی أن لا یشرطہ سواء شرط عدمہ أو سکت لکن صار بحیث لا ینتفع بہ بالکلیۃ، بأن لا یحصل منہ شئ أصلاً أولا یفی بمؤنتہ فھو أیضاً جائز علی الأصح إذا کان بإذن القاضی ورأیہ المصلحۃ فیہ'' (رد المحتار ۳، ۴۲۴)۔

استبدال کی دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے استبدال کی شرط نہ لگائی ہو، خواہ استبدال نہ کرنے کی شرط لگائی ہو یا اس سے سکوت اختیار کیا ہو، لیکن موقوفہ جائداد بالکلیہ قابل انتفاع نہ ہو اور اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا ہو، یا اس سے اس کا خرچ نہ پورا ہوتا ہو، اس صورت میں بھی اصح مذہب کے مطابق استبدال جائز ہے اگر قاضی کی اجازت سے ہو اور وہ اس میں مصلحت سمجھے۔

موجودہ زمانہ میں جب کہ قاضی موجود نہیں ہیں، اکثر علاقوں کا حال یہی ہے، لہذا عوام بمنزلہ قاضی قرار پائیں گے (امداد الفتاوی ۲/ ۶۱۵)، مساجد و مدارس اور اداروں کی کمیٹیاں عوام کی نمائندہ مانی جاتی ہیں، لہذا سارے عوام کو اکٹھا کرنے کے بجائے ان کمیٹیوں کا غور وخوض اور فیصلہ عوام کے فیصلے کے درجہ میں ہوگا۔

''البحر الرائق'' میں ہے: ''والمعتمد أنہ بلا شرط یجوز للقاضی بشرط أن یخرج عن الانتفاع بالکلیۃ وأن لا یکون ھناک ریع للوقف یعمر بہ وأن لا یکون البیع بغبن فاحش وشرط فی الإسعاف أن یکون المستبدل قاضی الجنۃ المفسر بذی العلم والعمل کیلا یحصل التطرق إلی إبطال أوقاف المسلمین کما ھو الغالب فی زماننا الخ... ویجب أن یزاد آخر فی زماننا وھو أن یستبدل بعقار لا بالدراھم والدنانیر، فإنا قد شاھدنا النظار یأکلونھا وقل: أن یشتری بھا بدل ولم نر أحداً من القضاۃ یفتش علی ذلک مع کثرۃ الاستبدال فی زماننا مع أنی نبھت بعض القضاۃ علی ذلک وھم بالتفتیش ثم ترک'' (البحر الرائق ۵، ۲۲۲)۔

معتمد یہ ہے کہ واقف نے استبدال کی شرط نہ لگائی ہو تو بھی قاضی کے لئے استبدال جائز ہے، بشرطیکہ جائداد موقوفہ انتفاع سے بالکلیہ نکل گئی ہو اور وہاں پر وقف کی کوئی ایسی آمدنی نہیں جس سے اسے آباد و تعمیر کیا جاسکے، اور بیع غبن فاحش کے ساتھ نہ ہو، اور اسعاف میں شرط لگائی ہے کہ استبدال کرنے والا قاضی جنت ہو، یعنی ایسا قاضی جو صاحب علم بھی ہو اور صاحب عمل بھی، تاکہ اوقاف مسلمین کے ضیاع و ابطال کا راستہ نہ کھل جائے، جیسا کہ یہی ہمارے زمانہ میں غالب ہے، اور ہمارے زمانہ میں ایک مزید شرط کا اضافہ ضروری ہے وہ یہ کہ استبدال، جائداد غیر منقولہ سے ہو دراہم و دنانیر سے نہ ہو، اس لئے کہ ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ متولی حضرات نقد پیسے کھا جاتے ہیں اور بہت کم اس کے ذریعہ متبادل خریدا جاتا ہے، اور ہم نے کسی قاضی کو نہیں دیکھا کہ وہ اس کی تفتیش کرے، جبکہ ہمارے زمانہ میں بکثرت استبدال ہو رہا ہے، حالانکہ میں نے بعض قاضیوں کو اس پر آگاہ کیا، انہوں نے تفتیش کا ارادہ کیا، پھر ترک کر دیا۔

''النہر'' کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اگر پورا اطمینان ہو کہ دراہم و دنانیر ضائع نہیں ہوں گے اور ان کے عوض دوسری زمین خرید لی جائے گی تو دراہم و دنانیر

---

[1] جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

سے بھی استبدال جائز ہے (درمختار ۳، ۴۲۵)۔

''وأجاز بعضهم الاستبدال به نقوداً ما دام المستبدل قاضي الجنة'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۸،۲۲۲)۔

بعض فقہاء نے نقود کے ذریعہ استبدال کی اجازت دی ہے، جبکہ استبدال کرنے والا قاضی جنت ہو۔

استبدال کے جواز کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ: ''أن لا يبيعه ممن لا تقبل شهادته له ولا ممن له عليه دين'' (رد المحتار ۳،۴۲۵)۔

ایسے شخص کو فروخت نہ کرے جس کی گواہی اس کے حق میں قبول نہ ہو اور نہ ایسے شخص کو فروخت کرے جس پر اس کا قرض ہو۔

مزید یہ کہ جس علاقہ کی زمین بدلے میں لی جارہی ہے وہ علاقہ پہلے علاقہ سے بہتر مانا جاتا ہو (ایضا)۔

البتہ مساجد کا معاملہ دوسرے اوقاف سے جدا ہے، اگر کسی مسجد کا وہی حال ہو جو سوال میں درج ہے، تو بھی اس کی بیع وشراء جائز نہیں، اس کا متبادل قائم کرنے کی گنجائش نہیں، مسجد ابدالآباد کے لئے مسجد ہوتی ہے، محض احاطہ بندی وباؤنڈری ہی کرا کے اسے محفوظ رکھا جائے، مگر محفوظ رکھنا بہرحال ضروری ہے، ''فتح القدیر'' میں ہے: ''(قوله ولو خرب ماحول المسجد واستغنى عنه) أى استغنى عن الصلوٰة فيه أهل تلك المحلة أو القرية، بأن كان في قرية فخربت وحولت مزارع يبقى مسجداً على حاله عند أبي يوسف، وهو قول أبي حنيفة و مالك والشافعي'' (فتح القدیر ۵،۴۴۶)۔

اگر مسجد کے آس پاس کا علاقہ ویران ہوجائے اور اس محلہ یا بستی کے لوگ اس مسجد میں نماز پڑھنے سے بے نیاز ہوجائیں، مثلاً مسجد جس بستی میں تھی وہ ویران ہوگئی اور کھیت بن گئی تو بھی مسجد علی حالہ مسجد باقی رہے گی، یہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے، اور یہی قول امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی ہے۔

''درمختار'' میں ہے: ''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام، والثانى أبداً إلى قيام الساعة، وبه يفتى'' (درمختار ۳،۴۰۶)۔

اگر مسجد کے اردگرد کا حصہ ویران ہوجائے تو بھی امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قیامت تک مسجد رہے گی اور اسی پر فتوی ہے۔

ویران، ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کرنے کے بعد ان کا متبادل اسی طور پر قائم کیا جائے جس سے واقف کا مقصد حاصل ہو، واقف کے منشاء ومقصد کی خلاف ورزی شرعاً جائز نہ ہوگی۔

''اشباہ'' میں ہے: ''شرط الواقف يجب اتباعه لقولهم شرط الواقف كنص الشارع أى في وجوب العمل به وفي المفهوم والدلالة'' (غمز عيون البصائر شرح الاشباه والنظائر ۲،۲۲۸)۔

واقف کی شرط واجب الاتباع ہے، فقہاء کا قول ہے کہ واقف کی شرط نصِ شارع کی طرح ہے، یعنی مفہوم اور دلالت میں اور عمل کے واجب ہونے میں نصِ شارع کی طرح ہے۔

''ردالمحتار'' میں ہے: ''(قوله أى في المفهوم والدلالة الخ) كذا عبر في الأشباه والذى في البحر عن العلامة قاسم في الفهم والدلالة وهو المناسب؛ لأن المفهوم عندنا غير معتبر في النصوص'' (ردالمحتار ۳،۴۵۶)۔

(اشباہ میں بھی مفہوم اور دلالت کے ہی الفاظ ہیں، لیکن ''البحر الرائق'' میں علامہ قاسمؒ سے فہم اور دلالت کے الفاظ منقول ہیں، یہی الفاظ مناسب ہیں کیونکہ مفہوم ہمارے نزدیک نصوص میں معتبر نہیں)۔

الف، ب۔ مسجد کو زیادہ آباد کرنے کے لئے مسجد سے متعلق مدرسہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

''فتاوی رحیمیہ'' میں ہے: ''مسجد کی زائد رقم قریب کی حاجتمند مسجد میں اور مدرسہ کی زائد رقم نزدیک کے ضرورتمند مدرسہ میں استعمال کی جائے، اور مسجد کی آبادی میں اضافہ مقصود ہو تو زائد رقم سے مسجد سے متعلق مدرسہ بھی کھول سکتے ہیں (فتاوی رحیمیہ ۲/۱۸۷)۔

اگر مدرسہ کی رقم زیادہ ہو تو اس مدرسہ کو ترقی دی جائے، اس سے لامحالہ اس کے مصارف بڑھ جائیں گے اور زائد رقم کا مصرف نکل آئے گا۔

اسی طرح کا ایک فتوی ''فتاوی محمودیہ'' میں بھی ہے، مفتی محمود حسن صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اگر مسجد کی آمدنی کا روپیہ زیادہ، صرف کم، اور اتنا روپیہ ہروقت موجود رہتا ہے کہ ضرورتِ شکست وریخت وغیرہ بسہولت پوری ہو سکے، اور روپیہ جمع رہنے میں خیانت کا قوی اندیشہ ہوتو اس روپے سے مسجد کے لئے جائداد، دوکانیں، زمین وغیرہ خرید لی جائیں۔ اگر اس میں دشواری ہو اور یا روپیہ جائداد خریدنے کے بعد بھی زائد بچ رہے تو پھر اسی مسجد میں دینی مدرسہ قائم کرلیا جائے تاکہ مسجد کی آبادی میں ترقی ہو، کیونکہ آبادی کو ترقی دینا مسجد کی بڑی مصلحت ہے (فتاوی محمودیہ ۱/ ۵۰۹)۔

یہ سوال اور استبدال وقف کا سوال تقریباً ایک ہی جیسا ہے، پھر بھی یہ مسئلہ ذرا تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

''درمختار'' میں ہے: ''حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه'' (درمختار ۴۰۷،۳)۔

مسجد کی گھاس پھوس، لکڑیاں وچٹائیاں وغیرہ اگر ان کی ضرورت نہ ہو، ایسے ہی رباط، کنواں وغیرہ، جب کہ ان سے منتفع نہ ہوا جائے، پس مسجد، رباط، کنویں اور حوض کے اوقاف، قریبی مسجد، رباط، کنویں اور حوض پر خرچ کئے جائیں گے۔

''ردالمحتار'' میں ہے: ''(قوله إلى أقرب مسجد أو رباط الخ) لف و نشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض، وعكسه، وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار على الدر المختار ۴۰۷،۳)۔

(مسجد ورباط وغیرہ کا تذکرہ لف ونشر مرتب کے طور پر ہے، اس کا ظاہر یہ ہے کہ ویران مسجد کا وقف، حوض پر، اور ویران حوض کا وقف مسجد پر صرف کرنا جائز نہیں ہے، اور شرح الملتقی میں کہ ان کے اقرب مشابہ میں صرف کیا جاسکتا ہے)۔

قریبی مشابہ میں عیدگاہ کی ضرورت نہ رہنے پر، عیدگاہ کو مسجد بنانے کا فتوی، ''فتاوی رحیمیہ'' (۸۲/۶) پر موجود ہے۔

''نظام الفتاوی'' جلد دوم مطبوعہ دیوبند ص ۱۹۱ تا ۱۹۳ بعنوان ''ٹونک کے ایک وقف کا شرعی حکم'' میں مسجد کی زائد آمدنی کو، جس کے ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہو، مسلم ذمہ داروں کے مشورہ سے دوسرے اہم کار خیر میں خرچ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند کے ہی ایک فتوی کی نقل احقر کے پاس موجود ہے جس میں ایک غیر مستعمل عیدگاہ کو مسجد بنانے یا دینی تعلیم کے لئے دینی مدرسہ قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اور وجہ یہ لکھی ہے کہ: ''ان دونوں صورتوں میں واقف کا منشاء تقرب الی اللہ اور حصول ثواب بذریعہ اکمل حاصل ہوگا، لہذا یہ دونوں عمل منشاء واقف کے خلاف نہ ہو کر جائز رہے گا۔

''امداد الفتاوی'' (۵۷۹/۲) پر ایک سوال وجواب بعنوان ''بنا نمودن مکان انجمن درقبرستان معطل'' یوں موجود ہے:

سوال نمبر (۷۰۲) ایک قبرستان عرصہ پچیس سال سے ویران پڑا ہے اور اس میں موتی بھی دفن نہیں کئے جاتے، اب اس میں ایک مکان ''انجمن اسلام'' بنانا چاہتے ہیں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: عینی شرح بخاری میں ہے: ''قال ابن القاسم: لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجداً لم أر بذلك بأسا وذلك لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لايجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد، لأن المسجد أيضاً وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد''۔

جواب مذکور سے بعلت اشتراک علت معلوم ہوا کہ انجمن کا مکان وفی نفع عام کے لئے اس مقبرہ کی جگہ بنانا جائز ہے۔

عینی کی مذکورہ عبارت سے علتِ مشترکہ ''وقف ہونا'' معلوم ہوا، اس سے پتہ چلا کہ استبدال وقف اور اوقاف کی زائد آمدنی کے صرف کے سلسلہ میں اہم دوسری چیز کا نفع مسلمین کے لئے وقف ہونا بھی کافی ہوگا۔

''امداد الفتاوی'' کے مذکورہ سوال وجواب کو مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بھی اپنی کتاب ''موجودہ زمانہ کے مسائل کا

شرعی حل'' میں نقل کیا ہے، اور اس کا عنوان قائم کیا ہے:

''قبرستان کی موقوفہ زمین پر مسجد یا نفعِ عام کے لئے عمارت بنانا۔

اگر واقف نے وقف نامہ میں اس کی اجازت دی ہو تو جواز میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اگر اجازت نہ دی ہو تو اس صورت میں اس کا جواز مختلف فیہ ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے عدم استبدال کو اصح اور مختار قرار دیا ہے:

''والثالث أن لا يشرطه أيضاً، ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعاً ونفعاً وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار'' (ردالمحتار ۳،۴۲۴)۔

استبدال کی تیسری صورت یہ ہے کہ واقف نے شرط نہیں لگائی، لیکن استبدال میں فی الجملہ نفع ہے اور اس کا بدل اس سے آمدنی اور نفع میں بہتر ہے، یہ استبدال اصح اور مختار مذہب کے مطابق جائز نہیں۔

علامہ شامی، علامہ حصکفیؒ کی درج ذیل عبارت ''لا يجوز استبدال العامر إلا في أربع'' کے تحت لکھتے ہیں:

''الأولى لو شرطه الواقف، الثانية إذا غصبه غاصب و أجرى عليه الماء حتى صار بحراً فيضمن القيمة و يشترى المتولى بها أرضاً بدلا، الثالثة أن يجحده الغاصب ولا بينة أى وأراد دفع القيمة فللمتولى أخذها ويشترى بها بدلا، الرابعة أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن صقعاً، فيجوز على قول أبي يوسف و عليه الفتوى كما في فتاوى قارى الهداية'' (ردالمحتار ۳،۴۲۶)۔

(پہلی صورت یہ ہے کہ واقف نے خود شرط لگائی تھی، دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غاصب نے اسے غصب کر کے اس پر پانی چلا دیا اور وہ دریا بن گیا، لہٰذا غاصب قیمت کا ضامن ہوگا اور متولی اس سے اس کے بدلے میں کوئی زمین خریدے گا، تیسری صورت یہ ہے کہ غاصب غصب کا انکار کرے اور گواہ بھی نہ ہوں، لیکن غاصب قیمت دینا چاہے، لہٰذا اس صورت میں بھی متولی قیمت سے زمین خریدے گا، چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقف میں ایسے بدل کے ذریعہ رغبت رکھے جس کا ماحصل بھی زیادہ ہو اور علاقہ وخطہ بھی پہلے سے اچھا ہو، لہٰذا ایسی صورت میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر استبدال جائز ہے اور اسی پر فتوی ہے، جیسا کہ فتاوی قاری الہدایہ میں ہے)۔

امام ابن ہمام لکھتے ہیں: ''والحاصل أن الاستبدال إما عن شرطه الاستبدال وهو مسئلة الكتاب أو لا عن شرطه، فإن كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف عليهم، فينبغى أن لا يختلف فيه كالصورتين المذكورتين لقاضى خان، وإن كان لا لذلك بل اتفق انه أمكن أن يؤخذ بثمن الوقف ما هو خير منه مع كونه منتفعاً به، فينبغى أن لا يجوز؛ لأن الواجب إبقاء الوقف على ماكان عليه دون زيادة أخرى، ولأنه لاموجب لتجويزه لأن الموجب فى الأول الشرط وفى الثانى الضرورة ولا ضرورة فى هذا إذ لا تجب الزيادة فيه بل تبقيه كما كان'' (فتح القدير ۵،۴۴۰)۔

(خلاصہ یہ ہے کہ استبدال یا تو واقف کے استبدال کی شرط لگانے کی وجہ سے ہوگا، یہی مسئلہ ہدایہ میں مذکور ہے، یا پھر اس کی شرط کے بغیر ہوگا، پس اگر واقف موقوف علیہم کے انتفاع سے نکل چکا ہو تو مناسب یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہ کیا جائے جیسے وہ دو صورتیں جو فتاوی قاضی خاں میں ذکر ہوئیں، لیکن اگر ایسا نہ ہو بلکہ ایسا اتفاق پڑا ہو کہ وقف کے ثمن سے وقف سے بہتر جائداد لی جا سکتی ہو، جب کہ وقف بھی قابل انتفاع ہو تو مناسب یہ ہے کہ یہ صورت جائز نہ ہو اس لئے کہ واجب وقف کا علی حالہ باقی رکھنا ہے، جائز قرار دینے کا موجب نہیں اس لئے کہ پہلی صورت میں موجب شرط واقف تھی، دوسری صورت میں ضرورت تھی، اس تیسری صورت میں ضروری بھی نہیں کیوں کہ وقف میں زیادتی واجب بلکہ اس کو جس طرح تھا اسی طرح باقی رکھنا واجب ہے)۔

قاری الہدایہ کے حوالہ سے جو جواز کا فتوی نقل ہوا ہے وہ عام محققین کے نزدیک احتیاط کے خلاف ہے، چنانچہ خود علامہ شامیؒ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ما أفتى به قارى الهداية من جواز الاستبدال إذا كان للوقف ريع مخالف لما مر فى الشروط من اشتراط

خروجه عن الانتفاع بالكلية'' (رد المحتار ۳،۴۲۶)۔

وقف کی آمدنی کے باوجود، استبدال کے جواز کا قاری الہدایہ نے جوفتوی دیا ہے وہ ان شرطوں کے مخالف ہے جوگزریں، یعنی یہ شرط کہ استبدال اس وقت جائز ہے جب وقف بالکلیہ انتفاع سے نکل جائے۔

ایک اور جگہ اس قول، کہ صاحب علم وعمل قاضی کو اس کی اجازت ہے، پر صاحب ''نہر'' کا ردیوں نقل کرتے ہیں:

''ولعمري إن هذا أعز من الكبريت الأحمر وما أراه إلا لفظاً يذكر فالأحرى فيه السد خوفاً من مجاوزة الحد والله سائل كل إنسان'' (ردالمحتار ۳،۴۲۷)۔

(میری زندگی کی قسم! یہ کبریت احمر سے بھی زیادہ دشوار ہے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ محض ایک لفظ ہے جس کا ذکر کردیا جاتا ہے (ورنہ صاحب علم وعمل قاضی ملتے کہاں ہیں؟) پس زیادہ لائق ومناسب یہ ہے کہ اس طرح کا فتوی نہ دیا جائے حدودِ الٰہی کے تجاوز کے خوف سے، اور اللہ ہر ایک سے سوال کرنے والا ہے)۔

دوسری جگہ علامہ بیریؒ کا قول نقل کرتے ہیں: ''أقول ما قاله هذا المحقق هو الحق الصواب'' (ردالمحتار ۳،۴۲۶)۔

(میں یہ کہتا ہوں اس محقق (امام ابن ہمامؒ) نے جو کہا ہے وہ حق اور درست ہے)۔

یہی بات علامہ قنائیؒ سے بھی (ردالمحتار ۳/ ۴۲۴) پر نقل کی ہے: خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ بڑا نازک ہے، محتاط طریقہ سے گنجائش نظر آتی ہے، لیکن سداً للذرائع جواز کا عام فتوی نہیں دیا جاسکتا، جس کو ضرورت پیش آئے وہ اصحاب افتاء سے رجوع کرے، حالات بتائے، جوفتوی ملے اس پر عمل کرے۔

اس کا جواب سوال نمبر (۳) کے جواب میں آگیا، وہ یہ کہ مسجد کے اوقاف کو کسی قریبی مسجد، مدرسہ کے اوقاف کو کسی قریبی مدرسہ اور فقراء کے اوقاف کو کسی قریبی جگہ کے فقراء پر خرچ کیا جائے۔

الف۔ دونوں صورتوں میں بیع درست نہیں، البتہ ایک دومنزل، بلکہ پوری عمارت ہی اسی بلڈر کو کرایہ پر دی جاسکتی ہے، جو اس نے خرچ کیا ہے کرایہ اسی سے وضع ہو۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے: ''وإذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضاً منها ليرم الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك'' (ردالمحتار ۳،۴۲۶)۔

جب وقف کی زمین ڈھ جائے اور متولی چاہے کہ اس کا کچھ حصہ فروخت کرکے اسی پیسے سے باقی کی مرمت کرے، تو متولی کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی کتاب میں ہے: ''شجرة جوز في دار وقف فخربت الدار لم يبع القيم الشجرة لأجل عمارة الوقف لكن يكري الدار ويعمرها ويستعين بالجوز على العمارة لا بنفس الشجرة، كذا في السراجية'' (فتاوی عالمگیری ۲،۴۱۷)۔

(اخروٹ کا درخت جو وقف کے مکان میں ہو، مکان ڈھ گیا، تو متولی وقف کو تعمیر کرنے کے لئے درخت کو نہ بیچے، بلکہ مکان کو کرایہ پر دے اور کرایہ کے پیسے سے اس کی تعمیر کرائے اور اخروٹ کی قیمت سے بھی تعمیر میں مدد لے، لیکن بذاتِ خود اخروٹ کے درخت کو نہ فروخت کرے، ایسے ہی سراجیہ میں ہے)۔

ب۔ اس کا جواب اوپر گذر چکا ہے، بیع کے بجائے اجارہ و کرایہ کی صورت اختیار کی جائے (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار ۳/ ۴۰۶-۴۱۹)۔

لیکن اگر وقف کی حفاظت، وقف شدہ زمین وجائداد کا کچھ حصہ فروخت کئے بغیر ممکن ہی نہ ہو، جیسا کہ سوال میں درج ہے، تو موقع ضرورت میں حنابلہ کے اس قول پر غور کیا جاسکتا ہے:

''إن الوقف إذا خرب و تعطلت منافعه كدار انهدمت أو أرض خربت و عادت مواتاً ولم تمكن عمارتها أو مسجد انتقل أهل القرية عنه و صار في موضع لا يصلى فيه أو ضاق بأهله ولم يمكن توسيعه في موضعه أو تشعب جميعه فلم تمكن عمارته ولا عمارة بعضه إلا ببيع بعضه جاز بيع بعضه لتعمر به بقيته ولم يمكن الانتفاع بشئ منه بيع جميعه'' (المغني والشرح الكبير ۶،۲۲۵، الفقه الاسلامي وأدلته ۸،۲۲۶)۔

(وقف ویران ہوگیا اور اس کے منافع معطل ہوگئے، مثلاً ایک گھر تھا جو منہدم ہوگیا، یا زمین تھی ویران ہوکر بالکل ناقابل استعمال ہوگئی اور اس کی تعمیر ممکن

نہیں ہے، یا کوئی مسجد تھی، بستی والے وہاں سے منتقل ہو گئے اور وہ ایسی جگہ میں ہوگئی کہ اس میں نماز نہیں پڑھی جاتی، یا مسجد محلہ والوں پر تنگ ہوگئی اور اس جگہ میں اس کی توسیع ممکن نہیں، یا سب لوگ وہاں سے منتشر ہو گئے پس اس کی پوری تعمیر یا بعض تعمیر، اس کے بعض حصہ کو فروخت کئے بغیر ممکن نہیں، لہذا اس کے بعض حصہ کی بیع جائز ہوگی تا کہ اس کا بقیہ حصہ تعمیر کیا جائے اور اگر اس سے کچھ بھی انتفاع ممکن نہ ہو تو پورے حصے کو فروخت کر دیا جائے گا)۔

اگر مسجد کی زمین ہو اور مسجد آباد نہ ہو، یا کم آباد ہو تو مسجد کو آباد کرنے یا مسجد کی آبادی کو بڑھانے کے لئے مسجد کی ضرورت سے زائد زمین میں مدرسہ قائم کیا جاسکتا ہے (دیکھئے: فتاوی رحیمیہ ۲/۱۸۷، کفایۃ المفتی ۷/۱۰۰، ۳/ ۱۳۴، فتاوی محمودیہ ۱۰/۱۸۶)۔

غالباً ''نظام الفتاوی مطبوعہ دہلی'' میں بھی مسجد کی زمین میں مدرسہ قائم کرنے کے جواز کا ایک فتوی موجود ہے جو احقر کی نظر سے گذرا ہے، لیکن فی الحال احقر کے پاس نظام الفتاوی مطبوعہ دہلی، موجود نہیں، اس لئے بقید صفحہ حوالہ دینے سے معذور ہے۔

قبرستان کی زائد زمین، جس کی مدت مدید تک قبرستان کو ضرورت نہ معلوم ہوتی ہو، وہاں مدرسہ قائم کیا جاسکتا ہے، اور جواز کی یہ گنجائش عینی کی اس عبارت کی بنیاد پر ہے جس کا حوالہ تیسرے سوال کے جواب میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔

جو قبرستان، آبادی میں آجانے کی وجہ سے تدفین کے کام میں نہ آتا ہو اور حکومت کی طرف سے وہاں تدفین پر پابندی لگ گئی ہو، اس جگہ مسجد، مدرسہ یا کار خیر کا کوئی ادارہ قائم کرکے اس کے انتفاع کو باقی رکھا جاسکتا ہے۔

عینی کی عبارت تیسرے سوال کے ضمن میں گذر چکی ہے۔

شرعاً حکومت کو اس قسم کا کوئی حق نہیں، مساجد کی آبادی ان کی عمارتوں کے باقی رہنے سے نہیں بلکہ نماز پڑھنے سے ہے، حکومت کا یہ فعل، ظلم وزیادتی ہے۔

''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها'' (سورہ بقرہ ۱۱۴)۔

نماز پڑھنے سے روکنا مسجد کو ویران کرنا ہے۔

جائز ہے، بشرطیکہ اگر قبریں دوکانوں میں جائیں تو وہ پرانی قبریں ہوں جن کے نشانات بالکل ختم ہو چکے ہوں (ردالمحتار ۱/ ۶۶۲)۔

فاضل آمدنی مناسب مصارف خیر میں لگانے کے متعلق عینی کی عبارت جس کا بار بار تذکرہ آچکا ہے، نظیر بنائی جاسکتی ہے۔

چونکہ وہ مسجد قبرستان میں پہلے سے ہی بنی ہوئی ہے لہذا وہ قبرستان سے متعلق ہوگئی، اس کے متعلق ہونے کی وجہ سے قبرستان کی زمین میں اس کی توسیع بھی جائز ہے، گویا قبرستان کی زمین قبرستان کے ہی کام میں آئی۔

اس جواز میں ویران اور زیر استعمال دونوں ہی قبریں داخل ہیں، البتہ مسجد کی توسیع صرف پرانی قبروں کی جگہ ہوسکتی ہے، ایسی قبریں جن کے مردوں کے متعلق اندازہ ہو کہ ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی۔

''ردالمحتار'' میں ہے: ''ويخير المالك بين إخراجه ومساواته بالأرض كما جاز زرعه والبناء عليه إذا بلى و صار تراباً. زيلعي'' (۱، ۶۶۲)۔

مساجد ومدارس اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کو غیر مسلم ادارہ کی تولیت سے نکال لینا بہتر ہے، لیکن اگر اس میں مشکلات ہوں تو ہوں، ان کی تولیت میں رہنے دینے کی گنجائش ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی ''مطلب فی شروط المتولی'' کے تحت لکھتے ہیں:

''والظاهر أنها شرائط الاولوية لا شرائط الصحة وان الناظر إذا فسق استحق العزل ولا ينعزل كالقاضي إذا فسق لا ينعزل على الصحيح المفتى به ويشترط للصحة بلوغه وعقله لا حريته وإسلامه'' (ردالمحتار ۳،۴۲۲)۔

ظاہر یہ ہے کہ (فسق وغیرہ سے محفوظ ہونا) اولویت کی شرط ہے، صحت کی شرط نہیں، چنانچہ متولی اگر فاسق ہوجائے تو وہ مستحق معزولی ہوجائے گا، مگر بسبب فسق خود سے معزول نہیں ہوگا، جیسے قاضی، صحیح مفتی بہ قول کے مطابق فسق کی وجہ سے از خود معزول نہیں ہوتا، اور تولیت کی شرائط صحت میں سے متولی کا بالغ وعاقل ہونا ہے، آزاد ہونا اور مسلمان ہونا شرط نہیں۔

☆☆☆

وسیع قبرستان میں واقع مسجد کی توسیع کا حکم

مفتی نسیم احمد قاسمی[1]

استبدال وقف:

مسائل وقف کے ذیل میں استبدال کی بحث نہایت ہی اہم اور قابل توجہ ہے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کے وقف سے متعلق سوالنامہ کے زیادہ تر سوالات اسی سے متعلق ہیں۔ اس لئے اس بحث کو تفصیل اور وضاحت سے تحریر کرنا ضروری ہے۔ نصوص فقہیہ سے یہ صراحۃً ثابت ہے کہ وقف کے مکمل اور تام ہو جانے کے بعد اشیاء موقوفہ کی خرید وفروخت اور ہبہ درست نہیں ہیں، اور واقف کی موت کی صورت میں اس میں وراثت جاری نہیں ہو گی۔

ہدایہ میں ہے: ''وإذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه'' (ھدایه، فتح القدیر علی ھامش ۶،۲۰۵)۔

علامہ علاء الدین الحصکفی نے تحریر کیا ہے: ''فإذا تم ولزم لا یملك ولا یعار ولا یرھن...'' اور صاحب ردالمحتار نے ''لا یملك'' کے ذیل میں تحریر کیا ہے: ''أی لا یکون مملوکا لصاحبه ولا یملك أی لا یقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه'' (رد المحتار ۶،۵۳۹)۔

اب رہا یہ سوال کہ اشیاء موقوفہ کو دوسری اشیاء سے بدلنا یا ضرورتاً اسے فروخت کر کے دوسری اشیاء خرید کر کے اسے ''وقف'' قرار دینا جائز ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء نے تفصیل سے بحث کیا ہے۔

استبدال وقف کے سلسلہ میں فقہاء کے حسب ذیل اقوال ہیں:

مالکیہ: امام مالکؒ کے نزدیک حسب ذیل دو صورتوں میں استبدال وقف بالکل ہی ممنوع ہے:

الف: ایک مسجد کا تبادلہ دوسری مسجد سے جائز نہیں ہے۔ استبدال مسجد کے عدم جواز پر فقہاء کا اتفاق ہے۔

ب: وقف عقار کی صورت میں ہو، اور اس سے اناج اور غلہ پیدا ہوتا ہو، تو ایسی صورت میں ارض موقوفہ کی بیع اور تبادلہ جائز نہیں ہوگا، البتہ مسجد، مقبرہ اور عام راستہ کی توسیع کی صورت میں ضرورتاً اراضی موقوفہ کا تبادلہ جائز ہوگا۔ فقہ مالکی کی معروف کتاب شرح مختصر خلیل میں ہے:

''لا بأس ببیع الدار المحبسة وغیرھا، ویکرہ الناس السلطان علی بیعھا إذا احتاج الناس إلیھا لجامعھم الذی فیه الخطبة وکذلك إذا احتاج الطریق إلیھا، وإذا کان النھر بجانب طریق عظیمة من طرق المسلمین التی یسلك علیھا العامة فحضرھا حتی قطعھا فإن أھل تلك الأرض التی حولھا یجبرون علی بیع ما یوسع به الطریق'' (شرح مختصر خلیل المسمی بالتاج والاکلیل ۶،۴۲)۔

عقار کی صورت میں اکثر فقہاء مالکیہ استبدال کے عدم جواز کے قائل ہیں، اگرچہ مقصد وقف فوت ہو رہا ہو، اور اراضی موقوفہ سے انتفاع واستغلال ختم ہو گیا ہو، البتہ اس صورت میں بعض مالکیہ استبدال کو جائز قرار دیتے ہیں۔

وقف منقول کی صورت میں مالکیہ کے نزدیک استبدال جائز ہے، امام مالکؒ سے منقول ہے: ''ما ضعف من الدواب المحبسة فی سبیل اللہ تعالی حتی لایکون فیه قوۃ علی الغزو بیع واشتری بثمنه ماینتفع به من الخیل، فیجعل فی سبیل اللہ'' (شرح

[1] سابق نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

مختصر خليل المسمى بالتاج والاكليل ٦،٤١)۔

مالکیہ کے نزدیک عقار اور منقول کے استبدال میں فرق کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عقار میں مستقبل میں انتفاع کی امید رہتی ہے، جبکہ منقول میں انتفاع کی امید نہیں رہتی ہے، بلکہ ضیاع کا خطرہ رہتا ہے، اس لئے عقار میں تنگی اور منقول میں توسع سے کام لیا گیا ہے۔

شافعیہ: استبدال وقف کے بارے میں شافعیہ کی رائے مالکیہ کی رائے سے زیادہ قریب ہے، ان کے نزدیک بھی اس میں تشدد اور تنگی سے کام لیا گیا ہے۔ اگر عقار بالکل ہی قابل انتفاع نہ رہے تو اس صورت میں عقار موقوف کا استبدال درست ہوگا یا نہیں؟ اس میں شافعیہ کے دو قول ہیں:

ایک قول جواز کا ہے، اور دوسرا قول عدم جواز کا ہے، فقہ المذہب میں ہے: ''وإن وقف نخلة فجفت أو بهيمة فزمنت أوجذوعا على مسجد فتكسرت ففيه وجهان: أحدهما: لا يجوز بيعه كما ذكرنا في المسجد، والثاني: يجوز بيعه لأنه لا يرجى منفعته فكان بيعه أولى من تركه بخلاف المسجد'' (المهذب)۔

حنابلہ: حنابلہ کے نزدیک استبدال وقف میں زیادہ توسع سے کام لیا گیا ہے۔

حنفیہ: حنفیہ کے نزدیک استبدال وقف میں زیادہ توسع ہے، صرف مسجد کی حد تک توسع کا دروازہ بند کردیا گیا ہے، حنفیہ کے نزدیک استبدال کی حسب ذیل تین صورتیں ہیں:

۱۔ وقف کرتے وقت واقف نے اپنے لئے یا وقف کے متولی کے لئے استبدال کی شرط لگائی ہو، مثلاً وقف کرتے وقت واقف نے یہ کہا کہ میری یہ زمین وقف ہے اس شرط کے ساتھ کہ مجھے اس کے استبدال کا حق حاصل ہوگا، ایسی صورت میں وقف درست قرار پائے گا، امام ابویوسف اور بعض روایات کے مطابق امام محمدؒ کے نزدیک استبدال کی شرط بھی درست قرار پائے گی۔ امام محمدؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ وقف درست قرار پائے گا اور شرط باطل قرار پائے گی، فقہائے حنفیہ میں سے ہلال اور خصاف بھی استبدال کی شرط کے جواز کے قائل ہیں، فتاوی قاضی خاں میں امام ابویوسف اور امام ہلال کے قول کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔

علامہ ابن ہمام نے استبدال وقف کے سلسلہ میں فقہاء حنفیہ کا نقطہ نظر اور مسلک مختار کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ولو شرط أن يستبدل بها أرضا أخرى تكون وقفا مكانها فهو جائز عند أبي يوسف وهلال والخصاف وهو استحسان، وكذا لو قال على أن أبيعها واشترى بثمنها أخرى مكانها، وقال محمد: يصح الوقف ويبطل الشرط ...وفي فتاوى قاضي خان قول هلال وأبي يوسف هو الصحيح'' (فتح القدير٦)۔

شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں استبدال وقف کی مذکورہ بالا صورت کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے، اگر واقف نے یہ شرط لگائی کہ اگر وہ چاہے تو ارض موقوفہ کا دوسری زمین سے تبادلہ کرسکتا ہے، تو یہ شرط امام ابویوسفؒ کے نزدیک جائز ہوگی، امام محمدؒ کے نزدیک اور یہی اہل بصرہ کا بھی قول ہے، وقف جائز ہوگا اور استبدال کی شرط باطل قرار پائے گی۔ اس لئے کہ یہ شرط بقاء وقف میں مؤثر نہیں ہوگی اور وقف اس کے ذریعہ تام جائے گا (المبسوط للسرخسی ۱۲ر ۴۲)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے البحر الرائق کے حاشیہ میں امام محمدؒ سے وقف اور شرط دونوں کے بطلان کا قول نقل کیا ہے (حاشیہ منحۃ الخالق علی البحر الرائق)۔

حنفیہ کا قول مختار یہ ہے کہ اگر واقف اپنے لئے یا متولی کے لئے استبدال وقف کی شرط لگادے تو وقف درست قرار پائے گا اور شرط بھی نافذ ہوگی، اس لئے یہ اس قسم کی شرط لزوم وقف اور اس کی تابید کے منافی نہیں ہے، جہاں تک وقف کے لزوم وتابید کا سوال ہے تو یہ کسی ارض معینہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ اس کے وقف کے زوال سے وقف زائل ہوجائے گا۔ وقف کا اصل مقصد یہ ہے کہ اصل شئ کو باقی رکھتے ہوئے اس کی منفعت موقوف علیہم پر صرف ہوتی رہے۔ اور یہ مقصد استبدال وقف کی صورت میں بھی حاصل رہتا ہے۔

استبدال کی شرط لگانے کی صورت میں واقف اور متولی کو اختیار ہوگا کہ وہ اراضی موقوفہ کا تبادلہ کرکے یا اسے فروخت کرکے دوسری اراضی وقف

کرے، اگرچہ قاضی کی طرف سے استبدال کی اجازت حاصل نہ ہو، کیونکہ واقف کی شرائط شریعت اسلامی کی طرف سے دی گئی ولایت خاصہ کی وجہ سے نافذ قرار پاتی ہیں۔

اشتراط کی صورت میں واقف کو استبدال کا حق حاصل ہوگا چاہے شئ موقوفہ کی ذات سے فائدہ اور نفع کا سلسلہ جاری ہو۔

فقہاء حنفیہ کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ مسجد کے بارے میں استبدال کی شرط درست نہیں ہے، اشتراط کی صورت میں وقف درست قرار پائے گا اور شرط باطل ہوگی۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے اپنے لئے یا غیر کے لئے استبدال کی شرط نہیں لگائی مگر وقف قابل انتفاع نہیں رہا، مثلاً وقف کا مکان منہدم ہوگیا، اور اس کی تعمیر کی کوئی صورت نہیں رہی، یا ارض موقوفہ قابل کاشت نہیں رہی، پیداوار سے زیادہ اس پر خرچ آرہا ہو تو آیا ایسی صورت میں استبدال وقف کی اجازت ہوگی یا نہیں، فقہاء حنفیہ کی اکثریت جواز کی قائل ہے۔ شمس الائمہ الحلوانی سے سوال کیا گیا کہ اگر اوقاف مسجد کی نافعیت ختم ہوگئی اور استغلال کی شکل باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں متولی وقف کو اوقاف کو فروخت کرنے اور اس کی جگہ دوسری اراضی خریدنے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ہاں (انفع الوسائل ر ۱۱۳)۔

امام محمد بن الحسن شیبانی سے بھی اس صورت میں استبدال وقف کا جواز ثابت ہے۔ فتاوی الطرطوسی میں ہے:

''وروی عن محمد أنه إذا ضعفت الأرض الموقوفة والقيم يجد بثمنها ما هو أكثر ريعا فى المنتقى قال هشام: سمعت محمدا يقول فى الوقف: إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضى أن يبيعه ويشترى بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضى'' (انفع الوسائل ۱۱۳)۔

حسب ذیل دو صورتوں میں بھی متولی کو استبدال وقف اور وقف کی فروختگی کا حق حاصل ہوگا:

۱۔ غاصب نے وقف کی جائداد غصب کرلی، وقف کا متولی اس جائداد کی واپسی سے عاجز ہو، اور کسی دلیل سے غصب کا ثابت کرنا مشکل ہو، غاصب ارض موقوفہ کی قیمت کی ادائیگی پر آمادہ ہو، تو ایسی صورت میں غاصب سے ارض موقوفہ کا معاوضہ اور بدل لازمی طور پر قبول کرلیا جائے گا، اور اس کے ذریعہ عقار خرید کر کے مغصوب کے بدلہ میں اسے ''وقف'' قرار دیا جائے گا۔

۲۔ غاصب نے ارض موقوفہ کو غصب کر کے اس میں تالاب بنادیا، اس طرح کہ وہ حصہ دریا کا جز بن گیا، جس کی وجہ سے وہ زمین قابل کاشت نہ رہی، اس صورت میں متولی غاصب سے ارض موقوفہ کی قیمت وصول کرے گا، اور اس سے دوسری زمین خرید کر کے اسے ''وقف'' کردے گا۔

۳۔ استبدال وقف کی تیسری صورت یہ ہے کہ اوقاف قابل انتفاع اور قابل استغلال ہوں، اوقاف پر آنے والے مصارف سے زیادہ آمدنی اور فائدہ ہو، جسے مصارف وقف پر صرف کیا جاتا ہو، مگر اس کا امکان ہو کہ استبدال کے ذریعہ اوقاف کو زیادہ مفید اور نفع بخش بنایا جائے، یعنی اوقاف کے عدم تعطل کے باوجود صرف زیادہ مفید اور نفع بخش بنانے کی غرض سے اوقاف کی اراضی کا دوسری اراضی سے تبادلہ کیا جائے، اس صورت میں استبدال وقف جائز ہوگا یا نہیں؟۔ اس میں ائمہ احناف کا شدید اختلاف پایا جاتا ہے، امام ابو یوسفؒ اس صورت کے بھی جواز کے قائل ہیں، چنانچہ ''ذخیرہ'' میں ہے:

''روی عن أبى يوسف أنه قال: لابأس باستبدال الوقف مما روى عن على بن أبى طالب ﷺ أنه وقف على الحسن والحسين، فلما خرج إلى صفين قال: إن نأت بهم الدار فبيعوها وأقسموا ثمنها بينهم'' (المحاضرة فى الوقف ۱۶۴)۔

امام ابو یوسف کا استدلال یہ ہے کہ استبدال وقف کی صورت میں وقف کا زیادہ فائدہ ہے، کہ اس صورت میں استبدال وقف، مقصد وقف کے منافی بھی نہیں ہے، بلکہ عین مطابق ہے، فقیہ ہلال اس صورت کے عدم جواز کے قائل ہیں (المحاضرۃ فی الوقف ر ۱۶۴)۔

علامہ ابن الہمام حنفی بھی عدم جواز کے قائل ہیں، ان کے نزدیک استبدال وقف یا تو شرط کی وجہ سے جائز ہوگا یا پھر ضرورت کی بنیاد پر، مذکورہ صورت میں نہ تو واقف کی طرف سے شرط پائی جاتی ہے اور نہ ہی ضرورت کا تحقق ہے۔

''فتح القدیر'' میں ہے: ''فينبغي أن لا يجوز (أي الاستبدال في حال وجود غلة)، لأن الواجب ابقاء الوقف على ماكان عليه دون زيادة أخرى، ولأنه لا موجب لتجويزه لأن الموجب في الأول الشرط، وفي الثاني الضرورة ولا ضرورة في هذا إذ لا تجب الزيادة فيه بل تبقيه كما كان'' (فتح القدیر ۶/۲۱۲)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے عدم جواز کے قول کو ''اصح'' اور ''مختار'' قرار دیا ہے (ردالمحتار ۶/ ۵۸۴)۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے بھی عدم جواز کے قول ہی کو راجح اور مفتی بہ قرار دیا ہے (المغنی لابن قدامہ حنبلی ۵/ ۶۳۴) مگر ''فتاوی قاری الهدایہ'' میں امام ابو یوسف کے قول کو مفتی بہ قرار دیا گیا ہے...... علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں:

''الرابعة أن يرغب الإنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن صقعا، فيجوز على قول أبي يوسف وعليه الفتوى، كما فتاوى قارى الهداية'' (رد المحتار ۶)۔

شرائط استبدال:

استبدال وقف کی حسب ذیل شرطیں ہیں:

۱۔ وقف کا استبدال اور اس کی بیع غبن فاحش کے ذریعہ نہ ہو۔

۲۔ متولی ایسے شخص سے بیع کا معاملہ نہ کرے جس کے حق میں اس کی شہادت مقبول نہیں ہے، اور نہ ایسے شخص سے معاملہ کرے جس کا دین اس کے ذمہ ہو، اس لئے کہ دونوں صورتوں میں اس کا احتمال ہے کہ متولی وقف کی اصلی قیمت سے کم قیمت پر اسے فروخت کر دے، لہذا موضع تہمت ہونے کی وجہ سے دونوں صورتوں میں اسے استبدال اور بیع سے روک دیا گیا ہے۔

۳۔ وقف کی فروخت کی گئی زمین کے مقابلہ میں خریدی گئی زمین زیادہ سود مند اور نفع بخش ہو (المحاضرة فی الوقف۔ ابو زہرة/ ۱۶۶۔۱۶۷)۔

۴۔ استبدال دنانیر و دراہم اور کرنسیوں کے ذریعہ نہ ہو بلکہ عقار ہی کے ذریعہ ہو۔

استبدال وقف کے لئے قاضی کی اجازت:

اشتراط کی صورت میں تو واقف کو شرط کی بنیاد پر استبدال وقف کا حق حاصل ہوگا، اور قاضی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوگی، البتہ عدم اشتراط کی صورت میں استبدال کا حق براہ راست واقف یا متولی کو حاصل ہوگا، یا اس کے لئے قاضی کی اجازت ہوگی۔

فقہاء حنفیہ نے استبدال کو قاضی کی اجازت کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے، اور یہ حق ہر قاضی کو نہیں دیا گیا ہے بلکہ قاضی الجنۃ کو اس کا مجاز ٹھہرایا گیا ہے، ''قاضی الجنۃ'' سے مراد وہ قاضی ہے جو صاحب علم وعمل اور صاحب زہد وتقویٰ ہو۔

صاحب ''اسعاف'' نے استبدال وقف کی بحث میں تحریر کیا ہے:

''وأما إذا لم يشترط فقد أشار في السير إلى أنه لايملكه إلا القاضي إذا رأى المصلحة في ذلك، ويجب أن يخص برأي أول القضاة الثلاثة المشار إليه بقوله عليه الصلوة والسلام: ''قاض في الجنة وقاضيان في النار'' المفسر بذي العلم والعمل لئلا يحصل التطرق إلى إبطال الوقف، كما هو الغالب في زماننا'' (الاسعاف ۳۲)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے بھی استبدال وقف کے جواز کے لئے قاضی الجنۃ کی اجازت کو ضروری قرار دیا ہے (ردالمحتار ۶/ ۵۸۷)۔

لہذا عدم اشتراط کی صورت میں شرائط استبدال کی رعایت کرتے ہوئے صاحب علم وعمل قاضی کی اجازت سے استبدال وقف درست ہوگا، قاضی الجنۃ کی اصطلاح بہت ہی مناسب اور تحفظ اوقاف کے لئے بہتر ہے، اگر علی الاطلاق تمام قضاۃ کو اس کا مجاز بنا دیا جاتا تو اس کا غالب اندیشہ تھا کہ دنیا دار قضاۃ ناجائز طور پر لوگوں کو اوقاف کی خرید وفروخت کی اجازت دے کر اوقاف کی املاک کے ضیاع وہلاکت کی راہ ہموار کرتے۔ بہار و اڑیسہ یا ہندوستان کی وہ ریاستیں جن میں باضابطہ نظام قضاء قائم ہے، اور قضاۃ مقرر ہیں ان ریاستوں اور مقامات میں استبدال وقف کے لئے اذن

قاضی ضروری ہوگا، البتہ جہاں باضابطہ نظام قضاء قائم نہیں ہے، وہاں مستند علماء جو صاحب علم وعمل ہوں ان کی اجازت استبدال کے لئے کافی ہے۔

اوقاف کی فاضل آمدنی کا مصرف:

مسائل اوقاف کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اوقاف کی فاضل آمدنی جو اس کے مصارف اور اس کی ضروریات سے زائد ہو، اور مستقبل قریب میں بھی ضرورت پڑنے کی توقع نہ ہو تو ایسی حالت میں فاضل آمدنی کا مصرف کیا ہوگا، اور اسے کہاں صرف کیا جائے گا۔ مثلاً کسی قبرستان، مدرسہ یا مسجد پر کافی اراضی وقف ہوں، اراضی موقوفہ میں دکانیں ہوں، اور آمدنی کے دیگر ذرائع ہوں، اوقاف سے حاصل شدہ آمدنی اس کے متعینہ مصارف پر صرف کرنے کے باوجود آمدنی کا کچھ حصہ بچ جاتا ہو، اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی صراحت کے مطابق اگر وقف سے حاصل آمدنی کی وقف کو آئندہ مستقبل قریب میں بھی ضرورت نہ ہو تو، الأقرب فالأقرب کے قاعدہ کے مطابق مسجد کے وقف کی فاضل آمدنی کو اس مسجد سے قریب تر دوسری مسجد کی ضروریات پر صرف کیا جائے گا، قبرستان کے وقف کی فاضل آمدنی کو اس سے قریبی قبرستان کی ضروریات میں صرف کیا جائے گا، اسی طرح مدرسہ کے وقف کی فاضل آمدنی کو اس سے قریبی مدرسہ کی ضروریات میں صرف کیا جائے گا، پھر اس سے جو قریب ہو، ایک جنس کے اوقاف کی فاضل آمدنی اسی جنس پر صرف کرنا ضروری ہوگا، اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ مسجد کے وقف کی آمدنی قبرستان یا مدرسہ یا دیگر رفاہ عام کے کاموں کی ضروریات میں صرف کیا جائے۔

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے: ''سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجد أو حوض خرب ولا یحتاج إلیه لتفرق الناس هل للقاضی أن یصرف أوقافه إلی مسجد آخر أو حوض آخر قال: نعم، ولو لم یتفرق الناس ولکن استغنی الحوض عن العمارة وهناك مسجد محتاج إلی العمارة أو عن العکس هل یجوز للقاضی صرف وقف ما استغنی عن العمارة إلی عمارة ماهو محتاج إلی العمارة قال لا'' (۲،۴۷۸)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے تحریر فرمایا ہے: ''وظاهره أنه لا یجوز صرف وقف مسجد خرب إلی حوض وعکسه وفی شرح الملتقی یصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار ۶،۵۵۱)۔

البتہ اگر واقف اور جہت وقف دونوں میں اتحاد ہو تو ایسی صورت میں ایک وقف کی فاضل آمدنی دوسرے وقف پر صرف کی جاسکتی ہے، مثلاً ایک صاحب خیر نے اپنی ایک دکان کسی مسجد کی تعمیری ضروریات کے لئے وقف کی اور دوسری دوکان اسی مسجد کے امام ومؤذن اور دیگر عملہ کی تنخواہ کے لئے وقف کی تو ایسی صورت میں ایک موقوفہ دکان کی فاضل آمدنی دوسرے وقف کے مصرف میں صرف کی جاسکتی ہے، اور اگر واقف یا جہت وقف میں سے کسی ایک میں بھی اختلاف ہو تو ایسی صورت میں ایک وقف کی فاضل آمدنی دوسرے وقف پر صرف نہیں کی جاسکتی ہے، مثلاً ایک شخص نے دو مسجدیں الگ الگ بنائیں، یا ایک شخص نے اپنی طرف سے ایک مسجد اور ایک مدرسہ بنایا، دونوں پر اپنی اراضی وقف کی تو مسجد کی فاضل آمدنی مدرسہ کی ضروریات میں یا مدرسہ کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر صرف کرنا درست نہیں ہوگا۔

''درمختار'' میں ہے: ''(اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف علیه) بسبب خراب وقف أحدهما (جاز للحاکم أن یصرف من فاضل الوقف الآخر علیه۔ وإن اختلف أحدهما بأن بنی رجلان مسجدین) أو رجل مسجداً ومدرسة ووقف علیهما أوقافا لا یجوز له ذلك'' (ردالمحتار ۶،۵۵۱)۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اوقاف کی فاضل آمدنی کا مصرف ذکر کرتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

''مدرسہ جنس مسجد سے نہیں، اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے، اگر اس شہر میں مسجد نہ ہو تو دوسرے شہر کی مساجد میں صرف کریں جو زیادہ قریب ہو اس کا حق مقدم ہے اسی طرح بہ ترتیب (امدادالفتاوی ۲ر ۶۱۴)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اوقاف کی زائد اور فاضل آمدنی کو اسی جنس کے اوقاف کی ضروریات میں ''الأقرب فالأقرب'' کی ترتیب سے صرف کیا جائے گا، دوسری جنس کے اوقاف پر صرف کرنا درست نہیں ہوگا۔ تمہیدی کلمات کے بعد اصل سوالات کے جوابات تحریر کئے جاتے ہیں:

الف۔ غیر آباد وقف کا تبادلہ:

اگر موقوفہ قبرستان، مدارس، خانقاہیں یا ان پر موقوفہ اراضی وہاں کے مسلمانوں کے منتقل یا فسادات میں تباہ و برباد ہوجانے کی وجہ سے ویران اور غیر آباد ہیں اور اوقاف کی املاک پر حکومت وقت یا غیر مسلموں کے قبضہ کا خطرہ ہے، اگر وقف نامہ میں واقف یا اس کے منتخب کردہ متولی کو اشیاء موقوفہ کی فروختگی اور تبادلہ کا اختیار دیا گیا ہو تو بلاشبہ واقف یا اس کے متولی کو واقف کے شرط کے مطابق اوقاف کے فروخت کرنے اور دوسری جگہ متبادل وقف قائم کرنے کا حق حاصل ہوگا، اور اگر "وقف نامہ" میں اس کی صراحت نہیں کی گئی ہو تو بھی چونکہ اشیاء موقوفہ فی الحال بے فائدہ اور ویران ہیں، ضیاع کا اندیشہ ہے، اس لئے تحفظ اوقاف، مصالح اوقاف اور منشاء واقف کی رعایت کرتے ہوئے قاضی شریعت (قاضی الجنۃ) کی اجازت سے مذکورہ اوقاف کو فروخت کر کے دوسری جگہ زیادہ مفید متبادل اوقاف قائم کرنے کی گنجائش ہوگی، قاضی شریعت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں متدینین اور اصحاب زہد وتقوی علماء کی اجازت سے بھی تبادلہ کی گنجائش ہوگی۔

ب۔ اشخاص یا حکومت سے تبادلہ:

مذکورہ بالا صورت میں ویران اور بے مصرف اوقاف کا تبادلہ چاہے اشخاص سے کیا جائے یا مرکزی وریاستی حکومتوں سے، ہر صورت میں اوقاف کے تبادلہ اور مذکورہ اوقاف کو اشخاص یا حکومتوں کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری اراضی یا مکانات حاصل کر کے مقاصد اوقاف کو باقی رکھنے کا طریقہ اپنایا جاسکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

شرعی نقطہ نظر سے واقف کے منشا اور مقاصد وقف کی رعایت ضروری ہے، لہذا استبدال اوقاف کی صورت میں بھی کسی ایسے کام کی اجازت نہیں ہوگی جو واقف کے منشا اور مقاصد اوقاف کے خلاف ہو، ویران اور ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی اور رعایت کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے تعلیمی ورفاہی اداروں کا قیام درست نہیں ہوگا، ہر صورت میں منشاء واقف اور مقاصد وقف کی رعایت ضروری ہوگی۔

الف۔ مساجد کی فاضل اراضی موقوفہ میں دینی یا عصری اداروں کا قیام:

مسجد پر وقف اراضی میں جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہو اس میں کسی بھی طرح کے ادارہ کا قیام خواہ وہ دینی درسگاہ ہو یا عصری شرعاً اس کی اجازت نہیں ہوگی، عدم جواز کی علت یہ ہے کہ واقف نے اپنی اراضی مسجد کی ضروریات کے لئے وقف کیا، کسی ادارے کے قیام یا اس کی ضروریات کے لئے نہیں، وقف میں منشاء واقف اور مقاصد وقف کی رعایت ضروری ہوتی ہے اس لئے اس طرح کے تصرف کی شرعاً اجازت نہیں ہو گی۔

ب۔ مساجد کی فاضل آمدنی کا استعمال:

مسجد کی آمدنی کو ضروریات مسجد ہی میں صرف کرنا ضروری ہے، اسے تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کرنا درست نہیں ہوگا، اگر کسی مسجد کے پاس فاضل اور ضروریات سے زائد آمدنی ہو اور مستقبل قریب میں مسجد کو اس کی ضرورت پڑنے کی امید نہیں ہو تو ایسی صورت میں مقاصد وقف کی رعایت کرتے ہوئے بہتر اور مفید طریقہ یہ ہے کہ اس رقم سے مزید اراضی خرید کر وقف کر دیا جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس سے کام لیا جاسکے، اور اگر مزید اراضی خریدنے کی ضرورت نہ ہو، اس کا تحفظ دشوار ہو اور اسے روک رکھنے میں "ضیاع" کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں اس کو کسی قریب کی مسجد یا اس کی دیگر ضروریات پر صرف کیا جائے گا، اور اگر قریب کی مسجد کو ضرورت نہ ہو تو اس سے قریب کی دوسری مسجد یا اس کی ضرورت پر صرف کیا جائے گا، اسی طرح "الاقرب فالاقرب" کے قاعدہ سے مساجد ہی پر اس رقم کا صرف کرنا ضروری ہوگا، اسے رفاہی یا تعلیمی اداروں کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا درست نہیں ہوگا۔

وقف کی فاضل آمدنی کا مصرف:

الف، ب۔ اگر واقعۃً کسی وقف کی آمدنی اس کی ضروریات سے فاضل اور زائد ہو اور ہر سال زائد رقم جمع ہو کر ایک بڑے سرمایہ کی شکل اختیار کر لیتی

ہو، جس کی ایک لمبے عرصہ تک حفاظت ونگہداشت مشکل ہو، اس کے ضیاع کا بھی خطرہ لاحق ہو، اور اس زائد رقم کی نہ تو روزمرہ کی ضروریات کے اندر صرف کرنے کی ضرورت ہو اور نہ آئندہ حفاظت یا وقف کی اصلاح ومرمت وغیرہ کے کاموں کے لئے اس کی ضرورت پڑنے کی امید ہو تو ایسی صورت میں اس فاضل آمدنی کو اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں صرف کرنا ضروری ہوگا، دیگر ملی دینی، علمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں صرف کرنا درست نہیں ہوگا، ایک وقف کی فاضل آمدنی اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں "الأقرب فالأقرب" کے اصول پر صرف کی جائے گی۔

اگر کسی وقف کا مکان یا دوکان کم نفع بخش ہو اسکو فروخت کر کے زیادہ نفع بخش مکان یا دوکان خریدنا تاکہ وقف کی آمدنی زیادہ ہو جائے، اسکے جواز وعدم جواز کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان کافی اختلاف رہا ہے، عام طور پر فقہاء کی رائے عدم جواز کی ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ نے عدم جواز کے پہلو کو ترجیح دی ہے، ''فتح القدیر'' میں وضاحت کی ہے:

''ينبغي أن لا يجوز (أي الاستبدال في حال وجود غلة)؛ لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة أخرى'' (فتح القدیر ۵،۲۲۹)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے زمین کے استبدال کو جائز تو قرار دیا ہے لیکن مکان کے استبدال کو ناجائز ہی قرار دیا ہے، موصوف فرماتے ہیں:

''إن الخلاف في الثالث إنما هو في الأرض إذا ضعفت عن الاستغلال بخلاف الدار إذا ضعفت بخراب بعضها ولم تذهب أصلاً، فإنه لا يجوز حينئذ الاستبدال على كل الاقوال''۔

مزید تشریح کرتے ہوئے آگے تحریر فرماتے ہیں: ''ولا يمكن قياسها على الأرض، فإن الأرض إذا ضعفت لا يرغب غالبا في استئجارها بل في شرائها أما الدار، فيرغب في استئجارها مدة طويلة لأجل تعميرها للسكنى'' (ردالمحتار ۴،۳۸۵، المبسوط للسرخسی ۱۲،۴۴)۔

علامہ شامیؒ نے زمین اور مکان کے سلسلہ میں جو فرق کیا ہے اور جو بنیاد بتائی ہے وہ یہ ہے کہ مکان کا استبدال اس لئے درست نہیں ہے کہ مکان قابل رہائش ہونے کی وجہ سے خواہ جہاں بھی ہو لوگوں کو کرایہ پر لینے میں رغبت رہتی ہے، لیکن اگر موجودہ دور میں مکان کے کرایہ کے سلسلہ میں عام لوگوں کا جو رجحان ہے وہ دیہات میں نہیں، بلکہ شہر میں ہے، بلکہ دیکھا یہی جاتا ہے کہ موجودہ دور میں دیہات میں رہائش کے لئے مکان کرایہ پر لینے کا رواج ہی نہیں ہے، اس جائزہ سے یہ معلوم ہوا کہ فی زمانا دیہات میں مکان کے بجائے زمین ہی کے سلسلہ میں عام لوگوں کی رغبت زیادہ ہوتی ہے، اس لئے رغبت والی بنیاد فی زمانا بہت کمزور ہو جاتی ہے، لہٰذا ناچیز کی رائے ہے کہ کم نفع بخش مکان جو دیہات میں ہو اسے فروخت کر کے اگر شہر میں زیادہ نفع بخش مکان دستیاب ہو تو اس کے خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے کہ یہ انفع للواقف بھی ہے اور مقاصد وقف کے منافی بھی نہیں ہے۔ ذخیرہ میں صراحت ہے:

''روى عن أبي يوسف أنه قال: لا بأس باستبدال الوقف لما روى عن على ابن طالب ﷺ أنه وقف على الحسن والحسين فلما خرج إلى صفين قال: إن نأت بهم الدار فبيعوها واقسمو ثمنها بينهم ولم يكن شرط البيع في أصل الوقف'' (الذخیرہ بحوالہ محاضرات فی الوقف لأبي زهرة ۱۶۴)۔

امام ابوزہرہؒ نے صراحت کی ہے کہ فتوی قدیم زمانہ ہی سے اس صورت میں بھی جواز استبدال ہی کا رہا ہے:

''والفتوى من قديم الزمان على جواز الاستبدال في هذه الحال كسابقتها وعليه العمل في المحاكم العربية، إن استثنينا البلاد السعودية، فإن العمل فيها على مقتضى المذهب الحنبلي، وإن الاستبدال فيه مصلحة ظاهرة'' (محاضرات في الوقف لأبي زهرة ۱۶۵)۔

مذکورہ بحث کا حاصل یہ ہے کہ ناچیز کے نزدیک فی زمانا وہ مکان یا دوکان جو کم نفع بخش ہو اسے فروخت کر کے زیادہ نفع بخش مکان خریدنا

درست ہے اور مصلحت وقف کے موافق ہے۔

مصارف اوقاف کے ختم ہوجانے کی صورت میں اوقاف کا مصرف:

مصارف اوقاف کے ختم ہونے کی حسب ذیل دو صورتیں ہیں:

الف۔ کوئی جائداد کسی خاص خاندان کے فقراء و مساکین پر وقف تھی، ایک عرصہ گزرنے کے بعد وہ خاندان ہی ختم ہوگیا، تو ایسی صورت میں موقوفہ جائداد کی آمدنی دوسرے فقراء و مساکین پر صرف کی جائے گی، کیونکہ جہت وقف کے ختم ہوجانے کی صورت میں اس وقف کے حقدار فقراء و مساکین ہی ہوتے ہیں۔ شرائط وقف میں سے ایک شرط تابید بھی ہے، یعنی وقف کرتے وقت واقف وقف کی ایسی جہت کی صراحت کردے جو ختم نہ ہونے والی ہو، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک تابید کی صراحت ضروری ہے، عدم صراحت کی صورت میں وقف درست نہیں ہوگا۔

فقہاء حنفیہ میں سے امام ابویوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ عدم صراحت کی صورت میں بھی وقف درست قرار پائے گا اور وہاں پر بھی تابید مقصود ہوگی، اور جہت وقف کے ختم ہوجانے کی صورت میں اس کی آمدنی کے مصرف فقراء و مساکین قرار پائیں گے، امام ابویوسفؒ ہی کا قول مفتی بہ ہے۔

لہذا جہت وقف کے انقطاع کی صورت میں وقف کی آمدنی دوسرے فقراء و مساکین پر صرف کی جائے گی، علامہ ابن الہمام نے تحریر فرمایا ہے:

''قال أبو يوسف: إذا انقرض موقوف عليهم يصرف الوقف إلى الفقراء (ويجعل آخره لجهة) قربة (لاتنقطع) ذا بيان شرائطه الخاصة على قول محمد؛ لأنه كالصدقة وجعله أبو يوسف كالاعتاق واختلف الترجيح والأخذ بقول الثاني أحوط وأسهل بحر في الدار وصدر الشريعة وبه يفتي وأقره المصنف'' (شرح فتح القدير ۶؍۱۹۹)۔

ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی زمین یا جائداد کسی مسجد، مدرسہ، قبرستان یا رفاہی ادارہ پر وقف تھی، اور اب نہ ہی وہ مسجد باقی رہی اور نہ ہی مدرسہ و قبرستان اور رفاہی ادارہ، تو ایسی صورت میں ایک جنس کے اوقاف کی آمدنی کو اسی جنس کے اوقاف پر صرف کرنا ضروری ہوگا۔ مثلاً مسجد کے اوقاف کی آمدنی دیگر مساجد کے اوقاف پر، مدرسہ کے اوقاف کی آمدنی دیگر مدارس پر ''الاقرب فالاقرب'' کی ترتیب سے صرف ہوگی، ایک جنس کے اوقاف کی آمدنی کو دوسری جنس کے اوقاف پر صرف کرنا درست نہیں ہوگا۔

الف۔ بلڈر سے اوقاف کی زمین پر اس شرط کے ساتھ مکان تعمیر کرانا کہ مکان کی ایک یا دو منزل اس کی ہوگی:

اگر کسی وقف کی عمارت خستہ اور مخدوش حالت میں ہو، وقف کے پاس اس کی از سر نو تعمیر کے لئے ضروری سرمایہ نہیں ہے، یا وقف کی کوئی زمین ہے جس پر مکان تعمیر نہیں ہے اور اس زمین سے پیداوار بھی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی اور صورت ممکن ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی بلڈر وقف کی مخدوش عمارت کو منہدم کرکے تعمیر جدید یا خالی زمین پر اپنے مصارف سے عمارت بنانے کے لئے اس شرط پر آمادہ ہوجائے کہ تعمیر شدہ مکان کی ایک یا دو منزل اس کی ذاتی ملکیت قرار پائے گی جس میں اسے ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہوگا، اور بقیہ منزلیں مصارف وقف کے لئے ہوں گی، تو چونکہ ایسی صورت میں وقف موجودہ پوزیشن میں کسی بھی طرح قابل انتفاع نہیں ہے اس لئے اسے قابل انتفاع بنانے کے لئے بلڈر سے اس قسم کا کوئی معاملہ کیا جاتا ہے تو شرعاً وہ درست اور جائز قرار پائے گا، اس طرح کا معاملہ مقصد وقف اور منشاء واقف کے عین مطابق ہے، اور مقاصد وقف کا اس میں تحفظ بھی ہے، اس لئے میرے نزدیک معاملہ کی یہ صورت درست ہے، البتہ اس کا خیال رکھا جائے کہ مکان کے نیچے کی منزل ہر حال میں وقف ہی رہے، اسے بلڈر کی ملکیت قرار نہ دیا جائے۔

ب۔ ارض موقوفہ کے کسی حصہ کو فروخت کرکے اس کی قیمت تعمیرات میں صرف کرنا:

وقف کے تام و مکمل اور لازم ہوجانے کے بعد اس کی فروختگی اور اس کا ہبہ درست نہیں ہے ارض موقوفہ کو فروخت کرکے اس کی قیمت کو تعمیرات میں لگانا، اور وقف کو اس کی واقفیت سے نکال دینا درست نہیں ہے۔ شئ موقوفہ کی وقفیت کو اپنی اصلی حالت میں یا اس کی جگہ پر اسی نوع کی دوسری چیز خرید کرکے وقف کی وقفیت کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ لہذا صورت مسئولہ میں ارض موقوفہ کے کسی حصہ کو فروخت کرکے اس کی قیمت کو مخدوش عمارت کی تعمیر جدید یا نئی مسجد کی تعمیر یا خالی زمین پر عمارت بنوانے یا نئی مسجد کی تعمیر میں صرف کرنا شرعاً درست نہیں ہوگا، اس سے اجتناب لازم و ضروری ہوگا۔

علامہ ابن نجیم نے تحریر کیا ہے:

"بیع عقار المسجد لمصلحة المسجد لا یجوز وإن کان بأمر القاضی وإن کان خرابا" (البحر الرائق ۵،۲۲۳)۔

مسجد یا قبرستان کی موقوفہ اراضی پر مدرسہ کی تعمیر:

مسجد یا مدرسہ کی موقوفہ اراضی پر مدرسہ کی تعمیر شرعاً درست نہیں ہے، چاہے زمین مسجد یا مدرسہ کی ضروریات سے زائد ہو، کیونکہ واقف نے اس زمین کو مسجد یا قبرستان کی ضروریات کے لئے وقف کیا تھا، مدرسہ کی تعمیر کے لئے نہیں، منشاء واقف کی رعایت ضروری ہے۔

ویران قبرستان کا حکم:

اگر کوئی قبرستان مسلم آبادی کے ختم ہوجانے کی وجہ سے ویران اور غیر آباد ہوجائے اور اس کی قبریں اتنی بوسیدہ اور پرانی ہوجائیں کہ مردوں کے سڑگل اور مٹی میں مل جانے کا ظن غالب ہو، اور اس قبرستان پر اپنوں یا غیروں کے قبضہ کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں اس طرح کے قبرستان کو قاضی شریعت کی اجازت سے مقاصد وقف کی رعایت کرتے ہوئے کسی دوسرے مصرف میں استعمال کیا جاسکتا ہے، مثلاً یہ کہ اسکو کاشت کے لئے استعمال کیا جائے، یا اس میں دکانیں تعمیر کر کے کرایہ پر دے دی جائیں۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی دوسرے قبرستانوں پر "الاقرب فالاقرب" کی ترتیب سے صرف ہوگی۔ "درمختار" میں ہے:

"کما جاز زرعه والبناء علیه إذا بلی وصار ترابا" (درمختار)۔

مساجد میں نماز پڑھنے سے روکنا:

مسجد اللہ کا گھر ہے جسے عبادت الٰہی، ذکر و تسبیح اور نماز کے لئے بنایا جاتا ہے، اس میں کسی شخص کو نماز پڑھنے سے روکنے کا اختیار نہ تو کسی حکومت کو ہے اور نہ ہی کسی فرد کو، قرآن کریم میں مساجد کو ویران کرنے اور ان میں اللہ کے بندوں کو عبادت سے روکنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"ومن أظلم ممن منع مساجد اللہ أن یذکر فیها اسمه وسعی فی خرابها" (سورۃ البقرہ: ۱۱۴)۔

لہذا قدیم مساجد کو آثار قدیمہ کی تحویل میں قرار دے کر ان میں اہل ایمان کو نماز پڑھنے سے روکنا حرام اور ظلم ہے، کسی بھی حکومت کو اس طرح کا حق حاصل نہیں ہے، اہل اسلام کی ذمہ داری ہے کہ ان مساجد کی بازیابی کے لئے قانونی چارہ جوئی کریں۔

حفاظت کی غرض سے اطراف قبرستان دکان کی تعمیر:

قبرستان کی حفاظت کے لئے جب کہ باؤنڈری اور چہار دیواری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور چہار دیواری نہ کرانے کی وجہ سے قبرستان غیر محفوظ ہو تو اس کے اطراف وجوار میں لوگوں سے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے کر دکانوں کی تعمیر اور ان کو کرایہ پر لگانے کی شرعاً اجازت ہوگی، البتہ اس کے لئے قاضی شریعت کی اجازت ضروری ہوگی، اور دکانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی ضروریات قبرستان میں صرف کی جائے گی، فاضل آمدنی کو دوسری قبرستانوں کی ضروریات پر "الأقرب فالأقرب" کی ترتیب سے صرف کرنا ضروری ہوگا۔

وسیع قبرستان میں واقع مسجد کی توسیع:

اگر قبرستان اور اس میں واقع مسجد دونوں کے کاغذات الگ الگ موجود ہیں جس میں قبرستان اور مسجد کی زمین کے رقبہ کی صراحت ہے تو ایسی صورت میں کاغذات کے مطابق عمل کیا جائے گا، کاغذات کی عدم موجودگی میں یہ سمجھا جائے گا کہ واقف نے دونوں کے لئے الگ الگ رقبہ کی تحدید نہیں کی تھی۔ بلکہ اس نے مردوں کی تدفین اور مسجد کے لئے زمین وقف کی تھی، ایسی صورت میں ضرورت پڑنے پر مسجد کی توسیع کی بھی گنجائش ہوگی۔ لہذا اگر قبرستان میں واقع مسجد کے ارد گرد کبھی مردے دفن نہیں ہوتے یا مردوں کی تدفین تو ہوتی ہو لیکن قبریں بوسیدہ اور پرانی ہوں کہ مردوں کے مٹی میں مل جانے اور ان کے اجسام کے سڑگل جانے کا ظن غالب ہو تو ایسی صورت میں قبرستان کی زمین میں مسجد کی توسیع کی اجازت ہوگی، قبروں کے

جدید ہونے کی صورت میں توسیع کی اجازت نہ ہوگی۔

مگر افضل و بہتر شکل یہ ہے کہ مسجد کی توسیع کے بجائے اسے حسب ضرورت دو منزلہ اور سہ منزلہ بنا کر ضرورت پوری کرلی جائے تاکہ کسی طرح کے شبہ کی گنجائش نہ رہے۔

اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا:

صحت وقف کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، غیر مسلم کا بھی وقف درست ہے، البتہ غیر مسلم کے وقف کے درست ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے وقف کررہا ہے اس پر وقف کرنا اس کے نزدیک بھی باعث قربت ہو اور ہمارے نزدیک بھی، جیسے بیت المقدس کے فقراء یا اپنی اولاد پر وقف کرنا ہمارے نزدیک بھی باعث قربت وتقرب ہے اور اس کے نزدیک بھی، اگر اس کے نزدیک قربت ہو ہمارے نزدیک نہیں جیسے مندر پر وقف، یا ہمارے نزدیک تو باعث قربت ہو، مگر اس کے نزدیک نہیں، جیسے حج وغیرہ، تو ایسی صورت میں غیر مسلم کا وقف درست نہیں ہوگا، لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم قربت وثواب سمجھ کر کسی مسجد یا قبرستان کے لئے اپنی کوئی جائداد وقف کردے تو اس کا وقف درست اور صحیح قرار پائے گا۔ علامہ ابن نجیم مصری نے شرائط وقف کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''وأما الإسلام فليس من شرطه فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم كما لو وقف على الفقراء أو على فقراء أهل الذمة فإن عمم جاز الصرف إلى كل فقير مسلم أوكافر وإن خصص فقراء أهل الذمة اعتبر شرطه كما نص عليه الخصاف'' (البحر الرائق ۵،۲۰۴)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ''حاشیہ البحر الرائق'' میں (قوله بشرط كونه قربة عندنا وعندهم) کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''الظاهر أن هذا شرط في وقف الذمي فقط ليخرج مالوكان قربة عندنا فقط كوقفه على الحج والمسجد ماكان قربة عندهم فقط كالوقف على البيعة بخلاف الوقف على مسجد القدس، فإنه قربة عندنا وعندهم فيصح'' (منحة الخالق على هامش البحر الرائق ۵،۲۰۴)۔

اور جب غیر مسلم وقف کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کا وقف درست ہے تو وہ اپنے اوقاف کا متولی اور نگران بھی بن سکتا ہے، کیونکہ تولیت اوقاف کی صحت کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے غیر مسلم بھی اوقاف کا متولی بن سکتا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی نے شرائط تولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''ويشترط للصحة بلوغه وعقله لاحريته وإسلامه لما في الاسعاف''۔

''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: ''ولا تشترط الحرية والإسلام للصحة لما في الاسعاف ولو كان عبدا يجوز قياسا واستحسانا والذمي في الحكم كالعبد''۔

لہٰذا اگر ہندوستان کی بعض ریاستوں میں ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد یا مقابر پر اراضی وقف کی ہیں اور ان اوقاف کی تولیت نسلاً بعد نسلٍ ان کے خاندانوں میں آرہی ہے جس کی بنیاد پر آج بھی وہ اوقاف ہندو وقف بورڈ کی تولیت میں ہیں تو ایسی صورت میں غیر مسلم ادارہ اور ہندو وقف بورڈ کی تولیت میں ان اوقاف کا رہنا صحیح ودرست ہے۔

☆☆☆

ویران اوقاف کو نفع بخش بنانے سے متعلق اصول

مفتی جنید عالم ندوی قاسمی [1]

فقہ اکیڈمی کی جانب سے اوقاف سے متعلق جو سوالات موصول ہوئے ہیں وہ یقینا حالات اور وقت کے تقاضے کے مطابق بہت ہی اہم ہیں، ان سوالات کے جوابات لکھنے سے قبل چند باتیں بطور تمہید ذکر کی جاتی ہیں، جن سے جواب کے سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

وقف کی لغوی اور شرعی تعریف:

وقف لغت میں روکنے کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاح شرع میں وقف کہتے ہیں: کسی شئ کو اپنی ملکیت سے نکال کر اس طرح محبوس کرنا کہ اصل شئ باقی رکھتے ہوئے اس سے انتفاع کیا جا سکے۔ یعنی اصل شئ محفوظ رہے اور اس کے منافع کو واقف کی صراحت کے مطابق صرف کیا جائے۔ نہایۃ المحتاج میں ہے:

''ھو لغة الحبس... وشرعا حبس مال یمکن الانتفاع به مع بقاء عینه بقطع التصرف فی رقبته علی مصرف مباح موجود'' (۵،۳۵۴،۳۵۵)۔

امام ابوحنیفہؒ کے دونوں شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے وقف کی شرعی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''(وعند هما هو حبسها علی) حکم (ملك الله تعالی و صرف منفعتها علی من أحب) ولو غنیا'' (الدر المختار علی هامش رد المحتار کتاب الوقف ۳،۳۵۸)۔

یعنی وقف شئ کو اللہ کی ملکیت میں محبوس کرنا اور اس کی منفعت کو منشاء واقف کے مطابق صرف کرنا ہے، گرچہ مالدار ہی پر کیوں نہ ہو۔

امام ابوحنیفہؒ چونکہ عام حالات میں وقف کے لزوم کے قائل نہیں ہیں، جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آرہی ہے، اس لئے وہ وقف کی شرعی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''(ھو) لغة الحبس و شرعا (حبس العین علی) حکم (ملك الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو فی الجملة'' (الدر المختار علی هامش رد المحتار کتاب الوقف ۳،۳۵۸)۔

یعنی اصل شئ کو واقف کی ملکیت میں باقی رکھتے ہوئے اس کے منافع کا صدقہ کرنا ہے، یہ صدقہ کسی بھی درجہ میں ہو، مثلاً اپنے اور اپنے اہل وعیال پر وقف ہو، اس کے بعد فقراء ومساکین پر یا مالداروں پر۔

وقف کا حکم:

ایک بحث وقف کی صحت اور عدم صحت کی ہے کہ کسی چیز کا وقف صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو شئ موقوف واقف کی ملکیت میں باقی رہتی ہے یا اس کی ملکیت سے نکل جاتی ہے؟ اور واقف کے لئے وقف کرنے کے بعد شئ موقوف کی خرید وفروخت یا اس کا ہبہ یا کوئی دوسرا جائز تصرف جو اپنی ملکیت میں ہوتا ہے، شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ملتے ہیں، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی جائداد وغیرہ وقف کرنا چاہے تو وقف کر سکتا ہے۔ اس کا وقف صحیح ہوگا۔ اس پر تقریباً تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ بعض حضرات گرچہ عدم صحت وقف کے قائل ہیں، لیکن ان کے قول کا اعتبار نہیں ہے۔ روایات، آثار صحابہ اور اقوال فقہاء صحت وقف پر متفق ہیں۔

---

[1] مفتی امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

امام ترمذی حضرت عمرؓ کے واقعہ وقف والی روایت کونقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"والعمل على هذا عند أهل العلم من أصحاب النبي ﷺ وغيرهم لا نعلم بين المتقدمين منهم في ذلك اختلافا في إجارة وقف الأرضين وغير ذلك" (ترمذی ۱٫۱۶۵)۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وقف تو صحیح وجائز ہوتا ہے، لیکن لازم نہیں ہوتا۔ یعنی شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نہیں نکلتی ہے۔ واقف اس کو فروخت بھی کرسکتا ہے اور ہبہ بھی، ہر طرح کے جائز تصرف کا اختیار واقف کو ہوگا، اس کے انتقال کے بعد اس میں وراثت بھی جاری ہوگی۔ اس کے قائل حضرت امام ابوحنیفہؒ ہیں...... البتہ دوصورتوں میں امام صاحب کے نزدیک بھی شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے۔

الف۔ واقف نے اپنی کوئی چیز وقف کر کے متولی کے حوالہ کردیا، پھر متولی سے اپنی چیز کا مطالبہ کیا اور متولی نے دینے سے انکار کردیا۔ جب معاملہ قاضی شریعت کے پاس پہنچا تو قاضی شریعت نے لزوم وقف کا فیصلہ دیا۔۔۔ اس صورت میں امام صاحب کے نزدیک بھی وقف لازم ہوجائے گا اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل جائے گی، اس لئے کہ یہ مجتہد فیہ مسئلہ ہے اور مجتہد فیہ مسئلہ میں قضاء قاضی رافع خلاف ہے۔

ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے یہ وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری فلاں چیز وقف ہے، تو اس صورت میں وقف لازم ہوجائے گا، اور اس کے انتقال کے بعد اس میں وراثت جاری نہ ہوگی، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صورت درحقیقت وقف کی نہیں ہے بلکہ وصیت کی ہے، لہٰذا اس صورت میں وصیت کے تمام احکام نافذ ہوں گے۔ مالک اگر اپنی زندگی میں رجوع کرنا چاہے تو رجوع کرسکتا ہے۔

"قال أبو حنيفة: لا يزول ملك الواقف من الوقف إلا أن يحكم به الحاكم أو يعلقه بموته فيقول إذا مت فقد وقفت داري على كذا" (ہدایہ ۲ کتاب الوقف)۔

"شرح فتح القدیر" میں دوسری صورت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"(وأما تعليقه بالموت فالصحيح أنه لايزول ملكه إلا أنه تصدق بمنافعه مؤبداً فيصير بمنزلة الوصية بالمنافع مؤبداً فيلزم) وإن لم يخرج عن ملكه؛ لأنه بمنزلته إذ لايتصور التصرف فيه ببيع ونحوه لما يلزم من إبطال الوصية وعلى هذا فله أن يرجع قبل موته كسائر الوصايا، وإنما يلزم بعد موته" (شرح فتح القدير ۶٫۱۹۳)۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ شئ موقوف واقف ہی کی ملکیت میں رہتی ہے، اس کی ملکیت سے نکلتی نہیں ہے، البتہ واقف کو فروخت کرنے یا ہبہ وغیرہ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس پر یا اس کے بعد مقرر کردہ متولی پر لازم ہے کہ شئ موقوف سے حاصل ہونے والے منافع کو واقف کی صراحت کے مطابق صرف کرے۔ یہ قول صحیح روایت کے مطابق امام مالکؒ کا ہے (دیکھئے کتاب المواہب الجلیل شرح مختصر الخلیل ۱۸٫۶)۔

۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ وقف لازم ہوجاتا ہے اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے، لیکن موقوف علیہ کی ملکیت میں نہیں آتی ہے۔ واقف نہ تو اس کو فروخت کرسکتا ہے اور نہ ہی ہبہ وغیرہ کرسکتا ہے، اور نہ ہی ان کے انتقال کے بعد اس میں وراثت جاری ہوسکتی ہے۔۔۔ یہ قول صاحبین (امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ) صحیح مذہب کے مطابق امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور صحابہ، محدثین اور علماء امت کا ہے، البتہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک وقف کرتے ہی شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک اس وقت نکلتی ہے جب کہ اس کو متولی کے حوالہ کردیا جائے۔ فتوی امام ابویوسفؒ کے قول پر ہے، اور علماء احناف کا عمل بھی اسی پر ہے۔

"وعندهما يلزم بدون ذلك وهو قول عامة العلماء وهو الصحيح ثم إن أبا يوسف يقول يصير وقفا بمجرد القول؛ لأنه بمنزلة الإعتاق عنده وعليه الفتوى، وقال محمد: لا إلا بأربعة شروط" (رد المحتار کتاب الوقف ۳۵۸۔ مزید دیکھئے: نهاية المحتاج في مذهب الامام الشافعي جلد پنجم كتاب الوقف۔ المغني لابن قدامه الحنبلي جلد پنجم كتاب الوقف۔ مواهب الجليل في مذهب الإمام مالك جلد ششم كتاب الوقف)۔

قول راجح: صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک امام صاحب کا قول راجح ہے، اس لئے کہ

امام صاحب کے قول کی دلیل بعد میں بیان کرنا اور صاحبین کے دلائل کا جواب دینا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک امام صاحب کا قول راجح ہے، لیکن احادیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں صحیح اور راجح قول جمہور کا معلوم ہوتا ہے۔ بہت سے صحابہ نے اپنی استطاعت کے مطابق وقف کیا، اور کسی سے بھی شئ موقوف کی واپسی یا اس کو فروخت کرنے اور اس کی قیمت کو اپنے مصرف میں لانے کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔

علامہ علاء الدین الحصکفی نے ابن الکمال اور ابن الشحنہ کے حوالہ سے اسی قول پر فتوی نقل کیا ہے۔

''درمختار'' میں ہے: ''(وعندهما هو حبسها على) حكم (ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من أحب) ولو غنيا فيلزم فلا يجوز له إبطاله ولا يورث عنه عليه الفتوى ابن الكمال وابن الشحنة''۔

اور علامہ شامیؒ نے فتح القدیر کے حوالہ سے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے، اس لئے کہ بے شمار احادیث وآثار اس کی تائید میں ہیں، اور صحابہ، تابعین اور بعد کے علماء کا عمل بھی اسی پر رہا ہے۔

علامہ شامی ''قولہ علیہ الفتوی'' کے تحت لکھتے ہیں: ''أي على قولهما بلزومه قال في الفتح والحق ترجح قول عامة العلماء بلزومه؛ لأن الأحاديث والآثار متظافرة على ذلك، واستمر عمل الصحابة والتابعين ومن بعدهم على ذلك، فلذلك ترجح خلاف قوله'' (رد المحتار ۳۵۸،۳)۔

اس قول کی بنیاد عبداللہ بن عمرؓ کی روایت پر ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو خیبر کی زمین حصہ میں ملی تو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی جو زمین حصہ میں ملی ہے وہ میرے نزدیک بہت ہی پسندیدہ مال ہے، میں اس کو اللہ تعالی کے راستہ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کو صدقہ کردو، لیکن اصل زمین نہ تو فروخت کی جائے گی اور نہ ہبہ کیا جائے گا، اور نہ اس میں وراثت جاری ہوگی۔

''أنه لا يباع أصلها ولا تباع ولا تورث ولا توهب'' (مسلم ۲،۴۱)۔ علامہ نووی نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وفيه أن الوقف لا يباع ولا يوهب ولا يورث'' (نووی شرح مسلم ۲،۴۲)۔

محقق ابن ہمام نے شرح فتح القدیر میں وقف کرنے والے صحابہ کی ایک لمبی فہرست شمار کی ہے، جن کا عمل لزوم وقف کی تائید کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی عبارت:

''والحق ترجح قول عامة العلماء بلزومه؛ لأن الأحاديث والآثار متظافرة على ذلك قولا كما صح من قوله عليه الصلوة والسلام لا يباع ولا يورث إلى آخره، وتكرر هذا في أحاديث كثيرة واستمر عمل الأمة من الصحابة والتابعين ومن بعد هم على ذلك أولها صدقة رسول الله ﷺ ثم صدقة أبي بكر و عمر و عثمان و علي والزبير و معاذ بن جبل و زيد بن ثابت و عائشة وأسماء أختها وأم سلمة وأم حبيبة و صفية بنت حيّ وسعد بن أبي وقاص و خالد بن وليد و جابر بن عبدالله و عقبة بن عامر وأبي أروى الدوسي و عبد الله بن الزبير، كل هؤلاء من الصحابة ثم التابعين بعدهم كلها بروايات و توارث الناس أجمعون ذلك فلا تعارض بمثل الحديث الذي ذكره على أن معنى حديث شريح بيان نسخ ما كان في الجاهلية من الحامي و نحوه، وبالجملة فلا يبعد أن يكون إجماع الصحابة العملي ومن بعدهم متوارثا على خلاف قوله فلذا ترجح خلافه الخ'' (شرح فتح القدير كتاب الوقف ۶،۱۹۲)۔

علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں عدم لزوم والے قول کو سنت نبویہ اور اجماع صحابہ کے خلاف قرار دیا ہے:

''وهذا القول يخالف السنة الثابتة عن رسول الله وإجماع الصحابة ﷺ فإن النبي ﷺ قال لعمر في وقفه، لا يباع أصلها ولا يبتاع ولا يوهب ولا يورث'' (المغني لابن قدامه ۵،۵۹۸)۔

خلاصہ یہ ہے کہ روایات اور آثار صحابہ کی روشنی میں صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ وقف صحیح اور لازم ہوتا ہے، اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے۔ عقلا بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے، اس لئے کہ وقف سے منشاء واقف یہ ہوتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد بھی اس کا نفع جاری ہو، جس کا ثواب اس کو ملتا رہے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ لزوم وقف کا حکم دیا جائے، ورنہ اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثین اس شئ کے مالک ہوجائیں گے اور مقصد فوت ہوجائے گا۔

شئ موقوف کی واپسی واقف یا اس کے وارثین کی طرف:

راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور اس پر ملکیت کے احکام جاری نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شئ موقوف کسی بھی حال میں کبھی بھی واقف یا اس کے وارثین کی ملکیت میں آتی ہے یا نہیں؟

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب شئ موقوف اپنی افادیت کھودے، اس سے موقوف علیہم کو استغناء و بے نیازی ہو جائے تو ایسی صورت میں اگر واقف زندہ ہو تو اس کی ملکیت ورنہ اس کے وارثین کی ملکیت کی طرف وہ لوٹ آتی ہے۔۔۔ مثلاً وقف کی عمارت منہدم ہوگئی اور اس کا غلہ نہیں ہے جس سے اس کی تعمیر ہو سکے، یا کسی بازار میں وقف کی دوکان ہے، وہ آگ لگنے سے اس طرح جل گئی کہ اس سے انتفاع ممکن نہیں اور نہ ہی کوئی شخص اس کو اجارہ پر لینے کے لئے تیار ہے، یا کسی محلہ میں موقوف حوض ہے جو خراب ہو گیا اور اس کو ٹھیک کرنے کے لئے غلہ نہیں ہے، یا مسافر خانہ ہے جو ویران ہو گیا یا اس کی عمارت منہدم ہوگئی، تو ان تمام صورتوں میں امام محمدؒ کے نزدیک مذکورہ موقوفہ مکان و دوکان اور حوض و مسافر خانے واقف اور اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثین کی ملکیت کی طرف لوٹ جائیں گے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ صورتوں میں بھی شئ موقوف واقف یا اس کے وارثین کی ملکیت میں نہیں آئے گی، بلکہ اگر موقوفہ دوکانیں یا مکانات یا حوض اور مسافر خانے بے مصرف اور نا قابل انتفاع ہوں تو ان کے فاضل اور ٹوٹے ہوئے آلات و دیگر سامانوں کو یا ان پر وقف جائداد کی آمدنی کو اسی جنس کے وقف پر جو اس سے قریب ہو صرف کیا جائے گا۔

مثلاً اگر حوض ہے تو قریب کے حوض پر اگر مسافر خانہ ہے تو قریب کے مسافر خانہ پر الأقرب فالأقرب کے اصول پر آمدنی صرف ہوگی۔ اسی طرح قدیم وقف کی عمارت منہدم ہو جائے تو اس کے انقاض مثلاً اینٹ اور لکڑیاں وغیرہ امام محمدؒ کے نزدیک واقف کے حوالہ کر دی جائیں گی، اس لئے کہ وہی مالک ہے...... اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قدیم وقف کی جدید تعمیر میں اگر ضرورت ہو تو اس میں استعمال کیا جائے گا، اگر ضرورت نہ ہو تو ان کو روک کر رکھا جائے گا، تا کہ ضرورت پڑنے پر ان کا استعمال ہو سکے، اور اگر مستقبل قریب میں ضرورت پڑنے والی نہ ہو اور رکھے رہنے میں ضیاع کا اندیشہ ہو تو قاضی شریعت کی اجازت سے ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت نئی تعمیر میں صرف ہوگی، اگر اس کو ضرورت نہ ہو تو قریب کے وقف پر صرف کیا جائے گا۔

اسی طرح مسجد کی گھاس اور اس کی چٹائیاں وغیرہ اگر نا قابل استعمال ہوں تو امام محمدؒ کے نزدیک واقف اور اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثین مالک ہو جائیں گے...... اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ان کو دوسری قریب کی مسجد میں منتقل کر دیا جائے گا، یا ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت مسجد میں صرف کی جائے گی۔

استبدال وقف کا حکم:

شئ موقوف کے تبادلہ کا مسئلہ وقف کے اہم مسائل میں سے ہے۔ سوالنامہ کے زیادہ تر سوالات کے جوابات اسی پر موقوف ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ تو مصرح ہے کہ وقف تام اور مکمل ہو جانے کے بعد شئ موقوف کو خرید و فروخت یا ہبہ کے ذریعہ یا اس میں وراثت جاری کر کے وقفیت سے نہیں نکالا جا سکتا ہے، شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے۔

"فإذا تم ولزم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن (درمختار) (قوله لا يملك) أي لا يكون مملوكا لصاحبه ولا يملك أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالة تمليك للخارج عن ملكه الخ" (رد المحتار كتاب الوقف ۳۶۲/۲)۔

البتہ شئ موقوف کو دوسری شئ سے بدلنا یا ضرورتاً اس کو فروخت کر کے دوسری شئ خرید کر اس کو وقف قرار دینا درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کرام نے تفصیلی بحث کی ہے، اور اس کی تین صورتیں ذکر کی ہیں:

۱۔ واقف نے بوقت وقف تبادلہ کی شرط لگا دی ہو، خواہ اپنے لئے لگائی ہو یا کسی دوسرے کے لئے۔

۲۔ واقف نے بوقت وقف تبادلہ کی کوئی شرط نہیں لگائی، نہ اپنے لئے اور نہ ہی دوسرے کے لئے۔ یا بایں قاعدہ یہ صراحت کر دی کہ کوئی بھی اس کا تبادلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن شئ موقوف بالکل نا قابل انتفاع ہے یا معمولی نفع ہے بھی تو اس نفع کے حاصل کرنے کے لئے اس پر ہونے والے اخراجات اس سے زائد ہوتے ہیں۔

۳۔ واقف نے اپنے لئے یا غیر کے لئے تبادلہ کی شرط نہیں لگائی اور شئ موقوف قابل انتفاع بھی ہے، اس سے آمدنی حاصل ہوتی ہے، البتہ اس کو زیادہ نفع آور

بنانے کے لئے اس کا تبادلہ دوسری نفع آور شئ سے کیا جائے۔

پہلی صورت:

جب کہ واقف نے بوقت وقف یہ شرط لگادی کہ ضرورت پڑنے پر میں خود یا فلاں شخص اس کو دوسری شئ سے بدل کر یا شئ موقوف کو فروخت کر کے اس کی جگہ پر دوسری شئ خرید کر وقف کر سکتا ہے، تو اس صورت میں واقف کی صراحت کے مطابق خود واقف کو یا اس کے نامزد کردہ شخص کو شئ موقوف کے تبادلہ کا اختیار ہوگا، اور شرط کے مطابق شئ موقوف کو فروخت کر کے اس کی جگہ دوسری شئ خرید کر وقف کر سکتا ہے۔

''(وجاز شرط الاستبدال به) أرضا أخرى حينئذ أو شرط بيعه ويشترى بثمنه أرضا أخرى إذا شاء، فإذا فعل صارت الثانية كالأولى فى شرائطها وإن لم يذكرها'' (در مختار)۔

''(قوله وجاز شرط الاستبدال) اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه الأول ان يشترطه الواقف لنفسه أولغيره أولنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقا الخ'' (رد المحتار کتاب الوقف ۳٫۳۸۷)۔

واقف کی شرط کے مطابق استبدال کا حق اس لئے ہے کہ واقف کی شرط شرعاً معتبر ہے، اگر وہ غلہ یا ولایت کی شرط اپنے لئے لگادے تو اس کی یہ شرط درست ہوگی، جب اپنے لئے غلہ اور ولایت کی شرط درست ہے تو استبدال کی شرط بدرجہ اولی درست ہوگی...... بلکہ کتب فقہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ جس طرح شارع کی نص پر عمل کرنا واجب ہے اسی طرح واقف کی شرط پر عمل کرنا بھی واجب ہے۔

''شرط الواقف كنص الشارع أى فى المفهوم والدلالة ووجوب العمل به'' (الدر المختار بہامش رد المحتار ۳٫۴۱۶)۔

دوسری صورت:

دوسری صورت میں جب کہ واقف نے بوقت وقف اس طرح کی شرط نہیں لگائی۔ وقف نامہ کسی طرح کی شرط سے خاموش ہے۔ یا یہ شرط لگادی کہ کسی کو بھی حتی کہ قاضی شریعت کو بھی تبادلہ کا اختیار نہیں ہوگا۔ لیکن شئ موقوف بالکل نا قابل انتفاع ہے یا معمولی نفع ہے جس کے حصول کے لئے اس سے زائد اخراجات ہوتے ہیں، اس صورت میں قاضی شریعت مصلحت سمجھ کر شئ موقوف کو نفع آور بنانے کے لئے اس کا تبادلہ دوسری شئ سے کر سکتے ہیں۔ یہ ان صورتوں میں سے ہے جن میں واقف کی شرط کی مخالفت قاضی شریعت کے لئے جائز ہے۔

''والثانى أن لا يشترطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شئ أصلا أولا يفى بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضى ورأيه المصلحة فيه'' (رد المحتار ۳٫۳۸۷)۔

اس صورت میں تبادلہ کا اختیار اس لئے ہے کہ تبادلہ نہ کرنے کی صورت میں واقف کا مقصد فوت ہو رہا ہے، کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ شئ موقوف کی آمدنی مساکین یا دیگر کار خیر پر جس کی اس نے صراحت کی ہے صرف کی جائے جس کا ثواب اس کو مرنے کے بعد بھی ملتا رہے، اور یہ اصل شئ کو باقی رکھتے ہوئے ممکن نہیں ہے، اور قاضی شریعت وقف کے مقاصد اور اس کے مصالح کے نگراں ہیں، اس کے تحفظ و بقا کے لئے کوشش قاضی شریعت کی ذمہ داری ہے، لہٰذا مقاصد وقف کے تحفظ و بقا کے پیش نظر قاضی شریعت اس کا تبادلہ دوسری شئ سے کر دیں گے یا ضرورت پڑنے پر اس کو فروخت کر کے دوسری شئ خرید کر اس کی جگہ پر وقف کر دیں گے۔

علامہ ابن قدامہ نے اس مسئلہ پر اچھی بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس صورت میں اصل شئ کو باقی رکھنے پر جمود اختیار کرنا مقصد واقف کو ضائع کرنا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

''وجمودنا على العين مع تعطلها تضييع للغرض'' (پوری بحث کے لئے دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۵، ۶۳۳)۔

اس صورت میں قاضی کو تبادلہ کا جو اختیار ہے وہ چند شرطوں کے ساتھ ہے:

۱۔ یہ اختیار اس قاضی کو ہے جو علم و عمل اور عدل میں ممتاز ہو، صاحب تقویٰ اور پابند شرع ہو۔ ۲۔ شئ موقوف بالکلیہ نا قابل انتفاع ہو۔ ۳۔ وقف کی کوئی

آمدنی نہ ہو جس سے اس کی آبادکاری ہو سکے۔ ۴۔ بیع غبن فاحش کے ساتھ نہ ہو۔ ۵۔ قاضی کسی ایسے شخص سے تبادلہ نہ کرے جو اس کا قریبی رشتہ دار ہو یا پہلے سے اس کا قرض قاضی پر ہو۔

''والمعتمد أنه بلا شرط يجوز للقاضى بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية وأن لايكون هناك ريع للوقف يعمر به وأن لا يكون البيع بغبن فاحش و شرط فى الإسعاف أن يكون المستبدل قاضى الجنة المفسر بذى العلم والعمل لئلا يحصل التطرق إلى إبطال أوقاف المسلمين كما هو الغالب فى زماننا... وأن لا يبيعه ممن لا تقبل شهادته له ولا ممن له عليه دين'' (رد المحتار ۴.۳۸۸)۔

تیسری صورت: اس صورت میں جب کہ واقف نے استبدال کی کوئی شرط نہیں لگائی، نہ اپنے لئے نہ ہی کسی غیر کے لئے، اور شئی موقوف قابل انتفاع بھی ہے البتہ اس کو زیادہ نفع آور بنانے کے لئے کسی دوسری نفع آور شئی سے اس کا تبادلہ کیا جائے، اس صوت کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں فقہاء کرام کے دو قول ملتے ہیں:

الف: ایک صورت میں تبادلہ جائز نہیں ہے۔ اس کے قائل امام ابوحنیفہؒ ہیں۔

ب: تبادلہ شرعاً جائز و درست ہے، یہ قول امام ابو یوسف اور حضرت ہلال کا ہے، اور ایک روایت کے مطابق امام محمدؒ کا۔

عام طور پر کتب فقہ حنفی میں عدم جواز کے قول کو راجح اور مفتی بہ قرار دیا گیا ہے۔ علامہ شامی نے رد المحتار میں اور علامہ ابن ہمام نے شرح فتح القدیر میں عدم جواز ہی کے قول کو راجح قرار دیا ہے، علامہ ابن قدامہ نے بھی المغنی میں اسی قول کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''وإن لم تتعطل مصلحة الوقف بالكلية لكن قلت وكان غيره أنفع منه وأكثر رد على أهل الوقف لم يجز بيعه؛ لأن الأصل تحريم البيع وإنما أبيح للضرورة صيانة لمقصود الوقف عن الضياع مع إمكان تحصيله ومع الانتفاع وإن قل ما يضيع المقصود'' (المغنى لابن قدامه ۵.۶۳۴)۔

اور اگر مصلحت وقف بالکلیہ ختم اور بے کار نہ ہو بلکہ کم پڑ جائے اور اس کا بدل اس سے زیادہ نفع بخش اور اہل وقف کو زیادہ آمدنی دینے والا ہو تو اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اصل بیع کی حرمت ہے۔ اور بیع کی اجازت ضرورتاً ہے تاکہ مقاصد وقف ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیں۔ اور جب تک انتفاع ممکن ہو گرچہ کم ہی کیوں نہ ہو مقصود ضائع نہ ہوگا۔

عدم جواز والے قول کی دو بنیادیں ہیں: ایک تو یہ کہ قاضی حضرات دیانت دار اور صاحب تقویٰ نہیں ہوتے ہیں۔ اگر اس صورت میں تبادلہ کی اجازت دے دی جائے تو وہ بلا وجہ اور بلا ضرورت تبادلہ کر کے اوقاف کو ضائع کر دیں گے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو شئی موقوف کی وقفیت کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ تبادلہ کی اجازت یا تو واقف کی شرط کی بنیاد پر ہو سکتی ہے یا ضرورت کی بنیاد پر، اور اس صورت میں کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ آمدنی کو بڑھانا ضرورت میں شامل نہیں ہے۔

علامہ شامی نے صاحب نہر کے حوالہ سے صدر الشریعہ کا فتویٰ نقل کیا ہے: ''نحن لا نفتى به وقد شاهدنا فى الاستبدال مالا يعد ويحصى، فإن ظلمة القضاة جعلوه حيلة لإبطال أوقاف المسلمين'' (رد المحتار ۴.۳۸۹)۔

علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں تفصیلی بحث کے بعد فرماتے ہیں: ''والحاصل أن الاستبدال إما عن شرطه الاستبدال وهو مسئلة الكتاب أو لا عن شرطه، فإن كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف عليهم به فينبغى أن لا يختلف فيه كالصورتين المذكورتين لقاضى خان، وإن كان لا لذلك بل اتفق أنه أمكن أن يؤخذ بثمن الوقف ماهو خير منه مع كونه منتفعا به فينبغى أن لا يجوز؛ لأن الواجب إبقاء الوقف على ماكان عليه دون زيادة أخرى ولأنه لاموجب لتجويزه؛ لأن الموجب فى الأول الشرط وفى الثانى الضرورة، ولا ضرورة فى هذا إذ لاتجب الزيادة فيه بل تبقيه كما كان'' (شرح فتح القدير ۶.۲۱۲)۔

بعض فتاوی میں امام ابویوسفؒ کے قول پر بھی فتوی نقل کیا گیا ہے، جیسا کہ ''فتاوی قاری الہدایہ'' میں ہے، جس کو علامہ شامی نے نقل کیا ہے:

''الرابعة أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن صقعا، فيجوز على قول أبي يوسف و عليه الفتوى كما في فتاوى قارئ الهداية'' (رد المحتار ۳)۔

ایک روایت کے مطابق امام محمدؒ نے بھی تبادلہ اور بیع کی اجازت دی ہے:

''وقد روى عن محمد إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستبدال والقيم يجد بثمنها أخرى أكثر ريعا كان أن يبيعها و يشتري بثمنها ما هو أكثر ريعا'' (منحة الخالق على هامش البحر الرائق ۵،۲۲۲)۔

یہ مسئلہ منصوص نہیں ہے، بلکہ مجتہد فیہ ہے، حالات اور ضرورت کے لحاظ سے اقوال فقہاء بھی مختلف ہیں اور ترجیحات وفتاوے بھی مختلف ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اپنے زمانے کے قضاۃ کے حالات کو سامنے رکھ کر عدم جواز کا فتوی دیا ہے، اور امام ابویوسفؒ نے اپنے زمانے کے حالات اور تقاضے کو سامنے رکھ کر اور مزید مقاصد واقف کی حفاظت کی غرض سے جواز کا فتوی دیا ہے۔ ہمارے اس زمانہ میں امام ابویوسفؒ کے قول پر فتوی دینا اور اس پر عمل کرنا احسن معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ اس زمانہ کے قضاۃ سرکاری ہوتے ہوں اور ان میں ظلم وتشدد اور رشوت خوری عام ہو، لیکن ہمارے اس زمانہ میں چونکہ قاضی حضرات سرکاری نہیں ہیں، اس لئے الحمد للہ جہاں بھی قضاء کا نظام ہے وہاں کے قاضی حضرات رشوت خوری وغیرہ کے مرض سے دور ہیں۔ خصوصاً بہار واڑیسہ میں قضاء کا نظام بہت ہی مستحکم ہے اور یہاں کے قاضی حضرات نہایت ہی دیانتدار، صاحب تقوی اور علم وعمل اور عدل میں ممتاز ہیں۔ رشوت لیکر اوقاف کو ضائع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ حتی الامکان وقف کی وقفیت کو باقی رکھنا ضروری ہے، اور تبادلہ کی گنجائش یا تو وقف کی شرط کی بنیاد پر ہے یا ضرورت کی بنیاد پر، اور یہاں پر کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ تو میرے خیال میں اس صورت میں تبادلہ عین منشاء واقف اور مقاصد وقف کے مطابق ہے، اور اس میں اس کا تحفظ وبقا بھی زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ واقف کا مقصد تو یہی ہے کہ وقف کی آمدنی زیادہ سے زیادہ ہو تا کہ کار خیر پر صرف ہو اور اس کا ثواب اس کو زیادہ سے زیادہ ملے، اور اگر فروخت کر کے اس کو زیادہ نفع آور بنانے کی کوشش نہ کی جائے تو ممکن ہے کہ وہ آہستہ آہستہ معطل وبے کار ہو جائے، اور ایک ایسا وقت آئے کہ اس سے انتفاع ممکن نہ ہو، اور اس وقت یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے تبادلہ یا اس کو خریدنے کے لئے کوئی شخص تیار بھی ہو جائے، اگر کوئی تیار بھی ہو تو ممکن ہے کہ معمولی قیمت دے۔۔۔۔۔ اور چونکہ قاضی مصالح کا نگراں ہے اور ہر قاضی کو تبادلہ کا اختیار بھی نہیں ہے، بلکہ قاضی الجنۃ یعنی صاحب تقوی، علم وعمل اور عدل میں ممتاز قاضی کو اس کا اختیار ہے، اس لئے وہ یقیناً مصالح کا خیال رکھ کر ہی تبادلہ کی اجازت دے سکتا ہے، لہذا اس صورت میں بھی راقم الحروف کی ناقص رائے میں حالات وضرورت کے پیش نظر امام ابویوسفؒ کے قول پر عمل کی گنجائش ہونی چاہئے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ اگر معمولی نفع کا فرق ہو تو قاضی کو اس کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔

بانی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اس صورت میں بھی قاضی شریعت کی اجازت سے تبادلہ کے جواز کا فتوی دیا ہے، چنانچہ وہ ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''موقوفہ زمین کو بخیال زیادتی منافع تبدیل کرنا یا فروخت کر کے دوسری زمین خریدنا بحکم واجازت قاضی جائز ہے، بغیر اجازت وحکم جائز نہیں، پس اگر اس کی ضرورت ہے تو قاضی شریعت سے درخواست دے کر اور ثبوت بہم پہنچا کر اجازت حاصل کیجئے'' (مولانا سجاد صاحب کا یہ فتوی مطبوعہ نہیں ہے۔ طباعت کے بعد انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے)۔

واضح رہے کہ اس صورت میں اختلاف صرف اراضی موقوفہ کے سلسلہ میں ہے، مکان موقوفہ کے سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بالاتفاق اس کا تبادلہ جائز نہیں ہے۔ مکان کا قیاس زمین پر نہیں کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اگر زمین کی پیداوار کم ہو جائے تو لوگ اس کو اجارہ پر لینے، بلکہ بعض دفعہ خریدنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے، اس کے برخلاف مکان اگر اس کا کچھ حصہ ویران ہو جائے تو بھی لوگ اس کو طویل مدت کے لئے اجارہ پر لے سکتے ہیں۔

''إن الخلاف في الثالث إنما هو في الأرض إذا ضعفت عن الاستغلال بخلاف الدار إذا ضعفت بخراب بعضها ولم تذهب أصلا، فإنه لا يجوز حينئذ الاستبدال على كل الأقوال، قال: ولا يمكن قياسها على الأرض فإن الأرض إذا ضعفت لا يرغب غالباً في استئجارها بل في شرائها أما الدار فيرغب في استئجارها مدة طويلة لأجل تعميرها للسكنى'' (رد المحتار ۳،۳۸۷)۔

استبدال کی مزید دو صورتیں:

مذکورہ بالا تین صورتوں کے علاوہ استبدال کی مزید دو صورتیں کتب فقہ میں ملتی ہیں:

الف۔ کسی شخص نے اراضی وقف کو غصب کیا اور اس پر پانی جاری کر دیا، یہاں تک کہ وہ سمندر ہو گیا، تو ایسی صورت میں غاصب ان اراضی کی قیمت کا ضامن ہوگا، اس قیمت سے دوسری اراضی خریدی جائیں گی جو پہلی اراضی کی جگہ پر وقف ہوں گی۔

ب۔ غاصب نے وقف کی جائداد دینے سے انکار کر دیا، اور متولی کے پاس کوئی بینہ بھی موجود نہیں ہے، پھر غاصب نے اس کی قیمت دینے کا ارادہ کیا تو متولی قیمت لے کر دوسری زمین خرید کر وقف کر دے گا۔

''لا يجوز استبدال العامر إلا في أربع'' (در مختار) (قوله إلا في أربع) الأولى لو شرطه الواقف الثانية إذا غصبه غاصب وأجرى عليه الماء حتى صار بحرا فيضمن القيمة و يشترى المتولي بها أرضاً بدلاً، الثالثة أن يجحده الغاصب ولا بينة أي وأراد دفع القيمة فللمتولي أخذها ليشتري بها بدلاً'' (رد المحتار ۳،۳۸۹)۔

شئ موقوف کے تبادلہ کا اختیار کس کو ہوگا:

جن صورتوں میں واقف نے تبادلے کی شرط اپنے لئے لگائی ہے یا کسی دوسرے کے لئے، ان صورتوں میں تبادلہ کا اختیار واقف کی شرط کے مطابق خود واقف کو یا اس کے نامزد کردہ شخص کو ہوگا۔ اور جن صورتوں میں واقف نے اپنے یا کسی غیر کے لئے کوئی شرط نہیں لگائی ہے اور شرعاً تبادلہ کی گنجائش ہے، ان صورتوں میں تبادلہ کا اختیار صرف قاضی شریعت کو ہوگا، جو علم و عمل اور عدل میں ممتاز ہوں۔

''(وأما) الاستبدال ولو للمساكين آل (بدون الشرط فلا يملكه القاضي) والمستبدل قاضي الجنة المفسر بذي العلم والعمل الخ'' (در مختار)۔

علامہ شامیؒ استبدال کی شرطیں بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''ولا يخفى أن هذه الشروط فيما لم يشترط الواقف استبداله لنفسه أو غيره فلو شرطه لا يلزم خروجه عن الانتفاع ولا مباشرة القاضي له ولا عدم ريع يعمر به كما لا يخفى فاغتنم هذا التحرير'' (رد المحتار ۳،۳۸۸)۔

اب رہا یہ سوال کہ جن مقامات پر قاضی شریعت موجود نہ ہوں وہاں پر یہ اختیار کس کو ہوگا، تو میرے خیال میں چونکہ متولی مصالح وقف کا نگراں اور محافظ ہے، اس لئے اگر متولی دیانتدار، صاحب تقوی اور پابند شرع ہے تو اس کو یہ اختیار ہونا چاہئے، لیکن وہ اس طرح کا تبادلہ اپنے علاقہ کے متدین اور صاحب تقوی علماء کی نگرانی میں کرے، اور اگر متولی بھی نہ ہو تو وہاں کے مسلمان کسی صاحب علم و عمل اور عدل میں ممتاز شخص کو اس کا متولی اور نگراں بنا دیں، اور وہ تبادلہ کرے۔

''في الذخيرة سئل شمس الأئمة الحلواني عن أوقاف المسجد إذا تعطلت و تعذر استغلالها هل للمتولي أن يبيعها ويشتري بثمنها مكانها أخرى قال نعم'' (منحة الخالق على هامش البحر الرائق ۵،۲۲۷) ''اتفاق المشائخ المتأخرين على أن الأفضل لأهل المسجد أن ينصبوا متوليا ولا يعلموا القاضي في زماننا لما علم من طمع القضاة في أمور الأوقاف صرح به في التتارخانية وغيرها في كثير من كتب المذهب'' (منحة الخالق على هامش البحر الرائق ۵،۲۲۳)۔

مسجد اور دیگر اوقاف میں فرق:

واضح رہے کہ تبادلہ وقف کے سلسلہ میں مذکورہ بالا پوری تفصیل مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف یا خود مسجد پر وقف شدہ جائداد سے متعلق ہے، خود مسجد کے سلسلہ میں یہ تفصیل نہیں ہے، بلکہ مسجد مفتی بہ قول کے مطابق تا قیامت مسجد ہی رہتی ہے، اس کی مسجدیت کو باقی رکھنا ضروری ہے، کسی بھی حال میں، گرچہ اس کے اردگرد آبادی ختم ہو گئی ہو، ایک شخص بھی نماز پڑھنے والا نہ ہو، پھر بھی نہ تو اس پر ملکیت کے احکام جاری ہوں گے، نہ اس کی خرید و فروخت جائز ہے، نہ اس کا تبادلہ اور نہ ہی اس میں کوئی ایسا کام کر سکتے ہیں جو احترام مسجد کے خلاف ہو۔

''(ولوخرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الإمام والثانى) أبداً إلى قيام الساعة (وبه يفتى)حاوى القدسى(درمختار) (قوله ولوخرب ماحوله الخ) اى ولو مع بقائه عامراً و كذا لوخرب وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد آخر(قوله عند الإمام والثانى) فلا يعود ميراثا ولا يجوز نقله و نقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أولا وهو الفتوى حاوى القدسى وأكثر المشائخ عليه مجتبى وهو الأوجه فتح'' (رد المحتار ۳،۳۷۱)

منشاء واقف کی رعایت اور مقاصد وقف کا تحفظ وبقا ضروری ہے:

اوقاف کے سلسلہ میں منشاء واقف کی رعایت اور مقاصد وقف کا تحفظ وبقا ضروری ہے۔ یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ واقف نے کس مقصد کے لئے وقف کیا ہے، جس مقصد کے لئے وقف کیا ہے اسی میں اس کا استعمال ضروری ہے، دوسرے مقاصد میں استعمال منشاء واقف کے خلاف ہے۔ مثلاً اگر مسجد کے لئے اراضی وقف ہیں تو ان اراضی کی پیداوار کو مسجد ہی پر صرف کرنی ہوگی، مدرسہ یا دیگر کار خیر میں صرف نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مقصد وقف کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، کوئی ایسا کام نہ ہو جس سے مقصد وقف فوت ہو جائے، اگر کسی وجہ سے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو قاضی شریعت یا قاضی شریعت نہ ہوں تو متولی کی ذمہ داری ہے کہ ایسی کوشش کرے جس سے مقصد وقف کی حفاظت ہو سکے۔ مثلاً قدیم مسجد شہید کر کے نئی مسجد بنائی گئی، قدیم مسجد کے سامان مثلاً اینٹ یا لکڑیاں جن کی ضرورت نئی مسجد کو نہیں پڑی، اور ان کو فروخت نہ کرنے کی صورت میں ضائع ہونے کا یا چوری ہونے کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں مقاصد وقف کے تحفظ وبقا کے پیش نظر قاضی شریعت کی اجازت سے وہ فروخت کردی جائیں گی اور قیمت مسجد میں صرف ہوگی، یا کوئی قبرستان ہے جو بہت ہی وسیع ہے، مردے کم دفن ہوتے ہیں، کچھ حصہ پر غیروں نے قبضہ کر لیا ہے اور بقیہ حصہ پر بھی قبضہ کر لینے کا خطرہ ہے، تو ایسی صورت میں قبرستان کی حفاظت کی غرض سے چاروں طرف سے دوکان بنا کر کرایہ پر لگانے کی گنجائش ہے، قاضی شریعت کی اجازت سے ایسا کر سکتے ہیں۔

''على أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة'' (رد المحتار ۳،۴۲۲)۔

''وما انهدم من بناء الواقف وآلته صرفه الحاكم فى عمارة الوقف إن احتاج إليه وإن استغنى عنه أمسكه حتى يحتاج إلى عمارته فيصرفه فيها؛ لأنه لابد من العمارة ليبقى على التابيد فيحصل مقصود الواقف. فإن مست الحاجة إليه فى الحال صرفها فيها وإلا أمسكها حتى لايتعذر عليه ذلك أوإن الحاجة فيبطل المقصود وإن تغدر إعادة عينه إلى موضعه بيع و صرف ثمنه إلى المرمة صرفا للبدل إلى مصرف المبدل'' (هدايه كتاب الوقف ۲،۶۴۲)۔

وقف کی فاضل آمدنی کا مصرف:

اس ذیل میں ایک اہم بحث یہ آتی ہے کہ ایک وقف کی فاضل آمدنی جو اس کی ضروریات سے زائد ہے، اور مستقبل قریب میں بھی اس کی ضرورت پڑنے والی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس فاضل آمدنی کو کس مصرف میں صرف کیا جائے۔ مثلاً کسی مسجد پر کافی اراضی وقف ہیں، ان اراضی کی آمدنی ہر سال اتنی ہوتی ہے کہ مسجد کی ضروریات پر صرف ہونے کے باوجود بہت زیادہ بچ جاتی ہے، اس طرح ہر سال آمدنی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، جس کی ضرورت مسجد مذکور کو نہیں ہے، تو ایسی صورت میں مسجد مذکور کی موقوفہ اراضی سے حاصل ہونے والی فاضل آمدنی کو کس مصرف پر صرف کیا جائے؟...... اس سلسلہ میں کتب فقہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ایک وقف کی آمدنی اولاً اسی وقف پر یا اس کی ضروریات پر صرف کی جائے گی، مثلاً مسجد پر موقوفہ جائداد کی آمدنی پہلے مسجد پر یا اس کی دیگر ضروریات جیسے امام و مؤذن کی تنخواہ یا اس کے لئے چٹائیاں یا تیل وغیرہ پر صرف کی جائے گی، لیکن اگر مسجد مذکور کی آمدنی اس کی ضروریات سے فاضل ہو جس سے مسجد کو بے نیازی ہو، یا مسجد کی گھاس یا اس کی چٹائیاں ہیں جن سے مسجد بے نیاز ہے، یا حوض یا مسافر خانہ یا کنواں ہے جس پر اراضی وقف ہیں، اور وہ حوض یا مسافر خانہ یا کنواں خراب و ویران اور بے مصرف ہو گیا، اس پر رقم صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ یا اس کی موقوفہ اراضی سے حاصل ہونے والی آمدنی بہت زیادہ ہے، جو اس کی ضروریات سے فاضل ہے، موقوفہ اراضی سے حاصل ہونے والی آمدنی کی حفاظت کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، اور مزید اراضی خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے، نیز رقم کو محفوظ رکھنے میں ضیاع کا اندیشہ ہے، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ متولی وغیرہ اس کا بے جا استعمال کریں، تو ایسی صورت میں ایک وقف کی آمدنی اسی جنس کے وقف پر جو اس سے قریب ہو صرف کی جائے گی۔ مثلاً کسی مسجد کی فاضل آمدنی اس سے قریب کی مسجد یا اس کی ضروریات پر، پھر اس سے جو قریب ہو، اس طرح الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے پورے ہندوستان کی مساجد پر صرف ہوگی۔ یا حوض کی آمدنی قریب کے حوض پر، مسافر خانہ کی آمدنی

مسافر خانہ پر، مدرسہ کی آمدنی مدرسہ پر صرف ہوگی۔ مسجد کی آمدنی مدرسہ پر یا مدرسہ کی آمدنی مسجد پر یا مسجد و مدرسہ کی آمدنی حوض یا مسافر خانہ یا کنواں پر صرف نہیں ہوگی۔

''(ومثله) في الخلاف المذكور (حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما و) كذا (الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر) أو حوض (إليه) (درمختار) قوله إلى أقرب مسجد أو رباط الخ، لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض و عكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار ۳٫۳۷۱)۔

درمختار اور اس کے حاشیہ ردالمحتار میں اسی صفحہ کے بعد یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اگر واقف اور جہت وقف دونوں متحد ہوں، تو ایسی صورت میں ایک وقف کی آمدنی دوسرے وقف پر صرف کر سکتے ہیں، مثلاً کسی شخص نے اپنی ایک زمین کسی مسجد کی تعمیر، چونہ گردانی وغیرہ پر وقف کی اور دوسری زمین اسی مسجد کے امام ومؤذن کی تنخواہ کے لئے وقف کی تو ایسی صورت میں چونکہ واقف اور جہت وقف دونوں متحد ہیں، اس لئے اگر امام ومؤذن کی تنخواہ اس پر موقوفہ اراضی کی آمدنی سے پوری نہیں ہو پاتی ہے تو دوسری اراضی جو اسی مسجد کی تعمیر یا چونہ گردانی وغیرہ پر وقف تھی اس کی آمدنی امام ومؤذن کی تنخواہ پر صرف ہوگی۔۔۔ اور اگر واقف یا جہت وقف دونوں میں سے کوئی ایک بھی مختلف ہو تو پھر ایک وقف کی فاضل آمدنی دوسرے وقف پر صرف نہیں کر سکتے ہیں۔ مثلاً دو آدمیوں نے الگ الگ مسجد بنائی یا ایک شخص نے ایک مسجد اور ایک مدرسہ بنایا اور ان دونوں پر کچھ اراضی وغیرہ وقف کیا تو مسجد کی فاضل آمدنی مدرسہ پر یا مدرسہ کی فاضل آمدنی مسجد پر صرف نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر دو منزلہ عمارت وقف ہو، جس کی ایک منزل رہنے کے لئے اور دوسری منزل آمدنی حاصل کرنے کے لئے ہو تو یہ بھی جہت وقف کے مختلف ہونے کی صورت ہے، اس میں بھی ایک کی آمدنی دوسرے پر صرف نہیں کر سکتے ہیں۔

''(اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه) بسبب خراب وقف أحدهما (جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه)؛ لأنهما حينئذ كشئ واحد (وإن اختلف أحدهما) بأن بنى رجلان مسجدين أو رجل مسجدا و مدرسة ووقف عليهما أوقافا (لا) يجوز له ذلك (در مختار) (قوله اتحد الواقف والجهة) بأن وقف وقفين على المسجد أحدهما على العمارة والآخر إلى إمامه و مؤذنه والإمام والمؤذن لا يستقر لقلة المرسوم للحاكم الديني أن يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة إلى الإمام والمؤذن باستصواب أهل الصلاح من أهل المحلة، إن كان الوقف متحدا؛ لأن غرضه إحياء وقفه و ذلك يحصل بما قلنا... (قوله بسبب خراب وقف أحدهما) أي خراب أماكن أحد الوقفين... (تنبيه) قال الخير الرملي أقول ومن اختلاف الجهة ما إذا كان الوقف منزلين أحدهما للسكنى والآخر للاستغلال فلا يصرف أحدهما للآخر وهي واقعة الفتوى'' (ردالمحتار ۳٫۳۷۲)۔

حضرت تھانویؒ ''امداد الفتاویٰ'' میں اس طرح کے سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: رہا یہ کہ وہ مصالح مسجد سے بچ جاتا ہے اور اس کے جمع رکھنے میں احتمال ضیاع کا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس فاضل کو دوسرے مساجد کے مصالح پر صرف کرنا چاہئے جو مسجد موقوف علیہ سے قریب ہو، اور اگر اس مسجد قریب میں بھی استغناء ہو تو پھر اس کے بعد جو مساجد قریب ہوں حتی کہ دوسری بلاد ہند کی مسجد تک اس کی محل ہیں (امداد الفتاوی ۲ر ۶۱۴)۔

دوسرے سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: مدرسہ جنس مسجد سے نہیں، اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے، اگر اس شہر میں حاجت نہ ہو تو دوسرے شہر کی مساجد میں صرف کریں جو زیادہ قریب ہو اس کا حق مقدم ہے، اسی طرح بہ ترتیب (امداد الفتاوی ۲ر ۶۱۸)۔

فتاوی دار العلوم قدیم میں مفتی عزیز الرحمن صاحب، مفتی دار العلوم دیوبند ایک سوال (مسجد کی موقوفہ اراضی میں واقف یا غیر واقف مدرسہ بنا سکتا ہے یا نہیں؟) کے جواب میں فرماتے ہیں: نہیں بنا سکتا (فتاوی دار العلوم قدیم ۶،۵ر ۲۵۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک وقف کی فاضل آمدنی کو اسی نوع پر الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے صرف کریں گے، دوسرے وقف پر صرف نہیں کر سکتے ہیں۔

غیر آباد قبرستان کا حکم شرعی:

الف۔ غیر آباد وقف کو فروخت کر کے دوسری جگہ متبادل وقف قائم کرنا:

اوپر تمہید میں استبدال وقف سے متعلق پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، جس کی روشنی میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر مذکورہ موقوفہ قبرستان مدارس اور خانقاہیں یا ان پر موقوفہ جائداد جو مسلمانوں کے وہاں سے منتقل ہوجانے کی وجہ سے ویران اور غیر آباد ہیں، اور ان پر حکومت یا غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جارہا ہے۔ اگر ان اوقاف کے کاغذات موجود ہیں اور ان کاغذات میں یہ صراحت موجود ہے کہ خود واقف کو یا اس کے نامزد کردہ شخص کو شئ موقوف فروخت کر کے متبادل وقف قائم کرنے کا اختیار ہوگا، بلاشبہ خود واقف کو یا اس کے نامزد کردہ شخص کو واقف کی شرط کے مطابق مذکورہ اوقاف کو فروخت کر کے دوسری جگہ متبادل وقف قائم کرنے کا اختیار ہوگا۔ اور اگر وقف ڈیڈ میں اس طرح کی صراحت موجود نہیں ہے تو بھی چونکہ شئ موقوف فی الحال بے مصرف اور ویران ہے، مزید اس کے ضیاع کا اندیشہ ہے، اس لئے منشاء واقف کے تحفظ وبقا کے پیش نظر قاضی شریعت کی اجازت سے ان اوقاف کو فروخت کر کے دوسری جگہ متبادل وقف قائم کرسکتے ہیں۔ اگر قاضی شریعت موجود نہ ہوں تو پھر صاحب تقوی اور پابند شرع متولی اپنے علاقہ کے ایسے علماء کے مشورہ سے جو علم وعمل اور عدل میں ممتاز ہوں یہ کام کرسکتا ہے۔ اگر متولی بھی موجود نہ ہو تو پھر وہاں کے مسلمان کسی عالم باعمل اور عدل میں ممتاز شخص کو متولی بنادیں وہ یہ کام کرسکتا ہے۔

ب۔ کسی فرد یا حکومت سے تبادلہ:

ان اوقاف کا تبادلہ بھی شرعاً جائز ودرست ہے، خواہ حکومت سے کریں یا کسی فرد سے، مذکورہ اوقاف کو حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔

فروخت کرنے یا تبادلہ کرنے میں مساجد اور دیگر اوقاف کے درمیان فرق ہے۔ مذکورہ صورت میں اوقاف کو فروخت کرنے یا تبادلہ کرنے کا جو اختیار ہے وہ عام اوقاف کا حکم ہے، مسجد کا یہ حکم نہیں ہے، چونکہ جس جگہ ایک مرتبہ مسجد بن جاتی ہے وہ جگہ تا قیامت مسجد کے حکم میں رہتی ہے، اس کی مسجدیت کو تا قیامت باقی رکھنا ضروری ہے، اس لئے نہ تو مسجد کی جگہ کو فروخت کرسکتے ہیں اور نہ ہی اس کا تبادلہ کرسکتے ہیں، اور نہ اس میں کوئی ایسا کام کرسکتے ہیں جو احترام مسجد کے خلاف ہو۔

مقاصد واقف کے خلاف کام کرنا:...... چونکہ منشاء واقف اور مقاصد وقف کی رعایت ضروری ہے کوئی ایسا کام نہیں کرسکتے ہیں جو منشاء واقف اور مقاصد وقف کے خلاف ہو، لہذا صورت مذکورہ میں مذکورہ نا قابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم نہیں کرسکتے ہیں، شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے۔

الف۔ مسجد کی موقوفہ فاضل اراضی میں دینی یا عصری ادارہ قائم کرنا: مسجد کی موقوفہ اراضی میں گرچہ اس کی ضروریات سے فاضل کیوں نہ ہوں، کوئی بھی ادارہ قائم نہیں کرسکتے ہیں، خواہ وہ دینی ادارہ ہو یا عصری، شرعاً اس کی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ منشاء واقف اور مقاصد وقف کے خلاف ہے، جبکہ منشاء واقف کی رعایت ضروری ہے۔

ب۔ مسجد کی فاضل آمدنی کا استعمال تعلیمی یا رفاہی ادارہ کے لئے:...... اگر مسجد کی فاضل آمدنی ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس سے مزید اراضی خرید کر وقف کردیا جائے تاکہ آئندہ ضرورت پڑنے پر کام دے، اور اگر مزید اراضی خریدنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے رکھے رہنے میں ضیاع کا اندیشہ ہے تو اس کو قریب کی مسجد یا اس کی دیگر ضروریات پر صرف کریں گے۔ اگر قریب کی مسجد کو ضرورت نہ ہو تو پھر اس سے قریب کی مسجد پر، اسی طرح الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے مساجد ہی پر وہ رقم صرف کی جائے گی۔ تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے مسجد کی فاضل آمدنی کا استعمال نہیں کرسکتے ہیں، اس سے احتراز لازم ہے۔

ایک وقف کی فاضل آمدنی کا مصرف:...... الف، ب۔ اس کا جواب بھی تقریباً آ ہی گیا ہے۔ اگر واقعتہً ایک وقف کی آمدنی اس کی ضروریات سے فاضل ہوتی ہے، اور ہر سال رقم جمع ہوکر ایک بڑا سرمایہ بنتی جارہی ہے، جس کی طویل عرصہ تک حفاظت ایک دشوار مسئلہ ہے، بلکہ خطرہ سے خالی نہیں، تو ایسی صورت میں اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات پر وہ رقم صرف کی جائے گی، الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے صرف کرنی ہوگی۔ دیگر دینی، ملی اور علمی کاموں اور مساجد وغیرہ پر صرف نہیں کرسکتے ہیں۔

وقف شدہ مکان کو فروخت کرنا:

اس سے قبل گذر چکا ہے کہ استبدال کی تیسری صورت میں جب کہ شئ موقوف قابل انتفاع ہے، لیکن کم منفعت بخش ہے، اس کو زیادہ نفع آور بنانے کے لئے دوسری نفع آور شئ سے اس کا تبادلہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے۔ اور امام صاحبؒ کے نزدیک ناجائز۔ یہ اختلاف اراضی وقف کے سلسلہ میں ہے، مکان کے سلسلہ میں نہیں ہے۔ ایسی صورت میں موقوفہ مکان کا تبادلہ بالاتفاق جائز نہیں ہے۔ لہذا مذکورہ صورت میں جو مکان کسی مسجد یا مدرسہ پر وقف ہو، اس کا تبادلہ کسی دوکان سے جو کسی تجارتی مقام پر ہو جائز نہیں ہے، گرچہ اس سے معمولی کرایہ آتا ہو، جس سے مسجد یا مدرسہ کی ضرورتیں پوری نہ ہوتی ہوں۔

''إن الخلاف فی الثالث إنما هو فی الأرض إذا ضعفت عن الاستغلال بخلاف الدار إذا ضعفت بخراب بعضها ولم تذهب أصلا، فإنه لا یجوز حینئذ الاستبدال علی کل الأقوال قال ولا یمکن قیاسها علی الأرض، فإن الأرض إذا ضعفت لا یرغب غالبا فی استئجارها بل فی شرائها، أما الدار فیرغب فی استئجارها مدة طویلة لأجل تعمیرها للسکنی'' (رد المحتار ۳،۳۸۷)۔

جہت وقف ختم ہو جانے کی صورت میں شئ موقوف کا مصرف:

اگر کوئی جائداد کسی خاص خاندان کے فقراء کے لئے وقف ہو، اور وہ خاندان ہی ختم ہو جائے تو ایسی صورت میں اس موقوفہ جائداد کی آمدنی دوسرے فقراء و مساکین پر صرف ہوگی۔ اس لئے کہ جہت وقف ختم ہو جانے کی صورت میں اس کے حقدار فقراء و مساکین ہی ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ کی بنیاد اس پر ہے کہ شرائط وقف میں سے ایک شرط تابید بھی ہے۔ ایسی جہت بیان کی جائے جو ختم ہونے والی نہ ہو۔ البتہ اس جہت کی صراحت ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔۔۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی صراحت ضروری ہے۔ اگر بوقت وقف ختم نہ ہونے والی اس جہت کی صراحت نہ کی جائے تو وقف صحیح نہیں ہوگا۔۔۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وقف صحیح ہوگا، اور وہاں پر بھی تابید مقصود ہوگی، یعنی جہت وقف ختم ہو جانے کے بعد اس کی آمدنی فقراء و مساکین پر صرف کی جائے گی، فتوی امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے۔

''ولا یتم الوقف عند أبی حنیفة ومحمد حتی یجعل آخره بجهة لا تنقطع أبدا وقال أبو یوسف: إذا سمّی فیه جهة تنقطع جاز وصار بعدها للفقراء وإن لم یسمّهم۔۔۔ وقیل: إن التابید شرط بالإجماع إلا أن عند أبی یوسف لا یشترط ذکر التابید؛ لأن لفظة الوقف والصدقة منبئة عنه لما بینا أنه إزالة الملك بدون التملیك کالعتق، ولهذا قال فی الکتاب فی بیان قوله: وصار بعدها للفقراء وإن لم یسمّهم وهذا هو الصحیح'' (هدایه ۲،۶۳۹)۔

علامہ ابن ہمام نے ''شرح فتح القدیر'' میں برامکہ کے حوالہ سے لکھا ہے:

''قال أبو یوسف: إذا انقرض الموقوف علیهم یصرف الوقف إلی الفقراء'' (شرح فتح القدیر ۶،۱۹۹) ''(ویجعل آخره لجهة) قربة (لا تنقطع) هذا بیان شرائطه الخاصة علی قول محمد، لأنه کالصدقة وجعله أبو یوسف کالإعتاق واختلف الترجیح والأخذ بقول الثانی أحوط وأسهل بحر فی الدار وصدر الشریعة وبه یفتی وأقره المصنف'' (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۳،۳۶۵۔۳۶۶)۔

اور اگر کسی مسجد یا مدرسہ کے لئے وقف تھا، اور اب نہ وہ مسجد رہی اور نہ ہی مدرسہ، تو مسجد کے اوقاف کی آمدنی دیگر مساجد پر اور مدرسہ کے اوقاف کی آمدنی دیگر مدارس پر الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے صرف کی جائے گی۔ ایک کی آمدنی دوسرے پر صرف نہیں کر سکتے ہیں۔

الف۔ کسی بلڈر سے اس شرط پر مکان بنوانا کہ اس کی ایک منزل یا دو منزل اس کی ہوگی:

اگر وقف کی عمارت مخدوش حالت میں ہے، اور وقف کے پاس اس کی تعمیر کے لئے سرمایہ نہیں ہے، اسی طرح وقف کی کوئی زمین ہے، جس پر کوئی عمارت نہیں ہے اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی صورت ہے، اور کوئی بلڈر مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے یا خالی زمین پر چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط کے ساتھ تعمیر کرنے کے لئے تیار ہے کہ ایک یا دو منزل اس کی ملکیت ہوگی، جس میں اس کو ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہوگا، اور بقیہ منزلیں وقف کے مصارف

کے لئے ہوں گی، تو چونکہ اس صورت میں وقف کو کوئی نقصان نہیں ہے بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے، اور اس میں منشاء واقف اور مقاصد وقف کا تحفظ و بقا بھی ہے۔ اس لئے میرے خیال سے اس صورت کو جائز ہونا چاہئے اس طرح کا معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کا خاص خیال رکھا جائے کہ نیچے کی منزل وقف رہے، وہ بلڈر کی ملک نہ قرار دی جائے۔ اس میں فتنہ کا اندیشہ ہے۔

ب۔ موقوف زمین کے کسی حصہ کو فروخت کر کے اس کی قیمت تعمیرات میں لگانا:

جب وقف تام و مکمل ہو جائے تو اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت کسی مصرف پر صرف کرنا اور وقف کو وقفیت سے نکال دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ شئی موقوف کی وقفیت کو باقی رکھنا خواہ اصلی حالت میں ہو یا اس کی جگہ پر اسی نوع کی دوسری شئی خرید کر ہو ضروری ہے۔ لہذا مذکورہ صورت میں موقوفہ زمین و جائداد کے کسی حصہ کو فروخت کر کے اس کی قیمت مخدوش عمارت کی نئی تعمیر یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے یا نئی مسجد کی تعمیر پر صرف نہیں کر سکتے ہیں۔ شرعاً اس کی اجازت نہیں ہو گی اس سے احتراز لازم ہے۔

علامہ ابن نجیم "البحر الرائق" میں خلاصہ اور فتاوی نسفی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

"بيع عقار المسجد لمصلحة المسجد لا يجوز وإن كان بأمر القاضي وإن كان خرابا" (البحر الرائق ۵،۲۲۲)۔

مسجد یا قبرستان کی موقوفہ زمین پر مدرسہ کی تعمیر:

مسجد یا قبرستان کی موقوفہ زمین پر مدرسہ بنانا شرعاً صحیح نہیں ہے، گرچہ مسجد یا قبرستان کی ضروریات سے فاضل ہو، اس لئے کہ یہ منشاء واقف کے خلاف ہے۔ جب کہ منشاء واقف کی رعایت ضروری ہے۔

غیر آباد قبرستان کا حکم:

اگر قبرستان، اردگرد کی مسلم آبادی ختم ہو جانے کی وجہ سے غیر آباد ہو اور قبریں اتنی پرانی ہوں کہ مردے کو سڑ گل جانے کا ظن غالب ہو اور اس کے کچھ حصہ پر غیروں کا قبضہ ہو گیا ہو، اور بقیہ پر قبضہ کا خطرہ ہو، تو ایسی صورت میں قاضی شریعت کی اجازت سے اس پر ہر وہ کام کر سکتے ہیں جس سے مقاصد وقف کا تحفظ ہو سکے۔ مثلاً قاضی شریعت کی اجازت سے اس پر کھیتی کی جائے، یا مکان یا چاروں طرف سے دوکانیں بنا کر کرایہ پر لگا دی جائیں جس سے قبرستان کی حفاظت بھی ہو، اور بوقت ضرورت اس میں مردے دفن ہو سکیں، اس سے حاصل ہونیوالی آمدنی دوسرے قبرستانوں پر الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے صرف کی جائے گی۔

"كما جاز زرعه والبناء عليه إذا بلى وصار ترابا، زيلعي" (الدر المختار على هامش رد المحتار ۱،۶۶۲)۔

مساجد میں نماز پڑھنے سے روکنے کا اختیار:

مساجد کی بنیاد ذکر الہی نماز وغیرہ کے لئے ہے۔ اس میں نماز پڑھنے سے روکنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہے، نہ کسی فرد کو نہ ہی کسی حکومت کو۔ اس سے بڑھکر ظالم کوئی نہ ہوگا جو لوگوں کو مسجدوں میں نماز پڑھنے سے روکے...... اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

"ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها" (سورہ بقرہ: ۱۱۴)۔

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو مساجد میں اللہ کے ذکر سے روکے اور اس کو ویران کرنے کی کوشش کرے۔

لہذا صورت مسئولہ میں بعض مساجد کو محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی قرار دے کر ان میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکنا حرام اور بہت بڑا ظلم ہے۔ حکومت کو قطعاً اس طرح کا حق نہیں ہے، مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان مساجد کی بازیابی کی پوری کوشش کریں۔

قبرستان کی حفاظت کی غرض سے کناروں میں دوکان بنانا:

جب کہ قبرستان کی چہار دیواری کے لئے قبرستان کے پاس کوئی رقم نہ ہو اور چہار دیواری نہ کرانے کی وجہ سے قبرستان غیر محفوظ ہو تو اس کے اطراف میں لوگوں سے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے کر دوکانیں بنا کر ان کو کرایہ پر لگا سکتے ہیں۔ شرعاً اس کی اجازت ہوگی۔ لیکن اس کے لئے قاضی شریعت سے اجازت لینی ہوگی، قاضی شریعت سے اجازت لئے بغیر یہ کام نہیں کر سکتے ہیں۔

قبرستان میں موجود مسجد کی توسیع:

اگر مسجد اور قبرستان دونوں کے الگ الگ کاغذات موجود ہیں، اور کاغذات میں مسجد اور قبرستان دونوں کے رقبہ کی صراحت ہے تو پھر اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ اور اگر کاغذات موجود نہیں تو پھر یہی سمجھا جائے گا کہ منشاء واقف رقبہ کی تحدید نہیں ہے، بلکہ یہ مقصد ہے کہ پوری زمین مردوں کی تدفین اور مسجد کے لئے وقف ہے۔ ضرورۃً مسجد کی توسیع بھی ہوسکتی ہے، اور مردے بھی دفن کئے جاسکتے ہیں۔ لہذا اگر قبرستان کے اندر کی مسجد کے اردگرد مردے کبھی دفن نہیں ہوئے ہیں یا مردے تو دفن ہوئے ہیں، لیکن قبریں اتنی پرانی ہیں کہ مردوں کے سڑگل جانے کا ظن غالب ہے تو ایسی صورت میں مسجد کی توسیع قبرستان کی زمین پر کر سکتے ہیں۔ اور اگر قبریں نئی ہیں تو توسیع نہیں کر سکتے ہیں۔ البتہ بہتر یہی ہے کہ مسجد کو دو منزلہ اور سہ منزلہ بنا کر ضرورت پوری کر لی جائے تا کہ کسی طرح کا شبہ باقی نہ رہے۔

غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں مساجد و مقابر یا دیگر اوقاف کا رہنا:

غیر مسلم کا کیا ہوا وقف بھی صحیح ہے، البتہ اس کے وقف کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جس کے لئے وقف کر رہا ہے اس پر وقف کرنا اس کے نزدیک بھی باعث قربت ہو اور ہمارے نزدیک بھی۔ جیسے اپنی اولاد یا فقراء یا بیت المقدس پر وقف کرنا، اس کے نزدیک بھی باعث قرب ہے اور ہمارے نزدیک بھی۔ اگر اس کے نزدیک باعث قرب ہے، لیکن ہمارے نزدیک نہیں۔ مثلاً مندر کے لئے وقف۔ یا ہمارے، نزدیک ہے لیکن اس کے نزدیک نہیں۔ جیسے حج وغیرہ کے لئے تو وقف صحیح نہیں ہوگا۔ لہذا اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر کسی مسجد یا قبرستان کے لئے وقف کرتا ہے تو اس کا وقف صحیح ہوگا۔

”وأما الإسلام فليس من شرطه فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم كما لو وقف على أولاده أو على الفقراء أو على فقراء أهل الذمة، فإن عمم جاز الصرف إلى كل فقير مسلم أو كافر وإن خصص فقراء أهل الذمة اعتبر شرطه كما نص عليه الخصاف“ (البحر ۵٫۲۰۲)۔

”(قوله بشرط كونه قربة عندنا وعندهم) الظاهر أن هذا شرط فى وقف الذمي فقط ليخرج ما لو كان قربة عندنا فقط كوقفه على الحج والمسجد ماكان قربة عندهم فقط كالوقف على البيعة بخلاف الوقف على مسجد القدس، فإنه قربة عندنا وعندهم فيصح الخ“ (منحة الخالق على هامش البحر الرائق ۵٫۲۰۲)۔

اور جب غیر مسلم کا وقف صحیح ہے تو وہ اپنے اوقاف کا متولی بھی بن سکتا ہے، اس لئے کہ صحت تولیت کے لئے اسلام شرط نہیں ہے۔

”ويشترط للصحة بلوغه وعقله لا حريته وإسلامه لما فى الإسعاف“ الخ (رد المحتار مطلب فى شروط التولى ۲٫۳۸۵)۔

”ولا تشترط الحرية والإسلام للصحة لما فى الإسعاف ولو كان عبداً يجوز قياساً واستحسانا والذمي فى الحكم كالعبد الخ“ (الفتاوى الهنديه ۲٫۴۰۸)۔

لہذا مذکورہ صورت میں اگر ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد یا مقابر پر وقف کیا ہے اور نسلاً بعد نسل یہ تولیت ان کے خاندانوں میں آرہی ہے، جس کی وجہ سے آج بھی وہ اوقاف غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں ہیں تو ایسی صورت میں غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں ان اوقاف کا رہنا صحیح و درست ہے۔

☆☆☆

ویران مساجد کا حکم اور استبدال وقف

مولانا انیس الرحمن قاسمی [1]

نیکی اور خیر کے کاموں کی بقاء، مقاصد شریعت کی تکمیل اور فقراء وضعفاء کی مدد جیسے اعمال خیر کے لئے اللہ تعالی شانہ نے جان ومال کو خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔

خیر کے کاموں میں مال خرچ کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وقتی ضرورت اور لازمی مصارف میں صدقات نافلہ وصدقات واجبہ خرچ کیا جائے، تاکہ حاجتمندوں کی ضرورت پوری ہو۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وقتی حاجت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اجتماعی ضرورت اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے ٹھوس اموال کو ہمیشہ کے لئے وقف کردیا جائے، تاکہ اصل شئ کو باقی رکھتے ہوئے اسکے منافع استعمال میں لائے جائیں اور اس سے واقف کو اس کی وفات کے بعد بھی ہمیشہ اجر وثواب ملتا رہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''إذا مات ابن آدم انقطع عمله إلا من ثلاث، صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعوله'' (مشكوة المصابيح)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ جاریہ چھوڑنے کی نہ صرف ترغیب دی ہے بلکہ عملی طور پر بھی اسے اختیار کر کے انسانیت کے لئے بہترین اسوہ چھوڑا ہے۔ اور اپنی زندگی میں ایسے آٹھ باغ جو مدینہ میں تھے وقف کیا (روى البيهقي أنه ﷺ جعل سبع حيطان بها بالمدينة صدقة على بني عبد المطلب وبني هاشم و ذكر الماوردي ثماني حيطان) بلکہ اپنی زندگی کے تمام اندوختہ کو بھی وقف قرار دیا (ما ترك رسول الله ﷺ إلا بغلته البيضاء وسلاحه وأرضا جعلها صدقة، وروى أبو بكر قول النبي ﷺ نحن معاشر الأنبياء ما تركناه صدقة) (بخاری) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں جتنے بھی اصحاب مال تھے انہوں نے بھی کسی نہ کسی خیر کے کام میں مکان وزمین وغیرہ وقف کیا (قال جابر بن عبد الله: لم يكن أحد من أصحاب النبي ذو مقدرة إلا وقف) (المغنی لابن قدامہ ۵.۵۴۵) اور اس کا اثر بعد کی صدیوں میں بھی یہ رہا کہ تمام ایسی جگہوں میں جہاں مسلمان آباد ہوئے انہوں نے خیر کے کاموں میں زمین ومکان وغیرہ وقف کیا، اور آج عالم اسلام کا کوئی خطہ اس سے خالی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اوقاف کی حفاظت اور نگرانی کے لئے تمام اسلامی ممالک میں ''وزارت اوقاف'' اور وقف کے ادارے قائم ہیں۔

وقف کی صورت حال:

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اوقاف نے جہاں دینی تعلیم کی نشر واشاعت مسکینوں وبیواؤں کی مدد، مسافروں ومجاہدوں کی نصرت وحمایت اور اسلامی زندگی کی بقاء واستحکام میں ایک موثر کردار ادا کیا، وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اوقاف کی بڑی تعداد قلت پیداوار یا تعطل کا شکار ہو کر اپنا سابقہ کردار کھو چکی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ وقف اپنی ابتداء میں چاہے وہ مکانات ہوں، زرعی اراضی ہوں یا باغات ہوں۔ اپنی بہتر پیداوار وآمدنی کی وجہ سے مقاصد کے لئے بہت مفید ہوتا ہے، مگر بعد میں آہستہ آہستہ طول دہر سے مکان کی بنیاد جب کمزور ہو جاتی ہے پھر وہ منہدم ہو جاتا ہے، یا باغات واراضی کی دیکھ بھال کی کمی سے پیداوار صفر کے درجہ میں آجاتی ہے تو وقف اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتا ہے، جبکہ ذاتی باغات یا اراضی میں نئے درخت اور پودے لگائے جاتے ہیں اور ان کی دیکھ بھال ہوتی ہے، اس لئے وہ زرخیزی کو باقی رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انقلابات دہر کی بنا پر کبھی پوری کی پوری آبادی وہاں سے منتقل ہو جاتی ہے اور اوقاف بنجر بن جاتے ہیں۔ آج بیشتر ممالک کی اوقاف کی جائدادیں اپنے بنجر پنا، بوسیدگی، اور کھنڈر پنے کے ذریعہ پہچانی جاتی ہیں، بلکہ ایسے ممالک جہاں سے مسلمان مختلف سیاسی حالات اور ظلم وتشدد کی بنا پر نقل وہجرت سے دوچار ہوئے ہیں۔ جیسے برما، ہندوستان، روس، صقلیہ وغیرہ وہاں تو اوقاف کی حالت یہ ہے کہ یا تو ظالمین وغاصبین

[1] ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

کے قبضہ میں ہیں۔ جس میں افراد بھی ہیں اور حکومتیں بھی یا اگر موجود ہیں تو بنجر پنا کا شکار ہو کر غیر نافع ہو گئے ہیں۔ خود ہندوستان کی وہ ریاستیں جہاں سے مسلمان ۴۷ء یا اسکے قبل ہجرت کر گئے، یا شہید ہو گئے اور بستیاں ویران ہو گئیں جیسے ریاست پنجاب، ہریانہ، اتر پردیش، وغیرہ کے بعض علاقے وہاں کی مساجد، اوران کی جائدادیں، مدرسے وخانقاہیں اور مسافر خانے وغیرہ سے متعلق سیکڑوں اوقاف ایسے ہیں جن پر افراد یا حکومتوں کا قبضہ ہو گیا ہے، اور جو باقی ہیں وہ معرض خطر میں ہیں، اوران کی حفاظت مشکل ہے، نیز ان کی واقفین کے منشا وارادوں کے مطابق ان کا استعمال بھی نا قابل عمل ہو گیا ہے، اس لئے یہ سوال انتہائی اہم ہے کہ ایسے اوقاف کا کیا کیا جائے؟

وقف کا حکم:

اوقاف کے بارے میں گرچہ شریعت اسلامی کا عمومی حکم یہی ہے کہ جب کسی کار خیر کے لئے وقف کیا جائے۔ اور وہ وقف مکمل وصحیح ہو کر لازم ہو جائے تو واقف کے منشاء وارادہ کے مطابق اسکے منافع کا استعمال کیا جائے گا اور اصل شئ کو باقی رکھا جائے گا، چنانچہ امام برہان الدین مرغینانی، امام ابو یوسف اور امام محمد کے مسلک پر وقف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"(وهو) حبس العين على حكم ملك الله تعالى، فيزول ملك الواقف عنه إلى الله تعالى على وجه تعود منفعته إلى العباد، فيلزم ولا يباع ولا يوهب ولا يورث" (الهدايه مع فتح القدير ٦،٢٠٣) "ومن اتخذ أرضه مسجداً لم يكن له أن يرجع فيه ولا يبيعه ولا يورث عنه" (الهدايه مع فتح القدير ٦،٢٣٥)۔

لیکن سوال یہ ہے کہ واقف نے جس کار خیر کے لئے وقف کیا اور جن لوگوں پر اسکے منافع کو خرچ کرنے کا ارادہ کیا تھا اگر وہ افراد ہی ختم ہو جائیں تو ایسے اوقاف کو کیا کیا جائے، اگر اس حکم کو باقی رکھا جائے کہ نہ ان کو فروخت کیا جا سکتا ہے، نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ دینے والے کی ملکیت میں یا اس کی وفات کے بعد اسکے وارثین کی ملکیت میں وہ جائداد آ سکتی ہے تو اوقاف کا تعطل لازم آئے گا۔ جیسے کسی آبادی میں مسجد تھی وہاں کی آبادی دوسری جگہ پر منتقل ہو گئی اور پھر وہاں دوسرے لوگ آ کر آباد ہو گئے جو مسلمان نہیں ہیں ان کا مسجدوں پر قبضہ بھی ہو سکتا ہے، اسکے سامان ولکڑیاں اور اینٹ وغیرہ کو لوٹ بھی سکتے ہیں، اور اس جگہ کو رہائش وغیرہ کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں، بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں کی درجنوں مساجد غیر مسلمین کے زیر قبضہ جا چکی ہیں جن کو وہ رہائش خانوں یا مویشی خانوں وغیرہ میں تبدیل کر چکے ہیں، اس لئے ان ویران مساجد کے شرعی احکام پر غور کرنا ضروری ہے۔

ویران مساجد کا حکم اور استبدال وقف:

مساجد کی حیثیت "بیت اللہ" اور شعار اسلام کی ہے، ان کی حفاظت، دیکھ بھال، اور تعمیر وآباد کرنا ایمان والوں کا وصف ہے، اوران کی تخریب اہل کفر کا کام ہے، اس لئے مسلمانوں کے اوپر ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی نمازوں سے آباد کریں، اور اس کی ظاہری تعمیر وترقی میں حصہ لیں۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام ابو یوسف (ایک قول کے مطابق) یہ کہتے ہیں کہ اگر مسجدیں بستی کے ویران ہونے کی وجہ سے ویران ہو جائیں یا دوسری مسجد کے بن جانے کی وجہ سے اس آبادی کو اس مسجد کی ضرورت نہ رہ جائے۔ بہر حال جو مسجد ایک بار بن گئی ہے اس کی مسجدیت ختم نہ ہوگی بلکہ تا ابد رہے گی۔

"ولو خرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام والثاني، أبداً الى قيام الساعة" (الدر المختار ٣،٣٥٨)

"وهو قول أبي حنيفة ومالك والشافعي فلا يعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أولا، وهو الفتوى (حاوي القدسي) وأكثر المشائخ عليه (مجتبى) وهو الأوجه" (فتح) الخ بحر، (رد المحتار ٣،٣٥٨)۔

اور امام ابو یوسف کا دوسرا قول ہے کہ ایسی مسجد کے سامان کو قاضی کی اجازت سے فروخت کر کے اس کی قیمت دوسری مسجد میں صرف کر دی جائے۔

"وعن الثاني: ينقل إلى مسجد آخر بإذن القاضي جزم به في الإسعاف حيث قال، ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف فيباع نقضه بإذن القاضي ويصرف ثمنه إلى بعض المساجد" (رد المحتار ٣،٣٥٩)۔

یہی ایک قول امام احمد کا ہے: "وعن أحمد يباع نقضه ويصرف إلى مسجد آخر" (فتح القدير ٦، ٢٣٦)۔ "وقد روى على بن سعيد

عن الإمام أحمد أن المساجد لا تباع ولكن تنقل آلتها (مجموع فی المناقلة والاستبدال'' (تحقیق محمد سلیمان الأشقر ۵۱)۔

ایسا ہی قول بعض اصحاب شافعی سے منقول ہے:

''ولهم في آلة الوقف كاخشابه ان تعطلت وجه لمساغ بيعها، وسوغوا نقل آلة المسجد إذا تعطل الانتفاع به بخراب المحلة ونحوه إلى مسجد آخر ولم يخرجوا الأول عن كونه وقفا (مجموع في المناقلة والاستبدال'' (تحقیق محمد سليمان الأشقر ۵۱)۔

امام ابو یوسفؒ کے اس دوسرے قول کو مشائخ احناف میں سے امام ابوشجاع، شمس الائمہ حلوانی، شیخ الاسلام، علامہ ابن عابدین وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔

''وفي الخانية: رباط بعيد استغنى عنه المارة وبجنبه رباط آخر قال السيد الامام أبو شجاع: تصرف غلته إلى الرباط الثاني كالمسجد إذا خرب واستغنى عنه أهل القرية فرفع ذلك إلى القاضي فباع الخشب وصرف الثمن إلى مسجد آخر جاز، ونقل في الذخيرة عن شمس الأئمة الحلواني أنه سئل عن مسجد أو حوض خرب لا يحتاج إليه لتفرق الناس عنه هل للقاضي أن يصرف أوقافه إلى مسجد أو حوض آخر، قال نعم، ومثله في البحر عن القنية'' (رد المحتار ۴،۳۵۹)

(فتاوی خانیہ میں ہے کہ مسافر خانہ جو رہ گذر سے دور ہو اور گذرنے والے اس سے قریبی سرائے کی وجہ سے مستغنی ہوں تو سید الامام ابوشجاع کا قول ہے کہ اس کا سامان وغلہ دوسرے سرائے میں استعمال کیا جائے گا۔ جیسے کہ مسجد ویران ہو جائے اور گاؤں والوں کو اس کی ضرورت نہ ہو، پھر معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے، اور وہ لکڑی فروخت کردے اور اس کی قیمت دوسری مسجد میں لگادے تو جائز ہے۔ نیز ذخیرہ میں شمس الائمہ حلوانی سے منقول ہے کہ ان سے ایسی ویران مسجد یا حوض کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کی آبادی وہاں سے منتقل ہوگئی ہو اور لوگوں کو اس کی ضرورت نہ ہو تو کیا قاضی کے لئے یہ جائز ہے کہ اس کے اوقاف کو دوسری مسجد یا دوسرے حوض میں صرف کرے تو انہوں نے کہا، ہاں۔

علامہ ابن عابدین شامی اس مسئلہ پر اور لوگوں کی رائے نقل کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسجد اور حوض کے درمیان کوئی فرق کئے بغیر مذکورہ بالا مشائخ کا اتباع کیا جانا چاہئے، جیسا کہ امام ابوشجاع اور امام حلوانی نے فتوی دیا ہے۔ و کفی بهما قدوة.

اسکے بعد پھر ''ذخیرہ'' میں فتاوی نسفی کے حوالہ سے یہ ملا کہ شیخ الاسلام سے ایک ایسے محلہ کے بارے میں سوال کیا گیا جس کے افراد اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں اور اس کی مسجد خراب وخستہ ہو رہی ہے اور کچھ لٹیرے ان کی لکڑیوں کو اٹھا کر اپنے گھروں کو لے جا رہے ہیں تو کیا اس محلہ کے رہنے والوں میں سے کسی کے لئے اس کی اجازت ہے کہ قاضی کی اجازت سے اس کی لکڑیوں کو فروخت کردے اور اس کی قیمت کو محفوظ رکھے تاکہ کسی دوسری مسجد میں یا اسی مسجد میں پھر صرف کر سکے۔ تو انہوں نے جواب دیا، ہاں (ردالمحتار ۴/ ۳۶۰)۔

۱۔ مساجد کے بارے میں اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ویران وشکستہ مساجد کے سامان۔ مثلاً فرش، چٹائیاں، کتابیں، واٹر پمپ، پنکھا وغیرہ کو دوسری مساجد میں یا تو بعینہ منتقل کردیا جائے یا اسے فروخت کردیا جائے، جیسا کہ امام ابو یوسف سے منقول ہے اور ایک قول میں امام صاحب بھی یہی کہتے ہیں، اور یہی فتوی شمس الائمہ حلوانی اور امام ابوشجاع نے دیا ہے۔ علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

''وأما الحصير و القنديل فالصحيح من مذهب أبي يوسف أنه لا يعود إلى ملك متخذه بل يحول إلى مسجد آخر أو يبيعه قيم المسجد للمسجد لأنه ما جعله مسجدا ليصلى فيه أهل تلك المحلة لاغيره بل يصلي فيه العامة مطلقا أهل تلك المحلة وغيرهم۔ قال محمد ...ولو جعل جنازة و ملاءة ومغتسلا وقفا في محلة ومات أهلها كلهم، لايرد إلى الورثة بل يحمل الى مكان آخر۔ فان صح هذا من محمد فهو رواية في الحصر والبوارى أنها لا تعود إلى الورثة'' (فتح القدير ۶،۲۳۷)۔

یہی مسلک علماء ہند میں مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ کا ہے (کفایت المفتی ۷/ ۲۹۹۔ ۳۰۰)۔

۲۔ اور اگر مسجد ویران وشکستہ ہو جس میں لکڑیاں، اینٹیں، چھپر، لوہے، دروازہ وغیرہ ہوں جن کی ضرورت اس مسجد میں نہ ہو اور اسکے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو انہیں بھی امام ابو شجاع اور امام حلوانی کے فتوی پر عمل کرتے ہوئے دوسری مسجد میں بعینہ لگادی جائے، یا ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت لگادی جائے۔

فقہاء کی عبارتوں سے انقاض مسجد کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں قاضی موجود ہو اس کی اجازت سے ہی اسکو منتقل کیا جائے، اور جہاں قاضی نہ ہو وہاں اہل محلہ، یا وقف بورڈ، اصحاب فتوی کے مشورہ سے منتقل کریں یا فروخت کریں (قاضی خاں حاشیہ فتاوی ہندیہ ۳/ ۲۴۲) لیکن فقہاء کی بعض عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انقاض مسجد کی منتقلی کے لئے قاضی کی اجازت ضروری نہیں ہے، انقاض مسجد کو منتقل کرنے کے جواز کے قول کو مفتی کفایت اللہ صاحب، مفتی عزیز الرحمن عثمانی، علامہ انور شاہ کشمیری وغیرہ نے بھی اختیار کیا ہے (فتاوی مظاہر علوم/ ۱۵۰)۔

مفتی کفایت اللہ صاحب ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

مساجد اگر ایسی حالت میں ہو جائیں کہ ان میں پنجگانہ جماعت نہیں ہوتی اور ان کی حاجت نہ رہی تو ان کو محفوظ مقفل کر کے چھوڑ دیا جائے، اور یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کا سامان چرا کر لے جائیں گے تو ایسی چیزوں کو جو چرائی جاسکتی ہوں دوسری قریب ترین مسجد میں منتقل کر دینا چاہئے۔

ایک دوسرے جواب میں لکھتے ہیں: مسجد منہدم شدہ میں اگر وہ لکڑیاں کام میں نہ آسکیں تو دوسری مسجد میں یا مسجد کے موقوفہ مکانات میں استعمال کی جاسکتی ہیں (کفایت المفتی ۷/ ۲۹۹، ۳۰۰)۔

الف، ب۔ ویران مساجد کے اوقاف میں عصری تعلیمی ادارہ قائم کرنا:

ایسے ادارے جو خالص دینی نہیں جیسے عصری تعلیم کے ادارے، تو ایسے ادارے قائم کرنے کی ویسی ضرورت نہیں ہے جیسے کہ مدرسہ کی ہے، البتہ ایسے رفاہی شفاخانہ جو مسلمانوں کے لئے بالخصوص فقراء کے لئے ہوں تو ان کو بھی قائم کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس لئے اگر مصلحت عامہ اس کی متقاضی ہو اور ویران مساجد کے ایسے اوقاف کی اراضی موجود ہوں جن کے مصارف منقطع ہو گئے ہوں تو قاضی کی اجازت سے یا جہاں نظام قضاء نہ ہو وہاں وقف بورڈ ومتدین علماء کی اجازت سے قائم کیا جاسکتا ہے، گرچہ اصل اصول یہی ہے کہ ایسے اوقاف اسکے متماثل دیگر اوقاف ومصارف میں خرچ ہوں۔

ایسی ویران مساجد کی مسجدیت کو باقی رکھتے ہوئے اس کی حفاظت وبقاء اور آباد کرنے کے لئے وقتی طور پر اس میں دینی تعلیم کا نظم کیا جاسکتا ہے، بالخصوص اراضی مسجد کے اس حصہ میں جو مسجد سے خارج ہوتی ہے اس میں مدرسہ یا مکتب قائم کیا جائے۔ حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ ایک فتوی میں لکھتے ہیں:

مسجد کے احاطہ میں زمین فاضل ہے اور وہ نماز پڑھنے کے لئے نہیں ہے، یعنی حقیقتاً وہ مسجد نہیں تو اگر اس میں مدرسہ ومکتب بنایا جائے تو جائز ہے، بلکہ ان دنوں ضرور بنانا چاہئے تاکہ مسجد کی آبادی ہو اور بچے تعلیم پائیں (فتاوی امارت شرعیہ زیر طبع)۔

بہر حال آج کے دور میں مساجد کی آبادی اور تعلیم دین کی اشاعت کے لئے ویران مساجد میں درس دینا، اور اس سے ملحق اراضی میں دینی مدرسہ بنانا عین مصلحت شرعی ہے۔ اور واقف کی غرض اصلی "تسبیل منفعت" کی تعمیل ہے۔

آباد مساجد کی فاضل اراضی میں دینی وعصری ادارے قائم کرنا: ...... اور اگر ایسی مساجد جو آباد ہوں اور ان کی ضرورت سے زائد اوقاف ہوں تو ان کی فاضل وافتادہ اراضی میں اگر مدرسہ قائم کرنے کی ضرورت ہو تو متولی کی اجازت سے مدرسہ قائم کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت مولانا سجادؒ نے فتوی دیا ہے البتہ دیگر اداروں کے قیام کی ضرورت داعی ہو تو اسکے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ کرایہ پر مسجد کی فاضل اراضی کو حاصل کیا جائے پھر اس پر ادارہ قائم کیا جائے۔

اوقاف کی زائد آمدنی کا دوسرے مصرف میں خرچ کرنا:

الف، ب۔ ایسے اوقاف جو کسی مسجد یا درگاہ وغیرہ کار خیر کے لئے وقف ہوں اور ان کی آمدنی اتنی زیادہ ہو کہ جس مسجد یا درگاہ وغیرہ کے لئے وقف کیا گیا ہے اسکو نہ فی الحال ضرورت ہے اور نہ آئندہ اسکو ضرورت ہوگی اور آمدنی سال بسال جمع ہو کر ایک بڑا سرمایہ بنتی جارہی ہو جس کی حفاظت بھی دشوار ہو، اور حکومت منتظمین کی طرف سے اس میں دست درازی کھا جانے کا خطرہ بھی درپیش ہو تو سوال یہ ہے کہ ایسے اوقاف کی فاضل آمدنی کا کیا مصرف لیا جائے۔

۱۔ کیا اسی نوع کے دوسرے ضرورت مند اوقاف میں خرچ کیا جائے۔

۲۔ یا ان کے علاوہ بھی حسب ضرورت دیگر دینی و ملی کاموں میں خرچ کیا جائے۔

یہ ایسا مسئلہ ہے جو گذشتہ صدیوں میں پیش آیا تھا جس طرح آج کل درپیش ہے، اور فقہاء اسلام نے ہر دور میں اس کا جواب دیا ہے۔ مگر ان کا جواب متفقہ نہیں ہے، بلکہ حالات و زمانہ کے اعتبار سے مختلف ہے، چنانچہ فقہاء احناف کے ایک طبقہ نے تو اس بنیادی نکتہ کو سامنے رکھا ہے کہ واقف نے جس کام کے لئے وقف کیا ہے اس کی پوری پوری پابندی کی جائے اور وقف کی آمدنی اسی وقف میں استعمال کی جائے، اور اسکے علاوہ کسی دوسرے وقف یا کسی دیگر، دینی و ملی مصرف میں خرچ نہ کی جائے، جیسا کہ فقہ حنفی کی معتبر کتب فتاوی (البحر ازیہ، اور الدرر) وغیرہ میں اس کی صراحت موجود ہے، لیکن فقہاء احناف کا دوسرا طبقہ جہت وقف اور واقف کے اتحاد کی صورت میں ایک وقف کی فاضل آمدنی دوسرے محتاج وقف میں خرچ کرنے کی اجازت دیتا ہے، چنانچہ الدر المختار میں ہے:

''اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه، لأنهما حينئذ كشئ واحد، وإن اختلف أحدهما بأن بنى رجلان مسجدين أو رجل مسجداً ومدرسة ووقف عليهما أوقافا لا يجوز له ذلك'' (الدر المختار مع رد المختار ۳۶۰/۴)۔

واقف اور جہت وقف متحد ہو اور ایک وقف کی آمدنی کم ہو جانے سے اسکے موقوف علیہم کا وظیفہ کم ہو جائے تو حاکم کے لئے جائز ہے کہ دوسرے وقف کی بچی ہوئی آمدنی سے اس پر خرچ کرے، کیونکہ اس صورت میں دونوں وقف شئ واحد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اگر واقف یا جہت وقف مختلف ہو جیسے دو شخصوں نے دو مسجدیں بنائیں یا ایک شخص نے ایک مسجد اور مدرسہ بنایا اور دونوں کے لئے وقف کیا تو ایک وقف کی آمدنی دوسرے پر صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

فقہاء احناف کا تیسرا طبقہ اس صورت حال میں متولی اوقاف کو مطلقاً یہ اجازت دیتا ہے کہ ایک وقف کی فاضل آمدنی کو دوسرے وقف یا کار خیر میں صرف کر سکتا ہے، علامہ حموی لکھتے ہیں:

''ويعارضه ما فى فتاوى الإمام قاضي خان من أن الناظر له صرف فائض الوقف إلى جهات برّ بحسب ما يراه''

اور عدم اجازت والے حکم کا معارض وہ قول ہے جو فتاوی قاضی خاں میں ہے کہ ناظر کو جائز ہے کہ وقف کی فاضل آمدنی کو جہات خیر میں جس طرح مناسب سمجھے خرچ کرے۔

علامہ حموی نے عدم اجازت والے قول کی توجیہ یہ کی ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ ممانعت کا قول اس صورت میں ہے، جبکہ مسجد کو دیگر عمارتوں کی احتیاج ہو اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے روپیہ جمع کر کے رکھا جائے گا، تا کہ بوقت ضرورت صرف کیا جا سکے، اور مناسب ہے کہ مدارس اور رباط کے اوقاف بھی اسی حکم میں ہوں۔

بہر حال فقہاء احناف کا وہ طبقہ جو ایک وقف کے مال زائد کو دوسرے وقف میں استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے، اس میں بھی بعض افراد تو اتحاد واقف و اتحاد جہت کی شرط لگاتے ہیں، مگر بعض ایک مسجد کے مختلف اوقاف کو چاہے واقف ایک ہو یا مختلف ایک ہی قرار دیکر خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، چنانچہ خانیہ میں ہے:

''مسجد له أوقاف مختلفة لا بأس للقيم أن يخلط غلتها كلها وإن خرب حانوت منها فلا بأس بعمارته من غلة حانوت آخر؛ لأن الكل للمسجد ولو كان مختلفا لأن المعنى يجمعها''۔

علامہ شامی نے البحر کے حوالہ سے اس قول کو نقل کرنے کے بعد یہ لکھا ہے، ''ومثله فى البزازيه ''تأمل''۔

اس طرح فقہاء احناف کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ''مجتہد فیہ'' ہے اور اس بارے میں تین اقوال ہیں: پہلا قول عدم اجازت کا ہے، دوسرا قول مشروط اجازت کا ہے، اور تیسرا مطلق اجازت کا ہے۔ اور اسی آخری قول کو فقہاء ہند میں مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، مفتی عزیز الرحمن عثمانی، شیخ الہند محمود حسن، علامہ انور شاہ کشمیری، اور علامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہ نے اختیار کیا ہے، مفتی کفایت اللہ صاحب کے تحریر کردہ کئی فتاوی پر ان اکابر نے دستخط کئے ہیں۔ ایک فتوی میں وہ لکھتے ہیں:

ایسی حالت میں کہ مسجد کے اموال کثیرہ جمع ہوں اور مسجد کو نہ فی الحال اس کی حاجت ہو اور نہ ظن غالب فی المآل، اور ان کے اموال کے اسی طرح جمع رہنے میں ضائع ہو جانے اور متغلبین کے کھا یا اڑا جانے کا اندیشہ ہو تو یہ زائد از حاجت اموال جمع شدہ کسی دوسری محتاج مسجد میں خرچ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح

کسی ایسے دینی مدرسہ میں جو علوم شریعت تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم دیتا ہو خرچ کرنا جائز ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی نے فقہاء احناف کے ایسے کئی اقوال نقل کئے ہیں جس میں انہوں نے بعض صورتوں میں مسجد کے اوقاف سے ضرورت کے وقت قرض لینے، کسی فتنہ کے موقع پر مسجد میں اسباب وسامان کے ساتھ رہنے، زائد آمدنی کی صورت میں مال کے ضائع ہونے کے اندیشہ سے مسجد کے نقش ونگار میں اسے استعمال کرنے، مسجد کی لکڑی کو جلا کر ٹھنڈک زدہ شخص کو اپنی جان بچانے کی اجازت دی ہے۔ یہ سارے اقوال فتاوی ہندیہ، الدر المختار اور رد المحتار وغیرہ کتب فتاوی میں منقول ہیں۔ ان اقوال کو نقل کر کے تیسرے قول کی تائید میں بعض احادیث کو نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

منجملہ ان روایات حدیثیہ کے یہ روایت ہے جو امام مسلمؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ: ''سمعت رسول اللهﷺ يقول: ''لولا أن قومك حديثو عهد بجاهلية أو قال بكفر، لأنفقت كنز الكعبة في سبيل الله''۔

(میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا، فرماتے تھے کہ اگر تمہاری قوم قریب العہد بکفر نہ ہوتی تو میں کعبہ کا خزانہ سبیل خدا میں خرچ کر دیتا)۔

اور منجملہ ان کے وہ روایت ہے جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابووائل سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں شیبہ کے ساتھ خانہ کعبہ میں کرسی پر بیٹھا تھا تو انہوں نے کہا کہ اسی مقام پر حضرت عمرؓ بیٹھے تھے اور فرمایا تھا کہ میرا ارادہ ہوتا ہے کہ اس میں نہ چاندی چھوڑوں نہ سونا، سب تقسیم کر دوں الخ۔

خاکسار کہتا ہے کہ حضرت عمر کا تقسیم مال کعبہ کا ارادہ کرنا پہلی حدیث کے ان الفاظ کی تفسیر کرتا ہے جو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ کعبہ کا خزانہ راہ خدا میں خرچ کر دیتا، اور اس تقریر سے یہ وہم بھی دور ہو جاتا ہے کہ حضرت عمر کا ارادہ مخفیہ حجت نہیں، کیونکہ انہوں نے خود اس ارادہ کو چھوڑ دیا جب کہ شیبہ نے کہا کہ تمہارے دونوں ساتھیوں نے ایسا نہیں کیا تو حضرت عمر نے فرمایا کہ وہ دونوں شخص ایسے ہیں جن کی اقتدا کی جاتی ہے۔ تو حضرت عمر کا یہ فرمانا اس پر دال ہے کہ تقسیم نہ کرنا ہی فعل پسندیدہ اور شارع علیہ السلام کی مرضی کے موافق تھا۔ اور تقسیم کرنا ممنوع تھا۔ اس لئے حضرت عمر نے بھی تقسیم نہ کیا۔

وجہ اس وہم کے دور ہونے کی یہ ہے کہ ترک انفاق آنحضرت ﷺ نے ایک خاص علت سے کیا تھا۔ اور وہ قریش کا قریب العہد بکفر ہونا ہے۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں اس کی تصریح ہے، تو حضرت عمر کا ارادہ آنحضرت ﷺ کے ارادہ کے مطابق اور ان کا ترک آنحضرت ﷺ کے ترک کے موافق واقع ہوا، گرچہ آنحضرت ﷺ کے ترک کی وجہ اور تھی اور وہ وجہ حضرت عمر کے زمانہ میں موجود نہ تھی، لیکن انہوں نے بوجہ شدت شوق اقتضاء آثار پیغمبر ﷺ آپ کا اتباع کیا۔

علامہ عینی نے لکھا ہے کہ علامہ ابن الصلاح کا قول ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ غلاف کعبہ کو بیچے یا یونہی مسلمانوں کو عطا کر دے، اور انہوں نے استدلال کیا اس واقعہ سے جو ازرقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر ہر سال غلاف کعبہ اتارتے اور حجاج کو تقسیم کر دیتے۔

خاکسار کہتا ہے کہ حضرت عمر غلاف کعبہ کو اس لئے تقسیم کر دیتے تھے کہ کعبہ کو اس کی حاجت نہ تھی، کیونکہ اس پر تو ہر سال نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ تو اترا ہوا غلاف اگر تقسیم نہ کیا جاتا تو ضائع ہو جاتا، یا دربان بیچ کر اپنی حاجتوں میں خرچ کر لیتے اور حضرت عمر کے قول میں چاندی سونے سے مراد وہ خزانہ ہے جو خانہ کعبہ میں مدفون تھا، کعبہ کو جو مال دئے جاتے تھے وہ اس پر خرچ ہوتے تھے۔ اور جو بچتا تھا وہ اس میں دفن کر دیا جاتا تھا، جیسا کہ علامہ عینی نے قرطبی سے نقل کیا ہے، یہ تو اوقاف مساجد اور اسکے مثل کا حکم تھا۔ رہے اور اوقاف تو اس میں حاکم اسلام کو ذرا اختیار وسیع ہے۔ جیسا کہ متتبع پر ظاہر ہے۔

یہ تھیں وہ روایات حدیثیہ وفقہیہ جن سے قول ثالث کے لئے استفادہ واستیناس کیا جاسکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مفتی کو گنجائش ہے کہ وہ اس قول پر فتوی دیدے، بشرطیکہ اسکو وقف کے لئے اصلح اور عامۃ المسلمین کے لئے انفع سمجھے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے سامان شکستہ مسجد کے نقل کرنے کے بارے میں امام حلوانی اور امام ابوشجاع کے قول کو قابل اتباع قرار دیا ہے۔ باوجود یہ کہ اصل مذہب عدم جواز نقل ہے، اور یہ ضرورت کی بنا پر ہے (کفایت المفتی ۷/...)۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسی مساجد یا اوقاف کی زائد آمدنی جسے ان مساجد یا اوقاف کو نہ فی الحال حاجت ہے اور نہ ظن غالب میں مستقبل میں اس کی ضرورت ہو تو اس آمدنی کو اسی نوع کے قریبی اوقاف میں جنکو ضرورت ہو خرچ کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر قریبی اوقاف کو بھی حاجت نہ ہو تو مسلمانوں کے لئے ان کے تعلیمی دعوتی وغیرہ امور میں صرف کیا جائے یا کسی دیگر مصرف خیر میں خرچ کیا جائے جو مسلمانوں کے لئے انفع ہو، بہتر ہے کہ ایسے اموال کے بارے میں اپنے شہر کے مفتی کے مشورہ سے وقف کے متولی خرچ کریں۔ اور اگر مسجد ہو اور اس کی کمیٹی ہو تو باہمی مشورہ سے یا مصلیان کے مشورہ سے خرچ کیا جائے۔

اوقاف کی تبدیلی وفروختگی:

اوقاف کی جائدادوں کی بہتری اور منشاء واقف کی صوری یا معنوی تکمیل کے لئے ان کی تبدیلی یا فروختگی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اس بارے میں فقہاء کرام نے بنیادی طور پر اوقاف کے بارے میں اس بنیادی اصول کو پیش نظر رکھا ہے کہ وقف کو برقرار رکھا جائے، اور اس کی بربادی یا ناجائز قبضہ وکھا جانے کی صورتوں پر بند لگاتے ہوئے جن قیود وشرائط کے ساتھ اجازت دی ہے اس کا خلاصہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اراضی وقف کے تبادلہ کا مسئلہ ان چند اہم مسائل میں سے ہے جنکی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ مسئلہ کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت وہ ہے جسمیں واقف نے خود وقف کرتے وقت اس کی صراحت کردی ہو کہ اسے یا اسکے قائم مقام متولیان کو اراضی وقف کے تبادلہ کا حق ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے ایسی کوئی صراحت نہیں کی ہے، اور اس باب میں وقف نامہ خاموش ہے یا اسکی صراحت موجود ہے کہ واقف خود یا کوئی اور ان اراضی وقف کا تبادلہ نہیں کرسکتا، پھر اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو ان اراضی وقف سے بالکلیہ کسی طرح کی آمدنی اور نفع حاصل نہ ہوسکتا ہو، یا تھوڑی بہت آمدنی ہو بھی تو اس آمدنی کے حاصل کرنے پر ہونے والے اخراجات آمدنی سے زائد ہوں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس جائداد سے کچھ نہ کچھ آمدنی تو حاصل ہوتی ہے، لیکن اگر اس کا تبادلہ کردیا جائے تو زیادہ آمدنی حاصل ہونے کی توقع ہے۔

پہلی صورت میں جب کہ واقف نے خود تبادلہ کا اختیار اپنے لئے یا دوسروں کے لئے رکھا ہو اور اراضی وقف سے آمدنی حاصل نہیں ہوتی ہو تو اس اراضی کا تبادلہ کرکے دوسری اراضی حاصل کرنا جس سے وقف کو فائدہ پہنچے جائز ہے۔

دوسری صورت میں اگر بالکلیہ اراضی وقف آمدنی سے محروم ہے یا خرچ آمد سے زائد ہے تو اگرچہ واقف نے اسکے تبادلہ کی اجازت نہیں دی ہو، یا تبادلہ پر روک لگائی ہو، لیکن قاضی مصلحت وقت کو دیکھتے ہوئے تبادلہ کی اجازت دے سکتا ہے۔

اور تیسری صورت میں جب کہ اراضی وقف بالکل بے مصرف نہیں ہیں محض آمدنی کے اضافہ کے لئے تبادلہ چاہا جائے تو قول اصح اور مختار یہی ہے کہ ایسی صورت میں اضافہ آمدنی کی خاطر اراضی وقف کے تبادلہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

واضح رہے کہ یہ حکم اراضی کا ہے، وقف کے مکانات کا نہیں، وقف کا مکان اگر اس کا کچھ حصہ ویران ہوجائے تو اسے باتفاق رائے نہیں بدلا جاسکتا۔

"اعلم أن الاستبدال... إلى قوله على كل الأقوال" (ردالمحتار ۳،۵۳۶)۔

واضح رہے کہ اگر وقف نامہ میں واقف یا متولی وقف کے لئے تبادلہ اراضی وقف کی اجازت صراحتاً موجود ہو تب تو مطابق شرائط وقف واقف یا متولی مفاد وقت کو سامنے رکھتے ہوئے اراضی وقف کا تبادلہ کرسکتا ہے۔ اور اگر وقف نامہ میں تبادلہ کی اجازت مصرح نہیں ہے یا یہ صراحت موجود ہے کہ اراضی کا تبادلہ نہیں کیا جاسکتا، ان ہر دو صورتوں میں اگر ضرورت داعی ہو تو حکم قاضی سے ہی تبادلہ ہوسکتا ہے کہ وہ مصالح کا نگراں ہے، اور قاضی کے حکم سے تبادلہ کے لئے ضروری ہے کہ:

(۱) اراضی بالکلیہ بے مصرف ہوجائیں۔

(۲) اور وقف کے پاس ایسی آمدنی نہ ہو جس سے ان اراضی کو دوبارہ آبادی کے قابل بنایا جاسکے۔

(۳) اراضی کے بدلہ اراضی ہی حاصل کی جائے کہ روپیہ پیسہ اگر لیا گیا تو اسکے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

(۴) اس کی بھی رعایت رکھنا چاہئے کہ یہ تبادلہ غبن فاحش کے ساتھ نہ ہو۔

(۵) قاضی یا متولی وقف کسی ایسے شخص کے ساتھ اراضی وقف کا تبادلہ نہ کرے جو اس کا ایسا قریبی رشتہ دار ہو جس کی شہادت اسکے حق میں مقبول نہ ہو، جیسے باپ، بیٹا، بیوی وغیرہ۔ اسی طرح ایسے شخص کے ساتھ بھی تبادلہ نہیں کیا جائے جس کا کوئی دین قاضی یا اس متولی وقف پر واجب ہو۔ فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی قاضی کو اختیار حاصل ہوگا جو علم وعمل اور عدل میں ممتاز ہو۔

"(وأما الاستبدال... بدون الشرط فلا يملكه إلا القاضي) (درر) وشرط في البحر خروجه عن الا نتفاع بالكلية و كون البدل عقارا و المستبدل قاضي الجنة المفسر بذي العلم والعمل" (درمختار ۳،۵۳۶،۵۳۷) "والمعتمد أنه

بلا شرط يجوز للقاضي بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية وأن لا يكون هناك ريع للوقف يعمر به وأن لا يكون البيع بغبن فاحش'' (رد المحتار ۵۳۷)۔

یہ مسئلہ کہ اگر اراضی وقف سے آمدنی تو حاصل ہوتی ہو، لیکن اگر اس کا تبادلہ دوسری اراضی سے کرلیا جائے یا اسے فروخت کرکے دوسری اراضی حاصل کرلی جائے تو وقف کی آمدنی میں اضافہ ہوگا، کیا اضافہ آمدنی کے خیال سے اراضی وقف کا تبادلہ یا بیع درست ہوگا؟ اس بارے میں حضرت امام ابویوسفؒ جواز کی طرف گئے ہیں۔ اور اسی قول پر مذکور الصدر فتوی مبنی ہے، لیکن عام طور پر علماء محققین بدلے ہوئے حالات میں اموال وقف میں بیجا تصرف اور اس کی بربادی کو دیکھتے ہوئے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ جواز مبنی برضرورت ہے۔ اور اضافہ آمدنی ضرورت نہیں، اس سے بڑی ضرورت وقف کی حفاظت اور اسکو اہل ہوس کی دست برد سے بچانا ہے۔

مصارف منقطعہ کا حکم:

رہے ایسے اوقاف جن کے مصارف ختم ہوچکے ہیں، مثلاً کوئی جاگیر کسی خاص خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی، وہ خاندان ختم ہوگیا، یا اسکے افراد دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ یا وقف کسی مسجد ومدرسہ کے لئے تھا اور اب نہ وہ مسجد ہے نہ مدرسہ تو ایسے اوقاف کی آمدنی کو بھی اسی نوع کے کسی دوسرے مدرسہ ومسجد یا فقراء پر خرچ کیا جائے، اگر آبادی بالکل اجڑ گئی ہو اور قریب میں اس نوع کا وقف یا مصرف نہ ہو تو دیگر جگہ کے مصرف خیر میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایسے اوقاف کی آمدنی نئے مصارف میں خرچ کرنے کے لئے اگر قاضی ہو تو اس سے یا مفتی سے اجازت وفتوی لیکر خرچ کیا جائے۔

''وفي الخانية رباط بعيد استغنى عنه المارة و بجنبه رباط، قال السيد الإمام أبو شجاع: تصرف غلته إلى الرباط الثاني كالمسجد إذا خرب و استغنى عنه أهل القرية فرفع ذلك إلى القاضي فباع الخشب وصرف الثمن إلى مسجد آخر جاز''۔

(اگر کوئی رباط (مسافر خانہ) دور پر واقع ہو، اور گذرنے والوں کو قریبی دوسرے رباط کی وجہ سے اس کی ضرورت نہ پڑتی ہو تو امام ابوشجاع کا قول ہے کہ پہلے رباط کے غلہ وآمدنی کو اس دوسرے رباط میں خرچ کیا جائے، جیسے کوئی ویران مسجد کہ اہل محلہ کو اس کی حاجت نہ ہو، اور یہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش ہوا اور قاضی نے اس کی لکڑی فروخت کردی اور قیمت دوسری مسجد میں خرچ کردی تو جائز ہے)۔

ویران مساجد کے اوقاف میں دینی ادارہ قائم کرنا:

عام طور پر مساجد کے لئے اراضی اور عمارتیں بھی وقف ہوتی ہیں۔ جو مساجد ہی کی طرح دائمی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اوقاف دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو صرف کسی معین مسجد کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں امام ابوحنیفہ وامام محمد کہتے ہیں کہ وقف صحیح نہیں ہے۔

''ولا يتم الوقف عند أبي حنيفة ومحمد حتى يجعل آخره لجهة لا تنقطع أبداً كالمساكين ومصالح الحرم والمساجد بخلاف ما لو وقف على مسجد معين ولم يجعل آخره لجهة لا تنقطع لا يصح لاحتمال أن يخرب الموقوف عليه''۔

لیکن امام ابویوسف کہتے ہیں کہ آخری جہت غیر منقطعہ کا تذکرہ اگر نہیں کیا گیا تو بھی وقف صحیح ہے اور موقوف علیہ کے ختم ہونے کے بعد وقف فقراء کے لئے ہوجائے گا۔

''وقال أبو يوسف: إذا سمى فيه جهة تنقطع جاز وصار بعدها للفقراء وإن لم يسمهم''۔

بہرحال ان ویران مساجد کے اوقاف یا تو امام اعظم کے مسلک پر ہوں گے اور معین مسجد کے ساتھ دیگر مساجد کے لئے یا فقراء وغیرہ پر بھی صرف کا تذکرہ ہوگا۔ یا امام ابویوسف کے مسلک پر ہوگا تو بھی یا تو معین وغیر معین مساجد شامل ہوں گی یا فقراء شامل ہوں گے۔ اس لئے ایسے ویران مساجد کے اوقاف کے وقف نامہ میں اگر صراحت ہو تو اسکے مطابق عمل کی کوشش ہوگی۔ اور جہاں وقف نامہ موجود نہ ہو اور نہ واقف ہو اور نہ ہی اسکے عہد کے لوگ ہوں جن سے معلوم ہوسکے تو ایسے اوقاف کا پہلا حکم تو یہی ہوگا کہ دوسری مساجد میں ان کا غلہ صرف کیا جائے اور اگر وہ نہ ہوں یا ضرورت نہ ہو تو فقراء پر صرف کیا جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا ویسے ویران مساجد کے اوقاف کی اراضی یا مکان میں کوئی دینی ادارہ، مدرسہ، دعوت وتبلیغ کا مرکز یا مسلمانوں کے لئے اسکول،

شفاخانہ، وغیرہ قائم کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

اس بارے میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے اصل مسجد کے بارے میں جو بحث کی ہے کہ اس کی مسجدیت تا قیامت باقی رہے گی۔ یہ بات مساجد کے دیگر اوقاف کے بارے میں نہیں ہے۔ کیونکہ مسجد کی اصل جگہ کو تو باقی رکھنے کا حکم ہے چاہے وہ ویران ہو یا آباد۔ لیکن مساجد کے دیگر اوقاف کے استبدال و بیع کی خاص حالت میں اجازت ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مسجد کی اصل جگہ کے کچھ مخصوص احکام ہیں جو مسجد کے دیگر اوقاف کے لئے نہیں ہیں۔ مثلاً مسجد میں رہائش اختیار کرنا۔ جنبی یا حائضہ کا اس میں داخل ہونا۔ بلند آواز سے بولنا، لڑنا جھگڑنا، خرید و فروخت کرنا۔ پاخانہ پیشاب کرنا۔ وغیرہ امور شنیعہ ناجائز ہیں، جبکہ مسجد کے دیگر اوقاف کی عمارتوں و اراضی کا یہ حکم نہیں ہے۔

اس لئے ویران مساجد کے اوقاف منقطعہ میں اگر مصلحت و ضرورت شرعی کسی دینی مدرسہ کے قیام کی متقاضی ہو تو قاضی شریعت کی اجازت سے اگر نظام قضاء ہو یا وقف بورڈ اصحاب علم کے مشورہ سے اس کی اجازت دیگر قائم کرائے۔ کیونکہ جسطرح مسجد مسلمانوں کی عمومی دینی ضرورت کے لئے ہوتی ہے اسی طرح مدرسہ بھی عمومی دینی ضرورت کے لئے ہوتا ہے، مولانا سجادؒ نے اپنے فتویٰ میں مسجد کی افتادہ اراضی میں مدرسہ قائم کرنے کی اجازت دی ہے، بلکہ اسے حالات کے پیش نظر ضروری قرار دیا ہے، بلکہ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے ویران مسجد میں درس و تدریس کا نظام قائم کرنے اور چلانے کی اجازت دی ہے (فتاوی محمودیہ)۔

ویران مقابر کی اراضی کا استعمال:

قبرستان بھی مساجد کی طرح عام طور پر وقف ہوتے ہیں۔ اور کہیں ذاتی و نجی بھی ہوتے ہیں۔

ایسے قبرستان جس کی اراضی کسی کی ذاتی ملک ہو اور اس میں اپنے مردوں کو دفن کرتے ہوں مگر دوسروں کو دفن کی عام اجازت نہ ہو اور اس کی اراضی کو مالک نے اپنی ملک سے خارج نہ کیا ہو تو فقہاء اسکے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر قبریں جدید ہوں تو ان کا احترام کیا جائے، لیکن اگر اتنی پرانی ہوں کہ لاش مٹی بن چکی ہو تو اس کی سابقہ حرمت باقی نہیں رہتی ہے، اور مالک اراضی کو اس میں مالکانہ تصرف کا حق ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ زیلعی نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر نعش بوسیدہ ہوگئی اور مٹی بن گئی تو دوسرے کا اس قبر میں دفن، اس میں کاشت کرنا، اور اس پر عمارت بنانا جائز ہے۔

اراضی قبرستان کسی کی ذاتی ملک و شخصی تحویل میں نہ ہو، بلکہ عام مسلمانوں کے لئے ہوں تو ایسے اراضی قبرستان وقف ہوتے ہیں، چاہے وقف صراحتاً کی گئی ہو یا موتیٰ کے دفن کی عام اجازت دے دی گئی ہو، امام محمدؒ کے قول کے مطابق قبرستان کے وقف کے لئے نہ زبان سے کہنا ضروری ہے نہ کسی متولی کا قبضہ ضروری ہے، بلکہ عملاً کسی اراضی پر مردوں کو دفن کیا جانے لگے تو ملک زائل ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت عام وقف کی ہو جاتی ہے، یعنی قرائن و آثار سے اجازت کا واضح ہو جانا کافی، البتہ یہ ضروری ہے کہ اذن عام ملک خاص میں ہو، مشترک و مشاع جائداد میں نہ ہو۔

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے: امام ابو یوسفؒ کے نزدیک محض زبان سے کہہ دینے کی وجہ سے واقف کی ملک زائل ہو جائے گی، اور امام محمدؒ کے نزدیک جب لوگ سقایہ سے پانی کھینچنے لگیں، مسافر خانوں میں اور رباطوں میں ٹھہرنے لگیں، اور قبرستان میں تدفین شروع ہو جائے تب ملک زائل ہوگا (الہندیہ ۲/۳۵۰)۔

اور جب ایک بار قبرستان وقف ہو گیا تو ہمیشہ کے لئے وقف ہو گیا۔ اب نہ اس کی بیع درست ہے اور نہ کسی کی ذاتی ملک قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہدایہ میں ہے:

اور جب وقف صحیح ہو گیا تو اب نہ اس کا فروخت کرنا درست ہے اور نہ کسی اور کو مالک بنانا (الہدایہ مع فتح القدیر)۔

قبرستان چاہے قدیم و مردہ ناقابل استعمال ہو یا جدید و قابل استعمال ہو اسکے فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ اس پر غور کیا جاسکتا ہے کہ ایسے قدیم و مردہ قبرستان جن میں عرصہ دراز سے دفن موتیٰ کا کام نہیں لیا جارہا ہے اور نہ آئندہ یہ مصرف لئے جانے کا بظاہر امکان ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کا قوی امکان ہے کہ ان اراضی پر غاصبین کا قبضہ بڑھتا جارہا ہے، اور آئندہ ان کے قبضہ کو ہٹانا ناممکن ہے یا بے حد دشوار ہے اور ان مقابر کے ختم ہو جانے ہی کا خدشہ یقینی ہے تو فقہاء احناف کے مشائخ متاخرین شمس الائمہ حلوانی اور امام شجاع کے اقوال سے استیناس کرتے ہوئے، اور زیلعی کے اس قول کے پیش نظر کہ جب قبر میں میت کی نعش بوسیدہ ہو کر مٹی میں مل جائے تو اس پر کھیتی کی جاسکتی ہے اور مکان بنایا جاسکتا ہے۔ فقہاء ہند میں مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مفتی نظام الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب وغیرہ نے ایسے قدیمی ناقابل استعمال اور خطرہ غصب سے گھری ہوئی اراضی قبرستان میں مسجد و مکانات بنانے کی اجازت دی ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی لکھتے ہیں: اگر یہ قبرستان زمین موقوفہ میں تھا جو دفن اموات کے لئے وقف تھی اسکو کسی دوسرے کام میں لانا جائز نہیں۔ ہاں اگر اس میں دفن اموات کی اجازت نہ رہی ہو تو جب کہ مردوں کے جسم مٹی ہو جانے کا گمان غالب ہو جائے اس وقت اس زمین کو کھیت یا باغ بنا کر اس کی آمدنی کو کسی دوسرے قبرستان کے ضروری مصارف میں صرف کیا جائے گا، اور اگر زمین وقف نہ ہو، بلکہ مملوکہ ہو تو مالک آمدنی کو اپنے صرفہ میں لاسکتا ہے (کفایت المفتی ۷ر ۱۲۳)۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب لکھتے ہیں: ہاں جو موقوفہ قبرستان اس حالت میں پہنچ گیا ہو کہ اس میں تدفین موقوف ہوگئی اور آئندہ اس کی توقع بھی نہ ہو کہ تدفین ہوگی، بلکہ اس کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو گیا ہو تو اس کے اور اس کے واقف کے منشاء کے تحفظ و بقا کے لئے جو مناسب صورت ہو اختیار کرنا ضروری ہے، مثلاً یہ کہ اسکو چہار دیواری سے محفوظ کر کے اس میں کل کے اندر باغ لگا کر یا مثلاً اسکے حواشی پر بیرون رخی دکانیں بنوا کر اور اندر باغ لگا کر اس کی آمدنی دوسرے محتاج اعانت قبرستان پر خرچ کی جائے، اور اگر دوسرا قبرستان محتاج اعانت نہ ہو تو اس کی آمدنی دینی مدارس پر خرچ کی جائے یا اس میں مسجد تعمیر کردی جائے یا دینی مدرسہ قائم کردیا جائے (نظام الفتاوی ار ۱۷۴۔ ۱۷۵)۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب لکھتے ہیں: پس پنجاب وغیرہ کی صورت حال جہاں سرے سے ان قبرستانوں کے ختم ہوجانے کا اندیشہ ہی یقینی ہے ایسے مجتہد فیہ مسائل میں کسی ایک پہلو پر اصرار جس سے دین کے عام مصالح مجروح ہوتے ہوں صحیح نہیں معلوم ہوتے۔

لہذا ایسے قدیم مقابر جو عرصہ سے غیر آباد ہیں اور آئندہ بھی ان کے آباد ہونے کی توقع نہیں ان پر عمارتیں بنا کر کرایہ پر لگائی جاسکتی ہیں، اور ان اراضی کو لیز پر بھی دیا جاسکتا ہے، تاکہ اصل اراضی وقف کی حیثیت سے باقی رہ سکے اور اس سے آمدنی حاصل ہوتی رہے۔

اور اس طرح کی آمدنی کو اولاً دیگر مقابر کے تحفظ یا ایسے شہروں وآبادیوں کے لئے قبرستان کی اراضی حاصل کرنے پر خرچ کرنا چاہئے جہاں قبرستان کی ضرورت ہے، اگر اس طرح کے مدات پر خرچ کے بعد رقم بچ جائے تو اسے مدارس، مسافر خانوں، نادار بچوں کی تعلیم میں اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ کیا جاسکتا ہے (بحث ونظر جلد ۲، شمارہ ۱۰۳۔ ۱۰۵)۔

اس بحث سے مقابر ومساجد کے علاوہ دیگر اوقاف، مثلاً خانقاہ، سرائے وغیرہ جو ویران ہو گئے ہوں، اور ان کی اراضی موجود ہوں اور ان کے مصرف کا انقطاع ہو تو حسب ضرورت دینی ومصلحت شرعی قاضی کی اجازت سے مدارس وغیرہ ان میں قائم کئے جاسکتے ہیں، احکام شرع سے واقف دقیق النظر علماء پر یہ مخفی نہیں ہے کہ مساجد ومقابر کے علاوہ دیگر اوقاف کے احکام قدرے مختلف ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اوقاف

مولانا ظفر عالم ندوی [1]

جو اوقاف ویران ہو چکے ہیں، مسلمانوں کی آبادی وہاں نہ ہونے کی وجہ سے ان کا آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق ان کو بروئے کار لانا ناقابل عمل ہو گیا ہے اور ان پر حکومت یا غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہے، مساجد کے علاوہ ایسے تمام اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی رعایت کرتے ہوئے ان کی جگہ متبادل وقف ایسی جگہ قائم کرنا جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو شرع اسلامی کی رو سے جائز اور درست ہے، استبدال وقف کے سلسلہ میں فقہاء نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کے پیش نظر سوال میں مذکور صورت کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے استبدال وقف پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''والثانی أن لا یشترطه سواء شرط عدمه أو سکت لکن صار بحیث لا ینتفع به بالکلیة بأن لا یحصل منه شئ صلا أو لا یفی بمؤنته فهو أیضا جائز علی الأصح إذا کان بإذن القاضی ورأیه المصلحة فیه'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۴،۳۸)

اس سلسلہ میں علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے، استبدال کی شرطوں، اس کے جواز و عدم جواز کے پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور اس مسلہ کے جزئیات کو بھی پیش کیا ہے، طوالت کے خوف سے علامہ موصوف کے کلام کو یہاں پیش کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔

مساجد و دیگر اوقاف میں فرق ہے، ویران یا غیر مفید ہونے کی صورت میں عام اوقاف کا استبدال درست ہے لیکن مساجد کا استبدال اور منتقلی جمہور فقہاء کی ئے کے مطابق ہرگز درست نہیں، علامہ حصکفیؒ نے درمختار میں لکھا ہے:

''ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الإمام والثانی أبدا إلی قیام الساعة وبه یفتی'' (درمختار ۴،۳۵۸)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے:

''وکذا لوخرب ما حوله ولیس له ما تعمربه وقد استغنی الناس عنه لبناء مسجد آخر... فلا یعود میراثا ولا یجوز نقله ونقل ماله إلی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أو لا وأکثر المشائخ علیه وهو الأوجه'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۴،۳۵۸)۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ نے مسجد کی حیثیت متعین کرتے ہوئے امام ابو یوسفؒ کا قول عدم استبدال کا نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

''وقال أبو یوسف: هو مسجد أبدا إلی قیام الساعة لا یعود میراثا ولا یجوز نقله، ونقل ماله إلی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أولا وهو الفتوی'' (البحر الرائق ۵،۲۵۱)۔

فتاوی ہندیہ میں اسی طرح فتاوی قاضی خاں (ص ۱۷۵) و فتح القدیر (۶/۲۲۸) میں بہت سے جزئیات موجود ہیں جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بوقت ضرورت بھی مسجد کا استبدال اور اس کی تبدیلی جائز نہیں۔ ''فتاوی ہندیہ'' سے ایک جزئیہ یہاں بطور نظیر درج کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ کی پوری نوعیت واضح ہو جائے:

''ولو کان مسجد فی محلة ضاق علی أهله ولا یسعهم أن یزیدوا فیه فسألهم بعض الجیران أن یجعلوا

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

ذلك المسجد له ليدخله في داره ويعطيهم مكانه عوضاً ما هو خير له، فيسع فيه أهل المحلة قال محمد: لا يسعهم ذلك'' (فتاوی ھندیه ۲،۴۵۷)۔

اس جگہ یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ مسجد کا حکم الگ ہے اور اس کے اوقاف کا حکم الگ ہے، مساجد کے اوقاف کا حکم عام اوقاف کی طرح ہے، علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے واقدیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے:

''والوقف علی المسجد ليس كالمسجد في حرمة البيع والاستبدال مطلقاً''۔

آگے فتاوی ظہیریہ کے حوالہ سے ایک فتوی نقل ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کے اوقاف کا حکم مساجد سے جدا ہے۔

''سئل الحلواني عن أوقاف المساجد تعطلت وتعذر استغلالها هل للمتولي أن يبيعها ويشتري بثمنها أخرى قال: نعم'' (اعلاء السنن ۱۳،۱۹۶)۔

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ واقف کے مقاصد کی رعایت کرنا واجب ہے جب کہ وہ اصول شرع سے متصادم نہ ہوں، علامہ ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''إنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة'' (ردالمحتار ۴،۴۴۵)۔

لیکن اگر قاضی شریعت یا دیندار مسلمانوں کی جماعت جس میں کم از کم ایک عالم دین ہو، کا اگر یہ فیصلہ ہوجائے کہ ویران اور نا قابل استعمال و نا قابل انتفاع اوقاف کو فروخت کرکے ان کی قیمت سے دینی تعلیمی ادارہ یا رفاہی ادارہ قائم کرنا بہتر ہے تو فقہ اسلامی کی رو سے اس کی اجازت ہوگی۔

الف۔ جو اراضی مسجد کے لئے وقف ہیں تا کہ ان سے مسجد کی ضروریات پوری ہوں، لیکن فی الحال وہ مسجد کی ضرورت سے زائد ہیں، ان اراضی میں تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنا درست نہیں ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اوقاف مصرف سے زائد ہیں ان کو قاضی شریعت کی اجازت سے اسی نوع کے اوقاف میں منتقل کرنے کی اجازت ہوگی لیکن غیر نوع میں منتقل نہیں کرسکتے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے صراحت کی ہے:

''لا يجوز صرف وقف المسجد خرب إلى حوض وعكسه، وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار ۴،۳۵۹)۔

علامہ ابن ہمامؒ نے بھی فتح القدیر میں صراحت کی ہے: ''وهكذا نقل عن شيخ الإسلام الحلواني في المسجد والحوض إذا خرب ولا يحتاج إليه لتفرق الناس عنه أنه يصرف أوقافه إلى مسجد آخر أو حوض آخر. . .'' (فتح القدیر شرح ھدایه ۶،۲۳۷)۔

حضرت تھانویؒ نے ایک فتوی کے جواب میں وضاحت کی ہے کہ مذکورہ عبارت جو ردالمحتار کی ہے اگر چہ ویران اوقاف و ویران مساجد کے سلسلہ میں ہے لیکن حکم کی بنیاد استغناء پر ہے، اس لئے یہ حکم عام ہے خواہ اوقاف ویران ہوں یا نہ ہوں، حضرت تھانویؒ کے الفاظ یہ ہیں:

''قلت: هذه الرواية وإن كانت منقولة في صورة خراب المسجد وغيره لكن ما كان مبنى الحكم الاستغناء كان الحكم عاما، وإن لم يخرب وهذا ظاهر عندي'' (امداد الفتاوی جدید ۲،۵۹۳)۔

مذکورہ تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ مسجد کی اراضی پر تعلیمی ورفاہی ادارہ قائم کرنا درست نہیں ہے، ہاں ان کی آمدنی دوسری ضرورت مند مساجد پر صرف کی جاسکتی ہے۔

ب۔ اسی طرح مسجد کی آمدنی بھی تعلیمی یا رفاہی مقاصد میں صرف نہیں کی جاسکتی ہے، فتاوی ہندیہ میں صراحت کے ساتھ یہ جزئیہ موجود ہے کہ مسجد کی زائد فاضل آمدنی فقراء پر بھی صرف نہیں کی جاسکتی، جب کہ باب وقف میں اس کی گنجائش موجود رہتی ہے کہ جہاں جہت وقف ختم ہوجائے تو وہ اوقاف فقراء کے لئے ہوجاتے ہیں۔ فتاوی ہندیہ کی عبارت یہ ہے:

''الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء قيل: لا يصرف وإنه صحيح، ولكن يشترى به مستغلا

للمسجد'' (فتاوی هندیه ۲،۴۶۳)۔

الف۔ وقف کی آمدنی اس وقف کے متعین مصارف سے زیادہ ہو اور اس زیادہ آمدنی کے مصرف کا اس کے متعین مصارف میں طویل عرصہ تک خرچ کرنے کا امکان نہ ہو تو اسی نوع کے مصارف میں اس زائد آمدنی کو صرف کرنا درست ہوگا۔ خصوصاً جب کہ اسکے ضائع ہونے اور اس پر حکومت کی دست درازی کا اندیشہ ہو تو اس وقت اس کا بچانا اور دوسرے اوقاف میں صرف کر دینا ہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

علامہ حصکفیؒ نے درمختار میں ویران اوقاف کی آمدنی کو دوسرے اوقاف میں صرف کرنے کے جواز پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ومثله حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنها وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض'' (الدر المختار ۴،۳۵۹)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه، وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار على الدر المختار ۴،۳۵۹)۔

جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اسی قسم کے فتوی کے جواب میں اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ درمختار یا ردالمحتار کی عبارتوں میں جواز کا پہلو اگرچہ ویران مساجد اور ویران اوقاف کے سلسلہ میں ہے، لیکن حکم کی بنیاد استغناء پر ہے اس لئے یہ حکم عام ہے، خواہ ویران اوقاف ہوں یا غیر ویران ہوں (امدادالفتاوی جدید ۲/ ۵۹۳)۔

ب۔ لیکن اس نوع کے اوقاف کے علاوہ دوسری نوع مثلاً مسجد کی آمدنی ہے تو اس کو تعلیمی یا رفاہی کاموں پر صرف کرنا درست نہ ہوگا، جیسا کہ فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ کا ایک فتوی بہت ہی واضح ہے۔ راندیر، ضلع سورت کی ایک مسجد کی زائد آمدنی کے مصرف کے سلسلہ میں لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ اس مسجد کی زائد آمدنی کے ضیاع کا اندیشہ ہے اور مسجد کو حاجت بھی نہیں ہے کیا اس سے دینی مدرسہ کی مدد کی جا سکتی ہے، جبکہ وہ مدرسہ مسجد سے علیحدہ ہو۔ حضرت تھانویؒ نے جو جواب دیا، میں ان ہی کے الفاظ کو نقل کر رہا ہوں۔

الجواب: مدرسہ جنس مسجد سے نہیں اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے اگر اس شہر میں حاجت نہ ہو تو دوسرے شہروں کی مساجد میں صرف کریں جو زیادہ قریب ہو اس کا حق مقدم ہے، اسی طرح بہ ترتیب (امدادالفتاوی جدید ۲/ ۵۹۶)۔

وقف کردہ مکان کی فروختگی:

اگر شئ موقوف قابل انتفاع ہو مگر اس کی منفعت کم ہو، تو ایسی صورت میں اس وقف کو زیادہ نفع بخش اور مفید بنانے کے لئے دوسری نفع بخش چیز کے ذریعہ اس کا تبادلہ درست ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ائمہ احناف میں سے امام ابویوسفؒ جواز کے قائل ہیں، فقیہ ہلال اور دیگر ائمہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، امام ابو حنیفہؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ واضح رہے کہ یہ اختلاف اراضی موقوفہ کے استبدال کی صورت میں ہے، مکان کے سلسلہ میں نہیں ہے، محض نفع بخش بنانے کے لئے مکان موقوف کا تبادلہ بالاتفاق جائز نہیں ہے، لہذا صورت مذکورہ میں کسی مسجد یا مدرسہ پر موقوف مکان کا تبادلہ ایسی دکان یا مکان سے جو کسی تجارتی یا مرکزی مقام پر واقع ہو جائز نہیں ہوگا، اگرچہ موقوفہ مکان سے معمولی کرایہ آتا ہو جس سے مسجد یا مدرسہ کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ارض موقوفہ اور مکان موقوف کے استبدال کے مابین فرق کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''إن الخلاف في الثالث إنما هو في الأرض إذا ضعفت عن الاستغلال بخلاف الدار إذا ضعفت بخراب بعضها ولم تذهب أصلا، فإنه لا يجوز حينئذ الاستبدال على كل الأقوال قال ولا يمكن قياسها على الأرض، فإن الأرض إذا ضعفت لا يرغب غالبا في استيجارها مدة طويلة لاجل تعميرها للسكنى'' (رد المحتار ۶،۵۸۴)۔

جو اوقاف جن مصارف کے لئے ہیں، ان کی آمدنی ہم جنس اور انہی نوع کے مصارف میں صرف کی جائے گی، جیسا کہ فقہاء کی بعض اصولی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ''شرح الملتقی'' کے حوالہ سے ذکر کیا ہے:

''يصرف إلى أقرب مجانس لها'' (رد المحتار ۴،۳۵۹)۔

اور جو اوقاف کسی خاص خاندان یا افراد کے لئے تھے ان کے ختم ہوجانے کے بعد وہ اوقاف عام فقراء کے لئے ہوجائیں گے۔ علامہ ابن قدامہؒ نے المغنی میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

''قال أبو یوسف یرجع إلی الواقف وإلی ورثته إلا أن یقول صدقة موقوفة ینفق منها علی فلان وعلی فلان، فإذا انقرض المسمی کانت للفقراء والمساکین؛ لأنها جعلها صدقة علی مسمی فلا تکون علی غیره'' (المغنی لابن قدامه ۵،۶۲۳)۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے ''الفقہ الاسلامی وأدلتہ'' میں امام ابویوسفؒ کے اس قول کو جمہور کا قول مختار بتایا ہے:

''أخذ الجمهور غیر الحنفیة بقول أبي یوسف'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۸،۱۹۹)۔

فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوقاف جو خاندان یا افراد کے لئے ہیں اگر اس خاندان یا افراد کا انقطاع ہوجائے اور جہتیں ختم ہوجائیں تو وہ اوقاف فقراء کے لئے ہوجاتے ہیں، چنانچہ علامہ حصکفیؒ درمختار میں لکھتے ہیں:

''فلو وقف علی أولاد زید ولا ولد له أو علی مکان ہیأه لبناء مسجد أو مدرسة صح (فی الأصح) وتصرف الغلة إلی الفقراء إلی أن یولد لزید أو یبنی المسجد'' (درمختار ۴،۴۳۰)۔

علامہ شامیؒ نے اس جگہ شرح کرتے ہوئے ایک اصولی بات بیان کی ہے، فرماتے ہیں:

''علم من هذا أن منقطع الأول ومنقطع الوسط یصرف إلی الفقراء'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۴،۴۳۰)۔

''فتاویٰ ہندیہ'' اور ''فتاویٰ قاضی خاں'' میں اس مسئلہ کے متعلق بعض صریح جزئیات بھی موجود ہیں، یہاں دو جزئیات ہم نقل کررہے ہیں:

''إذا وقف وقفا مؤبدا واستثنی لنفسه أن ینفق من غلة هذا الوقف علی نفسه وعیاله وحشمه مادام حیا جاز الوقف والشرط جمیعا عند أبي یوسف، فإذا انقرضوا صارت الغلة للمساکین، کذا فی الذخیرة'' (فتاوی هندیه ۲،۳۹۹)۔

''ولو قال علی بنی ولیس له بنون فالغلة للفقراء وکذا لو قال علی بناتی وله بنون فالغلة للفقراء لیس للبنین'' (هندیه ۲،۳۷۵)۔

حاصل یہ کہ ایسے اوقاف جو کسی خاص خاندان یا خاص افراد کے لئے ہوں جب وہ خاندان ختم ہوجائے یا وہ افراد باقی نہ رہیں تو وہ اوقاف فقراء ومساکین کے لئے مقرر ہوجائیں گے، اور ان کی آمدنی انہی پر صرف کی جائے گی۔

الف۔ اوقاف کی عمارتیں اگر مخدوش ہوں تو ان کو ڈھا کر نئے سرے سے تعمیر کے لئے اوقاف کے کسی حصہ کو تعمیر کے عوض میں بلڈر کو دینا، وقف کے بعض حصوں کو فروخت کرنا ہے جو اکثر فقہاء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ ''فتاویٰ ہندیہ'' میں ذخیرہ کے حوالہ سے اس قسم کا صریح جزئیہ موجود ہے:

''وإذا خربت أرض الوقف وأراد القیم أن یبیع بعضها لیرمّ الباقی بثمن ما باع لیس له ذلك، فإن باع القیم شیئا من البناء لم ینهدم لیهدم أو نخلة حیة لتقطع فالبیع باطل'' (فتاوی هندیه ۲،۴۱۷)۔

لیکن اگر مخدوش عمارت کے ضائع ہوجانے اور گرجانے کا قوی اندیشہ ہو اور آئندہ مستقبل میں وقف میں اس کی گنجائش نظر نہ آتی ہو کہ اس کی مرمت یا تعمیر ہوسکے تو قاضی شریعت یا ان کے قائم مقام جماعت المسلمین اس عمارت کو بلڈر کے ذریعہ تعمیر کرانے اور کچھ حصے کو بلڈر کے دینے ہی میں بہتر سمجھتی ہو اور اس سے وقف کا فائدہ ہی ہو تو پھر اس کی گنجائش ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے عمارت بنوانے کے لئے وقف ہی کے کچھ حصہ کو بلڈر کو عوض میں دینے کی عام اجازت نہ ہوگی۔ بعض مخصوص حالات میں صرف قاضی یا ان کے قائم مقام جماعت المسلمین کو یہ اجازت حاصل ہوگی۔ لیکن وقف کی مصلحت کے پیش نظر ہوگی، عموماً اجازت نہ ہوگی۔

ب۔ اگر وقف کی حفاظت اسکے بغیر ممکن نہ ہو تو وقف شدہ زمین میں سے کچھ زمین کو فروخت کرکے وقف کی حفاظت کرنے کی گنجائش ہوگی۔

مسجد یا قبرستان کی جو زمین زائد ہے اور آئندہ اس کی ضرورت کا امکان بھی نہیں ہے، تو اس زائد زمین میں سے اسی نوع کا وقف قائم کیا جا سکتا ہے، اس میں مدرسہ بنانا درست نہیں۔

ایسے قبرستانوں کے سلسلہ میں مسلمانوں کی دینی و ملی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کریں اور چہار دیواری کر دیں تا کہ قبضہ رہ سکے۔

کسی بھی مسجد میں نماز ادا کرنے سے روکنے کا حق کسی بھی حکومت کو نہیں ہے، اگر حکومت نے کسی مسجد میں نماز ادا کرنے سے روک دیا ہے تو یہ غیر قانونی عمل ہے، مسلمانوں کا اس صورت میں دینی فریضہ ہوگا کہ وہ اس کے خلاف حکومت سے احتجاج کریں۔

قبرستان کی حفاظت کی غرض سے اگر ایسا کیا گیا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، بعد میں اس کی زائد آمدنی دوسرے قبرستانوں پر صرف کی جا سکتی ہے۔

اگر قبرستان میں اس کی گنجائش ہے کہ مسجد کی توسیع کی جا سکے اور طویل عرصہ تک قبرستان کو اس جگہ کی ضرورت نہ پڑے تو مسجد کی توسیع کی جا سکتی ہے۔ اس کی نظیر ''فتاوی ہندیہ'' میں موجود ہے:

''أرض لأهل قرية جعلوها مقبرة أو اقبروا فيها ثم إن واحدا من أهل القرية بنى فيها بناء لوضع اللبن وآلات القبر وأجلس فيها من يحفظ المتاع بغير رضا أهل القرية أو رضا بعضهم بذلك قالوا: إن كان في المقبرة سعة بحيث لا يحتاج إلى ذلك المكان فلا بأس به'' (فتاوى هنديه ۲،۴۶۷)۔

(ویران اور زیر استعمال قبرستانوں میں یقیناً فرق ہے، مگر صرف اسقدر کہ اگر ویران قبرستان کا استبدال بہتر ہو تو اسے فروخت کر کے دوسری جگہ جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو دوسرا قبرستان اس کی قیمت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن زیر استعمال قبرستانوں کے فروخت کرنے کی اجازت نہ ہوگی)۔

اسی طرح جدید و قدیم قبروں میں بھی فرق ہے جدید قبریں، خواہ موقوفہ قبرستان میں ہوں یا نجی زمین میں بلا عذر شرعی ان کو کھودنا یا ان میں عمارت بنوانا یا کھیتی کرنا درست نہیں ہے، لیکن اگر نجی زمین میں قدیم قبریں ہوں اور اتنی قدیم ہوں کہ ان کے سارے نشانات مٹ چکے ہوں تو ان قبروں کی جگہ تعمیر یا زراعت کے کام میں لانا درست ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ نے لکھا ہے:

''إذا بلى الميت وصار تراباً جاز زرعه والبناء عليه'' (البحر الرائق ۱،۱۳۸، فتاوى هنديه ۱،۱۳۱ كتاب الجنائز)۔

لیکن اگر موقوفہ قبرستان ہے تو اس کی اجازت نہ ہوگی، جبکہ فقہاء نے صراحت کی ہے اور محیط کے حوالہ سے فتاوی ہندیہ میں شمس الائمہ محمود الأوزجندی کا فتوی نقل کیا گیا ہے:

''وسئل هو أيضا عن المقبرة في القرى إذا اندرست ولم يبق فيها أثر الموتى لا العظم ولا غيره، هل يجوز زرعها واستغلالها قال: لا ولها حكم المقبرة'' (هنديه ۲،۴۷۱ كتاب الوقف)۔

مساجد و مقابر اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا درست نہیں ہے، اولاً تولیت کے جو شرائط فقہاء نے بیان کئے ہیں وہ غیر مسلم ذمہ داروں میں مفقود ہیں، خاص طور پر امین ہونے کی شرط بنیادی شرط ہے (البحر الرائق ۵ / ۲۴۴)، بلا شبہ امانت کا تصور بلا ایمان ممکن نہیں۔

بالخصوص ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی کسی طرح اجازت نہیں دی جا سکتی ہے، لہٰذا ایسے اوقاف جو ہندو وقف بورڈ کے تحت ہیں ان کے سلسلہ میں مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کوشش کر کے ہندو وقف بورڈ سے منتقل کرا کر مسلم وقف بورڈ میں داخل کرائیں۔

☆☆☆

اوقاف کی خرید وفروخت اور اس میں تبدیلی کا شرعی حکم

مولانا ابوبکر قاسمی [١]

یہاں یہ بات بتانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی آبادی کے پاکستان کی طرف منتقل ہوجانے کے سبب تقریبا بہت سے اوقاف ویران ہو چکے ہیں، اور اگر کسی بستی میں کچھ اوقاف پائے بھی جاتے ہیں تو وہاں دور دراز تک مسلمانوں کی آبادی کے نہ ہونے کے سبب ان اوقاف کی اراضی کو آباد رکھنا یا واقف کے منشا اور اس کے اغراض ومقاصد کے تحت ان اراضی کی پیداوار کو استعمال کرنا، ایک حد تک ناممکن سا ہو گیا ہے، بلکہ دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ اس قسم کے اوقاف پر حکومت یا غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جارہا ہے۔

اوقاف کی خرید وفروخت اور اس میں تبدیلی کا شرعی حکم:

اب ایسی صورت میں اوقاف کے تحفظ کی خاطر سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا ایسے قریب الہلاک اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے اغراض و مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی دوسری جگہ جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی پائی جاتی ہو، اس کا متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں حضرات فقہاء کے کلام کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے وہ اوقاف جو مسلمانوں کی آبادی کے منتقل ہوجانے سے بالکل ویران ہو چکے ہیں، اور وہاں پر مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور انہیں واقف کی منشا کے مطابق بروئے کار لانا ممکن نہیں رہ گیا ہے، تو اگر یہ اوقاف مساجد ومقابر موقوفہ کے علاوہ ہیں، تو انہیں چند شرائط کے ساتھ فروخت کر کے واقف کے مقاصد کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے ان کے متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے، اب وہ شرائط کیا ہیں اور استبدال کی کتنی صورتیں جائز ہیں، تو اس سلسلہ میں علامہ ابن نجیم مصری نے ''الاشباہ والنظائر'' میں اور علامہ شامی نے رد المحتار میں شرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ استبدال کی پانچ صورتیں ہیں:

۱۔ اگر واقف نے وقف کے دوران ہی اپنے لئے یا کسی دوسرے شخص کے لئے استبدال کی شرط رکھی ہو تو صحیح قول کے مطابق بلاشبہ استبدال جائز ہے، شامی میں ہے:

''اعلم أن الاستبدال علی ثلاثة أوجه: الأول أن يشترطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه و غيره، فالاستبدال فيه جائز علی الصحيح وقيل اتفاقا... الخ'' (رد المحتار ۳،۴۲۴)، ''وفی الهندية: ''إذا شرط فی أصل الوقف أن يستبدل به أرضا أخری إذا شاء ذلك فتكون وقفا مكانها فالوقف والشرط جائز عند أبي يوسف وكذا لو شرط أن يبيعها ويستبدل بثمنها مكانها، وفی واقعات القاضی الإمام فخرالدين قول هلال مع أبي يوسف وعليه الفتوی، كذا فی الخلاصة'' (فتاوی عالمگیری ۲،۳۹۹)، ''وفی البزازية: ''وإن قال الواقف وقفت علی أن اشتری بثمنها أرضا أخری إن احتاج إلی ذلك صح استحسانا؛ لأن الأولی وإن تعينت للوقف قيمتها يقوم مقامها فی الحكم'' (بزازیہ علی الهنديه ٦،٢٥٦)۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ استبدال کی تو شرط نہ لگائی ہو، لیکن وہ وقف بالکل ویران ہوکر رہ گیا ہو، اور اس سے منتفع ہونے کی امید نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی اصح قول کے مطابق استبدال جائز ہے، شامی میں ہے:

''والثانی أن لايشترطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لاينتفع به بالكلية بأن لايحصل منه شئ أصلا أو لا يفی بمؤنته فهو أيضا جائز علی الاصح إذا كان بإذن القاضی ورأيه المصلحة فيه'' (ردالمحتار ۳،۴۲۴)، وفی

---

١ استاذ جامعہ اسلامیہ شکر پور بھرواره، دربھنگہ۔

البزازية: ''شرط فی أصل الوقف لا يستبدل أو البيع و شراء أرض أخرى بثمنها صح الشرط والوقف عند الثانی وعند محمد وهلال الوقف جائز والشرط باطل... وعليه الفتوى لأن الوقف يحتمل للانتقال من أرض إلى أرض، و ذكر القاضی قول هلال مع الثانی'' (بزازیہ علی الہندیہ ۶،۲۵۶)۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ نہ واقف نے استبدال کی کوئی شرط لگائی اور نہ ہی وقف ویران ہوا ہے، بلکہ اس کو باقی رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، تو اس صورت میں اصح اور مختار قول یہ ہے کہ استبدال جائز نہیں ہے۔

''قال ابن عابدين فی رد المحتار: والثالث أن لايشرطه أيضا، ولكن فيه نفع فی الجملة وبدله خير منه ريعا ونفعا، وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار، كذا حرره العلامة قنالی زادة فی رسالته الموضوعة فی الاستبدال وأطنب فيها عليه الاستبدال وهو مأخوذ من الفتح أيضا كما سنذكره عند قول الشارح لا يجوز استبدال العامر'' (ردالمحتار ۳،۴۲۴)۔

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ اشیاء موقوفہ کو غاصب نے قبضہ کر کے اس میں ایسا تصرف کر دیا ہے کہ وہ اراضی نا قابل کاشت ہوگئی، اور اب وہ قیمت دینے پر رضامند ہے، یا غاصب نے اس زمین کے وقف ہونے کا انکار کر دیا اور اس پر متولی کے پاس کوئی بینہ نہیں ہے، لیکن غاصب قیمت دینا چاہتا ہے، تو ان صورتوں میں بھی متولی کے لئے جائز ہے کہ قیمت لے کر ان اراضی موقوفہ کے بدلہ دوسری جگہ زمین خرید لے۔

''فی رد المحتار نقلا عن الاشباه الثانية إذا غصب غاصب وأجرى عليه الماء حتى صار بحرًا فيضمن القيمة و يشترى المتولی بها أرضا بدلا، الثالثة أن يجحده الغاصب ولا بينة أی وأراد دفع القيمة فللمتولی أخذها ويشترى بها بدلا'' (ردالمحتار ۳،۴۲۶، الاشباہ والنظائر ۱۰۳ کتاب الوقف)، وفی هامش الأشباه ''قوله يجحده الغاصب أی فيصالحه الناظر على مال صلحا عن إنكار'' (ہامش الاشباہ، ۲۰۱)، وقال فی الخانية: ''فإن أرض الوقف إذا غصبها غاصب وأجرى الماء عليها حتى صار بحرًا لا يصلح للزراعة يضمن قيمتها ويشترى بقيمتها أرضا أخرى فتكون الثانية وقفاً على وجه الأولى'' (خانیہ علی الہندیہ ۳،۳۰۶)، وفی البزازية: ''غصب أرض الوقف غاصب وأجرى عليها الماء حتى صار بحرًا يضمن قيمتها ويشترى بالقيمة أرض أخرى ويكون وقفاً مكانها'' (بزازیہ علی الہندیہ ۶،۲۵۶)۔

۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ اراضی موقوفہ کو کوئی شخص لینے کا خواہش مند ہے، اور وہ اس کے بدلہ میں اس سے بہتر اور زیادہ پیداوار والی زمین دینا چاہتا ہے، تو حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں استبدال جائز ہے، اور حضرات فقہاء نے اس قول کو مفتی بہ بھی کہا ہے۔

''وفی الأشباه: الرابعة أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن وصفاً فيجوز على قول أبي يوسف، وعليه الفتوى كما فی فتاوى قارى الهداية'' (الاشباہ ۱۰۳، ردالمحتار ۳،۴۲۶)۔

مندرجہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرات فقہاء نے لوگوں کے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھ کر چند صورتوں میں استبدال کو جائز اور بعض جگہ استبدال کو ناجائز قرار دیا ہے، اور ساتھ ہی جس قول کے جواز وعدم جواز کا قول کہا ہے اس کے مفتی بہ ہونے کی تصریح بھی فرما دی ہے، علامہ ابن الہمام نے بھی مختصراً استبدال کے جواز وغیرہ پر کلام کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''والحاصل أن الاستبدال إما عن شرط الاستبدال أو لا عن شرطه، فإن كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف عليهم فينبغی أن لايختلف فيه وإن كان لا لذلك بل اتفق انه أمكن أن يوخذ بثمنه ما هو خير منه مع كونه منتفعا به فينبغی أن لايجوز؛ لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة ولأنه لا موجب لتجويزه؛ لأن الموجب فی الأول الشرط، وفی الثانی الضرورة ولا ضرورة فی هذا (أی الثالث) إذ لا تجب الزيادة بل تبقيه كما كان الخ'' (فتح القدیر بحوالہ ردالمحتار ۳،۴۲۷)، ''قال ابن عابدين: أقول: ما قاله هذا المحقق هو الحق والصواب'' (ردالمحتار ۳،۴۲۷)، ''قال الراقم: فی الرابع والخامس أيضا الضرورة. فافهم''۔

لیکن صاحب ''شرح وقایہ'' نے کتاب الوقف میں استبدال کے سلسلہ میں حضرات صاحبین کا اختلاف درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ونحن لا نفتي به فقد شاهدنا في الاستبدال من الفساد ما لا يعد و لا يحصى، فإن ظلمة القضاة جعلوه حيلة إلى إبطال أكثر أوقاف المسلمين وفعلو ما فعلوا . . . الخ'' (شرح وقايه ۲،۳۵۳، ومثله في رد المحتار ۳،۴۲۶)۔

مندرجہ سطور میں صدر الشریعۃ علیہ الرحمہ نے استبدال کی صورت میں جن مفسدات کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان مفسدات کی پیش بندی کے لئے حضرات فقہاء نے آٹھ شرطوں کے ساتھ استبدال کو مشروط کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

شرائط استبدال:

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ وقف ویران ہوگیا ہو، اور اس کی آمدنی اور اس کا نفع بالکل ختم ہوگیا ہو۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اس جگہ وقف کی کوئی دوسری بلند جگہ نہ ہو کہ جہاں دوسری تعمیر ہو سکے۔

(۳) وقف کی بیع اور اس کا استبدال غبن فاحش (بہت زیادہ گھاٹے) کے ساتھ نہ ہو۔

(۴) بدلنے والا قاضی علم و عمل دونوں کا جامع ہو، اور وہ استبدال ہی میں وقف کے لئے مصلحت سمجھتا ہو۔

(۵) اراضی موقوفہ کا تبادلہ دوسری اراضی ہی سے ہو، روپے پیسے، دراہم و دنانیر سے نہ ہو، اس لئے کہ اس صورت میں خطرہ ہے کہ کہیں بدلنے والے لوگ استبدال سے پہلے ہی وقف کے روپے کو ہضم نہ کر جائیں۔

(۶) وقف کے تبادلہ کا معاملہ مقبول الشہادت شخص ہی سے کیا جائے، ایسے شخص سے نہ کیا جائے جس کی شرعاً شہادت قبول نہیں ہوتی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص چھوٹے بچے وغیرہ سے اوقاف کا تبادلہ کرے تو یہ جائز نہیں ہے، نیز وقف کے تبادلہ کا معاملہ ایسے شخص سے نہ کیا جائے جس کا دَین بدلنے والے پر باقی ہو، کیونکہ خطرہ ہے کہ بدلنے والا کہیں وقف کو دَین کے عوض فروخت نہ کردے، یا دوسرے لفظوں میں ممکن ہے کہ دائن اپنے دَین کے عوض وقف کی اراضی کو رکھ لے اور بدلنے والے مدیون سے کہدے کہ میرے دَین کے عوض تم ہی وقف کا ثمن ادا کردو، نیز حضرت امام ابو یوسفؒ نے جب وقف کی بیع سامان کے عوض کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، تو پھر وہ کیونکر دَین کے عوض وقف کے فروخت کرنے کا فتوی دیں گے۔

(۷) ایک وقف مکان کا دوسرے مکان سے تبادلہ کرنے کے لئے صاحب قنیہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ ایک ہی محلہ کے اندر ہو، کیونکہ اگر وقف مکان کا تبادلہ دوسرے محلہ کے مکان سے کیا جائے تو اگرچہ ممکن ہے کہ اس کی قیمت زیادہ ہو، لیکن دوسرے محلہ میں واقع ہونے کی وجہ سے احتمال ہے کہ لوگوں کی رغبت اس سے کم ہوجائے، البتہ اگر دوسرا محلہ پہلے محلہ سے بہتر ہو، اور وہاں کے باشندے نیک ہوں، نیز تبادلہ کی وجہ سے آمدنی میں اضافہ ہوجانے کی توقع ہو تو اس صورت میں پہلے محلہ میں واقع وقف مکان کو دوسرے محلہ کے مکان سے بدل سکتے ہیں، ورنہ تبادلہ جائز نہیں۔

(۸) علامہ قنالی زادہ نے اپنے رسالہ میں استبدال کے جواز کے لئے آٹھویں شرط یہ ذکر کی ہے کہ بدل اور مبدل منہ ایک ہی جنس سے ہو، کیونکہ ''فتاوی خانیہ'' میں ہے کہ اگر خود واقف نے اپنے لئے وقف گھر کو کسی دوسرے گھر سے استبدال کی شرط لگائی ہو تو خود اس کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس وقت گھر کا تبادلہ گھر کے بجائے کسی زمین سے کردے، یا اس کے برعکس معاملہ کرے، علامہ شامی فرماتے ہیں کہ بظاہر اس شرط کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ تبادلہ کی جس صورت میں خرچہ کم ہو اور آمدنی زیادہ آئے تو یہ تو اچھی بات ہے (مستفاد از رد المحتار ۳/ ۴۲۵)۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حضرات فقہاء نے جس طرح بعض صورتوں میں واقف کو استبدال کی اجازت دی ہے، اسی طرح قاضی کو بھی دی ہے، لیکن صاحب ''فتاوی خانیہ'' کا کلام قاضی کے سلسلہ میں مختلف ہے، ایک جگہ انہوں نے بغیر واقف کی شرط کے مطلقاً قاضی کو استبدال کی اجازت دی ہے، اور کہا ہے کہ جہاں وہ مصلحت دیکھے وقف کا استبدال کرے، لیکن دوسری جگہ مطلقاً منع کیا ہے، اگرچہ وقف ویران ہی کیوں نہ ہوجائے، لیکن مفتی بہ قول یہ ہے کہ بغیر کسی شرط کے قاضی کے لئے استبدال کی شرعاً اجازت ہے، البتہ قاضی پر لازم ہوگا کہ وہ مندرجہ بالا شرائط کا لحاظ کرکے واقف وقف کا استبدال کرے، البتہ فقہ کی مشہور کتاب ''اسعاف'' سے نقل کرتے ہوئے ''فتاوی عالمگیری''، اور ''رد المحتار'' میں لکھا ہے کہ قاضی علم و عمل کا پیکر ہو، تاکہ ظالم قاضیوں کی طرف سے اوقاف مسلمین کے ابطال کا جو خطرہ صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے حوالہ سے بیان کیا گیا وہ سامنے نہ آئے۔

"قال العلامة عبد الحی فی عمدة الرعاية: الاستبدال بدون الشرط لايمكنه إلا للقاضي الغير الجائر بشروط أحدها أن يخرج الموقوف عن الانتفاع بالكلية الخ" (عمدۃ الرعایہ بر حاشیہ شرح وقایہ ۲؍۳۵۳)۔

یہاں یہ بات مدنظر رہے کہ مساجد ومقابر موقوفہ کا تبادلہ اگرچہ وہ ویران ہی کیوں نہ ہوجائیں، شرعاً جائز نہیں ہے۔

"قال فی الهداية ومن اتخذ أرضه مسجدًا لم يكن له أن يرجع فيه ولا يبيعه ولا يورث عنه" (ہدایہ ۲؍۶۴۵)، "وفی الهندية نقلا عن فتاوى الحجة: لو صار أحد المسجدين قديما و تداعى إلى الخراب فأراد أهل السكة بيع القديم و صرفه فی الجديد فإنه لا يجوز إما على قول أبي يوسف فلأن المسجد وإن خرب واستغنى عنه أهله لايعود إلى ملك البانی (الی قوله) والفتوى على قول أبي يوسف...كذا فی المضمرات" (ہندیہ ۲؍۴۵۸)، "سئل القاضي الإمام شمس الأئمة محمود الأوزجندی عن مسجد لم يبق له قوم وخرب ما حوله واستغنى الناس عنه هل يجوز جعله مقبرة قال: لا. وسئل هو أيضا عن المقبرة فی القرى إذا اندرست ولم يبق فيها أثر الموتى لا العظم ولا غيره هل يجوز زرعها واستغلالها؟ قال: لا، ولها حكم المقبرة، كذا فی المحيط" (فتاوی عالمگیری ۲؍۴۷۰-۴۷۱) "قال فی هامش الهندية: قوله: لا، هذا لا ينافي ما قاله الزيلعي فی باب الجنائز من أن الميت إذا بلی وصار تراباً جاز زرعه، والبناء عليه، لأن المانع هنا كون المحل موقوفا على الدفن فلا يجوز استعماله فی غيره، فليتأمل وليحرر" (حاشیہ عالمگیری ۲؍۴۷۱)۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں سوال میں پوچھے گئے اجزاء کے جوابات حسب ذیل ہیں:

الف۔ ویران اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے، متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے (مستفاد از فتاوی عبدالحی ر ۲۶۷)۔

"وفی البزازية: وعن محمد ضعفت الموقوفة عن الاستغلال والقيم يجد بثمنه أرضا أخرى أكثر ريعا منه له البيع و شراء ما هو أكثر منه ريعا" (بزازیہ علی الہندیہ ۶؍۲۷۱) وفی الخانية: روى عن محمد...قال: إذا ضعفت الأرض الموقوفة على الاستغلال والقيم يجد بثمنها أرضا أخرى هی أنفع للفقراء وأكثر ريعا كان له أن يبيع هذه الأرض ويشترى بثمنها أرضا أخرى جوّز رحمه الله تعالى استبدال الأرض بالأرض" (فتاوی خانیہ علی ہامش الہندیہ ۳؍۳۰۰)۔

ب۔ ویران اوقاف کو حکومت کے بجائے کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری رکھنے کی شکل شرعاً اختیار کی جاسکتی ہے۔

"قال فی رد المحتار: فلو استبدل الحانوت بأرض تزرع و يحصل عنها غلة قدر أجرة الحانوت كان أحسن؛ لأن الأرض أدوم وأبقى وأغنى عن كافة الترميم والتعمير... الخ" (رد المحتار ۳؍۴۲۵)۔

فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد ومقابر کا تبادلہ کسی حال میں جائز نہیں، البتہ دیگر ویران اوقاف کا تبادلہ شرعاً شرائط استبدال کو ملحوظ رکھ کر کیا جاسکتا ہے (والتفصيل كما مرّ) نیز مسجد، مدرسہ، حوض وغیرہ کے اوقاف کا حکم عام اوقاف کا ہے کہ ان کا تبادلہ شرائط استبدال کے ساتھ جائز ہے۔

ویران وناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

"لأن مراعاة غرض الواقفين واجبة" (رد المحتار ۳؍۴۶۴)، "شرط الواقف كنص الشارع" (الاشباہ والنظائر تحت القاعدۃ الاولی ۵۵، قواعد الفقہ ۸۵، رد المحتار ۳؍۴۵۶) "وبيع أرض الوقف لا يجوز" (فتاوی خانیہ علی الہندیہ ۳؍۳۱۰)۔

الف، ب۔ مسجد کی فاضل آمدنی واراضی کو تعلیمی ورفاہی کاموں میں استعمال کرنا:

جن مقامات پر مساجد ومدارس یا مقابر کے لئے بڑے بڑے اوقاف ہیں، اور مسلمانوں کی آبادی وہاں بہت معمولی رہ گئی ہے، مثلاً ایک مسجد ہے، اس

کے لئے بہت سی زمینیں اور مکانات وقف ہیں، مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے زیادہ ہے، اسی طرح مسجد کے پاس بہت سی فاضل اراضی ہیں، جن کی مسجد کو نہ فی الحال ضرورت ہے، اور نہ تعمیر مسجد کے لئے آئندہ ضرورت پڑ سکتی ہے، تو کیا مسجد کی فاضل اراضی پر دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے، نیز کیا مسجد کی فاضل آمدنی، تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے، جبکہ واقف نے ان زمینوں اور مکانات کو مسجد کے لئے وقف کیا تھا، نیز ان کی آمدنیاں بھی مسجد ہی کے لئے وقف تھیں، تو اس سلسلہ میں عام طور سے فقہاء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ مسجد کی فاضل اراضی یا آمدنیوں کو تعلیمی و رفاہی ادارے کی تعمیر اور ان کے مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر کسی جگہ سخت ضرورت ہو، اور مسجد کو اس رقم کی ضرورت نہ ہو، تو بطور قرض کے مسجد کی فاضل رقم دی جاسکتی ہے، اسی طرح مسجد یا دیگر اوقاف کی فاضل آمدنی کو اسی نوع کے قریبی اوقاف پر خرچ کیا جاسکتا ہے، لہذا ایک مسجد کی فاضل آمدنی دوسری مسجد کی ترقی و تعمیر میں اور اسی طرح ایک مدرسہ کی دوسرے مدرسہ میں ایک حوض کی دوسرے حوض کی تعمیر میں خرچ کی جاسکتی ہے، چنانچہ ''درمختار'' میں ہے:

''حشيش المسجد وحصيره مع الاستغناء عنهما وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه، قال في رد المحتار: وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار ۳،۴۰۷)، ''وفي الخانية: إذا اجتمع من مال الوقف على الفقراء أو على المسجد الجامع ثم نابت الإسلام نائبة بأن غلبت جماعة من الكفرة فاحتيج في ذلك إلى مال لدفع شرهم قال رحمه الله تعالى ما كان من غلة المسجد الجامع يجوز للحاكم أن يصرف ذلك على وجه القرض إذا لم يكن للمسجد حاجة إلى ذلك المال ويكون ذلك دينا'' (فتاوی خانیہ علی الہندیہ ۳،۳۱۲)۔

لیکن حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے ''کفایت المفتی'' میں اس سلسلہ میں بزبان عربی ایک تفصیلی فتوی لکھا ہے، اور خود ہی عربی عبارت کا انہوں نے ترجمہ بھی فرمادیا ہے، حضرت مفتی صاحب موصوف کے اس فتوی پر تقریباً انیس (۱۹) گرامی قدر علماء کے دستخط ثبت ہیں جس کے سبب حضرت مفتی صاحب کے اس فتوی کو ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، لہذا مذکورہ تفصیلی فتوی کا ترجمہ من وعن مفتی صاحب مدظلہ ہی کے الفاظ میں لکھا جاتا ہے، البتہ حوالہ کی جو عبارتیں ہیں ان کو حتی الامکان من وعن نقل کیا جائے گا۔

جواب نمبر ۲۳۷: إن الحكم إلا لله'' (سورہ یوسف: ۴۰)، شرط واقف کی رعایت ضروری ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے فرمایا ہے: شرط واقف مثل نص شارع کے ہے، اسی طرح ''اشباہ'' اور ''درمختار'' وغیرہ میں مذکور ہے، اور اسی قاعدہ پر فقہاء نے بہت سے احکام جزئیہ مہمہ متفرع کئے ہیں، پھر شرط کبھی تو صراحۃً ثابت ہوتی ہے، مثلاً واقف نے ایک شئ کسی مسجد معین پر وقف کر کے تصریح کردی کہ دوسری چیز پر صرف نہ کی جائے، اور کبھی شرط کا ثبوت دلالۃً بحکم عرف ہوتا ہے، جیسے واقف نے کسی مسجد معین پر جائداد وقف کردی اور یہ تصریح نہ کی کہ کسی دوسری چیز میں صرف کی جائے یا نہ کی جائے، اور یہ حکم ماہرین فقہ پر ظاہر ہے، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اوقاف کی زائد از حاجت آمدنی کے بارے میں کہ آیا وہ فاضل آمدنی کسی دوسرے مصرف میں خرچ ہوسکتی ہے یا نہیں، فقہاء کا اختلاف ہے، بعض فقہاء تو مطلقاً منع کرتے ہیں، اور بعض اس شرط سے اجازت دیتے ہیں کہ دونوں وقفوں کا واقف اور جہت وقف متحد ہو تو ایک کی فاضل آمدنی دوسرے پر خرچ ہوسکتی ہے، اور بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ امام جیسی مصلحت دیکھے اس کے مطابق خرچ کرسکتا ہے، تو فقہاء کے یہ تین گروہ ہوئے، اور ان کے یہ تین قول ہو گئے۔ فرقہ اولی نے تو قاعدہ مذکورہ کو لیا، اور اس پر نہایت سختی سے عمل کیا، اور اس کے خلاف کی اجازت نہ دی۔ اور فرقہ ثانیہ نے ذرا نرمی برتی، لیکن دونوں جانب کی رعایت مدنظر رکھی، یعنی قاعدہ مذکورہ کا بھی لحاظ کیا، اور محاصل اوقاف کو ضائع ہونے سے بھی محفوظ رکھنے کا خیال کیا۔ اور فرقہ ثالثہ نے امام وحاکم اسلام کو مختار بنادیا کہ وہ غرض واقفین کو ملحوظ رکھتے ہوئے جہاں مناسب سمجھے خرچ کرے، کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وقف کرنے والوں کی غرض یہی ہوتی ہے کہ ان کے اوقاف امور خیر اور خدا کی راہ میں خرچ ہوں، اور متغلبین کے کھانے کے لئے یا ضائع ہونے کے لئے نہ چھوڑ دیئے جائیں، فرقہ اولی اور فرقہ ثانیہ کے قول تو نہایت صاف اور ظاہر ہیں، اور روایات فقہیہ کے لحاظ سے نہایت قوی و مستحکم اور پھر ایک قول دوسرے سے اقوی ہے۔ مانعین کی دلیلوں میں سے ''اشباہ'' کی یہ عبارت ہے:

''صرح في البزازية وتبعه في الدرر والغرر بأنه لا يصرف فائض وقف لوقف آخر اتحد واقفهما أو اختلف'' (الاشباہ مطبوعہ دیوبند ص ۱۹۲)۔

(بزازیہ میں تصریح ہے اور درر وغرر میں بھی اس کا اتباع کیا ہے کہ ایک وقف کی فاضل آمدنی دوسرے میں خرچ نہ کی جائے، خواہ دونوں کا واقف ایک ہو یا مختلف)۔

ناقل حروف محمد ابو بکر عرض کرتا ہے کہ علامہ حموی نے حاشیہ اشباہ میں فتاوی بزازیہ، اور درر وغرر کی عبارت کے نقل کرنے کے سلسلہ میں علامہ ابن نجیمؒ کی تغلیط کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اگر واقف اور جہت میں اتحاد ہو تو ایک وقف کی فاضل آمدنی دوسرے وقف پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

''قال المصنف: لا يجوز صرف فائض الوقف اتحد واقفهما أو اختلف وهو يفاده فقد أساء في النقل (إلى قوله) قد أطلق صاحب هذا الكتاب المنع نقلا عن الدرر والغرر والبزازية والحال أن ما في الدرر والغرر نقلا عن البزازية إنما هو التفصيل'' (حاشیہ اشباہ للحموی ۱۹۲)، ''قلت: ما قال المحشي: فهو الصحيح، وانظر إلى البزازية في كتاب الوقف قبيل نوع في الفاظ جارية في الوقف تحت نوع في وقف المنقول'' (بزازیہ علی الهندیہ ۶،۲۶۱)۔

اور جو لوگ کہ اتحاد واقف وجہت وقف کی صورت میں اجازت دیتے ہیں، منجملہ ان کی دلیلوں کے درمختار کی یہ عبارت ہے:

''اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشئ واحد'' (در مختار مع رد المحتار ۳،۴۰۸)۔

واقف اور جہت وقف متحد، اور ایک وقف کی آمدنی کم ہوجانے سے اس کے موقوف علیہم کا وظیفہ کم ہوجائے تو حاکم کو جائز ہے کہ دوسرے وقف کی بچی ہوئی آمدنی سے خرچ کرے، کیونکہ اس صورت میں دونوں وقف شئ واحد کا حکم رکھتے ہیں۔ اور اس حکم کا معارض وہ حکم ہے جو فتاوی قاضی خاں میں ہے، وہ یہ ہے کہ ناظر کو جائز ہے کہ وقف کی فاضل آمدنی کو جہات خیر میں جس طرح مناسب سمجھے خرچ کرے۔

اور جو لوگ کہ امام کو مطلقاً اجازت دیتے ہیں، ان کی دلیلوں میں ''حاشیہ حموی علی الاشباہ'' کی یہ عبارت ہے:

''ويعارضه ما في فتاوى الإمام قاضي خان في أن الناظر له صرف فائض الوقف إلى جهات برّ بحسب ما يراه'' (حاشیہ حموی علی الاشباہ ص۱۹۲)۔

ان تمام بیانات سے ظاہر ہوگیا کہ مسئلہ اختلافی ہے، لیکن جب ہم نے اس پر اچھی طرح غور کیا تو ان اقوال مختلفہ کو جمع کرنے کی ایک صورت ہماری سمجھ میں آگئی وہ یہ ہے کہ مانعین غالباً اس صورت میں منع کرتے ہیں، جبکہ مسجد موقوف علیہ تعمیر کی محتاج ہو، خواہ فی الحال ہو یا فی المآل، جیسا کہ حاشیہ حموی میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، حاشیہ مذکورہ کی عبارت یہ ہے:

''قال بعضهم: الذي فيها (أي في التاتارخانية) لا يصرف القاضي الفاضل من وقف المسجد (ثم قال) والظاهر أن ذلك لجواز احتياج المسجد إلى عمارة كثيرة فينبغي أن يعيد لها ما صرف إليها بشراء مستغل وينبغي أن يكون أوقاف المدارس والرباط في حكمه بخلاف ما ليس من هذا القبيل من الأوقاف'' (حاشیہ حموی علی الاشباہ ص۱۹۲)۔

(بعضوں نے کہا کہ تاتارخانیہ میں یہ مذکور ہے کہ قاضی وقف مسجد کی فاضل آمدنی خرچ نہ کرے، پھر محشی نے کہا کہ ظاہر یہ ہے کہ ممانعت کا حکم اس لئے ہے کہ مسجد کے محتاج تعمیر ہونے کا امکان ہے، اسلئے مناسب ہے کہ عمارت ممکنہ کے لئے اس قدر روپیہ رکھا جائے کہ بوقت ضرورت صرف کیا جاسکے، اور مناسب ہے کہ مدارس اور رباط کے وقف بھی اسی حکم میں ہوں، بخلاف ان اوقاف کے جو اس قسم کے نہیں)۔

خاکسار کا کہنا ہے کہ اس عبارت میں ممانعت کے حکم کو معلل باحتیاج مسجد ہونا بیان کیا ہے، پھر محشی کا یہ قول 'مناسب' ہے، اس امر کی جانب مشیر ہے کہ عمارت ممکنہ کے لئے روپیہ جمع رکھنا امر مستحسن ہے، واجب نہیں، کیونکہ حاجت اگرچہ مآلاً ممکن الوجود ہے لیکن فی الحال تو معدوم ہے، ورنہ وہ مال فاضل نہیں، بلکہ مشغول ہوگا۔ اور مجوزین جو اجازت دیتے ہیں وہ اس صورت میں کہ وقف مستغنی ہو، پھر ان میں دو فریق ہوگئے، ایک فریق نے بصورت استغناء اجازت تو دی لیکن اتحاد واقف وجہت وقف کا لحاظ مدنظر رکھا تاکہ حتی الامکان شرط واقف کی رعایت ہوسکے، اور دوسرے فریق نے حفاظت مال وقف کے خیال کو مقدم رکھا، اور غرض واقف کی رعایت کی، کہ اس کا مال خدا کی راہ میں خرچ ہو اور فضول برباد نہ ہو، اور اس صورت میں بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کی حاجت نہیں کیونکہ ہر

فریق کی نظر ایک خاص شرعی امر پر ہے، اور ہر ایک کا قبلہ توجہ ایک امر مستحسن ہے، پس مفتی کو گنجائش ہے کہ وہ واقعہ سوال میں جواز نقل کا فتوی دے، تاکہ خدا کے مال ضائع ہونے سے بچیں، اور ظالمین متغلبین کے ہاتھ سے محفوظ رہیں، جو کہ اوقاف کے مال بے باکی سے ہضم کر جاتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے، پھر اگر تم چاہتے ہو کہ فریق ثالث کے قول کے مؤیدات معلوم کرو، تو ان روایات حدیثیہ اور فقہیہ کا بغور ملاحظہ ہو۔

روایات فقہیہ:

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے کہ کسی کو راستہ میں سخت سردی لگی وہ کسی مسجد میں داخل ہوا، مسجد میں کسی شخص کی لکڑیاں رکھی تھیں، اس کی حالت یہ تھی کہ اگر آگ نہ سلگائے تو ہلاک ہو جائے، تو مسجد کی لکڑیاں سلگانا اولی ہے، اس سے کہ کسی غیر شخص کی لکڑیاں جلائے (عالمگیری)۔

خاکسار کہتا ہے کہ جب ایک شخص کی جان بچانے کے لئے مسجد کی لکڑیاں سلگانے کی اجازت دیدی گئی تو اگر ایک جماعت مسلمین کی جان بچانے کے لئے اموال مسجد خرچ کئے جائیں تو بدرجہ اولی جائز ہوگا۔

''وفی الهندية: يجوز إدخال الحبوب وأثاث البيت فی المسجد للخوف فی الفتنة العامة، كذا فی القنية'' (فتاوی عالمگیری بحوالہ الاشباہ ۲۱۲)۔

خاکسار کہتا ہے کہ دیکھو ضرورت شدیدہ کے وقت مسجد کو ایک ایسے کام کے لئے استعمال کرنا جائز ہو گیا جو غرض مسجد کے خلاف ہے۔ اور در مختار میں ہے کہ مسجد میں نقش ونگار سوائے محراب کے اور جانبوں میں بنانے کا مضائقہ نہیں ہے، چونے سے یا سونے کے پانی سے بشرطیکہ بنانے والا اپنے مال سے بنائے نہ کہ مال وقف سے کہ یہ حرام ہے، اور اگر متولی مال وقف سے نقش ونگار بنوائے، یا سفیدی کرائے تو ضامن ہوگا، ہاں اگر ظالموں کی طمع کا خوف ہو تو مضائقہ نہیں۔ اور ''ردالمحتار'' میں ہے کہ مصنف کا یہ قول کہ طمع کا خوف ہوالخ، یعنی جب کہ متولی کے پاس مسجد کا مال جمع ہو جائے، اور مسجد کو تعمیر کی حاجت نہ ہو، ورنہ متولی ضامن ہوگا، جیسا کہ قہستانی میں نہایہ سے منقول ہے (در مختار مع ردالمحتار ۱/۴۸۶ تا ۴۸۷)۔

خاکسار کہتا ہے کہ، دیکھو، مسجد کے استغناء عن العمارۃ اور مال کے ضائع ہونے کے خوف کی صورت میں ایک ایسے کام میں خرچ کرنے کی اجازت دیدی کہ بصورت عدم خوف ہلاک اس میں خرچ کرنے سے متولی ضامن ہوتا تھا، اور ''ردالمحتار کتاب الوقف'' میں پہلے شمس الائمہ حلوانی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ جب کوئی مسجد ویران ہو جائے، اور اس کی حاجت نہ رہے تو اس کے اوقاف مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز ہے، پھر فرمایا کہ مناسب یہی ہے کہ جواز نقل میں مشائخ مذکورین کا اتباع کیا جائے، اور مسجد اور حوض کا فرق نہ کیا جائے، جیسا کہ امام حلوانی اور امام ابوشجاع نے فتوی دیا ہے، اور ان دونوں کی اقتداء کافی ہے، بالخصوص ہمارے اس زمانے میں، کیونکہ مسجد یا رباط یا حوض خراب شدہ کا اسباب اگر نقل نہ کیا جائے تو چور اور متغلبین اسے اٹھا لے جاتے ہیں، جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے، اور اس کے اوقاف کو خود متولی یا اور اشخاص کھا جاتے ہیں، اور اس کا اسباب نقل نہ کرنے سے دوسری محتاج مسجدیں بھی ویران رہ جاتی ہیں (ردالمحتار کتاب الوقف ۳/۴۰۷)۔

اور ''فتاوی عالمگیری'' میں ہے کہ کچھ مال ہے جو سبیل خیر کے لئے اور غیر معین فقراء کے لئے وقف ہے، اور کچھ مال مسجد جامع کے لئے وقف ہے، اور ان دونوں کی آمدنی جمع ہے، پھر اسلام کو کوئی حادثہ پیش آیا، جیسے کہ روم کا حادثہ اور اس حادثہ میں خرچ کی حاجت ہوئی تو مسجد جامع کا جو مال ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مسجد کو فی الحال اس کی حاجت نہ ہو تو قاضی کو اختیار ہے کہ اس مال کو اس اسلامی حادثہ میں بطور قرض خرچ کر لے، اور پھر مال غنیمت میں سے ادا کر دے، اور مال موقوف علی الفقراء کی تین صورتیں ہیں: کہ یا تو وہ محتاجوں میں صرف کیا جائے، یا اغنیائے مسافرین میں یا اغنیائے غیر مسافرین میں۔ پہلی اور دوسری صورت میں بغیر لحاظ قرض خرچ کرنا جائز ہے۔ اور تیسری صورت میں پھر دو صورتیں ہیں: اول یہ کہ کوئی قاضی اغنیاء غیر مسافرین میں خرچ جائز سمجھتا ہو، تو اسے بلا لحاظ قرض خرچ کرنا جائز ہے، دوسرے یہ کہ قاضی اسے ناجائز سمجھتا ہو تو بطور قرض خرچ کرلے، اور مال غنیمت پر دین رہے (واقعات حسامیہ، فتاوی ہندیہ ۲/۴۶۴)۔

خاکسار کہتا ہے کہ اس قول سے کہ مسجد کو فی الحال حاجت نہ ہو، یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ اگر مسجد کو فی المآل بھی حاجت نہ ہو تو بلالحاظ قرض بھی خرچ کرنا جائز ہوگا، اسی طرح وقف فقراء کا اغنیاء پر خرچ کر دینا بھی اسی کا مؤید ہے، نیز کسی قاضی کے جائز سمجھنے سے خرچ کرنے کی اجازت دے دینا اس بات کی دلیل ہے کہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، مگر یہ سب باتیں ضرورت شدیدہ اور نائبہ عظیمہ پیش آنے کی حالت میں ہیں۔

روایات حدیثیہ:

منجملہ روایات حدیثیہ کے یہ روایت بھی ہے جو امام مسلمؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، فرماتے تھے کہ:

''لولا أن قومك حديثو عهد بجاهلية أو قال بكفر لأنفقت كنز الكعبة في سبيل الله'' (مسلم شریف ۱؍۴۲۹)۔

(اگر تمہاری قوم ابھی قریب العہد بکفر نہ ہوتی تو میں کعبہ کا خزانہ سبیل خدا میں خرچ کردیتا)۔

اور منجملہ ان کے وہ روایت ہے جو امام بخاری علیہ الرحمہ نے اپنی صحیح میں ابووائل سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں شیبہ کے ساتھ کعبہ میں کرسی پر بیٹھا تھا، تو انہوں نے فرمایا کہ اسی مقام پر حضرت عمر بیٹھے تھے، اور فرمایا تھا کہ میرا ارادہ ہوتا ہے کہ اس میں نہ چاندی چھوڑوں نہ سونا، سب تقسیم کردوں (صحیح بخاری۔ باب کسوۃ الکعبہ ۱؍۲۱۷)۔

خاکسار کہتا ہے کہ حضرت عمر کا تقسیم مال کعبہ کا ارادہ کرنا پہلی حدیث کے ان الفاظ کی تفسیر کرتا ہے، جو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ کعبہ کا خزانہ راہ خدا میں خرچ کردیتا، اور اس تقریر سے یہ وہم بھی دور ہوجاتا ہے کہ حضرت عمر کا ارادہ محض حجت نہیں، کیونکہ انہوں نے خود اس ارادے کو چھوڑ دیا، جبکہ شیبہ نے کہا کہ تمہارے دونوں ساتھیوں نے ایسا نہیں کیا، تو حضرت عمر نے فرمایا کہ وہ دونوں شخص ایسے ہیں کہ ان کی اقتداء کی جاتی ہے، تو حضرت عمر کا یہ فرمانا اس پر دال ہے کہ تقسیم نہ کرنا ہی فعل پسندیدہ اور شارع علیہ السلام کی مرضی کے موافق تھا، اور تقسیم کرنا ممنوع تھا، اس لئے حضرت عمر نے بھی تقسیم نہ کیا، وجہ اس وہم کے دور ہونے کی یہ ہے کہ ترک انفاق آنحضرت ﷺ نے ایک خاص علت سے کیا تھا، اور وہ قریش کا قریب العہد بکفر ہونا ہے، جیسا کہ مسلم کی روایت میں اس کی تصریح ہے، تو حضرت عمر کا ارادہ آنحضرت ﷺ کے ارادہ کے مطابق اور ان کا ترک آنحضرت ﷺ کے ترک کے موافق واقع ہوا، اگرچہ آنحضرت ﷺ کے ترک کی وجہ اور تھی، اور وہ وجہ حضرت عمر کے زمانے میں موجود نہ تھی، لیکن انہوں نے بوجہ شدت شوق اقتضائے آثار پیغمبر آپ کا اتباع کیا۔

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ ابن صلاح نے فرمایا: امام کو اختیار ہے کہ (غلاف کعبہ کو) بیچے یا یونہی مسلمانوں کو عطا کردے، اور انہوں نے استدلال کیا اس واقعہ سے جو ازرقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر ہر سال غلاف کعبہ اتارتے اور حجاج کو تقسیم کردیتے تھے (حاشیہ بخاری: باب کسوۃ الکعبۃ ۱؍۲۱۷)۔

خاکسار کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ غلاف کعبہ اس لئے تقسیم کردیتے تھے کہ کعبہ کو اس کی حاجت نہ تھی، کیونکہ اس پر تو ہر سال نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے، تو اترا ہوا غلاف اگر تقسیم نہ کیا جاتا تو ضائع ہوجاتا، یا دربان بیچ کر اپنی حاجتوں میں خرچ کرلیتے، اور حضرت عمرؓ کے قول میں چاندی سونے سے مراد وہ خزانہ ہے جو کعبہ میں مدفون تھا، کعبہ کو جو مال دیئے جاتے تھے وہ اس پر خرچ ہوتے تھے، اور جو بچتا تھا وہ اسی میں دفن کردیا جاتا تھا، جیسا کہ علامہ عینی نے قرطبی سے نقل کیا ہے۔ یہ تو اوقاف مساجد اور اس کے مثل کا حکم تھا، رہے اور اوقاف تو اس میں حاکم اسلام کو ذرا اختیار وسیع ہے۔

یہ تھیں وہ روایات حدیثیہ وفقہیہ جن سے قول ثالث کے لئے استناد واستیناس میں پیش کیا جاسکتا ہے، اور اسی وجہ سے مفتی کو گنجائش ہے کہ وہ اس قول پر فتوی دیدے، بشرطیکہ اس کو وقف کے لئے اصلح اور عامہ مسلمین کے لئے انفع سمجھے، جیسا کہ علامہ شامی نے مسجد کے سامان شکستہ نقل کرنے کے بارے میں امام حلوانی اور امام ابوشجاع کے قول کو قابل اتباع بتایا ہے، باوجودیکہ اصل مذہب عدم جواز نقل ہے۔ اور یہ کیوں؟ صرف ضرورت شدیدہ کی وجہ سے۔

مذکورہ بالا تحقیق کی بنا پر ایسی حالت میں کہ مسجد کے اموال کثیر جمع ہوں، اور مسجد کو نہ فی الحال ان کی حاجت ہو، اور نہ بظن غالب فی المآل، اور ان اموال کے اسی طرح جمع رہنے میں ضائع ہوجانے اور متغلبین کے کھا اڑا جانے کا اندیشہ ہو، تو یہ زائد از حاجت اموال جمع شدہ کسی دوسری محتاج مسجد میں خرچ ہوسکتے ہیں، اسی طرح کسی ایسے دینی مدرسہ میں جو علوم شریعت تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم دیتا ہو، خرچ کرنا جائز ہے (کفایت المفتی ۷؍۲۶۵ تا ۲۷۵)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے مندرجہ تفصیلی فتوی پر جن جلیل القدر علماء نے تائیدی دستخط کئے ہیں، ان میں علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمن دیوبندی، مفتی محمد سہول صاحب بھاگلپوری، مولانا مرتضی حسن چاندپوری اور مولانا اعزاز علی صاحب وغیرہم اکابر علماء بھی ہیں۔ اس مفصل فتوی میں مسجد کی فاضل آمدنی کے سلسلہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے روایات حدیث اور تصریحات فقہاء کی روشنی میں جو کچھ لکھا ہے، اور جس علت کی بنیاد پر مسجد کی فاضل آمدنی کو دوسری مسجد کی ضروریات یا دیگر رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسجد پر وقف اراضی فی الحال یا فی المآل مسجد کی ضرورت سے زائد ہو تو اس پر مسلمانوں کے لئے دینی تعلیم کا ادارہ قائم کرنا شرعاً جائز ہے، لیکن

عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا مسجد کی اراضی پر جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ زمین مسجد کی ضروریات سے فاضل ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ دینی ادارہ کی تعمیر درحقیقت مسجد کی معنوی تعمیر ہے، لیکن عصری تعلیم کے ادارہ کی تعمیر کی شرعاً یہ حیثیت نہیں ہے۔

یادرہے کہ یہاں مسجد کی فاضل اراضی پر دینی ادارہ کے قائم کرنے کے جواز کا جو فتویٰ دیا گیا ہے وہ فتویٰ اگرچہ جمہور علماء اسلام کی تصریحات کے خلاف ہے، لیکن جائز قرار دینے کی علت یہ ہے کہ مسجد کی فاضل اراضی کے سلسلہ میں بہت سی جگہ دیکھا گیا ہے کہ لوگوں نے اسے غصب کرکے اپنا مکان وغیرہ بنالیا ہے، اور اس کے مالک بن بیٹھے ہیں، جب کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ وقف زمین کا مالک ہوجائے، اور اگر مسجد کی فاضل اراضی پر دینی تعلیم کا ادارہ قائم کردیا جائے تو اس صورت میں مسجد کا وقف بھی علی حالہ باقی رہتا ہے، علاوہ ازیں دینی ادارہ کی تعمیر مسجد کی معنوی تعمیر ہے، لہٰذا مذکورہ اسباب کی بنا پر احقر کے نزدیک مسجد کی فاضل اراضی پر دینی ادارہ کی تعمیر کی شرعاً گنجائش ہے، اور اس کی نظیر راقم سطور کے نزدیک پرانے قبرستان پر مسجد بنانے کا جواز ہے۔

دیگر اوقاف کی فاضل آمدنیوں کا حکم:

الف، ب۔ جن اوقاف کی آمدنی ان کے متعین مصارف سے بہت زیادہ ہے، جو سال بسال جمع ہوکر ایک بڑا سرمایہ بن جاتی ہے، اور اس کی طویل عرصہ تک حفاظت ایک دشوار مسئلہ بلکہ خالی از خطرہ نہیں خواہ یہ خطرہ حکومت کی دست درازی کا ہو یا منتظمین کی خیانت کا، دوسری طرف یہ آمدنی جن اوقاف کی ہے ان کی اصلاح و مرمت کے لئے اس رقم کی نہ فی الحال ضرورت ہو اور نہ آئندہ ہو، اور نہ ہی اس آمدنی کو مذکورہ اوقاف کی روزمرہ کی ضروریات ہی میں خرچ کیا جاسکتا ہو تو ایسی صورت میں شریعت کا اصل حکم یہ ہے کہ مذکورہ اوقاف کی فاضل آمدنی کو اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں خرچ کیا جائے، البتہ اگر کسی جگہ کوئی حادثہ پیش آجائے، یا قوم وملت کا کوئی اہم کام درپیش ہو یا کسی جگہ کوئی مسجد تعمیر ہورہی ہو اور وہاں رقم کی ضرورت ہو، نیز کسی ملی و دینی اور علمی کاموں کی تکمیل کے لئے رقم درکار ہو تو ایسے موقع پر عام اوقاف کی فاضل آمدنیوں کو خرچ کرنے کی شرعاً گنجائش ہے، یہاں تک کہ مسجد کی بھی فاضل آمدنی کو غریب و نادار مسلمانوں کی امداد یا دیگر دینی و علمی کاموں میں خرچ کرنے کی بعض علماء وفقہاء نے اجازت دی ہے، چنانچہ کفایت المفتی میں متعدد فتاویٰ کے اندر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے مسجد کی فاضل آمدنی کو دوسری مسجد کے علاوہ دیگر دینی و علمی کاموں میں خرچ کرنے کی نہایت صراحت ووضاحت کے ساتھ اجازت دی ہے، حضرت مفتی صاحب کا ایک طویل ومدلل فتویٰ اوپر درج کیا جاچکا ہے، ذیل میں چند اور فتاویٰ ملاحظہ ہوں:

الجواب ۲۳۶: جب کہ مسجد موقوف علیہ کا مال اس قدر جمع ہوجائے کہ مسجد کو نہ فی الحال اس کی ضرورت ہو اور نہ آئندہ ضرورت پڑنے کا اندیشہ ہو، اور جمع رہنے میں مال کے تلف ہوجانے کا بظن غالب خوف ہو، اور دوسری مسجد کو تعمیر کی حاجت ہو کہ بغیر تعمیر اس کی ویرانی کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں مسجد اول الذکر کا مال اقرب الی المساجد المحتاجۃ الی العمارۃ میں لگادینا جائز ہے (کفایت المفتی ۷/ ۲۶۴)۔

الجواب ۲۴۰: اگر مسجد کا مال اس قدر جمع ہو کہ مسجد اس کی نہ فی الحال محتاج ہو اور نہ بظن غالب فی المآل، اور اس رقم کے اس طرح جمع رہنے کی حالت میں طمع طامعین اور تصرف متغلبین کا اندیشہ ہو، تو بے شک یہ رقم موجودہ ضرورت میں جو اسلام اور مسلمین کے لئے ایک حادثہ اور نائبہ کبری ہے، خرچ ہوسکتی ہے، یعنی ترک مجروحین و یتامی و بیوگان کی امداد کے لئے بھیجی جاسکتی ہے (کفایت المفتی ۷/ ۲۷۸)۔

الجواب ۲۵۳: اگر مساجد کی آمدنی مسجد کے مصارف کو پورا کرنے کے بعد اس قدر فاضل رہے کہ مسجد کو اس کی نہ فی الحال حاجت ہو اور نہ آئندہ اس کا خوف ہو کہ مسجد اس کی حاجتمند ہوگی، تو ایسی فاضل جمع شدہ رقم کو تعلیم میں خرچ کرنے کی گنجائش ہے، اگر دینی تعلیم کا مدرسہ مسجد ہی میں قائم ہو تو اس کی فاضل آمدنی کو اسی مدرسہ میں خرچ کرنا ایک طرح مسجد کی تعمیر معنوی میں داخل ہے، اور اگر مسجد سے خارج مدرسہ قائم ہو تو متولیان مسجد کی اس متفقہ رائے سے خرچ ہوسکتی ہے کہ مسجد اس سے مستغنی ہے (کفایت المفتی ۷/ ۲۹۱)۔

الجواب ۲۶۵: جب مسجد کی آمدنی اس قدر کثیر ہو کہ مسجد کو اس کی نہ فی الحال حاجت ہو اور نہ فی المآل تو ایسی حالت میں جمع شدہ رقم کو کسی دوسری محتاج مسجد میں یا دینی تعلیم میں خرچ کیا جاسکتا ہے (کفایت المفتی ۷/ ۳۰۰)۔

الجواب ۲۶۵: مذکورہ سوال رقوم جو اوقاف متعلق مساجد کی آمدنی میں سے ضروریات مساجد پوری ہونے کے بعد فاضل بچی ہوئی ہیں، اور بظاہر مساجد ان رقوم کی نہ فی الحال حاجت ہے اور نہ آئندہ احتیاج کا خطرہ ہے، ایسی رقوم سے مساجد میں مدارس دینیہ کا اجراء یا دینی ضرورتوں کے ماتحت دار المطالعہ کا قیام ہے، مسجد یا اس کی متعلقہ وقف عمارت میں تعلیم کا اجراء مسجد کی تعمیر معنوی میں داخل ہے، اور تعمیر مسجد شعائر اللہ میں شمار کی گئی ہے، اور مصرف وقف مسجد میں شامل

ہے، ایسی رقوم کو مولود شریف یا تعزیہ یا مرثیہ خوانی پر خرچ کرنا جائز نہیں، اور کسی انجمن کی دینی ضروریات میں دینا اگر جائز بھی ہوتا ہم تعلیم پر خرچ کرنا بہتر اور افضل ہے (کفایت المفتی ۷؍۳۰۲)۔

الجواب ۲۶۷: مساجد کے اوقاف کی آمدنی دراصل تو مساجد کے مصارف کے لئے ہوتی ہے، مگر جب آمدنی تمام مصارف پورے کرنے کے بعد بھی فاضل بچ جائے اور مساجد کو اس کی فی الحال بھی حاجت نہ ہو اور آئندہ حاجت پڑنے کا خوف بھی نہ ہو تو ایسی فاضل آمدنی نادار اور غیر مستطیع دینی طلبہ کو امدادی وظائف میں دی جاسکتی ہے، نیز جائز اور مباح علوم معاشیہ کے نادار اور غیر مستطیع طلبہ کو بھی دینا جائز ہے۔ دینی علوم کے نادار طلبہ زیادہ مستحق ہیں (کفایت المفتی ۷؍۳۰۲)۔

الجواب ۲۶۷: مسجد کے اوقاف کی آمدنی کا اصل حکم یہ ہے کہ اسی مسجد پر صرف کیا جائے جس کے لئے وقف ہے، البتہ اگر آمدنی اتنی زیادہ اور رقم اتنی جمع ہوگئی ہو کہ مسجد کو نہ فی الحال اس رقم کی حاجت ہے اور نہ اس کا اندیشہ ہے کہ آئندہ مسجد کو اس رقم کی حاجت پڑے گی، تو اس زائد از حاجت رقم میں سے کسی دوسری محتاج مسجد کو امداد دی جاسکتی ہے، قبرستان کی مسجد یا جنازہ گاہ یا ان کی متعلقہ ضروریات میں کسی مالدار مسجد کی زائد از حاجت رقم سے امداد کرنا متولیان مسجد کے لئے سخت ضرورت کے وقت جائز ہے (کفایت المفتی ۷؍۳۰۴)۔ ''فتاوی عالمگیری'' میں ہے:

''سئل نجم الدين في مقبرة فيها أشجار هل يجوز صرفها إلى عمارة المسجد قال نعم إن لم تكن وقفا على وجه آخر، قيل له: فإن تداعت حيطان المقبرة إلى الخراب يصرف إليها أو إلى المسجد، قال: إلى ما هي وقف عليه'' (فتاوی عالمگیری ۲؍۴۷۶)۔

''وفي مجموع النوازل: أشجار في مقبرة يجوز صرفها إلى المسجد إن لم يكن وقفاً على جهة أخرى فإن تداعت حوائط المقبرة إلى الخراب لا يصرف اليه بل إلى الجهة الموقوفة إن عرفت'' (فتاوی بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶؍۲۶۱)

''قال في الهندية: تحت الوقف على المسجد: إن للقيم أن يتصرف في ذلك على ما يرى وإذا استغنى هذا المسجد يصرف إلى فقراء المسلمين فيجوز ذلك كذا في الظهيرية. رجل وقف أرضا له على مسجد ولم يجعل آخره للمساكين تكلم المشائخ فيه والمختار أنه يجوز في قولهم جميعا. كذا في الواقعات الحسامية'' (عالمگیری ۲؍۴۶۰)۔

کم منفعت بخش اوقاف کو فروخت کرکے کسی تجارتی مقام میں دوکان خریدنا:

اگر کسی جگہ اوقاف اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہیں، مثلاً کسی مسجد یا مدرسہ پر کوئی مکان وقف ہے، جو محلہ کے اندر واقع ہے، جس کا معمولی کرایہ ملتا ہے، جس سے حاصل ہونے والی آمدنی مکان موقوفہ کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہوگی، مگر اس کے باوجود اس مکان موقوفہ یا مذکورہ اوقاف کو فروخت کرکے کسی دوسرے تجارتی مقام پر کوئی دوکان وغیرہ خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے، اگرچہ اس شکل میں وقف کی آمدنی کے زیادہ ہوجانے کی امید ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ''فتاوی خانیہ'' اور ''بزازیہ'' میں ایک جزئیہ امام محمد علیہ الرحمہ سے منقول ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم منفعت والے وقف کو زیادہ منفعت والی زمین کے عوض فروخت کرنا جائز ہے۔

''روى عن محمد ما هو أعلى من هذا وهو أن أرض الوقف لو قل ريعها فللقيم أن يبيعها ويشترى بثمنها أرضا أخرى ريعها أكثر نفعا للفقراء فجوّز استبدال الأرض بالأرض'' (بزازیہ علی الہندیہ ۶؍۲۵۴)۔

مگر اصح اور مفتی بہ قول کے مطابق کم منفعت والے اوقاف کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ استبدال کی تیسری صورت کے ذیل میں اس مسئلہ کی تفصیل گذر چکی ہے۔

اور فقہ حنبلی میں بھی قلیل المنفعت اوقاف کو فروخت کرکے اس کا متبادل کثیر النفع وقف خریدنا جائز نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا ہے:

''وإن لم تتعطل مصلحة الوقف بالكلية لكن قلت: وكان غيره أنفع منه وأكثر ردا على أهل الوقف لم يجز بيعه؛ لأن الأصل تحريم البيع وإنما أبيح للضرورة صيانة لمقصود الوقف عن الضياع مع إمكان تحصيله ومع

الانتفاع وإن قل ما يضيع المقصود'' (المغنی لابن قدامہ ۶،۲۲۷)۔

البتہ قلیل المنفعت اراضی موقوفہ میں زیادہ نفع کے حصول کے لئے عمارت بنا کر کرایہ پر دینا جائز ہے (کفایت المفتی ۷/۹۵ جواب ۸۴)۔

''ولو كانت الأرض متصلة ببيوت المصر يرغب الناس فی استيجار بيوتها وتكون غلة ذلك فوق غلة الزرع والنخيل كان للقيم أن يبنى فيها بيوتا فيواجرها'' (فتاوی عالمگیری ۲،۴۱۴)۔

اگر کسی وقف کے مصارف ختم ہوجائیں تو اس کی رقم کہاں خرچ کی جائے:

جن اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے ہیں، مثلاً کوئی جاگیر کسی خاص خاندان کے فقراء کے لئے وقف تھی، وہ خاندان ختم ہوگیا، یا اس کے افراد ختم ہوگئے، یا کسی مسجد ومدرسہ کے لئے زمین وقف تھی، اور اب نہ وہ مسجد ہے نہ مدرسہ تو ان اوقاف کی آمدنیوں کا مصرف یہ ہے کہ وہ جس قسم کے اوقاف کی آمدنیاں ہیں، اسی قسم کے دیگر قریبی اوقاف کے مصارف میں ان کو خرچ کیا جائے، مثلاً وہ وقف کسی خاندان کے فقراء کے لئے ہے، تو اس خاندان کے ختم ہونے پر اس وقف کی آمدنی عام فقراء پر خرچ کی جائے اور ایک مسجد کے انہدام کے بعد اس کی آمدنی دوسری مسجد پر اور مدرسہ کے ختم ہوجانے پر اس کے وقف کی آمدنی دوسرے دینی مدرسہ پر خرچ کی جائے، البتہ یادرہے کہ پہلے قریبی اوقاف کو دیا جائے، اور اگر اس قسم کے اوقاف کے مصارف اس شہر میں یا قریبی شہر میں نہ ہوں، تو دیگر شہروں میں جہاں اس جیسے اوقاف ہوں، وہ آمدنی کی رقم منتقل کردی جائے، چنانچہ ''امداد الفتاوی'' جلد دوم سوال نمبر ۲۳۷ کے جواب کے ذیل میں مرقوم ہے:

''الجواب: مدرسہ جنس مسجد سے نہیں اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے، اگر اس شہر میں حاجت نہ ہو تو دوسرے شہروں کی مساجد میں صرف کریں، جو زیادہ قریب ہو اس کا حق مقدم ہے، اسی طرح بہ ترتیب'' (امداد الفتاوی ۲/۲۹۶)۔

''فتاوی قاضی خان'' میں ہے: ''رباط فی طرق بعيد استغنى عنه المارة وبجنبه رباط آخر قال السيد الإمام أبو شجاع رحمه الله تعالى: يصرف غلته إلى الرباط الثانى كالمسجد إذا خرب و استغنى عنه أهل القرية فرفع ذلك إلى القاضى فباع الخشب وصرف الثمن إلى مسجد آخر جاز'' (فتاوی خانیہ علی ہامش الہندیہ ۳،۳۱۵)۔

''وقال أبو يوسف: إذا سمى فيه جهة تنقطع جاز وصار بعدها للفقراء'' (قدوری ۱۳۹)۔

''وفى البزازية: وعن الحلوانى فى المسجد والحوض إذا خرب وتفرق الناس يصرف أوقافه إلى حوض ومسجد آخر'' (فتاوی بزازیہ علی الہندیہ ۶،۲۷۱)۔

''وفيه أيضا وإن استغنى هذا المسجد يصرف إلى مسجد آخر'' (فتاوی بزازیہ ۶،۲۷۸)۔

''وفى الدر المختار: حشيش المسجد و حصره مع الاستغناء عنهما وكذا الرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه الخ. وفى الشامية: وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه، وفى شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳،۴۰۷)۔

الف۔ اراضی وقف پر تعمیر کرنے کے عوض بلڈر کو وقف مکان کی کسی منزل کا مالک بنا دینا:

اگر اوقاف کی عمارتیں مخدوش ہوگئیں اور واقف کے پاس ان کی تعمیر کے لئے کوئی سرمایہ نہیں ہے، اور کوئی بلڈر اس کے لئے تیار ہے کہ اس مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط کے ساتھ تعمیر کردے کہ اس کی ایک یا دو منزل بلڈر کی ملکیت ہوگی، جس میں اس کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہوگا، اور بقیہ عمارتیں وقف کے مصارف کے لئے ہوں گی، تو شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح وقف کی ایک زمین ہے جس پر کسی طرح کی کوئی عمارت نہیں ہے، اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی صورت ہے، تو ایسی صورت میں بھی اگر کسی بلڈر سے مذکورہ بالا معاملہ کیا جائے تو شرعاً اس کی بھی اجازت نہیں ہے، کیونکہ وقف زمین پر عمارت بنانے کے عوض بلڈر کو وقف مکان کی کسی منزل کا مالک بنا دینا درحقیقت اس مکان موقوفہ کو فروخت کرنا ہے، جس کی مذہب اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں ہے، چنانچہ ''قاضی خان'' میں ہے:

''ويجوز بيع الأشجار الموقوفة فى أرض الوقف إذا لم تكن مثمرة بعد القلع، ولا يجوز قبل القلع؛ لأنها قبل

القلع متصلة بالأرض، فتكون تبعا للأرض وبيع أرض الوقف لا يجوز فكذلك ماكان تبعا له'' (خانیہ علی ہامش الہندیہ ۳،۳۱۰)۔

ب۔ ایک وقف کوفروخت کر کے اس کی قیمت سے دوسرے وقف پر مکان کی تعمیر کرنا:

اگر کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا کسی خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے وقف شدہ زمین و جائداد کا کوئی حصہ فروخت کر کے اس سے نئی تعمیر کی جائے توشرعاً اس کی اجازت نہیں ہے، اگر چہ اس کے فروخت کرنے کا مقصد وقف ہی کی حفاظت ہے اور اگر چہ بغیر فروخت کئے مذکورہ اوقاف کی تعمیر ممکن نہ ہو، کیونکہ حضرات فقہاء نے اوقاف کی فروختگی کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقف کی حفاظت وتعمیر کے لئے دوسرے اوقاف کی فروختگی جائز نہیں ہے، چنانچہ ''فتاوی بزازیہ'' میں ہے:

''بيع عقار المسجد لمصلحة لايجوز وإن بأمر القاضي'' (بزازیہ علی الہندیہ ۶،۲۷۱)۔

''قال في الهندية: وإذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضها ليرم الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك'' (عالمگیری ۲،۲۱۷)۔

البتہ اگر وقف کی آمدنی سے کوئی زمین خریدی گئی تو متولی اس زمین کوفروخت کر کے وقف کی تعمیر میں لگا سکتا ہے۔

''اشترى بمال الوقف دارا ثم باعه يجوز'' (فتاوی بزازیہ ۶،۲۵۵)۔

''قال في رد المحتار أما إذا اشتراه المتولي من مستغلات الوقف فإنه يجوز بيعه بلا هذا الشرط (أي تعذر الانتفاع) لأن في صيرورته وقفا خلافا والمختار أنه لا يكون وقفا فللقيم أن يبيعه متى شاء لمصلحة عرضت'' (ردالمحتار ۳،۴۱۹)۔

نیز ایک وقف میں تعمیر کے لئے اسی وقف کی دوسری زمین کو یا خود اسی زمین کو کرایہ پر دینا جائز ہے بلکہ جو زمین شرعاً مسجد ہو گئی، اگر اس کی تعمیر کے لئے اس کو کرایہ پر دینا پڑے تو حضرات فقہاء نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے۔

''إن المسجد إذا احتاج إلى العمارة وآجره القيم لينفق من الأجرة يجوز'' (بزازیہ ۶،۲۶۰)۔

''قال في رد المحتار: إن الخان لو احتاج إلى المرمة آجر بيتا أو بيتين وأنفق عليه وفي رواية يؤذن للناس بالنزول سنة و يؤجر سنة أخرى ويرم من أجرته، وقال الناطفي: القياس في المسجد أن يجوز إجارة سطحه لمرمته وفي البرجندي والظاهر أن حكم عمارة أوقاف المسجد والحوض والبئر وأمثالها حكم الوقف على الفقراء'' (ردالمحتار ۳،۴۱۹، ومثلہ فی الہندیہ ۲،۴۱۴ مختصراً)۔

مسجد یا قبرستان پر وقف شدہ فاضل اراضی پر مدرسہ بنانا:

مسجد یا قبرستان کے لئے ایک زمین وقف ہے، جو مسجد وقبرستان کی ضرورت سے زائد ہے اب اگر اس زمین پر اس ارادے سے مدرسہ بنادیا جائے کہ وہ ضرورت سے فاضل زمین ایک کار خیر میں استعمال ہو تو شرعاً اس کی گنجائش ہے یا نہیں تو اس سلسلے میں فقہائے احناف نے عام طور سے کتب فقہ وفتاوی میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو زمین جس کام کے لئے وقف کی گئی ہو اس کو اسی مصرف میں استعمال کیا جائے، کیونکہ فقہ واصول کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ ''نص الواقف كنص الشارع'' (قواعدالفقہ ۸۵)، ''ومراعاة غرض الواقفين واجبة'' (رد المحتار ۴۶۴)۔

حضرات فقہاء کے بیان کردہ مندرجہ بالا اصول کا تقاضا یہ ہے کہ مسجد یا قبرستان کے لئے جو زمین وقف ہو وہ اگر چہ ضرورت سے زائد ہو، لیکن اس پر مدرسہ کی تعمیر کرنا جائز نہیں ہے (جامع بیان العلم ۲/ ۳۱) البتہ اگر واقف کی طرف سے صراحتہً یا دلالۃً مسجد وقبرستان کی زمین پر مدرسہ بنانے کی اجازت ہو تو پھر مدرسہ کی تعمیر جائز ہوگی، بلکہ دور حاضر میں عموماً ناخواندہ واقفین کی طرف سے دلالۃً اجازت پائی جاتی ہے، کیونکہ مسجد پر زمین وقف کرنے سے ان کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کی آمدنی مسجد، مصالح مسجد اور تعمیر مسجد وغیرہ میں خرچ کی جائے، اور ظاہر ہے کہ مدرسہ کی تعمیر مسجد کی معنوی تعمیر ہے، علاوہ ازیں اگر کوئی شخص مسجد کی فاضل

اراضی پر مدرسہ بنا دیتا ہے، اور واقف کو اس کا علم بھی ہو جاتا ہے، مگر وہ خود اس پر نکیر نہیں کرتا، بلکہ بہت سی جگہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد کی فاضل اراضی پر واقف سمیت گاؤں والوں کی اجازت سے مدرسہ بنا دیا گیا، اور پورے انہماک سے وہاں تعلیم ہو رہی ہے، بلکہ بہت سے شہروں میں بعض بڑے بڑے مدرسے مسجد ہی کے اطراف میں قائم ہیں وہاں پہلے سے مسجد تھی، اور مدرسہ بعد میں بنایا گیا، نیز زمانہ قدیم میں زیادہ تر طلبہ کی تعلیم وتربیت مسجد ہی کے اندر ہوتی تھی، بلکہ مسجد خود اس کا مرکز تھی، اور علامہ ابن عبدالبر علیہ الرحمہ نے "جامع بیان العلم" میں ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک ازدی شخص نے جہاد کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں تم کو جہاد سے بہتر چیز بتاتا ہوں: "تبتنی مسجدا و تعلم فیه القرآن والسنة والفقه فی الدین" (جامع بیان العلم ۲۰۲۱) مسجد تعمیر کر کے اس میں کتاب وسنت اور دینی احکام کی تعلیم دو۔

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد وقبرستان کی وہ فاضل اراضی جس کی مسجد وقبرستان کو نہ ابھی ضرورت ہے، اور نہ ہی آئندہ ضرورت پڑنے کا امکان ہے، مثلاً قبرستان میں لوگوں نے دفن کرنا چھوڑ دیا اور قبریں منہدم ہو گئیں، تو ان صورتوں میں مسجد وقبرستان کی فاضل اراضی پر مدرسہ کی تعمیر جائز ہے، اور اس سلسلہ میں قدرے تفصیل دوسرے سوال کے تحت گذر چکی ہے، نیز یہ بھی گذر چکا ہے کہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے نزدیک مسجد یا اس کی متعلقہ وقف عمارت میں تعلیم کا اجراء مسجد کی تعمیر معنوی میں داخل ہے (کفایت المفتی ۷/۳۰۲، جواب ۲۶۶) نیز آگے یہ مسئلہ آ رہا ہے کہ ویران قبرستان پر تعمیر مسجد ومدرسہ کی حضرات فقہاء نے اجازت دی ہے، البتہ اگر خود واقف نے زمین کو کسی معین مسجد پر وقف کر کے صراحت کر دی ہو کہ اس کی آمدنی کسی دوسری جگہ خرچ نہ کی جائے تو اس وقت اس کی مخالفت جائز نہ ہوگی۔

"لأن شرط الواقف کنص الشارع فیجب اتباعه" (رد المحتار ۳،۴۹۷)۔

لیکن اگر مسجد وقبرستان کی فاضل اراضی پر کسی کے غصب کر لینے کا واقعی خطرہ ہو تو ایسی صورت میں بہر حال اس پر تعمیر مدرسہ کی اجازت دی جائیگی۔

ویران قبرستان پر قبضہ کے خطرہ کے وقت اس سے انتفاع کی جائز شکلیں:

جس قبرستان سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہو جانے کی وجہ سے اب اس کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہو رہا ہے، یا وہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا ہے، جس کے سبب اس کے استعمال کرنے اور اس میں تدفین کرنے سے سرکار نے پابندی عائد کر دی ہے اور اب اس قبرستان پر قبضہ کا خطرہ ہے، بلکہ قبضہ ہو رہا ہے، تو ایسی صورت میں شرعاً گنجائش ہے کہ جب قبریں منہدم ہو جائیں تو اس زمین پر کوئی مسجد یا مدرسہ یا کوئی دینی انجمن یا کوئی رفاہی ادارہ قائم کر دیا جائے۔ اسی طرح غیر آباد قدیم قبرستان میں عمارت تعمیر کر کے اس کو کرایہ پر لگایا جا سکتا ہے، نیز جب قبریں منہدم ہو جائیں تو اس کو کھیت بنا کر یا اس میں باغ لگا کر اس کی آمدنی دیگر قبرستان کی حفاظت یا خریداری یا مساجد ومدارس کے مصارف میں اسی طرح عام غرباء پر خرچ کی جا سکتی ہے، اور ان تمام باتوں کی اجازت اکابر علماء کے فتاوی میں موجود ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے "امداد الفتاوی" میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ویران قبرستان میں جہاں مردوں کو دفن نہیں کیا جاتا اسلامی انجمن کے مکان بنانے کے جواز کا فتوی صادر فرمایا ہے (امداد الفتاوی ۲/۵۷۹، سوال ۷۰۲)، اسی طرح حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہ نے بھی احسن الفتاوی میں پرانی قبرستان میں مسجد بنانے کو جائز قرار دیا ہے (احسن الفتاوی ۶/۴۰۹)، ایک دوسرے فتوی میں وقف قبرستان پر قبضہ کر کے اس کو فروخت کرنے وغیرہ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

الجواب: قبرستان کے لئے وقف زمین پر لوگوں کا قبضہ کرنا ناجائز ہے اور ان کی بیع وشراء باطل ہے، حکومت یا متولی پر ضروری ہے کہ اس جگہ کو فوراً خالی کرائے، اور یہ جگہ دفن کے کام نہ آتی ہو تو اس پر مسجد یا کوئی اور رفاہ عامہ کی چیز تعمیر کرے (احسن الفتاوی ۶/۴۱۴) آگے حضرت مفتی رشید صاحب نے بطور تائید کے "عمدۃ القاری" (۴/۱۷۹) کی عبارت نقل کی ہے جو ماقبل میں گذر چکی ہے۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب مدظلہ نے ویران مقابر واوقاف کے شرعی احکام کو بیان فرماتے ہوئے بحث ونظر کے شمارہ ۲۱ (ص ۱۰۵) میں لکھا ہے کہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ غیر آباد قدیم اور مردہ قبرستانوں کو اگر لیز پر لگا دیا جائے تو ہزارہا قبرستان جو ابھی آباد ہیں، اور ان کا تحفظ خطرہ میں ہے، ایسے قبرستانوں کے تحفظ کی صورت نکالی جا سکتی ہے، لہذا میرے نزدیک شرع اسلام کی رو سے ایسے مردہ اور قدیم قبرستانوں کو تعمیرات یا کاشت کے لئے لیز پر دیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح کی آمدنی کو اولاً دیگر مقابر کے تحفظ یا ایسے شہروں اور آبادیوں کے لئے قبرستان کی اراضی حاصل کرنے پر خرچ کرنا چاہئے جہاں قبرستان کی ضرورت ہے، اگر اس طرح کے مدات پر خرچ کے بعد رقم بچ جائے تو اسے مدارس، مسافر خانوں، نادار بچوں کی تعلیم اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ

کیا جاسکتا ہے (بحث ونظر شمارہ ۲۱ جلد ۶ صفحہ ۱۰۵، فقہ المشکلات رص ۲۴۵، ۲۴۶)۔

''قال فی الهداية أن الميت إذا بلى وصار ترابا جاز زرعه والبناء عليه'' (ہدایہ ۲،۴۷۱۔ومثلہ فی رد المحتار ۱،۶۵۹)۔

قدیم مساجد کو آثار قدیمہ قرار دیکر اس میں نماز کی ادائیگی سے روکنا:

ہندوستان کی جن قدیم مساجد کو ان کی تاریخی اہمیت کی بنا پر حکومت نے محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی کر دیا ہے، اور ان میں بعض مساجد میں حکومت نے نماز کی ادائیگی سے لوگوں کو منع کر دیا ہے تو یہ سراسر ظلم ہے اور امر منکر ہے، جس کا ہرگز ہرگز حکومت کو حق حاصل نہیں ہے، اگر کوئی شخص قدرت رکھتا ہو کہ حکومت اور محکمہ آثار قدیمہ کے قبضہ تصرف سے مساجد مذکورہ کو نکال کر اس میں حسب سابق نماز جاری کرادے تو اس پر ایسا کرنا واجب ہے، اور اگر قدرت نہ ہو تو دل سے ناگواری اور عمل میں صبر کافی ہے (امداد الفتاوی ۲/ ۶۰۸-۶۰۹) اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں مسجد میں اللہ پاک کو یاد کرنے سے روکنے یا مسجد کی ویرانی کی سعی کرنے والے کو سب سے بڑا ظالم کہا ہے، چنانچہ باری تعالی کا ارشاد ہے:

''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه، وسعى فى خرابها أولئك ماكان لهم أن يدخلوها إلا خائفين، لهم فى الدنيا خزى ولهم فى الآخرة عذاب عظيم'' (سورہ بقرہ ۱۱۴)۔

(اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو، ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں، اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں، ان کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے، اور آخرت میں عذاب عظیم)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے مسجد کی ویرانی کے مفہوم میں مسجد کے انہدام اور اس کے تعطل دونوں کو شامل کیا ہے، چنانچہ جلالین میں ہے:

''وسعى فى خرابها بالهدم والتعطيل'' (جلالین ۱۷)۔

اور امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت کا نزول مشرکین کے متعلق ہوا ہے، جنہوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام میں ذکر خداوندی سے روکا اور مسجد کو ذکر وطاعت کے ذریعہ آباد کرنے سے روک کر اس کو ویران کرنے کی کوشش کی (احکام القرآن ۱/ ۷۰)۔

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ مسجد کی تعمیر کے مفہوم میں جس طرح مسجد کی عمارت بنانا اور اس میں عبادت کرنا دونوں داخل ہے، اسی طرح مسجد کو ویران کرنے میں اس کو ڈھانا اور اس میں عبادت کرنے سے روکنا دونوں شامل ہے، لہذا مسجد خواہ نئی ہو یا پرانی، کچی بنی ہو یا پختہ ہو، اسی طرح اس کی کوئی تاریخی حیثیت ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ مسجد ہے، اور اس کا مالک صرف اللہ ہے، اور اس کی حیثیت شعار اسلام کی ہے، اب اگر وہ مسجد نہ کسی کی زمین پر غصب کر کے بنائی گئی ہے، اور نہ وقتی وعارضی ضرورت کے تحت اس کی تعمیر ہوئی ہے، اور نہ کسی فتنہ وفساد کے پیش نظر اس کو بنایا گیا ہے، بلکہ اس کو اراضی موقوفہ پر تقوی اور خدا ترسی کے جذبہ سے خلوص نیت کے ساتھ بنایا گیا ہے، تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اور قیامت تک وہ کسی کی مملوک نہ ہوگی، چنانچہ ''اعلام الساجد'' میں ہے:

''إذا تعطل المسجد بتفرق الناس عن البلد أو خرابها أو بخراب المسجد فلا يعود مملوكا'' (اعلام الساجد باحکام المساجد ۳۴۵)۔

اور شامی میں ہے: ''ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف'' (رد المحتار ۳،۴۰۷)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسجد کو آثار قدیمہ قرار دیکر اس میں نماز پڑھنے سے روکنا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ہاں اگر کسی مسجد کے قریب مسلمانوں کی آبادی بالکل ختم ہو جائے اور وہاں کوئی نماز پڑھنے والا نہ پہنچے تو ایسی مسجد کو حفاظت کے پیش نظر مقفل کر دینا چاہئے، چنانچہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے ''کفایت المفتی'' میں لکھا ہے:

(الجواب ۲۶۲): مساجد اگر ایسی حالت میں ہو جائیں کہ ان میں پنجگانہ جماعت نہیں ہوتی، اور ان کی حاجت نہیں رہی تو ان کو محفوظ مقفل کر کے چھوڑ دیا جائے، اور یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کا سامان چرا کر لے جائیں گے، تو ایسی چیزوں کو جو چرائی جاسکتی ہوں، دوسری قریب ترین مسجد میں منتقل کر دیا جائے، اور جب تک کوئی مسجد رفاہ عام کے کاموں میں لائی جاسکے اس کو منہدم کرنا درست نہیں (کفایت المفتی ۷/ ۲۹۹)۔

قبرستان کے اطراف میں اس کی حد بندی کی غرض سے دوکان تعمیر کرا کر کرایہ پر دینا:

قبرستان کی حفاظت کے لئے جب کہ اس کی حد بندی واحاطہ (باؤنڈری) بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، اگر اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرادی جائے، جس کے لئے بطور کرایہ کے پیشگی رقم لے لی جائے، اور اس رقم سے یہ کام کرایا جائے تو شرعاً ایسا کرنا جائز ہے، اگر چہ ایسا کرنے سے قبرستان کا چند فٹ حصہ دوکانوں میں چلا جائے گا، اور اس قبرستان کے متولی کو چاہئے کہ بعد میں جو فاضل آمدنی ہو اسے مناسب مصارف خیر میں صرف کردے (بحث ونظر شمارہ ۲۱، ص ۱۰۵، جلد ۶)۔

''قال في الهندية: وإذا أراد القيم أن يبني فيها قرية ليكثر أهلها و حفاظها ويحرث فيها الغلة لحاجته إلى ذلك كان له أن يفعل ذلك، وهذا كان الخان الموقوف على الفقراء إذا احتيج فيه إلى خادم يكسح الخان ويفتح الباب ويسده فيسلم المتولى بيتا من بيوته إلى رجل بطريق الأجرة له ليقوم بذلك فهو جائز كذا في الظهيرية''
(فتاوی عالمگیری ۲، ۴۱۴)۔

قبرستان کی اراضی میں مسجد کی توسیع:

جب بڑے شہروں میں مسلمان اس صورت حال سے دوچار ہیں کہ وہاں کی وسیع قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جو ممکن ہے کہ کسی زمانے میں تدفین کی غرض سے آنے والوں کی رعایت سے بنائی گئی ہو کہ جب وہ قبرستان میں آئیں اور نماز کا وقت ہو جائے تو وہاں نماز ادا کرسکیں، اب اگر اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بڑھ گئی اور مسجد کی توسیع ضروری ہوگئی، تو ایسی صورت میں قبرستان کے حصہ میں مسجد کی توسیع کرنی شرعاً جائز ہے، باوجودیکہ اس قبرستان میں تدفین کا بھی سلسلہ جاری ہو، البتہ اس بات کا لحاظ کیا جائے کہ جہاں تک مسجد کی توسیع متوقع ہے اس کو چھوڑ کر تدفین کا عمل جاری رکھا جائے، لیکن یاد رہے کہ اس زیر استعمال قبرستان میں اگر مسجد کے قریب والی جگہ میں کوئی جدید قبر ہے تو فی الفورمیت کے احترام کوملحوظ رکھتے ہوئے مسجد کی توسیع نہ کی جائے، ہاں اگر قبر قدیم ہوگئی تو پھر فی الفور توسیع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح اگر ویران قبرستان ہے تو وہاں بھی شرعاً فی الفور مسجد کی تعمیر کی جاسکتی ہے، اسی طرح مسجد کی توسیع کرنی بھی جائز ہے، ''فتاوی رحیمیہ'' میں ہے:

الجواب: مسجد کی توسیع کے لئے پرانی قبریں اگر جماعت خانہ (مسجد شرعی) میں لینا ضروری ہو تو لے سکتے ہیں اس میں قبروں کی توہین نہ ہوگی، بلکہ صاحب قبر کی خوش نصیبی ہے اور سعادت مندی ہے، حرم شریف میں مطاف (طواف کی جگہ) میں بھی انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی قبریں ہیں، جماعت خانہ میں جو قبریں شامل کی جائیں ان پر نشان بنانے کی ضرورت نہیں، ہموار کردی جائیں (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۸۴)۔

قبروں کی جگہ کو مسجد میں شامل کرنے کے سلسلہ میں ایک دوسرے استفتاء (۱۶۷۳) کا جواب دیتے ہوئے حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب نے لکھا ہے کہ:

توسیع مسجد کے وقت ان پرانی قبروں کو زمین کے برابر کرکے شامل کر لینا بلا کراہت جائز ہے، اس سے قبروں کی بے حرمتی نہ ہوگی، بلکہ مردوں کی روحیں خوش ہوں گی کہ نماز پڑھی جاتی ہے، (اسی استفتاء کے آخر میں لکھا ہے) کہ قبروں کے نشانات باقی رکھنا جائز نہیں (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۹۳)۔

اور حضرت مفتی عزیز الرحمنؒ نے ''فتاوی دارالعلوم قدیم'' میں پرانی قبروں کو مسجد کے صحن کے فرش میں شامل کر لینے کو جائز قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

(الجواب): قبروں کو برابر کرکے فرش مسجد میں لیا جاوے اس میں کچھ حرج نہیں ہے، اور کچھ کراہت نماز میں نہ ہوگی (فتاوی دارالعلوم قدیم المعروف عزیز الفتاوی ۶/ ۸)۔

اسی طرح حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے غیر آباد قبرستان میں مسجد کی تعمیر کو جائز قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

(جواب ۱۳۷): اس صورت میں قبروں کو برابر کرکے اس کو مسجد میں شامل کر لینا مباح ہے، مگر قبروں کو کھودنا جائز نہیں، اور جو قبریں اتنی پرانی ہوں کہ ان اموات کی لاشیں مٹی ہوگئی ہوں، ان کو کھود کر برابر کر دینا جائز ہے، اور جو قبریں نئی ہوں، یعنی ابھی تک ان کی لاشوں کا مٹی ہو جانا متیقن نہ ہو ان کو کھودنا جائز نہیں، ویسے ہی مٹی ڈال کر برابر کردیں، اور اوپر مسجد بنالیں تو مباح ہے (کفایت المفتی ۷/ ۱۴۰)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے مندرجہ فتوی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نئی قبروں پر بھی مٹی ڈال کر مسجد بنانا شرعاً جائز ہے، لیکن حضرات فقہاء کی تصریحات میں غور کرنے اور حدیث نبوی ''انزل عن القبر لا تؤذ صاحب القبر فلا يؤذيك'' (ابن ماجہ حدیث ۱۵۶۵، شرح معانی

الآثار ۱،۲۲۸) کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں مسجد کی تعمیر کے جواز کے مسئلہ کو پرانی یا ویران قبرستان کے ساتھ مخصوص رکھنا چاہئے۔

''نظیرہ ماقال الزیلعی: ولو بلی المیت و صار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ و زرعہ والبناء علیہ'' (فقہ المشکلات ص۲۲۰، فتاوی عالمگیری ۱،۱۶۷، رد المحتار ۱،۶۵۹)۔

کیا کوئی غیر مسلم اوقاف کا متولی ہوسکتا ہے؟

ہندوستان کی جن بعض ریاستوں میں ہندوراجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد پر اراضی وقف کی ہیں اور غالباً واقف کے ہندو ہونے کے باعث اب تک مساجد کی یہ اراضی ہندو اوقاف کے تحت ہیں اور ہندو وقف بورڈ ہی مسجد سے متعلق نظم ونسق کو انجام دیتا ہے، لیکن چونکہ شرعاً مساجد ومقابر اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا درست نہیں ہے، اس لئے اگر حکمت عملی سے کوئی شخص اوقاف مذکور کو غیر مسلم ادارہ کی تولیت سے نکال کر مسلم اوقاف کے زیر نگرانی اس کے انتظام والنصرام کو کرسکتا ہو تو کردے لیکن اس کام کے کرنے کے لئے کوئی فتنہ برپا کرنے کی شرعاً گنجائش نہیں ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اس جگہ دو مسئلے الگ الگ ہیں، جن کا سمجھنا ضروری ہے ورنہ اشتباہ ہوسکتا ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم قربت و ثواب کی نیت سے کوئی زمین کسی مسجد ومقبرہ وغیرہ پر وقف کرے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز کوئی غیر مسلم کسی اوقاف کا واقف ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم کسی اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے

اوقاف کا متولی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو جہاں تک غیر مسلم کے واقف ہونے کا مسئلہ ہے تو یہ شرعاً جائز ہے، ''قال فی الھندیة فی کتاب الوقف: وأما الإسلام (للواقف) فلیس بشرط'' (فتاوی ھندیہ ۲،۳۵۲، در مختار مع رد المحتار ۳،۲۹۲ ومثلہ فی احسن الفتاوی ۶،۴۲۹) ''وفی شرح التنویر بدلیل صحتہ من الکافر''۔ البتہ غیر مسلم کا کسی بھی اسلامی وقف کا متولی ہونا جائز نہیں ہے، ''قال اللہ تعالی: وماکانوا أولیائہ إن أولیائہ إلا المتقون'' (سورۃ الانفال: ۳۴) ہاں اگر غیر مسلم نے وقف علی الاولاد وغیرہ کیا ہو تو اس صورت میں غیر مسلم متولی ہوسکتا ہے (فتاوی ہندیہ ۲،۴۰۸)۔

☆☆☆

دوسرے مصارف میں اوقاف کی آمدنیاں صرف کرنا

مولانا محمد ارشد فاروقی[1]

اوقاف کی ابتداء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی جو ایک ضابطہ اور ایک اصول بن گیا اور اسی ضابطے اور اصول کے مطابق دنیا میں آج تک وقف کا باقاعدہ نظام مساجد، قبرستان، مکاتب، مدارس، اور مسافر خانہ وغیرہ کی شکل میں چلا آرہا ہے، جس کا مقصد عام لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے (شامی ۳؍۳۵۷) لیکن کبھی کبھی اس کے ساتھ بڑی بڑی پیچیدگیاں بھی پیش آتی ہیں جن کو قرآن وحدیث اور اصول وقواعد کی روشنی میں حل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے متبادل وقف قائم کرنا:

کتب احناف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی علاقہ میں اوقاف ناقابل استعمال یا ویران ہوجائے جیسا کہ بعض جگہوں میں نقل آبادی کی وجہ سے ہوگیا ہے تو ایسے اوقاف کو حکومت یا کسی ادارہ یا کسی فرد کے حوالہ کر کے یا اس کو فروخت کر کے جہاں مسلمانوں کی آبادی موجود ہے وہاں متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی وقف شدہ زمین اس قابل ہوجائے کہ جس سے انتفاع ممکن نہ ہو تو اس کو کسی کے حوالہ کر کے اس کے عوض ان سے متبادل زمین حاصل کی جاسکتی ہے، نیز ذخیرہ اور منتقی کے حوالہ سے دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہشامؒ نے کہا کہ میں نے امام محمدؒ کو کہتے ہوئے سنا کہ اگر کوئی وقف کی زمین اس قابل ہوجائے کہ جس سے فائدہ نہ اٹھایا جاسکے تو قاضی کو چاہئے کہ اس ناقابل استعمال زمین کو فروخت کر کے اس کی جگہ کوئی متبادل وقف قائم کردے۔

’’ولو صارت الأرض بحال لا ينتفع بها جاز شرط الاستبدال به أرضا أخرى حينئذ‘‘ (درمختار ۴،۳۸۷)۔

فی الذخيرة وفی المنتقی قال هشام: سمعت محمدا يقول: إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضی أن يبيعه ويشتری بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضی ... كلام المشائخ أن محل الاستبدال عند التعذر‘‘ (شامی ۴،۳۸۴)۔

حنابلہ اور مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ اگر وقف شدہ چیز ناقابل استعمال ہوجائے جس کو اگر اہل وقف کی طرف واپس کرنا چاہیں تو نہ کرسکیں یا اس کے باقی نہ رکھنے ہی میں کوئی مصلحت ہو تو اس کو فروخت یا کسی کے حوالہ کر کے اس کی جگہ اس کا کوئی متبادل قائم کیا جاسکتا ہے۔

’’إذا خرب الوقف ولم يرد شيئا بيع واشترى بثمنه ما يرد على أهل الوقف وجعل وقفا كالأول ... إن الوقف إذا بيع فأی شئ اشتری بثمنه مما يرد على أهل الوقف جاز سواء من جنسه أو من غيرجنسه‘‘ (المغنی ۵،۳۶۹)۔

اگر وقف ویران ہوجائے اور اس سے آمدنی حاصل نہ ہو پائے تو اسے فروخت کردیا جائے اور اس کی قیمت سے کوئی ایسی چیز خریدی جائے جو اہل وقف پر لوٹادی جائے اور اس کو بھی پہلے وقف کی طرح وقف کردیا جائے، خواہ وہ وقف کی جنس سے ہو یا غیر جنس سے۔

’’رواية أبي الفرج عن مالك إن رأى الإمام بيع ذلك لمصلحة جاز ويجعل ثمنه فی مثله‘‘ (شرح الكبير ۴،۹۱)۔

ابوالفرج کی امام مالکؒ سے روایت ہے کہ اگر امام موقوفہ جائداد کو فروخت کرنے میں مصلحت سمجھے تو اس کا ایسا کرنا جائز ہے، لیکن اس کے ثمن کو اسی نوع کے اوقاف میں لگادے۔

مساجد اور دیگر اوقاف میں فرق:

---

[1] استاذ معہد انور، دیوبند۔

مساجد اور دیگر اوقاف میں فقہاء احناف نے مختلف انداز اور مختلف طرز سے فرق کو ظاہر کیا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جب کوئی چیز وقف کرتا ہے تو وہ اس کی ملکیت سے اس وقت تک نہیں نکلتی ہے جب تک حاکم اس کے نکلنے کا فیصلہ نہ کردے، لیکن مساجد چونکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا اور عبادت کے لئے وقف کی جاتی ہیں، اس لئے یہ وقف کرتے ہی واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہیں، حاکم کے فیصلے کی اس میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک مساجد کے سواء دیگر اوقاف کے درست ہونے کے لئے شرط ہے کہ اس کو وقف کرنے کے بعد متولی کے سپرد کردیا جائے، لیکن مساجد کا وقف بغیر متولی کے سپرد کئے درست ہوجائے گا۔

امام ابو یوسفؒ چونکہ اوقاف کے درست ہونے کے لئے متولی کو سپردگی شرط قرار نہیں دیتے، اس لئے وقف مشاع جو قابل قسمت ہو اس کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن مساجد اور مقابر میں وقف مشاع جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔

''اعلم أن المسجد يخالف سائر الأوقاف في عدم اشتراط التسليم إلى المتولي عند محمد وفي منع الشيوع عند أبي يوسف وفي خروجه عن ملك الواقف عند الإمام وإن لم يحكم به حاكم'' (شامی ۳،۳۶۹)۔

مسجد تمام اوقاف کے مخالف ہے متولی کی طرف سپردگی کی شرط نہ ہونے میں امام محمدؒ کے نزدیک، اور وقف مشاع مسجد میں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ممنوع ہے، امام صاحب کے نزدیک اوقاف واقف کی ملکیت سے نہیں نکلے گا جب تک حاکم نہ فیصلہ کردے، لیکن مسجد میں ایسا نہیں ہے۔

مسلک شافعی وحنبلی:

امام شافعی اور امام احمدؒ کے یہاں بھی مساجد اور دیگر اوقاف میں فرق کیا گیا ہے، چنانچہ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں کہ مساجد جب منہدم ہوجائیں اور نوبت یہ آجائے کہ ان کا اعادہ کبھی ممکن نہ ہوسکے تو اس کے باوجود اس کو فروخت کیا جاسکتا ہے نہ اس میں کسی طرح کا تصرف کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کو مالک کی ملکیت کی طرف لوٹایا جاسکتا ہے بخلاف دیگر اوقاف کے کہ جب وہ اس مرحلہ میں آجائے کہ اس سے انتفاع ناممکن ہوجائے تو اس کو فروخت کرکے اس کا متبادل قائم کیا جاسکتا ہے۔

ابن قدامہ نے بھی یہی بات تحریر کی ہے کہ مساجد جب اس مرحلہ میں آجائیں کہ ان میں نماز پڑھنا ناممکن ہوجائے تو اس کو فروخت نہیں کیا جائے گا، بخلاف دیگر اوقاف کے کہ جب وہ اس قابل ہوجائیں کہ ان سے انتفاع ممکن نہ ہو تو ان کو فروخت کیا جاسکتا ہے۔

''أما المسجد فإنه إذا انهدم وتعذرت إعادته، فإنه لا يباع بحال لإمكان الانتفاع به حالا بالصلوة في أرضه'' (شرح مهذب ۱۵،۳۶۱)۔

مسجد جب منہدم ہوجائے اور اس کا اعادہ متعذر ہوجائے تو اس کو کسی بھی حالت میں نہیں بیچا جائے گا، کیونکہ ممکن ہے اس زمین میں کبھی نہ کبھی نماز پڑھی جائے۔

''وإن وقف منجدا فخرب المكان وانقطعت الصلوة لم يعد إلى الملك ولم يجز التصرف فيه'' (شرح مهذب ۱۵،۳۶۰)۔

اگر کسی نے مسجد وقف کیا پس وہ جگہ ویران ہوگئی اور نماز پڑھنا اس جگہ میں بند ہوگیا تو وہ مالک کی ملکیت کی طرف نہیں لوٹے گی اور نہ اس میں تصرف جائز ہوگا۔

''قال أبو بكر: وقد روى على بن سعيد أن المساجد لا تباع وإنما تنقل آلاتها'' (المغنی ۵،۳۶۸)۔

ابوبکر نے کہا کہ علی بن سعید کی روایت ہے کہ مساجد فروخت نہیں کی جائے گی، البتہ اس کے اسباب منتقل کئے جائیں گے۔

منشاء واقف کی رعایت:

اگر کوئی یہ چاہے کہ اراضی اوقاف کو فروخت کر کے منشاء واقف کی رعایت کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کئے جائیں تو قائم نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ واقف جو بھی شرط لگا تا ہے وہ معتبر سمجھی جاتی ہے، لہذا اس کی رعایت کی جانی چاہئے، کیونکہ واقف جو شرط لگا تا ہے وہ وجوب عمل میں شارع کے نص کی طرح ہوتی ہے، لہذا اگر کوئی چیز واقف کی شرط کے مخالف ہو اس کو گویا شارع کے نص کے مخالف سمجھا جائے گا، اور اگر خدانخواستہ کوئی فیصلہ واقف کی شرط کے خلاف کر دیا جائے تو اس کو بلا دلیل سمجھا جائے گا، کیونکہ واقف کے جائز منشاء کی رعایت واجب ہے، چنانچہ ابن عابدین شامی رقم طراز ہیں:

''وقال: لأن شرط الواقف معتبر فيراعى'' (شامی ۴؍۳۸۴) ''قال الحنفية: شرط الواقف كنص الشارع أي في الفهم والدلالة ووجوب العمل به ... إن كل ما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص والحكم به بلا دليل سواء أكان كلام الواقف نصا ام ظاهرا؛ لأنه يجب اتباعه عملا بقول المشائخ شرط الواقف كنص الشارع'' (الفقه الاسلامی وادلته ۸؍۱۷۹)۔

مسلک مالکی:

محمد علیش نے شرح منح الجلیل میں لکھا ہے کہ اگر واقف کوئی شرط لگائے تو اس پر عمل کرنا واجب ہوگا بغیر کسی دشواری کے اس سے عدول کرنا جائز نہیں ہوگا، اس سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ واقف کے منشاء کی رعایت کی جائے گی:

''(شرطه) أي الواقف وجوبا (إن جاز) الشرط فيجب العمل به ولا يجوز العدول منه إلا أن يتعذر. فيصرف في مثله كما تقدم في القنطرة ونحوها'' (شرح منح الجلیل ۴؍۶۴)۔

واقف کا شرط لگانا وجوبا اگر شرط جائز ہو تو اس پر عمل کرنا واجب ہوگا اور اس سے عدول کرنا ناجائز ہوگا، مگر یہ کہ اس پر عمل کرنا متعذر ہو جائے تو اسی کے مثل کی طرف لوٹا دیا جائے گا، جیسا کہ پل وغیرہ کے مسائل میں گذرا۔

مسجد پر موقوفہ اراضی جس کی آمدنی مسجد کے موجودہ اخراجات سے زیادہ ہو:

الف، ب۔ اگر کسی مسجد پر موقوفہ اراضی کی آمدنی مسجد کے موجودہ اخراجات سے زیادہ ہو یا مسجد پر موقوفہ اراضی کے علاوہ کسی اور وقف کی آمدنی اس کی ضرورت سے زیادہ ہو اور بظاہر آئندہ اس موقوفہ کام کے لئے اس زائد آمدنی کے استعمال کی ضرورت پڑنے کا امکان نہ ہو تو اس کے ذریعہ اگر مسلمانوں کا دینی یا عصری تعلیمی ادارہ یا اسی نوع کی دوسری چیز قائم کرنا چاہیں تو قائم کیا جاسکتا ہے۔

دلیل: قاضی خاں نے لکھا ہے کہ اگر کسی مسجد کی آمدنی اتنی زیادہ ہو کہ مسجد کو فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے تو اس کو فقراء مسلمین کو دیدیا جائے گا اور ایسا کرنا جائز ہے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر اس زائد آمدنی سے دینی یا عصری تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہیں تو قائم کر سکتے ہیں۔

''إذا استغنى هذا المسجد يصرف إلى فقراء المسلمين فيجوز ذلك؛ لأن جنس هذه القربة مما لا ينقطع'' (خانيه على هنديه ۵؍۲۷۰)۔

جب مسجد کی آمدنی زیادہ ہوجائے تو اس کو فقراء مسلمین کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور ایسا کرنا جائز ہے، اس لئے کہ اس جنس کی قربت ان میں سے نہیں ہے جو منقطع ہوجائے۔

مسلک مالکی وحنبلی:

مسلک حنابلہ اور مالکیہ کی کتب سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے کہ اگر اس زائد آمدنی سے دینی یا عصری تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہیں تو قائم کر سکتے ہیں۔

ابن قدامہ رقمطراز ہیں: ''وما فضل من حصر المسجد وزيته ولم يحتج إليه جاز أن يجعل في مسجد آخر أو ليتصدق من ذلك على فقراء جيرانه وغيرهم'' (المغنی ۵،۳۷۰)۔

اگر مسجد کی چٹائی اور اس کے تیل میں سے کچھ بچ جائے اور مسجد کو اس کی ضرورت نہ ہو تو اس کو دوسری مسجد میں دے دینا جائز ہے یا اس کو مسجد کے قریب فقراء یا اس کے علاوہ فقراء کو دیدیا جائے۔

مسلک شافعی:

امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی وقف کی آمدنی اس کی ضرورت سے زیادہ ہو اور اس کو فقراء مسلمین کو دینا چاہیں یا اس سے دینی یا عصری تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہیں تو قائم نہیں کرسکتے جیسا کہ اس پر یہ عبارت دال ہے:

''أما غير المنهدم فما فضل من غلة الموقوف على مصالحه يشترى به عقار ويوقف عليه بخلاف الموقوف على عمارته يجب ادخاره لأجلها'' (شرح مہذب ۱۵،۳۶۱)۔

جو کچھ موقوفہ آمدنی سے بچ جائے جو اس کے مصالح پر موقوف ہو اس کے ذریعہ زمین خریدی جائے گی اور اس پر وقف کردی جائے گی، بخلاف اس وقف کی آمدنی کے جو موقوف ہو کسی وقف کی عمارت وتعمیر کے لئے، اس کا ذخیرہ کرنا اسی عمارت کے لئے واجب ہوگا۔

مسجد پر موقوفہ جائداد جس کی آمدنی کم ہے:

اگر مسجد کے ساتھ کوئی موقوفہ جائداد ہو، لیکن اس کی آمدنی کم ہو اور اگر اس اصل موقوفہ جائداد کو فروخت کرکے دوسری جگہ جائداد حاصل کی جائے تو آمدنی بڑھ جائے گی تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اس سلسلے میں علامہ شامی نے لکھا ہے کہ یہ صورت امام ابویوسفؒ کے نزدیک جائز ہے اور عمل بھی اسی پر ہے، آگے لکھتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ کا یہ قول صدر الشریعہ کے قول کے معارض ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہم اصل موقوفہ جائداد کے استبدال یا فروخت کرنے کا فتوی نہیں دیں گے، کیونکہ ہمارا بار بار کا مشاہدہ ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں موقوفہ جائداد برباد ہوجاتی ہے، اور گویا بعض قاضیوں نے اس کو اوقاف مسلمین کے باطل کرنے کا حیلہ بنالیا ہے، دوسری دلیل عدم جواز پر یہ دیتے ہیں کہ واجب اصل موقوفہ کو جوں کا توں باقی رکھنا ہے نہ کہ اس میں زیادتی کرنا مقصود ہے، علامہ شامی کا رجحان بھی مذکورہ صورت کے عدم جواز کی طرف ہے۔

''قال قارى الهداية: وإن كان للوقف ريع ولكن يرغب شخص في استبداله أن أعطى مكانه بدلا أكثر ريعا منه في صقع أحسن من صقع الوقف جاز عند أبي يوسف والعمل عليه ...والعمل على قول أبي يوسف معارض بما قاله صدر الشريعة. نحن لانفتي به وقد شاهدنا في الاستبدال ما لا يعد و يحصى فإن ظلمة القضاة جعلوه حيلة لإبطال أوقاف المسلمين ...أمكن أن يؤخذ بثمنه ما هو خير منه مع كونه منتفعا به فينبغي أن لا يجوز لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة ...أقول ما قاله هذا المحقق الصواب'' (شامی ۳،۳۸۹)۔

مسلک حنبلی:

امام احمدؒ کے یہاں اصل موقوفہ چیزوں کو بلاضرورت فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ موقوفہ جائداد کو آمدنی کی خاطر فروخت کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ آمدنی کی زیادتی کوئی ضرورت نہیں ہے، ابن قدامہ رقمطراز ہیں:

''إن لم تتعطل مصلحة الوقف بالكلية لكن قلت وكان غير أنفع منه وأكثر رد اعلى أهل الوقف لم يجز بيعه؛ لأن الاصل تحريم البيع وانما أبيح للضرورة صيانة لمقصود الوقف عن الضياع مع إمكان تحصيله ومع الانتفاع وإن قل ما يضيع المقصود'' (المغنی ۵،۳۶۹)۔

اگر وقف کی مصلحت مکمل ختم نہ ہوئی ہو تو اس کی بیع جائز نہیں (میں کہوں گا کہ) البتہ اگر اس کے علاوہ اس سے زیادہ فائدہ منداور زیادہ آمدنی والا ہو تو بھی اس کی بیع درست نہیں، اور اس لئے کہ وقف میں اصل بیع کی تحریم ہے، اور بیع کو مباح ضرورت کی وجہ سے کیا گیا ہے، وقف کے مقصود کو

ضیاع سے بچانے کی خاطر، اور جب اس سے انتفاع ممکن ہو اگرچہ کم ہو تو مقصود ضائع نہیں ہوگا۔

مسلک مالکی:

مالکیہ کے یہاں بھی مسجد پر موقوفہ جائداد جس کی آمدنی کم ہے، اس کی فروختگی درست نہیں ہے، چنانچہ "حاشیہ الدسوقی" میں ہے:

"(لاعقار) حبس من دور وحوانیت وحوائط وربع فلایباع لیستبدل به غیره وإن خرب" (حاشیه الدسوقی ۴،۹۱)۔

موقوفہ گھر، دکانیں، دیواریں اور کھیت، گو خراب ہو اس کو فروخت کر کے اس سے استبدال جائز نہیں ہوگا۔

جس وقف کا مصرف ختم ہو جائے:

اگر کسی وقف کا مصرف ختم ہو جائے مثلاً کوئی جائداد کسی مدرسہ پر وقف ہو اور اب وہ مدرسہ باقی نہیں رہا تو ایسے وقف کی آمدنی اسی نوع کے اوقاف جو دوسری جگہ واقع ہیں پھیر دیا جائے گا، اس پر علامہ شامی کی یہ عبارت دال ہے:

"فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلی أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إلیه وفی الرد لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا یجوز صرف وقف مسجد خرب إلی حوض وعکسه وفی شرح الملتقی یصرف وقفها لأقرب مجانس لها" (شامی ۶،۵۴۹)۔

مسجد، خانقاہ، کنواں اور حوض کے وقف کو قریبی مسجد، خانقاہ، یا کنواں، یا حوض کی طرف پھیرنا جائز ہے، شامی میں ہے کہ یہ لف ونشر مرتب ہے اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ منہدم مسجد کو حوض یا حوض کو مسجد کی طرف لوٹانا جائز نہیں ہوگا۔

مسلک مالکی:

امام مالکؒ کا بھی مذہب یہی ہے کہ اگر کسی وقف کا مصرف ختم ہو جائے تو اس کی آمدنی کو اسی نوع کے اوقاف میں استعمال کیا جائے گا، چنانچہ ابو البرکات "الدردیر" میں لکھتے ہیں کہ اگر کسی نے کچھ کتابیں کسی متعین مدرسہ پر وقف کیں اور اب وہ مدرسہ باقی نہیں رہا کہ وہاں کے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں تو اسے دوسرے مدرسہ کو دیدیا جائے گا۔

"أما کتب العلم إذا وقفت علی من لا ینتفع بها کأمی أو امرأة، فإنما لا تباع وإنما تنقل لمحل ینتفع بها فیه کالکتب الموقوفة بمدرسة معینة فتخرب تلك المدرسة و تصیر الکتب لا ینتفع بها، فإنما تنقل لمدرسة أخری ولا تباع" (الشرح الکبیر ۴،۹۱)۔

بہر حال علم کی کتابیں جب وقف کی جائیں اس شخص پر جو اس سے فائدہ نہ اٹھائے جیسے ان پڑھ یا کسی عورت پر تو اس کو فروخت نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو ایسی جگہ منتقل کیا جائے گا جو اس سے فائدہ اٹھا سکے، چنانچہ اگر کتابیں کسی متعین مدرسہ پر وقف کی جائیں اور وہ مدرسہ ویران ہو جائے اور ان کتابوں سے فائدہ اٹھانے والا نہ ہو تو اس کو دوسرے مدرسہ کی طرف منتقل کر دیا جائے گا لیکن فروخت نہیں کیا جائے گا۔

مسلک حنبلی:

امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی وقف کا مصرف ختم ہو جائے تو اس کو فقراء ومساکین کی طرف منتقل کر دیا جائے گا، چنانچہ ابن قدامہ رقم طراز ہیں:

"ولأنه مال الله تعالی لم یبق له مصرف فصرف إلی المساکین کالوقف المنقطع" (المغنی ۵،۳۷۱)۔

وقف کی مخدوش عمارت تعمیر کرنے والے کو اس کے عوض وقف کا کچھ حصہ بطور اجرت دینا:

الف، ب- صاحب بزازیہ نے لکھا ہے کہ اگر وقف منہدم ہو جائے اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ موجود نہیں ہے کہ جس سے اس کی تعمیر کرائی

جائے تو اس کو ایسی ہی حالت میں واقف یا اس کے ورثاء کو واپس کردیا جائے گا، نیز یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی نے دکان یا بازار وقف کیا اور وہ جل گیا اور اس کی حالت ایسی ہوگئی کہ اس سے انتفاع ناممکن ہوگیا تو ایسی صورت میں اس کو واقف یا اس کے ورثہ کو لوٹا دیا جائے گا، اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اگر کوئی وقف کی عمارت مخدوش حالت میں ہو اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ موجود نہیں، کوئی شخص اس بات کے لئے تیار ہے کہ اس مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے چند منزلہ عمارت کی صورت میں تعمیر کردے گا اور اس کے عوض ایک دو منزل اس کی ملکیت ہوگی تو ایسا کرنا درست نہیں ہوگا، بلکہ مخدوش عمارت واقف کو واپس کردی جائے گی۔

''انهدم الوقف وليس له من الغلة ما يعاد به بنائه دفع النقض إلى الواقف أو وارثه احترق حانوت الوقف والسوق فصار بحال لا ينتفع بطل كونه وقفا وعاد إلى الواقف أو وارثه'' (بزازیہ علی ہندیہ ۶،۲۷۲)۔

اگر وقف منہدم ہوجائے اور وقف کے پاس آمدنی نہ ہو جس سے اس کی دوبارہ تعمیر کی جائے تو ناظر ملبہ کو واقف یا اس کے وارث کو دیدے گا، وقف کی دکان اور بازار جل جائے اور اس کی حالت ایسی ہوجائے کہ اس سے انتفاع نہ ہوسکے تو اس کا وقف ہونا باطل ہوجائے گا اور وہ واقف یا وارث کی طرف لوٹ جائے گا۔

مسجد یا قبرستان کی زائد موقوفہ اراضی پر مدرسہ کی تعمیر:

اگر کسی نے کسی خاص عمارت مثلاً مسافر خانہ یا خانقاہ وغیرہ کی تعمیر کے لئے کچھ سرمایہ وقف کیا اور تعمیر مکمل ہونے کے بعد کچھ سرمایہ بچ گیا تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟ اس سلسلہ میں علامہ شامی لکھتے ہیں کہ اسی نوع کے قریبی اوقاف مثلاً مسجد کے امام یا مدرسہ کے مدرس کو دیدیا جائے گا، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسجد یا قبرستان کی موقوفہ اراضی پر جو اس کی ضرورت سے زیادہ ہے مدرسہ کی تعمیر درست ہونی چاہئے، کیونکہ مدرسہ بھی مسجد اور قبرستان کی طرح رفاہ عام ہی کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔

''في الدر ويبدأ من غلته بعمارته ثم ماهو أقرب لعمارته كإمام مسجد و مدرس مدرسة (وفي الرد). فإن انتهت عمارته وفضل من الغلة شئ يبدأ بماهو أقرب للعمارة وهو عمارته ... ثم ما هو أقرب إلى العمارة وأعم للمصلحة كالإمام للمسجد والمدرس للمدرسة'' (شامی ۳،۳۷۶)۔

وقف کی آمدنی کو سب سے پہلے وقف کی تعمیر و مرمت پر خرچ کیا جائے گا پھر ان اشیاء پر جو اس کی آبادی سے تعلق رکھتی ہوں مثلاً مسجد کے امام اور مدرسہ کے مدرس پر۔ (شامی میں ہے) کہ اگر مقصد وقف کا کام ختم ہوجانے کے بعد کچھ رقم بچ جائے تو پھر اس پر خرچ کیا جائے گا جو اس مقصد کے زیادہ قریب ہو (اگر پھر بھی کچھ بچ جائے) تو اس پر خرچ کیا جائے جو اس مقصد کے زیادہ قریب اور زیادہ مصلحت والا ہو مثلاً مسجد کا امام اور مدرسہ کا مدرس۔

مسلک مالکی: امام مالکؒ کے یہاں بھی مسجد یا قبرستان کی موقوفہ اراضی پر جو اس کی ضرورت سے زیادہ ہے، مدرسہ کی تعمیر درست ہوگی، کیونکہ شیخ محمد علیش نے اپنی کتاب میں سحنون، دحون، ابن رشد، اور ابن عرفہ کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ اگر کسی نے کسی خاص مسجد وغیرہ کے لئے کوئی چیز وقف کیا اور وہ اس کی ضرورت سے فاضل ہوجائے تو اس کو دوسری مسجد کو دیا جاسکتا ہے، یہ صورت مسئولہ کے جائز ہونے پر دال ہے۔

''فتيا سحنون في فضل زيت المسجد انه يوقد منه في مسجد آخر وفتيا دحون في حبس حصن يغلب العدو عليه يدفع في حصن آخر قال: و ما كان لله تعالى واستغنى عنه يجوز جعله في غير ذلك الوجه مما هو لله تعالى وفتوى ابن رشد في فضل غلات مسجد زائدة على حاجته أن يبنى منها مسجد تهدم، وقال ابن عرفة: شبيه المصرف مثله إن تعطل (شرح منح الجليل ۶۱،۶۲، ۴)۔

مسجد کے بچے ہوئے تیل کے بارے میں سحنون کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کو دوسری مسجد میں جلایا جائے، وہ قلعہ جس پر دشمن کا غلبہ ہو اس کے وقف کے سلسلہ میں ابن دحون کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کو دوسرے قلعہ میں دیدیا جائے، اور جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے وقف ہو اور لوگ اس سے بے نیاز ہوں تو اس کو اسی نوع کے اوقاف میں استعمال کرنا جائز ہے، اور مسجد کی زائد آمدنی کے سلسلہ میں ابن رشد کا فتویٰ ہے کہ اس سے دوسری منہدم مسجد تعمیر کی

جائے، اور ابن عرفہ کا کہنا ہے کہ موقوفہ چیز کے مصرف کا مماثل اسی کے حکم میں ہے اگر وہ بیکار ہو جائے۔

مسلک شافعی: امام شافعیؒ کے یہاں اگر کسی نے کسی خاص عمارت کی تعمیر کے لئے کچھ سرمایہ وقف کیا اور تعمیر کے بعد کچھ سرمایہ بچ جائے تو اس کو آئندہ کے لئے ذخیرہ بنا کر رکھنا واجب ہے، یہ اس بات پر دال ہے کہ مسجد یا قبرستان کی موقوفہ اراضی پر جو اس کی ضرورت سے زیادہ ہے مدرسہ کی تعمیر درست نہیں ہے، چنانچہ امام نووی رقم طراز ہیں:

''أما غير المنهدم فما فضل من غلة الموقوف على مصالحه يشترى به عقار و يوقف عليه بخلاف الموقوف على عمارته يجب إدخار لأجلها'' (شرح مهذب ۱۵،۳۶۱)۔

جو کچھ موقوف آمدنی سے بچ جائے جو اس کے مصالح پر موقوف ہو تو اس کے ذریعہ زمین خریدی جائے گی اور اس پر وقف کردی جائے گی بخلاف اس موقوفہ عمارت کی آمدنی کے جو اس کی عمارت پر موقوف ہو اس کا ذخیرہ کرنا اسی عمارت کے لئے واجب ہے، فی زمانہ فتویٰ مسلک احناف و مالکیہ پر ہونا چاہئے، کیونکہ جس طرح مسجد اور قبرستان کا وقف رفاہ عام کے لئے ہوتا ہے اسی طرح مدرسہ بھی رفاہ عام ہی کے لئے قائم کیا جاتا ہے، لہذا اس کی تعمیر مسجد یا قبرستان کی زائد موقوفہ اراضی پر درست ہونی چاہئے۔

جس قبرستان کے اطراف مسلمانوں کی آبادی ختم ہو چکی ہو:

اگر کسی وقف کی جائداد پر ناجائز قبضہ کا خوف ہو تو متولی کو چاہئے کہ اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت کو صدقہ کردے، نیز ابن عابدین شامی نے لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ سے لوگ چلے گئے ہیں اور وہاں مسجد اور حوض ہے جس کی اب ضرورت باقی نہیں رہی تو قاضی کو چاہئے کہ اس کے اوقاف کو دوسری مسجد یا دوسرے حوض کی طرف منتقل کردے، گویا مذکورہ دونوں باتوں سے من جملہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی وقف کے لوگوں کو ضرورت باقی نہیں رہی یا اس پر ناجائز قبضہ کا خطرہ ہو تو اس کو فروخت کر کے اسی نوع کے اوقاف میں اس کی قیمت کو خرچ کیا جاسکتا ہے یا پھر فقراء ومساکین کو دیدیا جائے۔ اس تفصیل سے مسئولہ صورت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کو فروخت کر کے اسی نوع کے اوقاف کی طرف لوٹا دیا جائے یا اگر چاہے تو فقراء و مساکین کو دیدیا جائے۔

''نقل في الذخيرة عن شمس الائمة الحلواني انه سئل عن مسجد أو حوض خرب ولا يحتاج إليه لتفرق الناس عنه هل للقاضي أن يصرف أوقافه إلى مسجد آخر أو حوض آخر فقال: نعم ومثله في البحر''۔

ذخیرہ میں شمس الائمہ حلوانی سے نقل کیا گیا ہے کہ ان سے ایسی ویران مسجد یا حوض کے بارے میں سوال کیا گیا جس کی لوگوں کو ضرورت باقی نہیں رہی کہ کیا قاضی ان اوقاف کو دوسری مسجد یا دوسرے حوض کی طرف لوٹا سکتا ہے تو جواب دیا ہاں لوٹا سکتا ہے، اسی کے مثل بحر میں ہے۔

''قيم خاف من السلطان أو من وارث يغلب على أرض وقف يبيعها ويتصدق بثمنها وكذا كل قيم إذا خاف شيئا من ذلك له أن يبيع ويتصدق بثمنها'' (البحر الرائق ۵،۲۰۷)۔

اگر ناظر سلطان یا وارث سے خطرہ محسوس کر رہا ہو کہ وقف کی زمین پر غلبہ پالے گا تو اسے بیچ کر حاصل شدہ رقم کو صدقہ کردے، ایسے ہی ہر وہ نگراں جو ایسی باتوں کا خوف کرے تو وہ اسے بیچ کر حاصل شدہ رقم صدقہ کرسکتا ہے۔

مسلک حنبلی: حنابلہ کی کتابوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں انتفاع کی صورت یہ ہوگی کہ اس کو فروخت کر کے دوسری جگہ قبرستان خرید لیا جائے، یا دوسری جگہ واقع قبرستان میں لگا دیا جائے، چنانچہ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ اگر موقوفہ جائداد سے انتفاع ممکن نہ ہو تو اس کو فروخت کردیا جائے۔

''الوقف إن لم يمكن الانتفاع بشئ منه بيع جميعه'' (المغني ۵،۳۶۸)۔

اگر وقف سے انتفاع ممکن نہ ہو تو ان تمام کو فروخت کردیا جائے گا۔

وہ مساجد جو محکمہ آثار قدیمہ کے تحت ہیں:

اللہ تبارک وتعالی کی عبادت کے لئے جو بھی عبادت گاہیں قائم ہیں، خواہ وہ مساجد کی شکل میں ہوں یا خانہ کعبہ کی شکل میں، اس میں حکم ہمیشہ ہمیش عبادت گاہ ہی کا رہے گا، ایسا نہیں ہے کہ اگر وہ منہدم ہوجائے اور اس قابل ہوجائے کہ اس میں عبادتیں نہ کی جاسکیں یا وہ غیر مسلم یا حکومت کی نذر ہوجائے تو اس کا مسجد یا کعبہ ہونے کا حکم ختم ہوجائے گا، بلکہ روز قیامت تک اس کا حکم جوں کا توں برقرار رہے گا، بنابریں جو بھی مساجد محکمہ آثار قدیمہ کے تحت ہیں اور حکومت نے ان میں نماز ادا کرنے پر پابندی لگادی ہے ان کا حکم قیامت تک مسجد ہی کا رہے گا، چنانچہ علاء الدین حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الإمام والثانی أبدا إلى يوم الساعة'' (در علی الرد ۳،۳۷۱)۔

اگر مسجد یا مسجد کے اردگرد کی چیز ویران ہوجائے تو بھی اس کا حکم روز قیامت تک مسجد ہی کا رہے گا، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک ''لأن المسجد لا يخرج عن المسجدية أبدا'' (شامی ۶،۵۷۶) مسجد ہمیشہ مسجد ہی کہلائے گی۔

''إذا خرب المسجد واستغنى أهله وصار بحيث لا يصلى فيه عاد ملكا لواقفه أو لورثته حتى جاز لهم أن يبيعوه... وقيل: هو مسجد أبدا، وهو الأصح، كذا فی خزانة المفتيين'' (هنديه ۲،۴۵۸)۔

جب مسجد ویران ہوجائے اور لوگ اس سے بے نیاز ہوجائیں اور مسجد اس قابل ہوجائے کہ اس میں نماز ادا نہ کی جائے تو وہ واقف یا اس کے وارث کی طرف لوٹ جائے گی یہاں تک کہ ان کے لئے جائز ہے کہ اس کو فروخت کردیں اور کہا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیش مسجد ہی رہے گی اور قول اصح یہی ہے۔

مسلک شافعی: ''أما المسجد فإنه إذا انهدم وتعذرت إعادته، فإنه لا يباع بحال لإمكان الانتفاع به حالا بالصلوة فی أرضه'' (شرح مهذب ۱۵،۳۶۰)۔

مسجد جب اس طرح منہدم ہوجائے کہ اس کی دوبارہ تعمیر مشکل ہو تو اس کو کسی بھی حالت میں فروخت نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ اس سے انتفاع فی الحال بھی یوں ممکن ہے کہ اس کی زمین میں نماز ادا کی جائے۔

جس قبرستان کی حفاظت کے لئے وسائل نہ ہوں:

اگر قبرستان کی حفاظت کے لئے وسائل نہ ہوں تو تاجروں سے پیشگی رقم لے کر چاروں طرف دکانیں بنادینا جائز ہوگا، کیونکہ اس صورت میں قبرستان کا اگرچہ تھوڑا سا نقصان ہے کہ چند گز اراضی دکانوں میں چلی جائے گی، لیکن فوائد زیادہ ہیں، اولاً یہ کہ وہ دکانیں قبرستان کی حصار بندی اور باؤنڈری کا کام دیں گی، ثانیاً یہ کہ ان دکانوں کی وجہ سے قبرستان کو ہمیشہ کرایہ ملتا رہے گا، اور کسی موقوفہ اراضی سے نفع حاصل کرنے کے لئے اس میں دکانیں تعمیر کرانا یا اس میں زراعت کرنا جائز ہے، چنانچہ صاحب بزازیہ رقم طراز ہیں:

''أراد القيم أن يبنى فی الأرض الموقوفة حوانيت ليستغلها بالإجارة ليس له ذلك؛ لأن استغلال الأرض بالزرع إليهم إلا إذا كانت الأرض متصلة بالمصر'' (بزازيه على هنديه ۶،۲۵۴)۔

(اگر ناظر یہ چاہے کہ موقوفہ زمین میں دکان بنائے تاکہ اس کو اجارہ پر دے کر نفع حاصل کرے تو یہ اس کے لئے درست نہیں ہوگا اس لئے کہ ان کو زمین میں کھیتی کرکے نفع حاصل کرنا ہے، ہاں اگر زمین شہر سے متصل ہو تو پھر دکان بنا کر نفع حاصل کرسکتے ہیں)۔

قبرستان میں مسجد کی توسیع:

اگر وسیع قبرستان میں چھوٹی سی مسجد ہے اور آبادی کے قریب ہونے، نیز قریب میں دوسری مسجد نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کی توسیع کی ضرورت ہے تو توسیع کی جائے گی، کیونکہ جس طرح قبرستان اوقاف مسلمین میں سے ہے اسی طرح مسجد بھی اوقاف مسلمین میں سے ہے، اور جس طرح

قبرستان کی تملیک جائز نہیں اسی طرح مسجد کی بھی تملیک جائز نہیں ہے، لہذا مسجد کی توسیع قبرستان میں جائز ہوگی، لیکن شرط یہ ہے کہ جہاں مسجد کی توسیع کی جائے وہاں کوئی نئی قبر نہ ہو اور اگر پرانی قبر ہو تو توسیع کے وقت اس کو مٹا دیا جائے، چنانچہ صاحب عینی رقم طراز ہیں:

''لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد'' (عینی ۱۰،۱۵۲)۔

اگر مسلمانوں کا کوئی قبرستان پرانا ہو جائے اور اس پر مسجد بنا دی گئی تو میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ قبرستان میت کو دفن کرنے کے لئے مسلمانوں کے وقف میں سے ایک وقف ہے، اس کا کوئی مالک نہیں ہوسکتا، اس لئے اگر وہ پرانا ہو جائے اور اس میں دفنانے کی ضرورت نہ ہو تو اس کا استعمال مسجد کے لئے درست ہے اس لئے کہ مسجد بھی مسلمانوں کے اوقاف میں سے ایک وقف ہے، اس پر کسی کی ملکیت جائز نہیں۔

''لو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه'' (زیلعی ۱،۲۴۶)۔

(اگر میت پرانی ہو کر مٹی ہو جائے تو اس قبر میں دوسری میت دفن کرنا اور اس کے اوپر کھیتی کرنا اور عمارت بنانا جائز ہے)۔

غیر مسلم کا مسلم اوقاف کا متولی ہونا:

اگر کوئی واقف کسی غیر مسلم کو مسلم اوقاف کا متولی بنا دے یا اپنے وقف میں اس کی شرط لگا دے تو اس کا غیر مسلم کو متولی بنانا درست نہیں ہوگا اور نہ اس کی شرط کی اتباع کی جائے گی، کیونکہ صاحب تقریر رافعیؒ نے لکھا ہے کہ ذمی اوقاف کا ذمی تو متولی ہوسکتا ہے، لیکن مسلم اوقاف کا متولی نہیں ہوسکتا ہے، اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے، جب ذمی مسلم اوقاف کا متولی نہیں ہوسکتا ہے تو وہ غیر مسلم جو ذمی نہیں مسلم اوقاف کا متولی کیسے ہوسکتا ہے۔

''إن تولية الذمي صحيحة ينبغي أن يخص بوقف الذمي، فإن تولية الذمي على المسلمين حرام لا ينبغي اتباع شرط الواقف فيها من خط ابن نجيم'' (تقریر الرافعی مع الشامی ۶،۸۴)۔

ذمی کا متولی بنا جائز ہے، مناسب ہے کہ اسے ذمی کے وقف کے ساتھ خاص کیا جائے، کیونکہ ذمی کا مسلمان پر متولی بنا حرام ہے، مناسب ہے کہ اس میں واقف کے شرط کی اتباع نہ کی جائے۔

☆☆☆

ختم شدہ مصارف اوقاف کے احکام

مولانا نذر توحید مظاہری[1]

وقف کی حقیقت عرفیہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین وجائداد وغیرہ کو اپنی ملکیت سے نکال کر اللہ تبارک وتعالی کے ملک میں ودیعت کردے تاکہ وہ شئ موقوف باقی رہے اور اسکے منافع کو حسب تصریح واقف مصارف خیر میں صرف کیا جاتا رہے۔ قرون اولیٰ سے وقف کرنے کا دستور چلا آرہا ہے، اسلاف کے بہت سارے اوقاف آج بھی مساجد، مدارس، خانقاہوں ومسافر خانوں وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔

اوقاف کے منافع سے استفادہ حسب تصریح واقف لازم وضروری ہے جیسا کہ فقہاء کی صراحت ہے کہ "شرط الواقف كنص الشارع" (رد المحتار ۳؍۴۵۶) واقف کی صراحت کے خلاف کسی وقف کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

فی زماننا بہت سارے اوقاف سے استفادہ ناممکن ہوگیا ہے، کیونکہ ان اوقاف کے دور دور تک مسلم آبادی نہیں ہے جو ان سے استفادہ کرے یا مسلم آبادی تو ہے، مگر ان اوقاف پر کسی کا غاصبانہ قبضہ ہے، تو ان حالات میں ان اوقاف کی جگہ دوسرے اوقاف قائم کرنا جائز ہوگا یا نہیں اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی آراء حسب ذیل ہیں:

استبدال وقف کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ واقف وقف کرنے کے وقت استبدال کی شرط اپنے لئے یا دوسرے کے لئے یا اپنے اور دوسرے کے لئے لگائی ہو تو بالاتفاق وقف کا استبدال جائز ہے۔

۲۔ واقف نے وقف کرتے ہوئے استبدال کی نفی کردی ہو یا استبدال کے متعلق خاموش ہو (نہ اثبات کیا ہو اور نہ نفی) اور وقف اس حالت میں ہو کہ اس سے بالکلیہ نفع حاصل نہیں کیا جاسکتا ہو، تو باجازت قاضی استبدال جائز ہوگا۔ یا کوئی شخص وقف پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہو یا کوئی ایسا کام کیا ہو، مثلاً باندھ باندھا ہو یا تالاب کی کھدائی کردیا ہو جس سے موقوفہ زمین سیلابی ہوگئی ہو اور قابل زراعت نہیں رہی، اس وقت غاصب زمین کا ضمان قیمتاً دے۔ یا غاصب نے تو غصب کرلیا، مگر اس کا اعتراف نہیں کرتا اور نہ ہی متولی وقیم کے پاس بینہ ہو تو اس وقت غاصب کچھ دے رہا ہو تو ان صورتوں میں استبدال جائز ہوگا۔

۳۔ واقف نے وقف کرتے وقت استبدال کی شرط نہیں لگائی ہے اور وقف سے فی الجملہ نفع حاصل ہو رہا ہو، مگر اس حال میں ہو کہ اس کو فروخت کرکے دوسری جگہ وقف قائم کردیا جائے تو وقف کی آمدنی بڑھ جائے گی تو اس مقصد کے لئے استبدال اصح قول کے مطابق جائز نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ استبدال دو صورتوں میں جائز ہے: (۱) شرط (۲) ضرورت۔

ضرورت کی وجہ سے جائز ہے مگر وہ چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے:

۱۔ وہ وقف بالکلیہ قابل انتفاع نہ ہو ۲۔ مستبدل متولی یا قیم ہو۔ ۳۔ استبدال باجازت قاضی ہو۔ ایسے قاضی کی اجازت جس کی دیانت وامانت مسلّم ہو اور علم وعمل میں فائق ہو۔

۴۔ فقدان قاضی کی صورت میں جماعت مسلمین کی اجازت سے ہو۔ جماعت مسلمین سے مراد ایسے افراد کی جماعت ہے جو دیانت وامانت وغیرہ کے اعتبار سے معتمد ہوں۔

"اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه: الأول أن يشترطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح، وقيل: اتفاقاً والثاني أن لا يشترطه سواء شرط عدمه أوسكت لكن صار بحيث لا ينتفع به

---

[1] جامعہ رشید العلوم چترا، جھارکھنڈ۔

بالکلیة بأن لایحصل منه شئ أصلا ولا یفی بمؤنته فهو أیضا جائز علی الأصح إذا کان بإذن القاضی ورأیه المصلحة فیه، والثالث أن لا یشرطه أیضا ولکن فیه نفع فی الجملة وبدله خیر منه ریعاً ونفعاً، وهذا لا یجوز استبداله علی الأصح المختار کذا حرزه العلامة قنالی زادة فی رسالته الموضوعة فی الاستبدال وأطنب فیها علیه الاستبدال وهو ماخوذ من الفتح'' (رد المحتار ۳،۴۲۴)۔

''وقد اخلف کلام قاضیخان فی موضع جوزه القاضی بلا شرط الواقف حیث رأی المصلحة فیه فی موضع منع منه ولو صارت الأرض بحال لاینتفع بها والمعتمد أنه بلا شرط یجوز للقاضی بشرط أن یخرج عن الانتفاع بالکلیة وأن لایکون هناك ریع للوقف یعمر به وأن لایکون البیع بغبن فاحش وشرط فی الإسعاف أن یکون المستبدل قاضی الجنة المفسر بذی العلم والعمل لئلا یحصل التطرق إلی إبطال أوقاف المسلمین کما هو الغالب فی زماننا'' (رد المحتار ۳،۴۲۵)۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی دامت برکاتہم ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

سوال: نئی عیدگاہ بننے کے بعد پرانی عیدگاہ بالکل ویران ہے آیا اسے مفت یا قیمتاً خرید کر مدرسہ میں داخل کرنا جائز ہے؟

جواب: اس میں اختلاف ہے کہ عیدگاہ بحکم مسجد ہے یا نہیں، ایسی ضرورت کے موقع پر قول ثانی انسب ہے اور وقف غیر مسجد کا بصورت تعطل استبدال باذن القاضی جائز ہے (شامی ۳؍۳۹۹)، تحقیق مذکور کے مطابق معطل عیدگاہ کی جگہ مدرسہ بنوانے کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اس عیدگاہ کے عوض اس کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ قیمتی زمین کسی قریب تر شہری عیدگاہ کے لئے وقف کی جائے، یہ استبدال باذن قاضی ہو، اور فقدان قاضی کی صورت میں باتفاق جماعت مسلمین، واللہ اعلم بالصواب (احسن الفتاوی ۶؍۴۶۱)۔

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: واقف نے وقف نامہ میں فروخت کرنے کی اجازت دی ہو یا وقف اس حالت میں ہو کہ اس سے کوئی نفع حاصل نہ ہوسکے تو فروخت کرنے کی اجازت ہے، اگر کچھ بھی نفع حاصل ہو تو اسے فروخت کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ شامی میں ہے:

''(قوله وجاز شرط للاستبدال به) اعلم أن الاستبدال علی ثلاثة وجوه الخ'' (بحوالہ شامی ۳،۵۳۵، فتاوی رحیمیہ ۶،۷۳)

استاذی حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: حامداً ومصلیاً! جو زمین مسجد کے مصارف کے لئے وقف ہو چکی ہے اس کی بیع ناجائز ہے، اس کی اجازت نہیں کہ اس کو فروخت کرکے اس سے زیادہ آمدنی کی زمین خریدی جائے۔

''فإذا تم ولزم لا یملك ولا یملّك أی لا یقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیك الخارج عن ملکه'' (شامی ۳،۵۰۷)۔

البتہ مسجد کی زمین پر کسی کا غاصبانہ قبضہ ہوجائے، اس کی واگذاری کرانا ممکن نہ ہو تو مجبوراً معاوضہ لے کر دوسری زمین خرید کر وقف کردی جائے، یا اگر وقف شدہ زمین قابل انتفاع نہ رہے تب بھی اجازت ہے کہ اس کو فروخت کرکے اس کی قیمت سے دوسری زمین لے کر اس کو وقف کردی جائے، پھر زمین، مکان و دوکان جو بھی مسجد کا تھا اور اس مجبوری کی وجہ سے فروخت کردیا گیا اور اب وہ مسجد نہیں رہی اور خریدار نے کوئی اس میں غیر اسلامی حرکت کی تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے نہ کہ منتظمین (فتاوی محمودیہ ۱۵؍۲۱۹)۔

ایک اور سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: حامداً ومصلیاً! واقف نے جبکہ وقف نامہ میں جائداد موقوفہ ہر قسم کے انتقال کو صراحتاً منع کردیا ہے تو متولی کو کسی طرح اس کے انتقال کا حق نہیں، البتہ اگر جائداد بالکل ناقابل انتفاع ہوجائے تو شرعی قاضی کو اس کا استبدال چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

''ہذا إذا شرط الاستبدال فی أصل الوقف. وأما إذا لم یشترط فقد یخصص برأی أول القضاة الثلثة المشار إلیه بقوله علیه الصلوۃ والسلام قاض فی الجنة وقاضیان فی النار المفسر بذی العلم والعمل لئلا یحصل التطرق إلی إبطال أوقاف المسلمین کما ہو الغالب فی زماننا'' (اسعاف ۲۷). ''والمعتمد یجوز للقاضی بشرط أن یخرج عن الانتفاع بالکلیة وأن لایکون ہناك ریع للوقف یعمر به وأن لا یکون البیع بغبن فاحش کذا فی بحر الرائق. وشرط فی الإسعاف أن یکون المستبدل قاضی الجنة المفسر بذی العلم. کذا فی نہر الفائق'' (فتاوی عالمگیری ۲،۹۹۱)۔

اور صورت مسئولہ میں مکان مذکور قابل انتفاع ہے اور ایک رقم اس پر صرف کرنے کے بعد زیادہ آمدنی کی امید ہے، اور واقف نے مکان کی مرمت وغیرہ کے لئے ایک جز متعین کیا ہے۔ الخ (فتاوی محمودیہ ۱/۵۱۸)۔

اسی سوال کے جواب میں حضرت مولانا سید عبد اللطیف نور اللہ مرقدہ (سابق ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور) تحریر فرماتے ہیں:

وقف نامہ میں اصل چیز یہ ہے کہ شرائط واقف جن کی واقف نے تصریح کی ہو ان کا اتباع کیا جائے کہ ''نص الواقف کنص الشارع کتب فقہ باب الوقف میں منجملہ مسلمہ اصول موضوعہ ہے، البتہ جن شرائط کی تصریح واقف نے نہ کی ہو، یا مبہم یا مجمل چھوڑی ہو ان میں قاضی کے اجتہاد اور تصرف کی گنجائش ہے، وقف نامہ ہذا میں مصارف اور شرائط کو بالکل واضح کر دیا ہے، مجمل نہیں چھوڑا، اور جن صورتوں میں فقہاء کے کلام سے قاضی کو تصرف کا حق معلوم ہوتا ہے وہ خاص خاص صورتوں میں ہے، مثلاً موقوفہ چیز کا بالکل قابل انتفاع نہ رہنا، جو صورت مسئولہ میں مفقود ہے (فتاوی محمودیہ ۱/۵۲۰)۔

الف۔ عبارات بالا سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ اوقاف جو نقل آبادی کی وجہ سے بالکل ویران ہو گئے ہوں اور ان اوقاف کے قرب میں مسلمانوں کی آبادی بالکل ختم ہوگئی ہو، بلکہ ان اوقاف کے دور دور تک کوئی مسلمان آباد نہ ہو، اور ان اوقاف کو آباد کرنے والا کوئی نہ ہو اور آئندہ بھی آباد ہونے کا امکان نہیں ہو، اور وہ اوقاف حکومت یا غیر مسلموں کے دست برد سے محفوظ نہ ہو، اور وہ اوقاف جو محفوظ ہوں، مگر آئندہ محفوظ رہنے کی ضمانت نہ دی جاسکتی ہو، اور وہ اوقاف بالکل معطل ہوں، نا قابل انتفاع ہوں، تو ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو متبادل وقف قائم کر لیا جائے۔

ب۔ ایسے ویران اوقاف کو حکومت یا کسی فرد کے حوالے کر کے اسکے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کی جائے۔

ویران و نا قابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کرتے ہوئے ان کی جگہ اسی طرح کے اوقاف قائم کئے جائیں (جیسا کہ ما قبل کی عبارتوں سے واضح ہے)۔

الف۔ ایسی اراضی جو مسجد پر وقف ہو اور جو فی الحال مسجد کی ضرورت سے زائد ہو تو ایسی اراضی پر منشاء واقف کے خلاف کوئی کام کرنا جائز نہیں ہے (جیسا کہ ما قبل کی عبارتوں سے واضح ہے)۔

ب۔ مسجد کی آمدنی یا اسی طرح وہ زمین و مکان کی آمدنی جو مسجد کے لئے وقف ہو منشاء واقف کے خلاف صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

''الفاضل من وقف المسجد ہل یصرف إلی الفقراء قیل لا وانه صحیح ولکنه یشتری به مستغلا للمسجد'' (تاتارخانیه ۵،۸۶۱)۔

الف۔ جن اوقاف کی آمدنی متعین مصارف سے بہت زیادہ ہو اور سال بسال جمع ہو کر ایک بڑا سرمایہ بن جائے، خدانخواستہ وقف کی عمارت منہدم ہو جائے تو اس سرمایہ سے دوبارہ تعمیر کے بعد رقم بچ جائے اور اس کی حفاظت بھی مشکل ہو تو فاضل آمدنی اسی نوع کے اوقاف محتاج کی ضروریات میں صرف کرنا جائز ہوگا۔

''وسئل أبوبکر عمن وقف أرضا له علی عمارة المسجد وشرط أن ما فضل من عمارته یصرف إلی الفقراء فاجتمعت الغلة والمسجد غیر محتاج إلی العمارة فی الحال قال تحبس الغلة. وہکذا کان یقول الفقیه أبوجعفر. وقد ذکرنا ہذہ المسئلة قبل قال الفقیه أبو اللیث: والصحیح عندی أنه إذا اجتمع من الغلة مقدار ما احتاج المسجد والأرض للعمارة یمکن العمارة منها وتبقی زیادة شئ من الغلة تصرف الزیادة إلی الفقراء علی ماشرط الواقف وفی العتابیة قال الصدر الشہید وہو المختار للفتوی'' (تاتارخانیه ۵،۸۵۶)۔

وہ اوقاف جو اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہوں، مثلاً کسی مسجد یا مدرسہ پر کوئی مکان وقف ہو اور وہ محلہ کے اندر واقع ہو جس سے معمولی کرایہ ملتا ہو، اور اگر اسکو فروخت کر کے دوسری جگہ قائم کیا جائے تو زیادہ آمدنی ہوگی، تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے (ماقبل کی عبارتوں سے واضح ہے)۔

جن اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے ہیں، مثلاً کوئی جاگیر جو کسی خاص خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی اور وہ خاندان ختم ہو گیا یا اسکے افراد ایسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے کہ وہاں تک ان اوقاف کی آمدنی بھیجنا یا صرف کرنا دشوار تر ہو، یا کسی مسجد و مدرسہ کے لئے وقف تھا اور اب نہ وہ مسجد ہے نہ مدرسہ تو ان اوقاف کی آمدنی اسی نوع کے مصارف پر خرچ کیا جائے۔ مثلاً فقراء مخصوص کے لئے وقف تھا تو ان کے فقدان کی صورت میں دوسرے قریب کے فقراء پر صرف کیا جائے اور مسجد و مدرسہ کے اوقاف کو دوسرے قریب محتاج مسجد و مدرسہ پر صرف کیا جائے۔

الف۔ جن اوقاف کی عمارتیں مخدوش حالت میں ہوں اور واقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ نہ ہو تو متولی وقف یا قیم وقف کے لئے جائز نہیں کہ کسی بلڈر کو اس شرط پر تعمیر کے لئے دیدے کہ ایک یا دو منزل تمہاری ہوگی اور تم کو مکمل تصرف کا اختیار ہوگا کوئی ایسی شکل اختیار کرنا جائز نہیں، اسی طرح زمین پر تعمیر اس شرط کیساتھ کرانا جائز نہ ہوگا۔

''ولا تجوز الإجارة الطويلة على الوقف ولو احتيج إليها فالوجه فى ذلك أن يعقد عقودا متفرقة مترادفة كل عقد على سنة فيكتب فى الصك استأجر فلان بن فلان كذا ثلاثين عقدا كل عقد على سنة، فيكون العقد الأول لازما ويكون العقد الثانى غير لازم وفى الذخيرة وبعض المشائخ زيفوا هذه الحيلة، وفى الخانية: وذكر شمس الائمة السرخسى أن الإجارة المضافة تكون لازمة فى إحدى الروايتين هو الصحيح'' (تاتار خانیه ۵،۷۵۰)۔

''الواقف اذا آجر الوقف إجارة طويلة إن كان يخاف على رقبتها التلف بسبب هذه الإجارة، فللحاكم أن يبطلها وكذلك إن آجرها من رجل يخاف على رقبتها من المستاجر فينبغي للحاكم أن يبطل الإجارة'' (تاتار خانیه ۵،۷۵۲)۔

عبارت بالا سے مستفاد ہوتا ہے کہ وقف کو طویل مدت کے لئے اجارہ پر دینا جائز نہیں، اسی طرح طویل مدت کے لئے اجارہ پر لگانا جس سے مال وقف کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو تو حاکم وقت ایسے اجارہ کو باطل قرار دے گا، اور ختم کر دے گا اس مسئلہ میں یہی ہے کہ ایک یا دو منزل بالکل وقف سے خارج ہونا لازم آتا ہے اس لئے جائز نہ ہوگا۔

ب۔ کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے وقف شدہ زمین وجائداد کا کوئی حصہ فروخت کر کے اس سے نئی تعمیر کرنا جائز نہیں ہے۔

''وفيه أيضا سئل عن أهل المحلة باعوا وقف المسجد لأجل عمارته قال: لايجوز بأمر القاضى وغيره'' (تاتار خانیه ۵،۸٦۴)۔

مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین جو کہ ضرورت سے زائد ہو اس پر مدرسہ یا کوئی اور مقصد کے لئے تعمیر کرنا جائز نہیں ہے، چونکہ وقف کو مقاصد وقف میں استعمال کرنا چاہئے اسکے خلاف جائز نہیں۔

جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادی ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہو رہا ہو، یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا اس کی وجہ سے اب اس کے استعمال اور اس میں تدفین پر پابندی عائد کر دی گئی ہو اس کی وجہ سے ان پر قبضہ کا خطرہ ہو تو گویا یہ قابل انتفاع نہیں، اس کا انتفاع بالکلیہ ختم ہو گیا ہے، اس صورت میں فروخت کر کے اس کی جگہ دوسرا وقف قائم کر لیا جائے۔

جو مساجد تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں ایسی بعض مساجد میں حکومت نے نماز کی ادائیگی سے منع کر دیا ہے تو حکومت کی طرف سے یہ ممانعت کرنا جائز نہیں ہے۔

''و من أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى فى خرابها الخ'' (سورہ بقرہ ۱۱۴)۔

اور حکومت کو اس طرح منع کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

قبرستان کی باؤنڈری عند الشرع مطلوب نہیں ہے اور صرف باؤنڈری کرانے کے لئے مقاصد وقف کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔

البتہ قبرستان پر غاصبانہ قبضہ ہو رہا ہو یا بیجا تصرف ہو رہا ہو یا خطرہ لاحق ہو تو ان امور سے حفاظت کے لئے باؤنڈری دینا ہو تو دوکان بنائی جائے، جبکہ کوئی نئی قبران دوکانوں میں نہ آئے اور اس کی آمدنی قبرستان کے مقاصد میں خرچ کیا جائے۔

حکومت وقت کو زندوں سے زیادہ مردوں کی حفاظت کی فکر ہے، اس لئے مرکزی حکومت نے تمام قبرستانوں کی باؤنڈری کا قانون وضع کیا ہے، اس لئے اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس اسکیم سے باؤنڈری کرالی جائے، ان ممنوعات کے ارتکاب کی چنداں کوشش نہ کی جائے۔

قبرستان میں مسجد ہو، اس کی توسیع کی جارہی ہو، اور اس کی توسیع میں پرانی قبریں آجائیں وہ پرانی قبریں کہ جس کی میت مٹی ہو چکی ہو تو اس طرح کی توسیع جائز ہے۔

"قال الزيلعي: لو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه" (ردالمحتار ۱،۶۵۹، بحر الرائق ۲،۱۹۵، نظام الفتاوی ۱،۱۶۱، احسن الفتاوی ۶،۴۰۹)۔

جو اوقاف ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد پر وقف کی ہیں اور وہ ہندو وقف بورڈ کی نگرانی میں ہیں، وہ مساجد و مقابر اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا درست و جائز ہے۔

"(غير مامون) قال في الاسعاف لا يولى إلا أمين قادر بنفسه أو بنائبه؛ لأن الولاية مقيدة بشرط النظر وليس من النظر تولية الخائن؛ لأنه يخل بالمقصود، وكذا تولية العاجز؛ لأن المقصود لايحصل به ويستوى فيه الذكر والأنثى، كذا الأعمى والبصير، وكذا المحدود في قذف إذا تاب؛ لأنه أمين وقالوا: من طلب التولية على الوقف لا يعطى له وہو كمن طلب القضاء لا يقلد الخ والظاهر أنها شرائط الأولوية لا شرائط الصحة وإن الناظر إذا فسق استحق العزل ولا ينعزل كالقاضي إذا فسق لا ينعزل على الصحيح المفتى به... ويشترط للصحة بلوغه وعقله لا حريته وإسلامه لما في الإسعاف" (رد المحتار ۳،۴۲۲)۔

استبدال وقف کے شرائط واحکام

مولانا محمد ارشاد القاسمی[1]

الف، ب۔ خلاصہ اس سوال کا یہ ہے کہ جو اوقاف ویران اور معطل ہو چکے ہوں، وہاں سے مسلمانوں کی آبادی ختم ہو چکی ہو، اوقاف سے نفع اور انتفاع کی کوئی صورت باقی نہ ہو تو ایسی صورت میں ان اوقاف کو کیا کیا جائے۔ یونہی معطل بیکار چھوڑ دیا جائے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اوقاف غیروں کی ملکیت اور استعمال میں آ جائے گا، یا اس کے بدل واستبدال کی شرعی گنجائش ہوگی۔

جی ہاں ایسے اوقاف کا متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے، اگر اسکے بقا اور انتفاع کی کوئی شکل نہ ہو تو اس کو فروخت کر کے دوسرا متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے۔ قریب قریب تمام فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔ علامہ حصکفی ''درمختار'' میں لکھتے ہیں:

''وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما، فيصرف وقف المسجد والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض'' (۴،۳۵۲)۔

''اسعاف'' اور ''قاضی خاں'' کے حوالہ سے ہے: ''رباط بعيد استغنى عنه المارة وبجنبه رباط آخر قال السيد الإمام أبو الشجاع، تصرف غلته إلى الرباط الثاني'' (ص ۳۵۹)۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ہے: ''حوض وبئر ورباط ودابة وسيف ...فقد ذكر التتارخانية وغيرها جواز نقلها'' (صفحہ ۳۶۰)۔

اسی طرح ابن ہمام کی ''فتح القدیر'' میں بھی جائز لکھا ہے: ''إذا ضعفت الأرض عن الاستغلال ويجد القيم بثمنها أخرى مما أكثر ريعا كان له أن يبيعها ويشترى بثمنها ما هو أكثر ريعا'' (صفحہ ۲۲۱)۔

اسی طرح ابن ہمام نے ''ظہیریہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے: ''سئل الحلواني عن أوقاف المسجد إذا تعطلت وتعذرت استغلالها هل للمتولي بيعها ويشترى بثمنها أخرى قال نعم''۔

اسی طرح ابن ہمام نے ہشام کے واسطے سے امام محمد کی روایت نقل کی ہے: ''وروى ابن هشام عن محمد أنه قال: إذا صار الوقف بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشترى بثمنه غيره'' (صفحہ ۲۲۷)۔

اور جن لوگوں نے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ واقف یا اس کے وارث کی جانب لوٹ آئے گا، اس قول کی تردید اور اسے غیر مفتی بہ قرار دیتے ہیں:

''وعلى هذا لا يفتى على قوله برجوعه إلى ملك الواقف وورثته بمجرد تعطله وخرابه'' (صفحہ ۲۲۷) ''وهكذا في الشامي'' (۴،۳۷۹)۔

لہذا نہ واقف، نہ واقف کے وارثوں کی جانب لوٹایا جائے گا، بلکہ اس کا متبادل وقف قائم کیا جائے گا۔

اسی طرح قاضی خان کے حوالے سے ابن ہمام لکھتے ہیں: ''وقف على مسكين خرب ولاينتفع به ولايستاجر أصله يبطل الوقف ويجوز بيعه'' (صفحہ ۲۲۷)۔

اسی طرح ابن نجیم کی ''بحر الرائق'' میں ہے: ''الوقف إذا صار بحيث لاينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشترى بثمنه

---

[1] استاذ جامعہ اسلامیہ ترجمہ والی مسجد بھوپال۔

غیرہ ولیس ذلك إلا للقاضی'' (۵،۲۲۳-۲۲۴)۔

اسی طرح ''منحۃ الخالق حاشیہ بحرالرائق'' میں علامہ شامی لکھتے ہیں: ''سئل عن أوقاف المسجد إذا تعطلت هل للمتولی أن يبيعها ويشتری مكانها أخرى قال: نعم'' (۵،۲۲۳، ۵،۲۲۴)۔

قاضی کی طرح متولی بھی معطل اوقاف کو فروخت کرکے اس کے بدلے دوسرے اوقاف کو خرید سکتا ہے۔ ابن نجیم نے بحرالرائق میں شمس الائمہ حلوانی کے قول کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: ''أوقاف المسجد إذا تعطلت وتعذر استغلالها هل للمتولی أن يبيعها ويشتری مكانا آخر قال نعم'' (۵،۲۲۳)۔

اسی طرح ''مجمع الانہر'' میں ہے: ''حوض أو مسجد خرب وتفرق الناس عنه فللقاضی أن يصرف أوقافه إلى مسجد أو حوض آخر'' (۱،۷۴۹)۔

اسی طرح ''ہندیہ'' میں ہے: ''وقف صحيح على أقوام مسمين خرب ولا ينتفع به وہو بعيد من القرية لا يرغب أحد فی عمارته ولا يستأجر أصله يبطل الوقف ويجوز بيعه'' (صفحہ ۴۸۰)۔

اسی طرح ''قاضی خاں'' میں ہے: ''فإذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستغلال والقيم يجد بثمنها أرضا أخرى هی أنفع للفقراء وأكثر ريعا كان له أن يبيع هذه الأرض ويشتری بثمنها أرضا أخرى'' (۳،۲۰۰ برحاشیہ ہندیہ)۔

حاصل کلام:

فقہاء کی ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا کہ وہ اوقاف جو معطل اور ویران ہوجائے اس کا متبادل وقف اسے فروخت کرکے قائم کیا جاسکتا ہے، اس کی صورت یہ ہوگی کہ اسے فروخت کرکے اسی جیسا وقف اختیار کیا جائے گا، اگر مسجد پر وقف تھا تو اس رقم سے خرید کر زمین یا مکان وغیرہ مسجد پر وقف کردیا جائے گا، اگر سرائے خانہ یا حوض تھا تو اسی طرح سرائے خانہ یا حوض بنوادیا جائے گا، اور قریبی مسجد پر اس کی آمدنی استعمال ہوگی۔ کذا فی الشامی۔

''وفی شرح المنتقی يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (صفحہ ۳۵۹) یعنی دونوں کی جہت ایک ہوگی۔

معطل ویران اوقاف کو لقطہ میں داخل کرنا:

فقہاء کے کلام میں اس کی بھی اجازت ملتی ہے کہ ایسے اوقاف کو لقطہ میں داخل کردیا جائے۔ چنانچہ ابن نجیم کی ''البحرالرائق'' میں ہے: ''حوض محلة خرب وصار بحال لا يمكن عمارته فهو للواقف ولورثته، فإن كان واقفه وورثته لا تعرف فهو لقطة. وزاد فی فتاوى الخلاصة: إذا كان كاللقطة يتصدقون به على فقير ثم يبيعه الفقير ثم ينتفع بثمنه'' (۵،۲۲۲)۔

ابن ہمام ''ہدایہ'' کی شرح ''فتح القدیر'' میں لکھتے ہیں: ''حوض محلة خرب وصار بحيث لا تمكن عمارته، فهو للواقف ولورثته، فإن كان واقفه وورثته لا تعرف فهو لقطة، كذا فی الخلاصة، إذا كان كاللقطة يتصدقون به على فقير ثم يبيعه الفقير فينتفع بثمنه'' (ص ۲۲۱)۔

خیال رہے کہ وقف کا ملک واقف کی جانب لوٹنا قول غیر مفتی بہ ہے:

''وقال صدر الشهيد... لأن الوقف بعد ما خرج إلى الله تعالى لا يعود إلى ملك الواقف'' (فتح ۲۲۱)۔

اسی طرح علامہ شامی نے ''رجوع الی الوارث'' کو ضعیف اور ناقابل فتویٰ قرار دیا ہے:

''وأما عود الوقف بعد خرابه إلى ملك الواقف أو ورثته فقد قدمنا ضعفه'' (۳،۴۲۹)۔

لقطہ اور اس کا مصرف:

ماقبل سے یہ معلوم ہوا کہ اوقاف معطلہ اور ویران کو فقہاء کرام کے ایک قول میں لقطہ مانا گیا ہے۔ اور لقطہ کا مصرف جہاں یہ ہے کہ فقراء پر تصدق ہو، وہاں

علامہ "حصکفی" نے لقطہ کا مصرف بیت المال بھی بتایا ہے، یعنی لقطہ کا مال جس کا مالک نہ مل رہا ہو اسے بیت المال میں داخل کردیا جائے۔ اور بیت المال کا مصرف عام نوائب المسلمین ہے جس میں رفاہی کام بھی داخل ہے۔

"كذا في الدر المختار: فهو مصرف جزية وخراج ومصرف زكوة وعشر مر في الزكاة ومصرف خمس وركاز مر في البر وبقى رابع وهو لقطة، وتركة بلا وارث" (۲۱۹،۴)۔

الانتباہ: خیال رہے کہ ویران ومعطل اور ناقابل انتفاع واستغلال اوقاف کے استبدال کی اجازت مطلقاً کھلے عام ہر ایک کو ہر وقت اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے فقہاء نے شرطیں ذکر کی ہیں جو متعدد مقام پر موضوع کے ذیل میں مذکور ہیں، جن میں لابدی شرطیں یہ ہیں:

۱۔ غبن فاحش کے ساتھ انتہائی کم قیمت میں فروخت نہ کیا جارہا ہو۔

۲۔ اس کے بدلہ زمین ہی خریدی جائے، روپیہ پیسہ کی شکل میں یا غیر منقولہ شکل میں اسے نہ منتقل کیا جائے، کہ یہ قریب الہلاکت ہوتے ہیں اور جو ابقاء وقف اور انفع للوقف کے خلاف ہے۔

۳۔ ایسا متولی یا قاضی فروخت کرسکتا ہے، جو نہایت صالح اور امانت دار ہو، جسکی تشریح فقہاء قاضی الجنۃ سے کرتے ہیں۔

علامہ زحیلی نے بھی ان شرطوں کو ذکر کیا ہے (الفقہ الاسلامی ۸/ ۲۲۲)۔

لہٰذا ان اوقاف کا استبدال نہایت احتیاط سے شروط مذکورہ کی رعایت کرتے ہوئے کیا جائے گا۔

مساجد اور دوسرے اوقاف میں فرق:

مفتی بہ اور محقق قول کے اعتبار سے مسجد کو منتقل یا فروخت یا اس کا متبادل دوسری مسجد میں نہیں کیا جاسکتا ہے۔

"درمختار" میں ہے: "ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الإمام والثاني أبدا إلى قيام الساعة وبه يفتي"

علامہ شامی اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "لوخرب وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه فلايعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر"۔

حتی کہ لوگ نماز چھوڑ چکے ہوں۔ آبادی ختم ہونے کی وجہ سے یا اور کسی غلط اقدام، مثلاً دوسروں کا غاصبانہ قبضہ ہوجانے کی وجہ سے، تب بھی اس کی مسجدیت باقی رہے گی۔

- چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں: "سواء كانوا يصلون فيه أولا" اور اسی پر فتویٰ بھی ہے۔ "وهو الفتوى، وأكثر المشائخ عليه وهو الأوجه" (۳۵۸،۴)۔

نہ مسجد کی مسجدیت منتقل ہوسکتی ہے نہ مسجد کی تعمیر۔ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

"أنه لا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر كما مر عن الحاوي" (۳۵۹،۴)۔

شیخ سراج الدین نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔

اسی طرح "بزازیہ" میں ہے: "خربت القرية والمسجد ولا يصلي فيه أحد عند الثاني هو مسجد أبدا؛ لأن كونه مسجدا لايتوقف في الابتداء على الصلوة عنده فكذا في البقاء" (۲۷۰،۶)۔

اسی طرح "ہندیہ" میں ہے: "والفتوى على قول أبي يوسف أنه لا يعود إلى ملك مالك أبدا، كذا في المضمرات" (۴۵۸،۲) "وإذا خرب المسجد واستغنى أهله وصار بحيث لا يصلى فيه... قيل هو مسجد أبدا وهو الأصح كذا في خزانة" (۴۵۸،۲)۔

اسی طرح "فتح القدیر" میں ہے: "يبقى مسجداً على حاله عند أبي يوسف وهو قول أبي حنيفة ومالك والشافعي"۔

فقہاء کرام کی ان تمام عبارتوں سے یہ بات بالکل منقح اور واضح ہوگئی کہ دیگر اوقاف اور مساجد میں فرق ہے۔ جب ایک مرتبہ مسجد مسجد بن جائے گی، شرعی مسجد ہوجائے گی تو پھر اب خواہ مدتوں ویران و معطل ہوجائے یا نماز متروک ہوجائے، در ودیوار منہدم ہوجائے، اسکی مسجدیت باقی رہے گی، مفتی بہ قول کے اعتبار سے مسجد ہی رہے گی۔ حتی کہ کفر وشرک کا غلبہ ہوجائے، اس میں بت رکھ دیئے جائیں، نماز، ذکر، عبادت الٰہی متروک ہوجائے، شرعی مسجد کی حیثیت باقی رہے گی۔ کیا کعبہ پر ایک طویل زمانے تک مشرکین کا قبضہ نہیں رہا، بت نہیں رکھے گئے، پھر بھی مسجد رہی کہ جب اسلام کا اقتدار ہوا بت ہٹا کر اس کی مسجدیت باقی رکھی گئی۔

''كذا في فتح القدير: واستدل أبو يوسف وجمهور العلماء بالكعبة، فإن الإجماع على عدم خروج موضعها عن المسجدية والقربة'' (۶،۲۳۷)۔

الف۔ وقف کی ایک نوع کو دوسری نوع پر صرف کرنا درست نہیں۔ ہاں البتہ واقف ایک ہو، جہت ایک ہو تو فاضل آمدنی کو صرف کیا جاسکتا ہے۔

''كذا في مجمع الأنهر: إذا اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر إليه وإن اختلف أحدهما فلا'' (۱،۷۴۹)۔

اسی طرح ''ہندیہ'' میں ہے: کہ مسجد کی فاضل آمدنی کو فقراء کو نہیں دیا جاسکتا: ''الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء قيل: لا يصرف وإنه صحيح'' (۲،۴۶۳)۔

ابن نجیم کی ''بحر الرائق'' میں ہے: ''لا يجوز لمتولي الشيخونية بالقاهرة صرف أحد الوقفين للآخر، أما إذا اختلف الواقف أو اتحد الواقف واختلف الجهة بأن بنى مدرسة ومسجدا وعين لكل وقفا وفضل من غلة أحده ا لا يبدل شرط الواقف، وكذا اختلف الواقف لا الجهة يتبع شرط الواقف'' (۵،۲۳۴)۔

ہاں البتہ فاضل آمدنی کو مدرسہ پر یا دینی تعلیمی امور میں اس وقف صرف کیا جاسکتا ہے جب کہ فاضل آمدنی تعمیر اور ضروری اخراجات اور اسی طرح مزید مسجد کو آمدنی کے ذرائع کی ضرورت نہ ہو، اور زائد آمدنی سے خیانت کا اندیشہ ہو تو ضرورت سے زائد فاضل آمدنی کو مدارس پر اور دینی تعلیم پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس وقت ہے، جبکہ واقف نے کچھ شرط نہ لگائی ہو، اگر شرط لگادی اور مصرف بیان کردیا ہو تو دوسری جگہ اس کو صرف کرنا درست نہ ہوگا۔ چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''فإن انتهت عمارته وفضل من الغلة شئ يبدأ بما هو أقرب للعمارة وهو عمارته المعنوية التي هي قيام شعائره قال في الحاوي القدسي والذي يبدأ به من ارتفاع الوقف اى من غلة عمارته شرط الواقف أم لا ثم ما هو أقرب إلى العمارة وأعم للمصلحة كالإمام للمسجد والمدرس للمدرسة يصرف إليهم إلى قدر كفايتهم ...هذا إذا لم يكن معينا'' (۴،۳۶۷)۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فاضل اوقاف کے مصارف کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''فيقدم أولاً العمارة الضرورية ثم الأهم فالأهم من المصالح والشعائر بقدر ما يقوم به الحال فإن فضل شئ يعطى بقيته المستحقين إذ لاشك أن مراد الواقف انتظام حال مسجده أو مدرسته لا مجرد انتفاع أهل الوقف...هذا إذا لم يكن معينا''

پھر مزید لکھتے ہیں کہ فاضل آمدنی دین اور شعائر دین میں کہاں خرچ کیا جاسکتا ہے: ''يعني أن الصرف إلى ما هو أقرب إلى العمارة كالإمام ونحوه إنما هو فيما إذا لم يكن الوقف معينا على جماعة معلومين كالمسجد والمدرسة، أما لو كان معينا كالدار الموقوفة على الذرية أو الفقراء، فإنه بعد العمارة يصرف الريع إلى ما عينه الواقف بلا تقديم لأحد على أحد'' (۴،۳۶۸)۔

اس عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ اوقاف مساجد کی آمدنی جو ضرورت تعمیر واستغلال سے فارغ ہو مدارس پر جو مصالح اور شعائر میں داخل ہے، صرف کیا جاسکتا ہے۔

ابن نجیم ''بحر الرائق'' میں لکھتے ہیں: ''ثم ما هو أقرب إلى العمارة وأعم للمصلحة كالإمام للمسجد والمدرس للمدرسة يصرف إليهم قدر كفايتهم''۔

ظاہر ہے کہ مساجد کا احیاء تعلیم اور مدارس سے ہے، اسی وجہ سے مدارس اور علم دین کی اشاعت کو مصالح میں شامل کیا گیا ہے۔ حاشیہ منحۃ الخالق میں لکھتے ہیں: ''إنما هو عدم النفع الحاصل من انتظام مصالح المساجد بإقامة شعائرها'' (صفحہ۲۲۱)۔

پھر حاوی قدسی کی عبارت ''كذلك إلى آخر المصالح'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''أى مصالح المسجد فيدخل المؤذن والناظر. لأنا قدمنا إنهم من المصالح. وقدمنا أن الخطيب داخل تحت الإمام؛ لأنه إمام الجامع فتحصل به أن الشعائر التى تقدم فى الصرف مطلقاً بعد العمارة الإمام والخطيب والمدرس والنوقاد والفراش والمؤذن والناظر'' (ص:۲۲۲)۔

اس عبارت سے بھی اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اوقاف مسجد کی فاضل آمدنی کو مدارس اور مدرس پر لگایا جاسکتا ہے۔ ابن نجیم نے تو بحر الرائق میں لکھا ہے کہ کسی واقف نے دو وقف میں سے ایک مسجد کے صرفہ کے لئے اور ایک امام و موذن کے لئے وقف کر دیا ہے، اور ادھر امام و موذن کی تنخواہ کم پڑتی ہے تو گنجائش ہے کہ وقف مسجد میں سے فاضل آمدنی کو امام و موذن پر جو مصالح مسجد میں داخل ہے خرچ کر سکتا ہے۔ اور اسی مصالح مسجد میں مسجد کا مدرسہ بھی داخل ہے۔ خیال رہے کہ عام مدرسہ نہیں، بلکہ اسی مسجد کا مدرسہ اس فاضل آمدنی کا اولین مصرف ہوگا۔

علماء اکابر کے فتوی سے تائید:

''فتاوی محمودیہ'' میں مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ نے بھی اس امر کی اجازت دی ہے کہ فاضل آمدنی کو مدارس میں لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سوال میں ہے:

ایک کثیر الاوقاف جامع مسجد ہو اور واقف سے کچھ شرائط منقول نہ ہوں، آمد مصارف سے بہت زیادہ ہو اور شکست و ریخت مسجد کے لئے روپیہ جمع و موجود ہو، اور زیادہ روپے جمع رہتے ہیں تو کیا ان اوقاف مسجد کی زائد آمدنی کو تعلیم دین اور تبلیغ اسلام اور تدریس علوم شرعیہ پر صرف کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً! صورت مسئولہ میں اگر مسجد کی آمدنی کا روپیہ زیادہ، صرف کم، اور اتنا روپیہ ہر وقت موجود رہتا ہے کہ ضرورت شکست و ریخت وغیرہ بسہولت پوری ہو سکے، اور روپیہ جمع رہنے میں خیانت کا قوی اندیشہ ہو تو اس روپیہ سے مسجد کے لئے جائداد، دوکانیں، زمین وغیرہ خرید لی جائیں۔ اگر اس میں دشواری ہو اور روپیہ جائداد خریدنے کے بعد بھی بچ رہے تو پھر اسی مسجد میں دینی مدرسہ قائم کر لیا جائے۔ تاکہ مسجد کی آبادی میں ترقی ہو۔ کیونکہ آبادی مسجد کو ترقی دینا مسجد کی بڑی مصلحت ہے (فتاوی محمودیہ ۱/۵۰۹)۔

ب۔ مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی امور پر صرف کرنے کی اجازت نہیں:

''كذا فى الهندية: الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء قيل لايصرف وانه صحيح'' (۲،۴۶۳)۔

اولاً مسجد کی آمدنی مساجد کے مصالح میں خرچ کی جائے گی اور مسجد کے مصالح میں رفاہی امور نہیں ہیں۔ البتہ مسجد میں مدرسہ ہو اور فاضل آمدنی تعمیر اور استغلال سے بھی زائد ہو اور جمع رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہو تو تعلیم و تدریس جو مصالح میں داخل ہے حسب ضرورت خرچ کیا جاسکتا ہے۔ جس کی تفصیل ''الف'' کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

الف۔ اسی نوع کے اوقاف میں فاضل آمدنی کو صرف کیا جاسکتا ہے، کذا فی الشامی:

''جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشئ واحد''۔

اسی طرح شامی نے ''بحر'' کے حوالہ سے بیان کیا ہے:

''مسجد له أوقاف مختلفة لا بأس للقيم أن يخلط غلتها كلها وإن خرب حانوت منها فلا بأس بعمارته من غلة حانوت آخر؛ لأن الكل للمسجد. هكذا فى عبارة البحر'' (۵،۴۲۲)۔

ب۔ نہیں کر سکتے۔ ''كذا فى الشامية إذا كان الوقف منزلين أحدهما للسكنى والآخر للاستغلال فلا يصرف أحدهما للآخر'' (صفحہ ۳۶۱)۔

ضرورت کی وجہ سے کہ آمدنی کم ہے صرفہ پورا نہیں ہوتا، یا وقف کا نقصان ہو رہا ہے تو اس سے بہتر شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔اس وقف کو فروخت کر کے دوسرا حاصل کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ابن نجیم ''البحر الرائق'' میں لکھتے ہیں:

''ونقل عن شمس الائمة الحلوانی أنه یجوز للقاضی والمتولی أن یبیعه ویشتری مكانه آخر وإن لم ینقطع، ولكن یؤخذ بثمنه ما هو خیر منه للمسجد لا یباع''۔

اسی طرح امام محمد سے بھی یہ منقول ہے کہ آمدنی کم ہو جائے، زمین یا وقف مکان کمزور یا پرانا ہو کر نا قابل رغبت ہو جائے تو ایسی صورت میں اسے فروخت کر کے اس کے بدلہ اس سے بہتر صورت اختیار کی جاسکتی ہے، تاکہ زیادہ نفع حاصل کیا جاسکے۔ابن نجیم کی ''البحر الرائق'' میں ہے:

''وقد روی عن محمد إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستغلال والقیم یجد بثمنها أخری هی أكثر ریعا كان له أن یبیعها ویشتری بثمنها ما هو أكثر ریعا'' (۵،۲۲۲)۔

اسی طرح ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے: ''إذا ضعفت الأرض عن الاستغلال ویجد القیم بثمنها أخری هی أكثر ریعا كان له أن یبیعها ویشتری بثمنها ماهو أكثر ریعا'' (۶،۲۲۱)۔

یہی عبارت فتاوی قاضی خان میں بھی ہے۔علامہ شامی نے بھی جواز اور گنجائش کا قول نقل کیا ہے، اس مسئلہ پر مفصل کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اعلم أن الاستبدال علی ثلثة وجوه: الأول أن یشرطه الواقف لنفسه أو لغیره فالاستبدال فیه جائز علی الصحیح، وقیل: اتفاقا. والثانی أن لا یشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحیث لاینتفع به بالكلیة، بأن لا یحصل منه شئ أصلا أولا یفی بمؤنته فهو أیضا جائز علی الأصح إذا كان بإذن القاضی ورأیه المصلحة فیه، والثالث أن لایشرطه أیضا، ولكن فیه نفع فی الجملة وبدله خیر منه ریعا ونفعا، وهذا لا یجوز استبداله علی الأصح'' (ص ۳۸۴)۔

خلاصہ: خلاصہ یہ نکلا کہ قلت آمدنی کی وجہ سے صرفہ نہ نکل رہا ہو، ضرورتیں پوری نہ ہوتی ہوں تو فروخت باحسن جائز ہوگا۔محض زیادتی نفع کے لئے گنجائش نہیں، جیسا کہ الثانی اور الثالث کی عبارت سے واضح ہو رہا ہے۔

علامہ شامی نے ''حاشیہ منحۃ الخالق'' میں اس کی اجازت دی ہے: ''إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستبدال والقیم یجد بثمنها أخری أكثر ریعا كان له أن یبیعها ویشتری بثمنها ما هو أكثر ریعا'' (۵،۲۲۷)۔

خیال رہے کہ اس قسم کے استبدال کی اجازت کم از کم دو لابدی شرطوں کے ساتھ ہوگی (۱) روپیہ یا جائداد منقولہ کی شکل نہ ہوگی بلکہ عقار اس کا متبادل وقف حاصل کیا جائے گا۔(۲) ہر ایک کو اجازت نہ ہوگی بلکہ صالح دیانتدار متولی کو اجازت مل سکتی ہے۔

علامہ عبدالحی فرنگی محل نے بھی زائد انتفاع کی بنیاد پر (جب کہ اخراجات پورے نہ ہو رہے ہوں) اس سے بہتر شکل اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔جیسا کہ ''مجموعۃ الفتاوی'' میں ہے:

الجواب: قاضی اگر مصلحتے در استبدال وقف داند میتواں کرد...... ودر اشباہ فی آرد...... ''ال ابعة أن یرغب إنسان فیه ببدل أكثر غلة وأحسن وصفا، فیجوز علی قول أبی یوسف وعلیه الفتوی''۔اس سے معلوم ہوا کہ مصلحت اور منافع کی وجہ سے قاضی اور متولی فروخت کر کے انفع صورت اختیار کرسکتا ہے (قدیم مجموعۃ الفتاوی ۸۹/۳)۔

خلاصہ: انفع للوقف کے مدنظر کہ ضرورتیں اور اخراجات پورے نہیں ہوتے تو استبدال کی شرطوں کے ساتھ استبدال کی اجازت ہے۔

خیال رہے کہ اس سوال میں دو چیزیں ہیں:

(۱) اگر کوئی جاگیر یا اوقاف کسی خاص خاندان کے لئے وقف کیا گیا تھا اور خاندان ختم ہو گیا۔تو اب اس وقف کا کیا ہوگا؟

(۲) مسجد و مدرسہ کے لئے وقف تھا وہ مسجد یا مدرسہ ختم ہو گیا۔تو اب ان اوقاف کا کیا حکم ہوگا؟ دونوں کے جوابات الگ ہیں:

پہلے جز کا جواب یہ ہے کہ کسی خاص خاندان کے اوقاف جب کہ وہ خاندان ختم ہوجائے عام فقراء کی جانب منتقل ہوجائیں گے۔ اور اس کی آمدنی اس علاقے کے فقراء میں تقسیم کردیا جائے گا۔

ابن ہمام کی ''فتح القدیر'' میں ہے: ''ما لو وقف داره على سكنى قوم بأعيانهم أو ولده و نسله ما تناسلوا، فإذا انقرضوا كانت غلتها للمساكين'' (۶،۲۱۲)۔

اسی طرح ''ہندیہ'' میں ہے: ''وكذا لو قال: على ولدي وعلى من يحدث لي من الولد، فإذا انقرضوا فعلى المساكين ... وإن لم يبق له ولد صرفت الغلة إلى الفقراء'' (۲،۳۷۱)۔

''رجل قال أرضي هذه صدقة موقوفة على ولدي كانت الغلة لولد صلبه يستوي فيه الذكر والأنثى وإذا جاز هذا الوقف فما دام يوجد واحد من ولد الصلب كانت الغلة له لا غير، فإذا لم يبق واحد من البطن الأول تصرف الغلة إلى الفقراء''۔

اس سے معلوم ہوا کہ خاندان کے ختم اور انقطاع کے بعد فقراء اس کے مصرف ہوں گے۔

دوسرے جز کا جواب یہ ہے کہ اگر مسجد یا مدرسہ پر وقف کیا گیا تھا تو اس کے انقطاع کے بعد قریبی مسجد و مدرسہ میں اس کے اوقاف کو منتقل کردیا جائے گا۔

''كذا في الهندية رباط يستغنى عنه وله غلة فإن كان بقربه رباط صرفت الغلة إلى ذلك الرباط، وإن لم يكن بقربه رباط يرجع إلى ورثة الذي بنى الرباط'' (۲،۴۲۸)۔

اسی طرح مسجد کے لئے حکم ہے کہ اس کے اوقاف کو قریبی مسجد کی جانب لوٹا دیا جائے گا۔ کذا فی مجمع الانہر:

''حوض أو مسجد خرب أو تفرق الناس عنه فللقاضي أن يصرف أوقافه إلى مسجد آخر أو حوض آخر'' (۱،۷۳۹)۔

اسی طرح ''شامی'' میں ہے: ''يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (۳،۳۵۹)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد یا مدرسہ کے اوقاف کو عدم ضرورت کی بنیاد پر قریبی اوقاف میں منتقل کردیا جائے گا۔

الف۔ اگر عمارت مخدوش حالت میں ہے تو اس کی ایک یا دو منزل کسی کی ملکیت میں دے کر اس سے تعمیر کا صرفہ لے کر تعمیر درست نہیں ہے۔ بلکہ کسی کرایہ دار سے پیشگی رقم لے کر اس کی تعمیر کرائی جائے چونکہ لوگ مکان و دوکان کے شدید محتاج ہونے کی بنیاد پر پیشگی رقم ادا کرکے اجارہ قبول کرلیتے ہیں، باقی خالی زمین ہو تو اسے عدم انتفاع کی شکل میں فروخت کیا جاسکتا ہے۔ اور بلڈر سے کسی منزل کو دے کر بھی معاملہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

''فإن الأرض إذا ضعفت لا يرغب غالبا في استئجارها بل في شرائها، أما الدار فيرغب في استئجارها مدة طويلة لأجل تعميرها للسكنى'' (ص ۳۸۵)۔

اس سے معلوم ہوا کہ زمین کے ناقابل انتفاع کی شکل میں اس کے استبدال اور فروخت پر اختلاف ہے۔ اور علامہ شامی کی رائے اس کے استبدال کی جانب ہے۔ اور صاحب منتقی کے بھی اطلاق سے زمین کا داخل جواز ہونا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ مکان کے مخدوش کا نہیں بلکہ اس کا حل کرایہ دار سے پیشگی رقم دے کر نکل سکتا ہے۔

''كذا في الشامي: محل الاستبدال إنما هو الأرض لا البيت... واعترضه الرملي، بأن كلام المنتقى المذكور شامل للأرض والبيت فالفرق بينهما غير صحيح'' (۳،۳۷۹)۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمارت مکان اور زمین دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ علامہ شامی کی آخری رائے منحۃ الخالق میں بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح ہندیہ میں ہے: ''إذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضا منها ليرم الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك'' (۲،۴۱۷)۔

اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

ب۔ حاصل اس سوال کا یہ ہے کہ مخدوش شدہ کی تعمیر جدید کے لئے کوئی رقم نہ ہو تو نئی تعمیر یا اصلاح اور ضروری مرمت کے لئے وقف کو بچانے کے لئے اس کا کوئی جز فروخت کردیا جائے اور اس کی رقم سے تعمیر واصلاح کی جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں۔

خیال رہے کہ فقہاء کرام نے تعمیر اور مخدوش کی اصلاح اور ٹوٹ پھوٹ کی درستگی کے لئے ہر ممکن صورت اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، تاکہ وقف کی بقا رہے، اس کے لئے اولاً یہ صورت ہے کہ اسے کچھ یوم کے لئے کرایہ پر لگادیا جائے اور حاصل شدہ رقم سے اصلاح ودرستگی کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو پھر قرض حاصل کرکے درست کیا جائے۔ اگر یہ دونوں شکل ممکن نہ ہو اور عمارت حددرجہ مخدوش وناقابل استعمال ہوگئی ہو اور کہیں سے کوئی رقم نہیں مل سکتی ہو تو ایسی صورت میں اس کے کسی جز کو فروخت کرکے اس کی تعمیر واصلاح جو حددرجہ ضروری ہوکی جاسکتی ہے۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کل مخدوش ناقابل استعمال واستغلال کو فروخت کرکے اس کی جگہ دوسری جائداد اختیار کی جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کسی حصہ کو فروخت کرکے حاصل شدہ رقم سے تعمیر کی جائے تاکہ وقف باقی رہے۔

خیال رہے کہ اس مقام پر بعض فقہاء کی عبارت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ کسی حصہ کو فروخت کرکے کل کی تعمیر جائز نہیں، مگر غالباً یہ قول اس صورت میں ہے جب کہ فروخت کے علاوہ کوئی ممکنہ صورت ہو۔ چونکہ فقہاء کی دوسری عبارت میں اس کا جواز منقول ہے۔

ا۔ کل کے فروخت کی اجازت یعنی استبدال:

''ولو لم يجد القاضي من يستاجرها لم أره وخطر لي أنه يخيره بين أن يعمرها أو يردها لورثة الواقف ...وفي فتاوى قارى الهداية ما يفيد استبداله أو رد ثمنه للورثة أو للفقراء''۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: ''والحاصل أن الموقوف عليه السكنى إذا امتنع من العمارة ولم يوجد مستاجر باعها القاضي واشترى بثمنها ما يكون وقفا'' (۴،۳۷۹)۔

بعض مشائخ کے کلام سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ استبدال کا اختیار زمین میں تو ہے مگر دار اور بیت میں نہیں چونکہ مکان اور دکان کی عموماً لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے، تعمیر کے لئے پیشگی رقم لگا کر یا دے کر مکان اور دوکان کو لوگ حاصل کرلیتے ہیں۔ لیکن علامہ رملی منتقی کی عبارت کے اطلاق سے ہر ایک کے استبدال کی اجازت دیتے ہیں اور فرق کو جو زمین اور دار وبیت ودکان کے درمیان قرار دیا گیا ہے رد کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی اسے نقل کرتے ہیں:

''واعترضه الرملي، بأن كلام المنتقى المذكور شامل للأرض والبيت فالفرق بينهما غير صحيح'' (۴،۳۷۹)۔

اس سے معلوم ہوا کہ استبدال کا حق جس طرح زمین میں ہے اسی طرح کرایہ دار اور مکان جو ناقابل اجارہ وانتفاع ہو اس میں بھی ہوگا۔ اسی طرح ''منحۃ الخالق حاشیہ البحر الرائق'' میں ہے:

''فالحاصل أن الفرق بين الأرض والدار غير صحيح'' (۵،۲۲۷)۔

خیال رہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب کہ پیشگی رقم دے کر کوئی اسے حاصل کرنے کو تیار نہ ہو ورنہ تو اس کی اجازت نہ ہوگی۔ کہ ''مہما أمکن ابقاء وقف'' کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ابن نجیم کی عبارت سے واضح ہے:

''وظاهره أنه لا يجوز بيعه حيث ما أمكن إعادته'' (۵،۲۲۷)۔

اسی طرح ''بزازیہ'' کی عبارت سے بھی جواز مستنبط ہوتا ہے:

''وعن الحلواني يجوز أن يباع ويشترى بثمنه آخر ويجوز للحاكم والمتولي'' (۶،۲۷۱ على هامش الهنديه)۔

اسی طرح صاحب ''ہدایہ'' نے بھی استبدال کی اجازت دی ہے:

''وإن تعذر إعادة عينه إلى موضعه بيع وصرف ثمنه إلى المرمة صرفاً للبدل إلى مصرف المبدل'' (فتح القدير)۔

اسی عبارت سے علامہ زحیلی نے بھی استبدال کا جواز ثابت کیا ہے (الفقہ الاسلامی ۸/۲۲۲)۔

۲۔ اسی طرح جزبیچ کر اس کی رقم مرمت میں بھی صرف کرنا جائز ہے۔ ”جامع الوجیز“ میں ہے:

”وإن باع بعضه لإصلاح باقيه لخراب كله جاز“ (على هامش الهنديه ۶،۲۷۱)۔

”جامع الوجیز“ کی اس عبارت سے اس بات کی اجازت معلوم ہوتی ہے کہ مخدوش یا خراب نا قابل اجارہ واستغلال عمارت کے کسی حصہ کا فروخت کر دینا، تا کہ باقی کی مرمت واصلاح ہو کر ابقاء استغلال وانتفاع کی شکل پیدا ہو جائے تو یہ کیا جا سکتا ہے۔ علامہ شامی ”منحۃ الخالق حاشیہ البحر الرائق“ میں بھی لکھتے ہیں:

”قال في البزازية بيع عقار المسجد لمصلحة لا يجوز وإن بأمر القاضي وإن باع بعضه لإصلاح باقيه لخراب كله جاز“ (حاشيه بحر الرائق ۵،۲۲۷)۔

اس سے معلوم ہوا کہ شدید ضرورت کی صورت میں جب کہ مخدوش وقابل اصلاح وقف میں بغیر کسی حصہ کے فروخت کے تعمیر کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو تو اس کے کسی حصہ کو فروخت کر کے باقی کی تعمیر کی جاسکتی ہے تا کہ وقف کے باقی اور قابل انتفاع ہونے کی شکل پیدا ہو جائے۔

”لأن الصرف إلى العمارة ضرورة إبقاء الوقف“ (فتح القدير ۶،۲۲۲)۔

ایک اشکال اور اس کا دفاع:

صاحب ”ہدایہ“ نے جو مرمت اور اصلاح کے لئے فروخت کی اجازت دی ہے: ”وإن تعذر إعادة عينه إلى موضعه بيع وصرف ثمنه إلى المرمة“ (فتح القدير ۲۲۲)، اس پر ابن نجیم صاحب ”البحر“ نے لکھا ہے: ”وظاهره أنه لا يجوز“۔ جس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ صاحب ہدایہ کا فروخت کی اجازت دینا صحیح نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صاحب ”ہدایہ“ نے جو فروخت برائے تعمیر کی اجازت دی ہے یہ اس وقت صحیح نہیں ہے جب کہ بلا فروخت کئے اس کی تعمیر اور ابقاء کی شکل ہو۔ چنانچہ اسی وجہ سے صاحب ”البحر الرائق“ نے ”وظاهره أنه لا يجوز“ کو ”حيث أمكن إعادته“ کی قید سے مقید کیا ہے، جس کا واضح اور منقح مطلب یہ ہے کہ تعمیر واعادہ کی کوئی دیگر ممکن صورت نہ ہو، تب اجازت ہے ورنہ نہیں۔

چنانچہ ابن ہمام ”فتح القدیر“ میں لکھتے ہیں: ”وإن تعذرت إعادته بأن خرج عن الصلاحية لذلك لضعفه ونحوه باعه وصرف ثمنه في ذلك إقامة للبدل مقام المبدل“۔

اگر بلا ضرورت کے نہ ہونے کے باوجود فروخت کرنا ناجائز ہوتا تو صاحب ہدایہ کی اس عبارت کی وضاحت وتشریح کے بجائے تردید کرتے، اور کہتے ”والأصح لا يجوز مطلقاً“، لیکن ایسا نہیں کہا۔ اس سے بقید ضرورت جائز ثابت ہو گیا۔ اسی طرح ”ہندیہ“ میں جو ہے:

”إذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضها ليرمّ الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك“ (۲،۴۱۷)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تعمیر کی ضرورت ہوئی اس کا ایک حصہ فروخت کر کے تعمیر کرا لیا۔ اجارہ یا استدانہ کے ذریعہ رقم حاصل نہ کر کے ایسا کر لیا تو اس کی ضرورت نہیں، چونکہ اس طرح تو اوقاف ہی ختم ہو جائیں گے۔ یعنی بلا ضرورت شدیدہ کی صورت میں ہے۔ اور جب کوئی صورت نہ ہو تو مجبوراً کل کی بقاء کے لئے تھوڑے جز کی قربانی کی جائے گی تا کہ وقف کا انتفاع واستغلال باقی رہے۔

مسجد کی وقف زمین پر مسجد اور مصالح مسجد کے علاوہ دیگر اشیاء کا بنا درست نہیں ہے۔ گو اس وقت ضرورت نہ ہو گی مگر بعد میں جیسا کہ تجربہ شاہد ہے ضرورت ہو گی۔ اوقاف میں آئندہ مستقبل کی ضرورت کا خیال رکھا گیا ہے۔ چنانچہ مسجد کے ملبے اور انقاض کی بیع کو روک دیا گیا ہے کہ بعد میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہاں البتہ مسجد کی فاضل ضرورت سے زائد زمین پر مدرسہ کی تعمیر ہو سکتی ہے کہ مدرسہ مصالح مسجد میں داخل ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ مدرسہ مسجد کو کرایہ ادا کرے۔ مسجد کے اوقاف پر مدرسہ کو مالکانہ اختیار نہ ہو گا۔

علامہ شامی کی عبارت سے بھی مستفاد ہوتا ہے: ”الصرف هو إلى ما هو أقرب إلى العمارة كالإمام ونحوه إنما هو فيما إذا لم يكن الوقف معينا على جماعة معلومين كالمسجد والمدرسة...“، اسی طرح ایک اور عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”ثم الأهم فالأهم من المصالح والشعائر بقدر ما يقوم به الحال“ (۳۶۸/۴)۔

چنانچہ "فتاویٰ رحیمیہ" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: احاطہ مسجد کی تمام جگہ مصالح مسجد پر وقف ہوتی ہے۔ اس جگہ مدرسہ کی عمارت بنانے کے لئے اجازت دینا درست نہیں ہے (رحیمیہ ۶/ ۹۵)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کی وقف زمین پر مصالح مسجد کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بنائی جاسکتی، البتہ مصالح مسجد میں مدرسہ داخل ہے۔ جیسا کہ بعض فقہاء کی عبارتوں سے مستفاد ہوتا ہے، تو مدرسہ مسجد کی ملک رہ کر مصالح عامہ کے تحت بنایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن نجیم کی اس عبارت سے مستفاد ہے:

''أی مصالح المسجد فیدخل المؤذن والناظر؛ لأنا قدمنا أنهم من المصالح۔ وقدمنا أن الخطیب داخل تحت الإمام، لأنه إمام الجامع فتحصل به الشعائر التی تقدم فی الصرف مطلقا بعد العمارة الإمام والخطیب والمدرس والوقاد والفراش والمؤذن والناظر'' (البحر الرائق ۵،۲۲۲)۔

اسی طرح "حاشیہ منحة الخالق" میں ہے: "إنما هو عدم النفع الحاصل من انتظام مصالح المساجد بإقامة شعائرها" (البحر الرائق ۵،۲۲۱)۔

حضرت مفتی محمود صاحب کا بھی فتویٰ ہے کہ مسجد کی زمین پر مدرسہ (جو مسجد کے ملک میں ہوگا بنایا جاسکتا ہے) چنانچہ محمودیہ میں اسی قسم کے سوال ''مسجد کی زمین پر مدرسہ بنانا کیسا ہے'' کا جواب یہ ہے:

الجواب: حامداً ومصلیاً۔ جو زمین مسجد کے لئے وقف ہو اور وہاں مدرسہ بنانے کی ضرورت ہو تو مسجد کے پیسے سے تعمیر کرلیں اور اس کو مدرسہ کے واسطے کرایہ پر لے لیں۔ مدرسہ کی جانب سے مسجد کو کرایہ ادا کردیا کریں۔ یا وہ زمین کرایہ پر لے کر مدرسہ تعمیر کرلیا جائے کہ زمین مسجد کو جس کا کرایہ مدرسہ کی طرف سے ادا کردیا جایا کرے (فتاویٰ محمودیہ ۱۸/ ۲۲۰)۔

مسجد کی توسیع کی جاسکتی ہے: ''لو أن مقبرة من مقابر المسلمین عفت فبنی قوم فیها مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمین لدفن موتاهم لا یجوز لأحد أن تملکها. فإذا درست واستغنی عن الدفن فیها جاز صرفها إلی المسجد؛ لأن المسجد أیضا وقف من أوقاف المسلمین'' (عمدة القاری بحوالہ فتاوی محمودیہ ۴۸۷)۔

مزید اس مسئلہ سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ طریق مثل مقبرہ کے عام ہے اور توسع کی وجہ سے طریق کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ تو مقبرہ سے بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ کذا فی قاضی خان۔

''قوم بنوا مسجدا واحتاجوا إلی مکان لیتسع المسجد فأخذوا من الطریق وأدخلوه فی المسجد إن کان یضر ذلك بأصحاب الطریق، فلا یجوز وإلا فلا بأس'' (هندیه ۳،۲۹۲)۔

توجیہ جواز یہ ہے کہ طریق اور مسجد دونوں عام مسلمانوں کے لئے ہیں۔ اسی طرح قبرستان بھی عامة المسلمین کے لئے ہے۔ لہٰذا قبرستان کی وہ زمین جو تدفین مردہ سے زائد ہے یا قدیم قبریں ہیں تو ان پران کی جگہوں کو مسجد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ قبرستان بھی عام پر وقف ہے اور مسجد بھی عام لوگوں کی ضرورت کے لئے ہے۔

فتاویٰ محمودیہ سے بھی اس کا جواز ثابت ہوتا ہے کہ قبرستان کی قبر پرانی ہوگئی ہو، ہڈیوں کے بوسیدہ ہوجانے کا گمان ہوگیا ہو، اور وہاں قبر کی ضرورت نہ ہو تو برائے مسجد اسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اور پرانی قبروں کی جگہ جب مسجد کی اجازت ہوگی تو توسیع مسجد کی بھی اجازت ہوجائے گی کہ اوقاف مسلمین عام ضرورتوں کے ہوتے ہیں اور مسجد اور قبرستان مسلمانوں کی عام ضرورتوں میں ہے۔ "فتاویٰ محمودیہ" میں ہے:

وہاں (قبرستان کی زمین میں جب کہ وسیع ہو) مسجد بنانا شرعاً درست ہے۔ بشرطیکہ دفن موتیٰ کے لئے اس جگہ کی حاجت نہ ہو، اور استدلال میں عمدة القاری شرح بخاری کا حوالہ پیش کیا ہے ''لو أن مقبرة من مقابر المسلمین عفت الخ'' (۱،۴۸۷)۔

اسی طرح ایک اور مقام پر توسیع مسجد میں قبرستان شامل کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

اگر زمین وقف ہے اور قبریں پرانی نہیں تو بھی شامل کرنا جائز نہیں۔ اگر قبریں پرانی ہو چکی ہوں کہ میت بالکل مٹی بن گئی، نیز وہاں اور مردوں کو دفن نہ کیا جاتا ہو تو اس کو مسجد میں شامل کرنا درست ہے۔ ''ولو بلی المیت صار ترابا جاز دفن غیرہ وزرعہ والبناء علیہ قال ابن قاسم: لو أن مقبرۃ من مقابر المسلمین الخ'' (ص۴۸۹)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کی تدفین میں خلل اور پریشانی نہ ہو تو مسجد کی توسیع درست ہے۔

پرانی اور نئی قبروں میں فرق:

نئی قبر ہو تو اس میں توسیع کی اجازت نہ ہوگی۔ چونکہ فقہاء کرام نے ''صار ترابا'' میں ہی اجازت دی ہے جیسا کہ ماقبل کی عبارت سے ظاہر ہے۔

تولیت کے لئے اسلام شرط نہیں۔ لہذا ہندو راجاؤں نے یا جاگیرداروں نے جو اراضی وقف کی ہیں ان کے نگراں اور متولی وہ یا اس کے وارثین یا غیر مسلم ادارے کی تولیت ہو درست ہے۔

علامہ شامی کی ''ردالمحتار'' میں ہے: ''ویشترط للصحۃ بلوغہ وعقلہ لا حریتہ وإسلامہ لما فی الإسعاف'' (۳۸۱،۴)، ''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے: ''ولا تشترط الحریۃ والإسلام للصحۃ'' (۲،۴۰۸)۔

اسی طرح ابن نجیم البحر الرائق شرح کنز الدقائق'' میں تولیت کے لئے اسلام اور حریت کی شرط نہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ولا تشترط الحریۃ والإسلام للصحۃ'' (ص۲۲۵)، البتہ بلوغ اور عقل شرط ہے۔ ''ویشترط للصحۃ بلوغہ وعقلہ'' (ص۲۲۴)، البتہ ''امداد الفتاویٰ'' میں اسلام کو تولیت کے لئے شرط قرار دیا ہے۔

اکابر کے فتاویٰ سے اس کی تائید:

مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ نے بھی (ضرورت کی بنا پر جب کہ مسلمان سے ضیاع کا خوف ہو) غیر مسلم کا متولی ہونا درست قرار دیا ہے (دیکھئے: سوال نمبر ۵۶۳۔ ۱۵/ ۳۰۲)۔

☆☆☆

غیر آباد مساجد سے متعلق احکام

مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری[1]

اوقاف کے سلسلہ میں حضرات فقہاء کے کلام کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچند شرائط انہیں فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے، اب وہ شرائط کیا ہیں؟ تو اس سلسلہ میں علامہ ابن نجیم علیہ الرحمہ نے ''الاشباہ والنظائر'' میں اور علامہ شامی نے ''ردالمحتار'' میں شرح وبسط سے کلام کیا ہے جن کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

(۱) اگر واقف نے وقف کے دوران ہی اپنے لئے یا کسی دوسرے شخص کے لئے استبدال کی شرط رکھی ہو تو صحیح قول کے مطابق بلاشبہ استبدال جائز ہے۔

''واعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه: الأول أن يشرطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح، وقيل: اتفاقا'' (رد المحتار ۴۲۴/۳، وهكذا فى الفتاوى العالمگيريه ۳۹۹/۲)۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے استبدال کی تو شرط نہ لگائی ہو، لیکن وہ وقف بالکل ویران ہو کر رہ گیا ہو اور اس سے منتفع ہونے کی امید نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی اصح قول کے مطابق استبدال جائز ہے۔

''والثاني أن لا يشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية، بأن لا يحصل منه شئ أصلا أو لا يفي بمؤنته، فهو أيضا جائز على الصحيح إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه'' (ردالمحتار ۴۲۴/۳)۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ نہ واقف نے استبدال کی کوئی شرط لگائی اور نہ ہی وقف ویران ہوا ہے، بلکہ اس کو باقی رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے تو اس صورت میں اصح اور مختار قول یہ ہے کہ استبدال جائز نہیں ہے۔

''والثالث أن لا يشرطه أيضا ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعا ونفعا وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار كذا حرره العلامة قنالى زاده فى رسالته الموضوعة فى الاستبدال وأطنب فيها عليه الاستبدال وهو مأخوذ من الفتح، الخ'' (رد المحتار ۴۲۴/۳)۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ واقف کے بعد اراضی موقوفہ کو کسی غاصب نے قبضہ کر کے ایسا تصرف کر دیا کہ وہ اراضی ناقابل کاشت ہوگئی، یا غاصب نے اس کے وقف میں ہونے کا انکار کر دیا اور اس پر متولی کے پاس کوئی بینہ نہیں ہے، لیکن غاصب قیمت دینا چاہتا ہے تو ان صورتوں میں بھی متولی کے لئے جائز ہے کہ غاصب سے قیمت لے کر ان اراضی موقوفہ کے بدلے میں دوسری جگہ زمین خرید لے۔

''فى رد المحتار نقلا عن الأشباه والنظائر (قولها إلا فى أربع) الأولى لو شرطه الواقف، الثانية إذا غصبه غاصب وأجرى عليه الماء حتى صار بحراً فيضمن القيمة ويشترى المتولى بها أرضا بدلا، الثالثة أن يجحده الغاصب ولا بينة أى وأراد دفع القيمة فللمتولى أخذها ويشترى بها بدلا'' (رد المحتار ۴۲۶/۳، الاشباه والنظائر ۱۰۳ تا ۱۰۴، فتاوى خانيه ۳۰۰/۳، فتاوى بزازيه ۲۵۶/۳)۔

(۵) پانچویں صورت یہ ہے کہ اراضی موقوفہ کو کوئی شخص لینے کا خواہش مند ہے، اور وہ اس کے بدلے اس سے بہتر اور زیادہ پیداوار والی زمین دینا چاہتا ہے تو حضرت امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ کے نزدیک اس صورت میں بھی استبدال جائز ہے، اور حضرات فقہاء نے اس قول کو مفتی بہ بھی قرار دیا ہے۔

---

[1] استاذ مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھرواڑہ دربھنگہ۔

''فی الاشباہ: الرابعة أن یرغب إنسان فیه ببدل أكثر غلة وأحسن وصفا فیجوز علی قول أبی یوسف و علیه الفتوی کما فی فتاویٰ قاری الهدایة'' (الاشباہ والنظائر ۱۰۳ تا ۱۰۴، و مثله فی رد المحتار ۳، ۴۲۶)۔

مندرجہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرات فقہاء نے لوگوں کے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھ کر چند شرائط کے ساتھ استبدال کو جائز قرار دیا ہے اور ساتھ ہی قول جواز کے مفتی بہ ہونے کی تصریح فرمائی ہے، علامہ ابن الہمام نے بھی مختصراً استبدال کے جواز پر کلام کیا ہے، لکھتے ہیں:

''والحاصل أن الاستبدال إما عن شرط الاستبدال أولا عن شرطه فإن كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف علیهم فینبغی أن لا یجوز؛ لأن الواجب إبقاء الوقف علی ماكان علیه دون زیادة. ولأنه لاموجب لتجویزه؛ لأن الموجب فی الأول الشرط وفی الثانی الضرورة ولا ضرورة فی هذا (فی الثالث) إذ لا تجب زیادة بل تبقیه کما کان (قال ابن عابدین) أقول ما قاله هذا المحقق هو الحق الصواب'' (رد المحتار ۳، ۴۲۷ بحواله فتح القدیر)۔

لیکن صاحب ''شرح وقایہ'' نے کتاب الوقف میں استبدال کے سلسلہ میں حضرات صاحبین کا اختلاف درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ونحن لا نفتی به فقد شاهدنا فی الاستبدال من الفساد وما لا یعد لا یحصی، فإن ظلمة القضاة جعلوه حیلة إلی إبطال أكثر أوقاف المسلمین وفعلوا ما فعلوا'' (شرح وقایة ۲، ۲۵۳ تا ۲۵۴)۔

(ہم اس کا فتوی نہیں دیتے اس لئے کہ ہم نے استبدال کی صورت میں جو فساد دیکھا ہے اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا، ظالم قاضیوں نے اس کو اوقاف کے ختم کرنے کا ایک بہانہ بنالیا ہے اور پھر جو سمجھ میں آیا کیا)۔

مندرجہ سطور میں صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے استبدال کی صورت میں جن مفسدات کی طرف اشارہ کیا ہے، ان مفسدات کی پیش بندی کے لئے حضرات فقہاء نے آٹھ شرطوں کا ذکر کیا ہے:

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ وقف ویران ہوگیا ہو اور اس کی آمدنی اور اس کا نفع بالکل ختم ہوگیا ہو۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اس جگہ وقف کی کوئی دوسری بلند جگہ نہ ہو کہ جہاں دوسری تعمیر ہوسکے۔

(۳) وقف کی بیع اور اس کا استبدال غبن فاحش (بہت زیادہ خسارہ) کے ساتھ نہ ہو۔

(۴) بدلنے والا قاضی علم وعمل دونوں کا جامع ہو۔

(۵) اراضی موقوفہ کا تبادلہ دوسری زمین ہی سے ہو، دراہم ودنانیر، روپئے پیسے سے نہ ہو، اس لئے کہ اس صورت میں خطرہ ہے کہ کہیں بدلنے والے لوگ استبدال سے پہلے ہی روپے کو ہضم نہ کرجائیں۔

(۶) وقف کا تبادلہ ایسے شخص سے نہ کیا جائے جس کی شرعاً شہادت قبول نہیں ہوتی ہے، اور نہ ایسے شخص سے کیا جائے جس کا دین (قرض) بدلنے والے پر ہو، کیونکہ خطرہ ہے کہ بدلنے والا کہیں وقف کو دَین کے عوض نہ فروخت کردے، حالانکہ حضرت امام ابویوسف علیہ الرحمہ نے وقف کی بیع سامان کے عوض کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، پھر وہ کیونکر دَین کے عوض وقف کے فروخت کرنے کا فتویٰ دیں گے۔

(۷) ساتویں شرط یہ ہے کہ ایک وقف کا تبادلہ دوسرے وقف سے ایک ہی محلہ کے اندر کیا جائے، اور اگر دوسرے محلہ کے اندر کیا جائے تو شرط یہ ہے کہ وہ محلہ پہلے محلہ سے بہتر ہو، اگر بہتر نہ ہو تو پھر تبادلہ جائز نہیں ہے۔

(۸) آٹھویں شرط علامہ قنالی زادہ نے یہ ذکر کی ہے کہ بدل اور مبدل منہ ایک ہی جنس سے ہو، لیکن علامہ شامی فرماتے ہیں کہ بظاہر اس شرط کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جہاں تبادلہ کی صورت میں خرچ کم ہو اور آمدنی زیادہ آئے تو یہ اچھی بات ہے، یاد رہے کہ حضرات فقہاء نے جس طرح بعض صورتوں میں واقف کو استبدال کی اجازت دی ہے اسی طرح قاضی کو بھی اجازت دی ہے لیکن صاحب فتاویٰ قاضی خاں کا کلام قاضی کے سلسلہ میں مختلف ہے۔

ایک جگہ انہوں نے بغیر واقف کی شرط کے مطلقاً قاضی کو استبدال کی اجازت دی ہے کہ جہاں وہ مصلحت دیکھے وقف کا استبدال کرے، لیکن دوسری جگہ

مطلقاً منع کیا ہے، اگر چہ وقف ویران ہی کیوں نہ ہوجائے۔

لیکن مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ بغیر کسی شرط کے قاضی کے لئے استبدال کی شرعاً اجازت ہے جب کہ وہ مندرجہ بالا شرطوں کا لحاظ کر کے استبدال کرے، البتہ فقہ کی مشہور کتب ''اسعاف'' سے نقل کرتے ہوئے ''فتاویٰ عالمگیری'' اور ''ردالمحتار'' میں لکھا ہے کہ قاضی علم وعمل دونوں کا پیکر ہو، تاکہ ظالم قاضیوں کی طرف سے اوقاف مسلمین کے ابطال کا جو خطرہ اور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے وہ سامنے نہ آئے۔

یہاں پر یہ بات ملحوظ رہے کہ مساجد ومقابر کے اوقاف کا تبادلہ اگر چہ وہ ویران ہی کیوں نہ ہوجائیں شرعاً جائز نہیں ہے۔

''سئل القاضی الإمام شمس الائمة محمود الأوزجندی عن مسجد لم یبق له قوم و خرب ما حوله واستغنی الناس عنه هل یجوز جعله مقبرة قال: لا. وسئل هو أیضا عن المقبرة فی القریٰ إذا اندرست ولم یبق فیها أثر الموتیٰ لا العظم الخ'' (فتاوی هندیه ۲،۴۷۱،۲،۴۷۰، ۵۴-۴۵۵، هدایه ۲،۶۴۵، المبسوط ۱۲،۶۴۵، بزازیه ۳،۲۷۰)۔

الف۔ ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسری جگہ پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے، ایسے مراحل ونوازل کے مواقع کے سلسلہ میں صاحب ''فتاویٰ خانیہ'' علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''قال إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستغلال والقیم یجد بثمنها أرضا أخریٰ هی أنفع للفقراء وأکثر ریعاً کان له أن یبیع هذه الأرض ویشتری بثمنها أرضا أخریٰ جوّز رحمه الله تعالی استبدال الأرض بالأرض'' (الفتاوی الخانیه ۳،۳۰۰)۔

''وقال شمس الأئمة السرخسی فی المبسوط: ومن ذلك أنه إذا شرط فی الوقف أن یستبدل به أرضا أخری إذا شاء ذلك فهو جائز عند أبی یوسف وعند محمد وهو قول أهل البصرة الوقف جائز و الشرط باطل؛ لأن هذا الشرط لا یوثر فی المنع من زواله والوقف یتم بذلك ولا ینعدم به معنی التابید فی أصل الوقف فیتم الوقف بشروطه ویبقی الاستبدال شرطا فاسدا فیکون باطلا فی نفسه کالمسجد إذا شرط الاستبدال به أو شرط أن یصلی فیه قوم دون قوم فالشرط باطل واتخاذ المسجد صحیح فهذا مثله'' (المبسوط ۴۱،۱۲، ۴۲)۔

ب۔ ویران اوقاف کو حکومت کے بجائے کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض میں دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری رکھنے کی شکل شرعاً اختیار کی جاسکتی ہے، قال ابن عابدین الشامی فی ''ردالمحتار'':

''فلو استبدل الحانوت بأرض تزرع ویحصل منها غلة قدر أجرة الحانوت کان أحسن؛ لأن الأرض أدوم وأبقی وأغنی عن کافة الترمیم والتعمیر بخلاف الموقوفة للسکن لظهور أن قصد الواقف الانتفاع بالسکن'' (ردالمحتار ۳،۴۲۵)۔

حضرات فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد ومقابر موقوفہ اور دیگر اوقاف میں فرق ہے، مساجد ومقابر موقوفہ کا تو تبادلہ کسی حال میں جائز نہیں ہے، البتہ دیگر عام ویران اوقاف کا تبادلہ شرعاً کیا جاسکتا ہے، نیز مسجد ومدرسہ وحوض وغیرہ کے اوقاف کا حکم عام اوقاف کا ہے کہ ان کا تبادلہ شرائط استبدال کے ساتھ جائز ہے۔

''قال: ومن اتخذ أرضه مسجدا لم یکن له أن یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه؛ لأنه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالی الخ'' (هدایه ۲،۶۴۵)۔

''والظاهر أن حکم عمارة أوقاف المسجد والحوض والبئر وأمثالها حکم الوقف علی الفقراء'' (رد المحتار ۳،۴۱۹)۔

ویران وناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

''(قوله ويجعل آخر لجهة قربة لا تنقطع) يعني لابد أن ينص على التابيد عند محمد خلافا لأبي يوسف'' (رد المحتار ۴، ۳۹۹)۔

''(شرط الواقف كنص الشارع)'' (رد المحتار ۴، ۴۵۶) ''مراعاة غرض الواقفين واجبة'' (رد المحتار ۴، ۴۶۴)۔

جن مقامات پر مساجد و مدارس یا مقابر کے بڑے بڑے اوقاف ہیں، اور مسلمانوں کی آبادی وہاں بہت معمولی رہ گئی ہے، مثلاً ایک مسجد ہے، اس کے لئے بہت سی زمینیں اور مکانات وقف ہیں، مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے زیادہ ہے تو مناسب یہ ہے کہ ایک وقف کا سامان دوسرے وقف میں منتقل کرنے کے مسئلہ میں امام ابوشجاع اور امام حلوانی ؒ کے فتوی کی اتباع کی جائے کہ اس مسئلہ میں ان کے نزدیک مسجد یا حوض کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، خصوصاً ہمارے زمانے میں، اس لئے کہ مسجد، سرائے یا حوض وغیرہ کو اگر منتقل نہ کیا جائے تو اس کے شکستہ حصے چور اور غارت گر اٹھالے جائیں گے، جیسا کہ مشاہدہ و تجربہ ہے، نیز خود اوقاف کے نگراں وغیرہ اسے کھا جائیں گے، اور منتقل نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری مسجد بھی جس کو اس کی ضرورت ہے ویران ہوجائے گی (اس کی تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۳، ۴۰۶، ۴۰۷، ہدایہ ۲، ۶۴۳، ۶۴۴، المبسوط ۱۲، ۴۲ تا ۴۳، فتاوی ہندیہ ۲، ۴۸۱۔ بدائع الصنائع ۶، ۲۱۸، ۲۲۱)۔

مسجد کی فاضل رقم کے سلسلے میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا موقف:

سوال نمبر (۷۱۹) کے جواب میں فرماتے ہیں:

''الجواب: في الدر المختار، ومثله حشيش المسجد و حصيره مع الاستغناء عنها، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه الخ. في رد المحتار لف ونشر مرتب فظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه. وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (۳، ۵۷۴)۔

''قلت وهذه الرواية وإن كانت منقولة في صورة خراب المسجد وغيره لكن ما كان مبنى الحكم الاستغناء كان الحكم عاما وإن لم يخرب وهذا ظاهر عندي''۔

اس سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں اس آمدنی کو دوسری مساجد میں بھی صرف کر سکتے ہیں لیکن ترتیب سے کہ اول اقرب مساجد میں اور اگر اس میں ضرورت نہ ہو تو پھر اسی طرح اقرب فالاقرب میں (امداد الفتاوی ۲ر ۵۹۳ تا ۵۹۴، احسن الفتاوی ۶ر ۴۲۶ تا ۴۲۷، رد المحتار مع الدر المختار ۳ر ۲۰۷)۔

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کا موقف:

اسی طرح کے سوال کے جواب نمبر (۲۴۳) میں آپ کے فتوی کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

''مذکورہ بالا تحقیق کی بنا پر ایسی حالت میں کہ مسجد کے اموال کثیرہ جمع ہوں اور مسجد کو نہ فی الحال ان کی حاجت ہو اور نہ بظن غالب فی المآل، اور ان اموال کے اسی طرح جمع رہنے میں ضائع ہوجانے اور متغلبین کے کھا اڑا جانے کا اندیشہ ہو تو یہ زائد از حاجت اموال جمع شدہ کسی دوسری محتاج مسجد میں خرچ ہو سکتے ہیں، اسی طرح کسی ایسے دینی مدرسہ میں جو علوم شریعت تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم دیتا ہو خرچ کرنا جائز ہے'' (کفایت المفتی ۷ر ۲۷۵، مسلم مع النووی ۱ر ۴۲۹۔ باب نقض الکعبۃ و بناءہا)۔

الف۔ مسجد کی اراضی موقوفہ پر جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہے مسلمانوں کے لئے کوئی دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا شرعی نقطہ نظر سے ممنوع و حرام ہے۔

''سئل القاضي الامام شمس الائمة محمود الاوزجندي عن مسجد لم يبق له قوم و خرب ما حوله واستغنى الناس عنه هل يجوز جعله مقبرة قال: لا. وسئل هو أيضا عن المقبرة في القرى إذا اندرست ولم يبق فيها أثر الموتى لا العظم ولا غيره هل يجوز زرعها واستغلالها قال: لا، ولها حكم المقبرة كذا في المحيط'' (فتاوى هنديه ۲، ۴۷۰ تا ۴۷۱)۔

ب۔ مسجد کے اوقاف کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی گنجائش ہے جب کہ واقف نے ان زمینوں اور مکانات کو مسجد ہی کے لئے

وقف کیا تھا، اسی طرح کے سوال کے جواب نمبر (۲۵۹) میں مفتی کفایت اللہ صاحب قلمبند فرماتے ہیں: جب کہ مسجد کی جمع شدہ رقم مسجد کی حاجت سے زیادہ ہو اور آئندہ بھی مسجد کو بظن غالب اس رقم کی حاجت پڑنے کا احتمال نہ ہو تو دوسری محتاج مسجد پر یہ رقم صرف کی جاسکتی ہے، اس اجازت میں وہ مقدار شامل ہوگی جس سے مسجد حالاً و مآلاً مستغنی ہو، واللہ اعلم (کفایت المفتی ۷/ ۲۹۷)۔

اور جواب نمبر (۲۵۶) میں ہے کہ جب مسجد کی آمدنی اس قدر کثیر ہو کہ مسجد کو اس کی نہ فی الحال حاجت ہو اور نہ فی المآل، تو ایسی حالت میں جمع شدہ زائد رقم کو کسی دوسری محتاج مسجد میں یا دینی تعلیم میں خرچ کیا جاسکتا ہے (کفایت المفتی ۷/ ۳۰۰)۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں: رہا یہ کہ وہ مصالح مسجد سے بچ جاتا ہے اور اس کے جمع رکھنے میں احتمال ضیاع کا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس فاضل آمدنی کو دوسرے مساجد کے مصالح پر صرف کرنا چاہئے جو مسجد موقوف علیہ سے قریب ہو اور اگر اس مسجد قریب میں بھی استغناء ہو تو پھر اس کے بعد جو مساجد قریب ہوں حتی کہ دوسری بلاد ہند کی مساجد تک اس کی محل ہیں (امداد الفتاوی ۲/ ۵۹۲، فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۸۴ تا ۱۸۷)۔

''عن عائشة زوج النبي ﷺ أنها قالت: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لو لا أن قومك حديثو عهد بجاهلية أو قال: بكفر لأنفقت كنز الكعبة في سبيل الله، ولجعلت بابها بالأرض ولأدخلت فيها من الحجر'' (مسلم ۱/ ۴۲۹ تا ۴۳۰)۔

(حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر تمہاری قوم جدید الاسلام نہ ہوتی، یا فرمایا کہ اگر وہ کفر کے زمانہ سے قریب نہ ہوتے تو میں یقینا کعبہ کا خزانہ راہ خدا میں خرچ کردیتا اور میں کعبہ کو از سر نو تعمیر کرتا اور حطیم کا حصہ اندر داخل کردیتا اور اس کے دو دروازے کردیتا کہ ایک سے لوگ داخل ہوں اور دوسرے سے باہر نکلیں اور دروازہ کو زمین سے ملا دیتا)۔

علامہ نووی اس حدیث کی توضیح وتشریح اس طرح فرماتے ہیں: ''وفيه دليل لجواز إنفاق كنز الكعبة ونذورها الفاضلة عن مصالحها في سبيل الله... ومذهبنا أن الفاضل من وقف مسجد أو غيره لا يصرف في مصالح مسجد آخر ولا غيره بل يحفظ دائماً للمكان الموقوف عليه الذي فضل منه فربما احتاج إليه والله أعلم'' (نووی علی هامش المسلم ۱/ ۴۲۹)۔

خلاصہ یہ کہ متقدمین کے فتویٰ سے ہٹ کر متاخرین محقق علماء کا دوسری رائے قائم کرنے کی علت یہ ہے کہ وقف اپنے مقاصد کو پورا نہیں کررہا ہے، اور اگر اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو غاصبین اس پر قبضہ کرلیں گے، درانحالیکہ دوسری مساجد کو ضرورت ہے، پس اگر اس ویران مسجد کے سامان دوسری ضرورت مند مساجد کو منتقل کرنا ممنوع قرار دیا جائے تو اس فتویٰ کے ذریعہ دوسری مساجد کو ویران کرنا لازم آئے گا، لہذا مصلحت شرع اس کی متقاضی ہے کہ اس انتقال کو درست قرار دیا جائے۔

جن اوقاف کی آمدنی ان کے لئے متعین مصارف سے بہت زیادہ ہے، جو سال بسال جمع ہوکر ایک بڑا سرمایہ بنتی جارہی ہے، جس کی طویل عرصہ تک حفاظت ایک دشوار مسئلہ، بلکہ خالی از خطرہ نہیں، یہ خطرہ حکومت کی دست درازی کا بھی ہے اور منتظمین وغیرہ کی طرف سے بھی، اور نہ ہی روزمرہ کی ضروریات کے اندر اسکے صرف کو سوچا جاسکتا ہے اور نہ آئندہ حفاظت یا اصلاح ومرمت وغیرہ کے کاموں کے لئے، تو ایسے مراحل پر ایسی فاضل آمدنی کا دوسرے مواقع یعنی یتیم خانہ، مسافر خانہ، ہسپتال، دار المطالعہ ولائبریری، خانقاہ ودار الاصلاح، مدارس اسلامیہ، نادار بچوں کی کفالت وتعلیم، نادار غیر مستطیع عصری علوم حاصل کرنے والے اسٹوڈنٹ (Student) اور دیگر رفاہی کاموں پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب (۲۶۶) میں رقمطراز ہیں: مذکورہ سوال رقوم جو اوقاف متعلقہ مساجد کی آمدنی میں سے ضروریات مساجد پوری ہونے کے بعد فاضل بچی ہوئی ہیں اور بظاہر مساجد کو ان رقوم کی نہ فی الحال حاجت ہے اور نہ آئندہ احتیاج کا خطرہ ہے، ایسی رقوم سے مساجد میں مدارس دینیہ کا اجراء یا دینی ضرورتوں کے ماتحت دار المطالعہ کا قیام جائز ہے، مسجد یا اس کی متعلقہ وقف عمارت میں تعلیم کا اجراء مسجد کی تعمیر معنوی میں داخل ہے اور تعمیر مسجد شعائر اللہ میں شمار کی گئی ہے اور مصرف وقف مسجد میں شامل ہے، ایسی رقوم کو مولود شریف یا تعزیہ یا مرثیہ خوانی پر خرچ کرنا جائز نہیں، اور کسی انجمن کی دینی ضروریات میں دینا اگر جائز بھی ہو، تاہم تعلیم پر خرچ کرنا بہتر اور افضل ہے (کفایت المفتی ۷/ ۳۰۱، ۳۰۲)۔

جواب (۲۶۷): مساجد کے اوقاف کی آمدنی دراصل تو مساجد کے مصارف کے لئے ہوتی ہے، مگر جب آمدنی تمام مصارف پورے کرنے کے بعد بھی فاضل بچ جائے اور مساجد کو اس کی فی الحال بھی حاجت نہ ہو اور آئندہ حاجت پڑنے کا خوف بھی نہ ہو تو ایسی فاضل آمدنی نادار اور غیر مستطیع دینی طلبہ کو امدادی

وظائف میں دی جاسکتی ہے، نیز جائز اور مباح علوم معاشیہ کے نادار اور غیر مستطیع طلبہ کو بھی دینا جائز ہے، دینی علوم کے نادار طلبہ زیادہ مستحق ہیں (کفایت المفتی ۷/ ۳۰۲)۔

الف۔ اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں خرچ کرنا جائز ہے۔

ب۔ دیگر ملی، دینی وعلمی کاموں اور مساجد اور قبرستان کی احاطہ بندی، دار الشوریٰ، دالان وچوپال کی تعمیر ومرمت پر، مفلس وقلاش کے مکان کی تعمیر پر، مفلس ونادار بیوہ کی لڑکیوں کی شادی وبیماری پر اوقاف کی فاضل رقم کو خرچ کیا جاسکتا ہے۔

کم منفعت بخش وقف کی بیع:

اگر کوئی وقف اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہے، مثلاً کسی مسجد یا مدرسے پر کوئی مکان وقف ہے جو محلہ کے اندر واقع ہے اس سے معمولی کرایہ ملتا ہے جس سے مسجد یا مدرسے کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں اور اگر اس کو فروخت کر کے کسی تجارتی مقام پر کوئی دکان خرید لی جائے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی مکان موقوفہ کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہوگی، مگر اس کے باوجود اس مکان موقوفہ یا مذکورہ اوقاف کو فروخت کر کے کسی دوسرے تجارتی مقام ومارکیٹ پر دکان خریدنا، مکان خریدنا، شرعی نقطہ نظر سے جائز نہیں ہے، اگر چہ اس شکل میں وقف کی آمدنی کے زیادہ ہوجانے کی امید ہی کیوں نہ ہو۔

''وبیع أرض الوقف لا یجوز فکذلك ما کان تبعا له'' (الفتاوی الخانیہ ۳،۳۱۰)۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا کہ میرے والد ماجد حضرت عمرؓ کو خیبر میں ایک قطعہ زمین ملی تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے خیبر میں ایک قطعہ زمین ملی ہے، وہ نہایت نفیس اور قیمتی ہے اس سے بہتر کوئی مالیت میں نے نہیں پائی، آپ اس کے بارے میں مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو ایسا کرو کہ اصل زمین کو محفوظ (یعنی وقف) کردو اور اس کی پیداوار اور آمدنی کو صدقہ قرار دے دو۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کو اسی طرح وقف کردیا اور فی سبیل اللہ صدقہ قرار دیدیا اور طے فرمادیا کہ یہ زمین نہ کبھی بیچی جائے، نہ ہبہ کی جائے، نہ اس میں وراثت جاری کی جائے، اور اس کی آمدنی اللہ کے واسطے خرچ ہو، فقیروں، مسکینوں اور اہل قرابت پر اور غلاموں کو آزاد کرانے کی مد میں اور جہاد کے سلسلہ میں اور مسافروں اور مہمانوں کی خدمت میں اور جو شخص اس کا متولی اور منتظم ہو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ مناسب حد تک اس میں سے خود کھائے اور کھلائے، بشرطیکہ اس کے ذریعہ مال جوڑنے اور مالدار بننے والا نہ ہو۔

''عن نافع عن ابن عمر... قال: إن شئت حبست أصلها وتصدقت بها قال: فتصدق بها عمر أنه لا یباع أصلها ولا تباع ولا تورث ولا توهب قال: فتصدق عمر فی الفقراء، وفی القربی، وفی الرقاب، وفی سبیل الله، وابن السبیل والضیف ولا جناح علی من ولیها أن یأکل منها بالمعروف أو یطعم صدیقا غیر متمول فیه'' (بخاری ۱،۳۸۸ تا ۳۸۹، مسلم ۲،۴۱، ترمذی ۱،۲۵۶، نسائی ۲،۱۲۶، ابوداؤد ۲،۲۹۸، ابن ماجه ۲،۱۷۳، فتح الباری ۵،۳۶۸ تا ۳۷۴) تشریح وتوضیح کے لئے دیکھئے (شرح معانی الآثار ۲،۲۲۹ تا ۲۳۰، الاشباه والنظائر ۱۰۳ تا ۱۰۹)۔

یہ حدیث وقف کے باب میں اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، ۷ھ میں خیبر جنگ کے نتیجہ میں فتح ہوا تھا، وہاں کی زمین عام طور سے بڑی زرخیز تھی، فتح کے بعد اس کی زمینوں کا تقریباً نصف حصہ رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین میں تقسیم کردیا، حضرت عمرؓ کے حصہ میں جو قطعہ زمین آیا انہوں نے محسوس کیا کہ میری ساری مالیت میں وہ نہایت قیمتی اور گرانقدر چیز ہے، انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے بارے میں رہنمائی چاہی تو آپ نے ان کو وقف کرنے کا مشورہ دیا تاکہ وہ صدقہ جاریہ رہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کو وقف کردیا اور اس کے مصارف بھی متعین فرمادیئے، جمہور فقہاء نے وقف مسجد کی زمین کی بیع ناجائز ہونے اور مالک کی ملکیت میں دوبارہ نہ لوٹنے پر حضرت عمرؓ کے اس وقف کے واقعہ سے استدلال کیا ہے جو اوپر مذکور ہوچکی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے، فقہاء مالکیہ میں سے علامہ مواق رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''ابن عرفة من المدونة وغیرها، یمنع بیع ما خرب من ربع الحبس مطلقا... وعبارة الرسالة، ولا یباع الحبس

وإن خرب ... وفي الطرر عن ابن عبد الغفور: لا يجوز بيع مواضع المساجد الخربة، لأنها وقف، ولا بأس بيع نقضها''۔

ابن عرفہ مدونہ وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ وقف مکان کی بیع مطلقاً جائز نہیں، اگر چہ وہ ویران ہوجائے ...... اور رسالہ میں یہ عبارت درج ہے کہ وقف کی بیع جائز نہیں، اگر چہ وہ ویران ہوجائے ..... طرر میں ابن عبدالغفور سے یہ عبارت منقول ہے کہ ویران مساجد کی جگہوں کو بیچنا وقف ہونے کی بنا پر جائز نہیں، البتہ ان کا ملبہ بیچنا جائز ہے (التاج والاکلیل للمواق، حاشیہ حطاب ۶/ ۴۲، بحوالہ فقہی مقالات ۱/ ۲۴۱ مولانا محمد تقی عثمانی زمزم بکڈپو، دیوبند)۔

فقہاء شوافع میں سے امام خطیب شربینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ولو انهدم مسجد، وتعذرت إعادته أوتعطل بخراب البلد مثلا، لم يعد ملكا ولم يبع بحال، كالعبد إذا عتق...ولم ينقض إن لم يخف عليه لإمكان الصلاة فيه ولإمكان عوده كما كان ...فإن خيف عليه نقض، وبنى الحاكم بنقضه مسجداً آخر إن رأى ذلك وإلا حفظه...''۔

اگر مسجد منہدم ہوجائے اور اس کو دوبارہ درست کرنا ممکن نہ ہو یا اس بستی کے اجڑ جانے سے وہ مسجد بھی ویران ہوجائے تب بھی وہ مسجد مالک کی ملکیت میں نہیں آئے گی اور نہ اس کو بیچنا جائز ہوگا، جیسا کہ غلام کو آزاد کردینے کے بعد اس کی بیع حرام ہوجاتی ہے، پھر اگر اس مسجد پر غیر مسلموں کے قبضے کا خوف نہ ہو تو اس کو منہدم نہ کیا جائے، بلکہ اس کو اپنی حالت پر برقرار رکھا جائے اس لئے کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ مسلمان دوبارہ یہاں آکر آباد ہوجائیں اور اس مسجد کو دوبارہ زندہ کردیں...... البتہ اگر غیر مسلموں کے تسلط اور قبضہ کا خوف ہو تو اس صورت میں حاکم وقت مناسب سمجھے تو اس مسجد کو ختم کردے اور اس کے بدلے میں دوسری جگہ مسجد بنادے اور یہ دوسری مسجد پہلی مسجد کے قریب ہونا زیادہ بہتر ہے اور اگر حاکم وقت اس مسجد کو توڑنا اور مسمار کرنا مناسب نہ سمجھے تو پھر اس کی حفاظت کرے (مغنی المحتاج ۲/ ۳۹۲)۔

فقہاء حنابلہ میں سے علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''وإن لم تتعطل مصلحة الوقف بالكلية، لكن قلت: وكان غيره أنفع منه وأكثر ردا على أهل الوقف لم يجز بيعه؛ لأن الأصل تحريم البيع وانما أبيح للضرورة صيانة لمقصود الوقف عن الضياع مع إمكان تحصيله ومع الانتفاع وإن قل ما يضيع المقصود''۔

(اگر وقف کی مصلحت اور منفعت بالکلیہ ختم نہ ہوئی ہو، لیکن اس میں کمی آگئی ہو اور دوسری صورت میں اہل وقف کے لئے زیادہ نفع بخش اور بہتر ہے، تب بھی اس وقف کی بیع جائز نہیں، اس لئے کہ وقف میں اصل بیع کی حرمت ہی ہے، لیکن وقف کی مصلحت کے لئے اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ضرورت کے وقت بیع اس وقت جائز ہے، جبکہ بیع کا مقصد بھی تحصیل مقصود ہو، لیکن اگر موجودہ حالت میں وقف کی بیع کے بغیر ہی اس سے نفع اٹھانا ممکن ہو، اگر چہ وہ نفع قلیل مقدار میں ہو تو اس صورت میں مقصود وقف بالکلیہ ختم ہونے کی وجہ سے اس وقف کی بیع جائز نہیں ہوگی) (المغنی لابن قدامہ ۶/ ۲۲۷)۔

میرے نزدیک مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق اس سلسلے میں جمہور کا مسلک راجح ہے، لہذا کسی مسجد کے شرعی مسجد بن جانے کے بعد یا وقف کے شرعی وقف بن جانے کے بعد اس کو بیچنا جائز نہیں، اگر مسجد کو بیچنے کی اجازت دیدی جائے تو پھر لوگ مسجدوں کو بھی گرجا گھر کی طرح جب چاہیں گے بیچ لیں گے اور مسجدیں ایک تجارتی سامان کی حیثیت اختیار کرلیں گی۔

جن کے اوقاف کے مصارف ختم ہوچکے ہیں مثلاً کوئی جاگیر کسی خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی وہ خاندان ختم ہوگیا یا اس کے افراد دوسری جگہ منتقل ہوگئے، یا کسی مسجد ومدرسہ کے لئے وقف تھا اور اب نہ وہ مسجد ہے نہ مدرسہ، تو ان اوقاف کی آمدنی کا مصرف یہ ہے کہ جس قسم کے اوقاف کی آمدنی ہے اس قسم کے دیگر اوقاف کے مصارف میں آمدنی کی اس رقم کو خرچ کردیا جائے۔

جن فقراء پر وقف کی گئی تھی اب بالفعل وہ لوگ ناپید ہیں تو دوسرے فقراء پر اس رقم کو خرچ کرنا چاہئے، اگر موقوف علیہ فقراء کسی دوسرے گاؤں میں منتقل ہوگئے ہیں تو رقم اس فقراء تک پہنچانے کی سعی بلیغ کرنی چاہئے، مسجد کے انہدام کے بعد اس کی آمدنی دوسری مسجد پر اور مدرسہ کے ختم ہوجانے پر اس کے وقف کی

آمدنی دوسرے دینی مدارس اسلامیہ پر خرچ کرنی چاہئے، اراضی موقوفہ کی بیع کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، ہاں اراضی موقوفہ کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے یا مکان بنوا کر کرایہ دار کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے۔

"عن ابن عمر أن عمر وجد مالاً بخيبر فأتى النبي ﷺ فأخبره فقال: إن شئت تصدقت بها فتصدق بها في الفقراء والمساكين وذي القربى والضيف" (بخاری ۱/۳۸۹، الاشباہ والنظائر ۱۰۲ تا ۱۰۹، ہدایہ ۲/۶۳۶ تا ۶۳۹، شرح وقایہ ۲/۳۵۰ تا ۳۵۵، قدوری ۱۳۸ تا ۱۴۰۔ الجوہرۃ النیرۃ ۲/۲۱۴ تا ۲۲۰)۔

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ کو خیبر میں ایک قطعہ زمین ملی تو اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اس کی پیداوار اور آمدنی کو صدقہ قرار دیدو، چنانچہ آپ نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق) اس زمین کو وقف کردیا اور اس کی پیداوار اور آمدنی کو فقیروں، مسکینوں، قرابت داروں اور مہمانوں کی خدمت میں صدقہ قرار دیدیا)۔

"قال العلامة الحصكفي في الدر المختار: الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه" (الدر المختار مع الرد المحتار ۳/۴۰۷)۔

"رباط في طريق بعيد استغنى عنه المارة وبجنبه رباط آخر قال السيد الإمام أبو شجاع رحمه الله تعالى: تصرف غلته إلى الرباط الثاني كالمسجد إذا خرب واستغنى عنه أهل القرية فرفع ذلك إلى القاضي فباع الخشب وصرف الثمن إلى مسجد آخر جاز" (الفتاوى الخانية ۳/۳۱۵)۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کا موقف:

اگر مسجد کا مال اس قدر جمع ہو کہ مسجد اس کی نہ فی الحال محتاج ہو اور نہ بظن غالب فی المآل، اور اس رقم کے اسی طرح جمع رہنے کی حالت میں طامعین اور متغلبین کے تصرف کا اندیشہ ہو تو بیشک یہ رقم موجودہ ضرورت میں جو اسلام اور مسلمین کے لئے ایک حادثہ عظمیٰ اور نائبہ کبریٰ ہے خرچ ہوسکتی ہے، یعنی ترک مجروحین و یتامیٰ و بیوگان کی امداد کے لئے بھیجی جاسکتی ہے الخ (کفایت المفتی ۷/۲۷۸ تا ۲۷۹، جواب نمبر ۲۴۰)۔

میری اپنی رائے بھی یہی ہے کہ دوسری محتاج مساجد و مدارس اسلامیہ، بیوگان وغیرہ پر جمع شدہ رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔

الف۔ بعض اوقاف کی عمارتیں مخدوش حالت میں ہیں، اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ نہیں ہے اور کوئی بلڈر اس کے لئے تیار ہے کہ اس مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط کے ساتھ کردے کہ اس کی ایک یا دو منزل اسی کی ملکیت ہوگی، جس میں اس کو ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا اور بقیہ وقف کے مصارف کے لئے ہوں گے تو شرعی نقطہ نظر سے ایسا کرنا جائز نہیں ہے یعنی بلڈر کو نہ پہلی منزل اور نہ دوسری اس کو دی جائے گی، "شرط الواقف كنص الشارع" (رد المحتار ۳/۴۵۲) کے خلاف ہے، نیز "مراعاة غرض الواقفين واجبة" (رد المحتار ۳/۴۶۴) کے بھی خلاف ہے، سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ احکام نبوی کے بھی خلاف ہے، اسی طرح وقف کی ایک زمین ہے جس پر کسی طرح کی کوئی عمارت نہیں اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی صورت ہے۔

اس زمین سے فائدہ اٹھانے کے لئے اگر کسی بلڈر سے اسی طرح کا معاملہ کرلیا جائے تو شرعی نقطہ نظر سے ایسی صورت میں بھی اجازت نہیں دی جائے گی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ ایسی زمین کسی شخص کے معرفت نہ بیچی جائے گی نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ اس میں وراثت جاری کی جائے گی (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۱۶۔ اس کی تفصیلی تشریح وتوضیح کے دلائل دیکھئے: بخاری ۱/۳۸۸ تا ۳۸۹، مسلم ۲/۴۱، نووی مع مسلم ۲/۴۱ تا ۴۲، نسائی ۲/۱۲۶، ترمذی ۱/۲۵۶، ابوداؤد ۲/۳۹۸، ابن ماجہ ۲/۱۷۳، رد المحتار ۳/۳۹۱ تا ۵۰۰، فتاوی ہندیہ ۲/۳۵۰ تا ۴۹۱، بدائع الصنائع ۶/۲۱۸ تا ۲۲۱، المبسوط ۱۲/۲۷ تا ۴۷، شرح معانی الآثار ۲/۲۲۹ تا ۲۳۰)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کا موقف:

سوال (۷۰۸) کے جواب میں رقمطراز ہیں: جب پہلی ہی بیع باطل ہے تو دوسری بیع جو اس پر مبنی ہے نیز باطل ہوگی (امداد الفتاوی ۲/۵۸۷)۔

یعنی کوئی دغاباز مکار متولی موقوفہ اراضی کو فروخت کردیا پھر عرصہ دراز کے بعد مشتری سے خرید کر اپنی ذاتی ملکیت میں لانا چاہتا تھا اس موقع پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے عدم جواز کا فتویٰ دیا تھا جو اوپر مذکور ہوا۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کا موقف:

ایک سوال کے جواب (۹۶) کے تحت رقمطراز ہیں:

عیدگاہ اوقاف عامہ میں سے ہے اور وقف ہونے میں اس پر مسجد کے احکام جاری ہیں، پس اس کو عبادت عامہ کے لئے تو استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن ذاتی منافع کے لئے کوئی اس پر قبضہ نہیں رکھ سکتا، اگر کسی غاصب نے اس پر جبراً قبضہ کرلیا ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ اس کے قبضہ سے نکال لیں اور غرض صحیح میں استعمال کریں، غاصب اوقاف سے اوقاف کو واپس لینے کا حکم کتب فقہ میں مذکور ہے اور گذشتہ زمانے میں غاصب نے جس قدر روپیہ وقف کے ذریعہ حاصل کیا ہے وہ اس سے واپس لیا جائے گا اور وقف کے کام میں خرچ کیا جائے گا فقط (کفایت المفتی ۷/ ۱۰۷۔ ۱۰۸)۔

جواب (۳۰۱): مسجد اور مسجد کے متعلق موقوفہ زمین پر ذاتی تعمیر بنانا غصب وقف ہے، اس لئے اس کو خالی کرنا اور وقف میں شامل کرنا لازم ہے، ذاتی مکان کا دروازہ زمین وقف پر کھولنا بھی جائز نہیں (کفایت المفتی ۷/ ۳۳۱)۔

لہذا مذکور فی السوال کے مطابق اوقاف مساجد ومقابر وغیرہ کی بیع کا سوال ہے، یعنی بلڈر کو وقف شدہ زمین کا مالک بنا دینا عمارت تعمیر کردینے کے صلے میں فروخت کردینے کے مترادف ہے، اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، البتہ یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ قدیم مساجد ومقابر کے وقف شدہ املاک جن سے نماز پڑھنے اور دفن موتی کا مصرف عرصہ دراز سے نہیں لیا جارہا ہے اور نہ آئندہ یہ مصرف لئے جانے کا امکان ہے ایسے مساجد ومقابر کی اراضی کو کیا کیا جائے۔

خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کا قوی امکان ہے کہ ان اراضی پر غاصب لوگ قبضہ کرلیں گے جس کو ہٹانا ناممکن ہے، یا دشوار ترین معاملہ ہوجائے، میری رائے میں ایسے مساجد ومقابر کی اراضی کو کرایہ (LEASE) پر دیا جاسکتا ہے اور یہی اقرب الی الفقہ ہے، مثلاً کوئی عمارت وقف تھی اور وہ منہدم ہوگئی اور اب کوئی ایسا ذریعہ آمدنی نہیں جس کے ذریعہ دوبارہ اسے آباد کیا جائے تو امام محمدؒ کے نزدیک وہ اراضی بانی یا ورثاء بانی کی طرف منتقل ہوجائے گی، اور امام ابو یوسف کے نزدیک اس کی حیثیت وقف برقرار رہے گی، لیکن امام محمدؒ کا قول بھی اس صورت میں ہے جب کہ قطعی طور پر مفاد وقف کا حصول ختم ہوچکا ہو، اگر کسی صورت میں بھی استفادہ ممکن ہے تو پھر وہ بانی کی طرف نہیں لوٹے گی (ردالمحتار ۳/ ۴۰۷، المبسوط ۱۲/ ۴۲ تا ۴۳، ہدایہ ۲/ ۶۴۵، فتاوی ہندیہ ۲/ ۴۵۸)۔

مثلاً دکان جل کر خاک ہوگئی، تعمیر کا خرچ نہیں اور اسے کرایہ پر لگانے کی کوئی صورت نہیں، لیکن اگر وہ اراضی ذریعہ آمدنی ہوسکتی ہے تو وہ وقف برقرار رہے گی، اور اسے اجارہ پر لگایا جاسکتا ہے (ردالمحتار ۳/ ۴۰۷ تا ۴۰۸، فتاوی ہندیہ ۲/ ۴۷۹ تا ۴۸۰، فقہ المشکلات ۲۴۳)۔

مخدوش شدہ عمارت اور غیر تعمیر شدہ والی زمین سے تبادلہ:

مخدوش عمارت کی بنا پر یا صرف خالی زمین ہے، یعنی اس پر عمارت بنی ہوئی نہیں ہے اور نہ اس سے بالفعل انتفاع کی کوئی صورت ہے اگر اس کو کارآمد بنانے کے لئے کوئی ذریعہ ہوجائے تو مفاد وقف کا حصول جاری رہے، تو اس کے لئے کوئی مسلم یا غیر مسلم جتنی اراضی موقوفہ ہے اتنی مقدار والی اپنی زمین جس پر عمارت بنی ہوئی ہو اور وہ تبادلہ کرلیں تو یہ صورت جائز ہوسکتی ہے۔

''الرابعة أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن وصفا. فيجوز على قول أبي يوسف وعليه الفتوىٰ كما في فتاوىٰ قارى الهداية'' (الاشباہ والنظائر ۱۰۳ تا ۱۰۴)۔

شجرکاری کے ذریعہ انتفاع:

ایسی اراضی موقوفہ جو سوال میں مذکور ہے کسی ایسے شخص کو کرایہ پر دی جاسکتی ہے جو اپنے ذاتی مصارف سے مکان بنالے اور اس میں سکونت پذیر ہوجائے اور مصارف عمارت کو ماہانہ کرایہ جو متعین ہوجائے اس میں وضع کرلے تو ایسی صورت جواز کی ہوسکتی ہے، اگر چہ کرایہ کم حاصل ہو، یا ایسی زمین پر پھل دار درخت یا غیر پھل دار درخت لگائے جس سے مفاد وقف کا منشا باقی رہے تو یہ بھی صورت جواز کی ہے، مثلاً آم، لیچی، امرود، انگور، سیب، سنترہ، کیلا وغیرہ کا باغ لگالے یا شیشم، سال یعنی ساکھو، ساگوان، تلکا، وغیرہ کا درخت لگالے جس سے آمدنی وقف کو ہونے لگے بلا شبہ جائز ہے پھر اسی آمدنی سے عمارت کی تعمیر بھی ہوسکتی ہے (ردالمحتار ۳/ ۴۰۶)، اگر اراضی موقوفہ پر آرچڈ کی شجرکاری ہوجائے تو سب سے زیادہ نفع حاصل ہونے لگے اسی یعنی آرچڈ درخت کی قیمت غیر ممالک میں بہت زیادہ ہے۔

منی پور آرچڈ کے درختوں کا روایتی علاقہ ہے:

اس درخت کی توصیف کا طائرانہ مطالعہ کرلیا جائے جو افادہ واستفادہ سے خالی نہیں ہے۔

منی پور کے مسحور کن پہاڑی سلسلے گھنے جنگلات اور سرسبز شاداب ڈھلانیں اور صاف وشفاف چمکتے ہوئے پانی کے چشمے آرچڈ کے پودوں کے لئے بہترین قدرتی ماحول فراہم کرتے ہیں، منی پور میں آرچڈ کے پودوں کی (۴۷۰) اقسام پائی جاتی ہیں اگرچہ آرچڈ کے پودے منی پور وادی کے بہت سے حصوں میں پائے جاتے ہیں تاہم پہاڑیاں آرچڈ کی خوبصورت اقسام کا روایتی مسکن ہیں۔

آرچڈ کے پودے نہایت سرد خطوں سے لے کر گرم خطوں میں اور سطح آب سمندر سے ۱۰۰۰۰ افٹ تک کی بلندی پر اگتے ہیں۔

ہندوستان میں آرچڈ کی ایک ہزار اقسام پائی جاتی ہیں، باغبانی کے لئے ان کی ایک بڑی اہمیت ہے، باغبانی کی بین الاقوامی تجارت میں بہت سی ہندوستانی اقسام کی مانگ ہے، قریبی ریاستوں میں اگنے والی بیشتر اقسام اور کچھ غیر ملکی اقسام جو ملیشیا اور فلپائن میں پائی جاتی ہیں، ریاست منی پور میں دستیاب ہیں، یہ زیادہ ترٹینگ ہاڈپال، جیری بام، سیناپتی، اکھرول، نامنگ لانگ، میں پائی جاتی ہیں، ریاست میں چھ قیمتی اقسام ایسی ہیں جن کا پودا غیر ممالک میں ۳۰۰ روپے تک میں بکتا ہے، آرچڈ کے پودے اپنے خوبصورت شگوفوں کے لئے مشہور ہیں۔

میرے نزدیک اس قسم کے اراضی موقوفہ جو غیر آباد ویران ہوں ان پر جمیع اشجار کی شجرکاری کرنا بالخصوص آرچڈ کی شجرکاری کرنا جائز ہے انہیں تجارتی مقصد کے لئے استعمال کرکے غیر ملکی زرمبادلہ کمایا جاسکتا ہے، پھر اسی آمدنی سے اراضی موقوفہ پر مکان کی تعمیر بھی ہوجائے گی۔

ب۔ اسی طرح کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے وقف شدہ زمین وجائیداد کا کوئی حصہ فروخت کرکے اس سے نئی تعمیر کی جاسکتی ہے جب کہ اس کا مقصد وقف کی حفاظت ہے اور اس کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔ اس مجبوری کے باجود شرعی نقطۂ نظر سے وقف شدہ زمین وجائداد کا کوئی حصہ فروخت کرکے نئی تعمیر نہیں کی جاسکتی ہے اگرچہ اس میں مفاد وقف کا حصول ومنشاء ہے، کیونکہ فقہاء عظام نے اوقاف کی فروختگی کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک وقف کی حفاظت وتعمیر کے لئے دوسرے اوقاف کی فروختگی شرعی نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے (الفتاوی البزازیہ ۳/۲۷۱)، البتہ ایک وقف کی زمین میں تعمیر کرنے کرانے کی غرض سے اس کے دوسرے اوقاف کی زمین کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے (الفتاوی البزازیہ ۳/۲۶۰)۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا موقف:

سوال (۳۸۷) کے جواب میں رقمطراز ہیں...... اس روایت سے معلوم ہوا کہ مسجد کسی وقت کسی کی ملک نہیں ہوسکتی اور اس کو کوئی شخص اپنی ملک بنا کر فروخت نہیں کرسکتا (امداد الفتاوی ۲/۶۰۹)۔

میری رائے بھی یہی ہے کہ وقف شدہ مساجد ومقابر اوقاف کی زمین کو فروخت نہیں کیا جاسکتا ہے، ہاں وقف شدہ زمین کو مفاد وقف کے لئے کرایہ پر دیا جاسکتا ہے۔

مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین جو کہ ضرورت سے زائد ہے، اس پر مدرسہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے کہ وہ زمین ایک کار خیر میں استعمال ہو؟ اگر اس نیک ارادے سے بھی مسجد کی زمین پر مدرسہ بنانا چاہے تو شرعی نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے، کیونکہ جو زمین ایک دفعہ مسجد میں داخل ہوچکی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی کسی بھی ضرورت کے لئے اسے مسجد سے خارج نہیں کیا سکتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی مسجد بنانے کے سلسلہ میں یہ ہے:

''عن عثمان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من بنی للہ مسجداً بنی اللہ له بیتا فی الجنة'' (رواہ البخاری ومسلم)،
حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی اللہ کے لئے (یعنی صرف اس کی خوشنودی اور اس کا ثواب حاصل کرنے کی نیت سے) مسجد تعمیر کرائے تو اللہ تعالی اس کے لئے جنت میں ایک شاندار محل تعمیر فرمائیں گے۔

تشریح: حدیث وقرآن کے بہت سے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں ہر عمل کا صلہ اس کے مناسب عطا ہوگا، اس بنیاد پر مسجد بنانے والے کے لئے جنت میں ایک شاندار محل عطا ہونا یقینا قرین حکمت ہے (بخاری ۱/۶۴، مسلم ۱/۲۰۱، معارف الحدیث ۳/۱۸۱)۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی کا موقف:

سوال: ایک مسجد کافی وسیع ہے اس کا کچھ حصہ خارج کر کے اس میں امام مسجد کے لئے مکان تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین ایک دفعہ مسجد میں داخل ہو چکی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی کسی بھی ضرورت کے لئے اسے مسجد سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔

''قال فی شرح التنویر: ولو خرب ماحوله واستغنیٰ عنه یبقی مسجدا عند الإمام والثانی أبداً إلی قیام الساعة وبه یفتی۔

وفی الشامیة: (قوله ولو خرب ما حوله الخ) أی ولو مع بقائه عامراً وكذا لو خرب وليس له بأن یعمر به وقد استغنی الناس عنه لبناء مسجد آخر'' (رد المحتار ۳، ۵۱۳) والله تعالی أعلم (احسن الفتاوی ۶،۴۳۶)۔

عیدگاہ کی فاضل زمین پر مدرسہ بنانا:

حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم سے سوال کیا گیا (مدرسہ کی تعمیر کے لئے عیدگاہ کی فاضل اراضی کا استعمال کرنا شرعاً جائز ہو تو مدرسہ کافی وسیع پیمانہ پر چلایا جا سکتا ہے) اس سوال کے جواب میں رقمطراز ہیں:

الجواب: بندہ نے صورت مسئلہ میں بار بار غور کیا مگر سمجھ میں یہی آیا کہ عیدگاہ کی زمین میں مدرسہ بنانا جائز نہیں، ہر چند سوچنے کے باوجود مجوزین حضرات کے خیال کی بنا سمجھ میں نہیں آتی...... بہر کیف مسئلہ کی نوعیت بالکل واضح ہے جس میں ذرہ برابر شک وشبہ کی گنجائش نہیں، مع ہذا جو امور موجب خلجان ہو سکتے ہیں اثناء جواب میں ان کی تنقیح بھی کر دی ہے الخ (تفصیلی دلائل کے لئے دیکھئے: احسن الفتاوی ۶/ ۴۳۳ تا ۴۳۶)۔

پرانی مسجد کو مکتب بنانا:

پرانی مسجد کو مکتب بنانا جائز ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم فرماتے ہیں: مسجد جب ایک بار بن گئی تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، خواہ لوگ اس میں نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، لہذا اس کو مکتب بنانا جائز نہیں، البتہ اس کی مسجدیت اور ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں دین کی تعلیم دینا ان شرائط سے جائز ہے:

(۱) معلم اجرت لے کر نہ پڑھائے، بقدر ضرورت وظیفہ لے سکتا ہے۔

(۲) چھوٹے بے سمجھ بچوں کو مسجد نہ آنے دیا جائے۔

(۳) مسجد کے احکام اور ادب واحترام کا پورا اہتمام رکھا جائے۔

''قال فی التنویر: ولو خرب ماحوله واستغنی عنه یبقی مسجداً۔

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالی: ولا يجوز نقله ونقل ماله إلی مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أولا وهو الفتوی حاوی القدسی وأكثر المشائخ عليه مجتبی وهو الأوجه فتح الخ بحر'' (ردالمحتار ۳، ۳۸۴) والله تعالی أعلم (احسن الفتاوی ۶،۴۵۶، رد المحتار ۳،۴۰۶)۔

زبدۃ الخلاصۃ: فقہاء عظام کی تشریحات وتوضیحات کی روشنی سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اوقاف مساجد کو فروخت کرنا یا اس کے اوپر کوئی دینی ادارہ یا عصری ادارہ قائم کرنا جائز نہیں ہے، یہی رائے میری بھی ہے۔

اوقاف قبرستان کی جگہ پر کوئی دینی ادارہ بنانا:

اگر کوئی قبرستان ویران پڑا ہو اور اس میں موتی بھی دفن نہیں کئے جاتے ہیں تو ایسے قبرستان کی اراضی مخروبہ پر مدرسہ کی تعمیر کر دی جائے، تا کہ وہ زمین ایک

کارِ خیر میں استعمال ہوتی رہے تو شرعی نقطہ نظر سے اس کی گنجائش ہے، ایسی زمین پر انجمن اسلام کے لئے مکان بنانا، یا مسافر خانہ بنانا، ہسپتال بنانا وغیرہ جائز ہے تاکہ مفاد وقف کا منشاء باقی رہے اور کوئی غاصب اس کو غصب نہ کرنے پائے، سوال نمبر (۷۰۲) کے تحت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں:

الجواب: عینی شرح بخاری میں ہے: ''قال ابن القاسم: لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد''۔

جواب مذکور سے بعلت اشتراک علت معلوم ہوا کہ انجمن کا مکان وقفی نفع عام کے لئے اس مقبرہ کی جگہ بنانا جائز ہے، واللہ اعلم (امداد الفتاوی ۲؍۵۷۹)۔

پرانے قبرستان پر مسجد بنانا:

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی نے بھی پرانے قبرستان پر مسجد بنانے کا فتوی صادر فرمایا ہے:

اس قبرستان میں اگر لوگوں نے اموات کو دفن کرنا ترک کردیا ہو اور سابقہ قبروں کے نشان مٹ گئے ہوں تو وہاں مسجد بنانا جائز ہے، ایسے ہی اگر قبرستان کسی کا مملوک ہو اور اس میں قبریں مٹ چکی ہوں تو مالک کی اجازت سے وہاں مسجد بنانا جائز ہے (احسن الفتاوی ۶؍۴۰۹)۔

جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہوجانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہو رہا ہے، یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آگیا، اس کی وجہ سے اب اس کے استعمال اور اس میں تدفین پر پابندی عائد کردی گئی ہے، اور اس کی وجہ سے ان پر قبضہ کا خطرہ ہے بلکہ قبضہ ہو رہا ہے تو ایسے پرخطر ماحول کے سامنے آجانے کے بعد شرعی نقطہ نظر سے ایسے قبرستان پر مفاد وقف کا خیال کرتے ہوئے کوئی دینی ادارہ قائم کردینا، انجمن کا مکان بنالینا، مسافر خانہ، یتیم خانہ بنادینا جائز ہے، تاکہ وقف کی وقفیت کا منشاء حاصل ہو اور غاصبوں کی غصبیت وملکیت سے مامون ومصئون ہوجائے۔

وقف قبرستان میں ذاتی تعمیر ممنوع:

اس سوال کے جواب میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی دامت برکاتہم رقمطراز ہیں:

الجواب: قبرستان کے لئے وقف زمین پر لوگوں کا قبضہ کرنا ناجائز ہے، اور ان کی بیع وشراء باطل ہے، حکومت یا متولی پر ضروری ہے کہ اس جگہ کو فوراً خالی کرائے اور یہ جگہ دفن کے کام نہ آتی ہو تو اس پر مسجد یا اور کوئی رفاہ عام کی چیز تعمیر کرے۔

''قال الحافظ العيني رحمه الله تعالى: فإن قلت: هل يجوز أن تبنى المساجد على قبور المسلمين؟ قلت: قال ابن القاسم رحمه الله تعالى: لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى قوم عليها مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لايجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد'' (عمدة القاري ۴، ۱۷۹، احسن الفتاوی ۶، ۴۱۳، ۴۱۴)۔

''وقال الزيلعي: ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه عليه'' (رد المحتار ۱، ۶۵۹، فتاوی ہندیہ ۱، ۱۶۷)۔

بہت سی قدیم مساجد اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں، ایسی بعض مساجد میں حکومت نے نماز کی ادائیگی کو منع کردیا ہے تو شرعی نقطہ نظر سے یہ سراسر ظلم وستم اور تعدی کے مترادف ہے، ہرگز ہرگز حکومت ہند کو یہ حق حاصل نہیں ہے، اگر کوئی شخص اپنی شوکت وثروت کے اثر سے حکومت اور محکمہ آثار قدیمہ کے قبضہ وتصرف سے مساجد قدیمہ کو آزاد کراکے اس میں نماز پڑھنا حسب سابق جاری کردے تو ایسے شخص پر واجب ہے کہ حتی الامکان مسجد کو آزاد کراکے دم لے، ان شاء اللہ جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب ملے گا، اور اگر قدرت نہیں ہے تو چپ چاپ رہے، دل سے حکومت ہند کے رویہ کو برا سمجھے اور عمل میں صبر کافی ہے کوئی مظاہرہ وایجی ٹیشن نکالنا ٹھیک نہیں ہے جیسا کہ ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کے انہدام کا حادثہ عظمی ہوا، وہ نااہل سیاستدانوں کی شرارت وخیانت کا نتیجہ

تھا، ورنہ ایسا حادثہ کبریٰ ہرگز ہرگز وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

"ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها" (سورہ بقرہ: ۱۱۴)۔

(اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جاوے وہاں نام اس کا اور کوشش کی ان کے اجاڑنے میں، ایسوں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں ان میں، مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے)۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل واحکام نکلے ان کی تفصیل یہ ہے:

اول یہ کہ دنیا کی تمام مساجد آداب مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں جیسے بیت المقدس، مسجد حرام یا مسجد نبوی کی بے حرمتی ظلم عظیم ہے، اسی طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے، اگرچہ ان تینوں مساجد کی خاص بزرگی وعظمت اپنی جگہ مسلم ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں ذکر ونماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز وحرام ہیں۔ ان میں سے ایک صورت تو یہ کھلی ہوئی ہے ہی کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز وتلاوت سے صراحتہً روکا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد میں شور وشغب کر کے یا اس کے قرب وجوار میں باجے گاجے بجا کر لوگوں کے نماز وذکر وغیرہ میں خلل ڈالے، یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد کی ویرانی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب حرام ہیں، اس میں بھی جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم اور ویران کرنا داخل ہے اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہو جائے، اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لئے لوگ نہ آئیں یا کم ہو جائیں (تفصیلی معلومات کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ۱/ ۲۹۹ تا ۳۰۰)۔

غیر آباد مساجد کے احکام:

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب نمبر (۲۶۲) میں رقمطراز ہیں: مساجد اگر ایسی حالت میں ہو جائیں کہ ان میں پنجگانہ جماعت نہیں ہوتی اور ان کی حاجت نہیں رہی تو ان کو محفوظ مقفل کر کے چھوڑ دیا جائے اور یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کا سامان چرا کر لے جائیں گے تو ایسی چیزوں کو جو چرائی جاسکتی ہوں دوسری قریب ترین مسجد میں منتقل کر دینا چاہئے اور جب تک کوئی مسجد رفاہ عام کے کاموں میں لائی جاسکے اس کو منہدم کرنا درست نہیں ہے (کفایت المفتی ۷/ ۲۹۹)۔

موقف حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کا:

سوال (۳۸۷) (الف ۲) اگر کوئی شخص کسی مسجد پر مالکانہ تصرف رکھتا ہو، آیا یہ امر ضروری ہے یا نہیں کہ اس کے قبضہ تصرف سے وہ مسجد نکال لی جاوے اور اس کو بطور مسجد رکھا جائے؟

الجواب (الف ۲) یہ نکال لینا ایک فرد ہے ازالہ منکر کا سو اس کا مدار قدرت پر ہے، اگر کسی کو اس پر قدرت ہو تو اس پر واجب ہے اور اگر قدرت نہ ہو تو دل سے ناگواری اور عمل میں صبر کافی ہے، ہذا ظاہر من القواعد الشرعیۃ (امداد الفتاوی ۲/ ۶۰۸ تا ۶۰۹)۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسجدوں کی جو بے حرمتی اور بربادی کی گئی، اس کی المناکی اب بھی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے، ۱۹۷۶ء میں حکومت ہند نے برنی کمیٹی مقرر کی تھی اس کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک صرف دہلی کی تقریباً ایک سو چھہتر (۱۷۶) مسجدیں ایسی تھیں جن کے تصرف سے مسلمان محروم تھے، ان پر یا تو حکومت یا ہندوؤں کا قبضہ تھا، اور اب تک واگذاشت نہیں ہو سکی ہیں، دہلی مسلمان بادشاہوں کا بھی دار السلطنت رہا، لیکن کسی مستند حوالہ سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں ایک سو چھہتر مندروں کے تصرف سے ہندو محروم کر دیئے گئے تھے، ۱۹۷۹ء میں مغربی بنگال آسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ صرف کلکتہ میں انسٹھ (۵۹) مسجدیں ایسی ہیں جن کے قبضہ سے مسلمان نہ صرف محروم ہیں بلکہ ان پر ہندوؤں کا تصرف ہے، اور بعض مسجدوں کو گوبر سے لیپا جاتا ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلایا جاسکتا ہے کہ صرف ایک شہر کے انسٹھ (۵۹) مندروں کی ایسی بے حرمتی کی گئی، اور اخباروں میں برابر ذکر آیا ہے کہ دہلی سے پاکستان کی سرحد تک نو ہزار مسجدیں ایسی ہیں جو غیر مسلموں کے تسلط میں ہیں (بابری مسجد ر ۱۴۵ تا ۱۴۶، دار المصنفین اعظم گڑھ)۔

مسلمانوں کو مساجد کے تصرف سے محروم کرنا آئین بھارت کے بھی خلاف ہے:

مذہب کی آزادی کا حق ۲۵:

(۱) تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے بشرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیحات متاثر نہ ہوں۔

(۲) اس دفعہ کا کوئی امر کسی ایسے موجودہ قانون کے نفاذ کو متاثر نہ کرے گا اور نہ وہ ایسے قانون کے بنانے میں مملکت کا مانع ہوگا جو کسی معاشی، مالیاتی، سیاسی یا دیگر غیر مذہبی سرگرمی کو جس کا تعلق مذہبی عمل سے ہوسکتا ہو منضبط کرے یا اس پر پابندی لگائے۔

مذہبی امور کے انتظام کی آزادی ۲۶:

اس شرط کے ساتھ کہ امن عامہ، اخلاق عامہ اور صحت عامہ متاثر نہ ہوں ہر ایک مذہبی فرقے یا اس کے کسی طبقے کو حق ہوگا۔ (الف) مذہبی اور خیراتی اغراض کے ادارے قائم کرنے اور چلانے کا، (ب) اپنے مذہبی امور کا انتظام خود کرنے کا، (ج) منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کے مالک ہونے اور اس کو حاصل کرنے کا، (د) اور ایسی جائداد کا قانون کے بموجب انتظام کرنے کا (بھارت کا آئین) (یکم جنوری ۱۹۸۵ء تک ترمیم شدہ) (صفحہ ۴۶، دفعات ۲۵-۲۶ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی طبع دوم ۱۹۸۵ء)۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے، جبکہ صرف باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، اس کے اطراف میں دکانوں کی تعمیر کرادی جائے جس کے لئے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لی جائے اور اس سے یہ کام کرایا جائے جس میں قبرستان کے اطراف کا چندفٹ دکانوں میں چلا جائے گا، کیا یہ درست ہوگا؟ شرعی نقطۂ نظر سے اوقاف کے مفاد کے مدنظر چندفٹ قبرستان کا حصہ لے کر دکان بنادی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی احاطہ بندی بھی ہوجائے گی تو بلاشبہ جائز ہے اور بعد میں فاضل آمدنی کو مناسب مصارف خیر میں لگادی جائے۔

''وقال الزيلعي: ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه'' (فقه المشكلات ۲۲۰، رد المحتار ۱/۶۵۹، فتاوى هنديه ۱/۱۶۷)۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی علیہ الرحمہ سوال کے جواب نمبر (۱۱۵) میں رقمطراز ہیں:

مقبرہ کی فارغ زمین میں ایسے طور پر درخت لگانا کہ اصل غرض یعنی دفن اموات میں نقصان نہ آئے جائز ہے، ان درختوں کے پھلوں کی بیع جائز ہوگی اور پھلوں کی قیمت قبرستان کے کام میں لائی جائے گی، جواز کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ درخت لگانے، ان کی حفاظت کرنے، پھلوں کے توڑنے، اور اس کے متعلقہ کاموں میں قبروں کا روندا جانا اور پامال ہونا نہ پایا جائے۔

درختوں کے لگانے میں قبرستان کا روپیہ خرچ کرنا جب کہ اس سے تجربہ کی بنا پر نفع کی امید ہے جائز ہے (کفایت المفتی ۷/۱۲۱)۔

آج کل بعض بڑے شہروں میں مسلمان اس صورت حال سے دوچار ہیں کہ وسیع قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو ممکن ہے کسی زمانہ میں یہ تدفین کے لئے آنے والوں کی رعایت سے بنائی گئی ہو کہ وہ وہاں نماز ادا کرسکیں، اب اس علاقہ میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مسجد کی توسیع ضروری ہوگئی ہے، نیز قبرستان میں بھی تدفین کا سلسلہ جاری ہے تو ایسی صورت حال میں اس قبرستان میں اگر لوگوں نے اموات کو دفن کرنا ترک کردیا ہو اور سابقہ قبروں کے نشان مٹ چکے ہوں تو وہاں مسجد بنانا جائز ہے، ایسے ہی اگر قبرستان کسی کا مملوک ہے اور اس میں قبور مٹ چکی ہوں تو مالک کی اجازت سے وہاں مسجد بنانا جائز ہے۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب نمبر (۱۳۰) میں رقمطراز ہیں:

یہ زمین قبرستان کے لئے وقف تھی یا مملوکہ زمین جس میں اموات دفن کئے جاتے ہیں، اگر وقف ہے تو اس کو جب تک دفن کے کام میں لانا ممکن ہے کسی دوسرے کام میں لانا جائز نہیں، لیکن اگر دفن کے کام میں لانا اب ممکن نہیں رہا ہو تو پھر مسجد بنالینا جائز ہے، اور مملوک ہے تو مالکوں کی اجازت سے مسجد بن سکتی ہے (کفایت المفتی ۷/۱۳۶)۔

مسجد کی توسیع کے لئے قبریں ہموار کر کے وہ جگہ مسجد میں داخل کرنا:

حضرت مولانا قاری مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری دامت برکاتہم سوال نمبر (۱۶۶۲) کے جواب میں رقمطراز ہیں:

مسجد کی توسیع کے لئے پرانی قبریں اگر جماعت خانہ (مسجد شرعی) میں لینا ضروری ہو تو لے سکتے ہیں اس میں قبروں کی توہین نہ ہوگی بلکہ صاحب قبر کی خوش نصیبی اور سعادت مندی ہے، حرم شریف میں مطاف (طواف کی جگہ) میں بھی انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی قبریں ہیں، جماعت خانہ میں جو قبریں شامل کی جائیں ان پر نشان بنانے کی ضرورت نہیں، ہموار کردی جائیں (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۸۴۔ ۹۲ تا ۹۳)۔

''وأنه أمر ببناء المسجد، فأرسل إلى ملأ من بني النجار، فقال: يا بني النجار ثامنوني بحائطكم هذا، قالوا: لا والله لانطلب ثمنه إلا إلى الله، فقال أنس: فكان فيه ما أقول لكم قبور المشركين وفيه خرب و فيه نخل فأمر النبي ﷺ بقبور المشركين فنبشت ثم بالخرب فسويت وبالنخل فقطع فصفوا النخل قبلة المسجد وجعلوا عضادتيه الحجارة وجعلوا ينقلون الصخر وهم يرتجزون والنبي ﷺ معهم وهو يقول: اللّهم لاخير إلا خير الآخرة۔ فاغفر للأنصار والمهاجرة'' (بخاری ۱/ ۶۱، مسلم ۱/ ۲۰۰)۔

''قال العلامة النووی فی شرحه الكامل: (قوله وبقبور المشركين فنبشت) فيه جواز نبش القبور الدارسة وانه إذا أزيل ترابها المختلط بصديدهم ودمائهم جازت الصلوة فی تلك الأرض وجواز اتخاذ مواضعها مسجدا إذا طيبت أرضه'' (نووی مع مسلم ۱/ ۲۰۰)۔

ویران اور زیر استعمال قبرستان اور جدید وقدیم قبروں کے احکام الگ الگ ہیں، اب تک جو مسائل لکھے گئے ہیں وہ ویران قبرستان اور قدیم قبر کے تحت لکھے گئے، زیر استعمال قبرستان اور جدید قبر کی جگہ مسجد کی توسیع نہیں کی جاسکتی ہے، کیونکہ اگر زیر استعمال قبرستان میں مسجد کی توسیع کردی جائے تو مردوں کی تدفین میں دقت پیش آئے گی، نیز جدید قبر کی جگہ توسیع کی جائے تو احترام میت کے خلاف ہے۔

''عن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ: ''كسر العظم للميت ككسره حيا'' مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے، جیسے زندہ کی ہڈی توڑنا (ابن ماجہ ۱/ ۲۹۶، حدیث ۱۶۱۶، باب ۶۳، ریاض طبع دوم ۱۴۰۴ھ، مؤطا امام مالک ص/ ۸۳)۔

''أذى المؤمن فی مماته كأذاه فی حياته'' مومن کو مردہ حالت میں تکلیف پہنچانا اس کی زندگی میں تکلیف پہنچانے کی طرح ہے (مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۳۶۷)۔

''عن عمرو بن حزم قال: رآنی رسول الله ﷺ علی قبر فقال: ''انزل عن القبر لا تؤذ صاحب القبر فلا يؤذيك'' عمرو بن حزم الانصاریؓ سے روایت ہے کہ مجھ کو ایک قبر کے اوپر بیٹھے ہوئے حالت میں رسول اللہ ﷺ نے دیکھ لیا تو ارشاد فرمایا: قبر کے اوپر سے اتر جاؤ قبر والے کو تکلیف مت پہونچاؤ، تم کو بھی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی (شرح معانی الآثار ۱/ ۳۲۸ تا ۳۲۹، ابن ماجہ ۱/ ۲۸۷، حدیث ۱۵۶۵، باب ۴۵)۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب نمبر (۱۳۷) کے تحت یوں فرماتے ہیں: اگر قبرستان کی زمین دفن اموات کے لئے وقف ہے اور اس میں دفن اموات جاری ہے تو اس زمین کو دفن سے معطل کرنا اور مسجد میں شامل کرنا جائز نہیں، کیونکہ جس کام کے لئے وہ وقف ہے اور وہ کام اس میں جاری یا ممکن ہے تو جہت موقوف علیہا سے اس وقف کو معطل کرنا ناجائز ہے، اور اگر وہ زمین دفن اموات کے لئے وقف تو ہے مگر اب اس میں دفن اموات ممکن نہیں، مثلاً حکومت نے منع کردیا اور وہاں دفن کرنے کو قانونی جرم قرار دیدیا، تو اس صورت میں قبروں کو برابر کر کے اس کو مسجد میں شامل کر لینا مباح مگر قبروں کو کھودنا جائز نہیں، اور اگر قبرستان کی زمین وقف نہیں ہے، بلکہ کسی کی مملوکہ ہے تو مالک کی اجازت سے اس کو مسجد میں شامل کر لینا جائز ہے، اور جو قبریں اتنی پرانی ہوں کہ ان اموات کی لاشیں مٹی ہوگئی ہوں ان کو کھود کر برابر کردینا جائز ہے، اور جو قبریں نئی ہوں، یعنی ابھی ان کی لاشوں کا مٹی ہوجانا متیقن نہ ہو ان کو کھودنا جائز نہیں، ویسے ہی مٹی ڈالکر برابر کردیں اور اوپر مسجد بنالیں تو مباح ہے (کفایت المفتی ۷/ ۱۴۰ تا ۱۴۱)۔

ہندوستان کی بعض ریاستوں میں ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد پر اراضی وقف کی ہیں، اور شاید واقف کے ہندو ہونے کے باعث یہ مساجد

اب ہندو اوقاف کے تحت ہیں، اور ہندو وقف بورڈ ہی مسجد سے متعلق تمام نظم و نسق انجام دیتا ہے، تو اس صورت میں مساجد و مقابر اور اسلامی مقامات کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا درست و جائز ہے، اگر کوئی شخص حکمت عملی سے ہندو اوقاف سے نکال کر مسلم اوقاف کی زیر نگرانی کردے یا خود ہندو اوقاف حق تولیت اور حق نگرانی اور ہر قسم کے حقوق سے دست بردار ہو جائے اور مسلم اوقاف کا اس پر تسلط و قبضہ مکمل طور پر ہو جائے تو فبہا، ورنہ نہیں، زبردستی ہندو اوقاف تولیت اور انتظام و انصرام کی باگ ڈور حاصل کرنے کے لئے بابری مسجد والا واقعہ رونما ہونے پاوے، نیز شرعی نقطہ نظر سے بھی زبردستی لینا جائز نہیں ہے کیونکہ تولیت اور انتظام و انصرام کے لئے اسلام شرط نہیں ہے۔

''وأما الإسلام فليس بشرط فلو وقف الذمي على ولده ونسله وجعل آخره للمساكين جاز ويجوز أن يعطى المساكين وأهل الذمة وإن خص في وقفه مساكين أهل الذمة جاز الخ'' (فتاوی ہندیہ ۲،۳۵۲، ردالمحتار ۳،۴۲۱ تا ۴۲۲)۔

''حربي دخل دار الاسلام بامان ووقف جاز من ذلك ما يجوز من الذمي كذا في الحاوي'' (فتاوی ہندیہ ۲،۳۵۳)۔

''وقال العلامة ابن عابدين الشامي في رد المحتار: ويشترط للصحة بلوغه وعقله لاحريته واسلامه كما في الإسعاف'' (ردالمحتار ۳،۴۲۲)۔

مشعل راہ حضرت عمر فاروقؓ کا:

جو لوگ قدیم سے زمیندار اور تعلقہ دار تھے اور جن کو ایرانی زبان میں مرزبان اور دہقان کہتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی حالت اسی طرح قائم رہنے دی اور ان کے جو اختیارات اور حقوق تھے سب بحال رکھے (الفاروق ۲ / ۴۱)۔

علامہ شبلی نعمانیؒ رقمطراز ہیں: جہاں تک ہم کو معلوم ہے عراق کے سوا حضرت عمرؓ نے اور کسی صوبے کی پیمائش نہیں کرائی، بلکہ جہاں جس قسم کا بندوبست تھا، اور بندوبست کے جو کاغذات پہلے سے تیار تھے ان کو اسی طرح قائم رکھا، یہاں تک کہ دفتر کی زبان تک نہیں بدلی یعنی جس طرح اسلام سے پہلے عراق و ایران کا دفتر فارسی میں، شام کا رومی میں، مصر کا قبطی میں تھا، حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی اسی طرح رہا، خراج کے محکمہ میں جس طرح قدیم سے پارسی، یونانی اور قبطی ملازم تھے بدستور بحال رہے، تاہم حضرت عمرؓ نے قدیم طریقہ انتظام میں جہاں جو کچھ غلطی دیکھی اس کی اصلاح کردی (الفاروق ۲ / ۴۲)۔

''وقال الحسن: لا يجوز للذمي وصية إلا الثلث، قال ابن عباس: أمر النبي ﷺ أن يحكم بينهم بما أنزل الله وقال الله تعالى وأن احكم بينهم بما أنزل الله'' (بخاری ۱،۳۸۳)۔

وقف کافر بحکم وصیت کافر ہے، اور ہدایہ وغیرہ جملہ کتب میں لکھا ہے کہ اگر جہت وصیت عندالکافر قربت ہو تو یہ وصیت جائز ہے، غیر مسلم اگر کار ثواب سمجھ کر وقف کرے تو اس کا وقف صحیح ہے، لہٰذا اگر غیر مسلم مساجد و دیگر اسلامی رفاہ عام کے لئے زمین وغیرہ وقف کردے تو اس کا وقف صحیح ہے، اسی طرح اس کا متولی و منتظم بننا اور رہنا بلاتردد صحیح و جائز ہے، اس سے خواہ مخواہ تولیت کو اپنے قبضہ میں کرنے کے لئے کوئی فتنہ برپا نہیں کرنا چاہئے۔

مسجد اور وقف کا متولی کیسا ہونا چاہئے؟

ایک استفتاء کے جواب میں حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری دامت برکاتہم یوں رقمطراز ہیں: کمیٹی کے اکثر ارکان و ممبران غیر دیندار اور احکام وقف سے ناواقف ہوں گے تو احکام وقف کے خلاف فیصلے ہوں گے، اس لئے ایسی کمیٹی سے فقط ایک دیندار احکام وقف سے واقف متولی کا ہونا افضل ہے، کام زیادہ ہو، تنہا انجام دینا دشوار ہو تو متولی اپنا نائب رکھ سکتا ہے (فتاوی رحیمیہ ۲ / ۱۵۷ تا ۱۵۸)۔

اہل علم و پابند صوم و صلوٰۃ اور پرہیز گار کے ہوتے ہوئے بے علم، بے عمل، فاسق و فاجر، داڑھی منڈائے، تولیت اور اہتمام کے اور دینی سوسائٹی کی قیادت و سیادت کے اہل نہیں ہوسکتے، صحیح حق دار حاملین قرآن و پابند شریعت لوگ ہیں، حضرت امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کی رہنمائی وہی کرسکتا ہے جس کی زندگی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا نمونہ ہو۔ اور حضرت علامہ ابن تیمیہؒ کا فرمان ہے کہ امت کا اتفاق ہے کہ عالم باعمل مسلمان سیادت و قیادت کا اہل ہے، اگر ایسا شخص میسر نہ ہو تو یہ منصب مجبوراً دو شخصوں میں سے ایک کے سپرد کیا جائے گا۔

(۱) عالم فاسق (یعنی عالم بے عمل) کو۔ (۲) جاہل متقی (بے علم باعمل) کو (کتاب السیاسۃ الشرعیۃ ص ۱۶۷)۔

فتاوی ابن تیمیہ میں ہے: ''ولا یجوز تولیۃ الفاسق مع إمکان تولیۃ البر'' یعنی نیک آدمی کے ملنے کا امکان ہو تو فاسق کو سردار بنانا ناجائز ہے (فتاوی ابن تیمیہ ۱/۱۵۰)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''إذا وسد الأمر إلی غیر أھلہ فانتظر الساعۃ'' یعنی جب اہم امور نااہل کو سپرد کئے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو (بخاری ۱/۱۴)۔

نااہل متولیان مساجد واوقاف کو برطرف کرنے کا مجاز کس کو ہے؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ سوال نمبر (۷۴۶) کے جواب کے تحت یوں رقمطراز ہیں: اور اگر متولی میں خیانت ثابت ہو خواہ وہ واقف کا مقرر کیا ہوا ہو، یا قاضی کا یا عام مسلمین کا اس کو معزول کردینا واجب ہے اور یہ حق معزول کردینے کا بھی اصل میں قاضی کو ہے۔

''فی الدر المختار و ینزع وجوبا بزازیۃ (لو) الواقف۔درر۔ فغیرہ بالأولی (غیر مامون) أو عاجزاً أو ظھر بہ فسق إلخ مختصراً فی رد المحتار، مقتضاہ اثم القاضی بترکہ الخ''۔

اوپر معلوم ہوچکا کہ عام مسلمین، بجائے قاضی کے ہیں، اس لئے اگر قاضی نہ ہو تو عام مسلمین کو یہ حق معزول کرنے کا حاصل ہے، لیکن اگر عام مسلمین بذات خود اپنے اس اختیار شرعی کو نافذ کرنے پر قانوناً قادر نہ ہوں تو ان پر لازم ہے کہ حکام وقت سے استعانت کریں اور ان سے درخواست کر اکر متولی صالح کو مقرر کر اکر اگر وقف کے انتظام کی اصلاح کریں، پس یہ متولی صالح شرعاً مسلمین کے طرف سے ہوگا اور قانوناً حکام وقت کی طرف سے ہوگا۔

اوقاف اسلامی کو عمداً حکومت کو سپرد کردینا جائز نہیں ہے:

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب نمبر (۱۵۰) کے تحت یوں رقمطراز ہیں: اوقاف اسلامیہ کو حکومت کے قبضہ میں دے دینا اور متولیوں کے اختیارات حکومت کو تفویض کردینا شرعاً درست نہیں ہے، متولیوں کی بے اعتدالی کو روکنے کے لئے حساب فہمی تو کی جاسکتی ہے، لیکن ان کے شرعی اختیارات جو واقف نے دیئے ہیں سلب نہیں کئے جاسکتے (کفایت المفتی ۷/۱۵۷، معارف القرآن ۴/۳۳۱، ہکذا فی فتاوی رحیمیہ ۶/۷۴)۔

زبدۃ الخلاصۃ:

کافر اگر قربت کی نیت سے مسجد تعمیر کرے یا مسجد کے لئے چندہ دے تو جائز ہے، آگے اس میں اختلاف ہے کہ مذہب واقف میں قربت ہونا شرط ہے یا کہ وقف کے خیال وعقیدہ میں قربت ہونا کافی ہے، راجح قول ثانی ہے:

''قال فی الھندیۃ: وأما سببہ فطلب الزلفی (إلی قولہ) وأما الإسلام فلیس بشرط. وفی کتاب الوقف من شرح التنویر بدلیل صحتہ من الکافر۔

وفی الشامیۃ حتی یصح من الکافر (إلی قولہ) بخلاف الوقف فإنہ لابد فیہ من أن یکون فی صورۃ القربۃ وھو معنی ما یأتی فی قولہ ویشترط أن یکون قربۃ فی ذاتہ إذ لو اشترط کونہ قربۃ حقیقۃ لم یصح من الکافر'' (ردالمحتار)۔

وقف کافر بحکم وصیت کافر ہے اور ہدایہ وغیرہ جملہ کتب میں لکھا ہے کہ اگر جہت وصیت عند الکافر قربت ہو تو یہ وصیت جائز ہے۔

آیت کریمہ "ما کان للمشرکین أن یعمروا مساجد اللہ" (سورہ توبہ:۱۷) سے کفار کی تعمیر مسجد کے عدم جواز پر استدلال صحیح نہیں، آیت کے سیاق و سباق اور شان نزول پر نظر ڈالنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس میں مسجد حرام کی تعمیر اور سقایت حاج پر افتخار مشرکین کا رد ہے، اس طرح کہ مشرکین میں قبول عمل کی شرط (ایمان) موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان کا یہ عمل مقبول نہیں اور عمل غیر مقبول پر فخر کرنا لغو ہے، اس آیت میں جواز وعدم جواز سے کوئی تعرض نہیں، لہذا "للمشرکین" میں لام جواز نہیں، بلکہ استحقاق وصلاحیت کا ہے، والتفصیل فی بیان القرآن۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض مفسرین کا اس آیت سے عدم جواز ثابت کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ آیت کے سیاق وسباق وشان نزول کے خلاف ہونے کے

علاوہ تصریحات فقہاء رحمہم اللہ تعالی سے بھی معارض ہے اور بوقت معارضہ مفسرین کا قول قابل قبول نہ ہوگا "فانہ لکل فن رجال"۔

خانہ کعبہ کی تعمیر مشرکین کو برقرار رکھنے سے زیادہ قوی کون سی دلیل جواز پر ہوسکتی ہے؟ "فبأی حدیث بعدہ یومنون" (سورہ مرسلات)۔

غرضیکہ اگر کافر بنیت ثواب مسجد تعمیر کرے (یا مساجد ومقابر اور مدارس دینیہ وغیرہ پر اپنی اراضی وقف کرے) تو جائز ہے، البتہ اگر اس عمل کی وجہ سے مسلمانوں پر کفار کے افتخار واظہار منت کا اندیشہ ہو تو ان کے اس عمل کو قبول کرنا جائز نہ ہوگا (احسن الفتاوی ۶/ ۴۳۹ تا ۴۴۰، فتاوی ہندیہ ۲/ ۳۵۲، در المختار ورد المحتار ۴/ ۳۹۲ تا ۳۹۳)۔

میری رائے یہ ہے کہ کافر کا وقف کرنا اور اس کا متولی ومنتظم رہنا بلاشبہ جائز ودرست ہے، اس کی تولیت کی باگ ڈور کو اپنے تصرف وتسلط میں لینے کی سعی کرنا بہتر نہیں ہے اس سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے۔

آیت کریمہ مذکورہ بالا سے مولانا مفتی محمد شفیع علیہ الرحمہ اور محمد علی صابونی نے کافر کی تعمیر مسجد اور متولی ہونے کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے جو صحیح نہیں ہے (معارف القرآن ۴/ ۳۳۰۔۳۳۱، روائع البیان ۱/ ۵۷۳۔۵۷۴، بحوالہ احکام القرآن للجصاص ۲/ ۸۷)۔

☆☆☆

تدفین پر پابندی لگائے گئے قبرستان سے انتفاع کی شکل

مولانا محمد نور القاسمی

سوالات کے جوابات تحریر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استبدال وقف کے شرائط وحالات پر ایک نظر ڈال لی جائے تا کہ آگے مسائل کے حل کرنے اور اسے اچھی طرح سمجھنے میں مدد مل سکے۔

حنفی نقطہ نظر: احناف کے نزدیک شرائط استبدال وقف تین ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ واقف نے خود اپنے لئے یا کسی دوسرے شخص کے لئے یا اپنے ساتھ ساتھ دوسرے کے لئے بھی استبدال کی شرط لگادی ہو، بایں طور کہ جب چاہیں گے اس وقف کا تبادلہ کردیں گے، تو اس صورت میں استبدال جائز ہوگا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی، بایں طور کہ بالکل خاموش رہا یا عدم استبدال کی صراحۃ شرط لگادی، لیکن آگے چل کر وقف کی ایسی حالت ہوگئی کہ یا تو اس سے بالکلیہ استفادہ مفقود ہوگیا ہے یا صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ سارا کا سارا وقف شدہ چیز کے خرچ میں صرف ہوجاتا ہے، تو ایسی صورت میں بھی استبدال وقف جائز ہے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی، بایں طور کہ بالکل خاموش رہا یا عدم استبدال کی شرط لگادی ہے، لیکن وقف سے کچھ نہ کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے، اور استبدال میں فائدہ زیادہ نظر آتا ہے، تو ایسی صورت میں صحیح قول کے مطابق زیادہ فائدہ کے لئے استبدال جائز نہیں ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ردالمحتار ۳/ ۳۸۷)۔

مالکی مذہب: مالکیہ نے اوقاف کی تین قسمیں بیان کی ہیں، اور ہر ایک کے لئے الگ الگ احکام بھی بیان کئے ہیں:

۱۔ مساجد کی خرید وفروخت کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے۔

۲۔ زمینوں (عقار) کی بھی خرید وفروخت جائز نہیں گرچہ وہ خراب ہورہی ہوں، اور نہ ہی اسی جنس کی دوسری زمین سے ان کا استبدال جائز ہے، نیز ان کی لکڑیوں کی بیع بھی جائز نہیں ہے، ہاں اگر ان لکڑیوں کا موقوفہ زمین میں واپس آنا ممکن نہ ہو تو اسی جیسی دوسری موقوف زمین میں منتقل کرنا جائز ہے، مالکیہ کے مسلک کے اعتبار سے صرف ایک صورت میں موقوفہ زمینوں کو فروخت کرسکتے ہیں اور وہ ہے مسجد یا راستہ کو کشادہ کرنے کے لئے۔

۳۔ موقوفہ سامان یا جانور کو اس صورت میں فروخت کرنا جائز ہے، جبکہ ان کی منفعت ختم ہوچکی ہو، بایں طور کہ جانور بوڑھاپے کی وجہ سے ناقابل انتفاع ہوگیا ہو، یا کپڑا اتنا پرانا ہو کہ اس کا استعمال ممکن نہ ہو۔ یہ مسلک تو مشہور مالکی فقیہ ابن القاسم کے مطابق ہے، لیکن ایک دوسرے فقیہ ابن ماجشون ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی بھی بیع جائز نہیں۔

شافعی فکر: شوافع کے مسلک کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ مساجد: ان میں تصرف کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، نہ خرید وفروخت کے ذریعہ اور نہ کسی دوسرے ذرائع سے، خواہ مسجد منہدم ہوگئی ہو یا محلہ اور شہر کی آبادی ختم ہونے کی وجہ سے اس میں نماز ادا نہ کی جاتی ہو، ایسی صورت میں اس مسجد کے "غلہ" کو دوسری مسجد جو قریب ترین ہو لگایا جاسکتا ہے۔

۲۔ مسجد کی چٹائیاں: عدم انتفاع کی صورت میں ان کی بیع جائز ہے، لیکن ان کی قیمت مصالح مسجد پر ہی صرف کرنا ضروری ہوگا۔

۳۔ ان کے علاوہ موقوفہ جانور اور درخت وغیرہ، اگر ان سے انتفاع کی کوئی صورت نہ ہو تو فروخت کیا جاسکتا ہے، بلکہ فروخت کردینا بہتر ہے اور ان کی قیمت فقراء ومساکین اور مصالح مسلمین میں صرف کردیا جائے۔

حنبلی مذہب: اوقاف کی منفعت جب کالعدم ہو جائے تو فروخت کر دینا جائز ہے، ہاں اگر ان سے تھوڑا بھی انتفاع ہو رہا ہو تو بیچنا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ اصلاً اوقاف کی بیع ناجائز ہے، اس کی اجازت صرف ضرورت اور اوقاف کے مقصود کو بچانے کے لئے دی گئی ہے، اسی طرح مساجد کو بھی صرف اس وقت منتقل کرنا جائز ہے جب کہ اس سے انتفاع ممکن نہ ہو (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۸/۲۲۱-۲۲۷)۔

پنجاب وہریانہ وغیرہ کے اوقاف کی منتقلی:

بہت سے اوقاف خصوصاً پنجاب وہریانہ، دہلی اور مغربی یوپی میں ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی طرف مسلمانوں کی آبادی منتقل ہو جانے کی وجہ سے ویران ہو چکے ہیں اور جن مقامات پر وہ اوقاف ہیں وہاں دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہو گیا ہے اس میں مساجد، قبرستان، مدارس اور خانقاہیں ہر قسم کے اوقاف ہیں، ایسے اوقاف پر حکومت یا غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہے، ایسی صورت میں:

الف۔ اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے، چنانچہ علامہ شامی نقل فرماتے ہیں:

''عن شمس الأئمة الحلوانی أنه سئل عن مسجد أو حوض خرب ولا يحتاج إليه لتفرق الناس عنه هل للقاضی أن يصرف أوقافه إلى مسجد أوحوض فقال: نعم... ولا سيما فی زماننا، فإن المسجد أو غيره من رباط أو حوض إذا لم ينقل يأخذ أنقاضه اللصوص والمتغلبون كما هو مشاهد، وكذلك أوقافه يأكلها النظار أو غيرهم ويلزم من عدم النقل خراب المسجد الآخر المحتاج إلى النقل إليه'' (ردالمحتار ۳،۳۷۲)۔

شمس الائمہ حلوانی سے مروی ہے کہ ان سے ایسی مسجد اور حوض کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ویران ہو گئی ہو اور لوگوں کی آبادی ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہ ہو تو کیا قاضی کو اختیار ہے کہ وہ ان کے اوقاف کو کسی مسجد یا حوض کی طرف منتقل کر دے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جی ہاں اختیار ہے...... اور خاص طور سے ہمارے زمانہ میں، اس لئے کہ اگر مسجد اور اس کے علاوہ مثلاً سرائے اور حوض جب منتقل نہ کی جائیں گی تو چور اور شر پسند عناصر اس وقف کی ٹوٹی پھوٹی چیز پر اپنا قبضہ جما لیں گے، جیسا کہ مشاہدہ ہے، اور اسی طرح اس کے اوقاف کو منتظمین وغیرہ کھا جائیں گے، اور منتقل نہ کرنے سے ایک خرابی یہ بھی لازم آئے گی کہ وہ مسجد جو ضرورت مند ہے وہ بھی ویران اور خراب ہو جائے گی۔

نیز دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية، بأن لا يحصل منه شئ أصلا أو لا يفی بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضی ورأيه المصلحة فيه'' (ردالمحتار ۳،۳۸۷)۔

لیکن اگر وقف کی یہ حالت ہو گئی ہو کہ اس سے انتفاع بالکل نہ ہو رہا ہو بایں طور کہ اس سے کچھ حاصل ہی نہ ہوتا ہو یا اس کی آمدنی سے وقف کی ضرورت بھی پوری نہ ہوتی ہو تو بھی صحیح قول کے مطابق تبادلہ جائز ہے جب کہ قاضی کی اجازت سے ہو اور قاضی اس میں مصلحت دیکھتا ہو۔

اور اس سلسلہ میں فقیہ عصر ڈاکٹر وہبہ زحیلی یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''إذا انهدم وقف ولم يكن له شئ يعمر منه ولا أمكن إجارته ولا تعميره ولم تبق إلا أنقاضه من حجر وطوب وخشب صح بيعه بأمر الحاكم'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۸،۲۲۱)۔

جب وقف منہدم ہو گیا ہو اور اس کی تعمیر کے لئے کچھ نہ ہو، اور نہ ہی اس کو اجارہ پر دینا ممکن ہو اور نہ ہی اس کی تعمیر ممکن ہو، اور سوائے اس کی ٹوٹی پھوٹی چیز، مثلاً پتھر، اینٹ، اور لکڑی کے کچھ بھی باقی نہ ہو تو حاکم کی اجازت سے اسے فروخت کر دینا جائز ہے۔

علامہ شامی ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں: ''قال هشام: سمعت محمداً يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضی أن يبيعه ويشتری بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضی'' (رد المحتار ۳،۳۸۲)۔

ہشام فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمد کو کہتے ہوئے سنا کہ وقف جب اس حالت میں پہونچ جائے کہ اس سے مساکین کا فائدہ ختم ہو گیا ہو تو قاضی کو اختیار

ہے کہ وہ اسے فروخت کردے اور اس کے ثمن سے دوسری چیز خرید لے، اور یہ اختیار صرف قاضی کو ہے۔

ب۔ نیز ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کرکے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کرکے مقاصد وقف کو جاری رکھنے کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ یہ بھی مبادلۃ المال بالمال ہے، گو دونوں کی جنس ایک ہے۔

ایسے ویران ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کرکے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم نہیں کئے جاسکتے ہیں، بلکہ انہی جیسا دوسرا وقف قائم کرنا ہوگا، اور اگر ممکن نہ ہو تو اس کی قیمت انہی جیسے دیگر اوقاف جو اس سے قریب ترین ہوں اس میں صرف کیا جائے گا (یہی مسلک علامہ ابن تیمیہ کا بھی ہے، فقہ السنۃ ۳؍ ۳۸۴)، چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

''الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما، فيصرف وقف المسجد والرباط والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أوحوض إليه'' (الدر المختار)۔

(سرائے اور کنواں سے جب انتفاع ختم ہوجائے تو مسجد، سرائے اور حوض کے وقف کو قریب کی مسجد یا سرائے، کنواں یا حوض پر خرچ کیا جائے گا)۔

زائد از ضروریاتِ مسجد کا مصرف:

بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں مساجد اور مدارس یا مقابر کے بڑے بڑے اوقاف ہیں اور مسلمانوں کی آبادی وہاں معمولی رہ گئی ہے، مثلاً ایک مسجد ہے اس کے لئے بہت سی زمینیں اور مکانات وقف ہیں، مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے کہیں زیادہ ہے، ایسی زائد آمدنی سے جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہے، اس سے نہ تو دینی یا عصری تعلیمی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی مسجد کی آمدنی کو رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس آمدنی کو مسجد کی مرمت وغیرہ میں صرف کیا جائے، نیز مصالح مسجد، مثلاً امام، خطیب، مسجد کی لائٹ وروشنی اور چٹائی وغیرہ میں صرف کیا جائے گا، پھر بھی اگر کچھ بچ جائے تو دوسری قریب کی مسجد میں صرف کیا جائے گا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے شیخ اشرف علی تھانویؒ (م: ۱۳۶۲ھ) کی عبارت ملاحظہ ہو:

''مدرسہ جنس مسجد سے نہیں، اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے، اگر اس شہر میں حاجت نہ ہو تو دوسرے شہروں کی مساجد میں صرف کریں جو زیادہ قریب ہو اس کا حق مقدم ہے، اسی طرح بہ ترتیب (امداد الفتاوی ۲؍ ۵۹۶)۔

اور علامہ علاء الدین حصکفیؒ (م: ۱۰۸۸ھ) تحریر فرماتے ہیں: ''ويبدأ من غلته بعمارته ثم ما هو أقرب لعمارته كإمام مسجد ومدرس مدرسة يعطون بقدر كفايتهم ثم السراج والبساط كذلك إلى آخر المصالح و إن لم يشترطه الواقف لثبوته اقتضائ'' (الدر المختار مع الرد ۳؍ ۳۷۶)۔

اس کی آمدنی پہلے اس کی عمارت پر اور پھر اس کو آباد کرنے والے ذرائع پر خرچ کی جائے گی، مثلاً مسجد کا امام اور مدرسہ کا مدرس ان کو انکی کفایت کے بقدر دیا جائے گا، پھر چراغ اور چٹائی پر خرچ کیا جائے گا، اسی طرح آخری مصلحت تک، گرچہ واقف نے اس کی شرط نہ لگائی ہو، اس لئے کہ یہ اقتضائی ثابت ہے۔

اس عبارت میں ''مدرس مدرسہ'' سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسہ بھی مصارف مسجد میں شامل ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ اشرف علی تھانویؒ (م: ۱۳۶۲ھ) رقمطراز ہیں:

''اس سے مراد یہ ہے کہ وقف علی المسجد میں امام وغیرہ مصارف ضروریہ سے ہے اور وقف علی المدرسہ میں مدرس وغیرہ مصارف ضروریہ سے ہے، اور یہ مراد نہیں کہ وقف علی المسجد میں یہ سب مصارف ہیں، بلکہ دو ورق کے بعد ایک جزئی مصرح ہے کہ اگر مسجد کے وقف میں مدرس بھی مشروط فی الوقف ہو وہ خود مصارف لازمہ سے نہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: امداد الفتاوی ۲؍ ۵۹۷)۔

دیگر اوقاف کی زائد آمدنی کا مصرف:

الف۔ بہت سے اوقاف ایسے ہیں جن کی آمدنی ان کے لئے متعین مصارف سے بہت زیادہ ہوتی ہے، جو سال بسال جمع ہو کر بڑا سرمایہ بنتی جاتی ہے جس کی طویل عرصہ تک حفاظت ایک دشوار مسئلہ، بلکہ خالی از خطرہ نہیں، یہ خطرہ حکومت کی دست درازی کا بھی ہوتا ہے اور منتظمین وغیرہ کی طرف سے بھی، اور نہ ہی روزمرہ کی ضروریات کے اندر اس کے صرف کو سوچا جاسکتا ہے اور نہ آئندہ حفاظت یا اصلاح و مرمت وغیرہ کے کاموں کے لئے، ایسی صورت میں فاضل آمدنی دوسرے

مواقع میں صرف کرنا درست ہے، مثلاً اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں صرف کردیا جائے اور یہی بہتر ہے، چنانچہ مفتی نظام الدین اعظمی (حفظہ اللہ) تحریر فرماتے ہیں:

"اس کی آمدنی سے دوسرے محتاج اعانت قبرستان پر خرچ کرنا یا مستقل دوسرا قبرستان قائم کرنا زیادہ قابل ترجیح ہوگا" (نظام الفتاوی ۱/۱۷۵)۔

ب۔ نیز اس زائد آمدنی کو دیگر ملی، دینی وعلمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں بھی صرف کرنا جائز ہے، چنانچہ مولانا موصوف (مدظلہ العالی) تحریر فرماتے ہیں:

"اور اگر دوسرا قبرستان محتاج اعانت نہ ہو تو اس کی آمدنی دینی مدارس پر خرچ کی جائے یا اس میں مسجد کی تعمیر کردی جائے یا دینی مدرسہ قائم کردیا جائے (نظام الفتاوی ۱/۱۷۵)۔

علامہ ابن تیمیہ کی عبارت اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

"فإنه يصرف ريع الوقف عليه إلى غيره وما فضل من ريع وقف عن مصلحته صرف في نظيره أو مصلحة المسلمين من أهل ناحيته ولم يحبس المال دائما فلا فائدة" (مجموعة الفتاوى ۳۱/۱۸)۔

کسی پر وقف شدہ چیز کی آمدنی اسی پر خرچ کی جائے گی اور جو اس کے مصالح سے بچ جائے اس کو اسی مثل میں یا اسی محلہ کے مسلمانوں کی ضروریات میں خرچ کیا جائے گا اور مال کو بلا فائدہ ہمیشہ روکے رکھنا جائز نہ ہوگا۔

ملی ودینی اور علمی کام مثلاً مدارس ومکاتب کی تعمیر نیز مساجد بھی مصالح مسلمین میں سے ہیں لہٰذا ان میں صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اوقاف کو زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے فروخت کرنا:

بہت سے اوقاف اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہیں، مثلاً کسی مسجد یا مدرسہ پر کوئی مکان وقف ہے جو محلہ کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے معمولی کرایہ ملتا ہے جس سے مسجد یا مدرسہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، اور اس کو فروخت کرکے کسی تجارتی مقام پر کوئی دوکان خرید لی جائے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی مکان موقوفہ کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہوسکتی ہے، اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے مکان موقوفہ کو فروخت کرکے وقف کی آمدنی بڑھانے کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں قاضی القضاۃ امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق جو مفتی بہ ہے اس کو فروخت کرکے دوسری جگہ جو زیادہ منفعت بخش ہو خرید کی جاسکتی ہے، چنانچہ علامہ شامی نقل فرماتے ہیں:

"الرابعة أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن صقعاً، فيجوز على قول أبي يوسف، وعليه الفتوى، كما في فتاوى قارئ الهداية" (رد المحتار ۳/۳۸۹، نیز ملاحظہ ہو: الفقه الاسلامي وادلته ۸/۲۲۲)۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ لوگ زیادہ آمدنی اور بہترین جائے وقوع کی وجہ سے تبادلہ کے خواہاں ہوں تو امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق جائز ہے اور اسی پر فتوی ہے، جیسا کہ "قاری الہدایہ" کے فتاوی میں ہے۔

لیکن علامہ شامی آگے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چونکہ آج کل دیانتداری کا فقدان ہے اور ہر طرف ظلم وزیادتی کا دور دورہ ہے، دلوں میں خوف خدا کا نام ونشان تک نہیں، ذمہ دار اور ظاہراً اچھے لوگوں کا دامن بھی اس سے پاک نہیں، اس لئے آج کے دور میں سداً للذریعہ امام ابویوسفؒ کے قول پر فتوی دینا زیادہ مناسب ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

"وقد شاهدنا في الاستبدال ما لا يعد ولا يحصى فإن ظلمة القضاة جعلوه حيلة لإبطال أوقاف المسلمين وعلى تقديره فقد قال في الإسعاف: المراد بالقاضي وهو قاضي الجنة المفسر بذي العلم والعمل ولعمري أن هذا أعز من الكبريت الأحمر، وما أراه إلا لفظا يذكر، فالأحرى فيه السد خوفا من مجاوزة الحد والله سائل كل إنسان" (رد المحتار ۳/۳۸۹)۔

(استبدال کے سلسلہ میں ہم نے ان گنت مرتبہ مشاہدہ کیا ہے کہ ظالم قاضی اس استبدال کو مسلمانوں کے اوقاف کو باطل کرنے کا حیلہ بناتے ہیں، اسی وجہ سے اسعاف میں مصنف نے کہا کہ قاضی سے مراد قاضی الجنۃ ہے، یعنی جس کے پاس علم اور عمل دونوں ہوں، لیکن میری جان کی قسم اب ایسے لوگ کہاں ملتے

ہیں، بس یہ کہنے کی بات ہے، لہذا مناسب یہی ہے کہ حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے خوف سے عدم جواز ہی کا فتوی دینا چاہئے، اللہ تعالی ہر انسان سے پوچھ گچھ کرنے والا ہے)۔

اسی وجہ سے علامہ بیری کا قول نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''قال العلامة البيرى... فينبغى أن لا يجوز؛ لأن الواجب إبقاء الوقف على ماكان عليه دون زيادة ولأنه لا موجب لتجويزه؛ لأن الموجب فى الأول الشرط وفى الثانى الضرورة ولاضرورة فى هذا إذ لا تجب الزيادة بل تبقيه كما كان'' (رد المحتار ۳،۳۸۹)۔

علامہ بیری نے فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ یہ جائز نہ ہو، اس لئے کہ وقف کو اسی حالت میں باقی رکھنا واجب ہے نہ کہ زیادتی کرنا، اور اس لئے بھی کہ اس کے جواز کی کوئی چیز متقاضی بھی نہیں ہے، پہلے میں تو تقاضا کرنے والی چیز شرط تھی اور دوسرے میں ضرورت، اور یہاں کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ زیادتی واجب نہیں، بلکہ اس کو علی حالہ باقی رکھنا واجب ہے۔

اور شرائط استبدال بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''والثالث أن لا يشرطه أيضا ولكن فيه نفع فى الجملة وبدله خير منه ريعاً ونفعاً، وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار'' (کتاب مذکور ۳،۳۸۷، نیز ملاحظہ ہو: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸،۲۲۱)۔

اور تیسری شرط یہ ہے کہ واقف نے استبدال کی شرط نہ لگائی ہو، لیکن اس میں فی الجملہ نفع بھی ہوتا ہو اور اس کا تبادلہ فائدہ کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہو، تو بھی اصح اور مختار قول کے مطابق استبدال جائز نہیں۔

لیکن اگر واقعی دیانتداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اللہ تبارک وتعالی کے پکڑ سے خوف کھاتے ہوئے اوقاف کو زیادہ منافع بخش بنانے کی غرض سے اس کو فروخت کرکے دوسری جگہ خریدنے کا کوئی ذمہ دار شخص ارادہ رکھتا ہو تو اسے اس کی اجازت ہونی چاہئے، جیسا کہ ابو یوسفؒ کا مسلک ہے، ورنہ نہیں۔

اوقاف کے مصارف ختم ہوجانے کی صورت میں آمدنی کا مصرف:

بہت سے اوقاف ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے مصارف ختم ہو چکے ہوتے ہیں، مثلاً کوئی جاگیر کسی خاص خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی وہ خاندان اب ختم ہوگیا یا اس خاندان کے افراد دوسری جگہ منتقل ہوگئے، یا مثلاً کسی مسجد ومدرسہ کے لئے وقف تھا اور اب نہ وہ مسجد باقی ہے اور نہ ہی مدرسہ، تو ایسے اوقاف کی آمدنی کا مصرف دوسرے فقراء ہوں گے یعنی محلہ، گاؤں اور شہر کے دیگر محتاج اور ضرورتمند لوگوں کے مصارف میں خرچ کیا جائے گا، جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کا قول ہے، چنانچہ علامہ داماد آفندی تحریر فرماتے ہیں:

''وإذا انقطع المصرف صرف إلى الفقراء ولايعود إلى ملكه إن كان حيا وإلى وارثه إن كان ميتاً'' (مجمع الانہر ۱،۷۳۴، نیز دیکھئے: شامی ۳،۳۶۶)۔

(جب مصرف ختم ہوجائے تو فقراء کو دے دیا جائے گا، وہ نہ واقف کی ملکیت میں واپس آئے گا اگر وہ زندہ ہو اور نہ ہی اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث کی ملکیت میں)۔

اور علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں: ''واختلف الترجيح والأخذ بقول أبى يوسف أحوط وأسهل كما فى المنح عن البحر وبه يفتى، كما فى الدرر و صدر الشريعة، وفى الفتح أنه أوجه عند المحققين'' (در المنتقی بهامش المجمع ۱،۷۳۴، اور دیکھئے: درمختار مع الرد ۳،۳۶۶)۔

(ترجیح میں اختلاف ہے، تاہم امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کرنے میں زیادہ احتیاط بھی ہے اور آسانی بھی، جیسا کہ منح میں بحر سے نقل کیا ہے، درر اور صدر الشریعہ میں ہے کہ اسی پر فتوی ہے، اور فتح القدیر میں ہے کہ محققین کے نزدیک یہی زیادہ مناسب ہے)۔

الف۔ کسی بلڈر کو اوقاف مشروط طور پر حوالہ کرنا:

بعض اوقاف کی عمارتیں، مثلاً مخدوش حالت میں ہیں اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ نہیں ہے کہ اس کی از سر نو تعمیر کی جائے یا اس کی اصلاح و مرمت کا کام ہو سکے، لیکن کوئی عمارتی ٹھیکیدار اس کے لئے تیار ہے کہ اس مخدوش عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط کے ساتھ تعمیر کر دیگا کہ اس کی ایک یا دو منزل اس کی ملکیت ہوگی جس میں اس (بلڈر) کو ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا اور بقیہ وقف کے لئے، ایسا معاملہ کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا۔ یا کوئی موقوفہ زمین ہے جس پر کسی طرح کی کوئی عمارت نہیں اور نہ ہی اس زمین سے انتفاع کی کوئی صورت ہے اس زمین سے فائدہ اٹھانے کے لئے کسی بلڈر سے مذکورہ معاملہ کرنا شرعی نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ متولی اور ذمہ دار حضرات کو اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ وقف کا کچھ حصہ فروخت کر کے بقیہ کی ترمیم واصلاح وغیرہ کرے، "عالمگیری" میں ہے:

"إذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضا منها ليرم الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك" (الفتاوى الهنديه ۲،۴۱۷)۔

(جب وقف کی زمین خراب ہو جائے اور متولی کا ارادہ ہو کہ اس میں سے بعض حصہ کو فروخت کر کے ثمن سے باقی کی ترمیم کرے تو یہ اس کے لئے جائز نہ ہوگا)۔

جب ترمیم کے لئے بعض حصہ کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے تو اس کو اس بات کا اختیار دینا کیوں کر ممکن ہوگا کہ وہ بلڈر کو وقف کا ایک حصہ بطور ملک دے دے۔ ہاں اگر کسی بلڈر سے ایسا معاملہ ہو گیا ہو تو جس حصہ یا عمارت کے ملکیت بلڈر میں چلے جانے کی شرط ٹھہری تھی وہ اس کی ملکیت میں داخل تو نہیں ہوگی، البتہ اس کے خرچ کو پورا کرنے کے لئے پوری (تیار شدہ) عمارت یا اس کا کچھ حصہ اس بلڈر کو بطور اجارہ دے دیا جائے تا کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنا صرفہ وصول کر لے۔

ب۔ ترمیم واصلاح کے لئے وقف کے بعض حصہ کی فروختگی:

اسی طرح کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے وقف شدہ زمین و جائداد کا کوئی حصہ فروخت کر کے اس سے نئی تعمیر کرنے کی فقہ حنفی میں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی ہے، چنانچہ "عالمگیری" میں ہے:

"وإذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضا منها ليرم الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك فإن باع القيم شيئا من البناء لم ينهدم ليهدم أو نخلة حية لتقطع فالبيع باطل فإن هدم المشتري البناء أو صرف النخلة ينبغي للقاضي أن يخرج القيم عن هذا الوقف؛ لأنه صار خائنا ثم القاضي إن شاء ضمن قيمة ذلك البائع وإن شاء ضمن المشتري فإن ضمن البائع نفذ بيعه وإن ضمن المشتري يبطل بيعه" (الفتاوى الهنديه ۲،۴۱۷)۔

جب وقف کی زمین خراب ہو جائے اور متولی کا ارادہ ہو کہ اس میں سے بعض کو فروخت کر دے، تا کہ ثمن سے اس کی ترمیم ہو جائے تو یہ اس کے لئے جائز نہ ہوگا، لہذا اگر غیر منہدم عمارت کا کچھ حصہ فروخت کر دیا تا کہ اسے منہدم کر دیا جائے یا شاداب کھجور کے درخت کو فروخت کیا تا کہ اسے کاٹ دیا جائے تو بیع باطل ہو جائے گی، چنانچہ اگر مشتری نے عمارت کو ڈھا دیا یا کھجور کے درخت کو اکھاڑ دیا تو قاضی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس متولی کو اس وقف سے برطرف کر دے اس لئے کہ وہ خیانت کرنے والا ہو گیا، پھر قاضی چاہے تو مشتری کو ضامن قرار دے، اور اگر چاہے تو اسی بائع کو ضامن قرار دے، اگر وہ بائع کو ضامن قرار دیگا تو اس کی بیع نافذ ہو جائے گی اور اگر مشتری کو ضامن قرار دیا تو اس کی بیع باطل ہو جائے گی۔

اس کی از سر نو تعمیر کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ موقوفہ زمین کو اجارہ پر دیدیا جائے اور حاصل شدہ آمدنی سے اس کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔

مسجد یا قبرستان کی موقوفہ زمین پر مدرسہ کی تعمیر:

کیا مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین جو کہ ضروریات سے زائد ہو اس پر مدرسہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں مسجد کے اوقاف اور دیگر اوقاف میں فرق کرنا چاہئے کہ مساجد کے اوقاف تو صرف مصالح مسجد، مثلاً اس کی ترمیم، امام ومؤذن اور خطیب وغیرہ کی تنخواہیں یا متولی وذمہ داران یا دوسری محتاج تعمیر مساجد کی ضروریات میں صرف کی جائیں، مدرسہ وغیرہ بنانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، چنانچہ علامہ اشرف علی تھانوی (م: ۱۳۶۲ھ) لکھتے ہیں۔

"مدرسہ جنس مسجد سے نہیں اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے اگر اس شہر میں حاجت نہ ہو تو دوسرے شہروں کی مساجد میں صرف کریں

جوزیادہ قریب ہو اس کا حق مقدم ہے اسی طرح بہ ترتیب'' (امداد الفتاوی ۲/ ۵۹۶)۔

ہاں دیگر اوقاف کی ضروریات سے زائد چیزیں، مثلاً قبرستان کی موقوفہ زمین جو اس قبرستان کے مصارف سے زائد ہے اس پر مدرسہ کی تعمیر کی گنجائش ہے، چنانچہ حضرت مفتی نظام الدین صاحب (مدظلہ العالی) کی رائے ہے:

''اور اگر قبرستان محتاج اعانت نہ ہو تو اس کی آمدنی دینی مدارس پر خرچ کی جائے یا اس میں مسجد تعمیر کردی جائے یا دینی مدرسہ قائم کردیا جائے'' (نظام الفتاوی ۱/ ۱۷۵)۔ اور علامہ ابن تیمیہؒ کی تحریر بھی ملاحظہ ہو:

''وما فضل من ريع الوقف عن مصلحته صرف في نظيره أو مصلحة المسلمين من أهل ناحيته ولم يحبس المال دائما بلا فائدة'' (مجموعة الفتاوی ۳۱/ ۹۳)۔

(اور وقف کے منافع جو اس کی مصلحت سے بچ جائے اس کو اسی کے ہم شکل میں صرف کیا جائے گا یا اسی محلہ کے مسلمانوں کی مصلحت میں، اور مال کو بلا فائدہ ہمیشہ نہیں روکا جائے گا۔

یہ واضح رہے کہ مدارس ومکاتب دینیہ کا قیام بھی مصالح مسلمین میں سے ہے۔

تدفین پر پابندی لگائے گئے قبرستان سے انتفاع کی شکل:...... جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادی ختم ہوجانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہ ہو رہا ہو یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آجانے کی وجہ سے اس کے استعمال اور اس میں تدفین پر پابندی عائد کردی گئی ہو اور اس کی وجہ سے ان پر قبضہ کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں ان سے انتفاع کی جتنی شکل ہوسکتی ہے اختیار کرنا ضروری ہے، مثلاً یہ کہ اس کو چہار دیواری سے محفوظ کرکے اس میں کل کے اندر باغ لگا دیا جائے، یا مثلاً اسی کے حواشی پر بیرون رخی دوکانیں اور اندر باغ لگا دیا جائے اور اس کی آمدنی سے دوسرے قبرستان کی زمین خرید لی جائے یا دوسرا قبرستان ہو تو اس پر خرچ کیا جائے، یا اگر نہ دوسرے قبرستان کی ضرورت ہو اور نہ ہی دوسرا قبرستان محتاج اعانت ہو تو اس کی آمدنی دینی مدارس پر خرچ کیا جائے یا اس میں مسجد کی تعمیر کردی جائے یا مدرسہ قائم کردیا جائے یا نفع عام کے لئے کوئی رفاہی، دینی کام کیا جائے جس سے مسلم عوام اور بچوں کی مذہبی واقتصادی تربیت وترقی کا ایسا کام کیا جائے کہ اصل واقفین کو ثواب پہنچتا رہے، اس لئے کہ واقف کا قبرستان کے لئے زمین وقف کرنا مسلمانوں کے نفع عام کے لئے ہی تھا۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے دوکانوں کی تعمیر:...... قبرستان کی حفاظت کے لئے جس اقدام کی ضرورت ہو وہ عمل میں لانا ضروری ہے، اس میں تساہل وکاہلی اور لاپرواہی سے کام لینا قطعاً جائز نہیں، مثلاً اسکو چہار دیواری سے گھیر دینا چاہئے اگر چہار دیواری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو کم سے کم کانٹے دار تار وغیرہ سے ہی سہی اسے محفوظ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اگر تار سے کام نہ چلتا ہو اور چہار دیواری کے بنانے کا بھی کوئی ذریعہ نہ ہو، اور حکومت یا دیگر شرپسند لوگوں کی طرف سے قبضہ کا خطرہ ہو تو اس قبرستان کے اطراف بیرون رخی دوکانیں تعمیر کرادی جائیں، جس کے لئے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے لی جائے اور اس سے کام کرایا جائے، ایسا کرنے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا، گو اس کام میں قبرستان کے اطراف چندفٹ زمین دوکانوں میں چلی جائے گی، اس لئے کہ اس قبرستان کی حفاظت کے لئے اور کوئی دوسری سبیل نظر نہیں آتی، بعد میں ان دوکانوں کی آمدنی اسی قبرستان کے مصارف میں خرچ کئے جائیں اور فاضل آمدنی دوسرے محتاج اعانت قبرستان یا دینی مدارس پر صرف کیا جائے یا مسجد اور مدرسہ کی تعمیر کردی جائے، یا دیگر مصارف خیر میں صرف کیا جائے۔

قبرستان میں مسجد کی توسیع:

بہت سے بڑے شہروں میں دیکھا گیا ہے کہ وسیع قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوتی ہے جو ممکن ہے کسی زمانہ میں تدفین کے لئے آنے والے حضرات کی رعایت سے بنائی گئی ہو کہ وہ وہاں نماز ادا کرسکیں، اب یہ دیکھا جارہا ہے کہ اس علاقہ میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مسجد کی توسیع ضروری ہوگئی ہے، تو کیا اس قبرستان کی زمین میں مسجد کی توسیع کرسکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل ہے کہ اگر اس قبرستان میں تدفین کا سلسلہ جاری ہے یا اس مسجد کے آس پاس جدید قبریں ہیں تو ایسی صورت میں دائیں بائیں آگے اور پیچھے اس مسجد کی توسیع کی گنجائش نظر نہیں آتی، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ اوپر کی منزلوں میں توسیع کریں ایک دو جتنی منزلیں چاہیں اوپر بنا سکتے ہیں اور اس طرح توسیع کا عمل کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر قبرستان بہت پرانا ہوگیا ہے اور اس میں تدفین کا سلسلہ ختم ہوچکا ہے، یا قبرستان تو زیر استعمال ہو، لیکن آس پاس کی قبریں اتنی پرانی ہوگئی ہوں کہ جسد میت کے مٹی ہوچکنے کا ظن غالب ہوچکا ہو تو اس قبر میں دوسرے مردہ کو دفن کرنا، اس

پر کھیتی کرنا اور مکان بنا لینا درست ہے، چنانچہ عالمگیری میں تبیین الحقائق سے نقل کیا گیا ہے:

''لو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه'' (الفتاوی الهندیه ۱۶۸،۱، نیز ملاحظہ ہو: رد المحتار ۶۰۶،۱۔ کتاب الجنائز)۔

اگر میت گل کر مٹی ہو جائے تو اس کے علاوہ دوسرے میت کو اس کی قبر میں دفن کرنا جائز ہے، نیز اس پر کھیتی کرنا اور عمارت بنانا بھی جائز ہے جب کھیتی کرنا اور مکان بنانا جائز ہے تو اس پر مسجد کی توسیع اور تعمیر بلاشبہ جائز و درست ہوگی، چنانچہ ''تاریخ الکعبۃ المعظمۃ'' میں ہے:

''ما بین المقام والرکن وزمزم قبر تسعة وتسعین نبیاً'' (ص ۱۶۷)۔

(مقام ابراہیم اور رکن اور چاہ زمزم کے درمیان ننانوے نبیوںؑ کی قبریں ہیں)۔

اور اسی کتاب میں ہے کہ جب کسی نبی کی امت ہلاک کردی جاتی تھی تو نبی علیہ السلام بیت اللہ شریف کے پاس آ کر پناہ لیتے تھے اور وہیں تا زندگی عبادت میں مشغول رہتے تھے، اور ظاہر ہے کہ نبی کی جس جگہ وفات واقع ہوتی ہے وہ اسی جگہ مدفون ہوتے ہیں، اور اب جب کہ ان قبروں کے نشانات صدیوں سے کسی کو معلوم نہیں تو کہنا پڑے گا کہ مسجد حرام کی توسیع میں زمانہ قدیم سے وہ قبریں حدود حرم میں آ گئیں، اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کی قبریں حطیم میں ہیں جو حدود مطاف میں ہے اور قبروں کا کوئی نشان نہیں، یہ باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ پرانی قبروں کے نشانات مٹا کر بھی توسیع مسجد و تعمیر جائز ہے۔

اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا:

اس سلسلہ میں نفی یا اثبات میں کچھ عرض کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شرائط تولیت پر ایک نظر ڈال لی جائے، دور حاضر کے مشہور عالم دین اور مذاہب اربعہ کے معتمد ناقل ڈاکٹر وہبہ زحیلی (حفظہ اللہ) نے لکھا ہے کہ ناظر و متولی کے لئے کل تین شرطیں ہیں: (۱) عدالت: یعنی دیانتداری کی صفت ناظر و متولی میں پائی جانی چاہئے، یہ جمہور کا قول ہے، حنابلہ عدالت کی شرط نہیں لگاتے ہیں۔ (۲) کفایہ: یعنی قوت کا ہونا بھی ضروری ہے، تا کہ وہ ان تصرفات کے انجام دینے پر قادر ہو جن کا انہیں حق ہے، اسی قدرت میں بلوغ اور عقل کی شرط شامل ہے، البتہ مذکر ہونا شرط نہیں، بلکہ عورت بھی تولیت کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ (۳) اسلام: یعنی اگر اوقاف مسلمانوں کے ہیں تو ان کا ناظر اور متولی بھی مسلمان ہونا چاہئے یا مسجد جیسی دینی اور مذہبی چیزوں کے لئے مسلمان متولی کا ہونا ضروری ہے، ہاں اگر اوقاف غیر مسلم کے لئے ہیں تب غیر مسلم بھی ان کی تولیت کے فرائض انجام دے سکتے ہیں، یہ مسلک جمہور کا ہے تاہم حنفیہ اس تیسری شرط کے قائل نہیں ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الفقه الاسلامی وأدلته ۲۳۲/۸)۔ علامہ شامی بھی حنفیہ کی ترجمانی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ویشترط للصحة بلوغه وعقله لا حریته وإسلامه لما فی الإسعاف'' (رد المحتار ۳،۳۶۵)۔

(صحت تولیت کے لئے متولی کا بالغ ہونا اور عقل مند ہونا شرط ہے، اس کا آزاد ہونا اور مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، جیسا کہ اسعاف میں ہے)۔

اوپر مذکور تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا جائز ہے، تاہم ہم مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ ایسے اوقاف کو مسلم وقف بورڈ کے تحت لائیں اور اس کوشش میں ہر فرد کو ایک دوسرے کا تعاون کرنا اپنا فریضہ سمجھنا چاہئے۔ ☆☆☆

زائد از ضرورت اوقافی جائداد کا حکم

مولانا قمر الزماں ندوی

اسلام ایک مکمل دین اور کامل دستور العمل ہے، جس میں انسان کے زندگی گذارنے کے لئے تمام اسباب و وسائل فراہم اور مہیا ہیں، مذہب اسلام کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اس نے انسان کے معاشی مشکلات اور اقتصادی پریشانی کو دور کرنے کے لئے مختلف مدات کو متعین کیا ہے تاکہ انسان صحیح طریقے سے زندگی گذار سکے، ان مدات میں ایک اہم شعبہ اوقاف کا ہے جس میں ایک شخص اپنی جائداد کو للہ فی اللہ وقف کرتا ہے، تاکہ محتاج و ضرورت منداپنی ضرورتوں کو پوری کرسکیں، اسکے ساتھ ہی موجودہ دور میں حکومت اور متولیان وقف کی بے راہ روی اور حرص و ہوس کی وجہ سے اوقاف کے چند نئے مسائل ابھر کر سامنے آگئے ہیں، ذیل میں ان سوالوں کے جوابات جدید وقدیم فقہ وفتاوی کی کتابوں سے دیئے جارہے ہیں (واللہ من وراء القصد وھو یھدی السبیل)۔

الف۔ ایسے اوقاف کو جو مسلمانوں کی آبادی کے منتقل ہوجانے کی وجہ سے ویران ہوچکے ہیں اور جن مقامات پر وہ اوقاف ہیں اگر وہاں دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہو، اور واقف کے مقاصد کو بروئے کار لانا ناقابل عمل ہوگیا ہو تو ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب اوقاف کے ضائع ہوجانے کا ظن غالب ہو، یا بالکل ہی ناقابل انتفاع ہوجائیں، تو فروخت کر کے ان کے بدلے میں متوازی و مماثل دوسری چیزیں خرید کر وقف کردی جائیں۔

''قال هشام: سمعت محمدا يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضي'' (البحر الرائق ۵؍۲۰۷)۔

(ہشام کہتے ہیں کہ امام محمدؒ سے کہتے ہوئے سنا کہ جب وقف اس پوزیشن میں ہوجائے کہ اس سے مساکین فائدہ نہ اٹھاسکیں تو قاضی کو حق ہے کہ وہ اسکو بیچ دے اور اس کی قیمت سے اسی کے متوازی خرید لے، یہ حق صرف قاضی ہی کو ہے)۔

''عن شمس الأئمة الحلواني ينقل الذخيرة حين سئل عن أوقاف المسجد إذا تعطلت هل للمتولي أن يبيعه ويشتري مكانه أخرى قال: نعم، والمختار أنه يجوز بيعها إن احتاجوا إليه قال الفقيه أبو جعفر ينبغي أن يكون ذلك بأمر الحاكم احتياطا في موضع الخلاف'' (البحر الرائق ۵؍۲۰۷)۔

(شمس الائمہ حلوانی نقل کرتے ہیں، جب ان سے اس مسجد کے اوقاف کے بارے میں سوال کیا گیا جو معطل اور بیکار ہو، کیا متولی کو یہ حق ہے کہ وہ اس کو بیچ کر دوسری خرید لے تو انہوں نے کہا ہاں، اور مناسب اور درست یہ ہے کہ بیچنا جب واقعتاً ضروری ہو تو جائز ہے، فقیہ ابوجعفر کہتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ مختلف فیہ مقامات میں یہ حکم حاکم کی اجازت سے ہو)۔

ب۔ ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالے کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے، لیکن عمومی صورت میں نہیں، یہ اس صورت میں ہے جب اوقاف پر حکومت اور غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جارہا ہو اور جن مقامات پر وہ اوقاف ہوں ان کو آباد کرنا ناممکن ہوگیا ہو۔

ویران ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعے مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنا درست نہیں ہے، واقف کے منشا کا خیال بہر حال ضروری ہے۔

الف۔ ایسے مقامات جہاں مساجد اور مدارس یا مقابر کے بڑے بڑے اوقاف ہوں اور مسلمانوں کی آبادی بہت ہی معمولی رہ گئی ہو، مثلاً ایک مسجد ہے اس کے لئے بہت سی زمینیں اور مکانات وقف ہوں، اور مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے زیادہ ہو تو اس صورت میں اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر مسجد میں اس کی

ضرورت بالکل نہ ہو تو مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ اوقاف کی زائد آمدنی وقف شدہ چیزوں ہی میں صرف کیا جائے، اگر واقف وقف کرتے وقت استبدال کی شرط نہیں لگائی تھی تو وقف تام ہو جانے کے بعد اس عبارت ''وأما الاستبدال ولو للمساکین بدون شرط فلا یملک'' کی وجہ سے یہ استبدال جائز نہ ہوگا۔

ب- مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کرنا اس صورت میں بالکل درست نہیں ہے، جبکہ واقف نے ان زمینوں اور مکانات کو مسجد ہی کے لئے وقف کیا ہو۔

ایسے اوقاف جن کی آمدنی متعین مصارف سے بہت زیادہ ہو اور سال بسال جمع ہو کر ایک بڑا سرمایہ بنتی جاتی ہو اور طویل عرصہ تک حفاظت دشوار ہی نہیں، بلکہ خالی از خطرہ نہ ہو، تو ایسی صورت میں فاضل آمدنی کا دوسرے اوقاف کی ضروریات، نیز ملی ودینی، علمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں استعمال کرنا بالکل درست ہو گا، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما، فيصرف وقف المسجد والرباط والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر...'' (شامی ۴،۴۰۷)۔

(مسجد کی گھاس مسجد کی چٹائی اسی طرح رباط اور کنواں جب مسجد کی ضرورت سے زیادہ ہو اور اس سے انتفاع بھی ناممکن ہو تو مسجد کے وقف کو رباط اور حوض کو کسی قریبی مسجد یا رباط یا کنویں میں صرف کر دینا چاہئے)۔

وہ اوقاف جو اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہیں، مثلاً کسی مسجد یا مدرسہ پر کوئی مکان وقف ہے، لیکن اس کا کرایہ بہت معمولی ہے جس سے مسجد یا مدرسہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں تو اس صورت میں اس کم منفعت بخش اوقاف کو فروخت کر کے دوسرے مقام پر اگر تجارتی دکان خرید لی جائے جس سے آنے والی آمدنی اس سے کئی گنا زیادہ ہو تو ایسا کیا جاسکتا ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''وفي المنتقى قال هشام: سمعت محمدا يقول: الوقف إذا صار بحيث لاينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضي'' (شامی ۴،۴۱۹)۔

(منتقی میں ہے ہشام کہتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ وقف جب اس حیثیت میں ہو جائے کہ اس سے مساکین کا فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو تو قاضی کے لئے حق ہے کہ وہ اس کو بیچ دے اور اس کی قیمت سے دوسرا خرید لے اور یہ حق صرف قاضی کے لئے ہے)۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں: ''وقد روى إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستعمال والقيم يجد بثمنها أخرى أكثر ريعا كان له أن يبيعها ويشتري بثمنها ما هو أكثر ريعا''۔

(اور روایت کی گئی ہے کہ جب موقوف شدہ زمین ہی استعمال کے لائق نہ رہے اور متولی اس کی قیمت سے دوسری جگہ اس سے زیادہ نفع بخش پائے تو اسکو حق ہے کہ وہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت سے اس سے زیادہ نفع والے کو خرید لے)۔

''وعن شمس الأئمة الحلواني حين سئل عن أوقاف المسجد إذا تعطلت هل للمتولي أن يبيعها ويشتري مكانها أخرى قال نعم'' (البحر الرائق ۵،۲۰۷)۔

(شمس الائمہ حلوانی سے مروی ہے کہ جب ان سے مسجد کے اوقاف کے سلسلے میں پوچھا گیا جب کہ وہ بیکار ہو گیا ہو تو کیا متولی کے لئے جائز ہے کہ وہ اسکو بیچ دے اور اس کی جگہ دوسری زمین خرید لے، انہوں نے کہا: ہاں!)۔

ایسے اوقاف جن کے مصارف ختم ہو چکے ہوں مثلاً کوئی جاگیر کسی خاص خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی، اور اب وہ خاندان ختم ہو گیا ہو یا اس کے افراد دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہوں، یا مسجد یا مدرسہ کے لئے وقف تھا لیکن اب نہ وہ مسجد ہے اور نہ مدرسہ، ان تمام صورتوں میں اوقاف کی آمدنی کا مصرف اس سے قریب جو مسجد اور مدرسہ ہے یا وہاں کے جو فقراء ہیں وہ اس کے مستحق ہوں گے، لیکن اگر وہاں کے رہنے والے اور وہاں کی مسجد اور مدرسہ اس سے مستغنی ہو تو متولی وقف کو اس کی اجازت ہے کہ وہ اس آمدنی کو انہی مصارف میں دوسری جگہوں پر خرچ کرے۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

''إذا سمي فيه جهة تنقطع جاز وصار بعدها للفقراء ولو لم يسمهم هذا هو الصحيح عندنا... ولا يعطى للفقراء شئ مادام الموقوف عليه حيا، فإذا مات صرف للفقراء'' (البحر الرائق ۵،۱۹۸)۔

جب وقف کے اندر کوئی جہت (مد) ایسی متعین کرے جو ختم ہوجائے تو اس کے بعد وہ فقراء کے لئے ہوجائے گا اگر چہ اس نے اس کی صراحت نہ کی ہو، اور فقراء کو اس میں سے کچھ نہیں دیا جائے گا جب تک موقوف علیہ باقی رہے، جب وہ مرجائے تو اس کو فقراء کی طرف منتقل کردیا جائے گا۔

الف۔ ایسے اوقاف جن کی عمارتیں مخدوش ہوں، اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے کوئی سرمایہ بھی نہ ہو، لیکن اگر کوئی بلڈر اس کے لئے تیار ہوجائے کہ اس مخدوش عمارت کو نئے سرے سے چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط کے ساتھ تعمیر کرے گا کہ اس کی ایک یا دو منزل اس کی ملکیت ہوگی اور اسکو ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا اور بقیہ وقف کے مصارف کے لئے، تو اس صورت میں اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ وقف شدہ زمین کسی کی ملکیت میں دینا درست نہیں ہے، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں کہ وقف شدہ زمین کا بیچنا، یا رہن میں رکھنا درست نہیں۔

''أنه لا يباع أصلها ولا تبتاع ولا تورث ولا توهب''۔

اوقاف کی چیزیں نہ بیچی جاسکتی ہیں اور نہ خریدی جاسکتی ہیں اور نہ وراثت اور ہبہ میں دی جاسکتی ہیں۔

آئندہ وہ زمین نہ تو بیچی جائے گی نہ خریدی جائے گی نہ اس میں وارثت جاری ہوگی اور نہ کسی کو ہبہ کی جاسکے گی۔ البتہ اس زمین کو اجرت پر دینا اور اس اجرت کی آمدنی سے وقف کی تعمیر کرنا درست ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

''قال في الخلاصة: هذا دليل إذا احتاج إلى نفقة تواجر قطعة بقدر ما ينفق عليه ولا شك أن باحتياجه إلى نفقة لا تتغير أحكامه الشرعية ولا يخرج به عن أن يكون مسجدا'' (البحر الرائق ۵،۳۰۲)۔

خلاصہ میں لکھا ہے کہ یہ دلیل ہے کہ جب کسی نفقے کی ضرورت پڑے تو کسی حصہ کو اجرت پر رکھ دے اور وہ اتنی مقدار میں ہو جس سے وہ خرچ مکمل ہوجائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وقف کے نفقے کے محتاج ہونے کی صورت میں اس کے شرعی احکام متغیر نہیں ہوتے اور...... علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''إن الخان لو احتاج إلى المرمة آجر بيتا أو بيتين وأنفق عليه'' (شامی ۴،۲۷٦)۔

اگر سرائے کی مرمت کی ضرورت پڑی تو ایک یا دو گھر اجرت پر رکھ دیا جائے گا جس سے اس پر خرچ کیا جائے۔

اسی طرح ایسے اوقاف جس پر کوئی عمارت نہ ہو اور اس سے انتفاع کی کوئی صورت نہ ہو تو اس زمین کو کچھ دنوں کے لئے اجرت پر رکھنا درست ہے جتنے دنوں میں اس زمین سے فائدہ اٹھانے کے لئے کوئی صورت نکل آئے۔ ہندیہ میں ہے:

''وكذلك وقف صحيح على أقوام مسمين خرب ولم ينتفع به وهو بعيد عن القرية لا يرغب في عمارته، فيجوز أن يستأجر بشئ قليل نبقي أصله وقفا'' (فتاوی ہندیہ ۲،۴۸۰)۔

اور اسی طرح وہ اوقاف صحیح جو کسی متعین قبیلہ اور جماعت کے لئے وقف ہو، خراب ہوجائے اور وہ قابل انتفاع نہ ہو اور وہ گاؤں سے اتنی دوری پر ہو کہ لوگ اس کی تعمیر کی طرف توجہ نہ دیتے ہوں تو جائز ہے کہ ان اوقاف میں سے کچھ حصہ کو اجرت پر دے دیا جائے جس سے اس اوقاف کو باقی رکھا جاسکے۔

ب: وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے وقف شدہ زمین و جائداد کا کوئی حصہ، اس کا ملبہ یا ان کے انقاض کو اسی وقت فروخت کر کے نئی تعمیر کی جاسکتی ہے، جب کہ اس کے بغیر یہ ممکن ہی نہ ہو اور مسجد کے اوقاف کا اجرت پر دینا بھی ناممکن ہو یا وہ مسجد کے اوقاف ایسی جگہ پر ہوں جس سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہو، ان صورتوں میں اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ اوقاف کی زمینیں اجرت پر رکھ کر ہی مسجد یا اوقاف کی تعمیر کی جائے، ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''حيث قال سئل عن وقف إنهدم ولم يكن له شئ يعمر منه ولا أمكن إجارته ولا تعميره هل تباع أنقاضه من حجر وطوب وخشب أجاب إذا كان الأمر كذلك صح بيعه بأمر الحاكم ويشترى بثمنه وقف مكانه'' (فتاوی ہندیہ)۔

ایسے وقف کے بارے میں سوال کیا گیا جو منہدم ہو جائے، اس کا تعمیر کرنا ناممکن ہو، اجرت رکھنا بھی ناممکن ہو، اور نہ ہی اس کی تعمیر ممکن ہو تو کیا اس کے اثاثہ کو بیچا جا سکتا ہے؟ جو پتھر، لکڑی، اینٹ، وغیرہ میں شامل ہے تو جواب دیا گیا کہ اگر معاملہ ایسا ہی ہو تو اس کی بیع حاکم کی اجازت سے صحیح ہے، اور اس کی قیمت سے اسی مکان کے مثل خریدے۔

مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین جو کہ ضرورت سے زائد ہو اور اس درجہ ہو کہ مدتوں وہاں تدفین کی ضرورت نہ ہو اور نہ ہی آئندہ ضرورت متوقع ہو تو اس صورت میں حواشی قبرستان پر مدرسہ کی عمارت تعمیر کرنا احقر کی رائے میں درست اور جائز ہے، کیونکہ وہ زمین ایک کار خیر میں استعمال ہو رہی ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ قبرستان اور مسجد کی ضرورت سے واقعۃً فاضل ہو تبھی اس زمین کو دینی کاموں میں بھی بر سبیل مناسب باقاعدہ دیانۃً اس پر مدرسہ کی تعمیر کی جا سکتی ہے ورنہ فی نفسہ کوئی صورت جواز کی نہیں ہے۔

ایسا قبرستان جس کے اطراف مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان ہو رہا ہے یا قبرستان آبادی کے اندر آ گیا جس کی وجہ سے اس میں تدفین پر پابندی عائد کر دی گئی، اور قبضہ کا خطرہ ہو، بلکہ قبضہ ہو رہا ہو تو اس صورت میں اس قبرستان سے انتفاع کی صورت یہ ہے کہ وہاں کوئی دینی یا رفاہی ادارہ قائم کر دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس زمین کو فروخت کر کے اسی کے متوازی اور مماثل زمین خرید لی جائے اور قبرستان کی ضرورت کے لئے وقف کر دیا جائے، اور اگر قبرستان کی بالکل ضرورت نہ ہو تو دوسرے دینی، رفاہی، ملی کاموں میں اس کو لگایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر حکومت اور غیر مسلموں کے تسلط اور قبضہ کا خوف ہو تو اس صورت میں اس کو ختم کر دے اور اس کے بدلے دوسری جگہ بنا دے اور اگر حاکم وقت اس کو توڑنا اور مسمار کرنا مناسب نہ سمجھے تو پھر اس کی حفاظت کرے۔

وہ مساجد جو اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں ان میں سے بعض میں حکومت نے نماز کی ادائیگی سے منع کر دیا ہے، شرعاً اس کا مسئلہ یہ ہے کہ جو مسجد بن جاتی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے حکومت کو اس طرح کا کوئی حق نہیں کہ وہ مسجد میں نماز ادا کرنے سے روک دے، مسلمانوں کو اپنی مسجد کی بازیابی کے لئے اور دوبارہ نماز کی ادائیگی کے لئے پوری کوشش کرنی ہوگی، خصوصاً اس مسجد سے قریب رہنے والے لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ قانونی طور پر حکومت کو مجبور کریں، اور دوبارہ نماز کی اجازت حاصل کریں، ورنہ ایسی مسجدوں کو آباد نہ کرنے کی وجہ سے تمام مسلمان گنہگار ہوں گے۔

''وأن المساجد لله'' (سورہ جن: ۱۸) قال المساجد كلها۔

(اور بے شک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں)، اور تمام مسجدیں اسمیں داخل ہیں، یعنی تمام مسجدیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے جب کہ صرف باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو اس کے اطراف میں دکان کی تعمیر کرنا اور پیشگی کرائے کے طور پر رقم لے کر اس کام کو کرانا درست ہے، کیوں کہ اس صورت میں قبرستان کی حفاظت بھی ہو جائیگی اور زمین چند فٹ ہی دکانوں میں جائے گی، اب جو فاضل آمدنی ہوگی اس کو قبرستان کے دیگر مصارف یا اگر اس سے بہت زیادہ ہو تو دوسرے کار خیر میں صرف کیا جا سکتا ہے، مفتی نظام الدین صاحب ''نظام الفتاویٰ'' میں لکھتے ہیں:

''کہ اگر وہ زمین جس میں چوحدی قائم کی جا رہی ہے وہ تدفین کی ضرورت سے زیادہ ہو اور آئندہ ضرورت متوقع نہ ہو تو اس صورت میں حواشی پر دکان بنا کر قبرستان کی حفاظت کر سکتے ہیں اور اس کی آمدنی جو قبرستان کی ضرورت سے فاضل ہو اسکو دیگر دینی کاموں میں بر سبیل مناسب اور باقاعدہ دیانۃً خرچ کر سکتے ہیں'' (نظام الفتاویٰ ۱/ ۱۹۷)۔

بڑے شہروں میں جہاں وسیع قبرستان میں چھوٹی سی مسجد ہو، لیکن علاقہ میں آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے مسجد کی توسیع ضروری ہو گئی ہو تو اس سلسلہ میں شرعی حل یہ ہے کہ اگر قبرستان میں تدفین جاری ہے تو بہتر یہ ہے کہ قبرستان کے اندر مسجد کی توسیع نہ کی جائے، لیکن جب قبرستان میں قبریں اتنی پرانی ہو جائیں کہ میت کے جسم کا مٹی بن جانا غالب ہو گیا ہو تو فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس پر تعمیر کرنا جائز ہے، جہاں تک مسجد کی توسیع کی ضرورت ہے تو اس کا ثواب بھی تدفین سے کم نہیں اس لئے ایسے قبرستان میں جس میں تدفین متروک ہو چکی ہو ویران اور ناقابل استعمال ہو اگر چہ موقوفہ ہو، اس میں مسجد کی توسیع بلاشبہ جائز ہے، اس صورت میں منشاء واقف کے خلاف بھی نہ ہوگا، صورت مسئلہ میں پرانی قبر کے نشان کو متاثر مسجد کی توسیع کر لی جائے اور اگر فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو تو قبر کو بغیر توڑے اور منہدم کئے ہوئے مٹی اتنی اونچی پاٹ دیجائے کہ قبر اس میں چھپ جائے اور اس پر توسیع مسجد کر دی جائے گی، ''عینی شرح بخاری'' میں ہے:

''قال ابن القاسم: لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبني فيها مسجدا لم أر بذلك بأسا؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين'' (امداد الفتوی ۲،۱۰۹)۔

(ابن قاسمؒ کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کا کوئی مقبرہ مٹ جائے اور وہاں کوئی مسجد بنالے تو میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، اس لئے کہ قبرستان بھی مسلمانوں کے اوقاف میں سے ہے ان کے موتی کے تدفین کے لئے، تو کسی کے لئے درست نہیں کہ وہ اسکو اپنی ملکیت میں رکھ لے، لیکن جب وہ مٹ جائے اور تدفین سے مستغنی ہوجائے تو اس کا مسجد میں منتقل کرنا جائز اس لئے ہے کہ مسجد بھی مسلمانوں کے اوقاف میں سے ایک وقف ہے)۔

ان ریاستوں میں جہاں ہندو راجاؤں نے اور جاگیرداروں نے مساجد پر زمینوں کو وقف کیا ہے، اور شاید واقف کے ہندو ہونے کے باعث یہ مساجد ہندو اوقاف کے تحت ہیں اور ہندو وقف بورڈ ہی مسجد سے متعلق تمام نظم ونسق انجام دیتا ہے تو اس صورت میں شرعی مسئلہ یہ ہے کہ مساجد و مقابر کا غیر مسلم ادارے کی تولیت میں رہنا درست نہیں ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ حکومت سے کوشش کر کے ان اوقاف کو مسلم اوقاف کی تولیت میں شامل کرائے، جہاں تک ان مسجدوں اور مقابر میں نماز اور تدفین کا مسئلہ ہے تو بہر حال یہ جائز اور درست ہے اس میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے، البتہ غیر مسلم کا متولی رہنا درست نہیں، اس کے لئے سنجیدہ اور مثبت انداز میں کوشش کرتے رہنا چاہئے کہ وہ اوقاف مسلمانوں کی تولیت میں آجائیں۔ فتاوی ہندیہ میں درج ہے:

''الصالح للناظر من لم يسأل الولاية للوقف وليس فيه فسق يعرف وفي الاسعاف لا يولى إلا أمين'' (فتاوی هندیه)۔

ناظر (متولی) کے لئے بہتر شخص وہ ہے جو ولایت کو نہ مانگے اور نہ اسکے اندر معروف فسق ہو، اور اسعاف میں ہے کہ متولی صرف امین ہی بن سکتا ہے۔

خلاصہ بحث:

ہندوستان کی ان ریاستوں میں جہاں اب بھی مساجد و مقابر ہندو اوقاف کے تحت ہیں اور ان ریاستوں میں ہندو آبادی کی اکثریت ہے اور یہ ممکن نہ ہو کہ ان اوقاف کو مسلم اوقاف میں منتقل کیا جاسکے بلکہ اس کا خطرہ ہو کہ الگ کرنے کی صورت میں مسجد اور قبرستان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیگا یا حکومت اس پر قبضہ کر لے گی تو اس صورت میں خاکسار کی رائے ہے کہ ہندو متولی جب مسجد کا صحیح نظم ونسق کررہا ہو تو اس صورت میں مسجد اور قبرستان کو اس کی تولیت میں رہنے دینا چاہئے کیوں کہ خود فقہ کی کتابوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ متولی کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، البتہ امین ہونا شرط ہے، چنانچہ ہندیہ میں ہے:

''ولا تشترط الحرية والإسلام لصحته لما في الإسعاف'' (هندیه ۲،۴۰۸)۔

متولی کے صحت کے لئے حریت (آزادی) اور اسلام شرط نہیں ہے جیسا کہ اسعاف میں ہے۔

☆☆☆

استبدال وقف کے احکام ومسائل

مولانا ابرار خاں ندوی [1]

نظام اوقاف اسلام کا وہ نادر الوجود شاہکار ہے، قبل اسلام جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، مصر و یونان میں بڑی بڑی تہذیبوں نے جنم لیا، جنھوں نے معاشی دنیا میں تہلکہ مچادیا، مگر وہ وقف کے تصور تک نہ پہنچ سکیں، افلاطون نے مدنیت کے قانون مرتب کرنے میں شہرۂ آفاق کارنامہ انجام دیا، مگر اس کی پرواز وقف کی اس عدیم المثال ایجاد تک نہ ہوسکی، دنیا کے بڑے بڑے فلاسفر، مصلحین، دانشوران اور سیاست دانوں نے سماج کی ترقی کا بیڑا اٹھایا، مگر وقف کا نعم البدل پیش نہ کرسکے۔

صرف اور صرف اسلام ہی دنیا کا وہ تنہا مذہب ہے، جس نے امت کو اس عظیم نعمت سے نوازا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود مدینہ میں بہت ساری جائدادیں وقف کیں، صحابہ کرامؓ نے بھی اوقاف میں حصہ لیا، اور حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے اوقاف آج تک باقی ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: مجمع الانہر ۱/ ۷۰۳)۔

تاریخ اوقاف کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اوقاف وہ نسخہ کیمیا ہے، جس کے ذریعہ افلاس وتنگ دستی، غربت وناداری کا علاج، اور معاشی واقتصادی مسائل کی عقدہ کشائیاں کی جاتی ہیں اور یہ ایک ایسا قابل فخر تمدنی کارنامہ ہے جس کے ذریعہ غرباء کی امداد، مساکین کی اعانت، یتیموں کی سرپرستی، بیواؤں کی خبر گیری، قرض داروں کی گلوخلاصی اور بے سہارا طبقہ کی دستگیری ہوتی ہے، یہی نہیں، بلکہ معاشی بدحالی میں پھنسے ہوئے اور ذہنی پستی میں دبے ہوئے لوگوں کو سماج میں آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کی ضمانت بھی ہے۔

لیکن افسوس صد افسوس! کہ گردش زمانہ کے ساتھ ساتھ اس مجرب نسخہ کو فراموش کردیا گیا، اور ملت کے مفید وکارآمد منصوبے مال ودولت کا شکوہ کررہے ہیں، کیونکہ ملت کے بے شمار اوقاف ہماری غفلتوں کی وجہ سے ویران، ناقابل استعمال اور بے توجہی کا شکار ہیں۔ خدا جزاء خیر دے ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کے دردمند افراد کو، جنھوں نے اس جانب توجہ کی، اور ہندوستانی اوقاف کو قابل استعمال بنانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ اس کے لئے اکیڈمی نے سوالات مرتب کرکے شرعی نقطۂ نظر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ سوالات کے جوابات عرض کرنے میں صحیح اور شرعی حل پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اوقاف کا تبدیل کرنا:

الف۔ موجودہ نازک حالات میں مقابر وخانقاہوں کو فروخت کرنا اور ان کو تبدیل کرنا کیسا ہے؟ اور کیا شریعت اسلامیہ میں اوقاف سے فائدہ اٹھانے کی خاطر اس کی گنجائش ہے؟ تو اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل اور شرائط ہمارے فقہاء نے بیان کی ہیں کہ:

اگر واقف زندہ ہے تو اسے اس کا کلی اختیار ہے کہ وہ اپنی وقف کردہ شئی کو بیچ کر اس کی جگہ دوسری چیز وقف کردے، لیکن اگر وقف کرنیوالا زندہ نہ ہو، اور اس نے وقف کو بیچنے کی نہ وصیت کی ہو، اور نہ ہی شرط لگائی ہو، بلکہ وقف کو بیچنے، تبدیل کرنے سے منع کیا ہے، یا منع نہ کیا ہو اور نہ ہی اجازت دی ہے بلکہ خاموش ہے تو ایسی صورت میں اگر موقوف بالکل ویران وتباہ حالی کا شکار ہوجائے، مقاصد وقف فوت ہورہے ہوں، اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو کہ انہیں بیچ دیا جائے اور اس کی جگہ اسی پیسے سے متوازی اور اسی طرح کا وقف جہاں آبادی ہے قائم کردیا جائے، تو اس حالت میں صرف قاضی کو استبدال وقف اور اس کی خرید وفروخت کی اجازت ہے، اس کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے اجازت نہیں ہے۔

فقہ حنفی کے مایہ ناز فقیہ علامہ ابن عابدین (متوفی ۔ ۱۲۵۲ھ) ان صورتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''والثانی: أن لا یشرطه سواء شرط عدمه أو سکت لکن صار بحیث لاینتفع بالکلیة، بأن لا یحصل منه شئ

---

[1] استاذ جامعہ ہدایہ جے پور، راجستھان۔

أصلاً أو لا يفي بمؤنته فهو أيضاً جائز على الأصح، إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه'' (دیکھئے: رد المحتار ۳٬۳۸۷، فتاوی هنديه ۲٬۴۰۱، احكام الوصايا والاوقاف ۲۰۳)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وقف کرنے والے نے اس کو تبدیل کرنے کی شرط نہ لگائی ہو، اگر اس نے عدم استبدال کی شرط لگائی ہے یا اس سلسلہ میں بالکل خاموش رہا، لیکن موقوف شئ اس حال میں ہو کہ اس سے بالکل فائدہ نہ اٹھایا جاسکتا ہو، اس طور پر کہ اس سے اصلاً کوئی چیز حاصل نہ ہو یا اس کا خرچ اس سے پورا نہ ہوتا ہو تو اصح قول کے مطابق قاضی کی اجازت ہو اور اس کی رائے مصلحت پر مبنی ہو تو استبدال جائز ہوگا۔

نیز مشہور فقیہ علامہ ابن نجیم مصری (متوفی۔ ۹۷۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''شرط الوقف عدم الاستبدال فللقاضي الاستبدال إذا كان أصلح'' (الاشباه والنظائر، مجمع الأنهر ۱٬۷۳۶)۔

شرط وقف عدم استبدال ہے اور استبدال کا حق صرف قاضی کو ہے اگر وہ استبدال کو بہتر سمجھے۔

نیز علامہ شامی نے قاضی جس کو استبدال وقف کا حق حاصل ہے اس کے لئے کچھ اوصاف کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''وشرط في الإسعاف أن يكون المستبدل قاضي الجنة المفسر بذي العلم والعمل لئلا يحصل التطرق إلى أوقاف المسلمين كما هو الغالب في زماننا'' (رد المحتار ۳٬۳۸۸، مجمع الأنهر ۱٬۷۳۶)۔

اور اسعاف کے اندر شرط لگائی گئی ہے کہ تبدیل کرنے والا قاضی علم کے ساتھ عمل کا بھی پیکر ہو (یعنی علم وعمل کا جامع ہو) تاکہ مسلم اوقاف کے ضیاع کا باعث نہ ہو، جیسا کہ ہمارے دور میں اکثر ہو رہا ہے۔

لیکن یہ بات ذہن نشیں رہے کہ قاضی کے لئے ضروری ہوگا کہ اس ویران وقف کو تبدیل کرنے یا فروخت کرنے کے بعد اسی کے متوازی ومماثل وقف قائم کرے، اور یہ دوسرا وقف اپنی تمام شرائط کے ساتھ جس طرح پہلا وقف تھا جاری ہوگا۔

فقہ حنفی کے رمز شناس فقیہ علامہ آفندی نے اس کو یوں ذکر کیا ہے:

''وصح شرط أن يستبدل به أي بالوقف غيره أي يبيعه ويشتري بثمنه أرضا أخرى إذا شاء عند أبي يوسف استحسانا، فإذا فعل صارت الثانية كالأولى في شرائطها'' (مجمع الأنهر ۱٬۷۳۶، درمختار ۳٬۳۸۷)۔

یہ شرط لگانا کہ وہ جب چاہے گا وقف کو فروخت کرکے اس کی قیمت سے دوسری زمین خرید سکتا ہے امام ابو یوسفؒ کے نزدیک استحسانا درست ہے، لیکن جب وہ ایسا کرے گا تو دوسرا وقف پہلے وقف کی طرح ہوگا تمام شرائط کے اندر۔

نیز موجودہ دور کے مشہور عالم دین حضرت مفتی نظام الدین صاحب کا فتوی بھی یہی ہے، مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اگر ضائع ہوجانے کا ظن غالب ہوجائے یا بالکل ناقابل انتفاع ہوجائے تو اس کو فروخت کرکے اس کے بدلہ میں اسی موقوفہ کے متوازی ومماثل دوسری چیزیں خرید کر وقف کردی جائیں گی'' (نظام الفتاوی ۱/۶۰)۔

اوقاف کو حکومت کے حوالہ کرنا:

ب۔ اوقاف کے قرب وجوار میں مسلم آبادی نہ ہونے کے سبب جہاں یہ مسائل درپیش ہیں، ان کو حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کرکے اس کے عوض مناسب جگہ اس کے متوازی چیز لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن زیادہ بہتر اور مناسب ہے کہ اوقاف کو مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کی جائے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب کا معروف فتوی ہے: ''مسجد کا پرانا سامان اور ملبہ جو اسی مسجد کی تعمیر جدید میں کام نہ آسکتا ہو، فروخت کردینا جائز ہے، بہتر ہے کہ مسلمان کے ہاتھ فروخت کیا جائے اور اس کی قیمت کو اسی مسجد کی ضرورت تعمیر میں یا جس قسم کا سامان تھا، اسی کے مثل میں صرف کردیا جائے (کفایت المفتی)۔

ویران اور ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کرنے کے بعد اسی کے مماثل وقف میں صرف کرنا ضروری ہوگا، واقف کے مقاصد کی خلاف ورزی کرنا، اور ان کو دیگر امور دینی، علمی ملی اور رفاہی کاموں میں صرف کرنا درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ شریعت اسلامیہ نے واقف کے مقاصد اور شرائط کا اعتبار کیا ہے، جبکہ وہ

شریعت کے خلاف نہ ہوں۔

محقق زماں علامہ شامی لکھتے ہیں: ''لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه، وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (رد المحتار ۳،۳۷۱)۔

ویران وبرباد مسجد کے وقف کو حوض میں صرف کرنا یا اس کے برعکس کرنا، جائز نہیں ہے، اور ''شرح الملتقی'' میں ہے کہ اس کے وقف کو اسی جنس کے قریب وقف میں صرف کیا جائے گا۔

نیز علامہ آفندی رقمطراز ہیں: ''وفي القنية حوض أو مسجد خرب وتفرق الناس عنه فللقاضي أن يصرف أوقافه إلى مسجد آخر أو حوض آخر'' (مجمع الأنهر ۱،۷۴۹، نیز دیکھئے: الدر المختار ۳،۳۷۱)۔

''قنیہ'' میں ہے کہ حوض یا مسجد خراب یا بربادی کا شکار ہوجائیں اور لوگ وہاں سے دوسری جگہ چلے گئے ہوں تو قاضی کے لئے جائز ہے کہ ان کے اوقاف کو دوسری مسجد یا دوسرے حوض میں صرف کرے۔

فقہ حنفی کے مایہ ناز فقیہ علامہ شامی نے اس کی مزید صراحت یوں بیان کی ہے: ''وفي الخانية: رباط بعيد استغنى عنه المارة وبجنبه رباط آخر قال السيد الإمام أبو شجاع: تصرف غلته إلى الرباط الثاني كالمسجد إذا خرب واستغنى عنه أهل القرية ... صرف الثمن إلى مسجد آخر'' (تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۳،۷۲-۳۷۱، در المنتقی مع المجمع ۱،۷۴۸)۔

''خانیہ'' میں مذکور ہے کہ رباط دوری پر ہو اور گذرنے والا اس سے بے نیاز ہوجائے اور اس کے دوسری جانب دوسرا رباط ہو تو شیخ ابوشجاع فرماتے ہیں کہ اس کا منافع دوسرے رباط میں صرف کیا جائے گا، جس طرح مسجد غیر آباد وبرباد ہوجائے، اور گاؤں کے لوگ اس سے بے نیاز ہوں تو قاضی اس کے سامان کو بیچ کر دوسری مسجد میں صرف کرے گا۔

مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ناقابل استعمال اور ویران اوقاف کو دوسرے علمی، دینی، تعلیمی امور میں صرف کرنا درست نہیں ہوگا، مگر قبرستان جو ناقابل تدفین ہو چکا ہو، اس کا حکم اس سے کچھ مختلف ہے جو انشاء اللہ آگے آئے گا۔

اوقاف کی فاضل آمدنی کا مصرف:

الف، ب۔ اوقاف جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ ہو، اور آئندہ بھی اس کا مصرف نظر نہ آرہا ہو، بلکہ اس طرح ذخیرہ اندوزی کا خطرہ ہے اور ذمہ داران اوقاف اور حکومت کی طرف سے دست درازی کا خدشہ بھی ہو، تو ایسی ضرورت سے زائد آمدنی کو کن امور میں صرف کر سکتے ہیں؟..... تو اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ مسجد کی فاضل آمدنی کو کسی دوسرے علمی، دینی، ملی کاموں میں بھی صرف کرنا درست نہیں ہوگا، بلکہ اس مسجد کی ضروریات سے زائد رقم کو دوسری مساجد میں صرف کریں گے، اگر وہاں کی مساجد کو ضرورت نہ ہو تو دوسرے مقامات میں مساجد کی ضروریات میں استعمال کرنا ہوگا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا فتوی ملاحظ ہو:

''مدرسہ جنس مسجد سے نہیں، اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے، اگر اس شہر میں حاجت نہ ہو، تو دوسرے شہر کی مساجد میں صرف کریں، جو زیادہ قریب ہو، اس کا حق مقدم ہے، اسی طرح بترتیب (امداد الفتاوی ۲/۵۹۶)۔

الف، ب۔ دیگر اوقاف کا حکم یہ ہے کہ ان کی فاضل آمدنی انہی جیسے اوقاف میں صرف کرنا تو درست ہے لیکن دیگر اوقاف میں خرچ کیا جائے، یہ جائز نہ ہوگا ......فتاوی ہندیہ کا یہ جزئیہ ملاحظہ ہو:

''ولو لم يتفرق الناس ولكن استغنى الحوض عن العمارة، وهناك مسجد محتاج إلى عمارة أو العكس هل يجوز للقاضي صرف وقف ما استغنى عنه العمارة إلى عمارة ما هو محتاج إلى العمارة، قال، لا، كذا في المحيط''۔

لوگ گرچہ وہاں سے دوسری جگہ نہ گئے ہوں، لیکن حوض عمارت سے بالکل بے نیاز ہو اور وہاں کوئی مسجد ہو جس کو عمارت کی ضرورت ہے یا اس کے برعکس

مسئلہ ہو، تو کیا قاضی کو یہ اجازت ہوگی کہ وہ وقف جس کو عمارت کی ضرورت نہیں ہے محتاج عمارت میں صرف کر سکے؟ وہ کہتے ہیں نہیں، یعنی قاضی کے لئے ایسا کرنا درست نہیں ہوگا، اسی طرح محیط میں بھی ہے۔

لیکن راقم کی ناقص رائے یہ ہے کہ جو آمدنی مصارف سے زائد ہو، اور جمع رہنے میں ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہو، تو اہل حل وعقد کے مشورہ سے اس کو دیگر تعلیمی و علمی کاموں میں استعمال کرنا درست ہونا چاہئے، لیکن یہ اسی وقت اجازت ہوگی، جبکہ منشاء واقف کے خلاف نہ ہو اور لوگوں کی جانب سے بے جا استعمال نہ کرنے میں اطمینان بھی ہو...... اس سلسلہ میں علامہ ابن نجیم مصری نے ایک جزئیہ نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اگر کسی نے گھر کو مسجد پر اس شرط کے ساتھ وقف کیا کہ اس کی فاضل آمدنی فقراء کے لئے ہوگی "أي علی أنہ ما فضل من عمارتہ فھو للفقراء"۔ اس کے بعد کثیر رقم جمع ہو اور مسجد کو عمارت کی ضرورت بھی نہ ہو تو شیخ ابو بکر سے جب یہ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ کیا اب اس زائد رقم کو فقراء پر صرف کریں گے، انہوں نے کہا نہیں کر سکتے، رقم چاہے کتنی جمع کیوں نہ ہو جائے، کہ بعد میں مسجد کو کبھی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے، فقیہ ابو جعفر نے بھی اس سوال کا جواب یہی دیا، لیکن علامہ ابن نجیم کا رجحان جواز کا ہے:

"ولكن الاختيار عندی إذا علم أنه قد اجتمع من الغلة مقدار ما لو احتاج المسجد والدار إلى العمارة أمكن العمارة منها، صرف الزيادة على الفقراء على ما شرط الواقف" (الأشباه والنظائر)۔

لیکن میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ پیسہ یا آمدنی اتنی مقدار میں جمع ہو چکی ہے کہ مسجد و گھر کو اگر عمارت کی ضرورت پڑی تو اس سے عمارت کی تعمیر ممکن ہے، تو واقف کی شرط کے مطابق زیادہ رقم فقراء پر صرف کی جائے گی۔

اوقاف کو زیادہ منفعت بخش بنانے کی شکل:

ایسے اوقاف جن کی آمدنی کم منفعت بخش ہو، اور اس سے اس کی ضروریات کی تکمیل نہ ہوتی ہو، مثلاً مدرسہ یا مسجد پر کوئی مکان وقف تھا، لیکن وہ کسی محلہ یا دیہات کے اندر ہے، جہاں اس کی آمدنی اتنی تھوڑی ہے کہ مسجد یا مدرسہ کی ضرورت کا پورا ہونا مشکل ہے، تو ایسی صورت میں بہتر ہوگا کہ اس مکان موقوفہ کو فروخت کر دیا جائے اور اس کے بدلے مارکیٹ یا کسی تجارتی مقام پر دوکان خرید لی جائے، جہاں اس کی آمدنی زیادہ ہو سکے، اور مسجد و مدرسہ کی ضروریات کو بآسانی پورا کیا جا سکے، یہ منشاء واقف کے خلاف بھی نہ ہوگا، کہ واقف کا اصل مقصد مدرسہ و مسجد کی ضروریات کی تکمیل تھا، اور یہ اس کے علاوہ ممکن نہیں ہے، لہذا یہ اس کے منشاء کے عین مطابق ہوگا۔

فقہ حنفی کے ترجمان علامہ شامی رقمطراز ہیں: "فلو استبدل الحانوت بأرض تزرع ويحصل منها غلة قدر أجرة الحانوت كان أحسن، لأن الارض أدوم وأبقى وأغنى عن كلفة الترميم والتعمير" (رد المحتار ۳۸۸،۴)۔

اگر حانوت کو قابل زراعت زمین سے تبدیل کیا جائے اور اس سے جو منافع حاصل ہوں، وہ حانوت کے منافع کے برابر ہوں تو یہ مستحسن اور بہت اچھا ہوگا، اس لئے کہ زیادہ پائیدار اور تادیر قائم رہنے والی ہے، اور اس سے اصلاح و مرمت اور رد و بدل کی پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔

نیز اصول فقہ کے ماہر عالم دین علامہ بدران ابو العینین بدران، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ زیادہ منفعت بخش چیز سے وقف کو تبدیل کرنا درست ہے، شیخ بدران رقمطراز ہیں:

"إذا وجدت مصلحة فى الاستبدال كما إذا كان الوقف منتفعاً به، ولكن يراد استبداله بما هو أكثر نفعاً من جهة الغلة أو كثرة الثمن، وخالف محمد فى ذلك لئلا يتخذ ذلك ذريعة إلى ضياع الأوقاف، والعمل على قول أبي يوسف" (أحكام الوصايا والاوقاف ۳۰۴)۔

وقف کی تبدیلی کسی مصلحت پر مبنی ہو کہ وقف منفعت بخش ہے، لیکن تبدیلی سے یہ مقصد ہو کہ اس سے زیادہ نفع حاصل ہوگا یا ثمن زائد مقدار میں ملے گا تو یہ جائز ہے، مگر امام محمدؒ کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ کہیں ضیاع اوقاف کا ایک ذریعہ نہ بن جائے، لیکن عمل امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر علامہ شامی نے تحریر فرمایا ہے بلکہ حاوی القدسی کے حوالہ سے ایک جزئیہ نقل کیا ہے کہ ہر وہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے جس میں وقف کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو "صرح صاحب حاوى القدسى بأنه يفى بكل ما هو أنفع للوقف (ردالمحتار ۳،۳۶۲)۔

اور علامہ ابن نجیم مصری نے یوں وضاحت کی ہے: ''استبدال الوقف العامر لا یجوز إلا فی مسائل... الرابعة: أن یرغب إنسان فیه ببدل أکثر غلة و أحسن وصفا، فیجوز علی قول أبی یوسف، وعلیه الفتوی کما فی فتاویٰ قاری الهدایة''
(الاشباہ والنظائر ۱۹۴)۔

وقف عامر کا استبدال درست نہیں ہے، مگر چند مسائل میں...... چہارم یہ کہ کا ستبدال کی رغبت اس وجہ سے ہو کہ دوسری زمین باعتبار غلہ کے اس سے بہتر اور اوصاف کے اعتبار سے اس سے اچھی ہو، ان صورتوں میں استبدال امام ابو یوسف کے قول کے مطابق جائز ہے اور اسی پر فتوی ہے، جیسا کہ ''فتاویٰ قاری الہدایہ'' میں ہے۔

نیز مولانا عبدالحی فرنگی محلی علیہ الرحمہ کا رجحان بھی اسی جانب ہے (مجموعۃ فتاوی ۲/ ۱۱۳)۔

مصارف ختم ہونے کے بعد اوقاف کا مصرف:

اوقاف کے مصارف ختم ہو جائیں، مثلاً جس مدرسہ یا مسجد پر وقف تھا، اب اس مدرسہ یا مسجد کا نام ونشان تک باقی نہیں ہے، یا جن فقراء پر وقف کیا تھا وہ فقراء دنیا سے رخصت ہو گئے ہوں یا کسی دور دراز مقام پر منتقل ہو جائیں، توان اوقاف کی آمدنی کو فقراء پر صرف کیا جائے گا۔

علامہ داماد آفندی تحریر فرماتے ہیں: ''وإذا انقطع المصرف صرف إلی الفقراء'' (مجمع الأنهر ۱،۷۴۴)۔

جب مصرف ختم ہو جائے تو اس کو فقراء پر صرف کریں گے۔ لیکن فقراء جن پر وقف تھا، اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ اگر وہ ایسی جگہ منتقل ہو جائیں جو ان کے مقام سے الگ بستی شمار ہوتی ہو، تو وہ وقف سے محروم تصور کئے جائیں گے اور اگر وہ جگہ جہاں منتقل ہو کر گئے ہیں وہ اسی بستی (سابق) میں شمار کی جاتی ہے تو وہ وقف سے محروم نہیں کئے جائیں گے۔ علامہ کردری نے اس سلسلہ میں ایک اہم جزئیہ نقل فرمایا ہے:

''وقف علی فقراء أقربائهم المقیمین بخوارزم فانتقلوا إلی بلد آخر إن کان مما یحصون لا تنقطع وظیفتهم وإن لا یحصون تنقطع ثم إن بقی هناك منهم أحد یصرف الکل إلیه وإن لم یکن صرف الکل إلی الفقراء''
(البزازیہ مع الهندیہ ۶،۲۷۸)۔

کسی شخص نے خوارزم میں مقیم اپنے رشتہ دار فقراء پر وقف کیا، پھر وہ لوگ (فقراء) دوسرے شہر منتقل ہو گئے، تو اگر اس شہر کو لوگ اسی میں سے (خوارزم میں) شمار کرتے ہیں تو ان کا وظیفہ ختم نہیں ہوگا، اور اگر اس کو خوارزم میں شمار نہیں کرتے ہیں تو ان کا وظیفہ ختم ہو جائے گا، لیکن اگر ان میں سے ایک بھی وہاں باقی ہے تو تمام کا تمام اسی کو دیدیا جائے گا، اور اگر کوئی بھی نہیں بچا ہے تو پورا فقراء و مساکین پر صرف کیا جائے گا۔

الف۔ بلڈر سے معاملہ کرنا:

اسی طرح اوقاف کی مخدوش عمارتوں کا حکم ہوگا جن کے پاس تعمیر کے لئے کوئی سرمایہ نہ ہو کسی بلڈر سے اس طرح کا معاملہ کر لیا جائے کہ وہ ڈھا کر از سر نو چند منزلہ عمارت تعمیر کردے اور اس تعمیر جدید کے تمام اخراجات کا بار اس (بلڈر) پر ہوگا، مگر اس کی ایک دو منزل عمارت اس کی ملکیت ہوگی جس میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا حق اس کو ہوگا، اسی طرح زمین پر بلڈر سے اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہوگا، کیونکہ واقف کا مقصد وقف کرنے سے یہ تھا کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور یہاں اس کے بغیر وقف کو قابل انتفاع بنانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

ب۔ اوقاف کی تعمیر کے لئے اس کے بعض حصہ کا بیچنا:

احناف کے مرجوح اور حنابلہ کے مفتی بہ قول کے مطابق اس بات کی اجازت ہے کہ وقف کی عمارت مخدوش (حالت سے دوچار) ہو، اور وقف کے پاس اتنا سرمایہ نہ ہو کہ اس کی جدید تعمیر کرا کے قابل انتفاع بنایا جاسکتا ہو، تو ایسی صورت حال کے وقت مخدوش عمارت کی تعمیر جدید کے لئے وقف کا کچھ حصہ فروخت کردینا جائز ہے، لہذا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے یا مخدوش عمارت کی جدید تعمیر کے لئے، یا وقف کی خالی زمین کو قابل انتفاع بنانے کی غرض سے اس پر عمارت تعمیر کرنے کے لئے وقف کے بعض حصہ کو فروخت کرنا درست ہوگا، اس لئے کہ اس کے بغیر وقف کو قابل انتفاع بنانے کا کوئی چارہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی مسلک حنابلہ کی ترجمانی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''لم تمکن عمارته ولا عمارة بعضه جاز بیع بعضه لتعمر به بقیته، وإن لم یمکن الانتفاع بشئ منه بیع جمیعه'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۸،۲۲۶)۔

اور نہ اس کے کل کی تعمیر ممکن ہو اور نہ بعض کی، تو اس کے بقیہ کی تعمیر کے لئے اس کے بعض کو بیچنا جائز ہوگا، اور اگر سرے سے ہی بالکل کچھ انتفاع ممکن نہ ہو تو اس کے تمام کو بیچنا درست ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی حنفیہ کا مرجوح قول نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''وفی صدر الشریعة: جوّز بعض المتأخرین بیع الوقف إذا خرب لعمارة الباقی والأصح أنه لایجوز'' (دار المنتقی شرح المنتقی ۱،۷۴۲)۔

صدر الشریعہ میں مذکور ہے کہ بعض متاخرین نے وقف مخدوش کو بقیہ حصہ کی تعمیر کے لئے بیچنا جائز قرار دیا ہے لیکن اصح یہ ہے کہ جائز نہیں ہے۔

موجودہ حالات میں اگر اس کی اجازت نہ دی جائے یا نہ دی گئی تو ہندوستان کے اوقاف اپنی اسی خستہ حالت میں پڑے رہیں گے، اور حکومت یا متعصب برادران وطن ان پر قبضہ کرنا شروع کردیں گے، لہذا حالات کا تقاضہ ہے کہ قول مرجوع کو اپنالیا جائے۔

مسجد یا قبرستان کی زائد زمین پر مدرسہ قائم کرنا:

علماء ہند کا خیال ہے کہ مسجد کے لئے وقف زمین جو ضرورت سے زائد ہو اس پر مدرسہ قائم کرنا درست نہیں ہے۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کا فتوی ہے: ''ہرگاہ مسجد آباد است اگرچہ مستغنی ست آمدنی او در جائے دیگر صرف کردن درست نیست'' (امداد الفتاوی ۲/ ۴۲)۔

لیکن راقم کا خیال ہے کہ مسجد کے لئے وقف زمین جو ضروریات مسجد سے زائد ہے اس پر دینی مدرسہ قائم کردیا جائے، تاکہ وہ زمین کار خیر میں استعمال ہو، فقہاء کی عبارات اور کتب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں بچوں کی دینی تعلیم کا نظم کرنا اور مسجد کے اندر مکاتب چلانا درست ہے، تو مسجد کی زائد زمین پر دینی علوم کی تعلیم کی اشاعت کے مقصد کے تحت مدرسہ اسلامیہ کا قیام عمل میں لانا بدرجہ اولی جائز ہونا چاہئے۔

''وتعلیم الصبیان فیه (أی المسجد) بلا أجر وبالأجر یجوز'' (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الفتاوی البزازیہ مع الہندیہ ۶/ ۳۵۷)۔

مسجد میں بچوں کو علم سکھانا تنخواہ لے کر اور بلا تنخواہ لئے دونوں طرح جائز ہے۔

اسی طرح قبرستان پر وقف زائد زمین جس میں تدفین نہیں ہو رہی ہے اور نہ آئندہ اس میں تدفین کی ضرورت متوقع ہے تو اس میں منشاء واقف کا خیال رکھتے ہوئے مدرسہ کی تعمیر درست ہوگی۔

قبرستان میں تدفین پر پابندی ہو اس کا حکم:

قبرستان میں اگر تدفین کا عمل جاری ہے تو اس میں کوئی دوسرا عمل کرنا درست نہ ہوگا، لیکن کسی سبب سے اس میں تدفین کا عمل متروک ہوگیا ہو، مثلاً تدفین پر پابندی عائد کردی گئی ہو جس کی وجہ سے اس پر قبضہ کا خطرہ ہے، بلکہ خطرہ ہی نہیں قبضہ ہو رہا ہے تو ایسے قبرستان میں مدرسہ یا دینی، علمی، تحقیقی ادارہ کا قیام، یا مسجد و مسافر خانہ وغیرہ کی تعمیر کردی جائے تاکہ وہ ایک کار خیر میں استعمال ہو سکے، لیکن یہ عمل اسی وقت درست ہوگا جب یہ یقین اور ظن غالب ہو جائے کہ جسد میت مٹی ہوگیا ہوگا۔ فتاوی ہندیہ کی عبارت ذکر کی جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

''ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه'' (الفتاوی العالمگیریہ ۱،۱۶۷)۔

اگر میت اتنی پرانی ہو کہ مٹی ہونے کا ظن غالب ہو تو اس قبر میں دوسرے کو دفن کرنا، اور اس پر کاشت کرنا، عمارت تعمیر کرنا جائز ہے۔

نیز موجودہ دور کے معروف عالم مفتی نظام الدین صاحب کی رائے بھی یہی ہے، مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جو قبرستان تدفین سے متروک ہو چکے ہوں، یا قانوناً دفن سے روک دیئے گئے ہوں، اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، تو اس میں دینی ضرورت کے مطابق مسجد یا دینی مدرسہ قائم کرکے، یا اس کو کسی ایسے کار خیر میں استعمال کرکے جس سے مسلم عوام اور بچوں کی مذہبی واقتصادی تربیت وترقی کا ایسا کام کیا جائے کہ اصل واقفین کو ثواب پہونچتا رہے (نظام الفتاوی ا/ ۱۸۰)۔

نیز یہی رائے استاد محترم مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کی ہے، (موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی حل ر ۱۴۸) کی عبارت سے مسئلہ کی بالکل وضاحت ہوجاتی ہے:

''اگر قبرستان پرانا ہوا اور اس میں تدفین بھی نہیں ہورہی ہو اور شدہ شدہ لوگوں نے قبضہ کرنا شروع کردیا ہو تو وہاں مسجد یا دینی مدرسہ بنادینا جائز ہے''۔

حکومت کا مساجد میں عبادت پر پابندی لگانا:

مسجد خدا کا مبارک گھر ہے جو خدا کی عبادت و بندگی، ذکر و تلاوت کے لئے بنائی جاتی ہے، اس میں کسی طرح کی لایعنی گفتگو اور غیر ضروری عمل کو ناپسند کیا گیا ہے، جو گھر خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا ہے وہ خدا کا گھر ہے، حکومت یا کسی فرد کے لئے بالکل جائز نہیں ہے کہ اس میں نماز کی ادائیگی پر پابندی عائد کرے، اگر کوئی حکومت ایسا اقدام کرتی ہے تو وہ ظالم ہے، ستم گر ہے بلکہ روئے زمین میں اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہ ہوگا جو مساجد الٰہی میں نماز ادا کرنے سے روک دے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها'' (سورۃ البقرۃ: ۱۱۴) (اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جاوے وہاں نام اس کا اور کوشش کی ان کے اجاڑنے میں) اس آیت کی تفسیر اور شان نزول ذکر کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانی نے لکھا ہے:

اس کے شان نزول نصاریٰ ہیں کہ انہوں نے یہود سے مقابلہ کرکے توریت کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب کیا، یا مشرکین مکہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو محض تعصب و عناد سے حدیبیہ میں مسجد حرام (بیت اللہ) میں جانے سے روکا، باقی جو شخص کسی مسجد کو ویران یا خراب کرے وہ اسی حکم میں داخل ہے (تفسیر عثمانی، سورۃ البقرۃ، صفحہ ۲۲، مجمع خادم الحرمين الشريفين الملك فهد لطباعة المصحف)۔

اس کی تفسیر یوں کی ہے: ''والمراد بمنع المساجد أن يذكر فيها اسم الله منع من يأتي إليها للصلاة والتلاوة والذكر وتعليمه... ويجوز أن يراد بالخراب تعطيلها عن الطاعات التي وضعت لها'' (فتح القدیر ا ر ۱۳۱، نیز دیکھئے: تدبر قرآن ا ر ۳۰۲)۔

مساجد کے اندر اللہ کا ذکر کیا جائے اس سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ جو اس میں نماز ادا کرنے، تلاوت و ذکر اور اس کو سیکھنے کی غرض سے آتا ہو اس کو روکا جائے، اور خراب کرنے کا یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ مساجد کو جس کے لئے بنا گیا ہے اس (طاعات) سے اس کو ختم کردیا جائے۔

''ومن أظلم... هذا استنكار واستبعاد لأن يكون أحد أظلم ممن فعل ذلك أي لا أحد أظلم ممن منع الناس من عبادة الله في بيوت الله'' (صفوۃ التفاسیر ا ر ۸۹، نیز دیکھئے: الاساس فی التفسیر ا ر ۲۲۲)۔

ومن أظلم...... یہ استنکار اور بعید ہے کہ جو ایسا کرے اس سے بڑا کوئی ظالم ہوسکتا ہے؟ یعنی اللہ کے گھر میں جو لوگوں کو اللہ کی عبادت کرنے سے روک دے اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔

اطراف قبرستان دوکانیں تعمیر کرنا:

قبرستان کی حفاظت وصیانت کی خاطر باؤنڈری بنانا درست ہے، لیکن اگر باؤنڈری کے بجائے اس کے اطراف دوکانوں کی تعمیر کرنا اور اس کے لئے قبرستان کی زمین استعمال کرنا پڑے تو ایسی شکل میں اگر زمین میں تدفین کی ضرورت نہ ہو اور نہ آئندہ ضرورت پڑنے کا امکان ہو تو اس پر دوکانوں کی تعمیر کرنا جائز ہے۔

مفتی نظام الدین صاحب اعظمی ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''وہ خالی زمین اگر اس درجہ میں ہو کہ نہ تو اس وقت تدفین کی ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت متوقع ہے تو اس صورت میں حواشی پر دوکانیں بنا کر چوحدی قبرستان بھی محفوظ کرسکتے ہیں اور اس کی آمدنی جو قبرستان کی ضرورت سے فاضل ہو اس کو مذکورہ دینی کاموں (یعنی مدرسہ، یتیموں، بیواؤں، غرباء) میں بھی بہ سبیل مناسب اور بقاعدہ دیانت خرچ کرسکتے ہیں، ورنہ کوئی صورت جواز کی نہ ہوگی'' (نظام الفتاویٰ ا ر ۱۷۰)۔

قبرستان میں مسجد کی توسیع کرنا:

قبرستان کے اندر تعمیر شدہ مسجد تنگ ہوجائے تو اس کی توسیع کرنا درست ہوگا، لیکن اگر قبرستان زیر استعمال ہے خواہ قدیم ہو یا جدید اس میں مسجد کی توسیع کی

گنجائش نہ ہوگی، البتہ قبرستان ویران، غیر استعمال ہو تو اس میں مسجد کی توسیع جائز ہی نہیں، بلکہ بہتر عمل ہوگا، کیونکہ فقہاء نے ویران قبرستان جس میں تدفین کا عمل بند ہو اس میں عمارت تعمیر کرنے، زراعت کرنے کی اجازت دی ہے (البحر الرائق ۲/۲۱۰، ردالمحتار ۱/۶۰۶، فتاوی عالمگیری ۱/۱۶۷) تو اس میں مسجد کی توسیع بدرجہ اولی جائز ہوگی، اور اگر قدیم قبرستان ہو یا جدید، لیکن زیر استعمال ہو اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور کثرت کے سبب توسیع کا عمل بہت ہی ناگزیر ہو تو ایسی صورت میں مسجد کے اوپر دومنزلہ، سہ منزلہ عمارت تعمیر کر کے توسیع کی صورت اپنائی جاسکتی ہے، اس سلسلہ میں مسئلہ کی وضاحت کے لئے مفتی نظام الدین صاحب کی تفصیلی عبارت کا نقل کرنا مناسب ہوگا، مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"ولو بلی المیت الخ"، اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قبر اتنی پرانی ہوجائے کہ جسد میت کے مٹی ہوچکنے کا ظن غالب ہوجائے تو اس قبر میں دوسرے مردے کا دفن کرنا اور اس پر کھیتی کرنا اور مکان بنانا جائز ہے تو مسجد کی توسیع و تعمیر بلا شبہ جائز و درست ہوگی، چنانچہ "تاریخ الکعبۃ المعظمۃ" (ص ۱۶۷) میں ہے: "ما بین المقام والرکن وزمزم قبر تسعۃ وتسعین نبیاً"۔ یعنی مقام ابراہیم اور رکن اور چاہ زمزم کے درمیان میں ننانوے نبیوں کی قبریں ہیں، اور اسی کتاب میں ہے کہ جب کسی نبی کی امت ہلاک کردی جاتی تھی تو وہ نبی بیت اللہ شریف کے پاس آکر پناہ لیتے اور وہیں تازندگی متعبد ہوجاتے تھے، اور ظاہر ہے کہ نبی کی جس جگہ وفات واقع ہوتی ہے وہ اسی جگہ مدفون ہوتا ہے، اور اب جب کہ ان قبروں کے نشانات صدیوں سے کسی کو معلوم نہیں تو کہنا پڑے گا کہ مسجد حرام کی توسیع میں زمانہ قدیم سے ہی وہ قبریں حدود حرم میں آگئیں، اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ ہاجرہ کی قبریں دار حطیم میں ہیں، جو حدود مطاف میں ہے اور قبروں کا کوئی نشان نہیں ہے...... یہ باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ پرانی قبروں کے نشانات مٹا کر بھی توسیع مسجد و تعمیر جائز ہے، اسی قسم کے مضامین "طبری" اور "البدایۃ والنہایۃ" صفحہ ۱۲۰۔ ۱۳۸۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲ میں اور جلد ۹ میں بھی ہیں (نظام الفتاوی ۱/۱۶۲۔ ۱۶۳)۔

خلاصہ کلام یہ کہ قبرستان زیر استعمال نہ ہو بلکہ اس میں تدفین متروک ہوچکی ہو تو اس میں توسیع کرنا درست ہے، اور یہ توسیع کا عمل واقف کی منشاء کے خلاف بھی نہ ہوگا۔

مسلم اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا:

اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا متولی غیر مسلم ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً مساجد و مقابر وغیرہ کی دیکھ بھال، اس کا نظم و نسق سنبھالنا غیر مسلم ادارہ، یا ہندو وقف بورڈ انجام دیتا ہے اور اس میں کسی قسم کی خیانت سے اجتناب کرتا ہے تو اس کی تولیت میں رہنا جائز ہوگا، اس لئے فقہاء نے متولی کے لئے جن شرائط کا ذکر کیا ہے اس میں عقل و شعور، بالغ ہونا، اور نظم و ضبط کے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت (موجود ہو) ہے، آزاد اور مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے۔

شیخ بدران ابوالعینین بدران نے تولیت وقف کی تین شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"العقل والبلوغ والقدرة على إدارة الوقف إدارة محققة للغرض المقصود منه، ولا يشترط فيه الإسلام ولا الحرية ولا الذكورة. لأنها من الإدارات المالية" (احکام الوصایا والاوقاف ۳۰۷)۔

عقل و بلوغ اور اس کو، یعنی وقف کو کما حقہ چلانے کی شرط لگانے اس کے مقصود اصلی کے حصول کے لئے ہے، اس میں نہ اسلام کی شرط ہے، نہ آزاد ہونے کی، اور نہ مرد ہونے کی، اس لئے کہ وقف مالی اداروں میں [illegible] رہ ہے۔

نیز فقہ حنفی کے رمز شناس فقیہ علامہ شامی رقمطراز ہیں:

"ويشترط للصحة بلوغه وعق[illegible] حريته وإسلامه" (رد المحتار على الدر المختار ۳/۴۸۵)۔

اس کے صحیح ہونے کے لئے اس کا بالغ [illegible] عقل و شعور سے متصف ہونا شرط ہے، آزاد اور اسلام شرط نہیں ہے۔

لیکن دور حاضر میں مسلم اوقاف کا غیر مسلم کی تولیت میں رہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ فقہاء نے بیان کیا ہے کہ خائن شخص اوقاف کا متولی نہیں ہوسکتا ہے اور متولی سے خیانت ظاہر ہو تو اس کو معزول کردیا جائے گا، آج کل غیر مسلم پر اعتماد کرنا بڑا مشکل ہے، لوگوں سے عدل وانصاف اور ایمانداری کی صفات مفقود ہوچکی ہیں، خصوصاً غیر مسلم، کہ ان کی جانب سے اوقاف میں خیانت کرنے کا قوی خدشہ ہے، لہذا ایسے حالات میں غیر مسلم، مسلم اوقاف کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆

مخدوش اوقافی عمارتوں کی تعمیر نو کا مسئلہ

مولانا تنویر عالم قاسمی [1]

واقفین کا مقصد وقف سے یہی ہوتا ہے کہ خلق خدا جائداد موقوفہ سے فائدہ اٹھائے، لوگوں کی اجتماعی ضرورتوں کی تکمیل ہو جس کے نتیجہ میں خدائے عز وجل ہماری خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرمائے، اور مقصود اصلی آخرت کی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار اور بہرور کرے، خواہ وہ انسان اپنی جائداد کو مساجد، مدارس، خانقاہوں وغیرہ میں سے جس نوع پر وقف کرے اس کا مقصد وہی ہوا کرتا ہے جو اوپر لکھا جا چکا ہے۔

موجودہ صورتحال میں سخت ضرورت ہے کہ اراضی موقوفہ کا جائزہ لیکر اس کی ویرانی و بربادی کو ختم کیا جائے، اور اس کی حفاظت کے اسباب مہیا اور فراہم کر کے اسے قابل انتفاع بنایا جائے، جہاں ان اراضی سے ملت کی اجتماعی ضرورتوں کو بروئے کار لانا ہے وہیں واقف کے منشاء و مقصد کی تکمیل بھی ہے۔

مذکورہ بالا تمہید کے بعد مرسلہ سوالوں کے جوابات یہ ہیں:

الف۔ وہ وقف جو اپنا مقصد کھو چکا ہے، ویرانی و بربادی کا شکار ہے، وہ اپنی موجودہ شکل میں نا قابل انتفاع ہے، جس پر غیروں کا قبضہ و تسلط کا خطرہ یقینی درجہ تک پہنچ چکا ہے تو ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے تبادل وقف قائم کرنے کی اجازت شریعت نے دی ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ ذخیرہ اور ''منتقی'' کی عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''والحاصل أن الموقوف عليه السكنى إذا امتنع من العمارة ولم يوجد مستأجر باعها القاضي واشترى بثمنها ما يكون وقفا'' (البحر الرائق ۵،۲۱۹)۔

حاصل یہ ہے کہ جس شخص پر رہائش کے لئے وقف کیا جائے اگر وہ خود موقوف مکان کی تعمیر نہ کرائے اور نہ کرایہ دار ملے تو قاضی اس کو بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری زمین و مکان خریدے جو وقف قرار پائے گا۔

ب۔ جب مشروط صورت میں اوقاف کی فروختگی کا ثبوت اور اس کا جواز اوپر معلوم ہو چکا تو پھر یہ سوال کہ: ''کیا ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین و مکان حاصل کر کے الخ'' میرے خیال میں تحصیل حاصل اور عبث ہے۔

جس زمین پر مسجد قائم ہے وہ اوقاف کی زمین اور دیگر اوقاف کی زمین میں فرق یہ ہے کہ بوقت ضرورت تمام اوقاف کی زمینوں کو بالاتفاق فروخت کیا جا سکتا ہے، لیکن امام شیخینؒ کے نزدیک جس زمین پر مسجد قائم ہے اسے کسی حال میں فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مسجد کے اوقاف اور دیگر، یعنی مدارس، قبرستان وغیرہ کے اوقاف میں تبدیلی کا حق صرف قاضی کو ہے کہ قاضی حالات، یعنی ضرورت شدیدہ، غیر شدیدہ کا جائزہ لیکر تبدیلی اور عدم تبدیلی کا فیصلہ کرے۔

- ''قال في الذخيرة: وفي المنتقى قال هشام: سمعت محمداً يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضي'' (البحر الرائق ۵،۲۱۹)۔

ویران نا قابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی ضروری ہے، واقف کے منشاء کی رعایت کئے بغیر کسی طرح کا تعلیمی یا رفاہی ادارہ قائم کرنا قطعاً درست نہیں، لہذا ایسے اوقاف فروخت کر کے واقف کے اغراض و مقاصد کے تحت نئے اوقاف قائم کرنے پڑیں گے جس کی تائید مندرجہ ذیل روایتوں سے ہوتی ہے۔

---

[1] استاذ جامعہ عربیہ اشرف العلوم کنہواں، سیتامڑھی بہار۔

''مراعاة غرض الواقفين واجبة'' (شامی ۴۲۲،۳)۔

''(قوله إلى أقرب مسجد أو رباط الخ) لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه'' (شامی ۳۷۱،۳)۔

شریعت نے منشاء واقف اور شرط کو نص شرعی کا درجہ دیا ہے، واقف کی شرط کے مطابق ہی شئ موقوف سے انتفاع اور اس کا استعمال درست ہوگا۔

''شرط الواقف كنص الشارع أي في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة'' (اشباہ/ ۱۹۵ قدیم نسخہ)۔

جس کا تقاضہ یہ ہے کہ شئ موقوف کا استعمال اسی خاص متعین نوع پر درست ہوگا جس پر واقف نے وقف کیا ہے اسکے علاوہ دوسرے وقف پر جائز اور درست نہ ہوگا، الا یہ کہ شئ موقوف ویران اور برباد ہوجائے اور اس سے انتفاع ختم ہوجائے تو ایسی صورت میں اس شئ موقوف کو بیچ کر حاصل شدہ رقم سے دوسری مناسب جگہ اسی نوع کے وقف پر خرچ کریں گے جس نوع پر واقف نے وقف کیا تھا، نوع کے تبادلہ کے ساتھ استعمال درست نہ ہوگا، جیسا کہ نمبر دو کی عبارت اس پر دال ہے (شامی ۳/ ۳۷۱)۔

مذکورہ بالا تمہید کے بعد عرض یہ ہے کہ ایسے مقامات جہاں مساجد کے بڑے بڑے اوقاف ہیں، جن کی آمدنی مسجد کے مصارف سے، بہت زیادہ ہے، تو کیا اس قسم کی اراضی پر جو فی الحال مسجد کی ضرورت سے زائد ہے مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے؟ مقصد وقف یہی ہے کہ حاصل شدہ آمدنی کو مسجد کے مصالح وضروریات میں صرف کی جائے۔

''لا شك أن مراد الواقف انتظام حال مسجده أو مدرسة لا مجرد انتفاء أهل الوقف'' (شامی ۳۷۷،۳)۔

''فيقدم أولاً لعمارة الضرورية ثم الأهم فالأهم من المصالح والشعائر'' (شامی ۳۷۷،۳)۔

الف۔ سوال میں ذکر کردہ زائد اراضی پر صرف دینی ادارہ قائم کرنے کی اجازت ملنی چاہئے، بشرطیکہ وہ اراضی ویران اور ناقابل انتفاع ہوجائے جس کی وجہ سے قبضہ ختم ہوجانے کا قوی خطرہ لاحق ہو، خواہ وہ خطرہ حکومت کی طرف سے ہو یا عوام کی طرف سے، اور دوسری شرط یہ کہ دینی ادارہ قائم کرنے کی ضرورت بھی ہو، اور مدرسہ قائم کرنے سے وہ خطرات ٹل جائیں جو خطرات پیچھے بیان کئے گئے۔

اگر وہاں بر تقاضائے حالات دینی ادارہ قائم کرنے کی فی الحال ضرورت نہیں، لیکن زائد زمین مسجد کے قبضہ سے نکل جانے کا قوی خطرہ درپیش ہے تو ایسی صورت میں زائد زمین فروخت کر کے حاصل شدہ رقم سے دیگر مساجد کیلئے ذریعہ آمدنی کو حاصل کیا جائے۔

ب۔ اور اگر وہاں پر مدرسہ کی ضرورت نہیں ہے اور نہ زائد زمین مسجد کے قبضہ سے نکل جانے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں حاصل شدہ زائد آمدنی کو صرف دیگر محتاج مساجد کے مصالح وضروریات میں خرچ کرنے کی اجازت ملے گی۔

وجہ ظاہر ہے کہ آمدنی جمع ہوکر چند سالوں میں ایک بڑا سرمایہ بن جائے گی، جس کی طویل عرصہ تک حفاظت ایک دشوار مسئلہ ہے، ایسی رقم خطرہ سے خالی نہیں ہے، یہ خطرہ حکومت کی دست درازی کا بھی ہوسکتا ہے اور منتظمین کی طرف سے خیانت کا بھی، یہ خطرات اس زمانہ میں تجربات ومشاہدات کی وجہ سے احتمالی نہیں رہے بلکہ واقعی ہوچکے۔

جب فقہاء نے ناجائز قبضہ کرنے والوں کے خوف وخطرہ سے اراضی کے انتقال کی اجازت دی ہے تو جب یہی خطرات آمدنی میں پیدا ہوجائے تو بدرجہ اولی آمدنی کا انتقال درست ہوگا۔

اوپر مشروط طور پر دینی ادارہ قائم کرنے کی اجازت اس لئے ہے کہ ہر واقف کا اصل مقصد حصول ثواب اور رضائے خداوندی ہے، یہ مقصد صرف دینی ادارہ قائم کرنے میں علی حالہ برقرار رہتا ہے، اگر واقف زندہ ہوتا اور وہ اپنے وقف کردہ جائداد کی ویرانی کو دیکھتا تو کیا وہ دینی ادارہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا، یقینا اجازت دیتا، لہذا زائد زمین میں مشروط طور پر دینی ادارہ کا قیام دلالۃً واقف کے منشاء ومقصد کے مطابق ہی ہے۔

اوپر لکھا جاچکا کہ مقصدِ واقف اور شرطِ واقف نص شارع کے درجہ اور حکم میں ہے، جہاں تک ممکن ہو مقصد وقف فوت نہ ہونے پائے۔

الف، ب۔ اس لئے شئ موقوف کے مصارف سے زائد آمدنی (جس پر خیانت کا اندیشہ ہو) کو اسی نوع کے مصالح وضروریات میں خرچ کرنے کی اجازت ہوگی، اس کے علاوہ دیگر ملی ودینی علمی وغیرہ امور میں صرف نہیں کر سکتے۔

ایسے اوقاف جو اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہیں، اس کا معمولی کرایہ ملتا ہے جس سے مسجد یا مدرسہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، تو کیا اجازت ملے گی کہ اسکو فروخت کر کے کسی تجارتی مقام پر کوئی دوکان خرید لی جائے جس سے اس کی آمدنی کئی گنا زیادہ آنے لگے، اور اس سے مدرسہ یا مسجد کی ضرورتیں بھی پوری ہونے لگے، اصح اور مختار مذہب کے مطابق ایسے اوقاف کو فروخت کرنا درست نہیں، کیونکہ یہ اوقاف فی الجملہ قابل انتفاع ہے (شامی ۳؍۳۸۷)۔

لیکن صاحب درمختار نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ وہ مسائل وقف جن میں علماء کا اختلاف ہے ایسے قول پر فتوی دیا جائے جو وقف کے لئے مفید تر ہو۔

''یفتی بکل ما هو أنفع للوقف فیما اختلف العلماء فیه'' (درمختار ۳،۴۰۱)۔

چنانچہ علامہ شامیؒ نے اس کی روشنی میں اس مقام پر بہت سے ایسے مسائل وقف ذکر کئے ہیں جن میں علماء کا اختلاف ہے اور مرجوح قول پر محض وقف کے فائدے کے پیش نظر فتوی دیا گیا ہے، اور ایسا ہی فتاوی بزازیہ میں ہے:

''عن محمد ضعفت الموقوفة عن الاستغلال والقیم یجد بثمنه أرضا أخری أکثر ریعا منه له البیع وشراء ما هو أکثر منه ریعا'' (فتاوی بزازیہ بر عالمگیری ۶،۲۷۱)۔

واقفین نے اپنی جائداد جس پر وقف کیا تھا وہ وقف کا مصرف ختم ہو چکا وہ متعین فقراء یا متعین مساجد ومدارس اب نہ رہے، سب معدوم ہو چکے تو ایسی صورت میں ان اوقاف کی آمدنی کو اسی نوع کے قریبی وقف پر خرچ کریں گے جس نوع پر واقف نے وقف کیا تھا۔

''وحکی أنه وقع مثله فی زمن سیدنا الإمام الأجل فی رباط بعض الطرق خرب ولا ینتفع المارة به وله أوقاف عامرة فسئل هل یجوز نقلها إلی رباط آخر ینتفع الناس به قال نعم؛ لأن الواقف غرضه انتفاع المارة ویحصل ذلك بالثانی'' (شامی ۳،۳۷۲)، ''وفی شرح الملتقی یصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (شامی ۳،۳۷۱)۔

الف۔ اوقاف کی وہ عمارتیں جو مخدوش ہونے کی وجہ سے نا قابل انتفاع ہیں اور نہ اوقاف کے پاس اتنی آمدنی ہے کہ جس سے تعمیر کر کے اس موقوفہ کو قابل انتفاع بنایا جا سکے تو ایسی صورت میں ملی حمیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ مسلمان چندہ جمع کر کے اس کی تعمیر کو انجام دیں، بلڈر کے معرفت (محض اس کے تعمیر کی وجہ سے) ایک یا دو منزل کی فروختگی کی صحت سمجھ میں نہیں آتی، ہاں اگر یہ معاہدہ ہو جائے کہ ایک یا دو منزل وقت متعینہ تک کے لئے تصرف میں بطور کرایہ دار کے تم رہو گے، جب کرایہ کی مقدار تمہارے صرف کردہ رقم کے برابر ہو جائے گی تو تم اس عمارت سے اپنا تصرف ختم کرلو گے تو ایسی صورت میں اوقاف کی تعمیر اور اس سے وقت متعینہ تک بلڈر کا تصرف جائز اور درست معلوم ہوتا ہے۔

ب۔ اوقاف کی عمارت مخدوش یا خالی زمین ہونے کی وجہ سے وہ وقف نا قابل انتفاع ہو جائے، اسے کارآمد بنانے کے لئے وقف کی آمدنی میں نہ تو اتنی گنجائش ہے کہ اس سے عمارت کی تعمیر ومرمت کی جا سکے اور نہ اس کے علاوہ اور کوئی سبیل وذریعہ ہے، اگر اس کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو وہ وقف ضائع ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں وقف شدہ زمین وجائداد کا وہ حصہ جو مصالح وضروریات کے لئے ہیں، اس میں سے بقدر ضرورت فروخت کر کے اوقاف کی تعمیر یا مرمت کی اجازت ہوگی، جس سے وہ وقف قابل انتفاع ہو جائے۔

قبرستان کی موقوفہ زمین پر جو قبرستان کی ضرورت سے زائد ہے، فقہاء نے مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ لوگوں نے اموات دفن کرنا چھوڑ دیا ہو، اور سابقہ قبروں کے نشانات مٹ گئے ہوں اور ایسا ہی اگر قبرستان کسی کا مملوک ہو تو قبروں کے نشانات مٹ جانے کے بعد مالک کی اجازت سے مسجد بنانا جائز ہے۔

''قال الحافظ العینی: فإن قلت هل یجوز أن تبنی المساجد علی قبور المسلمین؟ قلت قال ابن القاسم لو أن مقبرة من مقابر المسلمین عفت فبنی قوم علیها مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمین لدفن موتاهم لا یجوز لأحد أن یملکها، فإذا درست واستغنی عن الدفن فیها جاز صرفها إلی المسجد

لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد'' (عمدۃ القاری ۴،۱۷۹، احسن الفتاوی ۶،۴۰۹)۔

عبارت بالا میں قبرستان میں مسجد کے جواز کی دلیل یہ بیان کی گئی کہ قبرستان اوقاف مسلمین میں سے ہے جس کی منفعت عام ہے اور اس کی تملیک درست نہیں، ایسا ہی مسجد کا حال ہے۔

''لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه''۔

مذکورہ بالا گفتگو میں جس دلیل سے مسجد کی تعمیر کو درست کہا گیا ہے اسی دلیل سے قبرستان کی جگہ میں مدرسہ کی تعمیر کو درست اور جائز کہا جائے گا، ''والعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد''، چنانچہ ''فتاوی محمودیہ'' میں ہے:

اگر وہ قبرستان مملوک ہے تو مالک کی اجازت سے دینی مدرسہ کی تعلیم درست ہے، اگر قبرستان وقف ہے تو منشاء واقف ہی میں اس کو استعمال کیا جائے، لیکن اگر وقف ہونے کے باوجود وہ جگہ ضرورت سے زائد ہے اور بیکار رہنے سے اندیشہ ہے کہ کوئی اس پر غلط تصرف کرے جس سے وقف ہی ضائع ہوجائے تو دینی مدرسہ کی تعمیر کرنا درست ہے (فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۱۴۸)۔

عبارت بالا میں قبرستان کی زائد از ضرورت جگہ پر جس دلیل سے مسجد اور مدرسہ کا جواز اور اس کی درستگی معلوم ہوئی اسی دلیل سے مسجد کی زائد زمین میں مدرسہ کی تعمیر کا جواز اور اس کی درستگی ہوگی۔

زمانہ اتنا بدل چکا ہے کہ حرام و ناجائز جانتے ہوئے آخرت کی جوابدہی سے بے فکر ہو کر اراضی موقوفہ پر قبضہ و دخل لوگوں کا شیوہ بن چکا ہے، اگر اس زمین پر مدرسہ کی اجازت نہ دی جائے تو کوئی بعید نہیں کہ مستقبل قریب میں وہ زمین ہضم ہوجائے۔

وہ قبرستان جس سے مسلمانوں کی آبادی ختم ہوجانے کی وجہ سے اس کا استعمال متروک ہوجائے یا یہ کہ وہ قبرستان بیچ آبادی میں آجانے کی وجہ سے تدفین پر پابندی عائد کردی جائے جس سے اس پر قبضہ کا خطرہ ہے بلکہ قبضہ ہو رہا ہے ایسے بے مصرف قبرستان سے نفع اٹھانے اور وقف کو باقی رکھنے کے لئے ہر وہ تعمیر درست ہوگی جس میں دو شرطیں پائی جائیں۔ ایک یہ کہ وہ تعمیر جدید جس مقصد کے لئے ہو قبرستان ہی کی طرح وقف رہے۔ دوسری شرط یہ کہ اس کا نفع اجتماعی ضرورتوں پر مبنی ہو یعنی عام مسلمانوں کو حاصل ہو، بہتر یہ ہے کہ اس بے مصرف قبرستان پر مسجد یا مدرسہ بنادیا جائے بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو۔

ہمارا یہ استدلال عینی شرح بخاری کی مندرجہ ذیل عبارت سے ماخوذ ہے:

''قال ابن القاسم لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغني عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تملكيه لأحد فمعناهما على هذا واحد''

(ابن القاسم کا قول ہے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی قبرستان ویران ہوجائے اور اس میں مسجد بنادی جائے تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ قبرستان مسلمانوں کی تدفین کے لئے وقف ہوتے ہیں کوئی ان کا مالک نہیں بن سکتا، تو جب قبریں مٹ جائیں اور اس میں تدفین بند ہوجائے تو اس کو مسجد کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں اس لئے کہ مسجد بھی مسلمانوں کے اوقاف میں سے ہوتی ہے، کوئی اس کا مالک نہیں بن سکتا تو دونوں چیزیں ایک ہی ہیں)۔

حضرت تھانویؒ سے ایک ویران قبرستان کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا کہ اس زمین پر ایک مکان انجمن اسلام بنانا جائز ہے یا نہیں؟

حضرت تھانویؒ جواب میں مذکورہ بالا عینی کی عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''جواب مذکور سے بعلت اشتراک علت معلوم ہوا کہ انجمن کا مکان وقفی نفع عام کے لئے اس مقبرہ کی جگہ بنانا جائز ہے'' (امداد الفتاوی ۲/ ۵۷۹)۔

جو مساجد اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں، جن میں حکومت نے نماز کی ادائیگی کو منع کردیا ہے، حکومت کی طرف سے نماز پر پابندی ظلم اور زیادتی ہے، شرعا یہ منع غلط ہے، مسجد کی بڑی اہمیت وہی ہے جس مقصد کے لئے مسجد تعمیر ہوئی ہے، قرآن پاک کی آیت ''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه'' (سورہ بقرہ: ۱۱۴) کے تحت علامہ آلوسی تحریر فرماتے ہیں:

''وظاهر الآية العموم في كل مانع وفي كل مسجد وخصوص السبب لا يمنعه'' (روح المعانی ۱،۳۶۳)، اور ''(وسعى في خرابها) أي هدمها وتعطيلها'' (روح المعانی ۱،۳۶۴)۔

اوقاف کی حفاظت اور اس کا اپنے مصرف میں استعمال ہونا دونوں شریعت میں اہم اور مقصود اصلی ہے، ایسا قبرستان جو باؤنڈری نہ ہونے کی وجہ سے غیر محفوظ ہے، اس کی حرمت پامال اور ضائع ہورہی ہے، نیز اندیشہ ہے کہ اس پر قبرستان سے متصل مالک زمین آہستہ آہستہ قبضہ بڑھاتا چلا جائے، موجودہ صورتحال میں قبرستان کی حفاظت کے لئے (جب کہ باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو) اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرادی جائے جس کے لئے پیشگی کرایہ کے بطور لے لی جائے اور اس سے کام کرایا جائے جس میں قبرستان کے اطراف کا چندفٹ دوکانوں میں چلا جائے تو یہ طریقہ حفاظت درست ہے، لیکن یہ دوکانیں وقف کی ہوں گی، اس سے حاصل شدہ آمدنی اس کی ضروریات میں صرف ہوں گی، اور زائد آمدنی اسی نوع کی ضروریات میں استعمال ہوں گی۔

وہ قبرستان جس میں تدفین کا عمل جاری ہے، اور زمین قبرستان کی ضرورت سے زائد بھی ہے ادھر پرانی چھوٹی سی مسجد ہے، جو نمازی کے لئے تنگ پڑ رہی ہے ضرورت ہے کہ اس کی توسیع کی جائے، کیا ایسی صورت میں توسیع کی اجازت ملے گی؟

مسجد کی توسیع کی اجازت اس وقت ملے گی کہ جس طرف مسجد کی توسیع کرنی ہے اس طرف قبریں نہ ہوں اگر قبریں ہوں تو وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں، اور زمین قبرستان کی ضرورت سے زائد بھی ہے، ورنہ توسیع کی اجازت نہیں ملے گی، جیسا کہ آٹھویں سوال کے تحت تفصیلی گفتگو گذر چکی ہے۔

مسلم وغیر مسلم دونوں کی طرف سے وقف درست ہے، وقف کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں "وأما الإسلام فليس بشرط" (الهنديه ۲،۳۵۲)، مساجد ومقابر اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا (خواہ واقف مسلم ہو یا غیر مسلم) غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں رہنا درست ہے بشرطیکہ وہ اوقاف میں خیانت نہ کرے، مساجد ومقابر وغیرہ میں غیر شرعی تصرف نہ کرے، اوقاف کے متولی کا نصب وعزل امانت وخیانت پر موقوف ہے، خواہ وہ متولی مسلم ہو یا غیر مسلم۔

''قال في الإسعاف: ولا يولى إلا أمين قادر بنفسه أو بنائبه؛ لأن الولاية مقيدة بشرط النظر وليس من النظر تولية الخائن؛ لأنه يخل بالمقصود'' (شامی ۴،۳۸۵)۔

☆☆☆
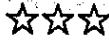
وقف کی حیثیت اور استعمال کی شرعی ضابطہ

مولانا سمیع اللہ قاسمی

وقف کی حقیقت کیا ہے؟ کن اشیاء میں وقف صحیح ہے اور کن میں صحیح نہیں ہے؟ اس کی بتدریج تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

وقف کی لغوی تعریف: اکثر لغت میں اس کی تعریف حبس سے کی ہے، یعنی ٹھہرنا، اور لسان العرب میں ''خلاف الجلوس'' یعنی بیٹھنے کے مقابلے میں کھڑے ہونے سے کیا ہے۔

وقف کی اصطلاحی تعریف: وقف کی اصطلاحی تعریف اکثر کتب فقہ میں امام صاحب کے نزدیک یہ ہے:

''حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة على الفقراء، وزاد فتح القدير على من أحب فيدخل فيه الغني، وزاد في الهندية على وجه تعود منفعتها إلى العباد''۔

کسی سامان کو واقف کی ملکیت میں محصور کرکے اس کی منفعت کو فقراء پر صدقہ کرنا۔ ''فتح القدیر'' میں مزید ہے: منفعت کا صدقہ کرنا جس پر چاہے تو غنی بھی اس کے تحت داخل ہوجائے گا۔ اور ''ہندیہ'' میں ہے: اس طرح کردینا کہ منفعت بندوں کو پہونچتی رہے۔ اور صاحبین کے نزدیک وقف کی اصطلاحی تعریف ''حبس العين على حكم ملك الله تعالى'' (سامان کو اللہ تعالی کی ملکیت کے حکم میں کردینا) ہے۔

وقف کا حکم:

چونکہ امام صاحب کے نزدیک وقف کی اصطلاحی تعریف ''حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة على الفقراء أو على من أحب'' ہے، اس لئے نہ وقف لازم ہوگا اور نہ شئ موقوف واقف کی ملکیت سے باہر ہوگی حتی کہ واقف کو شئ موقوف بیچنے اور ہبہ کرنے کا اختیار ہے، اور واقف کے مرنے کے بعد شئ موقوف میں وراثت بھی جاری ہوگی۔

لیکن تین صورتیں ایسی ہیں جن میں بالاتفاق شئ موقوف واقف کی ملکیت سے باہر ہوجاتی ہے:

(۱) کوئی شخص مسجد کے لئے وقف کرتا ہے تو شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج ہوجائے گی بالاتفاق۔

(۲) قضاء قاضی یعنی قاضی نے شئ موقوف ہونے کا فیصلہ کردیا تو واقف کی ملکیت سے باہر ہوجائے گی۔

(۳) اگر واقف اپنی موت کے ساتھ معلق کردے تو شئ موقوف واقف کی ملکیت سے باہر ہوجائے گی۔ اور صاحبین کے نزدیک چونکہ وقف کی تعریف ''حبس العين على حكم ملك الله'' ہے، لہذا جب واقف کا وقف کرنا صحیح ہوگیا تمام شرائط کے ساتھ تو وقف لازم ہوگیا، اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے باہر ہوکر اللہ تعالی کی ملکیت میں داخل ہوگئی۔

لیکن صاحبین کے مابین بھی تھوڑا اختلاف ہے: امام ابویوسفؒ کے نزدیک مطلقا وقف کردینے سے وقف ہوجاتا ہے اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج ہوجاتی ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک چونکہ وقف کے اندر تسلیم شرط ہے اس لئے جب تک سپرد نہ کیا جائے یا استعمال میں نہ لے آیا جائے تب تک وقف لازم نہیں ہوگا اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے باہر نہیں ہوگی، لہذا جب تسلیم (سپردگی) ہوجائے یا شئ موقوف مستعمل ہونے لگے تو وقف لازم بھی ہوگیا اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج بھی ہوگئی۔ لیکن اس صورت میں امام ابویوسفؒ کا قول اقرب الی الفقہ اور راجح معلوم ہوتا ہے۔

مسجد اور دیگر اوقاف میں فرق:

مسجد کے اندر تو بالاتفاق شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک جب تک اس مسجد کے اندر نماز

نہ پڑھے واقف کی ملکیت سے نہیں نکلتی ہے اور قبرستان، پیاؤ (پانی پینے یا پلانے کے نظم کی کوئی شکل)، حوض، مسافر خانہ، ودیگر اوقاف کے اندر امام صاحب کے نزدیک چونکہ وقف کی تعریف ''حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة على الفقراء'' ہے، لہذا مسجد کے علاوہ ان تمام صورتوں میں شئ موقوفہ واقف کی ملکیت سے نہیں نکلے گی، لہذا اس کو بیچنے اور ہبہ کرنے کا اختیار ہے اور اس میں وراثت بھی جاری ہوگی، ہاں دوصورتوں میں واقف کی ملکیت سے خارج ہوجاتی ہے اور وقف لازم ہوجاتا ہے۔

(۱) قضاء قاضی، یعنی قاضی صاحب نے فیصلہ کردیا ہے تو واقف کی ملکیت سے خارج ہوجائے گی اور وقف لازم ہوجائیگا:

(۲) تعلق بالموت، یعنی اپنے موت کے ساتھ متعلق کردے کہ میرے مرنے کے بعد یہ شئ وقف ہے تو یہ وقف لازم ہوجائے گا، اور صاحبین کے نزدیک چونکہ وقف کی تعریف حبس العين على حكم ملك الله یعنی عین کا خاص کرنا اللہ تعالی کی ملکیت میں ہے، اس لئے ان تمام صورتوں میں وقف لازم ہو جائے گا اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج ہوکر اللہ تعالی کی ملکیت میں داخل ہوجائے گی۔

لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مطلقاً وقف کردینے سے شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج ہوجاتی ہے اور چونکہ امام محمدؒ کے نزدیک تسلیم (سپردگی) شرط ہے لہذا جب مسافر خانہ میں کوئی رہنے لگے یا قبرستان میں ایک بھی مردہ دفن ہوجائے یا اس کے علاوہ تسلیم (کسی شکل میں سپردگی) ہوجائے تو وقف لازم ہوگیا اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج ہوگئی۔

امام صاحبؒ کی دلیل:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: ''لا حبس عن فرائض الله'' یعنی اللہ تعالی نے فرائض کے معاملہ میں جو حکم دیا ہے اس کے اندر وقف جاری نہیں ہوگا۔ یعنی اس کو خاص نہیں کیا جائیگا، اور جب کوئی شخص انتقال کرتا ہے تو اس کی متروکہ اشیاء کو اللہ تعالی نے اسکے وارثین میں تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے، اور جب وارثین کا حق اس سے متعلق ہوگیا تو اس کو اس کے مرنے کے بعد کیونکر روک کر رکھا جاسکتا ہے، اور وہ دونوں صورتیں جن میں وقف لازم ہوجاتا ہے اس میں بیان کرتے ہیں کہ حاکم چونکہ مجتہد ہے اس وجہ سے اس کے حکم سے وقف لازم ہوجائے گا، اسی طرح سے تعلق بعد الموت میں چونکہ وصیت ثلث مال میں صحیح ہے اس لئے مرنے کے بعد معلق کرتا ہے تو وقف لازم ہوجائے گا۔

اس کے بعد دوسری دلیل دیتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص قبرستان کی زمین وقف کرتا ہے، اسی طرح سے پیاؤ یا مسافر خانہ وقف کرتا ہے تو قبرستان میں خود مدفون بھی ہوسکتا ہے اور مسافر خانہ میں بھی خود بھی ٹھہر سکتا ہے، اگر موقوف چیز اس کی ملکیت سے زائل ہوجاتی تو قبرستان میں اس کو دفن نہیں کیا جاسکتا تھا اور مسافر خانہ میں ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ وہ مال غیر ہوگیا، لہذا وقف نہ لازم ہوگا اور نہ ہی واقف کی ملکیت سے خارج ہوگا لیکن وقف بہر حال صحیح ہوجائے گا، جیسا کہ عاریت میں رہتا ہے کہ شئ مستعار اس کی ملکیت میں رہتی ہے اور اس کے منافع کا حق دوسروں کو دیدیتا ہے، یعنی ملکیت تو مالک کی رہتی ہے، لیکن اس کو شئ سے نفع حاصل کرنے کا حق ہوتا ہے۔

صاحبین کی دلیل: ان کی دلیل یہ ہے کہ جب واقف نے کہا ''وقفت داری'' تو اس میں دو احتمال ہے، ایک تو یہ کہ وہ شے اس کی ملکیت میں ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ شئ موقوف اس کی ملکیت سے خارج ہوگئی، اور جب دونوں کا احتمال ہے تو ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح شمار کرکے کسی ایک پر عمل کیا جائے گا، لہذا جب ہم نے غور وخوض کیا تو ایک حدیث شریف سامنے آئی، جس کی بنا پر ہم نے دوسرے کو راجح قرار دیکر مسئلہ کو صاف کردیا، حدیث شریف یہ ہے جب حضرت عمرؓ نے خیبر کی زمین کا وقف کرنا چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اس کے عین کو صدقہ کرو، یہی محل استدلال ہے کہ جب تک شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نہیں نکلتی تب تک صدقہ کا تحقق کس طرح ہوگا یعنی عین کا صدقہ کس طرح سامنے آئیگا، لہذا جب عین کا صدقہ ہوجائے گا تو وقف بھی لازم ہوجائے گا اور شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج ہوجائے گی، اب جب شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج ہوگئی تو نہ اس کو بیچنے اور نہ ہی اس کو ہبہ کرنے کا اختیار ہے اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہوگی، یہی وجہ ہے اس کو ترجیح دیتے ہیں۔

صاحبین کی دوسری دلیل یہ کہ ضرورت بھی یہی ہے کہ وقف لازم ہوجائے، اس لئے کہ جب تک وقف لازم نہیں ہوگا ہمیشہ کے لئے واقف کو وقف کا ثواب حاصل نہیں ہوگا بلکہ جب وہ شئ موقوف کو بیچ دیگا یا ہبہ کردے گا یا اس میں وراثت جاری ہوگی تو اس کا ثواب منقطع ہوجائے گا، لہذا جب تک وقف لازم نہیں ہوگا موقوف ... اس کی ملکیت سے خارج نہیں ہوگی اور اس کو ثواب نہیں ملے گا۔

اس کے بعد وقف کے شرائط کو بیان کرتے ہیں کہ کن کن شرطوں کی بنا پر وقف صحیح ہوجاتا ہے اور کون سی شرط ایسی ہے جس کی وجہ سے وقف فاسد ہوجائے گا اور کون سی شرط سے شرط فاسد اور وقف صحیح ہوجائے گا۔

شرائط واقف:

(۱) پہلی شرط تو یہ ہے کہ واقف آزاد ہو، اسی لئے اگر کوئی غلام وقف کرتا ہے تو اس کا وقف صحیح نہیں ہوگا بلکہ وقف باطل ہوجائے گا، اس لئے کہ غلام کسی چیز کا مالک نہیں ہے، جو کچھ اس کے پاس ہے اس کے آقا کی ملکیت ہے۔

(۲) واقف بالغ ہو، اس لئے کہ اگر نابالغ وقف کرتا ہے تو اس کا وقف صحیح نہیں ہوگا، ہاں اس کا وقف موقوف رہیگا قاضی کی اجازت پر، اگر قاضی صاحب اجازت دیتے ہیں تو اس کا وقف بھی نافذ ہوجائے گا۔

(۳) واقف عاقل ہو، اسی لئے اگر کوئی مجنون، دیوانہ، پاگل کسی شئ کا وقف کرتا ہے تو اس کا وقف صحیح نہیں ہوگا، وجہ یہ ہے کہ وقف کہتے ہیں بغیر کسی عوض کے اپنے ملک کو زائل کرنا بنیت ثواب، اور نابالغ اور مجنون کا مال نقصان والے تصرفات کا محل نہیں ہے۔

(۴) یہ ہے کہ وقف کرتے وقت شئ موقوف واقف کی ملکیت میں ہو، لہذا اگر کوئی شخص ارض مغصوبہ کا وقف کرتا ہے تو اس کا وقف صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ جس چیز کا وقف کررہا ہے اس کا وہ مالک نہیں ہے، اسی طرح سے اگر وہ بعد میں ارض مغصوبہ کا مالک بن جاتا ہے کسی وجہ سے بھی تو وقف درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ بوقت وقف شئ موقوف کا اس کی ملکیت میں موجود ہونا شرط ہے اور وہ شخص وقف کرتے وقت اس کا مالک نہیں تھا۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ وقف منجز ہو معلق نہ ہو، یعنی اس شرط کے ساتھ وقف کرتا ہے کہ اگر میرا لڑکا آ گیا یا فلاں شخص کا انتقال ہوگیا تو میری زمین وقف ہے تو وقف صحیح نہیں ہوگا، اس لئے وقف بلا شرط ہو اور صاف وضاحت کے ساتھ وقف کرے۔

(۶) یہ ہے کہ شئ موقوف معلوم ہو مجہول نہ ہو، یعنی جو چیز وقف کرتا ہے اس کا متعین کرنا ضروری ہے، لہذا اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میری زمین وقف ہے تو وقف درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ وقف کے اندر متعین کرنا ضروری ہے کہ کتنی اور کون سی زمین وقف کررہا ہے ورنہ وقف باطل ہوجائے گا۔

(۷) یہ ہے کہ مجور علیہ نہ ہو، یعنی قاضی کی طرف سے اس کو تصرف سے منع نہ کیا گیا ہو، جیسا کہ کوئی دیوانہ ہے یا مقروض ہے اس کی وجہ سے قاضی نے اس کو مجور علیہ قرار دیا ہے تو اس کا وقف صحیح نہ ہوگا۔

(۸) ایک شرط یہ بھی ہے کہ واقف شئ موقوف کی آخری جہت ایسی بیان کرے جو کبھی ختم ہونے والی نہ ہو، یہ شرط طرفین کے نزدیک ہے ان کے برخلاف امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ آخری جہت بیان فرمانے کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ اس کے بعد فقراء اور مساکین پر خود بخود وقف ہوجائے گی، مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ میری فلاں زمین زید پر وقف ہے، اس کے بعد اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا تو طرفین کے نزدیک وقف درست نہیں ہوگا لیکن امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ زید کی اولاد کے بعد وہ شئ خود بخود فقراء پر وقف ہوجائے گی، بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۹) یہ ہے کہ وقف مؤبد ہو موقت نہ ہو، اس لئے کہ وقف کہتے ہیں غیر محدود طریقے پر اپنی ملکیت کو زائل کرنا اور موقت میں ایسا نہیں ہے لہذا اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد ایک سال کے لئے زمین فقراء پر وقف ہے تو یہ وقف باطل ہوجائے گا۔

(۱۰) یہ ہے کہ وقف کو خیار شرط کے ساتھ معلق نہ کیا ہو، لہذا اگر کسی شخص نے خیار شرط کے ساتھ معلق کیا ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تین دن تک خیار شرط ہے اس کے بعد خیار باطل ہوجائے گا، اور امام محمد مطلقاً خیار کو باطل قرار دیتے ہیں، یہ اختلاف مسجد کے علاوہ میں ہے ورنہ مسجد کے بارے میں بالاتفاق خیار باطل ہوجائے گا۔

(۱۱) یہ ہے کہ وقف کرتے وقت بیع کی شرط نہ لگایا ہو اس لئے کہ وقف کرنے سے شئ موقوف واقف کی ملکیت سے خارج ہوکر اللہ تعالی کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے، اور جب بیع کی شرط لگائے گا تو پھر اس کی ملکیت سے خارج نہیں ہوگی، اس وجہ سے کہ بیع کی شرط وقف میں جائز نہیں ہے۔

(۱۲) یہ ہے کہ وقف غیر منقول اشیاء میں ہو، جیسے زمین اور مکان وغیرہ، ہاں وہ اشیاء جو غیر منقولی کے تابع ہیں جیسے زمین کی کاشتکاری کے لئے ہل بیل کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ اس کے تابع ہے، لہذا اس طرح کی اشیاء غیر منقول کے تابع ہوکر وقف صحیح ہوجائے گا اس قاعدے کے تحت جس کو ہدایہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

''کم من شئ یثبت تبعا لم یثبت مقصوداً الخ'' (بہت سی چیزیں تبعاً تو ثابت ہوتی ہیں اور اصالۃً ثابت نہیں ہوتیں)۔

اوقاف کے اندر شرطوں کی بحث:

اب بیان کیا جاتا ہے کہ اوقاف کے اندر شرائط کی حیثیت کیا ہے، وقف کے اندر جتنی شرطیں ذکر کی گئیں ہیں تمام شرطیں پائی جاتی ہیں تو وقف صحیح اور درست ہوجائے گا، اور اگر تمام شرطیں نہیں پائی جاتی ہیں تو وقف باطل ہوجائے گا، لیکن بعض شرطیں ایسی ہیں جو کہ شروط فاسدہ کہلاتی ہیں، جنکی وجہ سے وقف صحیح اور شرط باطل ہوجاتی ہے۔ مثلاً وقف کی ایک شرط یہ ہے کہ واقف آزاد اور عاقل و بالغ ہو، لہذا اگر غلام یا مجنون اور بچہ وقف کرتا ہے تو وقف باطل ہے، اسی طرح سے وقف کے لئے شئی کا معلوم ہونا شرط ہے لہذا اگر کوئی شخص مجہول شئی کا وقف کرتا ہے تو وقف باطل ہوجائے گا۔

شرائط کی دوسری قسم میں اختلاف ہے، مثلاً کوئی شخص وقف کرتا ہے خیار شرط کے ساتھ تو اس کے بارے میں امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقف درست ہوجائیگا اور خیار کی شرط فاسد ہے، اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے تین دن تک کے لئے خیار ہوگا اور تین دن گذر جانے کے بعد خیار باطل ہوکر وقف صحیح ہو جائے گا، یہی مسئلہ اس صورت میں ہے جب کہ موقوفہ اشیاء کے بدلنے کی شرط لگائے۔

شرائط کی تیسری قسم: اگر کوئی شخص مسجد کے لئے زمین وقف کرتا ہے اور اس کے اندر کسی قسم کی شرط لگاتا ہے تو بالاتفاق وقف صحیح اور درست ہوجائے گا اور شرط فاسد قرار پائے گی۔

وقف کے الفاظ:...... علامہ شامی نے "ردالمحتار" میں ذکر کیا ہے کہ وقف کے الفاظ تقریباً (۲۰) ہیں جن میں کچھ کا شمار انہوں نے کیا ہے، مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میری فلاں زمین کا غلہ ہمیشہ کے لئے وقف ہے، یا یہ کہتا ہے کہ میری فلاں جائداد زید پر موقوف ہے، اس کے بعد اس کی اولاد پر، اس کے بعد فقراء پر، اسی طرح سے یہ کہے کہ میری فلاں زمین فقراء پر صدقہ ہے، یا اپنے مرنے کے ساتھ معلق کردیا کہ میری فلاں زمین فقراء پر وقف ہے تو اس کے ثلث مال میں سے وقف جاری کیا جائے گا۔ لیکن اصل لفظ جو ہے موقوفہ، یعنی موقوفہ کا لفظ استعمال کرنے سے بلا تامل وقف ہوجائے گا، یعنی یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ میری فلاں زمین موقوف ہے "ارضی ہذہ موقوفۃ" اس طرح کے الفاظ کہہ دینے سے وقف صحیح ہوجائے گا، یہ اس صورت کے ساتھ خاص ہے جب کہ کسی معین شخص کے لئے وقف نہ کیا ہو، اگر معین شخص کے لئے وقف کیا ہے تو اس معین شخص کے مرنے کے بعد شئی مذکورہ خود بخود فقراء پر وقف ہوجائے گی۔ اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ صدر الشہید کا قول یہ ہے کہ مشائخ بلخ کا اسی پر فتوی ہے، انہوں نے عرف کا اعتبار کیا ہے، عرف یہ ہے کہ جب انسان کسی معین شخص پر وقف کرتا ہے اور اسکے بعد کچھ نہیں ذکر کرتا ہے تو خود بخود شئی مذکور فقراء پر وقف ہوجائے گی، وجہ یہ ہے کہ عموماً وقف جو کیا جاتا ہے فقراء پر ہی کیا جاتا ہے۔

منقولی اشیاء کا وقف:

منقولی اشیاء کے اندر امام ابو یوسف کا قول یہ ہے کہ کراع، یعنی سواری کا جانور اور ہتھیار کے علاوہ کسی منقولی اشیاء میں وقف صحیح نہیں ہے، اور کراع اور اسلحہ کے بارے میں بھی فرماتے ہیں کہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسمیں بھی وقف درست نہیں ہو، لیکن چونکہ ان دونوں کے بارے میں نص وارد ہے اس وجہ سے اس کو جائز قرار دیا، اس لئے کہ وقف کے اندر تابید شرط ہے اور کراع و اسلحہ ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے، لہذا قیاس تو یہ کہتا ہے کہ وقف درست نہ ہو لیکن اس کے بارے میں حدیث ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أما خالد فقد حبس أدرعا وأفراسا له في سبيل الله، وأما طلحة حبس درعه في سبيله الخ" (خالد نے اپنی زرہیں اور گھوڑے اللہ کے راستے میں دیدئے ہیں اور طلحہ نے اپنی زرہ اللہ کے راستے میں دیدیا ہے)

اس حدیث کی بنا پر ان دونوں میں وقف درست ہے، اور امام محمد فرماتے ہیں کہ وہ شئی جس کو عرف عام میں وقف کیا جاتا ہے جیسے قرآن کریم، کلہاڑی وغیرہ، تو چونکہ شریعت میں عرف کا بہت بڑا دخل ہے اس وجہ سے عرف کا اعتبار کرتے ہوئے ان اشیاء میں بھی وقف درست ہوجائے گا۔ انکی دلیل "ما رآه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن" اس لئے کہ مسلمان کسی برائی کو حسن نہیں کہہ سکتا ہے، اور امام محمد کا قول أقرب إلی الفقہ معلوم ہوتا ہے یہی قول ہمارے یہاں مفتی بہ قرار پاکر فتوی اسی پر دیا جاتا ہے۔

غیر مسلم کا کیا ہوا وقف:...... غیر مسلم کا کیا ہوا وقف صحیح اور درست ہے، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ جس چیز کے لئے وقف کر رہا ہے وہ شئی ہمارے

یہاں بھی قربت اور ان کے یہاں بھی قربت ہو، یعنی باعث ثواب ہو، لیکن اگر کسی ایک کے یہاں قربت ہو اور دوسرے کے یہاں باعث قربت نہیں ہے تو صحیح نہیں ہے، دونوں کے نزدیک قربت ہونے کی مثال، جیسے کوئی غیر مسلم فقراء کے لئے وقف کرتا ہے تو ان کے یہاں بھی قربت ہے اور ہمارے یہاں بھی باعث ثواب ہے، اسی طرح بیت المقدس کے لئے وقف کو وہ بھی قربت مانتے ہیں، لہذا اس صورت میں وقف درست قرار پائے گا۔

مشترک اشیاء کا وقف:

مشترک اشیاء کا وقف صحیح بھی ہے اور نہیں بھی ہے، اگر مشترک اشیاء ایسی ہیں جو قابل تقسیم نہ ہو تو ایسی صورت میں بالاتفاق اشیاء کا وقف صحیح ہے، مثلاً چھوٹا کمرہ یا غسل خانہ ہے، اب اس میں دو آدمی شریک ہیں ان میں سے ایک اپنے حصہ کو وقف کرنا چاہتا ہے تو اس کا وقف بالاتفاق درست ہے اس لئے کہ یہ ایسی زمین ہے جو نا قابل تقسیم ہے۔

اور اگر مشترک اشیاء ایسی ہیں جو قابل تقسیم ہیں تو اس میں ائمہ کا اختلاف ہے، امام ابو یوسفؒ مشترک اشیاء کے وقف کو جائز قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ تقسیم قبضہ کو مکمل کرنے کے لئے ہوتی ہے، اور ان کے نزدیک قبضہ شرط نہیں ہے، لہذا مشترک اشیاء کا وقف درست ہو جائے گا، اور امام محمد کے نزدیک چونکہ تسلیم (سپردگی) شرط ہے اور مشترک اشیاء میں تسلیم نہیں پایا جاتا ہے، لہذا مشترک اشیاء کا وقف صحیح نہیں ہے۔

شئ موقوف کا تبادلہ:

اگر واقف شئ موقوف کے تبادلے کی شرط لگاتا ہے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے، اور امام محمد فرماتے ہیں کہ اگر تبادلے کی شرط لگاتا ہے تو وقف صحیح ہو جائے گا اور شرط باطل ہو جائے گی، اسی طرح سے اگر شرط لگاتا ہے کہ شئ موقوف کو بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری شئ خریدی جائے گی، تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ شرط بھی درست ہے، لیکن امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقف صحیح ہو جائے گا اور شرط فاسد ہو جائے گی، لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی اس کو ایک ہی مرتبہ کا اختیار ہو گا، دوسری مرتبہ پھر اس کا تبادلہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا اختیار نہیں ہے، اس لئے کہ پہلی مرتبہ تبادلہ سے شرط ختم ہو گئی، اب شرط مفقود ہے اس لئے اختیار نہیں ہوگا۔

دلیل: "فإن شرائط الواقف معتبرة مالم تخالف الشرع" (واقف کی شرطیں اگر مخالف شرع نہ ہوں تو معتبر ہیں)۔

واقف کے کن کن شرطوں کی رعایت ضروری ہے:...... واقف ایسی شرطیں لگاتا ہے جو کہ شرع کے مخالف نہ ہو تو قاضی کے لئے ایسی شرطوں کی رعایت ضروری ہے، مثلاً واقف اپنی جائداد کو وقف کرتا ہے اور شرط لگاتا ہے کہ اس زمین کا غلہ اس پر خرچ ہوگا تو یہ صحیح ہے، اسی طرح سے اگر یہ شرط لگاتا ہے کہ اس کی ولایت اسکے لئے ہے تو یہ شرط لگانا بھی صحیح اور درست ہے، اور ایسی شرطوں کی رعایت قاضی پر ضروری ہے، لہذا موقوفہ اشیاء کی ولایت اس کے لئے ثابت ہوگی۔

شئ موقوف کا مقصد اگر فوت ہو جائے تو کیا حکم ہے:

امام محمدؒ کے نزدیک مطلقاً شئ موقوف کا مقصد اگر فوت ہو جائے، یا وقف کوئی ایسی پرانی چیز میں ہے جو بیکار پڑی ہوئی ہے تو یہ تمام اشیاء واقف کی طرف لوٹ آئیں گی بشرطیکہ واقف باحیات ہو، ورنہ اگر واقف کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثاء میں تقسیم ہوں گی، اور مسجد کے بارے میں امام صاحب اور امام ابو یوسفؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ اگر مسجد ٹوٹ جائے اور ویران ہو جائے اور وہاں پر کوئی مسلمان آباد نہیں ہے جو مسجد کی دوبارہ تعمیر نو کر کے آباد کرے تب بھی وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، جب وہاں مسلمان پہنچنے لگیں تو ان کو اس جگہ پر مسجد بنانا ضروری ہوگا، لیکن امام ابو یوسف کی ایک ہدایت یہ ہے کہ اگر ان اشیاء کا مقصد فوت جائے تو چاہے وہ مسجد ہو، یا اوقاف کی دیگر اشیاء ہوں ان سب کو قاضی کے حکم سے بیچ کر قریب والی مسجد میں اس کے ثمن کو صرف کیا جائے گا، اسی طرح سے جو بھی اوقاف کی چیزیں بیکار پڑی ہوئی ہیں یا اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے تو قاضی کے حکم سے اس کو بیچ کر اس ثمن کو قریب والے اوقاف میں صرف کیا جائے گا بشرطیکہ وقف کسی معین شخص کے لئے نہ ہو بلکہ عام فقراء کے لئے ہو۔

الف، ب۔ ایسے اوقاف کے استبدال کے سلسلے میں فرق ہے کہ اگر مساجد ہیں تو بالاتفاق وہ مسجدیں قیامت تک مسجد ہی رہیں گی اس سے مسجد کا حکم ختم نہیں ہو گا، بلکہ اس جگہ جب بھی مسلمان آ کر آباد ہوں گے ان کے لیے اس جگہ مسجد تعمیر کرنا ضروری ہوگا۔ ہاں مسجد کے وہ سامان جو مصرف کے لائق نہیں اس کو قریب والی مسجد کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے، اور اس کے اندر بھی ارباب حل وعقد کے مشورہ سے اگر کیا جا سکتا ہے تو اس وقف کو منتقل کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، اور دوسرے اوقاف کے سلسلے میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر واقف کے مقاصد کو باقی رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر متبادل وقف قائم کیا جاتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے

اس لئے کہ فقہاء کا قاعدہ ہے ''شرط الواقف کنص الشارع''۔

جو مسجد غیر آباد ہو چکی ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کی کوئی صورت نہیں رہی اس جگہ کو محفوظ کردیا جائے، مفتی بہ قول کے مطابق وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، ہاں اس مسجد کا سامان دوسری مسجد میں یعنی کارآمد نہ ہو تو ارباب حل وعقد کی رائے سے اس سامان کو فروخت کر کے قیمت دوسری مسجد میں صرف کردی جائے لیکن مسجد کا سامان بلاقیمت مدرسہ یا مسافر خانہ وغیرہ میں صرف کرنا درست نہیں ہے۔ شامی میں ہے:

''ولو خرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام والثاني أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتي، وروى الملك عن محمد وعن الثاني ينقل إلى مسجد آخر بإذن القاضي وكذا الرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أوبئر أو حوض۔

قوله وخرب ما حوله اى ولو مع بقائه عامراً وكذا لو خرب وليس له ما يعمر، وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد آخر قوله وعند الثاني جزم به في الإسعاف حيث قال لو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف فيباع نقضه بإذن القاضي ويصرف القاضي إلى بعض المساجد قوله إلى أقرب مسجد أو رباط، لف ونشر مرتب وظاهره انه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه''۔

اس پوری عبارت سے پورا مسئلہ صاف ہوجاتا ہے کہ مسجد اور دیگر اوقاف کے اندر فرق ہے، لہذا مسجد کے علاوہ ان اوقاف کے سامان کو جن کا مقصد بالکل فوت ہو چکا ہے دوسرے اوقاف کے اندر صرف کیا جاسکتا ہے، چاہے وہ اوقاف قبرستان ہو یا حوض یا مسافر خانہ کسی بھی قسم میں ہو، اور اگر بالکلیہ طور پر انتفاع منقطع ہوجائے تو قاضی شرعی جہاں قائم ہے ورنہ ارباب حل وعقد کو چند شرائط کے ساتھ اس کا متبادل وقف قائم کرنے کی اجازت ہے۔

''والمعتمد انه يجوز القاضي بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية وأن لا يكون هناك ريع لوقف يعمر به وأن لا يكون البيع بغبن فاحش كذا في البحر الرائق۔ وشرط في الاسعاف أن يكون المستبدل قاضي الجنة المفسر بذى العلم''۔

یعنی بالکلیہ طور پر نا قابل انتفاع ہے یا اس کی آمدنی اتنی نہیں ہورہی ہے جس سے اس کی تعمیر ہوسکے اور بیع بڑے خسارے سے بھی نہیں ہورہی ہے تو اس صورت میں قاضی جنت جو کہ ذی علم ہو اس کے حکم سے استبدال جائز ہے۔ ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ اگر واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان نا قابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''شرط الواقف کنص الشارع''، یعنی واقف کی شرط شارع کے نص کی طرح ہے۔

الف۔ مسجد پر وقف اراضی جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہیں اسی مسجد میں دینی مدرسہ قائم کیا جاسکتا ہے تا کہ مسجد کی آبادی میں ترقی ہو کیوں کہ آبادی کو ترقی دینا بڑی مصلحت ہے۔

''الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء قيل: لا يصرف وأنه صحيح ولكن يشترى به مستغل للمسجد'' (مسجد کے وقف کی فاضل آمدنی فقراء پر صرف کی جاسکتی ہے یا نہیں، صحیح قول یہ ہے کہ ایسا نہ کرے اس سے مسجد کی آمدنی کے ذرائع کا نظم کیا جائے)۔ اور عالمگیری میں دوسری جگہ فرمایا ہے:

''الذى يبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف أم لا ثم إلى ما هو أقرب إلى العمارة وأعم للمصلحة كالإمام للمسجد والمدرس للمدرسة'' (وقف کی آمدنی سب سے پہلے وقف کی عمارت وتعمیر پر لگے گی، خواہ واقف نے شرط رکھی ہو یا نہ رکھی ہو، اس کے بعد پھر عمارت سے متعلق امور میں مثلاً مسجد کا امام اور مدرسے کا مدرّس)۔

اور اگر یہ بھی دشوار ہو تو مسجد کی فاضل آمدنی دوسری مسجد میں صرف کی جاسکتی ہے لیکن مسجد کے علاوہ دیگر کاموں میں صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

ب۔ چونکہ واقف نے مسجد کے ان مکانات کو جو مسجد کی ضروریات سے زائد ہیں مسجد ہی کے لئے وقف کیا تھا اس لئے واقف کے مقاصد کی رعایت ضروری

ہے، لہذا دوسری تعلیمی یا رفاہی کاموں میں صرف کرنا جائز نہیں ہے، فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ''فإن شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع''، یعنی واقف کی شرط کا اعتبار کیا جائے گا اگر شریعت کے مخالف نہ ہو۔ دوسرا قاعدہ ہے: ''شرط الواقف كنص الشارع أي في وجوب العمل به وفي المفهوم والدلالة الخ'' (واقف کی شرط شارع کی نص کے درجہ میں ہے یعنی اس سے عمل کے واجب ہونے کے حق میں اور مفہوم و دلالت کے سلسلہ میں) لہذا اس صورت میں جب کہ واقف نے مذکورہ اوقاف کو مسجد ہی کے لئے وقف کیا تھا، اس لئے وقف کی آمدنی سے دوسری تعلیمی یا رفاہی کاموں میں صرف کرنا جائز نہیں ہوگا۔

الف۔ اس سوال کے اندر چونکہ ایسی چیزوں کی صراحت موجود ہے جن میں اوقاف کی آمدنی اس کی متعینہ مصارف سے بہت زائد ہے اور سال بسال جمع ہوکر بہت بڑا سرمایہ بن گئی ہے جس کی بنا پر حکومت اور منتظمین کی طرف سے خطرہ بھی ہے، لہذا اسی نوع کی ضروریات میں صرف کیا جاسکتا ہے، ''عالمگیری'' میں ہے:

''الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء قيل لا يصرف وأنه صحيح ولكن يشترى به مستغل للمسجد۔

ب۔ دیگر علمی، دینی اور ملی کاموں یا مساجد وغیرہ میں صرف نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اوقاف کی زمینوں کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں: بیع الوقف باطل لا فاسد اور چونکہ یہ مقاصد واقف کے خلاف بھی ہے اس بنا پر فروخت نہ کیا جائے، اور شرح وقایہ میں ہے کہ اگر واقف شئی موقوفہ کے استبدال کی شرط لگاتا ہے تو اس کے اندر اختلاف امام ابویوسفؒ کرتے ہیں، وہ مطلق جواز کے قائل ہیں ان کے علاوہ باقی تمام فقہاء عدم جواز کے قائل ہیں، اور امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر زمین کی آمدنی کم ہوجائے اور اس کے اندر بڑھوتری بھی نہ ہو سکے تو بغیر شرط کے استبدال جائز ہے، ان کے علاوہ تمام فقہاء فرماتے ہیں کہ ہم جواز استبدال کا فتوی نہیں دے سکتے، اس لئے کہ استبدال میں جو فساد آتا ہے وہ ہمارے مشاہدہ میں ہے جس کا شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ ظالم قضاۃ نے مسلمانوں کے اکثر اوقاف کو باطل کرنے کے لئے استبدال کو حیلہ بنا کر اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنا شروع کردیا ہے۔

لیکن ان تمام صورتوں کے باوجود اصل مسئلہ جو سامنے آتا ہے وہ فتح کی عبارت سے سمجھ میں آجائے گا۔

''وقال في الفتح: الاستبدال أما عن شرطه أو لا عن شرطه، فإن كان لخروج الوقف عن الانتفاع الموقوف عليهم، فينبغي أن لا يختلف فيه وإن كان لا كذلك بل اتفق إنه إمكن أن يوخذ بثمن ما هو خير منه مع كونه منتفعا به فينبغي أن لا يجوز لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة''۔

یعنی اگر بالکلیہ انتفاع ختم ہوجائے تو اس میں استبدال کے جواز کی اجازت دی جاسکتی ہے لیکن اگر بالکلیہ انتفاع ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ انتفاع تو حاصل ہو، لیکن اس صورت سے بہتر کی طرف استبدال کیا جاتا ہے تو اس میں استبدال کی اجازت نہیں ہوگی۔

وہ اوقاف جن کے مصارف ختم ہوچکے ہیں، مثلاً کسی معین خاندان کے فقراء کے لئے خاص جاگیر وقف کی گئی تھی یا مسجد یا مدرسہ کے لئے وقف کی گئی تھی، اور وہ خاندان یا مسجد یا مدرسہ بالکل ختم ہوچکے ہیں تو اس کا حکم یہ ہے کہ ان اوقاف کی آمدنی اسی نوع کے اوقاف میں صرف کی جائے گی یعنی اگر خاص مسجد ہے تو اس کی طرف سے مستغنی ہونے کی وجہ سے دوسری مسجد میں اس کی آمدنی صرف ہوگی، اسی طرح سے مدرسہ ہے تو دوسرے مدارس میں۔

''وقال أبويوسف: إذا سمى فيه جهة تنقطع جاز وصار بعدها للفقراء وإن لم يسمهم''۔

یعنی امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر وقف کرتے وقت ایسی جہت متعین کیا جو منقطع ہونے والا ہے تو اس کا وقف کرنا درست ہے، اور اس جہت کے منقطع ہوجانے کے بعد فقراء کے لئے وقف ہوجائے گا۔

''وذلك مثل أن يقول جعلته صدقة موقوفة لله تعالى أبدا على ولد فلان وولد ولده ولم يذكر الفقراء ولا المسكين وذلك؛ لأنه إذا جعلها لله فقد وقفه أبدا لأن ما يكون لله فيصرف إلى المساكين فصار كما لو ذكره''۔

لہذا وہ اوقاف جو کسی خاص فقراء کے خاندان کے لئے یا کسی بھی متعین شخص کے لئے وقف کئے گئے تھے جن کے مصارف اب ختم ہوچکے ہیں، ان تمام کو اسی نوع میں صرف کیا جاسکتا ہے شرعاً اس کی اجازت ہے۔

الف۔ ایسے اوقاف جو مخدوش حالت میں ہیں اور وقف کے پاس کوئی سرمایہ بھی نہیں ہے جس سے اس کی تعمیر کی جاسکے کوئی بلڈر اس کے لئے تیار ہے کہ چند منزلہ

عمارت بنائے اس شرط پر کہ ایک یا دو منزل میں اس کو ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا، اوقاف کے اندران شرطوں کے ساتھ ان اوقاف کو تعمیر کے لئے دینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ وقف کے اندر تملیک نہیں ہے اور یہاں تملیک لازم آتا ہے جو کہ واقف کے مقاصد اور وقف کی شرط کے خلاف ہے، ہاں قاضی یا جہاں قاضی شرعی موجود نہ ہو ارباب حل وعقد کی رائے سے ان اراضی موقوفہ کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے جس کی آمدنی سے بعد میں ان اراضی پر عمارت بھی تعمیر ہوسکتی ہے۔

ب۔ وہ زمینیں جو مخدوش حالت میں ہیں اور اس کے پاس تعمیر کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں ہے اس کی تعمیر کے لئے اس زمین کا کوئی حصہ فروخت نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ وقف شدہ اشیاء کا بیچنا باطل ہے جس سے بیع درست نہ ہوگی، فاسد نہیں ہے، اور جب وقف تام ہوجاتا ہے تو اس میں بیع ووراثت سب ممتنع ہوجاتی ہے، لہذا اس موقوفہ زمین کے کسی بھی حصہ کو بیچنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کو کرایہ پر دیا جائے اور اس سے جو آمدنی حاصل ہو اس کو جمع کر کے عمارت کی تعمیر کردی جائے۔

مسجد یا قبرستان کی وہ موقوفہ زمینیں جو ضرورت سے زائد ہیں ان پر اگر مدرسہ قائم کیا جاتا ہے تو اس کے جواز کی شکل نکل سکتی ہے اس لئے کہ مسجد یا قبرستان کی وہ موقوفہ زمینیں جو ضرورت سے زائد ہیں اگر وہاں دینی مدرسہ قائم کیا جاتا ہے تو اس سے آبادی میں ترقی ہوگی، اور ایک کار خیر میں استعمال ہورہی ہے جو کہ واقف کے مقاصد میں بھی داخل ہے۔

جس قبرستان کی آبادی ختم ہوگئی ہے یا قبرستان آبادی میں آ گیا ہے اور حکومت اس پر پابندی عائد کردیتی ہے تو چونکہ وقف پر حکومت یا آبادی والوں کے قبضہ کا خطرہ ہے، لہذا ایسی صورت میں اس قبرستان کو اجارہ پر دے دیا جائے تا کہ واقف کے مقاصد کی رعایت بھی ہوجائے اور ایک عظیم خطرہ سے محفوظ بھی رہے۔

ایسی قدیم مساجد جو اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمۂ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں ان میں سے جن مساجد میں حکومت نے نماز ادا کرنے سے منع کردیا ہے شرعاً حکومت کو اس کی اجازت نہیں ہے، قرآن صاف طور پر اعلان کرتا ہے: ''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى فى خرابها أولئك ما كان لهم أن يدخلوها إلا خائفين لهم فى الدنيا خزى ولهم فى الآخرة عذاب عظيم'' (البقرة:۱۱۴)۔

(اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدائے تعالیٰ کی مسجدوں میں ان کا ذکر کئے جانے سے بندش کرے اور ان کے ویران ہونے میں کوشش کرے ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہوکر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا، ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسجد میں ذکر ونماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز وحرام ہیں۔

قبرستان کی باؤنڈری کے سلسلے میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری صورت نہ ہو تو اطراف میں مکان کی تعمیر کے لئے اجارہ پر دے دیا جائے، لیکن جب باؤنڈری مکمل ہوجائے تو اجارہ کو ختم کر کے دوبارہ قبرستان میں شامل کردیا جائے، دوسرے مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ''لأن شرط الواقف يجب اتباعه لقولهم شرط الواقف كنص الشارع أى فى وجوب العمل به و فى المفهوم والدلالة'' لہذا واقف کے مقاصد کی رعایت ضروری ہے۔

''لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة'' (واجب یہ ہے کہ وقف کو کسی زیادتی کے بغیر اپنے حال پر باقی رکھا جائے)

صورت مسئولہ میں قبرستان کے حکم کے بارے میں فرق ہے، اگر قبرستان بالکل ویران ہوچکا ہے اور جس جگہ مسجد کی توسیع کرنا چاہتے ہیں، قبریں بہت پرانی ہیں کہ قبر کا کوئی نام ونشان نظر نہیں آتا ہے تو اس جگہ مسجد کی توسیع کی جاسکتی ہے، اور اگر قبرستان زیر استعمال ہے اور اس جگہ قبریں نئی ہیں تو وہاں قبر کی جگہ مسجد کی توسیع جائز نہیں ہے۔

''ولو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى غيرها منجدا لم أر بذلك بأسا و ذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد۔ ولو بلى الميت و صار ترابا جاز دفن غيره فى قبره و زرعه والبناء عليه۔

وہ تمام اوقاف جو غیر مسلموں کی تولیت میں ہیں تو شریعت اس سے مانع نہیں ہے، چونکہ ''فتاوی ہندیہ'' میں شرائط وقف میں صرف عاقل وبالغ کی قید ہے:

''وشرطه لصحته بلوغه و عقله لا حريته وإسلامه''۔

لہذا غیر مسلموں کی تولیت میں رہنا درست ہے، بیت اللہ اور بیت المقدس اس کی نظیر ہے جب کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کسی طرح کی نکیر نہیں کی تھی۔ ☆☆

قبرستان کے کنارے دوکانوں کی تعمیر کا مسئلہ

مولانا اسعد اللہ قاسمی

اوقاف کا شرعی حکم کیا ہے:

اوقاف کے بارے میں شریعت کا اصل حکم تو یہی ہے کہ واقف نے جس غرض کے لئے کوئی چیز وقف کی ہے وہ موقوفہ چیز اس دائرہ تک محدود رہے اس کو کسی دوسرے مصرف میں لانا یا اس کو فروخت کرنا یا دوسری جگہ سے تبدیل کرنا جائز نہیں ہے، اس وجہ سے کہ فقہاء کرام اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ موقوفہ چیزوں میں واقفین کی غرض کی رعایت کرنا ضروری ہے، لہذا جس شخص نے مسجد کے لئے زمین وقف کی ہے تو وہ زمین مسجد ہی کی رہے گی اس کو مدرسہ میں تبدیل کرنا اور اس جگہ پر مدرسہ قائم کرنا جائز نہیں ہوگا، یہی دوسرے اوقاف کا حکم ہے، فقہاء فرماتے ہیں:

''شرط الواقف کنص الشارع'' (شامی ۳،۴۵۶)۔

واقف کا شرط لگانا شارع کے حکم کے مانند ہے۔ واقفین کے غرض کی رعایت کرنا ضروری ہے۔ ''مراعاۃ غرض الواقفین واجبۃ'' (شامی ۳،۴۶۴)۔

غیر اسلامی ملک ہندوستان میں بہت سے اوقاف، مثلاً مساجد و مدارس وقبرستان وغیرہ ایسے ویران اور معطل ہو چکے ہیں کہ اب وہاں کوئی ایسی صورت حال نہیں پائی جاتی کہ ان کو آباد کیا جائے، یا تو اس لئے کہ وہ اوقاف ایسے علاقوں میں ہیں جہاں موجودہ دور میں مسلمان آباد نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم لوگ آباد ہیں اور یا اس لئے کہ وہ غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں، تو ایسی صورت حال میں ان اوقاف کو شرعی اعتبار سے بروئے کار لانا ناممکن سا ہے، ایسی صورت میں واقفین کی رعایت کرتے ہوئے ان اوقاف کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارے سامنے مندرجہ ذیل احکامات سامنے آتے ہیں، جن کو بالترتیب بیان کیا جاتا ہے:

مسجد کے بارے میں حکم:

جس جگہ مسجد قائم کردی گئی ہو وہ شرعی اعتبار سے مسجد بن جاتی ہے، اب اس کے بعد کسی وجہ سے وہ مسجد بالکل ویران اور برباد ہو جائے اور اس میں کبھی کوئی نماز نہ پڑھی جاتی ہو، بلکہ مقفل ہو یا اور دوسرے کام اس مسجد میں کئے جانے لگے ہوں، یا ان میں دفاتر، اسکول وغیرہ قائم کردیئے گئے ہوں، یا جانور وغیرہ باندھے جانے لگے ہوں تو ایسی صورت میں معروف وراجح مسلک یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ مسجد بن جاتی ہے تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی ویران و برباد ہو جائے پھر بھی شریعت کا اصل حکم یہی ہے کہ وہ مسجد ہی رہے، امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام شافعی، امام مالک رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے، صاحب فتح القدیر نے اس کو ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

''ولو خرب ماحول المسجد واستغنی عنه ای استغنی عن الصلوۃ فیه أهل تلك المحلة أو القریة بأن کان فی قریة فخربت وحولت مزارع یبقی مسجداً علی حاله عند أبی یوسف وهو قول أبی حنیفة ومالك والشافعی'' (فتح القدیر ۵،۴۴۶)۔

(اور اگر مسجد کے ارد گرد ویران ہو جائے اور لوگ محلہ والے یا گاؤں والے اس میں نماز پڑھنے سے بے نیاز ہو جائیں، اس طرح سے کہ گاؤں پوری طرح ویران ہو جائے اور ان جگہوں کو کھیت بنا لیا جائے تو ایسی حالت میں بھی وہ مسجد ہی رہے گی امام ابویوسفؒ کے نزدیک، یہی قول امام ابوحنیفہؒ وشافعیؒ و مالکؒ کا ہے)۔

دیگر اوقاف کا شرعی حکم:

تمام اوقاف کے بارے میں اصل حکم تو یہی ہے کہ جس مقصد کے لئے واقف نے کوئی شئ وقف کی ہے وہ واقف کی غرض کے مطابق اس دائرے تک

محدود رہے اس سے تجاوز نہ کرے، اور اس کو کسی دوسری جگہ سے تبدیل کرنا یا فروخت کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ کی مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

''ولو كان الوقف مرسلاً لم يذكر فيه شرط الاستبدال لم يكن له أن يبيعها ويستبدل بها، وإن كانت الأرض سبخة لاينتفع بها؛ لأن سبيل الوقف أن يكون مؤبداً لا يباع'' (البحر الرائق ۵،۲۰۶)۔

اور اگر وقف مطلق ہے واقف نے بدلنے کی شرط ذکر نہیں کی تو اس کو فروخت کرنا اور دوسری جگہ سے تبادلہ کرنا جائز نہیں ہے، زمین اگرچہ دلدلی ہو جس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو، اس لئے کہ وقف کی راہ تو یہی ہے کہ موقوفہ زمین ابدی ہوتی ہے اس کو فروخت نہیں کیا جاتا۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ موقوفہ جگہ کو تبدیل کرنا یا فروخت کرنا صرف اس صورت میں جائز ہے جب کہ واقف نے وقف کرتے وقت یہ شرط لگادی ہو کہ اگر موقوفہ جگہ سے فائدہ نہ ہو تو اس کو تبدیل کرنے یا فروخت کرنے کی اجازت ہے، اس کے علاوہ فروخت کرنا یا دوسری جگہ سے تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔

لیکن جب ہم دوسری طرف نظر کرتے ہیں تو اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اس موقوفہ جگہ کا دوسری جگہ سے تبادلہ یا اس کو فروخت نہیں کیا جاتا تو اس جگہ پر غیر مسلموں اور شرپسندوں کا قبضہ ہوجائے گا اور اس جگہ سے غلط کام لئے جانے لگیں گے، تو ایسی صورت کے بارے میں فقہاء کرام سے کوئی صراحت منقول نہیں ہے، البتہ ویران شدہ مساجد حوض ورباط وغیرہ کے انقاض کے بارے میں فقہاء لکھتے ہیں کہ ان کو قریبی مساجد وحوض ورباط وغیرہ میں خرچ کیا جائے تو یہ درست ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

''والذی ینبغی متابعة المشائخ المذکورین فی جواز النقل بلا فرق بین مسجد أو حوض کما افتیٰ به الإمام أبو شجاع والإمام الحلوانی وکفیٰ بهما قدوة ولاسیما فی زماننا، فإن المسجد أو غیره من رباط أو حوض إذا لم ینقل یأخذه أنقاضه اللصوص والمتغلبون کما هو مشاهد وکذلك أوقافه یأکلها النظار أو غیرهم'' (رد المحتار ۳،۴۰۷، بمعناه فی البحر ۵،۲۵۲، الفتح ۵،۴۴۶)۔

اور مشائخ کی پیروی مناسب ہے نقل انقاض (بیکار ہوجانے والی اشیاء) کے بارے میں، مسجد اور حوض کے درمیان بلافرق کئے، جیسا کہ نقل انقاض کا امام ابوشجاع اور امام حلوانیؒ نے فتویٰ دیا اور ہم کو ان دونوں کی اقتداء کافی ہے، خاص طور سے ہمارے زمانے میں، کیونکہ مسجد، رباط، حوض وغیرہ کے انقاض کو اگر منتقل نہیں کیا جائے گا تو اس پر شرپسند اور چور وغیرہ قبضہ کرلیں گے، جیسا کہ مشاہدہ ہے، اور ایسے ہی ان اوقاف کا حکم ہے جس کو متولی وغیرہ ہتھیالیں۔

اس عبارت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جب اوقاف بالکل ایسی حالت میں پہونچ جائیں کہ اب ان سے کچھ نفع کی امید نہ ہو اور واقفین کی غرض بھی اس سے پوری نہ ہوتی ہو تو ایسی صورت میں ان اوقاف کو فروخت کرکے یا دوسری جگہ سے تبدیل کرکے مسلمانوں کی آبادی میں (خاص طور سے جہاں پسماندہ لوگ ہوں) اس مصرف میں خرچ کیا جائے جس کے لئے واقف نے وقف کیا تھا تو یہ جائز ہے بلکہ ایسی جگہ میں خرچ کرنا واجب اور ضروری ہے (امداد الفتاویٰ ۲/۶۷۱)۔

الف۔ مساجد کی ضرورت سے زائد زمین وآمدنی کو کہاں خرچ کیا جائے:

جب مساجد کی زمین وآمدنی اتنی کثیر مقدار میں جمع ہوجائیں کہ فی الحال اس مسجد میں اس زمین وآمدنی کی ضرورت نہیں ہے اور آئندہ بھی بالفرض بوقت ضرورت اس جیسی دوسری مسجد تعمیر کی جائے تو وہ مسجد بھی تعمیر ہوجائے اور اس کے بعد بھی فاضل رقم وزمین بچی رہنے کی امید ہے تو ایسی صورت میں فقہاء کرام نے اجازت دی ہے کہ اس جیسی دوسری مسجد کا اندازہ کرکے باقی رقم مسلمان فقراء پر تقسیم کرنا جائز اور درست ہوگا، چنانچہ قاضی خاں فرماتے ہیں:

''فما فضل من ذلك یصرف إلی عمارة المسجد ودهنه وحصیره وما فیه مصلحة المسجد علی أن القیم أن یتصرف فی ذلك علی ما یری، وإذا استغنی هذا المسجد یصرف إلی فقراء المسلمین، فیجوز ذلك لأن جنس هذه القربة مما لا ینقطع ویبقی ما بقی الإسلام'' (خانیه علی الهندیه ۳،۲۸۸ وهکذا خانیه ۳،۲۳۰)۔

جو زائد آمدنی ہو وہ مسجد کی تعمیر، تیل، فرش وغیرہ میں صرف کی جائے اور مسجد کی جو دیگر ضرورتیں ہوں، متولی حسب مصلحت اس میں خرچ کرسکتا ہے اور جب

وہ مسجد اس آمدنی سے مستغنی ہوجائے تو پھر مسلمان فقراء کو تقسیم کردی جائے، تو ایسا کرنا جائز ہے اس لئے کہ یہ بھی قربت میں داخل ہے، اور جب تک اسلام باقی رہے گا یہ قربت بھی ختم نہیں ہوگی۔

صاحب معارف السنن اس کی اور وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب مذکورہ بالا صورت میں رقم فاضل بچ جائے تو اس کے ذریعہ سے مدرسہ قائم کرنا اور اشاعتِ علم میں خرچ کرنا بھی جائز ہے، اگر چہ واقف نے اس کی صراحت نہ کی ہو۔

قال الراقم ومما تبين لي بعد فحص وبحث كثير أنه إذا اجتمعت أموال كثيرة تزيد على بناء المسجد فيجوز صرف الزائد إلى إنشاء مدرسة ونشر علم وإن لم يكن من شرط الواقف'' (معارف السنن ۲،۳۰۱)۔

(مرتب نے کہا کہ جو بات بہت زیادہ بحث وتمحیص کے بعد حاصل ہوئی ہے کہ جب اموال کثیرہ جمع ہوجائیں جو نئی مسجد کی تعمیر سے بھی زائد ہوتو پھر زائد آمدنی کو مدرسہ قائم کرنے اور علم پھیلانے میں خرچ کرنا بھی جائز ہے، اگر چہ یہ واقف کی شرط میں نہ ہو)۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگر بوقت ضرورت اعادہ مسجد سے زائد آمدنی بچ جائے تو اس زائد آمدنی کے ذریعہ مدرسہ قائم کرنا اور علم دین کی اشاعت میں صرف کرنا خواہ کسی طریقہ سے علم دین کی اشاعت کی جائے جائز اور درست معلوم ہوتا ہے۔

حکومت ومنتظمین سے خطرہ کے وقت زائد آمدنی کا مصرف:

الف، ب۔ جو اوقاف ایسے ہیں کہ ان کی آمدنی اتنی کثیر مقدار میں جمع ہوجائے کہ ان اوقاف کے بارے میں لوگوں کا یقین ہو کہ ان اوقاف کو زائد آمدنی کی ضرورت نہیں پڑے گی، نیز حکومت ومنتظمین کا بھی خطرہ ہے کہ حکومت ان اوقاف کو اپنے قبضہ میں لے کر اس سے دوسرے کام لے گی جو واقف کی منشاء کے خلاف ہوگا، اسی طرح منتظمین اس اوقاف کو قبضہ میں لے لیں گے تو اس سے بچنے کے لئے ان اوقاف کی زائد آمدنی کو دینی کاموں میں خرچ کرنا جائز اور درست ہوگا، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

''قال الراقم (إلى قوله) فيجوز صرف الزائد إلى إنشاء مدرسة ونشر علم وإن لم يكن من شرط الواقف و عبارة الخانية فيه صريحة وإن كان قيدها صاحب المهدية ''بغير وقف المسجد'' ويكاد يجب لو كان هنالك مظنة لضياع مال المسجد المجتمع بغصب المتولي أوغيره'' (معارف السنن ۲،۳۰۱)۔

(راقم نے کہا (الی قولہ) زائد آمدنی کو مدرسہ قائم کرنے اور علم کی اشاعت میں خرچ کرنا درست ہے اگر چہ یہ واقف کی شرط میں نہ ہو، اور خانیہ کی عبارت اس بارے میں صریح ہے اگر چہ صاحب مہدیہ نے ''بغیر وقف المسجد'' کی قید لگائی ہے، اور جب کہ مسجد کا مال ضائع ہونے کا اندیشہ اور گمان ہو تو پھر اس آمدنی کو مذکورہ جگہوں میں خرچ کرنا واجب ہے، کیونکہ متولی وغیرہ ایسی صورتوں میں ہتھیا لیتے ہیں)۔

اس عبارت کے اندر صاحب مہدیہ کی قید ''بغیر وقف المسجد'' سے یہ بات عیاں ہے کہ غیر مسجد کے بارے میں زائد آمدنی کو فقراء پر تقسیم کرنے کے صاحب مہدیہ بھی قائل ہیں، مسجد کے بارے میں نہیں، لیکن صاحب ''معارف السنن'' نے اس عبارت سے تمام اوقاف کا یہی حکم مراد لیا ہے، لہذا اس عبارت کو سامنے رکھ کر اس دور میں اگر مذکورہ عبارت کے مطابق عمل کی اجازت دی جائے تو اس کی وجہ سے مسلمانوں کو کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

کم منفعت والی موقوفہ جگہوں کو فروخت کرکے نفع بخش جگہ خریدنا:

جو مکانات یا دوکانیں وغیرہ دیگر اوقاف، مثلاً مساجد ومدارس وغیرہ پر وقف ہیں اور ان دوکان ومکانات سے کوئی خاطر خواہ منافع نہیں ہورہے ہیں حتی کہ جن اوقاف پر وہ دوکانیں وغیرہ وقف ہیں ان کے مصارف بھی ان کی آمدنی سے پورے نہیں ہوتے، بلکہ مزید آمدنی کی ضرورت پڑتی ہے تو ایسی حالت میں ان اوقاف پر جو دوکانیں وغیرہ وقف ہیں ان کو فروخت کرکے نفع بخش دوکانیں ومکانات وغیرہ اگر خریدے جائیں جن کی وجہ سے مساجد کی آمدنی میں اضافہ ہو اور مساجد وغیرہ کے مصارف پورے ہوجائیں تو ایسا کرنا جائز اور درست ہے، علامہ ابن نجیم امام محمدؒ سے نقل کرتے ہیں:

''وقد روى عن محمد إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستغلال والقيم يجد بثمنها أخرى أكثر ريعاً كان له أن يبيعها و يشتري بثمنها ما هو أكثر ريعاً'' (البحر الرائق ۵،۲۰۶)۔

امام محمدؒ سے مروی ہے کہ جب موقوفہ زمین پیداوار سے کمزور ہوجائے اور متولی اس کی قیمت کے بدلے کوئی دوسری زیادہ پیداوار والی جگہ پاتا ہے تو متولی کے لئے اس جگہ کو بیچ کر اس کی قیمت سے کثرت پیداوار کی جگہ خریدنا جائز اور درست ہے۔

امام محمدؒ کی یہ روایت اگرچہ مفتی بہ نہیں ہے، لیکن اس دور میں اگر امام محمدؒ کی اس روایت پر عمل کی گنجائش دی جائے تو مناسب ہے، اس لئے کہ ایسا کرنے کی وجہ سے آمدنی میں اضافہ ہوگا اور پھر اس کو کار خیر میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

مخصوص افراد پر وقف شدہ جائداد کا حکم:

جو جائدادیں یا اور دوسری چیزیں خاص خاندان یا خاص لوگوں پر وقف کی گئی ہیں تو اگر ان لوگوں میں سے جن پر وہ وقف ہیں کوئی ایک بھی زندہ ہوگا تو اس کے بقدر اس کا حصہ الگ کر کے اس کو دیا جائے گا اور جو باقی بچے گا اس کو فقراء پر تقسیم کرنا ضروری ہوگا، اور اگر وہ لوگ جن پر وہ وقف تھا ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہے، بلکہ سب فوت ہو چکے ہیں یا ان کا حال معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں تو پھر تمام آمدنی فقراء پر تقسیم کرنا ضروری ہوگا۔

''ولو جعل أرضه صدقة موقوفة على عبد الله و زيد فالغلة لهما ولو ماتا كانت الغلة كلها للفقراء وإن مات أحدهما كان النصف للفقراء'' (هنديه ٢،٤٢٧)۔

اور اگر زمین کو عبد اللہ اور زید پر وقف کیا تو اس کی آمدنی دونوں کے لئے ہوگی اور اگر دونوں فوت ہوگئے ہوں تو کل آمدنی فقراء پر تقسیم کی جائے گی اور اگر ان میں کا ایک فوت ہوا ہے تو نصف حصہ فقراء کو دیا جائے گا۔

لیکن یہاں صاحب ''معارف السنن'' کی عبارت ذہن میں رہے کہ فقراء کے بجائے اگر مدرسہ قائم کیا جائے یا اشاعت علم میں صرف کیا جائے تو بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ وہ بھی قربت میں داخل ہے۔

مسجد پر وقف شدہ زمین کا حکم:

جو مسجد ویران اور برباد ہو چکی ہے اور حال یہ ہے کہ لوگ اس مسجد میں اب نمازیں بھی نہیں پڑھتے ہیں اور اس مسجد پر کچھ زمین وقف ہے جس سے آمدنی ہو رہی ہے تو اس آمدنی کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اس آمدنی سے اسی مسجد جس پر وہ وقف ہے اس کی تعمیر میں صرف کی جائے، تا کہ واقف کی غرض اس سے پوری ہوتی رہے، اس مسجد کے علاوہ اس آمدنی کو دوسرے کار خیر میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس بارے میں فقہاء فرماتے ہیں:

''مسجد انهدم وقد اجتمع من غلته ما يحصل به البناء قال الخصاف: لا تنفق الغلة في البناء؛ لأن الواقف وقف على مرمتها ولم يأمر بأن يبني هذا المسجد والفتوى على أنه يجوز البناء بتلك الغلة'' (خانيه على الهنديه ٣،٢٩٢)۔

جو مسجد منہدم ہو جائے اور اتنا غلہ (آمدنی) موجود ہو کہ جس کے ذریعہ اس مسجد کی تعمیر ہو سکے تو خصافؒ یہ کہتے ہیں کہ وہ آمدنی تعمیر میں صرف نہیں کی جائے گی کیونکہ واقف نے مسجد کی مرمت وغیرہ کے لئے وقف کیا ہے اور اس نے اس آمدنی سے مسجد کی تعمیر کا حکم نہیں دیا، اور فتویٰ یہ ہے کہ اس آمدنی سے مسجد کی تعمیر جائز ہے۔

اس عبارت سے یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ اگر مسجد پر کوئی جگہ وقف ہے اور واقف نے اس لئے وقف کیا ہے تا کہ اس کے ذریعہ اس مسجد کی مرمت وغیرہ ہوتی رہے تو اس کے ذریعہ تعمیر کی جائے گی، لیکن اگر تعمیر کسی وجہ سے متعذر ہو، مثلاً اب وہاں مسلمان نہیں رہتے ہیں تو ایسی صورت میں مسلمانوں کی آبادی میں وہ آمدنی اسی مصرف میں صرف کی جائے گی دوسرے کاموں میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا، لیکن شرط یہ ہے کہ قاضی یا حاکم کی اجازت سے ہو، مگر اس ملک میں علماء اور مفتیان کی اجازت سے بھی منتقل کی جائے تو گنجائش معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ دار الاسلام نہیں ہے۔

''وعن الثاني ينقل إلى مسجد آخر بإذن القاضي'' (درمختار ٢،٤٠٧)۔

اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ دوسری مسجد میں منتقل کی جائے قاضی کی اجازت سے۔

الف۔ خستہ حال اوقاف جن کی آمدنی نہیں ہے ان کا حکم:

ایسے اوقاف جو اپنی خستہ حالی کی بنا پر اس درجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ ان کی ذرائع آمدنی کچھ نہیں ہے اور ان کو واقف کی غرض کے اعتبار سے بروئے کار لانے کی سعی کی جائے تو ان اوقاف کے پاس آمدنی نہ ہونے کے سبب کوئی ایسی صورت سامنے نہیں آتی کہ جس کی وجہ سے ان اوقاف کی آمدنی ہو اور اس کے ذریعہ ان اوقاف کو واقف کی غرض کے اعتبار سے بروئے کار لایا جائے، اس زمانہ میں بہت سی بلڈر پارٹیاں اس شرط پر تیار ہوتی ہیں کہ ہم ان اوقاف کی تعمیر کرائیں گے لیکن ایک یا دو منزل ہماری ہوگی، اب ہمارے سامنے دو باتیں آتی ہیں:

۱۔ یا تو بلڈر پارٹی کے ذریعہ اوقاف کی تعمیر کرا کے ایک یا دو منزل اس کو دیدی جائے۔

۲۔ اور یا ان اوقاف کو اسی حال میں رہنے دیا جائے۔

اب پہلی صورت تو اس لئے صحیح نہیں کہ اس میں موقوفہ زمین کو بلڈر پارٹی کے حوالہ کیا جارہا ہے اور اس کی وجہ سے ایک یا دو منزل اس پارٹی کی ہوجائے گی، یہ اوقاف کے اندر تصرف کرنے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان اوقاف کو ایسے ہی رہنے دیا جائے اس میں دوسری خرابی لازم آتی ہے کہ وہ واقف کی غرض کے اعتبار سے استعمال نہیں ہورہی ہیں یا پھر ان پر حکومت وغیرہ کے قبضہ کا بھی اندیشہ ہے، تو اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے علماء کرام نے ایک حل نکالا ہے کہ وہ موقوفہ خستہ حال جگہ یا تو کرایہ پر دیدی جائے یا پھر اس کو مکمل فروخت کردیا جائے اور اس کے بدلہ دوسری جگہ خرید لی جائے، پھر دونوں سے جو آمدنی ہو اس کو اسی مصرف میں لایا جائے جس کے لئے واقف نے وقف کیا ہے، اور اگر یہ دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں (نہ کرایہ پر دینا اور نہ فروخت کرنا) تو پھر موقوفہ زمین، واقف کے وارثین کو لوٹائی جائے جب کہ وہ زندہ ہوں اور اگر نہ ہوں تو پھر وہ آمدنی فقراء پر تقسیم کی جائے۔

''فلو انهدم الوقف كله فقد سئل عنه قارى الهداية بقوله سئل عن وقف انهدم ولم يكن له شئ يعمر منه ولا أمكن إجارته ولا تعميره هل تباع أنقاضه من حجر وطوب وخشب أجاب إن كان الأمر كذلك صح بيعه بأمر الحاكم ويشترى بثمنه وقف مكانه، فإذا لم يمكن رده إلى ورثة الواقف إن وجدوا وإلا صرف إلى الفقراء'' (البحر الرائق ۵،۲۲۰)۔

اگر وقف مکمل منہدم ہوجائے تو ایسے وقف کے بارے میں سوال کیا گیا کہ جس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کے ذریعہ اس وقف منہدم کی تعمیر کی جائے اور نہ ہی اس کو کرایہ پر دینا ممکن ہو تو کیا اس کے انقاض یعنی پتھر، اینٹ اور لکڑی وغیرہ کو فروخت کیا جاسکتا ہے؟ تو جواب دیا کہ اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو حاکم کی اجازت سے فروخت کرنا جائز ہوگا اور اس وقف کی قیمت کے بدلہ دوسری جگہ خریدی جائے گی، اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو پھر وہ آمدنی واقف کے ورثہ کو لوٹائی جائے گی اگر وہ موجود ہوں، ورنہ پھر فقراء ومساکین پر تقسیم کی جائے گی۔

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوئی کہ بلڈر پارٹی کو ان کی شرط کے مطابق دینا جائز نہیں ہوگا صرف کرایہ پر یا فروخت کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ خستہ حال موقوفہ جگہ میں سے قدرے فروخت کرکے باقی کی مرمت کرنا:

جب وقف ایسی حالت میں پہنچ جائے کہ اس سے واقف کا مقصد فوت ہوجائے اور مرور زمانہ کی بنا پر صرف خالی جگہ پڑی ہو اور ذرائع آمدنی ایسے نہیں ہیں کہ جن کے ذریعہ اس وقف کی تعمیر کرکے واقف کی غرض کے اعتبار سے بروئے کار لایا جاسکے، ایسی صورت میں اگر اس زمین میں سے قدرے فروخت کیا جائے تو اس کی وجہ سے تعمیر کا کام چل سکتا ہے، لہٰذا اگر ایسا کیا جائے اور اس میں سے قدرے فروخت کردی جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، فقہاء کرام فرماتے ہیں:

''وإن تعذر إعادة عينه إلى موضعه بيع وصرف ثمنه إلى المرمة'' (هداية مع الفتح ۵،۲۲۶)۔

(اور اگر عین جگہ پر دوبارہ تعمیر متعذر ہوجائے تو اس کو فروخت کردیا جائے اور اس کی آمدنی مرمت میں صرف کی جائے)۔

''وإن تعذرت إعادته، بأن خرج عن الصلاحية لذلك ضعفه ونحوه باعه و صرف ثمنه فى ذلك'' (فتح القدير ۵،۲۴۳)۔

(اور اگر دوبارہ تعمیر متعذر ہوجائے اس طور پر کہ اس کے کمزور ہونے یا اور کسی وجہ سے اس کے اندر تعمیر کی صلاحیت نہ ہو تو اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت اسی میں صرف کی جائے)۔

یہ عبارت اگرچہ اس بارے میں صریح نہیں ہے، لیکن اس عبارت سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ اس کے قدرے حصہ کو فروخت کر کے اس کی مرمت میں صرف کیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

مسجد کی زائد جگہ میں مدرسہ قائم کرنے کا حکم:

مسجد پر جو زمین وقف ہے اس کے بارے میں اصل حکم تو یہی ہے کہ وہ زمین ہمیشہ مسجد ہی کی رہے، نہ ہی اس کو فروخت کرنا جائز ہے اور نہ ہی اس جگہ سے مسجد کے آداب کے خلاف کوئی کام لینا جائز، اور نہ ہی اس جگہ پر مدرسہ وغیرہ قائم کرنے کی اجازت ہے، البتہ ارباب فتاویٰ نے ایسی زائد زمین کے بارے میں یہ حل نکالا ہے کہ اگر وہاں مدرسہ وغیرہ قائم کرنے کا ارادہ ہے تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں اور دونوں جائز ہیں۔

پہلی صورت تو یہ ہے کہ مسجد ہی کی طرف سے اس جگہ پر تعمیر کردی جائے اور اس کا کرایہ متعین کردیا جائے اور مدرسہ کو متعینہ کرایہ دے کر ماہوار مدرسہ سے کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تعمیر مسجد کی طرف سے نہ کی جائے بلکہ تعمیر کا مدرسہ خود کفیل ہو، لیکن مدرسہ اس جگہ کا متعینہ کرایہ ادا کرتا ہے (مستفاد فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۲۸۴،۱۵/ ۱۹۷)۔

علامہ محمد یوسف بنوریؒ نے ''معارف السنن'' کے اندر مسجد کی زائد آمدنی کو مدرسہ اور علم کی اشاعت میں صرف کرنے کی اجازت دی ہے، لہذا اگر زمین کو بھی آمدنی کے حکم میں رکھا جائے تو پھر اس جگہ پر بغیر کرایہ کے مدرسہ قائم کرنا جائز اور درست ہوگا، عبارت درج ذیل ہے:

''قال الراقم: ومما تبين لي بعد فحص و بحث كثير أنه إذا اجتمعت أموال كثيرة تزيد على إعادة بناء المسجد أن احتيج إليه، فيجوز صرف الزائد إلى إنشاء مدرسة ونشر علم، وإن لم يكن من شرط الواقف'' (معارف السنن ۳،۲۰۱)۔

راقم نے کہا اور بہت غور وفکر کے بعد مجھے یہ بات واضح ہوئی کہ جب مسجد کے پاس اعادہ مسجد سے بھی زائد مال جمع ہوجائے جس وقت کہ مسجد کو اعادہ کی ضرورت پڑے تو اس زائد اموال کو مدرسہ قائم کرنے اور علم پھیلانے میں صرف کرنا جائز اور درست ہے اگرچہ وقف کے وقت واقف نے شرط نہ لگائی ہو۔

جو مسجد کا حکم ہے وہی قبرستان کی زائد زمین کا بھی حکم ہے ان دونوں کے درمیان میں کوئی فرق نہیں ہے، لہذا قبرستان کی زائد زمین پر بھی مدرسہ قائم کرنے کی اجازت ہوگی۔

ویران قبرستان پر مساجد ومدارس قائم کرنے کا حکم:

جب قبرستان ویران ہوجائے کہ وہاں کے مسلمان دوسری جگہ چلے گئے ہوں یا وہ قبرستان آبادی کے اندر آجائے اور آبادی کے اندر آجانے کی بنا پر حکومت کی طرف سے تدفین پر پابندی عائد کردی جائے، تو ایسی صورت میں جو پرانی قبریں ہیں اگر وہ مٹی ہوگئی ہوں اور قبروں کے نشانات مٹ چکے ہوں تو ان قبرستان میں مساجد یا مدارس قائم کرنے کی اجازت ہے (امداد الفتاوی ۲/ ۵۷۹)

''قال ابن القاسم: لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجداً لم أر بذلك بأساً وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لايجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد'' (عمدة القاری ۴،۱۷۹)۔

ابن القاسم نے کہا کہ اگر قبرستان جو مسلمانوں کا ہے مردوں سے پاک وصاف ہوجائے پھر وہاں مسجد تعمیر کی جائے تو میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، اس لئے کہ مسلمانوں کے قبرستان تو مردوں کی تدفین کے لئے ہیں کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس قبرستان کو اپنی ملکیت میں لے لے، لہذا جب تدفین سے مستغنی ہوجائے تو اس کو مسجد میں صرف کرنا (لگانا) جائز ہے، اس لئے کہ مسجد بھی مسلمانوں کی موقوفہ ہوتی ہے، کسی کو اس کا مالک بنانا جائز نہیں ہے، لہذا اس

معاملہ میں دونوں کا حکم یکساں ہے۔

حکومت کو قدیم مساجد میں نماز کی ادائیگی سے روکنے کا حکم:

شریعت اسلامی میں تاریخ کو باقی رکھنے کے لئے مساجد کو مقفل کرنے اور نمازوں سے روکنے کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ ہی ان کو روکنا جائز ہے بلکہ مساجد تمام کی تمام خواہ قدیم ہوں یا جدید، اللہ تعالی کی ملکیت ہوتی ہیں، مساجد میں کسی کا کوئی حق نہیں رہتا اور نہ ہی کوئی نماز سے روک سکتا ہے، چنانچہ فقہاء کرام فرماتے ہیں:

''والمسجد خالص لله تعالى سبحانه ليس لأحد فيه حق قال الله تعالى ''وأن المساجد لله'' مع العلم بأن كل شئ له فكان فائدة هذه الإضافة اختصاصة به وهو بانقطاع حق كل من سواه عنه'' (فتح القدير ۵،۴۴۴)۔

اور مسجد خالص اللہ تعالی کے لئے ہے اس میں کسی کا کوئی حق نہیں ہے، اللہ تعالی نے فرمایا ''اور بیشک ساری مساجد اللہ کی ہیں'' اس بات کو جانتے ہوئے کہ تمام چیزیں اسی کی ہیں، پس اس اضافت کا فائدہ مساجد کی خصوصیت ہے۔ اور یہ اللہ تعالی کے علاوہ دوسرے لوگوں سے انقطاع کے حق کو ثابت کرتا ہے۔ نیز جو لوگ نماز سے روک کر مساجد میں آثار قدیمہ کو باقی رکھنے کے لئے پابندی لگاتے ہیں وہ قرآن کریم کی اس آیت کے تحت داخل ہوں گے ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں عذاب عظیم ہوگا۔

''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعىٰ فى خرابها أولئك ما كان لهم أن يدخلوها إلا خائفين لهم فى الدنيا خزى ولهم فى الآخرة عذاب عظيم'' (سورہ بقرہ: ۱۱۴)۔

لہذا ارباب حل وعقد کو چاہئے کہ وہ حکومت سے مطالبات کریں کہ مسلمانوں کے جتنے شعائر اسلام ہیں ان پر سے پابندی ہٹائی جائے اور مسلمانوں کو کھلے طور سے چھوٹ دی جائے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق مساجد میں عبادت کریں۔

قبرستان کے کنارے دوکانوں کی تعمیر کرانے کا کیا حکم ہے؟

اگر موقوفہ قبرستان کے کنارے خالی جگہ میں جہاں پر قبریں نہیں ہیں، وہاں دوکانوں کی تعمیر کی جائے جس کی آمدنی سے قبرستان کے مصارف پورے ہوتے رہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ان دوکانوں کی وجہ سے قبرستان کی تدفین میں تنگی اور دشواری نہ ہو تو یہ جائز ہے، اب اگر قبرستان کے پاس اتنی رقم ہے کہ جس کی وجہ سے تعمیر ہوسکے تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ لوگوں سے پیشگی رقم لے کر وہاں دوکانوں کی تعمیر کرائی جائے اور ان دوکانوں کا مناسب کرایہ متعین کردیا جائے جس سے قبرستان کے مصارف پورے ہوتے رہیں اور جو رقم پیشگی کے طور پر لی جائے اس کو آئندہ کرایہ میں محسوب کیا جاتا رہے (مستفاد از فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۳۰۴)۔

''الاستدانة على الوقف لا يجوز إلا إذا احتيج إليها لمصلحة الوقف لتعمير وشراء بذر'' (الاشباہ والنظائر ۲،۲۲۲)۔

(وقف کے لئے قرض لینا جائز نہیں ہے، البتہ جب وقف کی مصلحت مقتضی ہو تو ضرورۃً قرض لینا جائز ہے جیسے کہ تعمیر یا (درختوں کے لئے) بیج خریدنا)۔

اور اگر قبرستان کو آمدنی کی قطعاً ضرورت نہ ہو تو پھر ارباب حل وعقد اس آمدنی کو دیگر کار خیر میں صرف کریں تو یہ جائز ہے (فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۳۰۶)۔

''إن الناظر صرف فائض الوقف إلى جهات بر بحسب ما يراه'' (الاشباہ والنظائر ۲،۲۷۷)۔

(ناظر کے لئے وقف کی زائد آمدنی کو دیگر کار خیر میں صرف کرنا جائز ہے جہاں مناسب سمجھے)۔

اور اگر موقوفہ قبرستان کو کسی وقت اس جگہ کی ضرورت پڑے جہاں دوکانیں تعمیر ہوچکی ہیں تو پھر ان دوکانوں کو توڑنا ضروری ہوگا اور ان جگہوں کی ضرورت پڑنے پر قبریں بنائی جائیں گی، چنانچہ فقہاء فرماتے ہیں:

''أرض لأهل قرية جعلوها مقبرة وأقبروا فيها ثم إن واحداً من أهل القرية بنىٰ فيها بناءً (الى قوله) إن كان فى المقبرة سعة بحيث لا يحتاج إلى ذلك المكان، فلا بأس به وبعد ما بنى لو احتاجوا إلى ذلك المكان رفع

البناء حتی یقبر فیه'' (هندیه ۲،۴۶۸)۔

(اہل قریہ نے کسی زمین کو قبرستان بنادیا اور اس میں قبریں بھی بن گئیں، پھر اسی گاؤں کے کسی شخص نے تعمیر کرلی (الی قولہ) تو اگر قبرستان میں گنجائش ہے اس طور سے کہ اس قبرستان کو اس جگہ کی ضرورت نہیں تو جائز ہے، اور اگر تعمیر کر لینے کے بعد کسی وقت اس جگہ کی ضرورت پڑ جائے تو پھر وہ عمارت اکھیڑ دی جائیگی اور اس جگہ بھی قبریں بنائی جائیں گی)۔

قبرستان کی مسجد کو وسیع کرنے کا حکم:

جو مسجد کسی وقت قبرستان میں تعمیر کی گئی ہوتا کہ جو لوگ زیارت کے لئے قبرستان آئیں وہ نماز پڑھ لیا کریں، لیکن اب آبادی کے بڑھ جانے اور لوگوں میں زیادتی کے سبب وہ مسجد تنگ ہوجائے اور ایک عام مسجد کی طرح ہوجائے کہ جو لوگ زیارت کرنے والے نہیں ہیں وہ بھی اس میں آکر نماز پڑھنے لگیں تو ان وجوہات کی بنا پر اس مسجد کو وسیع کیا جائے، تو اس شرط کے ساتھ مسجد کی توسیع کی گنجائش ہے کہ قبرستان کے اندر اس مسجد کے آس پاس قبریں نہ ہوں اور اگر کسی زمانہ میں رہی ہوں تو وہ مرور زمانہ کی وجہ سے مٹی ہوچکی ہوں اور اب ان قبروں کے نشانات بھی مٹ چکے ہوں تو اس صورت میں ارباب فتاویٰ کے کلام سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے (مستفاد از فتاویٰ محمودیہ ۱۵/ ۳۰۰)۔

''وأما المقبرة الداثرة إذا بنی فیها مسجد لیصلی فیه فلم أر فیه بأساً، لأن المقابر وقف، وکذا المسجد فمعناهما واحد'' (عمدة القاری للعینی ۴،۱۷۴)۔

(اور پرانا قبرستان جب اس میں مسجد تعمیر کی جائے تا کہ لوگ اس میں نماز پڑھیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ قبرستان بھی وقف ہوتا ہے اور مسجد بھی، پس دونوں کا ایک ہی مطلب ہے)۔

مساجد کا ہندو اوقاف کی تولیت میں رہنے کا حکم:

جو زمین وجائیداد غیر مسلموں نے مساجد کے لئے وقف کی ہیں وہ زمین مساجد کی ہوں گی اور ان کا وقف کرنا صحیح ہے اور درست ہے، لیکن ان مساجد کا غیر مسلم اوقاف کی تولیت میں رہنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اوقاف کی ولایت کا اختیار واقف کو رہتا ہے یا اگر واقف کسی کو وصی بنادیتا ہے تو پھر ولایت کا حق وصی کو ہوتا ہے اور اگر وصی نہ ہو تو پھر ولایت قاضی کے لئے ہوتی ہے کہ وہ جس کو چاہے متولی مقرر کرے (امداد الفتاوی ۲/ ۶۱۴)۔

''ولایة نصب القیم إلی الواقف ثم لوصیه ثم للقاضی'' (التنویر علی الدر ۳،۴۴۸)۔

متولی مقرر کرنے کی ولایت واقف کو ہوتی ہے پھر وصی کو پھر قاضی کو کہ جس کو چاہے متولی مقرر کرے۔

نیز قاضی کے شرائط میں یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، لہذا غیر مسلم اوقاف مساجد کی تولیت کے مستحق نہیں ہیں، اس بنا پر مسلمانوں کو چاہئے کہ حکومت سے مطالبہ کریں اور ان سے مدد لیں کہ ہماری مساجد غیر مسلم اوقاف کی تولیت سے نکال کر مسلمانوں کو دی جائیں اور مسلمان پھر باہمی رضامندی سے جس کو چاہیں متولی مقرر کردیں یا مسلم اوقاف کے تحت داخل کردیں۔

''حاصله أن أهل المسجد لو اتفقوا علی نصب رجل متولیاً لمصالح المسجد فعند المتقدمین یصح ولکن الأفضل کونه بإذن القاضی ثم اتفق المتأخرون أن الأفضل أن لا یعلموا القاضی فی زماننا لما عرف من طمع القضاة فی أموال الأوقاف'' (شامی ۴،۳۳۲)۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر اہل مسجد کسی کے متولی بنانے پر مصالح مسجد کی خاطر اتفاق کرلیں تو متقدمین کے نزدیک صحیح ہے لیکن افضل یہ ہے کہ قاضی کی اجازت سے ہونا چاہئے، پھر متاخرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اب افضل یہ ہے کہ قاضی کو نہ بتلائیں اس لئے کہ ہمارے دور میں قاضیوں کے اندر لالچ ہوگیا ہے، جیسا کہ معروف ہے اور خاص طور سے اوقاف کے اموال میں زیادہ لالچ ہے۔

(الحاصل) اس عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مساجد و مقابر وغیرہ اوقاف کا غیر مسلم کی تولیت میں رہنا صحیح نہیں ہے۔ ☆☆☆

چوتھا باب مختصر تحریریں

وقف کی حقیقت اور شرعی حکم

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

وقف کے معنی ہیں: "حبس العين وصرف المنفعة في جهة الخير المؤبدة"۔ اگر جہت خیر موبدہ نہ ہو بلکہ منقطعہ ہو تو وقف ہی جائز وصحیح نہ ہوگی۔

اس تعریف وقف سے بطور اشارۃ النص یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وقف کار خیر ہی کے لئے اور ثواب ہی کے کام کے لئے ہونا ضروری ہے، یہیں سے حسب حکم شرع ''لا تبطلوا أعمالكم'' بھی معلوم ہو گیا کہ وقف صحیح ومنعقد ہو جائے تو خود واقف کو اس کے ختم کرنے وغیرہ کا حق نہیں رہے گا، اور فقہاء کرام نے اسی حکم کو بایں الفاظ نقل فرمایا ہے:

إن الوقف إذا تم لزم فلا يُملّك ولا يُملّك ولا يُوهب ولا يُرهن الخ''۔ اور اسی کی جانب اشارہ اس فقہی قاعدہ میں ہے:

''إن شرط الواقف كالنص في المفهوم والدلالة ووجوب العمل به''۔

نیز اسی قبیل سے یہ قاعدہ بھی ہے: ''إن مراعاة غرض الواقف واجبة''۔

یعنی کوئی موقوف چیز معطل ہو جائے تو واقف کو جو ثواب اس موقوفہ سے ملتا تھا وہ فوت نہ ہو بلکہ وہ ثواب حاصل ہونے لگے یا بڑھ جائے اور وہ موقوف زندہ ہو جائے تو ایسا کر لینا ان فقہی اصول کے اشارہ سے جائز ہو جائے گا، مثلاً کسی نے تدفین موتیٰ کے لئے کوئی اراضی وقف کی اور کسی قانونی معذوری سے یا کسی اور وجہ سے ان اراضی میں تدفین بند ہو جائے تو بجائے تدفین موتیٰ کے اس قبرستان میں مسجد یا علم دین کی تعلیم کے لئے کوئی دینی درسگاہ قائم کر دی جائے تو اس عمل سے بلاشبہ واقف کو جو ثواب ملتا تھا وہ ثواب بلکہ اس سے زائد ثواب ملنے لگے گا، اس لئے اس قبرستان میں مسجد کا بنا لینا بلاشبہ جائز ہوگا۔

اس کی تائیدی مثالیں مسجد اقصیٰ کے اطراف میں زمین کے اندر انبیاء علیہم السلام کے مدفون ہونے سے ملتی ہیں، نیز خود حرم مکہ میں بھی اس کے جواز پر تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اور یہی حکم وحال کسی دینی درسگاہ کی تعمیر کا بھی ہوگا، جس میں علوم دینیہ کی تعلیم دی جائے تو یہ بھی جائز ہوگا، اور اس کی دلیل آیت کریمہ ''يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم نارا'' (سورہ تحریم: ۶) سے بھی ملتی ہے، کیونکہ یہی چیز اسلام اور بعثت انبیاء کی اولین غایت ہے، اور ان کا یہی فریضۂ اولیہ ہے، کیونکہ یہی چیز اپنے کو اور لوگوں کو جہنم سے اور جہنم کے عذاب سے بچانے کا طریقہ لازمی ہے، کیونکہ یہ مقصد علم دین کی تحصیل کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور علم دین کی تحصیل بغیر علماء کے وجود کے نہیں ہو سکتی، اور علماء کا وجود بغیر علم دین پڑھے پڑھائے نہیں ہو سکتا، لہذا بطریق اقتضاء النص دینی مدرسہ کا قیام ضروری نکل آیا اور اس کی اجازت بھی نکل آئی، اس کام میں جو ثواب ہوگا وہ تدفین موتیٰ کے ثواب سے بڑھا ہوا ہوگا، لہذا جو ثواب واقف کو تدفین میت سے ملتا جب وہ ثواب اس سے بھی زیادہ واقف کو ملے گا تو یہ عمل منشاء واقف کے خلاف بھی نہ ہوگا، اور بلاشبہ جائز رہے گا۔

پس اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دینی تعلیم کی درسگاہ میں وقتی حساب کتاب بقدر ضرورت کر لینا حتمی طور پر جائز رہے گا، البتہ اس قبرستان کو کسی ایسے کام ومصرف میں استعمال کرنا کہ اس سے واقف کا ثواب مطلوب اس کو نہ ملے یا کم ملے تو درست وجائز نہ رہے گا۔ جیسے وہاں تجارتی کاموں کی منڈی بنا لینا، یا وہاں لوگوں کا ذاتی مکان بنا لینا، یا دنیوی تعلیم کا اسکول یا کالج وغیرہ بنانا جائز نہ رہے گا، کیونکہ اس عمل سے واقف کا ثواب مطلوب حاصل نہ ہوگا، اور "شرط الواقف كنص الشارع في المفهوم والدلالة ووجوب العمل" کے خلاف ہوگا، لہذا اس قسم کے امور کی اجازت شرعاً کسی طرح نہ ہوگی۔

☆☆☆

متبادل اوقاف کا قیام اور مساجد کی فاضل آمدنی کا مصرف

مولانا عتیق احمد بستوی [1]

الف۔ متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ ایسے ویران اوقاف کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے، لیکن استبدال وقف کی بنیادی شرط مسلمان قاضی عدل کی اجازت ہے جو ہندوستان کے اکثر علاقوں میں مفقود ہے، وقف بورڈ کو قاضی عدل کے قائم مقام نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ اس کی تشکیل خالص سیاسی بنیادوں پر ہوتی ہے، متدین اور امین افراد وقف بورڈ میں کم ہی پہنچ پاتے ہیں۔

اس کی گنجائش نہیں ہے، اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد وقف ہی میں صرف کیا جانا ضروری ہے، واقف کے مقاصد کو نظر انداز کر کے دوسرے تعلیمی یا رفاہی کاموں میں صرف کرنا درست نہیں۔

الف۔ مسجد پر موقوفہ اراضی میں دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ مسجد کو آباد رکھنے کے لئے ایسے اداروں کے قیام کی شدید تر ضرورت ہو۔

ب۔ مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد میں استعمال نہیں کی جاسکتی۔

الف، ب۔ اوقاف کی فاضل آمدنی کو محفوظ رکھا جائے اور اسے اوقاف کی آئندہ پیش آنے والی ضرورت ہی میں صرف کیا جائے، ہاں اگر فاضل آمدنی کے ضائع ہونے یا غلط ہاتھوں میں پہنچ جانے کا ظن غالب ہو تو اسی نوع کے دوسرے اوقاف کی ضروریات میں یا اسی نوع کا دوسرا وقف قائم کرنے میں فاضل آمدنی کو صرف کیا جاسکتا ہے۔

اوقاف کو کم منفعت بخش ہونے کی وجہ سے فروخت نہیں کیا جاسکتا۔

جن اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے انہیں اسی نوع کے دوسرے اوقاف پر صرف کیا جائے، اس نوع کے اوقاف نہ ہوں تو فقراء ومساکین پر صرف کیا جائے۔

الف۔ سوال میں مذکور صورت معاملہ درست ہے، لیکن ایسا انتہائی مجبوری میں کیا جاسکتا ہے پہلے کوشش کی جائے کہ بلڈر کو ایک دو منزلیں بہ طور ملک نہیں، بلکہ بطور اجارہ دی جائیں۔

ب: یہ صورت معاملہ بھی درست ہے۔

مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین میں مدرسہ کی تعمیر نہیں کی جاسکتی، ہاں اسے کرایہ پر دیا جاسکتا ہے، ہاں اگر مسجد کی آبادی یا قبرستان کی حفاظت کے لئے وہاں مدرسہ کی تعمیر ضروری ہو تو گنجائش ہے۔

انہیں فروخت کر کے دوسرا قبرستان قائم کرلیا جائے۔

آثار قدیمہ کے زیر انتظام مساجد میں حکومت کی طرف سے نماز کی ادائیگی پر پابندی عائد کرنا ایک ظالمانہ عمل ہے، شریعت اس پابندی کی اجازت نہیں دیتی۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے ایسا کیا جاسکتا ہے۔

قبرستان کے حصہ میں مسجد کی توسیع کی جاسکتی ہے۔

درست ہے۔

☆☆☆

---

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وسکریٹری برائے علمی امور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

محکمہ آثار قدیمہ کے تحت داخل شدہ مسجد کا حکم شرعی

مولانا محمد رضوان القاسمی[۱]

منتقلی وقف کا حکم:

الف، ب۔ آبادی کے منتقل ہونے کی وجہ سے مقصد وقف فوت ہو چکا ہے، ایسی صورت میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے، وہاں متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں علامہ ابن عابدین شامی کی یہ تحریر مشعلِ راہ کا درجہ رکھتی ہے:

"لكن صار بحيث لاينتفع به بالكلية، بأن لايحصل منه شئ أصلا أو لايفي بمؤنته فهوأيضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه" (رد المحتار ۶،۵۸۴)۔

استبدال وقف اسی صورت میں جائز ہے، جبکہ مکمل طور پر اس وقف سے انتفاع کی صورت ختم ہو چکی ہو، اس طور کہ اس وقف سے کوئی شئ حاصل ہی نہ ہو، یا اس کے اخراجات بھی پورے نہ ہوتے ہوں تو صحیح تر قول کے مطابق جب قاضی کی اجازت ہو اور اس میں مصلحت بھی ہو تو استبدال جائز ہے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ جب مقصد وقف فوت ہو گیا تو استبدال وقف کی گنجائش ہے، اسی طرح اگر واقف نے استبدال کی شرط لگا دی ہو تو بھی جائز ہے، جیسا کہ علامہ حصکفی کی عبارت سے ظاہر ہے:

"أو شرط بيعه ويشتري بثمنه أرضا أخرى" (الدر على الرد ۶،۵۸۳)۔

یا واقف نے بیع کی شرط لگا دی ہو تو اس کے ثمن سے دوسری زمین خریدنا بھی جائز ہے (در علی الرد ۶/ ۵۸۳)۔

البتہ تیسری صورت یعنی جب کہ فی الجملہ وقف سے نفع ہو رہا ہو تو ایسی حالت میں استبدال کو فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے، پس خلاصہ یہ ہے کہ جب واقف نے استبدال کی اجازت دی ہو یا وقف کا مقصد ہی فوت ہو چکا ہو تو دونوں صورتوں میں متبادل وقف قائم کرنے کی اجازت ہوگی، ہاں صرف زیادتی منفعت کے لئے استبدال وقف کی اجازت نہ ہوگی۔

منشاء واقف کی عدم رعایت:

عام حالات میں واقف کے منشا کی خلاف ورزی درست نہیں، لیکن بعض مواقع ایسے ضرور ہیں جہاں فقہاء نے منشاء واقف سے اختلاف کو بھی روا رکھا ہے، اور یہ اس وقت ہے جب کہ وقف کا مفاد اسی میں ہو، چنانچہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

"أو كان في الزيادة نفع للفقراء فللقاضي المخالفة دون الناظر" (شامی: ۶،۵۸۷)۔

واقف کی شرائط کے خلاف کرنے میں فقراء کے لئے نفع ہو تو قاضی کو اس کی اجازت ہے نہ کہ نگران (متولی) کو۔

سوال سے ظاہر ہے کہ اگر واقف کے منشا کے خلاف عمل نہ کیا جائے تو فقراء و مساکین کا اس سے نفع اٹھانا تو درکنار، بلکہ اوقاف کے ضائع ہونے کا یقین ہے، اس لئے مذکورہ صورت میں شرطِ واقف کی خلاف ورزی کی بھی گنجائش ہے۔

الف۔ مسجد کی زائد آمدنی کا حکم:

اس سلسلہ میں علماء احناف تو یہی کہتے ہیں کہ عین وقف کو باقی رکھتے ہوئے اس کی زائد از ضرورت آمدنی دوسرے دینی و ملی اداروں میں لگائی جا سکتی ہے،

[۱] سابق ناظم دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد۔

جیسا کہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابن نجیم مصری نے مسلمان قیدی کی رہائی، غازیوں کی اعانت اور دیگر فقراء و مساکین کی حاجت روائی کا ذکر کیا ہے (البحر الرائق ۵/۲۰۹)۔

گو مذکورہ مثال میں دینی درسگاہ کی صراحت نہیں، لیکن اس سے اتنا ضرور واضح ہو رہا ہے کہ آمدنی کو دوسری جگہوں میں جہاں دینی و ملی کام ہو رہا ہو، صرف کیا جاسکتا ہے، لہذا مدارس وغیرہ پر بھی صرف کی اجازت ہونی چاہئے، کیونکہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ بھی مسلمانوں کی اعانت ہی ہو رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ حصکفیؒ نے مسجد کی زائد آمدنی کو امامِ مسجد، مدرس اور مؤذن کی تنخواہ پر صرف کرنے کی اجازت دی ہے اور بہت خوب فرمایا ہے:

''وفضل من الغلة شئ يبدأ بما هو أقرب للعمارة، وهو عمارته المعنوية التي هي قيام شعائره' (درعلی الرد ۶،۵۶۰)۔

بچی ہوئی آمدنی کو سب سے پہلے ان چیزوں پر صرف کیا جائے گا جو اس مقصد سے زیادہ قریب ہو یعنی جس سے دین کے شعائر کا قیام عمل میں آتا ہو۔

علامہ حصکفی کی عبارت: "کامام مسجد ومدرس یعطون بقدر کفایتھم" (درعلی الرد ۶،۵۵۹) کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامی علیہ الرحمہ نے امام و مدرس کو بھی شعائر دینیہ میں شمار کیا ہے، لہذا مقصد حقیقی و معنوی دونوں پر مسجد کی آمدنی خرچ کرنے کی گنجائش ہے، تو جب مدرس کی تنخواہ کی اجازت ہے تو تعمیر مدرسہ و مکاتب کی بدرجۂ اولی اجازت ہوگی، کیونکہ یہ صورت وقف کو باقی رکھنے کی ہے۔

ب۔ اگر آمدنی مسجد کے لئے خاص کردی گئی ہو: ...... جیسا کہ پہلے سوال کے تحت مذکور ہوا کہ بعض صورتوں میں وقف کے مفاد کے تحفظ کے لئے واقف کی خلاف ورزی بھی درست ہے، اور یہاں جو آمدنی جمع ہے، اس سے کچھ حاصل نہیں بلکہ نقصان ہی کا اندیشہ ہمہ وقت دامن گیر رہتا ہے، لہذا اس صورت میں بھی زائد آمدنی کو دینی و ملی مصالح پر صرف کیا جائے تو جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہوگا۔

جب کثیر مقدار آمدنی کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو:

الف، ب۔ ماقبل کے دونوں سوال بھی تقریباً یکساں ہیں اور ہر ایک کا تعلق آمدنی ہی کے تصرف سے ہے، اس سلسلہ میں قاضی خان کی عبارت چشم کشا ہے:

''إذا استغنى هذا المسجد يصرف إلى فقراء المسلمين فيجوز ذلك؛ لأن جنس هذه القربة مما لا ينقطع''
(خانیہ علی الهنديه ۳،۲۸۸)۔

جب اس مسجد کو آمدنی کی ضرورت نہ رہے تو اسے فقراء مسلمین پر خرچ کیا جائے گا، اور اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسی قربت ہے جو منقطع نہیں ہوتی۔

تقریباً فقہاء احناف نے مذکورہ صورت میں آمدنی کے تصرف کی اجازت دی ہے، چونکہ یہاں مصلحت بھی ایسی جگہوں پر تصرف کی متقاضی ہے، اور مصلحت کی تمام فقہاء نے اوقاف جیسے مسائل میں بہت حد تک رعایت کی ہے، جیسا کہ ابن نجیم وغیرہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے (البحر الرائق ۵/۲۲۷)۔

نفع کی زیادتی کے لئے استبدال وقف کا حکم:

اوپر استبدالِ وقف کی تین صورتیں ذکر کی گئی ہیں، جن میں سے تیسری صورت یہی ہے کہ استبدال کی وجہ سے وقف کی آمدنی میں اضافہ ہوسکتا ہو، اس سلسلہ میں اکثر علماء احناف یہی فرماتے ہیں کہ محض نفع کی زیادتی کی غرض سے متبادل وقف قائم کرنا جائز نہیں، جیسا کہ ابن عابدین رقمطراز ہیں:

''ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعا ونفعا وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار'' (شامی ۶،۵۸۷)۔
(لیکن اس وقف میں فی الجملہ نفع ہو اور اس کا بدل نفع و آمدنی کے اعتبار سے بہتر ہو، ایسی صورت میں صحیح تر اور مختار قول کے مطابق استبدالِ وقف جائز نہیں ہوگا)۔

علامہ ابن نجیمؒ نے امام محمدؒ سے جواز نقل کیا ہے (البحر الرائق ۵/۲۲۳)، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کی بابت علماء کی آراء میں خاصا اضطراب پایا جاتا ہے، تاکہ بعض فقہاء کے تو دونوں طرح کے اقوال ہیں، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ جواز و عدم جواز کا تعلق اپنے اپنے زمانہ اور احوال کے اعتبار سے تھا تو بے جا نہ ہوگا، جیسا کہ علامہ ابن نجیم علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''أن أبا يوسف يجوز الاستبدال في الوقف من غير شرط إذا ضعفت الأرض من الريع ونحن لا نفتي به وقد شاهدنا في الاستبدال من الفساد ما لا يعد ولا يحصى الخ'' (البحر الرائق ۵،۲۲۳)۔

امام ابو یوسفؒ کا قول استبدالِ وقف کے متعلق بغیر کسی شرط کے جواز کا ہے، اگر موقوفہ زمین کی آمدنی کم ہوجائے، لیکن ہم استبدال کا فتوی نہیں دیتے، کیونکہ ہم نے استبدالِ وقف کی شکل میں فساد وبگاڑ کے بے شمار واقعات دیکھے ہیں۔

استبدال کے ناجائز ہونے کی علت پر ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں استبدال کو اوقاف کی بربادی وضیاع کا باعث بنالیا جاتا تھا، جب کہ یہاں مقصد اس کے برعکس ہے اور منشاء وقف کی افادیت کو بڑھانا ہے، نہ کہ ضائع کرنا، لہذا اس صورت میں بھی استبدال کو جائز ہونا چاہئے، خود علامہ شامی نے امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں: "وعليه الفتوى" (ردالمحتار ۶،۵۸۸).

اس مسئلہ میں تقریباً تمام ائمہ مذاہب کا اتفاق ہے کہ ایسے اوقاف جن کے مصارف باقی نہ رہیں، دوسرے دینی ادارے یا کار خیر میں ان کو خرچ کیا جاسکتا ہے (بزازیہ علی الہندیہ ۲۵۶/۶)۔

الف، ب- فقہاء نے بعض حصہ کی درستگی کے لئے بعض کی فروختگی کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ فتاوی بزازیہ میں ہے:

''وإن باع بعضه لإ صلاح باقيه لخراب كله جاز'' (بزازية على الهنديه ۶،۲۷۱)۔

اگر وقف کا کچھ حصہ باقی کی مرمت کے لئے فروخت کرے اور پوری جائداد موقوفہ ویران ہوگئی ہو تو ایسا کرنا جائز ہے۔

لہذا اس صراحت کو سامنے رکھتے ہوئے مذکورہ صورت کو جائز ہونا چاہئے۔

مسجد اور قبرستان کی موقوفہ اراضی پر مدرسہ کی تعمیر:

مسجد ہو یا قبرستان ہر ایک وقف کا مقصد دین کو تقویت پہنچانا اور امت کے لئے سہولت بہم کرنا ہے، اس لحاظ سے مساجد اور قبرستان کے اوقاف کے مقاصد فی الجملہ وہی ہیں جو مدارس اور درسگاہوں کے ہیں، اس لئے ان اراضی میں مدارس کا قیام درست ہے، جیسا کہ فقہاء نے قبرستان میں مساجد کی تعمیر کی اجازت دی ہے، مفتی عبدالرحیم لاجپوری مدظلہ نے اس سلسلہ میں عینی کی عبارت اس طرح نقل کی ہے:

''فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين'' (عینی بحوالہ فتاوی رحیمیہ)۔

(جب قبرستان ویران ہوجائے اور اس میں تدفین بھی نہ ہورہی ہو تو اس قبرستان کو مسجد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، کیونکہ مسجد بھی مسلمانوں کے اوقاف میں سے ہی ہے)۔

جو علت یہاں مسجد تعمیر کرنے کی بیان کی گئی ہے، بعینہ وہی علت مدرسہ کی تعمیر میں بھی موجود ہے، اس لئے علتِ مشترکہ کی بنا پر اگر مذکورہ صورت میں قبرستان میں مدرسہ کی تعمیر عمل میں آئے تو اس کی اجازت ہوگی۔

اگر تدفین پر پابندی عائد کردی جائے:

چونکہ وقف کا اصل مقصد فوت ہوچکا ہے اور ناجائز قبضہ کا بھی امکان ہے، اس لئے ایسے قبرستان سے انتفاع کی ہر وہ صورت درست ہے، جو فی الجملہ اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے فلاح کا باعث ہو، جیسے مسجد ومدرسہ کی تعمیر، کوئی دینی وملی ادارہ، جس سے مسلمانوں کے مصالح وابستہ ہوں، اسی طرح اسے بیچ کر حاصل شدہ رقم فقراء پر بھی صرف کی جاسکتی ہے اور استبدال کی بھی اجازت ہوگی، جیسا کہ ابن نجیم وابن عابدین کی مذکورہ تحریر سے ظاہر ہے (دیکھئے: البحر الرائق ۵/ ۲۰۷، ردالمحتار ۵۸۶/۶)۔

محکمۂ آثار قدیمہ کے تحت داخل شدہ مسجد کا حکم شرعی:

مسجد کے بارے میں حکم شرعی یہی ہے کہ مسجد ایک مرتبہ تعمیر ہوجانے کے بعد تا قیامت مسجد ہی کے حکم میں رہتی ہے، خواہ اس میں نماز ہو رہی ہو یا نہ ہو رہی ہو، علامہ حصکفی کا بیان ہے:

''لو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام والثاني أبدا إلى قيام الساعة و به يفتي'' (در على الرد ۸،۶،۵۴۶)

(اگر مسجد کے اطراف (کی آبادی) ویران ہوجائے اور اس مسجد کی ضرورت نہ رہے تو بھی وہ امام صاحب اور امام ابو یوسف کے نزدیک قیامت تک مسجد ہی کے حکم میں ہوگی، اسی پر فتوی ہے)۔

قبرستان کا احاطہ اور اس کے ساتھ دکانوں کی تعمیر:

اس صورت میں جہاں قبرستان کی حفاظت ہوگی، وہیں یہ آمدنی کا بہترین ذریعہ بھی ہوگا، ایسی صورت میں تو فقہاء نے اجارہ تک کو جائز قرار دیا ہے، لہذا قرض کی صورت تو بدرجہ اولی جائز ہوگی، جیسا کہ علامہ شامی نے مسافر خانہ وغیرہ کی مرمت کے لئے اس کے بعض حصہ کو کرایہ پر لگانے کی اجازت دی ہے (رد المحتار ۶ / ۵۷۳)، اس سلسلہ میں علامہ ابن نجیم کی یہ عبارت بڑی واضح ہے:

''لو بنى رجل بيتا فى المقبرة لحفظ اللبن ونحوه إن كان فى الأرض سعة جاز وإن لم يرض بذلك أهل المقبرة'' (البحر الرائق ۵،۲۵۴)۔

اگر کسی شخص نے قبرستان میں اس کی اینٹ وغیرہ کی حفاظت کے لئے مکان بنایا اور قبرستان میں گنجائش بھی ہے تو اگرچہ اہل قبرستان راضی نہ ہوں پھر بھی ایسا کرنا جائز ہے۔

قبرستان میں مسجد کی توسیع کا حکم:

ضرورۃً ایسا کرنا جائز ہے، فتاوی بزازیہ میں ہے:

''وإن ضاق المسجد من أهله جائز للمتولى أن يدخل بعض منازل ألوقف فيه ولو أدخله فيه بلا حاجة لا يصير مسجدا'' (بزازیہ علی الهندیه ۶،۲۸۵)۔

(اگر اہل مسجد پر مسجد تنگ ہوجائے تو متولی کے لئے دوسرے اوقاف کو مسجد میں داخل کرنے کی اجازت ہے، ہاں اگر بغیر ضرورت کے داخل کیا تو اس کو مسجد میں شمار نہیں کیا جائے گا)۔

اگر مسلم اوقاف کا متولی غیر مسلم ہو:

اس سلسلہ میں فقہاء کے دونوں طرح کے اقوال ہیں، لیکن صحیح قول یہی ہے کہ مسلم اوقاف کو مسلمانوں ہی کی تولیت میں ہونا چاہئے، علامہ رافعی رقمطراز ہیں:
"فإن تولية الذمى على المسلمين حرام" (تقریر رافعی علی الرد ۶،۸۴) مسلمانوں پر ذمی کی تولیت حرام ہے۔

☆☆☆

مساجد کی فاضل آمدنی بطور قرض دوسرے مصرف کے لئے لینا

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی [1]

"فتاوی خیریہ" (از شیخ خیر الدین بن احمد علی رملی ۹۹۳-۱۰۸۱ھ) میں ایسی مسجد کے متعلق جو کسی وجہ سے ویران اور غیر آباد ہو جائے مفصل بحث کی گئی ہے، عبارت یہ ہے:

"إن المسئلة فيها خلاف بين الائمة الأسلاف، فقال أبويوسف: يبقى مسجداً إلى قيام الساعة لا يعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أو لا"۔

الف۔ مقاصد وقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے تبادل وقف ایسے اوقاف کو فروخت کر کے باجازت قاضی یا مجوزہ شرعی کمیٹی کی اجازت سے قائم کرنے کی گنجائش ہے۔

ب۔ ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالے کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان مقاصد وقف کو جاری رکھنے کے لئے حاصل کی جاسکتی ہے۔

حتی الامکان واقف کے مقاصد کی پابندی ضروری ہے، تاہم کیونکہ وقف کا مقصد امور مذہبی سے متعلق ہوتا ہے، اس لئے قاضی کی یا مجوزہ شرعی کمیٹی کی اجازت سے مسلمانوں کے رفاہی اور ایسے تعلیمی اداروں پر جن میں تربیت دینی ہو خواہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم بھی ہو خرچ کرنے کی گنجائش ہے۔

الف۔ مسجد کی ضروریات سے زائد جو اراضی ہے اس کو کرایہ پر لے کر اس میں دینی تعلیم یا عصری تعلیم کا ادارہ جس میں دینی تربیت ہو قائم کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ مسجد کی زائد آمدنی سے بطور قرض رقم لی جاسکتی ہے اور اس سے مسلمانوں کے مذہبی تعلیمی ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں، یا عصری تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے جس میں تربیت دینی ہو قائم کئے جاسکتے ہیں۔

"أما المال الموقوف على المسجد الجامع لم تكن للمسجد حاجة للمال، فللقاضي أن يصرف في ذلك، لكن على وجه القرض، فيكون ديناً في مال الفئ" (فتاوی عالمگیری ۲،۴۶۴)۔

اگر آمدنی زائد نہیں ہے تو مسجد کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر ہی خرچ کی جائے گی۔

"وإن اختلف أحدهما بأن بنى رجلان مسجدين أو رجل مسجداً ومدرسة ووقف عليهما أوقافا لا يجوز ذلك (أي الصرف المذكور)" (در مختار مع الشامی ۳،۵۱۵)۔

اصلاً وقف قابل بیع نہیں ہے، اور اگر اصولی طور پر اس کی اجازت دے دی جائے تو اندیشہ ہے کہ لوگ وقف کی بیع کرنے لگیں گے، قاضی یا قابل اعتماد شرعی کمیٹی کی اجازت سے ایسا کرنا ممکن ہے۔

اسی سے ملتے جلتے دوسرے مصارف میں اس وقف کی آمدنی خرچ کر سکتے ہیں، مثلاً کوئی وقف کسی خاص مدرسے کے لئے تھا وہ مدرسہ باقی نہیں رہا تو وہ آمدنی دوسرے مدرسہ میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

الف۔ یہ وقف کے تحفظ کی صورت ہوگی اور اس کی گنجائش ہے۔

ب۔ تحفظ وقف کے لئے اس کی بھی گنجائش ہے مگر باجازت قاضی۔ "لايملك الواقف بالبيع ونحوه ولو لإحياء الباقي" (جامع الرموز)۔

---

[1] مالیر کوٹلہ، پنجاب۔

اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ اس جگہ کو کرایہ پر لے لیا جائے اور اس کو مدرسہ کی تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے۔

مذکورہ صورت میں قبرستان کی زمین کو کھیت بنا کر یا باغ بنا کر اس کی آمدنی کو کسی دوسرے قبرستان کے ضروری مصارف میں خرچ کیا جائے اور اگر قبرستان کی زمین وقف نہ ہو تو مالک اپنے استعمال میں لاسکتا ہے (دیکھئے: کفایت المفتی ۷ر ۱۲۳)۔

یہ حکومت کی زیادتی ہے، شرعاً وہ مسجد ہے اور اس کو مسجد کے طور پر استعمال ہونا چاہئے۔

قبرستان میں دوکانیں بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

مسجد کی توسیع کے لئے قدیم یا جدید قبریں مسجد میں شامل کی جاسکتی ہیں، مفتی کفایت اللہؒ اور مفتی عزیز الرحمنؒ اور مفتی دار العلوم دیوبند نے یہی فتوی دیا ہے۔

ہندوستان کی وزرات اوقاف کا وزیر غیر مسلم ہے، جبکہ اس میں اسلامی اوقاف بھی شامل ہیں۔

اوقاف کے سلسلہ میں ایک ضروری گذارش:

وقف بورڈ دینی رقم بینک میں رکھتے ہیں، بلکہ فکس ڈیپازٹ کراتے ہیں، اس پر سود ملتا ہے یہ سود کی رقم مذہبی اداروں، مسجدوں اور ملازمین کی تنخواہوں پر خرچ کی جاتی ہے، سود اور اصل سب خلط ملط رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ سود کی رقم الگ رکھی جائے۔ بورڈ کی جمع شدہ رقم پر بلا سودی منافع کی کوئی شکل اختیار نہیں کی جاتی۔ اس طرح ایک مذہبی ادارے میں کھلم کھلا سود کا سلسلہ ہے اس پر غور کیا جائے اور اوقاف کے لئے جائز راہ سامنے رکھی جائے۔

الف، ب۔ اوقاف کی فاضل آمدنی اسی نوع کے اوقاف میں صرف کی جاسکتی ہے، دیگر ملی و دینی و علمی کاموں میں نہیں، اس لئے کہ مقاصد واقف، نیز شرائط واقف کا لحاظ ضروری ہے۔

اگر اوقاف سے معمولی آمدنی ہے تو آمدنی بڑھانے کے لئے اوقاف کو فروخت کرنا درست نہیں ہے۔

’’لكن تكون المنفعة مصروفة إلى المصلحة التي كانت الأولى تصرف فيها، لأنه لا يجوز تغيير المصرف مع إمكان المحافظة عليه كما لا يجوز تغيير الوقف بالبيع مع إمكان الانتفاع به‘‘ (المغنی ۵؍۶۳۳)۔

(اوقاف کی آمدنی کا انہی مصالح میں صرف کرنا ضروری ہے جن میں وہ صرف کی جاتی تھی، کیونکہ حتی الامکان مصرف کو بدلنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ وقف کی بیع جائز نہیں ہے جب کہ اس سے انتفاع ممکن ہو)۔

اگر موقوف علیہ ناپید ہو جائے تو تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اوقاف کی آمدنی واقف کے اقارب خصوصاً اس کے عصبات پر صرف کی جائے، اور اگر واقف کے اقارب موجود نہ ہوں تو اس کا مصرف فقراء اور مساکین ہیں۔

’’واتفق الشافعية والحنابلة مع الرأي السابق للمالكية على أن الموقوف يصرف عند انقراض الموقوف عليهم إلى أقرب الناس إلى الواقف، فإن لم يكن للواقف أقارب أو كان له أقارب فانقرضوا صرف إلى الفقراء والمساكين وقفاً عليهم، لأن القصد به الثواب الجاري على الدوام‘‘ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸، ۲۰۰)۔

الف۔ وقف کی مخدوش عمارت کی تجدید کے لئے اگر اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ کسی بلڈر کو اس کی ایک آدھ منزل دے دی جائے جس پر اس کو مالکانہ تصرف کا حق حاصل ہو تو بظاہر اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ب۔ وقف کے بعض حصہ کو آباد کرنے کے لئے اس کے بعض حصہ کو فروخت کرنا درست ہے، ان دونوں جوابوں کے حوالہ میں وہی عبارت پیش کی جاسکتی ہے جو سوال اول کے جواب میں پیش کی جاچکی ہے۔

مسجد یا قبرستان کے لئے جو زمین وقف کی گئی ہے اس کو مدرسہ کے لئے استعمال کرنا مقاصد واقف کے خلاف ہے اس لئے درست نہیں ہے۔

ایسے قبرستان جہاں تدفین پر پابندی عائد کردی گئی ہے وہاں اگر کوشش بسیار کے باوجود پابندی ختم نہیں ہوتی تو ان کو مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر کے قبرستان کے لئے متبادل جگہ خرید لی جائے۔

آثار قدیمہ کے تحت آنے والی مسجدوں میں غیرآباد ہونے کی وجہ سے بت رکھدیئے گئے ہیں جو افسوسناک صورت حال ہے، اس کے لئے حکومت سے قانونی جنگ لڑی جائے اور کسی طرح ان کو آزاد کرایا جائے یا کم از کم ان میں نماز پڑھنے کی اجازت حاصل کی جائے، نماز پر پابندی لگانے کا حکومت کو کوئی حق نہیں ہے، آثار قدیمہ میں تو بہت سے مندر بھی آتے ہیں، لیکن وہاں پوجا پاٹ پر کوئی پابندی نہیں ہے، جو حکومت مساجد میں نماز پڑھنے پر پابندی عائد کرتی ہے وہ ظالم و جابر حکومت ہے، جمہوری حکومت نہیں ہے، مساجد سے روکنا قرآن کی نظر میں فتنہ کبری اور ظلم اکبر ہے، بندہ اور خدا کے درمیان حکومت کو حائل ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔

''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها'' (سورہ بقرہ:۱۱۴)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وصدّ عن سبيل الله وكفر به والمسجد الحرام وإخراج أهله منه أكبر عند الله والفتنة أكبر من القتل'' (سورہ بقرہ:۲۱۷)۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے قبرستان کا کچھ حصہ دوکانوں میں چلا جائے تو یہ قبرستان ہی کا ایک مصرف ہوا، راقم کے علم میں ایسے قبرستان ہیں جو لب سڑک واقع ہیں اور ٹاؤن ایریا، یا میونسپلٹی نے وہاں جبراً دوکانیں بنوادیں اور مسلمان دیکھتے رہ گئے، لہذا اس طرح کے خطرات سے بچنے کے لئے باؤنڈری بھی تعمیر کی جاسکتی ہے اور دوکانیں بھی بنوائی جاسکتی ہیں، لیکن اس آمدنی سے دوسری جگہ مزید قبرستان کے لئے زمین خریدی جاسکتی ہے، دیگر مصارف خیر میں نہیں لگایا جاسکتا۔

مسجد کی توسیع یا قبرستان کے لئے کسی عمارت کی تعمیر کے لئے ویران قبروں کی جگہ استعمال کی جاسکتی ہے، لیکن جدید قبریں جب کے نشانات ظاہر ہیں ان پر تعمیر درست نہیں ہے۔

ہندو راجاؤں نے مساجد کے لئے جو اراضی وقف کی ہیں، وہ ہندو ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ فرمانروا ہونے کی حیثیت سے وقف کی ہیں، لہذا اس کو ہندو وقف بورڈ کے تحت نہیں رکھنا چاہئے، جس طرح مسلم حکمرانوں نے مندروں کو اراضی دی تھیں جن کی دستاویزات موجود ہیں، لیکن واقف کے مسلم ہونے کی وجہ سے اس کو مسلم وقف بورڈ میں نہیں رکھا گیا۔

ہماری کوشش تو یہی ہونی چاہئے کہ وہ اوقاف غیر مسلم ادارہ کی تولیت سے نکل کر مسلم ادارہ کی تولیت میں آجائیں۔ ارشاد ربانی ہے:

''لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا'' (سورہ نساء:۱۴۱)۔

وضاحت: اوقاف کی بیع کے عدم جواز پر بخاری شریف کی وہ حدیث پیش کی جاتی ہے جو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیبر میں جو جائداد ملی اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو مشورہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا

''إن شئت حبست أصلها وتصدقت بها فتصدق بها عمر على أن لا تباع ولا توهب ولا تورث''۔

تو اس کی توجیہ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حبست اصلہا فرمانا یا حضرت عمر کا عدم بیع، عدم ہبہ اور عدم تورث کی شرط کے ساتھ وقف کرنا اس لئے تھا کہ اوقاف لوگوں کی دست برد سے محفوظ رہے اور اس کا صدقہ جاریہ ہونا متاثر نہ ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ کی تصریحات کا منشا اوقاف کو ناکارہ اور بے سود بنانا نہیں تھا، اور یہاں صورت حال یہ ہے کہ اگر اس کی بیع نہ کی جائے اور متبادل وقف کا انتظام نہ کیا جائے تو اوقاف بے سود اور ناکارہ ہوجائیں گے، یہاں خدانخواستہ کسی کی دخل اندازی اور تصرف کے لئے جواز فراہم کرنا پیش نظر ہے، بلکہ پیش نظر یہ ہے کہ کسی طرح اوقاف صدقہ جاریہ بنے رہیں اور ان کا فیض جاری رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ راقم نے بیشتر جوابات میں حنابلہ کے مسلک پر بنیاد رکھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اوقاف کا حال زار اور مسلمانوں کی بے بسی دیکھ کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ ایسے اضطراری حالات میں کیوں نہ امام احمدؒ کے مسلک پر عمل کرلیا جائے، یہاں اس مسلک کو اختیار کرنا اتباع ہوی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ شدید ضرورت کے تحت ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان میں اوقاف کے سرکاری ادارے اور متولیان اوقاف خیانت کے خوگر ہوچکے ہیں، اوقاف کی بیع کرکے اس رقم کو ہضم کرنے میں انتہائی بے باک ہیں، لہذا اگر سمینار میں اوقاف کی بیع کے جواز کا فیصلہ کیا جائے تو کچھ ایسی قیدیں لگادی جائیں جن کی بنا پر یہ طالع آزما اوقاف کو استحصال نہ کرسکیں۔

☆☆☆

مساجد پر وقف اراضی پر تعلیمی ادارے کا قیام

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی [1]

اشیاء موقوفہ میں اس بات کی رعایت ضروری ہے کہ وہ اشیاء باقی رہیں اور ان سے حاصل شدہ نفع واقف کے منشاء کے مطابق کار خیر میں خرچ ہوتا رہے۔

اراضی وقف کے تبادلہ کا مسئلہ ان چند اہم مسائل میں سے ہے جن کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے، اور علماء سلف نے اس پر تفصیلی کلام کیا ہے، مسئلہ کی تین صورتیں ہیں:

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ واقف نے وقف کرتے وقت اس کی صراحت کردی ہو کہ اسے یا اس کے قائم مقام متولیان کو اراضی وقف کے تبادلہ کا اختیار ہوگا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے ایسی کوئی صراحت نہیں کی، وقف نامہ اس بارے میں ساکت ہے، یا واقف نے صراحت کردی ہو کہ خود وہ یا کوئی اور ان اراضی موقوفہ کا تبادلہ نہیں کرسکتا۔

پھر اس کی دو صورتیں ہیں:

اول یہ کہ ان اراضی وقف سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا ہو، یا نفع تو ہوتا ہو مگر اس نفع کو حاصل کرنے میں اخراجات نفع کے برابر یا اس سے بھی زائد ہوں۔

دوم یہ کہ اس جائداد سے کچھ نہ کچھ نفع تو ہوتا ہے، لیکن اگر اس کا تبادلہ دوسری اراضی سے کردیا جائے تو نفع کے زائد ہونے کی توقع ہے۔

پہلی صورت میں، جبکہ واقف نے اپنے لئے یا دوسروں کے لئے تبادلہ کا اختیار رکھا ہو، اگر اراضی وقف سے آمدنی ختم ہوگئی ہو تو اس اراضی کا دوسری ایسی اراضی سے تبادلہ کرنا جس سے نفع زیادہ حاصل ہو جائز ہوگا۔

''واعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه الأول أن يشترطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقا'' (رد المحتار ۳،۳۸۷)۔

''فلو شرطه لايلزم خروجه عن الانتفاء و لا مباشرة القاضي و لاعدم ريع يعمر به كما لايخفى'' (رد المحتار ۳،۳۸۸)۔

دوسری صورت کی پہلی شق میں اگر اراضی وقف سے کوئی نفع نہیں ہے یا خرچ نفع سے زائد ہے تو اگرچہ واقف نے اس کے تبادلہ کی اجازت نہ دی ہو یا تبادلہ پر روک لگائی ہو، لیکن قاضی مصلحت وقف کو دیکھتے ہوئے تبادلہ کی اجازت دے سکتا ہے۔

''والثاني أن لايشترطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لاينتفع به بالكلية، بأن لايحصل منه شئ أصلا أو لايفي بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي'' (رد المحتار ۳،۳۸۷)۔

دوسری صورت کی دوسری شق میں جبکہ اراضی وقف کی آمدنی بالکل ختم نہ ہوئی ہو تو عام طور پر فقہاء تبادلہ کی اجازت نہیں دیتے ہیں، مگر امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی قاضی کی اجازت سے تبادلہ صحیح ہے، اور ایک روایت امام محمدؒ سے بھی یہی ہے۔

''الرابعة أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة و أحسن صقعا فيجوز على قول أبي يوسف، وعليه الفتوى كما فى فتاوى قارى الهداية'' (رد المحتار ۳،۳۸۹)۔

---

[1] قاضی امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

''وقد روی عن محمد إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستغلال والقيم يجد بثمنها أخرى أكثر ريعا كان له أن يبيعها و يشتري بثمنها ما هو أكثر ريعا'' (منحة الخالق علی البحر ۵،۲۲۷)۔

الف،ب۔ ایسے اوقاف جو مسلمانوں کے منتقل ہوجانے کی وجہ سے ویران ہوچکے ہیں، دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہوگیا ہے ایسے اوقاف کو حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کرکے اس کے بدلہ میں دوسری اراضی حاصل کرنا یا اس کو فروخت کرکے دوسری زمین خرید کر اسکی جگہ پر وقف کرنا جائز ہوگا۔

تبادلہ کی اجازت مسجد کے علاوہ دوسرے اوقاف یا خود مسجد کے لئے وقف شدہ اراضی کے بارے میں ہے وہ زمین جس پر مسجد بنی ہوئی ہے، اور جس میں نماز پڑھی گئی ہو اس کو بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسجد مفتی بہ قول کے مطابق تاقیامت مسجد رہتی ہے۔

''ولو خرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجدا... أبدا إلى قيام الساعة وبه يفتي حاوي القدسي'' (در مختار ۳،۳۷۱)۔

اس طرح کے اوقاف کو فروخت کرکے واقف کے منشاء کے خلاف مسلمانوں کے تعلیمی ورفاہی ادارے قائم کرنا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ واقف کے منشاء کی رعایت بہرحال ضروری ہے، مشہور جزئیہ ہے:

''شرط الواقف كنص الشارع أي في المفهوم و الدلالة ووجوب العمل به'' (در مختار ۳،۴۱۶)۔

''على أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة'' (ردالمحتار ۳،۴۱۶)۔

الف۔ مسجد پر وقف اراضی میں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا تو جائز نہیں ہوگا، البتہ اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ ان اراضی سے مسجد کو جو آمدنی ہوتی ہے اتنا کرایہ مسجد کو دیا جائے۔ اور اجارہ پر ان اراضی کو حاصل کرکے ان پر مسلمانوں کے فائدے کے لئے کوئی ادارہ قائم کیا جائے، تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، اگرچہ وقف کی اراضی کو طویل اجارہ پر دینا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں وقف کے ضائع ہوجانے کا ڈر ہے، مگر یہ اندیشہ کسی فرد کو دینے میں تو ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے رفاہی ادارہ قائم کرنے میں نہیں ہے۔

ب۔ مسجد کی آمدنی تعلیمی ورفاہی مقاصد کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔ منشاء واقف کی رعایت بہرحال ضروری ہے، جیسا کہ اوپر گزرا۔

الف،ب۔ اگر کسی وقف کی آمدنی اس کے مصارف سے زائد ہے، اور طویل عرصہ تک اسکی حفاظت دشوار ہے اور آئندہ بھی مصرف میں خرچ ہونے کی امید نہیں ہے تو فاضل آمدنی اسی نوع کے دیگر اوقاف کی ضروریات میں صرف کی جائے گی، دوسرے دینی وعلمی کاموں پر صرف کرنا جائز نہیں ہوگا۔

''ظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض و عكسه وفي الشرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار ۳،۳۷۱)۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: رہا یہ کہ وہ مصالح مسجد سے بچ جاتا ہے اور اس کے جمع رکھنے میں احتمال ضیاع کا ہے، تو اسکی صورت یہ ہے کہ اس فاضل کو دوسرے مساجد کے مصالح پر صرف کرنا چاہئے جو مسجد موقوف علیہ سے قریب ہو، اور اگر اس مسجد قریب میں بھی استغناء ہو تو پھر اس کے بعد جو مساجد قریب ہوں حتی کہ دوسری بلاد ہند کی مساجد تک اس کی محل ہیں (امداد الفتاوی ۲/ ۶۱۴)۔

مدرسہ جنس مسجد میں سے نہیں، اس لئے زائد رقم دوسری مساجد میں صرف کرنا چاہئے، اگر اس شہر میں حاجت نہ ہو تو دوسرے شہروں کی مساجد میں صرف کریں، جو زیادہ قریب ہو اس کا حق مقدم ہے، اسی طرح بہ ترتیب (امداد الفتاوی ۲/ ۶۱۸)۔

اراضی کا تبادلہ دوسری اراضی سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے جائز ہے یا نہیں، یہ تو مختلف فیہ ہے اکثر فقہاء نے اجازت نہیں دی ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور ایک روایت کے مطابق امام محمدؒ جواز کے قائل ہیں، لیکن اگر وقف کا مکان بالکل ناقابل انتفاع نہ ہو، صرف آمدنی کم ہوجائے تو زیادہ آمدنی کے لئے اس کا تبادلہ صحیح نہیں ہے۔

''إن الخلاف في الثالث إنما هو في الأرض إذا ضعفت عن الاستغلال بخلاف الدار إذا ضعفت بخراب بعضها

ولم تذهب أصلا، فإنه لا يجوز حينئذ الاستبدال على كل الأقوال'' (رد المحتار ۳،۳۸۷)۔

البتہ اگر مکان ناقابل انتفاع ہوتو اس کا تبادلہ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ دوسرا مکان اسی محلہ میں ہو یا اس سے اچھے محلہ میں ہو، صرف آمدنی کا زائد ہونا جواز تبادلہ کے لئے کافی نہیں ہوگا۔

''وفي القنية مبادلة دار الوقف بدار أخرى إنما يجوز إذا كانتا في محلة واحدة أو محلة أخرى خيرا وبالعكس لا يجوز، وإن كانت المملوكة أكثر مساحة وقيمة وأجرة لاحتمال خرابها في ادون المحلتين لدنائتها، وقلة الرغبة فيها'' (رد المحتار ۳،۳۸۸)۔

اگر اراضی کسی خاندان کے فقراء کے لئے وقف تھی اور وہ خاندان ختم ہوگیا تو اب اس کی آمدنی دوسرے فقراء ومساکین پر خرچ کی جائے گی۔

''وقال أبو يوسف سمى فيه جهة تنقطع جاز وصار بعدها للفقراء وإن لم يسمهم... وهذا هو الصحيح'' (هدايه ۲،۶۳۹)۔

اور اگر کسی مسجد یا مدرسہ پر وقف ہے اور وہ مسجد اور مدرسہ نہیں رہا تو اس سے قریب مسجد یا مدرسہ میں صرف کیا جائے گا۔ یعنی مسجد پر وقف اراضی کی آمدنی قریب تر مسجد میں اور مدرسہ پر وقف اراضی کی آمدنی قریب تر مدرسہ میں صرف کی جائے گی۔

الف۔ اگر وقف کی عمارت مخدوش ہو اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ نہ ہو اور کوئی شخص مخدوش عمارت کی جگہ نئی عمارت کی تعمیر کے لئے تیار ہے اس شرط کے ساتھ کہ ایک یا دو منزل اس کی ملکیت ہوگی یا کوئی خالی زمین ہے اس سے انتفاع ممکن نہیں ہے اور مذکورہ شرط پر کوئی شخص عمارت بنانے کے لئے آمادہ ہے تو میرے خیال میں اس شرط کے ساتھ اسکی اجازت دی جانی چاہئے کہ وہ شخص وقف کے مکان پر جتنا سرمایہ خرچ کر رہا ہے اس سے بہت زیادہ قیمت اس منزل کی نہ ہو جو اسکی ملکیت قرار دی جارہی ہے۔

ب۔ وقف شدہ اراضی کو فروخت کر کے مسجد کی تعمیر میں صرف کرنا جس سے اس کی آمدنی ختم ہوجائے جائز نہیں۔

''بيع عقار المسجد لمصلحة المسجد لا يجوز وإن كان بأمر القاضي وإن كان خرابا'' (البحر الرائق ۵،۲۲۲)۔

البتہ اگر وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے وقف کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور اس سے آمدنی حاصل کرنے اور اسکی حفاظت کا کوئی ذریعہ اس کے سوا نہیں ہے کہ اس کے ایک حصہ کو فروخت کر کے باقی حصہ کو محفوظ وقابل انتفاع بنایا جائے تو میرے خیال میں اسکی اجازت دی جانی چاہئے تاکہ وقف محفوظ بھی رہے اور اس سے آمدنی بھی حاصل ہو جو منشاء واقف کے مطابق خرچ ہو۔

''وإن باع بعضه لإصلاح باقيه لخراب كله جاز'' (منحة الخالق على البحر ۵،۲۲۷)۔

اگر کسی قبرستان کی اراضی اسکی ضرورت سے زائد ہے اور آئندہ بہت دنوں تک اس کو مصرف میں لانے کی توقع نہیں ہے اور قبرستان کی مثلاً چہار دیواری کے لئے آمدنی کی ضرورت ہے تو میرے خیال سے زائد اراضی کو مدرسہ کے لئے اجارہ پر دیدینا اور اس میں مدرسہ تعمیر کرنا اور اس کے کرایہ کی آمدنی کو قبرستان کی حفاظت کے لئے خرچ کرنا مناسب اور جائز ہوگا۔

اسی طرح اگر مسجد کی اراضی ہے تو اس کو بھی مدرسہ کی تعمیر کے لئے اجارہ پر دینا جائز ہوگا، جیسا کہ اوپر گزرا۔

جن قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہوگئی ہوں اور اب اس کا استعمال بطور قبرستان کے نہیں ہورہا ہو اور قبریں پرانی ہوگئی ہوں کہ ان کے سڑگل جانے کا ظن غالب ہو اور قبرستان کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہو تو اس کو فروخت کر کے مسلمانوں کی آبادی سے قریب اراضی خرید کر بطور قبرستان استعمال کی جائے۔ اسی طرح اگر قبرستان آبادی کے اندر آگیا اور حکومت نے اس میں تدفین پر پابندی عائد کردی ہے، اور اب اس میں مردے دفن نہیں کئے جاتے، اور اسی طرح اس کو باقی رکھنے میں ضیاع کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں بھی اس کو فروخت کر کے آبادی سے باہر اراضی خرید لی جائے اور اس کو بطور قبرستان استعمال کیا جائے۔

اگر وقف قبرستان کی حفاظت کے لئے اس کی باؤنڈری بنانا ضروری ہو جائے اور اس کے لئے رقم کا کوئی نظم نہ ہو تو قبرستان کے اطراف میں سے کچھ حصہ پر ذریعہ آمدنی کے طور پر دکان بنانے کا پروگرام بنایا جائے اور اس کے لئے پیشگی کرایہ کے نام پر کچھ لوگوں سے رقم حاصل کر کے قبرستان کی چند فٹ زمین اطراف سے لیتے ہوئے اس پر دکان بنائی جائے تو یہ جائز اور درست ہوگا، لیکن یہ ساری دکانیں وقف ہی ہوں گی اور دکانوں سے بعد میں حاصل ہونے والی آمدنیاں جب قبرستان کی ضروریات سے زائد ہو جائیں گی تو اسے ایسے مصارف خیر پر صرف کرنا بھی جائز ہوگا جس کا نفع عام مسلمانوں کو پہنچے، مثلاً قریب کے دوسرے قبرستان کی باؤنڈری بنانے اور دیگر ضروریات میں خرچ کیا جائے، یا کسی مسجد ومدرسہ کی تعمیر ومرمت یا دوسری بنیادی ضرورتوں میں لگا دیا جائے۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے باؤنڈری بنانا ضروری ہو اور اس کے لئے وقف کے پاس سرمایہ نہ ہو تو مناسب ہوگا کہ اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرادی جائے اور اس کے لئے پیشگی رقم بطور کرایہ لے لی جائے اور اس آمدنی سے قبرستان کی باؤنڈری کرادی جائے۔

اگر اراضی قبرستان اور مسجد دونوں کے لئے وقف ہے تو دیکھا جائے گا کہ دونوں کے لئے اراضی کی تحدید ہے تو اس کے مطابق عمل ہوگا، لیکن اگر دونوں کے لئے زمین کی حد متعین نہیں ہے تو حسب ضرورت اراضی کا استعمال قبرستان ومسجد دونوں کے لئے ہوگا۔ اور مسجد کے پاس قبریں نہ ہوں یا اتنی پرانی ہوں کہ ان کے سڑگل جانے کا ظن غالب ہو تو توسیع کی جاسکتی ہے، اور دو منزلہ اور سہ منزلہ بنائی جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ نماز کی ضرورت بھی پوری ہوگی اور قبرستان کی وسعت میں بھی فرق نہیں آئے گا۔

اگر کسی جگہ ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد پر اراضی وقف کیا ہے، اب ان کی اولاد میں کوئی ہندو اس کا متولی ہے تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ متولی کے لئے مسلمان کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

''ویشترط للصحة بلوغه وعقله لا حریته وإسلامه کذا فی الإسعاف'' (ردالمحتار ۳،۴۸۵)۔

''ولا تشترط الحریة والإسلام للصحة کما فی الإسعاف'' (ھندیہ ۲،۴۰۸)۔

☆☆☆

ویران اوقاف کی جگہ نئے اوقاف کا قیام

مفتی محمد حبیب اللہ قاسمی [1]

الف۔ اوقاف کی بیع تو شرعا جائز نہیں ہے، علامہ شامی کی رائے یہ ہے کہ بیع باطل ہے لیکن جن اوقاف کی بابت دریافت کیا گیا ہے ان کی بیع مجبوری کی وجہ سے جائز ہے، اور مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی ایسے دوسرے مقام پر جو ان اوقاف سے زیادہ قریب ہو متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے۔

''مطلب بيع الوقف باطل لا فاسد'' (شامی ۴،۳۹۴) ''وكذا الرباط والبئر والحوض إذا لم ينتفع بهما. فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر'' (درمختار ۴،۳۷۱)۔

ب۔ ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد واقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے میں تمام اوقاف کا حکم یکساں ہے، خواہ وہاں مدارس کے اوقاف ہوں یا مساجد اور مقابر و خانقاہوں کے، واقف کے شرائط کی رعایت کرتے ہوئے ایسے تمام ویران غیر منتفع اوقاف کے معاوضہ یا تبادلہ کی شکل اختیار کی جا سکتی ہے (شامی ۳؍۳۸۷)۔

واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان ویران اوقاف کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی و رفاہی ادارے قائم کرنا درست نہیں۔

''لأن شرط الواقف كنص الشارع'' (درمختار، الاشباہ والنظائر)۔

الف۔ مسجد کے اوقاف کو موقوفہ مسجد میں لگانا ضروری ہے، اگر مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے زیادہ ہو تب ان اوقاف مسجد سے دینی و تعلیمی ادارہ کھولنا جائز ہے۔

ب۔ مسجد کی فاضل آمدنی جس کی فی الحال یا فی المآل ضرورت نہ ہو تو تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال کرنا جائز ہے (دیکھئے: کفایت المفتی ۷؍۲۷۵، ۳۰۱، ۳۰۲)۔

الف۔ عام حالات میں تو ایک نوع کے سامان اوقاف کو دوسرے نوع کے اوقاف میں یا اسی نوع کے دوسرے اوقاف میں استعمال کرنا جائز نہیں، لیکن سوال میں جن اوقاف کا تذکرہ ہے انکی فاضل آمدنی کو اسی نوع کے قریب ترین اوقاف کی ضروریات میں صرف کرنا جائز ہے۔

''وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (شامی ۴،۳۷۱)۔

ب۔ دیگر ملی و دینی و علمی کاموں میں یا مساجد میں لگانا بھی جائز ہے (کفایت المفتی ۷؍۲۷۵)۔

جو زمین وقف کی جاتی ہے یا جو مکان وقف کیا جاتا ہے اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ بعینہ یہ زمین یا مکان باقی رہے اور اس سے منافع حاصل کئے جائیں وہ زمین یا مکان تجارت کے لئے نہیں دی جاتی، لہذا اس کا فروخت کرنا اور زیادہ آمدنی کے لئے مکان کا دوسری جگہ خریدنا جائز نہیں الا یہ کہ موقوفہ مکان سے انتفاع ہی ختم ہو جائے (دیکھئے: فتاوی محمودیہ ۱۵؍۱۷۵)۔

اگر کسی وقف کے مصارف ختم ہو جائیں، مثلاً کوئی چیز کسی مسجد یا مدرسہ پر یا فلاں خاندان کے فقراء پر وقف تھی، اور اب نہ وہ مسجد ہے اور نہ وہ مدرسہ ہے اور نہ وہ فقراء ہیں، تو ایسی حالت میں کسی دوسری حاجت مند مسجد یا مدرسہ یا فقراء کو ان اوقاف کی آمدنی کا مصرف قرار دیا جائے گا (دیکھئے: کفایت المفتی ۷؍۲۷۹)۔

الف۔ موقوفہ عمارتیں جب کہ مخدوش ہوں اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے پیسہ بھی نہیں ہے، اسی طرح موقوفہ زمین ناقابل انتفاع ہو تو ان حالات میں کسی بلڈر

[1] ناظم جامعہ اسلامیہ مہذب پور، اعظم گڈھ یوپی۔

سے ایسا معاملہ کرنا جس میں وہ اپنی ملکیت کی کچھ شرط لگائے شرعاً جائز ہونا چاہئے کیونکہ یہاں مجبوری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم، ویسے عام حالات میں ایسا معاملہ درست نہیں کیونکہ موقوفہ شئی کی بیع وملکیت درست نہیں تاہم بہتر شکل تو یہی ہے کہ برائے وقف چندہ لے کر عمارت کو بنوائے۔

ب۔ تجدید تعمیر کے لئے موقوفہ عمارت یا زمین کے کسی حصہ کو فروخت کر کے اس کی آمدنی کو شئی موقوفہ میں لگانا جائز نہیں۔ کفایت المفتی (۷/۲۹۴) میں مذکور ہے کہ اگر تجدید تعمیر ضروری ہوجائے تو اس وقت بھی کرایہ پر دینا جائز ہے۔ بیع جائز نہیں۔

مسجد یا قبرستان کی موقوفہ زمین میں خواہ وہ زمین ان کی ضروریات سے فاضل ہوں اس میں مدرسہ کی تعمیر شرعاً درست نہیں۔

''لأن شرط الواقف کنص الشارع'' (دیکھئے: فتاوی رحیمیہ ۶/۹۵)۔

اس جگہ کو فروخت کر کے دوسری جگہ لی جاسکتی ہے، مگر باجازت قاضی۔

''وأما الاستبدال ولو للمساکین بدون الشرط فلا یملکه الإ القاضی'' (درمختار)۔

حکومت یا کسی بھی آدمی کو یہ حق حاصل نہیں کہ مساجد میں نماز کی ادائیگی کو روک دے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''أن المساجد لله'' (سورہ جن: ۱۸) اور دوسری جگہ فرمایا: ''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن یذکر فیها اسمه'' إلی آخرہ (سورۂ بقرہ: ۱۱۴)۔

قبرستان کی حفاظت کی اگر کوئی دوسری شکل نہ ہو تو مذکورہ شکل اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے، لیکن پہلے کوشش یہ کی جائے کہ مسلمانوں سے چندہ وصول کر کے قبرستان کی باؤنڈری مکمل ہوجائے۔

جو زمین کہ قبرستان کے لئے واقف نے وقف کی ہے اس کو دفن کے کام میں ہی لانا چاہئے اس میں مسجد بنانا جائز نہیں، جو مسجد بنائی گئی ہے اس میں نماز تو ہوجاتی ہے مگر مسجد کا ثواب نہیں ملتا کیونکہ وہ بقاعدہ شرعیہ مسجد نہیں ہوئی، لہذا قبرستان میں بنی ہوئی مسجد کی توسیع کیسے جائز ہوگی (کفایت المفتی ۷/۱۳۹)۔

مساجد ومقابر ودیگر اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کی تولیت غیر مسلم ادارہ کے ہاتھ میں ہونا شرعاً جائز ہے، تاہم خلاف اولیٰ ضرور ہے۔

''ویشترط للصحة بلوغه وعقله لا حریته وإسلامه لما فی الاسعاف'' (شامی ۳،۳۸۵)۔

☆☆☆

بہتر مقاصد کے لئے وقف کی تبدیلی کا حکم

مفتی محبوب علی وجیہی [1]

الف۔ اس زمانہ میں ایماندار اور دیانتدار آدمی کا ملنا بہت دشوار ہے، اس لئے وقف کی بیع اور تبدیلی میں احتیاط بہت ضروری ہے، پس صورت مذکورہ میں مساجد کو چھوڑ کر بمجبوری اوقاف کو فروخت کر کے اس کی جگہ دوسرا وقف شرائط واقف کے مطابق کیا جاسکتا ہے، تاکہ واقف کی منشاء پوری ہو سکے اور اس کو اجر ملتا رہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس تبدیلی کے لئے کسی جج یا ایسی اتھارٹی سے جو اس کی مجاز ہو، اجازت لے لی جائے، پس ایسے اوقاف جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ظن غالب کے درجہ میں ہے یا ان کی آمدنی ختم ہو چکی ہے یا کسی غاصب کے قبضہ میں ہے جس سے اس کو چھڑانا ممکن نہیں ہے، ان کو فروخت کر کے اس رقم سے دوسری جگہ خرید کر شرائط وقف کے مطابق وقف کر دیا جائے، ''قانون العدل والإنصاف'' مؤلفہ محمد قدری پاشا مطبوعہ مصر میں ہے:

''إنما يجوز بيع الوقف يشترى بثمنه ما يكون وقفاً بدلا عنه إذا شرط الواقف استبداله سواء شرط له أو لغيره أو سوغت الضرورة والمصلحة للقاضي بيعه و الاستبدال به''۔

ب۔ اگر اس وقف سے مقاصد وقف حاصل نہ ہو رہے ہوں تو حکومت یا کسی فرد کو دے کر اس سے بہتر منفعت کی چیز جس سے مقاصد وقف پورے ہوتے ہوں جج یا کسی مجاز اتھارٹی کی اجازت سے تبدیلی جائز اور درست ہے۔ ''کما بینته من قانون العدل والإنصاف'' (ص ۱۶۔ مادہ ۳۵، اور ص ۶۳۔ مادہ ۱۳۳)۔

مساجد اور دیگر اوقاف میں فرق ہے، اوقاف کی تبدیلی و منتقلی باجازت جج وقف کی بقاء، احیاء اور ترقی کے لئے جائز ہے، لیکن مساجد کی بیع یا تبدیلی ممکن نہیں ہے، کیونکہ مسجد بننے کے بعد وہ جگہ قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے، اس کی مسجدیت میں کوئی فرق نہیں آتا ہے چاہے شکل وصورت کچھ بھی ہو جائے، فتاوی قاضی خاں میں ہے:

''وعند أبي يوسف يبقى المسجد بعد خراب ماحوله مسجداً''۔

اور شامی میں ہے: ''تحت قوله مثله حشيش المسجد و به علم أن الفتوى على قول محمد في آلات المسجد، وعلى قول أبي يوسف في تأبيد المسجد''۔

اس لئے مسجد کی بیع یا تبدیلی ممکن نہیں ہے، کبھی بھی اللہ تعالی نے مسلمانوں کو موقع عطا فرمایا تو جن مسجدوں پر غاصبانہ اور ظالمانہ قبضہ ہو گیا ہے ان سے واگذاشت کر کے ان کو مسجد ہی بنایا جائے گا، اس لئے محکمہ اوقاف وغیرہ کے لئے ضروری ہے کہ سرکاری کاغذات وغیرہ میں ان کو مسجد ہی لکھوایا جائے، البتہ ایسی مسجدیں جو ویران ہو گئیں تو ان کا سامان نکال کر دوسری حاجتمند مسجدوں میں لگایا جاسکتا ہے یا اس سامان کی قیمت دوسری مسجدوں میں خرچ کی جاسکتی ہے، شامی میں ہے:

''جزم به الإسعاف حيث قال: ولو خرب المسجد وماحوله وتفرق الناس عنه لايعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف ويباع نقضه بإذن القاضي و يصرف ثمنه إلى بعض المساجد''۔

واقف کی شرائط نص شارع کے حکم میں ہیں، لہذا ان کی مکمل پابندی کی جائے، البتہ جہاں مصارف وقف موجود نہ ہوں یا ان کی تکمیل کے بعد

---

[1] جامع العلوم فرقانیہ رامپور، یوپی۔

کچھ رقم فاضل رہتی ہے تو وہ مسلمانوں کے تعلیمی اور رفاہی کاموں میں خرچ کرسکتے ہیں، اور ایسے پرانے اوقاف جن کے شرائط معلوم نہ ہوں ان کی آمدنی پہلے غرباء ومساکین اور پھر دینی وملی ضروریات پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

الف۔ دینی ادارہ یا عصری تعلیم کا مرکز جس میں دینیات بھی پڑھائے جاتے ہوں ان پر مساجد کی فاضل آمدنی خرچ کی جاسکتی ہے، لیکن اگر کسی وقت مسجد کو اس فاضل رقم کی ضرورت پڑے تو پھر مسجد میں ہی خرچ کی جائے گی کسی دوسرے ادارہ کو نہیں دی جاسکتی، کیونکہ واقف نے مسجد کے لئے وقف کی ہے، چنانچہ ''درمختار'' وغیرہ میں ہے: "شرط الواقف کنص الشارع"۔

ب۔ واقف کی شرط کے خلاف بلاضرورت عمل جائز نہیں ہے، لہذا مسجد کے لئے جو وقف ہے اس کو مسجد ہی پر خرچ کیا جائے، اماموں اور مسجد کے کارندوں کی تنخواہ میں ضرورت زمانہ کے اعتبار سے اضافہ کیا جائے، جس سے وہ مطمئن زندگی گذار سکیں، مسجد کی صفائی اور دیکھ ریکھ پر خرچ کیا جائے، اس کے بعد بھی اگر رقم بچے تو اہل محلہ کے مشورہ واجازت سے یا وہ اتھارٹی جو اس کے نظم ونسق کے لئے مقرر ہو، اس کی اجازت سے یہ رقم تعلیمی اور رفاہی کاموں پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

ایسی فاضل آمدنی کا دیندار اور متقی لوگوں کی کمیٹی کے ذریعہ قاضی کی اجازت سے خرچ کرنا جائز ہے، چنانچہ فقہاء نے دیندار کو قاضی الجنۃ سے تعبیر کیا ہے۔

الف۔ اولاً اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں صرف کرنا ضروری ہے۔

ب۔ اس کے بعد اگر رقم بچے تو دینی، علمی، ملی اور کمزور مساجد وغیرہ میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

جب تک وقف سے نفع حاصل ہورہا ہے اس وقت تک اس کی تبدیلی جائز نہیں ہے، جیسا کہ شامی میں ہے:

''والثالث أن لا یشترطه أیضا و لکن فیه نفع فی الجملة وبدله خیر منه ریعا ونفعا وهذا لا یجوز استبداله علی الأصح المختار، کذا حرره العلامة قنالی زاده فی رسالته الموضوعة فی الاستبدال. ولکن (أقول فی هذا الزمان إن التبدیل من الأنفع یجوز ولو کان هذا غیر الأصح عند الفقهاء)'' (محبوب علی عفی عنہ)۔

ایسی آمدنی کو مسلمان غرباء تعلیم، علاج، مساجد، مدارس اور نوازلات میں خرچ کیا جائے، اگر ان اوقاف کے شرائط مصارف معلوم ہوں تو ان مصارف کے انواع میں پہلے خرچ کیا جائے۔

الف۔ بہتر صورت یہ ہے کہ بلڈر کو اس میں ملکیت کا حق نہیں دیا جائے، بلکہ اس کے نفع کے ساتھ ایک رقم طے کرلی جائے، اور تعمیر کے بعد اس کی آمدنی میں سے بلڈر کی طے شدہ رقم واپس کردی جائے، ایسا بھی معاملہ ہوسکتا ہے کہ بلڈر تعمیر کے بعد کرائے داروں سے ایک بڑی رقم علاوہ کرائے کے طے کرکے لے لیتا ہے، کرایہ مالک یا متولی وصول کرتا ہے اور بڑی رقم بلڈر لے لیتا ہے، یہ بھی اگر ممکن نہ ہو تو پھر جیسا کہ آپ نے سوال میں لکھا ہے اس وقف کا کچھ حصہ بلڈر کو دے دیا جائے اور بقیہ حصہ کو وقف قرار دے کر اس کی آمدنی شرائط وقف کے مطابق خرچ کی جائے، مگر اس میں پہلے قاضی کی اجازت ضروری ہے، چنانچہ ''قانون العدل والانصاف'' میں صفحہ ۱۷۔ مادہ ۳۶ میں ہے: "ولا تباع إلا تعذر الانتفاع بها"۔ اور خالی زمین کا بھی یہی حکم ہے۔

ب۔ اس سوال کا جواب اوپر مذکورہ جز میں آگیا، نیز "الضرورات تبیح المحظورات" کا قاعدہ بھی جواز کو چاہتا ہے۔

جی ہاں جو زمین مسجد یا قبرستان کی ضرورت سے زائد ہے اس میں مدرسہ تعمیر کیا جاسکتا ہے، لیکن مدرسہ والوں سے ایک قانونی تحریر لینا ضروری ہے کہ اگر کسی وقت مسجد یا قبرستان کو اس زمین کی ضرورت ہوگی تو یہ زمین واپس لے لی جائے گی۔

اگر وہ قبرستان وقف ہیں تو یہ قبضہ ناجائز ہے، بذریعہ عدالت اس قبضہ کو ختم کرایا جائے، اگر وہاں قبرستان کی ضرورت باقی نہیں ہے تو پھر اس کو فروخت کرکے دوسری جگہ جہاں ضرورت ہو اس رقم سے قبرستان بنوادیا جائے، اگر وہ قبرستان وقف نہیں ہے تو اس کے مالک کو اختیار ہے جو چاہے سو کرے، جب کہ وہ میت جو اس میں دفن ہوئی ہے گل سڑ گئی ہو، ''عالمگیری'' میں ہے:

''إذا كان الميت بليا وترابا جاز عليه الزرع والبناء''۔

مسلمانوں پر خصوصاً مسلم ایم۔ایل۔اے اور ایم۔پی وغیرہ اور جو بااثر مسلمان ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ حکومت سے پرزور مطالبہ کریں، اور ان مساجد کو نماز کے لئے کھلوائیں، کیونکہ مساجد نماز اور عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں اور یہ وقف ہوتی ہیں، گورنمنٹ کا مسلمانوں کو ان میں نماز سے روکنا ظلم ہے، قرآن شریف میں ہے:

''ومن أظلم ممن منع مساجد الله''...... إلى آخره'' (سوره بقره:۱۱۴)۔

اگر چندفٹ زمین لینے سے مقاصد وقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ اس جگہ پر قبروں کا نشان ہے تو حفاظت قبرستان اور مصارف قبرستان کے لئے دوکانیں بنانا جائز ہے اور کرائے داران سے پیشگی کرایہ لینا بھی جائز ہے۔

اور ان دوکانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی پہلے قبرستان کی دیکھ ریکھ اور تدفین کی سہولیات بڑھانے میں خرچ کی جائے، اس کے بعد جو رقم بچے وہ کار خیر میں خرچ کی جاسکتی ہے، لیکن اس میں غیر محفوظ قبرستانوں کی حد بندی اور حفاظت کو اولیت دی جائے۔

اس صورت میں مسجد کی عمارت کو دو منزلہ سہ منزلہ کردیا جائے، اگر اس سے بھی کام نہ چلے اور ضرورت ومجبوری دامن گیر ہو تو پھر پرانی قبروں کی جگہ پلر بنا کر تعمیر کردی جائے، تاکہ قبرستان کی کم سے کم جگہ تصرف میں آئے، ویران قبرستان اور زیر استعمال قبرستان میں فرق ہے، جو کھلا ہوا ہے، جدید اور قدیم قبروں کے اندر وقفی قبرستان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اوقاف مسلمین کا متولی غیر مسلم بھی ہوسکتا ہے بشرطیکہ عاقل بالغ اور امانت دار ہو، چنانچہ قانون العدل والانصاف صفحہ ۶۸، مادہ ۱۴۵ پر ہے:

''يشترط لصحة التولية أن يكون القيم عاقلا بالغاً ولا يشترط الحرية ولا الإسلام. فالعبد أهل للنظر في ذاته. وكذا الذمي فتصح توليته للنظر على الوقف''۔

☆☆☆

اوقافی جائداد کی خرید وفروخت، احکام ومسائل

مولانا ڈاکٹر سعود عالم قاسمی [1]

وقف کے لغوی معنی:

''الوقف فی اللغة الحبس عن التصرف''۔ یعنی تصرف سے روکنے کا نام وقف ہے (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۸/ ۱۵۳)

وقف کی اصطلاحی تعریف: وقف کی اصطلاحی تعریف میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وقف کہتے ہیں عین کا روکنا واقف کی ملکیت میں اور نفع کا صدقہ کرنا جس کو چاہے، ''حبس العين على تلك الواقف وتصدق بالمنفعة إلى من أحب إليه''۔

صاحبین کے نزدیک وقف کہتے ہیں عین کا روکنا اللہ تعالی کی ملکیت میں اور اس کے نفع کا صدقہ کرنا جس پر واقف چاہے ''حبس العين إلى حكم ملك الله تعالى والمنفعة على وجه تعود منفعته إلى العباد'' (فتاوی هنديه ۲،۳۵۱)۔

اور ''البحر الرائق'' میں ہے: ''حبس العين إلى حكم ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من أحب'' (البحر الرائق ۵،۲۵۲)۔

وقف کے تام اور لازم ہونے اور نہ ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں وقف دو طریقے سے تام اور لازم ہوتا ہے: (۱) قضاء قاضی کے ذریعہ یعنی قاضی متولی مقرر کردے اور واقف اسے شئ موقوفہ دیدے۔ (۲) وصیت کے ذریعہ یعنی واقف یہ کہہ دے کہ فلاں چیز میرے مرنے کے بعد مسجد کے لئے یا مدرسہ کے لئے وقف ہے۔

''ولا يلزم إلا بأحد الأمرين إما أن يحكم به القاضي أو يخرجه مخرج الوصية'' (شامی ۳،۳۵۸)۔

''إن الإمام لم يقل بكون الوقف جائز غير لازم مطلقا بل هو عنده لازم إذا علقه الواقف بالموت أوقضى به القاضي'' (شامی ۳،۳۶۱)۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقف اس وقت تام اور لازم ہوگا، جبکہ واقف شئ موقوفہ کو متولی کے سپرد کردے تو اس کی ملکیت ختم ہوجائے گی اور وقف تام ہوجائے گا (ہدایہ ۲/ ۶۳۷)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ شئ موقوفہ واقف کی ملکیت سے محض قول سے نکل جاتی ہے، اور وقف تام اور لازم ہوجاتا ہے، مثلاً واقف یہ کہے کہ میں فلاں چیز مسجد یا مدرسہ کے لئے وقف کرتا ہوں، تو محض اس کے قول کی بنیاد پر واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور وقف تام اور لازم ہوجاتا ہے، جس طرح اعتاق سے، محض غلام کو یہ کہہ دینے سے کہ میں نے تجھ کو آزاد کیا تو آزاد ہوجاتا ہے (بنایہ شرح ہدایہ ۶/ ۱۹۴)۔

امام مالک وشافعیؒ اور اکثر اہل علم علماء کا قول بھی امام ابو یوسف کے مطابق ہے اور ان کے یہاں بھی قول سے وقف تام اور لازم ہوجاتا ہے، اور یہی مفتیٰ بہ قول ہے جیسا کہ اوپر کی عبارتوں سے واضح ہے۔

ارکان وقف: وقف ایسے الفاظ خاصہ کے ذریعہ ہو جو وقف پر دلالت کرے، صاحب بحر الرائق نے اس طرح کے الفاظ تقریباً ستائیس ذکر کئے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: البحر الرائق ۵/ ۲۰۵)۔

---

[1] ☆ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔

سبب وقف: تقرب إلی اللہ۔

وقف کے شرائط:

(۱) عقل اور بلوغ کا ہونا، یعنی وقف کرتے وقت واقف کا عاقل وبالغ ہونا۔ (۲) حریت، یعنی واقف کا آزاد ہونا۔ (۳) قربت فی ذاتہ کا ہونا، یعنی شئ موقوفہ کو جس چیز پر وقف کیا جارہا ہو اس کا فی نفسہ باعث قربت ہونا ضروری ہے۔ (۴) وقف کرتے وقت شئ موقوفہ واقف کی ملکیت میں ہو۔ (۵) واقف بے عقلی اور قرض کی وجہ سے محجور نہ ہو۔ (٦) شئ موقوفہ متعین ہو مجہول نہ ہو۔ (۷) منجز ہو معلق نہ ہو، یعنی اس طرح نہ کہا ہو کہ اگر میرا لڑکا آئے گا تو میرا گھر وقف ہے وغیرہ۔ (۸) واقف شئ موقوفہ کو فروخت کرکے اپنے مصرف میں ثمن خرچ کرنے کی شرط نہ لگایا ہو۔ (۹) واقف نے وقف کرتے وقت خیار شرط نہ لگایا ہو۔ (۱۰) تابید یعنی شئ موقوفہ کو ہمیشہ ہمیش کے لئے وقف کیا ہو۔ یہ شرط تمام ائمہ کے نزدیک ہے، لیکن امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس کا وقف کرتے وقت ذکر کرنا ضروری نہیں ہے، فتویٰ بھی امام ابویوسفؒ ہی کے قول پر ہے:

’’الصحيح أن التابيد شرط اتفاقاً لكن ذكره ليس بشرط عند أبي يوسف وعند محمد لابد أن ينص عليه‘‘ (شامی ۳٬۳٦۵)۔

(۱۱) واقف ایسی جہت ذکر کرے جو کبھی بھی ختم ہونے والی نہ ہو۔ (۱۲) غیر منقولی اشیاء ہو جیسے زمین، گھر وغیرہ، منقولی اشیاء نہ ہو، البتہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک منقولی اشیاء کا بھی وقف جائز ہے (فتاویٰ ہندیہ ۲/ ۳۵۷)۔

وقف کے متعلق جوابات دینے سے قبل بطور تمہید تبادلہ وفروخت کے سلسلہ میں کچھ باتیں عرض کی جاتی ہیں جن کو حضرت علامہ شامیؒ نے ذکر کیا ہے تاکہ سوالات کے جوابات سمجھنے میں آسانی ہو۔

تبادلہ اور خرید وفروخت کی قسمیں:

شئ موقوف کے تبادلہ اور خرید وفروخت کی پانچ صورتیں ہوسکتی ہیں:

پہلی قسم: واقف نے بوقت وقف شرط لگادی ہو کہ متولی یا میں خود اگر تبادلہ یا فروخت کی ضرورت محسوس کروں تو تبادلہ یا فروخت کرسکتا ہوں تو ایسی صورت میں شئ موقوف کا تبادلہ اور فروخت جائز ہے (شامی ۳/ ۳۸۷)۔

دوسری قسم: واقف نے تبادلہ کی کوئی شرط نہ لگائی ہو، نہ ہی اپنے لئے اور نہ ہی کسی غیر کے لئے، لیکن شئ موقوف بالکل ناقابل انتفاع ہے تو اس کو فروخت کرکے اس کی جگہ پر دوسرا وقف قائم کرنا یا اس کا تبادلہ کسی دوسری شئ سے درست ہوگا، لیکن تبادلہ یا فروخت کرنے کا اختیار ہر کس وناکس کو نہیں ہوگا، بلکہ قاضی شریعت جو ذی علم باعمل ہو، اور قاضی شریعت کے مفقود ہونے کی صورت میں جماعت مسلمین جو دین دار اور ذی علم ہوں ان کی اجازت سے تبادلہ یا فروخت جائز ہوگا (شامی ۳/ ۳۸۷)۔

تبادلہ وفروخت کی تیسری صورت:

واقف نے شرط نہیں لگائی اور شئ موقوف بالکل ناقابل انتفاع بھی نہیں ہے لیکن جس شئ سے موقوف شئ کا تبادلہ کیا جارہا ہے وہ زیادہ نفع بخش ہے تو اس صورت میں امام ابویوسفؒ کا قول یہ ہے کہ استبدال جائز ہے، بعض حضرات نے اسی پر فتویٰ نقل کیا ہے، لیکن علامہ شامی نے صحیح اور معتمد قول یہ نقل کیا ہے کہ اس طرح کا تبادلہ جائز نہیں ہے اور خود ان کا رجحان بھی عدم جواز کی طرف ہے، اس لئے کہ اس زمانے میں قاضی حضرات میں پوری دیانت داری نہیں تھی جس کی وجہ سے حیلہ بہانہ کے ذریعہ اوقاف میں خرد برد کردیا کرتے تھے، اس طرح اوقاف ضائع ہوجایا کرتے تھے، اور ہر متولی کے اندر اتنی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ وقف کے مسئلہ کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرسکے، اب اس وقت کے حالات کے پیش نظر امام ابویوسفؒ کے قول پر عمل کرنا، جیسا کہ بعض حضرات نے فتویٰ بھی نقل کیا ہے، زیادہ بہتر اور اقرب الی الفقہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی قاضی شریعت جو ذی علم اور باعمل ہو اور قاضی کے مفقود ہونے کی صورت میں جماعت مسلمین جو دین دار اور احوال وقف سے واقف ہو ان کی اجازت ضروری ہوگی۔

استبدال کی چوتھی صورت:

شئ موقوفہ کو غاصب نے غصب کرلیا اور اس پر پانی بہا دیا، یہاں تک کہ وہ دریا ہوگیا اور قابل زراعت نہیں رہا تو غاصب اس کے قیمت کا ضامن ہوگا اور متولی اس سے دوسری زمین خرید کر وقف کرے (فتح القدیر ۵/۵۸، شامی ۳/۳۸۹)۔

استبدال کی پانچویں صورت:

غاصب نے زمین غصب کیا اور وہ انکار کرتا ہے اور اس پر کوئی بینہ نہیں ہے اور غاصب کچھ رقم متولی کو دیتا ہے تو متولی اس رقم سے دوسری زمین خرید لے تو اس طرح کا تبادلہ اور فروخت جائز ہے (شامی ۳/۳۸۹)۔

علامہ شامیؒ کے تبادلہ کی ان صورتوں کو ذکر کرنے کے بعد اب فقہ اکیڈمی کے سوالات کے جوابات پیش خدمت ہیں:

الف۔ ایسے اوقاف جہاں سے مسلمانوں کی آبادی منتقل ہوجانے کی وجہ سے ویران ہوچکا ہو اور دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق اسے بروئے کار لانا ناقابل عمل ہوگیا ہو تو ایسے اوقاف کو فروخت یا تبادلہ کرکے دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو وہاں مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے دوسرا استبدال وقف قائم کیا جاسکتا ہے اس کی گنجائش ہے، یہ صورت علامہ شامیؒ کے ذکر کردہ تبادلہ کی بالکل دوسری صورت ہے۔

''الثانی أن لا یشترطه سواء شرط عدمه أوسکت لکن صار بحیث لا ینتفع به بالکلیة، بأن لا یحصل منه شئ أصلا أو لایفی بمؤنته فهو جائز علی الأصح إذا کان بإذن القاضی ورأیه المصلحة فیه'' (شامی ۳،۳۸۷)۔

ب۔ اسی طرح ویران اوقاف کو کسی فرد یا حکومت کے حوالہ کرکے اس کے عوض دوسری جگہ یا زمین حاصل کرکے متبادل وقف مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کیا جاسکتا ہے ان دونوں صورتوں میں قاضی شریعت یا جماعت مسلمین کی اجازت شرط ہوگی۔

مسجد اور دوسرے اوقاف میں فرق ہے، تبادلہ یا فروخت مسجد کے علاوہ اوقاف میں کیا جاسکتا ہے، مسجد اگرچہ آبادی ختم ہوجانے کی وجہ سے ویران ہوگئی ہو، منہدم ہوگئی ہو پھر بھی وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، عمارت کے منہدم ہوجانے سے مسجدیت ختم نہیں ہوگی۔

''ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الإمام والثانی أبدا إلی قیام الساعة وبه یفتی'' (حاوی القدسی در مختار ۳،۳۷۱)۔

''عند الإمام والثانی فلا یعود میراثا ولایجوز نقله ونقل ماله إلی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أولا وہو الفتوی حاوی القدسی'' (شامی ۳،۳۷۱)۔

ویران اور ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت یا تبادلہ کرنے میں واقف کے مقاصد کی پابندی کرنا ضروری ہے، واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر مسلمانوں کے رفاہی یا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، شامی میں ہے:

متی ذکره للوقف مصرفاً لابدّ أن یکون فیه تنصیص علی حاجة وإن شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع'' (شامی ۳،۳۷۶)۔

''شرائط الواقف کنص الشارع أی فی المفهوم ودلالة وجوب العمل به'' (حواله مذکوره)۔

☆☆☆

اوقاف کی آمدنی دوسرے نوع کے مصارف میں صرف کرنا

مولانا اخلاق حسین قاسمی

موقوف شئ خالص اللہ کی ملکیت ہوتی ہے، اس میں دوام وثبات ہوتا ہے، وقف کی اصل حضرت ابراہیمؑ کی ذات اقدس ہے، انہوں نے بیت اللہ شریف اور خانہ کعبہ کی زمین وقف کر کے خانہ کعبہ تعمیر فرمایا تھا (حاشیہ شرح وقایہ دربیان وقف) علامہ ابن ہمام نے صیغہ تمریض استعمال کرتے ہوئے یہ بات بھی کہی ہے کہ ارض کعبہ اس سے قبل ہی سے موقوف تھی۔

وقف صدقات ہی کی طرح خالص اللہ کی ملکیت ہوتی ہے، پھر اللہ کی جانب سے بندے اس کے مستحق ہوتے ہیں، وقف کے اندر اصل یہی ہے کہ وقف ایسی چیزوں کی ہونی چاہئے جس میں دوام ہوتا ہے اور زوال کو قبول نہیں کرتا ہے، بایں وجہ منقولی اشیاء کا وقف درست نہیں ہے، گرچہ شروط وقیود کے ساتھ منقولی اشیاء کا وقف بھی درست ہے، اب وقف کا جو بھی پہلو اختیار کیا جائے خواہ وہ غیر منقولی ہو یا منقولی ہو، ہر پہلو میں منافع للناس ہی مضمر اور پوشیدہ ہے، پھر وقف میں تملیک شرط ہے یعنی مالک بنانا، جس طرح صدقات وزکوۃ میں تملیک شرط ہے، یہ بات دیگر ہے کہ صورتوں میں قدرے اختلاف اور تفاوت ہے۔

اوقاف کے بارے میں عرض یہ ہے کہ بہت سے وہ اوقاف جو مسلمانوں کی آبادی منتقل ہوجانے کی وجہ سے ویران ہو چکے ہیں، یا وہ اوقاف جہاں بھی ہیں وہاں دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق بروئے کار لانا نا قابل عمل ہو گیا، اس میں مساجد و مقابر خانقاہیں ہر طرح کے اوقاف ہیں، ایسے اوقاف پر حکومت اور غیر مسلمانوں کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہے۔

الف۔ ایسی صورتوں میں ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد وقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے اور منشاء حدیث کے خلاف بھی نہیں ہے۔

ب۔ ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالے کر کے اس کے عوض کسی دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کے جاری کرنے کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔

ویران، نا قابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنے کی گنجائش ہے اس شرط کے ساتھ کہ واقف کے مقاصد کی پابندی دشوار ہو کیونکہ اوقاف کا مقصد منافع للناس ہے، جو ہر دو صورت میں حاصل ہے۔

بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں مساجد ومدارس یا مقابر کے بڑے بڑے اوقاف ہیں، اور مسلمانوں کی آبادی وہاں معمولی رہ گئی ہے، مثلاً ایک مسجد ہے اس کے لئے بہت سی زمینیں اور مکانات وقف ہیں، مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے زیادہ ہے، اس بارے میں دو باتیں پیش نظر رہے:

الف۔ مصارف سے زیادہ آمدنی ہم جنس ہی پر صرف کیا جائے، غیر ہم جنس میں صرف کرنے کی گنجائش نہیں ہے مگر انہیں شرطوں کے ساتھ جو مذکور ہوئے، مثلاً مسجد پر جو اراضی وقف ہیں فی الحال مسجد کی ضروریات سے، بہت زیادہ ہیں تو دوسری مسجد میں صرف کیا جائے گا، دوسری قسم میں مثلاً مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم گاہ قائم کرنا اس کی اجازت حضرات فقہاء کے یہاں نہیں ملتی ہے۔

''لا يجوز تغيير المصرف مع إمكان المحافظة عليه كما لايجوز تغيير الوقف بالبيع مع إمكان الانتفاع به'' (المغنی ۵،۶۳۳)۔

ب۔ واقف کے مقاصد کا لحاظ ممکن حد تک ضروری اور لازم ہے۔

''وينظر فی الوقف من شرطه للواقف'' (المغنی ۵،۶۳۶)۔

بہت سے اوقاف کی آمدنی متعین مصارف سے بہت زیادہ ہے جو سال بسال جمع ہوکر ایک بڑا سرمایہ بنتی جارہی ہے جس کی طویل عرصہ تک حفاظت ایک دشوار مسئلہ، بلکہ خالی از خطرہ نہیں یہ خطرہ حکومت کی دست درازی کا بھی ہے اور منتظمین وغیرہ کے طرف سے بھی، اور نہ ہی روز مرہ کی ضروریات کے اندر اس کے صرف کو سوچا جاسکتا ہے اور نہ ہی آئندہ اصلاح ومرمت وغیرہ کے کاموں کے لئے، ایسی صورتوں میں:

الف۔ اسی نوع کی ضروریات میں صرف کیا جائے۔

ب۔ دوسری نوع کی ضروریات میں صرف کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

''لا يجوز تغيير المصرف مع إمكان المحافظة عليه كما لا يجوز تغيير الوقف بالبيع مع إمكان الانتفاع به'' (المغنی ۵،۶۳۳)۔

بہت سے اوقاف اپنی موجودہ شکل میں کم منفعت بخش ہیں، مثلاً کسی مسجد یا مدرسے پر کوئی مکان وقف ہے جو محلہ کے اندر واقع ہے اس سے معمولی کرایہ ملتا ہے جس سے مسجد یا مدرسہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں مگر ایک صورت میں، اور وہ یہ کہ کسی تجارتی مقام پر کوئی دوکان خرید لی جائے تو اس سے حاصل ہونیوالی آمدنی مکان موقوفہ کی آمدنی سے کہیں زیادہ ہوگی۔

اس بارے میں شرعی حل یہ ہے کہ اگر دوسرے مقام پر دوکان ومکان خریدنے کے نتیجے میں آمدنی کئی گنا زیادہ ہے تو فروخت کیا جاسکتا ہے اور اگر معمولی زیادتی ہے تو فروخت نہیں کیا جاسکتا ہے۔

''وان لم تتعطل مصلحة الوقف بالكلية لكن قلت: وكان غيره أنفع منه وأكثر ردا على أهل الوقف لم يجز بيعه؛ لأن الاصل تحريم البيع، وإنما أبيح للضرورة صيانة لمقصود الوقف عن الضياع'' (المغنی ۵،۶۳۴)۔

باقی وہ اوقاف جن کے مصارف ختم ہوچکے ہیں مثلاً کوئی جاگیر کسی خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی، وہ ختم ہوگیا یا اس کے افراد دوسری جگہ منتقل ہو گئے، یا کسی مسجد ومدرسہ کے لئے وقف تھا اب نہ وہ مسجد ہے نہ ہی مدرسہ۔ ایسی صورتوں میں اسی جیسے مصرف میں متذکرہ اوقاف کے مصارف کو صرف کئے جائیں گے۔

''لا يجوز تغيير المصرف مع إمكان المحافظة كما لا يجوز تغيير الوقف بالبيع مع إمكان الانتفاع به'' (المغنی ۵،۶۳۳)۔

الف۔ صورت مسئولہ کا حل یہ ہے کہ اوقاف خالص اللہ کی ملکیت ہے کسی کو تصرف کا حق نہیں، ہاں صرف اس قدر گنجائش ہے کہ مخدوش اوقاف یا غیر تعمیر اراضی اوقاف زر کے نہ ہونے کے سبب اس کی تھوڑی مقدار فروخت کرنے کی اجازت ہے جس سے مکان یا مسجد تعمیر ہوجائے اور وقف کا مقصد انتفاع للناس پر عمل جاری ہوسکے، بلڈر کا معاملہ گویا مشتری جیسا ہوا، لہذا وقف مخدوش وغیرہ کو قابل انتفاع بنانے کے لئے بلڈر کا یہ عمل درست ہے اور ایسی موقوفہ اشیاء میں اجازت ہے۔

''أو أرض خربت وعادت مواتا ولم تمكن عمارتها أو مسجد انتقل أهل القرية عنه وصار في موضع لايصلى فيه أو ضاق بأهله ولم يمكن توسيعه إلا ببيع بعضه جاز بيع بعضه لتعمريه بقيته، وان لم يمكن الانتفاع بشئ منه بيع جميعه'' (المغنی ۵،۶۳۴)۔

ب۔ اسی طرح کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے محتاج تعمیر مسجد کے لئے وقف شدہ زمین وجائداد کا کوئی حصہ فروخت کرکے مسجد یا مخدوش دوسری عمارت کی تعمیر کی جاسکتی ہے، جبکہ دوسرے ذرائع حاصل نہ ہوں۔

مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین ضرورت سے زائد ہے تو اسی طرح کے مصرف میں اسکو لایا جاسکتا ہے غیر جنس میں نہیں، تفصیل پانچویں سوال کے تحت گزر چکی ہے۔

وہ قبرستان جس کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادی ختم ہوجانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان ہورہا ہے اس بارے میں تو کچھ گفتگو ہی نہیں کیونکہ اپنے مصرف میں استعمال ہورہا ہے۔ گفتگو اس بارے میں ہے کہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا اس کی وجہ سے اب اس کے استعمال اور تدفین پر پابندی لگا

دی گئی ہے اور اس کی وجہ سے قبضہ اور تسلط بڑھتا جارہا ہے۔ یہاں پر دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہی کہ اوقاف جب خراب اور قابل استعمال اپنی موجودہ شکل میں نہ رہے تو اس کو فروخت کر کے کلاً یا بعضاً قابل استعمال بنایا جائے، یہاں پر اگر ایسا کیا جائے کہ فروخت کر کے دوسری جگہ قبرستان کے لئے جگہ خرید لی جائے تو یہاں دو صورت پیدا ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کا قبضہ، تو اس قبضہ کے بعد اس کا فروخت کرنا مشکل مسئلہ ہے، اگر آباد ہونے والے اور قبضہ جمانے والے فروختگی پر تیار بھی ہو جائیں تو انسانی جسم حیات و ممات ہر دو صورتوں میں قابل تکریم ہیں، اب سابق میں مدفون اشخاص جو زیر زمین ہیں ان کی بے حرمتی لازم آتی ہے جو درست نہیں ہے۔ ایسی صورتوں میں صرف ایک صورت رہ جاتی ہے کہ ممکن کوشش کے ذریعہ عائد ہونے والی پابندی کو ختم کیا جائے، اس کے بعد بھی بات نہ بنے تو اس کو فروخت کر کے دوسری جگہ قبرستان کی زمین خرید کر انتفاع کی صورت بنائی جائے۔

''لا يكلف الله نفسا إلا وسعها'' (سورہ بقرہ:۲۸۶)۔

بہت سی قدیم مساجد اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر مثلاً لال قلعہ کے اندر موتی مسجد، اورنگ آباد میں اورنگ زیبؒ کی اہلیہ محترمہ کے مزار کے اردگرد مسجد عالیشان۔ محکمہ آثار قدیمہ کی زیر نگرانی ہیں، ایسی بعض مساجد میں حکومت نے باقاعدہ نماز کی ادائیگی کو منع کر دیا ہے۔ مذہبی چیزوں میں اس طرح کا کوئی حق حکومت کو نہیں ہے، مگر اس کو حاصل کرنا بھی دشوار ہے اور خود سے فروخت کرنا بھی دشوار تر ہے، صرف ایک صورت رہ جاتی ہے وہ یہ کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ یا تو اسمیں نماز پڑھنے کی اذن عام دی جائے، ورنہ تو اسی طرح کی مسجد دوسری جگہ بنادی جائے۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے، جبکہ باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرادی جائے جس کے لئے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے لی جائے اور اس سے یہ کام کرایا جائے جس میں قبرستان کے اطراف کا چند فٹ دوکانوں میں چلا جائے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ سب قبرستان کی حفاظت کے لئے کئے جارہے ہیں، اور یہ تو ایسی صورت ہے کہ قبرستان کے تنگ ہونے کی صورت میں توڑ بھی دیا جاسکتا ہے، اور وقف کی درستگی کے لئے دوسرے ذرائع نہ ہونے کے سبب بعض حصہ کو فروخت کیا جاسکتا ہے تو متذکرہ صورت تو بدرجہ اولی جائز اور درست ہوگی۔ باقی باؤنڈری بن جانے کے بعد دوکان کی جو فاضل آمدنی ہے وہ قبرستان ہی کے مصارف میں خرچ کئے جاویں گے اور اگر اس قبرستان کو ضرورت نہیں تو دوسرے قبرستان پر صرف کیا جائے گا، تفصیل سابق میں گزر چکی ہے۔

آج کل بعض بڑے شہروں میں مسلمان اس صورت حال سے دوچار ہیں کہ وسیع قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ جو ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں یہ تدفین کے لئے آنے والوں کے لئے بنائی گئی ہو کہ وہ وہاں نماز ادا کرسکیں۔ اب اس علاقہ میں آبادی بڑھ گئی ہے اور قبرستان میں بھی تدفین کا سلسلہ جاری ہے باقی آبادی کے بڑھ جانے کے نتیجے میں مسجد قبرستان کے توسیع کا جو مسئلہ ہے وہ اس لئے درست نہیں کہ ظاہر حال بتارہا ہے کہ قبرستان کی زمین میں مسجد ہے۔ ہاں اگر صورتحال سے معلوم ہو جائے کہ اتنی سی زمین مسجد ہی کے لئے وقف ہے تو تنگی کے پیش آنے کی بنا پر مسجد کی زمین کو فروخت کر دیا جائے یا اسکو علی حالہ باقی رہنے دیا جائے اور دوسری جگہ دوسری مسجد بنانے کی سبیل نکالی جائے اور عام طور پر جہاں کہیں قبرستان کے اندر نماز پڑھنے کی جگہ متعین کر دی جاتی ہے وہ مسجد ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کا حکم دار الصلوۃ کا ہوتا ہے۔

اوقاف کی تولیت کے لئے مسلم ہونا ضروری نہیں، اس لئے ہندوستان کی بعض ریاستوں میں ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد پر بھی اراضی وقف کی ہیں، ہندو واقف ہونے کے باعث ہندو وقف بورڈ ہی مسجد سے متعلق تمام نظم و نسق انجام دیتا ہے، شرعاً اس کی اجازت ہے، چنانچہ ''فتاوی ہندیہ'' (۳۱۵/۲) میں اس بارے میں صراحت ہے کہ واقف کے لئے اسلام کے ساتھ متصف ہونا ضروری نہیں تو متولی ہونے کے لئے بدرجہ اولی ضروری نہیں۔

☆☆☆

اوقاف میں واقف کے مقاصد کی پابندی

مولانا شمس پیرزادہ [1]

الف۔ کیا ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے؟

یہ اوقاف جب مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ویران ہو چکے ہیں تو ان کو قائم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں، ان اوقاف کی زمینوں کی فروخت سے جو آمدنی ہو اس سے دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کر دینا چاہئے، اس سلسلہ میں واقف کے مقاصد کا خیال رکھنا ضروری ہے الا یہ کہ کوئی مقصد غیر شرعی ہو۔

ب۔ کیا ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے؟

مساجد کا تقدس اور حرمت سب سے بڑھ کر ہے، قبرستان اور مقبروں کو مساجد کے مقام پر نہیں رکھا جاسکتا۔ مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہوتی ہے، لیکن قبرستان اور مقبرے ایک مدت گزرنے کے بعد ضرورتاً ختم کئے جاسکتے ہیں۔ ایسا کرنے میں شریعت کا کوئی حکم مانع نہیں ہے۔

واقف کے مقاصد کی پابندی ضروری ہے، الا یہ کہ کوئی مقصد خلاف شرع ہو، ایسی صورت میں کوئی جائز صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔

الف۔ ایسی صورت میں زائد اراضی پر مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے کیونکہ مسجد کے احاطہ میں مدرسہ کا ہونا ایک معروف بات ہے اسکے لئے واقف کی طرف سے صراحت کی ضرورت نہیں۔

مغنی میں ہے: ''وما فضل من حصر المسجد وزیته ولم یحتج إلیه جاز أن یجعل فی مسجد آخر أو یتصدق من ذلك علی فقراء جیرانه وغیرهم'' (مغنی ۵/۶۳۵)۔

مسجد کی چٹائیوں اور تیل میں جو بچ گیا اور اس کی ضرورت نہیں رہی اس کو دوسری مسجد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، یا قریب کے فقراء وغیرہ پر صدقہ کیا جا سکتا ہے۔

اور فقہ السنہ میں علامہ ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

''وما فضل من ریع الوقف واستغنی عنه، فإنه یصرف فی نظیر تلك الجهة کالمسجد إذا فضلت غلة وقفه عن مصالحه صرف فی مسجد آخر؛ لأن الوقف غرضه فی الجنس والجنس واحد'' (فقه السنة: السید سابق ۳، ۵۲۹)۔

(وقف کی آمدنی سے جو بچ گیا اور اس کو خرچ کرنے کی ضرورت نہیں رہی اسے اس جیسی دوسری چیز پر صرف کیا جاسکتا ہے، مثلاً مسجد کہ اگر اسکے وقف کی آمدنی اسکے مصالح پر خرچ کرنے کے بعد بچ جاتی ہے تو اسے دوسری مسجد پر صرف کیا جاسکتا ہے، کیونکہ واقف کا مقصد جنس پر صرف کرنے سے ہے اور اس صورت میں جنس ایک ہی رہتی ہے)۔

ب۔ جو چیز مسجد کے لئے وقف کی گئی اس کی آمدنی مسجد ہی پر صرف ہونی چاہئے الا یہ کہ مسجد کے احاطہ میں مدرسہ ہو جیسا کہ معروف ہے۔ فاضل آمدنی کو کسی دوسری مسجد پر صرف کرنا چاہئے، اور اگر ایسی صورت ممکن نہ ہو تو البتہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے)۔

الف۔ جی ہاں بالکل جائز ہوگا۔ کیونکہ واقف کا اصل منشاء جنس سے ہے اور اس صورت میں جنس ایک ہی رہتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو فاضل آمدنی کا کوئی

---

[1] ادارہ دعوۃ القرآن ممبئی۔

مصرف نہیں رہ جاتا۔

ب۔ واقف نے جس مقصد کے لئے وقف کیا ہے اس سے ملتا جلتا مقصد اگر پورا کیا جاسکتا ہو تو اسے پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو پھر اسے دیگر ملی، دینی وعلمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

ایسی صورت میں مکان فروخت کر کے دوکان خرید لینے کی گنجائش ہے، کیونکہ موجودہ آمدنی وقف کے لئے ناکافی ہو رہی ہے۔ لیکن یہ صورت اختیار کرنے سے پہلے اس بات کی طرف سے اچھی طرح اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ دوکان مستقل طور سے وقف رہے گی۔

ایسے اوقاف کی آمدنی کو ان سے ملتے جلتے مقاصد پر صرف کیا جاسکتا ہے، مثلاً ایک مسجد کی آمدنی کو دوسری مسجد پر اور ایک مدرسہ کی آمدنی دوسرے مدرسہ پر تاکہ وقف کا اصل مقصد پورا ہو۔

الف۔ اوقاف کے مقاصد کو ممکن حد تک پورا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ مخدوش عمارتوں کو اگر ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ڈھیر ہو جائیں گی اور اوقاف کا زبردست نقصان ہوگا۔ اس نقصان سے بچانے کے لئے بلڈر کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا کہ وہ اپنے خرچ پر عمارت تعمیر کر دے اور اس کے ایک دو منزل اپنے لئے رکھ لے جائز ہو سکتا ہے۔

ب۔ جی ہاں اس صورت میں جائز ہوگا۔

جی ہاں کی جاسکتی ہے۔ اور مسجد کے احاطہ میں بالعموم مدرسہ ہوتا ہی ہے اس لئے اس معروف شکل کا جواز واضح ہے۔

جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا استعمال قبرستان کے طور پر نہ ہو رہا ہو اور اس پر ناجائز قبضہ کا خطرہ ہو تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

اس صورت میں قبروں کو ڈھا دینا ہوگا اور زمین کو فروخت کر کے اسکے بدل کے طور پر مسلمانوں کی آبادی میں جہاں ضرورت ہو نیا قبرستان بنانا ہوگا یا اس رقم کو دوسرے قبرستانوں کی مرمت وغیرہ پر صرف کرنا ہوگا۔

اگر مسجد مخدوش ہے اور اس کی وجہ سے حکومت نے اس کا استعمال روک دیا ہے تو اور بات ہے، ورنہ حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ قدیم مساجد میں نماز کی ادائیگی سے مسلمانوں کو روک دے۔

قبرستان میں جن کے مردے دفن ہوتے ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ فنڈ جمع کر کے قبرستان کے لئے باونڈری بنادیں اور یہ کام کسی وقف کی فاضل آمدنی سے بشرطیکہ وہ واقف کے مقصد کے خلاف نہ ہو کیا جاسکتا ہے۔

قبرستان تو آخرت کو یاد دلانے والی جگہ ہے اور دوکانیں دنیا کو یاد دلانے والی، اس لئے قبرستان کے احاطہ میں دوکانوں کی تعمیر کسی طرح صحیح نہیں۔

قبرستان کی مسجد کی توسیع کا حکم:

زمین اصلاً قبرستان کے لئے وقف ہے اس لئے اس میں کمی کرنا کسی طرح مناسب نہیں، البتہ مسجد پر منزلیں چڑھائی جاسکتی ہیں۔

نہیں، غیر مسلموں کی تولیت میں مساجد وغیرہ اوقاف کا رہنا ہرگز درست نہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

"ماکان للمشرکین أن یعمروا مساجد اللہ شاھدین علی أنفسھم بالکفر" (توبہ۱۷)۔

(مشرکین اس لائق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجد کو آباد کریں جب کہ وہ خود اپنے اوپر کفر کی گواہی دے رہے ہیں)۔

☆☆☆

وقف جائداد کے تبادلہ کا حکم اور آمدنی کا مصرف

مفتی شیر علی گجراتی [1]

الف۔ ایسی صورت میں ایسے اوقاف کو باستثناء مسجد فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے، جو اسی جنس کا ہو۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ''قوله وجاز شرط الاستبدال به اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه، الأول: أن يشرطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقا. والثاني: أن لايشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لاينتفع به بالكلية، بأن لايحصل منه شئ أصلا أو لا يفي بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه، والثالث: أن لايشرطه أيضا ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعا ونفعا وهذا لايجوز استبداله على الأصح المختار كذا حرره العلامة قنالى زاده فى رسالته الموضوعة في الاستبدال الخ'' (شامی ۶،۵۸۳)۔

صاحب ''البحر الرائق'' فرماتے ہیں: ''نقل عن الشيخ الإمام الحلوانى فى المسجد والحوض إذا خرب ولايحتاج إليه لتفرق الناس عنه انه تصرف أوقافه إلى مسجد آخر أو حوض آخر'' (۵،۲۵۲)۔

''شروط الاستبدال: إذا كان الوقف عقارا غير مسجد فالمعتمد أنه يجوز للقاضي الاستبدال به للضرورة بلا شرط الواقف بشروط ستة:

۱۔ أن يخرج الموقوف على الانتفاع به بالكلية اى يصبح عديم المنفعة

۲۔ ألا يكون هناك ريع للوقف يعمر به۔

۳۔ ألا يكون البيع بغبن فاحش۔

۴۔ أن يكون المستبدل قاضي الجنة، وهو ذو العلم والعمل لئلا يؤدى الاستبدال إلى إبطال أوقاف المسلمين كما هو الغالب في الزمن الاخير۔

۵۔ أن يستبدل به عقار لا دراهم و دنانير لئلا يأكلها النظار ولأنه قل أن يشترى بها الناظر بدلا وجاز بعضهم الاستبدال به نقودا مادام المستبدل قاضي الجنة۔

۶۔ أن لا يبيعه القاضي لمن لا تقبل شهادته له ولا لمن له عليه دين خشية التهمة و المحاباة فإذا لم تتوافر هذه الشروط كان بيع الوقف باطلا لا فاسدا وإذا صح بيع الحاكم بطل وقفيته ما باعه ويبقى الباقي على ما كان (الفقه الإسلامي وأدلته ۸،۲۲۱،۲۲۲)۔

مذکورہ بالا شروط کو ملحوظ رکھتے ہوئے فروخت کرنے کی اجازت ہے اور متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے۔

ب۔ جواب نمبر اول میں ذکر کردہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کیا جا سکتا ہے۔

[1] دار العلوم فلاح دارین ترکیسر، گجرات۔

''وفی القنیة مبادلة دارالوقف بدار أخری إنما یجوز إذا کانتا فی محلة واحدة أو محلة أخری خیرا، إن أرض الوقف لوقل ریعها فللقیم أن یبیعها و یشتری بثمنها أرضا أخری ریعها أکثر نفعا للفقراء، فجوز استبدال الأرض بالأرض'' (بزازیہ هامش علی هندیه ۶،۲۵۴)۔

اور مسجد میں کسی طرح تبدیلی جائز نہیں ہے۔

''ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الإمام والثانی أبدا إلی قیام الساعة، وبه یفتی حاوی القدسی'' (شامی ۶،۵۴۸)۔

وقف کے بعد مصرف بدلنا خود واقف کے لئے بھی جائز نہیں ہے، اس لئے ایک مصرف سے استغناء کے وقت اسی مصرف کے مماثل میں صرف کرنا چاہئے، وقف کے احکام بہت نازک ہیں، واقف کی غرض اور مقصد کا لحاظ اور اس کی عائد کردہ شرائط کی پابندی ضروری ہے۔ "شرط الواقف کنص الشارع"۔

''(اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف علیه) بسبب خراب وقف أحدهما وجاز للحاکم أن یصرف من فاضل الوقف، الآخر علیه لأنهما حینئذ کشئ واحد وإن اختلف أحدهما بأن بنی رجلان مسجدین أو رجل مسجدا ومدرسة ووقف علیهما أوقافا (لا) یجوز ذلك أی الصرف المذکور'' (شامی ۴،۳۶۰ مطبوعہ کراچی)۔

اس لئے ان اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

الف۔ فقہاء کرام کہتے ہیں کہ ایک وقف کی آمدنی دوسرے وقف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، لیکن فقہاء کرام یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر ایک مسجد کا سامان بیکار پڑا ہو اور ضیاع کا اندیشہ ہو تو اقرب المساجد میں منتقل کرنا جائز ہے۔

''(حشیش المسجد وحصیره مع الاستغناء عنهما) وکذا (الرباط والبئر إذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (إلی أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إلیه)'' (شامی ۴،۳۵۹)۔

اور ساتھ ساتھ حضرت علامہ یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں کہ مسجد کا سامان اگر استعمال سے زائد ہو تو اسی مسجد میں جو مدرسہ یا مکتب ہو تو اس مسجد کا سامان اس مکتب ومدرسہ میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اس پر نظر کرتے ہوئے موجودہ دور میں اسی مسجد ومدرسہ کے متولی اور کمیٹی والے دوسری جگہ جہاں ضرورت ہو مسجد ومدرسہ کی آمدنی سے وہی مسجد ومدرسہ اپنے زیر نگرانی قائم کر سکتے ہیں اور وہ مدرسہ ومکتب اسی مسجد کے لوازمات میں ہوں گے، یہ بندہ کی رائے ہے۔

ب۔ جب ایک وقف کی آمدنی دوسرے وقف میں استعمال کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے تو پھر رفاہی کاموں میں کیسے استعمال کی جاسکتی ہے۔

الف، ب۔ ایک وقف میں استغناء کے وقت اسکے مماثل دوسرے ضرورت مند اوقاف میں خرچ کر سکتے ہیں "الأقرب فالأقرب" کی رعایت کرتے ہوئے۔

''حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما وکذا الرباط والبئر إذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلی أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إلیه. لف ونشر مرتب وظاهره أنه لایجوز صرف وقف مسجد خرب إلی حوض و عکسه وفی شرح الملتقی یصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (شامی مطبوعہ کراچی ۴/۳۵۹)۔

متولی وقف بسبب وجوہ مذکور فی السوال ایسا کر سکتا ہے بشرطیکہ یہ تبدیلی انفع ہو اور کسی خطرہ کا اندیشہ نہ ہو۔

''وفی الأشباه أیضا: یتعین الافتاء فی الوقف بالأنفع له کما له فی شرح المجمع و حاوی القدسی''۔

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''وفی القنیة مبادلة دار الوقف بدار أخری إنما یجوز إذا کانتا فی محلة واحدة أو محلة

أخرى خيرا وبالعكس لا يجوز'' (۳۸۶/۴ مطبوعہ کراچی)، ''إن أرض الوقف لو قل ريعها فللقيم أن يبيعها ويشتري بثمنها أرضا أخرى ريعها أكثر نفعا للفقراء، فجوز الاستبدال الأرض بالأرض'' (بزازية الهامش على الهنديه ۶،۲۵۴)۔

جو جائیداد وغیرہ کسی خاص خاندان پر وقف ہوا اور وہ خاندان ختم ہو چکا ہو تو اس جائیداد کی آمدنی دوسرے فقراء پر جو ختم ہونے والے خاندان سے رشتہ میں قریب ہوں ان پر خرچ کیا جائے، اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں آمدنی منتقل ہونے والے خاندان ہی کو پہونچایا جائے گا، اور مسجد ومدرسہ کے ختم ہونے کی صورت میں موقوفہ جائیداد کی آمدنی اقرب المساجد والمدارس جو محتاج ہوں ان پر صرف کیا جائے۔

الف۔ وقف جائیداد کا کل یا بعض حصہ ختم کرنا جائز نہیں ہے۔ سوال مذکور کے جواز کی صورت یہ ہے کہ بلڈر سے اس طرح معاملہ کیا جائے کہ یہ مخدوش مکان کو از سر نو تعمیر کرنے میں آپ کا کتنا خرچ ہوگا، جتنا خرچ ہوگا اسکو ہم جتنی نقد رقم موجود ہے وہ ادا کردیں گے اور بقیہ رقم اس مکان کے کرایہ سے آپ وصول کرتے رہیں گے جب آپ اپنی خرچ کردہ رقم وصول کرلیں تو آپ اس مکان سے دست بردار ہو جائیں گے، یا کوئی صاحب خیر قرض حسن کے طور پر اس بلڈر کی طے شدہ کل رقم ادا کردے اور بعد میں وہ اس بلڈنگ کے کرایہ سے رقم وصول کرلیں۔ یا اس بلڈنگ کو قرض دینے والے کو اتنی مدت تک کے لئے کرایہ پر دیدے جس میں اپنا قرض وصول کرلیں بشرط اعتماد ''لأن استبقاء الوقف واجب ولا يبقى إلا بالعمارة'' (بدائع الصنائع ۶،۲۲۱)۔

ب۔ وقف شدہ زمین وجائیداد کو فروخت کر کے اسی وقف کے لئے نئے مکانات تعمیر کرنا اور مخدوش حال مکانات کی تعمیر کرنا، نیز اسی طرح مسجد پر وقف شدہ زمین وجائیداد فروخت کرنا مسجد کی مرمت کے لئے جائز نہیں ہے، فقہاء کرام کی عبارتوں سے جیسے صاحب بزازیہ (۲۷۱/۶) کی عبارت: ''بيع عقار المسجد لمصلحته لا يجوز وإن باع بأمر القاضي وإن باع بعضه لإصلاح باقيه لخراب كله جاز'' اس سے اگر چہ صورت مذکورہ میں فروخت کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب اسلامی حکومت تھی اور قضاۃ و منتظمین میں دیانتداری غالب تھی اور قاضی کے پاس وسیع اختیارات تھے، جب کہ موجودہ دور میں ان چیزوں کا فقدان ہونے کی وجہ سے فروخت کی اجازت دینا ضرر سے خالی نہیں، اور پھر تو اوقاف کے فروخت ہونے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ لہذا میرے خیال میں اس کی اجازت نہ ہونی چاہئے اور مسائل کا یہ جملہ کہ تعمیر اوقاف کے بعض حصے کو فروخت کئے بغیر تعمیر ممکن نہیں یہ بات میرے نزدیک غیر مسلم ہے، اس لئے کہ اصحاب خیر بہت ہیں جو مساجد وغیرہ کی تعمیر کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔

آئندہ کی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے ضرورت سے زائد زمین پر مدرسہ قائم کرنا جائز ہے کیونکہ اسمیں نمازیوں کی کثرت ذکر اللہ، تعلیم کے ساتھ ساتھ مسجد وقبرستان کی حفاظت بھی ہے اور تعامل بھی اسی پر چلا آرہا ہے، جیسے مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی، مدرسہ شاہی مراد آباد، مدرسہ منبع العلوم گلاوٹی بلند شہر، وغیرہ یہ سارے مدارس قدیم قبرستانوں کی اراضی میں قائم ہیں۔

ایسے قبرستان کی زمین میں مسجد یا دینی مدرسہ قائم کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ بہت سی مساجد اور مدارس پرانے قبرستانوں میں تعمیر کئے جاچکے ہیں نیز قدیم مقبروں میں مساجد ومدارس بنانے کا تعامل امت میں چلا آرہا ہے اور کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا خود حرم شریف میں مطاف (طواف کی جگہ) میں بھی انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی قبریں ہیں، جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہو جانے کی وجہ سے انکی اراضی خالی پڑی ہیں، لیکن ان مسلمانوں کی ملکیت باقی ہو تو ان زمینوں کو بطور قبرستان استعمال کرنے کے لئے انکی اجازت ضروری ہے۔ صراحۃً ہو یا دلالۃً۔

اگر قبرستان میں عمل تدفین جاری ہو تو قبرستان کی حفاظت کے لئے کنارے پر دوکانیں اسی صورت میں بنائی جاسکتی ہیں، جبکہ قبرستان اتنا وسیع ہو کہ جس جگہ پر دوکانیں بنائی جارہی ہوں نہ تو اس جگہ کی فی الحال عمل تدفین کے لئے ضرورت ہو نہ آئندہ اس کی ضرورت کی توقع ہو۔

اولاً باؤنڈری بنانے کی کوشش کی جائے، خود مسلمان آپس میں چندہ کر کے یا اصحاب خیر کی طرف رجوع کر کے ان کو اس کار خیر کی طرف متوجہ کیا جائے، اور اگر اس طرح بھی ممکن نہ ہو سکے تو پھر دفن اموات کے جاری ہونے کی صورت میں وہ زمین جس میں نہ فی الحال تدفین ہو رہی ہو اور نہ آئندہ متوقع ہو دوکانوں کو تعمیر کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ قبرستان ہی کی ملک ہے، اور فاضل آمدنی کو محتاج اقرب المقابر پر صرف کیا جائے گا۔

درمختار میں ہے: ''(ومثله) حشيش المسجد و حصيره مع الاستغناء عنهما، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما،

فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه الخ. قال الشامي: لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض و عكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (شامی ۴،۳۵۹)۔

حتی الامکان قبرستان کے باہر کہیں قریب میں مسجد کے لئے زمین حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو قدیم قبرستان کی زمین مسجد میں اس شرط کے ساتھ شامل کی جاسکتی ہے کہ آئندہ تدفین کے لئے زمین تنگ نہ ہونے پائے اور جدید قبروں کا احترام بہر حال ضروری ہے۔

''فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين'' (عمدة القاری ۴،۱۷۹)۔

(مساجد و مقابر اور ایسے ہی اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اوقاف کا غیر مسلم ادارہ کی تولیت میں ہونا مالی حیثیت تک تو جائز ہے)۔

''ويشترط للصحة بلوغه وعقله... ولا تشترط الحرية والإسلام'' (البحر الرائق ۵،۲۲۶)۔

''ويشترط للصحة بلوغه وعقله لا حريته وإسلامه... ولو كان عبدا يجوز قياسا واستحسانا لأهليته في ذاته بدليل أن تصرفه الموقوف لحق المولى ينفذ عليه بعد العتق لزوال المانع بخلاف الصبي. ثم الذمي في الحكم كالعبد'' (شامی ۴،۵۷۹)۔

فقہ کی ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ تولیت کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔ تو جب ابتدأ مسلمان ہونا شرط نہیں تو بقائً بقاعدہ "البقاء أسهل من الابتداء" بدرجہ اولی شرط نہ ہوگا، لیکن جہاں تک مسجد اور مدرسہ کے داخلی اور مذہبی امور میں نظم ونسق کا تعلق ہے مثلاً امام ومؤذن، مدرس اور اسی طرح نصاب تعلیم مقرر کرنا اس کی تولیت غیر مسلم ادارہ کے تحت رکھنا جائز نہیں ہے یہ تو صرف مسلمان ہی کرسکتا ہے۔

"إنما يعمر مساجد الله من آمن بالله واليوم الآخر..." (سورۃ التوبۃ: ۱۸)۔

☆☆☆

مسجد کی اراضی کا تعلیمی اور رفاہی مقاصد کے لئے استعمال

مولانا سلطان احمد اصلاحی ...... ادارہ علم وادب علی گڑھ

الف، ب۔ وقف کے سلسلے میں مسئلہ معروف ہے کہ: ''الوقف لایباع ولا یوھب ولا یورث'' (ھدایہ ۱، ۶۱۷)۔

پنجاب وہریانہ ودہلی ومغربی (یوپی) کے بھی مسجد وغیر مسجد جملہ اوقاف کی نسبت اس پر ہی عمل مناسب ہے، اس وقت جبکہ صورت حال یہ ہے کہ مسلمان متولیوں اور ٹرسٹیوں کی طرف سے ان کا دیانتدارانہ انتظام بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ ان میں خرد برد عام اور مالی بدعنوانیاں اس کے نظام کا حصہ بن چکی ہیں، ان حالات میں ان کی فروخت اور منتقلی دوسرے لفظوں میں ان اوقاف کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مخصوص حالات میں یہ اوقاف مسائل سے گھرے ہوئے ہیں، لیکن ان کی فروخت ان کے مسائل کا کسی طرح حل نہیں ہے۔ بحمد اللہ ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی ہونا شروع ہوگئی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ پوری امت کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ میں ان کے لئے الگ متحرک (Cell) بنایا جائے اور مسلمانوں کی تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں اور قوموں کے پروگراموں کا یہ لازمی حصہ بنیں۔ خلاصہ یہ کہ فروخت اور منتقلی کے بجائے ملت اسلامیہ ہند یہ ان کی حفاظت پر کمربستہ ہو، اس عمل میں امکانی کچھ اوقاف کا ضائع ہو جانا اس کے مقابلہ میں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ عمومی خرید وفروخت کے ذریعہ بڑے پیمانے پر ان کے ضیاع کا خطرہ مول لیا جائے۔

الف۔ مسجد پر وقف اراضی میں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم نہیں کیا جاسکتا، الا یہ کہ واقف کی طرف سے وقف نامہ میں اس کی صراحت ہو تو اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

ب۔ مسجد کے لئے وقف اراضی کی آمدنی کو تعلیمی اور رفاہی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا، متعلقہ مسجد سے زائد ہونے پر اسے قریب کی مستحق مساجد پر صرف کیا جائے۔

الف، ب۔ ہاں ایسے اوقاف کی زائد آمدنی کو الف وب میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

وقف مکان کو فروخت کرکے دوکان خریدنے کے بجائے اسی مکان کو دو منزلہ سہ منزلہ کر دیا جائے اور کرایہ بڑھا کر آمدنی بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

جاگیر اگر فقراء کے لئے وقف تھی تو دیگر مسلمان فقراء ومساکین پر، اور اگر مسجد ومدرسہ پر وقف تھی تو دیگر مدارس اور مساجد پر اس کی آمدنی کو صرف کیا جائے۔ میکانزم باہمی مشورہ سے طے کیا جائے۔

الف۔ اوقاف کی کسی عمارت یا اس کی کسی زمین کا کوئی حصہ کسی طور پر دینا درست نہیں۔ پھیلے ہوئے اوقاف کی زائد آمدنی سے مخدوش عمارت کی مرمت اور خالی زمین سے انتفاع کی صورتیں پیدا کی جائیں۔

ب۔ وقف جائداد کا کوئی حصہ فروخت کرکے ایسا کوئی کام نہیں کیا جائے۔ یہ سارے کام اوقاف کی زائد آمدنی سے ہوں۔

مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین پر مدرسہ کی تعمیر نہیں کی جاسکتی، ہاں ان کے لئے تعمیر شدہ عمارت مدرسہ کو کرائے پر دی جاسکتی ہے۔

غیر آباد قبرستان کی حفاظت کو قریب اور وہ کفایت نہ کرے، تو اس سے قریب کی مسلمان آبادی یقینی بنائے۔ قبرستان کا ہر حال میں آبادی کے اندر آجانا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں علی گڑھ میں سول لائن علاقہ میں ایسے کئی قبرستان ہیں ان کی حفاظت کو مستحکم کیا جائے۔ قلب شہر یا کسی نازک مسئلہ پیش آجانے کی صورت میں جب کہ اس کی حفاظت بالکل ناممکن ہو وہاں دوکانیں بنواکر کے اس کی آمدنی کو عامۃ المسلمین کے لئے وقف کر دیا جائے۔

ایسی مساجد میں حکومت کی لگی پابندی کو مسلمانوں کو ختم کرانے کی کوشش کرنی چاہئے، البتہ حکمت، تدبر اور صبر وتحمل کے رشتے کو مضبوطی سے تھامے رکھا جائے۔

ہاں یہ درست ہے، اس طرح قبرستان کے اطراف دوکانیں بنوائی جاسکتی ہیں۔

قبرستان کی مسجد میں توسیع نہ کی جائے اور قبروں سے تعرض نہ کیا جائے۔ آبادی کی مسجد کی ضرورت کو دوسرے ذریعہ سے حل کیا جائے۔

ہاں۔ ایسے اوقاف غیر مسلم کی تولیت میں رہ سکتے ہیں۔ مساجد میں غیر مسلموں کی اس درجہ شرکت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ☆☆☆

اوقاف کی آمدنی کے مصارف اور استعمال

مفتی شکیل احمد سیتاپوری[1]

الف، ب۔ جو اوقاف ویران ہو چکے ہیں اور وہاں سے مسلمان منتقل ہو گئے ہیں یا جن پر حکومت یا غیر مسلموں کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہے یا جہاں واقف کے مقاصد کی تحصیل تقریباً ناممکن ہو گئی ہے، ان اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد کا خیال رکھتے ہوئے مسلمانوں کی آبادی میں متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے، نیز تفصیل مذکور کے مطابق اراضی کا اراضی سے تبادلہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

واقف کے مقاصد کی پابندی ضروری ہے، تعلیمی یا رفاہی ادارے نہیں قائم کئے جا سکتے۔

''شرط الواقف کنص الشارع اتفق الفقهاء على ذه العبارة'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۸، ۱۷۸)، (فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ وقف کرنے والے کے شرائط نص شارع کی طرح قابل رعایت ہیں)۔

الف، ب۔ ''وما فضل من حصر المسجد وزيته ولم تحتج إليه جاز أن يجعل في مسجد آخر أو يتصدق من ذلك على فقراء جيرانه وغيرهم، وأرى أنه قد احتج بكسوة البيت إذا انخرقت تصدق بها'' (المغنی ۵، ۶۳۵)۔

(مسجد کی چٹائیاں اور اس کا تیل اگر ضرورت سے زائد ہو تو دوسری مسجد میں صرف کیا جا سکتا ہے، یا فقراء پر صدقہ کر دیا جائے، جیسا کہ خانہ کعبہ کا پردہ جب بوسیدہ ہو جاتا ہے تو اس کو صدقہ کر دیا جاتا ہے۔

مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی کاموں میں نہیں صرف کی جا سکتی۔

الف۔ ایسی جمع شدہ زائد آمدنی اسی نوع کے دوسرے اوقاف میں خرچ کی جا سکتی ہے۔

ب۔ دیگر ملی و دینی، علمی کاموں اور مساجد میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے، یہ سب امور قاضی یا شرعی کمیٹی کی اجازت سے انجام دیئے جائیں۔

☆☆☆

---

[1] لکھنؤ۔

مساجد ومدارس اور اوقاف کی آمدنی عصری تعلیم پر خرچ کرنا

مفتی عبدالرحیم قاسمی [۱]

الف۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی شئی شرعی قواعد کے مطابق وقف ہوجائے تو اس کی بیع ناجائز ہوتی ہے، جس زمین کو شرعی مسجد بنادی گئی اس کی بیع کسی حال مین درست نہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وقف اور مسجد بن چکی، جائداد منقولہ جو کہ مسجد کی ملک ہے وہ اس بارے میں مسجد کے حکم میں نہیں، جب مسجد غیر آباد ہوجائے اور کوئی توقع اس کی آبادی کی نہ رہے اور اس جائداد کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کی بیع درست ہے، اور ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ بعینہ اس جائداد کو کسی قریبی مسجد میں صرف کیا جائے، اگر یہ دشوار ہو تو اس کو فروخت کرکے اس کی قیمت کو دوسری مسجد میں صرف کیا جائے، اور غیر آباد مسجد کا احترام باقی رکھنے کے لئے اگر اس کی چہار دیواری نہ ہو تو اس کا احاطہ بنایا جائے، جو جائداد غیر منقولہ زمین وغیرہ مسجد کے لئے خریدی گئی، مسجد کے غیر آباد ہونے یا ضرورت شدیدہ پیش آنے کے وقت اس کی بیع اہل محلہ کی رائے سے درست ہے، اور جو جائداد غیر منقولہ خود واقف نے وقف کی ہے اس کی بیع درست نہیں، بلکہ مسجد کے غیر آباد ہونے کی صورت میں اس جائداد کی آمدنی کو دوسری قریبی مسجد پر اہل محلہ کی رائے سے صرف کرنا درست ہے (فتاوی محمودیہ ۱۹/۶)۔

اصل اور راجح تو عدم جواز نقل ہے، لیکن بعض علماء ضرورت میں جواز کے قائل ہوئے ہیں، سو بلا ضرورت شدیدہ تو اصل مذہب کو چھوڑنا جائز نہیں، اور ضرورت شدیدہ میں گنجائش ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب ایک مسجد مستغنی عنہ ہوجائے تو اس کا وقف دوسری مسجد میں صرف کرنا بھی جائز ہے (امداد الفتاوی ۲/۷۲۳)۔

ب۔ جس جگہ مسجد قائم ہے اور جس زمین کے رقبہ کو مسجد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس کی عمارت قائم رہے یا منہدم ہوجائے، اس میں کوئی نماز پڑھے یا نہ پڑھے، اس جگہ کی بستی آباد رہے یا ویران ہوجائے، ہر حال میں وہ جگہ علی الدوام تا قیامت مسجد ہی رہے گی دوسری زمینوں کی طرح فنا نہ ہوگی بلکہ جنت میں پہنچادی جائے گی، لہذا صورت مسئولہ میں حتی الامکان مسجد کو اپنی حالت پر برقرار رکھنے کی سعی بلیغ کی جائے اور محفوظ کردیا جائے کہ بے ادبی سے مصئون ومحفوظ رہے۔ اگر سامان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے دوسری مسجد کے لئے ہٹالیا جائے، اگر عمارت توڑ دئے جانے کا یقین ہو تو اسے بھی توڑ کر دوسری مسجد کے لئے رکھ لیا جائے، اور اصل جگہ محصور کرلی جائے تا کہ بے حرمتی سے محفوظ رہ سکے (رحیمیہ ۲/۱۸۳)، بحالت مجبوری اس کو منظور کیا جاسکتا ہے کہ حکومت اس جگہ کے عوض دوسری مسجد بنوادے (فتاوی رحیمیہ ۲/۱۸۹)۔

جس کام کے لئے واقف نے وہ قطعہ زمین وقف کیا ہے اسکے خلاف میں استعمال کرنا جائز نہیں، اور کسی کو بھی شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ واقف کی غرض کے خلاف کسی دوسرے کام میں اس وقف کو صرف کرے یا منتقل کرے۔

"نص الواقف کنص الشارع" (فتاوی محمودیہ ۶/۲۱۰)۔

الف، ب۔ جس وقف کی وہ آمدنی ہے اس کا وقف نامہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ واقف نے کس کس کام میں صرف کرنے کی اجازت دی ہے، ایک مسجد کے لئے مخصوص طور پر جو وقف ہو اس کی آمدنی دوسری مسجد میں صرف کرنا جائز نہیں، لیکن مسجد کی آبادی کے لئے مسجد سے متعلق مدرسہ دینی قائم کرنا شرعاً درست ہے کہ یہ بھی مصالح مسجد میں سے ہے، "ھکذا یفھم مما فی البحر الرائق" (۵/۲۱۵)۔ دنیوی تعلیم مصالح مسجد میں سے نہیں اس میں خرچ کرنا درست نہیں دینی تعلیم خواہ قرآن کریم کی تعلیم ہو، خواہ مسائل شرعیہ کی تعلیم ہو اور پھر چاہے عربی زبان میں ہو چاہے اردو میں چاہے گجراتی میں سب کا حکم ایک ہے (فتاوی محمودیہ ۱۰/۱۸۶)۔

الف۔ اگر مسجد کی آمدنی کا روپیہ زیادہ صرف کم، اور اتنا روپیہ ہر وقت موجود رہتا ہے کہ ضرورت شکست وریخت وغیرہ بسہولت پوری ہوسکے اور روپیہ جمع رہنے میں

---

[۱] ناظم جامعہ خیر العلوم، بھوپال۔

خیانت کا قوی اندیشہ ہو تو اس روپے سے مسجد کے لئے جائداد، دوکانیں، زمین وغیرہ خرید لی جائیں، اگر اس میں دشواری ہو یا روپیہ جائداد خریدنے کے بعد بھی زائد بچ رہے تو پھر اسی مسجد میں دینی مدرسہ قائم کرلیا جائے، تاکہ مسجد کی آبادی میں ترقی ہو کیونکہ آبادی کو ترقی دینا مسجد کی بڑی مصلحت ہے، اگر یہ بھی دشوار ہو تو اقرب مسجد میں صرف کیا جاسکتا ہے (محمودیہ ۱/۵۰۹)۔

ب۔ مساجد کی وقف رقم یتیم خانہ میں بطور وقف نہیں دے سکتے، ایک وقف کے روپے دوسرے وقف میں استعمال کرنا جائز نہیں، ممنوع ہیں، درمختار میں ہے:

''وإن اختلف أحدهما بأن بنى رجلان مسجدين أو رجل مسجدا ومدرسة ووقف عليهما أوقافا لا يجوز له ذلك أي الصرف المذكور''۔

(دو شخص علیحدہ علیحدہ مسجد بنائے یا ایک ہی شخص نے مسجد اور مدرسہ بنایا اور دونوں کے لئے جدا جدا وقف کئے تو قاضی کو حق نہیں کہ ایک کے وقف کی آمدنی دوسرے وقف پر خرچ کرے) (درمختار مع الشامی)۔

ہاں اگر واقف نے وقف نامہ میں تحریر کیا ہے کہ ضرورت سے زائد آمدنی سے بوقت ضرورت دوسرے غریب حاجتمند وقفوں میں امداد کریں اور کار خیر میں خرچ کریں واقف کی شرط کے مطابق، یعنی وقف نامہ میں جو تحریر ہے اسکے مطابق دوسرے وقف کی امداد کرنا اور کار خیر میں خرچ کرنا صحیح ہوگا، البتہ اگر کوئی وقف بہت مالدار ہو، وقف کو اچھی طرح سے جاری رکھتے ہوئے بھی زائد رقم اس قدر ہو کہ وقف کو اس رقم کی ضرورت فی الحال نہیں اور دوسرا وقف ضرورتمند ہے تو اس کو قرض دے سکتے ہیں۔

''أما المال الموقوف على المسجد الجامع لم تكن للمسجد حاجة للمال فللقاضي أن يصرف في ذلك لكن على وجه القرض، فيكون ديناً في مال الفئ'' (فتاوی عالمگیری)۔

اگر کسی وقف کے خزانہ میں روپئے اس طرح زائد ہوں کہ نہ انکی فی الحال ضرورت ہے نہ آئندہ ضرورت پڑے گی، اور یہ روپے یونہی جمع رہیں تو ضائع ہوجائیں گے یا ناجائز استعمال ہوں گے اور واقف کا مقصد فوت ہوجائے گا تو ایسے حالات میں قریب کے دوسرے ضرورتمند اوقاف کو زائد روپئے امداد کے طور پر (بلاقرض) دینا جائز ہوجائے گا، مگر اس صورت میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مسجد کی زائد رقم قریبی ضرورتمند مسجد کو اور مدرسہ کی زائد رقم قریبی ضرورتمند مدرسہ کو دی جائے۔

یتیم خانہ اور سرائے وغیرہ اوقاف کا بھی یہی حکم ہے اور اس مقصد سے کہ آبادی مسجد میں اضافہ ہو اس زائد اور فاضل رقم سے مسجد سے متعلق دینی تعلیم کا مدرسہ بھی قائم کر سکتے ہیں (رحیمیہ ۲/۱۸۵)۔

مساجد اور مقابر کی رقم دنیوی تعلیم کے (کالج اور اسکول میں پڑھنے والے) طلبہ کو بطور امداد دینا ناجائز ہے (فتاوی رحیمیہ ۲/۱۸۵)۔

جب کہ اس کی مرمت میں روپیہ اس کی آمدنی سے زائد خرچ ہوتا ہے اور جدید تعمیر کی گنجائش نہیں تو اس کی منفعت مفقود ہے۔ ایسی حالت میں اس کو فروخت کردیا جائے تو درست بلکہ قابل تحسین ہے، خاص کر جب کہ نو خرید کردہ مکان سے آمدنی نسبۃً زیادہ ہوگی (فتاوی محمودیہ ۱۴/۱۶۲)۔

''وأما الاستبدال ولو للمساكين بدون الشرط فلا يملكه إلا القاضي وشرط في البحر خروجه عن الانتفاع بالكلية وكون البدل عقارا والمستبدل قاضي الجنة المفسر بذي العلم والعمل'' (الدر المختار على رد المحتار ۳/۳۸۸)۔

موقوف علیہ اگر خاص خاندان ہو اور وہ ختم ہوجائے تو اس وقف کو دیگر فقراء کو دیا جائے گا، اسی طرح جس مسجد ومدرسہ کے لئے جائداد وقف ہو ان کے ختم ہونے کی صورت میں اس کے ہم جنس قریبی مماثل پر صرف کیا جائے گا۔

''قال الشامي علم من هذا أن منقطع الأول ومنقطع الأوسط يصرف إلى الفقراء'' (شامی ۳/۴۱۳) أن الموقوف عليه إذا خرب يصرف وقفه إلى مجانسه فتصرف أوقاف المسجد إلى مسجد آخر وأوقاف الحوض إلى حوض آخر'' (شامی ۳/۴۱۵)۔

الف۔ وقفیہ مخدوش عمارت کو اپنے مصارف سے تعمیر کرنے کے لئے بلڈر سے طے کرنا کہ چند منزلہ عمارت بنا کر دینے پر ایک یا دو منزل اس کے تصرف میں دی جائے گی بقیہ وقفیہ مصارف کے لئے رہے گی تو شرعاً اس معاملہ کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

''كما هو مستفاد من عبارة الشامي أن مستأجر أرض الوقف إذا بنى فيها ثم زادت أجرة المثل زيادة فاحشة. فأما أن تكون الزيادة بسبب العمارة والبناء أو بسبب زيادة أجرة الأرض في نفسها ففي الأول لا تلزمه الزيادة؛ لأنها أجرة عمارته و بنائه وهذا لو كانت العمارة ملكه، أما لو كانت للوقف كما لو بنى بأمر الناظر ليرجع على الوقف تلزمه الزيادة ولهذا قيد بالمحتكرة، وفي الثاني تلزمه الزيادة أيضا'' (شامی ۳،۳۹۱)۔

ب۔ وقف شدہ مخدوش عمارت یا وقفیہ زمین اور محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے قرض مل سکتا ہو تو قرض لیکر تعمیر کی جائے۔

''والعمارة لابد منها فيستدين بأمر القاضي'' (فتاوی عالمگیری ۲،۲۲۴)۔

اور قرض کا انتظام نہ ہو سکے تو اس وقفیہ جائداد کا کچھ حصہ کرایہ پر دیکر اس کی آمدنی سے تعمیر کی جاسکتی ہے۔

''إن الخان لو احتاج إلى المرمة آجر بيتا أو بيتين وأنفق عليه وفي رواية يؤذن للناس بالنزول سنة ويؤجر سنة أخرى ويرم من أجرته وقال الناطفي القياس في المسجد أن يجوز إجارة سطحه لمرمته والظاهر أن حكم عمارة أوقاف المسجد والحوض والبئر وأمثالها حكم الوقف على الفقراء'' (شامی ۳،۳۸۳)۔

کرایہ یا قرض وغیرہ کسی طرح سے تعمیر ممکن نہ ہو تو قاضی یا حاکم کی اجازت سے ایسے ناقابل استعمال اوقاف کو مفید اور کار آمد بنانے کے لئے ان کے بعض حصے کو فروخت کر کے تعمیر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں، لہذا اس کی اجازت دی جائے گی۔

''سئل عن وقف انهدم ولم يكن له شئ يعمر منه ولا أمكن إجارته ولا تعميره هل تباع أنقاضه من حجر وطوب وخشب أجاب إذا كان الأمر كذلك صح بيعه بأمر الحاكم ويشترى بثمنه وقف مكانه. فإذا لم يمكن رده إلى ورثة الواقف إن وجدوا و إلا يصرف للفقراء'' (شامی ۳،۳۸۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ زمین پر بنی ہوئی بوسیدہ عمارت کے نکلے ہوئے ٹوٹے سامان کو فروخت کیا جائے گا اور مسجد کی اصل جگہ کو محصور کر کے محفوظ کر دیا جائے گا اور دیگر زمین اور اوقاف کی جائداد کو فروخت کیا جاسکتا ہے۔

''لأنهم صرحوا باستبدال الوقف إذا خرب وصار لاينتفع به وهو شامل للأرض والدار قال هشام: سمعت محمدا يقول: الوقف إذا صار بحيث لاينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشترى بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضي'' (شامی ۳،۳۸۳)۔

مسجد کی آبادی کے لئے مدرسہ قائم کرنا مصالح مسجد میں ہے لہذا شرعاً مسجد میں مدرسہ قائم کرنا جائز ہے۔ قبرستان کی جگہ اگر ضرورت سے زائد ہے اور بیکار رہنے سے اندیشہ ہے کہ کوئی اس پر غلط تصرف کرے جس سے وقف ہی ضائع ہو جائے گا تو اس میں دینی مدرسہ کی تعمیر کرنا درست ہے (فتاوی محمودیہ ۱۴/۱۴۸)۔

جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادیاں ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہ ہو رہا ہو، یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا اس کی وجہ سے اب اسکے استعمال اور تدفین پر پابندی عائد کر دی گئی تو ان قبرستان کو چہار دیواری سے محصور و محفوظ کر دیا جائے۔ ''فتاوی محمودیہ'' میں ہے:

اگر جانوروں سے حفاظت مقصود ہو یا یہ کہ اندیشہ ہو کہ بغیر احاطہ کے اس کی زمین دوسروں کے قبضہ میں چلی جاوے گی تو اس کی چہار دیواری بنا لینا درست، بلکہ بہتر ہے یہ اسراف اور تبذیر نہیں (فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۳۱۴)۔

تاریخی مساجد میں نماز ادا کرنے سے محکمہ آثار قدیمہ کا مسلمانوں کو روکنا بہت بڑا ظلم ہے، حکومت کو شرعاً و قانوناً مسلمانوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کرنے کا حق نہیں۔

''وكما كره غلق باب المسجد إلا لخوف على متاعه به يفتى قال في البحر وإنما كره؛ لأنه يشبه المنع من الصلاة. قال تعالى: ''ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه'' (شامی ۱،۴۴۱)۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے صرف باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو اسکے اطراف میں جہاں قبریں [illegible] ہوں دوکانوں کی تعمیر کرنا جائز ہے۔

''قال الزيلعي: إن الميت إذا بلي وصار ترابا جاز زرعه والبناء عليه'' (فتاوی عالمگیری ۴۷۱/۲)۔

پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے کر اس سے قبرستان کے اطراف میں اندرونی قبروں کی حفاظت کے لئے دکانیں بنانا جائز ہے۔

قبرستان قدیم اور ضرورت سے زائد ہو کہ اب اسمیں مردے دفن نہ کئے جاتے ہوں اور پہلے دفن شدہ مردے مٹی بن گئے ہوں تو اسمیں مسجد بنانا جائز ہے۔ فتاوی محمودیہ میں ہے: وہاں مسجد بنانا شرعاً درست ہے بشرطیکہ دفن موتی کے لئے اس جگہ کی حاجت نہ ہو، اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ قبریں نمازیوں کے سامنے نہ ہوں بلکہ درمیان میں دیوار حائل کردی جائے۔

''لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لايجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد؛ لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد'' (فتاوی محمودیہ ۴۸۷/۱)۔

ہندو راجاؤں کی طرف سے کئے ہوئے اوقاف سے فائدہ حاصل کرنے اور ہندو وقف بورڈ کے ماتحت ان اوقاف کے رہنے سے کوئی مضائقہ نہیں، ''فتاوی محمودیہ'' میں ہے: کتنی ہی ہندو ریاستیں ہیں جہاں ان راجاؤں نے مسلمان رعایا کے لئے مسجدیں بنوا رکھی ہیں جن میں بغیر نکیر صدیوں سے نماز ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خانہ کعبہ خود کفار کا تعمیر کیا ہوا تھا جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی، اور زمانہ فتوحات میں آپ کے بعد خلفاء راشدین نے اس کی تعمیر کو تعمیر کفار ہونے کی وجہ سے بدلوانے کی ضرورت نہیں سمجھی (فتاوی محمودیہ ۱۸۹/۱۰)۔

دور حاضر میں جب مسلم وقف بورڈ ایکٹ کے تحت ہر ریاست میں قائم ہے تو اس کو ایسے اوقاف اپنے زیر تصرف لے لینا چاہئے یا ہندو وقف بورڈ سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ مسلم اوقاف مسلم وقف بورڈ کے سپرد کردے۔ غیر مسلم ادارہ مقاصد وقف اور احکام شریعت کو پوری طرح انجام نہیں دے سکتا، لہذا اس کے ماتحت مسلم اوقاف کا رہنا مناسب نہیں۔

مساجد کی فاضل آمدنی دوسرے مصرف میں صرف کرنا

مولانا ایوب ندوی[1]

الف،ب۔ یہ بندے کے نزدیک جائز ہے۔

جس مقصد کے لئے واقف نے وقف کیا ہو اس کی پابندی ضروری ہے۔

الف۔ ان اراضی کو دینی تعلیم کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی جائے، بصورت دیگر عصری تعلیمی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ اگر موقوف علیہ مسجد کے ماتحت کوئی تعلیمی ادارہ ہو تو اس مسجد کی آمدنی کو اس تعلیمی ادارہ پر خرچ کر سکتے ہیں، اگر موقوف علیہ مسجد کو آمدنی کی بالکل ضرورت نہ ہو تو دیگر مساجد پر اس آمدنی کو خرچ کرنا چاہئے۔

الف۔ جائز ہے۔

ب۔ اس نوع کے اوقاف نہ ہوں یا انہیں ضرورت نہ ہو تو اس نوع سے قریبی نوع میں اس کی آمدنی خرچ کر سکتے ہیں۔

جائز نہیں۔

اس آمدنی کے حقدار واقف کے غریب رشتہ دار ہوں گے چاہے عصبہ ہوں یا ذوی الارحام، اگر وہ بھی مفقود ہوں تو اس آمدنی کو مصالح مسلمین پر خرچ کیا جائے گا۔

جائز ہے۔

صورت مسئولہ میرے نزدیک جائز ہے۔

ان قبرستانوں پر باغبانی کی جائے اور اس کی آمدنی دیگر قبرستانوں پر خرچ کی جائے۔

حکومت کو منع کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

اگر قبرستان ضرورت سے زائد ہو تو جائز ہے۔

مسجد سے متصل جگہ پر سلیب ڈال کر تہ خانے میں قبرستان جوں کا توں رہنے دیا جائے اور اوپر مسجد بنالی جائے تو جائز ہے۔

اگر غیر مسلم میں امانت داری اور صلاحیت نظم ونسق پائی جائے تو غیر مسلم کی تولیت درست ہے۔

☆☆☆

---

[1] جامعہ اسلامیہ بھٹکل۔

واقف کے منشاء کی رعایت کا دائرہ

ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی[1]

الف، ب۔ وہ اوقاف جن سے واقف کے مقاصد بروئے کار لانا ناقابل عمل امر ہو ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اگر مسجد غیر آباد مقام پر ہے اس کا حکم بھی ایسا ہی ہوسکتا ہے ورنہ غیر مسلم حاوی ہوجائیں گے، اور ایسے ویران ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کردیئے جائیں۔

الف، ب۔ مسجد پر وقف اراضی میں جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہیں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ مسجد سے تعلیمی یا رفاہی کام لئے جاسکتے ہیں۔

الف، ب۔ اوقاف کی فاضل آمدنی دیگر ملی، دینی، علمی اور مساجد وغیرہ کے سلسلہ میں صرف کرنا درست ہے۔

کم منفعت بخش اوقاف فروخت کر کے موقوفہ کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ منفعت کے لئے جو دینی کاموں میں صرف کرنے کے بعد ضروری ہیں اس سلسلہ میں دوسری شکل زیادہ آمدنی کے لئے اختیار کی جاسکتی ہے۔

جن اوقاف کے مصارف ختم ہوچکے ہیں ان کی آمدنی قومی ورفاہی کاموں کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔

الف، ب۔ مخدوش عمارت موقوفہ کو ڈھا کر آمدنی میں اضافہ کے لئے مقررہ وقت تک حوالہ کیا جاسکتا ہے، طویل مدت کے لئے ہرگز دی نہیں جاسکتی۔

ضرورت سے زائد مسجد وقبرستان کی آمدنی ہو تو کار خیر کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔

آبادی میں داخل شدہ قبرستان سے انتفاع باقی رکھنے کے لئے ملی کار خیر کے لئے استعمال کرنے کی جائز صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

تاریخی مساجد میں نماز سے روکنا حکومت کو ہرگز حق نہیں ہے جب کہ مندروں میں پوجاپاٹ کی اجازت دی جارہی ہے، یہ عدل کے خلاف ہے۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے احاطہ بندی کے طور پر چند فٹ جگہ پر دوکانیں بنا کر اس کی حفاظت کرنا آج کل بہت ضروری ہے اس کی آمدنی مصارف خیر میں لگائی جاسکتی ہے۔

ضرورت پر مسجد کی توسیع کے لئے ویران وزیر استعمال قبرستان کی جگہ استعمال کی جاسکتی ہے۔

غیر مسلموں کی موقوفہ کی ادارت میں مساجد، مقابر اور اسلامی مقاصد اسلامی آزادی کے ساتھ تولیت درست ہے۔

☆☆☆

---

[1] میسور، کرناٹک۔

مخدوش اوقاف اور واقف کے مقاصد

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی [1]

الف۔ مذکورہ حالات میں ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے متبادل وقف قائم کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔

ب۔ بالکل اختیار کی جاسکتی ہے۔

ایک مقولہ یا اصول ہے "عبارة الواقف كنص الشارع" وقف کرنے والے کی عبارت شارع کے نص کی طرح ہے، اس کے مفہوم میں وجوب اور قداست شامل کر کے بعد کے لوگوں نے اوقاف سے متعلق بڑا جامد رویہ اپنایا ہے، حالانکہ اس کا مفہوم جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے تحریر کیا ہے یہ ہے کہ وقف کرنے والے کی عبارت اپنے مفہوم کی دلالت میں ویسے ہی ہے جیسے شارع کی نص اپنے مفہوم کے سلسلہ میں قطعی ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقف کی عبارت اپنے وجوب میں شارع کے نص کی طرح ہوتی ہے، اگر ایسا مفہوم لیا جائے تو ایک عام شخص کو شارع قرار دینے کے ہم معنی ہوگا، اس لئے ویران اور ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کر کے اگر مصلحت متقاضی ہو تو اس کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے تعلیمی ورفاہی ادارے قائم کرنے میں حرج نہیں معلوم ہوتا، اس سے واقف کے ثواب میں اضافہ ہی ہوگا، اس لئے کہ پہلی شکل میں اس سے منفعت موقوف ہوگئی تھی جس سے اس کا ثواب بھی موقوف ہوسکتا ہے۔

الف۔ عہد نبوی میں مسجد تعلیم گاہ بھی رہی ہے، اس لئے مسجد پر وقف اراضی جو مسجد کی ضروریات سے زائد ہے مسلمانوں کے لئے دینی وعصری (نہ کہ دینی یا عصری) تعلیم کا ادارہ قائم کرنے میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔

ب۔ اگر مسجد کی آمدنی اس کے اپنے اخراجات سے بہت فاضل ہے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوسری مساجد پر خرچ کیا جائے۔ امام احمد بن حنبل نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے لوگوں کو کسی مکاتب کے لئے رقم جمع کرنے پر ابھارا جو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جمع ہوگئی تو اس کو آپؓ نے دوسرے مکاتبین پر خرچ کرنے کا حکم دیا۔ البتہ اگر اسی طرح کا مصرف موجود نہ ہو تو خیر وثواب کے دوسرے کاموں پر خرچ کیا جاسکتا ہے، اور اگر تعلیمی ورفاہی مقاصد زیادہ توجہ کے طالب ہوں تو ان کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔

الف۔ مذکورہ صورتحال میں فاضل آمدنی کو بلاشبہ اسی نوع کے اوقاف کی ضروریات میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ اور اگر ان سے زیادہ فوری توجہ کے مستحق ملی، دینی وعلمی کام یا مساجد ہوں تو ان پر بھی خرچ کرنے میں حرج نہیں محسوس ہوتا، کسوۂ کعبہ بھی وقف ہوتا ہے مگر حضرت عمرؓ اسے تقسیم کردیا کرتے تھے اور بعد کے ادوار میں بھی اس پر عمل رہا، اس سے معلوم ہوا کہ کوئی موقوف شئ کے ضائع یا بیکار جانے کا اندیشہ ہو تو اسے دوسری حاجات میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

اگر موقوفہ جائداد بصورت موجودہ نفع بخش نہ رہی ہو یا جس کی منفعت بہت گھٹ گئی ہو تو اس کو اس سے بہتر جائداد میں بدلنا جائز ہوگا کیونکہ قدیم شکل میں باقی رکھنے کی صورت میں واقف کا مقصد اچھی طرح پورا نہیں ہو رہا ہے۔

جن اوقاف کے مصارف ختم ہوچکے ہیں ان کی آمدنی اسی نوعیت کے دوسرے مصارف پر خرچ کی جاسکتی ہے، مثلاً کوئی جائداد کسی مسجد یا مدرسہ کے لئے وقف تھی اور اب نہ وہ مسجد ہے نہ مدرسہ تو دوسری مساجد یا مدارس پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

الف۔ موقوفہ عمارتیں جو بوسیدہ اور مخدوش حالات میں پڑی ہوئی ہیں انہیں گرا کر، اور اسی طرح وہ موقوفہ خالی زمینیں جن سے انتفاع کی کوئی صورت نہ ہو ان پر

[1] شاہ عبد العزیز یونیورسٹی جدہ۔

ایسی نئی عمارتوں کی تعمیر جس سے ان اوقاف کی آمدنی اور استعمال بڑھ جائے اور وہ اپنے مقاصد کو بطریق احسن پورا کرسکیں نہ صرف جائز بلکہ مطلوب ہوگا، بہتر ہوگا کہ اس کے لئے فنڈ کی کوئی صورت پیدا کی جائے، مثلاً چندے اور عطیات یا قرض کے ذریعہ، اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتو ایسے بلڈرز سے معاہدہ کیا جاسکتا ہے جو اپنے سرمایہ سے اسے تعمیر کرے، مگر اس عمارت کے کچھ حصوں کو اس کی مستقل ملکیت میں دینے کے بجائے اس کے دھیرے دھیرے انخلاء کا معاہدہ ہو، اسلامی معاشیات کے کچھ ماہرین نے اسی طرح کے مشورے دیئے ہیں اور بعض اسلامی ملکوں میں اس کا تجربہ بھی ہورہا ہے۔

ب۔ جب وقف کی حفاظت ممکن نہ ہو تو پورے کو فروخت کرکے اس کا متبادل قائم کیا جاسکتا ہے، تو اگر اس کے کسی چھوٹے سے حصے کو نکالنے سے بقیہ بڑا حصہ محفوظ وکارآمد ہوجائے تو اس کی اجازت ہونی چاہئے۔

کسی واقف کے پیش نظر تین مقاصد ہوسکتے ہیں:

۱۔ جائداد کو وہ جوں کا توں رکھنا چاہتا ہے، اپنے بعد اس کے حصے کے ذریعہ اس کا مٹنا اسے پسند نہیں ہے، اس مقصد کے پیچھے جائداد کی محبت ہے جو کوئی محمود ومستحسن مقصد نہیں ہے بلکہ قانون وراثت کی خلاف ورزی ہے۔

۲۔ دوسرا مقصد جس غرض کے لئے وقف کررہا ہے اس کی حفاظت ہے۔

۳۔ اور تیسرا مقصد جو بنیادی اور اصل محرک ہونا چاہئے وہ ثواب اور صدقہ جاریہ ہے۔

موخر الذکر دونوں مقاصد ہی کے لئے وقف مشروع ہوا ہے، اب اگر جس غرض کے لئے وقف کیا گیا ہے وہ پوری ہورہی ہے تو زائد از ضرورت زمین پر مدرسہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے، واقف کا دوسرا مقصد تو پورا ہی ہورہا ہے تیسرے مقصد یعنی ثواب میں اس سے کمی نہیں آئے گی بلکہ اضافہ ہی ہوگا، انشاء اللہ، ہاں مسجد وقبرستان کی آئندہ توسیع کی ضرورت نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

جو قبرستان آبادی کے اندر آگیا ہے اور اس میں تدفین پر پابندی عائد کردی گئی ہے اور جس پر آس پاس کے لوگوں کا قبضہ بڑھتا جارہا ہے اس کی حفاظت کے لئے پہلی فرصت میں باؤنڈری بنانے کی سعی وتدبیر ہونی چاہئے کہ فی الحال قبضہ رک جائے اور جب قبریں مٹ مٹا جائیں تو اس سے انتفاع کے لئے کوئی ملی، دینی وعلمی ادارہ قائم کردیا جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ اس زمین کو دوسروں کے قبضہ کے لئے چھوڑ دیا جائے یا اسے ناپسندیدہ عناصر اپنا اڈا بنائیں۔

"ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه" (سورہ بقرہ:۱۱۴)۔

محکمہ آثار قدیمہ اس طرح کی مساجد کی مرمت ونگہداشت اپنے ذمہ لے سکتا ہے، مگر نماز سے روکنے کا اسے ہرگز حق نہیں ہے۔

بہتر ہوگا کہ جن کے مردے وہاں دفن ہوتے ہیں ان سے خصوصاً اور عام مسلمانوں سے عموماً چندے اور عطیات حاصل کرکے اس کی باؤنڈری کرادی جائے، لیکن یہ نہ ہوسکے اور حفاظت کا مسئلہ سنگین ہوجائے تو مذکورہ صورت اپنائی جاسکتی ہے۔

کوئی حرج نہیں محسوس ہوتا، مسجد نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام کی تعمیر وتوسیع میں نہ جانے کتنی قبریں آگئی ہیں، قبریں اگر ویران ہوں یا ویران ہوجانے دیں تو زیادہ اچھا ہے کہ کوئی جھجک باقی نہ رہے۔

"ما كان للمشركين أن يعمروا مساجد الله شاهدين على أنفسهم بالكفر" (سورہ توبہ:۱۷)۔

غیر مسلم ادارہ کی تولیت سے اس طرح کے اوقاف کو نکالنے کی جدوجہد ہونی چاہئے، مگر جب تک یہ نہیں ہو پاتا اس سے استفادہ کو رد نہیں کرسکتے۔

☆☆☆

ویران اوقاف کی جگہ متبادل اوقاف کا قیام

مفتی عبداللطیف پالنپوری[1]

الف۔ اوقاف کے سلسلے میں اگر واقف نے وقف نامہ میں فروخت کرنے کی اجازت دی ہو یا وقف اس حالت میں ہو کہ اس سے کوئی نفع حاصل نہ ہو سکے یا وقف کے تحفظ کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور اس پر غاصبانہ قبضہ ہو کر نفس وقف ہی کے باطل ہوجانے کا مظنہ ہو تو مجبوراً دوسری زمین سے اس کا تبادلہ کرلیا جائے یا اسے فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو متبادل وقف قائم کیا جائے۔

''اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه: الأول أن يشرطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح، وقيل: اتفاقا، والثاني أن لا يشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لاينتفع به بالكلية، بأن لا يحصل منه شئ أصلا أولا يفي بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه، والثالث أن لا يشرطه أيضا، ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعاً ونفعاً، وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار كذا حرره العلامة قنالى زاده'' (شامی ۳۸۷،۳، فتاوی محمودیه ۱۲،۲۸۸، فتاوی رحیمیه ۶،۷۳)۔

ب۔ وقف کے احکام بہت نازک ہیں واقف کی غرض اور مقصد کا لحاظ اور اس کی شرائط کی پابندی ضروری ہے، لہٰذا جن صورتوں میں شریعت نے ویران اور ناقابل استعمال اوقاف کو فروخت کرنے کی اجازت دی ہے ان صورتوں میں مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں ضرورت ہو متبادل وقف قائم کرنا چاہئے۔ واقف کے مقاصد کی پابندی کئے بغیر ان اوقاف کی قیمت سے مسلمانوں کے تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم کرنا جائز نہیں ہے۔

''فإذا تم ولزم لايملك ولايملّك ولايعار ولا يرهن (درمختار) (قوله لايملك) أي لا يكون مملوكا لصاحبه ولا يملك أي لايقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالة تمليكه الخارج عن ملكه ولا يعار ولا يرهن لاقتضاءهما الملك درر ويستثنى من عدم تمليكه مالو اشترط الواقف استبداله'' (شامی ۳،۳۶۷)۔

''وإن اختلف أحدهما بأن بنى رجلان مسجدين أو رجل مسجداً ومدرسةً ووقف عليهما أوقافا لا يجوز له ذلك (در مختار) (قوله لا يجوز له ذلك) أي الصرف المذكور'' (شامی ۳،۳۷۲، احسن الفتاوی ۶،۴۲۲، فتاوی محمودیه ۱۸،۱۸۶)۔

الف۔ مسجد کی وقف اراضی میں چاہے وہ مسجد کی ضروریات سے زائد ہوں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ بوقت ضرورت یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ مسجد کے پیسے سے تعمیر کرلیں اور اسکو مدرسہ کے واسطے کرایہ پر لے لیں، مدرسہ کی جانب سے مسجد کو کرایہ ادا کر دیا کریں، یا وہ زمین کرایہ پر لے کر مدرسہ تعمیر کیا جائے کہ زمین مسجد کی ہو جس کا کرایہ مدرسہ کی طرف سے ادا کر دیا جایا کرے اور عمارت مدرسہ کی ہو (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۹۵، فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۲۲۰، احسن الفتاوی ۶/ ۴۲۲)۔

ب۔ جب ایک مسجد کی آمدنی بلا مجبوری دوسری مسجد میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہے تو پھر مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے کیسے استعمال کی جا سکتی ہے (فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۸۵، فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۱۶۶) فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء، قيل: لا يصرف، وأنه صحيح ولكن يشترى به مستغلا للمسجد'' (فتاوی

[1] استاذ جامعہ نذیریہ کاکوسی۔

هندیه ۲،۴۶۳)۔

ہاں اگر واقف نے وقف نامہ میں بوقت ضرورت زائد آمدنی کو دوسرے نیک کام میں استعمال کرنے کے لئے لکھا ہو تو شرط کے مطابق دوسرے وقف و غیرہ نیک کاموں میں خرچ کرنا جائز ہے ورنہ ناجائز ہے (فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۸۴)

الف، ب۔ اگر وقف اس قدر مالدار ہو کہ اس مال کی اسکونہ فی الحال ضرورت ہو نہ آئندہ، اور اگر دوسرے نیک کام میں استعمال نہ کیا جائے تو یہ مال ضائع ہو جائے گا یعنی ناجائز استعمال ہوگا اور واقف کا مقصد پورا نہ ہوگا تو ایسے وقف میں سے قریبی ضرورت مند وقف کو بطور امداد مفت دینا جائز ہے، صورت مذکورہ میں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ مسجد کی زائد رقم قریب کی حاجت مند مسجد میں اور مدرسہ کی زائد رقم نزدیک کے ضرورت مند مدرسہ میں استعمال کی جائے۔

''ومثله ... حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما، فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه (در مختار) (قوله إلى أقرب مسجد أو رباط الخ) لف و نشر مرتب و ظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (شامی ۳،۳۷۱، فتاوی رحیمیه ۲،۱۸۷، امداد الفتاوی ۲، ۶۱۳ تا ۶۱۵)۔

جو زمین یا مکان کسی مسجد یا مدرسہ پر وقف ہے، آمدنی کم ہونے کی وجہ سے اس کو فروخت کر کے کسی تجارتی مقام پر دوسرا مکان یا زمین خریدنا تا کہ وقف کی آمدنی زیادہ ہو جائز نہیں ہے۔

''والحاصل أن الاستبدال إما عن شرط الاستبدال أو لا عن شرطه، فإن كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف عليهم، فينبغي أن لا يختلف فيه وإن كان لا لذلك بل اتفق أنه أمكن أن يؤخذ بثمنه ما هو خير منه مع كونه منتفعا به، فينبغي أن لا يجوز، لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة، ولأنه لا موجب لتجويزه، لأن الموجب في الأول الشرط، وفي الثاني الضرورة ولا ضرورة في هذا إذ لا تجب الزيادة بل تبقيه كما كان۔ أقول ما قاله هذا المحقق هو الحق والصواب'' (شامی ۳،۳۸۹، فتاوی محمودیه ۱۵،۳۱۹)۔

جن اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے ہوں تو ان اوقاف کی آمدنی ان کے ہم جنس قریبی مصارف میں خرچ کرنی چاہئے۔

''(قوله إلى أقرب مسجد أو رباط) لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (شامی ۳،۳۷۱)۔

الف۔ اوقاف کی وہ عمارتیں جو مخدوش حالت میں ہیں ان کی تعمیر اوقاف کی آمدنی، یعنی کرایہ سے ہونی چاہئے، ان عمارتوں کے بعض حصہ کو فروخت کر کے تعمیر کرنا صحیح نہیں ہے۔

''وإذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضا منها ليرم الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك'' (فتاوی هندیه ۲،۴۱۷)۔

الا یہ کہ وقف کی عمارت ایسی ہو کہ اس سے انتفاع بالکلیہ ختم ہو گیا ہو اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے، نیز کرایہ پر دے کر بھی اس کی تعمیر نہ ہو سکتی ہو تو فقہاء نے ایسے وقف کو بیچ کر اس کے بدلے میں دوسرے وقف کو خریدنے کی اجازت دی ہے۔

''وفي المنتقى قال هشام: سمعت محمدا يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره وليس ذلك إلا للقاضي، وأما عود الوقف بعد خرابه إلى ملك الواقف أو ورثته فقد قدمنا ضعفه فالحاصل أن الموقوف عليه السكنى إذا امتنع من العمارة ولم يوجد مستأجر باعها القاضي واشترى بثمنها مايكون وقفا الخ'' (شامی ۳،۳۸۴)۔

ب۔ ''وفي الفتاوى النسفية سئل عن أهل المحلة باعوا وقف المسجد لأجل عمارة المسجد قال: لا يجوز بأمر

القاضي وغيره كذا في الذخيرة'' (فتاوی ہندیہ ۲،۴۶۳)۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ سوال میں مذکور صورت بھی جائز نہیں ہے، وقف کی آمدنی ہی سے تعمیر ہونی چاہئے۔ اگر وقف سے انتفاع بالکلیہ ختم ہوگیا ہو تو اس کا استبدال جائز ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

مسجد یا قبرستان کے لئے جو زمین وقف ہے اور وہ ضرورت سے زائد ہے، اس پر مدرسہ کی تعمیر جائز نہیں ہے۔ بوقت ضرورت کرایہ والی صورت اختیار کی جا سکتی ہے جس کی تفصیل دوسرے سوال کے جواب میں گزر چکی ہے (احسن الفتاوی ۶/ ۴۳۳، فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۲۲۰)۔

اگر قبرستان پرانا ہوجائے کہ میت مٹی بن چکی ہو اور اب وہاں تدفین بند ہوگئی ہے اور قبرستان بند ہونے کی وجہ سے، نیز خالی پڑا رہنے کی وجہ سے اندیشہ ہو کہ اس پر کوئی غاصبانہ قبضہ کرلیگا تو پرانی قبروں کو ہموار کرکے اس پر مسجد یا اور کوئی رفاہ عامہ کی چیز تعمیر کرنا جائز ہے۔

''ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه'' (شامی ۱،۵۹۹) ''فإن قلت هل يجوز أن تبنى المساجد على قبور المسلمين؟ قلت: قال ابن القاسم رحمه الله تعالى: لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى قوم عليها مسجدا لم أر بذلك بأسا وذلك؛ لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لايجوز لأحد أن يملكها، فإذا درست واستغنى عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد، لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لايجوز تمليكه لأحد فمعناهما على هذا واحد'' (عمدة القاری ۴،۱۷۹ نقلا عن احسن الفتاوی ۶،۴۱۴. فتاوی محمودیه ۱۸،۴۱۴)۔

حکومت کو اس طرح کا کوئی حق نہیں ہے کہ مساجد کو آثار قدیمہ میں داخل کرکے نماز کی ادائیگی پر پابندی لگائے، ایسی مساجد کو حکومت کے قبضہ سے واگذار کرانا ازالہ منکر کا ایک جزء ہے، اور اس کا مدار قدرت پر ہے، اگر کسی کو اس پر قدرت ہے تو اس پر واجب ہے، اور اگر قدرت نہ ہو تو دل سے ناگواری اور عمل میں صبر کافی ہے (امداد الفتاوی ۲/ ۶۳۱)۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے، جبکہ باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرکے پیشگی کرایہ لینا اور اس کے ذریعہ باؤنڈری کا انتظام کرنا جائز ہے، اس کا خیال رہے کہ قبرستان کی چندفٹ جگہ جو دوکانوں کی تعمیر میں لی جائے اس میں کوئی تازہ قبر نہ ہو، نیز بعد میں فاضل آمدنی کو ایسی قبرستان کی ضرورت کے لئے محفوظ رکھا جائے اور اگر ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو کسی دوسرے قریبی قبرستان کی حفاظت میں صرف کیا جائے۔

''ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه'' (شامی ۱،۵۹۹)۔

قبرستان میں تدفین کا سلسلہ موقوف ہوجانے کی وجہ سے قبرستان ویران ہوچکا ہو، نیز قبریں اتنی پرانی ہوں کہ میت مٹی بن گئی ہو تو ایسے قبرستان میں مسجد کی توسیع جائز ہے (احسن الفتاوی ۶/ ۴۱۳، فتاوی رحیمیہ ۶/ ۸۴)۔

اور اگر قبرستان میں تدفین جاری ہو اور تدفین کے لئے اس قبرستان کی ضرورت ہو تو اس میں مسجد کی توسیع جائز نہیں ہے۔ لأن نص الواقف كنص الشارع.

اصل یہ ہے کہ مساجد، مقابر اور اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے تمام اوقاف مسلمانوں ہی کی تولیت میں ہوں اور مسلمان ہی اس کے تمام نظم و نسق کو انجام دیں، لیکن اگر یہ اوقاف زمانہ قدیم سے ہندوؤں کی تولیت میں چلے آرہے ہوں، اور اب ان اوقاف کو ان کی تولیت سے نکالنا ممکن نہ ہو، بلکہ ان اوقاف کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو بدرجہ مجبوری اس کو برداشت کیا جاسکتا ہے (فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۳۰۲)۔

☆☆☆

اوقاف کی آمدنی مدارس و مساجد میں صرف کرنا

مولانا عبد القیوم پالنپوری[1]

الف، ب۔ جس جگہ مساجد قائم ہیں پھر ان کی عمارت رہے یا نہ رہے، اس میں نماز پڑھی جاتی ہو یا نہ پڑھی جاتی ہو، اس کے پاس سے مسلمانوں کی آبادی بالکل ختم ہو جائے یا باقی رہے وہ جگہ جمہور کے راجح مذہب کے موافق قیامت تک مسجد کے حکم میں رہے گی، اس کے کسی حصہ کو بیچنا، کرایہ پر دینا، رہن رکھنا یا اس کے ورثاء کو دینا جائز نہیں، لہٰذا جن علاقوں میں دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہیں اور وہاں کی مساجد پر غیر مسلموں یا حکومت کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہو، ایسی مساجد کو حتی الامکان (قبضہ چھڑوا کر) اپنی حالت پر برقرار رکھنے اور محفوظ کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہئے، اور ان کے سامان کے چوری ہو جانے کا خطرہ ہو تو یا عمارت توڑ دیے جانے کا یقین ہو تو اسے توڑ کر دوسری ضرورت مند قریب کی مساجد میں صرف کرنا چاہئے، اور ان کی اصل جگہوں کو محفوظ کر لی جائے کہ بے حرمتی نہ ہو۔

حضرت مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جس جگہ مسجد قائم ہے اور جس رقبہ کو مسجد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس کی عمارت قائم رہے یا نہ رہے، اس میں کوئی نماز پڑھے یا نہ پڑھے، اس جگہ بستی آباد رہے یا ویران ہو جائے ہر حال میں وہ جگہ علی الدوام تا قیامت مسجد ہی رہے گی، دوسری زمینوں کی طرح فنا نہ ہوگی، بلکہ جنت میں پہنچا دی جائے گی، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''قد ذهب الأرضون كلها يوم القيامة إلا المساجد، فإنها ينضم بعضها إلى بعض'' یعنی قیامت کے روز ساری زمینیں فنا ہو جائیں گی، سوائے مساجد کے کہ وہ آپس میں مل جائیں گی (جامع صغیر سیوطی ۱/ ۱۰۹)۔

اس لئے فقہاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام والثاني أبداً إلى قيام الساعة (وبه يفتي)'' (در مختار)۔

یعنی اگر اطراف مسجد منہدم اور ویران ہو جائے اور مسجد کی کوئی حاجت باقی نہ رہے تب بھی امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ جگہ ہمیشہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اور اسی پر فتویٰ ہے۔

شامی میں ہے: ''فلا يعود ميراثاً ولا يجوز نقله و نقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أو لا وهو الفتوى (ايضاً فيه) ولو خرب المسجد و ما حوله و تفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف، فيباع نقضه بإذن القاضي و يصرف ثمنه إلى بعض المساجد الخ (ايضاً فيه) قال في البحر: وبه علم أن الفتوى على قول محمد في آلات المسجد و على قول أبي يوسف في تأبيد المسجد... الخ۔ والمراد بآلات المسجد نحو القنديل والحصير بخلاف أنقاضه لما قدمناه عنه قريباً من أن الفتوى على أن المسجد لا يعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر'' (۳، ۵۱۳)۔

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ جن مقامات کو مسلمان مساجد کی طرح وقف کر کے شرعی مسجد بنا لیتے ہیں، جمہور فقہاء (امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف وغیرہ) کے نزدیک اس قسم کی جگہوں کا حکم یہ ہے کہ وہ مکان اب قیامت تک کے لئے مسجد بن گیا، اس کو کسی صورت میں بھی بیچنا جائز نہیں...... چنانچہ مسلکِ شافعی کے امام خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں: ''ولو انهدم مسجد و تعذرت إعادته أو تعطل بخراب البلد مثلا لم يعد ملكاً ولم يبع بحال...'' (مغنی المحتاج ۲، ۳۹۲)، اور فقہاء مالکیہ میں سے علامہ مواقؒ تحریر فرماتے ہیں: ''وفي الطرر عن ابن عبد الغفور لا يجوز بيع مواضع المساجد الخربة؛ لأنها وقف ولا بأس ببيع نقضها'' طرر میں ابن عبد الغفور سے

[1] استاذ جامعہ نذیریہ کاکوسی۔

یہ عبارت منقول ہے کہ ویران مساجد کی جگہوں کو بیچنا وقف ہونے کی بنا پر جائز نہیں، البتہ ان کا ملبہ بیچنا جائز ہے (التاج الاکلیل للمواق حاشیہ حطاب ۶ر۴۲، فقہی مقالات ۱ر۲۴۰۔۲۴۵)۔

مسجد کے علاوہ دوسرے اوقاف (مدارس، خانقاہیں، قبرستان یا ان پر اور مسجد پر وقف اراضی ومکانات) کو بھی جہاں تک ممکن ہو قانونی طور سے ان کی حفاظت کی کوشش کی جائے، اور اگر ان کی حفاظت کی کوئی صورت نہ ہو اور دوسروں کے غلط قبضہ کا یقین ہو تو ان اوقاف کا زمین یا قیمت لے کر یا دونوں لے کر تبادلہ کرنے کی گنجائش ہے۔

الف، ب۔ مسجد پر وقف اراضی کی آمدنی مسجد کی ضروریات سے زائد ہے اس کی نہ فی الحال ضرورت ہے نہ آئندہ، تو مسجد کی آبادی کی غرض سے مسجد کے متعلق دینی تعلیم کا مدرسہ جاری کیا جائے اس آمدنی سے تو جائز ہے، اور اس سے بھی آمدنی بچ جائے اور اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو قریب کی پھر بعید کی علی الترتیب دیگر مساجد کی ضروریات میں صرف کی جائے، اس آمدنی کو مسجد سے غیر متعلق دینی مدرسہ میں خرچ کرنا یا اس رقم سے عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا یا رفاہی کاموں میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، "فتاوی محمودیہ" میں ہے: لیکن مسجد کی آبادی کے لئے مسجد سے متعلق مدرسہ دینی قائم کرنا شرعاً درست ہے کہ یہ بھی مصالح مسجد میں سے ہے (محمودیہ، فتاوی رحیمیہ ۲ر۱۸۵)۔ مساجد اور مقابر کی رقم دنیوی تعلیم کے (کالج اور اسکول میں پڑھنے والے) طلبہ کو بطور امداد دینا ناجائز ہے (فتاوی رحیمیہ ۲ر۱۸۵)۔

الف، ب۔ اسی نوع کے قریب کے پھر بعید کے علی الترتیب اوقاف پر خرچ کرنا جائز ہے، ان اوقاف کی آمدنی کو خلاف جنس پر علمی، ملی کاموں یا مساجد میں خرچ کرنا درست نہیں ہے، اگر اسی جنس کے اوقاف میں صرف کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو پھر مساجد، مدارس دینیہ وغیرہ کے مواقع میں صرف کرنا درست ہوگا (کذا فی فتاوی محمودیہ ۱۲ر۲۵۱)۔

کسی مسجد ومدرسہ پر موقوفہ مکان یا زمین جس کی آمدنی کم ہو، اس کو فروخت کرکے اس کی قیمت سے دوسرا مکان یا دوکان خریدنا جس سے آمدنی زیادہ ہو جائز نہیں ہے، البتہ موقوف مکان بالکل قابل انتفاع نہ ہو تو اس کو بیچ کر اس کی قیمت سے دوسرا مکان یا دوکان خرید کر وقف کر دینا جائز ہے، جیسا کہ "رد المحتار" میں ہے:

"والمعتمد انه (الاستبدال) بلا شرط الواقف يجوز للقاضي بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية الخ (۳.۵۴۷)
وفيه أيضاً: وفي الفتح والحاصل أن الاستبدال إما عن شرط الاستبدال أو لا عن شرطه، فإن كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف عليهم، فينبغي أن لا يختلف فيه وإن كان لا لذلك، بل اتفق أنه أمكن أن يؤخذ بثمنه ما هو خير منه مع كونه منتفعاً به، فينبغي أن لايجوز، لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة، ولأنه لا موجب لتجويزه، لأن الموجب في الأول الشرط، وفي الثاني الضرورة، ولا ضرورة في هذا إذ لا تجب الزيادة بل تبقيه كما كان (أقول ما قاله هذا المحقق هو الحق الصواب) الخ كلام البيري" (رد المحتار ۳.۵۲۹)۔

جن اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے ہیں، مثلاً کوئی جاگیر کسی خاص خاندان کے فقراء پر وقف تھی اور اب وہ خاندان دوسری جگہ منتقل ہو گیا ہو تو بھی اس کی آمدنی اسی خاندان کے فقراء پر صرف کی جائے، اور اگر وہ خاندان ختم ہو گیا ہے تو اس کی جنس یعنی دوسرے فقراء مسلمین اور مدارس کے طلبہ پر اس کی آمدنی صرف کی جائے، اور اگر وہ اوقاف کسی مسجد پر وقف تھے اور اب وہ مسجد باقی نہیں رہی اور وہاں مسلمانوں کی آبادی ہو تو ان اوقاف کی آمدنی سے اسی مسجد کی جگہ پر مسجد تعمیر کرکے آباد کیا جائے، اور اگر وہاں مسلم آبادی نہیں ہے تو ان کی آمدنی سے اولاً اس مسجد کی جگہ کو چہار دیواری وغیرہ بنا کر محفوظ کر لی جائے، تاکہ اس کی بے حرمتی نہ ہو اور غلط قبضہ کسی کا نہ ہو، اور بقیہ آمدنی قریب پھر بعید کی مساجد کی ضروریات میں صرف کی جائے، اسی طرح جو اوقاف کسی مدرسہ پر وقف تھے اور اب وہ مدرسہ نہیں رہا اور وہاں مسلمانوں کی آبادی ہے تو اس جگہ از سر نو مدرسہ قائم کیا جائے اس آمدنی سے، اور اگر وہاں مسلم آبادی نہیں ہے تو ان اوقاف کی آمدنی قریب کے مدارس ومکاتیب دینیہ کی ضرورتوں میں صرف کی جاوے۔

"كما مر عن شرح الملتقى يصرف وقفها إلى أقرب مجانس لها" (شامی ۳.۵۱۲) "حاصله أن ما خرب تصرف أوقافه إلى مجانسه" (رد المحتار ۳.۵۷۳)۔

الف۔ اوقاف کی مخدوش عمارتیں یا خالی زمین کی کچھ بھی آمدنی ہوتی ہو تو مذکور فی السوال معاملہ بلڈر سے کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ علامہ بیری کے نقل کردہ نمبر (۴)

عبارت سے معلوم ہوا:

''لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة... إذ لا تجب الزيادة بل تبقيه كما كان'' (شامی ۴،۵۳۹)۔

اگر اوقاف کی مخدوش عمارتیں یا خالی زمین بالکل قابل انتفاع نہیں رہی ہے اور وقف کی آمدنی سے اس کو قابل انتفاع بنانے کی کوئی صورت نہیں ہے تو کسی بلڈر سے اس طرح معاملہ کرنا کہ عمارت ڈھا کر یا خالی زمین پر اپنے صرفہ سے چند منزلہ عمارت بنائے گا اور اس کی ایک یا دو منزل اس کی ہوگی اور بقیہ منازل وقف کی ہوگی درست ہے، البتہ معاملہ کے وقت وقف کے زیادہ فائدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے موجودہ منازل سے ایک دو زائد کی تعمیر کی شرط کی جائے اور بلڈر کے لئے اوپر والی منزل طے کی جائے، عالمگیری میں ہے:

''علو وقف انهدم وليس له من الغلة ما يمكن عمارة العلو بطل الوقف وعاد حق البناء إلى الواقف إن كان حيا وإلى ورثته إن كان ميتا كذا في المحيط'' (۲،۳۶۰) وكذلك وقف صحيح... خرب ولا ينتفع به وهو بعيد عن القرية لا يرغب أحد في عمارته ولا يستأجر أصله يبطل الوقف ويجوز بيعه وإن كان أصله يستأجر بشئ قليل يبقى أصله وقفاً كذا في فتاوى قاضي خان، وهذا الجواب صحيح على قول محمد، فأما عند أبي يوسف ففيه نظر الخ'' (عالمگیری ۲،۲۶۵). ''وكذا يفتى بكل ما هو أنفع للوقف فيما اختلف العلماء فيه، حاوي القدسي'' (الدر المختار ۴،۵۵۵ مع ردالمحتار)۔

ب۔ وقف زمین یا جائداد کی آمدنی اگرچہ قلیل ہو اس کے کسی حصہ کو محتاج تعمیر مسجد کے لئے یا خالی زمین پر عمارت یا مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے بیچنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ واقف نے وقف کے وقت ان ضرورتوں کے لئے بیچنے کی اجازت دی ہو۔

''وفي الفتاوى النسفية: سئل عن أهل المحلة باعوا وقف المسجد لأجل عمارة المسجد قال لا يجوز بأمر القاضي وغيره'' (فتاوی عالمگیری ۲،۳۶۰)۔

ان کی تعمیر اسی جنس کے اوقاف کی فاضل آمدنی سے یا مسلمانوں کے عام چندے سے یا غیر جنس اوقاف کی فاضل آمدنی سے قرض لے کر کی جائے، اس لئے کہ قابل انتفاع اوقاف کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

مسجد کے لئے وقف زمین پر یا قبرستان کے لئے وقف زمین پر جو ضرورت سے زائد ہے مدرسہ تعمیر کرنا درست نہیں ہے، ''ولو لم يتفرق الناس ولكن استغنى الحوض عن العمارة وهنالك مسجد محتاج إلى العمارة أو على العكس، هل يجوز للقاضي صرف وقف ما استغنى عن العمارة إلى ما هو محتاج إلى العمارة، قال: لا، كذا في المحيط'' (عالمگیری ۲،۳۶۴-۳۶۵)۔

بلکہ اس زمین کی آمدنی اسی مسجد یا قبرستان کے لئے محفوظ رکھی جائے اور رقم کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو دوسری قریب کی مسجد یا قبرستان کی ضروریات میں صرف کی جائے۔

جس قبرستان کے اطراف سے مسلم آبادی ختم ہوجانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہو رہا ہے اور اس میں قبریں پرانی ہوگئی ہیں، اگر وہ مملوکہ ہے تو مالک یا ورثاء، یا مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے اس کو بیچنا، کرایہ پر دینا، اس پر دوکانیں بنانا، یا اس کو بیچ کر اس کی قیمت مسجد یا مدرسہ میں صرف کرنا جائز ہے، اور اگر وہ وقف ہے اور اس پر قبضہ کا خطرہ ہے تو بونے کے لئے کرایہ پر دینا یا اس پر دوکانیں وغیرہ بنا کر کرایہ پر اٹھا دینا یا اس کو بیچ دینا جائز ہے، لیکن اس کی آمدنی یا قیمت سے ضرورت کی جگہ قبرستان کے لئے زمین خریدنا یا اسی جنس میں صرف کردینا ضروری ہے۔ ''لأن مراعاة غرض الواقفين واجبة''۔ اگر دور اور نزدیک اس جنس میں صرف کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے تو مسجد یا مدرسہ میں ان رقوم کو صرف کرنا درست ہے۔

اسی طرح جو قبرستان آبادی میں آجانے کی وجہ سے اس میں تدفین پر پابندی عائد کردی گئی ہے، اولاً اس پابندی کو ہٹانے کی کوشش کی جائے، کامیابی نہ ہونے کی صورت میں اگر وہ قبرستان مملوکہ ہے تو مالک یا اس کے ورثاء کی ملک ہونے کی بنا پر ان کو اس میں ہر قسم کا تصرف جائز ہے، اور اگر وہ وقف ہے اور

مسلمانوں کو قبرستان کی ضرورت ہے تو باہمی مشورہ سے اس کو بیچ کر حاصل شدہ قیمت سے یا اس کو بونے کے لئے یا اس پر دو کانیں وغیرہ بنا کر کرایہ پر دینا اور اس کی آمدنی سے مسلمانوں کے لئے دوسرے قبرستان کے لئے زمین خریدنا جائز ہے، اور اگر قبرستان کی ضرورت نہیں ہے اور اس پر غاصبانہ قبضہ کا خطرہ ہے تو اس جگہ پر حسب ضرورت مسجد، مدرسہ یا مسافر خانہ وغیرہ بنانا جائز ہے۔

''قال الزيلعي: ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه'' (رد المحتار ۲،۲۳۲)۔

حکومت کو کوئی حق نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ان میں نماز سے روکے، حکومت کو چاہئے کہ ان مساجد کو نمازیوں کے لئے کھول دے، اور مسلمانوں کو حسب المقدور ان کو کھلوانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

قبرستان کی چہار دیواری اور باؤنڈری بنانے کے لئے کوئی آمدنی نہیں ہے، تو قبرستان کی حفاظت کے لئے اس کے اطراف میں پیشگی کرایہ لے کر حسب ضرورت دو کانوں کی تعمیر کی گنجائش ہے کہ جس کے کرایہ سے چہار دیواری بنائی جاسکے، اور بقیہ آمدنی قبرستان کی ضروریات میں صرف کی جائے، حضرت مفتی محمود صاحب تحریر فرماتے ہیں: اگر قبرستان کے چہار طرف دو کانیں تعمیر کر کے ان کو کرایہ پر اٹھادیا جائے اور کرایہ سے قبرستان کے مصارف پورے کئے جائیں تو اس کی گنجائش ہے، جبکہ ان تعمیرات سے قبرستان میں تنگی واقع نہ ہو...... سب کام باہمی مشورہ اور اتفاق سے کیا جائے (فتاوی محمودیہ ۱۵؍ ۳۰۴)۔

قبرستان اس لئے وقف ہوتا ہے کہ اس میں مردے دفن کئے جائیں، لہذا اس کے علاوہ کسی اور کام میں اس کو استعمال کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر قبرستان پرانا ہو جائے کہ میت مٹی بن چکے ہوں اور اب وہاں دفن کرنا بند کردیا گیا ہو، نیز خالی پڑا رہنے سے اندیشہ ہے کہ اس پر کوئی غاصبانہ قبضہ کرلے گا تو پرانی قبروں کو ہموار کر کے حسب ضرورت مسجد، مدرسہ یا کوئی عمارت بنانے کی اجازت ہے (کذا فی محمودیہ ۱۸؍ ۲۱۲-۲۷۱)۔

اور سوال میں مذکور صورت کہ وسیع قبرستان میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور مسلمانوں کی آبادی بڑھ جانے سے ضرورت کے لئے کافی نہیں اور ارد گرد بھی دوسری مساجد نہیں کہ ضرورت پوری ہو اور قبرستان اتنا وسیع ہے کہ اس کے کچھ حصہ کو مسجد میں شامل کرنے سے اس میں تنگی نہیں پیش آسکتی ہے تو قبرستان کے کچھ حصہ کو مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کرنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے:

''في الفتح: ولو ضاق المسجد وبجنبه أرض وقف عليه أو حانوت جاز أن يؤخذ ويدخل فيه... زاد في البحر عن الخانية بأمر القاضي وتقييده بقوله ''وقف عليه'' أي على المسجد يفيد أنها لو كانت وقفا على غيره لم يجز. لكن جواز أخذ المملوكة كرها يفيد الجواز بالأولى، لأن المسجد لله تعالى والوقف كذلك. ولذا ترك المصنف في شرحه هذا القيد وكذا في جامع الفصولين'' (رد المحتار ۳،۵۲۱)۔

اور جس حصہ کو مسجد میں شامل کیا جائے اس میں قبریں نہ ہوں، یا اگر ہوں تو اتنی پرانی ہوں کہ میت مٹی بن گئی ہو، اگر قبریں نئی اور تازہ ہوں تو اس حصہ کو میت کے مٹی ہونے سے پہلے شامل کرنا درست نہیں ہے۔

جو مسلم اوقاف ہندو وقف بورڈ کی زیر نگرانی اور تولیت میں ہیں ان کو قانونی چارہ جوئی سے مسلم سنی وقف بورڈ کی تولیت میں لانے کے لئے کوشش کرنی چاہئے، اگر کامیابی نہ ہو تو غیر مسلم کے متولی ہونے کو مجبوراً گوارہ کیا جاسکتا ہے، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی تحریر فرماتے ہیں: ''جب ایسی مجبوری ہے کہ وقف کے محفوظ رہنے اور انتظام برقرار رہنے کی صرف یہی صورت (یعنی غیر مسلم کو متولی بنانا) ہے تو مجبوراً برداشت کیا جاسکتا ہے (فتاوی محمودیہ ۱۵؍ ۳۰۳)۔

اور علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ متولی ہونے کی صحت کے لئے آزاد اور مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: ''ويشترط للصحة (أي لصحة التولية) بلوغه وعقله لا حريته وإسلامه، ولو كان عبداً يجوز قياسا واستحساناً لأهليته في ذاته ... ثم الذمي في الحكم كالعبد الخ'' (رد المحتار ۳،۵۲۲)۔

☆☆☆

حکومت یا فرد کو خستہ حال اوقاف حوالہ کر کے دوسرا حاصل کرنا

مولانا ابراہیم گجیا فلاحی [1]

الف۔ بہت سے اوقاف ویران ہو چکے ہیں اور جن مقامات پر اوقاف ہیں وہاں دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہو گیا ہے تو کیا ایسے اوقاف کو فروخت کر کے مقاصد واقف کا خیال رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام پر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو وہاں متبادل وقف قائم کیا جا سکتا ہے؟

اس کا حکم یہ ہے کہ وقف تام اور مکمل ہو جانے کے بعد اس کا بیچنا، خریدنا، ہبہ کرنا، رہن رکھنا وغیرہ کچھ بھی جائز نہیں، شامی میں ہے:

''فإذا تم ای الوقف ولزم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن'' (شامی ۳، ۵۰۷)۔

ہاں اگر ضائع ہونے کا ظن غالب ہو جائے یا بالکل ہی ناقابل انتفاع ہو جائے تو اسکو فروخت کر کے اس کے بدلہ میں اسی موقوفہ کے متوازی و مماثل دوسری چیزیں خرید کر وقف کر دی جائے (نظام الفتاوی ۱۶۰)۔

ب۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالہ کر کے اسکے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر کے مقاصد وقف کو جاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

شامی میں ہے: "وجاز شرط الاستبدال الخ" میں استبدال کی دوسری شرط یہ ذکر فرمائی ہے: ''أن لا يشرطه الاستبدال سواء شرط عدمه أو سكت ولكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية، بأن لا يحصل منه شئ أصلاً أو لا يفي بمؤنته، فهو أيضا جائز إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه'' (شامی ۳، ۴۲۴)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر وقف سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو رہا ہو، لیکن ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اسکو دوسری زمین یا مکان سے بدلنا جائز ہے، لیکن اس میں مسلم ذمہ داروں سے مشورہ اور رائے لینا بھی ضروری ہے۔

اور یہ سوال کہ واقف کے مقاصد کی رعایت کے بغیر ایسے اوقاف کو فروخت کر کے اس سے مسلمانوں کے تعلیمی، رفاہی ادارے قائم کرنا یہ جائز نہیں۔ کیونکہ واقف کی شرط کو نص شارع کے حکم میں مانا گیا ہے۔ شامی میں ہے:

''نص الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه كما صرح به في شرح المجمع'' (شامی ۳، ۴۹۷)۔

الف۔ مسجد پر وقف اراضی جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہے اس میں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اس میں مسجد کی آمدنی کے لئے مکان، دوکان وغیرہ تعمیر کی جائے تاکہ اس کی آمدنی کو مسجد کی ضروریات میں استعمال کیا جائے، عالمگیری میں ہے:

''الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء قيل لا يصرف وإنه صحيح، ولكن يشترى به مستغل للمسجد كذا في المحيط'' (عالمگیری ۲، ۴۶۳)۔

ب۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی کاموں میں استعمال کی جا سکتی ہے، جبکہ واقف نے ان زمینوں اور مکانات کو مسجد ہی کے لئے وقف کیا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسجد کی آمدنی مسجد ہی کے کام میں استعمال ہوگی۔ اسے تعلیمی اور رفاہی کام میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، جب کہ واقف نے بھی اس کی اجازت نہیں دی ہو، اور اوپر شامی کی عبارت (۳، ۴۹۷) ''شرط الواقف كنص الشارع'' سے بھی معلوم ہوا کہ اس کو دوسرے کاموں میں استعمال کرنا

[1] جامعہ دار الاحسان بارڈولی سورت، گجرات۔

جائز نہیں ہے۔

الف، ب۔ صورت مسئولہ میں دوسرے ضرورت مند اسی نوع کے وقف کو زائد آمدنی بطور قرض دی جائے۔ عالمگیری میں ہے:

''أما المال الموقوف على المسجد الجامع لم تكن للمسجد حاجة للمال فللقاضی أن یصرف فی ذلك لكن على وجه القرض، فیكون دینا فی مال الفئ'' (عالمگیری ۲،۴۶۳)۔

اور اگر کسی وقف کے خزانہ میں روپیہ اس قدر زائد جمع ہو کہ نہ فی الحال ان کی ضرورت ہے نہ آئندہ ضرورت پڑے گی، اور یہ روپے یوں ہی جمع رہیں تو ضائع ہو جائیں گے یا ناجائز استعمال ہوں گے اور واقف کا مقصد فوت ہوگا تو ایسے حالات میں قریب کے ضرورت مند وقف کو زائد رقم امداد کے طور پر (بلا قرض) دینا جائز ہوگا، مگر اس صورت میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مسجد کی زائد رقم قریب کی ضرورت مند مسجد کو، اور مدرسہ کی زائد رقم قریب کے ضرورت مند مدرسہ کو دی جائے، اور یتیم خانہ اور سرائے وغیرہ اوقاف کا بھی یہی حکم ہے۔ اور اس مقصد سے کہ آبادی مسجد میں اضافہ ہو اس زائد وفاضل رقم سے مسجد کے متعلق دینی تعلیم کا مدرسہ بھی قائم کر سکتے ہیں (فتاوی رحیمیہ ۲؍۱۸۰)۔

اس خلاصہ سے دونوں سوالوں کے جواب حل ہوئے ہیں کہ اولاً اسی نوع کے اوقاف میں فاضل رقم خرچ کی جاوے، اور ضرورۃً دوسرے رفاہی کام مثلاً مسجد کی آبادی کی خاطر مدرسہ کے لئے بھی زائد رقم استعمال کر سکتے ہیں۔

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ اگر واقف نے وقف نامہ میں فروخت کرنے کی اجازت دی ہو یا وقف اس حالت میں ہو کہ اس سے کوئی نفع حاصل نہ ہو سکے تو فروخت کرنے کی گنجائش ہے۔ اگر کچھ بھی نفع حاصل ہوتا ہو تو اسے فروخت کرنے کی شرعاً گنجائش نہیں۔

شامی میں ہے: ''وجاز شرط الاستبدال الخ، اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه، الأول أن یشترط الواقف لنفسه فالاستبدال فیه جائز فی الصحیح وقیل اتفاقا، الثانی أن لا یشترطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحیث لا ینتفع به بالكلیة بأن لا یحصل منه شیء أصلا أولا یفی بمؤنته فهو أیضا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضی ورآیه المصلحة فیه، الثالث أن لا یشترطه أیضا ولكن فیه نفع فی الجملة وبدله خیر منه ریعا و نفعا وهذا لایجوز استبداله على الاصح المختار'' (شامی ۳،۴۲۲)۔

صورت مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ ان اوقاف کی آمدنی جب کہ اسکے مصارف اب باقی نہیں رہے تو قریب کے اسی نوع کے دوسرے اوقاف پر اسکو صرف کیا جائے۔

الف۔ بعض اوقاف کی عمارت مخدوش حالت میں ہے اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ نہیں ہے۔ اور کوئی بلڈر اسکے لئے تیار ہے کہ اس مخدوش عمارت کو ڈھاکر نئے سرے سے چند منزلہ عمارت اپنے مصارف پر اس شرط پر تعمیر کردے کہ اس کی ایک یا دو منزلیں اس کی ہونگی، جس میں اسکو ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا اور بقیہ وقف کے مصارف کے لئے، تو اس معاملہ کا شرعی حکم، نیز اسی طرح وقف کی ایک زمین ہے جس پر کسی طرح کی کوئی عمارت نہیں اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی صورت ہے۔ زمین سے فائدہ اٹھانے کے لئے کسی بلڈر سے اس طرح معاملہ کرلیا جائے تو ان دونوں معاملوں کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر وقف کی عمارت اس طرح مخدوش ہے، جو سوال میں ذکر کی گئی اور نہ ہی وقف کے پاس تعمیر کے لئے صرفہ ہے تو اس وقف کی عمارت میں سے ایک دو مکانات کرایہ پر دئے جائیں اور اس کی آمدنی سے وقف کی عمارت کی مرمت کی جائے۔

شامی میں ہے: ''إن الخان لو احتاج إلى مرمة آجر بیتا أو بیتین وأنفق علیه۔ وفی روایة یؤذن الناس بالنزول سنة ویؤجر سنة أخری ویرم من أجرته'' (شامی ۳،۴۱۹)۔

معلوم ہوا کہ اس وقف عمارت سے جب تک اس طرح کا معاملہ ممکن ہو اس پر عمل کیا جائے اور اگر اس طرح کوئی مستاجر نہ ملے اور نہ ہی موجودہ مستاجر اس کی مرمت کے لئے تیار ہے تو شامی میں صراحت موجود ہے کہ اس وقف عمارت کو فروخت کر کے اس کی جگہ دوسرا وقف خرید لیا جائے۔ شامی کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''فالحاصل أن الموقوف علیه السكنى إذا امتنع من العمارة ولم یوجد مستأجر باعها القاضی واشترى بثمنها ما یكون وقفا'' (شامی ۳،۴۱۸)۔

جب اس وقف عمارت اور زمین کو اس حالت میں فروخت کرنے کی گنجائش ہے تو صورت مسئولہ تو اس سے اہون ہے اس میں وقف باقی رہتا ہے فروخت نہیں ہوتا۔ ہاں اسکے کچھ حصہ پر بلڈر کا تصرف ہوگا، لہذا شرعاً اس کی بھی گنجائش ہوگی۔ اور عالمگیری میں اس سے زیادہ صراحت موجود ہے۔ "عالمگیری" کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''ومن هذا الجنس منزل موقوف وقفا صحيحا على مقبرة معلومة فخرب هذا المنزل و صار بحال لا ينتفع به۔ فجاء رجل وعمر و بنى فيه بناء من ماله بغير إذن أحد فالأصل لورثة الواقف والبناء لورثة الباني كذا في المضمرات'' (عالمگیری ۴۸۰)۔

ب۔ اسی طرح کسی وقف شدہ مخدوش عمارت کی نئی تعمیر کے لئے یا خالی زمین پر عمارت قائم کرنے کے لئے یا محتاج تعمیر مسجد کی تعمیر کے لئے وقف شدہ زمین و جائداد کا کوئی حصہ فروخت کر کے اس سے نئی تعمیر کرنے کا مسئلہ یہ ہے کہ جب کہ وقف کی حفاظت کا مقصد ہو اور اس کے بغیر یہ ممکن نہ ہو تو اس کا حکم بھی اوپر مذکورہ جواب کے مانند ہے کہ اولاً اس تعمیر کو کسی کام کے لئے اجارہ پر دی جائے اور اس کی آمدنی سے اس کی مرمت کی جائے ورنہ اس کے لئے دوسری وقف شدہ زمین فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

''عالمگیری'' میں ہے: ''وإذا خربت أرض الوقف وأراد القيم أن يبيع بعضاً منها ليرمّ الباقي بثمن ما باع ليس له ذلك'' (عالمگیری ۳،۴۱۷)۔

اور شریعت میں تو اس صورت حال کی یہ بھی گنجائش ہے کہ اگر مسجد اس طرح محتاج تعمیر ہو تو مسجد کی چھت کو کرایہ پر دے کر اس کے کرایہ سے اس مسجد کی تعمیر کر لی جائے۔ جیسے شامی کی اس عبارت سے ظاہر ہے:

''وقال الناطفي القياس في المسجد أن يجوز إجارة سطحه لمرمة'' (شامی ۳،۴۱۹)۔

لہذا جب تک اس وقف شدہ تعمیر کو ان طرق مذکورہ سے تعمیر کرنا ممکن ہو، وہاں تک کسی جائداد کو فروخت نہ کیا جائے۔

مسجد یا قبرستان کے لئے وقف زمین جو کہ ضرورت سے زائد ہے اس پر مدرسہ کی تعمیر کا مسئلہ:

نظام الفتاوی میں لکھا ہے کہ جو قبرستان موقوفہ ہے اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک اس میں مردے دفن کرنا ہی متعین ہو اس کے علاوہ کسی دوسرے کام میں لانا جس سے منشاء واقف فوت ہو تو درست وجائز نہیں (نظام الفتاوی ۱۷۴/۱)۔

یہی حکم مسجد کا بھی ہے کہ واقف نے اسکو مسجد ہی کے لئے وقف کیا تھا دوسرے کام کے لئے نہیں تو اس کو دوسرے کام میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادی ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہو پا رہا ہے یا یہ کہ قبرستان آبادی میں آ گیا ہے اس کی وجہ سے اب اس کے استعمال اور تدفین پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور اس کی وجہ سے اس پر قبضہ کا خطرہ ہے لیکن قبضہ ہو رہا ہے تو ان قبرستانوں کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر قبرستان وقف ہو اور اس میں تدفین جاری ہو تو اس میں صرف تدفین کرنا چاہئے کسی اور کام میں استعمال کرنا درست نہیں۔ اور اگر اس میں تدفین ہو چکی ہو اور یوں ہی پڑے رہنے کی وجہ سے اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس کی حفاظت کی خاطر کہ وہ ضائع نہ ہو جائے دینی تعلیم کا مدرسہ بنانا اور مسجد بنانا سب جائز ہوگا، البتہ کوشش یہ کی جائے کہ خالی جگہ میں تعمیر کی جائے ورنہ قبروں کا جب کہ وہ پرانی ہو چکی ہوں کہ میت کا جسم مٹی بن چکا ہوگا تو ان قبروں کا تاج ہٹا کر یا مٹی پاٹ کر اس کی کرسی اتنی اونچی کر دی جائے کہ وہ قبریں زمین میں چھپ جائیں یہ درست ہے (فتاوی نظامیہ ۱/۳۲۷)۔

بہت سی قدیم مساجد اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہیں ایسی بعض مساجد میں حکومت نے نماز کی ادائیگی کو منع کر دیا ہے، شرعاً حکومت کو اس کا کسی طرح کوئی حق نہیں، ایسی صورت میں حکومت سے احتجاج کیا جائے اور نماز کی پابندی اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

قبرستان کی حفاظت کے لئے باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور یہ شکل اختیار کی جائے کہ اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرادی جائے جس کے لئے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے لی جائے اور اس رقم سے یہ کام کرایا جائے جس میں قبرستان کے اطراف کا چند فٹ حصہ دوکانوں میں چلا جائے گا تو کیا ایسا کرنا درست ہے؟ اور بعد میں فاضل آمدنی مصارف خیر میں لگا دی جائے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ قبرستان کے اطراف کا جو حصہ دوکان بنانے میں جا رہا ہے اس کی تولی

الحال ضرورت ہے اور نہ تو آئندہ ضرورت متوقع ہے تو اس میں دوکانیں بنا کر قبرستان کو محفوظ کر سکتے ہیں۔ اور جو آمدنی قبرستان کی ضرورت سے فاضل ہو اس کو مصارف خیر میں استعمال کر سکتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حکم بھی اوپر کی طرح ہے کہ مسجد کی توسیع میں اگر قبرستان کی اتنی زمین مستعمل ہو جس کی نہ فی الحال قبرستان کے لئے ضرورت ہے اور نہ آئندہ اس کی ضرورت متوقع ہو تو اس طرح اس کی توسیع کی جائے کہ قبریں نمازیوں کے سامنے نہ ہوں، بلکہ درمیان میں دیوار مسجد حائل ہو (فتاوی محمودیہ بحوالہ عینی ار ص ۴۸۷) البتہ نئی قبریں جہاں میت کا جسم مٹی نہ بنا ہو یہ تعمیر درست نہ ہوگی۔

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ اس کو حرام کہا گیا ہے۔ "تقریرات الرافعی علی رد المحتار" میں ہے:

"ويشترط للصحة بلوغه وعقله لاحريته وإسلامه فى منهوات الأنقروية هذا يدل على أن تولية الذمى صحيحة وينبغى أن يخص بوقف الذمى، فإن تولية الذمى على المسلمين حرام لا ينبغى اتباع شرط الواقف فيها من خط ابن نجيم" (تقریرات الرافعی ۲٫۸۴)۔

لہٰذا ایسے اوقاف کے متعلق مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ غیر مسلم کی تولیت سے نکل کر مسلمانوں کی تولیت میں داخل ہو جائے۔

☆☆☆

محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی مساجد کے احکام

مولانا محمد صدر عالم قاسمی

اشیاء موقوفہ کا حکم:

الف،ب۔ جب کسی شئ کو وقف کردیا گیا تو وہ شئ واقف کی ملکیت سے نکل جانے کی وجہ سے نہ تو فروخت کی جاسکتی ہے نہ ہبہ کی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس میں اجراء وراثت ہی ممکن ہے، نہ اس کا استبدال ہی جائز ہے۔

''فإذا تم الوقف ولزم لا يملك ولا يرهن قوله لا يملك أى لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالة تمليكه الخارج عن ملكه'' (رد المحتار ۴۲۴،۳)، (ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الإمام والثانى) أبداً إلى قيام الساعة'' (ردالمحتار ۵۱۲،۳)۔

اشیاء موقوفہ میں تبادلہ کی گنجائش:

اگر کوئی ایسی صورت حال پیش آجائے کہ مقاصد اوقاف باقی نہ رہ سکیں، مثلاً وہ جگہیں جہاں یہ اوقاف ہیں مسلمانوں کے بالکلیہ ختم ہوجانے کی وجہ سے ویران ہوچکی ہوں، دور دور تک مسلمانوں کا نام ونشان نہیں ہے، اور ان اوقاف کا بروئے کار لانا مشکل ہوگیا ہو، اور ایسے اوقاف پر حکومت کا ناجائز قبضہ ہوتا جارہا ہو، تو ان مذکورہ صورتوں میں تین علتوں کی بنا پر اوقاف کو فروخت کرنے یا کسی دیگر افراد کو حوالہ کرکے اس کے عوض متبادل اوقاف قائم کرنے کی احقر کے نزدیک گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ایک علت تو مقاصد اوقاف کا معطل اور برباد ہونا ہے، کیونکہ فقہاء کا اصول ہے "إن مراعاة غرض الواقف واجبة" (ردالمحتار ۳،۳۶۲)(واقف کی غرض کی رعایت واجب ہے)۔

دوسری علت عدم حفظ اوقاف ہے جو کہ حکومت کے ناجائز قبضہ کی وجہ سے رونما ہورہی ہے۔

''وفى فتح القدير فمن أرض الوقف إذا غصبها الغاصب وأجرى عليها الماء حتى صارت بحراً لا تصلح للزراعة يضمن قيمتها ويشترى بها أرضا أخرى، فتكون أرضا مكانها الخ'' (فتح ۵،۴۳۹)۔

(وقف کی زمین کو اگر کوئی غصب کرلے اور اس میں اتنا پانی ڈالے کہ وہ پانی کی زیادتی کی وجہ سے قابل کاشت نہ رہ جائے تو وہ قیمت کا ضامن ہوگا اور اس سے دوسری زمین خرید کر اس کو اس کی جگہ وقف قرار دیا جائے گا)۔

تیسری علت فقدان منافع اوقاف ہے، کیونکہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جب اوقاف کے منافع بالکلیہ مفقود ہوجائیں تو ان اوقاف کو فروخت کرکے بدل قائم کئے جاسکتے ہیں۔

''والثانى لا يشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شئ أصلا أولا يفى بمؤنته، فهو أيضا جائز'' (رد المحتار ۴۲۴،۳)۔

''الفقہ الاسلامی وأدلتہ'' کے اندر ہے:''(شروط الاستبدال) أن يخرج الموقوف عن الانتفاع به بالكلية أى يصبح عديم المنفعة'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۸،۲۲۲)۔

استبدال کے سلسلے میں اوقاف مساجد اور دیگر اوقاف کے حکم میں مساوات:

استبدال کے سلسلے میں اوقاف مساجد اور دیگر اوقاف کے احکام مساوی ہیں، یعنی جس طرح دیگر اوقاف کے مجبوری کی وجہ سے بدل قائم کئے جاسکتے ہیں اسی طرح مساجد کے اوقاف کے بھی بدل قائم کئے جاسکتے ہیں۔

استبدال اوقاف کے اندر مقاصد واقف کی پابندی:

فقہاء نے صراحت کی ہے: "صرحوا بأن مراعاة غرض الواقف واجبة" (رد المحتار ٣،٤٦٢) کہ واقف کے مقاصد کی پابندی بہر صورت ضروری ہے، اس لئے علی الاطلاق کسی وقف پر مسلمانوں کے تعلیمی ورفاہی ادارے قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہاں جہاں مقاصد اوقاف کا حصول ہو رہا ہو احقر کے نزدیک ان جگہوں میں اس کی گنجائش رہے گی۔

الف۔ مسجد پر وقف اراضی جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہیں، اس زائد اراضی پر اگر کوئی دینی ادارہ قائم کرلیا جائے تو اس کی گنجائش اس وجہ سے معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کے درمیان انتہا درجہ قرب اور مقاصد واقف جو کہ "التقرب الى الله وحصول الثواب" ہے موجود ہے۔

ب۔ مسجد کی زائد آمدنی کو علی الاطلاق تعلیمی یا رفاہی مقاصد میں صرف نہیں کیا جاسکتا، بلکہ الاقرب فالاقرب کا لحاظ کرتے ہوئے دیگر محتاج مساجد میں صرف کیا جائے گا، البتہ اگر اس نوع کے اندر ضرورت محسوس نہ ہو تو پھر جس نوع کے اندر مقاصد واقف کا حصول ہو رہا ہو وہاں صرف کیا جائے گا۔

الف، ب۔ وہ اوقاف جن کی آمدنی فاضل از ضرورت ہو، کثیر تعداد میں ہونے کی وجہ سے اس کی حفاظت دشوار ہو جائے تو ان آمدنیوں کے اصل مصارف ان کے انواع واجناس ہیں۔ لیکن اگر کسی دوسرے نوع کے اندر غایت درجہ کا قرب اور غرض واقف کا ایفاء موجود ہے تو پھر ان دیگر انواع واجناس کی جانب منتقلی کی گنجائش ہے۔

کم منفعت بخش اوقاف کا استبدال:

اوقاف کے سلسلے میں اصل حکم تو یہی ہے کہ فی الجملہ کچھ بھی منافع حاصل ہو رہا ہو تو اس کے استبدال کی بالکل اجازت نہیں تاوقتیکہ بالکلیہ اس کے منافع معدوم ومفقود نہ ہو جائیں۔

"والثالث أن لا يشرطه أيضا ولكن فيه نفع فى الجملة وبدله خير منه ريعا و نفعا وهذا لايجوز استبداله على الأصح المختار" (ردالمحتار ٣،٤٢٤)۔

لیکن فقہاء امت کے بعض اقوال سے اس بات کی گنجائش مل رہی ہے کہ وہ اوقاف جن کی ضرورتیں کم منافع بخش جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے نہیں پوری ہو رہی ہوں تو زیادتی منفعت کی خاطر اس کو فروخت کرکے دوسری جگہ اس کا بدل قائم کیا جاسکتا ہے۔ کتاب "البحر الرائق" کے اندر ہے:

"وإن كان للوقف ريع ولكن يرغب شخص فى استبداله أن أعطى مكانه بدلا أكثر ريعا فى صقع أحسن من صقع الوقف جاز" (البحر ٥،٢٢٣)۔

اور "فتح القدیر" کے اندر ہے: "وكذا أرض الوقف إذا قل نزلها بحيث لا تحتمل الزراعة ولا تفضل غلتها عن مؤنتها ويكون الصلاح فى الاستبدال بأرض أخرى (فيشترى بها أرضا أخرى)" (فتح القدیر ٥)۔

کنز الدقائق کے اندر امام محمدؒ کا قول مذکور ہے جو کہ اسی گنجائش کی جانب مشیر ہے:

"قد روى عن محمد إذا ضعفت الأرض الموقوفة عن الاستغلال والقيم يجد بثمنها أخرى أكثر ريعا كان له أن يبيعها ويشترى بثمنها ماهو أكثر ريعا وقيل هذا إذا باعه الموقوف عليه لضرورة" (الکنز مع البحر ٥،٢١٩)۔

لیکن اگر اس مسئلے کی یوں تفصیل بیان کی جائے کہ اوقاف کی آمدنی اتنی کم ہے کہ اپنی ضرورت کے ایفاء کے لئے دوسرے سے قرض لینا پڑتا ہے اور ہر سال قرضے پہ قرضہ ہوتا جارہا ہے، ادائیگی قرض کی کوئی صورت موجود نہ ہونے کی وجہ سے غالب گمان ہے کہ ایک نہ ایک دن ان اوقاف کو فروخت کرنے کی نوبت آپڑے گی جو کہ تعطل اوقاف پر مبنی ہے تو ان مذکورہ مجبوری اور ضرورت کے پیش نظر ان اوقاف کو فروخت کرکے زیادہ منفعت بخش مقام پر اس کا بدل قائم کرنے کی

گنجائش نکل سکتی ہے۔

وہ اوقاف جن کے معینہ مصارف ختم ہو چکے:

بہت سے اوقاف ایسے ہیں جن کے معینہ مصارف ختم ہو چکے، مثلاً کوئی جاگیر کسی معین خاندان کے فقراء کے لئے وقف کی گئی تھی وہ خاندان ختم ہو گیا۔ تو اب اس کی آمدنی اور منافع دیگر فقراء کی جانب منتقل ہو جائیں گے۔ اور ان سے ان کے حوائج وضروریات پورے کئے جائیں گے، جیسا کہ "فتح القدیر" کی عبارت سے یہ چیزیں مستنبط ہو رہی ہیں:

''وفی الفتح وقف علی زید ثم المساکین فرد زید فهو للمساکین وکذا علی زید و عمر فرد أحدهما أو ظهر أنه کان میتا فنصیبه للمساکین'' (فتح ۵؍۴۵۱)۔

اسی طرح اگر معین مدارس ومساجد پر وقف تھے، اور اب وہ مدارس ومساجد ختم ہو چکے تو اب ان کے منافع وآمدنی علی حسب الانواع والاجناس قریب تر مدارس ومساجد جو محتاج ہیں، پر صرف کئے جائیں گے۔

''وفی البحر ولو وقف علی إنسان بعینه أو علیه وأولاده أو علی قرابته وهم یحصون أو علی أمهات أولاده فمات الموقوف علیه فعلی الأول یعود إلی ورثة الواقف قال الناطقی إلی الأجناس وعلیه الفتوی'' (البحر الرائق ۵؍۲۰۲)۔

جیسا کہ ماسبق میں تحریر کیا جا چکا ہے اگر دیگر انواع سے اس نوع کو قریبی تعلق ہو اور غرض واقف کی پابندی ہو رہی ہو تو پھر دیگر اوقاف کی جانب منافع کے انتقال کی گنجائش ہو سکتی ہے، علماء کرام اس علت پر غور فرمالیں۔

الف۔ مخدوش شدہ عمارت کی نئی تعمیر کے لئے کسی بلڈر سے ایک یا دو منزل کی ملکیت کی شرط پر معاملہ کرنا درست نہیں ہے، بلکہ بطریق اجارہ معاملہ کیا جا سکتا ہے بایں طور کہ انہیں رقوم سے ان کے کرائے وضع ہوں۔

ب۔ اسی طرح مخدوش شدہ عمارت کی تعمیر کے لئے وقف کے بعض قطعہ کو فروخت کرنے کی بھی اجازت نہیں، بلکہ یہاں بھی حصول رقوم کی خاطر زمین کو کرائے پر دیا جا سکتا ہے۔

مسجد پر وقف زمین جو مسجد کی ضرورت سے زائد ہے اس پر مدرسہ کی تعمیر کی گنجائش اس وجہ سے معلوم ہو رہی ہے کہ دونوں صورتوں میں غرض واقف جو کہ "التقرب إلی الله وحصول الثواب" ہے بطریق اکمل حاصل ہو رہا ہے۔

پابندی عائد شدہ قبرستان سے انتفاع کی صورت:

جس قبرستان کے اطراف سے آبادی ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہو رہا ہے یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، اور اس پر قبضہ کا خطرہ ہے، بلکہ قبضہ ہو رہا ہے تو چونکہ فقہاء کا اصول ہے۔ "ان مراعاة غرض الواقفین واجبة" (در مختار علی هامش رد محتار ۳؍۴۶۳)، اس لئے اس کو علی حالہ اغیار کے قبضہ کے لئے چھوڑنا در حقیقت اس کو معطل اور منافع کو مفقود کرنا ہے جو کہ غرض واقف کے خلاف ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ ایسے تدابیر کئے جائیں جن سے بقاء غرض واقف اور بجائے اس کے تعطل کے اس کے منافع لوٹ سکیں، مثلاً اس کے اطراف میں باؤنڈری ڈال دی جائے، یا اطراف میں تعمیر کرا دی جائے، اور اگر کسی طرح تحفظ ممکن نہ ہو تو پھر شریعت کے اندر بحالت مجبوری اس کے استبدال کی گنجائش تو موجود ہی ہے۔ اسکو فروخت کر کے دوسری جگہ اس کا بدل وقف قائم کر لیا جائے۔

محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی مساجد کے احکام:

وہ مساجد جن کے محکمہ آثار قدیمہ میں ہونے کی وجہ سے ان میں ادائیگی نماز سے روک دیا گیا ہے۔ حکومت کا یہ فعل مذموم اور مقاصد مساجد کے خلاف ہے۔ بلکہ یہ آیت کریمہ "ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن یذکر فیها اسمه وسعی فی خرابها..." الخ (سورہ بقرہ ۱۱۴) کے مرادف ہے، اس لئے حکومت کو اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ مسلمانوں پر ضروری ہے کہ حکومت سے مطالبہ کر کے مقاصد مساجد کا اجراء کروائے، اور اپنی طاقت ووسعت کے مطابق حکومت

کے ان منکرات کو دفع کرے اور اگر دفع کرنے کی بالکل طاقت وقدرت نہیں ہے تو پھر دل سے ناگواری کافی ہے۔"وهذا ظاهر من القواعد الشرعية".

قبرستان کی تعمیر کے لئے پیشگی کرایہ لینا:

قبرستان کی حفاظت کے لئے جب کہ باؤنڈری بنانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کے لئے کسی سے پیشگی کرایہ لے کر اس طرح تعمیر کرائی جائے کہ قبرستان کے اطراف کے کچھ حصے تعمیر میں چلے جائیں۔ تو احقر کے نزدیک اگر اس حصے میں نئی قبریں ہیں تو پھر اس حصے میں تعمیر کی اجازت نہیں۔

''وفي العالمگيرية: ولو بلى الميت صار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه'' (عالمگیری ۱،۱۵۶) وکذا في التبيين رہی بات فاضل آمدنی کے مصارف کی تو اس میں قدرے تفصیل کرنی پڑے گی۔ وہ یہ کہ اگر خود قبرستان کی ضرورت موجود ہو تو پھر اس آمدنی کو اس میں صرف کرنا چاہئے۔ شرح وقایہ کے اندر ہے:

''ونقضه إلى عمارته أو يدخر إلى وقت الحاجة إليها إن تعذر صرفه بيع وصرف ثمنه إليها''۔

اور اگر قبرستان کی خود اپنی ضرورت موجود نہ ہو تو فاضل آمدنی کے بہتر مصارف ان کے انواع واجناس ہیں۔

''وفي الدر المختار: ومثله حشيش المسجد وحصيره مع الاستغناء عنها وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما، فيصرف وقف المسجد والرباط والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض إليه الخ. وفي رد المحتار لف و نشر مرتب و ظاهره أنه لا يجوز صرف وقف المسجد خرب إلى حوض أو عكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها'' (ردالمحتار ۳،۵۷۴)۔

علاوہ ازیں جب کہ واقف کے غرض کی پابندی اور اس کے مقاصد کی حصول یابی اگر دوسرے انواع واجناس کے مصارف خیر میں ہو رہی ہو تو ان دیگر مصارف خیر میں بھی ان کو صرف کرنے کی احقر کے نزدیک گنجائش ہے۔ کیونکہ اوقاف کے کلی مسائل کے اندر غرض واقف کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اس سے عدول جائز نہیں۔

قبرستان میں موجود مسجد کی توسیع:

کسی قبرستان میں چھوٹی سی مسجد ہے، اب جب کہ مسلمانوں کی آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے اس کی توسیع کی ضرورت پڑ گئی تو قبر کے مزید کچھ حصے شامل کر کے اس کی توسیع کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں آباد اور ویران دونوں اعتبار سے کچھ فرق نہیں، البتہ اس حصے میں جدید اور قدیم ہونے کے اعتبار سے فرق ہے۔

چنانچہ اگر قبر بالکل نئی ہے تو پھر اس حصے میں توسیع کی اجازت نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس سے قبر کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اور اگر قبریں پرانی اور بوسیدہ ہیں اور مردے مٹی ہو گئے ہیں تو اس حصے کو توسیع کے اندر شامل کر لینے کی اجازت ہے حتی کہ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہ تو صاحب قبر کی خوش قسمتی کی بات ہے کیوں کہ حرم کے مطاف میں بھی انبیاء کی قبریں ہیں (فتاوی رحیمیہ ۸۶/۶)۔

عالمگیری کے اندر ہے: ''ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه'' (عالمگیری ۱،۱۵۶، وہکذا فی التبیین ۱،۲۴۶)

اوقاف کا ہندوؤں کی تولیت میں رہنا:

وہ اوقاف جو اسلامی مقاصد کے تحت وجود میں آئے ہوں اور واقف کے ہندو ہونے کی وجہ سے ہندو ادارے کے ماتحت ہو کر انہیں کے نظم ونسق کے اندر ہوں تو ایسے اوقاف کا ہندو ادارے کی تولیت میں رہنا درست نہیں کیونکہ من جملہ شرائط تولیت میں سے امانت، دیانت اور فسق وفجور سے پاکیزگی بھی ہے۔ اور یہ تمام صفات کافروں میں اعلی طریقے پر موجود نہیں۔

''البحر الرائق'' کے اندر ہے: ''وفي الاسعاف لا يولى إلا أمين قادر بنفسه أو بنائبه؛ لأن الولاية مقيدة بشرط النظر و ليس من النظر تولية الخائن؛ لأنه يخل بالمقصود، وكذا تولية العاجز؛ لأن المقصود لا يحصل إلا به'' (البحر الرائق ۵،۲۲۶)۔

☆☆☆

اوقاف

مولانا عطاء اللہ قاسمی [1]

الف۔ ایسے اوقاف جو مسلمانوں کی اجتماعی نقل آبادی کے سبب ویران ہو چکے ہیں، یا اوقاف ایسے مقامات پر ہیں کہ دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناممکن ہو چکا ہے، پھر بھی ایسے اوقاف کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

''إذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه'' (هدایه ۲٫۶۴۰)۔

نیز ''فتاوی عالمگیری'' میں ہے:

''الوقف مرسلا لم یذکر فیه شرط الاستبدال لم یکن له أن یبیعها ویستبدل بها وإن کان أرض الوقف سبخة لا ینتفع بها کذا فی فتاوی قاضی خان'' (الفتاوی الهندیه ۲٫۴۲۰)۔

ب۔ ہاں ایسے اوقاف کا استبدال جائز ہے، یعنی ایسے ویران اوقاف حکومت یا کسی فرد کے حوالے کر کے اس کے عوض دوسری زمین یا مکان حاصل کر لیا جائے، یہ عوض معوض کی نوع کا ہی وقف قرار پائے گا، اور معوض کے ہی مقاصد اس پر جاری ہوں گے۔

''والمعتمد أنه یجوز للقاضی بشرط أن یخرج عن الانتفاع بالکلیة وأن لا یکون هناك ریع للوقف یعمر به وأن لا یکون البیع بغبن فاحش کذا فی البحر الرائق'' (فتاوی عالمگیری ۲٫۴۲۰)۔

استبدال وقف کے سلسلے میں مساجد اور دوسرے اوقاف کا حکم قطعاً یکساں نہیں ہے، بلکہ دونوں میں بنیادی فرق ہے، اور وہ یہ کہ مساجد کے علاوہ دوسرے تمام اوقاف حتی کہ مساجد پر وقف جائداد کا استبدال بشرائط جائز ہے، لیکن مساجد کا استبدال جائز نہیں ہے، کیونکہ جو جگہ ایک بار مسجد ہو گئی وہ ابدال آباد تک مسجد ہی رہے گی، اور وہ جگہ شخصی تصرفات وملکیت سے خارج ہو کر حق تعالی کی ملک ہو جاتی ہے۔

''قال اللہ تعالی: ''أن المساجد للہ'' (سورہ جن)۔

''وفی رد المحتار: إن المسجد إذا خرب یبقی مسجداً أبداً''۔

مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب ؒ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: جب مسجد کی جگہ ویران ہو جائے اور مسجد میں نمازی نہ رہیں اور اس کو آباد رکھنے کی کوئی صورت متصور نہ ہو تو اس کو مقفل کر کے محفوظ کر دیا جائے اور اس کا روپیہ کسی دوسری حاجتمند مسجد میں صرف کر دیا جائے (کفایت المفتی ۷/۶۲)۔

مسلمہ فقہی قاعدہ "شرط الواقف کنص الشارع" کے پیش نظر واقف کے مقاصد کی پابندی بہت ضروری ہے، اس لئے ویران اور ناقابل استعمال اوقاف کو اگر فروخت کر دیا گیا تو اس روپئے سے واقف کے خلاف مقصد تعلیمی یا رفاہی ادارے قائم نہیں کئے جا سکتے، بلکہ اس سے دوسری زمین خرید کر واقف کے مقاصد جاری کئے جائیں گے، اور اگر واقف کے شرائط ومقاصد معلوم نہ ہو سکیں تو فقراء ومساکین اس کے حقدار ہیں۔

الف۔ مسجد پر وقف اراضی جو فی الحال مسجد کی ضرورت سے زائد ہیں ان پر مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیمی ادارہ نہیں قائم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا جہت وقف کی تبدیلی ہے، جسکا اختیار لزوم وقف کے بعد خود واقف کو بھی نہیں چہ جائیکہ کسی دوسرے کو۔

''ماکان من شرط معتبر فی الوقف فلیس للواقف تغییره ولا تخصیصه بعد تقرره ولا سیما بعد الحکم''

---

[1] استاذ مدرسہ ضیاء العلوم پورہ معروف، مئو۔

(ردالمحتار ۶۸۵)۔

ب۔ مسجد اور مسجد کے اوقاف کی آمدنی صرف ان ہی مصارف میں خرچ کرنا جائز ہے جن کو مسجد کی آبادی میں دخل ہے اگر واقف نے ان زمینوں اور مکانات کو مسجد ہی کے لئے وقف کیا ہے تو کسی دوسرے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے۔

الف، ب۔ جن اوقاف کی آمدنی اسکے مصارف سے زیادہ ہے اس فاضل رقم کو اسی نوع کے دوسرے اوقاف کی ضروریات میں خرچ کیا جاسکتا ہے، موقوف علیہ کی جنس کا دوسرا موقوف علیہ جو اس سے قریب ہے وہ زیادہ مستحق ہے، پھر اس کے بعد کسی بھی خطہ میں اس نوع کا وقف ہو تو اس میں خرچ کیا جائے گا۔ لیکن موقوف علیہ کے علاوہ دیگر ملی دینی وعلمی کاموں اور مساجد وغیرہ میں خرچ کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایسا کرنا جہت وقف کی تبدیلی ہوگی جس کا اختیار کسی کو نہیں، نہ خود واقف کو اور نہ امام المسلمین کو۔

''ما كان من شروط معتبرة فى الوقف فليس للواقف تغييره ولا تخصيصه بعد تقرره ولا سيما بعد الحكم'' (رد المحتار)۔

جو اوقاف منفعت بخش ہیں اگر چہ کم ہی سہی انکو فروخت کرنا یا اس کا استبدال کرنا جائز نہیں، ''فتاوی عالمگیری'' میں ہے:

''والمعتمد أنه يجوز للقاضي بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية'' (فتاوی عالمگیری ۲،۲۲۰)۔

جن اوقاف کے مصارف ختم ہو چکے ہیں تو ان اوقاف کی آمدنی فقراء پر خرچ ہوگی۔

''وشرط لتمامه ذكر مصرف مؤبد، وقال أبويوسف: يصح بدونه، وإذا انقطع صرف على الفقراء'' (شرح وقایہ ۲،۳۵۴)۔

الف، ب۔ وہ اوقاف جن کی عمارتیں مخدوش ہوں اور وقف کے پاس اس کی تعمیر کے لئے سرمایہ نہ ہو، اسی طرح وقف کی ایک زمین ہے جس پر کسی طرح کی کوئی عمارت نہیں اور نہ ہی اس سے انتفاع کی کوئی صورت ہے تو ایسے اوقاف کی تعمیر کے لئے کسی بلڈر یا کسی شخص سے اس شرط کے ساتھ معاملہ کرنا کہ تعمیر شدہ عمارت کی ایک دو منزل یا وقف زمین کا کچھ حصہ اس بلڈر کی ملکیت میں ہوگا اور اسکو ہر قسم کا تصرف کرنے کا حق ہوگا اور بقیہ عمارت مصارف وقف کے لئے ہوگی شرعاً اس شرط کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ وقف کی بیع ہوگی۔

''اعلم أن بعض المتأخرين جوزوا بيع بعض الوقف إذا خرب لعمارة الباقي والأصح أنه لا يجوز. فإن الوقف بعد الصحة لا يقبل الملك كالحر لا يقبل الرقبة'' (شرح وقایہ ۲،۳۵۴)۔

اس کی تعمیر کی بہترین صورت یہ ہے، فقہاء نے جس کی اجازت اس طرح دی ہے:

''آجره الحاكم وعمره بأجرته ثم رده إلى مصرفه'' (شرح وقایہ)۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی بلڈر اس طرح معاملہ کرے کہ عمارت کا کرایہ وہ لیگا یہاں تک کہ اس کا خرچ کردہ سرمایہ حاصل ہوجائے گا اسکے بعد عمارت وقف کی ہوجائے گی تو جائز ہے۔

''لأن استبقاء الوقف واجب ولا يبقى إلا بالعمارة، فإذا امتنع عن ذلك أو عجز عنه ناب القاضي منابه في استبقائه بالإجارة كالعبد والدابة إذا امتنع صاحبها عن الإنفاق عليها أنفق القاضي عليها بالإجارة كذا هذا'' (بدائع الصنائع ۶،۲۲۱)۔

اس لئے کہ وقف کا باقی رکھنا واجب ہے جو تعمیر کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے، تو جب متولی اس سے انکار کرے یا عاجز ہو تو قاضی اس کا نائب ہوگا اس میں، کہ اس کو اجارہ کے ذریعہ باقی رکھنے کی کوشش کرے مثلاً غلام یا جانور جب ان کا مالک ان پر خرچ نہ کرے تو قاضی کرایہ پر دیدے، اور کرایہ ان پر خرچ کیا جائے گا، اسی طرح یہ صورت بھی ہوگی۔

اس سوال کا حاصل یہ ہے کہ مسجد یا قبرستان پر وقف زمین جو ضرورت سے زائد ہو اس پر دینی یا عصری علوم کی درسگاہ قائم ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ کا استفتاء عصر حاضر کے نامور فقیہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم سے کیا گیا کہ عیدگاہ کی فاضل اراضی کو مدرسہ کی تعمیر کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس استفتاء کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسی کا خلاصہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ حضرت مفتی صاحب مختلف نصوص فقہیہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

حاصل یہ کہ جملہ کتب معتبرہ میں وضاحت ہے کہ شرط واقف اور جہت وقف کے خلاف کرنا جائز نہیں، اگر موقوف علیہ سے استغناء ہو چکا ہو تو بھی وقف کی آمدنی موقوف علیہ کے مجانس اقرب پر صرف کی جائے گی اس حالت میں بھی جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں۔

”قال في التنوير: ومثله حشيش المسجد وحصيره مع الاستغناء عنها والرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر (والحوض) إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر (أو حوض) إليه. وقال في الشامية: (قوله إلى أقرب مسجد أو رباط الخ) لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها“ (رد المحتار ۳،۵۱۲)۔

مذکورہ جزئیہ اگرچہ مصرف اول کے خراب ہو جانے سے متعلق ہے، مگر مصرف اول سے اوقاف کی آمدنی اگر بہت زیادہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ استغناء دونوں صورتوں کو جامع ہے۔ آگے لکھتے ہیں: خلاصہ یہ کہ اصل موقوف علیہ سے استغناء کے وقت بھی جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں، اقرب مجانس پر صرف کرنا ضروری ہے۔ عالمگیریہ میں بھی اس قسم کا جزئیہ موجود ہے:

”سئل شمس الائمة الحلواني عن مسجد أو حوض خرب ولا يحتاج إليه لتفرق الناس هل للقاضي أن يصرف أوقافه إلى مسجد آخر أوحوض آخر قال: نعم ولو لم يتفرق الناس، ولكن استغنى الحوض عن العمارة وهناك مسجد محتاج إلى العمارة أو على العكس هل يجوز للقاضي صرف وقف ما استغنى عن العمارة إلى ما هو محتاج إلى العمارة قال: لا كذا في المحيط“ (عالمگیری ۲،۳۵۲)۔

اس عبارت میں اقرب مجانس کی تصریح نہیں، ”شرح التنویر“ اور ”شامیہ“ کے مذکورہ جزئیات میں وضاحت ہے کہ بحالت استغناء مسجد کا وقف قریب ترین مسجد پر اور حوض کا وقف قریب ترین حوض پر صرف کیا جائے (احسن الفتاوی ۶/ ۴۳۴، ۴۳۶)۔

جس قبرستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آبادی ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا استعمال بطور قبرستان نہیں ہو رہا ہے یا یہ کہ قبرستان آبادی کے اندر آ گیا ہے اس میں تدفین پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ نتیجہ کے طور پر قبرستان کی زمین پر غیروں کا قبضہ و تسلط ہوتا جا رہا ہے اس طرح یہ قبرستان اگر وقف ہے تو تعطل کا شکار ہونے کی وجہ سے اس کا استبدال بشرائط بھی جائز ہے۔

”والمعتمد أنه يجوز للقاضي بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية“ (عالمگیری)۔

اور اگر وقف نہیں ہے، بلکہ تدفین موتی کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے تو اس پر دوکان تعمیر کرا کے کرایہ پر چلایا جائے اور اس کی آمدنی فقراء و مساکین یا رفاہ عامہ کے کام پر خرچ کی جا سکتی ہے۔

”لو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره وزرعه والبناء عليه ومقتضاه جواز المشي فوقه“ (شامی)۔

قدیم مساجد کا تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور نہ ہی اس نگرانی سے جو مسجد کی شرعی حیثیت پر کوئی فرق پڑتا ہے، لیکن ان مساجد میں ادائیگی صلاۃ پر پابندی لگانے کا حق کسی کو یہاں تک کہ حکومت کو بھی نہیں ہے، شرعی طور پر بہت بڑا ظلم اور منکر ہے، واضح رہے کہ ازالہ منکر حسب استطاعت و قدرت فرض ہے جس کو قدرت ہے اس کے لئے واجب ہے کہ اس پابندی کو منسوخ کرائے۔ ”وهذا ظاهر من القواعد الشرعية“۔

سوال میں مذکورہ صورت قبرستان کی حفاظت کے لئے اختیار کرنا درست ہے، البتہ اتنی احتیاط ضرور کرنی ہوگی کہ قبرستان کا جو حصہ دکان کے زیر استعمال آنے والا ہے اس میں مردہ دفن کرنا چھوڑ دیا گیا ہو اور سابقہ قبروں کے نشانات مٹ گئے ہوں۔ اس قبرستان کی فاضل آمدنی قبرستان ہی کی حفاظت اور مرمت

میں خرچ ہوسکتی ہے کسی دوسرے مصرف میں نہیں۔

''لأن استبقاء الوقف واجب ولا يبقى إلا بالعمارة، فإذا امتنع عن ذلك أو عجز عنه ناب القاضي منابه في استبقائه بالإجارة كالعبد والدابة إذا امتنع صاحبها عن الإنفاق عليها أنفق القاضي عليها بالإجارة'' (بدائع الصنائع ۶،۲۲۱)۔

اگر اس قبرستان میں لوگوں نے مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دیا ہو اور سابقہ قبروں کے نشانات مٹ گئے ہوں تو مسجد کی توسیع جائز ہے۔

''ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ وزرعہ والبناء علیہ ومقتضاہ جواز المشی فوقہ'' (ردالمحتار ۱،۵۳۸)۔

مساجد پر غیر مسلم کی تولیت:

ہندوستان کی بعض ریاستوں میں راجاؤں اور جاگیرداروں نے مساجد پر بھی اراضی وقف کی ہیں۔ اور واقف کے ہندو ہونے کے باعث یہ مساجد اب ہندو اوقاف کے تحت ہیں اور ہندو وقف بورڈ ہی مسجد سے متعلق تمام نظم ونسق انجام دیتا ہے۔ میری ناقص رائے میں مساجد کا غیر مسلم ادارے کی تولیت میں رہنا درست نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں دو مسئلے ہیں ایک کافر کا مسجد بنانا یا مسجد کے لئے چندہ دینا۔ دوسرے مسجد کا غیر مسلم کے تصرف وتولیت میں باقی رہنا۔

''أما سببه فطلب الزلفى... وأما الإسلام فليس بشرط'' (فتاوی ہندیہ ۲،۲۱۷)۔

''وأن يكون قربة في ذاته أي بأن يكون من حيث النظر إلى ذاته وصورته قربة، الى قوله...فأفاد أن هذا شرط لوقف الذمي فقط'' (كتاب الوقف، ردالمحتار ۶،۵۲۲)۔

ان نصوص فقہیہ کی بنا پر کافر اگر قربت کی نیت سے مسجد تعمیر کرے یا مسجد میں چندہ دے تو جائز ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر میں مشرکین کو برقرار رکھنے سے زیادہ قوی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔ لیکن جواز کا یہ حکم اسی وقت تک ہے جب تک کہ مساجد پر تصرف وتسلط کا موجب نہ بنے، جیسے ہندو معماروں سے اجرت پر مسجد تعمیر کرانا، باوجودیکہ ہندو معمار حقیقی طور پر تعمیر کا مباشر ہے مگر یہ مباشرت ممنوع نہیں، جائز ہے۔ کیونکہ مزدوری پر کام کرنے سے کوئی شخص تصرف وتولیت کا مستحق نہیں ہوا کرتا۔

اور اگر مسجد کی تعمیر اور اس میں چندہ دینے سے کفار کا تصرف وتسلط ہورہا ہو تو حرام ہوگا۔ اور اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ تعمیر کفار کے مال سے ہو، بلکہ اگر کوئی کافر مسلمانوں سے چندہ جمع کرے اور مسجد کی تعمیر کرے، لیکن انتظام واہتمام میں خود مستقل ہو کسی مسلمان کو دخل نہ دینے دے تو یہ تعمیر بھی تعمیر ممنوع ہے، باوجودیکہ تعمیر مسلمان کے مال سے ہوئی ہو، کیونکہ اسلام کے مخصوص معابد پر کفار کا تصرف وتسلط ممنوع ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ انکی تولیت وتسلط سے مسلمانوں کی کوتاہی اور قصور ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کافر بحیثیت کافر ہونے کے شعائر اسلام اور خانہ خدا پر تصرف وتسلط کا مستحق نہیں ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ان دونوں مسئلوں پر بحث کرتے ہوئے ایک لطیف استدلال کیا ہے:

آیت کریمہ: "ما كان للمشركين أن يعمروا مساجد الله" (سورہ توبہ: ۱۷) سے اس تقدیر کے تعمیر سے تعمیر معروف مراد ہو، ثابت ہوتا ہے کہ اس میں حق تعالی نے کفار سے حق تعمیر کی نفی فرمائی ہے اور تعمیر سے بھی تعمیر کا ایک اکثری لازم مراد ہے اور وہ تصرف وتسلط ہے۔

پس آیت شریفہ میں اس تعمیر کے استحقاق کی نفی ہے جو تصرف اور تسلط کو مستلزم ہو۔ اور یہی مطلب ہے کتب تفسیر کی ان عبارتوں کا جن میں کفار کے لئے مساجد کی تعمیر معروف کو ممنوع لکھا ہے (کفایت المفتی ۷/۷۹)۔

☆☆☆

پانچواں باب

مناقشہ

مناقشہ اوقاف

خطبة افتتاحية

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی:

نبدأ البحث الآن حول موضوع الأوقاف وكما تعرفون أيها السادة! أن الوقف ثروة ثمينة للمسلمين فى جميع بلاد العالم، والأسف أننا قد ضيعناها بسبب قلة أمانتنا و بسبب قلة اهتمامنا هذه الثروة العظيمة وأنتم تعرفون أن الوقف قد ثبت عن النبى، وأيضا ثبت عن الخلفاء الراشدين المهديين، والصحابة قد وقفوا أراضيهم للمصالح العامة ولخدمات الإنسانية، وتاريخ أوقافنا تاريخ رائع، والمعروف كذلك أن المسلمين قد خدموا الإسلام وخدموا المسلمين وخدموا الناس جميعا فى جميع مجالات الحياة من التعليم والتداوى للمرضى وغير ذلك من أعمال الخير عن طريق هذه الأوقاف۔

وإن الوقف هو الحبس، والنكتة الأساسية فيه أن الأملاك يجب أن تكون محبوسة، لا تباع ولا تعار ولا توهب، ويتسع نفعها لكل مصرف الذى وقف الواقف عليه۔

من الأسف أن الزمان قد تغير، والأمانة قد ضيعت، وصارت الأوقاف مصيدة لهؤلاء الذين قد ضيعوا الأمانة فما كان موقوفا و محبوسا قد بيع وضيع فى الهند، يعيش المسلمون فيها منذ حوالى ألف سنين وأنهم قد أقاموا خلالها أوقافاً كبيرة، وفيها خدمات جليلة للأوقاف، ولكن حينما انهارت قيمنا الخلقية أصبحنا مصداق القول: ''أن لا إيمان لمن لا أمانة له ولا دين لمن لاديانة له'' فضيعنا هذه الثروات الثمينة. بالإضافة إلى فى هذا الزمان خاصة أن نظام الحكومة الهندية هونظام علمانى، و لا حاجة لها ولا علاقة لها بالتعليم الدينى۔

أيها الإخوة! إن أعدى الأعداء لنا هو الابتعاد عن الدين والجهل والفقر، نحن بحاجة الآن إلى مدارس كثيرة و إلى كتاتيب و مكاتيب فى جميع أنحاء الهند فى القرى و الأرياف البعيدة عن المدن، والمسلمون هم الفقراء لايستطيعون أن ينفقوا على هذا العمل العظيم، لوكانت الأوقاف حية ولو استعملنا هذه الأوقاف استعمالاً صحيحاً، والله لتتكفل هذه الأوقاف جميع مصارفنا فى سبيل التعليم و الخدمات الأخرى التى يحتاج إليها المسلمون، وهذه معضلةاشتريناها واكتسبناها بأنفسنا وبأيدينا۔ ''وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم'' (سورة الشورى)۔

فالآن الأوقاف فى يد الحكومة، وللحكومة الهندية تدخل كبير فيها، بالرغم من أنها شكلت لجنات الأوقاف،ولكن كما تعرفون أن الحكومة لا حاجة لها أن تصون هذه الأوقاف. فلذلك إذا شكلوا هذه اللجنات فى الولايات أوفى الحكومة المركزية فإنهم يرون فيها من هو قريب منهم ومن هو أقرب من أغراضهم۔

لا ينبغى أن نتغاضى عند البحث على هذه القضية أن قانون الأوقاف هذا داخل فى الأحوال الشخصية،

والحكومة ملزمة والمحاكم القضائية ملزمة بأن تتبع في هذه الأمور الأحكام الشرعية الإسلامية الدينية، والحال أن الحكومة قد وضعت لها قوانين، فهذه القوانين، فإن كانت لصيانة الأوقاف، ومع هذا قد خرجت من الشريعة الإسلامية، مثلا:

استبدال الوقف كما صرح به الفقهاء أنه لا يجوز إلا بإذن القاضي، وأيضا قد صرحوا أنه حينما نتكلم لفظ ''القاضي'' في بعض الوقف، فالمراد به قاضي القضاة، ولكن كل هذه الأمور قد فوضت إلى لجنة الأوقاف التي شكلتها الحكومة الهندية أو حكومة الولايات المختلفة، فما كان بأيدي القضاة قد خرج من أيدي القضاة الذين يعرفون الدين و الذين يعرفون قوانين الشرع، الذين يتقون الله، والذين نرجو منهم الأمانة والديانة، فلذلك بيع كثير من الأراضي الوقفية و خرجت من أيدينا، ولا تنسون أن هناك مدنا خاصة مثل بنجاب و هريانة قد خرج المسلمون منها عند تحرير الهند، فآلاف من المساجد وآلاف آلاف من الأوقاف قد خرجت من أيدينا فيها، فقد ضيعنا هذه الثروة الغالية۔

الآن نحن نحتاج إلى نظر في هذه القضية، كيف نصون و كيف نحفظ هذه الأوقاف؟ الحمد الله هنا في هذه الندوة المباركة يتواجد الأخ الشيخ عبد المحسن محمد العثمان وهو الأمين العام للأمانة العامة للأوقاف، وقد رأيت في البلاد الإسلامية ووجدت أوقاف المسلمين في الكويت أحسن حالا، و الحمد لله مسلمو الكويت لهم يد بالغة في الأمور الخيرية فوقفوا أوقافا كثيرة، وهؤلاء الرجال الكبار أنهم استعملوا هذه الأوقاف و استثمروا فيها و بذلوا جهدهم لتنمية الأوقاف و الاستثمار بها، فصار كل وقف ذا ريع، والوقف الذي كان يحصل منه مثلا مائة روبية، الآن بدأيعود بريعه إلى آلاف آلاف روبية، فهذه بركة من الله بسبب الأمانة وبسبب حسن التدبير، بارك الله في إخواننا بالكويت الذين عملوا عملا كبيرا في هذا السبيل، فجزاهم الله خير الجزاء۔

وهذه عبرة و هذا درس عظيم لنا أيها العلماء في الهند! يجب علينا أن ندرس هذه القضية في ضوء الفقه الإسلامي، ولا ننسى مقاصد الشريعة الإسلامية ولاننسى قواعد الكلية ولا ننسى مقاصد الوقف ولا ننسى ماذا هو مقصود الواقف الحقيقي، وهل يجوز لنا أن نضيع هذه الأوقاف؟ وهل يجوز لنا أن نتركها خربانا؟ ما فيها أي عائد للمسلمين، وقد قرأنا ودرسنا في الفقه أن ما هو أكثر نفعا للمستحقين هو الأحسن وهو الذي يجب علينا أن نختاره، فبهذه الكلمات الوجيزة على هذه القضية قضية الوقف نرجو من الأخ الفاضل عبد المحسن محمد العثمان الذي هو الآن رئيس هذه الجلسة۔ نرجو منه إن شاء الله أن يسلط الضوء خاصة على طرق تنمية الأوقاف وطرق الاستثمار وطرق صيانة الأوقاف، وقبل هذا كله نبدأ هذه الجلسة بتلاوة القرآن الكريم فأدعو الأخ المقرى عبد الخالق أن يتفضل هنا مشكورا ويتلو بعض آيات القرآن الكريم. شكراً۔

☆☆☆

مقالہ عبدالمحسن عثمان صاحب

جنہوں نے عربی زبان میں اپنے قیمتی خیالات پیش کئے،
ان کی گفتگو کا خلاصہ مولانا بدرالحسن قاسمی صاحب پیش کررہے ہیں

ہمارے فاضل مقالہ نگار ومقرر جناب عبدالمحسن عثمان صاحب نے آپ کے سامنے، نظر تو یہ آرہا تھا کہ مقالہ وہ لکھ کر لائے ہیں اسے پڑھ دیں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جتنا انہوں نے اصل مقالہ سے نہیں پڑھا اس سے زیادہ اہم باتیں وہ تھیں جو بعد میں انہوں نے چند نکات کی شکل میں آپ کے سامنے رکھی ہیں، اتنی لمبی گفتگو کے بعد اس کا موقع تو نہیں ہے کہ لفظ بلفظ ان کے اس پورے لکچر کا یا ان کے اس مقالہ کا ترجمہ کیا جائے، زبان چونکہ انہوں نے جو استعمال کی ہے خالص ٹیکنکل اور آج کی ہے جو اس موضوع پر بولی جاتی ہے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ سرسری طور پر دو باتیں آپ سے کہوں، ایک تو ان کا لکھا ہوا مقالہ ہے جس کا انگلش ترجمہ بھی وہ ساتھ لے کر آئے ہیں، اس میں انہوں نے تین چیزوں پر نظریاتی طور پر روشنی ڈالی ہے۔

پہلی چیز جو فی نفسہ اسلام کا مفہوم ہے، اور صحیح اسلام اگر لوگوں کے ذہنوں میں نہ ہو تو اس کے جو خطرناک نتائج ہوتے ہیں اس کو انہوں نے ظاہر کیا، اور اس پر خاص طور پر زور دیا کہ اس وقت کی جو دنیا ہے وہ معلومات کی دنیا ہے، اور انہوں نے کہا کہ انٹرنیٹ کے استعمال کرنے والے ایک شخص سے میں نے پوچھا کہ اس وقت جو معلومات انٹرنیٹ کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہیں اس کی مقدار کتنی ہے، تو وہ کہنے لگا کہ ساری دنیا میں کیا استعمال ہورہا ہے اس کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا، مگر میں ذاتی طور پر جو استعمال کرتا ہوں وہ اس کا ۴۴ ملین فل اسکیپ A4 سائز کاغذ پر جتنا میٹر لکھا جاتا ہے اتنا میں استعمال کرتا ہوں، یہ صرف ایک شخص کے استعمال کی بات ہے۔

پھر ایک ایسی دنیا جس میں ہم اس وقت زندگی گذار رہے ہیں اور جہاں ہمارے ارد گرد انفارمیشن اور معلومات کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا ہے، وہاں اسلام کی نشر واشاعت یا اس کی تشریح کس نہج پر ہونی چاہئے، تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں، یہ ایک سوال ہے۔

دوسری چیز وقف کا مفہوم ہے، وقف کا ایک مفہوم تو ہم سبھی سمجھتے ہیں، لیکن فی نفسہ وقف کا دائرہ کار کتنا بڑھ گیا ہے اس وقت اور خاص طور پر وقف کو انہوں نے جس انداز میں پیش کیا ہے کہ تہذیبوں کے بنانے میں وہ گویا سب سے زیادہ مؤثر ترین عامل کی حیثیت سے ہے۔

ایک مفہوم درمیان میں انہوں نے اور چھیڑا تھا، پسماندگی اور ترقی کا، کہ مختلف ملکوں یا مختلف قوموں کے درمیان پسماندگی اور ترقی کا جو معیار ہم نے اب تک سنا ہے یا معاشیات کے ماہرین جس کا ذکر کرتے ہیں اسلام کی تعلیمات اس سے کہیں زیادہ وقیع، دقیق اور شامل ہیں، ہم کو چاہئے کہ ان معیاروں پر بھی از سر نو غور کریں، اور اس ضمن میں انہوں نے کویت پر عراق کے حملہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ مال کا غلط مفہوم سمجھنے سے کیا نقصان ہوتا ہے یا یہ کہ اس طرح کی بعض دوسری جگہوں پر، جیسے اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام ان دونوں کا ٹکراؤ مال کے غلط مفہوم کو سمجھنے کی وجہ سے ہوا۔

ایسے ہی انہوں نے یہ پوائنٹ بھی واضح کیا کہ وہ ممالک جہاں اسلام نہیں ہے وہاں سامراجی طاقتوں نے بہت جلد وہاں کی قوموں کا مزاج بدلنے میں کامیابی حاصل کی، لیکن جہاں مسلمان ہیں وہاں ان کو وہ نہیں بدل سکے، تو اگر صحیح معنوں میں ہم ان کا استعمال کریں، اسلام کو اچھی طرح پیش کریں، ترقی کا صحیح مفہوم رکھیں اور پسماندگی کو حل کرنے کے لئے ان اصولوں کا استعمال کریں جو اصول اسلامی ہیں، تو اس صورت کے اندر ان سب چیزوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں انہوں نے ایک الگ مستقل مقالہ پڑھا وہ مقالہ لکھا ہوا نہیں تھا، لیکن سوال ایسے تھے جس کے لئے مستقل اس طرح کا سمینار منعقد ہونا چاہئے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے جو میٹر تیار کرکے دیا تھا وقف کے موضوع پر اس کو انہوں نے بڑی گہرائی سے پڑھا تھا اور چونکہ ان کا موضوع یہی ہے، اس لئے انہوں نے سوالات بڑے دقیق اور اہم قسم کے رکھے ہیں، پہلی چیز تو یہ کہ خود وقف کا مفہوم یہ ہے کہ عین کو باقی رکھ کر اس کی منفعت کو استعمال کیا جائے،

موجودہ زمانہ میں اس مفہوم کے اندر کتنی وسعت ہے، کتنی معنویت ہے، مال فی نفسہ کیا حیثیت رکھتا ہے، حقوق مجردہ کی بحثیں آپ کے یہاں پہلے ہی آچکی ہیں، آج کل کی دنیا میں مؤلفین کے حقوق، کمپیوٹر بنانے والے، ہوائی جہاز کی کمپنیاں اور دوسرے اس طرح کے حقوق اور مسائل جتنے ہیں ان سب کی وجہ سے اس کے اندر جو عموم پیدا ہو گیا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ایک چیز اور انہوں نے کہی کہ ایک ہے وقف کا کرنے والا شخص، اور ایک ہے اس کا ارادہ، کیا ہم کو اس کا حق ہے کہ اس کے ارادہ کے اندر دخل انداز ہوں، جو آپ نے وقف کے مصارف متعین کئے ہیں یا جن پر بحث کی جاتی ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں ان فقہی اصولوں کو بھی سامنے رکھا ہے، اور جو جدید پریشانیاں ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کے سامنے سوالات رکھے ہیں۔ ان کا تجزیہ یہ بھی ہے کہ اس وقت کی دنیا میں صنعتی ممالک نے چھ ارب ڈالر بطور چندہ کے دیئے ہیں، بطور مساعدات کے دیئے ہیں، اس میں تقریباً دو تہائی حصہ وہ ہے جو پبلک سکٹر سے یا عام طور سے جو خیرات زکوۃ مغرب والے کرتے ہیں، ہمارے یہاں وہ چیز اس وقت تقریباً بندسی ہوگئی ہے، حالانکہ پرانی تاریخوں میں دیکھیں تو ہاسپٹل سے لے کر جتنے بھی معاملات ومسائل تھے وہ ساری چیزیں وقف کے ذریعہ سے پوری ہوتی تھیں، مامون کے زمانے میں اور دوسرے خلفاء کے زمانے میں جو زریں زمانے گذرے ہیں ان میں جو وقف کی حیثیت تھی اس کو ہم کیسے اب دوبارہ بروئے کار لاسکتے ہیں، تو وقف کا مفہوم، مصارف وقف کی تعیین، اور واقف کے ارادے کے اندر تصرف کرنے کا حق، ایک شخص وقف کرتا ہے تو اس کا کچھ خاص مقصد ہوتا ہے، اس مقصد کو نظر انداز کر کے ہم اپنی طرف سے تحریر کریں کہ تم اس وقف کو فلاں مصرف میں خرچ نہیں کر سکتے، ایسے ہی وقف کے لازم اور لازم نہ ہونے کے مسئلہ میں۔

ہمارے استاذ عبدالمحسن عثمان نے جو پوائنٹ رکھے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہئے، ان کے حل ہمارے سامنے آنے چاہئیں، ان پر آپ جیسے فقہاء زیادہ باریکی سے نظر ڈال سکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ وقت میں نے کچھ زیادہ لے لیا، مگر ان کی باتیں ایسی تھیں جن کی وضاحت ضروری تھی۔

قاضی صاحب:

بہر حال آپ نے یہ خلاصہ سن لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اردو خلاصہ بھی قطعاً اس کے مضمرات اور اس کی اہمیت پر کافی نہیں ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ اس کو غور سے پڑھیں گے، آج کے دور میں خاص طور پر الفاظ کے ساتھ جو کھلواڑ کیا جارہا ہے اور الفاظ کی حقیقتیں جس طرح مسخ کی جارہی ہیں اور مصطلحات شرعیہ کے ساتھ جو ظلم کیا جارہا ہے، مصنف نے ان مصطلحات کی اہمیت اور دور حاضر میں ان مصطلحات کی تعبیر اور آج کے علمی انقلاب کے زمانے میں ان اہم ترین مصطلحات کو از سر نو سمجھنے کی طرف توجہ دلائی ہے، وقف کتنا بڑا کردار ادا کر سکتا ہے، چاہے وہ کلچرل، ثقافتی یا سوشل، اجتماعی، سماجی یا اقتصادی میدان میں وقف کے ذریعہ کتنا بڑا کام لیا جاسکتا ہے، پھر اس کے بعد ان جزوی مسائل کی طرف کہ لزوم وقف کے احکام اور عدم لزوم وقف کے احکام اور وقف کا ڈولپمنٹ اور جو ترقی پذیر ممالک ہیں ان کے مسائل، اور یہ سچی بات ہے کہ اگر زکوۃ کا نظام اور وقف کا نظام مسلمان ایمانداری سے پورے طور پر قبول کرلیں تو دنیا میں جو سود پر مبنی نظام اقتصادیات ہے اس کا سب سے بڑا حل آپ نکال سکتے ہیں، بہر حال یہ مقالہ آپ لوگوں تک پہنچے گا۔

جناب عبدالرحیم قریشی صاحب:

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين۔

محترم مہمانان گرامی اور معزز سامعین!

اوقاف سے متعلق ہم اس سیمنار میں بہت سے اہم مسائل پر گفتگو کریں گے اور اس گفتگو سے پہلے میں تمہیدی طور پر چند باتیں گوش گذار کرنا چاہتا ہوں اور جو باتیں میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں وہ اس لحاظ سے غور طلب ہیں کہ ایک ملی درد رکھنے والا آپ کے سامنے یہ بات رکھ رہا ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم ہندوستان کے اوقاف کے مسائل پر غور کریں تو ہمارے اپنے جو حالات ہیں، ہماری اپنی جو مصلحتیں ہیں، ہمارے اپنے جو ملی مصالح ہیں ان کو پیش نظر رکھیں، اور ظاہر ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جو باتیں مسلم ممالک میں اوقاف کے تعلق سے ہوئی ہیں وہ ہماری ملی اور دینی مصلحت کے خلاف ہو، اس بات کو بھی ہمیں پیش نظر رکھنا پڑے گا، اور میں سمجھتا ہوں کہ صرف اشاروں میں بات کرنا آپ جیسے علماء حضرات کے لئے کافی ہے، کہ وہاں اوقاف کے بارے میں جو رویہ رہتا ہے حکومتوں کا، یا کسی اور کا، ظاہر ہے کہ وہ رویہ ہم یہاں نہیں رکھ سکتے، کیونکہ وہاں کی بات تو یہ ہے کہ اگر وہاں کسی قسم کا کوئی تغیر ہوتا ہے اور بعد میں وہاں کے مسلمان محسوس کریں یا علماء کرام محسوس کریں کہ یہ تغیر اور تبدیلی غلط ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو بدلا جاسکتا ہے، لیکن یہاں اگر کوئی ایک تبدیلی ہو جائے گی تو پھر

ہم بدلنے کے موقف میں نہیں ہوں گے، ہم اپنی باتیں پیش کر کے قانون بنا سکتے ہیں تو پھر اس کے بعد ہماری کوئی آواز پارلیمنٹ میں نہ ہونے کی وجہ سے ہم کچھ کر نہیں سکتے، اس بات کو ہم کو پیش نظر رکھنی پڑے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اوقاف کے تعلق سے مختلف علاقوں کی مصلحتیں بھی الگ الگ ہیں جیسے پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش کا علاقہ ہے جس کے بارے میں سوال نامہ کا ایک حصہ بھی ہے، وہاں کی مصلحتیں کچھ اور ہیں، وہاں جو ہند کی تقسیم ہوئی، اس کے بعد جو حالات پیدا ہوئے اور اس کے بعد جو وہاں کی آبادی نے تخلیہ کیا، اور تخلیہ کے بعد ظاہر ہے کہ بہت سی مسجدیں اور اوقاف ویران ہو گئے، اوقاف ختم ہو گئے، تو سوال یہ ہے کہ اب وہاں کیا کیا جائے؟ مگر دوسرے علاقہ میں تو یہ ہے کہ اوقاف موجود ہیں، اور اوقاف کی موجودگی میں یہ ہوا کہ اوقاف کا اتلاف ہوا، اور تلف کرنے والا کون؟ جی ہاں خود مسلمان اس کے ذمہ دار ہیں، چاہے سجادہ نشین ہو، چاہے متولی ہو، چاہے کوئی ہو، غرض ہے تو مسلمان، دوسری طرف حکومت نے ہمیشہ ایسا مجہول وقف بورڈ تشکیل دیا کہ یہ وقف بورڈ یتیموں کی پناہ گاہ بن گیا، اس وقف بورڈ کو کوئی سیاسی کام نہیں دیا گیا پارلیمنٹ یا اسمبلی کا ٹکٹ نہیں دیا گیا اور ایسے شخص کو لا کر بٹھا دیا گیا وقف بورڈ میں جس کو وقف بورڈ سے کوئی دلچسپی نہیں، اگر آپ غور کریں تو ہمارے ملک میں جتنے بھی وقف بورڈ ہیں ان میں سے تقریباً نوے فیصد وقف بورڈ کے صدور ایسے ملیں گے کہ جن کو وقف کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، یہ تو محض سیاسی سرپرستی کی بنیاد پر آ گئے، جس پارٹی کی حکومت ہے اس نے اپنے آدمی کو لا کر بٹھا دیا، اور ظاہر ہے کہ ان کو اپنے سیاسی آقاؤں کی تعمیل کرنی ہوگی، یا تو اس کے سامنے یہ ہے کہ اس کو خود آگے چل کر بڑا سیاسی مفاد حاصل کرنا ہے، اسمبلی کا ٹکٹ لینا ہے، پارلیمنٹ کا ٹکٹ لینا ہے، کونسل میں آنا ہے، تو یہ تمام مصلحتیں ہیں، مثلاً اگر ہم پنجاب وہریانہ کو سامنے رکھ کر کوئی آسان شکل نکالتے ہیں جس کے ذریعہ استبدال وقف ہو سکتا ہے، وقف کی نوعیت بدل سکتی ہیں، وقف کی جائداد میں نکھار آ سکتا ہے تو اس کا اثر دوسرے حصوں پر کیا پڑے گا اس نوعیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا، ایک علاقے کو آپ سامنے رکھ کر کوئی قانون نہ بنائیں، بلکہ پورے ملک کو سامنے رکھ کر علماء کرام غور کریں، اب میں گفتگو کو آگے زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا، چند باتیں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، اور یہ چند باتیں وہ ہیں جو ہم نے، مسلمانان ہند نے بتوسط آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بڑی کدوکاوش کے بعد حاصل کی ہیں، اور جو بڑی کدوکاوش کے بعد حاصل کی گئی چیزیں ہیں ان کو ہم پیش نظر رکھیں اور جو سوالات ہمارے سامنے رہے ہیں ان سوالات پر غور کیا جائے۔

ہندوستان میں جو وقف کی تعریف ہے، ایک ہے وقف کا یوزر، وقف تعامل، یا بعض لوگ وقف علی الاستعمال جس کا ترجمہ کرتے ہیں، یا دوسرے وقف بالتعامل جس کا ترجمہ کرتے ہیں، اور اب تک کا ۱۹۵۴ء سے جو قانون چلا آ رہا تھا اس قانون میں صرف اتنا لکھا تھا کہ اگر کوئی وقف وقف تعامل ہے، وقف کا کوئی یوزر ہے تو یہ بھی وقف کی تعریف میں داخل ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

لیکن اس کے بعد پنجاب میں ایک کیس ہوا اور اس کیس میں یہ ہوا کہ ایک قبرستان تھا اور قبرستان کے بارے میں دستاویز موجود تھی کہ وہ زمین قبرستان کی ہے، لیکن عدالت نے یہ کہا کہ استعمال ختم ہو چکا ہے، تعامل ختم ہو چکا ہے، اور جب تعامل ختم ہو چکا تو ظاہر ہے کہ اس کے وقف کی نوعیت ختم ہو جائے گی، یہ وقف بالتعامل تھا، تعامل کی بنیاد پر، پریکٹس کی بنیاد پر، یوزر کی بنیاد پر، اور جیسے ہی یوزر اور پریکٹس ختم ہوگئی تو ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت وقف ختم ہو جائے گی، یہ فیصلہ ہمارے لئے بڑا نقصان دہ ثابت ہوا، یہ پنجاب ہائی کورٹ کا فیصلہ تھا، چنانچہ جب وقف انکوائری کمیٹی بنی تو اس وقف انکوائری کمیٹی میں اس کی نمائندگی کی گئی، وقف انکوائری کمیٹی یہاں آنے کے بعد سنٹرل وقف کونسل میں جب بل زیر غور تھا، اس وقت نمائندگی کی گئی، ظاہر ہے کہ بہت سی مساجد ہیں مسجد کا کوئی وقف نامہ نہیں ہوتا، بہت سے قبرستان ایسے ہیں، بلکہ سبھی قبرستان ہیں جن کا کوئی ڈاکومنٹ نہیں ہوتا، چنانچہ ہم نے یہ چیز اس میں داخل کروائی اور کہا کہ یہ تعریف جو آپ نے کی ہے وہ جامع اور کافی نہیں ہے، بلکہ اس میں اس بات کا اضافہ کیا جائے کہ اگر یوزر اور تعامل ختم ہو جائے، اگر وقف کے لحاظ سے بحیثیت وقف اس کا استعمال ختم ہو جائے تب بھی یہ وقف باقی رہے گا، یہ جو منظوری ہے آپ کے وقف تعامل کی اس منظوری کو ختم کر کے اس کا اضافہ کیا جائے۔ یہ ہمارا بہت بڑا Achievement ہے جس کو ہم سمجھیں اور خصوصاً پنجاب اور ہریانہ کے مسئلہ پر غور کرتے وقت، کہ پارٹیشن کے وقت ایک مسجد تھی اب اوقاف کی حیثیت سے اس مسجد کا استعمال ختم ہو چکا، لیکن آج ہم کو اس کا احساس ہے کہ وہاں پر مسجد تھی اور بحیثیت مسجد اس کا اندراج جائداد وقف میں ہونا چاہئے، تو وقف تعامل اور یوزر کے تعلق سے جو ترمیم بڑی کوشش کے بعد آج کے قانون میں ہم نے کروائی اور جو قانون میں آ چکی ہے، اور اس وقت ۱۹۹۵ء کا جو قانون ہے اس میں یہ موجود ہے، تو ایسی صورت میں ہم دیکھیں اور اس چیز کو بھی ہم سامنے رکھیں کہ ہم اپنا اچیومنٹ جو ہم نے اپنی کوشش سے حاصل کی ہے، کیا ہم اس کو ضائع کر دیں۔

اسی کے ساتھ ایک اور بات میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں، علماء کرام اس پر غور کریں کہ پنجاب اور ہریانہ کی بات میں نہیں کہتا، دلی شہر کتنا پھیل گیا اور دلی شہر پھیلنے کے بعد کتنی قدیم مسجدیں ہیں جو آباد ہیں، بہت سے شہر ایسے ہیں جو پھیلے اور پھیلنے کے بعد وہ مسجدیں جن کے بارے میں سان وگمان بھی نہیں تھا کہ وہ

آباد ہوسکیں گی، مگر الحمدللہ وہ اب آباد ہو چکی ہیں، اس لئے آج اگر کوئی مسجد ویران ہے تو محض ویرانی کی بنیاد پر ان کو نہ بیچیں، پنجاب میں جو مسلمان آبادی پارٹیشن کے وقت یا پارٹیشن کے فوری بعد تھی، آج اس سے کہیں زیادہ ہے، امرتسر میں جو مسجدیں غیر آباد تھیں ان مسجدوں میں سے کئی مسجدیں آباد ہو چکی ہیں کیونکہ وہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھی...... تو یہ قانون جو ۱۹۹۵ء کا قانون ہے، اس میں بہت سے نقائص ہیں لیکن ان نقائص کے باوجود ان میں چند چیزیں اچھی ہیں جن کو میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں:

ایک تو آپ کے سامنے ہے وقف کا یوزر، جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا، دوسرے کوئی ایسی چیز جس کی منفعت عوام کے لئے ہو، اور جس منفعت کے لئے وہ چیز وقف کی گئی تھی اور اس میں واقف کا جو منشا تھا اگر وہ منشا کھو چکا ہے تو ایسی صورت میں اس سے قریب مقصد کے لئے اس جائداد کو، اس کی منفعت کو استعمال کیا جاسکتا ہے، اور یہ قانون وقف میں نہیں تھا، ہندوستان میں ظاہر ہے کہ راجا، مہاراجہ، نواب، جاگیردار انہوں نے بڑے اوقاف بنائے، بڑے اوقاف قائم کئے اور ان اوقاف کا منشا یہ تھا کہ قبیلہ کے غریبوں اور مسکینوں کی امداد کی جائے، مکہ کے غرباء کی امداد کی جائے، شہر حیدرآباد کے اندر ایک بہت بڑی بلڈنگ ہے جس کا نام ہے، مکہ مدینہ علاء الدین وقف، اس طرح کے ایک نہیں ہزار ہا وقف ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ مکہ مدینہ کے مسافروں اور غرباء کی امداد کی جائے، اب اس کے بعد وہاں کی حکومت نے کہا کہ ہم اس کا پیسہ لینا نہیں چاہتے، اس طرح اس وقف کا جو مقصد اور واقف کا جو منشاء تھا وہ تو فوت ہو گیا تو اب کیا کیا جائے، تو علماء نے کچھ فتویٰ وغیرہ دیا اس کی بنیاد پر اس کو طے کیا گیا۔

اب اس وقت جو نیا قانون وقف ہے ۱۹۹۵ء کا، اس نئے قانون وقف کے اندر اس شق کو ہم نے بڑی کوشش سے داخل کروایا، یہ جو نیا قانون ہے اس کی دفعہ ۳۲ ذیلی دفعہ ۲، اور شق بی ۳ میں ہے، اس میں یہ کہا گیا کہ اگر کسی وقف کا مقصد فوت ہو جائے اس کا حصول مشکل ہو، اس کو حاصل نہ کیا جاسکتا ہو تو ایسی صورت میں ایسے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے جو اس مقصد کے مشابہ ہو یا اس مشابہ سے قربت رکھتا ہو، اس کے بعد کہا گیا کہ اگر ایسا بھی نہیں ہوسکتا ہے تو For the porpuse of promotion of the knowledge or learning of the Muslim community، یا پھر ایسی صورت میں یہ جائداد اس کی منفعت اور اس کی آمدنی استعمال کی جاسکتی ہے مسلمانوں میں یا تعلیم میں، اور تعلیم میں یہ قید نہیں کہ یہ تعلیم دینی تعلیم ہو یا عصری تعلیم ہو یا جس قسم کی بھی تعلیم ہو، اس اعتبار سے ہم موجودہ قانون میں جس نکتہ پر غور کر رہے ہیں کہ آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو آمدنی میں اضافہ کے تعلق سے بھی دفعہ موجود ہے کہ ایک وقف کی آمدنی بڑھے، ایک وقف کی فاضل آمدنی ہے، منشاء وقف کی تکمیل کے بعد بھی آمدنی بچتی ہے تو اس میں انہوں نے کہا ہے کہ یہ جو زائد آمدنی ہے اسے واقف کے اصل منشاء کے مطابق استعمال کیا جائے، اور پھر جو اس سے مشابہت رکھنے والے ہوں ان میں، اور پھر اس سے مطابقت رکھنے والے کسی اور مقصد کے لئے، تو اس بات کو ہم پیش نظر رکھیں۔

اب جہاں تک جائداد کی تبدیلی اور خصوصاً جائداد کے انتخاب کا تعلق ہے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قانونی موقف اس میں کیا ہے؟ قانونی موقف یہ ہے کہ اگر اس کا استعمال ختم ہو گیا ہے تو اس کا پورا پروسیجر دیکھیں، لیکن اس پروسیجر میں ایک چیز ہم نے بڑی مشکل سے داخل کروائی ہے، اس لئے داخل کروائی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک جائداد مسجد کے لئے، مسجد کی خدمت کے لئے، امام کی خدمت کے لئے، مؤذن کی خدمت کے لئے وقف کی گئی، اس کو متولیوں نے بیچ دیا، وقف بورڈ نے بیچ دیا، یہاں میں نام نہیں لوں گا ایک صاحب تھے مہاراشٹر کے جو زیر اوقاف تھے، انہوں نے ضلع بیڑ کے اندر ایک بہت بڑی پراپرٹی بیچ دی اور یہ کہہ کر بیچ دی کہ یہ پراپرٹی ایسی آبادی میں ہے جہاں جا کر کرایہ وصول کرنا مشکل ہے، اس کے بعد یہ ہوا کہ وہ آمدنی دھری کی دھری رہ گئی، وقف بورڈ کے دوسرے مصارف میں آگئی، جہاں ضرورت پڑی اور دیکھا پیسہ نہیں ہے اس میں سے لے لیا، اور وہ سارا کا سارا فنڈ ختم ہو گیا، تو جب یہ صورت حال سامنے آئی تو ہم نے کہا کہ کچھ پابندی تو لگائی جانی چاہئے، چنانچہ موجودہ جو قانون ہے اس میں ہم نے اس بات کو منظور کروایا ہے اور یہ Elemination کا جو سیکشن ہے، اس کے اندر کسی صورت میں مسجد، درگاہ اور خانقاہ کے اندر کوئی استبدال اور کوئی منتقلی نہیں ہوسکتی، نہ اس کو بیچا جاسکتا ہے نہ اس کو ہبہ کیا جاسکتا ہے نہ اس کو رہن رکھا جاسکتا ہے اور نہ کسی اور کو دیا جاسکتا ہے، یہ اس کا قانونی موقف ہے۔ اب اس قانونی موقف کے سلسلہ میں میں نے پہلا نکتہ جو آپ کے سامنے پیش کیا اس نکتہ کو سامنے رکھئے کہ ایک جائداد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ میں وقف کی، اس کے بعد اس کے وقف کی نوعیت کسی وجہ سے باقی نہیں رہی، لیکن قانون ہم کو اس بات کا حق دیتا ہے کہ ہم اس کو پھر واگذار کرائیں، اب یہاں ایک سوال آتا ہے کہ پنجاب اور ہریانہ میں، بہت سی ایسی اوقافی جائدادیں ہیں جن کو ایڈمنسٹریٹروں نے قبضہ میں لے لیا، پاکستان میں جو لوگ منتقل ہو گئے ان کی پراپرٹی تخلیہ کنندگان کی پراپرٹی قرار پائی ہے، اور تخلیہ کنندگان کی جائداد کی حیثیت میں ظاہر ہے کہ جو قانون وقف اس بابت ان کے یہاں تھا اس کے راستے پر وہ نکل چلے، ایک خاص دفعہ اس نئے قانون جو ۱۹۹۵ کا قانون ہے اس میں ہم نے رکھا ہے جس میں ہم نے

کہا کہ اس طرح کی جتنی بھی وقف کی پراپرٹی ہے جو کسی ایڈمنسٹریٹر کے پاس ہے یا گورنمنٹ کے کسی عہدیدار کے پاس ہے اور وقف بورڈ اس تحقیق کے بعد کہ اس جائداد کا استعمال پارٹیشن سے پہلے بحیثیت وقف ہوتا رہا ہے تو ایڈمنسٹریشن کم سے کم یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا پورا انتظام ہمارے حوالہ کیا جائے، اور اگر کہیں وقف بورڈ کمزور ہے تو ظاہر ہے کہ کچھ نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس قانون میں بہت سے نقائص ہیں مثلاً اگر قبضہ مخالفانہ ہو جاتا ہے........اور وقف کی پراپرٹی چلی جاتی ہے تو اس قانون میں وقف بورڈ کو یا وقف بورڈ کے کسی عہدیدار کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔

ہم آندھرا پردیش میں اس کے لئے کوشش کررہے ہیں کہ وہاں ایک نیا قانون وقف بنائیں، اور نئے قانون وقف میں اس کی کوشش کی جارہی ہے، چنانچہ کل ہی اس کی مشاورتی نشست تھی، لیکن ہم نے اس کو ملتوی کرایا کہ ہم جنوری تک اس میں اور تجاویز دے کر اس کو بہتر بنائیں گے، لیکن آپ جب غور کررہے ہیں تو میری مخلصانہ گذارش یہ ہوگی کہ جہاں تک مسلم ممالک ہیں ان کا موقف الگ ہے، وہاں مسلمان ایک چیز اگر کھو دیتا ہے تو پھر حاصل کرسکتا ہے، مگر یہاں ایک چیز کھونے کے بعد آپ حاصل نہیں کرسکتے۔ دوسرے یہ کہ جو مصلحتیں پنجاب اور ہریانہ کی ہیں وہ مصلحتیں وقف بورڈ کے ذریعہ حاصل کرنا ہوگا، اسی قانون وقف کے ذریعہ حاصل کرنا ہوگا، اور پھر پنجاب اور ہریانہ کی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر کے آپ کوئی چیز طے کرتے ہیں تو یہ بھی دیکھئے کہ اس کے مضر اثرات ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر کیا ہوں گے، جہاں پر لوگ نظریں لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی طرح کوئی آسان سی شکل نکل جائے اور ہم اس وقف کی جائداد کو اپنی جائداد بنالیں اور اس پر قبضہ کرلیں، کیونکہ بہت سی وقف کی جائدادیں شہری آبادی میں آچکی ہیں، اس کی قیمتیں بہت کچھ بڑھ چکی ہیں، اور آج کل اسٹیٹ بلڈر یا اسٹیٹ ڈیلر، پراپرٹی ڈیلر، یا پراپرٹی بلڈر یہ سب لوگ اپنی للچائی نظریں لگائے ہوئے ہیں، تو ایسے موقعہ پر آپ سے گذارش ہے کہ بڑے احتیاط کے ساتھ تمام چیزوں کو سامنے رکھیں اور ہمیں ہندوستانی مسلمانوں کی مصلحتوں کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا، اور میں سمجھتا ہوں کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے جو نیا قانون وقف ایکٹ ہے اس کی کاپیاں آپ کے پاس بھیج دی جائیں گی تو اس پر آپ حضرات بہتر طور سے غور کریں، میں اس بات کو ضروری سمجھتا ہوں، شکریہ۔

قاضی صاحب:

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دو اہم خطاب اس موضوع پر ہو گئے ہیں، اس کے بعد موقع ہے کہ پہلے عرض پیش کیا جائے آپ کے سامنے اور اس کے بعد صبح انشاء اللہ ہم لوگ پوری گفتگو کریں گے، حضرات شرکاء سے درخواست ہے کہ وہ اپنے نکات ضرور نوٹ کرتے جائیں، اس وقت جو بات مجھے عرض کرنی ہے وہ بہت اہم ہے، جس سوال کو اٹھایا ہے ہمارے جناب عبدالرحیم قریشی صاحب نے، اور ابھی ابھی فیکس کے ذریعہ پنجاب وقف بورڈ نے چند سوالات کئے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ایک بات میں آپ پر واضح کردوں کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ جو مسلمانوں کا عمومی نمائندہ تو ہے ہی، اصحاب علم، اصحاب فتوی اور اصحاب فقہ کا ایک مرکزی ادارہ ہے جس کے کسی فیصلہ کو ایک اجماعی حیثیت مسلم معاشرے میں حاصل ہے، اس لئے ساری بحثیں تو ہم مسائل پر کریں گے انشاء اللہ، لیکن یہ بات کہ جو کچھ فیصلہ مسلم پرسنل لابورڈ نے ۱۹۹۲ میں اپنے دلی کے اجلاس میں کردیا ہے، جو فیصلہ ساری عدالتوں میں دے چکے ہیں، سارے پریس کو دے چکے ہیں، ساری سرکار کو دے چکے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس پورے ہاؤس کو باتفاق آراء بلا کسی ردوقدح کے یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ مساجد کی مسجدیت کو کبھی بدلا نہیں جاسکتا، مسجد نہ بیچی جاسکتی ہے، نہ مسجد عاریت دی جاسکتی ہے، اور نہ مسجد کی حیثیت میں کوئی تبدیلی کی جاسکتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے اس فیصلہ کے بعد آج جو ہندوستان بھر کے اور ہندوستان کے باہر کے علماء بھی بیٹھے ہوئے ہیں ان سب کا یہ اجماع قرار پاتا ہے کہ مسجد بدلی نہیں جاسکتی، جگہ نہیں بدل سکتی، منتقل نہیں کی جاسکتی، مسجد بیچی نہیں جاسکتی، مسجد عاریت میں نہیں دی جاسکتی، اس فیصلہ پر آپ سب اتفاق کرتے ہیں تو یہ ایک اجماعی فیصلہ تسلیم کیا جانا چاہئے، میں امید کرتا ہوں کہ آپ سارے حضرات باتفاق رائے اس کی تائید کریں گے، اور اب اس مسئلہ پر کوئی بحث نہیں ہوگی، مسجد کے علاوہ جو دیگر مسائل ہیں ان پر ہم گفتگو کریں گے، اور آپ سب کی طرف سے یہ اجماعی فیصلہ پورے ملک کو پہنچ جائے گا کہ جو آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ نے ۱۹۹۲ء میں کیا تھا جہاں اکابر علماء جن میں بہت سے آج ہمارے بیچ نہیں رہے ہیں ان کا فیصلہ محقق ہے، محض وقتی مصالح پر مبنی نہیں ہے، آج پورے علماء ہند مجتمع ہوکر اس فیصلہ کی تائید کرتے ہیں اور اس فیصلہ کو دہراتے ہیں، یہ بات طے ہوگئی، میری بات ڈاکٹر وہبہ زحیلی اور دوسرے بزرگوں سے بھی اس موضوع پر ہوئی ہے وہ لوگ بھی اس کے ساتھ پورا پورا اتفاق رکھتے ہیں، تو اس اتفاقی فیصلہ کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ آگے بحث جاری رہے گی، اب میں مولانا عتیق احمد قاسمی سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا پہلا عرض شروع کریں، اور ہم ہارون بھائی کی ہدایت کے مطابق وقت پر ختم کریں گے، اور ہوسکتا ہے تینوں عرض مکمل ہوجائے اور صبح مناقشہ اسی پر ہو، میں آپ حضرات کی تعریف کرتا ہوں کہ بڑے صبر آزما موضوع پر بہت ہی صبر کے ساتھ بیٹھ کر آپ نے دلچسپی کا ثبوت دیا ہے، یہ آپ کی علمی دلچسپی کی دلیل ہے، اللہ تعالی ہم کو اور آپ کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

نوٹ: (جناب مولانا عتیق احمد قاسمی، جناب مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی اور جناب مولانا ظفر عالم ندوی نے بالترتیب عرض پیش کیے جو اس کتاب میں اپنے مقام پر شامل ہیں)

مولانا عتیق احمد قاسمی:

اگر کچھ قانونی سوالات آپ کے ذہن میں ہوں جن کی وضاحت آپ ضروری سمجھتے ہوں تو پہلے وہ سوالات کر لئے جائیں، یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ جناب عبدالرحیم قریشی صاحب موجود ہیں جو قانون وقف کے ماہر بھی ہیں اور ہماری زبان میں ہم کو بات سمجھا سکتے ہیں، اس لئے جن حضرات کے ذہن میں کوئی قانونی سوال ہو جس کی وضاحت درکار ہو تو پہلے مرحلے میں وہ سوالات کر لئے جائیں، اس کے بعد میری درخواست یہ ہے کہ سوال نامہ آپ کے سامنے ہوگا جن حضرات کو بھی اپنی رائے دینی ہے کچھ وضاحتیں کرنی ہیں اگر وہ پہلے سے نوٹ کرلیں کہ کس سوال کے بارے میں کیا بات وہ کہنا چاہتے ہیں، تاکہ ان کی بات مربوط اور مرتب ہو کہ فلاں سوال کے بارے میں ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں ہماری یہ رائے ہے ہمارے یہ دلائل ہیں، اور تیسری بات یہ ہے کہ اختصار سے کام لیں، اس لئے کہ بہت سے حضرات ہیں جو اصحاب علم ہیں اور اصحاب فہم ہیں ان کے لئے اشارہ کافی ہوگا اور ہر ایک کو اس کا موقع مل پائے گا، تو پہلے مرحلہ میں میری درخواست ہے کہ جن کو قانونی وضاحت درکار ہو وقف کے قانون کے بارے میں وہ اپنا نام پیش فرمائیں اور ان کو دعوت دی جائے گی گفتگو کے لئے۔

قاضی صاحب:

حضرات علماء! اب ہم اوقاف سے متعلق مختلف مسائل پر بحث کا آغاز کرتے ہیں، اس موقعہ پر آپ کی توجہ چند نکات کی طرف منعکس کرنا چاہتا ہوں، پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ مسئلہ وقف پر نصوص کم سے کم تر ہیں، اوقاف کے احکام کی تفصیلات جو فقہاء کے یہاں ملتی ہیں وہ مجتہدات ہیں منصوصات نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس نکتہ پر اختلاف آپ لوگوں کو نہیں ہوگا۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ وہ وقف کے جواز ہی کے قائل نہیں ہیں، لیکن محققین نے یہ بات ثابت کی ہے کہ امام صاحب جواز وقف کے قائل ہیں، لزوم وقف کے قائل نہیں، اور جہاں تک مسئلہ مسجد کا ہے وہاں امام صاحب لزوم کے بھی قائل ہیں، دیگر ائمہ بھی وقف کے جواز اور لزوم کے قائل ہیں، اس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ لزوم وقف تقریباً تمام ائمہ کے درمیان متفق علیہ ہے، تو مسئلہ اگر منصوص نہیں مجتہد ہے لیکن اس میں اگر علماء امت کا اجماع ہو چکا ہو تو خود ایک بڑی سند اور حجت کا درجہ رکھتا ہے، چونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اس لئے علماء کے درمیان اختلاف رائے بہت سی اشیاء میں ہوا ہے، دیکھنا یہ ہے ہم کو اور آپ کو بہت گہرائی کے ساتھ کہ پورے نظام وقف میں کن بنیادی باتوں کی رعایت جملہ ائمہ و مجتہدین فقہاء نے رکھی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اصول اگر ہم سب کے سامنے حاضر ہوگا تو مسائل کا حل کرنا ہمیشہ ہمارے لئے آسان ہوگا، پہلا مسئلہ تو مشروعیت وقف کے مقاصد، اسباب المشروعیہ، مقاصد المشروعیہ اور وقف کرنے کے اس عمل کی شرعی حیثیت کا ہے، ہمارے یہاں اسلامی نقطہ نظر سے ہر عمل کے اندر رضائے خداوندی اور اجر آخرت مطلوب ہوتا ہے، وہ عمل جو شریعت نے واجب نہیں کیا ہے، اس کو بطور خود آپ کے اختیار پر چھوڑا ہے، اس عمل کو تبرع کہا جاتا ہے، پس وقف کی حیثیت شرع کی زبان میں ایک تبرع کی ہے، مجھے یقین ہے کہ سارے علماء اس سے اتفاق کریں گے، چونکہ یہ کوئی خاص اہم بات نہیں ہے۔

وقف کا مقصد شئ موقوف کو ہمیشہ باقی رکھنا، اور اس کے منافع مستحقین کے درمیان تقسیم ہونا، اصل شئ کو محفوظ رکھنا اور منافع [illegible] بنیادی جز ہیں اوقاف کے، بنیادی طور پر وقف میں یہ دو باتیں اہم ہیں، ایک ہے حبس عین، اب اس بحث کو چھوڑ دیجئے کہ "علی ملك الواقف أو علی [illegible] الله" میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، لیکن حبس عین، عین شئ کا محفوظ رکھنا اور اس کے نفع کو عام کرنا، میں سمجھتا ہوں کہ اوقاف کے جملہ احکام ومسائل [illegible] بارے میں کچھ طے کرتے وقت دو چیزوں کو بنیادی طور پر سامنے رکھنا ہے، ایک یہ کہ وہ شئ محفوظ رہے، دوسرے یہ کہ اس کا نفع عام سے عام اور زیادہ سے زیادہ ہوتا رہے، اگر ان دو مقاصد کو ملحوظ رکھیں گے تو بہت ساری الجھنیں ہماری خود بخود طے ہو جائیں گی انشاء اللہ، ایک تو اصل شئ موقوف کی حفاظت ہو وہ ضائع نہ ہونے پائے، اور دوسرے نفع اس کا جاری رہے بڑھتا رہے، تو گویا نافعیت اور انفعیت اور صیانت اصل وقف، یہ گویا ہمیں بنیادی طور پر تمام مسائل اوقاف میں غور کرتے وقت ذہن میں رکھنا چاہئے، اب اس روشنی میں اگر آپ تمام فقہاء کی پوری کتاب الاوقاف پڑھ جایئے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہر فقیہ و مجتہد کی رائے دراصل اسی بنیاد کے تحت گھومتی ہے اپنے عہد کے اعتبار سے اپنے زمانے کے حالات کے اعتبار سے، جس فقیہ نے حفاظت وقف کے لئے جو ضرورت محسوس کی اس [illegible] اور وقف کی نافعیت کے لئے جو ضروری سمجھا حکم دیا، یہی دراصل پوری روح اور خلاصہ ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اوقاف کے مسائل میں عام بات لکھی ہے [illegible] نے کہ

آخری اختیار ناظر وقف اور متولی وقف کو نہیں بلکہ قاضی کو ہے، لیکن بعض نے یہ بھی لکھ دیا کہ نہیں نہیں قاضی سے بھی بچانا، زمانہ خراب ہے، قاضی سب بھی گڑبڑ ہو رہے ہیں، یعنی جب اس دور کے فقہاء نے حکومت کی طرف سے مقرر کئے ہوئے قاضیوں کی دیانت پر شبہ کیا تو انہوں نے قاضی سے بھی بچنے کی بات کہی، کیوں؟ تا کہ وقف محفوظ رہے، پس جملہ احکام ابواب وقف پر اگر آپ غور کریں گے تو یہی ملے گا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بنیادی نقطہ بھی آپ کے غور کرنے کا ہونا چاہئے، اور خوب اچھی طرح اللہ کے سامنے اپنے کو رکھ کر اس پر غور کریں کہ ہم کوئی فیصلہ ایسا نہ کریں جس سے وقف کی حفاظت مجروح ہو اور کوئی فیصلہ ایسا نہ کریں جس سے وقف کی نافعیت یا انفعیت متاثر ہو، یہ چیز ہمارے خیال میں بنیادی طور پر ذہن میں رہنی چاہئے تو بہت سی آسانیاں ہوں گی۔

ابھی پہلا سوال جو استبدال وقف سے متعلق ہے، اور مولانا عتیق صاحب کے عرض میں اس کا تذکرہ ہے، تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ استبدال وقف کی کبھی ضرورت پڑ سکتی ہے "صار الوقف خربانا" وقف ایسا ویران ہو گیا کہ اب اس سے کوئی آمدنی نہیں تو اصل شئی محفوظ ہے، مگر نافعیت ختم اس کی، اصل شئی محفوظ ہے، لیکن نفع نہیں دے رہی ہے، آمدنی نہیں ہو رہی ہے، اس کے محاصل نہیں ہیں، تو یہاں پر فقہاء نے بڑی احتیاط کے ساتھ کہ کہیں اس کا غلط استعمال نہ کیا جائے، استبدال کی اجازت دی، دوسری صورت یہ ہے کہ وقف کی آمدنی تو ہے، لیکن قلیل ہے، اگر اس وقف کو ہم Convert کریں، تبدیل کر کے ہم کسی دوسری جگہ وقف کی زمین حاصل کر لیں تو وہاں پر نفع بڑھ جائے گا، تو یہاں پر فقہاء کی دو رائے ہوئی، ایک رائے یہ ہے کہ اگر اصل نفع کچھ نہ کچھ جاری رہے تو زیادتی نفع کی خاطر وقف کی تبدیلی نہیں کر سکتے، کچھ فقہاء کی رائے ہوئی کہ اگر انفعیت حاصل ہو جاتی ہے اطمینان کے ساتھ تو استبدال کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اور بہر صورت استبدال کے حکم کا اختیار قاضی کو دیا گیا، اور وہ بھی ہر قاضی کو نہیں، بلکہ جو قاضی القضاۃ ہیں ان کو دیا فقہاء نے، تو یہاں بھی دیکھئے مسئلہ استبدال میں بھی نافعیت اور انفعیت اور شئ اصل موقوف کی حفاظت کو فقہاء نے سامنے رکھا ہے۔

اب میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ ایک وقف کو بیچ کر نقد پیسہ حاصل کرنا ہے، مثلاً اتفاق سے ہمارے یہاں بہار میں اگر اوقاف میں کوئی تبدیلی کرنی ہو تو اس کی اجازت کی درخواستیں دار القضاء میں آتی ہیں، ابھی چلتے وقت بھی میں نے دو تین معاملات کو دیکھا ہے، ہمیشہ آتی رہتی ہیں درخواستیں، تو مثلاً ایک وقف کا معاملہ یہ تھا کہ وہاں پر زمین درمیان آبادی میں آ گئی اس کا کوئی منافع نہیں ہے، اس کو اگر ہم علاحدہ کر دیں تو دوسری جگہ ہم زمین لے لیں، ٹھیک ہے؟ میں نے کہا کہ پہلے آپ یہ لے کر آئیے کہ دوسری زمین آپ کہاں حاصل کریں گے، اس کا زر ثمن کیا ہوگا اور جو ہم یہ بیچیں گے اس کا زر ثمن کیا ہوگا، دونوں کا پہلے ہم مقابلہ کریں گے، اس کے بعد دیکھیں گے، اب تین چار ماہ بعد یہ درخواست آئی کہ جس زمین کو ہم لینا چاہ رہے تھے وہ زمین فروخت ہو گئی، میں نے وہیں پر مثل روک دی کہ جب تک پھر کوئی دوسری زمین سامنے نہیں آئے گی کہ اس کا معاملہ طے ہو اور دونوں رجسٹری ایک ساتھ ہوں، ایک طرف ہم بیع کریں اور دوسری طرف شراء کریں، تا کہ اصل وقف مجروح اور متاثر نہیں ہونے پائے، جب تک یہ نہیں ہوگا ہم نہیں کریں گے، تو جناب والا ایسا نہ ہو اس لئے کہ پیسہ حاصل ہونے کے بعد پیسہ رہ ہی نہیں سکتا، اس پر خطرات ہوتے ہیں، اس لئے صیانت وقف کو بنیادی حیثیت دینا ہوگا، اس مسئلہ میں رائے کر لیجئے۔

اب اس سلسلہ میں عرض یہ کرنا ہے کہ ہمارے نزدیک صیانت وقف پر کوئی جھگڑا نہیں ہے، سبھی لوگوں کو یہ دیکھنا ہے کہ کوئی بھی ایسا حکم ہم نہیں دے سکتے جس میں اصل وقف کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، اور دوسری بات یہ ہے کہ وقف کی آمدنی نہیں ہو اس کو کار آمد اور نفع بخش بنانے کے لئے استبدال ظاہر ہے کہ ہو سکتا ہے، تمام لوگوں نے صراحت بھی کی ہے اور ہم بھی سمجھتے ہیں۔......

ہاں مسئلہ وہاں زیر بحث آئے گا جہاں پر صورت حال یہ ہو کہ آج ہزار روپے آمدنی ہوتی ہے اگر ہم تھوڑی سی تبدیلی کر لیں تو لاکھ روپے آمدنی ہو سکتی ہے تو زیادتی نفع کی خاطر ہم اس کی اجازت دے سکتے ہیں یا نہیں کہ وقف کا استبدال کیا جائے، اصل نفع کے لئے نہیں، بلکہ زیادتی نفع کے لئے، اب یہاں پر یہ بحث ہوگی کہ اگر اصل وقف کے تحفظ کا پورا اطمینان نہ ہو، ایک شکل، اور اصل وقف کے تحفظ کا پورا اطمینان ہو پھر ایک عالم دونوں حالات میں کیا فتوی دے گا، اس کو آپ حضرات کو دیکھ کر طے کرنا ہے۔

جہاں تک مسئلہ مسجد کا ہے اس سے ہم لوگ فارغ ہو چکے ہیں، اب اس پر بحث کرنا ہے کہ مسجد کی اراضی میں جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہیں دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ ہے پہلا سوال، دوسرا اسی کا حصہ ہے کہ مسجد کی آمدنی یعنی مسجد کے لئے اوقاف سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ وقف جو کسی مسجد پر ہے اس کے ذریعہ جو آمدنی حاصل ہے تو کیا مسجد کے اخراجات سے زائد ہونے کی صورت میں اس زائد آمدنی کو تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

بہرحال دوستو! یہ ہے ساری بحث کا خلاصہ۔

سوال نمبر ایک میں جہاں تک مساجد کا تعلق ہے عین مسجد کا اس پر ہم اب کوئی بحث نہیں کریں گے، اس کے علاوہ جو مسائل ہیں ان پر اگر آپ بحث کرنا چاہیں گے تو اس کی گنجائش دی جائے گی۔

مولانا شیر علی صاحب: ......وقف لازم نہیں ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک، یہ بات درست نہیں ہے۔

قاضی صاحب:

اگر ایسا نہیں ہے تو بہت اچھا ہے، ہم یہ جانتے ہیں ''إلا إذا قضى به'' میں نے یہ کہا کہ: إن الأئمة قد اختلفوا في لزوم الوقف أو عدم لزومه، الإمام أبو حنيفة لم يقل بعدم جواز الوقف، قد نسبوا إلى الإمام أبي حنيفة أنه قائل بعدم جواز الوقف، ولكن هذا ليس بصحيح، الصحيح أنه قائل بجواز الوقف، ولكنه يقول: إن الوقف لا يلزم بل يمكن أن يرجع الواقف من الوقف، فالاختلاف فيما بينهم في مسئلة لزوم الوقف وعدم لزومه لا في جواز الوقف أو عدم جوازه، هذا ما قلت، الآن ماذا تقول۔ میں نے حنفی مسلک میں نہیں کہا۔

أنت تعرف ياشيخ أن الإمام أباحنيفة إذا قال بقول، وقال أبو يوسف ومحمد بقول آخر، وقولهما أيضا جزء من مسئلة الأحناف، لأن كل ما نسب إلى هذين الإمامين الصاحبين كأنه قول للإمام أبي حنيفة رحمه الله تعالى، فاختار أحدهما هذا وآخرهما هذا، كما نسب إلى الإمام الشافعي أن هذا قول قديم، وهذا قول جديد، وهذا في مصر، وهذا في بغداد، كلها أقوال للإمام الشافعي، وكذلك اختاره أبو يوسف أو محمد أو زفر أو فلان أو فلان، كلها أقوال للإمام أبي حنيفة رحمه الله، اختاره أحد من تلامذته۔

مولانا شیر علی صاحب: ......اگر وقف لازم نہیں ہے تو وقف کا مقصد کیا رہا؟

قاضی صاحب:

میں نے کچھ نہیں کہا، میں نے تو کہا کہ خود حنفیہ کے یہاں مفتی بہ قول یہی ہے کہ وقف لازم ہوگا، یہ امام ابو یوسف کا قول ہے، امام محمد کا قول ہے، لزوم وقف کا قول مفتی بہ ہے احناف کے یہاں، اور پوری کتاب الوقف اسی پر مرتب ہے۔

کیا آپ کے علم میں یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا ایک معروف قول عدم لزوم وقف کا ہے۔

مولانا شیر علی صاحب: نہیں، میرے علم میں نہیں ہے۔

قاضی صاحب:

تو براہ کرام آپ کم سے کم شامی ضرور دیکھ لیں، آپ کے پاس سب کتابیں موجود ہیں، اسی لئے جب فقہاء احناف بحث کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ ''شرائط الوقف على قول الصاحبين، على قولهما''، یہ بحث کرتے ہیں۔

تو خیر مولانا سلطان صاحب ایسا ہے کہ آپ کی توجہ چاہتا ہوں، سوال نمبر ا ''الف'' اور سوال نمبر ا ''ب'' کے بارے میں آپ گفتگو کریں، ''ج'' طے ہو چکا ہے کہ مساجد کا مسئلہ ختم ہے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب:

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جو تلخیص مقالات کی دی گئی ہے یہ تلخیص یکطرفہ ہے، اور ظاہر ہے کہ بعد میں ریکارڈ نہیں بنتا ہے، یہاں پر عارض جو ہے مسئلہ کا

جو مزید معلومات فراہم کرتا ہے یا حوالہ دیتا ہے وہ اس کے پاس رہ جاتے ہیں، جو چیز آپ کے پاس ریکارڈ بنتی ہے اور اس کی تلخیص ہوتی ہے، اس بنا پر اس کو نمائندہ ہونا چاہئے اور اس میں جملہ آراء کا تذکرہ ہونا چاہئے، یہاں پر ہریانہ، پنجاب، دہلی اور مغربی یوپی کے اوقاف کے حوالہ سے بات کہی جارہی ہے، مسئلہ بڑا نازک ہے، اور ہندوستان کے پس منظر میں فقہ کے اندر اوقاف کے سلسلے میں مشہور، معروف، مفتی بہ جو بھی قول ہے وہ یہ ہے کہ "الوقف لا یباع ولا یوھب ولا یورث"، ہم سب جانتے ہیں اس کو، اس تلخیص میں اس کا حوالہ دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اگر اس کے مقابلہ میں امام محمدؒ کی رائے قابل ترجیح ہے، جیسا کہ اس میں تذکرہ کیا گیا ہے...... تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ مشہور ومعروف اور مفتی بہ جو قول ہے اس کے مقابلہ میں موجودہ حالات میں امام محمد کی رائے پر عمل کرنا زیادہ مناسب اور ہندوستان کے حالات میں زیادہ قرین مصلحت ہے، اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، اب میں نے اس پر جو جواب لکھا تھا اس میں سے صرف چند سطریں میں آپ کے سامنے پڑھ دیتا ہوں، جس کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے...... اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن رائے کا آنا اس میں ضروری ہے، آئندہ ریکارڈ اسی کی بنیاد پر بنتا ہے، میں نے یہ لکھا تھا اس پر کہ "الف" "ج" اور "د" جملہ شقوں کو شامل کرتے ہوئے وقف کے سلسلہ میں یہ مسئلہ معروف ہے کہ "الوقف لا یباع ولا یوھب ولا یورث"، پنجاب و ہریانہ اور دہلی و مغربی یوپی کے بیچ مسجد اور غیر مسجد جملہ اوقاف کی نسبت سے اسی پر ہی عمل مناسب ہے، اس وقت جب کہ صورت حال یہ ہے کہ مسلمان متولیوں اور ٹرسٹیوں کی طرف سے ان کا دیانت دارانہ انتظام نہیں ہو پا رہا ہے، اس میں خرد برد عام اور مالی بد عنوانیاں اس کے نظام کا حصہ بن چکی ہیں، ان حالات میں ان کی منتقلی یا فروختگی دوسرے الفاظ میں ان اوقاف کو ختم کرنے کے مترادف ہے، یہ صحیح ہے کہ مخصوص حالات میں یہ اوقاف مسائل سے گھرے ہوئے ہیں، لیکن ان کی فروخت ان کے مسائل کا کسی طرح حل نہیں ہے، بحمد اللہ ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی ہونا شروع ہوگئی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ پوری امت کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو، مسلم پرسنل لا بورڈ میں ان کے لئے الگ سے ونگ (Wing) بنایا جائے اور مسلمانوں کے تمام مذہبی، اور سیاسی جماعتوں کو اس میں شامل کیا جائے اور دیگر پروگراموں کی طرح یہ بھی اس کا ملت اسلامیہ ہندیہ اس کی حفاظت پر کمر بستہ ہو، اس عمل میں امکانی کچھ اوقاف کا ضائع ہو جانا اس کے مقابلہ میں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ عمومی خرید و فروخت کے ذریعہ بڑے پیمانے پر ان کے ضیاع کا خطرہ مول لیا جائے، میری اس رائے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا، میں سمجھتا ہوں کہ اس رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے، اس کو مرجوح قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن وقف کے سلسلہ میں یہ رائے ظاہر کی جانی ضروری تھی۔

اس تلخیص کے نمائندہ نہ ہونے کی ایک دوسری مثال آگے دیکھیں کہ سوال نمبر ۲ ہے کہ کیا مسجد پر وقف اراضی میں جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہے، مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جا سکتا ہے، اس کے سلسلہ میں تمام رائے وہ نقل کی گئی ہیں جو اکثر کی رائے ہے اس کی تلخیص کے اندر، خاکسار کی رائے جو اس سلسلہ میں ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ مسجد پر وقف اراضی میں مسلمانوں کے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم نہیں کیا جا سکتا، الا یہ کہ واقف کی طرف سے وقف نامہ میں اس کی صراحت ہو تو اس کی گنجائش نکل سکتی ہے، یہ میں صرف مثال دے رہا ہوں کہ اس رائے کا کوئی تذکرہ اس کے اندر نہیں ہے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ تمام آبادیوں میں مسجدوں میں جگہیں کم پڑ رہی ہیں، جو مسجدیں ہیں وہ چھوٹی ہو رہی ہیں ان کو توسیع کرنے کا مسئلہ ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر دو ایکڑ زمین کہیں موجود ہے اور اس وقت وہ مسجد چھوٹی بنی ہوئی ہے، اور اس مسجد کے بجائے اس پر مدرسہ یا عصری ادارہ کے جواز کی بات اس میں کہی گئی ہے، کوئی کالج کھول دیا جائے، کچھ کر دیا جائے، اور بیس سال کے بعد اس مسجد کی توسیع کا مسئلہ ہمارے سامنے آئے تو زمین ہمارے پاس نہ ہو یہ بڑی خطرناک بات ہے، تو اس میں علماء کی جو رائے ہو اس پر اتفاق ہو سکتا ہے، یا یہ کہ کثرت رائے پر فیصلہ ہو سکتا ہے، لیکن خاکسار کی رائے یہ تھی کہ مسجد کے لئے وقف کردہ زمین میں کوئی ادارہ نہ مدرسہ قائم کرنا جائز ہے، اور عصری ادارہ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، لیکن اس میں اس رائے کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے، تو یہ عرض ہے کہ تلخیصات ذرا مکمل ہوں اور اس سے اس کو مربوط کیا جائے۔

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب:

تلخیص کے سلسلہ میں ایک عرض یہ ہے کہ سوال نامہ ہمارا جاری ہوتا ہے سمینار سے کم از کم چھ سات مہینے پہلے اور اس بیچ میں اس کی ایک تاریخ متعین کی جاتی ہے، سمینار کی تاریخ سے کم سے کم دو ڈھائی تین مہینے پہلے جب مقالے مانگے جاتے ہیں اور بار بار یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ اور آخری تاریخ کے بعد پھر آگے مہلت دی جاتی ہے اور پھر یاد دہانی کرائی جاتی ہے، اور پھر اس کے بعد سمینار سے تقریباً ڈیڑھ مہینہ پہلے یا دو مہینہ پہلے ایک نشست ہوتی ہے، اس وقت تک جتنے مقالات موصول ہوئے ہوں ان کو سامنے رکھتے ہوئے عرض کی ذمہ داری دی جاتی ہے اور اسی کے مطابق تلخیص ہو جاتی ہے، اس سے پہلے بھی سمینار میں گذارش کی جا چکی ہے اور اکیڈمی کی طرف سے بار بار خطوط جاتے ہیں، لیکن بہت سے حضرات اب جب سمینار میں تشریف لاتے ہیں یا دو چار چھ دن پہلے اپنا مقالہ

پہنچاتے ہیں تو ان کی آراء سے تلخیص میں یا عرض جو مرتب کیا جاتا ہے اس میں کسی طرح کا استفادہ نہیں ہوسکتا ہے اور پھر مجبوری ہوتی ہے، وہ رائے نہیں آسکتی، ممکن ہے اشاعت میں وہ شامل ہوجائے، لیکن اس موقع پر اس کا ذکر مجبوری ہوتی ہے، اور ہم پہلے بھی گذارش کرتے رہے ہیں اور اب بھی گذارش کرتے ہیں کہ ہمارے احباب مندوبین جو دلچسپی رکھتے ہیں، جواب بھی لکھتے ہیں، شرکت بھی فرماتے ہیں، ان سے گذارش کی جاتی ہے کہ کم سے کم اپنا قلمی تعاون اکیڈمی کو جیسے اور تعاون حاصل ہے اس طور پر دیں کہ جو وقت مقرر کیا جاتا ہے اس میں اپنی رائے جو کچھ بھی ہو، اللہ جو دل میں ڈالے جو ان کا انشراح ہو کوئی پابندی تو ہوتی نہیں ہے وہ لکھ کر بھیج دیں، اچھا خاصا وقفہ ہوتا ہے، تاکہ استفادہ اس سے اچھی طرح کیا جاسکے، اور یہ بدمزگی نہ پیدا ہو اور یہ خیال نہ پیدا ہو کہ میری رائے نہیں ذکر کی گئی، یہ ایک سوال نہیں ہے، اور بھی لوگ کہتے اور پوچھتے ہیں، لیکن جب وقت پر مقالے نہیں آتے تو پھر وہ صحیح کام نہیں ہو پاتا، جن حضرات کے سپرد عرض کیا گیا ہے ان کے مقالے جو وقت پر آئے اور جو مقالات موجود تھے اکیڈمی نے اچھے خاصے اخراجات کے ساتھ سارے مقالے جس موضوع کا عرض جس کے پاس ہے ان سب کو پہونچائے، انہوں نے وقت لگائے اور مرتب کیا، اس لئے مولانا سلطان صاحب یا جو حضرات ہیں ان سے معذرت کے ساتھ ہم پھر گذارش کرتے ہیں کہ ہمارے جو سوال نامے جاری ہوتے ہیں ان کے جوابات وقت پر پہنچانے کی کوشش کیجئے، تاکہ آپ بھی صحیح طور پر مستفید ہوسکیں اور ہم بھی مستفید ہوسکیں۔

اور جہاں تک سوال ہے اس کا ویسے تو ابھی گفتگو چل رہی ہے کہ فاضل زمین میں کیا اقدامات کئے جائیں، بات صحیح ہے، اس سوال نامہ میں بھی ایک سوال ہے کہ مسجدیں تنگ ہورہی ہیں، قبرستان ادھر ادھر ہے تو کیا کریں، جہاں ایک طرف بڑی آبادی والے شہروں میں یا جہاں، بہت تیزی سے آبادی بڑھ رہی ہے، ترقی ہورہی ہے، یہ صورت حال ہے کہ پانچ سال کے بعد دس سال کے بعد جو موجودہ مسجد ہے وہ تنگ ہوجاتی ہے، دو منزل یا تین منزل بنائی جاتی ہے، یا بڑھائی جاتی ہے، وہاں تو یقیناً یہ بات نہیں سوچی جاسکتی، نہ وہاں کے لئے یہ سوال ہے، سوال بہت سی ایسی جگہوں کے لئے ہے کہ جہاں اس انداز کی بڑی آبادی ہے اور نہ حالات کے اعتبار سے یہ تصور ہے کہ دس بیس پچیس سال میں اس طرح کی کوئی صورت پیش آئے گی، اور زمین بہت کافی ہو تو اس کو وقف کی نسبت سے نفع بخش بنانے کے لئے جو ضرورت درپیش ہے کیا اس طرح کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے کہ زمین زائد پڑی رہے کسی طرح ہمارے کار آمد نہ ہو اور واقف کو بھی کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ پہونچ سکے تو اس طرح کی صورت اختیار کرلیں تو کس حد تک درست ہوگا، تو عرض ہوچکا ہے، اور گفتگو بھی آگے ہوگی،

حکیم ظل الرحمن صاحب: ...... مقالات کی تلخیص جو ہمیں دی گئی ہے مطبوعہ اور جو عبارت پڑھی گئی ہے اس میں بہت اختلاف ہے......

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب: ...... یہ سن لیں کہ رات میں جو کچھ پڑھا گیا یا ابھی جو کچھ پڑھا گیا وہ تلخیص نہیں وہ عرض ہے، اس میں نوعیت بدل جاتی ہے، اگر یہ بات ہو کہ ہم نے رائے پیش کی تھی، فلاں تاریخ تک مقالہ پہنچا دیا تھا اور وہ رائے نہیں آئی، اور افراد کا نام لینا بھی ضروری نہیں ہے، وہ نہیں فراہم کیا جاتا، وہ محدود رہتا ہے۔

مفتی فضیل الرحمن صاحب: ...... مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کے آغاز سے پہلے اوقاف کے تعلق سے ہمارے جتنے سوالات ہیں اور ان کے جوابات ہیں ان میں زیادہ تر ایسے سوال و جواب ہیں کہ ان کا تعلق بھی قاضی کی اجازت سے ہے، امارت شرعیہ بہار سے معاملہ کو الگ رکھ کے کہ وہاں کی صورت حال پورے ملک سے مختلف ہے، ملک کے جو دوسرے علاقے ہیں خاص طور پر پنجاب، ہریانہ، یا ہماچل پردیش وغیرہ کے علاقے اور وہاں ہمیں قاضی کی یا شرعی کمیٹی کی اس طرح کی سہولتیں حاصل نہیں ہیں، تو وہاں کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جائے اور کوئی تجویز رکھی جائے کہ قاضی کا بدل کیا ہوگا؟ تاکہ ہم آگے جتنے بھی سوالات کے جوابات باذن القاضی ہیں......... بحث بھی ہوجائے گی جواب بھی آجائے گا کہ وہاں قاضی کی اجازت سے ایسا ہوسکتا ہے، اور قاضی ہے نہیں اور اجازت اس سے کیسے لی جائے تو وہ ہماری ساری بحثیں ایک نظری بحث ہوجائے گی عملی بحث نہیں بنے گی۔

قاضی صاحب:

یہ بڑا بنیادی اور اہم مسئلہ ہے جس کی طرف مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب نے توجہ دلائی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس کی طرف ہمارے اکابر علماء نے اولین زمانہ سے توجہ دی، آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آیا تھا کہ وہ تمام احکام شرعیہ جن کا تعلق قضاء قاضی سے ہے، جب ہندوستان میں مغلوں کا زوال ہوا اور انگریزوں کا اقتدار آیا تو آہستہ آہستہ نظام قضاء ختم ہوگیا، اور حقیقت یہ ہے کہ اسلامی زندگی کے لئے نظام قضاء ریڑھ کی ہڈی کا

درجہ رکھتا ہے، اس لئے کہ: ''به يقوم العدل والمسلم يحتاج فی حياته في كل الآن إلى نظام القضاء الإسلامی، عدة من القضايا والمسائل فی حياة المسلم لا يمكن أن تطبق إلا أن يكون هناك قاض، فلذلك قد أفتى العلماء أن فی بلاد تغلب عليها الكفار يجب على المسلمين أن يتفقوا على واحد منهم يولّى قاضيا أو يكون هو الذى يقضى بينهم۔

هناك قضايا لا نستطيع أن ننفذ أحكام الشريعة فيها بسبب فقدان الولاية الكاملة أوالقوة القاهرة كما فی الحدود والقصاص لا يمكن لنا فيها تطبيق أحكام الشريعة، ولكن فی قضايا يمكن تطبيق أحكام الشريعة فيها على المسلمين بتراضيهم فی مثل هذه القضايا يجب على كل مسلم أن يفعل ما يستطيع ويرجو من الله تعالى أن يعطيه الاستطاعة فيما لايستطيع، هذا ماكتب الشيخ أبو المحاسن محمد سجاد، ما نستطيع الآن يجب علينا أن نتعامل به وما لا نستطيع، نرجو ان الله سبحانه وتعالى سيوفقنا ويسهل لنا طريق تنفيذ الأحكام الشرعية، وتطبيق الشريعة الإسلامية، ولذلك قدكتب الفقهاء أن القاضي يصير قاضيا بتراضي المسلمين، وهذا ما أفتى به الشيخ عبد العزيز المحدث الدهلوی بعد أن تسلط علينا الانجليز، هذا هو الأمر الأول والأساسی فی الهند، ولذلك قررت جمعية علماء الهند بل فی الحقيقة علماء الهند على تأسيس الإمارة وتفويض منصب القضاء لأحد منهم......

تعرفون أيها السادة! مع الأسف أن بعضهم قد أفتوا فی زمان قديم أن المسلمة إذا صارت مظلومة من جانب زوجها فلها۔ العياذ بالله۔ أن ترتد، ولذلك أفتى الشيخ أشرف على التهانوی أن بارتداد المرأة لاينفسخ نكاحها هذا أسف كبير، ولكن علمائنا ولله الحمد من وجهة نظر الإمارة الشرعية أو الجماعة العادلة من المسلمين قد خرجوا عن هذه القضية و أسسوا الإمارة الشرعية فی بيهار و أريسة، فالآن لو نحتاج إلى نظام القضاء الشرعی، فعلينا أولا أن نتفق فی كل ولاية على أمير منا وحدود عمله ما هو مستطاع فی هذا الزمان فی هذه الحكومة العلمانية، فما هو خارج من الاستطاعة لسنا بمكلفين، نحتاج إلى القضاء فی قضية فسخ النكاح بسبب أن الزوج مفقود أو أنه مريض مرضا يضر بالمرأة أو لا ينفق عليها أو هومعسر أو هو ظالم أو هو متعسف، مثل ذلك من الوجوه والأسباب لفسخ الزواج، كذلك نحتاج فی أمور الأوقاف إلى نظام القضاء الإسلامی، ونظراً إلى هذه الحاجة الماسة قررت هيئة الأحوال الشخصية لعموم الهند (مسلم برسنل لاء بورد) فی دورتها المنعقدة فی جيفور تاسيس نظام القضاء الشرعی فی جميع بلدان الهند، والحمد لله قد بدأ العمل على هذا ولكن فيها مشاكل تربية القضاة وتدريب القضاة، وكل من نجد أهلا للقضاء نفوض إليه القضاء، قضية الأوقاف نحتاج فيها أيضاً إلى القضاء فعلينا أولا أن نحاول ونجتهد فی جميع بلدان الهند أن نؤسس الإمارة الشرعية، ومن سوء حظنا إذا لم نتفق على أحد منا كأمير فعلينا نحن جماعة المسلمين أن نفوض القضاء إلى أحد من العلماء، فهذا هو الحل......لأن القضاء أصلا مصدره جماعة المسلمين، والأمير والخليفة نائب عن جماعة المسلمين، فإذا فقد الأمير فقد رجع الاختيار إلى جماعة المسلمين، فيجوز لجماعة المسلمين أن يفوضوا القضاء لأحد من العلماء، إذا لم يكن الأمير فيمكن لنا أن نجعل قاضيا بتراضينا وهو الذى يقضى بيننا۔

أيها السادة! إن القضاء هو الحكم، حقيقة القضاء هو الحكم بما أنزل الله فيما تنازع فيه المسلمون، فيما يتخاصم به المسلمون، هذا هو الحكم......

أما الالزام الحسی فهو خارج عن حقيقة الحكم كما صرح به القرافی وغيره من العلماء الأحناف، والطرابلسی قاضی القدس الشريف فی معين الحكام قد صرح بهذا أن الإلزام المعنوی داخل فی حقيقة الحكم، والإلزام الحسی ليس بداخل فيها، وكذلك حكم الأوقاف، أعرف أن بعضا من المسلمين يخرجون من أحكام الشريعة ويذهبون إلى المحاكم الرسمية، ولكن مع هذا نعرف أن عامة المسلمين الآن فی الهند مع جميع هذه الضلالات، المسلم لا يرضى بحكم غير إسلامی الآن أيضا، نعتمد على إيمانهم، وأنهم يذهبون إلى القضاء الشرعی

الإسلامي، لأنهم قد رضوا بالإسلام وقد رضوا بما قضى الله ورسوله كما ورد في القرآن: ''فردّوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير وأحسن تأويلا'' فعلينا أولا إذا اتفقتم على هذا أن نقول في قرارات هذه الندوة أنه في كل بلد يجب على المسلمين أن يفوضوا القضاء إلى أحد من العلماء الذين هم عارفون بأحكام الشريعة وفيهم ورع وفيهم تقوى، ولكن نقول هنا أنه مرة سأل سائل سيدنا على رضي الله عنه: ما كان في زمن أبي بكر و زمن عمر۔ رضي الله عنهما۔ أي خصومة، الآن ماذا حدث في زمنك وفي زمن عثمان أن قد تغيرت الأحوال، فقال سيدنا علي۔ كرم الله وجهه۔ حينما كان أبوبكر وعمر خليفة للمسلمين كنا تحته أمة واحدة نطيعه، الآن نحن الأمراء وأنتم الأمة، وهذا التغير بسبب تغير أحوال الأمة لا بسبب تغيره، فعلينا أن نتنزل مثل هذا التنزل في شرائط القضاء وأهلية القضاء، نتنزل حسب ما يمكن وحسب الزمان، لا يمكن أن نطلب مثل القاضي شريح ومثل فلان وفلان وقاضي أياس ابن معاوية، الآن يمكن أن يكون فينا قضاة مثلكم أيها العلماء، والله يبارك فينا ويجعل لنا مخرجا ''لعل الله يحدث بعد ذلك أمرا'' إن شاء الله، فعلينا يمكن أن يكون في التوصية أن المسلمين يجب عليهم أن يفوضوا القضاء لأحد من العلماء، مثل ما يمكن ومثل ما نجد في هذه الأحوال۔

و بعد ذلك إن لم يمكن وإلى وقت لا يمكن تفويض القضاء فهذا أحسن أن نجعل في كل بلد جماعة ولجنة للأوقاف مشتملة على العلماء الذين يعرفون أحكام الأوقاف، لأن كل عالم لا يعرف أحكام الأوقاف أيضا، لأن عندهم كل السؤال عن الصلاة والزكوة أو الطهارة، ولا يعرفون المعاملات، وإذا لم يطلع العلماء بهذه المسائل والقضايا فكيف يعرفون أحكامها، فعلينا أن نوصي في توصياتنا أولاً ما هو مطلوب في الشرع هو إقامة الإمارة أو تأسيس القضاء الشرعي الإسلامي، وبعد ذلك إن لم يمكن هذا وآخر الأحوال.........أن يكون هنا لجنة للعلماء الذين يعرفون أحكام الأوقاف فيكون هو أحسن۔

میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے مولانا فضیل الرحمن صاحب کے اس اہم ترین سوال کے جواب میں ہمارا یہ مجمع الفقہ الاسلامی اس بات کو قبول کرے گا کہ اصل صورت تو یہ ہے کہ ہم شرعی امارت قائم کریں، جیسا کہ ہمارے بزرگوں نے فتوی دیا تھا، وہ ممکن نہ ہو تو جماعت مسلمین اور علماء کے اتفاق سے ہم کسی کو قاضی مقرر کریں، اور اگر وہ بھی ناممکن ہے کہیں، ایسا نہیں کہ جو آسان ممکن ہو، اس کے لئے ہم اس مشکل کو اختیار نہ کریں، ایسا لجنہ بنائیں ایک ایسی کمیٹی بنائیں ایک کونسل بنائیں جس کونسل میں ایسے متبحر علماء موجود ہوں جو مسائل اوقاف سے واقف ہوں..........

مولانا فضیل الرحمن صاحب:......قاضی صاحب نے بہت اچھی بات فرمائی ہے، عرض یہ ہے کہ ہمارے یہاں وقف بورڈ کا ایک مستقل قانون ہے، ہم اپنے طور سے کوئی لجنہ بنالیں، امارت شرعیہ بنالیں یا قاضی بنالیں تو کوئی ضروری نہیں ہے کہ وقف بورڈ ہماری ان باتوں کا یا ان فیصلوں کا پابند ہو، اس لئے اس وقت چونکہ مسئلہ وقف کا ہے، تو ہم اس پہلو سے سوچ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے جتنے اوقاف ہیں ان کے وقف بورڈ سے یہ کہیں کہ آپ اپنے یہاں ایک دفعہ قاضی کے تقرر کا بھی رکھیں اور اپنے یہاں قاضی مقرر کیجئے، جہاں جہاں وقف کے قانون کے لئے قاضی کی اجازت کی ضرورت پڑے اور مسائل وقف کے بارے میں سوالات کی ضرورت پڑے تو وہ قاضی آپ کی رہبری کرے گا اور وہ فیصلہ کرے گا، تو خود وقف بورڈ ہی اپنے امور کے لئے بھی اور مسلمانوں کے دیگر امور کے لئے بھی قاضی کا تقرر کرے، اور یہ میں آپ کی معلومات کے لئے عرض کردوں کہ تقریبا ہر دوسرے تیسرے سال مرکزی حکومت کی طرف سے وقف بورڈ کے پاس مراسلہ آتا ہے کہ آپ کے یہاں کوئی قاضی ہے یا نہیں اور وہ مراسلہ کئی بار میرے پاس بھی وقف بورڈ نے بھیجا تو ہم نے ان کو لکھ دیا کہ ہمارے یہاں تو باقاعدہ کوئی قاضی نہیں ہے، تو ایسا لگتا ہے کہ کسی مرحلہ میں کوئی ایسی بات آئی ہوگی وہ قانون بنا ہوگا یا کوئی تجویز آئی ہوگی اور وہی حکومت کے کاغذات میں بار بار اس کے سلسلہ میں خط وکتابت ہوجاتی ہے، تو اگر ہماری یہ اکیڈمی اس بات کا مشورہ دے اور مطالبہ کرے کہ وقف بورڈ اپنی طرف سے وقف کے امور کے لئے اور مسلمانوں کے دیگر امور کے لئے بھی ساتھ ہیں، لیکن اصل تقرر ان کا وقف کے امور کے لئے ہوگا، خود قاضی کا تقرر کرے، تا کہ وہ اس کا پابند رہے۔

قاضی صاحب:...... بہت اچھی بات ہے یہ، لیکن جو دشواریاں ہیں وہ آپ جانتے ہیں کہ سرکار کے مقرر کئے ہوئے قاضی پر مسلمان اعتبار نہیں کریں گے، یہ ایک سچائی ہے اور یہ بہت بڑی سچائی ہے، آپ جانتے ہیں کہ آج جتنے وقف بورڈ بن رہے ہیں وہ سرکار (Oblige) کرنا چاہتی ہے، اور مجھے کہنے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ جتنے قسم کے وہ بورڈ جس سے بڑے بڑے مالی منافع ہو سکتے ہیں وہاں پر مسلمانوں کو مقرر نہیں کیا جاتا ہے، اب مسلمان ورکر کو خوش کرنے کے لئے کیا چاہئے؟ تو حج کمیٹی ہے، وقف بورڈ ہے، مدرسہ بورڈ ہے، اور یہاں پر ان ہی لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے جو دراصل سیاسی لوگ ہیں اور جن کو پارٹیاں خوش کرنا چاہتی ہیں، ۱۹۶۷ء سے یہ مسئلہ چلا آ رہا ہے، تو بسبب اہلیت وقف بورڈ کی رکنیت نہیں ملتی، بلکہ سرکار کی وفاداری کے حساب سے ملتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ نظام قضاء ان کے حوالہ کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔

ہاں اب جو رجحان چلا ہے، اس میں ہم لوگوں نے بہت کوشش کی ہے کہ آہستہ آہستہ وقف بورڈ کو جمہوری کردار دیا جائے، اور اس میں کچھ سیٹیں انتخاب کے ذریعہ آئیں، تو جس طرح بار کونسل آف انڈیا ہے یا بار کونسل آف اسٹیٹ ہوا کرتی ہے وہ اپنے میں سے کسی مسلمان وکیل کو مقرر کرے گی، ارکان پارلیمنٹ کی نمائندگی اور ارکان اسمبلی کی نمائندگی وہاں اسپیکر کے ذریعہ طے ہوتی ہے، یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ کم از کم مسلم ارکان ہی مل کر اپنے میں سے کسی کو منتخب کرتے، تو یہ کام تو آل انڈیا ملی کونسل یا جمعیۃ علماء ہند یا اس طرح کے اداروں کے لئے چھوڑ دیئے، ہمارا کام علمی اور فقہی ہے، کہ وہ اس بات کے لئے کوشاں ہوں کہ علماء کو اس بات کا اختیار دیا جائے کہ وہ ایسے علماء کو مقرر کرنے کے مجاز ہوں جن کو حکومت وقف بورڈ کا رکن مانے، اور اس میں اس کا اضافہ کیا جائے کہ چونکہ اس کا تعلق مسلم پرسنل لا سے ہے، اور ۱۹۳۷ء کے شریعت اپلیکشن ایکٹ کے مطابق وقف بھی مسلم پرسنل لا میں آتا ہے جس میں مسلمان Govern ہوں گے اسلامی شریعت سے، نہ کہ کسی کسٹم اور عرف یا اور کسی قانون سے، اس لئے اس میں یہ بات لکھی جائے کہ وہ تمام مسائل جن کا تعلق شرعی احکام سے ہوگا انہیں ارکان کے فیصلے اور ان کی رائے کے مطابق وقف بورڈ کو فیصلہ کرنا چاہئے، میں جانتا ہوں کہ اس میں مشکلات ہیں، لیکن یہ کوشش کی جانی چاہئے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ادارے جو ایسے موقعوں پر ہماری نمائندگی کرتے ہیں، ہندوستان کی حکومت کے سامنے، اور خوش قسمتی ہے کہ کے رحمن خاں صاحب یہاں تشریف فرما ہیں، ممبر پارلیمنٹ بھی ہیں اور ملی درد رکھتے ہیں، اور خاص کر اوقاف کے مسائل سے ان کی خاص دلچسپی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کا بھی ایک لکچر مختصر کراؤں گا ان حضرات کی مدد سے ان محاذ پر آہستہ آہستہ ہم کو کامیابی ہو سکتی ہے، اور قبل اس کے کہ میں اور لوگوں کو تکلیف دوں میں چاہوں گا کہ پانچ منٹ میں جناب عبدالرحیم قریشی صاحب اس موضوع پر روشنی ڈالیں۔

جناب عبدالرحیم قریشی صاحب:...... محترم حضرات! جہاں تک قاضی کے مسئلہ کا تعلق ہے اور جو تفصیل جناب مفتی فضیل الرحمن صاحب نے پیش فرمائی ہے اس تعلق سے یہ عرض کروں گا کہ......... جس طرح قاضی صاحب نے فرمایا کہ اگر ہم وقف بورڈ کو یہ اختیار دیتے ہیں تو اس میں بڑی خرابی ہے، کیونکہ وقف بورڈ میں جیسے لوگ آتے ہیں......... اور ظاہر ہے کہ وہ ایسے شخص کو حاکم بنادے جس کے ذریعہ وہ جیسے چاہے کر لے، فیصلہ دیکھا کر کے، فتوی لکھا کر کے......... اب ہماری کوشش یہ ہے، جیسا کہ قاضی صاحب نے کہا کہ ہم نے وقف بورڈ میں جمہوری انداز میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے کوشش کی ہے۔
(ٹیپ ریکارڈر میں آواز صاف نہیں ہے)

شیخ خالد مذکور عبداللہ المذکور:

بسم الله، والحمد لله، والصلاة والسلام على أشرف خلق الله، أما بعد!

فقد فهمت البارحة، وهذا اليوم فيما عرض من موضوع الوقف عدة قضايا تواجه المسلمين في الهند۔

أما القضية الأولى فهي متعلقة بالأمور الفقهية والاجتهادات التي اختلف فيها الفقهاء بالنسبة للزوم الوقف أو عدم لزومه، وبالنسبة لاستبدال الوقف أو عدم استبداله، وهذه الأمور بحمد الله فيها سعة، و مادام الأمر في نطاق الاجتهاد كل يستند إلى دليل وكل يستند إلى وجهة نظر، فلا بأس بأن يؤخذ من هذه الأقوال الأحسن والأنسب والأصلح عند إخوتنا المسلمين الهند۔

أما بالنسبة للقضية الثانية وهي مايتعلق باستبدال الوقف بالنسبة، لأن يكون بحكم القاضي الذي أعرفه

من البارحة حسب ما ترجم لي أن هناك قانونا ذكره الشيخ مجاهد الإسلام القاسمي يتعلق بالوقف للمسلمين و أن هذا القانون المطوق يهدم أوقاف المسلمين لا أدري ماهو الإشكال الذي كان في عدم تطبيق هذا القانون أو في عدم النصوص التي تثبت هذا الحق للمسلمين۔

أما الاقتراح الذي تفضل به الشيخ مجاهد الإسلام القاسمي حول أن لكل ولاية من ولايات الهند ظروفها. وأنه يجب أن تشكل هناك لجنة أو يكون هناك قاضي يتفق، أو من القضاة المتفقهين في الدين من أصحاب الورع و التقوى. فهذا اقتراح جيد حتى ترجع الأمور إليهم في مسائل القضايا للوقف الموجود۔

أما بالنسبة للمقابر والمساجد، وما يتعلق بها فهي باقية يعني الراجح فيها أنها يعني لا تستبدل، وإنما تبقى وتكون للمسلمين سواء كانت على الحدود التي بين الهند وباكستان عندما انقسمت الهند إلى قسمين أو باقية الولايات الهندية الموجودة. فالمقبرة مادام هناك مكان للدفن فيها فهي تسوى و تستعمل سواء سويت من قبل الولاية أو من غير أهل الولاية وكذلك للمساجد۔

وأما مسائل الأراضي الزراعيه...... كما قلت إنها مسائل اجتهادية والمسائل الاجتهادية فيها سعة إن شاء الله. لكن مسئلة هنا في القاضي الذي يحكم وفق شريعة الله سبحانه وتعالى وأن يُضمن هذا إما بنص قانوني إن كان القانون مستقرا إلى اجتهاد الموضوع أو بانتخاب أو بتعليم هذا القاضي الشرعي الذي يكون في هذه الشروط الشرعية من قبل لجنة أو من قبل فقهاء و علماء هذه الولاية. فجزاكم الله خيراً۔

قاضی صاحب:

یہ بھی بحث ہی کا ایک حصہ ہے، اور جیسے مجھے اور آپ کو اختیار ہے بحث کرنے کا باہر سے آنے والے مہمانوں کو بھی بحث کا حق پہنچتا ہے اور ہمارے لئے خوشی کی بات ہے کہ ہم نے ان کی رائے بھی جان لی۔

جو مسئلہ زیر بحث ہے میں سمجھتا ہوں کہ مرتب طریقہ پر جن امور پر ہمارا اتفاق ہے ان میں بحث کی ضرورت شاید باقی نہیں رہی۔

تو پہلا سوال یہ ہے کہ بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں بدقسمتی سے مسلمان باقی نہیں رہے اور وہاں پر جو مشکل ہے وہ آپ جانتے ہیں، لیکن یہ بھی بڑی خوش قسمتی اور سعادت کی بات ہے کہ پنجاب جیسے علاقہ میں جہاں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ وہاں پھر کبھی مسلمان آسکیں گے، اللہ کا شکر ہے کہ مزدور ہی کیوں نہ ہوں، لیکن بڑی اچھی خاصی تعداد میں وہاں پر مسلمان تیزی کے ساتھ آتے جارہے ہیں، ہمارے بہت ہی بزرگ دوست مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب روزانہ اس سے دوچار ہیں، اور یہ خوشی کی بات ہے کہ بہت سی مسجدیں جو غیروں کے قبضہ میں جاچکی تھیں وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف لوٹ کر آرہی ہیں اور مسجدیں آباد بھی ہورہی ہیں، اور ہم اپنے ان بزرگوں کے فقہی ژرف نگاہی کا اعتراف کرتے ہیں کہ جنہوں نے کہا تھا کہ مسجدوں کو بدلنا مت، آج اگرچہ وہ ویران ہوچکی ہیں۔ وإن كان اليوم خربانا ولكن يمكن أن يجتمع المسلمون حوله وبعد ذلك نجد فيها مصليا أوذا كراً تو الحمد للہ ایسے واقعات پیدا ہورہے ہیں۔

اب رہا تعلق کہ مساجد سے متعلق اوقاف ہیں یا بڑے بڑے قبرستان ہیں یا دیگر رفاہی مقاصد کے لئے قائم کئے جانے والے اوقاف ہیں، اب آبادی نہیں رہی، یا غیروں کا قبضہ غالب اندیشہ ہے کہ وہاں پر ہوجائے گا، بلکہ ہوچکا ہے اور ہورہا ہے، ایسے اوقاف کے بارے میں یہ سوال ہے کہ: ''هل يجوز أن نستبدل هذه الأوقاف أي نبيعها ونشتري بثمنها وقفاً آخر، فهذا متفق عليه بين الفقهاء. وأنها أنا إذا نستبدل شيئا من الأوقاف ونشتري منه أرضا أخرى، فيكون هذا البدل محل المبدل منه، ويكون وقفا كما كان الأول وقفاً، فيصرف دخله وتصرف محاصله على ما صرح به الواقف في الوقف الأول، فنرجو من جميع العلماء أن الوقف إذا صار خربانا لا يمكن أن يستعمل وليس له دخل، وفيه خطر قوي لتغلب من غير المستحقين لا أقول من غير المسلمين، بل غير المستحقين، لأنا نحن المسلمين كما تعرفون قد تغلبنا الأوقاف وجعلناها أملاكا شخصية ذاتية. وهذه جريمة كبيرة منا. فإذا كان منا خوف على أنهم يتغلبون ويتصرفون في هذه الأوقاف كتصرف الملك الشخصي

فهل يجوز أن يباع ويشترى أرض أخرى، وتصرف محاصله على ما صرح به الواقف في الوقف الأول"۔

کیا یہ ہمارے لئے جائز ہے کہ ایسے ویران اوقاف جن پر غیروں کے قبضہ کا خطرہ بھی ہے اور وہ آمدنی کے مواقع سے محروم بھی ہیں، کیا ان کو فروخت کر کے دوسری زمین خرید لینا اور اس کو بھی انہیں مصارف کے لئے وقف سمجھنا اور وقف ماننا جن مصارف کے لئے پہلا وقف کیا گیا تھا تو کیا سارے علماء اس کے جواز سے متفق ہیں؟

جتنے جوابات اور مقالات آئے ہیں ان میں اس پر اتفاق ہے، میں امید کرتا ہوں کہ آپ سب حضرات اس پر اتفاق کا اظہار کریں گے، تا کہ یہ مجمع علیہ مسئلہ لکھ دیا جائے کہ اگر وقف ویران ہے، وقف پر خطرہ ہے غیروں کے قبضہ کا، وقف کی نافعیت کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس وقف کو بدل دیا جائے اور اس کی جگہ ایک نئی اراضی حاصل کرلی جائے، اور جو مصرف پہلے وقف کا تھا اسی مصرف پر اس دوسرے وقف کی آمدنی بھی خرچ کی جائے تو کیا یہ جائز ہے، آپ لوگ اس پر رائے دیں، سب لوگوں کا اتفاق ہی؟ الحمدللہ۔

قاضی صاحب: ...... میں نے عرض کیا کہ پیسہ نہیں، بلکہ ہمیشہ ایک وقف کو فروخت کر کے دوسری اراضی اور جائداد کو حاصل کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ اجازت اسی حالت میں دی جاسکتی ہے جب پورا پورا اعتماد ہو، آپ جو اصول طے کریں گے اور علماء جو فتویٰ اس پر دیں گے اور قضاۃ جو فیصلہ کریں گے اس پر، تو ان کو اس شرط کی پابندی کرنی پڑے گی، ایسا نہ ہو کہ وقف کی نافعیت کے سامنے ہم اصل وقف کی حفاظت کو بھول جائیں، ٹھیک ہے، چلئے کوئی اشکال نہیں۔

حکیم ظل الرحمن صاحب: .... آپ نے یہ فرمایا کہ وقف بورڈ کو قاضی کا بدل قرار نہیں دیا جاسکتا، اور دوسری طرف حکومت کا یہ قانون موجود ہے کہ وقف بورڈ کی منظوری کے بغیر وقف کی کوئی جائداد منتقل نہیں ہوسکتی، اور اس کا بھی ایک طریقہ کار یہ ہے کہ آپ پہلے اس کی ایک پراپرٹی پیمنٹ جو ہوتی ہے...... پہلے سے، تو پھر سوال یہ ہے کہ اس کے طریق کار کیا ہوں گے، پہلے اس کی پراپرٹی کمیٹی ہوتی ہے.........

قاضی صاحب: ...... طریق کار تو ہم سب جانتے ہیں، میں خود وقف بورڈ کا ممبر ہوں برسہا برس سے، آپ تفصیل نہ بتائیں، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں دراصل وہ بتائیے۔

حکیم صاحب: ...... وقف بورڈ کو قاضی کا بدل نہیں مانا جاسکتا اور اس کی اجازت کے بغیر پراپرٹی فروخت نہیں ہوسکتی تو پھر آخر اس کا کیا مطلب ہے؟

قاضی صاحب: ...... موجودہ قانون میں وقف بورڈ کو قاضی کا بدل قرار دیا گیا ہے قانونی طور پر، ہماری کوشش یہ ہوگی جیسا کہ پہلے بات آچکی ہے کہ موجودہ حالات میں قانونی جبر جہاں پر ہے وہاں پر ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن کم از کم اگر وہی علماء جا کر کے وہاں پر بیٹھتے ہیں تو وہاں پر اوقاف میں حکم شرعی کی رعایت کریں گے، جس کا فیصلہ آپ کریں گے انشاء اللہ۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب: ...... اگر پنجاب اور ہریانہ کے اوقاف کو بالعموم ہم بیچنے کے جواز کے قائل ہوتے ہیں تو اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟ یہ معاملہ کس کے ذریعہ حل ہوگا، ملت اسلامیہ ہند میں یا مسلمانوں میں کون قاضی یا کون ایسا نمائندہ گروہ ہے جس کے ذریعہ یہ معاملہ انجام پائے گا، اصل مسئلہ اس نزاکت کا ہے۔

قاضی صاحب: ...... اصل میں یہ مسئلہ نزاکت کا نہیں ہے، وقف بورڈ جو کر رہے ہیں وہ ہم سے فتویٰ بھی مانگنے کے محتاج نہیں ہیں، ان کے ذہن میں جو آرہا ہے وہ کر رہے ہیں، جہاں جہاں ہم لوگوں کے کچھ اختیارات چلتے ہیں ہم ان کو احکام شرعیہ کا پابند کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جہاں پر یہ ممکن نہیں ہے وہاں پر ان کے جو مطلب میں آرہا ہے وہ کر رہے ہیں، میں ایک بات اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہزار ہا مایوسی کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت پنجاب وقف بورڈ ہندوستان کا سب سے مالدار وقف بورڈ ہے، ایک تو خیر ان لوگوں نے محنت اور کوشش بھی کی اور ان کو کچھ اچھے لوگ وقت پر ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے مل گئے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جہاں مصرف ہی نہ ہو وہاں تو آمدنی بچے گی ہی، وہاں کے مصارف کو ہی ختم کر دیا تو آمدنی کا بچنا لازمی تھا، لیکن پھر بھی اس کے باوجود جو احکام شریعت ہیں جن کی آپ وضاحت کریں گے، اپنی تمام ممکنہ قوتوں کے ساتھ ان کی تنفیذ کے لئے کوشش کرتے رہنا ہمارا فرض ہوگا، لیکن اس کے باجود جہاں

مجبوریاں ہیں وہاں مجبوریاں ہیں، اللہ کے یہاں آپ بھی مکلف نہیں ہیں، لیکن کوشش کرنا ہمارا فرض ہے، جیسا کہ خود بھی آپ نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے جو آپ نے ابھی دکھلایا تھا کہ حالات کو جوں کا توں قبول کرنے کے بجائے حالات کی تبدیلی کے لئے ہم کو کوشش کرنا چاہئے، اور یہ مبارک بات ہے۔

مولانا عبدالعظیم اصلاحی صاحب:...... استبدال وقف کے سلسلہ میں جو محترم مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب نے ابھی اپنے فیصلے کا ذکر کیا کہ استبدال کے لئے یہ کرلینا چاہئے کہ وہ دست بدست ہو، یہ بہت اچھی چیز ہے، اور میرا خیال یہ ہے کہ ہم استبدال کی جو تجویز پاس کردیں اس میں یہ جز ہونا چاہئے۔

اگر اس علمی مجلس میں زبان بندی نہیں ہے تو میں معذرت کے ساتھ مساجد کے سلسلہ میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

قاضی صاحب:...... سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں زبان بندی کا سوال نہیں ہے، لیکن جو مسئلہ مفروغ عنہا ہے اس کو زیر بحث لانا نہیں ہے۔

مولانا عبدالعظیم اصلاحی صاحب:...... میں اپنے علم میں اضافہ کیے لئے بس یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مساجد کے سلسلہ میں محترم قاضی صاحب نے فرمایا کہ یہ مسئلہ عرب اور تمام علماء ہند کی موجودگی میں ان کے نزدیک متفقہ علیہ ہے کہ اس کا استبدال جائز نہیں ہے، یہاں میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ علامہ ابن تیمیہ نے اپنے فتاوی میں کئی جگہ احمد بن حنبلؒ کی روایت سے یہ لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں کوفہ کی ایک مسجد تنگ پڑ گئی تھی تو اس کو امیر المومنین کی اجازت سے اس کے بدلہ میں ایک دوسری مسجد بنادی گئی اور پہلی مسجد کھجوروں کا بازار بن گیا، خود اس عہد میں سرزمین حجاز میں ہم نے دیکھا ہے کہ شاہراہوں کی تعمیر یا توسیع کے سلسلے میں حائل کتنی مساجد ہٹادی گئیں، قاضی صاحب نے مسجد کے سلسلہ میں اتفاق کی رائے لکھی ہے، وہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر ہو تو ٹھیک ہے، لیکن اگر وہ مطلق رائے ہے تو امام احمد بن حنبل کی روایت اور عربوں کے نقطۂ نظر کے بارے میں خاص طور سے میں مہمان علماء اور عرب علماء سے جاننا چاہوں گا۔

قاضی صاحب:

نمبر ۱۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو واقعات اور قصہ آپ دہرا رہے ہیں ان واقعات کی سندی حیثیت اور مختلف مسئلوں پر بحث کرنی پڑے گی۔

نمبر ۲۔ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی مسئلہ کسی عہد میں مختلف فیہ رہا ہو، لیکن بعد کے علماء نے اس پر اتفاق رائے کرلیا ہو تو اس سے گریز نہیں ہونا چاہئے۔

نمبر ۳۔ یہ کہ عرب ممالک کے بارے میں یہ تصور کہ وہ سراسر اور سوفیصد ان کا سارا عمل عین اسلام ہے، اور علماء ہند کے سامنے اس کو ایک تتبع کی حیثیت سے اس کو بطور نمونہ پیش کیا جائے تو ہم اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں، صاف الفاظ میں ہم کہنا چاہتے ہیں، اور یہ حجت ایک واقعہ ہے اور میں نے آپ سے عرض کیا کہ آج کی بات نہیں ہے، بلکہ مسلم پرسنل لا کا اجلاس بابری مسجد کے انہدام سے پہلے جب علماء اکٹھا ہوئے اور تقریباً ہر مسلک کے ممتاز ترین علماء جمع تھے اور انہوں نے ایک فیصلہ کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام حکم ومصالح کو آپ بھی سمجھتے ہیں، اس کے بعد اس مسئلہ کو متنازع فیہ بنانا صحیح نہیں ہے، جو فیصلہ اجماعی طور پر ہوا اس پر قائم رہنا چاہئے اور کل خود ڈاکٹر وہبہ زحیلی صاحب نے صاف اور صریح الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا: "لا یباع ولا یوھب ولا یورث"، یہ ان کے الفاظ تھے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد مزید اس مسئلہ پر کسی اور بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی قاسمی صاحب:...... مساجد کی فاضل اراضی جن کی فی الحال ضرورت نہیں ہے اور نہ آئندہ ضرورت پیش آنے کی امید ہے ان فاضل اراضی پر مکاتب قائم کرنا، اور مدارس قائم کرنا یا اور تعلیمی و رفاہی ادارے قائم کرنا، یہ مسئلہ زیر بحث ہے، جن حضرات کو اس موضوع کے بارے میں اظہار خیال کرنا ہو فاضل اراضی پر مدارس و مکاتب قائم کرنے کی بات جو سوال نمبر ۲ کے (الف) میں آئی ہے اس پر وہ اظہار خیال فرمائیں، اپنا نام پیش کریں۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب:...... کچھ کہنے سے پہلے پنجاب و ہریانہ کے وقف کے مسئلہ کے سلسلہ میں استبدال کی میری رائے نہیں ہے، میرا اختلاف نوٹ کیا جائے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب:...... ٹھیک ہے نوٹ کرلیا جائے گا آپ پریشان نہ ہوں۔

سوال نمبر ۲ (الف) کے بارے میں کوئی اظہار خیال کرنا ہو، مسجد کی زائد اراضی جن کی فی الحال ضرورت نہیں ہے اور جو مسجد کے اوقاف ہیں ان میں

مکاتب کی تعمیر کے بارے میں اگر کوئی بات کہنی ہو۔

حکیم ظل الرحمن صاحب:...... ایک گراؤنڈ کی پوزیشن یہ ہے کہ پورے سال خالی پڑی رہتی ہے، بعض جگہ تو یہ صورت حال پیش آئی کہ اس میں آر، ایس ایس کی پریڈیں ہونے لگیں اور کرکٹ کے میدان بن گئے، میں قصاب پورے کی عیدگاہ کا واقعہ تفصیل سے بیان کررہا ہوں کہ چار پانچ سال سے مسلسل آر، ایس، ایس کی پریڈیں ہونے لگی تھیں، پھر ہم لوگوں نے کسی طرح لوگوں سے مل ملا کران پریڈوں کو ختم کروایا، اور اس کے اندر ایک اسکول بھی ہے، اس سے لگا ہوا، تو مسئلہ یہ ہے کہ اگر اس کی فاضل اراضی پر اس حیثیت سے کوئی تعمیر کردی جائے کہ پہلا گراؤنڈ جو ہے وہ نماز کے لئے وقف رہے اور اس کے اوپر دو تین منزلہ عمارت بن جائے تو کیا اس بات کی اجازت ہوسکے گی؟

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:...... گویا آپ نے ایک سوال کھڑا کیا ہے، اس میں جو آپ کی رائے ہے اسے آپ لکھ کر دیدیجئے انشاء اللہ بعد میں اس پر بھی غور کرلیں گے۔ سوال نمبر ۲۔ الف کے بارے میں جو اظہار رائے کرنی ہو کسی کو ہماری درخواست ہے خاص طور سے اصحاب افتاء سے، علماء سے، وہ کچھ کہنا چاہیں مسجد کی زائد اراضی کے بارے میں تو اظہار فرمائیں۔

پروفیسر احسان الحق صاحب:...... میں صورت مسئلہ کے بارے میں کچھ وضاحت چاہوں گا کہ جس کو فاضل اراضی سمجھا جارہا ہے، آجکل عمارت کے برابر میں خالی جگہ چھوڑنا بھی عمارت کی ضرورت میں شامل ہے، خالی جگہ کو ضرورت سے زائد سمجھنا غیر مناسب ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر واقف نے مسجد کے لئے پلاٹ دیا ہے تو کہیں یہ شرع میں لکھا ہے کہ فاضل جگہ کو دوسرے مصرف میں لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ عام طور سے واقف یہ کہتا ہے کہ میں یہ مسجد کے لئے جگہ دیتا ہوں، تو اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جتنی اس میں تعمیر ہو وہ مسجد ہے اور جتنی جگہ خالی رہے تو وہ بھی مسجد ہی کے لئے ہوتی ہے۔

مولانا عتیق احمد صاحب:

ڈاکٹر احسان صاحب جو سوال پیش کررہے ہیں وہ سوال نامہ میں پیش کردیا گیا ہے اب جو اصحاب افتاء اور علماء ہیں ان کو کوئی نئی بات کہنی ہو تو وہ اپنی رائے دیں۔

سوال نمبر ۲ کا متن یہ تھا کہ بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں مساجد و مدارس یا مقابر کے بڑے بڑے اوقاف ہیں اور مسلمانوں کی آبادی وہاں بہت معمولی رہ گئی ہے، مثلاً ایک مسجد ہے اس کے لئے بہت زمینیں اور مکانات وقف ہیں، مسجد کے اوقاف کی آمدنی اس کے مصارف سے زیادہ ہے اس سلسلہ میں دو باتیں دریافت طلب ہیں:

(الف) کیا مسجد پر وقف اراضی میں جو فی الحال مسجد کی ضروریات سے زائد ہیں مسلمانوں کے لئے دینی یا عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے، یہ گویا سوال نمبر ۲ کا جز الف ہوا، اسی کے بارے میں اگر اظہار رائے کسی کو کرنا ہو تو کرے۔

مفتی شبیر قاسمی صاحب مرادآباد:...... موجود لوگوں میں سے جن لوگوں کی رائے اکثر آگئی ہے اس کو طے کرکے اس پر تبصرہ کیجئے، مثلاً یہ کہ میری رائے یہ آئی ہے کہ دینی ادارہ قائم کرنے کی اجازت ہے اور عام رفاہی ادارہ قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے، ایک رائے یہ بھی آئی ہے تمہید میں اس کے اوپر......

مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب:...... جو موقف آچکے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں، عرض میں بتایا جاچکا ہے کہ تین آراء تقریباً اس سلسلہ میں آئی ہیں، ایک رائے تو یہ ہے کہ جو مسجد کے لئے زمین وقف ہے اس میں کسی قسم کا کوئی ادارہ قائم نہیں کیا جاسکتا، نہ مدرسہ نہ مکتب نہ کچھ، دوسرا موقف یہ ہے کہ دینی مکاتب قائم کرسکتے ہیں عصری تعلیم گاہوں کی اجازت نہیں ہے، تیسرا موقف جو بعض حضرات نے ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ عصری تعلیم کے ادارے بھی قائم کئے جاسکتے ہیں، لیکن شرط ہے کہ وہاں بنیادی دینی تعلیم کا نظم بھی ہو اور دینی تربیت بھی، گویا دینی تعلیم کے ساتھ عصری ادارے بھی قائم کئے جاسکتے ہیں، اور مناسب یہ ہے کہ اس زمین کا کرایہ بھی اس مسجد کو دیا جائے، تاکہ مسجد کو بھی اس کا فائدہ پہنچتا رہے، یہ تین موقف ہمارے سامنے آئے ہیں، اس کے بارے میں مزید کسی صاحب کو کچھ کہنا ہو جن کے مقالے نہیں آسکے تھے، جن کی رائے نہیں آسکی تھی وہ اپنی رائے پیش فرمائیں۔

قاضی صاحب:

جہاں تک میں نے تلخیص کو پڑھا ہے اور عرض کو سنا ہے، اس کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اراضی جو مسجد کے مفاد کے لئے وقف کی گئی ہوں، اور مساجد پر جو وقف اراضی ہیں وہ ضرورت سے زائد ہیں، مسئلے دو الگ الگ ہیں، ایک پراپرٹی ہے جو ضرورت سے زائد ہے، اور ایک آمدنی ہے جو ضرورت سے زائد ہے، ابھی بحث ہے پراپرٹی کی، املاک اور اراضی کی، یہ اگر ضرورت سے زائد ہیں اور امت کو ضرورت ہے اس بات کی کہ وہاں پر تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں، بیشتر ہمارے یہاں وہ مساجد ہیں الحمد للہ جن کے اردگرد اچھی خاصی اراضی موجود ہیں جو افتادہ رہتی ہیں اور اگر اس پر زراعت ہوئی بھی تو وہ برائے نام ہے، اور وہاں پر بسنے والی آبادی کی تعلیم کے لئے کوئی دوسری جگہ فراہم نہیں ہے تو کیا ایسی اراضی پر تعلیمی اداروں کے لئے مکان بنایا جاسکتا ہے اور اس کو امت کے لڑکوں کی تعلیم کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، یہ سوال ہے، اس سوال میں تھوڑی سی تنقیح ہے، ایک تنقیح تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو خالص روایاتی طور پر تعلیم کے ادارے چلتے ہیں جن کو ہم مدارس اسلامیہ عربیہ کہتے ہیں، ایک تعلیمی ادارہ یہ ہے، دوسرا بنیادی مسئلہ تعلیم کے مکاتب کا ہے وہ بھی دینی تعلیم سے خاص متعلق ہے، اور تیسرا ہائی اسکول یا کالجز وغیرہ ہیں، جن میں عصری تعلیم دی جاتی ہے۔ چوتھا صنعتی تعلیم کے ادارے ہیں ٹیکنیکل ایجوکیشن کے، پھر ٹیکنیکل ایجوکیشن یا اسکول یا کالجز یا ریذیڈنشیل اسکولس کی بھی دو نوعیتیں ہیں، خالص سیکولر انداز میں چلایا جانا، یا دیندار مسلمانوں کے ذریعہ ایسے اداروں کا قیام جس میں ہوسٹل میں لڑکوں کو اسلامی ماحول میں رکھ کر اور دین کی بنیادی تعلیم دیتے ہوئے ان کو جدید عصری علوم بھی سکھائے جائیں یا ٹیکنیکل ایجوکیشن دیا جائے، اس طرح کے متنوع ادارہ ہوں، تو خالص مدرسہ قائم کرنا، خالص بنیادی تعلیم کے مکاتب قائم کرنا...... ان کو تعلیم دے کر مشن اسکولوں، اور جنرل پبلک اور انگلش اسکولوں میں جانے سے بچایا جاسکے، اور چوتھے خالص سیکولر ایجوکیشن کے لئے کالجز یا ہائی اسکول کے قیام کی کوشش، یہ چار رخ ہیں۔

آپ کو مصالح امت اور احکام شرع کی بنیادی باتیں جو میں نے عرض کیں ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ہے، اس سلسلہ میں جو تجویزیں آئی ہیں ان میں عرض یہ کرنا ہے کہ اگر ضرورت سے زائد اراضی کو ایسے اداروں کو کرایہ پر دید یا جائے تو غیروں کو اور دوسرے قسم کے مصارف کے لئے کرایہ پر دینے سے افضل ہے کہ امت کی تعلیم کا انتظام ہوگا، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں تو کوئی شاید شرعی نقص نہ ہو کہ زائد اراضی جو افتادہ پڑی ہوئی ہیں ان میں بجائے اس کے کہ دکان کے لئے، ورکشاپ کے لئے، موٹر و ہیکلس کرنے کے لئے ہم مدرسہ قائم کرنے کے لئے اجازت دیں، یا جناب رعایتی شرح پر جیسے آپ یہاں مثال کے طور پر جس حج ہاؤس میں بیٹھے ہیں، یہاں پر یہ تجویز ہے جو بڑے دیندار طبقے کی طرف سے ہمارے پاس آئی ہے، اور ہم نے یہاں کے وزیر خارجہ سے بات بھی کی ہے جو حج ہاؤس کے انچارج بھی ہیں کہ یہاں پر ایک بہترین قسم کا فلاحی اسپتال مسلمانوں کا قائم کیا جائے، اس کی دو منزلیں یا جتنی مناسب ہوں اس مصرف کے لئے دیا جائے اور چاہے قانوناً اس کو کچھ کہو، لیکن شرعاً تو یہ بھی وقف ہی ہے، تو کیا ہم اس کی اجازت دے سکتے ہیں کہ ہم اس کو یا تو رعایتی شرح کرایہ پر یا بلا کرایہ کے ہم اس کو ایک بہترین فلاحی اسپتال جس کی ضرورت کا احساس اہل ممبئی کو زیادہ شدید ہوگا، اور دوسرے لوگوں کو بھی، جو حالات کا تقاضا ہے، تو اس طرح کے سوالات کھڑے ہو سکتے ہیں، اس لئے اگر ہم کرایہ پر کوئی چیز دیں گے تو اس میں شاید لگتا ہے کہ کوئی شرعی قباحت نہیں ہوگی، لیکن بحث وہاں آتی ہے کہ کیا ہم کرایہ نہ لیں اور اس طرح کے ادارے قائم کرنے دیں، اس کی اجازت آپ دیں گے یا نہیں، تو اب اس تنقیح کو سامنے رکھ کر مختصر الفاظ میں آپ حضرات اپنی رائے ظاہر کریں، نمبر ا۔ بنیادی دینی تعلیم کے مکاتب قائم کرنا، جس سے تعلیم دین کی اشاعت پورے ہندوستان میں ہم کرسکیں، نمبر ۲۔ مدارس اسلامیہ عربیہ کا قیام جس سے ہم متخصصین اور متبحرین علم دین پیدا کریں، نمبر ۳۔ رہائشی یا غیر رہائشی ایسے اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کرنا جس میں دینی تعلیم لازم ہو اور، اسلامی ماحول میں، ہم اپنی نسل کو جدید علوم سے بھی آشنا اور واقف کراسکیں اور جدید علوم کو اس میں پڑھا سکیں، نمبر ۴۔ خالص سیکولر تعلیم کے لئے ہائی اسکول یا کالجز وغیرہ قائم کرنا، یہ ایک سوال اور آگے آسکتا ہے، میڈیکل کالج قائم کرنا، انجینئرنگ کالج قائم کرنا، یا اس طرح کے اور دوسرے ادارے، تو ان چار سوالات پر آپ لوگ جو سمجھتے ہیں نمبر وار اپنی رائے دیدیں۔

مفتی اشرف علی صاحب:...... اگر مسجد پر وقف اراضی سے وہ زمینیں مراد ہیں جو مسجد کے احاطے سے الگ ہیں، تو کرایہ پر تعلیمی اداروں کے لئے دینے کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے، لیکن اگر مسجد مسقف ہے اور پھر اس کے احاطےہیں جو مسجد کا حصہ ہوتے ہیں تو اس کے بارے میں مجھے تامل ہے، اس لئے کہ مسجد کی ضروریات میں اضافہ ہوسکتا ہے، آگے چل کر اس کی توسیع وغیرہ میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری بات جو اس سوال کے تحت ہے کہ مساجد کی فاضل آمدنی کو دینی تعلیمی مقاصد کے لئے یا عصری تعلیم کے لئے استعمال کی اجازت نہیں دی جاسکتی، بلکہ دوسری ضرورت مند مساجد پر اس فاضل آمدنی کا صرف کرنا ضروری ہوگا۔

مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب: ...... مسجد کے متصل جو اراضی ہیں ان اراضی میں جب تک مسجد کی توسیع کی ضرورت نہ ہو اس وقت تک مدرسہ اس شرط پر چلا یا جائے کہ مدرسہ کچھ کرایہ مسجد کے نام پر جمع کرتا رہے، تاکہ آئندہ مسجد کی توسیع کے وقت میں مدرسہ کو ختم کر کے مسجد کی توسیع کردی جائے ....

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب: ...... میں نے اپنے مقالہ میں اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ مساجد کے تحت مسلمانوں کے ساتھ مخصوص تعلیمی ادارے، خواہ دینی ہوں یا عصری ہوں قائم کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ مسجد کو اس کا کرایہ ادا کرے۔

قاضی صاحب: ...... میں اس بات کو پھر واضح کروں کہ ضرورت سے زائد جو اراضی مسجد پر وقف ہیں جن کی مسجد کو فوری ضرورت نہیں ہے ان پر کرایہ لے کر کوئی بھی کام ہو، دوکان کھلواسکتے ہیں کچھ اور کام کرواسکتے ہیں، مسجد کی آمدنی ہوگی، یہ مسئلہ تو میں نہیں سمجھتا کہ زیر بحث ہے یا مختلف فیہ ہوسکتا ہے، بحث یہ ہے کہ جن مقاصد کے لئے جن کا تعلق دینی تعلیم سے ہے یا مسلمانوں کے اس فلاح سے ہے جس کا تعلق دینی تعلیم یا عصری تعلیم سے ہے اس کے لئے اس زائد اراضی کا استعمال ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کرایہ کی بات نہیں، کرایہ تو استیجار ہے، یہ تو مسئلہ صاف ہے اس میں کسی شک کی بات نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب: ...... اس کو بغیر کرایہ کے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، مساجد کے تحت جو مکاتب قائم کئے جاتے ہیں بنیادی دینی تعلیم کے لئے اس کی تو اجازت ہے، یعنی مسجد کے تابع مکاتب دینی قائم کئے جاسکتے ہیں، باقی مدرسہ قائم کرنا اور تعلیمی ادارہ قائم کرنا اس پر صحیح نہیں ہوگا بغیر اجرت لئے ہوئے۔

مولانا زبیر قاسمی صاحب: ...... مسجد پر وقف اراضی اگر فی الحال مسجد کی ہر قسم کی ضروریات سے زائد ہوں تو اس زائد از ضرورت زمینوں کے اوپر دینی یا عصری تعلیم کا کوئی ادارہ قائم کرنا اس سلسلہ میں متقدمین فقہاء یا علمائے ہند کے موجودہ اکابر سبھوں کے فتاوی کی تصریحات کے جواب نفی میں آتے ہیں، مگر ایک حقیقت جو میری سمجھ میں آتی ہے، ایک ہے وہ زمین جو وقف ہو علی عمارۃ المسجد، تو ہمارے یہاں ایک جزئیہ ہے "فتح القدیر" کا "إن الوقف علی عمارۃ المسجد ومصالح المسجد سواء" عمارت مسجد پر کوئی چیز وقف ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے اخراجات یا اس کی آمدنیاں خرچ ہوں گی اسی کے اوپر، اور مصالح مسجد پر چونکہ بات ایک ہی ہوئی، تو عمارت مسجد اور مصالح مسجد تقریباً ایک ہی چیز ہے، اب مصالح مسجد کے اندر مثلاً مصلی ہیں، امام ومؤذن ہیں، یہ سارے کے سارے گویا مصالح مسجد میں داخل ہیں، اوقاف علی عمارۃ المسجد سے یہ ساری چیزیں پوری کی جاسکتی ہیں اور کی جاتی ہیں، تو میرا یہ خیال ہے کہ وہ زمین جو مسجد کے اوپر وقف ہے اور فی الحال مسجد کی ساری ضروریات سے فاضل ہیں ان پر ایسے دینی ادارے مستقلاً جن میں دینی تعلیم ہو وہ دراصل امام اور مؤذن اور مصلی وغیرہ ہی کو پیدا کرنا ہے، اور یہ مصلحت مسجد ہی میں داخل ہیں، اس لئے ایسا مدرسہ یا مکتب جس میں بنیادی دینی تعلیم ہو اس کے قیام کو ہم جائز سمجھتے ہیں، ایسا مکتب جو ابتدائی شکل کا ہو یا ایسا مدرسہ جو اسی سطح کا ہو جس میں عصری علوم کا بھی انتظام ہو، مگر ان کے اندر بنیادی دینی تعلیم کا بھی نظم ہو اور دینی تربیت کی بھی شرط ہو، اس شرط کے ساتھ اس قسم کے عصری علوم کے ادارے کے قیام کو میں صحیح سمجھتا ہوں، لیکن خاص عصری علوم کے لئے جہاں بنیادی دینی تعلیم کا کوئی نظم نہ ہو اور دینی تربیت کا کوئی نظم نہ ہو وہ میرے نزدیک جائز نہیں۔

مولانا شمس پیرزادہ صاحب: ...... مسجد کے احاطے میں جو فاضل زمین موجود ہے اور وہاں مدرسہ یا مکتب قائم کیا جاتا ہے دینی تعلیم کا، اس میں تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے اور ایسا ہو بھی رہا ہے، اور اگر اس کے ساتھ عصری تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے تو وہ بھی کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، اور آج کل جدید صورت یہ چل گئی ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم کا اہتمام کیا جاتا ہے، اب اگر بجائے اس کے کہ صرف دینی تعلیم ہو اور اس کے ساتھ عصری علوم کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اجازت ہی نہیں دے رہے ہیں کسی ایسے مکتب کو اور کسی مدرسہ کو قائم کرنے کی، اس لئے کہ جدید عصری تقاضوں کے مطابق اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم بھی پڑھائے جائیں۔ البتہ اگر سیکولر ٹائپ کی کوئی تعلیم ہوتی ہے تو وہ مسجد کے احاطے میں ہرگز مناسب نہیں ہوگی۔

مولانا مصطفی مفتاحی صاحب: ...... عہد نبوت میں مساجد کا استعمال کیسے ہوتا تھا اس کو ذہن میں رکھا جائے، عہد نبوت میں وسیع تر مقاصد کے لئے اس کا استعمال ہوتا تھا، قاضی کے فیصلے بھی مساجد ہی میں ہوا کرتے تھے، ابھی جو گفتگو ہو رہی ہے تو میری رائے یہ ہے کہ مدارس اور مکاتب کے قیام میں کوئی حرج نہیں

ہے اور عصری علوم بھی اگر مفید انسانیت ہے تو وہ بھی دینی علوم ہیں، اس لئے عصری علوم کے لئے بھی فاضل زمین پر کسی ادارہ کے قیام میں کوئی حرج نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی ایسا ادارہ جس میں خالص سیکولر انداز کی تعلیم ہو تو اس کی اجازت نہیں، خلاصہ یہ کہ فاضل زمین پر، خواہ دینی ہوں یا عصری، دونوں علوم کے ادارہ قائم کئے جاسکتے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے۔

مولانا سعود عالم قاسمی صاحب:...... یہ ایک اچھا سوال مولانا مصطفی صاحب نے اٹھایا ہے میں ان ہی کے حوالہ سے عرض کررہا ہوں، مساجد کا استعمال اسلام میں مختلف ایسے مقاصد کے لئے کیا گیا ہے جو اسلام کی ضرورتوں سے ہم آہنگ تھے، قیدیوں کو باندھا بھی گیا ہے، غنائم کی تقسیم بھی کی گئی لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب مسجد نبوی ہی ایک ٹھکانہ تھی مسلمانوں کے لئے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممبر بھی فراہم کیا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن بعد میں جیسے حالات بدلے یہ سارے امور منتقل ہوتے چلے گئے، قید خانے الگ بنے، جیل خانے الگ بنے، قضایا کے محکمے الگ بنے، یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ کہا کہ جس کو شاعری کرنی ہو وہ مسجد کے باہر جائے، دیکھنا یہ ہے کہ کون سی چیز مسجد کے مقاصد سے ہم آہنگ ہے اور کون سی چیز ہم آہنگ نہیں ہے، جو چیزیں ان کے مقاصد سے ہم آہنگ ہیں ان کو باقی رکھا جائے، تعلیم مسجد سے عین ہم آہنگ ہے، چنانچہ نہ صرف یہ کہ عہد نبوی میں، بلکہ صحابہ کرام کے زمانے میں، تابعین عظام کے زمانے میں، بلکہ مسجد کا بعد کے عہد میں بھی تعلیمی کردار برقرار رہا ہے اور ہندوستان میں بھی برقرار رہا ہے، اس لئے ہم دینی تعلیم کو مساجد کے مقاصد سے الگ نہیں کرسکتے اور اس میں تعلیم گاہ کے قیام کی اجازت دینا ہوگی، رہی دوسری بات کہ تعلیم میں ہم تفریق کرسکتے ہیں یا نہیں کرسکتے، اور کرسکتے ہیں تو کہاں تک کرسکتے ہیں، اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اسلامی تعلیم ایک یونیٹی ہے، اس میں دین اور دنیا کی تفریق نہیں ہے، وہ تعلیم جو قرآن وسنت اور انسان کو اس کی معرفت اور کائنات کی معرفت عطا کرے اس کے ادارے قائم کریں، ہمارے زمانہ میں سیکولر تعلیم کے جو ادارے کہے جاتے ہیں جن کو آپ ٹیکنکل ادارہ کہہ سکتے ہیں یا پیشہ وارانہ تعلیم کے ادارے کہہ سکتے ہیں یا پروفیشنل تہذیب کے سنٹر کہہ سکتے ہیں، میرے خیال میں مسجد کے مقاصد سے یہ ہم آہنگ نہیں ہیں، لیکن قرآن کی تعلیم، قرآن کی تفسیر، فقہ کی تعلیم، عبادات کی تعلیم، صلاتیات کی تعلیم، یعنی وہ ساری تعلیم جو اقدار پر مبنی ہیں ان کی تعلیم کے ادارے قائم کرنے کی ہم اجازت دیں گے، اور وہ تعلیم جو مسجد کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہے اس پر پابندی لگانی پڑے گی، ورنہ ہر کوئی مسجد کی زمین پر ایک ٹیکنیکل ادارہ کھول کر بیٹھ جائے گا۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب:...... مولانا سعود عالم قاسمی صاحب نے جو بات کہی ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں اور یہ بات میں نے اپنے مقالہ میں بھی عرض کی ہے کہ وہ چیزیں جو مسجد کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں ان کو ہم قائم کرنے میں کوئی پابندی نہیں سمجھتے، لیکن وہ چیزیں جو مسجد کے مزاج کو بدلنے والی ہوں اس سے تعلق نہ رکھتی ہوں ان کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

مفتی محبوب علی وجیہی صاحب:...... میری رائے کے مطابق فاضل زمین میں دینی تعلیم کے ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں، لیکن مسجد کی کمیٹی کے افراد کو بھی اس کے نظم میں شامل رکھا جائے، تاکہ آئندہ چل کر اس زمین کے مسئلہ میں کوئی ملکیت کا دعوی نہ کرے۔

مولانا شاہین جمالی صاحب:...... ایسا ہے کہ مسئلہ تعلیم کے غلبہ کا ہے اگر کسی ادارہ میں عصری تعلیم کا غلبہ ہے اور دینی تعلیم نہیں ہے اس میں تو یقیناً اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، لیکن اگر عصری علوم برائے نام ہوں اور اس مقصد کے لئے مسجد کی زمین میں کوئی ادارہ قائم ہو تو سعود عالم قاسمی صاحب نے بات واضح کردی ہے اور یہی مناسب ہے اور میری رائے بھی یہی ہے۔

مولانا محی الدین صاحب:...... اصل میں مسجد کی زائد اراضی پر دینی ادارہ، مکتب وغیرہ قائم کیا جاسکتا ہے، اور دنیوی تعلیم کے جو ادارے ہیں اگر سیکولر انداز کے ہیں تو اس کی اجازت میں تو بہت سے مسائل کھڑے ہوں گے، لیکن دنیوی تعلیم اگر سیکولر طرز پر نہیں ہے صرف مسلم اس کو چلا رہے ہوں، چونکہ اس زمانے میں بہت سے خرافات ہوتے ہیں ایسے اداروں میں، اس لئے مسجد کی زمین پر یہ سب قائم کرنا تو درست نہیں ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ ادارے یا مسلم ہوسٹل وغیرہ جس کا مقصد یہ ہو کہ کالج وغیرہ کے طلبہ جو وہاں آکر رہیں اور جن کی دینی تربیت کی جاسکے، چونکہ اس کی بہت ضرورت ہے اس زمانے میں، یا کہیں شہر میں کالج وغیرہ ہیں اس میں مسلم طلبہ وغیرہ رہتے ہیں اور وہ دینی ماحول سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں تو اگر کوئی ایسا ہوسٹل تربیت کے لئے قائم کیا جائے اور اس میں تربیت کی جائے اور باقاعدہ ان کو دینی تعلیم دی جائے تو اس قسم کے ادارے کی اجازت ہوسکتی ہے۔

مولانا عبداللہ صاحب:......سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام میں نظام تعلیم جو ہے اس میں کوئی تفریق نہیں ہے، یہ تو بعد کی چیز ہے کہ عصری تعلیم ہو اور دینی تعلیم ہو، اصل ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا جو نظام تعلیم ہو، چاہے وہ صنعت سکھائی جائے یا حساب یا جغرافیہ اور اس کا اسلامائیزیشن ہوتا ہے تو اس اسلامائیزیشن کے بعد تو وہ دینی بن جاتا ہے، تو یہ ایک اہم بات ہے کسی بھی تعلیم کے سلسلہ میں، اگر اس میں اسلامی رنگ غالب ہے اس نظام تعلیم میں تو پھر یہ علوم بھی سکھلائے جاسکتے ہیں۔

مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب:......جیسے ہمارے مولانا عبداللہ صاحب نے فرمایا، اس طرح کی تفریق نے ہمارے مسلم سماج کو بہت سخت نقصان پہونچایا کہ یہ دینی تعلیم ہے اور یہ عصری تعلیم ہے، اس میں کوئی شک نہیں، حالانکہ بدر کے قیدیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو لوگ اس میں سے لکھنا پڑھنا جانتے ہوں وہ ہمارے مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں تو ان کو چھوڑ دیا جائے گا، تو کیا انہوں نے توحید سکھائی تھی؟ وہ تو مشرکین تھے، تو اس طرح یہ جو ذہن ہے ہمارا، اس ذہن کو سب سے پہلے وسیع کرنا ہوگا، عصری تعلیم گاہوں کو یا اس کو عصری تعلیم کا نام دے کر اس طرح سے مسلمانوں کو اس سے الگ کیا گیا کہ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان عصری علوم سے بہت بڑا نقصان ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیوی تعلیم بھی ہماری تعلیم ہے، ایک طرف ہم یوں کہیں کہ عصری تعلیم بھی ہماری تعلیم ہے اور دوسری طرف ہم یہ کہیں کہ یہ عصری تعلیم ہے، یہ دنیوی تعلیم ہے اس سے بچو، یہ چیز میں سمجھتا ہوں کہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ تعلیم میں کوئی تفریق نہیں ہے، اگر مدارس اور مکاتب کے قائم کرنے کا جواز ہے تو عصری تعلیم گاہوں کا بھی جواز ہوگا اس میں کوئی تفریق نہیں ہے۔

مولانا قمر الدین صاحب:......اس بارے میں عرض یہ ہے کہ احاطہ مسجد جہاں مسجد کی ضروریات کا اس سے تعلق ہے تو اس میں اس قسم کا کوئی ادارہ قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ جو فاضل اراضی ہیں اس میں دینی تعلیم گاہیں قائم کرنا مسجد کمیٹی کی اجازت سے جائز ہے ورنہ مسجد کمیٹی کے جو اراکین ہیں اس میں اور دوسرے افراد میں نزاع پیدا ہوجائے گا، لیکن فاضل اراضی پر عصری تعلیم کے ادارے قائم کرنا جائز نہیں ہے۔

مفتی اسماعیل صاحب کنتھاریہ:......سب سے پہلے تو یہ سوچنا چاہئے کہ یہ زمینیں جو مسجد پر وقف ہوتی ہیں وہ لاستغلال الارض. لاستغلال المسجد یعنی مسجد کے لئے ذرائع آمدنی کے طور پر ہوتی ہے، تو پہلی بات یہ ہے کہ کیا واقف نے اس مقصد کے لئے وقف کیا تھا کہ اس کی آمدنی مسجد پر صرف ہوتی رہے تو مقصد واقف کے خلاف وہاں پر کوئی دینی ادارہ، یعنی مکتب یا مدرسہ قائم کرنا درست ہوگا؟ تو اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی ہے کہ مقاصد مسجد میں سے تعلیم اور وعظ وغیرہ بھی ہے اس لئے مسجد کی ایسی زمین پر جو فاضل ہے اگر کوئی دینی مدرسہ قائم کیا جائے تو درست ہے، باقی اس کی ملکیت تو وہ مسجد ہی کے پاس رہے مسجد سے ختم نہ کیا جائے، یہ قید اس لئے ضروری ہے کہ آج کل مسجد کا وقف، مدرسہ کا وقف ہے اور عموماً جہاں مکاتب کی تعلیم پہلے سے چلتی ہے وہاں پر مکتب کا وقف ہے، یہ بھی الگ ادارہ شمار ہوتا ہے اور کہیں کسی وقف بورڈ میں الگ سے اندراج ہوتا ہے، اس لئے اس کو مسجد ہی کی ملکیت میں رکھ کر مسجد کی خالی زمین پر مدرسہ ومکتب قائم کرنا درست ہے، البتہ عصری ادارہ قائم کرنا عصری تعلیم کے لئے یہ احقر کے نزدیک درست نہیں ہے، اس لئے کہ عصری تعلیم کے لئے اس کے پورے نصاب کو بھی دیکھنا پڑے گا، جس انداز سے عصری تعلیم دی جارہی ہے اس طریقے سے اگر رسمی مدارس یعنی سرکاری اسکول کے نہج پر اگر تعلیم دی جاتی ہے تو اس میں جو تاریخ ہے، اس طرح سے جو زبان سکھانے والی کتاب ہوتی ہے اس میں عموماً ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ شاید فرض کفایہ کے درجہ میں بھی اس کا جواز نہ ہو یعنی اس تعلیم کا کوئی ٹھکانہ نہیں کہ کیسی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور کیسی چیزیں ہوتی ہیں، حساب کے اندر دیکھئے کہ وہ بھی عصری تعلیم کا ایک جز ہے اور بہت ضروری ہے فرائض وغیرہ کے سلسلہ میں، زکوۃ کے حسابات وغیرہ کے سلسلہ میں، لیکن حساب سکھانے کا جو طرز ہے وہ ہمارے یہاں عموماً سودی حسابات ہوتے ہیں تو اس کو جواز کے درجہ میں لکھا ہے کہ چونکہ وہ مجبوری ہے اس لئے حساب سکھایا جائے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عصری تعلیم کے جو عناصر ہیں اس میں سے بعض چیزیں جیسے زبان، حساب، جغرافیہ ہے اس کا جاننا فرض کفایہ کے درجہ میں ہے، لیکن جس نہج سے وہ پڑھایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ جو دوسرے فنون پڑھائے جاتے ہیں تاریخ وغیرہ اور زبان سکھانے کے لئے جو مضامین ہوتے ہیں ان کتابوں میں ایسی چیزیں ہیں کہ عصری تعلیم کا جو موجودہ نہج ہے اس کے لئے وہاں پر ادارہ قائم کرنا مسجد کی فاضل اراضی میں یہ درست نہیں ہے۔

مولانا مفتی مسرور صاحب:......جہاں تک مکاتب دینیہ اور مدارس عربیہ کا تعلق ہے ان کے قیام کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، اور جہاں تک عصری علوم کی

تعلیم کا سوال ہے، جیسا کہ مجھ سے پہلے افاضل نے فرمایا اگر وہ عصری علوم کتاب وسنت سے متصادم نہیں ہیں اور نہج تعلیم بھی کتاب وسنت سے متصادم نہیں ہے تو ایسی حالت میں عصری تعلیم کا بھی جواز ہوسکتا ہے، جواز ہے۔

مولانا کمال احمد صاحب دیوریا:...... یہ بحث جو چل رہی ہے عصری اور دینی تعلیم کے اداروں کے بارے میں تو دراصل تعلیم کوئی بھی ہو، تعلیم تو ایک وحدت ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا، اور عہد صحابہ میں، جیسا کہ ہمارے فضلاء نے ذکر کیا مثال کے طور پر بدر کے قیدیوں کی مثال دی وہ ہمارے لئے راہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چند قیدیوں کو اس لئے رہا کردیا اور ان کی دیت یہ مقرر کی کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو جو دیگر زبان نہیں جانتے ہیں وہ زبان سکھائیں، اور ظاہر ہے وہ زبان جو سکھائی گئی وہ دینی زبان نہیں تھی، عربی زبان نہیں تھی...... اس سے تو ہم کو یہ روشنی ملتی ہے کہ جو زمین احاطہ مسجد کے علاوہ ہے وقف کی ہے، جس طرح ہم مساجد اور مکاتب اور اسلامی ادارہ قائم کرنے کے قائل ہیں اسی طریقہ سے ہم کو عصری علوم کے جو مراکز ہیں ان کے قیام کی بھی اجازت دینی چاہئے، اس لئے کہ جس طریقہ سے آج مسلمانوں کو علماء ومفتیان کی ضرورت ہے ویسے ہی ہم کو ڈاکٹر کی بھی ضرورت ہے، انجینئر کی ضرورت ہے، سائنسداں کی بھی ضرورت ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب ہمارے علوم ہیں ہمارے علم کو غیروں نے اپنایا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح مدارس اور مکاتب کے قیام کی اجازت ہونی چاہئے، اسی طرح علوم عصریہ کے مراکز کی بھی اجازت ہونی چاہئے بشرطیکہ کوئی اسلامی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

مفتی محمد یحیٰی صاحب:...... مدارس دینیہ کے لئے، مساجد کے لئے جو اراضی وقف ہیں اگر وہ مساجد کو حالاً اور مآلاً ضرورت نہیں ہے تو اس کو نمبر ۱، اور نمبر ۲، میں استعمال کیا جاسکتا ہے جائز ہے، بقیہ ۳، ۴، ۵ میں میرے نزدیک جائز نہیں ہے، لیکن نمبر ۱ اور نمبر ۲ میں شرط یہ ہے کہ جس کو بھی زمینیں دی جائیں مکتب یا مدرسہ کے لئے اس میں یہ شرط لگادی جائے کہ جس وقت بھی مسجد کو ضرورت ہوگی فوراً بلا کسی تاخیر کے خالی کرنا ہوگا، ورنہ قانونی چارہ جوئی کرنی پڑے گی نمبر ۱، اور نمبر ۲، میں اجازت ہے اس شرط کے ساتھ، نمبر ۳، ۴، ۵ میں جائز نہیں ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی صاحب:...... (آواز صاف نہیں ہے)

مفتی حبیب اللہ صاحب:...... مسجد کی فاضل اراضی پر مدارس دینیہ اور مکاتب بنانے کی اجازت ہے، البتہ عصری علوم کی درس گاہیں قابل غور ہیں ان پر اہل علم حضرات نظر ثانی فرمالیں، میرے نزدیک دینی مدارس ومکاتب کی طرح ان کی اجازت ہے۔

مولانا عبداللہ جولم صاحب:...... دینی مدارس کے ساتھ عصری علوم اگر دینی ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے، خاص کر تفریق جو دینی تعلیم اور عصری تعلیم میں موجود ہے، اور عصری تعلیم میں مسلمان طلبہ بہتپائے جاتے ہیں دینی مدارس میں داخلہ لینے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے اس طرح سے دینی مدارس میں عصری تعلیم کو داخل کرکے پڑھایا جائے تو پھر ٹھیک ہے، مستقل عصری تعلیم کے اعتبار سے اس کا قیام ایسی جگہوں پر صحیح نہ ہوگا۔

مفتی عبداللہ صاحب ہانسوٹ:...... الحمدللہ، ہمارے ارباب فتاوی کی جو تحقیقات سامنے آئی ہیں غالباً جزئیہ مبحوث عنہا سے ہماری بحث دور ہوتی جارہی ہے، اس کی اصل یہی ہے کہ اس کو بجائے دینی اور دنیوی علوم میں تقسیم کرنے کے نافع اور غیر نافع میں ہو، احادیث میں جو الفاظ وارد ہیں اگر اس میں محدود کردیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ پریشانی نہیں ہوگی اور یہی کہا جائے گا کہ جو علوم نافعہ کے لئے ہیں اس کا استعمال جائز، اور جو غیر نافعہ کے لئے ہیں وہ جائز نہیں، فجزاکم اللہ۔

قاضی صاحب:...... میں اپنے ان دوستوں سے معافی چاہتا ہوں جو اظہار رائے کرنا چاہتے ہیں، لیکن وقت کی کمی کے باعث ہم مجبور ہیں دوسرے موقعہ پر ہم ان سے بات کرائیں گے، میں خلاصہ کے طور پر چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ سارے حضرات ان پوائنٹس کو ضرور نوٹ کرلیں گے، تاکہ ہم لوگ ایک اتفاقی نقطہ تک پہنچ سکیں، عجیب توارد ہوا ہے کہ میرے اور مولانا عبداللہ صاحب کے درمیان، میں ابھی بیٹھ کر سوچ رہا تھا کہ میں اپنی بات یہاں سے شروع کروں گا۔

اللهم إني أسألك علما صحيحا نافعا وعملا صالحا متقبلا ورزقا واسعا حلالا طيبا. والقول الثاني اللهم إني

أعوذ بك من علم لا ينفع ومن قلب لا يخشع. میں سمجھتا ہوں کہ هذا هو أساس الكلام۔

ہم لوگ بحث میں ذرا دوسری طرف نکل گئے، العلماء كلهم قد اتفقوا على أن العلم النافع ينبغي للمسلمين جميعا ولا يقول أحد منا، إن علما نافعا يجب علينا أن نحترمه، كل علم ينفع فهو أساس للمسلمين، من طلب الحكمة فهي ضالة المؤمن۔

یہاں پر بحث ہے وہ دراصل یہ ہے کہ وقف مسجد پر ہم کیا کر سکتے ہیں کیا نہیں کر سکتے ہیں، بیشک مسجد اسلامی تاریخ میں بہت ساری ضرورتوں کا مرکز رہی ہے، هذا معروف أن المسجد محل للعبادة، ومحل للتعليم ومحل للجهاد وللحرب ولفلان ولفلان وللقضاء كل ذلك حينما كانت الحاجة داعية إليها، والأحوال لما تغيرت والأمكنة توسعت فخرج القضاء من المسجد إلى دار القضاء وخرج التعليم من الصفة إلى المدارس، كذلك كل شئ خرج من محله ووصل إلى محله، فكل هذا يبنى على الاحتياج إذا كان المسلمون في محل لم يتيسر لهم أي موضع ومحل وأرض؛ لأن يعلموا صبيانهم، فماذا يفعلون هل يمكن أن نفتي أنه حرام عليهم أن يدخلوا المسجد لتعليم الصبيان لا يمكن ذلك۔

اب عرض یہ کرنا ہے مجھے کہ مسئلہ کی تنقیح کے لئے اور بات کو ختم کرنے کے لئے یوں چلیں کہ بہت سی مساجد کے ساتھ واقف کی صراحت موجود ہے کہ تعلیم کا کام بھی اس کے ساتھ ہوگا فإذا صرح الواقف أن ما هو موقوف على المساجد يستعمل لتعليم الصبيان للمسلمين أيضا فلا حاجة إلى البحث إن قد صرح الواقف بها، وإن لم يصرح الواقف فماذا نفعل، فهذا معروف بين علمائنا في الهند أن جميع العلماء في جميع الأزمان قد علموا في المساجد مثلاً المسجد الجامع في دهلي، شاهي مسجد لاهور، مسجد مدرسة الذي أسسه شير شاه سوري على شاطئ نهر كنكا في بتنه، وجميع العلماء كانوا يجلسون في المساجد ويعلمون الطلاب، هذا هو المعروف والمتعامل فيما بين المسلمين من زمان قديم، فصار كعرف ليس بعرف حادث بل هذا عرف قديم قد ثبت به ولا يمكن لأي عالم أن يفتي بأن كل هذا كان غير جائز۔

پس یہ بات بھی منقح ہے کہ تمام وہ مساجد جن میں صراحت موجود ہے اس میں کوئی پرابلم نہیں ہے، کوئی دشواری نہیں ہے، اور مساجد میں وہ تعلیم جس کو ہم دینی کہہ رہے ہیں یہ معمول ومتعارف رہی ہے، اس لئے اگر کہیں بھی مسجد میں تعلیم دین کی دی جارہی ہے جو متعامل اور معروف ہے اس پر بھی کوئی اعتراض ہمیں نہیں ہونا چاہئے، اس کی صاف صاف اجازت دے دینی چاہئے، عین مسجد ہو یا حوالی مسجد میں کمرے بنے ہوئے ہوں، ہماری ساری مساجد جتنی بڑی بڑی مسجدیں ہیں ان میں ایسی عمارتیں موجود ہیں جہاں تعلیم دی جارہی ہے، ایسا فتویٰ نہ دیں ہم کہ جو ہو رہا ہے اس میں بھی مشکل پیدا ہو جائے۔

تیسری طرف ہم اس حاجت کو دیکھیں، کیا یہ سچائی نہیں ہے دوستو کہ ہمارے یہاں اسی، پچاسی فیصد مسلمان بچے جاہل بھی ہیں اور بدقسمتی سے ان کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے، کیا ہم پوری قوم کے بچوں کو جاہل چھوڑ دیں، ظاہر ہے کسی کی بھی ایسی رائے نہیں ہوگی، لیکن جہاں پر ہمارے لئے علاحدہ جگہ کا انتظام ہو سکتا ہے وہاں ہم مکاتب، مدارس، اسکول سب قائم کر سکتے ہیں، اور جہاں پر کوئی صورت نہیں اور مسجد کی اراضی میسر ہے جو اس آبادی کے مصالح کے لئے ضروری ہے، پہلی کوشش کہ ایسے مکاتب ومدارس یا تعلیمی ادارے جو بھی ہم قائم کریں اس کو بذریعہ اجرت مسجد کمیٹی سے حاصل کر لیں، تاکہ بلا اختلاف یہ شئ صحیح ہو جائے، اور اگر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہاں پر اجرت کیا دی جائے گی، وہاں تو دو دو پیسہ بھیک مانگ کر یوں ہی پریشان ہیں، برائے نام جیسے گورنمنٹ کرتی ہے کہ ایک روپیہ کرایہ رکھ دیتی ہے، ابھی راوڑ کیلا میں ہمارے دوستوں نے ۹۹ برس کے لئے دو ایکڑ زمین دی ہے اور دو روپیہ سالانہ کرایہ رکھا ہے اور ہم نے ۹۹ برس کے دو سو روپئے ادا بھی کر دئے ہیں، تو اگر ایسی کوئی شکل ہے تو دوسری بات ہے، ورنہ ایسے تعلیمی اداروں کے لئے گنجائش ہونی چاہئے، ایسے مقامات کے لئے جہاں حاجت مسلمین اس کی متقاضی ہو، اب اس کے بعد اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ بعض دوستوں نے کہا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے، یہ بھی تجربہ کی بات ہے کہ عام طور پر جو کمیٹیاں ہیں مسجدوں کی، بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے مسجد کی اراضی کا اپنے من مانے اداروں کو قائم کر کے اس کو ذریعہ آمدنی بنانے کے لئے استعمال کیا ہے، اس لئے ہمارا جو بھی

فتوی ہو اس میں اس طرح کے تجربات سے بچنے کے لئے احتیاط کی تحریر ضرور ہونی چاہئے، یہ بھی تجربہ ہے ملک کے مختلف علاقوں کا کہ وہ لوگ جو اللہ کا خوف نہیں رکھتے اور دین کے احکام کو سمجھتے نہیں کمرشیل ادارہ قائم کر کے اس کو ذریعہ آمدنی بناتے ہیں اور مسجد بے چاری محروم کی محروم رہتی ہے، نہ اس سے اس کو مصلی مل پاتے ہیں اور نہ اس کو آباد کرنے کے لئے ذرائع مل پاتے ہیں، اس لئے ان سارے مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے آپ حضرات تجویز منظور کریں گے، میں امید کرتا ہوں اور یہ قطعاً ایک الگ بحث ہے، ہم کسی علم کو اپنے لئے اجنبی نہیں سمجھتے ہیں اور نہ یہ ہماری آج کی بحث کا موضوع ہے، ابھی چونکہ وقف کا مسئلہ آرہا ہے کہ اراضی وقف کا استعمال ہم ان کاموں کے لئے کر سکتے ہیں یا نہیں، ظاہر ہے کہ تعلیم قرآن کی خاص نسبت قرآن سے ہے، اور اپنی ۔ ری وسعت ذہنی کے باوجود میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میتھ اور سائنس کی تعلیم کو اتنا مناسب کہوں مسجد کے ساتھ جتنا مناسب مسجد کے ساتھ قرآن کی تعلیم کا ہے، اور پھر اس پر ہندوستان کے ماحول میں غور کرنا چاہئے، جہاں پر عصری سیکولر ایجوکیشن کے ادارے ہوں، ابھی اتر پردیش میں بی جے پی گورنمنٹ نے ایک فیصلہ لیا ہے کہ پرائمری ایجوکیشن کے تمام اسکولوں میں سرسوتی کی مورتی لگی رہے گی اور ہر طالب علم جو وہاں پڑھنے آئے گا اس کو روزانہ ایک مالا ایک ہار لا کر اس کو پہنانا پڑے گا، جہاں اس سے ہماری پریشانی بڑھتی ہے وہاں ہماری ذمہ داریاں بھی بڑھتی ہیں کہ ان بچوں کو ہم مسجد یا مسجد سے ملحق اراضی میں پڑھنے کی اجازت دیں یا ان اسکولوں میں بھیجیں جہاں وہ جا کر مورتیوں پر مالا چڑھائیں گے، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ اس کی کوئی اجازت دی جاسکتی ہے، پس آپ جو بھی فیصلہ کریں مصالح امت کو سامنے رکھ کر کریں، اور جو دو بنیادی اصول ہیں کہ وقف کی صیانت وحفاظت اور وقف کی نافعیت کو سامنے رکھیں، اس گفتگو کے بعد میں اس سلسلہ میں ایک کمیٹی کا اعلان کردوں گا، ابھی چند منٹ میں مولانا عتیق صاحب اور مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب لسٹ تیار کر کے دیں گے اس کے بعد پھر انشاء اللہ بحث ہوگی، اب اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے، اگلی بحث شروع ہوگی۔

اور ایک مسئلہ یہ ہے اس پر توجہ دیں آپ حضرات کہ کچھ ایسی مساجد ضرور ملک میں ہیں، سو ہوں، دو سو ہوں پچاس ہوں، جن کے پاس ....ہوتی ہے، مال جامد پیدا ہو جاتا ہے، آمدنی زیادہ ہوتی ہے اور ضرورت مسجد کی پوری ہو رہی ہے، لیکن ایک بات ذہن میں رکھنی ہے کہ مسجد کی تزئین پر جتنا خرچ کرتا ہے متولی، مسجد کے امام کی تنخواہ پر خرچ نہیں کرتا، وہ بے چارہ ویسے ہی کے ویسے یتیم رہتا ہے، اس لئے جلدی سے ہم اس کو........ مانیں گے نہیں اور نہ مال جامد اس کو ماننے کو تیار ہیں، لیکن اگر کوئی ایسی مسجد ہو جس کے پاس اس کی تمام جائز اور واجب ضرورتوں کے علاوہ کافی بڑی رقم جمع ہے تو اہل دنیا کو آپس میں لڑنے کی بہت اچھی گنجائش ہے، اب سوال یہ ہے کہ وہ زائد آمدنی ان دینی یا عصری تعلیم کے یا دینی اور عصری تعلیم کے ادارے قائم کرنے پر صرف کی جاسکتی ہے یا نہیں، یا دیگر رفاہی مقاصد کے لئے خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں، جبکہ وقف میں صرف مسجد کی صراحت ہے اور کوئی صراحت موجود نہیں ہے، اس پر کون لوگ اظہار خیال کریں گے جو لوگ پہلے کر چکے ہیں ذرا وہ معذرت قبول کرلیں تو اچھا ہے۔

مولانا ابوبکر قاسمی صاحب:

میں مساجد کی فاضل اراضی کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ اس سلسلہ میں دو بنیادی نقطوں کو پیش نظر رکھا جائے، ایک تو یہ کہ مساجد کے مقاصد کو ملحوظ رکھا جائے، دوسرے ہندوستان میں سرکاری اداروں کے بجائے آزاد ادارہ قائم کرنے کے سلسلہ میں مشورہ کیا جائے، اس لئے کہ ہمارے ہندوستان میں جو سرکاری ادارے یا مدارس ہیں ان کی جو صورت حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان اداروں کا مقصد دور حاضر میں تعلیم کے بجائے فقط معاش تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اسلئے آزاد ادارہ قائم کرنے کے سلسلہ میں تو اجازت دی جاسکتی ہے، لیکن سرکاری ادارہ کے لئے نہیں۔ اور فاضل آمدنی کے سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ پہلے تو مساجد پر خرچ کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ ہمارے اکابر نے فرمایا ہے، لیکن اگر مساجد وغیرہ موجود نہ ہوں اور تعلیم پر خرچ کرنے کی ضرورت پیش آرہی ہو تو پھر دینی تعلیم کو مقدم رکھا جائے۔

کیرالا سے آئے ہوئے مہمان:

سوال یہ ہے کہ کیا مسجد کی آمدنی تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے، میرے خیال میں اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے، رفاہی

مقاصد ایسے ہوں جو ہمارے لئے آج کل جائز امور پر چل رہے ہوں، اور رفاہی مقاصد سب سے اہم مقاصد ہیں اس ماحول میں مسلمانوں کے لئے جو اہم مقاصد ہیں ان مقاصد کو دیکھ کر وہاں کے علماء اور مفکرین سب کو مل کر طے کرنا چاہئے، اور قرآن اور حدیث کی روشنی میں جب غور کیا جائے تو مسجد کی ضروریات کے بارے میں مولانا مسرور صاحب نے جو رائے پیش کی ہے:

أنا أوافقه على ما بين من آرائه القيمة حول المسجد وما يتعلق به۔

ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی صاحب کیرالہ:

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مسجد قرطبہ اور مسجد غرناطہ اور وہ مساجد جو جامع کی حیثیت سے جہاں رفاہی اور مصالحتی اور مصاحبتی جتنے علوم تھے، وہ سب سکھائے جاتے تھے، اس لحاظ سے مسجد کی فاضل اراضی میں یا مسجد کی فاضل آمدنی میں تفریق کر کے عصری اور دینی علوم کو الگ کر کے کچھ طے کرنا ہمارے لئے جائز نہیں ہے، مساجد جو ہوتی ہیں وہ بھی امت کی ہوتی ہیں اور تعلیم بھی امت کے لئے دی جاتی ہے اس لئے اس کے مصالح بھی امت کے لئے ہیں۔

مفتی بشیر احمد صاحب میسور:...... یہ جو مسئلہ زیر بحث ہے اس سلسلہ میں احقر کی رائے یہ ہے کہ جو فاضل آمدنی مساجد سے حاصل ہوتی ہے کمیٹی کے ذمہ داران کو اس پر تاکید کیا جائے کہ دینی ضروریات کے علاوہ اگر قوم کی بہبودی کے لئے دوسری ضرورت پڑے اس میں بھی خرچ کیا جائے، اگر عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم ہو کہ جس سے دینی تعلیم کا غلبہ ہو استعمال کر سکتے ہیں۔

مفتی انور علی صاحب:

اوقاف کی جو فاضل آمدنی ہے سب سے پہلے اسی وقف کی نوع کے مصارف میں خرچ کیا جائے، تا کہ واقف کی شرط کی زیادہ سے زیادہ رعایت ہو سکے۔

مولانا مفتی نسیم احمد قاسمی صاحبؒ:

مساجد کی فاضل آمدنی کا استعمال کیا ہوگا اس سلسلہ میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ضروریات مسجد ہی میں اسے صرف کرنا ضروری ہوگا، تعلیمی یا رفاہی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، اگر کسی مسجد کے پاس اتنی زائد آمدنی ہو کہ جس کی مسجد کو نہ اس وقت ضرورت ہو اور نہ مستقبل قریب میں ضرورت ہو تو ایسی صورت میں مقاصد وقف کی رعایت کرتے ہوئے بہتر اور مفید طریقہ یہ ہوگا کہ مزید اراضی خرید کر اسی مسجد پر وقف کر دیا جائے اور اگر زمین خریدنا ممکن نہ ہو تو پھر "الأقرب فالأقرب" کے قاعدہ کے تحت اس سے قریب کی جو مسجد ہوگی اس کی ضروریات اور مصالح میں اس زائد آمدنی کو خرچ کرنا ہوگا۔

مولانا مفتی ابو سفیان صاحب:...... مسجد کی فاضل آمدنی بوقت ضرورت دینی اداروں میں اور اوقاف کی چیزوں میں صرف کرنے کی اجازت ہے۔

مولانا وقار احمد صاحب:...... اگر اوقاف کی آمدنی مسجد کی ضروریات سے زائد ہو تو پہلے واقف کی جو شرائط ہیں ان کی پوری رعایت ہو، ان شرائط کے بعد اگر آمدنی فاضل بچتی ہے تو دینی ضرورتوں میں خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، دینی علوم ہوں، عصری علوم ہوں، جن کی مسلمانوں کو اس وقت ضرورت پڑ رہی ہے اس پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔

مفتی ارشاد قاسمی صاحب:...... فاضل آمدنی کے سلسلہ میں فقہاء نے مصالح مسجد بیان کیا ہے، اور مصالح مسجد کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے "الإمام والخطيب والمؤذن والوقاد والفراش والمدرس والناظر"، اسی طرح عالمگیری میں بیان کیا گیا ہے کہ مصالح مساجد میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو مسجد کے ابقاء اور نفع کے لئے ہوں، چنانچہ کہا گیا ہے:...... "كالإمام للمسجد والمدرس للمدرسة" تو مدرسہ کے اوپر خرچ کرنے کے لئے تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی عدم گنجائش ہو، تمام حضرات نے مصالح مساجد میں تعلیم دین کو اور تعلیم قرآن کو داخل مانا ہے، چنانچہ حاشیہ منحة الخالق میں لکھا گیا ہے:

"إنما هو عموم النظر لمصالح المساجد ولإقامة الشعائر" اور ظاہر بات ہے کہ تعلیم دین ہمارے یہاں شعائر اسلام میں داخل ہے، اس لئے مصالح مسجد میں تدریس، افتاء، تقریر وغیرہ سب داخل ہیں۔

مولانا شیر علی صاحب:

مسجد کی زائد زمین میں مدرسہ قائم کرنا یہ توتوارث چلا آرہا ہے اور یہ جائز ہے، اور مسجد کی زائد آمدنی کہاں خرچ کی جائے تو فقہاء کرام یہ لکھتے ہیں کہ اس جنس سے جو قریب ہے اس کو منتقل کیا جائے جس کو ضرورت ہو، یہی حال قبرستان کا ہے جو وہاں سے قریب ہے وہاں منتقل کیا جائے، اور مسجد کی آمدنی سے مدرسہ قائم کرنا یہ بھی جائز ہے، کیونکہ یہ دونوں لازم ملزوم ہیں اور اس میں مسجد کی آبادی بھی ہے، اور ہندوستان میں یہ تعامل ہے کہ جہاں مسجد ہوگی وہاں مدرسہ بھی ہوگا اور ہمارے یہاں افغانستان میں تو مسجد ہی میں طلبہ پڑھتے ہیں کوئی مستقل مدرسہ نہیں ہوتا ہے اسی مسجد میں تعلیم ہوتی ہے تو مسجد کی آمدنی سے مدرسہ قائم کرنا درست ہے۔

جہاں تک واقف کے مقاصد کی بات ہے تو مشہور مسئلہ ہے کہ "شرط الواقف کنص الشارع" ہمارے یہاں عرف ہے کہ مدرسہ الگ سمجھتے ہیں اور اسلام اور دینی علوم علی الاعلان الگ سمجھتے ہیں، لہٰذا مدرسہ اور مسجد کی آمدنی سے کوئی کالج قائم کرنا یا اسکول قائم کرنا یا رفاہی ادارہ قائم کرنا یہ میرے خیال میں جائز نہیں ہے، اور واقف کی شرط جو ہے میرے نزدیک کنص الشارع ہے، یہ میری رائے ہے کہ مدرسہ قائم کیا جائے پھر اگر کچھ دین کی غرض سے طبعاً ایسی چیزیں رکھی جائیں تو گنجائش نکل سکتی ہے۔

قاضی صاحب:

مولانا نے اصولی بات یہاں پر فرمادی کہ کوئی وقف اگر اپنا مصرف کھودے تو اس کو قریب ترین مدات کی طرف منتقل کیا جائے یعنی "الأقرب فالأقرب" کا اعتبار ہے یعنی وراثت کی ایک جھلک یہاں پر بھی موجود ہے، اب رہا کہ تحری اور اجتہاد کی ضرورت پڑے گی کہ کون اقرب ہے اور کون نہیں ہے، ہمارے یہاں تو اصولاً یہ قاضی کی ذمہ داری ہے اور قاضی کا نظام نہ ہو تو علماء اس کا فیصلہ کرسکتے ہیں ہر وقف کے لئے، اب اس وقت صرف ایک مسئلہ پر بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ رائے دے دوں پھر کمیٹی جملہ مسائل اوقاف پر تجویز مرتب کرے گی۔

جہاں تک تعلق ہے استبدال وقف کی ان تمام شرائط کا جو ہمارے فقہاء نے لکھی ہیں، اگر ایک شئ اپنا نفع کھوچکی ہے اس کو باقی رکھنے کا کوئی مصرف نہیں ہے، اس کی جگہ پر جملہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے نفع بخش وقف کے قیام کی کوشش، اس پر تقریباً کہیں بھی ہمارے علماء میں اختلاف نہیں ہے، اس پر کئی رسائل موجود ہیں، بحث صرف وہاں پر ہے کہ نفع کم ہے زیادہ نفع حاصل کرنا ہے، مثال کے طور پر آج کل بہت سے شہروں میں ہماری بعض بلڈنگس ہیں، اور مان لیجئے کہ وہ غیر مسلم علاقہ میں چلی گئی ہیں، یا ان کا کرایہ بہت تھوڑا مل پاتا ہے، کہیں پانچ روپے، کہیں دس، اور کہیں بیس روپے، اگر ہم ان کو فروخت کردیتے ہیں اور ان سے کوئی زمین دوسری مناسب جگہ پر حاصل کرلیں اور وہاں پر شاپنگ کمپلکس بنادیں تو اس سے لاکھوں روپئے کی آمدنی ہوسکتی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ اصل نفع اگرچہ قلیل ہے، لیکن قائم ہے، فتوی کی زبان میں یوں کہئے کہ اصل نفع اگرچہ قلیل ہے، مگر قائم ہے، تو ان صورت میں اس کی نافعیت کو بڑھانے کے لئے استبدال وقف جائز ہوگا یا نہیں؟ پہلی صورت پر ہمیں زیادہ بحث نہیں کرنی ہے صرف اس پر آپ حضرات کی رائے ضرور جان لینی ہے کہ اگر اس کا اطمینان ہے کہ اس وقف کے استبدال کے ذریعہ اس کے نفع قلیل کو ہم نفع کثیر سے بدل سکتے ہیں اور مصارف چاہے مسجد ہوں مدرسہ ہوں، فقراء ہوں ان کے لئے ہم مفید تر بنا سکتے ہیں اس کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس پر میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات جلدی جلدی دو دو منٹ میں رائے دیدیں "أنا أريد أن نتعرف من الأخ الدكتور خالد المذكور بهذه القضية، الوقف لم يخرج عن النفع مطلقا ولكن نفعه قليل فهل يجوز لنا أن نستبدلها بما هو أنفع لمصارف الوقف۔

الدكتور خالد المذكور: ...إذا كان الوقف نفعه قليل، فيجوز استبداله بوقف أو بأرض زراعية يكون نفعه كثيرا إن شاء الله لكن التعريف كذلك على المدارس التي تكون بقرب المساجد حتى ولو كان شرط الواقف أن يكون للمسجد و......الشرعي والعلم الغير الشرعي أو العلم الأخروي والعلم الدنيوي هناك

يعني تعبير دقيق عن هذا، كل .... ما عبر عنه الشيخ مجاهد....... وهو العلم النافع او العلم المباح وما دام علم نافعا وعلم مباحا...... بأن يدرس وبأن يتعلم وإذا كانت هنالك أراضي ...... وتكون عن حاجة المسجد فمن الممكن شرعاً استبدال هذه للإقامة لمدرسة أو إقامة... للعلم الشرعي وغير العلم الشرعي......

مولانا بدرالحسن قاسمی صاحب۔ خلاصہ:

وقف استبدال کا جہاں تک مسئلہ ہے اگر وقف کی آمدنی کو بڑھانے کے لئے اس کو بدلنا چاہتے ہیں تو اس کی اجازت ہے ہمارے یہاں، البتہ دوسرے مسئلہ میں جو مدارس کے قیام کے سلسلہ میں ہے کہ اگر علم نافع اور علم مباح ہے اور وہ مساجد جہاں پہلے سے مدرسہ قائم ہے اس میں علم دین اور علم دنیا کی تفریق کے بغیر صحیح تعلیم جو علم نافع اور علم مباح ہو اس کی تعلیم دی جانی چاہئے اس کی گنجائش ہے۔

مہمان کویت:

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله۔

يتفق بالنسبة لمنافع الوقف مادامت منافع الوقف كثيرة بشرعنا الإسلامي لكنه إذا تعطلت منافع الوقف، ولم يكن هناك لجنة فيصرف عليه ولكن هناك مصلحة، وكما يقال في الأمس، نص الواقف كنص الشارع، لكنه صرح الفقهاء وعندنا كذلك بمذهب أحمد بن حنبل، وكذلك بغير مذهب أحمد بن حنبل...... والأفضل بشرط هذه المبدأ فلا جناح إذا وجد هناك نص لأحد الواقف... وأن ينبغي هناك أن تتوسع المنافع بخيرات بما يكون للمسلمين ... وهذه توسعة كثيرة ونحن عندنا في الكويت بحمد الله الأمانة العامة للأوقاف صندوق في عمل حواليه كثيرة الأوقاف بها علوم القرآن وعيادة المرضى وللثقافة نعم وصندوق للصحة وعدة صناديق وقفية لخيرات المسلمين وارتفاع لهم فجزاكم الله۔

مولانا عبد العظیم اصلاحی:....... فقد صرح علامة حافظ ابن عابدين في شروط استبدال الوقف بالخط تكون ستة أو سبعة ومنها ان يستبدل القاضي الذي يتصف بالعلم والعمل ومن شروط استبدال الاوقاف ...

مولانا شیر علی صاحب:...... قاضی صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ وقف کا نفع کم ہوگیا اور اس کا معمولی نفع ہے اس کو بدلا جاسکتا ہے یا نہیں، تو فقہاء کرام نے بہت جگہ ذکر کیا ہے کہ لاء نفع سے بھی بدلا جاسکتا ہے اور الثا بھی کر سکتے ہیں، اور یہ بھی قاضی الجنہ کر سکتے ہیں، عالم باعمل ہے وہ کرے، اور یہ شبہ ہو کہ اگر وقف کو اس نے بیچ دیا یا بدل دیا اور اس کی جگہ زمین نہیں خریدا تو کیا؟ اس کے متعلق آپ حضرات خود سوچ لیں کیا ہونا چاہئے۔

مفتی شبیر صاحب:...... اس سلسلہ میں حضرات فقہاء لکھتے ہیں کہ وقف کی دو قسم ہے، ایک زمین کی شکل میں ہے عمارتی شکل میں نہیں، اگر عمارتی شکل میں نہیں ہے تو اس بارے میں فقہاء کی دو رائیں ہیں، راجح قول کے اعتبار سے انفع کے لئے استبدال جائز نہیں ہے اور قول مرجوح کے مطابق انفع کے لئے استبدال جائز ہے، لیکن اگر وقف عمارتی شکل میں ہے تو ایسی صورت میں کسی کے نزدیک بھی استبدال جائز نہیں ہے، الثالث أن لا يشرطه أيضا ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعا ونفعا وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار وأن الخلاف في الثالث إنما هو في الأرض إذا ضعفت عن الاستغلال بخلاف الدار إذا ضعفت بخرابها ولم تذهب أصلا، فإنه لا يجوز حينئذ الاستبدال على كل الأقوال۔

قاضی صاحب:

جس عبارت کو آپ نے نقل کیا ہے مولانا اس میں ایک بہت بڑی بات ہے آپ کے لئے اور حضرات علماء کے لئے، اور اس کی وجہ بھی بتادی ہے یعنی حکم

معلّل تو میں نہیں کہتا حکم موجّہ کہتا ہوں، وجہ یہ لکھی ہے کہ

’’فإنه لا يجوز حينئذ الاستبدال على كل الأقوال، قال: ولا يمكن قياسها على الأرض فإن الأرض إذا ضعفت لا يرغب غالبا في استيجارها بل في شرائها، أما الدار يرغب في استيجارها مدة طويلة لأجل تعميرها للسكنى‘‘۔

یہ بحث انہوں نے کی ہے یعنی قیاس کیا ہے اس بات پر کہ زمین کا معاملہ جو ہے وہ عام طور پر حالات پر مبنی ہے کہ کوئی ایسی جگہ پر مکان واقع ہے جہاں کرایہ دار نہیں مل رہا ہے تو وہاں پر بغیر بیچے آپ کو چارہ نہیں ہے، اور کہیں زمین ایسی جگہ پر ہے کہ ہے تو وہ بے کار لیکن اس کے استیجار کے بہت سے خواہش مند موجود ہیں تو وہاں پر حکم بدل جائے گا، اس لئے ان صراحتوں کو ان حالات پر آپ ضرور تطبیق دیں جن میں آپ بتلا ہیں، اس لئے کہ یہ سارے مسائل مجتہد فیہ ہیں، اور یہ دراصل ہر فقیہ نے اپنے زمانے اور اپنے شہر کے حالات کو سامنے رکھ کر یہ فتویٰ دیا ہے، اور جب حکم معلل میں ہمارے لئے موقعہ ہے تو یہ تو حکم موجہ ہے، یعنی خود فقہاء نے اس کی توجیہ کردی ہے اس کو بھی اب آپ کو سوچ لینا ہوگا۔

مفتی شبیر احمد صاحب: ......آپ نے جو فرمایا کہ اگر کرایہ پر مکان کو لینے والا وہاں پر ہے نہیں تو ایسی صورت میں تو میرے نزدیک بھی بیچنے کی اجازت ہے اس میں اختلاف نہیں ہے۔

قاضی صاحب:

قبل اس کے کہ اجلاس ختم ہو ہمارے لئے بڑی خوشی اور مسرت کی بات ہے اور خاص کر میں رحمت اللہ ندوی صاحب سے کہتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر وہبہ صاحب کے پاس جا کر بیٹھ جائیں، اور تمام عرب علماء کے ساتھ ایک ایک مترجم فوراً بیٹھ جائیں، ابھی ہمارے دوست رحمن خان صاحب جو ممبر پارلیمنٹ بھی ہیں، اور میں اہمیت بتا دوں کہ اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک بہت اہم کمیٹی بنائی ہے، دعاء کیجئے کہ اس سے ہم لوگ پورا فائدہ اٹھا سکیں، اس کمیٹی کے آپ چیئر مین ہیں، آپ حضرات جو بہت سارے فیصلے کریں گے اور ان کو جب آپ ان کے حوالہ کریں گے تو قانون وقف میں میں امید کرتا ہوں کہ ان کی کوششوں سے بہت سی ترمیمات ہم لا سکتے ہیں جو شرع کے ساتھ زیادہ موافق ہوں یہ بہت اچھی بات ہے، میں نے ان کو خصوصی طور پر وقف کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے بلایا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ ان کی بات سن لیں اور کیا مسائل ہیں اور کیا مشکلات ہیں اس کی روشنی میں ہم کو بہت سارے فیصلے کرنے میں مدد ملے گی اور ہماری واقفیت میں اضافہ ہوگا۔

عبدالرحمن خاں صاحب ممبر پارلیمنٹ:

علماء کرام، بزرگو اور بھائیو!

آج یہاں تمام حضرات اوقاف کے مسائل پر اور شرعی طریقہ سے کس طرح ملک میں اوقاف کے اداروں کو چلایا جائے اس سلسلہ میں آپ غور کر رہے ہیں، اس دفعہ اتفاق کی بات ہے کہ پارلیمنٹ میں ایک سال پہلے اوقافی اداروں کے ناجائز استعمال اور جس طرح سے اوقافی اداروں کا غلط استعمال ہو رہا تھا اور اوقافی جائداد اور خاص کر بنگلور میں بہت سے اوقافی اداروں کو کوڑیوں کے دام پر، جو کروڑوں روپے کی جائداد تھی، وقف بورڈ کی طرف سے ہی غلط استعمال ہو رہا تھا تو پارلیمنٹ میں جب یہ بحث ہوئی اس وقت یہ طے کیا گیا کہ اس ملک میں قانون تو ہے اوقاف کا، مگر اس کا استعمال صحیح نہیں ہے، پہلے ۱۹۵۴ میں اس کا قانون بنا اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں ایک وقف انکوائری کمیٹی بنی، سارے ملک میں اس پر بحث ہوئی، ۲۰۔۲۲ر سال کے بعد ایک دوسرا قانون بنا اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں یہ قانون جاری ہوا اور پہلی جنوری سے یہ قانون نافذ ہے اس ملک میں، مگر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ جو قانون ہے اس میں اور زیادہ تبدیلیوں کی ضرورت ہے، اور اوقاف کے تحفظ کے لئے قانون میں اور زیادہ مضبوطی اور تبدیلیوں کی ضرورت ہے، اس لئے پارلیمنٹ میں یہ سجھاؤ آیا کہ ایک کمیٹی بنا کر اور اس کمیٹی سے ایک رپورٹ حاصل کر کے پھر اس قانون میں ترمیمات کئے جائیں، چنانچہ ایک جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی بنائی گئی ہے، یہ کمیٹی دونوں راجیہ سبھا اور لوک سبھا سے مل کر بنی ہے، اور پہلی مرتبہ اس پچاس سال کی تاریخ میں مسلمانوں کے مسائل پر ایک جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی پارلیمنٹ نے تشکیل دی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس کا ہم کس طرح استعمال کریں، قانون تو اپنی جگہ

بن رہا ہے، مگر پارلیمنٹ کو صحیح رہنمائی چاہئے کہ کس طرح کا قانون ہونا چاہئے، اب اس کمیٹی کے سامنے چھ نکات ہیں۔

پہلی شق Terms of Reference یہ ہے کہ وقف کی جائداد جو اس ملک میں ہے اس کی نشاندہی کی جائے کہ کون سی جائداد وقف کی ہے اور کون سی جائداد وقف کی نہیں ہے، اس لئے پہلے اس کا سروے ہو جائے کہ پورے ملک میں اور تمام ریاستوں میں اوقافی جائدادیں کون سی ہیں۔ دوسرے اوقافی جائداد جو ناجائز قبضوں میں ہے، حکومت کے ناجائز قبضہ میں ہے متولیوں کے ناجائز قبضہ میں ہے اور بہت سے لوگوں کے ناجائز قبضہ میں ہے تو اس کو کس طرح حاصل کیا جائے، چاہے حکومت سے ہو یا جس کے ناجائز قبضہ میں ہو اس سے کیسے لیا جائے گا یہ بھی پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے ایک مسئلہ ہے اس کے اوپر غور ہو رہا ہے۔ تیسرے آمدنی وقف کی جو ہے وہ بہت ہی کم ہے، یعنی بہت سی جائداد ایسی ہے جس سے آمدنی اور زیادہ ہو سکتی ہے مگر دوسرے قانون کی وجہ سے جیسے......... کنٹرول ایکٹ ہے، ایکویزیشن ایکٹ ہے یا دوسرے جو قانون ملک کے ہیں ان کی وجہ سے وقف کی آمدنی میں بہت ہی مشکلات آرہی ہیں، اب اس کو کس طرح سے کریں کہ وقف کو......... کنٹرول ایکٹ سے بری کیا جاسکے، اور جو اوقافی پراپرٹی ہے اس کو کیا ہم پبلک پراپرٹی ڈکلیئر کر سکتے ہیں یعنی یہ ایک شخص کی جائداد نہیں، بلکہ پبلک پراپرٹی ہے اللہ کی ملکیت ہے اس پر کسی ایک فرد کا حق حاصل نہیں ہے، جیسا کہ گورنمنٹ کی پراپرٹی ہوتی ہے، پبلک پراپرٹی ہوتی ہے، تو اس پر جو قانون نافذ ہوتا ہے اس سے کسی کو اس جائداد کے حاصل کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے، اس طرح سے وقف کو پبلک پراپرٹی میں لایا جائے یا نہیں، یہ بھی ایک سوال کمیٹی کے سامنے ہے، اور اس کا علم ہم سبھی کو ہے کہ اوقاف بورڈ میں صحیح طرح سے کام نہیں ہو رہا ہے تو ان کا جائزہ لیں کہ کیا وقف بورڈ اپنا صحیح کام کر رہے ہیں یا نہیں، قانونی طریقے سے اور شرعی طریقہ سے کام کر رہے ہیں یا نہیں؟ اس کا بھی جائزہ لے کر اوقاف بورڈ میں مضبوطی لانے کے لئے ہمیں یہ بھی کرنا ہے، اور اس کے بعد یہ کمیٹی ایک تفصیلی رپورٹ پارلیمنٹ کو پیش کرے، تاکہ ایک ایسا جامع قانون بنے جس سے اس جائداد اوقاف کا تحفظ بھی ہو اور صحیح استعمال بھی ہو اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کام انجام پائے، یہ کام گذشتہ سات آٹھ مہینوں سے چل رہا ہے اور اس کی بہت سی ذیلی کمیٹیاں بنی ہیں اور ہر کمیٹی کو الگ ریاستیں دی گئی ہیں، مجھے نو ریاستوں کے کمیٹیوں کی ذمہ داری دی گئی ہے، پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش، دلی، ویسٹ بنگال، کرناٹک، آندھرا پردیش یہ جو علاقے ہیں ہماری کمیٹی نے اس پورے علاقوں کا دورہ کیا ہے، وہاں پر تبادلہ خیال کیا ہے، پنجاب، ہریانہ میں وہاں پر جو اوقاف ہیں ان کے جو حالات ہیں اور پراپرٹی کا جو غلط استعمال ہو رہا ہے اس کی تفصیل میں نہیں جاسکتے، اور ہماری کمیٹی کا اندازہ ہے کہ اس وقت ہندستان میں پانچ لاکھ اوقافی ادارے ہیں، اگر اس کے ویلو اور قیمت کو دیکھتے ہیں تو گورنمنٹ کے اندازے کے مطابق پچاس ہزار کروڑ سے زیادہ بنتے ہیں، اور اتنی پراپرٹی ہمارے پاس ہے، اب اسے کس طرح استعمال کرنا ہے اس کے لئے ہماری اور آپ کی پوری امت کی ذمہ داری ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں، مگر پارلیمنٹ کو قانون بنانا ہے، ہم کو قانون میں تبدیلیاں لانا ہے، اگر رہنمائی کمیٹی کو نہیں ملے گی کہ ہم کس طرح کی تبدیلی چاہتے ہیں تو کل ہم کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے کہ یہ قانون صحیح نہیں ہے، تو میری آپ تمام علماء کرام سے گذارش ہے کہ اب جو ہمارا قانون ہے اس پر آپ غور کریں، ۱۹۹۵ء کا جو قانون ہے اس پر، اب اس قانون میں کن کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو تبدیلی شرعی نقطہ نظر سے ضروری ہے اس سے متعلق اگر آپ بل بھی بنا کر دے سکتے ہیں تو یہ کمیٹی پارلیمنٹ کے سامنے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہے، آج میں آپ سے یہی گذارش کروں گا کہ اس کمیٹی سے فائدہ اٹھایئے، کیونکہ سب سے اہم یہ ہے کہ اس کمیٹی میں ہر پارٹی کے لوگ ہیں اور میں چھ سات مہینے سے اس کمیٹی میں کام کر رہا ہوں کسی کا کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اچھا قانون بنایا جائے، نہ بی جے پی کا ہے، نہ کسی شیوسینا کا ہے، نہ کسی پولیٹکل پارٹی کا ہے، ہر پولیٹکل پارٹی چاہتی ہے کہ وقف کا قانون مضبوط بنے اور صحیح ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں ہم اس قانون میں کس طرح مضبوطی لاسکتے ہیں اس لئے ہم اس کو صحیح رہنمائی کیسے دے سکتے ہیں کیونکہ ۱۹۷۵ء میں جو کمیٹی بنی تھی ہمارے ہی اختلافات سے ۲۰ رسال لگے، ۱۹۹۵ء کا قانون اب سامنے آیا ہے، جس میں بہت سی اچھی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ٹریبونل آیا ہے، اوقاف کے جو جھگڑے دس دس پندرہ پندرہ سال سے کورٹوں میں چل رہے تھے اب صرف اوقاف کیلئے ٹریبونل بن گیا ہے، اور لمیٹیشن ایکٹ تو پہلے ۱۲ رسال کا تھا اب ۳۰ رسال ہوا، اگر اوقاف کی پراپرٹی ہے اور سو سال سے بھی ناجائز قبضہ میں ہے تو اب وہ پراپرٹی واپس لی جاسکتی

ہے۔اوردوسراجوآثارقدیمہ کاسوال ہواتھا،ہمارے یہاں پرآتھولیجکل ڈپارٹمنٹ جومساجدڈکلیرکرتی ہے،آپ کویہ جان کرخوشی ہوگی کہ اس کوٹنس کے طور پرلایاگیاتھااورتین گھنٹے ان سے وٹنس لیا گیا،اور یہاں پر یہ سوال آپ کے سامنے ہے کہ آثارقدیمہ کے تحت ہمارے آتھولیجکل ڈپارٹمنٹ کے پاس جومساجد ہیں ان میں پھرنماز کا پڑھنا کیسے شروع ہواورکس طرح سے ان کوحاصل کیاجائے،یہ کسی کااعتراض نہیں کہ وہ آثارقدیمہ ہےاس کا تحفظ کیاجائے،اوروہاں میں نےخودآتھولیجکل ڈپارٹمنٹ پر یہ اعتراض کیا کہ آپ کویاکسی کوکیاحق ہے کہ جب ایک واقف نے مسجدوہاں بنایاتواس کے منشاکے خلاف کسی کونماز پڑھنے سے روکنا،آپ کواس کا کوئی حق نہیں ہے،تواس میں قانوناً کوئی گنجائش نہیں،مگراس طرح کے قانون کووہ انٹرپریٹ کررہے ہیں کہ وہاں ہم اجازت نہیں دیں گے،مگرڈائرکٹرجنرل ہمارے سامنے اتنی باتیں کرچکے ہیں کہ قانون میں توکوئی ایسی گنجائش نہیں ہے،مگراس کے تحفظ کے لئے ہم کام کررہے ہیں،اگرہم صحیح طریقہ سےغورکرکےجذبات سے ہٹ کرقانونی موقف میں ہم لیں تومجھے امید ہے کہ یہ بھی مسئلہ ہم حل کرسکتے ہیں انشاءاللہ،اس لئے میری گذارش آپ تمام سے یہی ہے کہ اس کے اوپرہم زیادہ سے زیادہ توجہ دیں،کیونکہ یہ موقعہ اگرہاتھ سےنکل گیااوریہ قانون نہیں بناتوپھراس مسئلہ میں ہم الجھ کے رہ جائیں گےاورہماراکوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا،بس اتناکہہ کرمیں آپ تمام کاشکرگذارہوں کہ آپ نے مجھے موقع دیا۔

ڈاکٹروہبہ زحیلی صاحب:

(آوازصاف نہیں ہے)

قاضی صاحب:

جو بات ڈاکٹروہبہ زحیلی صاحب نے فرمائی،میں سمجھتاہوں کہ سمینار کی طرف سے کہی جانی چاہئے،بہرحال اس سلسلہ میں ایک پختہ نظام بنناچاہئے کہ وقف احکام شرع اسلامی میں سے ایک حکم ہےاوراس کاایک مستقل شرعی نظام ہے،اورمسلم پرسنل لااس کی حفاظت کی ذمہ داری لے کہ ۱۹۳۷ء کے شریعت اپلیکیشن ایکٹ کے تحت کوئی بھی قانون بننے میں اس کی رعایت ضروری ہے کہ حکم شرع کی مخالفت نہ ہو،اس لئے علماءشریعت کااس میں عمل دخل ضروری ہے،لہٰذاجدیدوقف ایکٹ میں اگرکوئی ہم تبدیلی چاہتے ہیں تواس میں اس پہلوکوضرورسامنےرکھاجائےکہ ایسےعلماءہوں جوماہرین شریعت ہوں اوروہ سرکارکےنامزدکردہ نہ ہوں بلکہ جوآج جمہوریت ہرسسٹم میں آرہی ہےاس کوسامنےرکھتے ہوئےایسےعلماءہوں جن کوخودعلماءبیٹھ کرمنتخب کرلیں اوردعاکیجئے کہ ہم لوگ اتفاق کےساتھ کرلیں۔

بہرحال میں ابھی دواہم بات کہناچاہتاہوں،ایک تویہ کہ جتنے سوالات اوقاف سے متعلق ہیں اورایک بڑااہم سوال آپ کاآگیاکہ جوموجودہ وقف ایکٹ ہےاس میں آپ کیاتبدیلی چاہتے ہیں جومطابق شرع اورمقاصدوقف کی حفاظت کے لئے بہتراوراس کی ترقی کے لئے بہترہو،میں سمجھتاہوں کہ جوکمیٹی میں اس وقت بنانے جارہاہوں وہ تمام مسائل سے دلچسپی ختم کرکےآج ہی شام سے یہ کمیٹی بیٹھ جائے،اوروہ ان مسائل پربھی تجویزیں طے کرےاورساتھ میں ہمارے عبدالرحیم قریشی صاحب ہیں ایک ایک پوائنٹ پران کی نظرہےاورہم طویل بحث بھی کرچکے ہیں موجودہ وقف ایکٹ پر،چندپوائنٹ ہی ایسے ہیں جن پرگفتگوکی سخت ضرورت ہے،میں سمجھتاہوں کہ ان پراپنی تجاویزاس سمینار کی طرف سےتیارکی جائےجوہم جوائنٹ وقف کمیٹی کوبھیجیں،وزیراوقاف کوبھیجیں اورکیاپتہ کہ آج بمبئی کی سرزمین پرجوہم چندلوگ بیٹھ کرفیصلہ کررہے ہیں نظام وقف میں ایک بڑےانقلاب کی بنیادبن جائے،ایساتاریخ میں ہواہےاورایساہوسکتاہے،انشاءاللہ۔

ایساہےشمس پیرزادہ صاحب کہ جونیاوقف ایکٹ بناہےوہ پورےہندوستان کی تمام ریاستوں کےلئےمشترک ہےاوراس کوبہرقیمت ملک کی تمام ریاستوں میں نافذہوناہے،یہ قانون موحدہوگاوقف کاجوہندوستان کی تمام ریاستوں میں نافذہوگا،اب اس میں ذرابعض ریاستیں آگےپیچھےکررہی ہیں،لیکن وقف ایکٹ کاجوقانونی نفاذہےدوچارمہینہ آگےپیچھےکرکےمجبورہیں ساری ریاستیں کہ اسی ایک وقف ایکٹ کوپورےہندوستان میں نافذکریں اوریہ انشاءاللہ ہوجائےگا۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب:

متولیوں کو یہ جو اختیار بیچنے کا خریدنے کا ہے اس سلسلہ میں یہ بات پہلے ذہن میں سب کے بٹھادی جائے کہ متولی وقف کا مالک نہیں ہوتا مالک خالص اللہ تعالی ہے اور وہ اللہ کا نائب بن کر سب کچھ کرتا ہے، جو خرید وفروخت اور جو تصرفات وہ کرتے ہیں سب اسی حیثیت سے کرتے ہیں۔

قاضی صاحب:

بہرحال جو کمیٹی اس موضوع پر بنائی گئی ہے وہ وقف سے متعلق جملہ سوالات اور موجودہ ۱۹۹۵ء وقف ایکٹ کو سامنے رکھ کر اپنی سفارشات تیار کرے گی، چونکہ یہ کام ذرا زیادہ اہم ہے اس لئے میری درخواست ہے کہ پرسوں کا انتظار کئے بغیر آج عصر کی نماز کے بعد آپ حضرات بیٹھ جائیں اس میں ہمارے دکتور وہبہ زحیلی صاحب، مولانا عبداللہ جولم صاحب، ڈاکٹر خالد مذکور صاحب، مولانا بدر الحسن قاسمی صاحب، شمس پیرزادہ صاحب، مولانا عتیق احمد صاحب، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب، مولانا ظفر عالم ندوی صاحب، مفتی اشرف علی صاحب، جناب عبدالرحیم قریشی صاحب اور جناب رحمن خان صاحب، گیارہ افراد پر مشتمل ہوگی یہ کمیٹی جو آج عصر بعد کام شروع کردے، مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب اس کے کنوینر ہوں گے، یہ بہت بڑا اہم کام ہے، اس سمینار کے ذریعہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑا تعمیری کام انجام دیا جاسکتا ہے، اللہ تعالی ہم کو اور آپ کو حق اور خیر کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

☆☆☆

تمت

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

موجودہ اہم سماجی مسائل کے حل کے لئے

وقف کی اہمیت اور طریقۂ کار

عصر حاضر میں مسلمانوں کی معاشی و تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں وقف کی اہمیت
اور اس کے طریقۂ کار جیسے اہم موضوع پر چودہویں فقہی سمینار منعقدہ حیدر آباد
مؤرخہ ۲۰ تا ۲۲ جون ۲۰۰۴ء میں پیش کئے گئے علمی و فقہی مقالات و آراء کا مجموعہ

پہلا باب ☆ سوالنامہ اور فیصلے
دوسرا باب ☆ وقف سے متعلق تمہیدی نکات
تیسرا باب ☆ وقف-ضرورت واہمیت
چوتھا باب ☆ وقف کا فقہی پہلو، تفصیلی مقالات
تحریری آراء :

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ۰ ایم اے جناح روڈ ۰ کراچی پاکستان
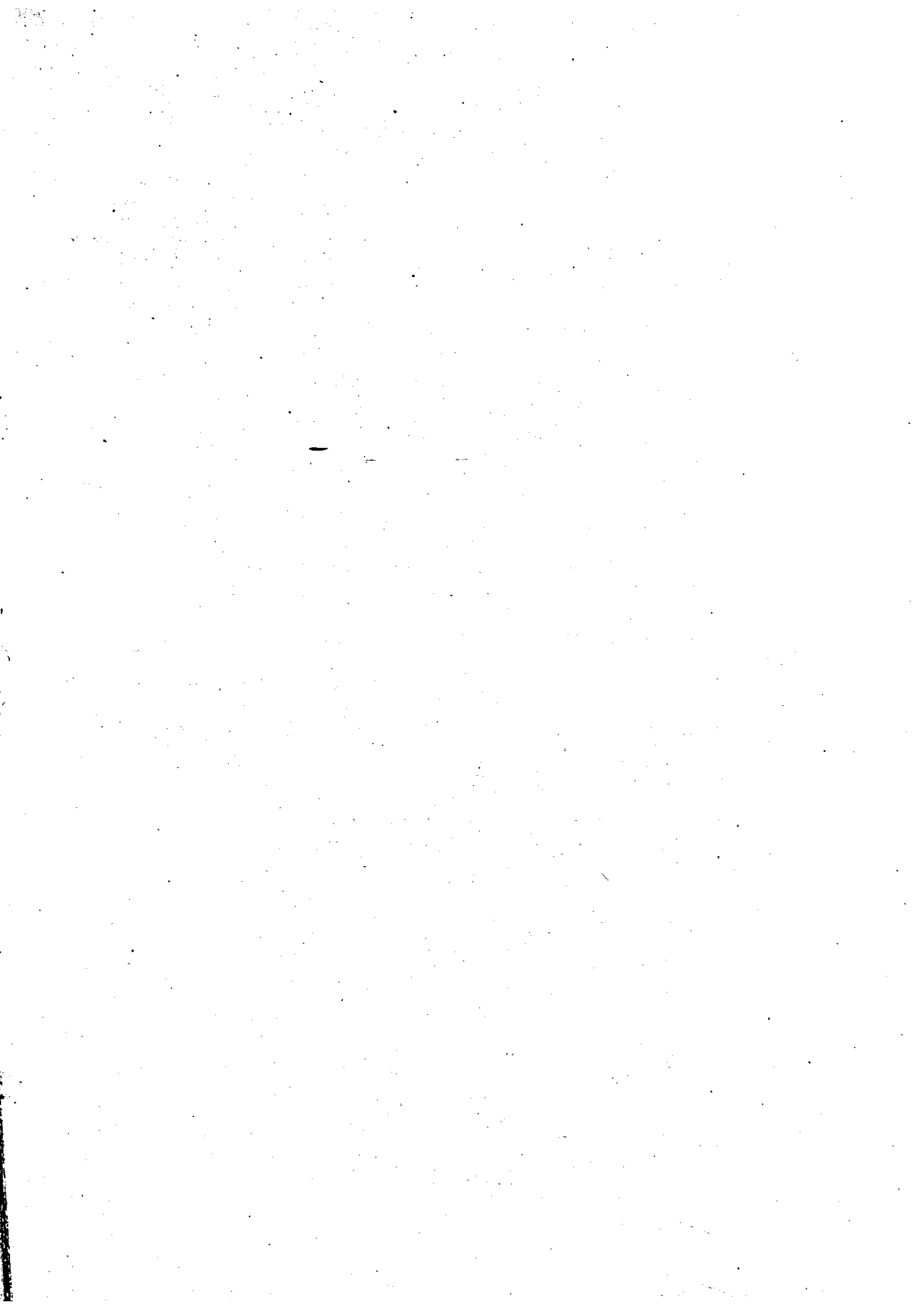
ابتدائیہ

شریعت کے تمام احکام کی بنیاد دو باتوں پر ہے: خالق کی اطاعت و بندگی اور مخلوق کے ساتھ محبت وحسن سلوک۔ خدا کی بندگی تو انسانیت کا اولین مقصد ہے: "وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون" (سورۂ ذاریات: ۵۶) لیکن اس کے ساتھ ساتھ مخلوق خداوندی کی خدمت اور اس کے ساتھ محبت اور بہتر برتاؤ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے اچھے ہونے کے لئے حسن اخلاق ہی کو معیار بنایا ہے، بلکہ غور کریں تو عبادت اور خدمت خلق کو شریعت میں بعض موقعوں پر ایک ہی درجہ دیا گیا ہے، چنانچہ بعض کفارات میں روزے واجب ہیں اور اگر روزے نہ رکھے جاسکیں تو ہر روزہ کے بدلہ ایک دن کا کھانا کھلانا واجب ہے۔

خدمت خلق کی ایک صورت وقتی ہے اور ایک دیرپا اور دائمی ہے، یہ دوسری صورت افضل ہے جس کو حدیث میں صدقہ جاری کہا گیا ہے۔ صدقہ جاریہ کی ایک صورت وقف بھی ہے، یعنی کوئی شئی کسی کار خیر کے لئے اس طرح مخصوص کی جائے کہ اصل شئی باقی رہے اور اس سے حاصل ہونے والا نفع اس مد میں خرچ ہوا کرے۔ وقف کے اس طریقہ کو علماء مغرب نے اسلام کی خصوصیات اور فقہ اسلامی کے امتیازات میں شمار کیا ہے۔ وقف کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عمل میں موجود ہے۔ صدقہ جاریہ کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جیسا کہ مذکور ہوا، وقف کے مشروع ہونے کی بنیاد ہے، اسی طرح وہ حدیث جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متروکات کے میراث ہونے کی نفی فرمائی، اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا ترکہ وقف علی اللہ تھا پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ہاں غیر منقول اموال میں وقف کی واضح صورتیں موجود ہیں۔

اسلامی تاریخ میں بعد کے ادوار میں مسلمانوں میں وقف کا عام ذوق پیدا ہوا اور جہاں لوگوں نے مسجدوں، مدرسوں اور قبرستانوں پر وقف کیا، وہیں رفاہی کاموں پر بھی کثرت سے وقف کیا گیا، اس میں یتیموں، بیماروں، مسافروں، بیواؤں اور بوڑھوں پر وقف شامل ہے، یہاں تک کہ مریضوں کے تیمارداروں پر بھی بعض لوگوں نے وقف کیا اور پرندوں کی غذاؤں کے لئے بھی وقف کیا گیا۔

اس وقت مسلمان جس معاشی زبوں حالی اور تعلیمی پس ماندگی سے دوچار ہیں، اوقاف کے ذریعہ ان کو بہتر طور پر دور کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے ایک طرف موجودہ اوقاف کو نفع آور بنانے اور ان کا صحیح استعمال کرنے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف تعلیمی اور رفاہی اغراض کے لئے نئے اوقاف قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں اگر مسلمانوں کے اوقاف بے جا تصرف وتغلب سے آزاد ہوجائیں اور نیک نیتی کے ساتھ ان کو نفع آور بنایا جائے اور تعمیری مقاصد میں ان کا استعمال کیا جائے تو بہت سی دشواریاں حل ہوسکتی ہیں اور مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم وتربیت، بیواؤں، یتیموں اور دوسرے بے سہارا لوگوں کی مدد کا بڑا کام انجام پاسکتا ہے۔

اسی لئے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) شروع سے اوقاف کے مسائل پر خصوصی توجہ دیتی رہی ہے۔ اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ نے اس موضوع پر بعض اہم مقالات سپرد قلم فرمائے ہیں، جو اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوچکے ہیں۔ اکیڈمی نے اپنے دسویں فقہی سمینار منعقدہ ممبئی بتاریخ ۲۵ تا ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں اوقاف کے مسائل کو خصوصی اہمیت کے ساتھ بحث کا

موضوع بنایا تھا، جس میں اوقاف سے متعلق موجودہ دور میں پیش آنے والے مشکل مسائل اور ہندوستان کے پس منظر میں پیدا ہونے والی مختلف پیچیدگیوں کو سامنے رکھتے ہوئے بڑے اہم سوالات مرتب کئے گئے تھے۔اس سمینار میں ملک و بیرون ملک کے موقر علماء شریک ہوئے اور انہوں نے ایسی تجاویز منظور کیں جن میں موجودہ مشکلات کا حل بھی ہے، وقف کے سلسلہ میں شریعت کی بنیادی تعلیمات اور اصول ومقاصد کی پوری پوری رعایت بھی اور توازن واعتدال بھی۔ان مقالات کا مجموعہ اردو میں اور ان میں سے منتخب مقالات اور علماء ہند کی آراء کا خلاصہ عربی میں اکیڈمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

چودھویں فقہی سمینار منعقدہ حیدرآباد میں وقف کے مسئلہ کو ایک اور پہلو سے زیر بحث لایا گیا اور وہ یہ کہ موجودہ دور میں مسلمانان ہند کے مسائل کے حل کے لئے کس طرح کے اوقاف قائم ہونے چاہئیں؟ اس موضوع پر جو تحریریں سمینار میں آئیں، وہ موجودہ حالات کے پس منظر میں بڑی ہی چشم کشا ہیں۔ان ہی مقالات اور مختصر تحریروں کا یہ مجموعہ آپ کے سامنے پیش ہے۔اس میں زیادہ تر تحریریں تو وقف کی ترغیب اور موجودہ حالات میں وقف کی ضروری اور اہم جہات کی تعیین پر مشتمل ہیں اور وزارت اوقاف حکومت کویت سے وابستہ ایک عرب فاضل ڈاکٹر عبدالغفار شریف کی گفتگو فقہی پہلو پر ہے۔ بہر حال یہ مجموعہ اپنے موضوع پر بڑی اہمیت کا حامل ہے اور گویا وقف سے متعلق مجلہ کا تکملہ ہے جو اس سے پہلے اکیڈمی کی جانب سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

قارئین کو عزیزم محمد ہشام الحق ندوی (رفیق شعبہ علمی امور) کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے بہتر طور پر اس مجموعہ کی ترتیب کی خدمت انجام دی ہے۔دعاء ہے کہ اللہ تعالی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس سے مسلمانوں کو اوقاف کو نفع آور بنانے اور نئے اوقاف قائم کرنے کے سلسلے میں روشنی ملے۔واللہ ہو الموفق۔

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری)

۲ رصفر المظفر ۱۴۲۸ھ / ۲۰ رفروری ۲۰۰۷ء

☆☆☆

اکیڈمی کا فیصلہ:

وقف

وقف کو اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اور وقف کے ذریعہ بڑے بڑے تہذیبی وتمدنی، فلاحی اور رفاہی کارنامے انجام دیئے گئے ہیں، اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمینار نے درج ذیل امور طے کئے ہیں:

۱- ہندوستان میں مسلم اوقاف کو سرکاری وغیر سرکاری ناجائز قبضوں سے واگذار کرنے، اور وقف کی جائیداد کو جدید امکانات اور شرعی ضابطوں کی رعایت کرتے ہوئے بڑھانے، نفع آور بنانے اور ان کی سرمایہ کاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲- بیواؤں، مطلقہ عورتوں، یتیموں، بیماروں اور دیگر ضرورت مند لوگوں کی حاجت روائی کے لئے نئے اوقاف کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۳- ضرورت مند طلبہ کی اعانت اور ان کے لئے اسکالرشپ وغیرہ کی فراہمی کے لئے ''فنڈ برائے تعلیمی امور'' قائم کیا جائے۔

۴- دینی مراکز اور اسلامی مدارس کی تقویت کے لئے ''فنڈ برائے دینی مراکز'' کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۵- ان تمام شعبوں کے لئے اہل خیر حضرات کو چاہئے کہ دل کھول کر حصہ لیں جو انشاء اللہ ان کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا۔

سوالنامہ:

سماج کے سنگین مسائل کے حل کے لئے اوقاف کا قیام

اسلام دین فطرت ہے، اس کی تعلیمات دنیا و آخرت میں انسان کی کامیابی کی ضامن ہیں، عقائد و عبادات سے لے کر اخلاق و معاملات ہر میدان میں اسلام کے احکام و تعلیمات اتنی جامع اور مکمل ہیں کہ ان کو اختیار کرنے اور ان پر عمل آوری سے نہ صرف آخرت کی فلاح یقینی بن جاتی ہے بلکہ دنیا کے مختلف میدانوں میں انسان کی زندگی خوشگوار، پرامن اور اطمینان بخش ہو جاتی ہے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ معاشیات اور اقتصادیات کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات اتنی جامع اور مکمل ہیں کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے سماج میں معاشی توازن پیدا ہوتا ہے اور ہر طبقہ کی معاشی ضروریات حسن و خوبی کے ساتھ پوری ہوتی ہیں۔

اسلام نے سماج کے نادار اور بے سہارا طبقوں اور افراد کو اوپر اٹھانے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایسی بہت سی تعلیمات دی ہیں جن کی انفرادی اور اجتماعی سطح پر عمل آوری سے کمزور طبقات و افراد کو سہارا ملتا ہے، وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق بنتے ہیں اور ان کا نہ صرف معاشی معیار بلکہ علمی و فکری معیار بھی بلند ہوتا ہے۔

اسلام کے مالیاتی نظام میں وقف کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے، مختلف احادیث و آثار میں وقف کی اہمیت بیان کی گئی ہے، اس کی ترغیب دی گئی ہے اور اسے صدقۂ جاریہ قرار دیا گیا ہے، اسلامی تاریخ کے ہر دور میں غریبوں اور مسکینوں کی ضروریات کو پورا کرنے، انہیں معاشی طور پر خود کفیل بنانے، مسلمانوں کو علوم و فنون سے آراستہ کرنے، مریضوں، پریشان حالوں کی حاجت روائی کرنے اور اصحاب علم و فضل کا معاشی تکفل کرنے میں اسلامی اوقاف کا بہت اہم رول رہا ہے، ہر دور میں باتوفیق اہل ثروت مسلمان مختلف دینی، علمی، سماجی و رفاہی مقاصد کے لئے چھوٹے بڑے اوقاف قائم کرتے رہے اور ان اوقاف کے ذریعہ بہت سے وہ کام انجام پاتے رہے جنہیں دور حاضر میں وزارت تعلیم، وزارت صحت وغیرہ انجام دیا کرتی ہیں۔

اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ قدیم اوقاف کی حفاظت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں نئے اوقاف قائم کرنے کا رجحان پیدا کیا جائے بلکہ اس رجحان کو مہمیز کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وقف کی یہ سنت (جس میں مسلم سماج بلکہ انسانی سماج کے لئے بے شمار فوائد ہیں) مسلسل فروغ و ترقی پاتی رہے۔ دور حاضر میں ایسے مختلف میدان ملکی و عالمی سطح پر ظاہر ہو چکے ہیں جن کے لئے اوقاف قائم کرنے اور ان کا مستحکم نظام بنانے کی ضرورت ہے۔ اس احساس کے ساتھ درج ذیل سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں، تاکہ ان کے بارے میں آپ کے مطالعہ و فکر سے استفادہ کیا جائے اور ان کی روشنی میں کچھ ایسی تجاویز چودہویں فقہی سمینار میں پیش کی جا سکیں جو اوقاف کے سلسلہ میں امت کی بہترین رہنمائی کر سکیں۔

۱- مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے اوقاف

موجودہ دور میں ایک اہم مسئلہ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کا ہے جو معاشی طور پر انتہائی کمزور اور بے سہارا ہوتی ہیں، اسلام کا نظام نفقہ مسلم سماج میں رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ اعزہ و اقرباء بھی جن پر یہ معاشی کفالت لازم ہے اور وہ معاشی طور پر ایسی عورتوں کی کفالت کر سکتے ہیں، اپنی ذمہ داری کو ادا نہیں کرتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب خاندانوں ہی کی نہیں بلکہ بعض اوقات معزز اصحاب ثروت خاندانوں کی مطلقہ اور بیوہ عورتیں معاشی بدحالی کا شکار ہوتی ہیں، ان کی اس بدحالی سے فائدہ اٹھا کر انہیں معاشی خوشحالی کا سنہرا خواب دکھا کر غلط راہوں پر ڈالا جاتا ہے، بعض اوقات آزادی نسواں کا نعرہ بلند کرنے والی بعض تنظیمیں انہیں اچک لیتی ہیں اور ان کے ذریعہ ملکی عدالتوں اور قومی پریس میں اسلامی تعلیمات کو ہدف بناتی ہیں، کیا ان

حالات میں مناسب نہ ہوگا کہ ملک کے مختلف شہروں اور علاقوں میں ایسے اوقاف قائم کئے جائیں جن کے ذریعہ ایسی فقر و فاقہ سے دوچار پریشان حال عورتوں کا باعزت معاشی تکفل ہو اور انہیں در در کی ٹھوکریں کھانے سے بچایا جاسکے۔

۲- تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف

مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب دوسری قوموں سے بہت کم ہے، جہالت اور ناخواندگی کی وجہ سے مسلمان قسم قسم کی سماجی خرابیوں میں مبتلا ہیں، اس بات کا عام احساس ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کا فیصد بہت کم اور تعلیم کا معیار دوسری اقوام سے کافی پست ہے، دینی تعلیم سے ہمارے بہت سے بچے محروم رہتے ہیں اور عصری تعلیم کے میدان میں بھی ان کا معیار کافی پست ہے، حالانکہ اللہ کی دی ہوئی ذہانت اور علمی وفکری صلاحیتیں اس امت کے بچوں اور نوجوانوں میں دوسری اقوام سے ہرگز کم نہیں ہیں، عام طریقہ سے معاشی بدحالی کی وجہ سے ہمارے ذہین ترین بچے جو علم کے مختلف میدانوں میں نئے اکتشافات کرسکتے ہیں، زیور تعلیم سے آراستہ نہیں ہوپاتے، اس تناظر میں اس بات کا احساس بار بار ہوتا ہے کہ کاش تعلیمی مقاصد کے لئے ہمارے پاس منظم اوقاف ہوتے اور ان کا بہترین نظم ونسق ہوتا تاکہ ہمارا کوئی بچہ معاشی کمزوری کی وجہ سے دین ودنیا کی تعلیم سے محروم نہ رہے اور اپنے ذہین ترین بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ہم ایسے تمام وسائل فراہم کرسکیں جن کی مدد سے وہ مقابلہ کی اس دوڑ میں دوسری اقوام سے بازی لے جاسکیں، اس پس منظر میں آپ سے گذارش ہے کہ تعلیمی اوقاف کی اہمیت اور اس کی مختلف شکلوں کے بارے میں آپ کے ذہن میں جو باتیں ہوں وہ تحریر فرمائیں۔

۳- مریضوں کے لئے اوقاف

دور حاضر میں انسانی آمدنی کا ایک بڑا حصہ علاج معالجہ پر خرچ ہورہا ہے، دن بدن علاج مہنگا ہوتا جارہا ہے، خوش حال لوگوں کے لئے بھی علاج معالجہ کے اخراجات ادا کرنا مشکل ہورہا ہے، خاص طور سے بعض انتہائی مہلک اور سنگین امراض (مثلاً کینسر، ایڈز وغیرہ) کے دوا علاج کے مصارف غیر معمولی ہوتے ہیں، جن کا علاج سماج کے متوسط طبقہ کے لئے بھی ممکن نہیں ہوتا، ہمارے سماج میں ایسے مریضوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے جو اپنے دوا علاج سے عاجز ہوتے ہیں، اسلام دین رحمت ہے، انسانوں کی خدمت اور راحت رسانی اس کی تعلیمات کا ایک اہم حصہ ہے، مسلم عہد حکومت میں مریضوں کے لئے بھی اوقاف قائم کئے جاتے تھے، اب اس میں بہت کمی آگئی ہے، اس بات کی ضرورت کا شدت سے احساس عام طور پر کیا جارہا ہے کہ ایسے مریضوں خصوصاً کینسر وغیرہ جیسے سنگین امراض میں مبتلا مریضوں کے لئے جو علاج معالجہ کے مصارف اٹھانے پر قادر نہیں ہیں، مختلف اوقاف قائم کئے جائیں، ان کے تحت اسپتال، طبی مراکز وغیرہ قائم ہوں جہاں علاج معالجہ کا اطمینان بخش نظم ہو، طب وصحت کے میدان میں اوقاف قائم کرنے اور ان کا نظم ونسق چلانے کے بارے میں کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں جو تجاویز آپ کے ذہن میں ہوں انہیں تحریر فرمائیں۔

۴- تحفظ شریعت اور دعوت دین کے لئے اوقاف

اوپر ذکر کردہ مقاصد کے علاوہ اور مختلف مقاصد مثلاً تبلیغ ودعوت، صحافت وابلاغ، دفاع عن الدین وغیرہ کے لئے مختلف قسم کے اوقاف قائم کئے جاسکتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ دور حاضر کے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں جن مقاصد اور جن کاموں کے لئے اوقاف قائم کئے جانے کی ضرورت ہے اور ان اوقاف کو زیادہ سے زیادہ مفید اور ثمر آور بنانے کے لئے جو طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں ان کی نشاندہی کی جائے اور اس سلسلہ میں اپنی قیمتی تحقیقات وآراء سے استفادہ کا موقع دیا جائے۔

☆☆☆

اوقاف سے متعلق شرعی احکام میں اجتہاد کی ضرورت

ڈاکٹر محمد عبد الغفار شریف [1]

فلاسفہ کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یہ انسانی معاشرہ کا دستور ہے، خواہ اس میں مسلمان رہتے ہوں یا غیر مسلم۔ یہی ضرورت علماء کو اجتہاد پر آمادہ کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ باغیوں اور رہزنوں وغیرہ سے متعلق بیش تر احکام صحابہ کرام کے درمیان ہونے والی جنگوں یا ان کے اور خوارج کے درمیان ہونے والی جنگوں کے نتیجہ میں وجود میں آئے۔ آپ تمام حضرات کو معلوم ہے کہ جب امام شافعی عراق سے مصر تشریف لے گئے تو ان کی بہت سی آراء تبدیل ہوگئیں۔ دلائل اور اصول تو پرانے ہی تھے البتہ بعض ان نئے واقعات، نئے عرفوں اور ان تہذیبی امور کی وجہ سے جو حجاز اور عراق میں انہیں پیش نہیں آئے تھے اور مصر میں ان کو ان سے سابقہ پیش آیا، انہوں نے بہت سے دلائل پر از سر نو غور کیا اور ان کے سامنے بہت سے ایسے دروازے کھلے جو اب تک نہیں کھلے تھے، ان ہی میں سے احکام وقف میں واقع ہونے والا تغیر بھی ہے، اسی لئے وقف کے مؤبد اور مؤقت ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، جمہور کی رائے یہی ہے کہ وقف مؤبد ہوگا، امام اعظم کے نزدیک وقف مؤقت بھی ہوسکتا ہے البتہ انہوں نے بعض مسائل مثلاً مساجد اور مقابر وغیرہ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اسی طرح اشیاء منقولہ، نقود اور منافع کے وقف میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے واقع ہوا ہے۔ امام مالک کے نزدیک جمہور فقہاء کے برعکس کوئی چیز کرایہ پر لے کر اس کی منفعت وقف کی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک وقف کے لئے عین کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔

سلطنت عثمانیہ کے آخری دور میں، اسی طرح مصر کے مملوکی عہد میں جب حکومت کمزور ہوئی تو بہت سے اوقاف ضائع ہوگئے، ان اوقاف کے ذریعہ کسی زمانہ میں مدارس اور شفاخانے اور بہت سے معاشی، سماجی، صحتی اور تعلیمی امور انجام پاتے تھے۔ مسلمان اتنے تہذیب یافتہ تھے کہ انہوں نے جانوروں پر بھی جائدادیں وقف کی تھیں۔ دمشق میں اس وقت جو میونسپل اسٹیڈیم ہے وہ کسی زمانہ میں مجاہدین کے بیمار اور بوڑھے گھوڑوں پر وقف تھا۔ اسے ''أرض المرجة'' کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد کے دور میں مسلمانوں کے اوقاف ضائع ہوگئے، اس کے اسباب کا علم مجھے ونشریسی کی کتاب ''المعيار المعرب في فتاوى علماء أفريقية والمغرب'' کے ذریعہ ہوا۔ یہاں افریقہ سے مراد تیونس ہے، اسے افریقہ اس وجہ سے کہتے تھے کہ وہ افریقہ کا باب الداخلہ تھا۔ اندلس کے تاجر پورے یورپ اور افریقہ میں اپنے تجارتی سامان برآمد کرتے تھے، یہ تجارتی سامان بندرگاہوں پر آتے تھے۔ اس زمانہ میں ان پر کسٹم ڈیوٹیز لگائی جاتی تھیں، کبھی کبھی یہ ٹیکس سامان کی قیمت سے بڑھ جاتے تھے، تاجروں نے اس سلسلہ میں غور کیا اور اپنے سردار شاہ بندر سے مشورہ کیا، اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ ایک فنڈ قائم کیا جائے اور اس کے ذمہ دار شاہ بندر ہوں گے۔ ہر تاجر اس میں ایک متعین فیس جمع کرے گا۔ اگر کوئی تاجر کسی حادثہ سے دوچار ہوجائے یا بھاری ٹیکسوں کی زد میں آجائے تو اس ٹیکس کی ادائیگی اس فنڈ سے کی جائے گی۔ اس فنڈ میں ترقی ہوئی اور اب انہوں نے اس کے مال میں سرمایہ کاری شروع کردی۔ اس فنڈ میں سرمایہ کاری کرنے والوں نے اندلس کے علماء سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے فتوی دیا کہ یہ وقف ہے۔ اس طرح کمرشیل انشورنس اور سرمایہ کاری انشورنس کا آغاز ہمارے آباء واجداد نے کیا، یورپ بہت بعد میں اس سے واقف ہوا، حالیہ دور میں یہی چیز ہمارے پاس دوبارہ مغرب سے آئی۔

سلطنت عثمانیہ کے زوال کے نتیجہ میں اوقاف کے زوال پذیر ہونے کی وجہ سے علماء نے اوقاف کے سلسلہ میں اجتہاد کے ذریعہ نئے احکام

[1] سکریٹری جنرل اوقاف پبلک فاؤنڈیشن حکومت کویت

مستنبط کئے جیسے أحکار اور اجارتین وغیرہ عقود کے احکام۔ وقف کے بیشتر احکام اجتہادی ہیں جو مصالح اور قواعد پر مبنی ہیں۔ کویت میں جب امانت عامہ برائے اوقاف کا قیام ہوا تو اس وقت اوقاف کی صورتحال یہ تھی کہ ایک طویل عرصہ تک کئی کئی سال کی آمدنی بمشکل چار فیصد ہو پاتی تھی یعنی سالانہ آمدنی صفر تھی، اوقاف کی عمارتیں تھیں، ان کا کرایہ آتا تھا اور اپنے شرعی مصارف میں خرچ ہو جاتا تھا، عمارتوں کے قدیم ہونے کی وجہ سے کرایہ دار بھی ان کو کرایہ پر لینے کی طرف راغب نہیں ہوتے تھے، وزارت اوقاف کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ان عمارتوں کو از سر نو تعمیر کراتی اور ان کو ترقی دیتی، ایسی صورت میں عالم اسلام کے دوسرے حصوں کی طرح ہم بھی ان عمارتوں کو نہایت معمولی کرایہ پر لگا دیتے تھے، حکمت مؤمن کا گمشدہ مال ہے۔

ہمارے دوست امریکہ اور برطانیہ گئے، وہاں انہوں نے ٹرسٹ کا نظام دیکھا، ٹرسٹ کا نظام وقف سے ملتا جلتا ہے، یہ اسلامی نظام سے ماخوذ ہے، یہ ٹرسٹ رفاہی ہوتا ہے، اس میں رقوم جمع کی جاتی ہیں اور تمام شعبوں میں ان کی سرمایہ کاری ہوتی ہے، مغرب کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں کیمبرج اور ہارورڈ وغیرہ سب وقف ہیں، البتہ انہیں تجارتی ذہن اور سرمایہ کاری کے نقطہ نظر سے چلایا جاتا ہے، اس میں غریب طلبہ کی امداد کا بھی فنڈ ہے۔ ان اوقاف کی آمدنیاں ان ہی جامعات میں صرف ہوتی ہیں، ہمارے دوستوں نے اس مغربی تجربہ سے فائدہ اٹھایا، وہ ملیشیا گئے، وہاں انہوں نے نہایت ترقی یافتہ پروجیکٹ دیکھا۔ اس کا نام ہے: ''تابونک حجی'' یہ ملیشیائی باشندوں کا ادارہ ہے، ملیشیا کے مسلمان باشندے انتہائی مفلوک الحال تھے، تجارت چینیوں کے ہاتھ میں تھی اور صنعت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں جن میں سے بیشتر غیر مسلم تھے، مسلمان یا تو حاکم تھے یا مزدور، ایک چھوٹا سا طبقہ اقتدار میں تھا اور بیشتر لوگ چینیوں کے ہاں مزدوری کرنے والے تھے، یہ حج کی آرزو رکھتے تھے مگر ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے، اس صورت میں انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم ہر اس شخص سے جو حج کی آرزو رکھتا ہو ماہانہ یا اس کی استطاعت کے مطابق ایک متعین قسط جمع کرائیں، پھر ان رقوم کو اکٹھا کر کے ایک فنڈ قائم کریں اور ان سے سرمایہ کاری کریں پھر ہر سال دس افراد کو، بیس افراد کو، سو آدمیوں کو حج کرائیں، جس کا نمبر آجائے وہ ان پیسوں سے حج کرے اور بقیہ پیسے بعد والوں کے لئے وقف رہیں۔

آج یہ ادارہ ''تابونک حجی'' ملیشیا کا سب سے بڑا اقتصادی ادارہ ہے، بڑی بڑی کمپنیاں چلاتا ہے، بہت سی کمپنیوں مین شراکت دار ہے، ملیشیا میں اس نے متعدد اسلامی بینک قائم کئے ہیں اور اپنے ملک کی ایک قابل لحاظ اقتصادی قوت بن کر ابھرا ہے۔ جو شخص بھی کوئی اسلامی کمپنی قائم کرنا چاہتا ہے وہ ''تابونک حجی'' کو اپنا شراکت دار بنانا چاہتا ہے۔

یہ سوچ کویت منتقل ہوئی، جب دوستوں نے ان دو تجربات ایک اسلامی اور ایک مغربی کی روشنی میں اموال وقف کو فروغ دینے کے لئے ایک ادارہ قائم کرنے پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ وقف کے بیشتر اموال تعمیر نو اور استبدال کے متقاضی ہیں۔ ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ فقہاء دو انتہاؤں پر ہیں: ایک انتہا یہ ہے کہ وقف کا استبدال کسی حال میں جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر وقف کوئی عمارت ہو اور وہ منہدم ہو جائے، قابل استعمال نہ رہے تو اسے بیچنا جائز نہ ہوگا۔ وہ اسی حال میں چھوڑ دی جائے گی، نہیں معلوم کہ کب اور کون اس کی از سر نو تعمیر کرے گا۔ اس رائے کی وجہ سے بہت سے اوقاف ضائع ہو گئے۔ اس کے برعکس بعض فقہاء (حنابلہ) کی رائے یہ ہے کہ اگر وقف کی کوئی چیز یہاں تک کہ مسجد بھی قابل استفادہ نہ رہ جائے یا منہدم ہو جائے تو اسے بیچ کر اس کی قیمت کسی دوسری جگہ میں موجود کسی مسجد میں صرف کی جاسکتی ہے، بلکہ بعض علماء حنابلہ جیسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن قاضی الجبل کی رائے یہ ہے کہ ایک کم فائدہ وقف کو دوسرے زیادہ نفع والے اور بہتر وقف سے بدلنا بھی جائز ہے، اس بات کا تعین کہ زیادہ نفع کس وقف میں ہے یا تو قاضی کے مشورہ سے وقف کا متولی کرے گا یا یہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہوگا۔ استبدال کا جواز علی الاطلاق نہیں ہے ورنہ وقف ایک کھلواڑ بن جائے گا۔

اس سلسلہ میں مناسب طریقہ کار اختیار نہ کرنے ہی کی وجہ سے اردن، فلسطین اور ہندوستان کے بہت سے اوقاف ضائع ہو گئے، فلسطین کے بہت سے مقدسات کی دیکھ ریکھ کے لئے وہاں کی وزارت اوقاف اور اسلامی بینک کے درمیان تعاون کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مقصد کے لئے مقارضہ یا مضاربہ بانڈز کا طریقہ اختیار کیا گیا جو اصلاً اگرچہ تجارت کے ساتھ خاص ہے مگر بہت سے فقہی اجتہادات کی رو سے غیر تجارتی معاملات میں بھی درست ہے۔

ہم لوگ ہمیشہ اپنی اکیڈمیوں، اداروں، دارالافتاءات یہاں تک کہ اسلامی کمپنیوں کے شرعی بورڈس میں کسی ایک مسلک کی پابندی نہیں کرتے، ہم جملہ اسلامی مسالک سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کے اجتہادات کے دائرہ سے نہیں نکلتے، ہم ان مسالک اور اجتہادات سے زمان ومکان کے مناسب حال آراء کو لے لیتے ہیں، بشرطیکہ وہ نص صریح سے متصادم نہ ہوں، نص صریح میں تاویل کا امکان نہیں ہوتا اور ایسی نص کبھی بھی کسی اصولی یا فقہی قاعدہ سے متصادم نہیں ہوسکتی ہے۔

الحمدللہ ہم نے محسوس کیا کہ اس طریق کار سے اوقاف کو بہت ترقی دی جاسکتی ہے، ہندوستان، فلسطین اور اردن کے بہت سے وہ اوقاف جو تعمیر نو یا سرمایہ کاری کے متقاضی ہیں، آئی ڈی بی وغیرہ کے تعاون سے ان کے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے مقارضہ بانڈز کی صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے۔ ایسی صورت میں وزارت اوقاف یا اوقاف مینجمنٹ کی حیثیت مضارب کی ہوگی، یہی ادارہ لوگوں سے مال اکٹھا کرے گا اور اس کے سلسلہ میں بانڈز جاری کرے گا، یہ بانڈز ایسے ہی ہوں گے جیسے کمپنی کے شیئرز۔ اگر نقود کی صورت میں ہوں گے تو ان پر بیع صرف کے احکام منطبق ہوں گے اور اگر دیون کی صورت میں ہوں تو ان میں دین کے احکام جاری ہوں گے۔ اگر نقود اور دیون کا مجموعہ ہوں گے تو حکم میں اعتبار غالب حصہ کا ہوگا۔ ان اموال سے ہم اوقاف کو فروغ دے سکتے ہیں، ایسی آمدنیوں کا ایک حصہ بانڈز کے مالکان کو ملے گا۔ ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ بانڈز کے مالکان اپنے بانڈز فروخت کرنا چاہیں اور وقف انہیں خرید لے۔ اس طرح وقف کے حصص بڑھ جائیں گے اور ان سے مزید سرمایہ کاری کی جاسکے گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وقف کی اصل پوزیشن بحال ہوجائے گی اور شرکاء اپنے اپنے منافع لے کر سرمایہ کاری سے علاحدہ ہونا چاہیں تو علاحدہ ہوسکیں گے۔

اس وقت وزارت اوقاف کویت نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اس کے پاس تقریباً ایک سو ساٹھ ملین کویتی دینار کے برابر اثاثہ جات اور نقد رقوم ہیں۔ کوئی بھی شخص اگر کوئی اسلامی کمپنی قائم کرنا چاہتا ہے تو اس کو شراکت کی دعوت دیتا ہے۔ ہم کمپنیوں میں شامل ہوتے ہیں، کبھی کبھی ہم مینجمنٹ میں بھی شریک ہوتے ہیں، کمپنیاں قائم کرتے ہیں اور دوسری کمپنیوں پر اپنی شرطیں عائد کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں، اس طرح وقف ان کمپنیوں میں سب سے مضبوط شراکت دار ہوتا ہے۔ اس سے وقف کو ایک ایسی آمدنی حاصل ہوتی ہے جو عمارت کے علاوہ ہوتی ہے، الحمدللہ ہم نے اس سلسلے میں علماء اور فقہی اکیڈمیوں کے فتاوی حاصل کرلئے ہیں کہ اگر کسی وقف کی آمدنی اس کی ضروریات سے زائد ہو تو اسے یوں ہی چھوڑنے کے بجائے اس سے سرمایہ کاری کی جائے، ان کو یوں ہی رکھ چھوڑنے سے ان کی قوت خرید میں کمی آتی جائے گی اور وقف کا نقصان ہوگا۔ ہم ان رقوم سے کمپنیوں کے شیئرز خریدلیں گے۔ کیونکہ مرکزی بینک کی نظر میں کمپنیوں کے شیئرز نقد رقوم کے مثل ہیں۔ ہم اسے کسی وقت بھی فروخت کرسکتے ہیں اور ان کی اچھی سے اچھی قیمت ہمیں مل سکتی ہے، اس طریقہ کار سے نہ صرف اصل سرمایہ آمدنی میں اضافہ کا باعث ہے بلکہ ایک آمدنی خود دوسری آمدنی کے حصول کا قوی ذریعہ ہے۔ اس طرح اللہ کا شکر ہے کہ اوقاف کی قدرت وقیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

اوقاف کو فروغ دینے کے لئے وسیع تناظر میں نئے طریقوں پر ہمیں غور وفکر کرتے رہنا چاہئے۔ ہم نے عقد انتفاع کا بھی استعمال کیا، اس سے اسلامی کمپنیوں کو بڑے منافع حاصل ہوئے۔ ہمیں تعصب سے بچتے ہوئے اوقاف کے نئے مسائل کو فقہی اصولوں کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس وقت نوجوانوں کی شادی کے لئے بھی اوقاف کا قیام ہونا چاہئے، اگر ہندوستان کے اوقاف کی سرمایہ کاری باہر کے ملکوں میں براہ راست ممکن نہ ہو تو مختلف رفاہی اور فلاحی تنظیموں مثلاً جمعیۃ الشیخ عبداللہ النوری وغیرہ کے توسط سے یہ کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ تنظیمیں سرمایہ کاری کریں گی اور آپ کے منافع آپ کو ادا کریں گی۔ اگر قانون سماجی مفادات کا تحفظ نہ کررہا ہو تو اس کے خلاف حیلہ اختیار کرنا شریعت کے منافی نہیں ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہم اسلام کے مصالح کے لئے باہم تعاون کریں گے۔

[عربی سے ترجمہ: محمد بشام الحق ندوی]

☆☆☆
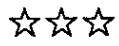
نئے اوقاف کا قیام: مسائل اور عملی تدابیر

مولانا بدر الحسن القاسمی، کویت

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اوقاف کے مسائل سے خاص دلچسپی لی ہے۔ اکیڈمی کی طرف سے اس موضوع پر ایک مستقل سمینار بھی منعقد ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں دو کتابیں بھی ایک عربی میں اور ایک اردو میں طبع کی گئی ہیں۔ اسی طرح اکیڈمی نے وقف کو فروغ دینے سے متعلق مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مرحوم کا ایک پمفلٹ بھی شائع کیا ہے۔

یہ وقت اوقاف سے متعلق فقہی احکام پر بحث ومناقشہ کا نہیں ہے۔ اس موقع پر چونکہ اوقاف پبلک فاؤنڈیشن حکومت کویت کے عزت مآب سکریٹری جنرل ہمارے درمیان موجود ہیں اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے گا اوقاف کو فروغ دینے سے متعلق ہم ان کے تجربات سے استفادہ کرنا چاہیں گے۔ محترم سکریٹری جنرل اس فن کے ماہر ہیں اور اس سلسلے میں ان کی رائے کا وزن ہے۔

اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار اور مشہور اسلامی سیاحوں کے سفرنامے مثلاً سفرنامہ ابن بطوطہ اور سفرنامہ ابن جبیر وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی میں مسلم دنیا کی علمی تحریک کو فروغ دینے میں اوقاف غیر معمولی طور پر مؤثر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اوقاف میں اتنا تنوع رہا ہے اور دوسروں کو آرام پہنچانے کا اتنا انتظام واہتمام رہا ہے کہ مغرب اپنی تمام تر ترقیات کے باوجود اس سطح تک نہیں آسکا ہے۔ مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے لئے اوقاف تو مشہور بات ہے لیکن گمشدہ کتوں کی دیکھ ریکھ کے لئے یا بلیوں کو کھانا کھلانے کے لئے یا گھروں میں کام کرنے والے ان خادموں کے لئے اوقاف جن سے کام کے دوران غلطی سے برتن ٹوٹ جائیں اور مالک کی طرف سے غصہ میں انتقامی کاروائی کا اندیشہ ہو اپنی نظیر آپ ہیں۔ اس قسم کے اوقاف ایسی مشکل گھڑی میں ان بے سہارا لوگوں کی دل داری کے لئے کئے جاتے تھے۔ مغرب عربی کے ایک عالم نے دو جلدوں میں وقف کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اوقاف کی ان متنوع اقسام سے متعلق بہت سی معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مصنفین نے اسپتالوں سے متعلق کئے گئے اوقاف پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کا معیار اتنا ترقی کر گیا تھا کہ مریض کے شفایاب ہوجانے کے بعد اس کے لئے مخصوص کھانوں کے علاوہ اس کو ذہنی و نفسیاتی آرام پہنچانے کے لئے نغموں اور ترانوں کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ اسی طرح خلیفہ مامون کے عہد کی تمام علمی درسگاہیں اوقاف کے زیر انتظام تھیں اور اس وقت کی عالم اسلام کی تمام علمی وفکری، ثقافتی اور تہذیبی ترقیات اوقاف کی مرہون منت تھیں۔ اس کے بعد کے دور میں اوقاف زوال پذیر ہو گئے۔

دور حاضر میں متولی حضرات اور حکومتوں نے ان کا ناجائز استعمال کیا۔ ہندوستان پر آٹھ سو سال تک اسلام کی حکمرانی رہی۔ یہاں کی تمام ریاستوں بشمول حیدرآباد و دہلی کے شہروں اور دیہاتوں میں اوقاف کی بڑی بڑی جائدادیں موجود ہیں۔ ان تمام پر یا تو مختلف حکومتوں نے یا ان کے متولیوں نے جو بدقسمتی سے مسلمان ہی ہیں، غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ فقہاء کی تعبیر کے مطابق "ظَلَمَة" اور "طُغَاة" ہیں۔

سروے رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ریاستوں میں بیس فیصد، بعض میں ستر فیصد اور بعض میں پچھتر فیصد وقفی جائدادیں ہیں۔ صرف دہلی میں ایک ہزار چھیالیس اور بہار میں بائیس ہزار اسی رجسٹرڈ اوقاف ہیں لیکن وقف بورڈ کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ ان کے سالانہ اخراجات ہی پورے کر سکے۔ حکومت ان اوقاف کا استعمال کرتی ہے اور اس کے سامنے اوقاف کی جائدادیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اصل مسئلہ ان کی بقاء وتحفظ کا ہے۔

ماضی قریب میں عالم اسلام کی حکومتوں اور اداروں نے اوقاف سے دلچسپی لینی شروع کی اور اس سلسلہ میں وزارت اوقاف کویت کو سب پر سبقت حاصل ہے۔ سب نے اس بات کی شہادت دی کہ حکومت کویت نے اپنی نوعیت کا بے نظیر تجربہ کیا۔ یہ تجربہ دوسرے ممالک کے اوقاف کے لئے سنگ میل ثابت ہوا۔ بطور خاص اس زمانہ میں اوقاف کو کیسے فروغ دیا جائے؟ ان کی تعداد میں اضافہ کے لئے کیا کیا جائے؟ اس وقت موجود اوقاف کا تحفظ کیسے کیا جائے؟ ان تمام

پہلوؤں پر کویت میں اور کویت سے باہر بھی متعدد سمینار منعقد کرائے گئے، استبدال وقف کی جو بحثیں قدیم فقہاء نے کی تھیں ان سے استفادہ کیا گیا اور اوقاف کی سرمایہ کاری کے متنوع طریقے اختیار کئے گئے۔ اس وقت ہمارے پاس ان تمام مسائل سے متعلق وافر علمی ذخیرہ جس کی ہمیں بھارت میں ضرورت پڑ سکتی ہے، مدون صورت میں موجود ہے۔

اس موضوع پر ایک مستقل سمینار ہوجانے کے باوجود اس کو زیر بحث لانے کی ضرورت اسی پہلو سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور ان کی ضروریات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس لحاظ سے اگر بھارت میں موجود بے پناہ اوقاف کی سرمایہ کاری کی جائے تو ان کے ذریعہ صرف مسلمانوں کی ضروریات ہی پوری نہیں ہوں گی بلکہ ایک پوری حکومت چلائی جاسکتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے کویت میں اوقاف کے مسائل سے متعلق ایک سمینار منعقد ہوا تھا، اس میں "وقف مرہون" کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا، بیشتر فقہاء مثلاً شیخ مختار السلامی، شیخ صدیق محمد الامین الضریر وغیرہ کی رائے یہ تھی کہ ایسا وقف ضائع سمجھا جائے گا اور اسے ترک کردیا جائے گا، لیکن میری رائے یہ تھی کہ اسے بھارت کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں بھارت میں ایسی مثال موجود ہے کہ ایک وقف کی قیمت ایک ملین کویتی دینار ہے لیکن وہ کسی ہندو کے پاس ایک لاکھ یا اس سے بھی کم قیمت میں بطور رہن ہے تو کیا ایسی صورت میں ہم اسے چھوڑ دیں گے اور اس کے حصول کی کوشش نہیں کریں گے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کویت کی طرز پر ہمارے ہاں بھی۔ نئے اوقاف کا قیام ہو اور مختلف "صنادیق" (فنڈز) قائم کئے جائیں، جیسے ٹکنالوجی فنڈ، علمی فنڈ، قرآن فنڈ، بیواؤں اور یتیموں سے متعلق فنڈ، قیدیوں، گم شدہ افراد اور شہداء کے خاندانوں سے متعلق مخصوص فنڈ وغیرہ۔ جب ہماری تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ کتوں اور بلیوں وغیرہ کے لئے اوقاف ہوتے تھے تو یتیموں، بیواؤں اور بیماروں کے لئے تو ان کی اشد ضرورت ہے۔

اس سمینار میں ایسے فنڈ کے قیام سے متعلق بھی فیصلے کئے جانے کی ضرورت ہے جن کے ذریعہ اوقاف کی اراضی اور جائدادوں کی بازیابی کے لئے قانونی چارہ جوئی کے اخراجات پورے کئے جاسکیں، خواہ یہ مقدمے قابض حکومت سے لڑنے پڑیں یا مختلف غاصب گروپوں سے۔

آخر میں میں ایک تجویز پیش کرنا چاہوں گا، خوش قسمتی سے اوقاف پبلک فاؤنڈیشن کے سکریٹری جنرل موجود ہیں، وہ تجویز یہ ہے کہ ہمارے علماء جو اپنے مدارس اور علمی مراکز کے لئے کویت اور دیگر عرب ممالک کا سفر کرتے ہیں اور تاجروں اور سرمایہ داروں کے دفاتر اور رہائش گاہوں پر لائن لگا کر کھڑے ہوتے ہیں، یہ ان کے مقام ومنصب کے شایان شان نہیں ہے، کبھی کبھی بہت ہی ناخوش گوار صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح گیارہ ستمبر کے بعد علمی مراکز ومدارس کی امداد وتعاون پر بعض قسم کی پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں۔ امدادی کمیٹیوں اور تنظیموں پر اس سلسلے میں سخت دباؤ بھی ہے۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میری تجویز یہ ہے کہ اس طرح چندوں کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے متعدد مدارس ومراکز کے لئے اوقاف کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس کے لئے یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ متعین رقوم بطور وقف ان مدارس کے نام پر اوقاف پبلک فاؤنڈیشن کویت یا اس طرح کے اداروں کو سرمایہ کاری کے لئے دے دی جائیں اور ان کی آمدنی سے یہ مدارس ومراکز اپنے اخراجات پورے کریں۔ اس طرح کا ایک معاہدہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی اپنی زیر نگرانی قائم اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) اور اوقاف پبلک فاؤنڈیشن کویت کے درمیان اور ایک معاہدہ "المعہد العالی للقضاء والإفتاء" پٹنہ اور اوقاف پبلک فاؤنڈیشن کویت کے درمیان طے پایا تھا۔

میرا مقصد موجودہ قوانین وضوابط کے تحت نئے اوقاف کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

[عربی سے ترجمہ: محمد ہشام الحق ندوی]

☆☆☆

وقف نقدی

ہماری موجودہ زندگی میں وقف کے کردار کا احیاء

ڈاکٹر شوقی احمد دنیا[1]

اسلامی شریعت میں جن خیر کے کاموں پر ابھارا گیا ہے ان میں وقف کو ایک بڑا مقام حاصل ہے، یہ خیر وفلاح کے کاموں میں انفاق مال کے اہم اور نمایاں طریقوں میں شمار ہوتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو عمدہ ترین مال میں سے خرچ کرنے کا طریقہ یہی تلقین کیا کہ وہ اسے وقف کردیں۔ اسی افضلیت کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں سے صاحب استطاعت افراد میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جس نے وقف نہ کیا ہو (ابن قدامہ، المغنی مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، الریاض ۱۴۰۱ھ- ۵/ ۵۹۹، القرافی، الذخیرۃ ۶/ ۳۲۳، دار الغرب الاسلامی بیروت ۱۹۹۴)، اسی طرح کوئی بھی عہد اور کوئی بھی مسلم مملکت خیر کے کاموں میں وقف کرنے والے سینکڑوں اصحاب خیر سے خالی نہیں رہی۔

وقف کی اسی اہمیت کی بنا پر معاش، اجتماع، ثقافت اور سیاست ہر پیمانہ پر اس کے زبردست اثرات پڑے، بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ کوئی اسلامی ادارہ اتنا طاقت ور اور اپنے مختلف میدانوں میں اثرات کے لحاظ سے اتنا موثر نہ تھا جتنا وقف اور اس میں عروج وزوال کے تمام ادوار یکساں رہے تو مبالغہ نہ ہوگا (ملاحظہ ہو:

شوقي دنيا، أثر الوقف في إنجاز التنمية الشاملة، مجلة البحوث الفقهية المعاصرة، الرياض، العدد (۲۴) ۱۴۱۵ھ، حلقة إدارة وتثمير الممتلكات الوقفية، المعهد الإسلامي للبحوث والتدريب جدة ۱۴۱۰ھ، أعمال ندوة إحياء دورالوقف في الدول الإسلامية، رابطة الجامعات الإسلامية بورسعيد ۱۹۹۸، ڈاکٹر مصطفى السباعي: من روائع حضارتنا، المكتب الإسلامي بيروت، أعمال ندوة الوقف، الجمعية الخيرية الإسلامية، قاهره، فروری ۲۰۰۰ء)۔

آج کے موجودہ حالات کے پیش نظر وقف کی ضرورت زیادہ بڑھ گئی ہے، کیونکہ افراد اور اجتماعیات کی سطح پر بہت سی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں وقف بنیادی رول ادا کرسکتا ہے اور باوجود اس کے کہ ماضی میں وقف نے اسلامی معاشرہ کی تشکیل وارتقاء میں بڑا کردار ادا کیا ہے آج پھر اسلامی معاشرہ کو اوپر اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ وقف اپنا کردار نبھائے۔ موجودہ صورت حال میں وقف انتہائی تنزلی، کمزوری اور اضمحلال کا شکار ہے اور شدید بحران سے گذر رہا ہے، حالانکہ اس کی ضرورت ہے اور اس میں امکانات بھی بہت ہیں۔ یہ ہماری معاصر مسلم دنیا کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ زندگی میں وقف کا اہم کردار کیا ہے؟ وہ اسباب وعوامل کیا ہیں جن کی وجہ سے وقف تنزلی اور کمزوری کا شکار ہے اور نتیجتاً اپنا مطلوبہ کردار ادا نہیں کررہا، ان عوامل کا علاج کیسے ہوگا، ان پر غلبہ کیسے پایا جائے کہ وقف صحت مند ہوجائے اور قوت کے ساتھ اپنا فعال کردار ادا کرے؟ اس مقالہ میں ان ہی سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی، بعض سوالوں کا جواب مجمل اور سرسری ہوگا، بعض میں صرف خاص مسائل کی طرف اشارہ کردیا جائے گا اور بعض کا مبسوط ومفصل جواب دیا جائے گا اور بعض میں اوسط درجہ کی تفصیل دی جائے گی۔

یاد رہے کہ مقالہ کا مرکزی عنوان "وقف نقدی" ہے، بقیہ مسائل سے تعرض تمہید وتکمیل کے بطور ہوگا۔ مرکزی موضوع مذکورہ تینوں سوالات اور ان کے جوابات کے بیچ بھی چھایا رہے گا۔

ان تینوں سوالوں اور ان کے جواب کے پیش نظر مقالہ کا خاکہ دو قسموں پر مشتمل ہوگا:

---

[1] صدر شعبہ معاشیات، کامرس کالج، جامعۃ الازہر۔

پہلی قسم میں وقف کی موجودہ ناگفتہ بہ صورت حال اور اس کی شدید ضرورت پر۔

اور دوسری قسم میں وقف نقدی، اس کے مسائل، سرمایہ کاری، مینجمنٹ اور اثرات پر بحث ہوگی۔

پہلی قسم: وقف کی کمزوری اور اس کی ترقی کی شدید ضرورت

۱-موجودہ دور میں وقف کی کمزوری

وقف موجودہ عالم اسلامی میں کس قدر کمزور پڑ گیا ہے اس کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں، بہت سی چیزیں ہیں جو اس کی دلیل ہیں، مثلاً اموال موقوفہ کی مقدار اور قومی سرمایہ میں ان کے تناسب، ان کی سالانہ افزونی (اگر وہ ہے) کے اوسط، قومی آمدنی کی شرح نمو سے اس کے تقابل، اموال موقوفہ کے منافع اور آمدنی کی مقدار اور قومی آمدنی میں اس کے تناسب وغیرہ سے اس کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

فطری بات ہے کہ اس بات کے تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ کے لئے مستقل ریسرچ ورک کی ضرورت ہے، یہاں تو ہم محض اس سلسلہ میں اشارہ ہی سے کام لیں گے جس سے معلوم ہوگا کہ معاصر مسلم دنیا میں اوقاف کس قدر گراوٹ کا شکار ہیں، بعض ممالک میں اوقاف کی بڑھوتری وترقی سے اس کلیہ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، ان میں کویت سرفہرست ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں اوقاف انحطاط کا شکار ہیں تو اس سے مراد اس فرق کو بتانا ہوتا ہے جو ماضی کے اوقاف اور آج کے اوقاف میں ہے، ظاہر ہے کہ یہ فرق بہت بڑا ہے، دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اوقاف کی موجودہ حالت سامنے آئے اور اس میں کیا تبدیلیاں ہوسکتی ہیں، یہ معلوم ہو۔

۲-موجودہ دور میں اوقاف کی تنزلی کے عوامل

ہر صورت حال کے کچھ اسباب وعلل ہوتے ہیں۔ اوقاف کی اس حالت کے اسباب کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے مستقل ریسرچ ورک کی ضرورت ہے، کیونکہ اسباب وعوامل متعدد بھی ہیں، پیچیدہ اور پھیلے ہوئے بھی اور ان کا مزاج بھی الگ الگ ہے۔

اس مقالہ میں ان سب اسباب کو تو گنایا نہیں جا سکتا نہ ہی اس کا یہ موضوع ہے، البتہ ان کے بعض ابھرے ہوئے پہلوؤں کی طرف اشارہ اور ان پر سرسری نظر ضرور ڈالی جائے گی۔ اگرچہ یہ اسباب وعوامل متعدد اور متنوع ہیں لیکن ان کو خاص خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

مثلاً: بہتیرے لوگوں کے نزدیک اوقاف کا فقہی پہلو مبہم ہے، جن میں خاصے پڑھے لکھے اور فقہ کے لوگ بھی ہیں، اوقاف کے فقہی احکام کے بارے میں لوگوں میں عجیب تصورات پھیلے ہوئے ہیں جو فقہی اعتبار سے زیادہ تر غلط ہیں، ان غلط فہمیوں کے باعث اوقاف میں بڑی کمزوری اور انحطاط آیا، تحلیل وتجزیہ کے بجائے بعض موٹی چیزوں کا ذکر کیا جارہا ہے، کیونکہ تجزیہ سے مقالہ اپنے اصل موضوع سے ہٹ جائے گا۔

(الف) یہ مشہور ہوگیا ہے کہ صرف اموال ثابتہ یعنی اراضی اور جائدادوں ہی کا وقف ہوسکتا ہے، اموال منقولہ کا نہیں، اس بنا پر نقد روپیہ تو بدرجہ اولی وقف کا محل نہیں رہتا، حالانکہ فقہی طور پر یہ رائے درست نہیں ہے، کیونکہ تمام اسلامی فقہی مسالک اس پر متفق ہیں کہ اموال ثابتہ وقف کا محل ہیں اور بہت سے فقہی مذاہب اور بعض مذاہب کے کچھ علماء اموال منقولہ کے وقف کو جائز قرار دیتے ہیں بلکہ صراحت کے ساتھ نقود کے وقف کو اور حتی کہ منافع کو بھی ایک قسم کا مال قرار دے کر اس کے وقف کو جائز ٹھہراتے ہیں (الدسوقی، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۴/۷۶، دار احیاء الکتب العربیہ، القاہرہ، الرملی نہایۃ المحتاج ۵/۳۶۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، النووی، روضۃ الطالبین ۴/۳۸۷، دار الکتب العلمیۃ بیروت) نتیجہ یہ نکلا کہ جو بات معروف ہے وہ فقہ کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

(ب) یہ بھی مشہور ہے کہ وقف ہمیشہ کے لئے ہوگا، وقتی طور پر نہیں، حالانکہ فقہی طور پر یہ بھی غلط ہے، صحیح بات یہ ہے کہ یہ رائے بعض مسالک کی ہے، جبکہ بعض دوسرے مسالک وقتی وقف کی اجازت دیتے ہیں (ایضا الدسوقی ۴/۸۷، ابن شاش، عقد الجواہر الثمینہ ۳/۲۷، دار الغرب الاسلامی، بیروت ۱۴۱۵ھ، ابن قدامہ، المغنی ۵/۶۲۳، الماوردی ۹/۳۸۱، الحاوی الکبیر، المکتبۃ التجاریہ بمکۃ المکرمہ ۱۴۱۴ھ، احمد بن یحی المرتضی، عیون الازہار ۳/۶۰، دار الکتاب اللبنانی، بیروت ۱۹۷۵ء)۔

(ج) یہ بھی عام ہے کہ وقف لزوماً ہی ہوتا ہے، جواز نہیں، اسی لئے اس سے رجوع، یا اس کو معلق بنانا یا اس میں کوئی شرط وغیرہ لگانا جائز نہ ہوگا حالانکہ فقہ میں ان سب کی گنجائش موجود ہے (السرخسی، المبسوط ۱۲/۲۷، دار المعرفہ بیروت، ۱۹۸۹ء، اور اس کے بعد کے صفحات، ابن عابدین، رد المحتار ۴/۳۳۸، دار الفکر بیروت، ۱۹۷۹ء،

الدسوقی، حوالہ سابق، ۴؍ ۸۹، القرافی، الذخیرۃ ۶؍ ۳۲۶، دار الغرب الاسلامی، بیروت ۱۹۹۴ء، المہدی المرتضی، عیون الازہار، حوالہ سابق ۱؍ ۳۶۱)۔

(د) یہ بات بھی مشہور ہے کہ وقف ایک انفرادی عمل ہے، ایک شخص ایک موقوف علیہ کے لئے وقف کرسکتا ہے، حالانکہ فقہی طور پر جو بات صحیح ہے، وہ یہ ہے کہ واقف ایک بھی ہوسکتا ہے اور کئی بھی، اسی طرح موقوف علیہ ایک بھی ہوسکتا ہے اور کئی بھی، مختلف مذاہب کی متعدد کتابیں اس بات کو صراحت سے بیان کرتی ہیں (السرخسی، المبسوط، حوالہ سابق ۱۲؍ ۳۸، ابن قدامہ، المغنی ۵؍ ۶۳۳، سحنون، المدونۃ ۶؍ ۹۹ دار صادر، بیروت)۔

(ھ) اسی طرح یہ بھی عام ہے کہ وقف میں اموال موقوفہ یا موقوف علیہ جہات کے سلسلہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، حالانکہ بہت سے فقہاء اس کی اجازت دیتے ہیں کہ حالات کے لحاظ سے اوقاف کی حفاظت کی غرض سے اور وقف کے مقاصد کے لحاظ سے اس کی گنجائش موجود ہے بلکہ بعض مذاہب میں تو بہت ہی وسعت پائی جاتی ہے (المہدی المرتضی، حوالہ سابق، ۲؍ ۳۶۰، السرخسی، المبسوط ۱۲؍ ۴۱، ابن عابدین، حوالہ سابق ۴؍ ۳۸۴)۔

(و) اسی طرح یہ بھی معروف ہے کہ واقف اپنے وقف سے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں اٹھاسکتا، حالانکہ فقہ اس بات کی اجازت دیتی ہے (عبدالرحمن بن قاسم، مجموع فتاوی ابن تیمیہ، الریاض ۱۳۹۸، ۳۱؍ ۲۱۲، اور اس کے بعد کے صفحات، ابن قدامہ، حوالہ سابق ۵؍ ۶۳۳، ابن بیہ، اثر المصلحۃ فی الوقف، مجلۃ البحوث الفقہیہ المعاصرہ، الریاض شمارہ ۱۴۲۱، ۴۷ھ، ابن عابدین، حوالہ سابق ۴؍ ۳۸۴ اور اس کے بعد کے صفحات)۔

(ز) یہ بھی مشہور ہے کہ واقف کی شرطیں جو بھی ہوں ان کا احترام کیا جائے گا، اگر وہ معصیت پر مبنی نہ ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ کسی قاری کے کانوں میں یہ عبارت پڑی یا نہیں کہ "شرط الواقف کنص الشارع" حالانکہ فقہی طور پر صحیح یہ ہے کہ واقف کی شرطیں صحیح ہوں گی بشرطیکہ ایک طرف تو وہ شرع کے قواعد کے مطابق ہوں اور دوسری طرف شریعت کے مقاصد سے بھی ہم آہنگ ہوں، ورنہ ان کا اعتبار نہ ہوگا، فقہ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن میں واقفین کی شرطیں نہ صرف ختم کی جاتی ہیں بلکہ ان کو کالعدم کرنا واجب ہوجاتا ہے (محمد ابوزہرہ، محاضرات فی الوقف، دار الفکر العربی، قاہرہ ۱۹۷۱ء، ۶؍ ۱۳۶ اور اس کے بعد کے صفحات، ابن عابدین، حوالہ سابق ۴؍ ۳۸۷، الحطاب، مواہب الجلیل ۵؍ ۳۶، ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی ۳۱؍ ۴۳ اور اس کے بعد کے صفحات)۔

فقہ الاوقاف سے متعلق غلط طور پر رائج تصورات کے یہ چند نمونے دیئے گئے ہیں، حالانکہ فقہ الوقف اس سے بری ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کے فقہی پہلوؤں کے سلسلہ میں کچھ علمی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں اور اس پیچیدگی کا وقف پر منفی اثر پڑنا منطقی بات ہے، اسی لئے بہت سے اموال وقف کا محل نہیں ہوسکے، حالانکہ موجودہ دور میں ان کی بڑی اہمیت ہے، اراضی اور جائداد تو بہت سے لوگوں کے پاس نہیں ہیں لیکن نقد روپیہ تھوڑا بہت ہر ایک کے پاس ہوتا ہے، بعض لوگ اس لئے وقف نہیں کرتے کہ انہیں ابھی آمدنی کی ضرورت ہے یا مستقبل میں ہوسکتی ہے، تو مذکورہ بالا غلط تصورات کی وجہ سے وہ کلی یا جزئی طور پر وقف کرنے سے باز رہتے ہیں، کون ہے جو تنہا صحت، تعلیم، سکونت یا دین سے متعلق کوئی پروجیکٹ شروع کردے!! ایسے لوگ بہت ہی کم تعداد میں ہیں جبکہ اکثریت کے لئے یہ ممکن نہیں، ہاں مشترکہ طور پر ممکن ہے، لیکن انفرادی وقف کا تصور لوگوں کو ایسا کرنے سے روک دیتا ہے، اسی طرح یہ خیال کہ وقف کو بدلا نہیں جاسکتا، چاہے حالات جیسے بھی ہوں، کتنے ہی اوقاف کے ویران اور برباد ہونے کا سبب بنا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگ وقف کرنے سے گریز کرتے ہیں، کیونکہ اوقاف کی بدحالی ان کی نظر میں ہے، اسی لئے واقف کی غرض فوت ہوگئی اور واقف کی شرطوں کو ان کی نوعیت سے قطع نظر لازما ماننے کا خیال، بہت سی حکومتوں کو اوقاف کی تنظیم، ان کے لئے قانون بنانے اور ان میں سے بعض پر پابندیاں عائد کرنے کی صورت میں ظالمانہ مداخلت کے لئے جواز عطا کرتا ہے، دوسری طرف واقف کی شرط کے باعث بہت سے اوقاف زوال پذیر ہوجاتے ہیں۔

واقف کی شرطوں کی مناسب تنفیذ و تطبیق ایک اہم معاملہ ہے اور اس کے باعث بہت سے لوگ وقف کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں، فقہ میں اس پہلو کی رعایت کی گئی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ شرطیں واقف کے مفاد، موقوف علیہ کے مفاد اور سماج کے مفاد کو پورا کرنے والی اور مناسب و معقول ہوں، یعنی مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس کا صحیح شعور ہو اور اجتماعیت یا مملکت کی مداخلت ضرورت پڑنے پر مناسب طریقہ پر ہو، لوگوں میں منافع وقف کے جائز ہونے کے شعور کا مناسب حد تک نہ پایا جانا ہی، وقف کی فعالیت اور اس کے دائرہ کی وسعت کے بڑی حد تک متاثر ہونے کا سبب ہے، حالانکہ فقہ مالکی میں اس کی صراحت موجود ہے اور منافع بھی مال ہوتے ہیں اور اعیان کی طرح باقی رہتے ہیں، اعیان سے کم ان کی اہمیت نہیں ہوتی، بلکہ اعیان میں ان کے پائے جانے ہی سے اعیان کو اقتصادی قیمت حاصل ہوتی ہے۔

امور وقف کی انجام دہی کی عصری شکلیں یعنی انتظام، سرمایہ کاری اور دیکھ ریکھ وغیرہ کا نظام نہیں ہے یا کم از کم عام لوگ انہیں نہیں جانتے، جبکہ موجودہ دور میں

زمانہ کے حالات کے مطابق جدید اور عصری طریقوں کی شدید ضرورت ہے۔ بہت سے اسلامی ملکوں میں ایسے قانون موجود ہیں جو لوگوں کو وقف کرنے سے روک دیتے ہیں۔

اس طویل اقتباس سے جو جوہری نتائج نکلتے ہیں، وہ یہ کہ فقہ الاوقاف میں کافی لچک ہے جو اوقاف کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے اور آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہے، خاص طور پر جب ہم وقف کی دینی اہمیت کو پیش نظر رکھیں اور کیا یہ محض مذہبی و تعبدی عمل ہے یا ایسا دینی عمل جو معقول ہے اور جس کی ایک غرض و مقصد ہے، وقف اور موقوف علیہ کو فائدہ پہنچانا اس کا مقصد ہے یعنی حالات کے لحاظ سے اس میں جمود بھی آسکتا ہے اور حالات و ظروف کے لحاظ سے تبدیلی و ترقی بھی ہوسکتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں کیا شریعت مصلحت معتبرہ کو وقف کی پالیسی سازی میں کچھ دخل ہوگا، اگر ہم جواب ہاں میں دیں تو ایک بات ہوگی اور فقہاء کے مطابق ہوگی، شیخ عبداللہ بن بیہ (حوالہ سابق) نے جو تحلیل و تجزیہ کیا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ وقف کے کام میں زیادہ سے زیادہ لچک ہونی چاہئے تاکہ ان کو حالات کے مطابق ڈھالا جاسکے۔

۳- موجودہ دور میں اوقاف کے فعال کردار کی شدید ضرورت

گزشتہ سطور میں ہم نے یہ بیان کیا کہ اوقاف اس وقت کمزوری اور پژمردگی کا شکار ہیں اور اگر بعض فکری و عملی کام کئے جائیں تو ان کے کردار کا احیاء ممکن ہے، اس طرح کی کوششوں کے جواز میں چند باتیں کہی جاسکتی ہیں، مثلاً:

۱- موجودہ دور میں مملکت کا سماجی اور معاشی کردار کمزور ہوگیا ہے، جدید رجحانات نے قومی معاشیات کو پرائیوٹ سیکٹر میں مرکوز کردیا ہے، سول اور پرائیوٹ اداروں اور افراد کے ہاتھ پوری اجتماعی زندگی آگئی ہے، اسی لئے ممکن ہے کہ وقف کا ادارہ افراد و اجتماعیات کی بہت سی اقتصادی و سماجی ضرورتوں کی تکمیل میں ایک زبردست رول ادا کرے۔

۲- اسی میں یہ اضافہ کیجئے کہ آج مذکورالصدر رجحانات کے نتیجہ میں ریاست کے مالی وسائل بڑی حد تک محدود ہوگئے ہیں، کیونکہ اسے بہت سے وہ ٹیکس نہیں ملتے جو پہلے ملا کرتے تھے، نتیجہ یہ ہے کہ آج بہت سی اقتصادی و اجتماعی ضرورتیں حکومت کے بجٹ سے باہر پوری ہوتی ہیں، جنہیں بنیادی طور پر سول سیکٹر اور رضاکارانہ طور پر پرائیوٹ اقتصادی سیکٹر ہی پورا کرسکتے ہیں، وقف اپنی شکل اور مالیاتی طریقہ کار سے بہت سی ضرورتیں پوری کرسکتا ہے۔

۳- موجودہ صورت حال میں کئی حکومتوں کو اپنی مالی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے باہر سے مدد لینی پڑتی ہے، اس قسم کی مالی امداد کے نقصانات بالکل واضح ہیں۔

۴- موجودہ دور میں عالم اسلام تعلیم اور علمی تحقیق میں ایک زبردست پچھڑے پن کی حالت میں ہے، اس کے لئے مسلم حکومتیں جو بجٹ بناتی ہیں وہ بہت ہی معمولی ہیں، جس سے اس کی تنزلی میں روز بروز اضافہ ہی ہورہا ہے، یہ زوال اقتصادی بھی ہے اور علمی اور سائنسی بھی۔ معاصر اقوام کی ترقی کی اساسیات میں علم و معرفت کی اقتصادیات کو جنہیں جدید اقتصادیات کہا جاتا ہے، اول درجہ دیا جانا مشہور و معروف بات ہے۔ عمومی آمدنی کی کمی کی صورت میں مسلم حکومتیں ان اجتماعی اداروں اور مراکز کو سرمایہ کیسے فراہم کریں؟ کیا اس کام کو پرائیوٹ سیکٹر کے لئے چھوڑ دیا جائے جو اصلاً زیادہ سے زیادہ منافع سمیٹنے کے لئے ایسے پروجیکٹس پر توجہ مرکوز رکھتا ہے جن کے ذریعہ وہ منافع حاصل ہوسکیں، ظاہر ہے کہ اس بات سے حقیقی سائنٹفک ریسرچ و تحقیق اور تعلیم کے ادارے راضی نہ ہوں گے، کیا ان چیزوں کو خارجی مالیاتی اداروں پر چھوڑ دیا جائے جن کے مقاصد اور محرکات مشتبہ ہیں یا صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ اوقاف کو مثبت اور تعمیری طور پر اس میدان میں استعمال کیا جائے جیسا کہ ماضی میں کیا گیا تھا اور ایسا علمی ارتقاء وجود پذیر ہوا تھا جس کا اعتراف پوری دنیا کو ہے؟

۵- عالم اسلام میں روز بروز تقسیم دولت کے بارے میں خلیج بڑھ رہی ہے اور غربت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے حتی کہ اس وقت مسلم دنیا کے ۹۰ فیصد سے زیادہ لوگ غربت کا شکار ہیں (اسلامی ترقیاتی بینک کی سالانہ رپورٹ ۹۹/۲۰۰۰، ص ۵۱ اور اس کے بعد کے صفحات)، موجودہ دور کے حالات اور گلوبلائزیشن اور اسپیشلائزیشن وغیرہ کے نئے عالمی و مقامی رجحانات سے ایسا لگتا ہے کہ غربت کی اس سنگین صورت حال میں مزید ابتری آئے گی اور تقسیم دولت میں فاصلہ بڑھے گا۔ پوری دنیا پر اس صورت حال کا مقابلہ کرنا ضروری ہے جو نہ صرف اس کے امن و امان اور استحکام کے لئے خطرہ ہے بلکہ اس کے وجود کے لئے ایک چیلنج ہے، مسلم دنیا پر اللہ کا یہ فضل ہے کہ وہ اس نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کا ایک موثر ذریعہ رکھتی ہے جو وقف ہے بشرطیکہ اس پر بہتر

طریقہ سے عمل کیا جائے۔

۶- دولت کی غلط تقسیم اور شدید غربت کے نتیجہ میں عام محتاج لوگ علاج معالجہ کی بہتر سہولیات سے محروم ہیں، کیونکہ ایک طرف تو سرکاری اسپتال اور طبی مراکز روبہ زوال ہیں، دوسری طرف ان میں علاج کی جدید سہولیات اور اچھے مینجمنٹ کا فقدان ہے، جبکہ سرمایہ کاری کی بنیاد پر چلائے جانے والے اسپتال اور پرائیوٹ نرسنگ ہوم گراں قیمت ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ عام غریب لوگ ان سے فائدہ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے، بیماریاں پھیلتی جاتی ہیں اور غریبوں کی آمدنی اور کمائی کی صلاحیت کو مزید گھٹادیتی ہیں اور ان کی غربت میں اضافہ کردیتی ہیں، اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فلاحی اور چیریٹیبل اداروں سے مدد لی جائے، جن میں اوقاف کا کردار ماضی میں بہت تابناک رہا ہے اور وہ آج بھی بہت اچھا کردار ادا کرسکتے ہیں۔

۷- مذکورہ بالا نکات کے علاوہ ہمیں ایسے طریقہ کار کی شدید ضرورت ہے جس کے معاشی ڈائمنشن کے ساتھ ہی اس کا روحانی اور اخلاقی پہلو بھی ہو اور ہمارا اقتصادی، اخلاقی، مادی اور روحانی ہر طرح سے ارتقاء ہوسکے، وقف ہمیں اس قسم کا ارتقا بہم پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہر پہلو اور ہر اعتبار سے یہ بات مبرہن اور روشن ہوجاتی ہے کہ موجودہ دور میں اوقاف کی کتنی ضرورت ہے۔ اب اس مقالہ کے دوسرے حصہ میں اوقاف کی مختلف قسموں میں سے ایک قسم جس کی افادیت کے ہم اب تک بہت زیادہ قائل نہیں رہے ہیں یعنی "نقدی اوقاف" پر گفتگو ہوگی۔

دوسری قسم- وقف نقدی

نقدی وقف میں بہت سے امکانات ہیں، جن سے بہتر طریقہ پر وقف کے فلاحی اور تعاونی مقاصد کا حصول ممکن ہے، اسی لئے وقف نقدی پر توجہ اور اس کے ارتقاء کی کوشش وقف کے کردار کے احیاء کے سلسلہ میں بنیادی نوعیت رکھتی ہے، اس موضوع کے اہم نکات ہم ذیل میں لکھتے ہیں:

۱- نقدی وقف کا مفہوم

اس وقف سے مراد یہ ہے کہ نقد مال کی تمام تر انواع و اقسام کو وقف کیا جائے، یعنی ایسا وقف جس میں موقوف علیہ نقد مال ہو۔

۲- نقدی وقف کا حکم

اس مسئلہ میں تتبع اور غور وفکر سے مذاہب اسلامیہ کے فقہاء کی جو رائیں ملیں وہ یوں ہیں:

۱- ایک بھی فقہی مذہب ایسا نہیں جس کے علماء کا نقد مال کے وقف کے ناجائز ہونے پر اجماع ہو، ہر مذہب میں اس کے جواز کے قائلین موجود ہیں، مذہب مالکی اس بارے میں سرفہرست ہے، اس کی جتنی بھی مشہور اور معتمد علیہ کتابیں ہیں سب میں وقف نقدی کے جواز کی صراحت ملتی ہے (الدسوقی، حوالہ سابق ۴/۷۷)، اس کے بعد حنفی مذہب ہے کہ اس کے کئی ائمہ اور مشاہیر علماء اس کے جواز کے قائل ہیں بلکہ اس کے ایک مشہور عالم نے تو وقف النقود کے جواز میں ایک کتاب لکھی ہے (الامام ابو السعود، رسالة ابی السعود فی جواز وقف النقود، تحقیق صغیر احمد، دار ابن حزم بیروت ۱۴۱۷ھ) تقریباً یہی موقف حنبلی مسلک کا ہے حتی کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس کے جواز کو راجح قرار دیا ہے (مجموع فتاوی شیخ الاسلام ۳۱/۲۳۴ اور اس کے بعد کے صفحات)، ایسا لگتا ہے کہ شافعی مذہب میں اس کے جواز کی سب سے کم بات کہی گئی ہے (الماوردی، الحاوی الکبیر، حوالہ سابق ۹/۳۷۹)، جہاں تک شیعی فقہ کا میں نے مطالعہ کیا ہے، مجھے کوئی ایسی صراحت نہیں ملی جو وقف النقود اور اس کے شرعی حکم کو بتاتی ہو، لیکن ایک نص ایسی ہے جو اگر ثابت ہوجائے تو جواز پر دلالت کرے گی، امام مرتضی کہتے ہیں: "ويشترط في الموقوف صحة الانتفاع به مع بقاء عينه" (عیون الازہار حوالہ سابق ۳۵۹) (مال موقوف میں یہ شرط ہے کہ اس کے عین کے باقی رہتے ہوئے اس سے انتفاع صحیح ہو) اس مطالعہ کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوگا کہ وقف النقود میں یہ شرط متحقق ہے، یہ اشارہ کرنا بھی مناسب ہے کہ ماضی میں کئی مسلمان ملکوں میں نقد وقف کرنا ایک عام بات تھی، حتی کہ بعض علماء نے اس کے جواز وعدم جواز کے حوالہ سے نہیں بلکہ نقود موقوفہ کی زکاۃ کے حوالہ سے بات کی ہے، یعنی جواز کا مسئلہ ان کے نزدیک طے شدہ تھا۔

۲- نقد وقف کے عدم جواز پر کوئی صریح قول مجھے نہیں ملا، فقہاء کے اقوال و مذاہب کے مطالعہ سے جو بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں وقف نقد نہیں تھا بلکہ اراضی اور جائداد وغیرہ کا وقف تھا، سنت وقف اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ اصل کو روک لیا جائے اور اس کے ثمرات کو عام کیا جائے، یہ وقف نقود میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس سے صحیح شرعی فائدہ اہلاک عین سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ صدر اسلام میں صرف

اموال منقولہ کے وقف پر عمل سے دوسری چیزوں کے وقف کی ممانعت لازم نہیں آتی، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وقف صرف اصول ثابتہ (اراضی) پر ہی منحصر نہ تھا، ہاں غالب یہی تھا، کیونکہ حضرت خالدؓ نے اپنی زرہ اور جنگی اسلحہ وقف کیا جو کہ منقولہ اموال ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برقرار رکھا جیسا کہ متفق علیہ حدیث سے ثابت ہے، نقد بھی اموال منقولہ میں سے ہے، یہ بھی تسلیم ہے کہ وقف کا طریقہ یہی ہے کہ اصل کو روکا جائے، پیداوار سے استفادہ کیا جائے، لیکن ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ یہ چیز وقف نقد میں حاصل نہ ہوگی، کیونکہ نقود مثلی ہوتے ہیں، مثل بھی اصل کی طرح ہوتا ہے اور نقود تعیین سے متعین نہیں ہوتے، ان کا بدل بھی ان کے قائم مقام ہوتا ہے۔ یہ بات بھی تسلیم ہے کہ استفادہ شرعی چاہتا ہے کہ نقود کو بدلا جائے لیکن ان کے عین کو خرچ کرنا کوئی ضروری نہیں، کیونکہ عین تو دائما باقی رہے گا (کئی فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، ابن عابدین، حوالہ سابق ۴ر ۳۶۴، دسوقی، حوالہ سابق ۴ر ۷۷)

لگتا یہ ہے کہ عدم جواز کے قائلین نے یہ دیکھا کہ ایک شخص دوسرے شخص یا جہت کو نقد وقف کرتا ہے اور انہیں روپیہ دے دیتا ہے اور بس قصہ ختم۔ حق یہ ہے کہ اس طرح کا عمل وقف نہیں بلکہ محض عام صدقہ ہوتا ہے کہ اس صورت میں نہ اصل قائم ہے نہ انتفاع جاری!! لیکن جو نقد وقف کے قائل ہیں ان کا مقصود یہ شکل نہیں ہوتی، بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ موقوفہ نقود کو اصل قائم سمجھا جائے اور اس سے استفادہ اس طور پر ہو کہ اصل قائم رہے، جیسا کہ آگے آنے والی تفصیلات سے واضح ہوگا۔ اس صورت میں کہ نقود موقوفہ کی سرمایہ کاری کی جائے اور ان کے منافع موقوف علیہ پر تقسیم ہوں اور اس صورت میں کہ کھجور کے درخت کو وقف کردیا جائے اور اس کے منافع وثمرات کسی پر خرچ کئے جائیں، کیا فرق ہے، جبکہ کھجور کا درخت پرانا ہوکر ختم بھی ہوسکتا ہے، اسی لئے فقہاء نے کہا ہے کہ اس کے پودے خرید کر لگانا ضروری ہوگا تاکہ کھجور مستقل باقی رہے (ہلال الرائی، احکام الوقف، دار المعارف العثمانیہ، ۱۳۳۵ھ ص ۲۰)۔

اب سوال یہ ہے کہ کھجور کا جو درخت باقی رہے گا کیا وہی ہوگا جو وقف کیا گیا تھا؟ حالانکہ مثلیت ایک جنس کے درختوں کے مقابلہ میں نقود میں زیادہ ہوتی ہے۔ پھر نقود کے وقف سے وقف کی ہمیشگی کا قانون بھی نہیں ٹوٹتا، کیونکہ وہ بھی سرمایہ کاری اور افزونی سے برابر موجود رہے گا، بلکہ اراضی اور جائدادوں کے مقابلہ میں زیادہ موجود رہے گا، اصل میں اعتبار مال موقوف کی نوعیت کا نہیں اس کے انتظام کا ہے۔ بدنظمی سے ہر قسم کا مال ضائع ہوجائے گا۔ کسی میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ بہت سے فقہاء نے نقد وقف کی اجازت دی ہے، نیز یہ کہ اس قسم کے وقف میں بعض ایسے خصائص وفوائد ہیں جن میں سے بیشتر عین کے وقف میں نہیں پائے جاتے جیسا کہ اگلے مبحث میں ہم دیکھیں گے۔

۳- جدید دنیا میں وقف نقد کو زیادہ اہمیت دینے کے عوامل

شروع میں یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ نقد وقف کے ذرائع ووسائل کے مدنظر اس پر زیادہ توجہ دینے کی ہماری دعوت کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ ہم وقف عینی کی اہمیت گھٹا رہے ہیں، جیسا کہ بعض ان لوگوں کا کہنا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وقف عین موجودہ اقتصادی ترقی میں کچھ معاون نہیں ہے (محمد بوجلال، نحو صیاغۃ مؤسسیۃ للدور التنموی للوقف: الوقف النامی، مجلۃ دراسات اقتصادیۃ اسلامیۃ، المعہد الاسلامی للبحوث والتدریب، جدۃ، جلد خامس، العدد الاول رجب ۱۴۱۸ھ)۔ صحیح یہ ہے کہ وقف شرعی اپنی مختلف انواع کے ساتھ ترقی کے کام میں مدد دیتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی خدمت کے مزاج، نوعیت اور مقدار میں وقف کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے، جیسے حالات ہوں ان کے مطابق۔ اس بحث کا مقصود وقف کی اس فراموش کردہ نوعیت کی اہمیت واضح کرنا اور اس کی طرف توجہ دلانا ہے، یہ نہیں کہ وہ وقف عینی کا بدل ہے بلکہ وہ وقف عینی کو سہارا دیتا ہے اور اس کا بنیادی جز ہے، خاص طور پر اس لئے بھی کہ اس میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں:

۱- نقد تقریبا تمام لوگوں کے پاس ہوتا ہے، قلت وکثرت سے صرف نظر کرتے ہوئے عام لوگوں کے پاس مال اور نقد روپیہ ہوتا ہے، جبکہ ان میں سے بہت سے لوگ اراضی اور جائدادوں کے مالک نہیں ہوتے۔

۲- وقف مشترک یا اجتماعی وقف کے قیام کے لئے اوقاف کی دوسری اقسام سے زیادہ مناسب وقف نقدی ہے اور انفرادی وقف سے زیادہ اجتماعی وقف تقاضائے وقت کے مطابق ہے، اس لئے کہ اس میں ذرائع ووسائل کی فراوانی ہوتی ہے جس کے ذریعہ بہت سے اقتصادی اور اجتماعی پروجیکٹ بنائے جاسکتے ہیں۔

۳- اس کی سرمایہ کاری کے طریقے، انداز اور میدان متعدد ومتنوع ہیں، اسی وجہ سے اس کے منافع بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

۴- اس کے مقاصد اور دائرے بھی متنوع ومتعدد ہیں جن میں کوئی محدودیت اور رکاوٹ نہیں ہے۔

۵- ''مالیات کی فراہمی کو عام کرنے'' کے موجودہ اصول سے بھی وقف نقدی ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۶- سرمایہ کاری میں اس کا اثر اس لئے زیادہ ہوتا ہے کہ مختلف مراحل میں پروڈکشن کے مختلف طریقوں میں یہ مدد دیتا ہے، کیونکہ نقد پیسہ کی بنیاد پر ان پروجیکٹوں اور سرگرمیوں میں شامل ہونا آسان ہے، یہ بعض وہ خصوصیات ہیں جن سے وقف نقدی کی اہمیت اور مقام کا پتہ چلتا ہے۔

۴- وقف نقدی کی تشکیل

نقد وقف کبھی تو انفرادی ہوتا ہے اس طرح کہ کوئی فرد یا جہت اکیلے وقف کرے اور مال موقوف میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو، یہ عام طور پر اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ یا تو آدمی کی مالی استطاعت اچھی ہو اور موقوف علیہ معین ومحدود ہو یا جہت عام اور چھوٹی ہو، چنانچہ اس طرح کا وقف اپنی اہمیت کے باوجود محدود نوعیت کا ہوتا ہے (اگر چہ اس کا وجود ہے جیسے کہ ڈاکٹر شوقی فنجری نے طلبہ علم اور دعوت وفقہ اسلامی کے لئے وقف کیا اور جیسے صالح کامل نے جامعۃ الازہر کے مرکز الاقتصاد الاسلامی پر وقف کیا)، جو نقدی وقف اجتماعی یا مشترک ہوتا ہے وہ اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی محدود یا غیر محدود جماعت بالاشتراک کسی بھی صورت میں وقف فنڈ قائم کرے یا کوئی ایسا ادارہ فنڈ قائم کرے جس کے پاس انفرادی اوقاف جمع ہو گئے ہوں، جیسا کہ بعض بینک کرتے ہیں جنہیں انفرادی اوقاف موصول ہوتے ہیں، وہ ان کو ملا کر جن کا مقصد ایک ہو، ایک فنڈ بنا دیتے ہیں تا کہ اس کی سرمایہ کاری اور اس سے حاصل شدہ منافع کے ذریعہ جہت موقوف علیہ کو منافع ملیں یا اگر واقف نے کسی ایک جہت کو مخصوص نہ کیا ہو تو کوئی فلاحی اداروں کو منافع دیئے جائیں۔

کبھی یہ فنڈ وقف کے چیکوں کے ذریعہ بنایا جاتا ہے، جن کی قیمت متعین ہوتی ہے اور کوئی نظام بنا کر عام لوگوں کو فروخت کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی واقفین کی ایک جماعت یا کسی خیراتی ادارہ یا بینک یا کسی سرکاری ادارہ کے ذریعہ دین اور حکومت کی رو سے جائز متعین ضوابط کے دائرہ میں یہ چیک پیش کیا جاتا ہے۔

۵- نقدی وقف کی سرمایہ کاری

کسی چیز کی سرمایہ کاری سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس چیز کو کام میں لگا دیا جائے تا کہ اس سے منافع حاصل ہوں، جیسے گھروں اور اراضی کو کرایہ پر دینا اور منافع حاصل کرنا یا کبھی کوئی چیز بٹائی پر دینا، مشہور ہے کہ نقود جامد اور ساکن ہوتے ہیں، وہ بذات خود کوئی منافع نہیں دے سکتے، ان کو بدلنا، حرکت میں لانا اور سرمایہ کی دوسری صورتوں میں بدلنا ضروری ہے، پھر ان ہی کو یا ان کے منافع کو نقود میں لوٹا دیا جائے، مثلاً ممکن ہے کہ ان سے کوئی سامان خریدا جائے پھر نفع لے کر بیچا جائے یا ان سے مستقل اسباب وجائداد خرید لی جائیں اور منافع حاصل کئے جائیں مثلاً اراضی، مکانات، کارخانے، شیئرز وغیرہ، اس سے پہلے ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ وقف نقود کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کو کام میں لگا دیا جائے، ان سے منافع بھی حاصل ہوں اور وہ زائل بھی نہ ہوں، بیشتر حالات میں اس کا تقاضا ہے کہ ان کے ذریعہ سرمایہ کاری کی جائے، اس طرح انہیں باقی رکھا جائے اور ان کے حاصل اور آمدنی کو خرچ کیا جائے۔

اس موقع پر مناسب ہے کہ فقہاء نے وقف نقود کی جن صورتوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک صورت کی طرف اشارہ کر دیا جائے، پھر نقد وقف کی سرمایہ کاری کی صورتوں کا تذکرہ کیا جائے گا، فقہاء نے کہا کہ قرض دینے کے لئے نقود وقف کئے جاسکتے ہیں، مثلاً ایک شخص محتاجوں کو قرض دینے کے لئے نقد مال کی ایک مقدار وقف کرے، محتاج اس قرض کو لے کر اس سے ضرورت پوری کرے، اس کے بعد وقف کے متولی کو لوٹا دے (الدسوقی، حوالہ سابق ۴/۷۷)۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اصل محبوس کیا ہے اور اس کی آمدنی کہاں ہے؟

جواب یہ ہوگا کہ اصل نقود موقوف ہوں گے، وہ اس قرض کے لئے قائم اور باقی رہیں گے، آمدنی وہ منفعت ہوگی جو قرض لینے والے کو ان نقود سے پہنچے گی، ظاہر ہے کہ قرض لینے والے کو ایک قسم کا فائدہ ہے ورنہ قرض لینے کی کوئی حاجت نہ ہوتی۔ اس کا مطلب ہے کہ قرض حسن دینے کے لئے وقف سے کوئی فنڈ قائم کیا جاسکتا ہے اور یہ ایک اہم چیز ہے جس کا بدل نہیں (ڈاکٹر راشد العلیوی، الصیغ الحدیثۃ لاستثمار الوقف وأثرھا فی دعم الاقتصاد، ندوۃ مکانۃ الوقف وأثرہ فی الدعوۃ والتنمیۃ مکۃ مکرمہ۔ شوال ۱۴۲۰ھ)۔ یہاں کہا جاسکتا ہے کہ نقود کی سرمایہ کاری کہاں ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ یہاں سرمایہ کاری نہیں، کیا ہر وقف سے الگ منفعت اور علاحدہ آمدنی حاصل ہوتی ہے؟۔

علماء کہتے ہیں کہ بعض قسم کے اوقاف سے آمدنی حاصل ہوتی ہے اور بعض سے حاصل نہیں ہوتی (سحنون: المدونۃ، حوالہ سابق ۶/۱۰۰) پہلے کی مثال وہ کرایہ

کے لئے وقف کئے گئے مکان سے اور دوسرے کی مثال رہائش کے لئے وقف کئے گئے مکان سے دیتے ہیں، یہاں سوال تو یہ ہونا چاہئے کہ قرض کبھی کبھی ادا نہیں کئے جاتے اور وقف کے متولی کا جو خرچ ہے وہ کیسے پورا ہوگا، کیونکہ اگر یہ مسائل صحیح طور پر حل نہیں ہوں گے تو اموال وقف اور فنڈ کے ذرائع ختم ہوجائیں گے، جو وقف کے مقصد اور اس کی سنت کے منافی ہوگا، اسی طرح واقف کی جو غرض ہے کہ وقف باقی رہے اور موقوف علیہ اس سے دائمی فائدہ اٹھائے جس سے دائمی ثواب حاصل ہو، وہ بھی ختم ہوجائے گی، ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کرنے لیعنی ضمانتوں، رہن اور کفالات کے ساتھ ساتھ اس بات کے جواز پر بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ قرض لینے والا اطمینان بخش طریقہ پر طے شدہ حدود وضوابط کی روشنی میں اپنے قرض کے واقعی اخراجات ادا کرے، ہماری رائے یہ ہے کہ اس سلسلہ میں بہتر یہ ہوگا کہ وقف کا متولی وقف کے ایک متعین حصہ کی سرمایہ کاری کرے اور یہ واقف کے علم میں ہو اور اس کے منافع سے بنیادی طور پر متولی کے اخراجات پورے کئے جائیں، دیون معدومہ کے لئے کچھ حصے خاص کر دیئے جائیں، جو بچیں ان کو رأس المال بنالیا جائے اور قرض کے لئے محفوظ کئے گئے فنڈ میں شامل کرلیا جائے، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ مال وقف کے کچھ حصہ کو بیچ کر باقی حصہ پر اس کی آمدنی صرف کی جاسکتی ہے، اسی طرح انہوں نے صراحت کی ہے کہ اس کے ایک حصہ سے آمدنی حاصل کرکے اسے اس کے دوسرے حصہ پر خرچ کیا جاسکتا ہے (فقہاء کہتے ہیں: کسی شخص کی خدمت کے لئے وقف کئے گئے غلام کا نفقہ خود اس شخص کے ذمہ ہوگا (الذخیرۃ ۶/ ۳۴۱)، یہاں نقود شہریوں کی خدمت کے لئے وقف ہیں، لہٰذا وہ تمام چیزیں جو ان کی بقاء کے لئے ضروری ہیں ان ہی کے ذمہ ہوں گی۔ دیکھئے: (الکمال ابن الہمام، فتح القدیر ۵/ ۴۳۴، ابن تیمیہ، الفتاوی ۳۱/ ۲۱۲، الدسوقی ۴/ ۹۰)

یہ اس وجہ سے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وقف باقی رہے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے، اس موقع پر ضرورت ہے کہ قرض دینے کے لئے وقف کا جو فنڈ ہے اس کے مال کی سرمایہ کاری اور بڑھوتری سے متعلق فقہ کی رو سے غور کیا جائے اور اس کو زائد از ضرورت آمدنی نیز نگہداشت کی غرض سے رہائشی مکان کی سرمایہ کاری کے مسئلہ پر قیاس کیا جائے۔ وقف نقود کا مقصد جہت موقوف علیہ پر اس "کے منافع کو خرچ کرنا بھی ہوتا ہے، جس کا لازمی تقاضا یہ ہوگا کہ پہلے اس کی سرمایہ کاری ہو پھر اس کے نفع کو خرچ کیا جائے یا زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ اس کے ایک جز کو موقوف علیہ پر خرچ کیا جائے قدیم فقہاء نے بھی ان کی صراحت کی ہے (الماوردی، الحاوی الکبیر، حوالہ سابق ۹/ ۳۷۹، ابن تیمیہ، الفتاوی ۳۱/ ۲۳۴ اور اس کے بعد کے صفحات، الکمال ابن الہمام، حوالہ سابق ۵/ ۴۳۲)۔

اگر واقف نے وقف کے لئے کوئی خاص طریقہ مقرر نہ کیا ہو تو سرمایہ کاری کے بہت سے طریقے اور اسالیب ممکن ہیں، بس شرط یہ ہے کہ وہ زیادہ نفع بخش اور وقف کی غرض پوری کرنے والے ہوں اور احکام شریعت سے ہم آہنگ بھی ہوں، اگر ایسا نہ ہو تو وقف کا متولی دوسرے ایسے طریقے اختیار کرسکتا ہے جو ان تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ وقف کے منتظمین کے سامنے موجودہ دور کے بہت سے طریقے ہیں اور اسلامی بینکوں نے انہیں استعمال بھی کیا ہے، جیسے راست سرمایہ کاری، کرایہ پر دینا، مضاربت، شرکت، سلم، بیع مرابحہ، مال تیار کرانا، کرنسی نوٹوں کی خرید، سرمایہ کاری فنڈ قائم کرنا اور ان میں شرکت کرنا وغیرہ۔ کیونکہ اوقاف کے مال بھی دوسرے مالوں کی طرح ہیں اور ان کے لئے بھی متعدد طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں، بس شرعی التزام کی شرط ہے، اس وقت بھی جبکہ واقف غیر شرعی طریقہ کی صراحت کردے، اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ سرمایہ کاری کے عمل کی افادیت پر سنجیدگی سے غور وفکر کرلیا جائے تا کہ ایک طرف مال وقف کی حفاظت بھی ہو اور دوسری طرف زیادہ سے زیادہ منفعت بھی حاصل ہو، کیونکہ مال وقف یتیم کے مال اور بیت المال کے مال کی طرح ہے، اس کی سرمایہ کاری کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت ہونی چاہئے۔ بہتر ہوگا کہ عمومی مصلحت سے بالکل صرف نظر بھی نہ کی جائے تا کہ وقف سے متعلق معاشی مصلحت کا حصول ممکن ہو، کیونکہ وقف اصلاً ایک رفاہی عمل ہے، لہٰذا افلاح وبہبود کا تصور اس کے تمام اقدامات ومراحل میں موجود رہنا چاہئے اور اسے موقوف علیہ کے حقوق میں جو وقف کے عمل کا اصل مقصود ہیں غبن تصور نہ کیا جائے، اس بات کو مثال سے یوں سمجھا یا جاسکتا ہے کہ کسی اسپتال یا اسکول یا یونیورسٹی کو نقد وقف کیا گیا اور اس نقد کی سرمایہ کاری یعنی مذکورہ مصارف پر ان کی آمدنی کے صرف کے لئے دو پروجیکٹ سامنے ہیں، پہلا عام لوگوں کی آبادکاری کا، دوسرا پروجیکٹ متوسط یا اعلی درجہ کے لوگوں کی آبادکاری کا، پہلے پروجیکٹ سے جو فائدہ ہوگا وہ دوسرے کے مقابلہ میں کم ہوگا لیکن پہلے پروجیکٹ سے غریب لوگوں کو فائدہ ہوگا، جنہیں رہنے سہنے کی جگہ کی ضرورت ہے، تو اس صورت میں وقف کے منتظمین وقف کے مال کو کہاں لگائیں، اس سوال کا جواب آسان نہیں؟ کیونکہ پہلی صورت میں اجتماعی فائدہ ہے تو دوسرے میں موقوف علیہم کو زیادہ فائدہ ہے۔ مناسب میدان میں اس مال کی سرمایہ کاری کے لئے موقوف، موقوف علیہ اور اموال وقف کی سرمایہ کاری اور اس کے منافع کی تقسیم کے درمیان دقت نظر پر مبنی تمیز مفید ہوگی، اسی طرح اس پہلو کو پیش نظر رکھنا کہ موقوف علیہم کی مصلحتوں کی رعایت خاص طور پر جب کہ وہ ضرورت مند بھی ہوں یا عمومی مصارف کی رعایت بذات خود ایک اجتماعی مصلحت ہے۔ اس میں اس سے بھی مدد مل سکتی ہے کہ مملکت خود روبعمل لائے جانے والے پروجیکٹوں کے لئے ترجیحات متعین کرے اور وقف کا فنڈ بھی سرمایہ کاری کے متنوع میدان اختیار کرے، اس طرح ایک حسین امتزاج سامنے آئے گا جس کے

ذریعہ ممکنہ طور پر بیک وقت عام وخاص دونوں قسم کے منافع ومصالح کے حصول کو یقینی بنایا جاسکے گا۔

۶-نقدی اوقاف کے نظم وانصرام کا مسئلہ

انفرادی نقد وقف کے انتظام میں کوئی خاص دشواری نہیں، اسے تو واقف خود بھی انجام دے سکتا ہے یا کسی تجربہ کار سرمایہ کاری کے ادارہ کو معاہدہ کے ذریعہ یہ ذمہ داری دے سکتا ہے، اس کی نگرانی کا ذمہ وہ خود لے یا کسی دوسرے ادارے سے کروائے لیکن اجتماعی نقد وقف جس میں چیک، فنڈز اور اچھے مالیاتی ادارے کی ضرورت ہوگی جو خود اس کی سرمایہ کاری کرے یا کسی دوسرے ادارے سے کروائے، اس کے لئے ایک پورے انتظامی نظام کی ضرورت پڑتی ہے اور غالباً سب سے اہم مسئلہ یہ ہوگا کہ واقفین کیسے اس نظام کی مناسب نگرانی کریں جس سے یہ ضمانت ملے کہ وقف کے مال کی بہتر سرمایہ کاری ہورہی ہے اور اس کے منافع بہتر طریقے پر صرف کئے جارہے ہیں یا تو واقف فنڈ بنا کر جس کا نظم ان میں سے بعض افراد کریں اور مختلف سرمایہ کاری کے اداروں سے تعامل کریں، اس کام کو انجام دیں گے، باقی واقفین ایک عام سوسائٹی بنالیں گے اور کبھی واقفین کسی مالیاتی ادارہ سے مدد لیں گے جو ان کی نیابت میں مذکورہ فنڈ کا نظم کرے گا اور وکالت یا مضاربت یا اجارہ کی بنیاد پر اس کے ذرائع آمدنی کو کام میں لگائے گا وغیرہ......

اس صورت میں اہم یہ ہوگا کہ ایک تنظیم عمل میں لائی جائے جو ایک طرح سے واقفین کی نگرانی کرے یا تو وہ فنڈ کی انتظامیہ میں شامل ہو یا کم از کم واقفین کی عام سوسائٹی میں، بہرحال اس طرح کے بہتر انتظامات آج کے ترقی یافتہ مینجمنٹ میں کوئی مشکل نہیں، کیونکہ اس طرح کے مالیاتی اور مینجمنٹ کے ادارے پھیلے پڑے ہیں، یہ بھی اہم ہے کہ مملکت قوانین وضوابط کی روشنی میں اس طرح کے معاملات میں دخیل ہو۔

۷-نقدی وقف کے فنڈز کا میدان عمل

اس سے پہلے ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ عالم اسلام زندگی کے تقاضے پورے کرنے میں شدید مشکلات سے دوچار ہے اور اپنے باشندوں کی تعلیم، علاج، روزگار اور رہائش وغیرہ کے مسائل کو حل کرنے اور باوقار زندگی کی فراہمی میں ناکام ہے، ہم نے یہ بھی اشارہ کیا کہ ان ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے جو حکومتوں کے پاس نہیں ہیں اور پرائیوٹ سیکٹر جو معاشیات پر چھایا ہوا ہے وہ ان پر توجہ نہیں کرتا، لہذا اب ایک ہی شکل بچتی ہے کہ سول سیکٹر پر مبنی رضا کار ادارے اسے کریں اور پرائیوٹ سیکٹر سے مدد لیں۔

اس کام کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف افراد اور اداروں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اقتصادی واجتماعی طور پر ضروری چیزوں کی فراہمی کے لئے سرمایہ صرف کریں، اس چیز کے لئے دین ومذہب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو انہیں رضا کارانہ مال خرچ کرنے پر آمادہ کرے، اسلام صدقات، وقف اور خیرات کی اپنی تعلیمات اور قوانین کے ذریعہ اس رجحان کو سب سے زیادہ ابھار سکتا ہے، مطلوب یہ ہے کہ پہلے یہ جذبہ ابھارا جائے اور ایک عام شعور پیدا کیا جائے، جس میں سب کو خطاب کیا جائے اور اس طور پر کہ سب اسے سمجھیں اور اس کے تمام پہلو اور نکات سب کے سامنے واضح ہوجائیں، پہلے اوقاف کی مذہبی اہمیت، پھر اقتصادی اور سماجی اہمیت بتائی جائے، پھر اس کی شکلوں اور اسالیب پر عمل کی بھرپور وضاحت ہو، لوگوں کے سامنے یہ پہلو لایا جائے کہ اس سے عام لوگوں کے مفادات کیسے پورے ہوں گے اور اس میں حصہ لینے والوں کو بہتر ثواب ملے گا، پھر مملکت اپنے قوانین اور حدود وضوابط کے ذریعہ لوگوں کو اس پر مطمئن کردے کہ ان کے عطیے اور اوقاف محفوظ رہیں گے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے خاص ہوں گے، ان کو دست درازی اور کھلواڑ سے بچایا جائے گا۔

اسی طرح یہ بھی اہم ہے کہ پرائیوٹ مالیاتی ادارے اور سرکاری ایجنسیاں بھی وقف کے فنڈز قائم کریں جو سماج کی فلاح وبہبود کے لئے کام کریں اور علاج کے مسئلہ، تعلیم کے مسئلہ، بے روزگاری کے مسئلہ، ریسرچ کے مسئلہ اور آبادکاری کے مسئلہ وغیرہ پر کام کریں (الامانة العامة للاوقاف، الکویت، ''الصناديق الوقفية - النظام العام ولائحته التنفيذية'' مطابع الخط ۱۴۱۷ھ) اور افراد اور اداروں کو ان مدات میں خرچ کرنے پر ابھاریں، اسی طرح واقفین کے مقاصد درست ہوں گے اور ان کا رخ بالفعل حقیقی خیر کے کاموں کی طرف ہوگا، لاحاصل، گھٹیا اور دین ودنیا کے لئے غیر مفید مقاصد کی طرف نہ ہوگا، ابن تیمیہ نے ایسے کاموں میں وقف کرنے کو باطل قرار دیا ہے (الفتاوی) اور یہ نہ صرف شرعاً صحیح ہے بلکہ معاشی طور پر بھی درست ہے۔

خاتمہ

بنیادی طور پر اس مقالہ میں نقد وقف سے بحث کی گئی ہے، تمہید میں اس سے متعلق بنیادی نکات کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کا اصل مقصود یہ ہے کہ موجودہ دور میں وقف کے کردار کو مضبوط بنایا جائے۔ مقالہ میں وقف کے ادارہ کی تعریف وتوضیح کی گئی اور پھر موجودہ دور میں اس کے کردار کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا، مقالہ کے پہلے حصہ میں ان چیزوں سے بحث تھی تو دوسرے حصہ میں وقف نقد سے، اس حصہ میں وقف نقد کی تعریف کی گئی، اس کے سلسلہ میں فقہی موقف بیان کیا گیا، پھر وقف کی خصوصیات اور اس کے وسائل، اس کی تشکیل اور اس کی سرمایہ کاری کی بعض صورتوں کا تذکرہ کیا گیا، آخر میں اس کے بعض ادارہ جاتی اور تنظیمی امور کو بیان کیا گیا۔

اس پوری بحث سے بعض اصولیات سامنے آئیں، جن کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جارہا ہے:

اول: ایک طویل مدت سے مسلم دنیا کے اوقاف دگرگوں حالات سے دوچار ہیں، اگرچہ اب بعض جگہوں پر اس کی ترقی اور افزونی کے لئے بعض اچھی کوششیں کی جارہی ہیں۔

دوم: اوقاف کی اس ناگفتہ بہ حالت کے پیچھے بنیادی طور پر بعض وہ تصورات اور غلط فہمیاں ہیں جو اس کے احکام اور شرعی قیود سے متعلق پھیلی ہوئی ہیں، جن کے باعث وسعت تنگی میں، آسانی مشکل میں اور بہاؤ جمود میں بدل گیا، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ فقہ اسلامی میں اوقاف کے تعلق سے کافی لچک پائی جاتی ہے اور "ماجری التعامل به فوقفه جائز" (جس چیز کا تعامل جاری ہو اس کا وقف جائز ہے) کی بے نظیر عبارت سے اس بات کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے ہمیں آج شدید ضرورت ہے کہ فقہ الوقف کوئی صورت میں سامنے لائیں اور اس کی تشکیل جدید کریں۔

سوم: معاصر مسلم دنیا کے اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی احوال کا تقاضا ہے کہ اوقاف پر سنجیدگی سے توجہ دی جائے اور جدید اسالیب اور ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے اسے ترقی دی جائے تاکہ آج کے حالات میں وہ اپنا مطلوبہ کردار ادا کرسکیں اور ان بحرانی حالات کا سامنا کیا جاسکے۔

چہارم: اوقاف کی افزائش اور ترقی دینے کی جہت میں یہ بھی اہم ہے کہ وقف نقدی کا اہتمام کیا جائے، اس لئے کہ اس کی خصوصیات اور وسائل زیادہ ہیں اور مختلف مسالک اور فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں، سابقہ بحث سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں وقف نقد پر عمل رہا ہے اور آج وہ عصر حاضر سے پوری طرح مطابقت بھی رکھتا ہے۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ اس کے انتظامی اور مالیاتی پہلوؤں کی کافی شافی توضیح کی جائے، ان کو بروئے کار لانے کا عمل آسان ہوجائے گا اگر ان اسلامی مالیاتی اسالیب اور طریقوں کو پیش نظر رکھا جائے جن پر اسلامی مالیاتی ادارہ کے ذریعہ عمل کیا جارہا ہے اور جن کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں ہماری تجویز یہ ہے کہ اکیڈمی وقف نقد کی انفرادی واجتماعی دونوں شکلوں کے جواز کا فیصلہ صادر کرے اور اس پر اسلامی مالیاتی ضوابط وطریقوں کو لاگو کرنے میں زیادہ لچک اور آسانی کا مظاہرہ کرے، اس طرح وقف کے سلسلہ میں امام قرافیؒ کے مندرجہ ذیل قول پر عمل کیا جاسکے گا:

"هو من أحسن القرب وينبغي أن تخفف شروطه"

(وقف ثواب حاصل کرنے کی بہتر صورتوں میں سے ایک ہے اور اس کی شرطوں کو آسان ہونا چاہئے) (الذخیرہ ۶/۳۲۲)

نیز اکیڈمی مسلم حکومتوں سے یہ سفارش کرے کہ وہ لوگوں کو اوقاف کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اپنے قوانین اور طریقہ کار پر نظر ثانی کریں۔

☆☆☆

وقف کا مقام اور سماجی مسائل

کے حل میں اس کا کردار

عبد الرحمن بن سلیمان المطرودی[1]

ان الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره نستهديه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا وسيئات أعمالنا. من يهد الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا ہادی له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمدا عبده ورسوله۔

تمہید

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن إلا وأنتم مسلمون" (سورہ آل عمران: ۱۰۲)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے اور جان نہ دینا بجز اس حال کہ تم مسلم ہو)۔

اسی طرح ارشاد ربانی ہے: "یا أیها الناس اتقوا ربكم الذی خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالًا كثيرًا ونساء واتقوا الله الذی تساءلون به والأرحام إن الله كان عليكم رقيبًا" (سورہ نساء: ۱)

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقوی اختیار کرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہ کثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیئے اور اللہ سے تقوی اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی تقوی اختیار کرو، بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے)۔

نیز فرمان باری ہے: "یایها الذین آمنوا اتقوا الله وقولوا قولًا سديدًا يصلح لكم أعمالكم ويغفر لكم ذنوبكم ومن يطع الله ورسوله فقد فاز فوزًا عظيمًا" (سورہ احزاب: ۷۰،۷۱)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو اللہ تمہارے اعمال قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی سو وہ بڑی کامیابی کو پہنچ گیا)۔

اللہ تعالی نے ہمارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا اور آپ کے سلسلہ میں فرمایا:

"وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين" (سورہ انبیاء: ۱۰۷) (اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے)۔

اسی طرح فرمایا: "لقد جاء كم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمؤمنين رؤوف رحيم" (سورہ توبہ: ۱۲۸)

(تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک ایسے رسول آئے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، وہ تمہاری مغفرت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں)۔

اللہ تعالی کا اپنے مومن بندوں پر یہ احسان ہے کہ اس نے انہیں نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کا حکم دیا:

"تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب" (سورہ مائدہ: ۲)

(نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو، گناہ اور سرکشی پر تعاون نہ کرو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، بلاشبہ اللہ شدید سزا دینے والا ہے)۔

---

[1] سکریٹری وزارت برائے امور اوقاف، سعودی عرب۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ایک دوسرے کا دینی بھائی بنایا تا کہ ہر بھائی اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے:

''والله لا يؤمن أحدكم حتى يحب لأخيه ما يحب لنفسه''

(خدا کی قسم تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

میرے لئے خوشی و مسرت کی بات ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ذمہ داروں کی گذارش قبول کرتے ہوئے اسلام میں وقف کی اہمیت، معاشرہ کی ترقی کے لئے اس کی ضرورت اور سماج کے معاشی مسائل کے حل میں اس کے کردار کے موضوع پر ایک مقالہ لکھوں، خاص کر اس لئے بھی کہ یہ حضرات ہندوستانی معاشرہ کو درپیش موجودہ مسائل کے حل کے لئے اسلامی اوقاف قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان مسائل میں سرفہرست یتیموں، مطلقہ عورتوں اور بیواؤں کے حالات و مسائل ہیں، اسی طرح مریضوں کا علاج، مختلف سماجی شعبوں کے تقاضے، صحت کے مسائل نیز تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کی ضروریات بھی ان میں شامل ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وقف انفاق فی سبیل اللہ کے میدان سے متعلق اسلام کی معروف ترین سنتوں میں سے ایک ہے، یہ اپنی حقیقت و منہج کے اعتبار سے ایک انوکھا اسلامی انتظام ہے۔ یہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے صدقہ جاریہ ہے اور منہج کے لحاظ سے صدقہ کے تسلسل اور صدقہ کے ماخذ کے دوام کا جامع ہے۔ یہ صدقہ کا ماخذ عین وہ شئی ہے جو بلند دینی تعلیمات و قوانین کے مطابق صدقہ کی جائے۔ یہ تعلیمات زندگی کے مسائل میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ وقف نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اسلامی معاشروں کی ترقی اور تکافل میں اہم کردار ادا کیا ہے، یہ ہر زمان و مکان میں اپنا یہی زبردست کردار ادا کرنے پر قادر ہے اگر اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے طریقہ کے مطابق شرعی بنیادوں پر روبہ عمل لایا جائے۔

پیش نظر مقالہ مندرجہ ذیل مباحث پر مشتمل ہے:

مبحث اول: فقہ الوقف:

اس میں اختصار کے ساتھ موضوع کے فقہی زاویہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کا مقصد وقف کے سلسلہ میں فقہی اجتہادات کی وضاحت کرنا نیز یہ اجاگر کرنا ہے کہ وقف کے مسائل میں فقہی احکام اور علماء کی آراء اور ان کے مسالک میں بے حد لچک پائی جاتی ہے۔

مبحث دوم: معاشرہ کی ترقی میں رفاہی اوقاف کا مقام:

اس میں اسلامی معاشرہ کو ترقی دینے، آگے بڑھانے، امداد باہمی اور افراد کے تعاون میں رفاہی اوقاف کے مقام و مرتبہ کی توضیح کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشروں میں اوقاف اب بھی یہ کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مبحث سوم:

مبحث سوم اور چہارم میں چند متعین موضوعات پر بحث کی گئی ہے، چنانچہ مبحث سوم کا موضوع بیماروں، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کے لئے اوقاف کی اہمیت ہے، اس میں بطور خاص سوسائٹی کے مذکورہ طبقات سے متعلق شرعی احکام کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں۔

مبحث چہارم:

مبحث چہارم میں دعوت و تبلیغ اور تعلیمی میدانوں میں اوقاف کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں علم کا مقام واضح کیا گیا ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اس کی اشاعت کے لئے مسلمانوں کو اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے، اسی طرح یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کے دور عروج میں کتابوں کی تالیف، نشر و اشاعت اور لائبریریوں اور دار العلوموں کے قیام میں وقف کا کیا کردار رہا ہے۔

بحث کے اختتام میں ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش اقتصادی، ترقیاتی اور سماجی مسائل کے حل کے لئے اسلامی اوقاف کے قیام کی تشکیل و تاسیس سے متعلق چند اہم سفارشات ذکر کی گئی ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اس کام کو اپنی رضا کے لئے خاص کرلے اور سب کو کتاب و سنت کے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، سب کی محنتوں کو بابرکت بنائے اور ان کو درست راستہ کی رہنمائی فرمائے۔ ☆☆☆

مبحث اول-فقہ الوقف

اسلام میں وقف کی ضرورت واہمیت اور اسلامی معاشرہ کی ترقی میں اس کے کردار پر گفتگو کرتے وقت شاید اس طرف اشارہ کرنا بھی اہم ہوگا کہ امت مسلمہ ایک متبع امت ہے نہ کہ مبتدع (بدعتی)، اس لئے ضروری ہے کہ وقف سے متعلق بعض فقہی احکام کی واقفیت حاصل کی جائے، اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا ارادہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کی ضرورت کے میدانوں سے دلچسپی لینے والے اسلامی اوقاف قائم کرے۔ یہ میدان اور گوشے صحت، سماج، تعلیم وتربیت، ترقی اور دعوت وتبلیغ سے متعلق ہیں۔ وقف سے متعلق فقہی احکام کا جاننا اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ اس قسم کے اوقاف کا قیام شرعی طور پر درست، کتاب وسنت کے مطابق اور صحابہؓ کے عمل پر مبنی ہو، کیونکہ ان اوقاف کی درست شرعی بنیاد ہی ان کے تحفظ اور ان کے دوام وبقاء کی ضامن ہے، کیونکہ صحیح آغاز اور درست مقدمات کا نتیجہ بالعموم بہتری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ اس مقالہ میں وقف کے موضوع سے متعلق بعض فقہی پہلوؤں سے اختصار کے ساتھ تعرض کیا جائے گا، جیسے وقف کی لغوی واصطلاحی تعریف، کتاب وسنت اور عمل صحابہ سے اس کی شرعی دلیلیں، اس کی مشروعیت کی حکمت اور وقف کے ارکان وشرائط وغیرہ۔

اول-وقف کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

الف-لغوی تعریف:......لغت میں وقف کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ وقف یقف بمعنی ''حبس'' کا مصدر ہے، تحبیس اور تسبیل اس کے مترادف ہیں، کہتے ہیں: ''وقفت الدار للمساكين وقفا'' یعنی میں نے گھر کو مسکینوں کے لئے روک دیا۔ ''وقفت الدابة'' یعنی میں نے سواری کو روک لیا، لیکن ''أوقفت'' کہنا درست نہیں، یہ غیر فصیح لغت ہے، علماء لغت نے اسے ناپسند کیا ہے، چنانچہ فیروزآبادی کہتے ہیں کہ فصیح کلام میں أوقف یا تو سکت (وہ خاموش رہا) یا أمسک وأقلع (رک گیا) کے معنی میں آتا ہے، جوہری نے کہا کہ کلام عرب میں أوقفت صرف ایک معنی میں آتا ہے جیسے ''أوقفت عن الأمر الذي كنت فيه'' (میں جس کام میں لگا تھا اس سے رک گیا)، راغب نے کہا ہے: لغت میں اس کے معنی ہیں: حرکت سے روک دینا، لغت کی رو سے یہ کبھی حسی ہوتا ہے، مثلاً: وقفت الدار اور کبھی معنوی مثلاً ''وقفت جهودي لإصلاح الناس'' یعنی میں نے اپنی کوششیں لوگوں کی اصلاح پر مرکوز کردیں۔

ب-اصطلاحی تعریف:......وقف کی تعریف میں فقہاء کا اختلاف ہے جیسا کہ اس کے ارکان وشروط میں مختلف فقہی مذاہب کے درمیان اختلاف ہے۔ میں یہاں مذاہب اربعہ کی بعض تعریفات اختصار سے بیان کروں گا:

مذہب حنفی:......مرغینانی نے اس کی تعریف یوں کی ہے: وقف کسی شئی کو اللہ کی ملکیت قرار دے کر روک لینا اور اس کے منافع کو صدقہ کردینا ہے۔

مذہب مالکی:......اقرب المسالک میں ہے کہ یہ مالک کا اپنی مملوک شئی کی منفعت کو اگرچہ اجرت کے ساتھ ہو یا اس کی آمدنی کو مخصوص عبارت کے ذریعہ اتنی مدت تک کے لئے جتنی وہ مناسب سمجھے کسی مستحق کے لئے خاص کردینا ہے۔

مذہب شافعی:......رملی نے اس کی تعریف یوں کی ہے: یہ ایسے مال کو جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہو، اصل کو باقی رکھتے ہوئے، اس کی ملکیت میں تصرف کئے بغیر کسی موجود اور مباح مصرف کے لئے روک لینا ہے۔

مذہب حنبلی:......ابن قدامہ نے اس کی تعریف یوں کی ہے: یہ اصل کو روک لینا اور ثمرات کو اللہ کے راستہ میں دینا ہے۔ یہ تعریف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تھا: ''حبس الأصل وسبل الثمرة'' (اصل کو باقی رکھو اور پھل کو خرچ کرو)۔

اسلام میں وقف چونکہ شرعی معاملات میں سے ہے، اس لئے اعتبار عملی معانی کا ہوگا، الفاظ اور حروف کا نہیں، یہاں وہ تعریف زیر بحث ہے جو معاملات کی صورتوں اور عملی صورت حال سے ہم آہنگ ہو، عملی لحاظ سے میں جس تعریف کو بہتر سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ''مالک شئی مملوک میں اپنا تصرف روک دے اور اس کی

آمدنی یا منافع کو صدقہ کردے"۔

دوم- وقف کی مشروعیت

وقف انفاق فی سبیل اللہ کے اہم ترین، سب سے زیادہ باعث اجر، سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ دیرپا طریقوں میں سے ایک ہے، اس کی مشروعیت کے بارے میں کتاب وسنت سے بہت سی نصوص وارد ہیں، اکثر اہل علم کے نزدیک وہ مشروع ہے، جمہور علماء کی رائے اس کے مشروع اور لازم ہونے کی ہے۔

یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہے، کیونکہ یہ نیکی اور خیر کے کاموں میں سے ہے اور ان بڑی عبادتوں میں سے ہے جن کے ذریعہ بندہ اللہ سبحانہ کی قربت حاصل کرتا ہے۔

ابن قدامہ کہتے ہیں: سلف اور ان کے بعد کے اکثر اہل علم وقف کو درست سمجھتے ہیں، صرف شریح وقف کے قائل نہیں ہیں جو فرماتے ہیں کہ مال میں اللہ تعالیٰ نے حقوق متعین کردیئے ہیں، ان کو نظر انداز کرنا اور مال کو روکنا جائز نہیں۔

ابن رشد کہتے ہیں: وقف ایک جاری سنت ہے، اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے مسلمان عامل رہے ہیں، اس کی مشروعیت پر کتاب وسنت اور اجماع دلالت کرتے ہیں۔

الف- قرآن سے وقف کی دلیلیں:

کتاب اللہ میں متعدد نصوص اور بہت سی ایسی آیات ہیں جو انفاق کی مشروعیت اور عمل خیر پر آمادہ کرتی ہیں اور خیر کے کاموں میں سب سے اہم عمل وقف ہے۔ یہ نصوص درج ذیل ہیں:

"لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون وما تنفقوا من شئ فإن الله به عليم" (آل عمران: ۹۲)

(تم ہرگز نیکی نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے)۔

نیز فرمایا:

"يأيها الذين آمنوا أنفقوا من طيبات ما كسبتم ومما أخرجنا لكم من الأرض ولا تيمموا الخبيث منه تنفقون ولستم بآخذيه إلا أن تغمضوا فيه واعلموا أن الله غني حميد" (بقرة: ۲۶۷)

(اے ایمان والو! جو تم نے کمایا ہے اس میں سے عمدہ چیزیں خرچ کرو اور اس میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں اور خراب چیز کا قصد بھی نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کروگے حالانکہ تم خود بھی اس کے لینے والے نہیں ہو بجز اس صورت کے چشم پوشی ہی کرجاؤ اور جانے رہو کہ اللہ بے نیاز ہے، ستودہ صفات ہے)۔

"إنما أموالكم وأولادكم فتنة والله عنده أجر عظيم فاتقوا الله ما استطعتم واسمعوا وأطيعوا وأنفقوا خيرا لأنفسكم ومن يوق شح نفسه فأولئك هم المفلحون إن تقرضوا الله قرضا حسنًا يضاعفه لكم ويغفر لكم والله شكور حليم" (تغابن: ۱۵-۱۷)

(تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے، لہذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو، اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور اطاعت کرو، اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہے، جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے، بس وہی فلاح پانے والے ہیں، اگر تم اللہ کو قرض حسن دو، تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کردے گا، اور تمہارے قصوروں سے درگذر فرمائے گا، اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے)۔

اور فرمایا:

"وما يفعلوا من خير فلن يكفروه والله عليم بالمتقين" (آل عمران: ۱۱۵)

(اور جو بھی نیک کام یہ کریں گے، اس سے ہرگز محروم نہ کئے جائیں گے اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے)۔

اور فرمایا:

"یا أیہا الذین آمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون" (حج: ۷۷)

(اے ایمان والو! رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو، اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو، اور نیکی کرتے رہو تاکہ فلاح پا جاؤ)۔

اور فرمایا:

"مثل الذین ینفقون أموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ أنبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم" (بقرۃ: ۲۶۱)

(جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں، ان کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اس سے سات بالیاں اگیں، ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں، اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے، اور اللہ بڑا وسعت والا ہے، بڑا علم والا ہے)۔

ب- سنت سے وقف کی دلیلیں:

وقف کی مشروعیت سے متعلق بہت ساری احادیث اور بے شمار روایات وارد ہیں، یہ عمومی یا خصوصی طور پر وقف کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہیں، یہ قولی بھی ہیں اور فعلی بھی۔ خصاف نے ان میں سے بہت سی نصوص کو اپنی کتاب "احکام الاوقاف" میں بیان کیا ہے، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱- بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں: حضرت عمر کو خیبر میں ایک زمین ملی، اس کے بارے میں مشورہ کے لئے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور بولے: یا رسول اللہ مجھے خیبر میں ایک ایسی زمین ملی ہے جس سے عمدہ کبھی کوئی مال نہیں ملا، اس بارے میں آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر چاہو تو اصل کو روک کر اسے صدقہ کردو"۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے یہ صدقہ (وقف) کردیا اس نیت کے ساتھ کہ اس کی اصل نہ فروخت کی جائے گی، نہ خریدی جائے گی، نہ اس میں وراثت جاری ہوگی اور نہ وہ بطور ہبہ کسی کو دی جائے گی۔ یہ وقف فقراء، قرابت داروں، غلاموں، فی سبیل اللہ، مسافر اور مہمانوں کے لئے تھا، اس کے ذمہ دار کو دستور کے مطابق اس میں سے لینے کی اجازت تھی، اسی طرح اس سے غیر متمول دوست کو کھلانے کی بھی اجازت تھی (بخاری)۔

نووی نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ وقف کی اصل درست ہے، نیز اس بات کی بھی کہ یہ جاہلیت کے شائبوں سے پاک ہے، یہی ہمارا اور جمہور کا مسلک ہے۔ اس پر مسلمانوں کا یہ اجماع بھی دلیل ہے کہ مساجد اور سقایات (آب رسانی کے ذرائع) کا وقف درست ہے۔

۲- مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إذا مات الإنسان انقطع عملہ إلا من ثلاثۃ: إلا من صدقۃ جاریۃ أو علم ینتفع بہ أو ولد صالح یدعو لہ" (صحیح مسلم)

(جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے البتہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کا اجر اسے ملتا رہتا ہے: صدقہ جاریہ، مفید علم اور نیک اولاد کی دعائیں)
نووی نے اپنی شرح مسلم میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں وقف کی بنیاد کے صحیح ہونے اور اس کے باعث ثواب ہونے کی دلیل ہے۔

ج- اجماع سے وقف کی دلیلیں:

اس کی مشروعیت پر علماء کا اجماع ہے، اسے رافعی اور ابن قدامہ نے بیان کیا ہے۔

رافعی کہتے ہیں: وقف پر صحابہؓ کا قولی اور فعلی اتفاق مشہور ہے۔

ابن قدامہ نے کہا: جابر فرماتے ہیں کہ صحابہؓ میں کوئی بھی وسعت والا شخص ایسا نہ تھا جس نے وقف نہ کیا ہو، اس پر ان کا اجماع ہے کہ ان میں جو بھی وقف پر قادر تھا اس نے وقف کیا اور یہ چیز مشہور ہوئی، اس پر کسی نے بھی نکیر نہیں کی، لہذا اجماع ثابت ہوگیا۔

حدیث عمرؓ پر ترمذیؒ نے یہ حکم لگایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، صحابہ اور دیگر اہل علم کے نزدیک اس پر ہی عمل ہے، ہم ان کے متقدمین میں زمین وغیرہ کے وقف کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں پاتے (سنن الترمذی)۔

سوم- وقف کی مشروعیت کی حکمت:

یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ اسلامی قوانین اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ ایک مسلمان کا اپنے خالق جل شانہ سے تعلق مضبوط ہونا چاہئے۔ اس تعلق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی توحید خالص، تنہا اسی کی معبودیت اور تمام اقوال وافعال میں صرف اسی کے قصد پر ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی احکام نازل کئے ہیں ان کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کی خاطر انسانوں سے باہم محبت کی بنیاد پر مسلمان آپس میں اپنے رشتے مضبوط کریں۔ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان سے تعلق کو مضبوط بنانے، اس کی خبر گیری اور اس کی حاجت روائی کے اصول تک پہنچانے والے وسائل میں سے وقف ہے، اس کی حکمتیں عظیم اور اس کے مقاصد بلند ہیں، یہ حکمتیں اور مقاصد مسلمانوں کے عام وخاص مصالح کے دائرہ میں پورے ہوتے ہیں۔ نصوص شرعی واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلامی شریعت بندوں کی مصلحتوں کے لئے وضع کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"رسلا مبشرين ومنذرين لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل وكان الله عزيزا حكيمًا" (نساء: ۱۶۵)

(اور پیغمبروں کو ہم نے بھیجا خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کرتا کہ لوگوں کے لئے پیغمبروں کے آنے کے بعد اللہ کے سامنے عذر نہ باقی رہ جائے اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست بڑا حکمت والا)

اور فرمایا: "وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين" (انبیاء: ۱۰۷) (اے نبی ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کے لئے صرف رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے)۔

اسلام میں احکام شرع کی تکلیف کی بنیاد مخلوق سے متعلق شرعی مقاصد کی حفاظت پر ہے۔ یہ مقاصد تین ہیں:

۱- ضروری، ۲- حاجی، ۳- تحسینی۔

ضروری مقاصد کا مفہوم یہ ہے کہ دین ودنیا کے مصالح کے لئے ان کی تکمیل ضروری ہو، ان کی حفاظت دو چیزوں سے ہوگی: ایک اس ذریعہ سے جس سے اس کے ارکان وقواعد کو مضبوط کیا جاسکے اور دوسرے اس ذریعہ سے جس کے سہارے وقوع پذیر یا متوقع خرابی کو دور کیا جاسکے، یعنی سلبی طور پر مقاصد کی رعایت۔

ضروریات مجموعی طور پر پانچ ہیں:

۱- دین کی حفاظت، ۲- جان کی حفاظت، ۳- نسل کی حفاظت، ۴- مال کی حفاظت، ۵- عقل کی حفاظت۔

جہاں تک حاجی مقاصد کی بات ہے تو ان کا مفہوم یہ ہے کہ توسیع کے پہلو سے ان کی ضرورت ہو اور ان کے ذریعہ اس تنگی کو رفع کیا جائے جو غلبی طور پر حرج میں مبتلا کرتی ہے اور جس سے مطلوب فوت ہوجائے، ان کا لحاظ نہ رکھا جائے تو مکلفین بالجملہ حرج ومشقت میں مبتلا ہوجاتے ہوں، البتہ یہ حرج مصالح عامہ میں متوقع عمومی فساد کے درجہ میں نہیں ہوتا۔

تحسینی مقصد یہ ہے کہ اچھی عادات واخلاق کو لیا جائے اور عقل سلیم جن بری چیزوں سے ابا کرتی ہو ان سے اجتناب کیا جائے، اس میں مکارم اخلاق بھی آجاتے ہیں، جن چیزوں پر حاجی اور ضروری مقاصد منطبق ہوتے ہیں ان ہی پر تحسینی بھی منطبق ہوتے ہیں مثلاً عبادات میں نفل نمازیں اور تمام سنتیں، زینت وجمال، خیر کے کام کرنا، صدقات، احسان تقرب وغیرہ کے دوسرے کام۔

ان چیزوں میں وقف سماج کے احوال وظروف کے مطابق شامل ہے۔

وقف صدقات، زکاۃ، ہدیے اور خیرات وغیرہ میں انفاق کی صورتیں متنوع ہیں۔ شریعت اسلامی نے مسلمان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ انفاق کی جس مشروع صورت کو چاہے اختیار کرلے۔ تاہم انفاق کی سب سے افضل صورت وہ ہے جس کا فائدہ عام ہو، جو برقرار اور جاری رہے، وقف میں عمومی فائدہ اور نفع ہے، اسی وجہ سے وہ ان عباداتی کاموں میں سے ہوگیا جن سے اللہ کی قربت حاصل ہوتی ہے، قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس پر ابھارا ہے، چنانچہ فرمایا:

"لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون وما تنفقوا من شئ فإن الله به عليم" (آل عمران: ۹۲)

(جب تک اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کروگے نیکی کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکوگے)

اسی طرح فرمایا: "مثل الذين ينفقون أموالهم في سبيل الله كمثل حبة أنبتت سبع سنابل في كل سنبلة مائة حبة والله يضاعف

لمن یشاء واللہ واسع علیم" (بقرہ: ۲۶۱)

(جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں، ان کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اس سے سات بالیں اگیں، ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں، اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے، اور اللہ بڑا وسعت والا ہے، بڑا علم والا ہے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إذا مات الإنسان انقطع عمله إلا من ثلاثة: وعدّ منها صدقة جارية'' (مسلم)

(جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا ہر عمل منقطع ہوجاتا ہے، بجز تین کے: ان میں سے آپ نے صدقہ جاریہ کا شمار فرمایا)

وقف دو وجوہ سے بقیہ صدقات اور ہدایات سے ممتاز ہے:

پہلی وجہ: اس کا تسلسل۔ دوسری وجہ: اس کی پائداری۔

پہلی وجہ:...... وقف کے تسلسل کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ وہ ان ابواب خیر میں سے ہے جن کا اجر وثواب جاری رہتا ہے، جیسا کہ حدیث گزری کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا ہر عمل منقطع ہوجاتا ہے، بجز تین کے، صدقہ جاریہ۔ واقف کی جانب سے وقف سے یہی مقصود ہوتا ہے۔

دوسرا پہلو خیر اور نیکی کے کاموں میں اس کے فائدہ کا تسلسل ہے جو کہ ملکیت کی منتقلی سے بھی منقطع نہیں ہوتا، امت کے اس سے مستفید ہونے کی جہت سے وقف کا یہی مقصود ہے۔

دوسری وجہ:...... یعنی وقف کی پائیداری جس کے معنی یہ ہیں کہ وقف ایک مستقل اسلامی مالیاتی ادارہ ہے جو اس میدان میں خرچ کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے جس کے لئے وقف ہوتا ہے، امت کو جب شدید حالات ومصائب پیش آتے ہیں اس وقت اس کی زبردست خدمت کرتا ہے، وقف اعمال خیر کے تسلسل اور پائیداری کا ذریعہ ہے، کیونکہ دعوتی، تعلیمی اور ریلیف کے کاموں نیز مدارس ومساجد پر خرچ کرنے میں اس کا بڑا کردار ہے۔

وقف کے ہونے سے وہ خدمات اور امت کے وہ فرائض اور سرگرمیاں نہیں رکتیں جو کم آمدنی اور کم انفاق سے رک سکتی تھیں۔ فقہاء نے وقف کی مشروعیت کی مندرجہ ذیل حکمتیں بیان کی ہیں:

۱- وقف کے ذریعہ مسلمانوں کے امداد باہمی کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔

۲- اس کے ذریعہ امت کے مصالح اور اس کی ضرورتیں انجام پاتی ہیں اور اس کی ترقی ونمو پذیری میں مدد ملتی ہے۔

۳- اس میں مال کی بقاء اور اس سے دائمی انتفاع کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

۴- یہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے اور اس سے اجر وثواب کا حصول ہوتا ہے۔

۵- اس سے نیکی وخیر کے کاموں کو دوام ملتا ہے۔

۶- وقف کے ذریعہ مال کو کھلواڑ سے بچایا جاسکتا ہے مثلاً اولاد کی فضول خرچی یا رشتہ دار کے غلط تصرف سے۔

مجموعی حیثیت سے وقف سے وسیع پیمانے پر اجتماعی مقاصد واہداف کی تکمیل ہوتی ہے، خیر کے وسیع الاطراف کام کیے جاسکتے ہیں، اسلامی معاشرہ کی ضروریات ومطالبات جیسے بھی ہوں ان میں مختلف طرح سے وقف کا استعمال ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخروی اجر وثواب تو ہے ہی۔

چہارم- ارکان وقف

کسی شی کا رکن اس کا وہ جزو لازم ہوتا ہے جس کے بغیر اس کا تحقق نہ ہوتا ہو، کسی معاملہ کا رکن وہ جز ہے جس کے بغیر وہ عقد وجود پذیر نہ ہو، ارکان وقف کے بیان میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، حنفیہ کی رائے ہے کہ یہ ہر وہ لفظ ہے جو وقف پر دلالت کرے۔ جمہور نے اس کے مندرجہ ذیل ارکان بتائے ہیں:

۱- واقف، ۲- جس پر وقف کیا جائے، ۳- موقوف، ۴- صیغۂ وقف۔

ابن نجیم البحر الرائق میں لکھتے ہیں کہ وقف کا رکن وہ الفاظ ہیں جو وقف پر دلالت کریں۔

خرشی لکھتے ہیں: وقف کے ارکان چار ہیں: عین موقوفہ، صیغہ وقف، واقف، موقوف علیہ۔

نووی نے کہا: اس کے ارکان چار ہیں: واقف، موقوف، موقوف علیہ اور صیغہ وقف۔

غایۃ المنتہی اور اس کی شرح مطالب اولی النہی میں ہے کہ وقف کے ارکان چار ہیں: واقف، موقوف علیہ، وہ لفظ جس کے ذریعہ وقف کیا جائے اور عین موقوفہ، فقہاء نے ان الفاظ کی دو قسمیں کی ہیں جن سے وقف منعقد ہوتا ہے:

پہلی قسم: صریح الفاظ یعنی جو وقف پر بغیر کسی قرینہ کے دلالت کریں اس طور پر کہ وہ اسی معنی میں استعمال ہوتے ہوں، وہ یہ ہیں: وقف، حبس، تسبیل، وقف کا لفظ تو اسی کے لئے موضوع لہ اور اسی سے معروف ہے، تحبیس اور تسبیل عرف شرع میں وقف کے لئے ثابت ہیں، مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا:

''حبس الأصل وسبل الثمرة'' (اصل کو روک کر اس کے پھل کو وقف کردو)۔

مختصر خلیل اور اس کی شرح الشرح الصغیر میں ہے: چوتھا رکن صریح صیغہ ہے جیسے وقفت، حبست، یا سبلت ہے۔ شیرازی نے لکھا ہے: وقف، حبس اور تسبیل یہ صریحی صیغے ہیں، ابن قدامہ نے مقنع میں لکھا ہے: وقف کا صریح صیغہ وقفت، حبست اور سبلت ہے۔ حنفیہ کی یہ رائے اوپر گزر چکی ہے کہ وہ وقف کے ارکان کو صیغہ میں محصور کرتے ہیں۔ خرشی کا کہنا ہے: اگر یوں کہے کہ میں نے فقراء اور مساکین یا طلبہ علم وغیرہ کے لئے صدقہ کیا، تو وقف صحیح اور ہمیشہ کے لئے ہوجائے گا بشرطیکہ اس نے اس میں اس قسم کی کوئی قید لگادی کہ اسے نہ بیچا جائے نہ ہبہ کیا جائے۔

شیرازی نے کہا: لفظ "تصدق" وقف کا کنایہ ہے، کیونکہ یہ لفظ صدقہ نافلہ اور وقف کے مابین مشترک ہے، اس لئے صرف اس لفظ سے وقف کرنا صحیح نہ ہوگا، البتہ اگر وقف کی نیت یا مندرجہ ذیل پانچ الفاظ میں سے کوئی لفظ اس سے جوڑ دے مثلاً کہے: ''تصدقت به صدقة موقوفة أو محبوسة أو مسبلة أو مؤبدة أو محرمة'' تو وقف ہوجائے گا یا تصدق کے ساتھ وقف کا حکم بیان کردے، مثلاً کہے: یہ وہ صدقہ ہے جسے نہ بیچا جاسکتا ہے نہ ہبہ کیا جاسکتا ہے نہ وراثت میں دیا جاسکتا ہے، تب بھی وقف ہوجائے گا، کیونکہ ان قرائن کے ساتھ اور کوئی احتمال باقی نہ رہے گا۔

دوسری قسم:...... الفاظ کنائی کی ہے، جن میں وقف کے علاوہ دوسرے معنی کا بھی احتمال ہو، جیسے صدقہ، نذر تو ان الفاظ سے وقف تبھی صحیح ہوگا جب ان کے ساتھ وقف کے معنی پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ بھی جوڑا جائے۔

ابن قدامہ کہتے ہیں: وقف کا کنایہ تصدقت، حرمت اور أبدت جیسے الفاظ ہیں، کنایہ سے وقف صحیح نہ ہوگا الا یہ کہ اس کی نیت ہو یا دوسرے الفاظ میں سے کوئی لفظ اس سے ملایا جائے یا وقف کا حکم بیان کیا جائے، مثلاً کوئی شخص کہے: میں نے صدقہ موقوفہ کردیا یا موقوفہ کے علاوہ محبسة، مسبلة، محرمة یا مؤبدة جیسے الفاظ استعمال کرے یا ساتھ میں یوں کہہ دے: اسے بیچا نہ جائے گا، نہ ہبہ کیا جائے گا اور نہ اس میں وراثت چلے گی۔

ابن قدامہ الشرح الکبیر میں لکھتے ہیں: اگر کنایات کے ساتھ تین میں سے کوئی چیز جوڑ دی جائے تو کنایہ کے لفظوں سے بھی وقف صحیح ہوجائے گا۔ وہ یہ ہیں:

۱- واقف وقف کی نیت کرے، تو نیت سے وہ باطن میں وقف ہوجائے گا، ظاہر میں نہیں۔

۲- یہ کہ اس میں کوئی لفظ پانچوں الفاظ میں سے جوڑ دیا جائے مثلاً کہے: صدقہ موقوفہ، یا محبسہ، یا مسبلہ یا مؤبدہ یا محرمہ۔

۳- یہ کہ واقف وقف کو اس کی صفات سے متصف کرے، مثلاً کہے: ''صدقة لا تباع، ولا توهب لا تورث''، اسی پر اکتفا کرے، کیونکہ ملزوم کا ذکر لازم کے صریح ذکر سے بے نیاز کردیتا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی بھی لفظ کسی مخصوص جہت میں مال وقف کرنے والا ہی استعمال کرے گا۔

پنجم- وقف بالفعل کا حکم

اس مبحث سے وقف بالفعل کا حکم بھی تعلق رکھتا ہے، اس بارے میں امام ابوحنیفہؒ، مالکیہ اور حنابلہؒ یہ کہتے ہیں کہ وقف بالفعل ثابت ہوجائے گا، اگر اس کے ساتھ ایسے قرائن پائے جائیں جو وقف پر دلالت کریں مثلاً واقف کوئی مسجد بنوادے اور اس میں نماز کی اجازت دے دے۔

مذہب حنفی:...... مرغینانی فرماتے ہیں کہ اگر مسجد بنادے گا تو اس سے اس کی ملکیت زائل نہ ہوگی جب تک اپنے طریقہ سے اسے ملکیت سے نکال نہ دے اور اس میں لوگوں کو نماز کی اجازت نہ دے دے۔ اگر کسی ایک نے نماز پڑھ لی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی ملکیت زائل ہوجائے گی، اسے ملکیت سے نکالنا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ اللہ تعالیٰ کے لئے خاص نہ ہوگی۔ اس میں نماز کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ حوالگی ضروری ہے اور تسلیم نوع کی

شرط ہے جو کہ مسجد ہونے کی صورت میں اس میں نماز سے ہی پوری ہوگی یا اس لئے کہ جب قبضہ دشوار ہو تو قبضہ کی جگہ اس کے مقصود کا تحقق لے لے گا پھر اس میں ایک کی نماز بھی کافی ہوگی، یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ سے منقول ایک روایت ہے، کیونکہ پوری جنس کا عمل دشوار ہے کہ ایک جماعت کے ذریعہ نماز کی ادائیگی کی شرط لگائی جائے، کیونکہ مسجد تو بالعموم اسی کے لئے بنائی ہی جاتی ہے، امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ اس کے قول "میں نے اسے مسجد کے لئے کردیا" سے اس کی ملکیت زائل ہوجائے گی۔

مالکی مذہب:......دسوقی شرح کبیر کے اپنے حاشیہ میں وقف کے صیغہ کے سلسلہ میں خلیل کے قول: حبست و وقفت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ایسے الفاظ جو حبست و وقفت کے قائم مقام ہوں، مثلاً تخلیہ کہ مسجد بنائے اور اس کے اور لوگوں کے بیچ تخلیہ کردے، اگر چہ مسجد کچھ لوگوں کے لئے مخصوص نہ ہو، نہ یہ تخصیص ہو کہ اس میں فرض پڑھی جائے نفل نہیں، لہذا مسجد بنا کر اس میں لوگوں کو نماز کی اجازت دینا بھی وقف کی تصریح کے مثل ہوگا۔ اگر چہ کسی وقف یا افراد کی تخصیص نہ ہو، ایسے ہی اگر نماز کو مقید نہ کرے کہ فرض ہی ہو، تو پھر کسی چیز کی ضرورت نہ ہوگی اور اس پر وقف کا حکم لگایا جائے گا۔

شافعی مذہب:......شیرازی کہتے ہیں: وقف صرف قول کے ذریعہ ہی درست ہے، لہذا اگر واقف نے کوئی مسجد بنوائی اور اس میں نماز ادا کی یا لوگوں کو اس میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی تو یہ وقف نہیں ہوا۔

امام نوویؒ کہتے ہیں: اگر مسجد کی طرز کی کوئی عمارت بنوائی یا کسی اور طرز کی کوئی عمارت بنوائی اور اس میں لوگوں کو نماز ادا کرنے کی اجازت دی تو وہ مسجد نہ ہوگی، اسی طرح اگر اپنی ملکیت میں تدفین کی اجازت دی تو اس سے وہ زمین قبرستان نہ ہوگی خواہ اس جگہ میں نماز ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، اسی طرح اس میں تدفین ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

حنبلی مذہب:......ابن قدامہ کہتے ہیں کہ امام احمد کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ وقف بالفعل اس پر دلالت کرنے والے قرائن کے ذریعہ ثابت ہوجاتا ہے، مثلاً مسجد بنائی اور اس میں لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دی، یا مقبرہ بنایا اور اس میں دفن کرنے کی اجازت دی یا پانی کی سبیل بنائی اور اس سے پینے کی لوگوں کو اجازت دی، کیونکہ امام احمدؒ نے ابوداؤد اور ابوطالب کی ایک روایت میں ایسے آدمی کے بارے میں جس نے مسجد میں کوئی مکان داخل کردیا اور نماز کی اجازت دی، کہا ہے کہ اسے رجوع کا حق نہ ہوگا، یہی حکم اس کا ہوگا جس نے قبرستان بنایا یا سبیل بنوائی اور لوگوں کو استعمال کی اجازت دے دی، اسے بھی رجوع کا حق نہ ہوگا۔

راجح یہی ہے کہ ایسی صورتوں میں اگر قرائن ہوں تو بالفعل وقف ثابت ہوجائے گا، کیونکہ عرف میں اس کا اعتبار ہے اور عرف میں اس پر وقف کی دلالت ہے، لہذا قول کی طرح عرف سے بھی وقف ثابت ہونا چاہیے مثلاً کسی نے اپنے مہمان کے سامنے کھانا پیش کیا تو عرف میں یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے کھانے کی اجازت دے دی، کسی نے راستہ میں پانی کا مٹکا رکھ دیا تو سمجھا جائے گا کہ اس نے یہ فی سبیل اللہ دے دیا ہے۔ کسی نے لوگوں میں کچھ بکھیر دیا تو سمجھا جائے گا کہ یہ اس کو لینے کی اجازت ہے، اسی طرح حمام میں داخل ہونا اور اس کا پانی بغیر اجازت کے استعمال کرنا دلالت حال کی وجہ سے مباح ہوگا۔ تو جس طرح بغیر لفظ بولے لین دین سے بیع ہوجاتی ہے اور دلالت حال سے ہبہ اور ہدیہ صحیح ہوجاتا ہے، اسی طرح یہاں وقف بھی ہوجائے گا۔

مبحث دوم

سماج کی ترقی میں رفاہی اوقاف کی اہمیت اوران کا مقام

بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بہت زیادہ اور بے شمار ہیں، اس نے فرمایا: "وإن تعدوا نعمة الله لا تحصوها إن الله غفور رحيم" (نحل: ۱۸) (اگر اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو گن نہ سکو گے، بلاشبہ اللہ غفور اور رحیم ہے)۔ ان نعمتوں میں سب سے بڑی اور عظیم تر اسلام کی نعمت ہے، اللہ نے فرمایا:

"يمنون عليك أن أسلموا قل لا تمنوا علي إسلامكم بل الله يمن عليكم أن هداكم للإيمان إن كنتم صادقين" (حجرات: ۱۷)

(یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی، اگر تم واقعی اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو)۔

اللہ کی نعمتیں تمام احوال، گوشوں اور میدانوں میں متعدد اور متنوع ہیں، یہ زبردست نعمتیں، عظیم احسانات اور بے شمار انعامات تمام ہی لوگوں کے لئے عام ہیں اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے، خفیہ، اعلانیہ اور ماضی، حال و مستقبل اور کائنات کی تمام باریکیوں کو محیط ہیں۔

مسلمان بندوں پر اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے یہ ہے کہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ رب العالمین کے پاس سے ایک متوازن شریعت لے کر آئے جس سے لوگوں کے دنیا و آخرت کے امور درست ہوں اور انہیں صراط مستقیم کی رہنمائی ملے۔ اللہ نے فرمایا:

"هو الذي بعث في الأميين رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفي ضلال مبين" (جمعہ: ۲)

(وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا، جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے)۔ اللہ نے ان کے لئے دین کی تکمیل کی اور ان پر دین کا اتمام کیا، فرمایا:

"أليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا"

(آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کردیا، اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے بطور پسند کرلیا)۔

انہیں خیر امت بنایا جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے، اسی طرح فرمایا: "كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله ولو آمن أهل الكتاب لكان خيرا لهم منهم المؤمنون وأكثرهم الفاسقون" (آل عمران: ۱۱۰)

(تم لوگ بہترین جماعت ہو، جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اہل کتاب بھی اگر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت خوب ہوتا، ان میں سے کچھ تو ایمان والے ہیں مگر اکثر ان میں سے نافرمان ہیں)۔

اس دین کی تکمیل یہ ہے کہ یہ زندگی کے تمام گوشوں کو محیط اور اس میں زندگی کے تمام مادی و معنوی اطراف شامل ہیں۔ یہ انسانی شخصیت کے تمام مطالبات وضروریات کو پورا کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خالق و قادر مطلق انسانی نفس کی تمام باریکیاں جانتا ہے۔ فرمایا:

"ونفس وما سواها فألهمها فجورها وتقواها قد أفلح من زكاها وقد خاب من دساها" (شمس: ۷-۱۰)

(اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا)۔ اور اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کی بغیر رنگ، زبان اور نسل کے اختلاف کے ضرورتیں پوری کرتا ہے، کیونکہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انسانیت کا بناؤ کس میں ہے اور بگاڑ کس میں، لہذا جن چیزوں میں بناؤ ہے ان کا حکم دیا، جن میں بگاڑ ہے ان سے روکا اور اسلامی قوانین کا وہ نظام دیا جو

اس دین کو کامل و مکمل کرتا ہے۔ اس نے اس نظام کو ہر زمان و مکان کے قابل بنایا جو زندگی کے امور کی تنظیم کرتا ہے، صحیح راستہ کی رہنمائی کرتا ہے، فاسد اور کج امور کو درست کرتا ہے۔ گم کردہ راہ کو راہ دکھاتا ہے۔ فقیر کی مدد کرتا، یتیم کی کفالت کرتا اور معاشرہ کے تمام افراد کے اندر ہمدردی کی روح پیدا کرتا ہے، یہ اللہ کا بڑا احسان، اس کا فضل اور بندوں پر اس کی بڑی رحمت ہے، وہ رحمان و رحیم ہے۔ اس نے اپنے رسول کو تمام انسانوں کے لئے آخری پیغام دے کر بھیجا ہے تا کہ آپ تمام دنیا والوں کے لئے رحمت بنیں، فرمایا: "وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين" (انبیاء: ۱۰۷) (اور ہم نے آپ کو (اے پیغمبر) دنیا جہان پر اپنی رحمت ہی کے لئے بھیجا ہے) اس رحمت نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو گھیر لیا ہے، لہذا وہ تمام اسلامی قوانین کی ایک صفت لازمہ ہے، رحمت ربانی شریعت اسلامیہ میں ظاہر ہے، اس کا احساس صرف وہی مسلمان کر سکتا ہے جو دین دار ہو اور ظاہری و باطنی طور پر دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہو، یہ تعلیمات ہمیشہ اس کے نفس کو صاف، قلب کو پاکیزہ، روح کو شفاف اور کردار بلند بنائیں گی، ہمیشہ اسے خیر پر عمل پیرا ہونے، نیک اعمال کرنے اور اللہ کی رضاجوئی کے لئے اپنی قیمتی سے قیمتی چیز قربان کرنے پر آمادہ کریں گی جس کا یہ حال اور یہ صفت ہو وہ ہمیشہ اپنے رب کی چوکھٹ پر پڑا رہے گا، جو شخص دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہو رحمت اس کے دل سے کبھی جدا نہیں ہوگی، وہ اسے چاہے گا، اسے لٹائے گا اور سب کو اسی کی نصیحت کرے گا جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

"ثم كان من الذين آمنوا وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمة" (بلد: ۱۷)

(پھر (اس کے ساتھ یہ کہ) آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور خلق خدا پر رحم کی تلقین کی)۔

کیونکہ اپنے ایمان کی رو سے وہ جانتا ہے کہ اللہ کی مخلوق پر رحم کر کے وہ خود اپنے لئے خدا کی رحمت لا رہا ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إنما يرحم الله عباده الرحماء" (بخاری) (اللہ اپنے بندوں میں ان ہی پر رحم کرتا ہے جو رحم دل ہوتے ہیں)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء" (طبرانی) (تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا)۔ اپنے ایمان و یقین، اور نبی کی تصدیق کے باعث وہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ مخلوق خدا پر رحم نہیں کرے گا تو اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائے گا بلکہ دنیاوی زندگی میں بھی بدبختی اس کے حصہ میں آئے گی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا تنزع الرحمة إلا من شقي" (رحمت کسی شقی کے دل سے ہی کھینچی جاتی ہے)۔

اس کے علاوہ سماج کے افراد کی باہمی ہمدردی کا عظیم حاصل اور بلند مقام مضبوطی اور وحدت ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق ہے کہ محبت باہمی اور آپسی تراحم و مہربانی میں مسلمانوں کی مثال جسد واحد کی ہے، جس کا کوئی عضو بیمار ہو جائے تو رات جگے اور بخار کے باعث سارے جسم پر اس کا اثر پڑے گا، اسی طرح ایک محرک اور بھی ہے جو جذبہ رحمت کو ابھارتا ہے اور آدمی کو خرچ کرنے اور لٹانے پر آمادہ کرتا ہے، وہ ہے مومن کی یہ خواہش کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"والذي نفسي بيده لا يؤمن أحدكم حتى يحب لأخيه ما يحب لنفسه" (مسلم)

(خدا کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ان بلند اسلامی قوانین کے اغراض و مقاصد اور حکمتوں پر جس کی بھی نظر ہوگی اسے معلوم ہوگا کہ وہ بنی نوع انسان کے مابین تکافل، تعاون اور وحدت کے سلسلہ میں اتنی بلندی پر ہیں کہ جہاں تک کوئی بھی وضعی قانون نہیں پہنچتا، کیونکہ یہ ایسے بشری قوانین ہیں جن کو خطاء، کمی یا نقص عارض ہوتا ہے، پھر اس قسم کی اسلامی تعلیمات دو بنیادوں پر مشتمل ہیں: دنیا کا اجر و ثواب تمام تر اشکال و انواع کے ساتھ اور آخرت کا ثواب جسے اللہ نے بندوں کے لئے تیار کیا ہے اور جس کی حقیقت محض اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ انفاق کے سلسلہ کی ہی اسلامی تعلیمات میں سے ایک میدان اوقاف کا بھی ہے، جس کا دائرۂ کار انسان کی ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل ہے۔ اوقاف انسان کو ایک ترقی یافتہ اور مہذب انتظام کے ذریعہ جس سے انسان کی ضرورت بھی پوری ہو اور انسان کی کرامت کی بھی حفاظت ہو، محتاجی اور تنگ دستی سے بچاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولقد كرمنا بني آدم" (بنی اسرائیل: ۷۰) (ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے)۔ یہ اسلامی قوانین انسان کو اس سے بچاتے ہیں کہ وہ اپنے کو ذلیل کرے یا اپنی توہین کرے، جو تنگی و محتاجی میں دست سوال دراز کرنے اور مانگنے سے ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ شریعت نے اسے اپنی تعلیمات اور قوانین کے ذریعہ نفس کے مطالبات اور ضروری حاجات بھی فراہم کر دیئے اور اس کو تذلیل سے بھی بچالیا۔ اس نے سماج کی تعمیر اور امن کی برقراری کے ساتھ ان ذرائع کو بھی بند کر دیا جو انسان کی ضرورت و محتاجی سے پیدا ہوتے ہیں اور اپنے اہل و عیال کی

ضرورتیں پوری کرنے میں وہ بہت سی غلطیاں کر گزرتا ہے۔

اس لئے ہم پاتے ہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ کے میدان میں اسلامی ہدایات فقر ومحتاجی کو دور کرنے کے مادی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اخروی ومعنوی پہلوؤں پر بھی مشتمل ہیں، جس کا ادراک فی سبیل اللہ خرچ کرنے والے کو ہوتا ہے۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بہترین منہج دیا ہے جس میں تزکیہ نفس اور سماج میں خیر کے کام علی الدوام کرتے رہنے کی ضمانت ہے، اس کے بہت سے راستے ہیں جن میں سب سے افضل وقف ہے، وقف وہ صدقہ جاریہ ہے جو سب سے زیادہ مکمل، سب سے زیادہ ثواب والا، عملی پہلو سے سب سے زیادہ مفید، سب سے زیادہ دائمی نفع کا حامل اور سب سے زیادہ پائیدار ہے، کیونکہ وہ سماج کی مضبوطی وتکافل کا تحفظ کرتا ہے، لوگوں میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز کاموں پر ابھارتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقف کو شریعت اسلامیہ میں زبردست مقام دیا گیا، اسے سب سے مؤکد سنت بتایا گیا اور اسے صدقہ وانفاق فی سبیل اللہ کے افضل ابواب میں سے قرار دیا گیا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''إذا مات ابن آدم انقطع عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له'' (مسلم)

(جب کسی آدمی کی موت ہوجاتی ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے، سوائے تین باتوں کے: صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مبارک سنت امت کو اللہ تعالی کے اس فرمان پر عمل کے لئے ابھارتی ہے:

"آمنوا بالله ورسوله وأنفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه فالذين آمنوا منكم وأنفقوا لهم أجر كبير" (حدید: ۷)

(ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جس مال میں اس نے تم کو دوسروں کا جانشین بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو، سو جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور خرچ کریں انہیں بڑا اجر حاصل ہوگا)۔

خیر کا کام کرنے والوں سے اللہ سبحانہ وتعالی نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، ارشاد ہے:

"ليس عليك هداهم ولكن الله يهدي من يشاء وما تنفقوا من خير فلأنفسكم وما تنفقون إلا ابتغاء وجه الله وما تنفقوا من خير يوف إليكم وأنتم لا تظلمون" (بقرہ: ۲۷۲)

(ان کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور تم جو کچھ بھی مال میں سے خرچ کرتے ہو سو اپنے لئے کرتے ہو اور تم اللہ ہی کی رضاجوئی کے لئے خرچ کرتے ہو اور تم مال میں سے جو کچھ بھی کرچ کرتے ہو سب تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا اور تم پر ذرا بھی زیادتی نہ کی جائے گی)

اور ارشاد ہے:

"لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون وما تنفقوا من شيء فإن الله به عليم" (آل عمران: ۹۲)

(جب تک تم اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کروگے نیکی کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکوگے اور جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے)۔

اسلام میں وقف کی تاریخ اور مسلمانوں کی زندگی میں اس کے اثرات کا مطالعہ کرنے والا پائے گا کہ وہ زندگی کے تمام تر شعبوں، علمی، سماجی اور اقتصادی وغیرہ میں اسلامی معاشرہ کے لئے بہت مفید حل پیش کرتا ہے، وقف کے ذریعہ سے ہی بہت سے گوشوں میں اسلامی تہذیب پھلی پھولی، چنانچہ اسلامی شہروں میں اسپتال بنائے گئے۔ فقراء ومساکین اور بیماروں کے لئے علاج کا انتظام کیا گیا، اسی طرح فقراء اور محتاجوں کے لئے سرائے بنائے گئے، مساجد کی تعمیر ہوئی، قرآن کریم کے حفظ کے حلقے قائم ہوئے، وقف سے چلنے والے دار المطالعے قائم ہوئے، یہ وقف کے وہ عظیم اثرات ہیں جو پوری مسلم دنیا پر پڑے۔

اسی سے دیکھا جاسکتا ہے کہ اسلامی معاشروں میں اسلامی اوقاف کے مثبت اور نتیجہ خیز اثرات کیا تھے اور انھوں نے مختلف اداروں میں اسلامی تہذیب کو مالا مال کرنے میں کیا بلند کردار ادا کیا، اسلامی معاشروں کو آگے بڑھانے اور ان میں مختلف اقتصادی، سماجی اور صحتی وترقیاتی ادارے قائم کرنے میں وہ کیا سرگرم کردار کرسکتے ہیں۔

علمی تحقیق، تعلیم وتربیت کتب خانوں اور علاج ومعالجہ اور طبی تحقیقات کے لئے اسپتال اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں آج بھی وقف کے کردار کو سرگرم بنایا جاسکتا ہے، نیز اس کے ذریعہ غربت کو دور کیا جاسکتا ہے، اس طرح کہ جو لوگ کام کرسکتے ہوں انہیں روزگار دیا جائے اور جو کام نہ کرسکتے ہوں ان کی ضرورتیں

پوری کی جائیں نیز اور بھی میدانوں میں اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سماجی، انسانی اور ترقیاتی پہلوؤں سے ہم پاتے ہیں کہ ان میدانوں میں وقف نے ماضی میں بھی زبردست کردار ادا کیا ہے اور یہ صدقات جاریہ کی سب سے عظیم اور درست ترین تعبیر ہے۔ ان صدقات کا جذبہ انسانی نفس میں اندر سے پیدا ہوتا ہے جو دینے، خرچ کرنے اور عمل خیر پر ابھارتا ہے، اللہ کی رضاجوئی کے علاوہ اور کوئی دباؤ، پابندی اور واجبات اس کے محرک نہیں بنتے، اس طرح دنیا میں مسلم معاشرہ کے افراد کے مابین تعاون اور تکافل ہوتا ہے، چونکہ مقصد نیک اور نیت بلند ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں باہمی میل ملاپ، محبت، تکافل اور وحدت باہمی پیدا ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

"وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲)

(ایک دوسرے کی مدد نیکی اور تقوی میں کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو) پر عمل ہوگا، اس لئے صدقات جاریہ کا درجہ بھی بہت بلند ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا فرمان الٰہی اہل خیر، ثروت منداور باغیرت افراد کو بڑی سخاوت کے ساتھ اسلامی معاشرہ میں ترقی اور اجتماعی کفالت کے تمام میدانوں میں خرچ کرنے پر ابھارتا ہے۔ یہ میدان وہ ہیں جو مسلم معاشرہ کی تمام ضرورتوں کو محیط ہیں اور اہم ترین گوشوں میں بہت بڑا رول ادا کرتے ہیں، یعنی سماج کو آگے بڑھانے کے لئے وہ کام کرنا جن میں یتیموں کی کفالت، فقراء و مساکین کی مدد، بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کی نگہداشت، دار العلوموں اور حفظ قرآن وغیرہ کے مدارس اور سماجی خدمات کے دیگر تمام گوشے آجاتے ہیں۔

اسلامی وقف نے سماجی مسائل کے حل میں ایک بڑا انسانی کردار ادا کیا جو تمام انسانی، اجتماعی، ترقیاتی، صحتی اور تعلیمی میدانوں میں ممتاز ہے، اسی طرح دعوت الی اللہ میں بھی اس کا کردار نمایاں ہے۔ اسی سے وہ نمونہ سامنے آیا جو ہر حال میں اور ہر زمان و مکان میں قابل تقلید ہے۔ اوقاف اسلامیہ کے اس کردار کا احیاء اس مبارک سنت نبوی کی طرف رجوع سے ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معاشرہ کی ترقی میں وقف کی ضرورت و اہمیت کے سلسلہ میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اسی طرح اس مبارک میدان میں جو لوگ خرچ کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں ان کے حوصلوں کو بلند کرنے کی ضرورت ہے، نیز موجودہ زمانے کے مطالبات کے موافق نظام وقف کے نئے خدوخال وضع کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

مبحث سوم

مطلقہ عورتوں، یتیموں، بیماروں اور بیواؤں کی خبر گیری میں اوقاف کی اہمیت

اسلام نے معاشرہ کے ان تمام طبقات کی طرف زبردست توجہ دی ہے، جو خبر گیری اور توجہ کے مستحق ہیں، اس میدان میں اس کے قوانین نہایت اہم ہیں، چنانچہ اس نے ان لوگوں کو زمانہ کے مصائب اور ظروف واحوال کے تغیرات کے تھپیڑے کھانے کے لئے بے یار ومددگار نہیں چھوڑ دیا تا کہ یہ مشکلات وپریشانیاں اسے بڑے خطرات اور خطرناک نتائج تک نہ پہنچادیں اور وہ ان حالات سے نمٹنے کی کوشش میں شریعت مخالف اقدامات نہ کر بیٹھیں۔ اس لئے اسلام شدت سے اس بات کا خواہاں ہے کہ ہر گروپ کے لئے جو تعاون وخبر گیری کا ضرورت مند ہوایسے قوانین بنائے جو اس کو مادی ومعنوی طور پر مصائب سے محفوظ رکھیں، اس کی ضرورتیں پوری کریں، اس نے کبھی زکاۃ جیسے فرائض کے ذریعہ اور کبھی انفاق فی سبیل اللہ اور خیر کے مختلف کاموں مثلاً وقف اور صدقات نافلہ وغیرہ پر ابھار کر مسلم معاشرہ کو ان قوانین کی پابندی کی تعلیم دی ہے۔

ان اوقاف کو اگر اللہ کے حسب منشا استعمال کیا جائے، ان کی سرمایہ کاری بہتر طور پر کی جائے اور شرعی دائرہ میں نیز زمانے کے مطالبات اور زمانی ومکانی احوال کو سامنے رکھا جائے تو مسلم سماج میں کوئی بھی ایسا گروپ نہ رہ جائے گا جس کو مدد وتعاون کی ضرورت ہوگی، ہر ایک کی ضرورت پوری ہوجائے گی۔ اسلامی قوانین کے دائرہ میں رہتے ہوئے ضرورت، محتاجی اور فقر کو دور کرنے میں کسی کی عزت پامال نہ ہوگی اور مسلم معاشرے کے تمام افراد میں تکافل، تعاون اور مضبوط تعلق قائم ہوجائے گا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پورا ہوجائے گا:

''مثل المؤمنين في توادهم وتعاطفهم وتراحمهم كمثل الجسد إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى''

(اپنی مودت باہمی، تعاطف اور تراحم میں مومنین کی مثال جسد واحد کی ہے، جس کا ایک عضو بھی اگر بیمار ہوجائے تو اس کا اثر سارے جسم پر رات کو جاگنے اور بخار سے پڑے گا)۔ اس طرح کوئی بھی گروپ بغیر مدد وتعاون اور خبر گیری کے نہیں رہ جائے گا۔

سماج کے ان حصوں میں جن کو اوقاف کی توجہ تاریخ کے مختلف ادوار میں حاصل رہی ہے وہ بھی ہیں جن کا حکم ہم یہاں بیان کریں گے یعنی مطلقات اور وہ بیوائیں جو ان کے حکم میں ہوں۔

اول- اسلام میں بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کی خبر گیری

اسلام نے مطلقات کے سلسلہ میں زبردست اہتمام کیا ہے، چاہے حفاظتی تدابیر کا معاملہ ہو یا علاج کا۔ حفاظتی تدابیر کے سلسلہ میں اسلام نے کوشش یہ کی ہے کہ سماج میں طلاق کے حالات کم سے کم ہوں، یہ صرف ضرورت اور ناگزیر حالات ہی میں ہو جبکہ اس کے بغیر کوئی حل ہی نہ ہو، اس سلسلہ میں اسلام نے دو متوازی حل پیش کیے ہیں جو یوں ہیں:

الف- اس کا انتظام کہ طلاق کے حالات کم سے کم ہوں

یہ اس طرح کہ شریعت میں طلاق کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور اللہ کے نزدیک اسے ابغض الحلال بتایا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز طلاق ہے (اسے بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے)۔

اسلام نے ان حالات کو دور کرنے کی کوشش پر ابھارا جو طلاق کی طرف لے جاتے ہوں تا کہ طلاق کے وقوع سے قبل ان کو حل کرنے کی کوشش ہو اور طلاق کے وقوع کو روکا جاسکے۔ اسلام نے یہ ضمانت دی ہے کہ اگر فریقین کی نیت صحیح ہو اور اصلاح حال کا ارادہ ہو اور اللہ کی خوشنودی مطلوب ہو تو دونوں کے مابین صلح ہوسکتی ہے۔

"وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا اصلاحا يوفق الله بينهما إن الله كان عليما خبيرا" (سورۂ نساء: ۳۵)۔

(اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کردو، اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی، تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا، بے شک اللہ تعالی بڑا ہی علم رکھنے والا ہے، ہر طرح باخبر ہے)

اور فرمایا:

"يأيها النبي قل لأزواجك إن كنتن تردن الحيوة الدنيا وزينتها فتعالين أمتعكن وأسرحكن سراحا جميلا" (سورۂ احزاب: ۲۸)۔

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کردوں)۔

اور فرمایا:

"يأيها الذين آمنوا إذا نكحتم المومنات ثم طلقتموهن من قبل أن تمسوهن فما لكم عليهن من عدة تعتدونها فمتعوهن وسرحوهن سراحا جميلا" (سورۂ احزاب: ۴۹)۔

(اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کرسکو، لہذا انہیں مال دو اور بھلے طریقہ سے رخصت کردو)۔

اور فرمایا:

"فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن" (سورۂ طلاق: ۶)۔

(پھر اگر وہ تمہارے لئے بچہ کو دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو)۔

"أسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن وإن كن أولات حمل فأنفقوا عليهن حتى يضعن حملهن" (سورۂ طلاق: ۶)۔

(ان کو (زمانہ عدت میں) اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو، جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو، اور انہیں تنگ کرنے کے لئے ان کو نہ ستاؤ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہوجائے)۔

نکاح کی ترغیب

ب- اسلام نے نوجوانوں کو شادی پر ابھارا ہے، خواہ کنواری عورت سے یا شوہر دیدہ سے۔ اللہ تعالی نے فرمایا:

"وأنكحوا الأيامى منكم والصالحين من عبادكم وإمائكم إن يكونوا فقراء يغنهم الله من فضله والله واسع عليم" (سورۂ نور: ۳۲)۔

(اور تم اپنے بے نکاحوں کا نکاح کرو اور تمہارے غلام اور باندیوں میں جو اس کے یعنی نکاح کے لائق ہوں ان کا بھی۔ اگر یہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کردے گا اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا جاننے والا ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج، ومن لم يستطع فعليه بالصوم فإنه له وجاء'' (صحیح بخاری)

(اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو نفقہ پر قادر ہو وہ شادی کرلے اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے، کیونکہ روزہ سے شہوانی قوت ٹوٹتی ہے)، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تنكح المرأة لأربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك'' (صحیح بخاری)۔

(عورت سے نکاح چار چیزوں کی وجہ سے کیا جاتا ہے: اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب کی وجہ سے، اس کے جمال کی وجہ سے، اس کے دین کی وجہ سے، تم دین دار کو ترجیح دو تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں)۔

اگر ایک مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات پر عمل کرے گا تو معاشرہ میں مطلقات کا تناسب بہت کم ہو جائے گا اور اس طرح اس مسئلہ پر بہت آسانی سے قابو پایا جاسکے گا۔

حجۃ الوداع میں آپ نے عورتوں کے حق میں عمومی اور بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کے حق میں خاص طور پر نصیحت کی، فرمایا:

"فإنكم أخذتموهن بأمانة الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف" (مسلم)۔

(عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے بدلے لیا ہے، اللہ کے کلمہ کے ذریعہ تم نے ان کی شرمگاہیں حلال کی ہیں، تمہارے اوپر ان کی روزی اور معروف کے مطابق ان کو پہنانا ہے)۔

جہاں تک بیواؤں کی بات ہے تو وہ عورتوں کے عموم میں تو داخل ہی ہیں لیکن اسلام نے جہاں مساکین اور محتاجوں کی مدد اور ان کی خبر گیری پر ابھارا ہے وہیں بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی ترغیب دی ہے: حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''الساعي على الأرملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله وأحسبه قال: وكالقائم الذي لا يفتر وكالصائم الذي لا يفطر'' (النووي)۔

(مسکین اور بیوا کی دیکھ بھال کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی مانند ہے۔ میرا گمان ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا: وہ رات میں اس عبادت کرنے والے شخص کی طرح ہے جو تھکتا نہیں اور اس روزہ دار کی مانند ہے جو افطار نہیں کرتا)۔

ہر زمانہ میں اسلامی اوقاف نے مطلقہ عورتوں اور بیواؤں وغیرہ کی مشکلات و مسائل کو حل کیا ہے اور فقر و تنگدستی کے وقت ان کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی ہے جب ان کے لئے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں، ان کے لئے اوقاف خاص کئے جاتے تھے جن کی آمدنی ان پر خرچ کی جاتی تھی، اسی طرح ان کو مکان دیئے جاتے، نفقہ اور لباس کا انتظام کیا جاتا، ان کو ہر وہ چیز دی جاتی جس سے ان کی ضرورت پوری ہوتی ہو، ان کی صحیح اسلامی طریقہ پر خبر گیری ہوتی اور ان کی اس کے لئے مدد کی جاتی کہ وہ کتاب اللہ کا حفظ کریں، شرعی علوم سیکھیں اور وہ کام بھی انھیں سکھائے جاتے تھے جو ایک مسلمان عورت کے لئے مناسب ہیں بلکہ وقف کے ادارے اس سے بھی آگے بڑھ کر شریعت کے مطابق ان کی شادی بھی کرتے تھے، تا کہ عورت کی حیاء اور عزت کا تحفظ ہو سکے۔

دوم- اسلام میں مریضوں کی دیکھ بھال

سماج میں جو طبقہ خبر گیری، توجہ اور مدد کا سب سے زیادہ مستحق ہے وہ بیماروں کا ہے، یہ وہ گروپ ہے جس کو مختلف حکمتوں اور اسباب کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ابتلاء میں ڈال دیا ہے اور اسی وجہ سے سماج کے دوسرے لوگوں پر ان کا یہ حق ہے کہ ان کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی کا سلوک کریں اور اگر بیماری کے ساتھ فقر و فاقہ، تنگ دستی اور احتیاج ہو اور علاج کرانے کی سکت بھی نہ ہو تو اس سے انسان اور زیادہ متاثر ہوتا ہے، اسی مشقت کے لحاظ سے مریض پر خرچ کرنے والے کا ثواب بھی بڑھ جاتا ہے۔

اسلام نے بحیثیت دین رحمت کے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے، اپنے قوانین کے ذریعہ انسانیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے اور اپنی عمومی ہدایات کے ذریعہ تکافل، اتحاد اور تعاون کے میدان میں ایک منفرد نظام دیا ہے، ان ہی عمومی ہدایات کے تحت مریضوں کی نگرانی، دیکھ بھال اور ان کی مدد بھی آجاتی ہے، تا آنکہ اللہ اپنے فضل و کرم سے انہیں شفاء عطا کرے، کیونکہ اس کی رحمت تو سبھی انسانوں کے لئے عام ہے۔

جہاں تک خصوصیت کے ساتھ مریضوں پر توجہ دینے کا تعلق ہے تو اسلام نے ان سے اعتناء کرنے، ان کی خبر گیری اور ان کے علاج و عیادت پر ابھارا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ ان کے حوصلوں کو بلند کیا جائے اور مادی و معنوی طور پر ان کی مدد کی جائے، تا آنکہ اللہ کے فضل سے وہ شفایاب ہو جائیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ باعتبار ضعف، مرض اور اپنی حالت کے اسلام نے ہمارے حال پر بہت توجہ دی ہے اور یہ بات سامنے رکھی ہے کہ سماج میں بیمار سب سے زیادہ مدد اور تعاون کے مستحق ہوتے ہیں، خاص کر جب کہ وہ فقیر و محتاج بھی ہوں۔ اسلام کی یہ توجہ بیمار کے علاج و معالجہ سے شروع ہو کر شفاء کے بعد بھی اس کی خبر گیری اور

اس وقت تک اس کی کفالت تک رہتی ہے جب تک وہ پوری طرح شفایاب ہوکر کام کاج کے لائق نہ ہوجائے۔اسی طرح اسلام نے اس پر بھی ابھارا ہے کہ بیمار کی عیادت کی جائے، کیونکہ عیادت سے اس کے حوصلے بلند ہوتے ہیں اور علاج پر بھی اس کا اچھا اثر پڑتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اس پر ابھارا ہے، چنانچہ فرمایا:

''حق المسلم على المسلم خمس: رد السلام، وعيادة المريض، واتباع الجنائز، وإجابة الدعوة وتشميت العاطس''۔
(مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا، مریض کی عیادت، جنازہ کے پیچھے چلنا، دعوت قبول کرنا اور چھینکنے والے کی چھینک کا جواب دینا)، نیز آپ نے فرمایا:

''عودوا المريض وأطعموا الجائع وفكوا العاني'' (بخاری)۔
(مریض کی عیادت کرو، بھوکے کو کھلاؤ اور مصیبت زدہ کی مدد کرو)، اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''من عاد مريضا وزار اخا له في الله ناداه مناد بأن طبت وطاب ممشاك وتبوأت من الجنة منزلًا'' (سنن ابن ماجہ)۔
(جس نے کسی بیمار کی عیادت کی یا اللہ فی اللہ اپنے کسی بھائی سے ملاقات کی تو اسے ایک ندا دینے والا پکارتا ہے کہ تم خوش رہو تمہارا چلنا مبارک ہو اور تم جنت میں ایک گھر پاؤ)۔اسی طرح ایک حدیث قدسی میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''إن الله عزوجل يقول يوم القيامة: يا ابن آدم مرضت فلم تعدني قال: يارب كيف أعودك وأنت رب العالمين، قال: أما علمت أن عبدي فلانًا مرض فلم تعده أما علمت أنك لو عدته لوجدتني عنده. . .'' (رواہ مسلم)
(اللہ تعالیٰ قیامت میں فرمائے گا: آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، وہ کہے گا، میرے رب تو تو رب العالمین ہے، میں تیری عیادت کیسے کرتا، کہے گا: تجھے معلوم نہیں ہوا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا لیکن تو نے اس کی زیارت نہیں کی، تو نہیں جانتا کہ اگر اس کی عیادت کرتا تو مجھے بھی اس کے پاس پاتا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ہدایات بیماروں کی خبر گیری، توجہ، علاج اور ان کی عیادت کے سلسلہ میں بہت ہیں۔اس سلسلہ میں وہ نصوص بھی ہیں جو باہمی ہمدردی اور تعاون پر ابھارتی ہیں اور ایسے نصوص بھی ہیں جو خاص طور پر بیماروں سے متعلق ہیں۔

اسلام کے ہر عہد میں اوقاف نے ایک عظیم کردار ادا کیا ہے، آج بھی جبکہ نت نئے امراض ظاہر ہورہے ہیں جن کو اب سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا، اوقاف کے اس کردار کو زندہ کیا جاسکتا اور ان کے نقوش کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

آج اگرچہ تشخیص وعلاج کے طریقوں میں تبدیلی آگئی ہے اور علاج کے طریقوں میں ترقی ہوئی ہے، لیکن علاج معالجہ پر اتنا زیادہ صرفہ آتا ہے کہ فقراء ومساکین اور محتاج لوگ اس کی استطاعت نہیں رکھتے، لہذا آج شدید ضرورت ہے کہ مریضوں اور اسپتالوں کے لئے اوقاف قائم کرنے کا اہتمام کیا جائے اور بطور خاص غریب اور محتاج بیماروں کی مدد وتعاون کے لئے وقف کے فنڈ قائم کئے جائیں۔

مبحث چہارم

تعلیم اور دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں اوقاف کی اہمیت

علم وتعلیم اور دعوت الی اللہ دو عظیم کام اور ایسے میدان ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مقام بلند کیا ہے، ان کی عزت بڑھائی ہے اور ان کے ذمہ داران وکارکنان کی عزت افزائی کی ہے، دنیا میں ان کی جو توقیر ہوتی ہے اور جو اعتراف فضل ہوتا ہے وہ تو الگ آخرت میں اجر عظیم کا وعدہ بھی ان سے فرمایا ہے۔ ان دونوں کاموں سے اسلام نے اتنا زبردست اعتناء کیا ہے کہ جس کی کوئی نظیر سابق یا بعد کے کسی نظام وقانون میں نہیں ملتی، ان کے شرف کے لئے یہ کافی ہے کہ کتاب اللہ کی سب سے پہلی آیت وہ ہے جو قراءت (پڑھنا) کی دعوت دیتی ہے اور قراءت ہی علم وتعلم کا دروازہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اقرأ باسم ربك الذي خلق، خلق الإنسان من علق، اقرأ وربك الأكرم، الذي علم بالقلم، علم الإنسان مالم يعلم" (سورۂ علق: ۱-۵)۔

(پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہ جانتا تھا)۔

ان آیات کریمہ میں غور وفکر کرنے والا پائے گا کہ مضمون کی ابتداء قرأت سے ہوئی پھر قلم کا بیان ہوا اور قلم ہی کتابت کا وسیلہ اور علم وتعلیم کا رمز ہے، اس کے بعد بتایا گیا کہ خدا نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔

اس سے دین اسلام کا راست طریق کار معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے درجہ میں توحید خالص کا دین تو ہے ہی، اس کے بعد وہ علم ومعرفت کا دین ہے، جس میں لوگوں کو امور دین سکھائے جاتے ہیں، انھیں حق کی اور صراط مستقیم کی دعوت دی جاتی ہے، اسی سے مولیٰ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل بھی ہوتی ہے جس کا ارشاد ہے:

"ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر وأولئك هم المفلحون" (سورۂ آل عمران: ۱۰۴)۔

(اور ضرور ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت رہے، جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیا کرے اور بدی سے روکا کرے اور پورے کامیاب یہی تو ہیں)۔

اسی طرح فرمایا:

"وما كان المؤمنون لينفروا كافة فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون" (سورۂ توبہ: ۱۲۲)۔

(اور مؤمنوں کو نہ چاہئے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں، سو یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں ایک حصہ نکل کھڑا ہوتا کہ باقی لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور تا کہ یہ اپنی قوم والوں کو جب وہ ان کے پاس واپس آئیں ڈرائیں، عجب کیا کہ وہ محتاط رہیں)، نیز فرمایا:

"قل هذه سبيلي أدعو إلى الله على بصيرة أنا ومن اتبعني وسبحان الله وما أنا من المشركين" (سورۂ یوسف: ۱۰۸)۔

(آپ کہہ دیجئے کہ میرا طریق یہی ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے پیرو بھی اور پاک ہے اللہ اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں)۔

قرآن میں بہت سی نصوص وارد ہیں جو علماء کی شان بلند کرتی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین أوتوا العلم درجات واللہ بما تعملون خبیر" (سورۂ مجادلہ: ۱۱)۔

(تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو اس کی خبر ہے)۔

اللہ نے بتایا کہ علماء وہ لوگ ہیں جو اپنی معرفت الٰہی، حلال وحرام کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کے امر ونہی کی پابندی کے باعث لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ فرمایا:

"إنما یخشی اللہ من عبادہ العلماء إن اللہ عزیز غفور" (سورۂ فاطر: ۲۸)۔

(حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں، بے شک اللہ زبردست اور درگذر فرمانے والا ہے)۔

وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں جس نے ارشاد فرمایا:

"لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعھا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت ربنا لا تؤاخذنا إن نسینا أو أخطأنا ربنا ولا تحمل علینا إصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا أنت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین" (سورۂ بقرہ: ۲۸۶)۔

(اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا مگر اس کے بساط کے مطابق، اسے ملے گا وہی جو کچھ اس نے کمایا اور اس پر پڑے گا وہی، جو کچھ اس نے کمایا، اے ہمارے پروردگار ہم پر گرفت نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں، اے ہمارے پروردگار ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ڈالا تھا ان لوگوں پر جو ہم سے پیشتر تھے، اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ نہ اٹھوا جس کی برداشت ہم سے نہ ہو، اور ہم سے درگذر کر اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہی ہمارا کارساز ہے، سو ہم کو غالب کر کافر لوگوں پر)۔

اسلام میں علم وعلماء اور تعلیم کی اس زبردست اہمیت کے پیش نظر اور علی وجہ البصیرۃ دعوت الی اللہ، اللہ کے دین کی حفاظت اور اسلامی معاشرہ میں ان کی شدید ضرورت کے باعث، معاشرہ کی رفعت شان، ترقی اور اللہ کے دین کی نشر واشاعت اور امور دین اور عقیدہ کی حفاظت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے، اسلامی اوقاف نے تاریخ کے تمام ادوار میں علم اور دعوت الی اللہ کے میدانوں میں ایک بڑا کردار ادا کیا اور ہمیشہ ان امور کو اوقاف کی بڑی توجہ وعنایت حاصل رہی، ان پر زیادہ سے زیادہ خرچ کیا گیا، ان کے تحفظ کی کوشش ہوئی اور ان کے ذمہ داران وکارکنان کو عزت وتوقیر ملی، اس سے وہ علم اور دعوت کے میدان میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے کے قابل ہوسکے۔

علم وتعلیم اور خاص کر شرعی علوم کی اشاعت کے سلسلہ میں اسلامی اوقاف نے وہ زبردست اور نمایاں کردار ادا کیا کہ اس کی تفصیل اس مختصر مقالہ میں بیان کرنا مشکل ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم وتعلیم کے ان اوقاف میں مشترک قدر یہ تھی کہ وہ ان کاموں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں جبکہ موجودہ دور کی طرح سرکاری ادارے اور ایجنسیاں اور وزارتیں نہیں ہوتی تھیں جو تعلیم وغیرہ پر خرچ کریں، اس صورت میں تمام تر انحصار صرف اوقاف کی مالیات اور ان کی آمدنی پر تھا جن کا فیض تعلیم علوم اور حفظ قرآن کے تمام حلقوں کو پہنچتا تھا بلکہ علم وتعلیم کا کوئی بھی گوشہ ان کے فیض سے محروم نہ تھا جیسا کہ تاریخی مراجع بتاتے ہیں، ان کے مطابق وہ چاہے مساجد میں لگنے والے علم کے حلقے ہوں یا الگ سے مدارس کا قیام ہو، سب کے لئے مالی بنیاد وقف ہی تھا۔ متعدد تاریخی مصادر بتاتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں تمام تعلیمی ادارے وقف کے نظام کے ماتحت تھے۔

لہٰذا اگر اوقاف کا نظام نہ ہوتا بطور خاص عہد مملوکی میں تو یہ مدارس اپنی بنیاد کھودیتے۔ تعلیم اور مدارس کے سلسلہ میں اوقاف جو اخراجات کیا کرتے تھے ان میں مدارس کی تعمیر، مدرسین کی تنخواہیں طلبہ کی ضرورتیں مثلاً کتابیں، روشنائی، کاغذ، کھانا اور لباس وغیرہ سب شامل تھے، تاریخ بتاتی

ہے کہ ابوصالح احمد بن عبدالمالک المؤذن النیساپوری کتب حدیث کے ذخیرہ کی دیکھ بھال کرتے تھے اوران کی حفاظت کے لئے اوقاف سے انہیں سرمایہ ملتا تھا۔ کچھ اوقاف محدثین کی ضروریات روشنائی وغیرہ فراہم کرتے تھے۔

القدس میں المدرسۃ العمریہ کا وقف تھا جس میں طلبہ کو روزانہ تقریباً ایک ہزار روٹی دی جاتی تھی، اس کے علاوہ دیگر اوقاف سے کپڑے، برتن، وضو کے لوٹے اور روشنی کے لئے تیل فراہم کیے جاتے تھے۔ اس طرح علم کے حلقے، مدارس اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق تمام اموران ہی اوقاف سے انجام پاتے تھے، پورے عالم اسلامی میں بڑی مساجد بھی حفظ قرآن، علم کے حلقوں اور علوم شرعیہ کی اشاعت کی مرکز تھیں، مثلاً مکہ مکرمہ میں مسجد حرام، مدینہ منورہ میں مسجد نبوی، مسجد بصرہ، مسجد کوفہ، مسجد قرطبہ، الجامع الاموی، قاہرہ میں مسجد عمرو بن العاص، حتی کہ بعض مساجد میں علوم کے حلقے وسعت اختیار کر کے پوری پوری یونیورسٹیاں بن گئیں، مثلاً جامع قرطبہ، الجامع الازہر، جامع القرویین، جامع الزیتونہ وغیرہ، ان تمام سرگرمیوں کو سرمایہ مذکورہ چیریٹیبل اوقاف ہی فراہم کرتے تھے۔

اس مختصر مقالہ میں ذکر کردہ تفصیلات سے ہمیں یہ تحریک ملتی ہے کہ اوقاف کو ہم اس کا سابقہ کردار لوٹائیں خاص کر اس لئے بھی آج مسلم معاشروں میں آبادی بڑھ چکی ہے، تعلیم کے اخراجات بڑے مہنگے ہوگئے ہیں اور کئی مسلم ممالک تنہا اپنے فرزندوں کی تعلیم وتربیت کے اخراجات اٹھانے کے متحمل نہیں ہیں۔ لہذا ایسے ملکوں کو شدید ضرورت ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کی مدد وتعاون کرے، یہ تعاون اوقاف کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ ان اوقاف کے ساتھ جو تعلیمی میدان کے لئے مختص ہوں ہر ملک کے ساتھ اصحاب ثروت کے عطیے اور چندے بھی تعلیمی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کریں، اس سے علمی سرگرمیاں اپنے سابقہ کردار کی طرف لوٹ آئیں گی، اوقاف کے سرمایے اور آمدنیاں ان کو بنیادی طور پر مالیات فراہم کریں گی۔

دعوت وتحفظ دین

دعوت وتبلیغ اور تحفظ دین کے میدان میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ تمام اسلامی ادوار میں اسلامی اوقاف بڑا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دو عامل بنیادی کردار ادا کرتے تھے جو اہل خیر کو مذکورہ میدانوں میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے پر ابھارتے تھے۔

پہلا عامل

پہلا عامل یہ تھا کہ وقف انفاق کے ان راستوں میں سے ہے جس پر بہت ابھارا گیا ہے۔ اس میں خرچ کرنا تزکیہ نفس بھی ہے اور خیر ومعروف کو برقرار رکھنا بھی۔ یہ ان طریقوں میں سے ہے جو خالصتاً اللہ کے لئے نیکی اور انفاق کے ہیں جو زیادہ نفع بخش، زیادہ اجر والے، زیادہ مفید اور زیادہ پائیدار اثرات والے ہیں۔ کیونکہ انفاق کا یہ طریقہ سماج کی مضبوطی، یک جہتی اور تکافل کی حفاظت میں حصہ لیتا ہے۔ انسانی قلوب سے کینے دور کرتا ہے اور معاشرہ کے تمام افراد میں محبت واتحاد پیدا کرتا ہے۔ دنیا وآخرت میں اس کے فضل کے تذکروں سے کتاب وسنت کی نصوص بھری پڑی ہیں۔

دوسرا عامل

دوسرا عامل دعوت الی اللہ کی فضیلت، اس میں مشغول ہونے کی فضیلت اور اس کے کارکنان وذمہ داران کا مقام ومرتبہ ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، اسی طرح لوگوں کے امور دین کو سیکھنے اور عبادت وغیرہ دوسرے اعمال کو صحیح طریقہ پر ادا کرنے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی فضیلت اور معاشرہ کی صلاح وفلاح میں اس پہلو کی اہمیت ہے۔ نیز یہ کہ ان امور میں مشغول ہونے والوں اور کارکنوں سے آخرت میں اجر عظیم کا وعدہ ہے، کیونکہ یہ کام وہ خالصتاً لوجہ اللہ کرتے ہیں۔ انفاق، دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کے جو کام ہیں وہ سب اللہ کی خوشنودی ورضا کے حصول کے لئے کئے جاتے ہیں اور جو لوگ بھی ان کاموں میں سرمایہ لگاتے ہیں انہیں اجر وثواب کی بشارت ہے۔

اس طرح دو عامل تھے جو لوگوں کو خیر کے کاموں میں خرچ اور انفاق پر آمادہ کرتے تھے۔ خاص طور پر ان میں خرچ کرنے پر آخرت میں جو اجر عظیم ملے گا اس کے باعث اہل خیر اور غیرت منداہل ثروت کو اللہ کے راستہ میں، دین کی دعوت وتبلیغ میں اور تحفظ دین کے میدانوں میں خوب خوب

خرچ کرنے کی تحریک ملتی تھی۔ اسی طرح اپنے ہم مذہب یا ہم جنس محتاج وغریب انسانوں کی شدید ضروریات زندگی کا پورا کرنا بھی خیر وثواب کے کاموں میں آتا ہے، ساتھ ہی دین کی دعوت جو تمام حاجتوں اور ضرورتوں سے بڑھ کر حقیقی اور ضروری ہے، جیسا کہ علامہ ابن القیمؒ نے صراحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''لوگوں کو شریعت کی ضرورت ان کی دوسری تمام حاجتوں سے بڑھ کر ہے حتی کہ شریعت کی انہیں اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے جتنی سانس لینے کی ہوتی ہے، کھانے اور پینے کا تو ذکر ہی کیا ہے، کیونکہ سانس نہ لینے اور کھانا پانی نہ ملنے سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ موت آجائے گی جبکہ شریعت نہ ہونے سے روح اور دل تمام فاسد ہوجائیں گے۔ ابدی ہلاکت ہوگی، ان دونوں کے مابین زمین وآسمان کا فرق ہے، موت سے صرف بدن ہلاک ہوتا ہے، لہذا لوگوں کو رسول اکرم ﷺ کی دعوت کی معرفت، اس کی دعوت، اس پر صبر، اس کے لئے شریعت سے بغاوت کرنے والوں سے جہاد جب تک کہ وہ اس میں واپس نہ آجائیں کی ضرورت سب سے زیادہ شدید ہے اور دنیا میں بناؤ اور صلاح اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا''۔

معاشرہ کی اصلاح اور صراط مستقیم پر استقامت، اللہ کے دین کی حفاظت، دین کے بارے میں شکوک وشبہات کو دور کرنا، لوگوں کو امور دین سکھانا وغیرہ جیسے عظیم مقاصد ہیں جنھوں نے آخرت کے ثواب اور اللہ کے ساتھ نفع بخش تجارت کے ساتھ مل کر ایک زبردست محرک کی شکل اختیار کر لی اور اسی محرک نے مسلم معاشروں میں لوگوں کو اپنے مال وسرمایے اللہ کے دین کی دعوت اور اس کی حفاظت میں لگا دینے پر ابھارا، چنانچہ وقف کے مالوں اور جائیدادوں کی کثرت ہوگئی، وقف کی صورتیں بھی بڑھتی گئیں، حتی کہ وقف نے علم ودعوت الی اللہ کے مختلف میدانوں کے مطالبات پورے کئے بلکہ بعض اوقاف کی آمدنیاں ان کے اخراجات سے بھی بڑھ گئیں، ان سب کی تفصیلات کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

عصر حاضر میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نیکی وخیر اور دعوت دین کے کاموں کو برابر اہل خیر اور ثروت مند اپنے سرمایوں اور مالیات سے فیض پہنچاتے رہے ہیں جو رضائے الٰہی کے لئے ان میدانوں میں مسابقت کر رہے ہیں۔ الحمد للہ کہ آج تک لوگ بھی رسول اکرم ﷺ، صحابہؓ اور سلف امت کی اقتدا کر رہے ہیں، کیونکہ امت محمدیہ میں خیر قیامت تک باقی ہے۔ ہم پاتے ہیں کہ ان میں بہت سے لوگ مسجدوں کی تعمیر، داعیوں کی کفالت، دعوتی کتابوں کی طباعت اور دعوت کے دیگر مطالبات وضروریات پر خرچ کرنے کے لئے مسابقت کر رہے ہیں۔

اس وجہ سے ہمیں بھی ان کی پیروی اور ان کی اقتداء کی ضرورت ہے، کتاب وسنت اور عمل صحابہؓ کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ ہم خیر کے اس کام کو ترقی دیں اور نئے نئے گوشے وا کریں جو موجودہ زمانے کے مطالبات کے مطابق ہوں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ وقف کے مخصوص فنڈ قائم کیے جائیں جو خیر کے کاموں کے لئے ہوں تاکہ یہ دعوت الی اللہ اور تحفظ دین کے میدانوں کے لئے مالی ذرائع اور مادی مدد وخیر کا نہ سوکھنے والا سرچشمہ اور غیر منقطع ذریعہ بن جائیں۔ ہمیں یہ بھی کرنا چاہیے کہ ان فنڈز میں سماج کے تمام لوگوں کے لئے حصہ لینے کا دروازہ کھولیں، کیونکہ اس سے فرد ومعاشرہ پر اس کے اچھے اثرات پڑیں گے اور دنیا وآخرت کی بھلائی حاصل ہوگی۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اردگرد میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے عیسائی چرچوں اور ان کی مشنریز کے لئے کتنا مال وقف کر رکھا ہے حتی کہ ایک ایک مشنری چرچ کی آمدنی اور بجٹ اتنا ہوتا ہے کہ پوری پوری حکومتوں کا بھی اتنا بڑا بجٹ نہیں ہوتا۔

خاتمہ بحث:

اب میں اس مقالہ کے آخر میں بعض سفارشات پیش کرتا ہوں، تاکہ جب اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا معاشرہ کی دعوتی، تعلیمی اور صحتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نئے اوقاف قائم کرے تو ان سفارشات سے بھی فائدہ اٹھائے، یہ سفارشات سرخیاں ہیں اور فقہ اکیڈمی ان کو وسعت دے کر عملی زمین پر ان کو فعال بنا سکتی ہے تاکہ بننے والے اوقاف سلامت بھی رہیں، صحیح سمت میں کام کریں اور ان سے جو آمدنیاں حاصل ہوں وہ خیر وفلاح کے منابع بنیں جن سے معاشرہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے مستفید ہو۔

۱- سب سے پہلے تو یہ کہ اوقاف کو صحیح شرعی اصول پر قائم کیا جائے جو اس میدان میں کتاب وسنت اور عمل صحابہ سے مستفاد ہوں۔

۲- ایسا شرعی بامقصد ابلاغی پروجیکٹ بنایا جائے جس کے وسیلہ سے لوگوں کو وقف اور اس کی شرعی اصل سے واقف کرایا جائے اور مسلمانوں کی زندگی میں اس کے تصور کو راسخ کیا جاسکے۔

۳- وقف کے انتظامی امور کے لئے وہ انتظامی ڈھانچہ اختیار کیا جائے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے احوال وظروف کے مطابق ہو اور جس میں ان کے قانونی اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات کی رعایت رکھی گئی ہو۔

۴- انتظامی ڈھانچہ کی بنیادوں کو ترقی دی جائے اور معلومات کو قابل اعتماد شکل میں مرتب کیا جائے اور اس کے لئے مینجمنٹ کے جدید ترین نظریات اور سائنٹفک تکنیک کو اختیار کیا جائے تاکہ اوقاف کی تنظیمی تاسیس اس کے کاموں کے مطابق ہو اور وہ فعال شکل میں اپنا مشن انجام دیں اور جو واقفین کی شرائط کے بھی مطابق ہو، اس کے لئے کمپیوٹر اور پروگرامنگ کی جدید ترین ٹکنالوجی سے استفادہ ناگزیر ہے جس سے اوقاف کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔

۵- اوقاف کے تمام کاموں کی بہتر پلاننگ ہو، اس کے لئے مختصر مدتی اور طویل مدتی منصوبے بنائے جائیں جو کہ آخر کار اوقاف کے تمام مطلوبہ کاموں اور سرگرمیوں کی تکمیل پر منتج ہوں گے۔

۶- معاشرہ کے مطالبات اور ضروریات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تاکہ ان میدانوں کی تحدید کی جاسکے جن میں اوقاف کام کریں گے کہ وہ ضروریات سماجی ہیں، صحت سے متعلق ہیں یا تعلیمی یا دعوتی وغیرہ۔

۷- وقف اور سرمایہ کاری کی نئی صورتیں پیدا کی جائیں جو ان مطالبات کو پورا کرسکیں جن کا ذکر اوپر آیا اور ساتھ ہی اس مالی معیار کے مطابق بھی ہوں کہ سماج کے افراد اس میں شامل ہوسکیں، یعنی وہ صورتیں وقف کے کاموں میں اکثر لوگوں کو حصہ داری کی اجازت دیتی ہوں۔

۸- معاشرہ میں جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں یا ان میں سے کسی ایک میدان میں وقف کے فنڈ بنائے جائیں۔ اس کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ معاشرہ کو کس میدان اور کس چیز میں تعاون کی زیادہ ضرورت ہے۔

۹- وقف کے کاموں کا باریک بینی سے جائزہ اور وقفہ وقفہ سے احتساب کیا جائے تاکہ خرابیوں کو جان کر ان کی تلافی کی جائے اور خوبیوں کو پرکھ کر مزید آگے بڑھا جائے۔ اس کے لئے ایک باصلاحیت اور ماہر مینجمنٹ کی ضرورت ہوگی۔

۱۰- سماج کے ثروت مند اور تاجر طبقہ سے سماج کے تعلقات کو مضبوط بنایا جائے، اس کے لئے مختلف وسائل اور چینل استعمال کیے جاسکتے ہیں، تاکہ ان کے ذریعہ ان اوقاف کو مادی ومعنوی طور پر تعاون ملتا رہے۔

۱۱- وقف کرنے والوں کی شرطوں کو پوری باریکی کے ساتھ نوٹ کیا جائے تاکہ اوقاف کی حاصل شدہ آمدنیوں کو وقف شدہ میدان میں ہی خرچ کیا جائے اور اس طرح شرعی مصارف میں ان کا صرف عمل میں آئے۔

۱۲- اوقاف کے انتظام اور سرمایہ کاری کے لئے انتظامی اور سرمایہ کاری کی صلاحیتوں کو بڑھایا جائے اور ان کو کام میں لایا جائے جو ممتاز بھی ہوں اور اجر وثواب کی نیت سے کام بھی کریں۔

☆☆☆

تفصیلی مقالات:

سماج کے سنگین مسائل کے حل کے لئے اوقاف کا قیام

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی [1]

۱- اس مسئلہ کے تبرع اور قربت فی ذاتہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں جو وقف کی اصل روح ہے۔ علامہ شامی تحریر کرتے ہیں: "ان الوقف تبرع"۔

صاحب تنویر الابصار رقم طراز ہیں: "وأن یکون قربة فی ذاته"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ تحریر کرتے ہیں: "فأجاب: الحمد لله الأصل في هذا أن كل ما شرط من العمل من الوقوف التي توقف على الأعمال فلا بد أن تكون قربة" جن اوقاف میں یہ لابدی عنصر موجود نہ ہوگا وہ وقف ہی باطل ہوگا۔

بنابریں مذکورہ عبارتوں سے بطریق تحقیق مناط مطلقہ اور بیوہ خواتین کے لئے اوقاف کی گنجائش نکلنی چاہئے، نیز ایک صریح فقہی جزیہ بھی موجود ہے:

"وقال: من طلقت فلها أيضًا قسط من الوقف" (البحر الرائق ۱۹۹،د) مطلقہ اور بیوہ کو بھی وقف سے دیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ سوال میں تحریر کردہ مشکلات و پریشانیوں کا حل یہی ہونا چاہئے کہ ایسی بے سہارا و مجبور خواتین کے لئے نظام اوقاف قائم کیا جائے۔

اسلام کی تابناک اور روشن تاریخ میں اوقاف کی آمدنیاں دفاعی امور، افلاس زدہ لوگوں کی امداد، علوم و ثقافت کو فروغ دینے اور رفاہی مصارف میں خرچ کی جاتی تھیں۔

علامہ ابن قدامہ کی تحریر سے بھی جواز کی گنجائش نکلتی ہے:

"وسائر الوقف يصرف إلى كل ما فيه أجر ومثوبة وخير" (المغنی مع شرحہ ۶/ ۲۱۳)۔

۲- فقہاء کی آراء و نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف درست ہیں:

"قال شمس الائمة: فعلى هذا إذا وقف على طلبة علم بلدة كذا يجوز؛ لأن الفقر غالب فيهم" (البحر الرائق ۵/ ۱۹۹، الفتاوی البزازیہ علی هامش الهندیہ ۶/ ۲۵۸)۔

نیز اس کے وجوہ خیر میں سے ہونے کے باعث بھی اس میں وقف درست ہے:

"الثاني موقوفة صدقة على وجوه البر والخير أو اليتامى جاز مؤبدًا كالفقراء" (بحر ۵/ ۲۰۰)۔

جس طرح قرآن عزیز کے مساجد و مدارس پر وقف کرنے کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے، اسی طرح اس پر قیاس کرتے ہوئے اہل علم نے دینی کتابیں بھی وقف کی ہیں، کیونکہ دونوں ہی کے مقاصد میں احیاء دین تعلیماً و تعلماً ہے:

"وعن نصير بن يحيى أنه وقف كتبه إلحاقالها بالمصاحف، و هذا صحيح، لأن كل واحد يمسك للدين تعليمًا وتعلمًا وقراءة، وجوز الفقيه أبو الليث وقف الكتب، وعليه الفتوى كذا فى النهاية" (البحر الرائق ۵/ ۲۰۲)۔

شیخ عبد المحسن محمد عثمان تحریر فرماتے ہیں: "اما عن اهمية التعليم... كل هذه الامور جاء ت التوجيهات الإسلامية فيها واضحة ومحدوده... واعتبرها الإسلام من الضرورات وليست من الكماليات" (مجلہ فقہ اسلامی بابت وقف: ۵۰)

---

[1] شیخ الحدیث، دار العلوم مئو۔

آگے پھر لکھتے ہیں: ''وإذا كانت الأوقاف القربية كذلك غير محتاجة ففي مصالح المسلمين الاجتماعيه وأمورهم الدعوية والتعليميه أوفي أي مصرف البر الذي يكون أنفع للمسلمين'' (مجلہ مذکورہ: ۱۹۴)
اسلام نے تعلیم کی اہمیت اور اس کی عظمت کی طرف واضح طور پر رہنمائی کی ہے اور اسے ضروریات میں سے شمار کیا ہے...... اگر اوقاف قربیہ مستغنی ہوں اور ان میں احتیاج نہ ہو تو مصالح مسلمین و دعوت و تعلیم اور رفاہی مصرف میں خرچ کرنا چاہئے۔

تعلیم کی اہمیت کا اندازہ شیخ محی الدین بن شرف نووی کے اس قول سے بھی ہوتا ہے جس میں انہوں نے تعلیم و تعلم کی غرض سے عورت کو غیر محرم کے سامنے آنے کی اجازت دی ہے اور دلیل میں علامہ تاج الدین سبکی کا قول پیش کیا ہے:

''قد كشفت كتب المذاهب فإنما يظهر عنها جواز النظر للتعليم فيما يجب تعلمه وتعليمه كالفاتحة'' (الاشباه والنظائر للسيوطي: ۱۸۱)
کتب مذاہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کی تعلیم و تعلم واجب ہے ان میں غیر محرم کو دیکھنا جائز ہے جیسے سورۂ فاتحہ، جن حضرات کو بھرپور فقہی بصیرت حاصل ہے ان کو غور کرنا چاہئے کہ عامۃ المسلمین کی مصلحت اور نفع عام کس میں ہے:

''فإن المفتي في سعة أن يفتي بذلك بشرط أن يرى مصلحة المسلمين الاجتماعيه ونفعهم العام كما تابع العلامة الشامي الإمام الحلوائي والإمام أبا شجاع في نقل أنقاض المسجد''۔
حضرت عائشہ صدیقہؓ کی فقہی بصیرت کا ہی نتیجہ تھا کہ جب آپ سے کہا گیا کہ غلاف کعبہ بوسیدہ ہو گیا ہے تو آپ نے اصلح للمسلمین کی رعایت کرتے ہوئے غلاف کو فروخت کرا کر اس کی قیمت رفاہی مصرف میں خرچ کی جبکہ غلاف کعبہ پر وقف تھا (مجموع الفتاوی لابن تیمیہ ۳۱ ر ۲۲۳)۔

ابن تیمیہ کے فتاویٰ سے بھی ائمہ ومؤذنین وعلوم قرآن وفقہ وسنت سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے اوقاف کے جواز کا پتہ چلتا ہے:

''فأجاب قدس الله روحه الحمدلله رب العالمين: الأعمال المشروطة فى الوقف من الأمور الدينية مثل الوقف على الأئمة والمؤذنين و المشتغلين بالعلم والقرآن والحديث والفقه ونحوذلك'' (مجموع الفتاوى ۳۱/۵۶)۔
۳- قنیہ کے حوالہ سے علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں ایک عبارت تحریر فرمائی ہے جس سے اس طرح کے مصارف میں اوقاف کا ثبوت ملتا ہے:

''وفى القنية: وقف الأدوية بالتيمار خانه لا يجوز إذا لم يذكر الفقراء''
(ہسپتالوں میں دواؤں کا وقف اس وقت تک درست نہ ہوگا جب تک فقراء کا ذکر نہ ہو)

ہاں فقراء کے ضمن میں اغنیاء بھی شامل ہو جائیں گے اور یہاں تو وہ مالدار ہو کر بھی اس قابل نہیں کہ اس موذی اور کثیر صرفہ والی بیماری سے نجات پا سکیں، اس لئے وہ مالدار بھی غریب ہی کے حکم میں ہیں، چنانچہ ایسے حضرات بھی وقف کا مصرف ہیں۔

۴- ہم لوگ جس ملک میں ہیں وہ ملک نہ تو اسلامی ہے اور نہ زمانہ ہی عہد اسلامی ہے کہ اس طرح کے کار خیر میں حکومتی سطح پر اوقاف کا قیام ہو، اس لئے عامۃ المسلمین کی ذمہ داری ہے کہ اصلح للمسلمین کی خاطر اوقاف کا نظم قائم کریں تا کہ لاچار و نادار لوگوں کی کفالت، علاج ومعالجہ و تعلیم و تعلم کا بندوبست ہو سکے اور اقامت دین، تحفظ دین ودعوت وتبلیغ کی راہیں ہموار ہو سکیں اور اسلام پر آنے والی مشکلات و پریشانیوں کا دفاع کیا جا سکے۔

اب اخیر میں چند تجاویز اور فقہاء کی نصوص پیش ہیں جو تقریباً تمام سوالات کا جواب بن سکتی ہیں:

۱- اوقاف کے مسائل کے استیعاب سے معلوم ہوتا ہے کہ موقوف علیہم کی دو صورتیں ہیں:

ایک تو وہ جن کے موقوف علیہم موجود ہیں دوسرے جن کے موقوف علیہم موجود نہیں۔ پہلی صورت میں موقوف علیہم کی زائد اشیاء جس کی اس موقوف علیہ کو نہ تو فی الحال ضرورت ہے نہ آئندہ سوال کردہ مصارف میں خرچ کیا جا سکتا ہے، مثلاً مسجد کی چٹائی، تیل وغیرہ جس کی اس مسجد کو نہ تو اب ضرورت ہے نہ آئندہ تو اسے فقراء ومساکین وغیرہ پر خرچ کیا جا سکتا ہے (المغنی مع شرحہ ۶/۲۲۹، علامہ ابن تیمیہ کی بھی یہی رائے ہے، مجموع الفتاوی ۳۱ ر ۲۱۳)۔

۲- دوسرے وہ جن کے موقوف علیہم موجود نہیں معدوم ہو چکے ہیں، ایسے وقف کا استعمال بھی صورت مسئولہ میں جائز ہوگا، کیونکہ اس وقف کا مقصود اصلی صدقہ جاریہ ہے (المغنی مع الشرح ۶/ ۲۱۷)۔

۳- اسی طرح وہ مساجد و مدارس جن پر اوقاف تھے مگر ان دنوں نہ مسجد ہی ہے نہ مدرسہ ہی اور لوگ وہاں سے ترک سکونت کر چکے ہیں تو ایسے اوقاف کی آمدنی فقراء و مساکین پر خرچ کی جاسکتی ہے (الفتاوی البزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/ ۲۶۴)۔

۴- وہ اوقاف جو بطور وقف شہرت یافتہ ہیں مگر دیوان قضا یا وقف بورڈ میں واقف کی جانب سے شرائط وقف و مصارف وقف کا پتہ نہیں چلتا ہے تو انہیں بھی مذکورہ مصارف میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ صورتیں تو وہ تھیں جہاں اوقاف پہلے سے قائم تھے، انہیں مزید ثمر آور منفعت بخش بنانے کی تدابیر تھیں۔ اب وہ صورتیں پیش خدمت ہیں جہاں از سر نو اوقاف کا قیام ہو۔

۵- مدارس و مکاتب و تعلیم گاہوں پر اس طرح وقف کیا جائے کہ مذکورہ تمام اداروں کا رجسٹریشن سوسائٹی نیز وقف بورڈ دونوں میں اس کے بائی لاز کے ذریعہ ہو اور اس کے دستور و شرائط میں جملہ مقاصد ہوں۔ مدارس کی رجسٹرڈ کمیٹی کے توسط سے مطلقہ اور بیواؤں کی امداد و کفالت (یا ماہانہ پنشن کے طور پر) دینی و عصری اداروں کا قیام، مریضوں کا علاج و معالجہ، دین کا تحفظ اور اس کی دعوت و صحافت و دفاع عن الدین وغیرہ ہوتا رہے۔

۶- ہندوستان کے تمام اوقاف کا سروے کیا جائے اور وہ اوقاف جو منجمد ہیں یا ان کی افادیت کمتر ہے، ان کے بارے میں مرکزی و صوبائی وقف بورڈ سے درخواست کی جائے کہ وہ انہیں فعال اور بیش از بیش منفعت بخش بنائے۔

۷- بیت المال کا قیام ہو اور اس میں دراہم و دنانیر وغیرہ وقف ہوں اور رقوم کو وقف کے زمرہ میں لانے کے لئے مضاربت کا معاملہ کیا جائے تا کہ ان دراہم و دنانیر پر وقف کی تعریف صادق آسکے:

”قيل: و كيف، قال: يدفع الدراهم مضاربة ثم يتصدق بها في الوجه الذي وقف عليه وما يكال أو يوزن يباع ويدفع ثمنه لمضاربة“ (شامی قدیم ۳/ ۵۱۸)۔

۸- مذکورہ مسئلہ سے ہٹ کر ایک صورت یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ملک کے طول و عرض میں وعظ و تقریر، صحافت و خطابت و دیگر وسائل سے کام لے کر مسلمانوں اور ارباب خیر سے اپیل کی جائے کہ لوگ اپنی اپنی ماہانہ و یومیہ آمدنی سے کچھ فیصد ان مقاصد کے لئے پس انداز کرتے رہا کریں اور رضا کارانہ طور پر کچھ لوگ اسے وصول کر اس مقصد کے تحت قائم کردہ کمیٹی کے حوالہ کرتے رہیں۔

☆☆☆

اوقاف کا قیام

کئی مسائل کا بہترین شرعی حل

مولانا راشد حسین ندوی[1]

۱- مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے اوقاف

فقراء اور مساکین پر وقف کرنے کی مثالیں ہمیں ہر دور میں کثرت سے مل جائیں گی، لیکن مطلقہ اور بیوہ عورتوں پر الگ سے وقف کرنے کی مثالیں عام طور سے نظر نہیں آئیں گی، اس لئے کہ اسلامی قانون وراثت اور قانون نفقات کی موجودگی میں اس کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں تھی، مطلقہ اور بیوہ اگر مال دار گھرانہ کی ہوتی تھی تو اس کو وراثت ہی میں اتنا کچھ مل جاتا تھا کہ وہ مستغنی ہو جاتی تھی، جن کو وراثت کا مال ناکافی ہوتا تھا اور کچھ دقت ہوتی تھی ان کے لئے نفقات کا مستقل ایک ضابطہ تھا، جس کے تحت اقارب پر اس کی خبر گیری لازمی تھی، اس کی تفصیل علامہ ابن نجیم سے سنئے:

''ولقريب محرم فقير عاجز عن الكسب بقدر الإرث لوموسرًا، أي وتجب النفقة للقريب إلى آخره'' (البحر الرائق ۴/ ۲۰۹)

''وقيد عن الكسب وہو بالأنوثة مطلقًا وبالزمانة ونحوها في الذكر. فنفقة المرأة الصحيحة الفقيره على محرمها، فلا يعتبر في الأنثى إلا الفقر'' (ایضا: ص ۲۱۰)۔

(کمائی سے عاجز ذی رحم محرم نادار کا نفقہ اس کو مالدار فرض کر کے وراثت کے بقدر واجب ہوتا ہے، کمائی سے عاجزی کی جو قید لگائی ہے وہ عورتوں میں مطلقاً رہتی ہے اور مرد میں معذوری اور نابینا وغیرہ ہونے پر ہوتی ہے، اس طرح تندرست محتاج عورت کا نفقہ اس کے محرم پر واجب ہو جاتا ہے اور عورت میں صرف محتاجی کا اعتبار کیا جاتا ہے)۔

لیکن موجودہ دور میں صورت حال میں بڑی تبدیلی آچکی ہے، اسلام کے قانون وراثت کو نظر انداز کر کے عورتوں کو میراث سے محروم رکھا جا رہا ہے، خاص طور سے اتر پردیش جیسے صوبوں میں (جہاں اس قانون پر عمل کرنے میں کچھ قانونی رکاوٹیں بھی ڈال دی گئی ہیں) اس قانون پر عمل کرنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

اور قانون نفقات پر عمل تو بالکل ہی ختم ہو گیا ہے، اقارب بیوہ عورتوں اور مطلقہ خواتین کی خبر گیری کرتے بھی ہیں تو اپنی دانست میں احساناً وتبرعاً کرتے ہیں، واجب جان کر نہیں اور خاصی بڑی تعداد تو اس ''احسان'' کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی، کچھ لوگ ''زبان خلق'' کے خوف سے اوپری دل کے ساتھ کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں تو ''بے چارے'' اپنی بیویوں کے عتاب کے ڈر سے اپنے کو معذور پاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی خبر گیری کی برکات سے یہ لاچار عورتیں اسی وقت مستفید ہو سکتی ہیں جب غیرت وخودداری کا خون کر دیں اور عزت نفس کا جنازہ نکال دیں۔

ہماری اصل ذمہ داری ہے یہ ہے کہ اسلامی قانون وراثت اور نفقات جاری کرنے کی کوشش کریں یہ مسئلہ تاکہ مستقل طور پر حل ہو جائے، لیکن درمیانی مدت کے لئے یہ بھی مناسب شکل ہو سکتی ہے کہ اوقاف کے ذریعہ ان کا معاشی تکفل کیا جائے، فقراء ومساکین پر کئے جانے والے عام اوقاف سے بھی ان کے زخموں پر مرہم رکھا جاسکتا ہے اور مستقل اوقاف کے ذریعہ بھی۔

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی۔

۲-تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف

علماء دین عصری علوم کی طرف بھی توجہ دیں۔

علماء دین نے دینی مراکز کے قیام کو اپنا مقصد بنایا اور اس کے ذریعہ تحفظ دین اور دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیا، انہیں اس میدان میں بھرپور کامیابی ملی اور اس میدان میں کوئی واقف شخص کسی کوتاہی کا شکوہ نہیں کرسکتا، ہمارے ان اسلاف نے (اللہ ان کے مراقد کو نور سے بھردے) پورے ہندوستان میں مدارس ومکاتب کا جال بچھادیا، لیکن ان حضرات نے علوم عصریہ کے مراکز قائم کرنے میں نہ دلچسپی دکھائی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی اور اس وقت یہی مناسب اور مفید بھی تھا تاکہ دانشوران قوم کو اپنے جوہر دکھانے کا بھرپور موقع مل سکے۔

لیکن یہ تجربہ بڑا تلخ رہا ہے، علماء کے دلچسپی نہ لینے کے سبب عصری علوم کے میدان میں مسلمان ابناء وطن سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں، جبکہ علوم دینیہ میں اس طرح کا شکوہ نہیں کیا جاسکتا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۸۰ فیصد نوجوان کالجوں میں جاتے ہیں اور بمشکل ۲۰ فیصد مدارس دینیہ میں آتے ہیں (یہ تعداد ظنی ہے، اندازہ اس سے بھی بڑے فرق کا ہے) لیکن جس کثرت سے دینی علوم کے ماہرین ہمیں ہر طرف مل جاتے ہیں، ڈاکٹرس وکلاء اور انجینئر اس تعداد میں نظر نہیں آتے۔

لہذا علماء دین کے لئے ضروری ہے کہ اس میدان کی طرف بھی توجہ دیں تاکہ عصری علوم میں بھی ہم اتنی ترقی کرلیں کہ دنیا کی ضرورت بن جائیں اور ہمارے بغیر سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ، میڈیسن، سرجری اور دوسرے اعلیٰ علوم کا گلشن بے رونق اور سونا معلوم ہو، اس کے لئے ان شعبہ ہائے علم سے متعلق مراکز کا قیام اوقاف کے ذریعہ ہونا چاہئے۔

۳-مریضوں کے لئے اوقاف

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں شہر شہر شفاخانوں کا جال بچھایا، جہاں ہر طرح کی بیماریوں کا علاج ہوتا تھا، بہت سے شفا خانے جانوروں کے علاج کے لئے مخصوص تھے، بعض سنگین بیماریوں کے شفاخانے مستقلاً ان سب کے علاوہ تھے اور عام طور سے ان شفاخانوں کے مصارف ان اوقاف سے پورے کئے جاتے تھے جو مسلمانوں نے شفاخانوں ہی کے لئے خاص طور سے کر رکھے تھے (تفصیل کے لئے دیکھئے: مجلۃ البحوث الفقہیہ رجب شعبان رمضان ۱۴۱۵ھ)۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ دوسرے امور کی طرح اس امر میں بھی مسلمان آج پستی کا شکار ہوگئے ہیں، عیسائی مشنریاں بظاہر خدمت خلق کے جذبہ سے لیکن بباطن تبلیغی اور تبشیری مقاصد سے جگہ جگہ ہزاروں اسپتال کامیابی سے چلارہی ہیں اور شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بڑی حد تک اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کررہی ہیں، لیکن کم ہی ایسے ملی اسپتال اور قابل ذکر شفاخانے ہوں گے جو مسلمانوں کے زیر انتظام کامیابی سے چل رہے ہوں، پہلی بات تو ان اسپتالوں کی تعداد ہی بہت کم ہے اور جو ہے بھی وہ اس لائق نہیں قرار دیئے جاسکتے کہ بطور مثال ان کا ذکر کیا جائے۔

البتہ کچھ ایسے پرائیوٹ اسپتال اور نرسنگ ہوم کامیابی سے ضرور چل رہے ہیں جن کو مسلم ڈاکٹروں نے تجارتی مقاصد سے قائم کررکھا ہے۔

اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ کوئی بھی اسپتال اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ کسی ڈاکٹر کے زیر انتظام ہو، لہذا اسپتالوں کے قائم کرنے سے پہلے ضروری ہوگا کہ ملی درد رکھنے والے ڈاکٹرس سے رجوع کیا جائے اور ان کے مشوروں سے کام کو آگے بڑھایا جائے، ورنہ اس مد میں قائم کئے جانے والے اوقاف خواہ مخواہ ضائع ہوجائیں گے۔

جہاں تک کینسر اور ایڈز جیسے امراض کے لئے معیاری اسپتال قائم کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لئے اسی وقت کوشش کی جائے جب عام نوعیت کے طبی مراکز پوری طرح کامیابی سے ہمکنار ہوچکیں، پھر زینہ بزینہ ترقی کرتے ہوئے مخصوص اور سنگین امراض کے مراکز بھی قائم کرنا آسان اور ممکن ہوجائے گا۔

۴-تحفظ شریعت اور دعوت دین کے لئے اوقاف

دشمنان اسلام نہایت ہی منصوبہ بند طریقہ سے اپنے باطل خیالات نیز دین اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات پھیلارہے ہیں اور

اس کے لئے ہر ممکن ذریعہ اور وسیلہ کو اختیار کر رہے ہیں۔

لہٰذا ضرورت ہے کہ اس محاذ پر بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا جائے اور ہر ممکن اور جائز ذریعہ سے ان کے زہر کا ازالہ کیا جائے، اوقاف کے ذریعہ بلاشبہ یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے۔

اوقاف کو ثمر آور کیسے بنایا جائے

احقر کے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ اس کے لئے ماہرین اقتصادیات سے مدد لی جائے، پھر اوقاف کی شرائط کی روشنی میں ان کے مشوروں کے مطابق اوقاف کو زیادہ ثمر آور اور نفع بخش بنانا انشاء اللہ ممکن ہوسکے گا۔

☆☆☆

اوقاف کی فضیلت، تاریخ اور موجودہ دور میں ان کے قیام کی بعض عملی صورتیں

مولانا عبدالسبحان ندوی[1]

وقف کی فضیلت اور اس کی تاریخ

وقف ایک ایسی عبادت ہے جس کا ثواب ہمیشہ جاری رہتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کبھی کوئی معاشرتی یا اقتصادی مسئلہ آتا تو آپ وقف وصدقات کی ترغیب دیتے تھے، ہجرت کر کے جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں پینے کے میٹھے خوشگوار پانی کی قلت تھی، ایک کنواں بئر رومہ نامی تھا جس کا پانی بڑا لذیذ اور انتہائی خوشگوار تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے مابین اس کا باضابطہ اعلان فرمایا کہ کون ہے جو بئر رومہ کو خرید کر اللہ کے لئے وقف کردے اور جنت کا حق دار بن جائے، یہ فضیلت چونکہ حضرت عثمان کے مقدر میں تھی اس لئے آپ ہی نے وہ کنواں خرید کر تمام مسلمانوں کے لئے وقف کردیا، خود بھی عام مسلمانوں کی طرح جاکر اس سے پانی بھرتے تھے۔

”قال عثمان: أنشدکم باللہ وبالإسلام هل تعلمون أن رسول اللہ ﷺ قدم المدينة وليس بها ماء يستعذب به غير بئر رومة فقال: من يشتري بئر رومة فيجعل فيها دلوه مع دلاء المسلمين بخير له منها في الجنة فاشتريتها من صلب مالي فجعلت دلوي فيها مع دلاء المسلمين“ (بخاری، کتاب الوصایا ۳۳، باب إذا وقف أرضًا أو بئرًا، النسائی، کتاب الأحباس حدیث: ۳۶۳۸)

(میں تم سے اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور یہاں بئر رومہ کے علاوہ کوئی اور میٹھے پانی کا کنواں نہیں تھا، آپ نے فرمایا: کون ہے جو بئر رومہ کو خرید لے اور خود بھی عام مسلمانوں کی طرح وہاں سے پانی لے (یعنی وقف کردے) اور جنت میں اس سے کہیں بہتر چشمہ پائے، اس وقت میں نے ہی اپنے ذاتی مال سے وہ کنواں خریدا اور اپنا حصہ بھی اس میں عام مسلمانوں کی طرح رکھا، صحابہ نے کہا کہ عثمان ! تم سچ کہتے ہو)۔

جہاں تک زمین یا جائیداد اللہ کے راستے میں وقف کرنے کا معاملہ ہے اس میں بلاشبہ اولیت حضرت عمر کو حاصل ہے، جب آپ نے اپنی خیبر والی زمین وقف کی تو عام مہاجرین کا خیال یہی تھا کہ یہ اولین وقف ہے جو اللہ کے راستے میں کیا گیا۔

”عن عمرو بن سعد بن معاذ قال: سألنا عن أول حبس في الإسلام فقال المهاجرون: صدقة عمر، وقال الأنصار: صدقة رسول اللہ ﷺ“ (فتح الباری ۵/ ۴۰۳، کتاب الوصایا)۔

حضرت عمرو بن سعد بن معاذ کہتے ہیں: ہم نے صحابہ کرام سے اسلام میں اولین وقف کے بارے میں دریافت کیا، مہاجرین کا کہنا تھا کہ اولین وقف حضرت عمر کا تھا جبکہ انصار نے کہا کہ اولین وقف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تھا)۔

واقدی کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جو زمین اللہ کے لئے وقف کی گئی وہ مخیریق کی تھی۔ ان کا تعلق بنوثعلبہ سے تھا، یہود کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ دعوت حق آپ پر اثر انداز ہوئی، انہوں نے احد کے دن اپنی قوم کو دعوت دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بشانہ لڑیں، اس لئے کہ آپ نبی برحق ہیں، قوم نے انکار کیا، خود جنگ میں شرکت کی، بے جگری سے لڑے اور جام شہادت نوش فرمایا۔ آپ خاصے صاحب جائداد تھے۔ مدینہ میں آپ کے

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی۔

سات باغات تھے، انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ اگر میں مارا جاؤں تو میرا مال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ ہے، آپ جیسا چاہیں تصرف کریں، آپ نے سارا مال مسلمانوں کے لئے وقف فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا: مخیریق قوم یہود میں سب سے بہتر ہیں، رضی اللہ عنہ وأرضاہ (البدایۃ والنہایۃ ۲۳۶/۳، ۳۸/۴)۔

حضرت محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں کہ یہ اسلام کا اولین وقف تھا (البدایہ والنہایہ ۲۳۶/۳، ۳۸/۴)

اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے اور واقدی کی تاریخی حیثیت مسلم ہونے کی بنا پر اس روایت کو مجروح نہ قرار دیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف کی صرف تحریض ہی نہیں کی بلکہ عملاً اپنی زمین وقف بھی فرمائی ہے، اس لحاظ سے وقف سنت قولی بھی ہے اور سنت عملی بھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد تو آپ کی ساری زمین وجائداد ایک طرح سے وقف ہی مانی گئی۔

''نحن معاشر الأنبياء لا نورث ما تركنا فهو صدقة'' (بخاری، کتاب فرض الخمس، فضائل اصحاب النبی ۱۲، مسلم، کتاب الجہاد: ۴۹، ۵۲)

(گویا تمام انبیاء کرام کا چھوڑا ہوا مال یا تو صدقہ ہوتا تھا یا پھر مسلمانوں پر وقف)، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ حضرات صحابہ کرام بھی اس مبارک عمل میں سب سے پیش پیش رہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''لم يزل العدد الكثير من الصحابة فمن بعدهم يلون أوقافهم'' (فتح الباری ۴۰۲/۵)

(صحابہ کرام اور آپ کے بعد والوں کی ایک کثیر تعداد اپنے اوقاف کی دیکھ ریکھ خود کرتی تھی)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک کثیر تعداد نے اپنے مال کا کچھ حصہ اللہ کے راستہ میں وقف کر رکھا تھا، حضرت جابر بن عبداللہ الانصاری فرماتے ہیں:

''فما أعلم أحدًا ذا مقدرة من أصحاب رسول الله ﷺ من المهاجرين والأنصار إلا حبس مالًا من ماله صدقة موقوفة لا تشترى ولا تورث ولا توهب'' (المغنی لابن قدامہ ۱۸۵/۶، ۱۸۷، کتاب الوقوف، من روائع حضارتنا ۱۲۴)

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجر وانصار صحابہ میں جو ذرا وسعت والے تھے کوئی ایسا نہ تھا جس نے اپنا کچھ نہ کچھ مال راہ خدا میں وقف نہ کیا ہو، جس کو نہ خریدا جاسکتا تھا نہ ہبہ کیا جاسکتا تھا اور نہ اس میں وراثت جاری ہوسکتی تھی) بعد میں تو اوقاف کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا جس کی نظیر کسی اور قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وقف اہل اسلام کی خصوصیت ہے، یعنی زمین وجائداد کو وقف کرنا، زمانہ جاہلیت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی نے اپنی زمین یا جائداد وقف کی ہو (فتح الباری ۴۰۳/۵)۔

وقف کن لوگوں پر کیا جائے

وقف ہر طرح کے لوگوں پر کیا جاسکتا ہے، حضرت عمر نے جن اصناف پر اپنی زمین وقف فرمائی تھی ان میں درج ذیل قسمیں شامل تھیں:

(۱) فقراء، رشتہ دار، اس سے مراد واقف کے اقرباء بھی ہوسکتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء بھی ہوسکتے ہیں، پہلی توجیہ راجح ہے۔

(۳) فی سبیل اللہ (اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے مجاہدین اسلام)۔

(۴) غلاموں کی آزادی کے لئے۔

(۵) مہمان۔

(۶) مسافر (فتح الباری ۳۹۹/۵، باب الوقف کیف یکتب)۔

حضرت عثمان کا وقف عامۃ المسلمین کے لئے تھا۔ حضرت ابن عمر نے اپنا گھر آل عمر کے ضرورت مندوں کے لئے وقف فرمایا تھا، حضرت انس نے اپنا ایک گھر وقف کیا تھا جو مدینہ منورہ میں تھا، جب آپ حج کے لئے تشریف لے جاتے تو قیام مدینہ کے دوران وہیں رہتے۔

حضرت زبیر نے اپنے بعض مکانات اپنی ان بیٹیوں کے لئے وقف کئے تھے جو طلاق بائنہ پاچکی تھیں، یا ان کے شوہر کے انتقال کرجانے کی بنا پر ان کے لئے رہائش کا کوئی نظم نہ تھا (فتح الباری ۴۰۶/۵)۔

ان تمام احادیث اور واقعات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اوقاف صرف ضرورت وحاجت کے لئے ہی نہیں بلکہ راحت کے لئے بھی ہو سکتے ہیں، عمومی بھی ہو سکتے ہیں اور خصوصی بھی۔ محدود بھی اور لامحدود بھی، بالخصوص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ضرورت کے وقت وقف کرنے سے اجر میں بھی نسبت اضافہ ہوتا ہے یہاں تک کہ حضرت عثمان نے میٹھے پانی کا کنواں خرید کر وقف کر دیا تو آپ نے ان کو جنت کی بشارت سنائی اور ان کے اس عمل کی بڑی پذیرائی فرمائی۔

اوقاف میں اجتماعی ضرورت کا لحاظ

اوقاف میں اجتماعی ضرورتوں کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی، ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ایک باندی آزاد کی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ملی تو آپ نے فرمایا: اگر تم اپنے اخوال یعنی ماں کے خاندان والوں کو یہ باندی ہبہ کرتیں تو تمہیں اجر وثواب اور زیادہ ملتا (بخاری، کتاب الھبۃ ۱۵، مسلم، کتاب الزکاۃ ۴۴)، یہاں بات تو ہبہ کی ہے لیکن غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ آزادی جیسے افضل ترین عمل پر بھی کبھی کبھی اجتماعی ضرورتیں بازی لے جاتی ہیں، موجودہ دور کا مسئلہ انتہائی حساس ہے۔

یہ مشترکہ مسئلہ علماء امت اور اصحاب ثروت دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے کہ ایسے اوقاف قائم کئے جائیں جن کے ذریعہ ملت اسلامیہ ہندیہ آزمائش کے اس دور سے نکل جائے اور ایک بہتر مستقبل کی طرف پیش قدمی کر سکے۔

۱- مریضوں کے لئے اوقاف

اسلام جسمانی صحت پر کافی زور دیتا ہے اور اسے انسان کے ذاتی حق کے ساتھ ساتھ شرعی تقاضا بھی قرار دیتا ہے، اسلام میں ایسے مؤمن کو جو طاقتور ہو اللہ کی نظر میں زیادہ محبوب اور پسندیدہ بتایا گیا ہے: ''المؤمن القوي خير وأحب إلى الله من المؤمن الضعيف وفي كل خير'' (مسلم)۔

اسی طرح یہ بات بھی زور دے کر کہی گئی ہے کہ آدمی پر اس کے جسم کا بھی حق ہے: ''وان لجسدك عليك حقًا'' (بخاری، کتاب الصوم، ۵۱، ۵۴، ۵۵، مسلم کتاب الصیام ۱۸۳، ۱۸۷)، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف امراض کے علاج اور اس کی ترکیبیں بھی ثابت ہیں، احادیث کی کتابوں میں کتاب الطب کے عنوان کے تحت بہت سارے محدثین نے احادیث درج کی ہیں بلکہ طب نبوی پر علماء امت کی مستقل تصنیفات بھی ہیں، ہماری تہذیب، ہماری تاریخ اور ہمارا شاندار ماضی اس کی گواہی دیتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ عالم اسلامی کا چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا شہر ایسا نہ تھا جہاں ایک سے زیادہ اسپتال نہ ہوں، ان کے لئے بڑی بڑی جائدادیں وقف ہوتی تھیں، ایک وقت ایسا تھا کہ صرف قرطبہ میں پچاس بڑے اسپتال تھے (من روائع حضارتنا الدکتور مصطفی السباعی ص ر ۱۴۰)۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے علم دین کے بعد علم طب کو سب سے افضل قرار دیا ہے، علم دین انسان کی روحانی بالیدگی کا سامان کرتا ہے اور انسان کی معنوی شخصیت کی بقاء کی ضمانت لیتا ہے، اسی طرح علم طب انسانی جسم کو صحت اور عافیت کے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''لا أعلم علمًا بعد الحلال والحرام أنبل من الطب'' (سیر اعلام النبلاء للذہبی ۱۰/ ۵۷)

(حلال وحرام کے علم کے بعد طب سے بڑھ کر کوئی علم نہیں ہے)۔

اوقاف سے متعلق کرنے کے کام

اوقاف کے میدان میں ہمیں دو طرح کے کام کرنے ہوں گے:

پہلا کام نہایت اہم ہے وہ یہ کہ ہمارے سابقہ اوقاف جن میں اکثر عمومی اور مطلق تھے ان کو واگذار کروایا جائے، اس کے لئے قانونی لڑائی لڑی جائے، ان اوقاف پر جو بد دیانت افراد حاوی ہیں ان کو بے دخل کیا جائے، اگر وہ اوقاف حکومت کے قبضہ میں ہیں تو حکومت کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے، ان ہمدردان ملت کی جائدادوں کو از سر نو قابل انتفاع بنایا جائے، بھیڑیا صفت افراد کے قبضہ میں موجود ہمدردان ملت کی جائدادوں کو از سر نو قابل انتفاع بنایا جائے جو اوقاف کے ایندھن سے اپنے لئے جہنم کی آگ بھڑکا رہے ہیں، صرف پنجاب، آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش، کرناٹک اور بہار میں کل جائداد اوقاف کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار کے لگ بھگ ہے، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی جن میں مدھیہ پردیش میں ۷۵ فیصد سے زائد اوقاف ناجائز قبضہ میں ہیں اور پنجاب میں ۶۰

فیصد کے قریب ناجائز قبضہ میں ہیں (ہندوستان میں وقف بورڈس کا نظام، رپورٹ، سالار محمد خاں ص ۶)، اس کے علاوہ ہر صوبہ کے اوقاف میں ایک بڑا حصہ یا تو حکومت کے ناجائز قبضہ میں ہے، یا پھر بددیانت متولیان کے ہتھے چڑھا ہوا ہے، اوقاف کی واگذاری کے لئے مسلمانوں کی نمائندہ تنظیمیں اگر یکجا ہو کر یہ کام کریں تو بہت کچھ مفید نتائج نکل سکتے ہیں، بالخصوص مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے اگر ایک ''بحالی اوقاف فورم'' قائم کیا جائے تو امکان ہے کہ امت کی یہ امانتیں ملت کے تعمیری کاموں میں پھر سے استعمال ہو سکیں۔

دوسرا کام یہ ہے کہ نئے اوقاف قائم کئے جائیں۔

مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے اوقاف

یہ تمام تر سلگتا ہوا مسئلہ ہے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں مسلم معاشرے میں بھی معاشی ناہمواریوں کی بنا پر بہت ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، اسلام نے مطلقات اور بیواؤں کی کفالت کے لئے جو ترتیب قائم کی تھی آج مسلم معاشرہ کا ایک بڑا حصہ عملاً اس سے کنارہ کش ہو چکا ہے، فقہ شافعی کی رو سے معاشی ضمانت کی ذمہ داری ترتیب وار چلتی ہوئی بیت المال تک جا پہنچتی ہے، اگر بیت المال کا نظم نہ ہو تو اس علاقہ کے اصحاب ثروت اس کے ذمہ دار ہیں، اگر وہ بھی اپنی ذمہ داری ادا نہ کریں تو پھر یہ ذمہ داری اور پھیلتی ہے، یہاں تک کہ کفایہ وجوب پوری قوم پر عائد ہوتا ہے، اس کی رو سے دیکھا جائے تو جو خاتون بھی معاشی بدحالی سے تنگ آ کر اپنے لئے غلط راستے ڈھونڈ لیتی ہے اس کا ذمہ دار پورا معاشرہ ہوگا اور ہر ایک کے ذمہ اپنے حصہ کے بقدر گناہ کا بوجھ ضرور ہوگا، لہٰذا بیواؤں اور مطلقات کے لئے اوقاف کا نظم اگر معاشی کفالت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہو تو پورے معاشرے کی یکساں ذمہ داری ہے، یہ کام اتنا عظیم اور اہم ہے کہ ایسے شخص کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہد فی سبیل اللہ، قائم اللیل اور صائم النہار سے تشبیہ دی ہے، ارشاد رسالت ہے:

''الساعي على الأرملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله وأحسبه قال: وكالقائم لا يفتر وكالصائم لا يفطر''

(بخاری، نفقات: ۱، ادب: ۲۵،۲۶، مسلم، کتاب الزہد ۴۱)

(بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے، راوی کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا نمازی ہے جو بلا تکان نماز پڑھتا جائے، یا ایسا روزہ دار ہے جو ہمیشہ روزے سے رہے)، حضرت عمر تو ان عورتوں کے گھر بھی تشریف لے جاتے جن کے شوہر وقتی طور پر جنگی مصروفیات کی بنا پر غائب رہتے اور ان خواتین کی ضروریات پورا کرنے پر خاص توجہ فرماتے، آج کل اس طرح کے واقعات صرف پڑھنے اور سر دھننے کے لئے رہ گئے ہیں، عملی اقدام کرنے والے بس چند گنے چنے لوگ ہی رہ گئے ہیں۔

اوقاف کو مفید اور ثمر آور کیسے بنایا جائے؟

جہاں تک اوقاف کو مفید اور ثمر آور بنانے کا معاملہ ہے تو اس کی شرط اول دیانت داری ہے، امت مسلمہ میں جب تک اس صفت کا وجود رہا اوقاف نے ایسے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، اوقاف بلاشبہ حکومت کے اندر ایک پوری حکومت کا کام انجام دیتے تھے، مسجدیں، مدرسے، اسکولس، یونیورسٹیاں، شفاخانے، کارخانے، کنویں، قبرستان، پل، رہائشی مکانات، لائبریریاں، قلعے، رصدگاہیں، کونسا ایسا تہذیبی وتمدنی سرمایہ تھا جو اوقاف کے ذریعہ محفوظ نہ رکھا گیا ہو، آج یہ صفت عنقا ہے، ضرورت ہے ایسے دیانت دار افراد کی جو اسے سنبھال سکیں، سالار محمد خاں (ایڈوکیٹ) کی رپورٹ میں جو ہندوستان میں وقف بورڈس کے نظام سے متعلق ہے، یہ بات صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ وقف سے متعلق آج کے سنگین مسائل میں سب سے مشکل اور پیچیدہ مسئلہ اوقافی جائداد پر غاصبانہ قبضہ ہے، جس کی وجوہات میں ایک اہم ترین وجہ متولیان کی بددیانتی ہے، حدیث شریف میں ایسے لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد نبوی کافی ہے: ''إن رجالا يتخوضون في مال الله بغير حق فلهم النار يوم القيامة'' (بخاری، خمس ۷)

(کچھ لوگ اللہ کے مال میں ناحق مداخلت کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے قیامت کے دن آگ ہے)

، جب ناحق مداخلت پر یہ وعید ہے تو ناجائز تصرف اور غاصبانہ قبضہ پر کیا کچھ وعیدیں نہ ہوں گی، غور کرنے کا مقام ہے، اس کا حل بعض حضرات نے یہ سوچا ہے کہ اگر متولی وقف خائن یا بددیانت ہو تو موقوفہ مال کو موقوف علیہ کے زیر تصرف دے دیا جائے، اس لئے کہ وقف کا فائدہ تو موقوف علیہ کی ملک ہے، لہٰذا اسے کل وقف ہی کا مالک بنا دیا جائے تو مناسب ہوگا، لیکن یہ حل کوئی آسان نہیں ہے، اس لئے کہ اگر وقف کی جہت عام ہو یا موقوف علیہ فقراء ومساکین ہوں تو یہ

لوگ وقف کو کس طرح سنبھال سکتے ہیں، دوسرے یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے جب موقوف جائداد کا مالک ہی موقوف علیہ کو قرار دیا جائے، جو بہرحال کمزور مسلک ہے، ورنہ راجح مسلک تو یہی ہے کہ اصل وقف کی ملکیت اللہ تبارک وتعالی کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔

تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف

اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی سے مدارس اوران کے لئے اوقاف کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا، جن میں کچھ مشہور مدارس یہ ہیں: مدرسہ نظامیہ، مدرسہ صالحیہ، مدرسہ ظاہریہ، مدرسہ صلاحیہ، مدرسہ عباسیہ وغیرہ (مجلۃ البحوث الفقہیہ ۱۴۱۵ھ، رجب شعبان رمضان ۱۲۵، ۱۲۶)۔

یہ تمام مدارس اوقاف سے چلتے تھے، مدرسہ نظامیہ کے بارے میں تاریخ العرب میں ہے: ''یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ مدرسہ نظامیہ وہ معیاری درسگاہ تھی جس کی تقلید یورپ کے ان دانش کدوں نے بھی کی جو بعد میں جامعات یعنی یونیورسٹیز کی حیثیت سے مشہور ہوئے

) نگارشات، مولانا عبداللہ عباس ندوی بحوالہ (Hitti-History of the Arabs -P- 260)۔

خود امام شافعیؒ نے ایک مدرسہ قائم فرما کر اس کے لئے اپنا گھر وقف کردیا تھا، مدارس اوران کے لئے اوقاف کا سلسلہ بعد کی صدیوں میں اس قدر ترقی کرگیا کہ مشہور سیاح ابن جبیر کے مطابق جب اس نے دمشق کا دورہ کیا تو وہاں چارسو مدارس وقف کے تحت (مجلۃ البحوث الفقہیہ المعاصرہ، ۱۴۱۵ھ، رجب شعبان، رمضان ص ۱۲۷)، نعیمی نے کچھ مدارس اوران کے لئے وقف کی ہوئی جائدادوں کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے، جس کے مطابق صرف دمشق میں فقہ حنفی کی تدریس کے ۵۲ مدارس، فقہ شافعی کی تدریس کے ۶۳ مدارس اور فقہ حنبلی کے گیارہ مدارس تھے (ایضاص ۱۲۷)، دمشق کا سرسبز وشاداب قطعہ جسے غوطہ دمشق کہا جاتا تھا، یہ لگ بھگ پورا کا پورا وقف تھا (مجلۃ البحوث الفقہیہ المعاصرہ، رجب شعبان رمضان ص ر ۱۳۰) بالخصوص تعلیمی امور کے لئے، اس کے علاوہ چھوٹے موٹے مکاتب کی تعداد تو بے شمار تھی، اس کے لئے جو اوقاف تھے وہ صرف طلبہ کی رہائش ہی کے لئے نہیں تھے، بلکہ ان کے کھانے پینے دوا علاج اس سے آگے بڑھ کر ان کے بیوی بچوں تک کی کفالت کا ان مدارس کے اوقاف میں بھرپور انتظام تھا (ایضاص ۱۲۷، ۱۳۶)، اس کثرت وفراخی کو دیکھ کر ابن جبیر نے یہاں تک کہہ دیا:

> تكثر الاوقاف على طلبة العلم في البلاد الشرقية فمن شاء الفلاح فليرحل إليها (ایضا ص ۱۲۹)
> (تشنگان علم کے لئے تو مشرقی ممالک میں اوقاف کی بہتات ہے، جو بھی نمایاں کامیابی حاصل کرنا چاہے وہیں جائے)

ابوالنعیم رضوان النصری نے غرناطہ میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، اس کے اخراجات کا بندوبست کیا اوراس کے لئے جائدادیں وقف کیں، یہ مدرسہ اپنی مثال آپ تھا، خوش نمائی، وسعت، حسن ذوق اور شان وشکوہ کا نمونہ تھا، اس کے لئے ایک کثیر مقدار میں نہر سے پانی آنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔

(نگارشات عبداللہ عباس ندوی ۸۴، بحوالہ الاحاطہ فی اخبار غرناطہ، لسان الدین ابن الخطیب)۔

تعلیم وتعلم اور علم وفن کی ترقی کے لئے مسلمانوں نے مساجد کے ذریعہ بھی خوب خوب کام لیا ہے اوران پر بہت کچھ وقف کیا ہے، یہ مسجدیں صرف نماز پنجگانہ کے لئے نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان میں سے اکثر علمی مراکز کی حیثیت رکھتی تھیں، اندلس کی مسجد قرطبہ، مراکش کی جامع قزوین، قاہرہ کی جامع ازہر، دمشق کی مسجد اموی اور تیونس کی جامع الزیتونہ، یہ سب فی الحقیقت مساجد تھیں جو آہستہ آہستہ پوری یونیورسٹی کی شکل اختیار کرگئیں، ان میں جامع ازہر، جامع قزوین اور جامع الزیتونہ پر بہت کچھ اوقاف تھے جن سے ان کا پورا خرچ چلتا تھا (مجلۃ البحوث الفقہیہ المعاصرہ ۱۴۱۵ھ رجب شعبان رمضان ص ۱۲۶)۔

اسی طرح مکتبات یعنی لائبریریوں کے لئے بھی اچھے خاصے اوقاف ہوا کرتے تھے، یہ محض لائبریریاں نہ تھیں، بلکہ علم وفضل کی دانشگاہیں تھیں، جہاں علم کا دریا بہتا تھا، دنیا جہاں کے محققین یہاں اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے آتے تھے، ان پر اوقاف کی آمدنی دل کھول کر خرچ کی جاتی تھیں، جو بھی کتابوں سے استفادہ کے لئے دور سے آتا اسے یہ سہولتیں ضرور ملتی تھیں، رہائش، اسکالرشپ اور صفائی ستھرائی کا بے مثال نظم تھا، مثلاً ان کے لئے خاص غسل خانے ہوتے جسے عام آدمی استعمال نہیں کرسکتا تھا، طبی خدمات اوران کے لئے اسپیشلسٹ ڈاکٹرس ہوتے جو وقتاً فوقتاً ان کا چیک اپ کرتے، بیمار ہونے پر ان کے لئے مخصوص اسپتال ہوتے، گویا وی آئی پی شفاخانے ہوتے جہاں ہر طرح سے ان کی دیکھ بھال ہوتی، اس کے علاوہ خادمین کی سہولت الگ سے میسر تھی جو روز مرہ کے کام انجام دیتے (ایضاص ۱۲۷)، گویا ان محققین کو تمام فکروں سے فارغ کردیا جاتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زمانہ میں ایسے ایسے محققین پیدا ہوئے جن کے کارناموں پر آج بھی دنیا فخر کرتی ہے۔

کچھ مکتبات کا حال آپ بھی سن لیں:

مکتبۃ الخلفاء الفاطمیین، یہ فاطمی خلفاء کی لائبریری تھی جہاں اکثر مورخین کے نزدیک بیس لاکھ کے لگ بھگ کتابیں تھیں (من روائع حضارتنا للدکتور مصطفی السباعی ص ۱۵۹)۔

مکتبہ دار الحکمہ، قاہرہ: یہ مکتبہ حاکم بامر اللہ کا قائم کیا ہوا تھا، ۳۹۵ھ میں اس میں لگ بھگ ساڑھے سات لاکھ کتابیں تھیں (ایضاً ص ۱۵۹)۔

بیت الحکمہ: اسے ہارون رشید نے قائم کیا تھا، مامون کے دور میں یہ اوج کمال کو پہنچا، روم و یونان کی اکثر کتابوں کا ترجمہ جب مامون کے حکم سے کیا گیا تو وہ کتابیں اسی مکتبہ کی زینت بنیں، یہ ایک پوری یونیورسٹی تھی، جہاں محققین مطالعہ کرتے اور آپس میں تبادلہ خیال بھی ہوتا، گویا اسے اپنے زمانے کا علمی و تحقیقی بے مثال مرکز قرار دیا جاسکتا ہے (ایضاً ص ۱۵۹، ۱۶۰)۔

مکتبہ بنی عمار، طرابلس، یہاں کی کتابوں کی تعداد مناسب اندازے کے مطابق بیس لاکھ کے قریب تھی (ایضاً ص ۱۶۰)۔

ان مدارس و مکتبات میں علوم عصریہ کی بھی تعلیم ہوتی تھی اور اس کے لئے بھی خوب خوب اوقاف تھے، مسلمانوں نے اس میں اپنوں اور غیروں کی بھی تفریق نہیں کی، غیر بھی اوقاف کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے (مجلۃ البحوث الفقہیہ المعاصرہ، رجب شعبان رمضان ۱۴۱۵ھ ص ۱۲۷)۔

ان ہی موقوفہ مدارس میں پڑھ کر امام غزالی جیسے نابغہ روزگار افراد پیدا ہوئے اور دنیا پر چھا گئے، ان ہی مدارس سے کسب فیض کر کے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شافعی ثانی بنے، متقدمین بلکہ متوسطین میں کسی کی بھی سیرت اٹھایئے اکثر یہ ملے گا کہ ان کی تعلیم فلاں موقوفہ مدرسہ میں ہوئی، اس ناحیہ سے دیکھا جائے تو دینی علوم کی ترویج و اشاعت میں اوقاف کا کردار کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

تعلیم و تعلم کے لئے اگر خدانخواستہ دائمی اوقاف کا قیام نہ ہو پارہا ہو تو اتنا ضرور کیا جاسکتا ہے کہ عارضی طور ہی پر اہل ثروت سے فائدہ اٹھایا جائے، ان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ان غریب مگر ذہین بچوں کا خیال رکھیں جو صرف غربت کی بناء پر حق تعلیم سے محروم ہو رہے ہوں، پھر ہر متمول شخص کم سے کم ایک طالب علم کا بار تو اپنے ذمہ لے، اپنی زندگی سہولت سے گذارنے کا یہ سب سے آسان اور ثواب سے بھرپور راستہ ہے کہ آدمی دوسروں کی مدد کرے،

"واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیہ" (اللہ اپنے بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت ملنے سے قبل ہی یہ مبارک عمل اپنے حق میں لازم کرلیا تھا، حضرت خدیجہ نے جن الفاظ میں آپ کی توصیف کی ہے، ان کا پہلا جملہ ہی یہ ہے کہ آپ تو دوسروں کا بوجھ ڈھوتے ہیں، اللہ آپ کو رسوا کیسے کرسکتا ہے:

کلا واللہ لا یخزیك اللہ أبدا إنك تحمل الكل (بخاری، بدء الوحی ۳، کفالہ ۴، مسلم، کتاب الایمان ۲۵۲)

، ان احادیث کی روشنی میں کسی بھی تاجر سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی ایک طالب علم کی مکمل تعلیم اپنے ذمہ لے اور اپنے نفع کا ایک حصہ اس پر خرچ کرتا رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی تعلیم سے فارغ ہوجائے، کوئی صاحب جائداد اپنی زمین اگر وقف نہ کرنا چاہے تو اتنا ہوسکتا ہے کہ اپنی پیداوار کے ایک حصہ کو کسی طالب علم کی تعلیم پر خرچ کرنے کے لئے الگ کرلے، اوقاف کے ذریعہ اگر دائمی اور پائدار کام نہ ہو رہے ہوں تو اس طرح کے عارضی اور وقتی کام تو کئے جاسکتے ہیں، پھر یہ چھوٹی موٹی کوششیں بھی رنگ لائیں گی، فرض کیجئے کسی علاقے میں بیس بڑے مالدار ہیں اور وہ بیس غریب مگر ذہین طلبہ کو پڑھا لکھا کر اچھا شہری بنائیں، کیا یہ طلبہ آئندہ چل کر اپنے جیسے کئی اور طلبہ کا سہارا نہیں بنیں گے؟ بس ترتیب قائم کرنے پھر اسے قائم رکھنے کی ضرورت ہے، مالدار صحابہ نے اسی طرح نادار صحابہ کو آگے بڑھایا ہے، پھر دنیا نے دیکھا کہ (عجم) میں ایسے ایسے نابغہ روزگار افراد پیدا ہوئے کہ آج علمی دنیا کی گردن ان کے احسانات سے جھکی ہوئی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کاریگر کی مدد کرنے کو بھی افضل عمل بتایا ہے (بخاری، کتاب العتق ۳، مسلم، کتاب الایمان ۲۵۲)

اس زمانے میں "علم" سے بڑھ کر کونسی صنعت ہوسکتی ہے، ضرورت ہے کہ انفاق فی سبیل الخیر کے جذبہ کو تازہ رکھا جائے، جو اس امت کا نمایاں امتیاز ہے۔

☆☆☆

معاشی مسائل کے حل میں اوقاف کا کردار

مولانا بلال احمد القاسمی [1]

وقف کی شرعی حیثیت

''الإسعاف'' میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات باغوں کو وقف کیا جو اسلام میں پہلا وقف خیری تھا، یہ باغات ''مخیریق'' نامی ایک یہودی کے تھے، جو ہجرت نبوی کے بتیسویں ماہ کے آغاز میں اس وقت مارا گیا جب وہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کی طرف سے شریک قتال تھا، اس نے وصیت کی کہ اگر میں مارا جاؤں تو میرے اموال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوں گے، وہ انہیں اللہ کی مرضی سے صرف کریں گے، احد کے دن یہودیت پر ہی اس کی موت ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مخیریق اچھا یہودی تھا'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سات باغوں کو اپنی تحویل میں لے کر انہیں صدقہ یعنی وقف کر دیا، پھر اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وقف ہوا، پھر صحابہ کرام کے اوقاف مسلسل ہوتے گئے (الاسعاف فی احکام الاوقاف لبرہان الدین بن ابراہیم بن ابی بکر الطرابلسی ص ۹-۱۰)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ جاریہ کی ترغیب دی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان ایسی مفید خدمت انجام دے جس کا فائدہ محض وقتی نہ ہو بلکہ اس کے گزر جانے کے بعد بھی اس کا فائدہ جاری رہے اور اس کا اجر وثواب اس کو مسلسل ملتا رہے۔ نیل الاوطار میں ہے:

''إذا مات ابن آدم انقطع عمله إلا من ثلاث: صدقة جارية، أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له'' (۶/۱۲۷)۔

وقف کی تعریف

وقف کے معنی لغت میں روکنے کے ہیں، پھر یہ اسم مفعول یعنی موقوف کے معنی میں مشہور ہو گیا (الدر مع الرد ۳/۳۵۷)۔

وقف کی شرعی تعریف میں حضرات صاحبین اور امام صاحب کا اختلاف ہے۔

امام صاحب کے نزدیک ملکیت باقی رکھتے ہوئے منافع کو صدقہ کر دینے کا نام شریعت میں وقف ہے (درمختار ۳/۳۵۷)۔

اور حضرات صاحبین اور اکثر علماء کے نزدیک کسی چیز کو اللہ رب العزت کی ملکیت میں دے کر اس کے منافع کو اپنے پسندیدہ جائز مصارف پر صرف کرنے کا نام شریعت میں وقف ہے (درمختار ۳/۳۵۸)۔

وقف کا حکم

وقف کا حکم مفتیٰ بہ قول کے مطابق یہ ہے کہ الفاظ وقف استعمال کرنے سے وقف تام اور لازم ہو جاتا ہے۔ اس کی بیع، ہبہ وغیرہ ناجائز اور حرام ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے:

''فقال النبي ﷺ: إن شئت حبست أصلها وتصدقت بها، غير أنه لا يباع أصلها ولا يبتاع ولا يوهب ولا يورث الخ''

(تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اس کی اصل کو باقی رکھ کر اس کی پیداوار کو صدقہ کر دو مگر یہ کہ اس کی اصل نہ بیچی جا سکتی ہے، نہ خریدی جا سکتی ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہو سکتی ہے)۔

۱- مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے اوقاف

وقف کی مشروعیت انسانی فلاح اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دینے کے لئے ہوئی ہے۔

---

[1] نائب مفتی جامعہ اسلامیہ دار العلوم مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڈھ

لازمی طور پر مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے ملک کے ہر گوشہ، ہر شہر اور ہر صوبہ میں وقفی نظام کا قائم کرنا اور اس کو منظم طور پر چلانا ہر ایک اخلاق مند، غیور اور باضمیر مسلمان کا فریضہ ہے تاکہ قوم کی محتاج اور معاشی کمزوری کی شکار مطلقات اور بیوائیں باعزت زندگی گزار سکیں، دردر کی ٹھوکریں کھانے اور دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے محفوظ رہیں:

''الثاني موقوفة صدقة علی وجوه البر أو الخير أو اليتامی جاز مؤبدًا كالفقراء'' (۵/ ۲۰۰)۔

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے: ''مسجد کے علاوہ دوسرے کارخیر کے لئے بھی اگر وقف ہو تو شرعاً صحیح ہے تاکہ امور خیر میں لوگوں کے لئے مزید وسعت، سہولت اور آسانی ہو (۱۰/ ۷۶۵۷، نیز دیکھئے: فتاوی عالمگیری ۲/ ۳۷۰)۔

۲- تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلم سماج تعلیم کے میدان میں نہایت پیچھے ہے، یہ بات صرف ہندوستانی مسلمانوں پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ کم وبیش پوری مسلم امت اپنے عددی تناسب کے لحاظ سے دوسری معاصر قوموں کے بالمقابل نہ صرف پیچھے بلکہ بہت پیچھے ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال کا اگر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اپنی آبادی کے تناسب سے اس کا تعلیمی ریکارڈ نہایت مایوس کن ہے۔

وقف میں اس مسئلہ کے حل کی ایک بہت اچھی شکل موجود ہے جسے آج وزارت تعلیم انجام دے رہی ہے، اس کے بارے میں قرآن میں بڑی فضیلت اور تاکید آئی ہے اور حدیث میں اس کو صدقۂ جاریہ قرار دیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مختلف طریقے سے اس کی ترغیب دی ہے۔

ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا أنفقوا مما رزقناكم من قبل أن يأتي يوم لا بيع فيه ولا خلة ولا شفاعة" (سورۂ بقرہ: ۲۵۴)۔

(اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی چیز کو خرچ کرو قبل اس کے کہ ایسا دن آئے جس میں نہ بیع وشراء ہوگی اور نہ کوئی سفارش)۔

۳- مریضوں کے لئے اوقاف

دین اسلام رحمت ہے، انسانوں کی خدمت اور اس کی راحت رسانی اس کی تعلیمات کا ایک جزو لاینفک ہیں، قدیم تاریخوں میں وقف کی طبی خدمات مسلم اور ثابت ہیں لیکن آج یہ چیز کمیاب اور مفقود ہے جب کہ عصر حاضر میں ایسے ایسے امراض پیدا ہو گئے ہیں جن کا علاج بہت گراں ہے اور جس پر ہر کوئی قادر نہیں۔

لہٰذا ایسے وقت میں شرعی اعتبار سے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اوقاف قائم کر کے اسپتال اور طبی مراکز کا نظام ایک اصول اور ضابطے کے تحت چلایا جائے اور مریضوں کا اطمینان بخش اور کارگر علاج کیا جاسکے (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۶۵۴، ۷۶۵۶)۔

دواؤں کا وقف بصراحت فقراء واغنیاء صحیح ہے، تبعاً امراء کے لئے بھی اس سے انتفاع درست ہے (عالمگیری ۲/ ۳۶۲، البحر الرائق ۵/ ۲۰۳)۔

خلاصہ یہ کہ اسپتال اور طبی مراکز کا نظم چلانے کے لئے اوقاف قائم کرنا اور ان کی آمدنی اور منفعت سے مریضوں کا علاج ومعالجہ اور طبی خدمت کرنا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ مطلوبات شرعیہ میں سے ہے اور اس فریضہ کو انجام دینا ہر صاحب ثروت اور مالدار مسلمان پر ضروری ہے۔ ارشاد ہے:

"وفي أموالهم حق للسائل والمحروم"۔

☆☆☆

متنوع سماجی و معاشی مسائل کے حل میں اوقاف کا کردار

مولانا محمد ارشد مدنی چمپارنی [1]

۱- مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے اوقاف کا قیام

موجودہ دور میں غرباء و مساکین اور مطلقہ بیوہ اور بے سہارا عورتوں کا مسئلہ نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔ اسلام کا نظام نفقہ رائج نہ ہونے کی وجہ سے مسلم سماج کے اندر غرباء و مساکین کے ساتھ ساتھ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کا معاشی بدحالی کا شکار ہونا عام سی بات ہوگئی ہے۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ کتاب و سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرز زندگی کو اسوہ بنایا جائے اور ایسے محتاج افراد کی اعانت کے لئے منظم تحریک چلانے کے ساتھ عملاً ان کی معاشی کفالت کا انتظام کیا جائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ عورتوں کی مدد اور ان کی خبر گیری کا خصوصی نظم فرما رکھا تھا (بخاری مع الفتح ۶/۲۱۵) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کو اس کار خیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''الساعي على الأرملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله أو القائم الليل، الصائم النهار'' (بخاری، نفقات ۵۳۵۳، أدب/ ۶۰۰۷)۔

یعنی ''بیوہ عورتوں اور مسکینوں کی کفالت کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ یا راتوں کو تہجد پڑھنے والے اور دن میں روزہ رکھنے والے کی طرح ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلامی حکومتوں خصوصاً خلفاء راشدین نے بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے لئے حکومتی سطح پر معاشی کفالت کا انتظام کیا اور اسے بحسن و خوبی انجام دیا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک بیوہ عورت کی استدعاء پر اس کا نام بیت المال کے رجسٹر میں درج کر کے اس کے اور اس کے یتیم بچوں کے لئے مستقل معاش کا انتظام فرما دیا (صفۃ الصفوۃ ۱/۱۰۷، سیرۃ عمر لابن الجعفری ص ۵۷)۔ اپنی شہادت سے چند ہی روز قبل انہوں نے فرمایا:

''لئن سلمني الله لأدعن أرامل أهل العراق لا يحتجن إلى رجل بعدي أبدا'' (بخاری، فضائل الصحابۃ: ۳۷۰۰)
(یعنی ''اگر میں زندہ رہا تو عراق کی کوئی بیوہ اپنی گذر بسر کے لئے کسی کی محتاج نہ رہے گی)۔

مذکورہ نصوص کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ باثروت مسلمانوں کے لئے مناسب ہی نہیں بلکہ ان کے اوپر واجب ہے کہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی معاشی کفالت کا انفرادی یا اجتماعی خصوصی نظم کریں۔

مطلقہ اور بیوہ عورتوں کی مالی کفالت اور ان کی امداد کی کئی ایسی صورتیں ہوسکتی ہیں، ان میں سے چند کا ذکر کر دینا مناسب ہے:

۱- ان کے گذر اوقات کے لئے مستقل نظم کیا جائے اور ان کے بال بچوں کی اچھی تعلیم کے لئے خصوصی پیکج متعین کیا جائے۔

۲- بعض عورتیں گھریلو صنعت کے ذریعہ خود کفیل ہونا چاہتی ہیں، ان کے کام میں معاونت کی جائے تاکہ وہ گھریلو صنعت میں ترقی کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل سنوار سکیں۔

۳- خواندہ طبقہ کی عورتوں کے علم سے فائدہ اٹھایا جائے محلے اور علاقے کی بچیوں کو یہ عورتیں اپنے گھروں میں ابتدائی تعلیم دیں اور ان کا ماہانہ وظیفہ اوقاف جیسے مالیاتی اداروں سے متعین کر دیا جائے یا طالبات کی اقامتی درسگاہوں میں جن میں معلمات کی ضرورت ہو، ان کی تقرری کر کے ان کا اور ان کے بچوں کا مناسب وظیفہ متعین کر دیا جائے۔

---

[1] جامعہ ابن تیمیہ، چمپارن، بہار

۴۔ مسلمانوں کے اندر بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے شادی کرنے کو رواج دیا جائے اور شادی میں ان کو خوب مدد دی جائے۔

۲۔ تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف

امت کے ذہین بچوں کی تعلیم کے لئے امداد کرنے میں امیر وغریب کی تفریق نہ کی جائے، غریب طلباء کے ساتھ ساتھ امیر طلباء کی بھی مدد کی جائے تا کہ امت کے عام بچوں کے اندر بے فکر ہو کر علم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ ہمارے اسلاف نے طلباء، علماء، فقہاء اور قضاۃ کی امداد کے سلسلے میں امیر وغریب کی تفریق نہیں کی ہے، انہوں نے خدمت علم کی تشجیع کی خاطر بلا تفریق بیت المال سے وظائف دیئے ہیں، عمرؓ نے اپنے حکام کے نام فرمان جاری کیا کہ قرآن کی تبلیغ وتعلیم کو عام کرواور قرآن پڑھنے والوں کے لئے وظیفہ جاری کردو۔ بعض حاکموں نے اطلاع دی کہ بعض لوگ قرآن اس لئے پڑھ رہے ہیں کہ ان کی معاش کا سلسلہ پیدا ہورہا ہے، آپ نے فرمایا کہ وظیفہ بہرحال جاری کردو (کتاب الاموال رص ۱۷۰)۔

طلباء واساتذہ کے وظائف کا یہ سلسلہ عمر بن عبدالعزیز کے عہد تک جاری تھا (طبقات ابن سعد ۵ / ۲۶۴)۔

امام غزالی بیت المال سے علماء دین ومحدثین ومفسرین، فقہاء وقراء اور طلبہ وغیرہ کی امداد ومساعدت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وليس يشترط في هؤلاء الحاجة بل يجوز أن يعطوا مع الغنى، فإن الخلفاء الراشدين كانوا يعطون المهاجرين والأنصار ولم يعرفوا بالحاجة وليس يتقدر أيضًا بمقدار بل هو إلى اجتهاد الإمام“ (احیاء العلوم ۲/ ۱۳۸)۔

(ان حضرات کی امداد کے سلسلے میں حاجت وضرورت کی شرط نہیں ہے بلکہ مناسب ہے کہ ان کو مالداری کے باوجود دیا جائے، کیوں کہ خلفاء راشدین انصار ومہاجرین کو ان کی ضرورت جانے بغیر دیا کرتے تھے اور اس میں مقدار کا بھی اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ چیز امام کے اجتہاد پر موقوف ہوگی)۔

۵۔ ملک سے باہر اعلی تعلیم۔

۳۔ مریضوں کے لئے اوقاف

بلاشبہ دور حاضر میں انسانی آمدنی کا معتد بہ حصہ علاج ومعالجہ پر صرف ہورہا ہے اور متعدد مہلک اور جان لیوا بیماریاں مثلاً ایڈز اور کینسر وغیرہ عام ہو چکی ہیں جن کے علاج کے مصارف برداشت کرنا عام آدمی سے قطع نظر صاحب ثروت افراد کے لئے بھی کبھی ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ایسے افراد کی معاونت وامداد ہمارا دینی واخلاقی فریضہ ہے، انسانی ہمدردی اور جذبہ ایثار وقربانی ہم ملت اسلامیہ کا طرہ امتیاز ہے جس کا حکم ہماری شریعت مطہرہ نے دیا ہے، اس لئے انسانی آبادی میں پیش آنے والے مصائب وآلام پر دوسروں کی مدد کرنا اور لوگوں کو اس کار خیر پر ابھارنا خوش آئند اور مستحسن عمل ہے بلکہ بیت المال اور اوقاف کے ذریعہ مختلف بیماریوں میں مبتلا افراد جو علاج کا صرفہ برداشت کرنے سے قاصر ہیں، کی امداد واعانت کا معقول انتظام نہایت ہی ضروری ہے تا کہ مذکورہ بیماریوں کی وجہ سے جو شرح اموات میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے اور معاشی طور پر کمزور ہونے کے سبب علاج کا صرفہ نہ برداشت کر پانے والے لوگوں میں جو قلق واضطراب ہے ان کا سد باب ہوسکے۔

۴۔ تحفظ شریعت اور دعوت دین کے لئے اوقاف

اسلامی شریعت اور اس کے اصول ومبادی پر ہمیشہ سے مختلف پیرایہ اور انداز میں حملے ہوتے رہے ہیں، ہر دور میں اعداء اسلام نے متعدد ذہنی، فکری اور مادی ومعنوی وسائل کو استعمال کر کے دین حنیف کو مٹانے کی ناروا کوششیں کی ہیں اور آج کے اس سائنس وٹکنالوجی اور متنوع وسائل اعلام کے دور میں شریعت اسلامیہ پر حملوں اور اعتراضات کے لئے اعداء اسلام نے مختلف طریقے اپنا رکھے ہیں۔

ماضی میں ہمارے اسلاف نے تحفظ شریعت اور تبلیغ دین کی راہ میں جتنے بھی وسائل وذرائع ہوسکتے ہیں ان کا خوب خوب استعمال کر کے دشمنان اسلام کے اعتراضات کا مسکت ومدلل جواب دیا جس کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اپنے باہمی اختلافات کے باوجود توحید وسنت کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی بسر کر رہے ہیں ورنہ آج ہماری حالت کیا ہوتی اہل دانش بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ آج بھی امت مسلمہ کے ہر فرد پر واجب ہے کہ حسب استطاعت دین وشریعت کی حفاظت اور اسلامی احکام کی ترویج واشاعت کے لئے پوری کوشش کریں، اس ضمن میں ارباب حل وعقد پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ شریعت کی حفاظت اور اس کی تبلیغ واشاعت کے لئے کوئی منظم طریقہ اختیار کریں، کیونکہ عصر حاضر کے تمام وسائل کو بروئے کار لاکر ہی ہم اپنی اس کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں اوقاف کے شرعی مصارف

مولانا نیاز احمد عبدالحمید مدنی[1]

۱- پریشان حال مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے شہروں اور دیہاتوں میں اوقاف قائم کئے جاسکتے ہیں تاکہ ان مصیبت زدہ عورتوں کی کفالت کی جائے اور یہ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر غلط راستے پر نہ پڑ جائیں یا ڈال دی جائیں۔

۲- مسلمان تعلیم کے میدان میں پچھڑے ہیں کیا اس کا سبب معاشی بدحالی ہی ہے یہ محل نظر ہے، میری سمجھ سے معاشی بدحالی بعض اعتبار سے رکاوٹ بن سکتی ہے لیکن تعلیمی زوال کا اسے عمومی سبب نہیں قرار دیا جاسکتا، تعلیمی پسماندگی کے جہت سے اسباب ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

☆ گھر پر طلبہ کی مناسب نگرانی نہ ہونا۔ ☆ سرمایہ داروں کا تعلیم کو اہمیت نہ دینا۔ ☆ طلبہ کا مطلوبہ محنت نہ کرنا۔

۳- مریض کے لئے اوقاف کا قیام ہونا چاہئے۔

اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقہ کے لوگوں کا علاج کیا جائے۔ جسمانی علاج کے ساتھ روحانی علاج کا بھی نظم کیا جائے۔

۴- تحفظ شریعت اور دعوت دین کے لئے اوقاف کا قیام جائز ہے، تحفظ شریعت کی مختلف شکلیں ہیں:

قرآن کی طباعت، قرآن کے معانی کا ترجمہ، قرآن کی تفسیر، ان کو وقف کے پیسہ سے شائع کر کے مفت فراہم کیا جائے۔

حدیث کا ترجمہ، تشریح، تخریج، تحقیق کر کے علماء اور طلبہ کو مفت یا کم قیمت پر فراہم کی جائے۔

اسی طرح دیگر علوم وفنون کی کتابیں شائع کی جائیں جو محقق کوئی کام کر رہا ہے اور مالی اعتبار سے کمزور ہے اس کی مدد کی جائے اور اسی وقف سے اس کی کفالت کی جائے، مذکورہ کاموں میں اخلاص کے ساتھ ساتھ امانت بھی مطلوب ہے۔

وقف کی جائداد سے یہ کام بھی لیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرایا جائے، نیز قرآن، حدیث، فقہ ترجمہ کے کام میں تکرار نہیں ہونی چاہئے۔

وقف کی ایک سرگرمی یہ ہوسکتی ہے کہ قرآن، حدیث یا پیغمبر اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، علماء اس کا مدلل اور منطقی جواب تحریر کریں اور ٹی وی، ریڈیو، اخبار یا کتاب کے ذریعہ اسے عوام تک پہنچایا جائے۔

وقف کی جائداد سے علماء کو وظائف دیئے جائیں اور یہ لوگ دعوت کا کام کریں۔

اس ترقی یافتہ دور میں اوقاف کے ذمہ داروں کا ذہن کامرشیل اور استثماری ہونا چاہئے، اسی طرح اوقاف کے ذمہ داروں کو مختلف اوقاف کے لئے میزانیہ بنا کر اہل ثروت کو اس کی طرف راغب کرنا چاہئے، کہ فلاں پروجیکٹ میں اتنا سرمایہ لگے گا آپ اتنا پیسہ دے کر اسے اپنے نام وقف کرالیں۔

مثلاً: تجارت، زراعت، مچھلی پالن، مرغی پالن، باغ، مضاربت، بس یا جیپ چلوانا، مکتبہ کھول کر دینا، زیراکس، پریس وغیرہ کھولنا۔

مذکورہ چیزوں میں سے کسی کے لئے کوئی جائداد دے یا پرانے وقف سے جو کمائی ہو وہ مطلوبہ حدود سے اگر زائد ہے تو اس کا استثمار کیا جائے اور اسی جیسے مد میں لگایا جائے۔

اگر کوئی جائداد کسی خاص مد کے لئے وقف کی گئی ہے اور مذکورہ مد سے اس کی آمدنی زیادہ ہے تو اسی جیسے مد میں اس کو صرف کیا جاسکتا ہے (مجموع فتاوی شیخ الاسلام)۔

---

[1] ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر، یوپی۔

اوقاف کا قیام-ضروریات اور دائرہ کار

مولانا اقبال احمد قاسمی[1]

اوقاف کا درجہ اسلام میں دیگر عام صدقات سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، وقف، صدقۂ جاریہ کے زمرہ میں آتا ہے جس کی فضیلت کے لئے یہ مشہور روایت کافی ہے:

''عن أبي هريرة رضي الله تعالیٰ عنه قال قال رسول الله ﷺ: إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له'' (بحواله مشكاة المصابيح)۔

وقف کی صحت کے سلسلہ میں بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ ابواب خیر میں سے کسی باب میں ہو اور اس کا سلسلہ دوامًا جاری وساری رہنے کا امکان ہو۔

مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے اوقاف

غریب مطلقات اور مسکین بیوگان کی کفالت اور اخراجات کے لئے وقف کی صحت وجواز میں تو کوئی شبہ نہیں، کیونکہ ان مصارف پر خرچ کار خیر میں شامل ہے اور اس کے علاوہ ان میں احتیاج اور تابید کی صورت بھی پائی جاتی ہے (فتاوی عالمگیری ۲؍۳۷۰)۔

تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف

دینی تعلیم کے لئے اوقاف تو قدیم بات ہے، الحمد للہ دینی مدارس کے لئے اوقاف کا رواج بھی کسی قدر ہے، لیکن دنیاوی تعلیم اور ملازمت کے لائق بنانے والی تعلیم وصنعت کے لئے اوقاف کی صحت محل تامل ہے۔

دنیاوی تعلیم اگر دینی تعلیم کے ضمن میں ہو یا مسلم اسکول کا قیام علاحدہ شکل میں ہو یعنی ملک بھر میں پھیلے غیر اسلامی طرز کے کالج اور عصری تعلیم گاہوں کے برعکس اس میں دینی اعمال کی بیداری اور عمل کے ساتھ غیروں کی تہذیب سے بچا کر ان کو اعلیٰ عصری تعلیم دی جائے اور اس مقصد کے لئے اوقاف کا قیام ہو تو یقینا کار خیر کا ایک باب شروع ہوگا اور اعمال بر کے دائرہ میں آکر وقف کی صحت کا سبب ہوگا ورنہ محض کلاسیں پاس کرا کر دین سے دور اور دنیا کے پاس کر دینا کوئی کار خیر کارنامہ نہ ہوگا اور نہ ایسے امور کے لئے وقف کرنا درست ہوگا۔

تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ وقف کی عمارت، ہاسٹل وغیرہ سے تو امیر وغریب سبھی طلبہ مستفید ہو سکتے ہیں، لیکن اوقاف کی آمدنی اور رقم واشیاء کا مصرف صرف غریب طلباء ہی ہو سکتے ہیں اور غریب طلباء کی ملازمت میں بھی وقف کی آمدنی سے تعاون کیا جا سکتا ہے۔

مریضوں کے لئے اوقاف

غریب مریضوں کے علاج ومعالجہ کا خرچ بھی ضرورت مند اور فقراء پر اخراجات کا ایک جزء ہے، لہذا فقراء اور غرباء کی دیگر ضروریات پر وقف کی طرح علاج پر خرچ کے مقصد سے کیا گیا وقف بھی صحیح ہے، ضرورت کے تحت موقع محل کے اعتبار سے ہر نوع کے شفاء خانے، ڈسپنسری سے کلینک اور نرسنگ ہوم تک کے اسپتالوں کا قیام یا محض دواؤں کا نظم یا صرف تشخیص وتجویز کی سہولت کے مراکز کا قیام یہ سب صورتیں جائز اور درست ہیں۔ صراحت ہو یا کم از کم نہ ہو تو غرباء کے علاج کے ساتھ ساتھ امراء کے علاج میں بھی رعایت برتی جا سکتی ہے بشرطیکہ وقف کا اصل محل جو فقراء ہیں اس میں خلل نہ پڑے (شامی، کتاب الوقف ۳؍۴۹۳، نیز شامی ۳؍۴۵۷)۔

---

[1] مدرسہ مظہر العلوم، کانپور

دیگر مقاصد کے لئے اوقاف

دین کے بہت سے ایسے شعبے ہیں جن کو موجود رکھنا اور ان کی حفاظت وبقاء کا نظم اور ان کی ترقی وفروغ پوری امت مسلمہ کا اجتماعی فریضۂ کفایہ ہے، مثلاً:

۱۔ مبلغین اسلام و مصلحین امت کے ذریعہ تبلیغ دین، غیروں میں تبلیغ اسلام اور مسلمانوں میں تذکیر کا کام، معروفات کی ترویج اور منکرات پر نہی۔

۲۔ ہر بستی میں دینی تعلیم کا نظم اور پیش آمدہ مسائل کا شرعی حل بتلانے کے لئے کسی مستند عالم کا ہونا کم از کم مسلمانوں کے ایمان، عقائد، نکاح، جنائز، اذان وغیرہ کا بندوبست رکھنا۔

۳۔ یتیم خانہ کا قیام اور یتیم ونادار بچوں کی دینی ودنیاوی کفالت وتربیت۔

۴۔ نومسلموں کا نظم جو اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں مظلوم ومحروم ہوکر مسلمانوں کے دامن میں بھی پھل پھول نہیں پاتے اور پریشانی کا شکار رہتے ہیں۔

۵۔ عوامی قبرستان کا نظم اور ان کا تحفظ، نیز لاوارث میتوں کی تجہیز وتکفین کا نظم۔

۶۔ اجتماعی حادثات یا آفات سماوی وارضی میں یا فسادات میں جو مجبور و پریشان حال ہوجاتے ہیں ان کے قیام وطعام وریلیف کا نظم۔

۷۔ مسافر خانے، کالونیاں، سبیلیں بنانا۔

۸۔ نشرواشاعت، لائبریری وغیرہ کا قیام۔

۹۔ محکمہ جات شرعیہ، دارالقضاء وغیرہ کا قیام۔

۱۰۔ اعیاد وتقریبات، وغیرہ مواقع میں غرباء کے لئے کپڑوں اور ضروریات کی فراہمی۔

اس قسم کی جملہ دینی خدمات جو کہ لابدی ہیں اور اسلامی حکومت نہ ہونے کے باعث تعطل کا شکار ہیں یا ہوسکتی ہیں، کوئی ذریعہ نہ ہونے کی صورت میں اوقاف کی آمدنی سے بھی انجام دی جاسکتی ہیں، ان کارہائے خیر کی انجام دہی کرنے والوں کی تنخواہ بھی بربنائے ضرورت (قیاساً علی اجرت التعلیم) وقف کی آمدنی سے دینے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہ ہوگا، واقف کا منشاء پورا ہوگا اور عنداللہ اجر کا سبب ہوگا۔

وقف کے سلسلہ میں چند قابل لحاظ مسائل

حاجات وضروریات کے تنوع کے پیش نظر وقف کے مصرف کے تعین میں واقف کو یہ ہدایت کردینا چاہئے کہ وہ وقف کا مصرف از خود نہ قرار دے کر اس میں یا توتوسع سے کام لے یا وقف کے متولی کی صوابدید پر چھوڑ دے تاکہ واقف کی غرض کے خلاف وقف کا مصرف اختیار کرنے کی قباحت لازم نہ آئے۔ (شامی ۳/ ۵۸۵، عالمگیری ۲/ ۴۹۰)۔

محکمۂ اوقاف ایک سرکاری محکمہ بھی ہے جو بلا مبالغہ حکومت کے شعبوں میں سب سے خائن شعبہ ہے، اس لئے حتی الامکان اوقاف کو ان کے عمل دخل سے اور ان کے تصرفات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے، یوں بھی اوقاف کو شرعاً سرکاری محکمۂ اوقاف کے حوالہ کرنا ضروری نہیں ہے (خانیہ ۳/ ۲۹۷)۔

اوقاف کو مستحکم اور اس کے نظم ونسق کو بہتر بنانے کے لئے ایک تدبیر فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ متولی جو اوقاف میں آمد وخرچ اور تصرفات کا ذمہ دار ہوتا ہے اس پر ایک نگراں کمیٹی بھی مسلط رہے جو صرف نگرانی کا اختیار رکھے گی کہ جائز مصرف کے علاوہ کوئی تصرف نہ ہوسکے (خانیہ ۳/ ۲۹۷)۔

وقف کی آمدنی کے جو مصارف ہیں ان پر خرچ کرنے میں بھی حدود کا لحاظ ضروری ہے، مثلاً:

وقف کی آمدنی اوقاف کے استحکام میں لگانا جائز ہے تزئین ونقش ونگار میں نہیں (خانیہ ص ۲۹۱، عالمگیری)۔

وقف کے متولی فرد یا کمیٹی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ وقف کا حساب سالانہ یا عندالطلب واقف یا وقف سے فائدہ اٹھانے والوں یا معاملہ فہم دیانتدار محلہ والوں یا قاضی کے سامنے پیش کرتا رہے اور اپنا دامن صاف رکھنے کی کوشش کرے (درمختار ۳/ ۵۸۸، (عالمگیری ۲/ ۴۹۰)۔

تحریری آراء:

مختلف دینی مقاصد کے لئے اوقاف کا قیام

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی[1]

اسلام میں فلاح و بہبود کے کاموں کی ذمہ داری حکومت پر ہے اور وقف کا ادارہ ایک ایسا پرائیویٹ ادارہ ہے جو فلاح و بہبود کے کاموں میں حکومت کی امداد اور اعانت کرتا ہے۔ وقف کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اصل چیز کو باقی رکھتے ہوئے اس کے منافع سے فائدہ پہنچایا جاتا ہے اور یہی بات اس کو سب سے ممتاز کرتی ہے۔ اس لئے ہر وقف صدقہ ہے، مگر ہر صدقہ وقف نہیں ہے۔ صدقہ دینے والے کی ملک سے نکل کر جس کو دیا گیا اس کی ملک میں چلا جاتا ہے، لیکن وقف واقف کی ملکیت سے نکل کر مالک حقیقی کی ملک میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے منافع سے ہمیشہ ہمیشہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔

۱- جہاں تک مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے اوقاف قائم کرنے کا تعلق ہے یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، مطلقہ اور بیوہ عورتیں خاوند کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد بے سہارا ہو جاتی ہیں، اس لئے ایسا وقف ضرور ہونا چاہئے جو ایسی خواتین کو سہارا دے اور ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔

۲- تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف کا قیام بھی نہایت ضروری ہے، ہمارے بچوں کو مناسب تعلیم نہ ملنے سے ان کی صلاحیتیں برباد ہو رہی ہیں اور بعض اوقات ایسے بچے اچھی تعلیم و تربیت نہ ملنے کی وجہ سے بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لئے تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف کا قیام نہایت ضروری ہے۔

۳- مریضوں کے لئے اوقاف قائم کرنا اسلام کی روایت رہی ہے، وہ لوگ جو طبی امداد حاصل کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے لئے کم خرچ اور مفت علاج معالجے کی سہولت کا ہونا ایک صحت مند سماج کے لئے ضروری ہے، صرف علاج ہی کے لئے نہیں بلکہ ایسے کیمپ بھی لگائے جائیں جن میں حفظان صحت کے اصولوں اور طریقوں سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے، مریضوں کے اوقاف کے تحت اس طرح کے کیمپوں کا لگنا اور ان کے ذریعہ لوگوں کو صحت کے تحفظ کے طریقوں سے باخبر کرنا نہایت مفید ہوگا۔

۴- تحفظ شریعت اور دعوت دین کے لئے بھی مستقل وقف ہونا چاہئے، قرآن مجید میں سورۂ توبہ کی آیت ۷: ''وفي سبيل الله'' کے جملے میں جہاں مجاہدین شامل ہیں، وہیں دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے اور شریعت کے تحفظ کی خدمات انجام دینے والے بھی اس کا مصداق ہیں، اس لئے اگر ایسے اوقاف قائم ہوں گے تو دین کی دعوت کا کام زیادہ منظم اور وسیع پیمانہ پر انجام دیا جا سکے گا۔

البتہ یہ غور کرنا ہوگا کہ حکومت ہند کے وقف ایکٹ کے تحت جو ریاستی اوقاف قائم ہیں اس سے الگ ہو کر اوقاف کے ایک مستقل ادارے کو قانونی تحفظ کیسے حاصل ہوگا۔ حکومت کے قائم کردہ وقف بورڈوں پر لوگوں کو اعتماد نہیں رہا اور اس سے بدگمانیاں عام ہو چکی ہیں لیکن ایک مستقل ادارہ جو عوامی ادارہ ہوگا اس کو قانونی تحفظ اور لوگوں کا اعتماد دونوں حاصل کرنے ہوں گے، اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ امت مسلمہ میں اجتماعی کاموں کو ٹھیک ڈھنگ سے کرنے کا ابھی وہ سلیقہ پیدا نہیں ہو سکا ہے جو اس طرح کے کاموں کے لئے ضروری ہے، خصوصاً مالیات کے معاملے میں احتیاط کا پایا جانا اور اس کے لئے معتمد افراد کا ملنا یہ سب باتیں ہمیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

☆☆☆

---

[1] جامعہ دار السلام، مالیر کوٹلہ، پنجاب

تعلیمی، رفاہی اور دینی مقاصد کے لئے

اوقاف کا قیام وقت کی اہم ضرورت

مولانا محمد ارشاد القاسمی[1]

۱- مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے اوقاف

ایسے مصارف کے لئے اوقاف کا قیام شریعت اور وقت کا اہم تقاضا ہے۔

۲- تعلیمی مقاصد کے لئے اوقاف

تعلیمی مقاصد کے لئے بھی اوقاف کا قیام "بر" کے مفہوم میں شامل ہے (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۸/ ۱۹۵)۔

۳- مریض کے لئے اوقاف کا قیام

"بر" کے جامع مفہوم میں جو وقف کے مقاصد میں ہے، یہ بھی شامل ہے، ان کی مالی اعانت اوقاف کی آمدنی سے اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ فقراء کے ذیل میں شامل ہو کر یہ علاج معالجہ کے لئے مالی تعاون حاصل کریں گے اور شفاخانہ کا قیام جہاں ان کا بحسن وخوبی علاج کیا جاسکے، اس کے لئے بھی اوقاف کا قیام جائز ہے اور اوقاف کے مقاصد میں ہے (دیکھئے: الفقہ الإسلامی وأدلتہ ص ۱۹۵)۔

۴- تحفظ شریعت اور دعوت دین کے لئے اوقاف

اس امر کی ضرورت ہندوستان جیسے ملک میں بہت شدید ہے اور یہ بر اور قربت کے جامع مفہوم میں داخل ہے (شامی ۲/ ۳۴۱)۔

☆☆☆

[1] مدرسہ ریاض العلوم، گورینی، جونپور۔

نئے اوقاف کے قیام کے لئے پیش بندی کی ضرورت

مولانا سلطان احمد اصلاحی[1]

سوال نامہ میں: ۱- مطلقہ اور بیوہ عورتوں کی فلاح و بہبود، ۲- مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ، ۳- مریضوں کی خبر گیری اور ۴- تحفظ شریعت کے مقصد سے اوقاف کے قیام کی جو تجویز پیش کی گئی ہے، اس کے محمود اور مطلوب ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ ملت اور ملت کی اس طرح کی دیگر ضروریات و مقاصد کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے، جہاں تک امت کی فلاح و بہبود کے لئے نفس اوقاف کے مسئلہ کا سوال ہے تو اس کی فضیلت اور برتری کے حق میں اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ امت میں اس بابرکت روایت کی ابتداء کا سہرا موفق امت حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے سر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے خیبر میں اپنی ''ثمغ'' نامی اراضی کو راہ خدا میں وقف قرار دیا (ہدایہ ۲/ ۲۱۷ طبع رشیدیہ، دہلی)۔ اس کے سلسلے میں اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث اس کے علاوہ ہیں جن میں اس کار خیر کی غیر معمولی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے، جس کی تفصیل اپنے مقام پر دیکھی جاسکتی ہے (ایک حوالہ کے لئے دیکھئے: الامیر الصنعانی (م ۱۱۸۲ھ): سبل السلام شرح بلوغ المرام ۳/ ۹۳۴، ۷-۹۳ طبع جدید مکتبہ عاطف (مصر) تصحیح و تعلیق: محمد عبد العزیز الخولی)۔

اس کی بنا پر آج بھی بالخصوص بے سہارا خواتین کی بہتری اور ان دیگر مقاصد کے لئے اوقاف کے قیام کی ترغیب مسلم عوام کو دی جاسکتی ہے، جن کی زیر نظر سوالنامہ میں نشاندہی کی گئی ہے۔ موجودہ حالات میں جبکہ بحمد للہ امت میں ایک طبقے کو خوشحالی اور آسودگی میسر ہے اس کے لئے مزید فضا ہموار کی جاسکتی ہے، شہری آبادی میں مسلمانوں کے پاس بڑی بڑی عمارتیں اور حویلیاں ہیں جن کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں ہے اور تھوڑے سے عزم و ارادے سے وہ انہیں راہ خدا میں وقف کرسکتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں بھی خاص طور پر قدیمی عمارتوں اور حویلیوں کی بڑی تعداد ہے جن کا ان کے مالکوں کے لئے اب کوئی خاص مصرف نہیں رہ گیا ہے، ان کو راہ خدا میں وقف کرکے دین و ملت کی بڑی خدمت کی جاسکتی ہے اور اپنے نامہ اعمال کو سرسبز و شاداب کیا جاسکتا ہے، شہر اور دیہات دونوں جگہ دوکانوں اور زراعت اور کاشت کی زمینوں کو بھی اسی طرح مختلف مقاصد کے تحت راہ خدا میں وقف کیا جاسکتا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے موجودہ نازک اور پیچیدہ حالات کے پس منظر میں بلاشبہ علماء و عمائدین امت ان کو اس کی طرف متوجہ کرسکتے ہیں اور ان کی اس پکار پر مسلم عوام و خواص کو لازماً توجہ دینی چاہئے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے مسئلہ کی طرف بھی امت کو متوجہ کرنا چاہئے اور وہ ہے امت کے اندر تنظیم کی قوت کا پیدا کیا جانا جس کے نتیجے میں کاموں کو مل جل کر دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ لگاتار اور مسلسل باہمی مشاورت اور اعتماد کی فضا میں انجام دیا جاسکے۔ اس صلاحیت کے لحاظ سے امت اسلامیہ ہندیہ کا حال بالکل کھوکھلا ہے اور اس کے تمام ادارے، فورم اور تنظیمیں اکثر و بیشتر دکھاوے کی اور حقیقی قوت سے محروم ہیں، ورنہ دیانتداری، شورائیت اور تنظیم کی صلاحیت اگر ہندوستانی مسلمانوں کے اندر موجود ہو تو جیسا کہ کہا جاتا ہے آج صرف پنجاب اور ہریانہ کے مسلمانوں کے قدیمی اوقاف سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی کئی ایک یونیورسٹیاں چلائی جاسکتی ہیں۔ لیکن بہرحال امت کی ضرورتیں بہت پھیلی ہوئی ہیں اور ان اوقاف کے باوجود مسلمانوں کے لئے نئے اوقاف کی ضرورت کسی طرح کم نہیں ہوتی ہے، البتہ نئے اوقاف کے قیام کے ساتھ ان کے مؤثر انتظام کی بھی اول دن سے اسی طرح فکر کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ پرانے اوقاف کے مانند ہمارے یہ نئے اوقاف بھی ہماری روایتی بدنظمی اور نااہلی کی نذر ہوجائیں اور ان کی بدحالی کی شکایت کے ساتھ ان کے مؤیدین و مجوزین کی طرف بھی تنقید و اعتراض کی انگلیاں اٹھنے لگیں۔ اس کی پیش بندی کرتے ہوئے نئے اوقاف کے قیام کی ترغیب اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پلیٹ فارم سے دی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

---

[1] ادارہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ۔

اوقاف کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے جامع منصوبہ بندی کی ضرورت

مفتی محبوب علی وجیہی [1]

فقہ اکیڈمی کے ارکان تاسیسی کی فکر اور اس کے لئے ممکنہ حل قابل مبارکباد ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ متولیان اوقاف اپنا حق ادا نہیں کرتے، آج جو ہمارے قدیم بزرگوں کے اوقاف ہیں اگر انہیں کی ٹھیک دیکھ بھال کی جائے اور موجودہ شرح کرایہ ان کی مقرر کی جائے اور جو شکستہ ہو گئے ہیں ان کی تعمیر جدید کی جائے تو آپ کے مذکورہ مدات کے لئے بہت کچھ ضرورت ان سے پوری ہو سکتی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ضلع وار اوقاف کمیٹیاں بنائی جائیں جن میں علماء حق شامل ہوں اور وہ قدیم اوقاف کا سروے کریں، جن اوقاف کے متولیان غبن کر رہے ہیں یا حق تولیت ادا نہیں کر رہے ہیں ان کی تولیت توڑی جائے اور ہر مکتبہ فکر کے علماء حق کی ایک کمیٹی بنا کر کار تولیت ان کے سپرد کیا جائے، وہ ذرائع آمدنی بھی بڑھائے اور اس کو اس کے مصارف پر خرچ کرے، مزید اہل اسلام کو اس میں تعاون کے لئے سرگرم کرے، چاہے بذریعہ وقف ہو یا وقتی امداد ہو۔ اس میں جو مصارف زکاۃ کے تحت آتے ہیں، ان کے لئے زکاۃ بھی وصول کی جائے، جب علماء حق اور بااثر دین دار، دین پسند مسلمانوں کی کمیٹیاں بنیں گی اور صحیح خدمت مسلمانوں کی انجام دیں گی تو اوقاف بھی بڑھیں گے اور موجودہ اوقاف میں سدھار بھی آئے گا، مسلمان قوم آج ہمارے دینی و دنیاوی رہنماؤں سے بدگمان ہو چکی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان میں اپنا اعتماد بحال کیا جائے تو اس جیسے کام خود بخود پورے ہونے لگیں گے۔ افسوس یہ ہے کہ علماء، صوفیاء اور رہنمایان قوم خدمت کے محاذ پر پورے نہیں اترتے، اگر فقہ اکیڈمی یہ کام انجام دے سکتی ہے تو اس میں ضرور پیش قدمی کرنا چاہئے ورنہ قوم کے سرمائے کو ضائع کرنے اور اپنے اوپر ایک اور داغ لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، ماشاء اللہ آپ حضرات کو مجھ سے اس معاملہ میں کہیں زیادہ تجربہ ہے اور اوقاف کی حالت سے آپ بے خبر نہیں ہیں۔ آپ نے جو چار مدات قائم کی ہیں ضروری ہیں لیکن سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد قدم اٹھانا چاہئے۔

☆☆☆

---

[1] انگوری باغ، رامپور۔

نئے اوقاف کے قیام سے متعلق تجاویز پر غور

مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری[1]

ملی ضروریات کی تکمیل کے لئے اوقاف کے قیام کی ترغیب بظاہر بہت اچھی تجویز ہے اور دیانت دارانہ طور پر اس پر عمل ہو جائے اور مستحقین تک اوقاف کی آمدنی پہنچانے کا انتظام ہو تو بلا شبہ اس ذریعہ سے بڑے بڑے کام انجام پاسکتے ہیں، لیکن عملی اور تجرباتی زندگی میں ہمارے ملک میں آج ایسی صورتحال پیدا ہو چکی ہے کہ حصول آمدنی کے لئے اوقاف کی ترغیب دینا محض بے فائدہ بلکہ مضر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حکومت اسلامی کے مفقود ہونے کی وجہ سے ۹۰ رفیصدی سے زیادہ اوقاف خود مسلمانوں کی طرف سے دست درازی کا شکار ہیں اور واضح طور پر نہایت بے دردی سے ان کا استحصال کیا جارہا ہے۔ مثلاً:

۱- اوقاف کے متولی حضرات وقف کی جائدادوں میں مالکانہ تصرف کرتے ہیں اور ان کی آمدنی اصل مصارف میں خرچ نہیں کرتے ہیں۔

۲- بعض مرتبہ متولیان کی خیانت اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ وہ وقف بورڈ کے بددیانت افسران سے مل کر وقف جائداد کو فروخت کر دیتے ہیں۔

۳- وقف کی جگہ پر جو قابض ہوتا ہے وہ آسانی سے خالی نہیں کرتا اور وقف کے کرایہ دار نسلاً بعد نسل قابض رہنے کی وجہ سے مقبوضہ دوکان یا جائداد پر مالکانہ تصرف کرتے رہتے ہیں۔

۴- عموماً کرایہ داروں اور اوقاف کے متولیوں میں مقدمہ بازی شروع ہو جاتی ہے جو دسیوں سال میں بھی نمٹنے میں نہیں آتی اور ادارہ کا بڑا سرمایہ اس میں ضائع ہوتا رہتا ہے، دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی جیسے بڑے اداروں کے اوقاف کے شعبوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر قابض کرایہ داروں سے مقدمہ بازی چل رہی ہے اور اس شعبہ کی آمدنی بہت محدود ہے جبکہ خطرات اور تحفظ اوقاف کے لئے محنتیں کہیں زیادہ ہیں۔

۵- مذکورہ باتوں سے قطع نظر یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جس ملی ادارہ کے ساتھ وقف وغیرہ کی شکل میں آمدنی کے متعین ذرائع جتنے زیادہ پائے جاتے ہیں اسی اعتبار سے اس میں اقتدار کے لئے رسہ کشی بھی تیز ہو جاتی ہے اور طالع آزما قسم کے لوگ ان اداروں پر قابض ہو کر من مانی کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

ان سب خرابیوں کی اصل بنیاد یہ ہے کہ یہاں کوئی ایسا طاقتور ادارہ اور حکومت موجود نہیں جو وقف کا صحیح معنی میں تحفظ کرے، انہیں خائن منتظمین اور متولیان سے بچائے اور اوقاف کو خرد برد ہونے سے محفوظ رکھے، جب تک اس کا انتظام نہ ہو یہاں اوقاف کی ترغیب کیسے دی جاسکتی ہے؟ اگر بالفرض کسی ادارے میں وقتی طور پر اس میں کوئی فائدہ بھی نظر آتا ہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ بھی یہ نفع برقرار رہے گا، لہذا اوقاف کی ترغیب سے متعلق تجویز لانے سے پہلے اس راہ کی مشکلات کا سدباب کرنے کا انتظام کر لینا چاہئے، اس کے بعد ہی ترغیبی پہلو اپنانا چاہئے۔

---

[1] دارالافتاء، جامعہ قاسمیہ، مدرسہ شاہی، مرادآباد۔

مسلم اوقاف کا اسلامی حکومت سے بڑا گہرا جوڑ ہے، فقہ اسلامی کا ایک مستقل باب وقف اور اس کے تحفظ کے متعلق ہے، بلکہ بعض فقہاء نے تو اس موضوع پر مبسوط کتابیں بھی تالیف فرمائی ہیں لیکن تقریبا تمام وقف کے مسائل کی تان حاکم کے اختیارات پر آ کر ٹوٹتی ہے، شریعت میں بااختیار مسلم حکومت کو اوقاف کے تحفظ کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اوقاف کے رجسٹریشن سے لے کر اس کو کرایہ پر اٹھانے، اوقاف کے متولیان کی نگرانی کرنے اور خیانت پر گرفت کرنے اور کوتاہی کرنے والوں سے باز پرس کرنے تک کی ساری ذمہ داری بااختیار مسلم حاکم کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر حاکم شرعی اس معاملہ میں دخیل نہ ہو تو اوقاف کا ہرگز تحفظ نہیں ہو سکتا۔

بہرحال ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملک میں چونکہ تحفظ اوقاف کا ابھی تک صحیح انتظام نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کو ملی ضرورت کی تکمیل کے لئے اوقاف قائم کرنے کا مشورہ دینا دراصل ان کی جائدادوں کے ضیاع کا دروازہ کھولنا ہے، اس لئے موجودہ حالات کے تناظر میں یہ تجویز انجام کے اعتبار سے بہتر معلوم نہیں ہوتی، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو اوقاف موجود ہیں پہلے ان کو کارآمد بنانے کی کوشش کی جائے اور جس طرح پنجاب وقف بورڈ ایک نظم کے ساتھ اوقاف کی آمدنی کے ذرائع پیدا کر رہا ہے اور وہ آمدنی ملی اداروں اور ائمہ وغیرہ کی تنخواہوں میں صرف بھی ہو رہی ہے، دیگر صوبوں کا نظام بھی اسی طرح بنانے کی کوشش کی جائے، یہ ملت کی بڑی خدمت ہوگی۔ انشاء اللہ۔

نئے اوقاف کا منصوبہ دیہات تک وسیع ہو

مفتی نعمت اللہ قاسمی ؒ

اس سلسلہ میں میری تجاویز مندرجہ ذیل ہیں:

- سب سے پہلی تجویز تو اس تعلق سے یہ ہے کہ اس منصوبہ کو گاؤں دیہات تک پھیلایا جائے۔
- دوسری تجویز یہ ہے کہ اوقاف کا قیام ہر گاؤں میں ہو یا زیادہ سے زیادہ دو چار گاؤں کا حلقہ بنا کر اس میں اوقاف کا قیام کیا جائے جو ان گاؤں یا اس حلقہ کے لوگوں کی ضروریات کے لئے کافی ہو، چھوٹے شہر کو ایک حلقہ تسلیم کیا جائے، بڑے شہروں میں کئی حلقے بنائے جاسکتے ہیں اور ہر حلقہ میں اوقاف کا قیام ہو۔
- تیسری تجویز یہ ہے کہ ہر دو چار اوقاف پر ایک منتظم مقرر ہو جو ان اوقاف کی حفاظت اور نگرانی کرے۔
- چوتھی تجویز یہ ہے کہ ہر حلقہ میں امداد کی درخواست پر غور کرنے کے لئے پانچ نفری کمیٹی بنادی جائے جو ہر ہفتہ امداد کی درخواست پر غور کر کے ایماندارانہ فیصلہ کرے۔
- پانچویں تجویز یہ ہے کہ تمام ذیلی مراکز (اوقاف) کو منظم اور مربوط رکھنے کے لئے ایک مرکزی وقف بورڈ قائم ہو جس کی حیثیت منتظم اعلیٰ کی ہو۔

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بیسویں فقہی سمینار منعقدہ مورخہ ۵-۷ مارچ ۲۰۱۱ء
کوراپور میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات ومناقشات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان
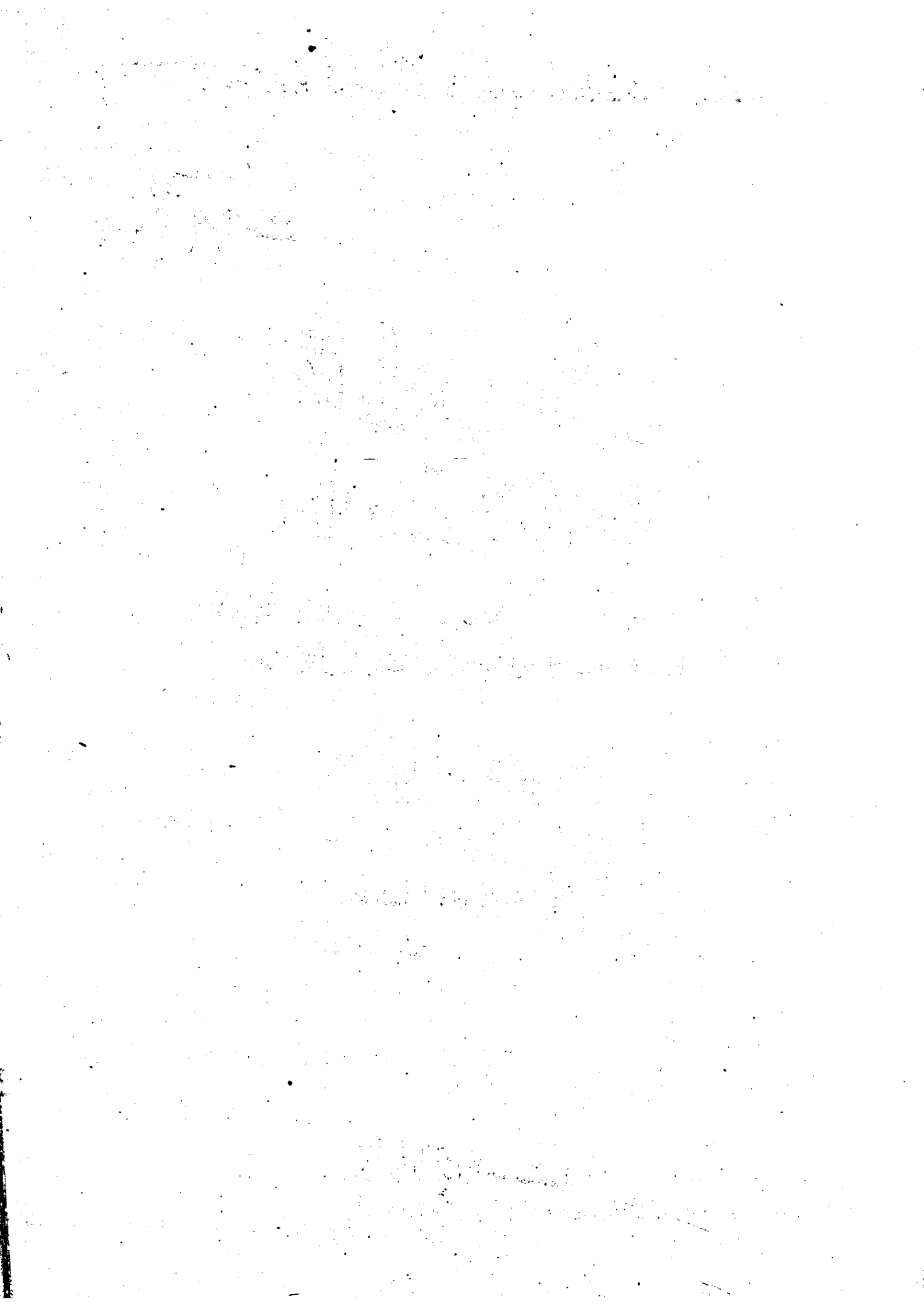
پیش لفظ

کسب معاش کے بنیادی طور پر تین ذرائع ہیں: تجارت، زراعت اور صنعت۔

"تجارت" مال کے خریدنے اور بیچنے کا نام ہے، تجارت ہی کے واسطے سے انسان کو تمام ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں، "زراعت" کاشتکاری اور باغبانی سے عبارت ہے، زراعت ہی کے ذریعہ انسان اور حیوان کی بنیادی غذائی ضرورت پوری ہوتی ہے، "صنعت" قدرتی وسائل کے ساتھ انسانی محنت کو شامل کر کے چیزوں کو وجود میں لانے کا نام ہے، زندگی کی بہت سی ضروریات شروع سے صنعت کے ذریعہ حاصل ہوتی رہی ہیں اور اب اس مشینی دور میں سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر چیز انسان کی صناعی کا شاہکار ہے۔

تجارت ہو یا زراعت یا صنعت، اکثر اوقات تنہا ایک شخص اس کو انجام نہیں دے سکتا، تجارت جتنی بڑی ہوگی، اتنے ہی زیادہ افراد کی ضرورت ہوگی، زراعت کے لئے مزدور کی ضرورت ہے، زراعت کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا، اتنے ہی افراد مطلوب ہوں گے، سب سے زیادہ افرادی وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے صنعت میں؛ بلکہ صنعتیں روزگار کے لئے زبردست وسیلہ تصور کی جاتی ہیں؛ اس لئے کسب معاش کا جو بھی شعبہ ہو، اس میں آجرین اور ملازمین دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ قدرتی وسائل سے زیادہ اہمیت افرادی وسائل کو حاصل ہو، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار حاصل ہو، مزدوروں کو ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملے؛ اس لئے ملازمت کے جائز ہونے میں کوئی دورائے نہیں ہوسکتی؛ لیکن ایک اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ کسی شئی کو وجود میں لانے یا اس کو فروغ دینے میں ملازمین کا نہایت اہم رول ہوتا ہے، اگر ان کی محنت سے کوئی ایسی چیز وجود میں آتی ہے، جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو اور بہتر نیت کے ساتھ مزدور مزدوری کریں تو وہ کام اس کے لئے باعث اجر ہے اور اگر وہ کسی ایسی چیز کو وجود میں لانے کا سبب بن رہا ہے جو انسانیت کے لئے نقصان دہ ہے، جو اخلاق کے لئے تباہ کن ہے اور جو شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے تو یہی چیز اس کے لئے گناہ اور اللہ کے یہاں پکڑ کا باعث ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: [وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان] (المائدۃ: ۲)، اسلامی نقطۂ نظر سے جب ملازمت کے بارے میں غور کیا جائے تو ضروری ہے کہ اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جائے، نیز یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ تعاون کے مختلف درجات ہیں اور اسی لحاظ سے اس کے احکام ہوں گے۔

گذشتہ ادوار میں ملازمت کے مواقع کم تھے، اسی لحاظ سے ان کے بارے میں فقہی احکام ملتے ہیں، موجودہ عہد میں ملازمت کی متنوع شکلیں پیدا ہوئی ہیں، پھر جو ملازمتیں گناہ کے کام میں تعاون کا ذریعہ بنتی ہیں، ان کے بارے میں بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ تعاون کے کس درجہ میں ہیں؟ کیا وہ قریبی تعاون کے درجہ میں آتی ہیں جس کی ممانعت ہے یا تعاون بعید ہے جس سے بچنا دشوار ہے؟ نیز وہ جس ممنوع کام میں تعاون کا ذریعہ بن رہی ہیں، خود وہ کام حرام ہے یا مکروہ یا خلافِ مستحب؟ اور حرام ہے تو حرام لعینہ ہے یا حرام لغیرہ؟ غرض کہ مختلف جہتیں ہیں، جو قابلِ توجہ ہیں؛ اس لئے یہ اس دور کا ایک اہم مسئلہ ہے اور خاص کر ارباب افتاء اس سلسلہ میں مختلف سوالات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے موضوع کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے بیسویں فقہی سیمینار منعقدہ رام پور میں اس موضوع کو بھی شامل کیا، اس کے لئے ایک جامع سوالنامہ جاری کیا گیا، اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ اکیڈمی کی دعوت پر اہلِ علم توجہ دیتے ہیں اور اس طرح جدید مسائل پر ایک قیمتی علمی ذخیرہ تیار ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے محب عزیز مفتی محمد سراج الدین قاسمی وفقه الله كما يحب ويرضاه کو، کہ انہوں نے بڑی محنت سے اس مجموعہ کو مرتب کیا اور اس میں مقالات کے ساتھ ساتھ سیمینار میں پیش کئے جانے والے عرضِ مسئلہ، مشارکین کے مناقشات اور تجاویز...... جو سیمینار کا لب لباب ہیں۔ کو بھی شامل کیا، اس طرح یہ مجموعہ قارئین کے سامنے ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو امت کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے اور اکیڈمی کی خدمات میں تسلسل کو برقرار رکھے۔

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا) / محرم الحرام ۱۴۳۳ھ / ۱۰ دسمبر ۲۰۱۱ء

اکیڈمی کا فیصلہ

مختلف النوع ملازمتیں اوران کے شرعی احکام

[۱] ۔الف۔ فوج کا بنیادی مقصد ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور غیر معمولی حالات میں امن وامان کا قیام ہے، یہ دونوں مقاصد شریعت اسلامیہ میں بھی مطلوب ہیں، اس لیے مصلحت عامہ کے پیش نظر فوج کی ملازمت مسلمانوں کے لیے جائز ہے، البتہ حتی الامکان غیر شرعی اقدام سے احتراز ضروری ہے۔

ب۔ پولیس کا محکمہ بھی دراصل امن وامان قائم کرنے اور شہریوں کی جان ومال کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے، اس لیے اس کی بھی ملازمت جائز ہے، لیکن ضروری ہے کہ اپنے فرض کی انجام دہی کے لیے کسی طرح کا ظلم وستم وغیرہ نہ کیا جائے۔

ج۔ ملک کی سلامتی، امن وامان کے قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے انٹیلی جینس کی ملازمت درست ہے، البتہ ہر ایسے طریقۂ کار سے اجتناب لازم ہے جو غیر شرعی اور حقوق انسانی کے خلاف ہو۔

د۔ عدلیہ کا مقصد انصاف کی فراہمی اور ظلم وحق تلفی کی روک تھام ہے، لہٰذا عدلیہ کی ملازمت درست ہے۔

ھ۔ حکومت کی طرف سے رعایا کی فلاح وبہبود کی غرض سے مختلف ٹیکس عائد کیے جاتے ہیں اور ان کے لیے محکمے وادارے قائم ہیں، ایسے اداروں کی ملازمت شرعی حدود کا لحاظ کرتے ہوئے جائز ہے۔

[۲] ۔الف۔ بینک کا بنیادی کام سودی لین دین کا ہے، اس لیے اصولی طور پر بینک یا کسی سودی کاروبار کے ادارے کی ملازمت جائز نہیں ہے۔

ب۔ بینک کی ایسی ملازمت جس کا تعلق براہ راست سودی معاملات (سود کے لکھنے اور لینے ودینے وغیرہ) سے نہ ہو ایسی ملازمت کی گنجائش ہے، اور اس سے بھی بچنا بہتر ہے۔

ج۔ بینک کے لیے عمارت وغیرہ کا کرایہ پر دینا مکروہ ہے۔

د۔ انشورنس کمپنیاں عام طور سے سود وقمار کا کام کرتی ہیں لہٰذا ایسی کمپنیاں جن میں سود وقمار یا کسی ایک کا نظام ہو ان کی ملازمت جائز نہیں ہے۔

ھ۔ انشورنس کی وہ کمپنیاں جن کا نظام سود وقمار سے پاک ہو ان کی ملازمت درست ہے کہ جان ومال کی حفاظت اسلام کے مقاصد میں سے ہے۔

و۔ شراب سازی کے کام وکارخانہ میں کسی طرح کی بھی ملازمت ناجائز ہے۔

ز۔ ایسی اشیاء جن کا استعمال شراب سازی کے لیے کیا جاسکتا ہے ان کا شراب سازی کا کام کرنے والوں کے ہاتھوں فروخت کرنا اور ایسے کاموں کی ملازمت کی گنجائش ہے مگر اس سے بچنا بہتر ہے۔

[۳] ۔الف۔ ایسے سپر مارکیٹ کی ملازمت جس میں شراب کے علاوہ اکثر جائز اشیاء فروخت ہوتی ہوں اور ملازمت کا تعلق براہ راست شراب سے نہ ہو تو ایسی ملازمت جائز ہے۔

ب۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مخلوط تعلیمی نظام درست نہیں ہے؛ البتہ جہاں جداگانہ تعلیمی نظام کی سہولت نہ ہو وہاں ضرورۃً اس سے استفادہ کی گنجائش

ہے، اور مخلوط تعلیم گاہ نیز جہاں صنف مخالف کو تعلیم دینے کی نوبت آئے وہاں تدریسی ملازمت کی گنجائش ہے، البتہ شرعی حدود و ہدایات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

ج۔ یہ سمینار مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کریں جو جداگانہ نظام پر مبنی ہوں اور ان میں شرعی حدود و احکام کی پوری رعایت ہو، نیز تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ معیار کو پورا کرتے ہوں؛ تاکہ مسلمان طلبہ و طالبات ان مفاسد سے بچتے ہوئے تعلیم حاصل کر سکیں جو آہستہ آہستہ عصری تعلیمی اداروں کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

د۔ پیشہ وکالت فی نفسہ جائز ہے؛ البتہ غلط مقدمات کی پیروی اور صاحب حق کی حق تلفی کے لیے وکالت اور کذب بیانی وغیرہ جائز نہیں ہے۔

ھ۔ طبابت (ڈاکٹری) انسانی خدمات اور آمدنی کا بہترین ذریعہ ہے، طبیب کا بطور ملازمت کسی ہاسپٹل میں اجرت پر کام کرنا اور علاج کرنا جائز ہے۔

و۔ بلا ضرورت کسی مریض کا ٹیسٹ کرانا، آپریشن تجویز کرنا یا کسی دوا کا دینا محض اضافۂ آمدنی کے لیے جائز نہیں ہے، ایسا کرنا خیانت اور بددیانتی ہوگی اور اس طور پر حاصل کیا ہوا مال جائز نہیں ہوگا۔

۲۔ مرد مریض کے لیے مرد معالج اور خاتون مریض کے لیے خاتون معالج ہونا چاہئے؛ البتہ ضرورت کے موقع پر صنف مخالف کا علاج کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ بلا ضرورت کسی کے جسم کے ایسے حصے پر نظر کرنا یا مس کرنا جو ستر میں داخل ہے، جائز نہیں ہے؛ البتہ بوقت ضرورت معالج کے لیے مریض کے ایسے قابل ستر حصہ کو جس کا تعلق مرض سے ہے، بقدر ضرورت دیکھنا اور چھونا جائز ہے۔

۴۔ ہوٹل کی ملازمت فی نفسہ جائز ہے۔ ہوٹل میں قیام کرنے والے اشخاص کا اپنے طور پر اس میں محرمات کا استعمال ہوٹل مالک کے لیے حاصل ہونے والے کرایہ پر اثر انداز نہیں ہوگا، اس کی اجرت اور کرایہ جائز ہے۔

۵۔ ہوٹل مالک یا اس کے کسی ملازم کے ذریعہ محرمات کی فراہمی تعاون علی الاثم براہ راست شمار ہوگی اور اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہوگا۔

سوالنامہ

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

انسان کی صلاحیتیں منجانب اللہ محدود رکھی گئی ہیں، وہ اپنی تمام ضرورتیں خود پوری نہیں کرسکتا، اسے بہت سی دفعہ اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور وہ اس کی اجرت ادا کرتا ہے، اس طرح اس شخص کی ضرورت پوری ہوتی ہے، مثلاً اس کا مکان بنتا ہے اس کا کاروبار چلتا ہے، اس کے لئے سفر آسان ہوجاتا ہے وغیرہ، اور دوسرے شخص کے لیے یہی عمل رزق کا ذریعہ بن جاتا ہے، اسی لئے اجارہ کے جائز ہونے پر امت کا اجماع ہے، اور خود قرآن وحدیث سے اس کا واضح ثبوت موجود ہے، لیکن عمل کوئی بھی ہو، ضروری ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں ہو، اس سے اللہ اور اس کے رسول کا حکم ٹوٹتا نہ ہو اور منہیات شرعیہ کا ارتکاب لازم نہ آتا ہو، چنانچہ قرآن مجید نے جہاں اچھے کاموں کا حکم دیا ہے، وہیں گناہ اور ظلم سے منع فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے کاموں کو کرنا جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، گناہ میں تعاون کرنا ہے، پھر تعاون کا ایک قریبی درجہ ہے، جو براہ راست کسی عمل میں مدد ومعاون ہوتا ہے۔ دوسرا درجہ دور کے تعاون کا ہے کہ جس سے بچنا بعض دفعہ ممکن نہیں ہوتا، اسی لئے فقہاء نے سدّ ذریعہ کے اصول کے ذیل میں وہ عمل جو اکثر یا بکثرت کسی بات کا ذریعہ بنتا ہو اور وہ عمل جس کا ذریعہ بننا شاذ و نادر ہو، فرق کیا ہے۔

اس پس منظر میں درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں، امید کہ کتاب وسنت، شریعت کے مقاصد اور فقہاء کی تشریحات کی روشنی میں ان کے جوابات عنایات فرمائیں گے:

۱۔ بعض ملازمتوں کا تعلق حکومتوں سے ہوتا ہے؛ لیکن اندیشہ ہوتا ہے کہ اس میں بعض دفعہ خلاف شریعت عمل کا ارتکاب کرنا پڑے گا، اس سلسلہ میں ملازمتوں کی درج ذیل صورتیں قابل توجہ ہیں، اگر اس طرح کی کچھ اور صورتیں بھی آپ کے سامنے ہوں تو ان کو بھی واضح کردینا مناسب ہوگا:

الف۔ حکومت کا ایک اہم شعبہ فوج کا ہے، جس کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان کو قائل رکھنا ہے، ظاہر ہے کہ فی نفسہ یہ بہتر مقاصد ہیں، لیکن بعض دفعہ فوج کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کئے بغیر وار کرنا پڑتا ہے اور فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے، اسی طرح بعض دفعہ ایک مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہوتا ہے، اگر چہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے؛ البتہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ فوج میں مسلمانوں کا رہنا اجتماعی لحاظ سے مسلمانوں کے مفاد میں ہے، بہت سی دفعہ اس کی وجہ سے مسلمان، فوج کی زیادتی سے بچ سکتے ہیں، نیز یہ روزگار کا ایک وسیع ذریعہ بھی ہے، اس کو چھوڑ دینا مسلمانوں کے لیے معیشت کے وسائل کو محدود کردینے کے مترادف ہوگا؛ تو کیا مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا؟

ب۔ فوج ہی سے قریب دوسرا شعبہ پولیس کا ہے، جس کا بنیادی مقصد اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے، پولیس کو بھی بعض اوقات مظلوموں پر گولی چلانی پڑتی ہے، مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذا رسانی کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ اچھا انسان بھی اس شعبہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی صحبت کی وجہ سے بدزبان اور ظلم وجور کا خوگر بن جاتا ہے؛ البتہ اگر پولیس میں مسلمان نہ ہوں تو اس سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان اور انصاف سے محرومی کا اندیشہ ہے؛ تو کیا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا؟

ج۔ حکومت کا ایک اہم شعبہ مخبری اور انٹیلیجنس کا بھی ہوتا ہے، ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ اس شعبہ میں ملازمت کرتے ہیں، انہیں تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات محض شبہ کی وجہ سے شریف شہریوں کے خلاف بھی ایسی کارروائی کی ضرورت پڑ جاتی ہے، ان حالات میں کیا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ میں ملازمت کرنا درست ہوگا؟

د۔ انصاف کی فراہمی، ظلم وحق تلفی کی روک تھام اور نزاعات کو طے کرنے کے لیے عدلیہ کا نظام قائم ہے اور ہر مہذب معاشرہ کے لیے اس نظام کا وجود ناگزیر ہے، عدالتیں بنیادی طور پر دستور کی تشریح اور تصفیہ طلب واقعات میں ان کی تطبیق کا کام کرتی ہیں، اور یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہمارے ملک کا دستور یا قانون کتاب اللہ اور سنت رسول پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ بہت سے قوانین شریعت اسلامی سے متصادم بھی ہیں، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی نسبت سے عدالت کے رویہ کو بھی منصفانہ نہیں کہا جاسکتا، اگر عدالتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہوجائے تو اندیشہ ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بڑھ جائے گی، ان حالات میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے عدالتوں میں ملازمت کرنا درست ہے یا نہیں؟

ھ۔ کوئی حکومت عوامی ٹیکس کے بغیر اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتی، ٹیکس کی ایک صورت وہ ہے جسے انکم ٹکس کہا جاتا ہے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں انکم ٹیکس کی جو شرحیں رکھی گئی ہیں وہ ظالمانہ ہیں، دوسرے عموماً اس ٹیکس کو ٹھیک طور پر عوامی فلاح پر استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ آمدنی کا بڑا حصہ حکمرانوں کی عیش کوشی اور انہیں دی گئی غیر معمولی سہولتوں پر خرچ کردیا جاتا ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ انکم ٹیکس کے لیے بعض اوقات لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تجسس بھی کرنا پڑتا ہے، لہٰذا کیا انکم ٹیکس کے شعبوں میں مسلمان ملازمت کرسکتے ہیں؟

۲۔ بعض ملازمتیں ایسی ہیں جن کا سرکاری ہونا ضروری نہیں، لیکن وہ بنیادی طور پر محرمات پر مبنی ہیں، چنانچہ:

الف۔ بینک اصل میں سودی لین دین کا بنیادی طور پر کاروبار کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ بینک کی ملازمت کا کیا حکم ہے؟ اگر ایک شخص پیسہ کے لین دین اور سودی حسابات کو لکھتا نہ ہو، کوئی اور کام کرتا ہو، جیسے بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا، کیا یہ صورتیں بھی سودی معاملات کے تعاون میں شمار کی جائیں گی یا اس نوعیت کی ملازمت جائز ہوگی؟

ب۔ انشورنس کمپنی کا کاروبار ربا اور قمار پر مبنی ہے، البتہ انشورنس کی ایسی شکلیں جس میں واقعہ پیش نہ آنے کی صورت میں پالیسی ہولڈر کو کوئی رقم نہ ملتی ہو، جیسے میڈیکل انشورنس یا حادثہ انشورنس، یا جو انشورنس جبری نوعیت کا ہو، بعض اہل علم اس کو جائز قرار دیتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ انشورنس کمپنی کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ کیا انشورنس کی تمام صورتوں کے لیے ایک ہی حکم ہے یا ان میں کچھ فرق بھی ہے؟ نیز کسی شخص کا انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے یا نہیں؟

ج۔ شراب کی کمپنی میں کچھ لوگ شراب کی خرید وفروخت کرتے ہیں، کچھ لوگ کمپنی کے لیے بوتل بناتے ہیں، کچھ لوگ شراب کے لین دین میں نہیں رہتے؛ لیکن حساب کتاب لکھتے ہیں یا شراب کی کمپنی کو وہ اجزا پیش کرتے ہیں، جن سے شراب بھی بنائی جاتی ہے تو شراب کی کمپنی کے ان مختلف کاموں میں ملازمت کا حکم یکساں ہے یا ان میں حکم کے اعتبار سے کچھ فرق بھی ہوگا؟

۳۔ بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں کاروبار کا اصل مقصد حرام کام کرنا نہیں ہے؛ لیکن ضمنی طور پر وہاں حرام کام بھی کئے جاتے ہیں، جیسے:

الف۔ سپر مارکیٹ ہے، جس میں زندگی کی مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں، اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے، ایسے سپر مارکیٹ کی ملازمت

کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات ہوں تو ان کو واضح کیا جائے۔

ب۔ تدریس ایک معزز پیشہ ہے، جس کا انسانی شخصیت کی تعمیر سے گہرا تعلق ہے، لیکن موجودہ دور میں اولاً تو مخلوط تعلیم کے نظام کا غلبہ ہے، اور استاذ کو بعض اوقات اس طرح تدریس کا فریضہ انجام دینا ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب لڑکے بھی ہوتے ہیں اور لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، اسی طرح لڑکیوں کی مخصوص درسگاہوں میں مرد اساتذہ بھی کام کرتے ہیں، اور لڑکوں کی درسگاہوں میں خاتون اساتذہ بھی کام کرتی ہیں، ایسی ملازمت جائز ہوگی یا نہیں؟

ج۔ ایک اہم پیشہ وکالت کا ہے، وکیل کا مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوتا ہے، مسلمانوں کے اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل کے لیے وکیل کی ضرورت پڑتی ہے، اور بہت سے مواقع پر اچھے مسلمان وکلاء کی کمی محسوس کی جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے اکثر وکلاء کے یہاں ظالم اور مظلوم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا بلکہ بہت سی دفعہ وہ مظلوم کو انصاف سے محروم کردیتا ہے، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر اوقات وکلاء اپنے موکل کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے انہیں جھوٹ بولنے کی باضابطہ تربیت دیتے ہیں، اس پس منظر میں یہ بات قابل غور ہے کہ کیا مسلمان اس پیشہ کو اختیار کرسکتے ہیں؟

د۔ انسانی خدمت کا ایک اہم ذریعہ علاج اور پیشۂ طبابت ہے، لیکن بدقسمتی سے اس شعبہ میں بعض برائیاں در آئی ہیں، جیسے آپریشن مجبوری کی حالت میں کیا جانا چاہیے، لیکن ہاسپٹل کی انتظامیہ ڈاکٹروں کو تاکید کرتی ہے کہ وہ ہر ماہ کم سے کم اتنی مقدار میں آپریشن یا ٹیسٹ لکھے؛ تاکہ ہاسپٹل کی اور اس کی لیباریٹری کی آمدنی بڑھ سکے؛ اسی طرح سرکاری ہاسپٹلوں کے علاوہ پرائیویٹ ہاسپٹلوں میں بھی مرد ڈاکٹر کو خاتون مریض اور خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے ایسے علاج پر بعض اوقات مجبور کیا جاتا ہے جس کا تعلق قابل ستر حصے سے ہے تو ایسے ہاسپٹلوں میں ملازمت کرنے کا کیا حکم ہوگا؟ اور ملازمین کے لیے کیا شرعی حدود ہوں گی؟

ہ۔ ذرائع مواصلات کی ترقی، سیاحت کے رجحان میں اضافہ اور مسافر کی ضرورت کے لحاظ سے "ہوٹل" موجودہ سماج کی ضرورت بن گئے ہیں اور یہ اس وقت ایک نفع بخش تجارت بھی ہے، ہوٹلوں کا بنیادی مقصد تو معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے، لیکن بڑے ہوٹلوں میں بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں، جو شرعاً جائز نہیں ہیں، جیسے: شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ، ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کرنے کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ حرام چیزوں کی فراہمی سے اس کا براہ راست تعلق ہو، یا براہ راست اس سے تعلق نہ ہو۔

....

تلخیص مقالات

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

تلخیص: مفتی محمد ہارون رشید ندوی [1]

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بیسویں فقہی سمینار کا ایک موضوع "مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام" ہے، تادم تحریر تقریباً اکیڈمی کو ۱۸/ مقالات موصول ہو چکے ہیں، مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، ڈاکٹر بہاء الدین ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مولانا شمس الدین مظاہری، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا عبد التواب اناوی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد قمر عالم قاسمی۔

موضوع سے متعلق تین سوالات اکیڈمی نے جاری کئے تھے، ان کے جوابات کی تلخیص حسب ذیل ہے:

۱۔ بعض ملازمتوں کا تعلق حکومتوں سے ہوتا ہے؛ لیکن اندیشہ ہوتا ہے کہ اس میں بعض دفعہ خلاف شریعت عمل کا ارتکاب کرنا پڑے گا، اس سلسلہ میں ملازمتوں کی درج ذیل صورتیں قابل توجہ ہیں، اگر اس طرح کی کچھ اور صورتیں بھی آپ کے سامنے ہوں تو ان کو بھی واضح کر دینا مناسب ہوگا:

الف۔ حکومت کا ایک اہم شعبہ فوج ہے، جس کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے، ظاہر ہے کہ فی نفسہ یہ بہتر مقاصد ہیں، لیکن بعض دفعہ فوج کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر وار کرنا پڑتا ہے اور فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے، اسی طرح بعض دفعہ ایک مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہوتا ہے، اگرچہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے؛ البتہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ فوج میں مسلمانوں کا رہنا اجتماعی لحاظ سے مسلمانوں کے مفاد میں ہے، بہت سی دفعہ اس کی وجہ سے مسلمان، فوج کی زیادتی سے بچ سکتے ہیں، نیز یہ روزگار کا ایک وسیع ذریعہ بھی ہے، اس کو چھوڑ دینا مسلمانوں کے لیے معیشت کے وسائل کو محدود کر دینے کے مترادف ہوگا؛ تو کیا مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام ہی مقالہ نگار حضرات نے مجموعی مفاد اور اجتماعی لحاظ کے پیش نظر فوج کی ملازمت اختیار کرنے کی گنجائش رکھی ہے، کیوں کہ بعض اوقات اس شعبہ میں مسلمانوں کی نمائندگی سے خود مسلمان فوج کی بے جا زیادتیوں سے بھی بچ سکتے ہیں اور ایک حد تک اس سے مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی معاشی صورت حال کی بھرپائی بھی ہوتی ہے۔

مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب نے "شرح السیر" اور "سیرت ابن ہشام" کے حوالہ سے اس شعبہ میں ملازمت کو جائز ٹھہرایا ہے، نیز اس شعبہ میں جو خامیاں ہیں اور جو اسلام کی واضح تعلیمات سے متصادم ہوں تو ان کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ "اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے گی اور جمہوریت میں اس کی گنجائش موجود ہے۔"

---

[1] سابق رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا۔

جبکہ مولانا سلمان پالنپوری اور مفتی ثناء الہدی قاسمی نے "اذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفهما" کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ: فوج اور پولیس میں ملازمت اختیار نہ کرنے کی صورت میں ضرر شدید لاحق ہونے کا خطرہ ہے، تقلیل ضرر کی نیت سے ملازمت اختیار کی جائے، مفتی ثناء الہدی قاسمی صاحب نے لکھا ہے: چونکہ اس ملازمت میں بالقصد گولی چلانی پڑتی ہے اور حالات کے مدنظر مؤمن یا مسلم کے قتل کا عمدًا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، لہٰذا صرف یہ سوچ کر فوج کی ملازمت سے خود کو الگ کر لینے سے معیشت کے وسائل بھی محدود ہوں گے اور بہت سی دفعہ مسلمانوں کے فوج میں ہونے کی وجہ سے مسلمان فوج کی زیادتی سے جو بچ جاتے ہیں یہ بھی باقی نہیں رہے گا، بطور حوالہ انہوں نے فقہی عبارتیں پیش کی ہیں:

''ولا بأس برميهم بالنبال وإن علموا أن فيهم مسلمين من الأسارى والتجار لما فيه من الضرورة'' ۔(بدائع الصنائع، ۹/۳۰۶)

''وكذا اذا تترسوا بأطفال المسلمين فلا باس بالرمي إليهم لضرورة إقامة الفرض لكنهم يقصدون الكفار دون الأطفال فإن رموهم فأصاب مسلما فلادية ولاكفارة'' ۔(بدائع، ۹/۳۰۷)

نیز اگر مدمقابل یقینی طور پر مسلمان ہوں اور مسئلہ اپنے ملک کی سرحد کی حفاظت کا ہو تو بھی کمانڈر کے حکم سے سرتابی کی اجازت نہیں دی جاسکتی، حضرت عوف بن مالک کی مرفوع حدیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے: "ألا من ولی علیه وال فرأه یأتی شیئا من معصیة الله فلیکره ما یأتی من معصیة الله ولا ینزعن یدا من طاعته" ۔(مسلم، ۱۲۹/۳)(دیکھئے: مقالہ مولانا مفتی ثناء الہدی قاسمی)

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی صاحب نے کہا کہ: "فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی یا اس شعبہ میں مسلمانوں کی صحیح ترجمانی و تصویر کشی کا آئینہ دار ہوگی اور وہ وہاں بڑی حکومت کے ساتھ اپنے دین اور ملت کے مفاد کے لیے کام کر سکتے ہیں"، موصوف نے فوج میں ملازمت کرنے کے فوائد اور نہ کرنے کے نقصانات کو حوالوں سے مزین کر کے نمبروار ذکر کیا ہے: مثلاً اگر مسلمان فوج کو اپنے اور اپنے ملک کی دفاع کے لیے دوسرے ملک کے مسلمان فوج پر حملہ کرنا پڑے یا گولی چلانی پڑے تو جائز ہے:

''إذا تعرض شخص لإنسان يريد الاعتداء على نفسه أو أهله أو ماله فإن أمكنه رده بأسهل طريقة ممكنة فعل ذلك، وإن لم يكن رده إلا بالقتال قاتله فإن قتل المعتدى عليه فهو شهيد وإن قتل المعتدى فلا قصاص ولادية'' ۔(الموسوعة الفقهيه، ۲۲/۳۱۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون أهله فهو شهيد'' ۔ (بخاری:۲۴۸)

نیز موصوف نے اعداد و شمار کے لحاظ سے تخمینہ لگاتے ہوئے عرض کیا کہ اگر مسلمان اپنی فیصد کے اعتبار سے فوج میں شمولیت اختیار کرلیں تو تقریباً دو لاکھ ستر ہزار مسلمانوں کی ملازمت ملنے کی وجہ سے کم از کم چودہ لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کے قیام و طعام اور تعلیم کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔(دیکھئے: مقالہ مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی)

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے "قد تراعى المصلحة لغلبتها على المفسدة"، "المشقة تجلب التيسير" اور "الأمور بمقاصدها" جیسے اصول و قواعد کو بنیاد بناتے ہوئے کہا کہ "فوجی ملازمت کو ذریعہ معاش بنانے میں اعانت علی المعصیۃ ضرور ہے مگر یہ اسی وقت ممنوع ہوگی جبکہ حقیقتاً یا حکماً اس کا قصد ہو، لہٰذا ایسی فوج میں ملازمت کرنا جس کا مقصد مسلمانوں سے لڑنا خواہ لڑائی کی نوبت آئے یا نہ آئے جائز نہیں ہے، یا پھر تقرری کے وقت ہی ظلم و زیادتی کو مشروط کر دیا جائے تو بھی جائز نہیں، ورنہ اگر معصیت کی نیت نہیں ہے تو فوجی ملازمت میں کچھ حرج نہیں ہے، بلکہ اگر نیت ظلم و جور کو دفع کرنا ہو تو اس میں ثواب بھی ہے" شامی میں ہے: "قوله يؤجر من قام بتوزيعها بالعدل، أي بالمعادلة كما عبر في القنية، أي أن يحمل كل واحد بقدر طاقته، لأنه لو ترك توزيعها إلى الظالم ربما يحمل بعضهم لا يطيق فيصير ظلما ففي قيام العارف بتوزيعها بالعدل تقليل للظلم فلذا يؤجر" ۔(شامی، ۲/۲۳۶)(دیکھئے: مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)

مولانا فاروق دربھنگوی صاحب نے مسلمان فوج کا اپنے ہم مذہب شخص سے مقابل ہونے کو ایک وہمی امر قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ نہ غالبی ہے اور نہ

ضروری، اس لیے واقعی فائدہ کے ہوتے ہوئے صرف امر وہمی کی وجہ سے ملازمت کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا، تاہم اگر صرف ہم مذہب شخص کو گولی چلانے کا حکم ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔

''ومعلوم أن من أغار هولاء (الكفار) لايخلو من أن يصيب من ذراريهم ونساءهم المحظور قتلهم، فكذلك إذا كان فيهم المسلمون وجب أن لا يمنع ذلك من شن الغارة عليهم ورميهم بالنشاب وغيره وإن خيف عليه إصابة المسلم''۔ (احکام القرآن للرازی، ۳/۵۲۵)

"قال أبو حنيفة وأبو يوسف وزفر ومحمد والثوری: لا بأس برمی حصون المشركين وإن كان فيها أسارى وأطفال من المسلمين وكذلك أن تترس الكفار بأطفال المسلمين رمی المشركين وإن أصاب أحد المسلمين فی ذلك"۔(ایضاً)(دیکھئے: مقالہ مولانا محمد فاروق دربھنگوی)

جبکہ مولانا اشتیاق احمد اعظمی صاحب نے مسلمان فوج کا اپنے ہم مذہب شخص پر وار کرنے کو شریعت اسلامیہ کی نظر میں ناجائز قرار دیا ہے، اور کہا کہ اگر ایسی نوبت آجائے تو پھر اس کام میں شریک ہونا حرام ہوگا، حتی کہ اگر مکرہ ہو تو بھی اس کے لیے مسلمان پر حملہ کرنا حد جواز میں نہیں آسکتا، بطور دلیل انہوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے:

''لا يحل دم امرىء مسلم إلا بإحدى ثلاث: زنى بعد إحصان فإنه يرجم، ورجل خرج محاربا لله ولرسوله فإنه يقتل أو يصلب أو ينفى من الأرض، وتقتل نفسًا فيقتل بها''۔(ابوداؤد بحوالہ مشکوۃ، ۶۱/۴-۱۶۰)

نیز "تأملات فی سيرة العمل الإسلامی" کے حوالہ سے نقل کیا ہے: "حيث لم يجز أحد من أهل العلم قط لأحد من المسلمين أن يقاتل مسلما أو يقتله بغير حق ولو أكره على ذلك وأتى الإكراه على نفسه لأن نفس المكره ليست بأولى بالعصمة من نفس المسلم الذي يكرهونه على قتله" (ص ۷۷)(دیکھئے: مقالہ مولانا اشتیاق احمد اعظمی)

مولانا خورشید احمد اعظمی نے اس سلسلہ میں مزید تنقیح کرتے ہوئے کہا کہ: "اگر مدمقابل مسلمان فوجی ظلم وزیادتی پر آمادہ ہو اور اس کا مقصد دنیوی اغراض ومقاصد کا حصول ہو تو اپنے ملک اور عوام کی دفاع میں اس کو مارنا اور اس سے لڑنا دونوں جائز ہوگا"

"هذا الوعيد لمن قاتل على عداوة ودنيوية أو طلب ملك مثلا، فأما من قاتل أهل البغى أو دفع الصائل فقتل فلايدخل فی هذا الوعيد لأنه مأذون له فی القتال شرعا" (فتح الباری، ۱۲/ ۱۹۷)، البتہ اگر اعتداء وابتداء اس مسلمان فوجی کی حکومت کی طرف سے ہے تو اس کا اپنے مدمقابل ہم مذہب پر وار کرنا درست نہیں ہوگا، نیز اس معاملہ میں اپنے کمانڈر کا حکم ماننا بھی جائز نہیں ہوگا، "لأنهم أمروه بالمعصية ولا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق وهو بالإقدام على القتل"۔(شرح الکبیر، ۴/ ۵۰۳)

مقالہ نگاران حضرات کی ایک معتد بہ تعداد نے مسلمانوں کی فوجی ملازمت میں شرکت کو خود مسلمانوں کے حق میں نفع آور قرار دیا اور "أهون الشرين" کو متدل بناتے ہوئے اسے استحکام معیشت کا بھی ایک سنہرا ذریعہ بتایا، نیز اس سے کنارہ کشی ودستبرداری کو باعث نقصان ٹھہراتے ہوئے کہا کہ اس سے مزید مسلمانوں پر ظلم وزیادتی بڑھے گی اور بے گناہ مسلمان فوج اور پولیس کی بے جا زیادتیوں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبد الرشید قاسمی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا ظفر عالم ندوی وغیرہ)

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی کے الفاظ میں: ہندوستان میں مسلم اقلیت کو جہاں عزت وآبرو کا مسئلہ ہے وہیں معاشی مسائل بھی درکار ہیں، فوج اور پولیس جیسے شعبہ میں حلت وحرمت، منفعت ومضرت دونوں پہلو ہیں، لہٰذا اس طرح کی ملازمت بدرجہ مجبوری اختیار کی جائے، مسلمانوں کے نفع کو پیش نظر رکھا جائے، نیز خود کو بھی ظلم سے بچائے اور مظلوم کی حسب استطاعت مدد بھی کرے اور ان شعبوں میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ضرور ادا کرے۔ (دیکھئے: مقالہ مفتی محمد اقبال ٹنکاروی)

مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے "يجوز ارتكاب أخف الضررين لدفع أعظمهما" (الاشباہ والنظائر ص ۸۹) کی بنیاد پر کہا کہ چونکہ فوج میں اکثر بہتر مقاصد کا استعمال ہوتا ہے، لہٰذا شاذ ونادر کا اعتبار نہیں ہوگا، نیز اس کے ذریعہ جہاد کی تیاری میں بھی مدد ملتی ہے، "وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة

و من رباط الخیل"۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)

مولانا عبد التواب اناوی کے الفاظ میں: مسلمانوں کا فوج میں حصہ لینا یقینی طور پر مسلمانوں کے لیے باعث نقصان ہوگا، محض شک وشبہات کی بنیاد پر ناحق مسلمانوں کا خون ہوگا، لہٰذا اسے ترک نہیں کیا جاسکتا، "الأحکام لا تتغیر من الشبہات"۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا عبد التواب اناوی)

مقالہ نگاران حضرات نے مزید جن دلائل کو اپنے مقالات میں بطور دلیل پیش کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

☆ "یجوز لشخص دفع کل صائل مسلم و کافر مکلف وغیرہ علی معصوم من نفس أو طرف أو منفعة" (فتح المعین مع إعانة الطالبین، ۴/ ۲۶۲)، (ڈاکٹر بہاء الدین ندوی)

☆ "وما کان لمؤمن أن یقتل مؤمنًا إلا خطأ ومن یقتل مؤمنًا متعمدًا فجزاءہ جہنم خالدًا فیہا"۔ (نساء: ۹۳-۹۲)

☆ حدیث میں ہے: قیامت کے دن لوگوں میں سب سے پہلے خون کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ (مسلم: کتاب القسامة)، (مولانا اقبال احمد نکاروی)

☆ "قولہ علیہ السلام: انصر أخاك ظالما أو مظلوما قالوا: یا رسول اللہ! ہذا ننصرہ مظلوما فکیف ننصرہ ظالمًا، قال: تأخذ فوق یدیہ" (بخاری مع الفتح، ۵/ ۹۸)

☆ "لا بأس بأن یتوظف الرجل عملًا فی دوائر وزارات الحکومة الأمریکیة أو غیرہا من حکومات البلاد والکافرة وکذلك لا بأس بقبول مثل ہذہ الأعمال فی مجالات الصناعة الذریة أو الدراسات الاستراتیجیہ" (بحوث قضایا فقہیہ معاصرہ، ص ۳۴۵-۳۴۴)(مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)

☆ قالوا: "وما لنا أن لا نقاتل فی سبیل اللہ وقد أخرجنا من دیارنا"۔ (سورۂ بقرہ: ۲۴۶)

☆ ایک حدیث میں ہے کہ: اطاعت امیر کے حوالہ سے لوگوں کو آگ میں کود جانے کا حکم ملا، بعض لوگوں نے اطاعت کا ارادہ کرلیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لو دخلتموہا لم تزالوا فیہا إلی یوم القیامة، وقال للآخرین قولا حسنا وقال: لا طاعة فی معصیة اللہ إنما الطاعة فی المعروف" (مسلم: ۱۸۴۰)(مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)

☆ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لزوال الدنیا أہون علی اللہ من قتل رجل مسلم" (نسائی: ۳۹۸۶)(مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی)

ب۔ فوج ہی سے قریب دوسرا شعبہ پولیس کا ہے، جس کا بنیادی مقصد اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے، پولیس کو بھی بعض اوقات مظلوموں پر گولی چلانی پڑتی ہے، مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذا رسانی کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ اچھا انسان بھی اس شعبہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی صحبت کی وجہ سے بدزبان اور ظلم وجور کا خوگر بن جاتا ہے؛ البتہ اگر پولیس میں مسلمان نہ ہوں تو اس سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان اور انصاف سے محرومی کا اندیشہ ہے؛ تو کیا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا؟

تقریباً تمام ہی مقالہ نگاران حضرات نے شعبہ پولیس کی ملازمت کے سلسلہ میں وہی احکام بیان کئے ہیں جو شعبہ فوج کی ملازمت کے ضمن میں انہوں نے ذکر کیا ہے، مزید ان حضرات نے لکھا ہے کہ اجتماعی، قومی، ملی اور وسیع تر مفاد کے پیش نظر اس شعبہ میں بھی ملازمت جائز ہے، کیونکہ اس میں بجائے خود مسلمانوں کی اپنی ذاتی حفاظت وصیانت کا سامان موجود ہے نیز اس شعبہ میں مسلمانوں کی عدم شرکت خود ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے (دیکھئے: مقالہ مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، ڈاکٹر بہاء الدین ندوی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا قمر عالم قاسمی وغیرہ)۔

مولانا محمد شاہجہاں ندوی صاحب کے الفاظ میں: پولیس کی ملازمت میں کچھ ضرر کا اندیشہ ضرور ہے، جیسے صحبت کی تاثیر سے بدزبان اور ظلم وجور کا خوگر بننے وغیرہ، مگر بصورت ترک زیادہ نقصان اور انصاف سے محرومی کا قوی امکان بھی ہے، لہٰذا "إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمہما ضررا بارتکاب أخفہما" کے پیش نظر اسے اختیار کرنا جائز ہے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب نے ناحق کسی معصوم پر ظلم وزیادتی کو غلط اور ناجائز ٹھہراتے ہوئے یہ حدیث قدسی پیش کی ہے: "یا عبادی إنی حرمت الظلم علی نفسی وجعلتہ بینکم محرمًا فلا تظالموا" (مسلم: ۲۵۷۷)، نیز بطور حوالہ حدیث کا یہ ٹکڑا بھی نقل کیا ہے: "اتقوا

الظلم فإن الظلم ظلمات یوم القیامة"، البتہ اگر بڑے فتنہ کی توقع ہو تو مناسب طریقہ قوت کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے،" یتحمل الضرر الخاص لأجل دفع الضرر العام"۔ (اشباہ: ۱۲۱)

جبکہ مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی اور مفتی ثناء الہدی قاسمی صاحبان نے اس شعبہ کے اندر ہونے والی خرابیوں اور برائیوں کو اختیاری اور اپنا ذاتی فعل قرار دیا ہے اور کہا کہ اس کا تعلق اس کی فطری صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ اپنے نفس پر کس قدر قابو رکھتا ہے اور خود کو اسلامی اخلاق وکردار کا خوگر بناتا ہے (دیکھئے: مقالہ مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مفتی ثناء الہدی قاسمی)۔

مولانا مفتی ظفر عالم ندوی صاحب نے اس طرف بطور خاص توجہ دلائی کہ اس ملک میں مسلمان عموماً پولیس کی زیادتیوں کے شکار ہیں، اگر اس شعبہ میں فرض شناس مسلمانوں کی معتد بہ تعداد شامل ہو جاتی ہے تو صرف یہ ملازمت ہی کے لیے نہیں بلکہ ملک اور انسانیت دونوں کی خدمت کا بہترین میدان ہوگا۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا ظفر عالم ندوی)

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب نے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس شعبہ میں داخل ہونے کی تحریض کی ہے، کہ وہ اپنے کردار وعمل سے لوگوں کے دل جیت سکتے ہیں اور دیگر لوگوں کے مقابلہ میں اپنے قول وعمل کے اعتبار سے بہتر مظاہرہ کر سکتے ہیں اور انشاء اللہ اس کے اچھے اور دوررس نتائج بھی برآمد ہوں گے۔ (دیکھئے: مقالہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی)

ج۔ حکومت کا ایک اہم شعبہ مخبری اور انٹیلیجنس بھی ہوتا ہے، ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ اس شعبہ میں ملازمت کرتے ہیں، انہیں تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات محض شبہ کی وجہ سے شریف شہریوں کے خلاف بھی ایسی کارروائی کی ضرورت پڑ جاتی ہے، ان حالات میں کیا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ میں ملازمت کرنا درست ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران حضرات کی کثیر تعداد نے عام حالات میں اس کی اجازت کو موقوف کر کے ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور روز افزوں جرائم کی بیخ کنی جیسے مخصوص حالات میں جواز ٹھہرایا ہے اور اس نیت سے غیبت وتجسس کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی صاحب نے چور ڈاکوؤں وغیرہ کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے تجسس اور غیبت کو واجب قرار دیا اور بطور حوالہ تبصرۃ الحکام کی یہ عبارت پیش کی:

"وقد یکون التجسس واجبًا فقد نقل عن الماجشون أنه قال: اللصوص وقطاع الطریق أری أن یطلبوا فی مظانهم ویعان علیهم حتی یقتلوا أو ینفوا من الأرض بالهرب وطلبهم لا یکون إلا بالتجسس علیهم وتتبع أخبارهم۔" (موسوعہ، ۱۰/ ۱۶۲)

نیز دوران جنگ بھی ایسا کرنا مباح قرار دیا:" ویباح فی الحرب بین المسلمین وغیرهم بعث الجواسیس لتعرف أخبار جیش الکفار من عدد وعتاد" (موسوعہ، ۱۰/ ۱۶۲)، لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ محض شبہ کی بنیاد پر ان چیزوں کا ارتکاب جائز نہیں معلوم ہوتا۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا اشتیاق احمد اعظمی)

جبکہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے "فتح الباری" کی اس عبارت کو مستدل بناتے ہوئے بعض غیبت وتجسس کو مستحسن بلکہ واجب قرار دیا، جس کا مقصد صحیح اغراض ومقاصد کا حصول ہو،" قال العلماء: تباح الغیبة فی کل غرض صحیح شرعا حیث یتعین طریقا إلی الوصول إلیه بها کالتظلم والاستعانة علی تغییر المنکر والاستفتاء والمحاکمة والتحذیر من الشر الخ" (۱۰/ ۵۲۷)، (دیکھئے: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)

اس شعبہ کا تعلق چونکہ ملک کی سلامتی اور امن وامان کے قیام سے ہے، لہٰذا اس کام میں جستجو کرنے والے تجسس اور غیبت کے گنہگار نہیں ہوں گے، اگر کوئی مسلمان تعاون علی البر والتقوی کے جذبہ سے مخبری وانٹیلیجنس کی ملازمت کرے تو درست بھی ہے اور اس کی نظیر یہ ہے کہ بعض غزوات کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے یہ کام بھی لیا ہے، نیز" المشقة تجلب التیسیر"،" الضرورات تبیح المحظورات"،" یختار أهون

الشرین"، "إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفهما" اور "الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف" جیسے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، مزید یہ کہ اس شعبہ میں مسلمانوں کی خاطر خواہ نمائندگی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی مسلمان ناحق پھنس گیا ہو تو تفتیشی حالات میں رعایت ملنے کی توقع کی جاسکتی ہے (دیکھئے: مقالہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا شمس الدین مظاہری، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی وغیرہ)۔

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی نے تجسس کو اصلاً حرام قرار دیتے ہوئے یہ کہا کہ اگر کوئی کافر کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی کرے تو اس کی قباحت اور بڑھے گی، بطور حوالہ انہوں نے "موسوعہ" کی یہ عبارت پیش کی ہے:

"الجاسوس على المسلمين إما أن يكون مسلمًا أو ذميا أو من أهل الحرب، فإن كانوا من أهل الحرب أو من أهل الذمة ممن يؤدى الجزية من اليهود والنصارى والمجوس فاضرب أعناقهم وإن كانوا من أهل الإسلام معروفين فأوجعهم عقوبة وأطل جسمهم حتى يحدثوا توبة"۔ (۱۶۵/۱۰)

لہٰذا انہوں نے محض مجبوری کی بنا پر اس ملازمت کو جائز قرار دیا ہے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی کے الفاظ میں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق کے موقع پر کفار کے لشکر کے حالات معلوم کرائے تھے، "یا حذیفة! اذهب فادخل فی القوم فانظر ماذا یصنعون"۔ (سیرت ابن ہشام، ۱۳۲/۲)

موصوف نے مزید کہا: البتہ عمل مخبری تجسس اور غیبت کو مستلزم ہے اور قرآن وحدیث میں اس کی مذمت وارد ہے، لیکن بعض ملکی اور معاشرتی مفاد کی خاطر احادیث کی شرحوں اور فقہاء کے اقوال میں اس کی اجازت دی گئی ہے، "اعلم أن الغيبة تباح لغرض صحيح شرعي لا يمكن الوصول إليه إلا بها وهو ستة أسباب" (ریاض الصالحین، ص ۳۷۴)، (دیکھئے: مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)

لیکن مولانا محمد شاہجہاں ندوی صاحب نے جہاں یہ کہا کہ ڈاکوؤں کو ان کی ممکنہ جگہوں میں تلاش کرنا مخبری کے بغیر ممکن نہیں، وہیں اس پر بھی زور دیا کہ محض شبہ کی بنیاد پر شریف شہریوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف تجسس کی کارروائی نہ کی جائے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر معاویہؓ سے فرمایا: "إنك إذا اتبعت عورات الناس أفسدتهم أو كدت أن تفسدهم" (ابوداؤد: ۴۸۸۸)، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إلا ان تتقوا منهم تقاة"۔

مفتی رضوان الحسن مظاہری صاحب نے کہا کہ چونکہ اس ملازمت میں اکثر غیر شرعی عمل اور ظلم کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور بیشتر اوقات جھوٹ اور غیبت کا سہارا لینا پڑتا ہے لہٰذا مسلمانوں کو ایسی ملازمت سے دور رہنا چاہئے اور اسے اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہئے، "ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الظالمون"۔

د۔ انصاف کی فراہمی، ظلم وحق تلفی کی روک تھام اور نزاعات کو طے کرنے کے لیے عدلیہ کا نظام قائم ہے اور ہر مہذب معاشرہ کے لیے، اس نظام کا وجود ناگزیر ہے، عدالتیں بنیادی طور پر دستور کی تشریح اور تصفیہ طلب واقعات میں ان کی تطبیق کا کام کرتی ہیں اور یہ کہ محتاج بیان نہیں کہ ہمارے ملک کا دستور یا قانون کتاب اللہ اور سنت رسول پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ بہت سے قوانین شریعت اسلامی سے متصادم بھی ہیں، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی نسبت سے عدالت کے رویہ کو بھی منصفانہ نہیں کہا جاسکتا، اگر عدالتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہوجائے تو اندیشہ ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بڑھ جائے گی، ان حالات میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے عدالتوں میں ملازمت کرنا درست ہے یا نہیں؟

مولانا شاہجہاں ندوی صاحب نے قرآنی آیت "إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان" اور مشہور فقہی قاعدہ "الضرورات تبيح المحظورات" کو سامنے رکھتے ہوئے محض اضطراری صورت میں اس شعبہ کی ملازمت کو درست کہا ہے کیونکہ نہ اختیار کرنے کی صورت میں مظلومیت کے اور بڑھ جانے کا اندیشہ ہے لیکن دل میں عقیدہ ہو کہ الٰہی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا فرض ہے۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا شاہجہاں ندوی)

مولانا خورشید احمد اعظمی نے "والأصل أن القضاء فريضة محكمة وسنة متبعة قد باشره الصحابة والتابعون ومضى عليه الصالحون ولكنه فرض كفاية" (عالمگیری، ۳۰۶/۳) کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ عہدہ قضا قبول کرنا فرض کفایہ ہے اور کہا کہ غیر مسلم ممالک

میں مسلمانوں کا اس عہدہ پر ہونا پوری مسلم کمیونٹی کے لیے مفید ثابت ہوگا" ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کافرًا، فی التاتارخانیة: الاسلام لیس بشرط فیه أی فی السلطان الذی یقلد "(شامی، ۸/ ۴۳)، (دیکھئے: مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)

جبکہ مولانا محمد فاروق صاحب نے ملازمت کو درست قرار دیتے ہوئے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر ظن غالب ہو کہ ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں اس سے ظلم وجور کا ہی صدور ہوگا یا حکومت کی جانب سے اس پر اظہار حق کی پابندی ہوگی تو پھر اجازت نہیں دی جاسکتی ہے اور اس عہدہ کو قبول کرنا حرام ہوگا، "ویجوز تقلد القضاء من السلطان إلا إذا کان یمنعه عن القضاء بالحق فیحرم "۔(شامی، ۸/ ۴۱)

مولانا اشتیاق احمد اعظمی نے فقہاء کرام کے حوالوں سے دوطرح کی رائیں نقل کی ہیں: ایک عدم جواز، دوسرا جواز۔ اول الذکر میں تین صورتوں کو عدم جواز کی بنیاد بنایا ہے: (۱)"ما انزل الله" کے علاوہ کے ذریعہ فیصلہ عمل میں آئے گا"ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئك هم الکافرون"۔ (۲) قضاءِ حکم کے معاملہ میں کفار کی اعانت لازم آئے گی"ما یتضمنه علی إعانتهم علی باطلهم فی الحکم والقضاء "(نوازل فقہیہ: ۶۵)۔ (۳) عملی طور پر طاغوتی اوامر واحکام کا نفوذ لازم آئے گا۔ جبکہ چار صورتیں بیان کی ہیں: (۱) ایسے مناصب میں عدم شرکت سے فجار وفساق کے تسلط وغلبہ کا امکان بڑھ جائے گا"لأن ترك هذه المواقع یعنی خلوها من الصالحین وتمکین الفجار والأشرار من رقاب المسلمین "۔(نوازل فقہیہ: ۶۵)

۲۔ بایں طور مسلمان اپنی مشق وممارست جاری رکھ سکتے ہیں اور آئندہ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔

۳۔ مسلمانوں سے مظالم کے دفاع میں مدد ملے گی" مایتضمنه من دفع الظلم عن المسلمین وتقلیل مفاسد القضاء ما أمکن "۔

۴۔ خصومت کے موقع پر جج کو اسلامی شریعت کی طرف دعوت دینے کا موقع فراہم ہوگا" مایتضمنه من دعم الدعوة إلی تطبیق الشریعة فی مواجهة الخصومة "۔(نوازل: ۶۶)

مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ جہاں معصیت کا لزوم واضح ہو وہاں حرام اور جہاں قاضی وجج کو اجتہاد کی گنجائش ہو وہاں عمل کی اجازت ہوگی، لیکن ایسا کرنا بھی احتیاط کے خلاف ہے کیونکہ بہتر یہ ہے کہ وضعی قوانین کی اسلامی شریعت کے مقابلہ میں بالادستی قبول نہ کی جائے۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا اشتیاق احمد اعظمی)

اس بات کا قوی امکان ہے کہ غیر اسلامی محکمہ عدلیہ میں شرعی احکام کی خلاف ورزی ہو، لیکن مسلمانوں کی عظیم تر مفادات، مزید حق وانصاف کو ضرر نہ پہنچے، اس خاطر پورا محکمہ کہیں غیر مسلم قانون پر عمل کرنے والا نہ بن جائے اور" درء المفاسد مقدم من جلب المنافع "،" ظنوا بالمؤمنین خیرا" کے تحت مسلمانوں کو اس شعبہ سے وابستہ ہونا چاہئے اور مسلمانوں کے وقار وقدر ومنزلت کو برقرار رکھنے کے لیے بھی یہ از حد ضروری ہے، اس میں شرکت سے بڑے دوررس نتائج ثابت ہوسکتے ہیں (دیکھئے مقالہ: مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی)۔

۵۔ کوئی حکومت عوامی ٹیکس کے بغیر اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتی، ٹیکس کی ایک صورت وہ ہے جسے انکم ٹیکس کہا جاتا ہے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں انکم ٹیکس کی جو شرحیں رکھی گئی ہیں وہ ظالمانہ ہیں، دوسرے عموماً اس ٹیکس کو ٹھیک طور پر عوامی فلاح پر استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ آمدنی کا بڑا حصہ حکمرانوں کی عیش کوشی اور انہیں دی گئی غیر معمولی سہولتوں پر خرچ کردیا جاتا ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ انکم ٹیکس کے لیے بعض اوقات لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تجسس بھی کرنا پڑتا ہے، لہٰذا کیا انکم ٹیکس کے شعبوں میں مسلمان ملازمت کرسکتے ہیں؟

بیشتر مقالہ نگاران حضرات نے ملکی مفاد بلکہ مسلمانوں کے عظیم تر مفادات کو نظر میں رکھ کر اس شعبہ میں ملازمت کو جائز قرار دیا ہے، لیکن عام حالات سے مستثنیٰ ہوکر محض مجبوری اور خاص حالات جن میں مسلمانوں کا فائدہ ہو صرف انہی حالات میں اجازت دی ہے، تفصیل درج ذیل ہے:

یہ حقیقت ہے کہ ٹیکس کی وصولیابی کے لیے حدیث میں سخت وعید وارد ہوئی ہے، اس میں شرح ٹیکس کی زیادتی، عوامی فلاح وبہبودگی پر خرچ میں بے انصافی، ذاتی ونجی دولت پر بے جا تجسس اور ان جیسے بے شمار حق تلفیوں کے باوجود اگر مسلمان اس شعبہ سے بالکلیہ کنارہ کش ہوجائیں، تو بعید نہیں کہ ظلم وزیادتی میں مزید

اضافہ ہوجائے، لہٰذا مستامنوں کے مصالح کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے اس شعبہ میں ملازمت کی اجازت ہونی چاہئے (دیکھئے مقالہ: مولانا سلمان پالنپوری، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا قمر عالم قاسمی وغیرہ)۔

اس شعبہ میں ملازمت اختیار کرنے کے جواز وعدم جواز کے سلسلہ میں حکم لگانے سے پہلے اس کے اغراض ومقاصد پر غور کرنا ضروری ہوگا، فقہی قاعدہ ہے "العبرة في العقود للمقاصد والمعاني دون الألفاظ والمباني" (قواعد الفقہ)۔ اور یہ حقیقت ہے کہ شعبۂ ٹیکس کا مقصد اصلی حکومتی ضرورتوں کی تکمیل اور عوامی فلاح وبہبودگی ہے جو فی نفسہ بہتر ہے، لہٰذا "تعاون علی البر" اور "کلوا من طیبات ما رزقناکم" نیز "طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة" کے تناظر میں ملازمت جائز ہے۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا شمس الدین مظاہری)

مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب نے اس طرح کے معاملات کو اصول وقوانین کے اعتبار سے حرام قرار دیا، لیکن ساتھ ہی حضرت تھانویؒ کی اصولی بحث کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی اضافہ کیا کہ: شریعت نے ہی ضرورت واضطرار کے وقت ان ضوابط کے برعکس عمل کی اجازت دی ہے، جیسے اکل میتہ، تناول خمر اور جبر واکراہ کی صورت میں غصب سے حاصل شدہ مال کا کھانا جائز ہے (امداد الفتاوی، ۳/۴۰۸)۔ نیز موصوف نے "ردالمحتار" کے حوالہ سے یہ بھی ثابت کیا کہ اگر مقصد دفع مضرت ہو اور اس نیت خالص کی بنا پر ملازمت اختیار کرے تو نہ صرف جائز ہوگا بلکہ عند اللہ ماجور بھی ہوگا "ويوجر من قام بتوزيعها بالعدل ... بأن يحمل كل واحد بقدر طاقته لأنه لو ترك توضيعها إلى الظالم ربما يحمل بعضهم مالا يطيق فيصير ظلمًا على ظلم. ففي قيام العارف بتوزيعها بالعدل تقليل للظلم فلذا يوجر" (۲/۶۲)۔ (مقالہ: مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی)

مولانا اشتیاق احمد اعظمی نے ٹیکس کی دو قسمیں بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ اگر ٹیکس معقول ہو اور عوام الناس کی فلاح وبہبودگی پر خرچ ہو تو ٹیکس لینا بھی جائز اور ایسے شعبہ میں ملازمت بھی جائز ہوگی "أخذ الضرائب من الرعية لتلبية الحاجات السحة جائزة. إذا كانت موارد الدولة لاتفي بحاجات البلاد من الحراسة والأدوية والتعليم وإصلاح الطرق والموانی ... والمرافق وإعانة المسؤلين عن الأمن" (حکم الضرائب: ۲۷)، نیز "وأما الحسن فی هذه الضرائب فلا بأس به" (ص ۲۷)۔ برخلاف اس کے اگر ٹیکس ظالمانہ ہو اور عوام کی فلاح پر خرچ بھی نہ کیا جاتا ہو تو اس قسم کا ٹیکس لینا بھی حرام اور ایسے محکمہ میں ملازمت بھی درست نہیں ہوگی: لقوله عليه السلام: لايدخل الجنة صاحب مكس (ابوداؤد)۔ اس قسم کے ٹیکس کی وصولیابی "اخذ أموال الناس بدون حق" اور "أكل أموال الناس بالباطل" کے تحت داخل ہے، جو کہ منہی عنہ ہے اور ایک قسم کا ظلم ہے اور ظلم حرام ہے، لہٰذا موصوف نے اس محکمہ کی ملازمت کو درست نہیں قرار دیا ہے۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)

جبکہ مفتی رضوان الحسن مظاہری نے مذکورہ صورتوں کے باوجود بدرجۂ مجبوری ملازمت کو جائز قرار دیا اور قانع ہونے کے بجائے دوسری ملازمت تلاش کرنے پر زور دیا۔ (دیکھئے مقالہ: مفتی رضوان الحسن مظاہری)

مولانا ظفر عالم ندوی نے کہا کہ چونکہ اس شعبہ میں جواز کے بھی پہلو ہیں، لہٰذا اس محکمہ میں ملازمت جائز ہے۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی)

مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا محمد فاروق صاحب نے ظلم محض کو بنیاد بناتے ہوئے اس شعبہ کی ملازمت کو نادرست قرار دیا، بطور استدلال موصوف حضرات نے "فتح القدیر" اور "ردالمحتار" کی عبارتیں پیش کی ہیں: "إن أريد بها ما ليس بحق كالواجبات المؤظفة على الناس في زماننا ببلاد فارس على الخياط والصباغ وغيرهم للسلطان في يوم أو شهر أو ثلاثة أشهر فإنما ظلم" (فتح القدیر، ۶/۳۳۲)، "دفع النائبة أى ماينوبه من جهة السلطان من حق أو باطل أو غيره والظلم عن نفسه أولى" (درمختار، ۳/۲۵۳)۔

۲۔ بعض ملازمتیں ایسی ہیں جن کا سرکاری ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن وہ بنیادی طور پر محرمات پر مبنی ہیں، چنانچہ:

الف۔ بینک اصل میں سودی لین کا بنیادی طور پر کاروبار کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ بینک کی ملازمت کا کیا حکم ہے، اگر ایک شخص پیسہ کے لین دین اور سودی حسابات کو لکھتا ہو، کوئی اور کام کرتا ہو، جیسے بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئرکنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا، کیا یہ صورتیں بھی سودی معاملات کے تعاون میں شمار کی جائیں گی، یا اس نوعیت کی ملازمت جائز ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگاران حضرات نے بینک کے تعلق سے ہونے والے تمام امور کو ناجائز قرار دیا، خواہ وہ کسی بھی طرح کی مرمت سے تعلق ہو، یا کرایہ پر لین دین کی بات ہو، اور بطور دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو پیش کیا ہے: "لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله

وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء" (مسلم:۱۵۹۸)۔ نیز اسے تعاون علی الاثم والعدوان کے ضمن میں رکھتے ہوئے حرام قرار دیا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عالم ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی وغیرہ)۔

لیکن مولانا شاہجہاں ندوی اور شمس الدین مظاہری صاحبان نے مسئلہ کی تفریع کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر حالات اضطراری ہو جائیں اور کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہ ہو تو بدرجۂ مجبوری "إذا سبب الله لأحدكم رزقًا من وجه فلا يدعه" (مشکوۃ، ۱/۲۴۳) کے مطابق ملازمت کرسکتا ہے، لیکن دوسرا حلال ذریعہ معاش کی تلاش جاری رکھے اور اس کے ملتے ہی اسے ترک کردے۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا شاہجہاں ندوی)

مولانا خورشید احمد اعظمی نے "بحر الرائق" کے ایک جزئیہ "وفي المحيط: ذمي استاجر من مسلم أو ذمي بيعة يصلي فيها لم يجز لأن صلاة الذمي معصية وإن كانت طاعتة في زعمه" (۸/۳۵) کا حوالہ دیتے ہوئے رقم کیا ہے کہ: بینک کو اپنا مکان یا عمارت کرایہ پر دینا درست نہ ہوگا، لیکن ساتھ ساتھ موصوف نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ: بینک کے کمپیوٹر، ایئر کنڈیشن وغیرہ کی مرمت یا بینک کی عمارت کی تعمیر کی اجرت جائز ہوگی" ولو استأجر الذمي مسلما ليبني له بيعة أو كنيسة جاز ويطيب له الأجر كذا في المحيط" (عالمگیری، ۴/۴۵۰)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)

بعض دیگر حضرات نے بینک سے متعلق ایسے کام کو جو براہ راست سودی لین دین سے متعلق نہ ہوں جواز کے زمرہ میں رکھا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کو اختیار کیا ہے، جبکہ صاحبین کا اس سے اختلاف بھی نقل کیا ہے، مثلاً مولانا عبدالتواب اناوی صاحب نے لکھا ہے کہ بینک کے جو کام غیر بنیادی ہوں جیسے: بینک کی صفائی، برقی نظام کی مرمت، اس کی رنگائی، اس کے لیے مکان کی تعمیر، یا اس کے لیے دیئے گئے مکان کی اجرت وغیرہ، ان کے بارے میں جواز وعدم جواز کے متعلق فقہاء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے: "إذا استأجر الذمي من المسلم بيتًا ليبيع فيه الخمر جاز عند أبي حنيفة خلافًا لهما" (ہندیہ، ۴/۴۹۴)۔ نیز موصوف نے "ردالمحتار" کی عبارت" ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به لأنه لا معصية في عين العمل" نقل کرنے کے بعد کہا کہ اس کے غیر بنیادی کاموں میں ملازمت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا عبدالتواب اناوی)

اسی طرح مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی صاحب نے چپراسی، کیشیر، کمپیوٹر اور ایئر کنڈیشن ٹھیک کرنے والوں کی ملازمت کو تعاون علی المعصیت سے باہر رکھا ہے، نیز مکان کرایہ پر دینا، معماری کا کام اس کے لیے کرنا بھی تعاون کی اس فہرست میں نہیں ہے جو کہ حرام ہے، اس کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے موصوف نے "بحر الرائق" کی عبارت نقل کی ہے: "جاز إجارة البيت لكافر ليتخذ معبدًا أو بيت نار للمجوس أو يباع فيه خمر في السواد وهذا قول الإمام، وقالا: يكره كل ذلك لقوله تعالى: ''وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' وله: أن الإجارة على منفعة البيت ولهذا تجب الأجرة بمجرد التسليم ولا معصية فيه" (۸/۲۰۳)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی)

جبکہ مولانا اقبال ٹنکاروی صاحب نے مرمت کرنے والے، دربان اور ڈرائیوروں کی ملازمت کو جائز قرار دیتے ہوئے اس کا بھی اضافہ کیا کہ اگر مکان کی تعمیر کے وقت اس کو معلوم تھا کہ یہ تعمیر بینک کے لیے تھی تو معصیت میں داخل ہوگا اور اگر معلوم نہ تھا اور بینک یا سودی کاروبار کے لیے استعمال ہونے لگا تو اس وقت اجارہ جائز ہوگا اور وہ تعاون علی المعصیت کا مرتکب نہ ہوگا۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا اقبال احمد ٹنکاروی)

مولانا اشتیاق احمد اعظمی صاحب نے بینکوں میں ملازمت کے جواز وعدم جواز کے بارے میں فقہاء کرام کے حوالوں سے دو طرح کی آراء کا ذکر کیا ہے: ایک علی الاطلاق ناجائز اس وجہ سے کہ اثم وعدوان پر تعاون ہے، نیز اس کی کمائی کسب خبیث ہے اور اس کا نظام طاغوتی مصالح کی ہمت افزائی پر مشتمل ہے "كون الأجر الذي يحصل عليه العامل في هذه البنوك من الكسب الخبيث لخبث مصدره وهو الربا الذي يمثل النسبة الغالبية على أرباح البنوك" (نوازل فقہیہ، ص ۷۰)۔ جبکہ بعض فقہاء کرام نے بھی کہا کہ اگر سودی لین دین یعنی کتابت و گواہی جیسے اعمال سے خود کو الگ رکھا جائے تو باقی کاموں میں چونکہ اصل حلت ہے اس لیے ایسے اعمال میں ملازمت کی جاسکتی ہے، جیسے حفاظت ونگہبانی، کمپیوٹر یا ایئر کنڈیشن کی مرمت وغیرہ۔ موصوف نے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینے کے بارے میں عرض کیا کہ اگر دانستہ طور پر ہو تو مکروہ تحریمی اور ناجائز ہوں گے۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)

مولانا سلمان پالنپوری رقم طراز ہیں: ایسی ذمہ داریاں جن کا تعلق براہ راست سودی کاروبار سے نہ ہو بلکہ وہ بینک کے دوسرے کام یا اس کی حفاظت پر ملازم ہو تو یہ ملازمت جائز ہوگی، البتہ ایسی ملازمت سے بھی احتراز بہتر ہے۔ نیز مکان بینک کو کرایہ پر دینا، مکان کی تعمیر کرنا اور کمپیوٹر وغیرہ کی مرمت کرنا بھی صاحبین کے قول کے مطابق کراہت سے خالی نہیں اس میں بھی یک گونہ تعاون علی المعصیت ہے، جبکہ مولانا محمد فاروق صاحب امام ابوحنیفہ کے قول کو مستدل بناتے ہوئے، کمپیوٹر، ایئر کنڈیشن وغیرہ کی مرمت، نیز بینک کی حفاظت، مکان کی تعمیر، اسے کرایہ پر دینا ان سب کو جائز قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر بہاء الدین ندوی صاحب نے لکھا ہے کہ: اگر کمپیوٹر وغیرہ کی مرمت کی رقم سود کی رقم سے دی جاتی ہو تو حرام ہے ورنہ نہیں" ویکرہ معاملة من بیده حلال و حرام و إن غلب الحرام الحلال نعم إن علم بتحریم ما عقد به حرم وبطل" (فتح المعین)۔

مولانا عبدالرشید قاسمی صاحب نے کہا کہ جہاں سودی معاملات میں تعاون اور سودی نفع کے ذریعہ تنخواہوں کا ملنا دو امر مرکب ہوں وہاں تو ملازمت جائز نہ ہوگی، لیکن جہاں صرف ایک چیز سودی نفع سے اجرت کا ملنا ہو، سودی معاملات میں تعاون نہ ہو وہاں اجرت جائز ہوگی، جیسے کمپیوٹر یا ایئر کنڈیشن کی مرمت وغیرہ۔

ب۔ انشورنس کمپنی کا کاروبار ربا اور قمار پر مبنی ہے، البتہ انشورنس کی ایسی شکلیں جس میں واقعہ پیش نہ آنے کی صورت میں پالیسی ہولڈر کو کوئی رقم نہ ملتی ہو، جیسے میڈیکل انشورنس یا حادثہ انشورنس، یا جو انشورنس جبری نوعیت کا ہو، بعض اہل علم اس کو جائز قرار دیتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ انشورنس کمپنی کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ کیا انشورنس کی تمام صورتوں کے لیے ایک ہی حکم ہے یا ان میں کچھ فرق بھی ہے؟ نیز کسی شخص کا انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے یا نہیں؟

بیشتر مقالہ نگار حضرات نے سود اور قمار پر مبنی انشورنس کمپنی میں ملازمت نیز بحیثیت ایجنٹ کام کرنے کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد فاروق، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ثناء الہدی قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی وغیرہ)۔

جبکہ بعض حضرات نے شرعی مجبوری، یا انشورنس نہ کرانے کی صورت میں جان و مال کی حفاظت مشکل ہو جائے، یا فقر و افلاس اس حد تک آجائے کہ معصیت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو جائے تو "الضرورات تبیح المحظورات"، "الضرورة تتقدر بقدرها" کے تناظر میں ملازمت کا شرعاً جواز ہوگا، البتہ جلد از جلد ترک کرنے کا ارادہ ہو اور استغفار کرتا رہے، نیز زائد ملنے والی رقم کو غرباء میں بغیر نیت ثواب خرچ کر دیا جائے (دیکھئے مقالہ: مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ثناء الہدی قاسمی)۔

لیکن مولانا سلمان پالنپوری نے بیمہ کمپنی میں ملازمت کو "الضرورات تبیح المحظورات" کے دائرہ سے باہر قرار دیا، البتہ اس میں بعض جائز کام کرنے کی اجازت دی، جیسے چوکیداری، یا چپراسی وغیرہ کا کام (دیکھئے مقالہ: مولانا سلمان پالنپوری)۔

بعض حضرات نے انشورنس کی کئی صورتیں بیان کی ہیں اور ان میں سے بعض کو جائز قرار دیتے ہوئے اس میں ملازمت کو جائز اور بطور ایجنٹ کام کرنے کو بھی مستحسن قرار دیا ہے۔

مولانا اقبال احمد ٹنکاروی صاحب نے دفع ضرر کی غرض سے بعض قیود و شرائط کے ساتھ شرعاً بیمہ کی اجازت دی ہے، نیز انہوں نے کہا کہ: اشیاء کے بیمہ کی اجازت بدرجہ مجبوری ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا اقبال احمد ٹنکاروی)۔

مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی صاحب نے حاجت شدیدہ کی وجہ سے "حادثہ بیمہ"، "میڈیکل بیمہ" اور قانونی جبر کی وجہ سے تھرڈ پارٹی بیمہ کو علماء عصر کے حوالہ سے جائز قرار دیا ہے، نیز انہوں نے اس طرح کی بیمہ کمپنیوں میں عام مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے ایجنٹ بننے کی بھی گنجائش رکھی ہے" وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان فی الأصل فاسدًا لكثر التعامل وكثير من هذا غير جائز، فجوزه لحاجة الناس" (شامی ۶/ ۶۳)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی)۔

مولانا شمس الدین مظاہری اور مولانا عبدالرشید قاسمی نے مزید تفصیل کرتے ہوئے رقم کیا ہے: انشورنس گرچہ سود اور قمار پر مبنی ہوتا ہے، لیکن اس کی بعض صورتیں اس سے خارج ہوتی ہیں، مثلاً سرکاری انشورنس اور تعاون پر مبنی انشورنس، نیز حادثاتی انشورنس، چونکہ اول الذکر میں حکومت جبراً تنخواہ کا ایک حصہ وضع کر لیتی ہے اور بعد میں جو پنشن کی صورت میں اسے بڑھا کر دیتی ہے، جسے تبرع اور احسان کہا جاتا ہے، دوسری صورت میں بھی خطرہ کے پیش نظر مدد کرنا مقصود

ہوتا ہے، اور آخر صورت میں جس کے لیے اسلام نے "نظام معاقل" رکھا ہے، لہٰذا ان تینوں جگہوں پر چونکہ ربا اور قمار نہیں ہوتا ہے، لہٰذا ان مذکورہ صورتوں میں ملازمت اور ایجنٹ بننا دونوں جائز ہوں گے، اور جہاں ربوا اور قمار عام ہو جیسے تجارتی انشورنس، لائف انشورنس ان جیسی جگہوں میں دونوں چیزیں ناجائز ہوں گی (دیکھئے مقالہ: مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

مولانا ظفر عالم ندوی صاحب ایسے انشورنس کو حرمت کے حکم سے مستثنیٰ رکھا ہے جہاں جبراً سرکاری یا غیر سرکاری ملازموں کو اس میں ملوث ہونا پڑتا ہے، لیکن انہوں نے ایسی کمپنیوں میں ملازمت نیز بحیثیت ایجنٹ کام کرنے کو قطعاً درست نہیں قرار دیا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی)۔

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی صاحب نے مطلق کہا کہ انشورنس کے جس شعبہ میں ربا اور قمار ہو وہاں ملازمت جائز نہیں اور جہاں نہ ہو وہاں جائز ہے "الأصل فی الأشیاء الاباحة" کی بنا پر (دیکھئے مقالہ: مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی)۔

مولانا رضوان الحسن مظاہری صاحب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ہندوستانی حالات کے تناظر میں ضرورۃً علماء نے انشورنس کی اجازت دی ہے، لیکن یہ جائز نہیں کہ خود مسلمان اس کی ایجنسی لیں یا اس کی ملازمت کریں یا اس کا ایجنٹ بنیں (دیکھئے مقالہ: مولانا رضوان الحسن مظاہری)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب نے "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر" (مسلم، ۳/۱۱۵۳) کو بنیاد بناتے ہوئے اس شعبہ میں ملازمت اور ایجنٹ بننے دونوں کو تعاون علی الاثم والمعصیۃ قرار دیا اور ناجائز کہا ہے، البتہ موصوف نے جبری واضطراری انشورنس کی بقدر ضرورت اجازت دی ہے، لیکن اس پر سختی سے زور دیا کہ جمع شدہ رقم سے جو زائد رقم ملے اسے استعمال کرنا جائز نہ ہوگا اور اس کا حکم تصدق علی الفقراء ہوگا "لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد" (بحر الرائق، ۸/۳۶)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)

ج۔ شراب کی کمپنی میں کچھ لوگ شراب کی خرید وفروخت کرتے ہیں، کچھ لوگ کمپنی کے لیے بوتل بناتے ہیں، کچھ لوگ شراب کے لین دین میں نہیں رہتے؛ لیکن حساب کتاب لکھتے ہیں، یا شراب کی کمپنی کو وہ اجزاء پیش کرتے ہیں، جن سے شراب بھی بنائی جاتی ہے، تو شراب کی کمپنی کے ان مختلف کاموں میں ملازمت کا حکم یکساں ہے یا ان میں حکم کے اعتبار سے کچھ فرق بھی ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگاران حضرات نے "لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الخمر عشرة: عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة إليه وساقيها وبائعها وآكل ثمنها والمشتري لها والمشتراة له" (ترمذی: ۱۳۸۳)۔ اور "إن الله عزوجل قد لعن الخمر وعاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة إليه وبائعها ومبتاعها وساقيها ومستقيها" (صحیح ابن حبان: ۵۳۵۶)۔ جیسی روایات کی بنیاد پر شراب کی کمپنی یا اس میں کسی بھی طرح کی معاونت والی ملازمت کو ناجائز قرار دیا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی وغیرہ)۔

جبکہ بعض حضرات نے شراب کی کمپنی میں حساب کتاب رکھنے یا لکھنے کی ملازمت کو جائز ٹھہرایا ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی نے "عالمگیری" کے اس جزئیہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے "وإن استأجر ليكتب له غناءً بالفارسية أو بالعربية فالمختار أنه يحل لأن المعصية في القراءة" (۴/۴۵۰)، جبکہ مولانا محمد فاروق صاحب نے امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق اسے جائز قرار دیا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی)۔

بوتل وغیرہ بنانا یا شراب کے اجزاء فروخت کرنے کے تعلق سے مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب نے یہ کہا ہے کہ ویسے تو ناجائز ہے "وقد نص أحمد على مسائل نبه بها على ذلك فقال... ومن يخترط الأقداح لا يبيعها ممن يشرب فيها" (مغنی، ۶/۳۱۹)۔ البتہ اگر کوئی کمپنی شراب کے علاوہ سرکہ یا کوئی دوسرا حلال مشروب بھی بناتی ہو تو پھر اس کے اجزاء کی خرید وفروخت کو جائز لکھا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

اس سلسلہ میں مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب نے ذکر کیا ہے کہ شراب کی بوتلیں بنانا یا میٹریل فروخت کرنے کا حکم بلاواسطہ ملازمت کرنے والوں سے مختلف ہوگا، ایسی ملازمت کا حاصل کرنا اور جاری رکھنا دونوں درست ہوگا، کیونکہ اس میں اعانت علی المعصیۃ کے درجات مختلف ہیں اور جواز وعدم جواز بڑی حد تک نیت پر ہے، موصوف نے "خلاصہ" کے حوالہ سے استدلال کیا ہے: "إن بيع العصير ممن يتخذ خمرًا إن قصد به التجارة فلا يحرم وإن قصد لأجل التخمير حرم"، نیز ذکر کیا ہے: "رجل أجر بيتًا ليتخذ فيه بيت نار أو بيعة أو كنيسة أو يباع فيه الخمر فلا

بأس به وكذا كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار" (خلاصہ، ۴/ ۳۷۷)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا ثناء الہدی قاسمی)

اس بارے میں مولانا شمس الدین مظاہری صاحب ومحبوب احمد فروغ قاسمی صاحب کے مطابق بوتلیں بنانا یا دیگر میٹریل دینا جس کے متعلق یقین ہو کہ وہ شراب ہی میں استعمال ہوں گے تو پھر ملازمت اور تعاون جائز نہ ہوگا، لیکن اگر معاملہ برعکس ہو کہ ان چیزوں سے دوسرے اشیاء بھی بنائے جاتے ہوں تو پھر ان کاموں میں ملازمت جائز ہوگی، کیونکہ یہ چیزیں بذات خود معصیت نہیں ہیں۔ "لكن الإعانة هي ما قامت المعصية بعين فعل المعين ولايتحقق إلا بنية الإعانة أو التصريح بها أو تعينها في استعمال هذا الشئ بحيث لايحتمل غير المعصية" (جواہر الفقہ، ۲/ ۳۵۰)۔ "وإذا استاجر الذمي مسلمًا ليحمل له خمرًا ولم يقل ليشرب أو قال: ليشرب جازت الإجارة في قول أبي حنيفة خلافًا لهما" (عالمگیری، ۴/ ۴۴۹)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی)

جبکہ مولانا اقبال احمد ٹنکاروی صاحب نے اجزاء فروخت کرنے والے کو نہ ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے شراب بنانے والے کو مورد الزام ٹھہرایا اور کہا کہ یہ اس کا اپنا اختیار فعل ہے اس میں اجزاء فروخت کرنے والا ذمہ دار نہیں ہے، لیکن موصوف نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر اجزاء فروخت کرنے والے کو علم یقینی ہو کہ وہ شراب ہی بنائے گا تو پھر اسے بیچنا تعاون علی الاثم ہوگا (دیکھئے مقالہ: مولانا اقبال احمد ٹنکاروی)۔

مولانا عبدالرشید قاسمی صاحب نے "جاز بيع العصير وعنب ممن يعلم أنه يتخذ خمرًا لأن المعصية لاتقوم بعينه بل بعد تغيره" (درمختار، ۹/ ۵۶۰) اور "جاز تعمير الكنيسة وحمل خمر ذمي" (۹/ ۵۶۲) میں امام ابوحنیفہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے شراب کے دیگر شعبوں میں ملازمت جائز قرار دی، نیز شیخ وہبہ زحیلی کی کتاب "الفقه الإسلامي وأدلته" (۴/ ۲۶۸۸) کے حوالہ سے کہا کہ یہاں امام ابوحنیفہ کے مذہب پر عمل کرنے میں راحت ہے، لہٰذا کمپنی کے وہ کام جن میں براہ راست شراب کا پینا پلانا، بیچنا خریدنا نہ ہو تو اس میں ملازمت اور دیگر کام کاج کی اجازت ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی صاحب نے بوتل فروخت کرنے یا حساب کتاب لکھنے کو شراب فروشی کی طرح حرام تو قرار نہیں دیا لیکن مکروہ وناجائز ضرور کہا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

اسی طرح مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب نے کہا کہ ویسے تو اس شعبہ میں ملازمت حرام ہے، لیکن جو کام فی نفسہ جائز ہیں ان میں ملازمت بھی جائز ہوگی، جیسے الکٹریشین کا کام، ایئر کنڈیشن کی مرمت، چوکیداری وغیرہ (دیکھئے مقالہ: مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی)۔

۳۔ بعض صورتیں ایسی ہیں، جن میں کاروبار کا اصل مقصد حرام کام کرنا نہیں ہے، لیکن ضمنی طور پر وہاں حرام بھی کیے جاتے ہیں، جیسے:

الف: سپر مارکیٹ ہے، جس میں زندگی کی مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں، اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے، ایسے سپر مارکیٹ کی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات ہوں تو ان کو واضح کیا جائے۔

اکثر مقالہ نگار حضرات نے سپر مارکیٹ میں غالب کا اعتبار کرتے ہوئے فی نفسہ ملازمت کو جائز قرار دیا ہے، نیز کہا کہ اگر خود کو شراب یا دیگر حرام اشیاء کی فروختگی سے دور رکھا جائے تو ایسی جگہوں میں ملازمت کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی وغیرہ)۔

مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی صاحب نے کہا کہ اگر ایسے سپر مارکیٹ میں حرام اشیاء کی کثرت ہے تو ملازمت جائز نہ ہوگی "ما اجتمع الحلال والحرام إلا غلب الحرام" اور اگر اکثر جائز اشیاء کی ہے تو ملازمت درست ہوگی لیکن حرام اشیاء کے لین دین سے خود کو الگ رکھنا ضروری ہوگا، اگر لین دین بھی متعلق ہو نیز حرام اشیاء کی فروختگی عند العقد مشروط ہو تو تعاون علی الاثم ہونے کی وجہ سے ملازمت ناجائز لیکن تنخواہ حلال ہوگی، بطور استدلال انہوں نے "البحر الرائق" کی یہ عبارت نقل کی ہے: "حمل خمر الذمي بأجر يعني جاز ذلك، وهذا عند الامام، وقالا يكره، لأنه عليه السلام لعن في الخمر عشرة وعدمنها حاملها وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية وإنما المعصية بفعل فاعل مختار" (۸/ ۲۰۳)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی)

مولانا اقبال احمد ٹنکاروی صاحب نے کہا کہ اگر حرام اشیاء سے بھی تعلق رکھنا پڑتا ہو تو ملازمت مکروہ تحریمی ہے اور احتیاط اولی ہے (مقالہ: مولانا اقبال احمد ٹنکاروی)۔

جبکہ مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب کے مطابق اگر حرام کام ان سپر مارکیٹ یا ہوٹل وغیرہ میں براہ راست نہ کرنا پڑتا ہو یا اس کی نوبت بہت کم آتی ہو تو جواز ہوگا، لیکن اس کے برعکس بلا واسطہ حرام کام کرنا پڑتا ہو تو اعانت علی المعصیۃ کی وجہ سے ملازمت ناجائز ہوگی "ولا تجوز الإجارة على شئ من الغناء والنوح والمزامير والطبل وشئ من اللهو وعلى هذا الحداء وقراءة شعر وغيره لا أجر في ذلك وهذا كله قول أبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد" (کتاب الاجارۃ، ۴/۴۴۹)۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی)

مولانا عبدالرشید قاسمی صاحب نے سپر مارکیٹ سے متعلق کئی شکلوں کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا کہ اگر شوروم ایسا ہو جہاں ہر چیز کی دکان الگ ہو تو صرف شراب کے شعبہ میں ملازمت جائز نہ ہوگی، لیکن اگر مختلف مجموعوں کا مارکیٹ ہو اور کوئی شخص وہاں بحیثیت کیشیر کام کرے لوگ خود اپنا سامان لے لیں تو ملازمت جائز ہوگی، موصوف نے اس کے علاوہ یہ بھی واضح کیا کہ سپر مارکیٹ میں دکان وشوروم کی سیلس مینی کے علاوہ ملازمت کے درجنوں شعبے ہوتے ہیں چپراسی سے لے کر منیجر تک، ان تمام شعبوں میں ملازمت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (دیکھئے مقالہ: مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب نے "فتاویٰ عالمگیری" کی عبارت: "وإذا استأجر الذمي من المسلم دارًا ليسكنها فلا بأس بذلك إن شرب فيها الخمر أو عبد فيها الصليب أو أدخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم في ذلك بأس لأن المسلم لايواجرها لذلك إنما آجرها للسكنى كذا في المحيط" (۴/۴۵۰) کو مستدل بناتے ہوئے عرض کیا کہ اگر حرام کام سے خود کو بچا لیا جائے تو ایسی جگہوں میں ملازمت کرنا جائز ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

جبکہ مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی صاحب نے کہا کہ اگر شراب کے گوشوں کا دوسرے گوشوں سے کوئی تعلق نہ ہو نیز اس کا حساب کتاب بھی الگ ہو تو ملازمت جائز ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی)۔

ب۔ تدریس ایک معزز پیشہ ہے، جس کا انسانی شخصیت کی تعمیر سے گہرا تعلق ہے، لیکن موجودہ دور میں اولاً تو مخلوط تعلیم کے نظام کا غلبہ ہے اور استاذ کو بعض اوقات اس طرح تدریس کا فریضہ انجام دینا ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب لڑکے بھی ہوتے ہیں اور لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، اسی طرح لڑکیوں کی مخصوص درسگاہوں میں مرد اساتذہ بھی کام کرتے ہیں، اور لڑکوں کی درسگاہوں میں خاتون اساتذہ بھی کام کرتی ہیں، ایسی ملازمت جائز ہوگی یا نہیں؟

بیشتر مقالہ نگاران حضرات نے کہا ہے کہ بہتر تو ہے کہ لڑکوں کے لیے مرد اساتذہ اور لڑکیوں کے لیے عورتیں ہوں، لیکن چونکہ مخلوط تعلیم کا غلبہ ہے، اور تدریس جیسے معزز پیشہ نیز ایک بہتر ذریعہ معاش کو بالکلیہ نادرست قرار دے دینا صحیح نہیں ہے، لہٰذا اگر پردہ کا معقول انتظام ہو، شرعی پردہ کا مکمل لحاظ ہو، نیز نشست کی ترتیب ایسی ہو کہ ایک دوسرے کا سامنا نہ ہو اور لڑکیاں مکمل حجاب میں ہوں اور آخری نشست پر بیٹھتی ہوں، یا اگر مرد استاذ ہوں تو لڑکیوں کا مکمل پردہ کے ساتھ ان کی تعداد تین سے کم نہ ہو اور اپنے قلب ونظر کو گناہ سے محفوظ رکھنے کی مکمل کوشش ہو، غض بصر کا مکمل اہتمام ہو، اور اپنے بہتر کردار وعمل کا اظہار ہو تو ایسے مخلوط تعلیمی اداروں میں مردوں کا لڑکیوں کو اور عورتوں کا لڑکوں کو یا لڑکیوں کے اسکول میں مردوں کا اور لڑکوں کے اسکول میں عورتوں کا تعلیم وتدریس دینا جائز ہوگا (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا خورید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی وغیرہ)۔

مذکورہ حضرات نے حسب ذیل نصوص سے استدلال کیا ہے:

☆ "عن أبي سعيد الخدري قال: قالت النساء للنبي صلى الله عليه وسلم: غلبنا عليك الرجال، فاجعل لنا يومًا من نفسك فوعدهن يومًا لقيهن فيه فوعظهن وأمرهن" (بخاری: ۱۰۰)۔

☆ "الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة" (الاشباہ: ۹۱)، (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

☆ "ولايظن من لا مظنة عنده إذا قلنا ''صوت المرأة عورة'' إنا نريد بذلك كلامها، لأن ذلك ليس بصحيح فإنا

تجیز لکلام مع النساء للأجانب ومحاورتھن عند الحاجة إلی ذلك"(ردالمحتار ۲/۷۹)،(مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

☆ "یا أیها النبی قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنین یدنین علیهن من جلابیبهن"(احزاب:۵۹)

مولانا عبدالرشید قاسمی صاحب نے مخلوط تعلیم کے سلسلہ میں رقم کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مخلوط تعلیم کی تدریس میں فتنہ کم، بدنگاہی کا احتمال زیادہ ہے، اب اس کی وجہ سے ملازمت ناجائز قرار دے دی جائے تو حرج لازم آئے گا اور معیشت کے وسائل تنگ کرنے کے مترادف ہوگا، اس طرح لاکھوں پروفیسر، ٹیچرس جو اپنی شرافت اور تدین باقی رکھتے ہوئے، بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور جامعات میں تعلیم دیتے ہیں جہاں مخلوط تعلیم ہوتی ہے، اگر اسے مکروہ بھی قرار دیا جائے تو "أهون البلیتین" کے پیش نظر گنجائش دینی ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

مولانا شمس الدین مظاہری صاحب نے اولاً کہا کہ اگر تعلیم مخلوط ہو اور پردہ کا نظم نہ ہو تو مخلوط تعلیم جائز نہیں ہے "لعن الله الناظر والمنظور إلیه" (مشکوۃ ۱/۲۷۰) اس کے بعد تعلیم کی دو تقسیم (ایک فرائض وواجبات کی تعلیم، دوسری مستحبات ومباح درجہ کی تعلیم) کرتے ہوئے اول الذکر یعنی فرائض وواجبات کی تعلیم کے بارے میں کہا کہ اگر خلاف شریعت عمل کے ارتکاب سے بچتے ہوئے ملازمت کی جائے تو گنجائش ہوگی "جواز النظر منها للتعلیم فی مایجب تعلمه وتعلیمه کالفاتحه"۔ جبکہ آخر الذکر یعنی مستحبات ومباح درجہ کی تعلیم کے لیے بغیر پردہ درس وتدریس کو جائز نہیں قرار دیا ہے اور حوالہ انہوں نے فقہی قواعد سے نقل کیا ہے "الفرائض أفضل من النفل" اور "فرض العین لا یترك بالنافلة وبماهو من فروض الکفایة" (دیکھئے مقالہ: مولانا شمس الدین مظاہری)۔

مولانا عبدالتواب اناوی صاحب نے ملازمت تدریس کی اجرت کو جائز قرار دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی اضافہ کیا کہ البتہ جس درجہ میں بے پردگی ہوگی اس درجہ کا گناہ بھی ہوگا (دیکھئے مقالہ: مولانا عبدالتواب اناوی)۔

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی نے اس بات پر زور دیا کہ اگر علی الاطلاق مردوں وعورتوں کو مخلوط درسگاہوں میں تدریس سے منع کر دیا جائے تو حرج کے ساتھ ساتھ تقریباً ۱۵ لاکھ مسلم اساتذہ کی ملازمت ناجائز قرار پا جائیں گی، لہٰذا "ینظر من الأجنبیة ولو کافرة إلی وجهها وکفیها فقط للضرورة" کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے شرعاً پردہ کے ساتھ تدریس کی اجازت دی جانی چاہیے (دیکھئے مقالہ: مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی)۔

مولانا سلمان پالنپوری نے خدشہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج کل کے عصری تعلیمی اداروں میں بے پردگی، بے حیائی اور آزادانہ اختلاط کے پیش نظر شرعی پردہ کا لحاظ عنقا معلوم ہوتا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا سلمان پالنپوری)۔

جبکہ مولانا قمر عالم قاسمی مخلوط تعلیم نیز مردوں کا عورتوں کو یا عورتوں کا مردوں کو تدریس دینے کو مطلقاً اور شرعاً ناجائز کہا ہے "قل للمؤمنین یغضوا من أبصارهم ویحفظوا فروجهم" (نور:۳۱-۳۰)۔ "قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إن الشیطان یجری من الإنسان مجری الدم" (متفق علیہ)، (دیکھئے: مقالہ مولانا قمر عالم قاسمی)۔

ج۔ ایک اہم پیشہ وکالت کا ہے، وکیل کا مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوتا ہے، مسلمانوں کے اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل کے لیے وکیل کی ضرورت پڑتی ہے اور بہت سے مواقع پر اچھے مسلمان وکلاء کی کمی محسوس کی جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے اکثر وکلاء کے یہاں ظالم اور مظلوم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، بلکہ بہت سی دفعہ وہ مظلوم کو انصاف سے محروم کر دیتا ہے، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر اوقات وکلاء اپنے مؤکل کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے انہیں جھوٹ بولنے کی باضابطہ تربیت دیتے ہیں، اس پس منظر میں یہ بات قابل غور ہے کہ کیا مسلمان اس پیشہ کو اختیار کر سکتے ہیں؟

بیشتر مقالہ نگاران حضرات نے مسلمانوں کی اجتماعی وانفرادی ضرورت کے پیش نظر اس پیشہ کو اختیار کرنے کی اجازت دی، کیونکہ اس شعبہ میں مسلمانوں کی خاطر خواہ نمائندگی نہ صرف اس پیشہ کی توقیر میں اضافہ کرے گا بلکہ مظلوموں کو ان کا صحیح حق ملے گا اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔

اکثر حضرات نے اس بات کو واضح کیا کہ اس پیشہ کے اندر جو خرابیاں ہیں، اس کا سبب خارجی اور ذاتی اسباب کی بنا پر ہیں، بلکہ اگر مظلوموں کو

انصاف دلانے اور ان کی نصرت واعانت کی نیت سے اس کو اختیار کیا جائے تو نہ صرف جائز بلکہ ایک مستحسن اور کارِ ثواب عمل ہوگا اور اس راہ میں اگر فریق ثانی یعنی ظالم کو زیر کرنے کے لیے چرب زبانی، حیلہ سازی اور بعض اوقات جھوٹ کا بھی سہارا لینا پڑے تو بعض حضرات نے اسے بھی گوارا کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے "إن الله يحب المقسطين" (دیکھئے مقالہ: مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا قمر عالم قاسمی وغیرہ)۔

☆ "وفيه الحيل في التخلص من الظلمة، بل إذا علم أنه لا يتخلص إلا بالكذب جاز له الكذب الصريح، وقد يجب في بعض الصور بالاتفاق لكونه ينجي نبيًا أو وليًا ممن يريد قتله أو لنجاة المسلمين من عدوهم، وقال الفقهاء: لو طلب ظالم وديعة الإنسان ليأخذها غصبًا وجب عليه الإنكار والكذب في أنه لا يعلم موضعها" (عمدۃ القاری، ۱۲/۴۶)۔

☆ "واتفقوا على جواز الكذب عند الاضطرار كما لو قصد قتل رجل وهو مختف عنده فله أن ينفي كونه عنده ويحلف على ذلك ولا يأثم" (فتح الباری، ۵/۳۶۴)۔

مولانا محمد فاروق دربھنگوی صاحب نے قانونی مشورہ کو سرے سے مالِ متقوم میں نہ شمار کرتے ہوئے اس کی اجرت کو جائز نہیں کہا ہے "رجل ضل له شئ فقال: من دلني على كذا فله كذا، فهو على وجهين: إن قال ذلك على سبيل العموم بأن قال: من دلني فالإجارة باطلة لأن الدلالة والإشارة ليست بعمل يستحق به الأجر" (شامی، ۹/۱۱۱)، لیکن انہوں نے وضاحت کی کہ چونکہ آج کل صرف قانونی مشورہ نہیں دینا پڑتا ہے، بلکہ عدالت جانا، بحث ومباحثہ کرنا، ثبوت جمع کرنا، ان سب کاموں میں بہت سارا وقت صرف ہوتا ہے، لہٰذا جس طرح قاضی وحاکم محبوس فی أمور العامۃ کے تحت نفقہ کے مستحق ہوتے ہیں، اسی طرح وکیل بھی ہوسکتا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد فاروق صاحب)۔

مولانا مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب نے "تصح الوكالة بأجر أو بغير أجر لأن النبي ﷺ كان يبعث عماله تقبض الصدقات ويجعل لهم عمولة ... ولأن الوكالة عقد جائز ... فيجوز أخذ الأجرة فيها بخلاف الشهادة" (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۵/۱۴۵۸) کے حوالہ سے انصاف کی راہ میں جدوجہد کو جائز قرار دیا، ساتھ ہی موصوف نے جھوٹے اور ناحق مقدموں کی پیروی نیز ظالم کی اعانت والی وکالت کی آمدنی کو ناجائز قرار دیا "لاتجوز أخذ الأجرة على المعاصي كالغناء والنوح والملاهي" (مجمع الانہر، ۳۸۴)، (دیکھئے مقالہ: مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی)۔

اس سلسلہ میں مولانا اشتیاق احمد اعظمی صاحب نے فقہاء کرام کے حوالہ سے وکیل کے لیے بطور خاص چند شرائط کا ذکر کیا ہے کہ وکیل متعین ہو مبہم نہ ہو، تصرف کا اہل ہو، پیشۂ وکالت سے اس کا مقصد حق وانصاف کو واضح کرنا ہو، ظالم کو ظلم سے روکنا اور مظلوم کی فریاد رسی کرنا ہو، نیز انہوں نے کہا کہ ناجائز امور میں ظالم اور باطل کی طرف سے وکالت ناجائز ہوگی لقوله تعالى: "ولا تكن للخائنين خصيما. ولاتجادل عن الذين يختانون أنفسهم" (المحاماۃ فی الشریعۃ الاسلامیہ، ۸۴-۸۳-۵۸۲)، (دیکھئے مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب نے "لكل من المدعي والمدعى عليه أن يوكل من شاء بالخصومة ولا يشترط رضا الآخر" (شرح المجلۃ، رقم: ۱۵۱۶) کے حوالہ سے وکیل بننے اور اجرت لینے دونوں کو جائز قرار دیا، لیکن شہادت زور کو کبائر میں شمار کرتے ہوئے مؤکل کو جھوٹ بولنے کی تربیت دینے اور ترغیب دینے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ "عن أبي بكرة قال: كنا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ألا أنبئكم بأكبر الكبائر (ثلاثًا) الإشراك بالله وعقوق الوالدين وشهادة الزور" (مسلم: ۱۴۳)، (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

د- انسانی خدمت کا ایک ذریعہ علاج اور پیشۂ طبابت ہے، لیکن بدقسمتی سے اس شعبہ میں بعض برائیاں در آئی ہیں، جیسے آپریشن مجبوری کی حالت میں کیا جانا چاہئے، لیکن ہاسپٹل کی انتظامیہ ڈاکٹروں کو تاکید کرتی ہے کہ وہ ہر ماہ کم سے کم اتنی مقدار میں آپریشن یا ٹیسٹ لکھے، تاکہ ہاسپٹل کی اور اس

کی لیبارٹری کی آمدنی بڑھ سکے، اسی طرح سرکاری ہاسپٹلوں کے علاوہ پرائیوٹ ہاسپٹلوں میں بھی مرد ڈاکٹر کو خاتون مریض اور خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے ایسے علاج پر بعض اوقات مجبور کیا جاتا ہے، جس کا تعلق قابل ستر حصہ سے ہے، تو ایسے ہاسپٹلوں میں ملازمت کرنے کا کیا حکم ہوگا، اور ملازمین کے لیے کیا شرعی حدود ہوں گی؟

تقریبا تمام ہی مقالہ نگاران حضرات نے پیشہ طبابت کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے اور مجبوری کی صورت میں عورتوں کا علاج مردوں کے ذریعہ یا مردوں کا علاج عورتوں کے ذریعہ کرانے کو درست قرار دیا ہے، بایں صورت کہ اگر مرض بڑھ جانے کا خدشہ ہو یا ہلاک ہوجانے کا خطرہ ہو، نیز بغیر ضرورت ٹیسٹ لکھ کر مریض کو پریشان کرنے کو سب نے نفاق، خیانت، ظلم، اکل بالباطل، تعاون علی العدوان اور زیادتی بتاتے ہوئے ناجائز عمل قرار دیا اور اس خرابی کو پیشہ کی خرابی نہ بتا کر ذاتی عمل بتایا ہے، (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا ثناء الہدی قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، ڈاکٹر بہاء الدین ندوی وغیرہ)۔

ان حضرات نے حسب ذیل دلائل کو بطور دلیل پیش کیا ہے:

☆ "لتاكلوا فريقا من أموال الناس بالاثم وانتم تعلمون" (شاہجہاں ندوی)۔

☆ "والطبيب إنما يجوز له ذلك إذا لم يوجد امرأة طبيبة فلو وجدت فلا يجوز له أن ينظر لأن نظر الجنس إلى الجنس أخف" (تکملہ بحر الرائق، ۹/ ۵۳-۳۵۲)، (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی)۔

☆ "إذا كان المرض في سائر بدنها غير الفرج، يجوز النظر إليه عند الدواء لأنه موضع ضرورة، وإن كان في موضع الفرج فينبغي أن يعلم امرأة تداويها، فإن لم توجد وخافوا عليها أن تهلك أو يصيبها وجع لا تحتمله يستروا منها كل شئ إلا موضع العلة، ثم يداويها الرجل، ويغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح والظاهر أن ينبغي هنا للوجوب" (رد المحتار، ۹/ ۵۳۳)، (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا محمد فاروق دربھنگوی)۔

☆ "ينظر الطبيب إلى موضع مرضها بقدر الضرورة، إذا الضرورات تتقدر بقدرها" (الدر المختار، ۹/ ۵۳۲)، (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

☆ "لا يكلف الله نفسا الا وسعها" (مفتی ثناء الہدی قاسمی)۔

☆ "ولايجوز النظر إليه بشهوة أي إلا لحاجة أو مداواتها إلى موضع المرض بقدر الضرورة" (شامی ۱/ ۸۰-۷۹)، (شمس الدین مظاہری)

☆ "ويجوز النظر إلى الفرج ...... وللطبيب عند المعالجة ويغض بصره ما استطاع" (ہندیہ، ۵/ ۳۳۰)۔

مولانا شمس الدین مظاہری صاحب نے کہا کہ اگر مسلمان اس پیشہ سے زیادہ وابستہ ہوں گے تو حتی الامکان دوسروں کے مقابلے میں پردہ کی رعایت زیادہ کریں گے اور گویا یہ ایک طرح کا کار خیر میں تعاون ہوگا۔

مولانا محمد فاروق صاحب نے آپریشن یا جانچ کی شرط کو مقتضائے عقد کے خلاف قرار دیا اور ایسی ملازمت کو ناجائز کہا ہے "الفاسد ما عرض عليه من الجهالة أو اشترط شرطا لا يقتضيه العقد كما في الشامي" (۹/ ۵۹)، (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد فاروق)۔

۵۔ ذرائع مواصلات کی ترقی، سیاحت کے رجحان میں اضافہ اور مسافر کی ضرورت کے لحاظ سے "ہوٹل" موجودہ سماج کی ضرورت بن گئے ہیں اور یہ اس وقت ایک نفع بخش تجارت بھی ہے، ہوٹلوں کا بنیادی مقصد تو معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے، لیکن بڑے ہوٹلوں میں بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں، جو شرعا جائز نہیں ہیں، جیسے: شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ، ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کرنے کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ حرام چیزوں کی فراہمی سے اس کا براہ راست تعلق ہو یا براہ راست تعلق نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہوٹل کی ملازمت میں فی نفسہ کوئی قباحت نہیں ہے، اگر مسلم ملازم اس چیز کا التزام کرے کہ حرام اشیاء کی فراہمی، نیز خلاف شرع امور سے خود کو الگ رکھے اور براہ راست اس سے اسکا تعلق نہ ہو تو ایسی جگہ میں ملازمت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا سلمان پالنپوری، مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا قمر عالم قاسمی وغیرہ)۔

لیکن مولانا سلمان پالنپوری صاحب نے کہا کہ اس میں کئی دینی خطرات ہیں، لہٰذا احتراز بہتر ہے، نیز اقبال احمد ٹنکاروی صاحب نے بھی احتیاط ہی کو ترجیح دی ہے۔

جبکہ مولانا مظاہر حسین صاحب نے جواز کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ حرام کاموں کا حساب کتاب الگ ہو، نیز ہوٹل کی اکثری تجارت حرام کاموں کے ذریعہ نہ ہو۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا مظاہر عماد قاسمی)

مولانا محمد فاروق صاحب نے حدیث پاک "فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعي يرعى حول الحمى يوشك أن يرتع فيه" (مشکوۃ، ۲۴۱) کے حوالہ سے کہا کہ ایسے ہوٹلوں کی ملازمت سے احتراز کریں۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا فاروق صاحب)

☆ "ما حرم أخذه حرم إعطاءه" (الاشباہ، ۱/ ۱۲۲)

☆ "ولا يسقى أباه الكافر خمرًا ولايناوله القدح" (عالمگیری، ۵/ ۴۲۰)۔

☆ "وقال أصحابنا: لا يجوز الانتفاع بالميتة على أي وجه ولا يطعمها الكلاب والجوارح" (عالمگیری، ۵/ ۴۲۲)، (محبوب احمد فاروق قاسمی)۔

☆ "لكن المعصية هي ما قامت المعصية بعين فعل المعين ولا يتحقق إلا بنية الإعانة أو التصريح بها او تعينها في استعمال هذا الشئ بحيث لا يتحمل غير المعصية " (جواہر الفقہ، ۲/ ۳۵۰)، (شمس الدین مظاہری)۔

☆ "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لعن الله الخمر وشاربها وساقيها" (ابوداؤد: ۳۶۷۴)۔

☆ "وعلى هذا يخرج الاستيجار على المعاصي أنه لايصح لأنه استيجار على منفعة غير مقدورة الاستيفاء شرعًا كاستيجار الإنسان للعب واللهو كاستيجار المغنية والنائحة للغناء والنوح" (بدائع الصنائع، ۴/ ۳۹)۔

☆ "لا تصح الإجارة لأجل المعاصي مثل الغناء والنوح والملاهي " (درمختار، ۹/ ۷۵)، (اشتیاق احمد اعظمی)۔

مولانا شاہجہاں ندوی صاحب نے کہا کہ ہوٹل کی ملازمت میں اگر حرام چیزوں سے ملازمت کا براہ راست تعلق ہو تو حرام ہے، لیکن اگر براہ راست تعلق نہ ہو تب بھی مکروہ تنزیہی قرار پائے گا، انہوں نے ملازمت کو بدرجہ مجبوری اختیار کرنے کو کہا ہے نیز موصوف نے قرآن وحدیث وفقہ کے اصول سے استدلال کیا ہے: "يا أيها الذين آمنوا لا تتبعوا خطوات الشيطان ومن يتبع خطوات الشيطان فإنه يأمر بالفحشاء والمنكر " (النور: ۲۱)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعي يرعى حول الحمى يوشك أن يرتع فيه" (مسلم: ۱۵۹۹)، "من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يجلس على مائدة يدار عليها الخمر" (ترمذی: ۲۸۰۱)، (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی)۔

مولانا ظفر عالم ندوی صاحب نے ایسے منکرات سے پر ہوٹلوں میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کو ناجائز قرار دیا ہے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی (ہند) نے اپنے بیسویں فقہی سمینار کا ایک موضوع "مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام" منتخب کیا ہے، اس موضوع میں کل ۳/ سوالات اٹھائے گئے ہیں، جن میں اجزاء وشقیں مذکور ہیں، احقر کو مذکورہ موضوع کے پہلے سوال کا عرض مسئلہ پیش کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے۔

اس موضوع سے متعلق مرسلہ وتیار کردہ سوال نامہ کے جواب میں اکیڈمی کی طرف سے مجھے کل ۱۷/ مقالات بھیجے گئے تھے، ان میں سے چند مقالات تفصیلی ومبسوط ہیں، اکثر مختصر ہیں اور بعض مقالات میں مقالہ نگار نے صرف اپنی رائے ظاہر کردی ہے۔

مقالہ نگار حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا سلمان پالن پوری، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، ڈاکٹر بہاء الدین ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا فاروق بارڈولی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا ثناء الہدی قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا قمر اعظم قاسمی، اور راقم الحروف اقبال محمد ٹنکاروی۔

جوابات کی نوعیت یہ ہے کہ بعض حضرات نے اجمالی جوابات پر اکتفاء کیا ہے اور بعض حضرات نے ہر دفعہ کا وضاحت وصراحت سے جواب دیا ہے، عرض میں کوشش کی گئی ہے کہ کوئی رائے چھوٹنے نہ پائے اور نہ کسی رائے کے اخذ کرنے میں غلطی ہو، مگر بشر ہوں، براءت کا دعوی نہیں کرسکتا۔

اکثر مقالہ نگار حضرات نے ابتداءً کسب معاش اور رزق حلال وطیب کے فضائل اور اسی کو اختیار کرنے پر روشنی ڈالی ہے، ان کے نام یہ ہیں: مولانا سلمان پالن پوری، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی۔

ان حضرات نے جو آیات کریمہ واحادیث مبارکہ پیش کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

[۱] "وما من دابة فی الارض الا علی الله رزقها" (ہود: ۶)۔

[۲] "یا ایها الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیبًا" (البقرۃ: ۱۶۰)۔

[۳] "کلوا من طیبات ما رزقناکم" (الاعراف: ۱۶۰)۔

[۴] "طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة" (مشکوۃ شریف، ۱/ ۲۴۲)۔

[۵] "لو انکم توکلتم علی الله حق توکله لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا وتروح بطانا" (ابن ماجہ، ۴/ ۲۵۲)۔

مولانا فاروق بارڈولی اور مولانا خورشید احمد اعظمی نے ان ملازمتوں کو اجارہ قرار دیتے ہوئے اس کی تفصیل، اقسام اور شرائط بیان کیے ہیں۔

شرائط حسب ذیل ہیں:

---

[1] مہتمم واستاذ حدیث: جامعہ اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عیدگاہ روڈ، بھروچ، گجرات۔

☆ وہ عمل معصیت اور حرام نہ ہو۔

☆ اس عمل سے کسی ظلم یا گناہ کی اعانت نہ ہو۔

☆ شریعت کی نظر میں وہ عمل لغو اور لایعنی نہ ہو۔

☆ مدت مقرر اور اجرت معلوم ہو۔

☆ ملازم کی طرف سے عمل میں کوتاہی اور بددیانتی نہ ہو۔

☆ مستأجر کی طرف سے اجرت کی ادائیگی میں ظلم اور بدعہدی نہ ہو۔

مولانا عبدالتواب نے اجارہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے اجارہ علی العمل کی صورتیں ذکر کی ہیں اور آخر میں قاعدہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اگر ناجائز عمل جائز عمل پر غالب ہے تو اجارہ کی یہ صورت باتفاق علماء عظام ناجائز ہے؛ البتہ ناجائز عمل پر جائز عمل غالب ہے تو فقہاء کے یہاں اس صورت میں اختلاف ہے۔" (دیکھئے مقالہ)

موضوع مذکور کے سوال اوّل کے جزء (ا) میں ذکر کیا ہے کہ حکومت کا ایک شعبہ فوج ہے، جس کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور اندرون ملک امن و امان کو قائم رکھنا ہے، ظاہر ہے کہ فی نفسہ یہ بہتر مقاصد ہیں، لیکن بعض دفعہ فوج کو ظالم و مظلوم کی تحقیق کے بغیر وار کرنا پڑتا ہے اور فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے، اسی طرح بعض دفعہ ایک مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہوتا ہے، اگرچہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے؛ البتہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ فوج میں مسلمانوں کا رہنا اجتماعی لحاظ سے مسلمانوں کے مفاد میں ہے، بہت سی دفعہ اس کی وجہ سے مسلمان فوج کی زیادتی سے بچ سکتے ہیں، نیز یہ روزگار کا ایک وسیع ذریعہ بھی ہے، اس کو چھوڑ دینا مسلمانوں کے لیے معیشت کے وسائل کو محدود کر دینے کے مترادف ہوگا؛ تو کیا مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا؟

اس کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات نے کہا ہے کہ اشد الضررین کو دفع کرتے ہوئے اور اخف الضررین کو اختیار کرتے ہوئے حالات کے پیش نظر اس ملازمت کو بدرجۂ اولیٰ قبول کرنا جائز ہوگا۔

اس نکتہ پر بھی اکثر حضرات کا اتفاق ہے کہ فوجی کے لیے کسی پر ظلم کرنا جائز نہ ہوگا، ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا قمر عالم رانچی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا سلمان پالن پوری، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا فاروق بارڈولی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی۔

ان حضرات نے درج ذیل قواعد فقہیہ کی روشنی میں شرکت و ترک ملازمت میں ضرر ثابت کیا ہے:

[۱] الضرر الأشد يزال بالضر الأخف۔

[۲] اذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب اخفهما۔

[۳] المصلحة العامة مقدمة على المصلحة الخاصة۔

نیز مولانا عبدالرشید قاسمی "مجموعة الفتاوى" کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں: "ان الشريعة جاءت بتحصيل المصالح وتكميلها وتعطيل المقاصد وتقليلها، فانما ترجح خير الشرين وتحصل اعظم المصلحتين بتثبيت ادناه وتدفع اعظم المفسدتين باحتمال ادناه۔"

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی اور راقم الحروف کی بھی یہی رائے ہے کہ فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ساتھ ساتھ مؤثر اعمال، پاکیزہ اخلاق و کردار اور دین داری اختیار کرے تاکہ لوگوں کے لیے ذریعہ اصلاح بن سکے اور دین کا مبلغ اور داعی بنے۔

مولانا سلمان پالن پوری لکھتے ہیں: جہاں تک ہو سکے خلاف شرع عمل کے ارتکاب سے بچنے کی کوشش کرے اور استغفار کرتا رہے۔

مولانا مظاہر حسین صاحب فرماتے ہیں: اس شعبہ میں بڑی حکمت سے دین اور ملت کے مفاد کے لیے کام کرے۔

راقم الحروف (اقبال ٹنکاروی) کی رائے یہ ہے کہ اس ملازمت میں شرکت جمیع المسلمین کے جلب مصالح اور دفع مضرات کی نیت سے ہو، نہ کہ اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور تشہیر کے لیے۔

تو دوسری طرف مولانا رضوان الحسن مظاہری فرماتے ہیں: مسلمانوں کو اپنی تشخیص، دینی تہذیبی اور دنیوی مفادات کے تحفظ کے لیے کوشش کرنی چاہیے، جس سے وہ سیاسی اعتبار سے مفلوج اور دینی ومذہبی لحاظ سے مجبور نہ ہو جائے، اس لیے مسلمانوں کا فوج، پولیس اور محکمہ عدلیہ میں ملازمت درست ہے اور صحیح ہے؛ لیکن عدل وانصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

ڈاکٹر بہاؤالدین ندوی صاحب فرماتے ہیں: ایک آدمی فوج میں ملازم ہو سکتا ہے، بشرطیکہ غیر اسلامی عمل کا مرتکب نہ ہو۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی رقم طراز ہیں: فوجی ملازمت کو ذریعہ معاش بنانے میں اعانت علی المعصیت ضرور ہے، مگر اسی وقت ممنوع ہوگی جب کہ حقیقۃً یا حکماً اس کا قصد ہو، لہٰذا ایسی فوج میں بھرتی ہونا جس کا مقصد مسلمانوں سے لڑنا ہو؛ خواہ لڑائی کی نوبت آئے یا نہ آئے جائز نہیں، یا پھر تقرری کے وقت ہی ظلم و زیادتی کو مشروط کر دیا جائے تو بھی جائز نہیں؛ ورنہ اگر معصیت کی نیت نہیں ہے تو فوجی ملازمت میں کچھ حرج نہیں۔

رہی بات کمانڈر کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر وار کرنے کی، تو مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی فرماتے ہیں: اگر مدمقابل مسلمان اپنے مطالبہ اور دعویٰ میں حق پر ہے، اور اس نے کوئی ظلم نہیں کیا، تو اس صورت میں مسلمان مدمقابل سے لڑنا جائز نہیں ہے اور اس نے تعدی اور ظلم کیا ہے تو اس سے لڑنا جائز ہے۔

مولانا قمر عالم صاحب فرماتے ہیں: ظلم میں اپنے کمانڈر کی اطاعت ضروری نہیں "لانه لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"۔

مولانا فاروق بارڈولی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر وار کرنا اگر عدم تمیز اور سد الباب الفتنہ ہو تو اس کی گنجائش ہے؛ تاکہ معاملہ فرو ہو جائے، اور بعض دفعہ ایک مسلمان فوجی کا ہم مذہب سے مقابل ہونا وہمی امر ہے جو نہ غالبی ہے اور نہ ضروری، اس لیے واقعی فائدہ کے ہوتے ہوئے صرف امر وہمی کی وجہ سے ملازمت کو ناجائز نہیں کہا جائے گا، تاہم صرف ہم مذہب پر گولی چلانے کا حکم ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی رقم طراز ہیں: اگر ایسے حالات آئیں کہ مسلمان فوجی کو مسلمان فوجی یا مسلم عوام پر حملہ کی نوبت آئے تو مسلمان فوجی کو ایسے کام میں شریک ہونا حرام ہوگا؛ حتی کہ اگر مکرہ بھی ہو تو بھی اس کے لیے مسلمان پر حملہ کرنا حد جواز میں نہیں آسکتا۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: کسی بھی مسلمان کے لیے ناحق قتل کی اجازت نہیں اور امیر اور کمانڈر کی اطاعت ایسے امور میں درست اور جائز نہیں جس میں شریعت کی خلاف ورزی لازم آئے۔

مولانا شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں: "فوجی اپنے کمانڈر کا تابع ہوتا ہے اور بعض دفعہ ہم مذہب پر وار کرنا پڑتا ہے" کو نظر انداز کرتے ہوئے اجتماعی مصلحت کے پیش نظر فوج کی ملازمت کرے؛ البتہ کسی مظلوم خصوصاً مسلمان مظلوم کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے سے بچے، خواہ اس کے لیے نقصان ہی کیوں اٹھانا نہ پڑے۔

مولانا عبدالتواب اناوی کے الفاظ ہیں: کمانڈر کے حکم کی پابندی اور بغیر تحقیق کے وار کی صورتیں کبھی کبھار ہوتی ہیں، جن کی مقدار اصل کام کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہیں۔

راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ حتی المقدور خود تو ظلم سے بچنا ہی ہے، چاہے مقابل مسلمان ہو یا غیر، لیکن غیر ظلم کرے تو اس وقت بھی حسب استطاعت مظلوم کی مدد اور ظالم کو ظلم سے روکنا ہے۔

سوال نامہ کا دوسرا جز (ب) یہ ہے کہ فوج ہی سے قریب دوسرا شعبہ پولیس کا ہے، جس کا بنیادی مقصد اندرون ملک میں امن وامان قائم رکھنا ہے، پولیس کو بھی بعض اوقات مظلوموں پر گولی چلانی پڑتی ہے، مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذا رسانی کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ اچھا انسان

بھی اس شعبہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی صحبت کی وجہ سے بدزبان اور ظلم و جور کا خوگر بن جاتا ہے؛ البتہ اگر پولیس میں مسلمان نہ ہوں تو اس سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان اور انصاف سے محرومی کا اندیشہ ہے؛ تو کیا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ میں بلازمت اختیار کرنا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تمام ہی مقالہ نگاروں کا کچھ شرائط کے ساتھ سابق میں ذکر کردہ قواعد فقہیہ کی روشنی میں جواز پر اتفاق ہے، ہاں! مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں کہ کسی کو اپنے بارے میں ظن غالب ہے کہ اسلامی حدود کی پاسداری اس کے بس میں نہیں رہ پائے گی تو اس کے لیے اس عہدے سے اجتناب لازم ہے، نیز مولانا محمد ثنا الہدیٰ قاسمی تحریر فرماتے ہیں: کیا ان محکموں (پولیس اور فوج) میں عورتوں کے لیے ملازمت کی اجازت ہوگی؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ان ملازمتوں میں عورتیں شرعی حدود کے ساتھ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتیں، اس لیے عورتیں نہ ہی پولیس محکمہ میں اور نہ ہی ٹریفک پولیس میں بحال ہوسکتی ہیں، کیوں کہ ان محکموں میں مردوں کے عمومی اختلاف سے بچا نہیں جاسکتا اور نہ ہی پردہ کے ساتھ امور کی انجام دہی کی جاسکتی ہے۔

تمام حضرات نے جو شرائط ذکر کی ہیں؛ وہ مجموعی طور پر درج ذیل ہیں:

☆ مسلمانوں کی حفاظت وصیانت نیز مسلمانوں سے دفع مضرت وجلب منفعت کے طور پر یہ ملازمت گوارا کرے۔ (مولانا فاروق بارڈولی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ غیر اسلامی نظام کو حالات کے پیش نظر بدرجہ مجبوری گوارا کرے۔ (مولانا رضوان الحسن مظاہری، راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ ظلم وزیادتی سے پرہیز کرے۔ (مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا قمر عالم رانچی اور مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)

☆ انصاف سے کام لے۔ (فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا قمر عالم رانچی، مولانا رضوان الحسن مظاہری)

☆ رشوت سے پرہیز کرے۔ (مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی)

☆ بدکلامی، بدزبانی اور غیر شرعی امور سے اجتناب کرے۔ (مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا شاہ جہاں ندوی)

☆ قول وعمل، حسن کردار اور مؤثر افعال سے عوام اور اس شعبہ کو فائدہ پہنچائے۔ (مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی) تاکہ لوگوں کے لیے ذریعہ اصلاح وہدایت بن سکے۔ (راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ (ڈاکٹر بہاؤالدین ندوی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ کسی کو غلط مقدمات میں پھنسانے یا غلط رپورٹ درج کروانے سے پرہیز کرے۔ (مولانا خورشید احمد اعظمی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ عہدے کا استعمال حمایت کے لیے کرے۔ (مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی)

☆ خلاف شریعت عمل سے اجتناب کرے اور استغفار کرتا رہے۔ (مولانا سلمان پالن پوری)

☆ اس میں شرکت کو ذاتی اغراض ومقاصد اور تشہیر کا ذریعہ نہ بنائے۔ (راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

مولانا محمد قمر عالم رانچی لکھتے ہیں: ظلم میں پولیس کے اعلیٰ افسر کی اطاعت ضروری نہیں، لانہ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق

سوال نامہ کا تیسرا جز (ج) یہ ہے کہ حکومت کا ایک شعبہ مخبری اور انٹیلیجنس بھی ہوتا ہے، ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے، لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ اس شعبہ میں ملازمت کرتے ہیں، انہیں تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات محض شبہ کی وجہ سے شریف شہریوں کے خلاف بھی ایسی کارروائی کی ضرورت پڑ جاتی ہے، ان حالات میں کیا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ میں ملازمت کرنا جائز ہوگا؟

مولانا قمر عالم رانچی اور مولانا ثنا الہدیٰ قاسمی مطلق بغیر کسی قید وشرط کے اس ملازمت کے جواز کے قائل ہیں۔

جب کہ درج ذیل حضرات المشقة تجلب التيسير، الضرورات تبيح المحظورات، اذا تعارض مفسدتان روعي اعظمهما ضررا بارتكاب اخفهما اور الضرر الاشد يزال بالضرر الاخف جیسے قواعد فقہیہ کی روشنی میں کچھ شرائط کے ساتھ جواز کے

قائل ہیں:

مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا فاروق بارڈولی، مولانا شاہ جہان ندوی، مولانا عبدالتواب اناوی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی۔

مذکورہ بالا حضرات جن شرائط کے ساتھ جواز کے قائل ہیں، وہ یہ ہیں:

☆ دفع شر یا تقلیل شر کی نیت سے ملازمت کرے۔ (مولانا سلمان پالن پوری، مولانا عبدالتواب اناوی)

☆ مسلمان کے لیے جلب مصالح اور دفع مضرات کی نیت سے اس شعبہ میں شرکت کرے۔ (مولانا اشتیاق احمد اعظمی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ محض ادنیٰ شبہ کی وجہ سے شہریوں اور مسلمانوں کے خلاف کارروائی نہ کرے اور بے قصوروں کو پھنسانے کے لیے فرضی رپورٹیں درج نہ کرے۔ (مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا شاہ جہان ندوی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ جرائم پیشہ لوگوں کی روک تھام کے لیے اور امن وامان قائم کرنے کی نیت سے اس شعبہ میں شرکت کرے۔ (مولانا فاروق بارڈولی)

☆ غلط تجسس اور غیبت کا ارتکاب نہ کرے۔ (مولانا ظفر عالم ندوی)

تو دوسری طرف مولانا رضوان الحسن مظاہری عدم جواز کے قائل ہیں، خود ان ہی کے الفاظ میں: جس نوکری یا ملازمت میں پابندی اجراء احکام غیر شرعیہ اور اجراء احکام ظلم وغیرہ کی ہو اور اس نوکری کرنے میں اکثر اوقات جھوٹ اور غیبت کا سہارا لینا پڑتا ہے، اس لیے مسلمان خاص طور پر اس ملازمت کو نہ اپنائے، قرآن مجید میں ہے: ومن لم یحکم بما انزل الله، فأولئك هم الظالمون. (دیکھئے مقالہ)

نیز مولانا فاروق بارڈولی افساد اور فتنہ پروری کی نیت سے اس شعبہ میں ملازمت کے عدم جواز کے قائل ہیں۔

رہا مسئلہ اس شعبہ میں غیبت اور تجسس کا جو شریعت کی رو سے ممنوع ہے، تو مجوزین حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ یہ دونوں عام حالات میں ممنوع ہے، البتہ وہ حالات جس میں غیبت وتجسس کی فی الحقیقت ضرورت ہو اور ان حالات کا اثر متعدی ہو، لازم نہ ہو تو اس وقت غیبت وتجسس کی اجازت ہوگی۔

ان کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب فرماتے ہیں: شرعی مصالح اور ملکی امن وامان کی خاطر مخبری کرنا اور جو لوگ مفاسد کی اصلاح پر قادر ہوں ان تک فساد پسند عناصر کی اطلاع پہنچانا جائز ہے، امام نوویؒ لکھتے ہیں: اعلم ان الغيبة تباح لغرض صحيح شرعي، لا يمكن الوصول اليه الا به، وهو ستة اسباب. (ریاض الصالحین) نیز محمد بن سلمہ کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ وہ سیدنا عمرؓ کے دور میں جانچ اور تحقیق کے منصب پر مقرر تھے۔ (الخلفاء الراشدون)

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی تحریر فرماتے ہیں: قال العلماء: تباح الغيبة في كل غرض صحيح شرعا حيث يتعلق طريقا الى الوصول اليه بها كالتظلم والاستعانة على تغيير المنكر والاستفتاء والمحاكمة والتحذير من الشر، ويدخل فيه تجريح الرواة والشهود، واعلام من له ولاية عامة يسيرة من هو تحت يده ... (فتح الباری: ۱۰/ ۷/ ۵۳، کتاب الادب)

سوال مذکور کا چوتھا جز (د) یہ ہے کہ انصاف کی فراہمی، ظلم وحق تلفی کی روک تھام اور نزاعات کو طے کرنے کے لیے عدلیہ کا نظام قائم ہے اور ہر مہذب معاشرہ کے لیے اس نظام کا وجود ناگزیر ہے، عدالتیں بنیادی طور پر دستور کی تشریح اور تصفیہ طلب واقعات میں ان کی تطبیق کا کام کرتی ہیں، اور یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہمارے ملک کا دستور یا قانون کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ بہت سے قوانین شریعت اسلامی سے متصادم بھی ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی نسبت سے عدالت کے رویہ کو بھی منصفانہ نہیں کہا جاسکتا، اگر عدالتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہوجائے تو اندیشہ ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بڑھ جائے گی، ان حالات میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے عدالتوں میں ملازمت کرنا درست ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات کچھ شرائط کے ساتھ جواز کے قائل ہیں، نیز اس نکتہ پر بھی اکثروں نے روشنی ڈالی ہے کہ مذکورہ ملازمت مسلمانوں کے جلب منفعت ودفع مضرت کے لیے اختیار کرے، ان حضرات کے اسمائے گرامی ہیں:

مولانا قمر عالم رانچی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا فاروق بارڈولی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا سلمان پالن پوری، مولانا ثناء الہدی قاسمی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا عبدالرشید قاسمی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی۔

ان حضرات کے دلائل یہ ہیں:

[۱] یجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کان کافرا۔ (درمختار)

[۲] یتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام۔

[۳] حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: جولوگ ان حکومتوں اور عہدوں کو اختیار کرتے ہیں، دیکھنا چاہیے کہ ان کے قبول نہ کرنے سے خود ان کو یا عام اہل اسلام کو کوئی ضرر شدید لاحق ہونا غالب ہے یا نہیں؟ پہلی صورت میں ان کا قبول کرنا جائز ہے، اور دوسری صورت میں اگر دفع ضرر ہو تو جائز اور اگر مالی یا جاہی نفع کے لیے ہو تو ناجائز۔

مذکورہ بالا حضرات نے جو شرائط ذکر کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ انصاف کی فراہمی اور ظلم وحق تلفی کی روک تھام کے لیے ہو۔ (مولانا قمر عالم رانچی، مولانا فاروق بارڈولی، مولانا ظفر عالم ندوی اور مولانا رضوان الحسن مظاہری)

☆ رشوت اور جانبداری جیسے امور سے اجتناب کرتا ہو اور ظالم یا کافر حکومت کی طرف سے اس پر کوئی دباؤ نہ ہو۔ (مولانا خورشید احمد اعظمی)

☆ غیر اسلامی نظام کی طرف سے ایک چبھن اور بے اطمینانی ہو اور موجودہ حالات کو مجبوری کے طور پر گوارہ کرے۔ (مولانا سلمان پالن پوری، مولانا رضوان الحسن مظاہری اور راقم الحروف اقبال محمد ٹنکاروی)

☆ غیر خدائی قانون کو ناپسند کرے اور دل میں یہ سمجھے کہ ہم اضطراری حالت میں کام کررہے ہیں۔ (مولانا شاہ جہاں ندوی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ مؤثر اعمال واخلاق اختیار کرے اور فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر فراموش نہ کرے، نیز منصب کو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور تشہیر کا ذریعہ نہ بنائے۔ (راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

مولانا شمس الدین مظاہری رقم طراز ہیں: اگر نیت میں فساد نہ ہو، ممکن حد تک اسلامی قوانین کے مطابق عمل کرنے کا پختہ ارادہ ہو، شریعت مطہرہ کے خلاف عمل کے ارتکاب سے اجتناب کی پوری کوشش ہو اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا پورا پورا عزم ہو تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے عدالتوں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں: غیر اسلامی عدالت کی ملازمت بھی جائز ہے، اس کا اصل مقصد انصاف دلانا ہے، نہ کہ ظلم کرنا، ظلم و عدوان قانون ملکی کی خلاف ورزی ہے، اس لیے اصل مقصود انصاف کی فراہمی ہے جو نیک مقصد ہے۔

لہٰذا اسی نیت سے یا محض کسب معاش کی غرض سے ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا؛ البتہ خلاف اسلامی قانون برتنا جائز نہ ہوگا؛ بلکہ ہر ایسے مرحلہ پر دوسرے کسی غیر مسلم عہدہ دار کو سپرد کردیا جائے وہی اس قانون کو نافذ کرے؛ تاکہ کسی مسلم کی طرف سے معاونت نہ پائی جائے، درمختار میں ہے:

یجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کافرا۔

ہاں! اگر ظن غالب ہے کہ اس پیشہ کو قبول کرنے سے وہ غیر اسلامی قانون اختیار کرنے پر مجبور ہوگا تو پھر جائز نہیں کہ اس پیشہ کو اختیار کرے،

فلو کان غالب ظنه انه یجور فی الحکم ینبغی ان یکون حراما۔ (شامی، ۵/۳۶۷)

مولانا فاروق بارڈولی بھی ظلم وجور کے ظن غالب ہونے یا اظہار حق سے حکومت کے مانع ہونے کی صورت میں عدم جواز کے قائل ہیں، مولانا خورشید احمد بھی اظہار حق سے روک ہونے یا دباؤ ہونے کی صورت میں حرمت کے قائل ہیں، الا اذا کان یمنعہ عن القضاء بالحق فیحرم۔ (شامی،۸/۴۴)

جب کہ دوسری طرف مولانا اشتیاق احمد اعظمی محکمۂ عدلیہ کی ملازمت میں جواز کے قائل نہیں ہیں، انہوں نے معاصر علماء کے تین طرح کے اقوال ذکر کئے ہیں: جواز، عدم جواز اور تفصیل بین الجواز وعدمہ، مذکورہ تیسری صورت یہ ہے کہ جن صورتوں میں معصیت کا لزوم واضح ہو وہاں عمل حرام ہوگا اور جن مواقع میں قاضی اور جج کے اجتہاد کی گنجائش ہو؛ اس میں عمل کی گنجائش ہوگی۔

مولانا اشتیاق احمد صاحب اسی تیسرے قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں: کیوں کہ حکم بما انزل اللہ واجب ہے، اور بغیر ما انزل اللہ والاحکم ناجائز اور حرام ہوگا، اس لیے غیر مسلم عدالتوں میں منصب قضاء کا قبول کرنا بہر حال احتیاط کے خلاف ہے، اولیٰ اور احوط یہی ہے کہ وضعی قوانین کی اسلامی شریعت کے مقابلہ میں بالادستی قبول نہ کی جائے۔

سوال کا پانچواں جز (ھ) یہ ہے کہ کوئی حکومت عوامی ٹیکس کے بغیر اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتی ٹیکس کی ایک صورت وہ ہے جس کو انکم ٹیکس کہا جاتا ہے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں انکم ٹیکس کی جو شرحیں رکھی گئی ہیں؛ وہ ظالمانہ ہیں، دوسرے عموماً اس ٹیکس کو ٹھیک طور پر عوامی فلاح پر استعمال نہیں کیا جاتا؛ بلکہ آمدنی کا بڑا حصہ حکمرانوں کی عیش کوشی اور انہیں دی گئی غیر معمولی سہولتوں پر خرچ کردیا جاتا ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ انکم ٹیکس کے لیے بعض اوقات لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تجسس بھی کرنا پڑتا ہے، لہٰذا کیا انکم ٹیکس کے شعبوں میں مسلمان ملازمت کرسکتے ہیں؟

مولانا قمر عالم رانچی اور مولانا ظفر عالم ندوی اس شعبہ میں مطلقاً ملازمت کے جواز کے قائل ہیں، ثانی الذکر فرماتے ہیں: اس میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنے میں کوئی حرج نہیں، عدم جواز کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے، شرحوں کا زیادہ ہونا یہ حکومت کی زیادتی تصور کی جائے گی؛ لیکن اہم ضروریات کے پیش نظر ٹیکس لیا جاتا ہے، اس لیے اس میں جواز کے بھی پہلو ہیں، لہٰذا اس محکمہ میں ملازمت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح اکثر حضرات نے کچھ شرائط وقیود کے ساتھ اس شعبہ میں ملازمت کی اجازت دی ہے، ان کے دلائل یہ ہیں:

☆ الامور بمقاصدھا

☆ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب میں اصولی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

البتہ کلام ضرورت میں ہے اور یہی اہم ہے، سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ ضرورت عرفی کی دو قسمیں ہیں: ایک تحصیل منفعت، خواہ دینی ہو یا دنیوی، اپنی ہو یا غیر کی، دوسری دفع مضرت، اسی تعمیم کے ساتھ، سو تحصیل منفعت کے لیے تو ایسے افعال کی اجازت نہیں، اور دفع مضرت کے لیے اجازت ہے۔ (امداد الفتاوی، ۳/۴۰۸)

☆ ویوجر من قام بتوزیعھا بالعدم بان یحمل کل واحد بقدر طاقتہ لأنہ لو ترك توزیعھا إلی الظالم ربما یحمل بعضھم مالا یطیق فیصیر ظلما علی ظلم، ففی قیام المعارف بتوزیعھا بالعدل تقلیل للظلم. فلذا یوجر۔ (ردالمحتار، ۲/۶۲)

☆ راقم الحروف نے مذکورہ تمام شعبوں کے لیے ایک دلیل وہ بھی پیش کی ہے، جو حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے احکام القرآن (سورۂ قصص) میں ذکر کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

واما فی زماننا الذی اشتد علی الناس الاجتناب من الحرام الصریح لتسلط الکفار والفجار علی سائر المکاسب، والمسلمون مضطرون الی رخص یترخصون بھا فی کسب المعاش ھذرا من الوقوع فی اشد منہ۔

وحاصل کلام حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالی فی "صائب الکلام": أن اختیار ھذہ المناصب المحرمۃ لجلب المنفعۃ لنفسہ او لغیرہ حرام کما ھو حقیقۃ ھذہ المناصب، الا انہ ان ارید بہ دفع المضرۃ عن نفسہ وعن المسلمین، فیرجی ان لا

يلحقه به اثم، لكونه اختيار لأهون البليتين واخف الضررين كما هو معروف فى قواعد الاشباه والنظائر۔

والحاصل ان الاجتناب عن الخدمة الظلمة والكفرة اية خدمة كانت اولى واحفظ لدين الرجل ما امكن دفع الضرر عن نفسه والمسلمين بدونها، واما عند الاضطرار فالمرجو من كرمه سبحانه وتعالى ان لا يوخذ به عباده، ولاسيما فى الخدمات التى ليست من قبيل الاعانة، ولا من قبيل التسبب بالسبب القريب؛ بل لها تسبب فى المعصية بالسبب البعيد۔ والله الموفق للصواب والسداد۔

ان حضرات نے جو دلائل ذکر کیے ہیں؛ وہ ملاحظہ ہوں:

☆ اس میں شرکت جمیع المسلمین کے جلب مصالح اور دفع مضرات یا تقلیل مضرات کے لیے ہو۔ (مولانا سلمان پالن پوری، مولانا عبد التواب اناوی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ بلاوجہ لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تجسس نہ کریں اور عدل وانصاف کی پابندی کریں۔ (مولانا شاہ جہاں ندوی)

☆ جہاں تک ہوسکے خود تو ظلم سے بچنا ہی ہے، لیکن دوسرا کوئی ظلم کرے تو مظلوم کی مدد اور ظالم کو ظلم سے روکنا ہے، اور رشوت سے بھی بچے۔ (مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا عبد الرشید قاسمی اور راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

☆ انکم ٹیکس کی شرحیں کم کروانے کی کوشش کریں اور اس کے صحیح استعمال کی طرف بھی حکام کو توجہ دلائیں۔ (مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی)

☆ فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ساتھ مؤثر اعمال واخلاق اختیار کرے؛ تاکہ لوگوں کے لیے ذریعۂ اصلاح وہدایت بن سکے اور اس ملازمت کو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور تشہیر کا ذریعہ نہ بنائے، اس ملازمت کی وجہ سے مسلم معاشرہ یا اپنے علاقہ کے لوگوں کا استحصال نہ کریں۔ (راقم الحروف اقبال ٹنکاروی)

مولانا رضوان الحسن مظاہری علی وجہ الظلم اس شعبہ میں ملازمت کے عدم جواز کے قائل ہیں، لیکن ایک صورت میں وہ جواز کے قائل ہیں، خود ان کے الفاظ میں: "اس شخص کے لیے جو معاشی اعتبار سے بالکل مفلوج ہو، کوئی دوسرا ذریعۂ معاش حاصل نہ ہو، اور اگر وہ ملازمت ترک کردے تو فاقہ کا اندیشہ ہو، ہاں! یہ مجبوری کے درجہ میں ہے، متبادل مل جانے پر ترک کردے۔"

تو دوسری طرف بعض حضرات نے علی وجہ الظلم وتعاون علی ترویجہ اس ملازمت میں شرکت کو ناجائز قرار دیا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا فاروق بارڈولی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی اور مولانا خورشید احمد اعظمی۔

انہوں نے درج ذیل دلائل کی روشنی میں ممنوع قرار دیا ہے:

☆ دفع النائبة اى ما يتوجه من جهة السلطان من حق او باطل اوغيره

☆ والظلم على نفسه اولى۔ (درمختار)

☆ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان

☆ لا يدخل الجنة صاحب مكس۔ (سنن ابوداؤد)

مولانا فروغ احمد لکھتے ہیں: اگر حکومت ٹیکس وصول کرے لیکن صحیح مصرف میں خرچ نہ کرے تو ایسے ادارے سے انسلاک تعاون علی المعصیۃ ہے، اس کو برداشت اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ مفاد عامہ میں ہوتا، لیکن یہ مفاد عامہ کے حق میں نہیں ہے، اس لیے ایسی ملازمت جائز نہیں۔

مولانا شاہ جہاں ندوی صاحب ایک صورت میں اس شعبہ میں ملازمت کے عدم جواز کے قائل ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں: البتہ اگر ظالمانہ شرح ٹیکس اور اس کے غلط استعمال کا کسی کو یقین ہو تو اس کے حق میں یہ ملازمت درست نہیں ہے۔

☆☆☆

مختلف النوع ملازمتیں اوران کے شرعی احکام

سوال ـ ۲ (الف، ب، ج)

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی[1]

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله الكريم اما بعد!

"مختلف النوع ملازمتیں اوران کے شرعی احکام کے سوال نمبر ۲ (الف، ب، ج)" میں ان ملازمتوں سے متعلق سوالات اٹھائے گئے تھے، جن کا سرکاری ہونا ضروری نہیں، لیکن وہ بنیادی طور پر محرمات پر مبنی ہیں، اس سوال سے متعلق کل اٹھارہ مقامات (مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا سلمان پالن پوری قاسمی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، ڈاکٹر بہاء الدین ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا محمد فاروق، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا قمر عالم قاسمی، مفتی جنید عالم ندوی اورراقم الحروف محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کے) اسلامی فقہ اکیڈمی کوموصول ہوئے۔

ان مقالہ نگاروں میں مولانا قمر عالم قاسمی نے سوال نمبر ۲ کے کسی بھی شق کا اورڈاکٹر بہاء الدین ندوی نے اس سوال کے شق "ب" اور "ج" کا جواب تحریر نہیں فرمایا ہے، بقیہ تمام مقالہ نگاراس بات پر متفق ہیں کہ ایسے اداروں کی ملازمت جن کا کام بنیادی طور پر محرمات پر مبنی ہے اور بلاواسطہ اس ملازمت کے نتیجہ میں حرام کاموں میں شمولیت ہوتی ہے، درست نہیں ہے، اور یہ تعاون علی الاثم کے ذیل میں آتا ہے۔ مقالہ نگاروں نے عمومی طور پران آیات اوراحادیث کا ذکر کیا ہے۔

☆ أحل الله البيع وحرم الربوا۔(بقرة:۲۷۵)

☆ يا ايها الذين امنوا لا تاكلوا الربوا اضعافا مضاعفا۔(آل عمران:۱۳۹)

☆ يا ايها الذين امنوا اتقو الله وذروا ما بقى من الربوا۔(بقرة:۲۷۸)

☆ عن جابر قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا ومؤكله وكاتبه و شاهديه وقال: هم سواءً (مسلم،۲/۲۷)
مولانا شمس الدین مظاہری، محبوب فروغ احمد قاسمی، محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، سلمان پالن پوری۔

☆ درهم ربوا ياكله الرجل وهو يعلم أشد من ستة وثلاثين زنية (مجمع الزوائد ۴/۱۱۷) شمس الدین مظاہری

☆ كون الاجر الذى يحصل عليه العامل فى هذه البنوك من الكسب الخبيث لخبث مصدره وهو الربوا الذى يمثل النسبة الغالبية على ارباح البنوك (نوازل فقہیہ ص ۷۰) مولانا اشتیاق احمد اعظمی

☆ العبرة فى العقود للمقاصد والمعانى دون الالفاظ والمبانى (قواعد الفقہ ص ۹۱) شمس الدین مظاہری

سوال میں یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ اگر ایک شخص پیسے کے لین دین اور سودی حسابات کو لکھنا نہ ہو بلکہ کوئی اور کام کرتا ہو جیسے: بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا، کیا یہ صورتیں بھی سودی معاملات کے تعاون میں شمار کی جائیں گی یا اس نوعیت کی ملازمت جائز ہوگی؟

---

[1] نائب ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

مولانا اقبال احمد ٹنکاروی کی رائے ہے کہ بینک کی نوکری کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، خواہ اس کا ضمیر اس پر مطمئن نہ ہو۔ ان کی رائے میں کسی اسٹاف کے نوکری چھوڑ دینے سے اس سودی نظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور غیر مسلموں کا غلبہ ہوجائے گا، جو خطرناک ہے۔ جبکہ مولانا شمس الدین مظاہری نے بینک کی ہر قسم کی ملازمت کو ناجائز اور کم از کم مکروہ لکھا ہے۔ ان کی دلیل ہے کہ شریعت مطہرہ میں ذرائع اور وسائل کو عین شی کا حکم دیا جاتا ہے۔ شامی میں ہے "وما کان سببًا لمحظورٍ فهو محظور" (شامی، ج ٦ ص ۳۵۰)۔ شاہ جہاں ندوی، مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا محمد فاروق اور مفتی ظفر عالم ندوی کی بھی یہی رائے ہے۔

ان کے علاوہ بیشتر مقالہ نگاروں نے بینک کی ایسی ملازمت کو جن کا تعلق براہ راست سودی کاروبار سے نہ ہو جائز لکھا ہے۔ (محبوب فروغ احمد قاسمی، محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، عبدالرشید قاسمی، رضوان الحسن مظاہری، خورشید احمد اعظمی، عبدالتواب اناوی، سلمان پالن پوری، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی جنید عالم ندوی)

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

☆ "رجل اجر بيتًا ليتخذ فيه بيت نارٍ او بيعةٍ او كنيسة او يباع فيه الخمر فلا بأس فيه وكذا كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار۔" (خلاصة، ج ۴، ص ۳۷۷) محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، اقبال احمد ٹنکاروی، عبدالتواب اناوی۔

☆ "وجاز تعمير كنيسةٍ وحمل خمر ذمّي بنفسه او دابته باجرٍ۔" (درمختار، ۹/ ۵۶۲) مفتی جنید عالم ندوی، عبدالرشید قاسمی۔

☆ "ولو استأجر الذمى مسلمًا ليبني له بيعةً او كنيسةً جاز ويطيب له الاجر كذا فى المحيط" (عالمگیری، ج ۴، ص ۴۵۰، کتاب الاجارۃ) مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، خورشید احمد اعظمی۔

☆ "اذا استأجر الذمى من المسلم بيتًا فيه الخمر جاز عند ابي حنيفة خلافًا لهما" (عالمگیری، کتاب الاجارۃ، ۴/ ۴۹۴) مولانا عبدالتواب اناوی۔

☆ "ولو اجر نفسه ليعمل فى الكنيسة ويعمرها لا بأس به لانه لامعصية فى عين العمل" (ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ، ۹/ ۴۷۷) مولانا عبدالتواب اناوی۔

☆ "لان المسلم لا يواجرها لذالك انما آجرها للسكنى كذا فى المحيط" (عالمگیری، ۴/ ۴۵۰) خورشید احمد اعظمی۔

☆ "مالم يتصل بهذه العقود بوجه كالعمل فى مجال تغيير العملة او تقديم الخدمات العامة للبنك كالحراسة والصيانة ونحو ذلك فالسواد الاعظم من المفتيين على الترخص فى ذلك عند الحاجة و التورع عند انعدامها" (نوازل فقہیہ، ص ۴۷) اشتیاق احمد اعظمی۔

ڈاکٹر بہاء الدین ندوی نے لکھا ہے کہ کمپیوٹر کی مرمت کی اجرت بینک اگر سودی رقم سے دیتا ہے تو حرام ہے، کیوں کہ فقہاء لکھتے ہیں: "ويكره معاملة من بيده حلالٌ و حرامٌ وان غلب الحرام الحلال نعم ان علم بتحريم ما عقد به حرم وبطل" (فتح المبین)۔

جن حضرات نے براہ راست سودی کاروبار کے علاوہ کی ملازمت کو جائز لکھا ہے، ان کے نزدیک آیات قرآنی واحادیث مقدسہ کا تعلق ان افراد سے ہے جو براہ راست سودی معاملات سے جڑے ہوئے ہوں، البتہ ان حضرات کے یہاں بھی ایسی ملازمتوں سے احتراز بہتر اور احوط ہے۔ کئی مقالہ نگاروں نے ابتداءً ایسی ملازمتوں کے حصول سے احتراز کو بہتر قرار دیا ہے، البتہ بقاءً ایسی ملازمتوں کو جب تک کوئی دوسری سبیل حصول معاش کی نہ نکل آئے ترک کرنے سے منع کیا ہے۔

اس سوال کے دوسرے شق "ب" میں دریافت کیا گیا تھا کہ انشورنس کمپنی کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ کیا انشورنس کی تمام صورتوں کے لیے ایک ہی حکم ہے یا ان میں کچھ فرق ہے؟ نیز کسی شخص کا انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے یا نہیں؟

اس شق کے جواب میں بیشتر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ انشورنس کمپنی کا کاروبار ربوا اور قمار پر قائم ہے اور ان دونوں کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔ اس لیے انشورنس کمپنی کی ملازمت اور اس کا ایجنٹ بننا گناہ کے کاموں میں تعاون دینے کی وجہ سے ناجائز اور باعث گناہ ہے۔ (مفتی جنید عالم ندوی، محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، اشتیاق احمد اعظمی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، سلمان پالن پوری قاسمی، خورشید احمد قاسمی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محمد فاروق،

ظفر عالم ندوی، محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

اس سلسلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ انشورنس کی وہ صورتیں جو ربوا اور قمار پر مبنی نہیں ہیں، ان میں ملازمت جائز ہے اور اس کا ایجنٹ بننا بھی درست ہے۔ (مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبدالتواب اناوی، عبدالرشید قاسمی، محبوب فروغ احمد قاسمی)

مولانا شمس الدین مظاہری نے سرکاری انشورنس جو جبراً تنخواہ سے وضع کر لی جاتی ہیں اور حادثہ سے متعلق انشورنس کا شمار ان صورتوں میں کیا ہے جن میں ربوا اور قمار نہیں پایا جاتا ہے۔

بظاہر یہ دو نقطۂ نظر ہیں؛ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شق کے جواب میں مقالہ نگاروں کے مابین اصولی اختلاف نہیں ہے، جو لوگ انشورنس کمپنیوں کی ملازمت اور ایجنٹ بننے کے عدم جواز کے قائل ہیں، وہ اس کی علت ربوا اور قمار کو قرار دیتے ہیں، اس لیے جن صورتوں میں ربوا و قمار فرضی نہیں، بلکہ حقیقی طور پر نہیں پایا جائے تو یہ صورت ان کے یہاں بھی جائز ہوگی کیوں کہ عدم جواز کی جو علت تھی وہ نہیں پائی جارہی ہے۔ اسی طرح جن مقالہ نگاروں نے بعض صورتوں میں جواز کی رائے دی ہے اگر ربوا و قمار ان صورتوں میں بھی متحقق ہو تو ان کے نزدیک بھی عدم جواز کا فتویٰ دیا جائے گا۔ البتہ ضرورتاً اور بقاءً ملازمت کرتے رہنے اور ایجنٹ بنے رہنے کی اجازت ہوگی اور کہا جائے گا کہ متبادل ملازمت کی تلاش خلوص سے جاری رکھے اور توبہ واستغفار کرتا رہے۔ (مفتی جنید عالم ندوی، محمد ثناء الہدیٰ قاسمی)۔

اس سوال کے شق "ج" میں دریافت کیا گیا تھا کہ کچھ لوگ شراب کی کمپنی میں شراب کے لین دین میں نہیں رہتے ہیں، لیکن حساب کتاب لکھتے ہیں یا شراب کی کمپنی کو وہ اجزاء پیش کرتے ہیں جن سے شراب بھی بنائی جاتی ہے تو شراب کی کمپنی کے ان مختلف کاموں میں ملازمت کا حکم یکساں ہے یا ان میں حکم کے اعتبار سے کچھ فرق بھی ہوگا؟

اس سلسلہ میں ایک رائے تو یہ ہے کہ شراب کی کمپنی میں کسی بھی قسم کی ملازمت خواہ وہ بوتل بنانے کی ہو ناجائز، حرام اور باعث گناہ ہے، اور سب کا حکم یکساں ہے۔ (مفتی جنید عالم ندوی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، سلمان پالن پوری قاسمی، اشتیاق احمد اعظمی) اس لیے کہ حرام تک پہنچانے والا وسیلہ بھی حرام ہے۔ (ظفر عالم ندوی) شراب کی تیاری میں کسی طرح کا بھی تعاون صرف ایک کام میں تعاون نہیں بلکہ شراب کے نشے میں وقوع پذیر ہونے والے بہت سارے حرام کاموں میں تعاون ہے (مظاہر حسین عماد قاسمی)۔

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

* "یا ایہا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب الازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون" (المائدہ: ۹۰) مظاہر حسین عماد قاسمی
* "عن انس بن مالك: لعن رسول الله ﷺ فی الخمر عشرۃ عاصرها و معتصرها وشاربها وحاملها والمحمول اليه وساقيها و بائعها وآكل ثمنها و المشتری لها والمشتری له" (مولانا محمد فاروق، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، محمد ثناء الهدی قاسمی، شمس الدین مظاہری)
* "عن جابر: انه سمع رسول الله ﷺ يقول عام الفتح وهو بمكة: ان الله ورسوله حرم بيع الخمر" (مشکوۃ: ۱/۲۴۲) شمس الدین مظاہری۔
* "بيع اشياء ليس لها مصرف إلا فی المعصية ...... ففی جميع هذه الصور قامت المعصية بعين هذا العقد، والعاقد ان كلاهما آثمان" (جواہر الفقہ، ۲/۴۴۸) شمس الدین مظاہری۔

اس سلسلہ میں دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بالواسطہ ملازمت درست ہوگی یعنی شراب میں استعمال ہونے والی اشیاء کی شراب کی کمپنیوں کے ساتھ تجارت، ایسی کمپنی میں ملازمت؛ جس میں شراب کے لیے بھی بوتلیں تیار ہوتی ہیں اور بوتل بنانے والے کی نیت معصیت کی نہ ہو تو یہ صورت جائز ہوگی اور احناف کے یہاں اس کی گنجائش ہے، کیوں کہ اس صورت میں فعل معصیت کا ارتکاب فاعل مختار سے نہیں ہو رہا ہے۔ (محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، محبوب فروغ احمد قاسمی، عبدالرشید قاسمی،

مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا عبدالتواب اناوی)۔

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

☆ "واذا استاجر الحربی مسلمًا لیحمل له خمرًا ولم یقل لیشرب أو قال: لیشرب جازت الاجارة فی قول ابی حنیفة خلافًا لهما۔" (عالمگیری، ۴/ ۴۴۹) محبوب فروغ احمد قاسمی، خورشید احمد اعظمی، اقبال احمد ٹنکاروی۔

☆ "جاز بیع العصیر من خمار، لأن المعصیة لا تقوم بعینه بل بعد تغییره" (البحر الرائق، ۸/ ۲۰۲) محبوب فروغ احمد قاسمی۔

☆ "ولا باس ببیع العصیر ممن یعلم انه یتخذه خمرًا لأن المعصیة لاتقام بعینه بل بعد تغییره بخلاف بیع السلاح فی ایام الفتنة لأن المعصیة تقوم بعینه ... وقال: ومن آجر بیتا لیتخذ فیه بیت نار أو کنیسة أو بیعة أو یباع فیها الخمر بالسواد فلا بأس به وهذا عند ابی حنیفة" (ہدایہ، ۴/ ۴۵۶، درمختار مع الشامی، ۹/ ۵۶۰) مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، عبدالرشید قاسمی۔

☆ "ان بیع العصیر ممن یتخذه خمرًا و ان قصدبه التجارة فلا یحرم وان قصد به لاجل التخمیر حرم" (الاشباہ والنظائر، ص ۴۳) مفتی جنید عالم ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد ثناء الہدیٰ قاسمی۔

☆ "وله ان الاجارة علی الحمل وهو لیس بمعصیة ولا سبب لها وإنما تحصل المعصیة بفعل فاعل مختار ولیس الشرب من ضرورات الحمل لان حملها قد یکون للاراقة أو للتخلیل" (شامی، ۹/ ۵۶۲) مفتی جنید عالم ندوی، خورشید احمد اعظمی، عبدالرشید قاسمی۔

☆ "لکن الإعانة فی ما قامت المعصیة بعین فعل المعین ولا یتحقق الابنیة الإعانة أو التصریح بها أو تعیینها فی استعمال هذا الشئی بحیث لا یحتمل غیر المعصیة" (جواہر الفقہ، ۲/ ۴۵۰) شمس الدین مظاہری۔

مولانا خورشید احمد اعظمی کے نزدیک شراب کی کمپنی میں حساب کتاب لکھنے کی ملازمت کرنا بھی جائز معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اس سے براہ راست شراب نوشی کا تعاون نہیں ہوتا۔

"وان استأجر لیکتب له غنا بالفارسیة أو بالعربیة فالمختار انه یحل لان المعصیة فی القرأة۔" (عالمگیری، ۴/ ۴۵۰)

جو کام فی نفسہ جائز ہیں ان میں شراب کی کمپنیوں میں بھی ملازمت جائز ہوگی، جیسے الیکٹریشن کی ملازمت، اے سی وغیرہ کے کام یا چوکیداری، یہ کام بذات خود جائز ہیں، لہٰذا ان کی اجرت بھی جائز ہوگی۔ (مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی)

ان آراء اور دلائل کی روشنی میں سیمینار کو طے کرنا ہے کہ "اعانة علی المعصیة" کے ذیل میں کون کون سی ملازمت اور کس قسم کا تعلق آتا ہے، نیز کون کون سی صورتیں اعانت کے سبب بعید ہونے کی وجہ سے جائز ہوں گی۔ بقول حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب: "ان فی الاعانة درجات متفاوتة واختلاف الاحکام بحسب اختلاف الدرجات"

☆☆☆

مختلف النوع ملازمتیں اوران کے شرعی احکام

سوال نمبر ۳

مولانا خورشید احمد اعظمی [1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کے بیسویں فقہی سمینار کے ایک موضوع "مختلف النوع ملازمتیں اوران کے شرعی احکام" کے سوال نمبر ۳ کا تعلق کچھ ایسے کاروبار کی ملازمتوں کے حکم سے ہے، جن کا اصل مقصد حرام کام کرنا نہیں ہے، لیکن ضمنی طور پر اس میں حرام کام بھی کئے جاتے ہیں، جیسے:

الف۔ سپر مارکیٹ جس میں زندگی کی مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں، اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے، ایسے سپر مارکیٹ کی ملازمت کرنا درست ہے یا نہیں؟

اس موضوع پر کل سترہ مقالے موصول ہوئے، جن میں سے پندرہ اصحاب مقالہ نے اس ملازمت کے متعلق اپنی آراء ظاہر کی ہیں جو جواز اور عدم جواز دونوں پر مشتمل ہیں، اور عدم جواز کی وجوہات الگ الگ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ سپر مارکیٹ میں خاص گوشہ شراب کی ملازمت، اس کے عدم جواز کی صراحت اگر چہ صرف دو مقالہ نگار، مولانا محمد فاروق اور مولانا عبدالرشید صاحبان نے کیا ہے، لیکن بقیہ حضرات کے مقالہ میں مذکور تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم متفق علیہ ہے اور عدم جواز کی وجہ ظاہر ہے۔

۲۔ دوسرا قول عقد ملازمت کے اعتبار سے ہے، یعنی عقد ملازمت میں یہ بھی شرط ہو کہ دیگر امور کے ساتھ شراب بھی فروخت کرنی ہوگی تو ملازمت جائز نہیں، مولانا محمد فاروق صاحب کے نزدیک عقد مخلوط بالمعصیۃ ہونے کی وجہ سے اور مولانا محبوب فروغ نے لکھا ہے کہ تعاون علی الاثم کی وجہ سے ملازمت ناجائز لیکن تنخواہ حلال ہوگی، جواز کے لیے بطور دلیل البحر الرائق کی عبارت: "وحمل خمر الذی بأجر یعنی جاز ذلك وھذا عند الإمام"، اوراس کی توجیہ "وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية" ذکر کی گئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عقد ملازمت میں بیع خمر کا معاملہ ہے نہ کہ حمل خمر کا، اور بیع خمر پر اجرت کا جواز شاید امام سے منقول نہ ہو، نیز بیع خمر معصیت ہے، اور معصیت پر اجارہ جائز نہیں، "ولا لأجل المعاصي مثل الغنا والنوح والملاهي ولا اخذ بلا شرط يباح" (درمختار، ۹/ ۷۵)۔

۳۔ تیسرا قول ملازم کے عمل کے اعتبار سے ہے، یعنی اس قول کے حاملین نے نوعیت عقد کا ذکر کئے بغیر اپنی رائے اس طور پر ظاہر کیا ہے کہ سپر مارکیٹ میں حلال اور مباح اشیاء کے ساتھ، شراب یا حرام اشیاء کی فروخت وغیرہ کا کام بھی کرنا پڑے تو ملازمت جائز نہیں ہے، ورنہ جائز ہے، یہ رائے مولانا اقبال احمد صاحب کی اس صورت میں جبکہ سپر مارکیٹ کا مالک غیر مسلم ہو، مولانا عبدالتواب صاحب نے لکھا ہے کہ شراب کی خرید وفروخت سے ملازمت میں شبہ ہوگیا، اور مفتی رضوان الحسن نے عدم جواز کی وجہ تعاون علی الاثم قرار دیا ہے، جبکہ مولانا شاہجہاں ندوی نے بطور دلیل اس حدیث کا ذکر کیا ہے جس میں شراب، اس کے پینے والے، اٹھانے والے اور بیچنے والے وغیرہم پر لعنت کا ذکر ہے، مولانا اشتیاق احمد صاحب نے تعاون علی الاثم اور مذکورہ حدیث کے ساتھ حدیث پاک "ان الذی حرم شربھا حرم بیعھا" کا بھی ذکر کیا ہے، اور مولانا شمس الدین صاحب نے ان سب کے ساتھ آیت کریمہ "انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل

---

[1] محلہ رگوناتھ پورہ، مئو۔

الشیطان فاجتنبوہ"، نیز فقہی عبارت "وما کان سببا لمحظور فھو محظور" سے اپنے قول کو مؤید کیا ہے، مولانا سلمان قاسمی نے شراب کا گوشہ بھی لازم سے متعلق ہونے کی صورت میں ملازمت کو ناجائز لیکن خالص ناجائز ملازمت سے غنیمت قرار دیا ہے، اور یہ تعبیر انہوں نے فتاویٰ محمودیہ کے ایک فتویٰ سے مستعار لیا ہے جو پریس میں جائز چیزوں کے ساتھ تصاویر چھاپنے سے متعلق ہے، اور مولانا مظاہر حسین عماد نے اس صورت میں بھی ملازمت کو ناجائز کہا ہے جبکہ سپر مارکیٹ کے حلال وحرام دونوں گوشوں کا حساب وکتاب ایک ہی ہو، اس لیے کہ یہ تعاون علی الاثم ہے، مولانا کی یہ رائے تقویٰ پر محمول ہونا زیادہ اقرب ہے، ورنہ تو مخلوط مال میں اعتبار غالب کا کیا گیا ہے۔

۴۔ چوتھا قول مولانا اقبال احمد صاحب کا ہے جنہوں نے دوکان مالک کا بھی لحاظ کیا ہے، لکھا ہے کہ اگر یہ سپر مارکیٹ مسلمان کا ہے تو وہاں کسی طرح کی ملازمت جائز نہیں، مولانا نے مسند الفردوس کی حدیث: "الخمر حرام وبیعھا حرام وثمنھا حرام"، نیز المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی کی ایک عبارت نقل کیا ہے جس کا ایک فقرہ ہے: "لأنہ (بیع الخمر والخنزیر) حرام لعینہ، ألا تری انہ لو وجد من المسلم کان حراما ومعصیۃ"، نیز فتاویٰ محمودیہ سے یہ ایک فتویٰ بھی نقل کیا ہے جس میں یہ تحریر ہے کہ "یہ کارخانہ اگر مسلمان کا ہے تو اس کی سب ملازمتیں حرام ہوں گی"، مگر یہ فتویٰ ایک ایسے استفتاء کا جواب ہے جس میں خالص شراب کے ایک کارخانہ کی ملازمت کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے، جس میں شراب تیار اور اس سے سپلائی کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ کاروبار اصلاً خالص حرام کاروبار پر مبنی ہے، اور یہاں سوال ایسے مارکیٹ کی ملازمت کا ہے جس کا اصل یا اکثر کاروبار جائز اور حلال اشیاء کا ہے اور اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے، اور فقہ کی کتابوں میں یہ صراحت ملتی ہے کہ جس کا اکثر مال حلال ہو اس کی ضیافت اور ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے۔

"لان اموال الناس لا تخلو عن قلیل حرام فالمعتبر الغالب" (عالمگیریہ، ۵/۳۴۲)

"مالم یتعین انہ من حرام" (فتاویٰ بزازیہ علی ہامش العالمگیریہ، ۶/۳۶۰)، لہٰذا سپر مارکیٹ جس میں اکثر جائز اشیاء کے ضمن میں شراب بھی فروخت ہوتی ہے، اس کا مالک مسلمان ہو تب بھی اگر ملازم شراب کی فروخت کا کام نہ کرتا ہو تو یہ ملازمت اور اس کی اجرت درست ہونی چاہئے۔

۵۔ بقیہ جن مقالہ نگاروں نے اس ملازمت کے جواز کا قول نقل کیا ہے انہوں نے ملازم کے اکثر عمل یا مارکیٹ کی اکثر اشیاء کا اعتبار کیا ہے، چنانچہ غالب کاروبار کے جائز اور مباح ہونے اور اس کے ضمن میں بعض ممنوع چیزیں ہونے کی وجہ سے "للاکثر حکم الکل" کے ضابطہ سے گنجائش کی بات کہی ہے۔

مولانا ظفر عالم ندوی اور مولانا عبدالرشید صاحبان نے سلیس مینی کے علاوہ دیگر ملازمتوں کو بلا مضائقہ قرار دیا ہے، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے لکھا ہے کہ ان (ممنوعہ) کاموں کو براہ راست نہ کرنا پڑتا ہو یا بہت کم اس کی نوبت آتی ہو تو ایسی ملازمت جائز ہے، استشہاد میں فتاویٰ محمودیہ کا ایک فتویٰ ذکر کیا گیا ہے کہ "اگر جائز کام کے مقابلہ میں دوسرا کام کم ہے تو اپنی ملازمت ترک نہ کریں"، مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی صاحب نے سپر مارکیٹ کی ملازمت کو فی نفسہ جائز کہتے ہوئے ملازم کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے گوشہ شراب سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور خورشید احمد اعظمی نے بھی ملازمت کو اور ماہانہ اجیر ہونے کی وجہ سے اس کی اجرت کو جائز کہا ہے، البتہ شراب کی خرید وفروخت اور حمل ونقل کا ارتکاب کی اتو گنہگار ہوگا، اور حدیث میں مذکورہ وعید کا مورد ہوگا، لیکن اجرت جائز ہوگی کیونکہ ملازمت فی نفسہ جائز کاموں کے لیے ہے۔

خلاصہ عرض یہ ہے کہ ایسے سپر مارکیٹ میں ملازم کا کام گوشہ شراب سے متعلق نہیں ہے، تو تقریباً سبھی مقالہ نگار کا اتفاق ہے کہ ملازمت جائز ہے، مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے برائی کے مشاہدہ کی جگہ ملازمت کو مکروہ تنزیہی کہا ہے، "فان مشاھدۃ الباطل مشارکۃ فیہ: قول القاضی فی تفسیر قولہ تعالیٰ: والذین لا یشھدون الزور" (البحرالرائق، ۷/ ۲۱۳)، اگرچہ کبھی اسے گوشہ شراب کا بھی کام نبھانا پڑ جائے، کیونکہ فقہاء نے "اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام" سے اموال الناس کی مستثنیٰ کیا ہے، اور اس میں غالب کا اعتبار کیا ہے۔

(دیکھا جائے الاشباہ والنظائر، فتاویٰ بزازیہ، فتاویٰ عالمگیریہ)۔

ب۔ دوسرا مسئلہ ملازمت تدریس کا ہے، ایسے اداروں میں جن میں مخلوط تعلیم کا نظام ہو یا جنس مخالف کو تعلیم دینا ہو۔

۱۔ اس ملازمت کے بارے میں ایک قول تو عدم جواز کا ہے، جس کے قائل مولانا قمر عالم قاسمی صاحب ہیں، عدم جواز کا سبب برائیوں میں ابتلاء کا قوی امکان ہے، اور دلیل کے طور پر آیت غض بصر، آیت کریمہ: "وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى" اور احادیث رسول "إن الشيطان يجري من الإنسان مجرى الدم، النظر سهم مسموم من سهام إبليس" کے ساتھ رسم المفتی کی عبارت "العمل بالعرف مالم يخالف الشرع" کا ذکر کیا ہے، یعنی مخلوط تعلیم یا غیر جنس کی تدریس کا کثرت سے رواج اس کے جواز کی گنجائش نہیں نکال سکتا، لیکن اگر یہ تعلیم غض بصر اور پردہ کے ساتھ ہو تو گنجائش ہے یا نہیں؟ مولانا نے اس کے متعلق خاموشی اپنائی ہے۔

۲۔ دوسرا قول جواز کا ہے، مولانا عبدالرشید صاحب لکھتے ہیں: تدریس ہی کیوں؟ کون سی ایسی جگہ ہے جہاں اختلاط نہ پایا جاتا ہو، عدم جواز کا حکم وسائل روزگار کو بند کردے گا، مخلوط تعلیم کی تدریس میں فتنہ کم، بدنگاہی کا احتمال زیادہ ہے، جائز نہیں کہنے میں حرج عظیم ہے، اھون البلیتین کے پیش نظر کراہت تنزیہی کے ساتھ گنجائش دینا ہوگا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بدنگاہی تو خیر بدنگاہی ہے محتاط نگاہ بھی کچھ کم گل نہیں کھلاتی۔

مولانا رضوان الحسن، مولانا فضیل الرحمٰن صاحبان نے بھی غض بصر اور خلوت سے اجتناب کے ساتھ اس طرح کی تعلیم وتدریس کو بدرجہ مجبوری گوارا کر لینے کا مشورہ دیا ہے، مولانا ظفر عالم صاحب نے تفصیل کیا ہے، مرد اساتذہ کے متعلق لکھا ہے کہ مجبوری میں کامل پردہ نہ کرنے والی طالبات کو پڑھانے میں اپنے کو محفوظ رکھتے ہوئے کوئی حرج نہیں، اور خواتین اساتذہ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ کوئی ادارہ بغیر پردہ کے پڑھانے پر مجبور کرے تو وہاں خواتین کے لیے ملازمت درست نہ ہوگی، مولانا نے اس فرق کی کوئی وجہ تحریر نہیں کی۔

مولانا عبدالتواب صاحب نے بے پردگی کو ناجائز اور موجب گناہ قرار دیتے ہوئے ملازمت اور اجرت علی العمل کو جائز کہا ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی نے بھی پردہ کے ساتھ مخلوط تعلیم اور غیر جنس کی تدریس کو جائز کہا ہے، اور شامی میں مذکور ابوالعباس القرطبی کا قول نقل کیا ہے کہ: "فإنا نجيز الكلام مع النساء للأجانب ومحاورتهن عند الحاجة إلى ذلك"، نیز صحابہ کرام کا امہات المومنین رضی اللہ عنہم جمیعا سے احادیث اخذ کرنا اور مسائل معلوم کرنا معروف ومشہور ہے، پردہ کا اہتمام نہ کرنا ناجائز ہے، بے پردہ مخلوط تعلیم باعث گناہ ہے، لیکن نفس تدریس کی اجرت جائز ہوگی۔

مولانا محبوب فروغ صاحب نے بھی ناگزیر حالات میں اسلامی حدود وقیود کے ساتھ جواز کا اشارہ دیا ہے۔

۳۔ تیسرا قول تفصیل کا ہے، یعنی ہم جنس استاذ کے فراہم نہ ہونے پر، پردہ کے اہتمام، خلوت سے احتراز اور غض بصر کے ساتھ، خاتون اساتذہ کا لڑکوں کو اور مرد اساتذہ کا لڑکیوں کو تعلیم دینا جائز ہے ورنہ یہ ملازمت جائز نہیں، یہ موقف ہے مولانا سلمان قاسمی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، اور مولانا اقبال احمد صاحب کا، مولانا اشتیاق احمد اعظمی صاحب نے اپنے اس موقف کے لیے غض بصر، حجاب اور عدم نظر إلی الاجنبیہ کے مفہوم کی متعدد آیات واحادیث کا ذکر کیا ہے، مولانا محمد فاروق صاحب نے بھی بے پردہ تعلیم کو ناجائز قرار دیتے ہوئے پردہ کے ساتھ تعلیم کے جواز کے لیے شامی کی عبارت "يجوز الكلام المباح مع امرأة اجنبية" کو نقل کیا ہے، اور مولانا مظاہر حسین عماد صاحب نے "الضرورات تبيح المحظورات بقدر الضرورات" کے اصول کو سامنے رکھا ہے، مولانا شاہجہاں ندوی نے مخلوط تعلیم کے عدم جواز پر حدیث پاک: "قالت النساء للنبي ﷺ غلبنا عليك الرجال فاجعل لنا يوما من نفسك" کو مستدل بنایا ہے، اور مولانا شمس الدین صاحب نے فرائض اور مباح کی تعلیم میں فرق کیا ہے، مباحات ومستحبات کی تعلیم بے پردگی کے ساتھ جائز نہیں، اور فرائض کی تعلیم کی ملازمت اگر نیت میں فساد اور خلاف شریعت کام کا ارتکاب نہ

ہوتو اختیار کرنے کی گنجائش ہے، ڈاکٹر بہاء الدین صاحب نے اسی مفہوم کی صرف ایک عبارت تحفۃ المحتاج سے نقل کیا ہے، کہ ضرورت کے وقت واجبات کی تعلیم پردہ اور منع خلوت کے ساتھ جائز ہوگی۔

عارض مسئلہ کی رائے ہے کہ پردہ کے اہتمام اور دیگر احتیاط کے ساتھ جنس آخر کی تعلیم مردوزن ہر ایک کے لیے جائز ہونی چاہیے، اور اگر کوئی استاذ اس کا اہتمام نہیں کرتا تو معصیت کا مرتکب ہوگا، لیکن عمل تدریس کی وجہ سے اس کی اجرت مباح ہونی چاہیے کیونکہ تدریس فی نفسہ جائز ہے، اور پردہ کا لحاظ نہ کرنا عمل تدریس سے خارج شے ہے جس کی وجہ سے کراہت ہوسکتی ہے، مگر اس سے اجارہ اور ملازمت فاسد نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ بیع الحاضر للبادی، اور بیع عند اذان الجمعہ سے منع کیا گیا ہے پھر بھی کوئی ایسی بیع کرلے تو اسے فاسد نہیں کہا گیا ہے، "لأن الفساد في معنى خارج زائد لا في صلب العقد والا في شرائط الصحة" (ہدایہ، ۳/ ۵۱، کتاب البیوع فصل فیما یکرہ)۔

ج۔ تیسرا مسئلہ پیشہ وکالت کا ہے، صورت حال یہ ہے کہ اکثر وکلاء کے یہاں ظالم ومظلوم کا فرق کیے بغیر ہر ایک کی وکالت قبول کرلی جاتی ہے، اور اپنے موکل کے حق میں فیصلہ کے لیے اسے جھوٹ کی تربیت دی جاتی ہے، اس پس منظر میں مسلمان اس پیشہ کو اختیار کرسکتے ہیں یا نہیں؟

اس ماحول اور پس منظر میں بھی مسلمان اس پیشہ کو اختیار کرسکتا ہے، پیشہ وکالت اور اس پر اجرت لینا جائز ہے، کیونکہ جھوٹ اور مظلوم کی حق تلفی وکالت کا جزولازم نہیں ہے، اس کے جواز پر سبھی مقالہ نگار کو اتفاق ہے، اور سبھی مقالہ نگار نے اس کی صراحت بھی کی ہے کہ وکیل کو ظالم کی حمایت، غلط مقدمات کی پیروی اور جھوٹ سے اجتناب کرنا چاہیے، اور اس پیشہ میں در آئی خرابیوں اور نقائص کو اپنے عمل اور کردار سے سدھارنا چاہیے، جن حضرات نے مذکورہ طور پر محض نفس جواز کا ذکر اپنے مقالہ میں کیا ہے، ان کے اسماء یہ ہیں: مولانا فضیل الرحمن عثمانی، مولانا مظاہر حسین عماد، مولانا عبدالتواب، مولانا محمد ظفر عالم، اور مولانا محمد شاہجہاں ندوی، آخر الذکر نے بطور دلیل "تعاونوا على البر والتقوى"، نیز "انصر اخاك ظالما أو مظلوما" کا ذکر کیا ہے۔

مقالہ نگار کی دوسری جماعت نے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ مظلوم کی حمایت اور مستحق کو اس کا حق دلانے کے لیے جھوٹ کی ضرورت پیش آئے، تو جھوٹ کا سہارا لیا جاسکتا ہے، بلکہ بتقاضاء احوال واجب ہوگا، مولانا رضوان الحسن صاحب نے اس سلسلہ میں درمختار کی عبارت "الكذب مباح لاحياء حقه ودفع الظلم عن نفسه" اور اس کے تحت علامہ شامی کی تفصیل کو ذکر کیا ہے، اور مولانا محبوب فروغ صاحب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول "هذه اختي" اور اس کے تحت علامہ عینیؒ کی تفصیل "بل إذا علم انه لا يتخلص إلا بالكذب جاز له الكذب" اور حافظ ابن حجرؒ کے قول "واتفقوا على جواز الكذب عند الإضطرار" کے ساتھ فتاویٰ عالمگیریہ کی عبارت "والكذب محظور إلا في القتال... وفي الصلح... وفي دفع الظالم عن الظلم" کو نقل کیا ہے، اور مولانا عبدالرشید صاحب نے "الأمور بمقاصدها" کا حوالہ دیا ہے۔

بقیہ مقالہ نگار نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر وکیل غلط مقدمات کی پیروی کرے گا، ظالم کی حمایت کرے گا، مظلوم کو اس کے حق اور انصاف سے محروم کرے گا، اور اس کے لیے جھوٹ کا استعمال کرے گا تو اس کی وکالت ناجائز ہوگی، یہ قول ہے مولانا سلمان قاسمی، مولانا شمس الدین اور مولانا عبدالرشید کا، مولانا اشتیاق احمد صاحب نے دلیل میں آیت کریمہ "ولا تكن للخائنين خصيما"، نیز حدیث پاک: "من أعان على خصومة بظلم أو يعين على ظلم لم يزل في سخط الله حتى ينزع" کا ذکر کیا ہے۔

مولانا اقبال احمد صاحب نے کافی تفصیل سے وضاحت کیا ہے اور مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ کا ایک فتویٰ بھی ذکر کیا ہے کہ جھوٹے مقدمات کی پیروی سے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ حرام ہے، بشرطیکہ وکیل کو جھوٹ کا علم ہو، مفتی ثناء الہدیٰ صاحب نے مفتی محمد صاحبؒ کے ایک فتویٰ کے حوالہ سے مجمع الانہر کی عبارت "لا تجوز اخذا الأجرة على المعاصي" کا ذکر کیا ہے، مولانا محمد فاروق صاحب نے بھی مقدمہ کے معصیت پر مبنی ہونے کی وجہ سے اجرت کے جائز نہ ہونے کی صراحت کی ہے، اسی طرح مولانا خورشید احمد اعظمی نے بھی ظالم کی اعانت اور حقدار کو محروم کرنے کی وکالت اور اس کی اجرت کو ناجائز لکھا ہے اور دلیل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان"، نیز

حدیث نبوی "ملعون من ضار مومنا أو مکر به" (ترمذی) نقل کیا ہے۔

اس مسئلہ کے عرض کا خلاصہ یہ ہے کہ وکالت کا پیشہ فی نفسہٖ جائز اور اس کی اجرت حلال ہے، حصول انصاف اور دفع ظلم کے لیے بوقت ضرورت جھوٹ جائز ہے، ظالم کی حمایت اور مظلوم کی حق تلفی کے لیے وکالت کرنا، ناجائز اور اس کی اجرت وآمدنی حرام ہے۔

د۔ چوتھا مسئلہ پیشہ طبابت کا ہے اس صورت حال میں کہ سرکاری یا پرائیوٹ ہاسپٹلوں کی انتظامیہ محض اضافہ آمدنی کے لیے ڈاکٹر کو تاکید کرتی ہے کہ وہ غیر ضروری آپریشن یا ٹیسٹ بھی لکھا کرے، یا مرد ڈاکٹر کو خاتون مریض یا خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے ایسے امراض کے علاج پر مجبور کیا جائے جس کا تعلق قابل ستر حصہ سے ہو، ایسے ہاسپٹلوں میں ملازمت کا حکم اور ملازمین کے لیے شرعی حدود کیا ہوں گی؟

جنس مخالف مریض کے علاج اور اس کی شرعی حدود کے متعلق بعض مقالہ نگار کے علاوہ اکثر نے تحریر کیا ہے اور سبھی کا اس پر اتفاق ہے کہ خاتون مریض کا علاج خاتون ڈاکٹر اور مرد مریض کا علاج مرد ڈاکٹر سے ہی کرانا چاہیے، اور اگر اس مریض کے لیے ہم جنس ڈاکٹر موجود نہ ہو تو ضرورۃً دوسری صنف کا ڈاکٹر علاج کرسکتا ہے، بہتر یہ ہے کہ اگر مریض عورت ہے اور ڈاکٹر کے لیے ممکن ہے کہ اس کا علاج کسی نرس یا دایہ کے واسطہ سے کرسکتا ہے تو ایسا ہی کرے، نیز اگر مرض کا تعلق قابل ستر حصہ سے ہے اور بغیر کسی حائل کے اس کا چھونا یا دیکھا ضروری ہو تو موضع مرض کے علاوہ سے غض بصر کرتے ہوئے بقدر ضرورت کشف ستر سے کام لے، اور خلوت میں علاج سے اجتناب کرے، اس کے لیے جن دلائل سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک تو آیت غض بصر ہے اور دوسری فقہی عبارات ہیں مثلاً درمختار کی عبارت "ینظر الطبیب إلی موضع مرضها بقدر الضرورة" اور فقہی قاعدہ "الضرورات تبیح المحظورات"، نیز البحر الرائق کی عبارت: "والطبیب إنما یجوز له ذلك إذا لم یوجد إمرأة طبیبة"۔

ڈاکٹروں کے محض اضافہ آمدنی کے لیے بلا ضرورت آپریشن یا ٹیسٹ لکھنے کو مولانا عبد التواب، مولانا محبوب فروغ نے ظلم وعدوان، مولانا سلمان قاسمی نے گورکھ دھندا، مولانا شاہجہاں ندوی اور مولانا اشتیاق احمد صاحبان نے ناجائز، مولانا اقبال احمد نے باطل طریقہ پر مال کھانا اور مولانا محمد فاروق نے خیانت سے تعبیر کیا ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی نے بھی اس حرکت کو "المستشار مؤتمن"، نیز "الدین النصیحة" کے پیش نظر خیانت اور باطل طریقہ پر مال کھانے سے تعبیر کیا ہے۔

اس پس منظر میں سرکاری یا پرائیوٹ ہاسپٹل کی ملازمت کے عدم جواز کا قول نقل کیا ہے، مولانا مظاہر حسین عماد نے تعاون عن الاثم والعدوان کی وجہ سے، مولانا اقبال احمد اور مولانا خورشید احمد اعظمی نے "لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" کی دلیل سے، اور مولانا محمد فاروق صاحب نے غیر ضروری آپریشن وغیرہ کی شرط کو شرط فاسد ہونے کی وجہ سے اور مولانا اشتیاق احمد، مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور مولانا عبد الرشید نے لکھا ہے کہ اسپتال کی ایسی شرط پر ڈاکٹر اسے چھوڑ دیں اور پرائیوٹ پریکٹس کریں۔

مولانا سلمان قاسمی صاحب لکھتے ہیں کہ اگر اس اسپتال میں مسلمان زیادہ آتے ہیں اور ڈاکٹر کے اسپتال چھوڑنے سے ان کا نقصان ہو تو تقلیل ضرر کی نیت سے ملازمت کی گنجائش ہے ورنہ نہیں۔

مولانا شمس الدین، مولانا محمد ظفر عالم اور مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب نے شرعی حدود کا لحاظ کرتے ہوئے ڈاکٹر کی ملازمت کو جائز کہا ہے اور مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے ضرورۃً ملازمت کو درست قرار دیا ہے اور دوسری ملازمت مل جائے تو ترک کو اولیٰ قرار دیا ہے، عارض مسئلہ کا خیال ہے کہ چونکہ اس ملازمت سے دوسروں کا ضرر وابستہ ہے اور ڈاکٹر کے لیے کسب معاش کے طور پر بدل پرائیوٹ پریکٹس موجود ہے، اس لیے ایسی ملازمت کو اپنانا یا اس پر برقرار رہنا درست نہ ہونا چاہیے۔

ھ۔ پانچواں اور آخری مسئلہ ایسے ہوٹلوں کی ملازمت کا ہے جن کا بنیادی مقصد تو قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے، اس کے ساتھ اگر شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ کا بھی نظم ہو تو ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کرنے کا کیا حکم ہوگا، جبکہ حرام چیزوں کی فراہمی سے اس کا براہ راست تعلق ہو یا براہ راست تعلق نہ ہو۔

مولانا فضیل الرحمٰن عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ ہوٹل کی ملازمت میں فی نفسہ کوئی قباحت نہیں، شرعی حدود میں رہ کر اپنی ملازمت کو انجام دینا چاہیے، خرابیوں کے اس دور میں تمام جزئیات کو سامنے رکھنے سے بہت دشواریاں ہوں گی، اس لیے اضطرار کی حالت کو عمومی حالت پر قیاس نہ کرنا چاہیے، غالباً مولانا کا منشاء یہ ہے کہ اگر کسی کو مجبوری میں ایسے ہوٹلوں کی ملازمت ہی کرنی پڑے، کسب معاش کا جائز ذریعہ اس کے پاس نہ ہو تو اس کے لیے گنجائش ہونی چاہیے، ورنہ تو کسب معاش کے ذرائع اتنے تنگ نہیں ہیں کہ حالت کو اضطراری قرار دیا جائے، اور خمر و خنزیر جن کی حرمت اور ان سے اجتناب کا حکم نصوص قطعیہ ہے ان کی ترویج واشاعت میں شریک کار رہا جائے، مولانا عبدالتواب صاحب کی رائے ہے کہ ملازمت اگر اصلاً جائز امور کی ہے لیکن کچھ ناجائز کام بھی کرنے پڑیں تو ملازمت جائز ہوگی، ناجائز کاموں کا گناہ ہوگا، مولانا نے کسی دلیل کا ذکر نہیں کیا ہے۔

بقیہ اکثر مقالہ نگار نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر ان امور محرمہ کو انجام دینے میں ملازم کا تعلق براہ راست نہ ہو تو ملازمت درست ہوگی اور براہ راست تعلق ہو تو جائز نہ ہوگی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا سلمان پالنپوری، اور مولانا رضوان الحسن نے تعاون علی الاثم کی وجہ سے ناجائز کہا ہے، مولانا محمد قمر عالم صاحب نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے جس میں شراب اور ان کے متعلقین پر لعنت کی گئی ہے۔

مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی نے عالمگیریہ سے "ولا تجوز الإجارة على شئى من الغناء والنوح والمزامير والطبل وشئى من اللهو" کا ذکر کیا ہے اور مولانا اشتیاق احمد صاحب نے اسی مفہوم کو درمختار سے نقل کیا ہے، مولانا شمس الدین صاحب نے تعاون علی الاثم کے ساتھ فقہی قاعدہ "درء المفاسد اولى من جلب المنافع" کو بھی دلیل بنایا ہے، اور مولانا عبدالرشید صاحب نے الفقہ الاسلامی وادلتہ سے "للمسلم إذا لم يجدعملا مباحا شرعا العمل فى مطاعم الكفار بشرط أن لا يباشر بنفسه سقى الخمر أو حملها أو صناعتها أو الإتجار بها وكذلك بالنسبة لتقديم لحوم الخنازير ونحوها من المحرمات" کو نقل کیا ہے۔

مولانا اقبال احمد صاحب نے لکھا ہے کہ ہوٹل کا مالک مسلمان ہو یا ان اشیاء سے ملازم کا تعلق براہ راست ہو تو ملازمت جائز نہیں، مولانا مظاہر حسین عماد نے یہ تفصیل کیا ہے کہ اکثر تجارت حرام کام کی نہ ہو اور حساب کتاب الگ الگ ہو تو ملازمت جائز ورنہ حرام ہوگی۔

مولانا شاہجہاں ندوی نے "من وقع فى الشبهات وقع فى الحرام" نیز "من كان يومن بالله واليوم الآخر فلا يجلس على مائدة يدار عليها الخمر" کے ساتھ البحرالرائق سے "فإن مشاهدة الباطل شركة فيه" کی دلیل سے براہ راست تعلق نہ ہو جب بھی ملازمت کو مکروہ تنزیہی کہا ہے، مولانا محمد فاروق صاحب نے بھی احتیاطاً ایسے ہوٹلوں کی ملازمت سے اجتناب کا مشورہ دیا ہے، مولانا محبوب فروغ نے "ما حرم اخذه حرم اعطاءه" اور "لا يسقى اباه الكافر خمرا ولا يناوله قدحا" کے حوالہ سے عدم جواز کا قول نقل کیا ہے، اور مولانا محمد ظفر عالم ندوی نے منکرات کی وجہ سے ایسے ہوٹلوں کی ملازمت کو ناجائز قرار دیا ہے۔

....

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی [1]

فوج کی ملازمت:

فوج کی ملازمت کے سلسلے میں جب غور کرتے ہیں تو اس میں کچھ نفع سمجھ میں آتا ہے اور کچھ نقصان بعض اعتبار سے یہ ملازمت جائز اور ضروری معلوم ہوتی ہے اور بعض اعتبار سے ناجائز معلوم ہوتی ہے۔

بعض دفعہ فوجیوں کو اپنے کمانڈر کے حکم سے مسلمانوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں اور ان مسلمان فوجیوں کی گولیوں کے شکار مسلمان ہوتے ہیں، نیز بعض دفعہ جن پر گولیاں چلائی جاتی ہیں وہ مجرم اور ظالم کے بجائے مظلوم اور معصوم ہوتے ہیں، ایسے مظلوم اور معصوم پر گولی چلانے کی اجازت کیسے ہوگی؟ یہ اور اس طرح کی دیگر خرابیوں کی وجہ سے فوج کی ملازمت ناجائز معلوم ہوتی ہے، لیکن دوسری طرف بہت ساری حکمتیں و مصلحتیں اور بہت سارے نکات ہیں جن سے فوج کی ملازمت جائز ہی نہیں بلکہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

الف: حلال روزی کمانا شرعاً جائز و درست ہی نہیں بلکہ باعث اجر و ثواب ہے اور حلال روزی استعمال کرنے سے عمل صالح کی توفیق ملتی ہے، کسب معاش بعض دفعہ فرض ہوجاتا ہے، کتب فقہ میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اتنی مقدار کمانا فرض ہے جو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے نفقہ کے لیے کافی ہو، اسی طرح دیون کی ادائیگی کے لیے کمانا فرض ہے۔ ہر شخص کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ تجارت کرسکے اور ملازمت بھی جلدی نہیں ملتی ہے۔ اگر مسلمانوں کے لیے فوج کی نوکری سے روک لگادی جائے تو گویا کہ ان کو ایک جائز ذریعہ معاش سے روکا جارہا ہے۔

"فرض وهو الكسب بقدر الكفاية لنفسه وعياله وقضاء ديونه... الخ" (الفتاویٰ الہندیہ الباب الخامس عشر فی الکسب، ۵/۳۴۸-۳۴۹)۔

(ب)۔ فوجیوں کا اصل کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہے اور حسب ضرورت ملک کے اندر امن و امان قائم رکھنا ہے اور حفظ جان، حفظ مال و حفظ عرض شریعت کے اہم اصول ہیں جن کی رعایت ضروری ہے۔ ان کے پیش نظر ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور ملک میں امن و امان قائم رکھنا شرعاً محمود و پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ضروری ہے ورنہ اگر دوسرے ملک نے حملہ کرکے قبضہ کرلیا تو جان بھی جائے گی اور مال بھی نیز عزت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس اعتبار سے بھی فوج کی ملازمت ضروری ہے۔

(ج)۔ مسلمان عموماً سرکاری ملازمتوں میں کم ہیں، جس تناسب سے ان کو ملازمت ملنی چاہیے اس تناسب سے نہیں ملتی ہے، خاص طور سے فوج میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم ہے اور بعض دفعہ فوجیوں کا غلط رویہ مسلمانوں کے خلاف ہوتا ہے مسلمان ان کے ظلم کے شکار ہوجاتے ہیں، اگر مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت کو بالکلیہ ناجائز قرار دیا جائے تو پھر مسلمانوں کے خلاف ظلم و بربریت کا بازار مزید گرم ہوجائے گا۔

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ فوج کی ملازمت میں کچھ نقصان بھی ہے اور کچھ نفع بھی اور یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ نفع زیادہ ہے اور نقصان کم ہے۔ جواز کے دلائل مضبوط معلوم ہوتے ہیں عدم جواز کے مقابلہ میں اور قرآنی اصول ہے: "واثمهما اكبر من نفعهما" جس سے یہ واضح ہے کہ اگر نفع بڑھا ہوا ہو تو جائز ہوگا ورنہ ناجائز۔ نیز کتب اصول فقہ میں یہ قاعدہ مذکور ہے کہ جب دو خرابیاں ٹکرا جائیں تو جس میں کم نقصان ہو اس کو اختیار کرکے

---

[1] صدر مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

بڑے نقصان کو دور کیا جائے گا، اسی کو فقہاء اھون البلیتین سے تعبیر کرتے ہیں، "الاشباہ والنظائر" میں ہے:

"اذا تعارض مفسدتان، روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما، وقال الزيلعي: ثم الأصل في جنس هذه المسائل أن من ابتلي ببليتين وهما متساويان، ياخذ بأيتهما شآء وان اختلفاه يختار أهونهما. لأن مباشرة الحرام لاتجوز الا لضرورة"۔ (الاشباہ والنظائر، ۱/ ۱۴۵)

(جب دو خرابیاں ٹکرا جائیں تو ان میں سے جس میں نقصان کم ہو اس کو اختیار کر کے زیادہ نقصان والی خرابی کو دور کیا جائے گا۔ اور زیلعی نے کہا کہ اس جیسے مسائل میں اصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دو مصیبتوں کا شکار ہو اور وہ دونوں مصیبتیں برابر ہیں تو ان میں سے جس کو چاہے اختیار کرے اور اگر دونوں مختلف ہوں تو ان میں سے جس میں کم خرابی ہو اس کو اختیار کرے، اس لئے کہ حرام کا ارتکاب ضرورت کی بنیاد پر جائز ہے)، اس کے علاوہ الضرر یزال، الضرورات تبیح المحظورات اور اس جیسے دیگر مسلمہ اصول بھی فوج کی ملازمت کے جواز کی طرف مشیر ہیں۔

رہا یہ معاملہ کہ بعض دفعہ مسلمانوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں اور مسلمان ہی ان گولیوں کے شکار ہوتے ہیں تو اس کی نظیر کتب فقہ میں ملتی ہے۔ فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر دشمن مسلمان بچوں کو ڈھال بنالیں تو ان پر تیر پھینکنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے البتہ تیر پھینکتے وقت ان مسلمان بچوں کا قصد نہ ہو بلکہ کفار و مشرکین کا قصد کر کے تیر پھینکا جائے، فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اس صورت میں اگر کسی مسلمان کو تیر لگ جائے اور وہ ہلاک ہوجائے تو کسی طرح کی دیت اور کفارہ واجب نہیں ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی صراحت ملتی ہے کہ اگر کفار کے غول میں مسلمان قیدی یا مسلمان تاجر ہوں تو ان پر تیر پھینکنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ان مسلم قیدی اور تجار کا قصد نہیں ہوگا بلکہ کفار کا قصد کر کے تیر پھینکا جائے گا۔ بدائع الصنائع میں ہے:

"ولا بأس برميهم بالنبال وإن علموا أن فيهم مسلمين من الاسارى والتجار لما فيه من الضرورة ... ولكن يقصدون بذالك الكفرة دون المسلمين لأنه لاضرورة في القصد الى قتل مسلم بغير حق" (بدائع الصنائع، ۹/ ۳۰۶)۔

"وكذا إذا تترسوا بأطفال المسلمين فلا بأس بالرمي إليهم لضرورة إقامة الفرض، لكنهم يقصدون الكفار دون الأطفال فإن رموهم فأصاب مسلما فلادية ولا كفارة۔" (حواله مذكور، ۹/ ۳۰۷)۔

فقہاء کی اس صراحت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر اپنے ملک کی حفاظت اور امن و امان کی بقا و تحفظ کے لئے مسلمان فوجی مدمقابل پر گولیاں چلائے اور مدمقابل میں مسلمان بھی ہوں تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی جبکہ گولی چلانے والے کی نیت مسلمان پر چلانے کی نہ ہو۔ البتہ پریشانی اس وقت زیادہ بڑھ جاتی ہے جبکہ مدمقابل صرف مسلمان ہوں اور کمانڈر کا حکم ہوجائے گولی چلانے کا تو پھر یہ مسلمان فوجی کیا کرے گا؟ کیا وہ اپنے کمانڈر کی بات مان کر گولی چلائے گا یا حکم نہ مان کر راہ فرار اختیار کرے گا؟ اس سلسلے میں راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے ملک نے حملہ کیا ہے جس کی فوج میں مسلمان ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا یہ حملہ اپنے ملک کی توسیع کے لئے ہے، یہ کوئی کفر و اسلام کی جنگ نہیں ہے اس لئے اپنے ملک کی سالمیت کے لئے ان پر گولی چلانے کی گنجائش ہوگی، اسی طرح اگر اندرون ملک میں کوئی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کئے ہوا ہے جس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ نہیں ہے تو وہ باغی ہے اور اپنے ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے گولی چلانے کی اجازت ہوگی۔

پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے فوج کی ملازمت شرعاً جائز و درست ہے، البتہ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس بات کی پوری کوشش کریں کہ کسی پر کسی طرح کا ظلم نہ ہو اور خلاف شرع امور کے ارتکاب سے بہر حال اجتناب کریں۔

پولیس کی ملازمت:

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے پولیس کی ملازمت جائز ہے؟ اس سلسلے میں تقریباً وہی تمام تفصیلات ہیں جو فوج کی ملازمت کے سلسلے میں گزریں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حالات و ضرورت کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے شرعاً یہ جائز ہوگا کہ وہ پولیس کی ملازمت اختیار کریں، البتہ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ کسی پر ظلم نہ کریں، کسی کو ناحق نہ ستائیں، گالی گلوچ، بدزبانی، بدسلوکی، ناروا سلوک اور دیگر شرعی منکرات و منہیات سے مکمل اجتناب کریں اور اپنے عہدہ کا غلط استعمال نہ کریں، ان کا جو بھی قدم اٹھے وہ رضاء الٰہی کے لئے ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور ملک کی بقاء و سالمیت کے لئے اٹھے اور اسلامی نمونہ پیش کر کے

وہ دنیا والوں کو بتادیں کہ مسلمان فوج اور مسلمان پولیس اس طرح اعلیٰ اخلاق وکردار کی ہوتی ہے۔

اس مقام پر اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں فوج اور پولیس میں عورتوں کی بحالی بھی بہت تیزی سے ہورہی ہے، عورتیں بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہورہی ہیں تو کیا مسلمان عورتیں فوج اور پولیس کی ملازمت اختیار کرسکتی ہیں یا نہیں؟ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ شریعت میں عورتوں کے لئے بھی کسب معاش جائز ہے، اس کے لئے کتاب وسنت میں واضح دلائل موجود ہیں۔ الموسوعۃ الفقہیہ میں لکھا ہے:

''ومع ذالك فالإسلام لايمنع المرأة من العمل فلها أن تبيع وتشتري وأن توكل غيرها وان تتأجر بمالها وليس لأحد منعها من ذالك مادامت مراعية أحكام الشرع وأدابه'' (الموسوعة الفقهيه،۷/۸۷)۔

(اوراس کے باوجود اسلام عورتوں کو کام کرنے سے نہیں روکتا ہے، عورتوں کو بیع وشراء اور تجارت کا حق ہوگا، وہ کسی دوسرے کو وکیل بناسکتی ہیں اور دوسرے لوگ بھی ان کو وکیل بناسکتے ہیں اور کوئی شخص عورتوں کو کام کرنے سے نہیں روک سکتا ہے جب تک کہ وہ احکام شرع اور اس کے آداب کی رعایت کرتی رہیں)، البتہ عورتیں کام کرنے میں بالکل آزاد نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ کچھ قیود وبند بھی ہے، ان کے کام کے لئے ضروری ہے کہ پردۂ شرعی کی مکمل رعایت کریں، اگر کسی جگہ پردۂ شرعی کی رعایت ممکن نہ ہوتو پھر وہاں کام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، جو کام کریں وہ معصیت اور گناہ کا کام نہ ہو، اپنے کام کے لئے زیب وزینت کے ساتھ نہ نکلیں جس سے ان کی طرف لوگوں کی کشش ہو، اجنبی مردوں کے ساتھ تنہائی میں نہ رہیں سفر پر کسی غیر محرم کے ساتھ نہ جائیں۔ فوج یا پولیس کی ملازمت میں ان قیود وحدود کی رعایت عورتوں کے لئے ممکن نہیں ہے، اس لئے مسلمان عورتوں کے لئے فوج اور پولیس کی ملازمت شرعاً جائز نہیں ہے، ان پر اس سے احتراز لازم ہے۔

انٹلیجنس کی ملازمت:

تیسرا اہم سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے حکومت کے شعبہ مخبری اور انٹلیجنس میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کام میں غیبت اور تجسس کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے اور یہ دونوں شرعاً ممنوع وحرام ہیں۔ قرآن کریم میں ان دونوں کی ممانعت صراحت کے ساتھ آئی ہے، ارشاد ربانی ہے:

"ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضا أيحب أحد كم أن ياكل لحم أخيه ميتًا فكرهتموه" (سورہ حجرات:۱۲)

(اور تجسس نہ کرو اور تم میں سے بعض بعض کی غیبت نہ کریں کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردار بھائی کے گوشت کو کھائے ظاہر ہے کہ تم اس کو ناپسند کروگے) گویا کہ کسی کی غیبت کرنا اپنے مردار بھائی کے گوشت کھانے کے برابر ہے۔ دوسری طرف ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام کے لئے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس پس منظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کیا کریں، اس کی ملازمت کو اختیار کریں یا نہ کریں؟

اس سوال کے جواب سے قبل تجسس اور غیبت کے سلسلے میں تفصیلات جان لینا ضروری ہے کہ تجسس اور غیبت کسے کہتے ہیں اور کیا یہ دونوں ہر حال میں ممنوع وحرام ہیں یا کسی حال میں جائز بھی ہیں، اس سلسلے میں تفصیلات درج ذیل ہیں:

غیبت:

فقہاء کرام نے غیبت کی تعریف یوں کی ہے کہ:

کوئی شخص کسی شخص کی خرابی اور اس کی برائی کو اس کے غائبانہ میں اس طرح بیان کرے کہ اگر وہ سنے تو اس کو تکلیف ہو اور وہ اس کو ناپسند کرے، خواہ یہ خرابی دینی ونسبی اعتبار سے ہو یا بدنی اعتبار سے، خواہ اس کے قول وفعل میں ہو یا اس کے کپڑے، مکان اور سواری میں ہو۔

علامہ علاء الدین الحصکفی اپنی شہرۂ آفاق کتاب الدر المختار میں رقم طراز ہیں:

''الغيبة أن تصف أخاك حال كونه غائبا بوصف يكره إذا سمعه''

علامہ ابن عابدین شامی اس ذیل میں فرماتے ہیں:

''سواء كان نقصا في بدنه أو نسبه أو خلقه أو فعله أو قوله أو دينه حتى في ثوبه أو داره او دابته كما في تبيين

المحارم... الخ" (الدر المختار مع رد المحتار کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع، ۵/ ۲۶۳)۔

غیبت کی مذکورہ تعریف کی بنیاد وہ حدیث پاک ہے جس کی روایت امام مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ سے کی ہے کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا چیز ہے؟ تو صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے بھائی کے اندر کی خرابی کو اس طرح بیان کرے جس کو وہ ناپسند کرے تو یہ غیبت ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اگر اس کے اندر وہ خرابی موجود ہو پھر بھی اس کے بیان کرنے پر وہ غیبت میں شمار ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی صورت میں وہ غیبت ہوگا، اگر وہ خرابی اس کے اندر نہ ہو اور اس کو تم بیان کرو تو وہ بہتان ہے جو غیبت سے بڑھا ہوا ہے۔

"عن أبي هريرة ان رسول الله ﷺ قال: أتدرون ما الغيبة؟ قالوا: الله ورسوله اعلم قال: ذكرك أخاك بما يكره قيل: أفريت إن كان في أخي ما أقول؟ قال: إن كان فيه ماتقول فقد اغتبته وان لم يكن فيه فقد بهته" (الصحيح لمسلم، باب تحريم الغيبة، ص ۳۲۲/ ۲)۔

غیبت کا شرعی حکم:

یہ تو غیبت کی تعریف ہوئی، جہاں تک اس کے شرعی حکم کا تعلق ہے تو علامہ ابن عابدین شامی نے فقیہ ابواللیث کی کتاب تنبیہ الغافلین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ غیبت کی چار قسمیں ہیں:

(۱) کفر (۲) نفاق (۳) معصیت (۴) مباح

کفر:

غیبت کرنے والا اس کو جائز وحلال سمجھ کر کرے تو یہ کفر ہوگا، اس لئے جس غیبت کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو وہ حلال سمجھ رہا ہے اور یہ کفر ہے۔

نفاق:

اگر کوئی شخص کسی کا نام لئے بغیر اس شخص کے سامنے غیبت کرے جو یہ سمجھ رہا ہے کہ کس کی غیبت ہو رہی ہے تو غیبت کرنے والا اگر چہ یہ سمجھے کہ میں غیبت نہیں کر رہا ہوں پھر بھی وہ حقیقت میں غیبت کرنے والا ہوگا اور چونکہ اس صورت میں ظاہر باطن کے خلاف ہے، اس لئے یہ صورت نفاق کی ہوئی۔

معصیت:

اگر کوئی شخص کسی متعین شخص کی غیبت کرے اور غیبت کو وہ معصیت اور گناہ بھی سمجھے تو یہ معصیت ہے، ایسے شخص پر توبہ واستغفار لازم ہے۔

مباح:

کسی فاسق کے فسق ظاہر کو یا کسی بدعتی کی بدعت کو بیان کرنا تا کہ لوگ سمجھ لیں اور دھوکہ نہ کھائیں یہ شرعاً جائز و درست ہے، اس پر ممنوع وحرام غیبت کو اطلاق نہیں ہوگا۔

"وفي تنبيه الغافلين للفقية أبي الليث الغيبة على أربعة أوجه: هي كفر بأن قيل له: لا تغتب فيقول: ليس هذا غيبة لأني صادق فيه فقد استحل ما حرم بالأدلة القطعية وهو كفر، وفي وجه هي نفاق بأن يغتاب من لا يسميه عند من يعرفه فهو مغتاب ويرى من نفسه انه متورع فهذا هو النفاق، وفي وجه هي معصية وهو أن يغتاب معينا ويعلم أنها معصية فعليه التوبة وفي وجه هي مباح وهو ان يغتاب معلنا بفسقه أو صاحب بدعة وان اغتاب الفاسق ليحذره الناس يثاب عليه، لأنه من النهي عن المنكر" (ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحة، ص ۲۶۲/ ۵)۔

کتب فقہ میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ اگر کوئی شخص صوم وصلوۃ کا پابند ہو اور لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہو تو اس کی اس خرابی کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا تا کہ لوگ اس کی نماز، روزہ اور اس کی ظاہری دینداری سے دھوکہ کھا کر نقصان نہ اٹھائیں غیبت نہیں ہے، اسی طرح کسی حکمت ومصلحت اور اصلاح کی غرض سے رعایا

کی خرابیوں کو سلطان اور قاضی کے سامنے یا اولاد کی خرابیوں کو والدین کے سامنے یا کسی ماتحت کی خرابیوں کو اس کے ذمہ دار کے سامنے پیش کرنا جبکہ اصلاح کی امید ہو تو یہ شرعاً جائز و درست ہے، ممنوع اور حرام غیبت میں شامل نہیں ہے (دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ص ۲۶۲/ ۵)۔

علامہ نووی نے مسلم کی شرح نووی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت (جو غیبت سے متعلق ہے) کے ذیل میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کن کن صورتوں میں غیبت جائز ہے، مثلاً: اگر کوئی مظلوم کسی حاکم یا قاضی کے سامنے ظلم کو انصاف حاصل کرنے کے لئے بیان کرے یا کوئی شخص منکرات کو دور کرنے کی غرض سے ان لوگوں کے سامنے بیان کرے جو منکرات کو دور کرنے پر قادر ہوں یا کسی کے ظلم کو بیان کر کے مفتی سے فتویٰ طلب کیا جائے کہ اس کا شرعی حکم اور اس سے خلاصی کی صورت کیا ہے، یا مسلمانوں کو فتنین کے فتنہ اور شر پسندوں کے شر سے بچانا مقصود ہو یا جس کا لقب اعمش، اعرج، ازرق، قصیر، طویل وغیرہ ہو تو اس کے تعارف کے لئے اس کے لقب کے ساتھ ذکر کرنا یا اور اس طرح کے دیگر امور میں غیبت کی شرعاً اجازت ہے (نووی، ۲/ ۳۲۲ باب تحریم الغیبۃ)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ غیبت ہر حال میں حرام نہیں ہے بلکہ وہ غیبت حرام ہے جس میں دوسروں کی تحقیر، تنقیص اور تکلیف پہنچانا مقصود ہو، اگر کوئی حکمت و مصلحت اور اصلاح مقصود ہو تو وہ غیبت حرام نہیں ہے۔

تجسس کا معنی:

تجسس کا معنی ہے خبروں کو تلاش کرنا، کسی کے ٹوہ میں پڑنا، اسی سے جاسوس ہے، اس لئے کہ وہ خبروں کو تلاش کرتا ہے اور باطنی امور کی جستجو میں رہتا ہے۔

الموسوعۃ الفقیہ میں المصباح المنیر کے حوالہ سے لکھا ہے: "التجسس لغة: تتبع الأخبار ...... ومنه الجاسوس، لأنه يتتبع الأخبار ويفحص عن بواطن الأمور" (موسوعہ فقہیہ، ۱۰/ ۱۶۱)۔

تجسس کا شرعی حکم:

الموسوعہ میں تجسس کا حکم شرعی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) حرام (۲) واجب (۳) مباح

تجسس حرام:

مسلمانوں کے خلاف تجسس اصلاً حرام ہے جبکہ مقصود پردہ دری اور تذلیل و تنقیص ہو۔ کتاب و سنت میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت آئی ہے۔

تجسس واجب:

اگر چور ڈاکو اپنے ٹھکانوں میں ہوں اور لوگ ان کی چوری اور ڈکیتی سے پریشان ہوں تو ایسی صورت میں تجسس کر کے ان کو کھوج نکالنا واجب ہے، یہاں تک کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا جلاوطن کر دیا جائے۔

تجسس مباح:

دشمنوں کے لشکر کی تعداد اور ان کے ہتھیار معلوم کرنے اور وہ کہاں ہیں اس کا پتہ لگانے اور اس طرح کی دیگر خبروں سے متعلق جاسوسی شرعاً جائز و درست ہے (سابقہ حوالہ)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہر حال میں تجسس حرام نہیں ہے بلکہ تجسس کا مقصد غلط ہو، کسی کو رسوا کرنا اور ذلیل کرنا مقصود ہو تو وہ تجسس حرام ہے اور جس تجسس کا مقصد کوئی حکمت و مصلحت ہو اور کسی فتنہ سے بچانا مقصود ہو تو وہ جائز و درست ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک کی سالمیت اور اس کے امن وامان کی بقاء و تحفظ کے لئے اور ملک کو فتنوں سے بچانے کے لئے تجسس جائز و درست ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف کا رجحان یہ ہے کہ حکومت کے شعبہ مخبری اور انٹیلیجنس میں مسلمانوں کے لئے ملازمت شرعاً جائز و درست ہے جبکہ مقصود ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام ہو۔ اس کی بنیاد اسلام میں بھی موجود ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بھی بعض غزوات میں جاسوس بھیج کر دشمنوں کی خبروں کو معلوم کیا جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے غزوہ خندق کے موقع پر حضرت حذیفہؓ کو دشمنوں کے

احوال اور ان کی خبریں معلوم کرنے کے لئے بھیجا اور ان کی خبر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا۔

اس سے واضح ہوا کہ جاسوسی کا عمل فی نفسہ جائز و درست ہے، مسلمان اس ملازمت کو اختیار کر سکتے ہیں، البتہ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ خلاف شرع امور کے ارتکاب سے بچتے رہیں۔

واضح رہے کہ چونکہ اس شعبہ میں بھی عورتوں کے لئے پردہ شرعی کی رعایت ممکن نہیں ہے اور عزت و آبرو کو شدید خطرہ لاحق ہے، عموماً مردوں سے اختلاط ہوتا ہے، اس لئے اس شعبہ میں بھی مسلمان عورتوں کے لئے ملازمت جائز نہیں ہے، ان پر اس سے احتراز لازم ہے۔

سرکاری عدالتوں کی ملازمت:

ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے سرکاری عدالتوں میں ملازمت جائز و درست ہے؟ یہاں کا دستور اور قانون کتاب وسنت پر مبنی نہیں ہے بلکہ بہت سے قوانین شریعت اسلامی سے متصادم بھی ہیں، ان خلاف شرع قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا مسلم جج بنص قرآنی فاسق، ظالم اور کافر ہوگا، جبکہ انصاف کی فراہمی، ظلم وحق تلفی کی روک تھام کے لئے عدلیہ کا یہ نظام ضروری ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس شعبہ میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی بہت ہی کم ہے، اگر اس کو ناجائز قرار دیا جائے تو پھر بالکلیہ ہی مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہو جائے گی اور اس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال ہندوستان جیسے ملک کے لئے ہے جہاں ہم رہتے ہیں، غور کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہاں کی عدالت میں بھی دستوری طور پر مسلمانوں کی نزاعات و مقدمات اسلامی قوانین کے مطابق فیصل ہوتے ہیں، ان کا کوئی بھی مقدمہ کا اسلامی قانون کے خلاف فیصلہ نہیں ہوتا ہے، اگر ملک کا کوئی قانون ایسا بنتا ہے جس سے شریعت اسلامی میں مداخلت ہوتی ہے تو ہمارے علماء خاص طور سے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ دار اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور پوری تحریک چلا کر اس قانون میں ترمیم کراتے ہیں۔ اگر کسی جج کا فیصلہ اسلامی قانون کے خلاف ہوتا ہے تو اس کے خلاف لڑائیاں لڑی جاتی ہیں اور چونکہ ہندوستان جمہوری ملک ہے اس لئے ہماری آواز پر توجہ بھی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ غیر مسلموں کے معاملات میں جو قوانین ہوں وہ اسلامی قوانین سے متصادم ہوں، ظاہر ہے کہ ان کا فیصلہ ان کے قانون کے مطابق ہوگا۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت رشوت کا بازار ہر طرف گرم ہے، فیصلے بھی خریدے جاتے ہیں، مقدمہ بازوں کے یہ جملے برابر سننے کو ملتے ہیں کہ ہم تو فیصلے خرید لیں گے، یعنی یہ جانتے ہوئے کہ ناحق پر ہیں پھر بھی وہ لڑتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فیصلہ اپنے حق میں کرالیں گے جس کی وجہ سے صاحب حق کو حق نہیں مل پاتا ہے اور مظلوم کی دادرسی نہیں ہو پاتی ہے، ان حالات میں صاحب تقویٰ، خداترس اور دیندار مسلم ججوں کی ضرورت ہے جو انصاف پر مبنی فیصلے کر سکیں اور اسلامی نمونہ پیش کر کے دنیا والوں کو یہ بتادیں کہ حق، صاحب حق تک کس طرح پہنچتا ہے تاکہ ظالموں کو ظلم کی جرأت نہ ہو۔ تیسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس شعبہ میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی بہت ہی کم ہے، ججوں کی کرسی پر مسلمان شاید ہی نظر آتے ہیں۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس شعبہ کی ملازمت شرعاً جائز و درست ہے۔ البتہ اگر کسی موقع پر اسلامی قوانین سے کوئی قانون ٹکرائے تو اس وقت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے، اگر ممکن ہو تو جمع و تطبیق کی صورت اختیار کریں۔

انکم ٹیکس کی ملازمت:

سرکاری ملازمتوں میں سے ایک ملازمت انکم ٹیکس کی بھی ہے جس میں مخصوص مقدار سے زاید آمدنی پر حکومت کی طرف سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ ٹیکس ظالمانہ ہے، اس کی آمدنی کا بڑا حصہ حکمرانوں کی عیش کوشی اور ان کی غیر معمولی سہولتوں پر خرچ کیا جاتا ہے، نیز اس میں لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلے میں تجسس بھی کرنا پڑتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا انکم ٹیکس کے شعبوں میں مسلمانوں کے لئے ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی حکومت عوامی ٹیکس کے بغیر اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتی، ہندوستانی حکومت بھی اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے بہت سارے ٹیکس لیتی ہے جس میں سے ایک ٹیکس وہ بھی ہے جس کو انکم ٹیکس کے نام سے جانا جاتا ہے، اس رقم کو بہت سی رفاہی کاموں میں خرچ کرتی ہے، اس ٹیکس کو ناروا اور ظالمانہ ٹیکس کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کو ظالمانہ ٹیکس کہنے کی صورت میں حکومت کے لئے اپنے نظام کو قائم رکھنا دشوار ہوگا۔ بہر حال! سابقہ تفصیلات کی روشنی میں اس شعبہ کی ملازمت بھی مسلمانوں کے لئے شرعاً جائز و درست ہے اور لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں جو تجسس کرنا پڑتا ہے اس کی بھی گنجائش ہے، جہاں تک اس ٹیکس کی رقم کو حکمرانوں کی عیش کوشی اور غیر معمولی سہولتوں پر خرچ کرنے کی بات ہے تو یہ ان کا اپنا عمل ہے وہ خود جواب دہ ہوں گے، اس کی وجہ سے دوسروں کے لئے اس شعبہ کی ملازمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

بینک کی ملازمت:

جہاں تک ان ملازمتوں کا تعلق ہے جن کے لئے سرکاری ہونا ضروری نہیں ہے لیکن وہ بنیادی طور پر محرمات پر مبنی ہیں جیسا کہ بینک کی ملازمت تو اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ اس کا نظام سودی کاروبار پر قائم ہے اور سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وأحل الله البيع وحرم الربوا'' (اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا اور سود کو حرام قرار دیا) (قرآن کریم، سورہ بقرہ، آیت: ۲۷۵)

''يمحق الله الربوا ويربي الصدقات'' (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے) (قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت: ۲۷۶)

جو لوگ سودی کاروبار کو نہیں چھوڑتے ہیں ان کے لئے قرآن کریم نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جنگ کا اعلان کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، دینے والے، اس کو لکھنے والے اور اس کی شہادت دینے والے سب پر لعنت فرمائی ہے اور گناہ میں سب کو برابر کا شریک قرار دیا ہے۔ مسلم شریف میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے:

''لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء'' (مسلم شریف، ۲/۲۷)۔

علامہ نووی نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے:

''هذا تصريح بتحريم كتابة المبايعة بين المترابيين والشهادة عليهما وفيه تحريم الإعانة على الباطل'' (حوالہ مذکور)۔

(یہ اس بات کی صراحت ہے کہ دو سودی کاروبار کرنے والوں کے معاملہ کو لکھنا اور اس کی شہادت دینا اور غلط و ناجائز کاموں میں مدد کرنا حرام ہے)۔

اس لئے سود کی حرمت، اس کی شناعت وقباحت (جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہے) کے پیش نظر بینک کی وہ ملازمت جس میں سودی کاروبار لکھنا پڑھنا پڑتا ہے شرعاً ناجائز وحرام ہے، ہر مسلمان پر اس سے احتراز لازم ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص ملازمت کر رہا ہے اور اس کے پاس دوسرا جائز ذریعہ آمدنی نہیں ہے تو اس کے لئے "الضرورات تبيح المحظورات" اور "الضرر يزال" اور اس جیسے دیگر اصول کے پیش نظر اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ بدرجۂ مجبوری ملازمت کرتا رہے اور دوسرے جائز ذرائع آمدنی کی تلاش میں رہے، جب دوسرا جائز ذریعہ آمدنی مل جائے تو بینک کی ملازمت کو چھوڑ دے اور ملازمت کے دوران توبہ واستغفار کرتا رہے۔

بینک کا وہ کام جس کا تعلق سودی کاروبار لکھنے پڑھنے سے نہ ہو:

اس مقام پر یہ سوال بہت ہی اہم ہے کہ بینک کا وہ کام جس کا تعلق پیسے کے لین دین اور سودی حسابات کے لکھنے پڑھنے سے نہیں ہے، جیسے بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا یہ اور اس طرح کا دوسرا کام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ ان سب کاموں میں ایک طرف تو یہ ہے کہ ان کا تعلق براہ راست سودی معاملات سے نہیں ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ سب کام جائز ہوں، لیکن دوسری طرف ان سب کاموں میں سودی معاملات میں کسی نہ کسی درجہ میں تعاون لازم آرہا ہے اور یہ سب کام معصیت کا سبب بنتے ہیں جبکہ گناہ کے کاموں میں تعاون بنص قرآنی ممنوع وحرام ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ سب کام بھی ناجائز اور باعث گناہ ہوں، اس طرح کے بے شمار جزئیات ونظائر کتب فقہ میں موجود ہیں، مثلاً عصیر عنب (انگور کا شیرہ) کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ شراب بنائے گا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اور امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ناجائز ومکروہ ہے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ معصیت خود عصیر عنب کے ساتھ قائم نہیں ہے بلکہ اس میں تغیر کے بعد اس کو شراب بنالیتے ہیں تو معصیت آتی ہے اور یہ فروخت کرنے والے کا عمل نہیں ہے بلکہ خریدار کا عمل ہے اور صاحبین یہ فرماتے ہیں کہ یہ گناہ کے کاموں میں تعاون دینا ہے، اس لئے ناجائز ومکروہ ہے۔ درمختار میں ہے:

''وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمر الأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغيره وقيل يكره لاعانته على المعصية، وفي ردالمحتار (قوله جاز) أي عنده لا عندهما'' (الدر المختار مع رد المحتار كتاب الحظر والاباحة فصل

فی البیع، ۵/ ۲۵۰)۔

اور اگر امرد کی بیع کسی لوطی سے ہو یا ہتھیار کی بیع باغیوں اور اہل حرب سے ہو تو یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی ممنوع و مکروہ ہے، اس لئے کہ ان صورتوں میں معصیت خود امرد اور ہتھیار کے ساتھ قائم ہے جس کی بیع ہو رہی ہے۔

''بخلاف بیع أمرد لمن یلوط بہ و بیع سلاح من أھل الفتنۃ، لأن المعصیۃ تقوم بعینہ۔'' (حوالہ مذکور)

اسی طرح یہ جزئیہ بھی موجود ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کنیسہ یا مدر یا غیر مسلموں کی کسی دوسری عبادت گاہ کی تعمیر میں کام کرے یا کسی کی شراب کو اٹھا کر دوسری جگہ لے جائے خواہ اپنے اوپر رکھ کر یا اپنے کسی جانور پر رکھ کر لے جائے، اسی طرح کسی کو اپنا مکان غیر مسلموں کو ان کی عبادت کے لئے دے یا شراب فروخت کرنے کے لئے دے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک ناجائز و مکروہ ہے، امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تجارت اور عمل فی نفسہ جائز ہے، اسی طرح اپنا مکان کرایہ پر دینا بھی فی نفسہ جائز ہے، معصیت دوسرے فاعل مختار کے عمل سے آتی ہے اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ یہ گناہ کے کاموں میں تعاون ہے جو جائز نہیں ہے (حوالہ مذکور)۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار مسائل کتب فقہ میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں اور کافی الجھے ہوئے اور باہم متعارض ہیں جس کی وجہ سے کوئی حتمی فیصلہ کرنا اور کسی نتیجہ پر پہونچنا بہت ہی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا تمام صورتوں میں گناہ کے کاموں میں تعاون لازم آرہا ہے اور گرچہ یہ اعمال فی نفسہ جائز ہیں، لیکن کسی معصیت کے ارتکاب کا سبب تو ضرور بن رہے ہیں اور کسی گناہ کے کام میں تعاون دینا یا کسی گناہ کا سبب بننا جائز ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دائرہ کو اگر وسیع کر دیا جائے تو پھر گناہ سے بچنا ممکن نہیں رہے گا، اس لئے کہ کاشتکار جو کھیتی کرتا ہے اور جو غلہ اُگاتا ہے یہ بھی چوروں، ڈاکوؤں، زانیوں اور دوسرے غلط کام کرنے والوں کے کاموں میں تعاون دینے والا سمجھا جائے گا کیونکہ کھیت سے پیدا ہونے والا غلہ ان سب کی خوراک ہوتا ہے۔ اسی طرح ہتھیار بنانا بھی ناجائز رہے گا، اس لئے کہ خریدار بعض دفعہ اس کا غلط استعمال بھی کرتا ہے، لہٰذا اس معاملہ میں بہت زیادہ غور و فکر اور پوری گہرائی و گیرائی کے ساتھ کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ قرآنی آیات اور احادیث نبویہ پر اور فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں ان منتشر اور الجھے ہوئے مسائل پر گہری نظر ڈالنے کے بعد جو تفصیلات سامنے آتی ہیں وہ ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں جن سے انشاء اللہ مسائل کے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور ان کی پیچیدگی دور ہوگی۔

اس بحث میں دو بنیادی باتیں ہیں: (۱) تعاون علی المعصیۃ (۲) تسبب للمعاصی۔

تعاون علی المعصیۃ:

نصوص قطعیہ سے یہ ثابت ہے کہ گناہ کے کاموں میں تعاون دینا ممنوع و حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان'' (سورہ مائدہ)۔

البتہ یہ کب سمجھا جائے گا کہ گناہ کے کام میں تعاون ہوا؟ اس سلسلے میں یہ واضح رہے کہ اس کا مدار قصد و نیت پر ہے، اگر کام کے وقت معصیت کا قصد و ارادہ ہو تو یہ تعاون علی الاثم والعدوان میں شمار ہو کر ممنوع و حرام ہوگا، معصیت کا قصد و ارادہ کی صورت یہ ہے کہ معاملہ کرتے وقت ہی گناہ کا قصد و ارادہ ہو یا معاملہ کرتے وقت ہی متعاقدین میں سے کسی ایک کی جانب سے گناہ کے کام کی صراحت ہو جائے۔ اور حکماً کی صورت یہ ہے کہ وہ چیز گناہ کے کام کے علاوہ دوسرے کام میں استعمال ہی نہ ہو، جیسے طبلہ، سارنگی اور مختلف قسم کے آلات موسیقی، ان کا بنانا اور فروخت کرنا گرچہ معصیت کے ارادہ سے نہ ہو پھر بھی حکماً معصیت کا قصد سمجھا جائے گا اور ممنوع ہوگا۔ اور اگر معصیت کا قصد نہ حقیقۃً ہو اور نہ ہی حکماً تو گناہ کے کام میں تعاون نہیں سمجھا جائے گا۔

الاشباہ والنظائر میں نیت کی بحث کے ذیل میں لکھا ہے:

''ان بیع العصیر ممن یتخذ خمرا ان قصد بہ التجارۃ فلا یحرم وان قصد لأجل التخمیر حرم'' (الاشباہ والنظائر: ۵۳)۔

(انگور کا شیرہ کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جو شراب بنائے گا اگر اس بیع سے اس کی نیت تجارت کی ہو تو یہ حرام نہیں ہے اور اگر شراب بنانے کی نیت سے ہو تو یہ حرام ہے)۔

کتب فقہ میں جہاں یہ صراحت ہے کہ کسی کی شراب کو منتقل کرنا خواہ خود اٹھائے یا اپنی سواری پر اٹھا کر لے جائے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، اس لئے کہ اجارہ شراب اٹھا کر لے جانے پر ہے اور یہ نہ تو خود معصیت ہے اور نہ ہی معصیت کا سبب ہے، معصیت تو فاعل مختار کے فعل سے آتی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ شراب کو منتقل کرنے سے ہی لازم نہیں آتا ہے کہ اس کا مالک اس کو پیئے ہی بلکہ وہ اس سے سرکہ بھی بنا سکتا ہے اگر پیتا ہے تو یہ اس کا عمل ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ وممنوع ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے سلسلے میں دس شخصوں پر لعنت فرمائی ہے، ان میں سے ایک اس کو ڈھونے والا بھی ہے، اس حدیث کا جواب امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ شراب اٹھانے والے سے مراد وہ شخص ہے جو معصیت کے ارادہ سے اٹھائے۔ درمختار میں ہے:

’’وجاز تعمير كنيسة وحمل خمر ذمي بنفسه او دابته بأجر‘‘ علامہ ابن عابدین شامی اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

’’(قوله وحمل خمر ذمي) قال الزيلعي: وهذا عنده وقالا: هو مكروه، لأنه عليه الصلوة والسلام لعن في الخمر عشرة وعد منها حاملها، وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية ولاسبب لها وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار وليس الشرب من ضرورات الحمل لأن حملها قد يكون للإراقة أو للتخليل فصار كما إذا استأجره لعصر العنب أو قطعه والحديث محمول على الحمل المقرون بقصد المعصية (الدرالمختار مع ردالمحتار كتاب الحظر والاباحة فصل في البيع، ۵/ ۲۵۱)۔

اس سے یہ واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص معصیت کے قصد وارادہ سے شراب کو منتقل کرتا ہے اور اس پر اجرت لیتا ہے تو یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی ناجائز ہوگا۔

اسی طرح علامہ ابن عابدین شامی نے اس مسئلہ پر کہ انگور کو نچوڑ کر شیرہ تیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بحث کرتے ہوئے جواز اور عدم جواز کی دونوں رائیں ذکر کی ہیں اور ان دونوں کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

’’ولعل المراد هنا عصر العنب على قصد الخمرية فإن عين هذا الفعل معصية بهذا القصد‘‘ (الدرالمختار مع ردالمحتار كتاب الحظر والاباحة فصل في البيع، ۵/ ۲۵۱)۔

یعنی انگور کو نچوڑنا فی نفسہ جائز ہے اور جو لوگ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں شاید ان کی مراد یہ ہو کہ انگور کو شراب بنانے کے قصد وارادہ سے نچوڑا جائے، اس لئے کہ اس نیت سے انگور کو نچوڑنے کا عمل معصیت وگناہ ہے۔

مذکورہ بالا فقہی عبارتوں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ تعاون علی المعصیۃ کا مدار معصیت کے قصد وارادہ پر ہے اور اس طرح کے تمام مسائل میں اگر معصیت کا قصد وارادہ ہو تو بالاتفاق وہ تعاون علی المعصیۃ میں شمار ہو کر ناجائز وحرام ہوگا۔ اور اگر معصیت کا قصد وارادہ نہ ہو تو وہ اعانۃ علی المعصیۃ میں شامل نہیں ہوگا۔

تسبب للمعصية:

البتہ اس سے ملتی جلتی ایک چیز تسبب ہے، یعنی اگر کوئی شخص لوگوں کے لئے اچھے کام کا سبب بنتا ہے، کوئی اچھا راستہ اختیار کرتا ہے جس پر لوگ چل کر اچھے بنتے ہیں تو جتنے لوگ وہ اچھے کام کریں گے اس کا ثواب ان کو بھی ملے گا، اور جو سبب بنا ہے اس کو بھی ملے گا۔ اور اگر کوئی غلط اور گناہ کے کام کا سبب بنے، کوئی غلط راستہ اختیار کرے تو جتنے لوگ اس غلط راستہ پر چلیں گے ان سبھوں کو اس کا گناہ ہوگا اور جو شخص اس کا سبب بنا ہے اس کو بھی گناہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها‘‘ (سورہ نساء:۸۵)۔
(جو شخص اچھی سفارش کرے تو اس کو اس کا حصہ ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرے تو اس کو اس کا حصہ ملے گا)۔

مشکوۃ شریف میں مسلم شریف کی روایت ہے:

’’عن ابي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من دعا إلى هدى كان له من الأجر مثل أجور من تبعه لا ينقص

ذالك من أجورهم شيئا، ومن دعا الى ضلالة كان عليه من الإثم مثل آثام من تبعه لا ينقص ذالك من آثامهم شيئا" رواه مسلم (مشکوٰۃ شریف، ص:۲۹، باب الاعتصام بالکتاب والسنة الفصل الاول)۔

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات وروایات سے یہ بات واضح ہے کہ اگر کوئی شخص گناہ کا ذریعہ وسبب بنے تو اس کو بھی گناہ ہوگا ایک کام فی نفسہ جائز ہے، لیکن وہ دوسرے گناہ کا ذریعہ بن رہا ہے تو وہ جائز کام بھی ناجائز ہوجائے گا، فقہاء کرام نے اس کو سد ذرائع سے بھی تعبیر کیا ہے، البتہ اس میں تفصیل یہ ہے کہ سبب کی دو قسمیں ہیں:

(۱) سبب قریب (۲) سبب بعید

پھر سبب قریب کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک وہ سبب ہے جو گناہ کے لئے محرک ہو یعنی وہ سبب ہی بہ ظاہر گناہ کے صادر ہونے کا ذریعہ ہو، اگر وہ سبب نہ ہو تو گناہ کے صادر ہونے کی کوئی ظاہری وجہ نہ ہو۔

(۲) سبب قریب کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ گناہ کے لئے محرک نہ ہو بلکہ معصیت کسی فاعل مختار کے اپنے فعل سے صادر ہو۔

سبب قریب کی پہلی قسم:

سبب قریب کی پہلی قسم جو گناہ کے لئے محرک ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اس طرح کے اسباب معصیت کا ارتکاب کرنے والا درحقیقت معصیت ہی کا مرتکب سمجھا جائے گا، درمیان میں کسی فاعل مختار کے حائل ہوجانے سے معصیت کی نسبت اس سے منقطع نہیں ہوگی بلکہ معصیت کی نسبت اسی کی جانب کی جائے گی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں معبودان باطلہ کو برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے، اس لئے کہ ان کے ماننے والے بھی ہمارے معبود حقیقی کو برا بھلا کہیں گے۔ گویا کہ یہ ایسا سبب ہے جو معصیت کا محرم بن رہا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوًا بغير علم" (سورہ انعام:۱۰۸)۔

(اور تم ان کو برا نہ کہو جن کی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے ہیں پھر یہ لوگ اللہ کو بغیر سمجھے محض دشمنی میں برا کہنے لگیں گے)۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

اس سے ایک اصول یہ نکل آیا کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو یا اس کے نتیجہ میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں تو وہ کام بھی ممنوع ہوجاتا ہے کیونکہ معبودان باطلہ یعنی بتوں کو برا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے اور ایمانی غیرت کے تقاضہ سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو مگر چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہوگیا کہ لوگ اللہ جل شانہ کو برا کہیں گے تو بتوں کو برا کہنے والے اس برائی کا سبب بن جائیں گے، اس لئے اس جائز کام کو بھی منع کردیا گیا۔ (معارف القرآن، ۳/۴۲۱)۔

اسی طرح قرآن کریم میں امہات المومنین کو نرم گفتگو کرنے سے منع کیا گیا جس کے سبب منافقین اور فساق وفجار کو غلط امیدیں بندھ جائیں۔ اور عورتوں کو زیب وزینت کے ساتھ بن سنور کر نکلنے سے منع کیا گیا، اس لئے کہ یہ گناہ کے لئے محرک ہے۔ اسی طرح حدیث شریف میں دوسروں کے ماں باپ کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے، اس لئے کہ یہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا سبب بنے گا۔

کتاب وسنت کی مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو کام فی نفسہ جائز ہوں لیکن دوسرے ناجائز اور گناہ کے کام کے لئے محرک اور اس پر ابھارنے والے ہوں تو وہ بھی ناجائز ہوں گے، خواہ اس میں معصیت کا قصد ہو یا نہ ہو۔

سبب قریب کی دوسری قسم:

اس کے علاوہ وہ اسباب معصیت کے لئے محرک اور اس پر ابھارنے والے نہ ہوں بلکہ کسی فاعل مختار کے فعل سے سرزد ہوں جیسے عصیر عنب کو کسی

شراب بنانے والے کے ہاتھ فروخت کرنا یا شراب کو ڈھونے کے لئے اپنے آپ کو یا اپنی کسی سواری کو اجارہ پر دینا، یا اپنا مکان کسی کو کرایہ پر دینا اور وہ اس میں اپنے دھرم کے مطابق عبادت کرے یا اس میں شراب فروخت کرے، یہ اور اس طرح کے دیگر مسائل میں یہ اسباب معصیت کے لیے محرک نہیں ہیں بلکہ خریدار یا کرایہ پر لینے والا شخص اپنے اختیار سے معصیت کا مرتکب ہوتا ہے، اس قسم کے اسباب معصیت کا حکم یہ ہے کہ:

الف: اگر معاملہ کرتے وقت ہی معصیت کی صراحت ہو جائے یعنی معاملہ کرتے وقت ہی خریدار کہہ دے کہ میں یہ عصیر عنب شراب بنانے کے لیے خرید رہا ہوں یا شراب کا مالک کہہ دے کہ میری اس شراب کو میرے گھر تک پہنچا دو میں پیوں گا یا مکان کرایہ پر لیتے وقت ہی کرایہ دار کہہ دے کہ میں اس کو بت خانہ بناؤں گا تو ایسی صورت میں معصیت کا قصد ہونے کی وجہ سے یہ معاملات ناجائز ہوں گے۔

ب: اس طرح کی صراحت معاملہ کرتے وقت تو نہ ہو البتہ یہ معلوم ہو کہ عصیر عنب خریدنے والا شراب بنائے گا یا امرد کو خریدنے والا اس سے سیہ کاری کرے گا یا شراب منتقل کرانے والا اس کو پیئے گا یا مکان کرایہ پر لینے والا اس کو بت خانہ بنائے گا یا اس میں شراب فروخت کرنے گا تو یہ مکروہ ہوگا، البتہ مکروہ تنزیہی ہوگا یا مکروہ تحریمی؟

اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر معصیت خود اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو تو ایسی صورت میں مکروہ تحریمی ہوگا جیسا کہ امرد کو کسی لوطی کے ہاتھ فروخت کرنا یا ہتھیار کسی باغی اور حربی کے ہاتھ فروخت کرنا کہ معصیت خود امرد اور ہتھیار کے ساتھ قائم ہوتی ہے ان کی حقیقت بدلنے کے بعد معصیت نہیں آتی ہے۔ اور اگر معصیت خود اس کی ذات کے ساتھ قائم نہ ہو بلکہ اس میں تغیر وتبدل کے بعد معصیت آئے تو ایسی صورت میں مکروہ تنزیہی ہوگا جیسا کہ انگور کے شیرہ کو فروخت کرنا، اس میں معصیت انگور کے شیرہ میں نہیں آتی ہے بلکہ اس کی ہیئت اور حقیقت بدلنے کے بعد آتی ہے۔ درمختار میں ہے:

"أن ماقامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريمًا والافتنزيها" (الدرالمختار على هامش ردالمحتار كتاب الحظر والاباحة فصل فى البيع، ۵/ ۲۵۰)۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ کیسے سمجھا جائے گا کہ معصیت شئی کی ذات کے ساتھ قائم ہوئی یا اس میں تغیر کے بعد آئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس حالت میں شئی کو لیا ہے اسی حالت میں معصیت کا ارتکاب کرنا پڑے تو کہا جائے گا کہ معصیت اس شئی کی ذات کے ساتھ قائم ہوئی اور اگر اس حالت میں تغیر و تبدل کے بعد دوسری حالت پیدا ہوگئی پھر معصیت آئی تو کہا جائے گا کہ شئی کے ساتھ معصیت قائم نہیں ہے بلکہ اس میں تبدیلی کے بعد معصیت آئی۔ جیسا کہ ردالمحتار میں ہے:

(قوله لا تقوم بعينه الخ) يؤخذ منه أن المراد بما لا تقوم المعصية بعينه ما يحدث له بعد البيع وصف آخر يكون فيه المعصية وإن ماتقوم المعصية بعينه ما توجد فيه عن وجه لموجود حالة البيع كالامرد والسلاح" (الدرالمختار على هامش ردالمحتار كتاب الحظر والاباحة فصل فى البيع، ۵/ ۲۵۰)۔

ج: اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ خریدار یا کرایہ پر لینے والا کیا کرے گا تو ایسی صورت میں بلا کراہت جائز ہے، جیسا کہ کوئی غیر مسلم مکان کرایہ پر رہنے کے لئے لے اور کرایہ پر لینے کے بعد اس میں اپنے دھرم کے مطابق عبادت کرے یا اس میں شراب فروخت کرے یا عصیر عنب خریدا اور فروخت کرنے والے کو معلوم نہیں کہ خریدار کیا کرے گا تو ایسی صورت میں یہ معاملات بالاتفاق بلا کراہت جائز ہوں گے۔ ردالمحتار میں ہے:

"(قوله لمن يعلم) فيه اشارة إلى أنه لو لم يعلم لم يكره بلاخلاف" (حواله مذكور)۔

سبب بعید:

اور اگر کام فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود کسی معصیت کا سبب بن رہا ہو، لیکن دور کا سبب ہو جیسا کہ لوہا کسی باغی یا حربی کے ہاتھ یا انگور کسی شراب بنانے والے کے ہاتھ یا اینٹ اور لکڑی کسی مندر بنانے والے کے ہاتھ یا غلہ کسی چور اور ڈاکو کے ہاتھ فروخت کرنا یا ٹیلی ویژن کی مرمت یا کسی بینک کے کمپیوٹر اور ایئر کنڈیشن کی مرمت یا بینک کے مکان کی حفاظت، یہ اور اس طرح کے دیگر جائز کام ارتکاب معصیت کے لئے سبب بعید ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ اگر معلوم ہو کہ خریدار یا کرایہ پر لینے والا شخص غلط استعمال کرے گا تو پھر یہ کام مکروہ تنزیہی ہوگا۔ اور اگر معلوم نہ ہو کہ خریدار یا کرایہ دار کیا کرے گا تو بلا کراہت جائز و درست

ہوگا۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے جواہر الفقہ جلد دوم میں تفصیلی بحث کی ہے جو بہت ہی قیمتی ہے۔ دو رسالے ہیں، ایک عربی میں جو بہت ہی تفصیلی ہے اور ایک اردو میں جو مختصر ہے۔ ان دونوں رسالوں کا مطالعہ بہت ہی مفید ہے، میں نے اس مسئلہ میں ان دونوں رسالوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

بینک کے کمپیوٹر، ایئر کنڈیشن کی مرمت اور اس کی حفاظت اور بینک کے مکان کی تعمیر کا شرعی حکم:

ان مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ بینک کے کمپیوٹر، اس کے ایئر کنڈیشن کی مرمت اور بینک کی حفاظت کا کام، اسی طرح بینک کے مکان کی تعمیر کرنا شرعاً جائز و درست ہے، اس لئے کہ یہ سب کام فی نفسہ جائز ہیں اور ارتکاب معصیت کے لیے سبب بعید کا درجہ رکھتے ہیں، زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے کہ جانتے بوجھتے یہ سب کام کرنا مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہوگا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے "کتاب الفتاویٰ" میں بینک کی ملازمت کے سلسلے میں ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے بینک کی اس ملازمت کو ناجائز لکھا ہے جس میں سودی کاروبار لکھنا پڑھنا پڑتا ہو۔ اس کے علاوہ بینک کی وہ ملازمت جس میں معاملات سے کوئی تعلق نہیں اس کے متعلق لکھتے ہیں:

البتہ نیچے درجہ کی ملازمت (مثلاً جاروب کش، چوکیدار وغیرہ جن کا کاروبار اور معاملات سے تعلق نہیں، نفس عمارت کی حفاظت وغیرہ پر مامور ہیں) جائز ہے۔ (کتاب الفتاویٰ، ۵/۳۹۰)

بینک کو مکان کرایہ پر دینا:

جہاں تک بینک کو اپنا مکان کرایہ پر دینے کی بات ہے تو مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مکان کرایہ پر لینے والا شخص اجارہ کا معاملہ کرتے وقت ہی وضاحت کردے کہ یہ مکان بینک کے لیے لے رہا ہوں تو ایسی صورت میں تعاون علی المعصیۃ کی وجہ سے ناجائز ہوگا، اس طرح اپنا مکان بینک کھولنے کے لیے کرایہ پر نہیں دے سکتے ہیں۔ اور اگر معاملہ کرتے وقت کرایہ دار بینک کھولنے کی وضاحت نہ کرے لیکن یہ معلوم ہو کہ وہ اس مکان میں بینک کھولے گا تو اس صورت میں مکروہ تحریمی ہوگا۔ اور اگر کچھ معلوم نہ ہو کہ وہ کیا کرے گا تو بلا کراہت جائز ہوگا، البتہ بینک کھولنے کے بعد مکان مالک کی ذمہ داری ہوگی کہ اس معاملہ کو ختم کرنے کی کوشش کرے، اگر کوشش کے باوجود بھی مدت کے اندر ختم کرنا ممکن نہ ہو تو وہ معذور سمجھا جائے گا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اس طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ایسے سودی قرض فراہم کرنے والے اداروں کو شوروم میں جگہ فراہم کرنا ایک سودی معاملہ میں تعاون کرنا ہے، اس لیے یہ صورت جائز نہیں ہے۔" (حوالہ مذکور، ۵/۴۰۹)

مفتی محمد شفیع صاحب اس طرح کے سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

اس لیے اگر کسی کو یہ علم نہ ہو کہ اجارہ پر لینے والا اس میں بینک بنائے گا تب تو بلا کراہت جائز ہے اور اگر علم ہے تو مکروہ ہے...... اور یہ اس وقت ہے کہ تنبیہ کے بعد بھی اس پر اصرار کرے اور اگر تنبیہ کے بعد توبہ کرلی مگر فسخ اجارہ قدرت میں نہیں تو اپنی پوری سعی فسخ اجارہ میں کر لینے کے بعد امید ہے کہ معذور سمجھا جائے گا۔ (جواہر الفقہ، ۲/۴۵۶)

انشورنس کمپنی کی ملازمت یا اس کا ایجنٹ بننا:

انشورنس کمپنی کا کاروبار بھی سود اور جوا پر قائم ہے اور ان دونوں کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اس لیے اس کمپنی کی وہ ملازمت جس میں سودی کاروبار لکھنا پڑھنا پڑتا ہو شرعاً ناجائز اور باعث گناہ ہے، اس لیے کہ یہ گناہ کے کاموں میں تعاون دینا ہے جو شرعاً ممنوع ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، دینے والے اس کو لکھنے والے اور اس کی شہادت دینے والے سب پر لعنت فرمائی ہے اور ان سبھوں کو گناہ میں برابر کا شریک قرار دیا ہے جیسا کہ اس سے قبل مسلم شریف کے حوالہ سے حضرت جابرؓ کی روایت گزر چکی ہے، انشورنس خواہ جبری ہو یا اختیاری دونوں کی ملازمت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ جبری انشورنس کا جواز تو انشورنس

کرانے والوں کے لیے ہے نہ کہ انشورنس کرنے والوں کے لیے، ان کے لیے توان کا یہ اختیاری عمل ہوگا۔

اسی طرح انشورنس کمپنی کا ایجنٹ بننا بھی گناہ کے کاموں میں تعاون دینے کی وجہ سے ناجائز اور باعث گناہ ہوگا، مسلمانوں پر اس سے احتراز لازم ہوگا، البتہ اگر کوئی شخص پہلے سے ملازمت کر رہا ہو اور اس کے پاس دوسرا جائز ذریعہ آمدنی نہ ہو تو بدرجہ مجبوری وہ ملازمت کرتا رہے اور دوسرے ذرائع آمدنی کی تلاش میں رہے، جب دوسرا ذریعہ آمدنی مل جائے تو اس کو اختیار کر کے انشورنس کمپنی کی ملازمت کو چھوڑ دے اور اس ملازمت کے دوران توبہ واستغفار کرتا رہے۔

واضح رہے کہ انشورنس کمپنی کی وہ ملازمت جس میں سودی کاروبار لکھنا پڑھنا نہ پڑتا ہو جیسے کمپیوٹر، ایئر کنڈیشن کی مرمت، جاروب کشی یا کمپنی کی حفاظت وغیرہ شرعاً جائز ودرست ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کام ارتکاب معصیت کے لیے سبب بعید ہیں جیسا کہ اوپر گزرا۔

شراب کی کمپنی کی ملازمت:

شراب کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور اس کی حرمت متفق علیہ ہے۔ حدیث شریف میں شراب کو ام الخبائث یا ام الفواحش یعنی تمام برائیوں کی جڑ کہا گیا ہے، اس میں دینی، دنیوی، جسمانی اور روحانی ہر طرح کی خرابیاں اور مفاسد پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے اس کی سخت مذمت فرمائی ہے، جو درج ذیل ہیں: (۱) نچوڑنے والا (۲) بنانے والا (۳) پینے والا (۴) پلانے والا (۵) شراب لاد کر لانے والا (۶) جس کے لیے شراب لاد کر لائی جائے (۷) شراب فروخت کرنے والا (۸) خریدنے والا (۹) جس کے لیے خریدا جائے (۱۰) اس کی آمدنی کھانے والا۔

حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”عن انس قال: لعن رسول اللہ ﷺ فی الخمر عشرۃ عاصرھا ومعتصرھا وشاربھا وحاملھا والمحمولۃ إلیہ وساقیھا وبایعھا وآکل ثمنھا والمشتری لھا والمشتری لہ رواہ الترمذی وابن ماجہ (مشکوۃ شریف کتاب البیوع باب الکسب وطلب الحلال الفصل الثانی ۲۴۲)۔

لہٰذا شراب کی کمپنی میں ملازمت شرعاً جائز نہیں ہے، مسلمانوں پر اس سے احتراز لازم ہے، خواہ شراب کی خرید وفروخت کریں یا کمپنی میں رہ کر شراب رکھنے کے لیے بوتل بنائیں یا اس کا حساب وکتاب لکھیں یا شراب بنانے کے لیے اجزاء پیش کریں۔ یہ تمام صورتیں تعاون علی الاثم والعدوان میں شامل ہو کر ناجائز وحرام اور باعث گناہ ہوں گی اور سب کا حکم یکساں ہوگا، البتہ اگر کوئی شخص شراب کی کمپنی کے علاوہ دوسری کمپنی میں رہ کر بوتل بنائے جہاں سے مختلف کمپنیوں کو بوتل کی سپلائی ہوتی ہو جس میں سے شراب کی کمپنی بھی بوتل لیتی ہو اور بوتل بنانے والے کی نیت معصیت کی نہ ہو تو ایسی صورت میں بوتل بنانے کی شرعاً اجازت ہوگی۔

سپر مارکیٹ کی ملازمت:

اب ان صورتوں کو بیان کیا جا رہا ہے جن میں کاروبار کا اصل مقصد حرام کام کرنا نہیں ہے لیکن ضمنی طور پر وہاں حرام کام بھی کیے جاتے ہیں، جیسے سپر مارکیٹ ہے، جس میں زندگی کی مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں، اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے، اس کے علاوہ دیگر شرعی ممنوعات کا ارتکاب بھی بسا اوقات کرنا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کے مارکیٹ کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے مارکیٹ کا وہ کام جو شرعاً حرام ہے جیسے شراب کی خرید وفروخت، خنزیر یا دیگر حرام اشیاء کی خرید وفروخت، یہ اور اس طرح کی دیگر ملازمتیں شرعاً حرام ہیں، مسلمانوں پر اس سے احتراز لازم ہے، اور وہ کام جو از روئے شرع جائز ہیں ان میں حرام اور ممنوع اشیاء کی خرید وفروخت نہیں ہوتی یا خلاف شرع امور کا ارتکاب نہیں کرنا پڑتا ہے تو ان کی ملازمت شرعاً جائز ودرست ہے، البتہ ان ملازمین پر لازم ہوگا کہ حتی الامکان خلاف شرع امور کے ارتکاب سے اجتناب کریں۔

مخلوط نظام تعلیم میں تدریس کا حکم:

تدریس ایک معزز پیشہ ہے اور اگر نیت صحیح ودرست ہو تو بہت بڑا ثواب بھی ہے، حضور ﷺ کے اوصاف حمیدہ میں سے ایک اہم وصف معلم ہونا بھی ہے، آپ ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تعلیم کا بھی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”بعثت انا معلما“ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، اس لیے تدریسی خدمات انجام دینا جائز ہی نہیں بلکہ بہتر اور تصحیح نیت کے ساتھ باعث ثواب بھی ہے، البتہ پریشانی وہاں بڑھ جاتی ہے جہاں مخلوط نظام تعلیم ہو، ایک

ہی ساتھ لڑکے اور لڑکیاں بیٹھ کر تعلیم حاصل کریں، یا لڑکیوں کی درسگاہ میں مرد اور لڑکوں کی درسگاہ میں عورتیں تعلیم دیں، ایسی صورت میں پردۂ شرعی کی رعایت ممکن نہیں ہے اور فتنہ کا قوی امکان ہے، جبکہ پردۂ شرعی کی رعایت ہر مسلمان مرد وعورت پر لازم ہے، لہٰذا مخلوط نظام تعلیم قائم کرنا اور اس میں تدریسی خدمت انجام دینا شرعاً ناجائز اور باعث گناہ ہوگا۔ اسی طرح لڑکیوں کی درسگاہ میں مرد کے لیے اور لڑکوں کی درسگاہ میں عورتوں کے لیے پردہ شرعی کی رعایت کیے بغیر پڑھانا جائز نہیں ہوگا، اس طرح کی ملازمت اختیار نہیں کرسکتے ہیں بلکہ اس سے احتراز لازم ہوگا۔ البتہ اگر نشست گاہ اس انداز سے بنے کہ لڑکے ایک طرف ہوں اور لڑکیاں دوسری جانب اور ان کے درمیان پردہ ڈال دیا جائے اور معلم یا معلّمہ سے بھی پردہ رہے، اسی طرح مخصوص درسگاہ میں بھی پردۂ شرعی کی مکمل رعایت رہے کہ پڑھنے اور پڑھانے والے ایک دوسرے کو نہ دیکھیں اور کسی طرح کے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی گنجائش ہوگی۔

پیشۂ وکالت:

ہمارے مقالہ کا ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا مسلمان پیشۂ وکالت کو اختیار کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر وکلاء کے یہاں ظالم اور مظلوم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا بلکہ بسا اوقات وہ مظلوم کو انصاف سے محروم کردیتے ہیں، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر اوقات وکلاء اپنے مؤکل کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے انہیں جھوٹ بولنے کی باضابطہ تربیت دیتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وکیل کا مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے اور مسلمانوں کو اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل میں وکیل کی ضرورت پڑتی ہے اور بہت سے مواقع پر اچھے مسلمان وکلاء کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، اس پس منظر میں سوال یہ ہے کہ پیشۂ وکالت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

یہ تو حقیقت ہے کہ یہ پیشہ فی نفسہ جائز ہے، اس کے جواز پر فقہاء کرام کا اتفاق ہے، اس کی مشروعیت قرآن کریم سے بھی ثابت ہے اور احادیث نبویہ سے بھی۔ مشروعیت کے دلائل کتاب وسنت میں بھرے پڑے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر اب تک وکالت کے جواز پر امت کا اجماع رہا ہے۔

"الموسوعۃ الفقہیۃ" میں ہے:

"أما الاجماع فقد أجمع الفقهاء على جواز الوكالة ومشروعيتها منذ عصر رسول الله ﷺ الى يومنا هذا ولم يخالف فى ذالك أحد من المسلمين" (الموسوعة الفقهيه ۴۵/۸ وكالة)۔

(بہرحال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر اب تک وکالت کے جواز پر اجماع رہا ہے اور مسلمانوں میں سے کسی نے بھی اس سلسلہ میں مخالفت نہیں کی ہے)۔

الموسوعۃ میں ایک ورق پہلے ہے:

"اتفق الفقهاء على أن الوكالة جائزة ومشروعة واستدلوا على ذلك بالقرآن الكريم والسنة المطهرة والإجماع والمعقول۔" (حوالہ مذکور ۴۵/ ۶-۷)۔

(فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وکالت جائز ومشروع ہے، فقہاء نے اس پر کتاب وسنت، اجماع اور قیاس سے استدلال کیا ہے) عقلی طور پر بھی وکالت کا جواز سمجھ میں آتا ہے، اس لیے کہ ہر آدمی ہر کام نہیں کرسکتا ہے، ہر آدمی میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اپنے حقوق کا مطالبہ اچھے ڈھنگ سے کرسکے، یا اپنی بات کو پوری قوت کے ساتھ اچھے انداز میں پیش کرکے ظلم سے نجات پاسکے، بہت سارے لوگ اپنے معاملات میں وکیل کے محتاج ہوتے ہیں، اگر وکالت کو ناجائز قرار دیا جائے تو پھر حرج عظیم لازم آئے گا۔ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

"وأما المعقول فلأن الحاجة داعية إلى مشروعية الوكالة فإنه لا يمكن لكل واحد فعل ما يحتاج إليه بنفسه فدعت الحاجة إليها" (حواله مذكور، ۴۵/ ۸)۔

چونکہ وکالت فی نفسہٖ جائز ہے، اس لیے اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے جبکہ اجرت طے ہو، مجہول نہ ہو، اگر کوئی وکیل اجرت نہیں لیتا تو اس کو اس کا اختیار ہوگا۔ کتب فقہ میں کتاب وسنت کی روشنی میں وکالت پر اجرت کے جواز کی صراحت موجود ہے۔

نفس وکالت پر اجرت لینے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ وکیل اپنے مؤکل کے کام کے لیے اپنے آپ کو محبوس کر دیتا ہے، اپنا وقت صرف کرتا ہے اور حبس وقت کی اجرت لینا جائز ہے، لہٰذا ان تفصیلات کی روشنی میں پیشہ وکالت کے سلسلے میں شرعی حکم یہ ہے کہ یہ پیشہ فی نفسہ جائز ہے، مسلمان وکلاء اس پیشہ کو اختیار کر سکتے ہیں اور اپنی محنت کی اجرت بھی طے کر کے لے سکتے ہیں اور اس کو اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں شرعاً جائز و درست ہوگا، البتہ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ صحیح مقدمہ لیں غلط مقدمہ لینے، جھوٹ بولنے اور اس کی تعلیم دینے نیز خلاف شرع امور کے ارتکاب سے مکمل اجتناب کریں۔

اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں مفتی محمود الحسن صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اگر سچے مقدمہ میں باقاعدہ کام اور اجرت معین کر کے وکالت کی جائے اور کوئی کام خلاف شرع اس میں نہ کیا جائے تو نفس وکالت اور اس کی اجرت کا روپیہ اور اس کا کھانا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/ ۴۵۰، کتاب الوکالۃ)

امداد الفتاویٰ میں ہے:

"حاصل یہ ہے کہ پیشۂ وکالت فی نفسہ جائز ٹھہرا مگر شرط یہ ہے کہ سچے مقدمات لیتا ہو"۔ (امداد الفتاویٰ، ۳/ ۴۲۰، کتاب الوکالۃ)

البتہ یہ واضح رہے کہ اگر جھوٹے اور ناحق مقدمات لیے جائیں اور ان کی پیروی کی جائے اور ظالم کی مدد کر کے مظلوم کو اس کے حق سے محروم کیا جائے تو ایسی وکالت اور اس کی آمدنی ناجائز ہوگی، اس لیے کہ یہ حرام عمل ہوگا اور حرام عمل کی اجرت بھی حرام ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"اور جس وکالت میں معصیت پر اجرت لیا جائے یعنی جھوٹے اور ناحق مقدمہ کی پیروی کی جائے اور ظالم کی اعانت کی جائے ایسی وکالت اور اس کی آمدنی ناجائز ہے"۔

"لا يجوز أخذ الأجرة على المعاصي كالغناء والنوح والملاهي، لأن المعصية لايتصور استحقاقها بالعقد فلا يجب عليه الأجر وإن أعطاه الأجر أو بعضه لا يحل له ويجب عليه رده" (مجمع الانهر كتاب الاجارة، ۳/ ۵۲۳، فتاوى محموديه، ۱۶/ ۴۵۳)۔

پیشہ طبابت:

انسانی خدمت کا ایک اہم ذریعہ علاج پیشہ طبابت بھی ہے، مریضوں کا علاج کر کے ان کو راحت و آرام پہنچانا، ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کو خوش رکھنا بہت بڑا کار ثواب ہے، اس لیے مسلمان ڈاکٹروں کے لیے یہ پیشہ اختیار کرنا اور اس طرح کی سرکاری ملازمت کرنا شرعاً جائز و درست ہے اور تصحیح نیت کے ساتھ کار ثواب بھی ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ مرد ڈاکٹر مرد مریضوں کا علاج کرے اور عورت ڈاکٹر عورت مریضوں کا علاج کرے۔ اگر کسی جگہ مجبوری ہو، ایسا مرض ہو کہ اس مرض کے علاج کے لیے عورت مریضوں کے واسطے عورت ڈاکٹر اور مرد مریضوں کے علاج کے واسطے مرد ڈاکٹر نہ ملے تو بدرجہ مجبوری بوقت ضرورت عورتیں مرد ڈاکٹر سے اور مرد، عورت ڈاکٹر سے علاج کرا سکتے ہیں، لیکن ضروری ہوگا کہ حتی الامکان ستر کا خیال رکھیں، اگر قابل ستر حصہ کا دیکھنا ضروری ہو تو صرف اسی حصہ کو دیکھیں اور بقیہ حصہ پر کپڑے وغیرہ ڈال دیں، بغرض علاج ضرورۃً قابل ستر حصے کو دیکھنا جائز و درست ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"وقال في الجوهرة: إذا كان المعرض في سائر بدنها غير الفرج يجوز النظر عند الدواء لأنه موضع ضرورة وإن كان في موضع الفرج فينبغي أن يعلم امرأة تداويها فإن لم توجد وخافوا عليها أن تهلك أو يصيبها وجع لاتحتمله يستروا منها كل شئ إلا موضع العلة ثم يداويها الرجل ويغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح فتأمل والظاهر أن ينبغي هنا للوجوب" (ردالمحتار كتاب الحظر والاباحة فصل في النظر والمس، ۵/ ۲۳۷)۔

(اور جوہرہ میں کہا ہے کہ جب شرمگاہ کے علاوہ پورے بدن میں مرض ہو تو علاج کے وقت اس کو دیکھنا جائز ہے، اس لیے کہ اس جگہ ضرورت ہے اور اگر مرض شرمگاہ کی جگہ میں ہو تو مناسب ہے کہ کسی عورت کو تعلیم دیدے اور وہ علاج کرے اور اگر ایسی عورت نہ ملے اور اس کی ہلاکت کا یا ناقابل برداشت درد ہونے

کا اندیشہ ہو تو مرض کی جگہ کے علاوہ پورے جسم کو ڈھانک کر کوئی مرد علاج کرے اور اپنی قدرت بھر اپنی نگاہ جھکا کر رکھے، البتہ زخم کی جگہ کو دیکھ سکتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہاں ینبغی کا لفظ وجوب کے لیے ہے)۔

واضح رہے کہ مسلمان ڈاکٹروں کی ذمہ داری ہوگی کہ بلا ضرورت جانچ لکھنے اور بلا ضرورت آپریشن کرنے سے مکمل اجتناب کریں، مریضوں کو بے جا پریشان کر کے ان کی بددعا نہ لیں، اللہ رازق ہے، اس کی صفت رزاقیت پر اعتماد کرتے ہوئے اس طرح کی غلط حرکت سے باز رہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے ساتھ ہوگی۔

ہوٹلوں کی ملازمت:

جہاں تک اس دور پُرفتن میں ہوٹلوں کی ملازمت کا سوال ہے، خاص طور سے بڑے بڑے ہوٹلوں کی ملازمت ہے جہاں بہت سارے خلاف شرع امور کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے تو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ وہ کام جو شرعاً جائز و درست ہیں جس میں خلاف شرع امور کا ارتکاب لازم نہیں آتا ہے، مثلاً ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کو کھانا کھلانا، ان کے بستر کو درست کرنا، ان کی دیگر جائز ضروریات کا خیال رکھنا یہ اور اس طرح کے دیگر جائز کاموں کی ملازمت شرعاً جائز ہے۔ اور وہ کام جو خلاف شرع ہیں، مثلاً شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کی انتظام، رقص، موسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ یہ اور اس طرح کے دیگر خلاف شرع امور کی ملازمت شرعاً حرام ہے، مسلمانوں پر اس طرح کی ملازمت سے اجتناب لازم ہے۔ هذا ما عندي والله اعلم وعلمه أتم وأحكم۔
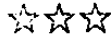
☆☆☆

مختلف شعبوں میں ملازمتوں کے شرعی احکام

مفتی سہیل احمد قاسمی[1]

کیا مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت جائز ہے؟

صیغہ فوج:...... یہ حکومت کا اہم ترین شعبہ ہے جس کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان کو قائم کرنا ہے، کبھی اندرون ملک امن وامان کو قائم کرنا ہے، کبھی اندرون ملک حالات بگڑ جائیں تو امن وامان کے قیام کے لیے بھی ہنگامی حالات میں ان کی خدمات لی جاتی ہین اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت، ملک میں رہنے والوں کو بیرونی خطرات سے بچانا، عزت و آبرو اور جان ومال کی حفاظت، اور ملک میں امن وامان قائم رکھنا شرعاً محمود و پسندیدہ ہی نہیں بلکہ بہت ضروری ہے، فقہاء نے جن امور کے لیے جنگ وجدال اور قتال کو جائز کہا ہے ان میں جان ومال اور وطن کی حفاظت بھی ہے۔

اس طرح فوج کی ملازمت، فوجی کی ذمہ داریاں اور خدمات کی روشنی میں جب گہرائی کے ساتھ اور حالات کے تناظر میں غور کرتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس میں نفع ونقصان دونوں ہے، بعض اعتبار سے یہ ملازمت نہ صرف یہ کہ جائز و درست ہے بلکہ غیر معمولی اہم اور ضروری معلوم ہوتی ہے اور بعض اعتبار سے ناجائز۔ چونکہ کبھی کبھی فوجیوں کو اپنے کمانڈر کے حکم سے مسلمانوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں اور مسلمان ہی ان کی گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں، بسا اوقات بے قصور اور معصوم ومظلوم لوگ بھی ان کی گولیوں کی زد میں آجاتے ہیں یہ اور اس طرح کے دیگر نقصان دہ خرابیوں کی وجہ سے فوج کی ملازمت ناجائز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف بہت ساری حکمتیں اور مصلحتیں ایسی ہیں جن سے فوج کی ملازمت نہ صرف جائز ومباح ہے بلکہ مستحب وضروری معلوم ہوتی ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں بہت ہی کم ہیں خاص طور پر فوج اور دیگر اہم محکمہ میں تو معدود چند ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض دفعہ فوجیوں کا غلط رویہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے، مسلمان ان کی زیادتیوں اور ظلم وبربریت کا شکار ہو کر ہر طرح مفلوج ہو جاتے ہیں، ان سنگین حالات کے تناظر میں فوج کی ملازمت کو ناجائز قرار دیا جائے تو پھر مسلمانوں کے خلاف ظلم وبربریت کا بازار مزید گرم ہوگا اور امت مسلمہ کو غیر متلافی نقصان پہنچے گا۔

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فوج کی ملازمت میں کچھ نقصان بھی ہے اور نفع بھی ہے، لیکن یہ واضح ہے کہ نفع زیادہ ہے اور نقصان کم ہے، عدم جواز کے مقابلہ میں جواز کے دلائل مضبوط معلوم ہوتے ہیں۔

قرآنی اصول ہے: "واثمهما أكبر من نفعهما" جس سے یہ واضح ہے کہ اگر نفع بڑھا ہوا ہو تو جائز ہوگا ورنہ جائز نہیں ہوگا۔

نیز کتب اصول فقہ میں یہ قاعدہ مذکور ہے کہ جب دو خرابیاں باہم متعارض ہوں تو جس میں کم نقصان ہو اس کو اختیار کر کے بڑے نقصان سے بچا جائے گا، جس کو أهون البليتين کہا جاتا ہے۔

"إذا تعارض مفسدتان، روعي أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفهما، وقال الزيلعي: ثم الأصل في جنس هذه المسائل أن من ابتلى ببليتين وهما متساويان، ياخذ بأيتهما شاء وإن اختلفاه يختار أهونهما، لأن مباشرة الحرام لا تجوز إلا لضرورة۔" (الاشباہ والنظائر ۱/ ۲۶۱)۔

(جب دو خرابیاں باہم متعارض ہوں تو جس میں نقصان کم ہو اس کو اختیار کر کے زیادہ نقصان والی خرابی سے پرہیز کیا جائے گا، اور زیلعی فرماتے ہیں کہ اس طرح کے مسائل میں اصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دو مصیبتوں میں پھنس جائے اور دونوں مصیبتیں برابر ہوں تو ان میں سے جس کو چاہے اختیار

---

[1] مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

کرے، اس لیے کہ حرام کا ارتکاب ضرورۃً ہی جائز ہے)، اس کے علاوہ الضرر یزال اور" الضرورات تبیح المحظورات" اور اس جیسے دیگر مسلمہ اصول بھی فوج کی ملازمت کے جواز کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

اب رہا یہ معاملہ کہ کبھی کبھی مسلمانوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں اور مسلمان ہی ان کی گولیوں کی زد میں آتے ہیں، یہ یقینی اور کثیر الوقوع نہیں ہے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے لیکن اگر ایسا ہے بھی تو اس کی مثال فقہ کی کتابوں میں بصراحت موجود ہے کہ:

اگر دشمنوں نے مسلمان بچوں کو ڈھال بنالیا ہے تو ان پر تیر چلانے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ تیر چلاتے وقت کفار و مشرکین کی نیت کر کے چلایا جائے۔ مسلمان بچوں کا قصد نہ ہو، ایسی صورت میں اگر کسی مسلمان کو تیر لگ جائے اور وہ ہلاک ہو جائے تو کسی طرح کی دیت اور کفارہ واجب نہیں ہے۔

اسی طرح یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ اگر کفار و مشرکین کی بھیڑ میں مسلمان قیدی یا تاجر ہوں تو ان پر تیر چلانے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ کفار کا قصد کر کے تیر چلایا جائے۔

بدائع میں ہے:

"إذا تترسوا بأطفال المسلمين فلا بأس بالرمي إليهم لضرورة اقامة الفرض، لكنهم يقصدون الكفار دون الأطفال فان رموهم فأصاب مسلما فلادية ولاكفارة" (بدائع الصنائع، ۹/ ۳۰۷)۔

"ولا بأس برميهم بالنبال، وإن علموا أن فيهم مسلمين من الأسارى والتجار لما فيه من الضرورة ولكن يقصدون بذالك الكفرة دون المسلمين لانه لا ضرورة فى القصد الى قتل مسلم بغير حق" (بدائع، ۹/ ۳۰۶)۔

البتہ مشکل ترین مرحلہ وہ ہے جبکہ مدمقابل صرف مسلمان ہوں اور کمانڈر کا حکم گولی چلانے کا ہو جائے تو پھر یہ مسلمان فوجی کیا کرے گا؟

کمانڈر کا حکم مان کر گولی چلائے گا؟

حکم عدولی اور انکار کرے گا؟

دکھلانے کے لیے صرف ہوا میں گولی چلائے گا؟

یا پھر راہ فرار اختیار کرے گا؟

یہاں پر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ فوجیوں کا نظم وضبط اور دستور و قانون بہت ہی سخت اور مثالی ہوتا ہے، اس کے اندر صرف اور صرف بلکہ جنون کی حد تک اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ حکم عدولی، یا فرار، قانوناً سنگین ترین جرم ہے، ایسی صورت میں اس کو فوجی عدالت ہی میں مقدمات کے دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔

ملک و وطن کا غدار قرار دے کر موت کی سزا بھی دی جاسکتی ہے اور اس ملک میں جہاں اقتدار اعلیٰ اور کلیدی عہدہ و منصب غیر مومن کے ہاتھوں میں ہو، پوری امت کا اعتماد مجروح ہوگا، مسلمانوں کے لیے فتنے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوگا، ملازمت کی راہ بند ہوگی جس کے خطرناک نتائج پیدا ہوں گے اور مشکلات میں اضافہ ہوگا۔

اس لیے راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے ملک کی فوج نے حملہ کیا ہے جس کی فوج میں مسلمان ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا یہ حملہ ہوس ملک گیری اور اپنے ملک کی توسیع یا جذبات کی تسکین کے لیے ہے یہ کوئی کفر و اسلام کی جنگ نہیں ہے، اس لیے اپنے ملک کی حفاظت و بقا کے لیے ان پر گولی چلانے کی شرعاً گنجائش ہے اور یہ ایک فوجی کا فرض منصبی ہے کہ پوری ہمت و جرأت کے ساتھ اپنے ملک کی حفاظت کرے اور الامور بمقاصدہا کے تحت اپنے ملک کے خلاف حملہ آور فوج سے قتال کرنا جائز اور درست ہے خواہ مقابلہ میں کفار ہوں یا مسلم۔

خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحسن اور ضروری ہے، البتہ ان کی ذمہ داری ہے کہ حتی الامکان کسی پر ظلم نہ ہو اور خلاف شرع امور سے بہر حال پرہیز کریں۔ اپنے پاکیزہ کردار و عمل سے یہ ثابت کریں کہ وہ سچے مسلمان فوجی، رات کے عابد و

زاہداوردن کے بہادرفوجی اورمحبِّ ملک وملت ہیں۔

پولیس کی ملازمت:

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لیے پولیس کی ملازمت جائز ہے؟

اس سلسلہ میں تقریباً تمام تفصیلات وہی ہیں جو فوج کی ملازمت کے سلسلہ میں بیان کی جاچکی ہیں، ہندوستان کے مخصوص حالات اور مسلمانوں کے مفادات کے پیش نظر مسلمانوں کا پولیس میں ہونا نہایت ہی ضروری ہے، مسلمانوں کے لیے شرعاً جائز ہے کہ وہ پولیس کی ملازمت اختیار کریں بلکہ اس کے حصول کے لیے ممکن حد تک جدوجہد کریں، چونکہ اندرون ملک امن وامان کے قیام، لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت اور دیگر بہت سارے مواقع پر پولیس کا اہم رول رہتا ہے، اس لیے مسلمانوں کے لیے پولیس کی ملازمت نہ صرف یہ کہ جائز ودرست ہے بلکہ نہایت ہی ضروری ہے، البتہ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ گالی، گلوچ، ظلم وزیادتی اور دیگر شرعی منکرات سے پرہیز کریں اور اپنی ذات سے حتی الامکان قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے لوگوں کو فائدہ پہنچائے اور مظلوم کی مدد کرے۔

فوج اور پولیس میں عورتوں کی ملازمت کسی طرح بھی جائز نہیں ہے چونکہ شرعی حدود وقیود کی رعایت کرتے ہوئے ان ملازمتوں میں عورتیں اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتیں، اس لیے مسلمان عورتوں کے لیے فوج اور پولیس کی ملازمت شرعاً جائز نہیں ہے، ان پر اس سے احتراز لازم وضروری ہے۔

مخبری اور جاسوسی کی ملازمت:

تیسرا اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لیے حکومت کے شعبہ مخبری اور محکمہ جاسوسی میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے؟

محکمہ فوج کا ہو یا پولیس کا امن وامان کے قیام، مجرموں تک رسائی کے لیے مخبر اور جاسوس کا ہونا ضروری ہے، موجودہ حالات میں جس ملک کا جاسوسی نظام جتنا زیادہ مضبوط ومستحکم ہوگا وہ ملک اسی اعتبار سے طاقتور اور مضبوط ومامون ہوگا۔ لیکن اس کام میں غیبت اور تجسس کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے جو شرعاً ممنوع وحرام ہے، قرآن کریم میں ان دونوں کی ممانعت واضح طور پر موجود ہے: "ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضا" (سورہ حجرات)۔

دوسری طرف ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کے سدباب کے لیے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس پس منظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کیا کریں۔ اس کی ملازمت کریں یا نہ کریں۔

غیبت کہتے ہیں کسی شخص کی خرابی اور عیب کو اس کے غائبانہ میں اس طرح بیان کرنا کہ اگر وہ سنے تو اس کو تکلیف ہو اور وہ اس کو ناپسند کرے خواہ یہ خرابی دینی ونسبی اعتبار سے ہو یا شکل وصورت یا عادات واخلاق سے متعلق ہو، ماں باپ سے متعلق ہو یا بیوی وخدام سے یا چال ڈھال یا اموال وغیرہ سے متعلق ہو غیبت ہے۔

''الغيبة أن تصف أخاك حال كونه غائبا بوصف يكره إذا سمع. سواء كان نقصاني بدنه أو نسبه أو خلقه أو فعله أو قوله أو دينه حتى في ثوبه أو داره او دابته كما في تبيين المحارم'' (درمختار مع ردالمحتار، ۵/ ۲۶۳)۔

حضرات فقہاء کرام نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ غیبت وتجسس کی ممانعت وحرمت بالعموم نہیں ہے، اصل میں یہ احکام، مقاصد ونتائج کے تابع ہیں اگر کسی شرعی مصلحت کی بنیاد پر غیبت، تجسس اور افشاء راز کی ضرورت وحاجت ہو تو پھر یہ کام بھی جائز اور کبھی بتقاضائے مصلحت واجب وضروری ہوجاتا ہے۔ اگر اللہ کے بندوں کی خیر خواہی یا کسی مضرت اور مفسدہ کے انسداد کے لیے کسی شخص یا گروہ کی واقعی برائی دوسروں کے سامنے بیان کرنا ضروری ہوجائے، یا اس کے علاوہ کسی شرعی، اخلاقی، یا تمدنی مقصد کا حاصل ہونا اس پر موقوف ہو تو اس شخص کا یا گروہ کی برائی کا بیان کرنا اس غیبت میں داخل نہیں ہوگا جو شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے بلکہ بعض حالتوں میں یہ کار ثواب ہوگا۔

چنانچہ حاکم کے سامنے ظالم کے خلاف گواہی دینا۔

دھوکہ باز کی حالتوں سے لوگوں کو باخبر کرنا تاکہ لوگ اس کے دھوکہ میں نہ آئیں۔

حضرات محدثین کا غیر ثقہ اور غیر عادل راویوں پر جرح کرنا۔

دین وشریعت کے محافظ علماء کا اہل باطل کی غلطیوں پر لوگوں کو مطلع کرنا۔

منکر ومعاصی کے ازالہ کی نیت سے ایسے شخص سے بیان کرنا جو اس کے ازالہ پر قدرت رکھتا ہو۔

استفتاء کے طور پر کسی کے عیوب کو بیان کرنا۔

کسی کے شر سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے بیان کرنا۔

مسلمانوں کو فتین کے فتنہ اور شر پسندوں کے شر وضرر سے بچانا مقصود ہو۔

یا کسی مصلحت کے تحت لوگوں کے تعارف کے لیے ناپسندیدہ صفت ولقب بیان کرنا جیسے اعمش، اعرج، اعمی، قصیر، طویل وغیرہ۔

حضرات صحابہ کرام سے بھی کسی مصلحت یا اصلاح کے لیے بعض لوگوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کرنا ثابت ہے، اسی لیے فقہاء نے ازالہ ظلم، دفع ضرر اور کسی جائز مقصد کے حصول کے لیے غیبت کی اجازت دی ہے۔

مذکورہ بالا وضاحتوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ غیبت ہر حال میں حرام نہیں ہے بلکہ وہ غیبت حرام ہے جس میں دوسروں کی تحقیر وتنقیص وایذا رسانی مقصود ہو۔ اگر کوئی حکمت ومصلحت اور اصلاح وترقی مقصود ہو تو وہ غیبت میں داخل ہوکر حرام نہیں ہوگا بلکہ مستحسن اور کار ثواب ہوگا۔

تجسس کا معنی ہے خبروں کی تلاش وجستجو کرنا، کسی کی ٹوہ میں رہنا، اسی سے جاسوس بھی ہے، اس لیے کہ وہ بھی خاموشی سے خبروں کی جستجو اور واقعات کی تحقیق کرتا ہے، مخفی امور کی جستجو میں رہتا ہے۔

الموسوعۃ الفقہیہ میں المصباح المنیر کے حوالہ سے لکھا ہے:

"التجسس لغة تتبع الأخبار ... ومنه الجاسوس لانه يتبع الاخبار ويفحص عن باطن الامور" (الموسوعة الفقهيه، ۱۰/ ۱۶۱)۔

لیکن یہ واضح ہے کہ تجسس ہر حال میں حرام نہیں ہے بلکہ وہ تجسس حرام ہے جس کا مقصد غلط ہو، کسی کی پردہ دری، اور تنقیص وتذلیل یا کسی کا رسوا کرنا مقصود ہو، جس کی تجسس کا مقصد کوئی حکمت ومصلحت ہو فتنہ وضرر سے بچنا مقصود ہو تو وہ جائز ہے، اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ملک کی سالمیت اور اس کے حفظ وبقا اور امن وامان کے قیام کے لیے اور ملک اور شہریوں کو فتنہ وفساد سے بچانے کے لیے تجسس جائز ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں ناچیز راقم الحروف کا رجحان یہ ہے کہ صیغہ مخبری وجاسوسی میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنا شرعاً جائز ودرست ہے جبکہ مقصود ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام، جرائم کا سد باب اور فتنہ وفساد کا روکنا ہو، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات وسرایا میں جاسوسوں کی خدمات لی ہیں اور ان کی رپورٹ پر فیصلے فرمائے ہیں، جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے، غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت حذیفہؓ کو دشمنوں کے احوال معلوم کرنے کے لیے بھیجا اور آپ کی خبر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا۔ (مسلم شریف باب غزوۃ الاحزاب، ۲/ ۱۰۷)۔

اس سے واضح ہے کہ جاسوسی کا عمل فی نفسہ جائز ودرست ہے، مسلمان اس شعبہ میں ملازمت کر سکتے ہیں، البتہ ان کی ذمہ داری ہے کہ خلاف شرع امور سے پرہیز کریں۔

واضح رہے کہ اس محکمہ میں بھی عورتوں کے لیے ملازمت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ عزت وآبرو اور جان کو شدید خطرہ لاحق ہے عموماً مردوں سے اختلاط ہوتا ہے، اجنبی لوگوں سے تنہائی میں ملاقات کرنی ہوتی ہے شرعی پردہ کی رعایت بالکل ممکن نہیں ہے، اس لیے مسلمان خواتین کے لیے اس کی ملازمت کسی طرح بھی جائز نہیں ہے ان پر اس سے احتراز لازم ہے۔

سرکاری عدالتوں میں ملازمت:

ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا مسلمانوں کے لیے سرکاری عدالتوں میں ملازمت جائز ودرست ہے، جہاں کا دستور اور قانون کتاب وسنت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ

بہت سے قوانین شریعت اسلامی سے متصادم بھی ہیں، ان خلاف شرع قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا مسلم جج بنص قرآنی فاسق، ظالم اور کافر ہوگا، جبکہ انصاف کی فراہمی، ظلم وحق تلفی کی روک تھام کے لیے عدلیہ کا یہ نظام ضروری ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس شعبہ میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی بہت ہی کم ہے، اگر اس کو ناجائز قرار دیا جائے تو پھر بالکلیہ ہی مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہوجائے گی اور اس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال ہندوستان جیسے ملک کے لیے ہے جہاں ہم رہتے ہیں، غور کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہاں کی عدالت میں بھی دستوری طور پر مسلمانوں کے نزاعات ومقدمات اسلامی قوانین کے مطابق فیصل ہوتے ہیں، مسلمانوں کا مقدمہ عموماً اسلامی قانون کے خلاف فیصل نہیں ہوتا ہے، اگر ملک کا کوئی قانون ایسا بنتا ہے جس سے شریعت اسلامی میں مداخلت ہوتی ہے تو ہمارے علماء خاص طور سے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داران تحریک چلا کر اس قانون میں ترمیم کراتے ہیں اور چونکہ ہندوستان جمہوری ملک ہے اس لیے ہماری آواز پر توجہ بھی دی جاتی ہے اور مفید نتائج سامنے آتے ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر عدلیہ سے مسلمان بالکلیہ الگ ہوجائیں تو یہ پورا محکمہ غیر مسلم قانون دانوں سے بھر جائے گا، نیز عدالت کا رویہ مسلمانوں کے سلسلہ میں غیر منصفانہ اور جانبدارانہ ہوتا ہے ایسی صورت میں مسلمانوں کو ظلم وجور کا سامنا کرنا پڑے گا، یہ بھی صحیح ہے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کو جتنا نقصان مسلم ججوں سے پہنچا ہے دوسروں سے نہیں پہنچا، اس لیے ان حالات میں صاحب تقویٰ، خداترس اور دیندار مسلم ججوں کی سخت ضرورت ہے جو حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرکے عدل اسلامی کی حقانیت وصداقت اور مثالی رول کا نمونہ پیش کرسکے۔

اس لیے میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے شعبہ عدالت میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ودرست ہے بلکہ موجودہ حالات میں کوشش کرکے حاصل کرنے کی سخت ضرورت ہے، ساتھ ہی اگر صاحب حق کو حق دلانے اور مظلوموں کی مدد کرنے کی نیت ہو تو انشاء اللہ اس کا ثواب بھی ملے گا۔

ہاں اس کا خیال رہے کہ اگر کسی موقع پر اسلامی قوانین سے کسی قانون میں ٹکراؤ سامنے آئے تو ممکن حد تک جمع وتطبیق کی کوشش کرے اور احتیاط سے کام لے۔

محکمۂ انکم ٹیکس کی ملازمت:

حکومت کوئی بھی ہو اپنے نظام کو چلانے اور ترقیاتی کاموں کو انجام دینے کے لیے مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ رقم حاصل کرتی ہے جس کو انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، روڈ ٹیکس، غیرہ ناموں سے جانا جاتا ہے، بعض حضرات ان ٹیکسوں کو ناروا اور ظالمانہ کہتے ہیں، اس کی آمدنی کا بڑا حصہ حکمرانوں کے آرام وراحت اور عیش کوشی اور غیر معمولی سہولتوں میں خرچ کیا جاتا ہے، نیز اس میں لوگوں کے ذاتی معاملات میں مداخلت بھی کیا جاتا ہے، لوگوں کے سرمایہ میں تجسس بھی ہے تو شرعی اعتبار سے اس محکمہ کی ملازمت جائز ہے یا نہیں۔

یہ تو صحیح ہے کہ کوئی حکومت ٹیکس لیے بغیر اپنی ضروریات اور ترقیاتی منصوبوں کو مکمل نہیں کرسکتی ہے۔

ہندوستانی حکومت بھی اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنے شہری اور لوگوں سے ٹیکس لیتی ہے، جس کو دفاعی اور ترقیاتی کاموں میں خرچ کرتی ہے اس ٹیکس کو ناروا اور ظالمانہ کہنا محل غور ہے، اس لیے کہ ایسی صورت میں حکومت کا نظام درہم برہم ہوجائے گا اور انتظامی دشواریاں پیدا ہوں گی۔ اس لیے محکمہ انکم ٹیکس میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنا شرعاً جائز ودرست ہے جہاں تک ذاتی معاملات میں مداخلت اور تجسس کی بات ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

اب رہی بات حکمرانوں کی عیش کوشی اور غیر معمولی سہولتوں میں خرچ کرنے کی اگر واقعۃً ایسا ہے تو یہ ان کا عمل ہے وہ خود اس کے جواب دہ ہوں گے۔ اس سے دوسروں کی ملازمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن یقینی طور پر یہ کہنا بہت ہی دشوار اور مشکل ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ رقم مخصوص طریقہ پر حکمرانوں کی آرام وراحت اور غیر ضروری سہولیات میں خرچ ہوتی ہیں۔

بینک کی ملازمت:

بینک کا نظام سودی لین دین پر مبنی ہے جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے:

''أحل الله البيع وحرم الربوا، يمحق الله الربوا ويربي الصدقات'' (سورہ بقرہ، آیت: ۲۷۵، ۲۷۶)۔

(اللہ تعالیٰ بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیتا ہے، اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے)۔

حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، دینے والے، لکھنے والے، گواہ بننے والے، سب کو ایک ہی درجہ میں رکھ کر سب پر لعنت فرمائی ہے:

''لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوا و موکلہ و کاتبہ و شاھدیہ قال: ھم سواء'' (مسلم شریف:۲۷)۔

اس کے علاوہ بھی بہت ساری حدیثوں میں سود کی قباحت اور اس کی سنگینی کو بہت ہی سخت انداز میں بیان کیا گیا ہے جس کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اس لیے بینک کی وہی ملازمت اور خدمت جس میں سودی معاملات لکھنا، پڑھنا اور حساب و کتاب کرنا پڑتا ہے شرعاً حرام اور باعث گناہ ہے اور ہر مسلمان کے لیے اس سے بچنا اور پرہیز کرنا لازم وضروری ہے۔

البتہ اگر کوئی شخص بینک کی ملازمت کر رہا ہے اور اس کے پاس دوسرا جائز ذریعہ آمدنی نہیں ہے تو اس کے لیے بدرجہ مجبوری اس بات کی گنجائش ہے کہ فی الحال ملازمت ترک نہ کرے بلکہ ملازمت کرتا رہے اور کوئی حلال و پاکیزہ ذریعہ آمدنی تلاش کرتا رہے اور جب جائز ذریعہ حاصل ہوجائے تو بینک کی ملازمت سے علیحدہ ہوجائے اور دوران ملازمت توبہ واستغفار کرتا رہے۔

بینک کے وہ کام جس کا تعلق سودی معاملات سے نہ ہوں:

یہ سوال بھی اپنی جگہ بہت زیادہ اہم ہے کہ بینک کا وہ کام جس کا تعلق براہ راست سودی حساب کتاب اور معاملات سے نہ ہو جیسے بینک کے کمپیوٹر اور ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کے لیے مکان تعمیر کرنا، بینک کی حفاظت، بینک کو اپنا مکان کرایہ پر دینا وغیرہ ذالک یہ سب جائز ہے یا نہیں، چونکہ اس کا تعلق براہ راست سودی معاملات سے نہیں ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ سب کام جائز ہونا چاہیے، لیکن دوسری طرف کسی نہ کسی طرح سودی معاملات میں تعاون دینا بھی سمجھ مین آتا ہے جو معصیت و گناہ کا سبب بنتے ہیں جبکہ گناہ کے کاموں میں تعاون دینا بھی بنص قرآنی ممنوع اور باعث گناہ ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ سب کام بھی ناجائز وحرام اور باعث گناہ ہوں۔

کتب فقہ میں ایسے نظائر اور جزئیات موجود ہیں جیسے عصیر عنب ایسے آدمی سے فروخت کرنا جو شراب بناتا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے۔ حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک ناجائز وممنوع ہے۔

حضرت امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ معصیت عصیر عنب میں نہیں ہے بلکہ تبدیلی کے بعد جب شراب بنالیا جاتا ہے تو برائی اور معصیت آتی ہے جو بائع کا نہیں مشتری کا عمل ہے۔ اور حضرات صاحبین فرماتے ہیں کہ یہ گناہ کے کاموں میں تعاون دینا ہے اس لئے جائز نہیں ہے۔

''جاز بیع عصیر عنب ممن یعلم أنه یتخذہ خمرا، لأن المعصیة لاتقوم بعینه بل بعد تغیرہ وقیل: یکرہ لإعانته علی المعصیة۔ وفی رد المحتار (قوله جاز) ای عندہ لا عندھما'' (کتاب الفتاویٰ، ۵/ ۳۹۰)۔

اسی طرح یہ جزئیہ بھی موجود ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مندر یا کنیسہ کی تعمیر میں کام کرے یا شراب اٹھا کر دوسری جگہ پہنچائے خواہ جس طرح بھی ہو یا اپنا مکان کسی کو شراب بیچنے یا غیر مسلموں کو عبادت کے لیے دے تو حضرت امام صاحبؒ کے یہاں جائز ہے اور حضرات صاحبین کے نزدیک ناجائز مکروہ ہے۔

حضرت امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ عمل فی نفسہ جائز ہے اور مکان بطور اجارہ کرایہ پر دینا بھی جائز ہے، معصیت دوسرے کے عمل سے آتی ہے اور حضرات صاحبین فرماتے ہیں کہ یہ گناہ کے کاموں میں تعاون دینا ہے جو جائز نہیں ہے۔

اب یہاں پر قابل توجہ امور یہ ہیں کہ تعاون دینا کب سمجھا جائے گا؟

تو واضح یہ ہے کہ اس کا مدار قصد و نیت پر ہے، اگر کام کے وقت ہی نیت معصیت کی ہو تو یہ تعاون علی الاثم والعدوان میں شامل ہو کر ممنوع وحرام ہوگا ورنہ جائز ہوگا۔

یا یہ کہ وہ سامان گناہ کے علاوہ کسی دوسرے کام میں استعمال ہی نہ ہو جیسے طبلہ، سارنگی، ڈھول، باجہ وغیرہ اس کا بنانا اور خرید وفروخت کرنا گرچہ معصیت کے قصد وارادہ سے نہ ہو لیکن حکماً معصیت ہی کا قصد وارادہ سمجھا جائے گا اور ممنوع ہوگا، اور اگر معصیت کا قصد وارادہ نہ تو حقیقۃً ہو اور نہ حکماً تو گناہ کے کام میں تعاون

نہیں سمجھا جائے گا اور جائز ہوگا۔

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ تعاون علی المعصیۃ کا مدار نیت وارادہ پر ہے اگر نیت معصیت کی ہے تو تعاون علی المعصیت کی بنیاد پر حرام ہوگا اور اگر معصیت کی نیت نہیں ہے تو اعانت علی المعصیت میں شمار نہیں ہوگا اور جائز ہوگا۔

مذکورہ بالا تفصیلات وضاحت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بینک کے کمپیوٹر وایئر کنڈیشن کی مرمت اور بینک کے ملازمین سے اس کو فروخت کرنا، حفاظت کی ذمہ داری کو انجام دینا، بینک کے لیے مکان تعمیر کرنا یہ سب کام شرعاً جائز ہے چونکہ سب کام فی نفسہ جائز ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے بینک کی ملازمت کو ناجائز لکھتے ہوئے نیچے درجہ کی ملازمت وخدمت کو جائز قرار دیا ہے جس کا تعلق سودی معاملات سے نہیں ہے جیسے جاروب کش، چوکیدار وغیرہ۔

بینک کے حساب وکتاب کو آڈٹ کرنا:

سودی معاملات ہوجانے کے بعد جولوگ آڈٹ کرتے ہیں اور گزشتہ دنوں کے تمام حسابات اور کارگزاری اور رپورٹیں وغیرہ لکھتے ہیں یہ کام ان کے لیے جائز ہے جیسا کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے درس ترمذی میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

وکاتبہ:

اس کی تفصیل میں حافظ ابن حجرؒ نے یہ لکھا ہے کہ کاتب سود سے مراد وہ شخص ہے جو کہ عقد سود کے وقت سود وغیرہ کا حساب لکھ کر عاقدین کی اس عقد میں معاونت کرتا ہے وہ اس وعید میں داخل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص عقد سود کے انعقاد کے وقت یہ حساب وکتاب نہیں لکھتا بلکہ عقد کے بعد جب وہ پچھلے عرصہ کے تمام حسابات اور کارگزاری اور رپورٹیں وغیرہ لکھتا ہے تو اس کے ذیل میں سود کے حسابات بھی اسے لکھنے پڑتے ہیں، غرض یہ کہ اس حساب وکتاب سے عقد سود میں معاونت نہیں ملتی، تو وہ شخص اس وعید میں داخل نہیں ہوگا۔ اگر اس تفصیل کو پیش نظر رکھا جائے تو اس سے ان حضرات کی الجھن دور ہوسکتی ہے جن کا کام اکاؤنٹس اور آڈٹ وغیرہ کا ہے، ان لوگوں کو مختلف فرموں، اداروں اور کمپنیوں کے پورے سال کے حسابات لکھنے پڑتے ہیں اور اس کی چیکنگ کرنی ہوتی ہے، اس میں انہیں سود وغیرہ جس کا کمپنی نے عقد کیا ہوتا ہے، اسے بھی لکھنا پڑتا ہے لیکن ان کا یہ لکھنا محض ایک سالانہ رپورٹ اور کارگزاری کی حیثیت رکھتا ہے اس سے کمپنی کے سودی لین دین میں کوئی معاونت نہیں ہوتی، لہٰذا یہ حضرات اس وعید میں داخل نہیں ہوں گے۔

انشورنس کمپنی کی ملازمت:

انشورنس کا معاملہ بھی سود وقمار اور جوا پر مبنی ہے اور ان دونوں کی حرمت بھی نص سے ثابت ہے، اس لیے اس کمپنی کی بھی وہ ملازمت جس کا تعلق سودی حساب کتاب اور سودی معاملات سے ہو شرعاً جائز نہیں ہے، اور بطور ایجنٹ، یا کمیشن پر کام کرنا بھی شرعاً جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ گناہ کے کام میں تعاون ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔

البتہ اگر کوئی شخص قبل سے ملازمت کر رہا ہو اور اس کے پاس دوسرا جائز ذریعہ آمدنی نہ ہو تو بدرجہ مجبوری ملازمت کرتا رہے فی الفور ترک نہ کرے بلکہ دوسرا حلال ذریعہ معاش تلاش کرتا ہے، جب حلال ذریعہ حاصل ہوجائے تو انشورنس کمپنی کی ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلے اور دوران ملازمت توبہ واستغفار کرتا رہے۔

شراب کی کمپنی میں ملازمت:

شراب کی حرمت بھی نص قطعی سے ثابت ہے، شراب دینی، روحانی اور جسمانی مفاسد وخرابی کی بنیاد، اور مجموعہ ہے، آنحضور ﷺ نے اس کو ام الخبائث یا ام الفواحش فرمایا ہے، اور احادیث میں بہت سخت وعیدیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے شراب کے معاملہ میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے: (۱) نچوڑنے والا (۲) بنانے والا (۳) پینے والا (۴) پلانے والا (۵) شراب لاد کر لانے والا (۶) جس کے لیے شراب لائی جائے (۷) شراب فروخت کرنے والا (۸) شراب خریدنے والا (۹) جس کے لیے ہبہ کیا جائے (۱۰) شراب کی آمدنی کھانے والا۔

”عن أنس قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الخمر عشرة: عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة اليه وساقيها وبائعها واكل ثمنها والمشترى لها والمشترى له“ رواه الترمذى وابن ماجه (مشكوٰة شريف كتاب البيوع: ۲۴۲)۔

ملاعلی قاری نے مشکوٰۃ المصابیح کی شرح مرقاۃ المفاتیح میں اس کی شرح کرتے ہوئے علامہ طیبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ صرف دس ہی مراد نہیں ہیں بلکہ ان تمام لوگوں پر حضور ﷺ کی لعنت ہے جو شراب کے معاملہ میں کسی طرح کا معاون بنیں۔

”قال الطيبى رحمه الله: لعن من سعى فيها سعيا ما على ما عدد كمن العاصر والمعتصر وما اردفهما وانما اطنب فيه يستوعب من زاولها مزاولة مابأى وجه كان“ (مرقات المفاتيح، ۳/۲۹۷)۔

لہٰذا شراب کی کمپنی میں ملازمت کسی بھی حال میں شرعاً جائز نہیں ہے، مسلمانوں پر اس سے احتراز لازم ہے، خواہ شراب کی خرید وفروخت کرے یا کمپنی میں رہ کر شراب کے لیے بوتل بنائے یا اس کا حساب وکتاب لکھے، یہ تمام صورتیں تعاون علی الاثم والعدوان میں شامل ہو کر ناجائز وحرام اور باعث گناہ ہوں گی اور سب کا حکم یکساں ہوگا، البتہ اگر کوئی دوسری کمپنی میں رہ کر بوتل بنائے جہاں سے مختلف کمپنیوں کو بوتل کی سپلائی ہوتی ہو جس میں شراب کی بھی بوتل بنتی ہو اور بوتل بنانے والے کی نیت معصیت کی نہ ہو تو بوتل بنانے کی اجازت ہوگی۔

سپر مارکیٹ کی ملازمت:

یہاں پر ان اداروں اور جگہوں میں ملازمت کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا کاروبار اصلاً حرام نہیں ہے لیکن ضمنی طور پر وہاں منکرات ومنہیات اور حرام کاموں کا ارتکاب ہوتا ہے، جیسے سپر مارکیٹ جہاں روزمرہ اور ضروریات زندگی کی مختلف چیزیں فروخت کی جاتی ہیں لیکن اس میں شراب بھی فروخت ہوتی ہے اور دیگر شرعی ممنوعات کا معاملہ بھی ہوتا ہے خنزیر کا گوشت اور بعض حرام اشیاء بھی فروخت کی جاتی ہیں۔

اسی طرح ہوٹل بھی لوگوں کی ایک ضرورت ہے، سیر وتفریح اور سیاحت کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور مسافروں کی رہائش کی ضرورت کے پیش نظر یہ ایک نفع بخش تجارت کی شکل اختیار کر گیا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شراب وشباب، عیاشی وفحاشی سیون اسٹار، اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کی شناخت بن گئی ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان محرمات ومنکرات اور منہیات کے باوجود ایسے اداروں کی ملازمت درست ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہی دیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی مارکیٹ اور ہوٹلوں میں جو ذمہ داریاں اس کے سپرد کی جائیں ان میں براہ راست وہ کام کرنا پڑتا ہو جو حرام اور باعث گناہ ہے جیسے شراب اور خنزیر کا گوشت وغیرہ تو یہ ملازمتیں حرام ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بچنا اور پرہیز کرنا ضروری و لازم ہے، اور اگر براہ راست ممنوع وحرام کاموں کا ارتکاب نہ کرنا پڑتا ہو تو ایسی ملازمت شرعاً جائز ہے۔

مفتی محمود الحسن علیہ الرحمہ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

آپ کی اصل آمدنی تو جائز تھی لیکن اب آپ کو اپنی جائز ملازمت میں کچھ ایسا کام بھی کرنا پڑتا ہے جس کی شرعاً اجازت ہیں، جائز کام کے مقابلہ میں اگر دوسرا کام کم ہے تو اپنی ملازمت ترک نہ کریں اگر جائز کام کم ہو اور دوسرا کام زائد ہو تب بھی فوراً ملازمت ترک نہ کریں، مبادا کہ پریشانی کا سامنا ہو جو قابل برداشت نہ ہو، البتہ دوسری جائز کسب معاش تلاش کرتے رہیں جب وہ میسر آجائے تب ان موجودہ ملازمت کو ترک کردیں۔ استغفار بہرحال کرتے رہیں نیز اللہ پاک سے حلال کسب معاش کی دعاء میں لگے رہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمائیں گے۔

مخلوط نظام تعلیم وتدریس:

درس وتدریس، بہت مقدس اور پاکیزہ پیشہ اور کار نبوت ہے، حضور اقدس ﷺ کے اوصاف حمیدہ میں اہم ترین وصف آپ کا معلم ہونا بھی ہے، آپ ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تعلیم بھی ہے، اس لیے تدریسی خدمات دینا جائز ہی نہیں بلکہ اگر نیت صحیح ہو تو باعث اجر وثواب بھی ہے۔

لیکن موجودہ دور میں مخلوط نظام تعلیم نے اس مقدس پیشہ کو جائز وناجائز کا موضوع بحث بنا دیا ہے آج کی تعلیم گاہ میں مرد اساتذہ، لڑکوں کی درسگاہ میں عورتیں تعلیم دیتی ہیں جس کے نتیجے میں اختلاط مرد وزن عام ہے، شرعی حدود وقیود کی رعایت ناپید ونا ممکن ہے روز بروز سماجی اور معاشرتی برائیوں میں اضافہ ہو رہا

ہے۔

لہٰذا مخلوط تعلیم گاہ قائم کرنا اور اس میں تدریسی خدمت انجام دینا ناجائز اور باعث گناہ ہے، لڑکیوں کی تعلیم گاہ میں مرد کے لیے اور لڑکوں کی درسگاہ میں عورتوں کے لیے پردۂ شرعی کی رعایت کے بغیر تعلیم دینا شرعاً جائز نہیں ہوگا۔

البتہ اس طرح کا انتظام کیا جائے کہ نشست گاہ دونوں کی ایسی ہو کہ دوسرے کا سامنا نہ ہو اور اختلاط سے بچایا جائے، پردۂ شرعی کی رعایت ہو، معلم اور معلمہ بھی پردہ میں ہوں تو اس طرح تعلیم دینے کی اور ملازمت کرنے کی شرعاً گنجائش ہے۔

پیشہ وکالت:

کسب معاش کے مختلف ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ پیشہ وکالت بھی ہے، اس کا مقصد ظالموں کو سزا دلانا، مظلوموں کو عدلیہ سے انصاف دلانے کی کوشش کرنا ہوتا ہے جہاں دوسرے لوگوں کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیلوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات میں وکیلوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اکثر و بیشتر اچھے وکلاء کی تلاش ہوتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وکلاء حضرات ظالم و مظلوم میں کوئی فرق نہیں کرتے، مظلوم کی مدد کرنے کے بجائے ظالم کی مدد کر کے صاحب حق کو محروم کروا دیتے ہیں، وکلاء اپنے موکل کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے کذب بیانی کی باضابطہ تربیت دیتے ہیں، ان حالات میں پیشہ وکالت کا شرعاً کیا حکم ہے جائز ہے یا نہیں؟

پیشہ وکالت کی مشروعیت قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اس لیے فی نفسہٖ پیشہ وکالت شرعاً جائز ہے اور اس کے جواز میں حضور ﷺ کے زمانہ سے لے کر اب تک فقہاء کا اس پر اتفاق اور امت کا اجماع ہے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی ہے۔

"أما الاجماع فقد أجمع الفقهاء على جواز الوكالة ومشروعيتها منذ عصر رسول الله ﷺ إلى يومنا هذا ولم يخالف في ذالك احد من المسلمين" (الموسوعة الفقهية، ۸/ ۴۵)۔

عقلاً بھی اس کا جواز سمجھ میں آتا ہے، اس لیے کہ ہر آدمی میں اچھے انداز سے اپنے حقوق کے مطالبہ کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے اور پوری قوت سے اپنی بات کہنے کی ہمت بھی نہیں کر پاتا ہے، اس لیے یہ لوگوں کی ضرورت ہے اور مشکلات و دشواری سے بچنے اور سہولت و آسانی کی راہ ہے۔

"وأما المعقول فلأن الحاجة داعية إلى مشروعية الوكالة فانه لا يمكن لكل واحد فعل ما يحتاج إليه بنفسه فدعت الحاجة إليها" (حواله بالا)۔

خلاصہ یہی ہے کہ پیشہ وکالت شرعاً جائز و درست ہے اور اجرت لینا بھی درست ہے جبکہ اجرت طے ہو، سچے مقدمات کی پیروی کرے، جھوٹ اور دیگر خلاف شرع امور سے پرہیز کرے۔

حضرت مفتی محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اس طرح کے سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر سچے مقدمات میں باقاعدہ کام اور اجرت معین کر کے وکالت کی جائے اور کوئی کام خلاف شرع اس میں نہ کیا جائے تو نفس وکالت اور اس کی اجرت کا روپیہ اور اس کا کھانا درست ہے۔" (فتاویٰ محمودیہ، ۱۶/ ۴۵۰)۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

حاصل یہ ہے کہ پیشہ وکالت فی نفسہٖ جائز ٹھہرا اگر شرط یہ ہے کہ سچے مقدمات لیتا ہو (امداد الفتاویٰ، ۳/ ۳۲۰)۔

اگر غلط مقدمات کی پیروی کی جائے، یا ظالم کی مدد کر کے مظلوم کو حق و انصاف سے محروم کرنے کی کوشش ہو تو ایسی وکالت اور اس کی آمدنی شرعاً ناجائز ہے، اس لیے یہ حرام ہے اور حرام کام کی اجرت بھی حرام ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اور جس وکالت میں معصیت پر اجرت لیا جائے یعنی جھوٹے اور ناحق مقدمہ کی پیروی کی جائے اور ظالم کی اعانت کی جائے ایسی وکالت اور اس کی آمدنی

ناجائز ہے۔(فتاویٰ محمودیہ،۱۶/ ۴۵۳)

"لایجوز أخذ الأجرة علی المعاصی کالغناء والنوح والملاهی لأن المعصیة لایتصور استحقاقها بالعقد فلا یجب علیه الأجر وإن أعطاه الأجر أو بعضه لایحل له ویجب علیه رده"۔ (مجمع الانھر، ۲/ ۵۳۳، کتاب الاجارہ)۔

پیشہ طبابت وڈاکٹری:

انسانیت کی خدمت کا بہت بڑا ذریعہ پیشہ طبابت وڈاکٹری ہے، بیمار اور مریض انسانوں کا علاج کرکے اس کو آرام اور راحت پہنچانا اجر وثواب کا ذریعہ ہے، اس لیے مسلمانوں کا یہ پیشہ اختیار کرنا شرعاً جائز ودرست ہے، سرکاری یا غیر سرکاری ہاسپٹل میں ملازمت کرنا اور اس کی تنخواہ لینا شرعاً جائز ودرست ہے، اور اگر خدمت خلق کا جذبہ اور نیت صحیح ہو تو اجر وثواب کا ذریعہ بھی ہے اور اہل ایمان کے لیے اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کا باعث بھی ہے۔البتہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ مرد ڈاکٹر مرد مریضوں کا علاج کرے اور عورت ڈاکٹر عورت مریضوں کا علاج کرے، لیکن بسا اوقات ایسے ماہر ڈاکٹر دستیاب نہیں ہوتے یا مرض ایسا ہو کہ مریض عورت کے لیے خاتون ڈاکٹر اور مریض مرد کے لیے مرد ڈاکٹر نہ ہوں تو بدرجہ مجبوری بوقت ضرورت مرد عورت ڈاکٹر سے اور عورتیں مرد ڈاکٹر سے علاج کراسکتے ہیں لیکن ضروری ہوگا کہ حتی الامکان ستر کا خیال رکھا جائے۔نیز بغرض علاج ضرورت کی حد تک قابل ستر حصے کا دیکھنا بھی شرعاً جائز ہے۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"وقال فی الجوهرة: إذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر عند الدواء لأنه موضع ضرورة، وإن کان فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها فإن لم توجد وخافوا علیها أن تهلك أو یصیبها وجع لا تحتمله لیستروا منها کل شئ إلا موضع العلة، ثم یداویها الرجل ویغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح فتأمل والظاهر أن ینبغی هنا للوجوب" (ردالمحتار کتاب الحظر والاباحة فصل فی النظر والمس، ۵/ ۲۳۷)۔

(اور جوہرہ میں کہا ہے کہ جب شرمگاہ کے علاوہ پورے بدن میں مرض ہو تو علاج کے وقت اس کو دیکھنا جائز ہے، اس لیے کہ اس جگہ ضرورت ہے اور اگر مرض شرمگاہ کی جگہ میں ہو تو مناسب ہے کہ کسی عورت کو تعلیم دیدے اور وہ علاج کرے اور اگر ایسی عورت نہ ملے اور اس کی ہلاکت کا یا ناقابل برداشت درد ہونے کا اندیشہ ہو تو مرض کی جگہ کے علاوہ پورے جسم کو ڈھانک کر کوئی مرد علاج کرے اور اپنی قدرت بھر اپنی نگاہ جھکا کر رکھے، البتہ زخم کی جگہ کو دیکھ سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں ینبغی کا لفظ وجوب کے لیے ہے)۔

واضح رہے کہ مسلمان ڈاکٹروں کی ذمہ داری ہوگی کہ غیر ضروری آپریشن اور جانچ سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کریں اور محض مالی منفعت کے لیے مریضوں کو بیجا پریشان کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

☆☆☆

مختلف نوع کی ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

مولانا خورشید احمد اعظمی [1]

انسانی معیشت کا نظام بھی رب العالمین کی حکمت اور شان ربوبیت کا ایک خاص مظہر ہے، کہ یہ انسان خواہ کتنی بھی برتری حاصل کرلے، اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر فائز ہوجائے، جسمانی، مالی اور افرادی قوت کی انتہاء کو پہنچ جائے، سائنسی ترقیات اور مشینی ایجادات کے ذریعہ خود کفیل ہونے کی ہر ممکن کوشش کرے، پھر بھی رب العالمین کی غیرت غنا نے اس کو احتیاج سے بے نیاز نہیں کیا، کتنی ہی ضروریات زندگی ایسی ہیں کہ ہر طرح کی آسائش وسہولیات مہیا ہونے، اور بظاہر دوسروں سے مستغنی ہونے کے باوجود، انسان ان کی تکمیل اور انجام دہی کے لیے اپنے غیر کا محتاج ہوتا ہے، ان کو پورا کرنے کے لیے دوسرے سے مدد اور تعاون لینا ہے، اور اس کے عمل یا اس کی ملکیت سے نفع حاصل کرنے کا معاوضہ ادا کرتا ہے، اس طرح اس ربانی نظام سے دو آدمیوں کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے، ایک کی در پیش حاجت انجام پاتی ہے، اور یہی عمل دوسرے کے لیے رزق اور آمدنی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اجارہ اور اس کا ثبوت:

اس باہم احتیاج ناس کے پیش نظر "اجارہ" کو جائز کہا گیا ہے، حالانکہ عقد اجارہ کے وقت، عوضین میں سے ایک، یعنی منفعت معدوم ہوتی ہے، اگر چہ صحت اجارہ کے لیے اس کا معلوم ہونا ضروری ہے، عقد اجارہ، کتاب اللہ، سنت رسول اور تعامل صحابہ سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن" (سورۂ طلاق: ۶) (پھر اگر وہ عورتیں تمہارے لیے (تمہارے بچوں کو) دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت ادا کرو)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں مذکور ہے:

"قال إني أريد أن أنكحك احدى ابنتي هاتين على أن تاجرني ثماني حجج ..." (سورۂ قصص: ۲۷) ((حضرت شعیب علیہ السلام) نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح آپ سے کردوں، اس شرط پر کہ آپ میری مزدوری کریں آٹھ سال)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

"قال احتجم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واعطی الحجام اجره" (صحیح بخاری مع فتح الباری، ۴/ ۴۵۸، حدیث ۲۲۷۸) (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فصد کھلوائی، اور پچھنے لگانے والے کو اس کی اجارت عنایت فرمائی)۔

ان مذکورہ آیات واحادیث سے اجرت پر کام کرنے اور ملازمت کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

اجارہ کی تعریف:

اجارہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"عقد يرد على المنافع بعوض" (ہدایہ ۳/ ۲۷۷) (ایسا معاملہ جو عوض پر منافع حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے)۔

---

[1] محلہ رگھوناتھ پورہ، مئو۔

"تملیك نفع مقصود من العین بعوض" (درمختار، ۹/ ۴) (معاوضہ پر ایسی منفعت کا مالک بنانا جو شی سے مقصود ہوتی ہے)۔

"بیع المنفعة المعلومة بعوض معلوم" (شرح المجلة، ۱/ ۲۲۳، نیز کنز الدقائق مع البحر، ۸/ ۵) (منفعت معلومہ کو عوض معلوم یا اجرت معلوم پر فروخت کرنا)۔

یعنی بیع وشراء کے مثل اجارہ بھی ایک معاملہ ہے جس کا مقصد کسی انسان کے عمل یا اس کی ملکیت سے منفعت حاصل کرنا ہوتا ہے، اور شخص آخر کو اس منفعت کا معاوجہ ادا کیا جاتا ہے، جو باہمی رضامندی سے ہونا چاہیے، اسی لیے اس کے ارکان بھی ایجاب وقبول ہی ہیں، خواہ بالمشافہ بذریعہ گفتگو ہوں، یا بالمکاتبہ، بذریعہ تحریر، اور باہمی رضامندی کے لیے نزاع کے اسباب کا دور ہونا ضروری ہے، اسی لیے اس معاملہ کے صحیح ہونے کے لیے منفعت اور اجرت دونوں کا معلوم اور متعین ہونا شرط ہے۔

"وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة" (شامی، ۹/ ۷)۔

"وعن أبي سعيد قال: إذا استاجرت اجيرا فاعلمه أجره" (سنن النسائی، ۷/ ۳۲) (جب تم کو مزدور (یا ملازم) سے اجرت پر معاملہ کرو، تو اس کی اجرت اسے بتلادو)۔

نیز وہ منفعت جس کے حصول کے لیے معاملہ اور عقد ہوتا ہے، شریعت اور ارباب نظر کی نگاہ میں اس کا مقصود اور مطلوب ہونا بھی شرط ہے، کوئی ایسی منفعت نہ ہو جو شرعاً یا عقلاً درست نہیں۔

"ثم انه يشترط في المنفعة أن تكون مقصودة من العين في الشرع ونظر العقلاء" (شرح المجله، ۱/ ۲۲۳) (پھر منفعت کے بارے میں یہ شرط ہے کہ وہ شریعت اور عقلاء کی نگاہ میں شئی سے مقصود ہو)۔

مثلاً محض آرائش اور زینت کے لیے کپڑے یا برتن کا اجارہ، یا محض اس ارادہ سے کوئی جانور کرایہ پر لینا کہ دروازہ پر بندھا رہے گا اور لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ صاحب حیثیت ہیں، ان کے پاس یہ مویشی بھی ہے، درست نہیں ہے، اور اسی لیے معصیت پر اجرت لینا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ وہ بھی شرعاً مقصود نہیں ہوتی۔

"لأن المعصية لايتصور استحقاقها بالعقد" (البحر، ۸/ ۳۵) (کیونکہ عقد کی وجہ سے معصیت کا حق ہونا متصور نہیں)۔

معقود علیہ یعنی منفعت کے اعتبار سے اجارہ کی دو انواع ہیں:

۱۔ "عقد الاجارة الوارد على منافع الأعيان" (اجارہ کا وہ معاملہ جو اشیاء سے منفعت حاصل کرنے کے لیے ہو) جیسے مکان، دوکان، برتن، کپڑے، گھوڑا گاڑی وغیرہ کرایہ پر لینا دینا)۔

"عقد الاجارة الوارد على العمل" (شرح المجله، ۱/ ۲۳۶) (کام اور عمل پر اجرت لینے دینے کا معاملہ کرنا)۔

اس دوسرے نوع کے اعتبار سے اجرت پر کام کرنے والے شخص کو اجیر سے تعبیر کرتے ہیں، اجیر کی دو قسم ہیں:

۱۔ اجیر مشترک: اس اجیر کو کہتے ہیں جو صرف مستاجر کے کام کا ہی پابند نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کے کام کرنے کا بھی مجاز ہوتا ہے، اس کے لیے کسی وقت یا مدت کی تخصیص یا پابندی نہیں ہوتی، جیسے خیاط، موچی، حمال وغیرہ۔

"هو الذي لم يقيد بشرط عدم العمل لغير المستاجر" (شرح المجله، ۱/ ۲۳۶) (اجیر مشترک وہ شخص ہے جو پابند نہ کیا گیا ہو غیر مستاجر کے کام نہ کرنے کا)۔

ایسے اجیر کا حکم یہ ہے کہ جب وہ مستاجر کے عمل کو انجام دے گا تو اجرت کا مستحق ہوگا۔

۲۔ اجیر خاص: "وهو الذي استوجر على أن يعمل للمستاجر فقط عملا موقتا بمدة معلومة كالخادم مشاهرة" (ایضاً) (وہ اجیر ہے جس سے اجرت کا معاملہ اس طور پر کیا گیا ہو کہ وہ صرف مستاجر کا کام کرے گا، متعینہ مدت میں مقررہ کام، جیسے ماہانہ خدمت کرنے والا (ملازم،

نوکر))۔

اجیر خاص کا حکم یہ ہے کہ اگر مدت اجارہ میں حاضر ہو اور اس کی طرف سے عمل میں کوئی مانع نہ ہو تو یہ اجرت کا مستحق ہو جائے گا، اگر چہ عمل انجام نہ پائے، اجیر خاص کو عرف میں ملازم سے تعبیر کرتے ہیں اور اس نوع کے اجارہ کو ملازمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مستاجر اور عمل کے لحاظ سے ملازمت کی مختلف صورتیں ہیں: بعض ملازمتیں سرکاری اداروں کی ہوتی ہیں، اور بعض پرائیویٹ کمپنیوں اور افراد کی، لیکن ان ساری ملازمتوں میں یہ امور ملحوظ رہنے چاہئیں کہ وہ عمل جس کے لیے ملازمت کی جاتی ہے معصیت اور حرام نہ ہو، اس عمل سے کسی ظلم یا گناہ کی اعانت نہ ہو۔ شریعت کی نظر میں وہ عمل لغو اور لایعنی نہ ہو، مدت مقرر اور اجرت معلوم ہو، ملازم کی طرف سے عمل میں کوتاہی اور بد دیانتی نہ ہو، اور مستاجر کی طرف سے اجرت کی ادائیگی میں ظلم اور بدعہدی نہ ہو، ان امور کی رعایت کے ساتھ کوئی ملازمت بھی جائز ہو سکتی ہے، علی سبیل المثال چند ملازمت کی اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ الف: شعبہ فوج کی ملازمت:

یہ ملازمت عقد الاجارۃ علی العمل کی نوع سے ہے، فوجی ملازم اجیر خاص ہوتا ہے، اور مستاجر (حکومت) کی طرف سے متعینہ مدت کے لیے معلوم اجرت پر معاملہ کا پابند ہوتا ہے، اس کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا، غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان قائم رکھنا اور عوام کی مدد کرنا ہوتا ہے، اور یہ امور شرعی طور پر ممنوع نہیں بلکہ حدیث رسول اللہ ﷺ: "من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون أهله فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون دمه فهو شهيد" (سنن النسائی، ۷/۱۱۶)

(جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے اہل کے دفاع میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے، جو شخص اپنے دین کی حفاظت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے، اور جو اپنی جان بچانے میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے)۔

اس کی رو سے مسلمان فوجی شہید کا مرتبہ پانے کا مستحق ہے، کیونکہ اپنے ملک کی حفاظت اور اس پر حملہ آور کا مقابلہ کرنا درحقیقت اپنے نفس، اہل اور مال کا تحفظ اور دفاع کرنا ہے، کسی شہری کی اپنے مسکن اور وطن سے محبت طبعی ہے، اور آیت کریمہ:

"قالوا وما لنا أن نقاتل في سبيل الله وقد أخرجنا من ديارنا......" (سورۂ بقرہ: ۲۴۶) (ان لوگوں نے کہا: اور کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ کے راستہ میں قتال نہ کریں، حال یہ ہے کہ ہم اپنے دیار سے نکالے بھی گئے، سے حب وطن کی تائید بھی ہوتی ہے، نیز ایک روایت جس کی صحت میں محدثین کو کلام ہے، اس میں وارد ہے:

"حب الوطن من الإيمان" قال السخاوي: لم أقف عليه ومعناه صحيح (المقاصد الحسنۃ، ص ۱۹۵)، نیز فوج میں مسلمانوں کا وجود اور ان کی کثرت، مسلمان باشندگان وطن کی قدر ومنزلت، شان وشوکت اور وجاہت ودبدبہ کا سبب بھی ہے، اس لیے مسلمانوں کا فوج میں ملازمت کرنا جائز اور مستحسن ہے۔

فوج کی ملازمت میں کبھی ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ مسلمان فوجی کا مدمقابل اس کا ہم مذہب شخص ہو، اور حدیث میں وارد ہے: "سباب المسلم فسوق وقتاله كفر" (صحیح مسلم کتاب الایمان، حدیث ۱۱۶/ ۶۴) (مسلمان سے گالی گلوچ کرنا فسق ہے اور اس سے (ناحق) قتال کرنا کفر ہے)۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے: "اذا التقى المسلمان بسيفيهما، فالقاتل والمقتول في النار" (صحیح بخاری مع الفتح ۱۲/ ۱۹۲، حدیث ۶۸۷۵، ۷۰۸۳) (جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ مدمقابل ہو تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں (داخل ہونے کے مستحق) ہیں)۔

لیکن ظاہر ہے کہ حدیث میں مذکورہ وعید ہر ایک کے لیے نہیں ہو سکتی، کیونکہ قرآن میں یہ بھی مذکور ہے:

"والذين اذا أصابهم البغي هم ينتصرون" (شوریٰ: ۳۹) (اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں)۔

"ولمن انتصر بعد ظلمه فاولئك ماعليهم من سبيل" (شوریٰ: ۴۱) (اور جس نے اپنے مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لیا تو ان پر کوئی

الزام نہیں)۔

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے مذکورہ حدیث کی شرح میں علامہ خطابی کا یہ قول نقل کیا ہے:

"هذا الوعيد لمن قاتل على عداوة دنيوية أو طلب ملك مثلا. فأما من قاتل أهل البغي أو دفع الصائل. فقتل فلا يدخل في هذا الوعيد، لأنه مأذون له في القتال شرعا" (فتح الباری، ۱۲/۱۹۷) (یہ وعید اس شخص کے لیے ہے جو دنیاوی عداوت یا طلب حکمرانی کے لیے قتال کرے، اور وہ شخص جو اہل بغاوت سے قتال کرے یا حملہ آور کو دفع کرے اور قتل کرے تو اس وعید میں داخل نہیں ہوگا، کیونکہ یہ شرعی طور پر قتال کے لیے مجاز ہے)۔

اور صاحب فتح القدیر علامہ ابن الہمام نے بھی یہی توجیہ کیا ہے لکھتے ہیں:

"فمحمول على اقتتالهما حمية وعصبية، كما ينفق بين اهل قريتين ومحلتين أو لأجل الدنيا والمملكة" (فتح القدیر مع الکفایہ، ۵/۳۳۶) (روایت محمول ہے ان دونوں کے تعصب اور حمیت پر مبنی آپسی قتال پر، جیسا کہ دو گاؤں یا دو محلوں کے درمیان واقع ہوتا ہے، یا دنیا اور سلطنت کی خاطر)۔

لہٰذا مسلمان فوجی کا مدمقابل اگر ایسا مسلمان ہے جس کی طرف سے ظلم و زیادتی ہے، وہ حملہ آور ہے تو پھر اس مسلمان فوجی کو اس حملہ آور کے روکنے اور اپنے مل کا دفاع کرنے کا شرعی و قانونی جواز ہوگا، اس پر یہ ماجور ہوگا، اور ہلاک ہو گیا تو شہید ہوگا، اور اگر اعتداء وابتداء مسلمان فوجی کی حکومت کی طرف سے ہے تو اس کا اپنا مدمقابل ہم مذہب پر وار کرنا درست نہیں ہوگا، اور اگر اس نے کمانڈر کے حکم سے اپنے مدمقابل پر حملہ کیا تو مذکورہ وعید کا مستحق ہوگا، کیونکہ شرعی طور پر صرف اس قتال کی اجازت ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہو، یا اپنی جان، مال، دین اور اہل وعیال کی طرف سے دفاع کے لیے ہو۔

البتہ اس صورت میں امیر کی اطاعت سے انحراف اور اس کے حکم سے سرتابی لازم آتی ہے، جبکہ حدیث میں سمع وطاعۃ کی بڑی تاکید کی گئی ہے اور اس نافرمانی کی صورت میں خود اپنے لیے مصیبت کو دعوت دینا ہے، لیکن ان سب کے باوجود کمانڈر کی اطاعت نہیں کرے گا، کیونکہ جہاں خالق کی معصیت ہو ایسے امر میں مخلوق کی طاعت کا جواز نہیں، اگر اس نے کمانڈر کا حکم مانتے ہوئے اپنے ہم مذہب کو مار دیا تو قتل ناحق کا مرتکب ہوگا۔

"ولو قالوا لأسير مسلم: اقتل لنا هذا الأسير المسلم أو لنقتلنك لم يسعه أن يقتله، لما جاء في الأثر ليس في القتل تقية" (اگر کفار نے کسی مسلمان قیدی سے کہا کہ تم اس (دوسرے) مسلمان قیدی کو قتل کرو، ورنہ ہم تم کو قتل کر ڈالیں گے تو اس کو (دوسرے مسلم قیدی) قتل کرنے کی گنجائش نہیں (جائز نہیں) کیونکہ حدیث میں وارد ہے: قتل میں تحفظ نہیں ہے)۔

علامہ سرخسیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ولأنهم أمروه بالمعصية ولا طاعة للمخلوق في معصية الخالق، وهو بالإقدام على القتل يجعل روح من هو مثله في الحرمة وقاية لروح ويقدم على ماهو من مظالم العباد ولا رخصة في ذلك" (شرح السیر الکبیر، ۴/۱۵۰۳) (اور اس لیے کہ ان (کفار) نے اس کو معصیت کا حکم دیا ہے اور خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں، اور وہ (مسلمان قیدی) قتل پر اقدام کر کے ایک ایسے شخص کی روح کو جو حرمت واحترام میں اسی کے مثل ہے اپنی جان کے لیے ڈھال بنا رہا ہے، اور مظالم عباد پر اقدام کر رہا ہے، جس کی رخصت واجازت نہیں ہے)۔

وجہ استشہاد یہ ہے کہ جب ایک مسلمان قیدی جس کو یہ دھمکی دی جارہی ہے کہ یا تو اپنے ہم مذہب قیدی کو قتل کرے ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا، تو اس کو یہ اجازت نہیں کہ اپنی جان بچانے کے لیے اپنے ہم مذہب کو قتل کرے، تو پھر اس ملازم فوجی کو یہ اجازت بدرجہ اولی نہیں ہوگی، زیادہ سے زیادہ یہ ملازمت سے برخاست کیا جائے گا، یا کسی سزا کا مستحق گردانا جائے گا جو بہر حال قتل سے اہون ہے، الاشباہ والنظائر کی اس عبارت:

"وقالوا: الكافر إذا تترس بمسلم، فإن رماه مسلم فإن قصد قتل المسلم حرم، وإن قصد قتل الكافر لا"

(ص ۴۶، قاعدہ الامور بمقاصدہا) (اور فقہاء نے کہا ہے کہ کافر جب کسی مسلمان کو آڑ اور ڈھال بنالے، تو اگر کوئی مسلمان اس کو مسلم کے قتل کے ارادہ سے مارے تو حرام ہے، اور اگر کافر کے قتل کا ارادہ کیا تو حرام نہیں) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا، اس پر حملہ کرنا درست اور جائز نہیں۔

اطاعت امیر کی ایک حد شریعت میں مقرر ہے، جس کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک امیر لشکر کو لشکر کی کسی بات سے ناراضگی ہوئی، انہوں نے آگ جلوائی اور اطاعت امیر کے حوالہ سے لوگوں کو اس آگ میں کود جانے کا حکم دیا، بعض لوگوں نے اطاعت امیر میں اس کا ارادہ کرلیا، اور بعض لوگوں نے اس سے انکار کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے آگ میں داخل ہونے کا ارادہ کرلیا تھا، فرمایا:

''لم تزالوا فيها إلى يوم القيامة وقال للآخرين: قولا حسنا وقال: لاطاعة في معصية الله إنما الطاعة في المعروف'' (صحیح مسلم کتاب الامارة، حدیث: ۱۸۴۰) (اگر تم لوگ اس میں کود گئے ہوتے تو قیامت تک اسی میں رہتے، اور دوسرے لوگوں کے بارے میں آپ نے اچھی بات کہی اور فرمایا: اللہ کی معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں، بلکہ اطاعت خیر اور معروف کاموں میں ہے)۔

لہٰذا ظلماً کسی بھی مسلمان پر وار کرنا درست نہیں، اگرچہ کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی لازم آئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ:

☆ سرحد اور ثغور کی حفاظت ایک متوارث اور معروف عمل ہے۔

☆ اس عمل کے لیے فوج کی ملازمت اور اس پر اجرت لینا جائز ہے۔

☆ شرعی طور پر صرف اسی قتال کا اعتبار و جواز ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ اور جان و مال، اور دین و اہل کے تحفظ اور دفاع کے لیے ہو۔

☆ اسلام میں عہد و معاہدہ کے ایفاء کی بڑی تاکید ہے، حکومتوں کا باہمی معاہدہ بھی اس میں داخل ہے۔

☆ مسلمان فوجی کے لیے اپنے ملک کے دفاع میں ایسے مسلمان پر وار کرنا جائز ہوگا جس نے دنیوی غرض سے اس کے ملک پر حملہ اور چڑھائی کی ہو۔

☆ کسی بھی مسلمان کے لیے ناحق قتل کی اجازت نہیں، لہٰذا اگر تعدی اور غدر اس کی فوج اور ملک کی طرف سے ہو تو اس مسلمان فوجی کے لیے اپنے مدمقابل ہم مذہب پر حملہ اور وار کرنا جائز نہیں ہوگا۔

☆ امیر اور کمانڈر کی اطاعت ایسے امور میں درست اور جائز نہیں جس میں شریعت کی خلاف ورزی لازم آئے۔

ب۔ شعبہ پولیس کی ملازمت:

اس شعبہ کی ملازمت بھی جائز ہے، کیونکہ اجرت (مشاہرۃ) معلوم ہوتی ہے، اور پولیس ملازم کام کے لیے حاضر ہوتا ہے، اور اس کا عمل، اندرون ملک امن و امان کو سنبھالنا و قائم رکھنا، معصیت بھی نہیں ہے، بلکہ جائز عمل ہے، بدزبانی یا ظلم و زیادتی اس ملازمت کا حصہ نہیں ہے، اور ایک مسلمان کے لیے ان امور سے بچنا ممکن ہے، اور اس کے لیے ان سے احتراز کرتے ہوئے اس ملازمت کو انجام دینا لازم ہے، اور اس شعبہ میں بھی مسلمانوں کی اکثریت صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام شہریوں کے لیے باعث راحت و رحمت ہے، نیز مسلمان پولیس اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ اس شعبہ کی ملازمت کے ذریعہ اس شعبہ کی اصلاح اور سدھار کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

پولیس اور فوج کا محکمہ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں قائم ہو چکا تھا، اور آپ نے ان کی تنخواہیں بھی مقرر کر رکھی تھیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: البدایہ والنہایہ، نیز الفاروق مصنفہ علامہ شبلی نعمانی، ۲/ ۷۲، ۹۶)۔

مظلوم پر گولی کا استعمال:

اسلام میں کسی پر ظلم کرنے یا اسے ناحق قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے، قرآن کریم میں متعدد جگہ "إنه لا يحب الظالمين" اور اس کے مثل وعیدیں

مذکور ہیں، حدیث نبوی میں بھی ظلم کی مذمت وقباحت کا ذکر کثرت سے وارد ہے، ایک طویل حدیث قدسی جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"یا عبادی إنی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرما فلا تظالموا ... الحدیث" (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ، حدیث ۲۵۷۷) (اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے اور تمہارے مابین بھی اسے حرام کیا ہے، لہٰذا آپس میں ایک دوسرے پر ظلم مت کرو)۔

اس لیے پولیس والوں کا بھی کسی پر گولی چلانا درست نہیں، مگر یہ کہ عوام یا مدمقابل کی طرف سے تعدی اور زیادتی ہو یا کسی بڑے فتنہ اور نقصان کا اندیشہ ہو تو حسب موقع مناسب طریقہ اور قوت کا استعمال کرنا ضروری ہوگا۔

"یتحمل الضرر الخاص لأجل دفع الضرر العام" (الاشباہ، ص ۱۲۱۵)
(نقصان عام کو دور کرنے کے لیے خاص نقصان کو برداشت کیا جائے گا)

اس قاعدہ کے تحت تفریع میں مذکور ہے: "جواز الرمی إلی کفار تترسوا بصبیان المسلمین" (ایضا)
(ایسے کفار کی جانب تیر چلانے کا جائز ہونا جنہوں نے مسلمان بچوں کو ڈھال بنا رکھا ہے)۔

اور ضرر عام کو دفع کرنے کے لیے پولیس کا گولی استعمال کرنا ناگزیر ہو تب ہی اس کی اجازت ہوگی ورنہ اس سے پیشگی بقیہ تدابیر کا اختیار کرنا ضروری ہوگا۔

اقبال جرم کے لیے ایذا رسانی:

ملک اور شہروں میں نظم ونسق اور امن وامان کا قیام شعبہ پولیس کا بنیادی مقصد ہے، اور معاشرہ میں شیطانی عنصر کی ریشہ دوانی بھی معاشرہ کا ایک حصہ ہے جس کے سبب بدنظمی اور جرائم وجود میں آتے ہیں، اور حقیقی مجرم تک رسائی کے لیے شعبہ پولیس کو بسا اوقات بڑی تگ ودو کرنی پڑتی ہے، اور کبھی مجرم سے اقبال جرم کے لیے اس کے ساتھ سخت رویہ اپنانا پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ مجرم آسانی سے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرے گا۔

لیکن اس مہم کے لیے شعبہ پولیس کو مطلق العنان آزادی نہیں دی جاسکتی، انسانیت پر مبنی حقوق انسانی کا پابند ہونا اس کے لیے ضروری ہے، ہر کس وناکس کو گرفت میں لینا اور اس پر انسانیت سوز حربے استعمال کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہوگا، اسلامی شریعت کے اعتبار سے کسی کو شبہ میں گرفتار کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے خلاف گواہی ہو، للقاضی تعزیر المتہم کے تحت شامی میں مذکور ہے:

"إن التهمة تثبت بشهادة مستورین أو واحد عدل، فظاهره أنه لو شهد عند الحاكم واحد مستور وفاسق بفساد شخص لیس للحاکم حبسه" (ردالمحتار، ۶/۱۲۶) (تہمت دو مستور یا ایک عادل کی گواہی سے ثابت ہوگی، لہٰذا اس کا ظاہر یہ ہے کہ اگر حاکم کے پاس ایک مستور اور ایک فاسق کسی کے فساد (جرم) کی گواہی دیں تو حاکم کے لیے اس کو قید کرنا جائز نہ ہوگا)۔

اور جس پر جرم کی تہمت ہو اس سے اقبال جرم کے لیے مناسب سختی بھی کی جاسکتی ہے، مگر اس کے لیے ہر آدمی کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا جائے گا، اور نہ انسانیت سوز تشدد کا معاملہ کیا جائے گا۔

"الذی علیه جمهور الفقهاء فی المتهم بسرقة ونحوها أن ینظر، فإما أن یکون معروفا بالبر لم تجز مطالبته ولا عقوبته وهل یحلف قولان، ومنهم من قال: یعزر متهمه، وإما أن یکون مجهول الحال فیحبس حتی یکشف امره، قیل: شهرا وقیل: باجتهاد ولی الأمر، وإن كان معروفا بالفجور فقالت طائفة یضربه الوالی أو القاضی" (ردالمحتار، ۶/۱۴۸) (چوری یا اس کے مثل میں متہم شخص کے بارے میں وہ قول جس پر جمہور فقہاء ہیں یہ ہے کہ دیکھا جائے گا، یا تو وہ شخص صلاح وشرافت میں معروف ہوگا تو اس شخص کا مطالبہ یا اس کو سزا دینا جائز نہیں، اور کیا اس سے قسم لی جائے گی؟ اس بارے میں دو قول ہیں اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ ایسے متہم کی بھی تعزیر کی جائے گی، اور یا تو وہ مجہول الحال ہوگا تو اس کو قید کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کا معاملہ واضح ہو جائے، قید کی مدت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ایک مہینہ، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ولی الامر کی صوابدید پر ہے اور

اگر وہ متہم شخص فسق وفجور میں معروف ہوگا تو ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ والی یا قاضی اس کی پٹائی کرے گا)۔

اور حسن بن زیاد سے منقول ہے: "مالم یقطع اللحم لا تبین العظم" (حوالہ سابق) (جب تک سختی نہیں ہوگی بات واضح نہیں ہوگی)۔

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ بھی مجرم سے اقبال جرم کے لیے اس کی ضرب کے قائل ہیں:

"إلا أن العلماء جوزوا في أيامنا هذه الإمتحان بالضرب وبماشاء من التهديد، لما رأوا من تفويت الحقوق واتلافها لولا ذلك، وكان فيما مضى من الزمان يكتفي باليسير من التهديد في اعتراف السارق" (بذل المجهود فی حل أبی داؤد، ۵/۱۳۱) (مگر علماء نے ہمارے اس زمانہ میں مار یا جو دھمکی بھی مناسب ہو اس کے ذریعہ تفتیش کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ انہوں نے محسوس کیا حقوق کے تلف اور فوت ہونے کو اگر ایسا نہ ہو، اور گزشتہ ادوار میں چور کے اعتراف میں معمولی دھمکی پر بھی اکتفاء کیا جاتا تھا)۔

اور علامہ ابن الصیم ؒ بھی تفتیش کے سلسلہ میں عادی مجرم اور مہذب شہری کے مابین فرق اور ان میں سے بعض کے ساتھ سختی کے قائل ہیں:

"ولو خلفنا كل واحد منهم وأطلقناه مع العلم باشتهاره بالفساد في الأرض وكثرة سرقاته وقلنا لاناخذه إلا بشاهدي عدل كان مخالفا للسياسة الشرعية" (ردالمحتار، ۶/۱۲۶) (اور اگر ہم ہر شخص سے قسم لیں اور چھوڑ دیں، جانتے ہوئے اس کی چوریوں کی کثرت، اور زمین میں فتنہ وفساد میں اس کے مشہور ہونے اور ہم اس کو بغیر دو عادل گواہوں کے گرفتار نہ کریں تو یہ شرعی سیاست کے خلاف ہوگا)۔

ان عبارتوں سے اقبال جرم کے لیے مجرم پر سختی کے استعمال کی اجازت معلوم ہوتی ہے، لیکن واضح رہے کہ اس غرض سے ایذا رسانی اور سختی اس کے جرم کی حقیقی سزا سے متجاوز نہ ہو، اور اس پر ایسا تشدد نہ کیا جائے جو انسانیت کے لیے شرمناک ہو، مثلاً برف پر رکھنا، کرنٹ اور بجلی لگانا، سخت دھوپ یا سخت سردی میں رکھنا وغیرہ درست نہیں، ہشام بن حکیم بن حزام ؓ سے منقول ہے:

"قال: مربالشام على أناس، وقد اقيموا في الشمس وصب على رؤسهم الزيت. فقال: ماهذا؟ قيل: يعذبون في الخراج فقال: أما إني سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن الله لعذب الذين يعذبون في الدنيا" (صحیح مسلم، ۴/۲۰۱۷، کتاب البر والصلہ حدیث ۲۶۱۳) (وہ شام میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو دھوپ میں کھڑے کئے گئے تھے اور ان کے سروں پر تیل ڈال دیا گیا تھا، انہوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو بتایا گیا کہ خراج کے سلسلہ میں سزا دی جارہی ہے، تو انہوں نے کہا کہ میں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو لوگ دنیا میں عذاب دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب میں مبتلا کریں گے)۔

نتیجہ بحث یہ ہے کہ:

☆ شعبہ پولیس کی ملازمت جائز ہے۔

☆ کسی پر ظلم کرنا یا مظلوم پر گولی چلانا، یا کسی کے خلاف غلط زبان کا استعمال کرنا درست نہ ہوگا۔

☆ کسی معصوم شہری کو کسی جرم میں گرفتار کرنا درست نہ ہوگا جب تک اس پر تہمت اور شبہ کی گواہی نہ ہو۔

☆ اقبال جرم کے لیے کسی متہم شخص پر مناسب قابل تحمل سختی کی جاسکتی ہے، اس کے لیے ایسی سزا اور ایذا رسانی کا جواز نہیں ہے جو اس جرم کی سزا سے زائد ہو، نیز اس سلسلہ میں عام شہری، شرفاء اور فساق وفجار (جن کا ریکارڈ صحیح نہ ہو) کے مابین فرق کا اعتبار لازم ہے۔

ج۔ انٹلیجنس اور شعبہ مخبری کی ملازمت:

مخبری کا شعبہ، نظام سلطنت کا ایک حصہ ہے، رعایا کے احوال سے واقفیت، ان کی ضروریات وحوائج کی تکمیل، مجرموں اور فساق کی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں سے باخبر رہنے اور ان کے ممکنہ فساد فی الارض اور دہشت گردی کے خطرات سے بچنے کے لیے اس شعبہ کی ضرورت ہے، جس کا صحیح استعمال، ایک پر امن نظام سلطنت کے لیے بہترین مدد ومعاون ہے، رسول اللہ ﷺ سے غزوات کے موقع پر اس کا ثبوت، اس کے بوقت ضرورت استعمال وجواز کی دلیل قرار دیا

جاسکتا ہے، حضرت حذیفہؓ کو آپ نے غزوہ خندق کے موقع پر کفار کے لشکر میں حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

"فقال: یا حذیفة! اذهب فادخل فی القوم فانظر ماذا یصنعون ... الخ" (سیرت ابن ہشام، ۲/۱۳۲) (حذیفہ جاؤ، اور قوم (کفار) میں گھس جاؤ اور دیکھو کہ وہ لوگ کیا کر رہے ہیں)۔

"وعن انس قال: بعث - یعنی النبی ﷺ بسبسة عینا ینظر ما صنعت عیرا ابی سفیان۔" (سنن ابی داؤد، ۳/۳۸، حدیث: ۲۶۱۸) (حضرت انسؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ نبی ﷺ نے بسبسہ نامی شخص کو بطور جاسوس روانہ کیا تھا تا کہ وہ جائزہ لے کر ابوسفیان کے قافلہ نے کیا کیا)۔

البتہ یہ عمل مخبری تجسس اور غیبت کو مستلزم ہے، اور قرآن وحدیث میں اس کی مذمت وارد ہے، اور اس سے منع کیا گیا ہے۔

"یا أیها الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن، إن بعض الظن اثم، ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا أیحب احدکم أن یاکل لحم اخیه میتا فکرهتموه واتقوا الله إن الله تواب رحیم" (سورۂ حجرات: ۱۲) (اے لوگو جو ایمان لائے! بہت گمان (تہمت، بدگمانی) سے پرہیز کرو، کیونکہ کچھ گمان گناہ ہیں، اور ٹوہ میں مت پڑو، اور تم میں کا بعض بعض کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، جس سے تم کو کراہت اور نفرت ہو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

نیز ہمام بن الحارث سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

"کنا جلوسا مع حذیفة فی المسجد فجاء رجل حتی جلس إلینا فقیل لحذیفة: إن هذا یرفع إلی السلطان أشیاء. فقال حذیفة: إرادة أن یسمعه: سمعت رسول الله ﷺ یقول: لا یدخل الجنة قتات" (صحیح مسلم، ۱/۱۰۱، کتاب الایمان حدیث ۱۷۰، ۱۰۵) (ہم لوگ حضرت حذیفہؓ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی آیا اور ہمارے قریب میں بیٹھ گیا، تو حضرت حذیفہؓ سے کہا گیا کہ یہ شخص حاکم تک کچھ باتیں پہنچاتا ہے، تو حضرت حذیفہؓ نے اس کو سنانے کی غرض سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ چغلی کرنے والے جنت میں نہیں جائیں گے)۔

لیکن بعض وہ احادیث جن سے عمل مخبری کا ثبوت ملتا ہے، ان کے پیش نظر علماء نے ان احادیث کی شرح میں تفصیل وتوجیہ کی ہے جن میں تجسس اور غیبت سے منع کیا گیا ہے، اور بظاہر غیبت کی بعض صورتوں کو غیبت قرار نہیں دیا ہے، امام راغب اصفہانیؒ نے غیبت کی یہ تعریف کی ہے:

"والغیبة أن یذکر الإنسان غیره بمافیه من عیب من غیر أن أحوج إلی ذکره" (مفردات، ص ۳۶۷) (اور غیبت یہ ہے کہ انسان اپنے غیر کا ذکر اس عیب کے ساتھ کرے جو اس میں ہے، بغیر اس کے کہ محتاج کیا گیا ہو اس کے ذکر کا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاضرورت کسی کے عیب کو ذکر کرنا غیبت ہے، اور اگر کسی مصلحت اور ضرورت کے تحت کسی کے عیب کو ذکر کیا جائے تو وہ غیبت میں شمار نہیں، امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"اعلم أن الغیبة تباح لغرض صحیح شرعی، لا یمکن الوصول إلیه إلا بها وهو ستة أسباب" (ریاض الصالحین، ص ۴۷۴) (معلوم ہونا چاہئے کہ غیبت مباح ہے، ایسے صحیح شرعی غرض کے لیے جس تک بغیر غیبت کے پہنچنا ممکن نہ ہو، اور وہ چھ اسباب ہیں)۔

پھر انہوں نے ان چھ اسباب کی تفصیل بیان کی ہے، اور صحیح غرض کے لیے اس کے جواز پر دلالت کرنے والی چند احادیث ذکر کی ہیں جن میں زید ارقمؓ سے مروی ایک حدیث ہے:

"قال: خرجنا مع رسول الله ﷺ فی سفر أصاب الناس فیه شدة، فقال عبدالله بن أبی: لا تنفقوا علی من عند رسول الله حتی ینفضوا، وقال: لئن رجعنا إلی المدینة لیخرجن الأعز منها الأذل، فأتیت رسول ﷺ فأخبرته

بذلك" (ریاض الصالحین، ص ۳۷۶) (فرمایا کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، جس میں لوگوں کو کچھ دشواریاں پیش آئیں، تو عبد اللہ بن ابی نے کہا جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہنے والے ہیں ان پر خرچ نہ کرو (ان کی امداد نہ کرو) تاکہ وہ لوگ الگ ہو جائیں، نیز یہ بھی کہا کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو ہم میں کا عزت والا کمتر کو اس سے نکال کر باہر کرے گا، تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں نے آپ کو اس کی خبر دی)۔

نیز حضرت حذیفہؓ سے مروی حدیث "لا یدخل الجنة قتات" کی شرح میں امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"اور نمیمہ کے بارے میں یہ سب مذکور وعیدیں اس وقت ہے جب کہ اس میں کوئی شرعی مصلحت نہ ہو (بلکہ علی وجہ الفساد ان کا وقوع ہو) اور اگر کوئی ضرورت اس کی داعی ہو تو پھر وہ ممنوع نہیں، جیسے اس کو یہ خبر دے کہ کوئی آدمی اس کو یا اس کے اہل کو، یا اس کے مال کو ہلاک کرنا چاہتا ہے یا کسی ذمہ دار یا حاکم کو یہ بتلائے کہ فلاں آدمی ایسا کرتا ہے، اور کسی فساد کے درپے ہے، اور صاحب منصب پر اس کی تفتیش کرنا اور اس کا ازالہ کرنا لازم ہے، تو یہ اور اس جیسی صورتیں حرام نہیں ہیں، بلکہ موقع محل کے لحاظ سے ان میں سے بعض واجب اور بعض مستحب ہوں گی" (شرح صحیح مسلم للامام النووی، ۱/ ۱۱۳)۔

نیز محمد مسلمہؓ کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ وہ سیدنا عمرؓ کے دور میں جانچ اور تحقیق کے منصب پر مقرر تھے۔

"کان عمر قد أقام محمد بن مسلمة مفتشاعاما يرسله إلى كل بلد اشتكى على أميره" (الخلفاء الراشدون لعبد الوهاب النجار، ص ۲۳۲) (حضرت عمرؓ نے حضرت محمد بن مسلمہؓ کو انسپکٹر جنرل بنایا تھا، ان کو (معائنہ کے لیے) ہر اس علاقہ کی طرف بھیجتے تھے جہاں کے لوگوں نے اپنے حاکم کی شکایت کی ہوتی)۔

ان ساری عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ:

☆ بلا ضرورت تجسس اور غیبت گناہ عظیم ہے جس سے احتراز لازم ہے۔

☆ شرعی مصالح، اور ملکی امن وامان کی خاطر مخبری کرنا اور جو لوگ مفاسد کی اصلاح پر قادر ہوں ان تک فساد پسند عناصر کی حرکات کی اطلاع پہنچانا جائز ہے۔

☆ تجسس اور مخبری صرف اسی حد تک جائز ہے جتنے سے ضرورت پوری ہو جائے۔

☆ اصلاح اور امن وامان کی غرض سے انٹیلجنس اور مخبری کے شعبہ کی ملازمت جائز ہے، کیونکہ اس مقصد سے یہی عمل معصیت نہیں ہوگا، نیز اس ملازمت میں بھی مدت متعینہ کی اجرت معلوم ہوتی ہے، فقہی قاعدہ ہے: "الأمور بمقاصدها"۔

د- شعبہ عدلیہ کی ملازمت:

نزاع باہم جو بسا اوقات پورے معاشرے کے فساد اور بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے، ایسے نزاع کو دور کرنے، مظلوم کو ظالم سے انصاف دلانے، حقدار تک اس کو حق پہنچانے کے لیے کسی بھی معاشرہ اور حکومت میں عدلیہ کا نظام ہونا ضروری ہے، شرعی طور پر قضاء کا حکم فرض کفایہ کا ہے۔

"والاصل أن القضاء فريضة محكمة وسنة متبعة قد باشره الصحابة والتابعون ومضى عليه الصالحون ولكنه فرض كفاية" (عالمگیریہ، ۳/ ۳۰۶) (اور اصل یہ ہے کہ قضا ایک ثابت شدہ فریضہ اور سنت متوارثہ ہے، صحابہ اور تابعین نے اسے انجام دیا ہے اور صالح لوگوں کا طریقہ رہا ہے، البتہ یہ فرض کفایہ ہے)۔

لہٰذا اگر کسی کو قاضی اور جج ہونے کی پیشکش ہو، اور اس علاقہ میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس کا اہل نہ ہو (یا کسی دوسرے کے اس منصب پر مقرر ہونے سے انصاف نہ ملنے کا خوف ہو) تو اس کے لیے اس عہدہ کو قبول کرنا لازم ہوگا، اور اگر اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس کے اہل موجود ہوں، تو اس کے لیے اس عہدہ کو قبول کرنا ضروری نہیں۔

"إذا عرض القضاء على من يصلح له من أهل البلد ينظر إن كان في البلد عدد يصلحون لا يفترض عليه القبول، بل هو في سعة من القبول والترك" (بدائع الصنائع، ۵/ ۴۴۰)

(جب شہر کے کسی صاحب لیاقت شخص پر قضا کا عہدہ پیش کیا جائے، تو وہ دیکھے گا کہ شہر میں اگر کچھ اور لوگ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو اس پر اس عہدہ کا قبول کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ وہ قبول کرنے اور نہ کرنے کی گنجائش میں ہے)۔

البتہ عہدہ قضا کا طلب کرنا مستحسن نہیں ہے، بلکہ اس سے منع کیا گیا ہے۔

"عن النبی ﷺ قال: من ابتغی القضاء وسأل فیه شفعاء وکل إلی نفسه ومن اکره علیه أنزل الله علیه ملکا یسدده" (سنن الترمذی، ۳/ ۶۰۵، کتاب الاحکام حدیث ۱۳۲۴) (رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کہ جس کسی نے قضا کو طلب کیا اور اس میں سفارشی طلب کیے تو اسی کے سر ڈال دیا جاتا ہے اور جو اس پر مجبور کر دیا جائے (قبول کرنے پر) تو اللہ تعالیٰ اس پر (مدد کے لیے) ایک فرشتہ نازل کرتے ہیں جو اسے راہ راست پر لگائے رہتا ہے)۔

قضا کا عہدہ ظالم یا کافر حکومت کی طرف سے بھی پیش کیا گیا ہو تو اسے بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔

"ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کافرا وفی التاتارخانیة: الإسلام لیس بشرط فیه: أی فی السلطان الذی یقلد" (شامی، ۸/ ۴۳) (اور عادل وظالم بادشاہ (حاکم) کی طرف سے عہدہ قضا قبول کرنا جائز ہے، اگرچہ وہ حاکم کافر ہو، اور تاتارخانیہ میں ہے: اسلام اس کے لیے شرط نہیں ہے، یعنی اس حاکم کا مسلمان ہونا شرط نہیں جو قاضی مقرر کر رہا ہے)، لہٰذا ایسے ممالک جن کے حکمران غیر مسلم اور کافر ہوں، اور ان حکومتوں کی طرف سے اگر جج اور قاضی کا عہدہ کسی مسلمان کو پیش کیا جائے تو اس کے لیے اس عہدہ کا قبول کرنا جائز ہے، بلکہ ان ممالک میں اس عہدہ پر مسلمانوں کا ہونا پوری عوام کے لیے مفید ہوگا، بشرطیکہ وہ مسلمان جج رشوت، جانبداری وغیرہ سے احتراز کرتے ہوئے اس خدمت کو انجام دے، اور اس شرط کے ساتھ کہ اس ظالم یا کافر حکومت کی طرف سے اس پر دباؤ نہ ہو، اور حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے پر کوئی روک نہ ہو، اور اگر اس طرح کا کوئی دباؤ ہوگا تو پھر اس عہدہ کا قبول کرنا حرام ہوگا۔

"إلا إذا کان یمنعه عن القضاء بالحق فیحرم" (الدرالمختار، ۸/ ۴۴) (مگر یہ کہ وہ حاکم اس کو حق کا فیصلہ کرنے سے روکے تو اس عہدہ کا قبول کرنا حرام ہوگا)۔

کیونکہ اس صورت میں قضا کا مقصد ہی حاصل نہیں ہوگا (ہدایہ مع فتح القدیر، ۶/ ۳۶۵، عالمگیریہ، ۳/ ۳۰۷)۔

اور ظاہر ہے کہ وہ ممالک جن کے حکمراں کافر ہوں ان کے دستور وقوانین کتاب اللہ اور سنت رسول پر مبنی نہیں ہوں گے، اس لیے اگر اس ملک کے بعض قوانین شریعت سے متصادم بھی ہوں مگر ایک مسلمان جج حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور اس پر حکومت کی طرف سے دباؤ نہیں ہے تو مسلمانوں کے لیے ان ممالک کے عدلیہ کی ملازمت جائز ہوگی، اور جب عہدہ قضا کے قبول کرنے کا جواز ہوگا تو ایسی عدلیہ میں وکالت اور دیگر عہدوں کی ملازمت بھی درست ہوگی۔

فقہی عبارت سے یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ قضا پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، بلکہ حاکم شہر پر یہ لازم ہے کہ بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دے بلکہ اگر قاضی اور جج مالدار ہو تو اس طور پر بھی بیت المال سے لینا اس کے لیے غیر اولیٰ ہے۔

"فإن کان غنیا تکلموا فیه والأولی أن لا یاخذ من بیت المال کذا فی فتاوی قاضی خاں" (عالمگیریہ، ۳/۳۲۹)
(اور اگر قاضی مالدار ہو تو اس کے بیت المال سے لینے میں کلام کیا ہے اور اولیٰ یہ ہے کہ وہ بیت المال سے بھی نہ لے)۔

"القاضی إذا کان یاخذ من بیت المال شیئا، لا یکون عاملا بالأجر بل یکون عاملا لله تعالی ویستوفی حقه من مال الله تعالی وکذا الفقهاء والعلماء والمعلمون الذین یعلمون القرآن" (عالمگیریه، ۳/۳۲۹)
(قاضی جب بیت المال سے کچھ لے رہا ہو، تو وہ اجرت پر عمل کرنے والا نہیں ہوگا، بلکہ وہ اللہ کے لیے عمل کرنے والا ہوگا، اور اپنے حق اللہ کے مال سے حاصل کرے گا، اور ایسے ہی فقہاء، علماء اور وہ معلمین جو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں)۔

"وهذا لو بلا شرط، ولو به کالأجرة فحرام لأن القضاء طاعة فلم تجز کسائر الطاعات" (الدرالمختار، ۹/۵۵۹)
(اور یہ (قاضی کا بیت المال سے لینا) اگر بلا شرط ہو، اور اگر شرط کے ساتھ ہو اجرت کی طرح تو حرام ہوگا (لینا) کیونکہ قضا ایک طاعت ہے لہٰذا

سبھی طاعات کی طرح (اس پر اجرت لینا) جائز نہ ہوگا)۔

اسی کے ساتھ یہ وضاحت بھی مذکور ہے:

''یستحق القاضی الأجر علی کتب الوثائق والمحاضر والسجلات قدر ما یجوز لغیرہ کالمفتی فانہ یستحق أجر المثل علی کتابۃ الفتوی، لأن الواجب علیہ الجواب باللسان دون الکتابۃ بالبنان'' (الدر المختار، ۹/۱۲۷)

(قاضی، دستاویزات، کارروائی اور ریکارڈ کو لکھنے پر اجرت لینے کا مستحق ہوگا، اتنی مقدار جتنا اس کے غیر کے لیے جائز ہے جیسے مفتی کہ وہ فتاویٰ کی تحریر پر اجر مثل کا مستحق ہوتا ہے، کیونکہ اس پر واجب زبان سے جواب دینا ہے، لکھنا واجب نہیں)۔

جس سے قاضی کے لیے فیصلہ لکھنے پر اجرت لینے کا جواز ملتا ہے اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ نفس قضا پر اجرت لینا حرام کہا گیا ہے، اجرت کے طور پر قاضی کے کچھ لینے کو امام احمد اور امام شافعیؒ نے بھی پسند نہیں کیا ہے۔

''وقال أحمد: لا یعجبنی أن یاخذ علی القضاء اجرا وان کان فبقدر شغلہ ... فاما الإستئجار علیہ فلایجوز، قال عمر: لا ینبغی لقاض المسلمین ان یاخذ علی القضاء اجرا وھذا مذھب الشافعی ولا نعلم فیہ خلافا'' (المغنی لابن قدامہ، ۱۴/۱۰) (امام احمدؒ نے فرمایا کہ: مجھے پسند نہیں کہ قضا پر اجرت لے، اور اگر ہو بھی تو اس کی مصروفیت کی بقدر اور بہر حال اس پر اجرت لینا تو جائز نہیں، سیدنا عمرؓ نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں کے قاضی کو زیب نہیں دیتا کہ قضا پر اجرت لے، اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں)۔

لہٰذا قاضی کے لیے نفس قضا پر تو اجرت لینا جائز نہیں، لیکن اگر وہ اس فیصلہ اور کارروائی کو تحریر کرتا ہے، اس عمل کے لیے عدالت میں حاضر ہوتا ہے، تو اس عمل پر اسے اجرت لینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

ھ۔ شعبہ انکم ٹیکس کی ملازمت:

انسانی معیشت میں مال کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے کیونکہ اسی پر ساری معیشت قائم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تؤتوا السفھاء أموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما" (سورۂ نساء: ۵)

(اور تم نادانوں کو اپنے وہ مال مت دو جسے اللہ نے تمہارے لیے قیام معیشت کا ذریعہ بنایا ہے)۔

انسان جو کچھ کماتا اور حاصل کرتا ہے شرعی طور پر اس کا مالک ہوتا ہے، اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر کسی دوسرے کو اس مال کے کھانے اور استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔

"ولا تاکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (اور اپنے مال اپنے درمیان باطل اور ناجائز طور پر مت کھاؤ)۔

لہٰذا کسی بھی فرد، کمپنی یا حکومت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے فرد یا رعایا کے مال کو اس کی رضا کے بغیر، جبر واکراہ کے ذریعہ طلب کرے، ایسا کرنے کو ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے، حضرت انسؓ سے مرفوعاً منقول ہے:

"لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفسہ" (سنن دار قطنی، ۳/۲۶، ۷) (کسی بھی مسلمان کا مال اس کی رضا کے بغیر حلال نہیں)۔

حکومتیں اپنی رعایا سے جو محصول وصول کرتی ہیں، وہ اگر کسی ایسی شے سے متعلق ہے جس سے عام رعایا کی مصلحت اور مفاد وابستہ ہے، تو اس محصول کا وصول کرنا ان کے لیے درست ہوگا، فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے:

''وأما النوائب فإن أرید بھا ما یکون بحق ککری النھر المشترك وأجرۃ الحارس والموظف لتجھیز الجیش وفداء الأساری وغیرھا جازت الکفالۃ بھا علی الاتفاق'' (ہدایہ مع فتح القدیر، ۶/۳۳۲)

(اور بہر حال نوائب تو اگر مراد لیا جائے اس سے ان کو جو کسی حق کی وجہ سے ہو جیسے عام لوگوں کے لیے مشترک نہر کے کھودنے اور

حارس (چوکیدار) کی اجرت، تجہیز جیش کے لیے ملازم کی اجرت اور قیدیوں کے فدیہ کے لیے تو اس کی کفالت بالاتفاق جائز ہے)۔

علامہ ابن الہمام اس کے تحت لکھتے ہیں:

"لأنها واجبة على كل مسلم موسر بإيجاب طاعة ولي الأمر في ما فيه مصلحة المسلمين ولم يلزم بيت المال أو لزمه ولاشئي فيه" (فتح القدیر، ۶/ ۳۳۲) (کیونکہ یہ ہر مالدار مسلمان پر واجب ہے کہ حاکم کی اطاعت کے واجب کیے جانے کی وجہ سے اس امور میں جن میں مسلمانوں کی مصلحت ہے اور وہ بیت المال پر لازم نہیں ہے یا اس پر لازم ہو مگر اس میں کچھ موجود نہ ہو)۔

اور وہ محصول جو حکومتیں اپنی رعایا، سے کسی جائز حق کے عوض کے علاوہ وصول کرتی ہے مثلاً آمدنی اور انکم پر ٹیکس وصول کرنا یہ درست اور جائز نہیں اس کو ظلم سے تعبیر کیا جائے گا۔

"وإن أريد بها ما ليس بحق كالجبايات الموظفة على الناس في زماننا ببلاد فارس على الخياط والصباغ وغيرهم للسلطان في كل يوم أو شهر أو ثلاثة اشهر فانها ظلم" (فتح القدیر، ۶/ ۳۳۲) (اور اگر ان (نوائب) سے مراد لی جائیں وہ وصولیاں جو مقرر کی گئی ہیں ہمارے زمانہ میں بلادِ فارس میں خیاط، صباغ وغیرہ پر بادشاہ کے لیے روزانہ یا ہر ماہ یا ہر تین ماہ پر تو وہ ظلم ہے)۔

لہٰذا آج کل کی حکومتیں جو عوام کی آمدنی میں اس طور پر مداخلت کرتی ہیں کہ ایک مقررہ مقدار آمدنی پر وہ اس پر ٹیکس عائد کرتی ہیں جس کو انکم ٹیکس سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ جائز نہیں یہ حکومتوں کا رعایا پر ایک طرح کا ظلم ہے، اور ظلم کی ترویج ونفاذ پر تعاون کرنا تعاون علی الاثم ہوگا۔

"تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان"

(نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کا تعاون کرو اور ظلم ومعصیت پر باہم تعاون مت کرو)۔

اس لیے شعبہ انکم ٹیکس میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنا درست نہ ہوگا، ٹیکس وصول کرنے والے کے بارے میں سخت وعید وارد ہے، عقبہ بن عامرؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے:

"لايدخل الجنة صاحب مكس" (سنن ابوداؤد، ۳/ ۱۳۳، کتاب الخراج باب فی السعایہ علی الصدقہ حدیث ۲۹۳۷)

(ٹیکس لینے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا)۔

"وقال الأصمعي: الماكس: العشار واصله الجباية والمكس: الذي يأخذه وقال غيره... وصاحب المكس هو الذي يعشر أموال المسلمين ويأخذ من التجار إذا مروابه باسم العشر، وليس هذا بالساعي الذي ياخذ الصدقات" (معالم السنن مع مختصر سنن ابوداؤد، ۴/ ۱۹۸) (اصمعی نے کہا: ماکس عشر وصول کرنے والا ہے اور اس کی اصل جبایہ (ٹیکس) ہے اور مکس وہ چیز ہے جس کو وہ وصول کرتا ہے، اور ان کے علاوہ نے کہا: صاحب مکس وہ شخص ہے جو مسلمانوں کے مال سے عشر لیتا ہے، اور جو تجار اس کے پاس سے گزرتے ہیں ان سے عشر کے نام پر لیتا ہے، اس سے ساعی مراد نہیں ہے جو صدقات وصول کرتا ہے)۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ وعید اس شخص کے لیے نہیں ہوسکتی جو جائز طور پر صدقات اور عشر وصول کرتا ہے، بلکہ صاحب مکس سے مراد وہی شخص ہوسکتا ہے جو بطور ظلم لوگوں سے وصول کرتا ہو، القاموس المحیط میں "مکس" کے تحت مذکور ہے:

"والمكس: النقص والظلم ودراهم كانت توخذ من بائعي السلع في الأسواق في الجاهلية أو درهم كان ياخذه المصدق بعد فراغه من الصدقه" (القاموس المحیط، ۴/ ۲۷۲، مادہ مکس) (اور مکس کا معنی نقص اور ظلم ہے، اور وہ دراہم جو بازار میں سامان بیچنے والوں سے زمانہ جاہلیت میں لیے جاتے تھے یا وہ درہم جس کو صدقہ وصول کرنے والا صدقہ سے فارغ ہونے کے بعد وصول کرتا تھا)۔

"قد غلب استعمال المكس فيما ياخذه أعوان السلطان ظلما عند البيع والشراء" (المصباح المنیر ص ۵۷۷)

(اور مکس کا استعمال غلبہ پا گیا ہے، ان (اموال) کے بارے میں جس کو بادشاہ کے گماشتے بیع وشراء کے وقت بطور ظلم وصول کرتے ہیں)۔

ان تشریحات سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ حدیث: "لا يدخل الجنة صاحب مكس" سے مراد وہ عامل نہیں ہے جو حکومت کی طرف سے عشر وخراج وصول کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، کیونکہ عشر وخراج شرعی حق ہے، بلکہ اس حدیث میں مذکور وعید اس شخص کے لیے ہے جو عشر وخراج کے علاوہ بطور ظلم وصول کرے، یعنی شرعی طور پر اس کا مطالبہ نہ ہو اور عامل اپنے عامل ہونے کا دباؤ ڈال کر وصول کرے۔

اور اس وعید کا مستحق وہ شخص ہے جو لوگوں کی آمدنی پر کسی طرح کا محصول وصول کرے جیسا کہ بیع کے وقت بائع سے وصول کرنا وغیرہ، خواہ یہ وصول انفرادی اور پرائیوٹ طور پر ہو یا اجتماعی اور سرکاری طور پر، اور جب اس طرح کی وصولی کرنیوالے کے لیے وعید وارد ہے تو ظاہر ہ کہ اس کا یہ عمل معصیت اور عدوان ہوگا، لہٰذا اس کی ملازمت کرنا معصیت اور عدوان پر تعاون ہوگا، جو جائز نہیں، اس لیے محکمہ انکم ٹیکس کی ملازمت جائز نہیں ہوگی۔

۲۔الف۔محرمات پر مبنی ملازمتیں:

اللہ تعالیٰ نے سود اور ربا کو حرام کیا ہے، اور اس کے کھانے اور اس کا معاملہ کرنے سے منع کیا ہے۔"احل الله البيع وحرم الربوا" (اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے)۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سودی معاملہ سے متعلق لوگوں پر لعنت فرمائی ہے:

"عن جابر قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء" (صحیح مسلم باب الربا حدیث) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، اس کے کھلانے والے، اس کے لکھنے والے، اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے اور آپ نے فرمایا کہ وہ سب (گناہگار ہونے میں) برابر ہیں)۔

امام نوویؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

"وفيه تحريم الإعانة على الباطل" (شرح نووی، ۲۶/۱۱) (اور اس حدیث میں باطل پر تعاون کرنے کے حرام ہونے کا ثبوت ہے)۔

اور قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہے:

"ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کی اعانت مت کرو)۔

لہٰذا بینک جو بنیادی طور پر سودی لین دین کا کاروبار کرتا ہے، اس کے کسی ایسے کام کی ملازمت کرنا جس کا تعلق براہ راست سودی معاملہ سے وہ حرام ہوگا، اور اس کے کرنے والا احادیث وقرآن میں مذکور وعیدوں کا مستحق ہوگا۔

بینک کو اپنا مکان یا عمارت کرایہ پر دینا درست نہیں، کیونکہ بینک کا اس عمارت کو لینا سودی لین کا جو اس کا بنیادی کاروبار ہے اسی کے لیے ہوگا، اور اس طرح کرایہ پر اپنا مکان دینے والا اس سودی معاملہ پر تعاون کا مرتکب ہوگا۔

"وفي المحيط: ذمي استاجر من مسلم او ذمي بيعة ليصلي فيها لم يجز. لأن صلاة الذمي معصية وإن كانت طاعة في زعمه" (البحر الرائق، ۳۵/۸) (کسی ذمی نے کسی مسلمان سے۔ یا کسی ذمی سے معبد کرایہ پر لیا تا کہ اس میں وہ نماز پڑھے تو جائز نہیں، کیونکہ ذمی کی صلاۃ معصیت ہے اگرچہ اس کے خیال میں وہ اطاعت اور بندگی ہے)۔

"ولو استاجر الذمي مسلما ليبني له بيعة أو كنيسة جاز ويطيب له الأجر. كذا في المحيط" (فتاویٰ عالمگیریہ، ۴۵۰/۴) (ذمی کسی مسلمان سے اس کام کے لیے اجارہ کا معاملہ کرے کہ وہ اس کے لیے ایک معبد یا گرجا گھر تعمیر کردے تو جائز ہوگا اور اجرت ان کے لیے حلال ہوگی)۔

"وإذا استاجر الذمي من المسلم دارا ليسكنها فلا بأس بذلك وإن شرب فيها الخمر أو عبد فيها الصليب" (ایضا) (اور جبکہ ذمی مسلمان سے کوئی گھر کرایہ پر لے تو کوئی حرج نہیں اگرچہ وہ اس میں شراب پیے یا اس میں صلیب کی پوجا کرے)۔

بینک کو مکان کرایہ پر دینے کے جواز کے لیے شاہد نہیں بن سکتیں، کیونکہ یہاں صورت حال مختلف ہے، بینک کو مکان کرایہ پر دینے کی صورت میں ایک حرام کام کے لیے منفعت کا عوض حاصل کرنا لازم آتا ہے، اوران مذکورہ جزئیات میں یا تو اپنے عمل تعمیر کی اجرت لینا ہوتا ہے یا مکان رہائش کے لیے دینے کی اجرت لینا ہوتا ہے، بقیہ اعمال معصیت ضمناوجود میں آرہے ہیں، اسی لیے اس اخیر جزئیہ کی تفصیل میں مذکور ہے۔

''لأن المسلم لا يؤاجرها لذلك انما آجرها للسكنى كذا فى المحيط'' (فتاویٰ عالمگیریہ، ۴/۴۵۰)

(کیونکہ مسلم شخص شراب پینے کے لیے یا صلیب کی پوجا کرنے کے لیے اس مکان کو اجرت پر نہیں دیتا ہے بلکہ رہائش کے لیے دیتا ہے)۔

اور فقہی قاعدہ ہے: ''الأمور بمقاصدها'' (الاشباہ والنظائر، ص ۴۳)، نیز ان صورتوں میں براہ راست تعاون علی المعصیۃ بھی لازم نہیں آتا جیسا کہ بینک کو اپنی عمارت کرایہ پر دینے میں تعاون علی المعصیۃ لازم آرہا ہے، تعاون علی المعصیۃ کی تفصیل میں مذکور ہے:

''إن المراد بما لا تقوم المعصية بعينه ما يحدث له بعد البيع وصف آخر فيه قيام المعصية، وأن ما تقوم المعصية بعينه ما توجد فيه على وصفه الموجود حالة البيع'' (شامی، ۹/۵۶۱)

(عین (معاملہ) سے قیام معصیت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بیع کے بعد وہ وصف پیدا ہو جس میں معصیت پائی جائے، اور عین (معاملہ) سے معصیت قائم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بیع کے وقت وہ وصف موجود ہو جس میں معصیت پائی جائے)۔

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن، یا ان جیسے کاموں کی مرمت کی اجرت لینا، یا بینک کی عمارت کی تعمیر کی اجرت لینا جائز ہوگا، اوران اعمال سے تعاون علی الاثم لازم نہیں آئے گا۔

ب۔ انشورنس کمپنی کی ملازمت:

انشورنس کمپنیاں جو اس اصول پر کام کرتی ہیں کہ انشورنس کرنے والوں سے ایک متعینہ رقم جمع کراتی ہیں، اوراس مدت میں معہود خطرہ پیش آنے کی صورت میں جمع شدہ رقم سے زائد واپس کرتی ہیں، اوراس مدت میں معہود خطرہ پیش آنے کی صورت میں جمع شدہ رقم سے زائد واپس کرتی ہیں، چونکہ نفس عقد میں زائد رقم کی واپسی مشروط ہوتی ہے، لہٰذا یہ معاملہ جائز نہیں، شامی (۷/۳۹۵) میں مذکور ہے:

''كل قرض جر نفعا حرام أى إذا كان مشروطا'' (ہر قرض جو مشروط نفع لائے حرام ہے)۔

اور خطرہ پیش نہ آنے کی صورت میں بھی جمع شدہ رقم کے ساتھ زائد رقم کی واپسی یا جمع شدہ رقم کا واپس نہ ملنا غرراور قمار پر مشتمل ہے، کیونکہ جن خطرات کے اندیشے کے مدنظر انشورنس کرایا گیا ہے ان کا وقوع محتمل اور غیر یقینی ہے، اور یہی غرر کا مصداق ہے، جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے۔

''عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر'' (صحیح مسلم، ۳/۱۵۳، کتاب البیوع حدیث، ۴/۱۵۱۳) (حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع حصاۃ اور بیع غرر سے منع کیا ہے)۔

اور غرر کا معنی ہے خطرہ، ضائع ہونے کا اندیشہ (المصباح المنیر للفیومی)۔

''وغرر بنفسه تغريرا أو تغرة كتحلة عرضها للهلكة والإسم الغرر محركة'' (القاموس المحیط)۔

لہٰذا جب انشورنس کا کاروبار بھی سود، غرر اور قمار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہے تو انشورنس کمپنیوں کی ملازمت، نیز ان کے لیے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا تعاون علی المعصیۃ والاثم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگا، ''تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان''۔

وہ انشورنس جو جبری اور اضطراری ہو اس کی اجازت بقدر جبر وضرورت ہی ہے۔

''فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا اثم عليه ان الله غفور رحيم'' (سورۂ بقرۃ: ۱۷۳)۔

''ما أبيح للضرورة يقدر بقدرها'' (الاشباه والنظائر، ص ۱۱۹)۔

اور ایسے انشورنس جو بالجبر ہوتے ہیں اس میں بھی جمع شدہ رقم سے جائز جو رقم ملے گی وہ انشورنس کرانے والے کے لیے اپنے کسی بھی استعمال

میں لانا جائز نہیں، وہ سود ہی ہوگی اور اس کا حکم تصدق علی الفقراء ہے۔

"لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد" (البحر الرائق، ۸/ ۳۶۹)

(اس لیے کہ خبیث اور حرام کمائی (سے نجات پانے) کا راستہ صدقہ کر دینا ہے جبکہ واپس کرنا مشکل ہو)۔

انشورنس کمپنیوں کی ملازمت جس میں براہ راست سودی معاملہ سے واسطہ پڑے جائز نہیں ہے۔

انشورنس کمپنیوں کے لیے بحیثیت ایجنٹ کام کرنا جائز نہیں ہے۔

ج۔ شراب کی کمپنی کی ملازمت:

شراب ایک نجس اور گندی چیز ہے، اور اس کی حرمت ونجاست منصوص ہے۔

"یایها الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون" (سورۂ مائدہ: ۹۰) (اے ایمان والو! بلاشبہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک ہیں، شیطان کے کام سے ہیں، لہٰذا ان سے بچو تاکہ کامیابی پاؤ)۔

"وکذلك الخمر والدم المسفوح ولحم المیتة ... نجس نجاسة غلیظة" (عالمگیریہ، ۱/ ۴۶) (اور ایسے ہی شراب، دم مسفوح، مردار کا گوشت وغیرہ نجس نجاست ہیں)۔

اور حرام شئی کی بیع درست نہیں۔

"وأما بیع الخمر والخنزیر إن کان قوبل بالدین کالدراهم والدنانیر فالبیع باطل" (ہدایہ) بہرحال شراب اور خنزیر کی بیع دین کے مقابل میں ہو جیسے درہم، ودنانیر، (رائج سکے) تو بیع باطل ہوگی)۔

لہٰذا شراب کی خرید وفروخت کرنا یا اس کام کے لیے ملازمت کرنا اور اجرت لینا جائز نہیں ہوگا، اس کام کے لیے ملازمت کرنا، ایک نجس اور حرام شے کی ترویج واشاعت میں تعاون کرنا ہے، اور اس کا اعزاز کرنا ہے، اور حرام ومعصیت پر تعاون کرنے سے صراحۃً منع کیا گیا ہے۔

"وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) (نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ وزیادتی پر ایک دوسرے کا تعاون مت کرو)۔

اور ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لعن الله الخمروشاربها وساقیها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة إلیه" (سنن ابوداؤد، ۳/ ۳۲۶، کتاب الاشربۃ حدیث ۳۶۷۴) (اللہ تعالیٰ نے لعنت کیا ہے شراب پر اور اس کے پینے والے پر اور اس کے پلانے والے پر اور اس کے بیچنے والے پر اور اس کے خریدنے والے پر اور اس کے تیار کرنے والے پر اور اس کے تیار کرانے والے پر اور اس کے لے جانے والے پر اور جس تک لے جائی جائے، اس پر)۔

اس حدیث کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شراب کے تیار کرنے میں یا اس کو پینے والوں کے لیے مہیا کرنے میں کسی طرح کا تعاون، تعاون علی الاثم ہوگا، اور ایسے شخص پر اللہ کی لعنت ہے۔

لہٰذا شراب کی کمپنی کو وہ اجزاء فراہم کرنا اور پیش کرنا جن سے شراب تیار کی جاتی ہے ناجائز اور حرام ہوگا، امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو یہ نسبت کی جاتی ہے کہ ان کے نزدیک کسی مسلمان کے لیے شیرہ انگور فروخت کرنا ایسے شخص کو جو شراب بناتا ہو یا کسی ذمی کی شراب کو کسی جگہ پہنچانے کی اجرت لینا جائز ہے۔

"وجاز أی عنده لا عندهما بیع عصیر عنب" (شامی، ۹/ ۵۶۱) (اور جائز ہے ان کے نزدیک نہ کہ ان دونوں کے نزدیک شیرہ انگور کا بیچنا)۔

"ولذا استاجر ذمی مسلما لیحمل له خمرا ولم یقل لیشرب أو قال: یشرب جازت الإجارة فی قول أبی حنیفة

رحمه الله خلافا لهما" (فتاویٰ عالمگیریہ، ۴/۴۴۹) (وار جب کسی ذمہ نے کسی مسلمان کو اجرت پر لیا تا کہ وہ اس کی شراب پہنچادے اور پینے کا تذکرہ نہیں کیا یا یہ کہا کہ وہ پیئے گا تو اجارہ جائز ہوگا، ابوحنیفہؒ کے قول میں بخلاف ان دونوں کے)۔

اس سے مراد مطلق بیع یا مطلق اجارہ حمل ہے، لیکن اگر کوئی اس لیے اور اس قصد سے اجزاء شراب کی بیع کرتا ہے تا کہ اس سے شراب تیار کی جائے یا اس لیے شراب کہیں پہنچاتا ہے تا کہ کوئی شراب نوشی کرے تو یہ ان کے نزدیک بھی انشاء اللہ حرام ہوگا، پھر بھی چونکہ شراب کا استعمال پینے کے لیے ہی ہوتا ہے، اس لیے اس کا اجارہ کرنے والا احادیث کی رو سے وعید کا مستحق ہوگا، چنانچہ "الأمور بمقاصدها" کے تحت مذکور ہے:

"إن بيع العصير ممن يتخذه خمرا إن قصد به التجارة فلا يحرم وإن قصد به لأجل التخمير حرم" (الاشباہ والنظائر، ص ۴۳) (بیع عصیر ایسے شخص کے ہاتھ جو اس سے شراب تیار کرے، اگر اس (بیع) سے تجارت کا قصد کیا جائے تو حرام نہیں، اور اگر اس بیع سے شراب بنانے کا قصد کیا جائے تو یہ بیع حرام ہوگی)۔

اور "حمل خمر ذمی" کے تحت علامہ شامیؒ امام ابوحنیفہؒ کے قول جواز کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية ولا سبب لها وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار وليس الشرب من ضرورات الحمل لأن حملها قد يكون للإراقة أو للتخليل" (شامی، ۹/۵۶۲) (اور ان کا یہ کہنا ہے کہ اجارہ کا عقد حمل (پہنچانے) کے لیے ہوا ہے، اور وہ معصیت نہیں ہے اور نہ اس کا سبب ہے، بلکہ معصیت تو اپنے اختیار سے کرنے (پینے) والے کے فعل سے پائی جائے گی، اور پینا شراب کے لے جانے کی ضرورت میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا لے جانا کبھی ضائع کرنے کے لیے ہوگا یا سرکہ بنانے کے لیے)۔

لیکن شراب کی کمپنی کو شراب کی تیاری کے اجزاء فروخت کرنا تو اسی لیے ہوگا کہ وہ کمپنی شراب تیار کرتی ہے، لہٰذا ان اجزاء کو کمپنی کے لیے پیش کرنا ناجائز ہوگا، اور اسی طرح شراب کی کمپنی کے لیے اس کی ملازمت بھی درست نہیں ہوگی۔

"إن بيع العصير لمن يعتقد أنه يتخذه خمرا محرم وكرهه الشافعي، وذكر بعض أصحابه أن البائع إذا اعتقد أنه يعصرها خمرا فهو محرم وإنما يكره إذا شك فيه" (المغنی لابن قدامہ، ۶/۳۱۷)

عصیر (نچوڑنے) کی بیع اس شخص کے ہاتھ جس کے بارے میں یقین ہو کہ شراب بنائے گا حرام ہے، اور امام شافعیؒ نے مکروہ کہا ہے، بعض اصحاب شافعیؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ بائع کو جب اس کا یقین ہو کہ وہ اس کی شراب بنائے گا تو حرام ہے، مکروہ اس وقت ہے جب اس کے بارے میں شک ہو۔

نیز ابن قدامہؒ حسن بصری، عطا اور سفیان ثوریؒ کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک ایسے شخص کے ہاتھ کھجور فروخت کرنا جو اس سے شراب تیار کرے گا، جائز ہے، اور دلیل "أحل الله البيع"، "ولأن البيع تم بأركانه وشروطه" کو نقل کرکے "لا تعاونوا على الاثم والعدوان"، اور حدیث ابوداؤد "لعن الله الخمر وشاربها... الحديث" کے ذریعہ اس کا رد کیا ہے، آگے "وهكذا الحكم في كل ماقصد به الحرام" کے تحت لکھتے ہیں:

"وقد نص أحمد على مسائل نبه بها على ذلك فقال... ومن يخترط الأقداح لا يبيعها ممن يشرب فيها" (المغنی، ۶/۳۱۹) (اور امام احمدؒ نے چند مسائل کی صراحت کی ہے جس کے ذریعہ اس پر متنبہ کیا ہے انہیں میں سے ہے کہ جو آدمی پیالے ڈھالتا ہو (بناتا ہو) ان کو اس کے ہاتھ نہیں بیچے گا جو اس میں شراب پیئے)۔

ان ساری عبارتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شراب کی کمپنی جس میں شراب ہی تیار ہوتی ہے اس کی ملازمت جو شراب پینے پلانے کے کام سے متعلق ہو یا اس کمپنی کو ایسے اجزاء پیش کرنا یا بیع کرنا جن سے شراب تیار ہوتی ہے یا شراب کی کمپنی کے لیے مخصوص بوتلیں تیار کرنا یا ان کے ہاتھ فروخت کرنا درست اور جائز نہیں۔

البتہ اگر کوئی کمپنی محض شراب کی تیاری کا ہی کام نہ کرتی ہو بلکہ وہ سرکہ یا دوسرا کوئی حلال مشروب بھی اس سے تیار کرتی ہو تو پھر اس کے ساتھ اس کے اجزاء کی خرید و فروخت کو جائز لکھا ہے، چنانچہ المغنی میں ہے:

"فأما إن كان الأمر محتملا، مثل أن يشتريها من لا يعلم حاله أو من يعمل الخل والخمر معا ولم يلفظ بما يدل علي ارادة الخمر فالبيع جائز" (المغنی، ۳۱۹/۶) (بہرحال صورت حال محتمل ومبہم ہو مثلاً اس عصیر کو ایسا شخص خریدے جس کا حال معلوم نہ ہو یا وہ شخص خریدے جو سرکہ اور شراب دونوں بناتا ہو، اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے خمر کے ارادہ پر دلالت ہو تو بیع جائز ہے)۔

شراب کی کمپنی میں حساب کتاب لکھنے کی ملازمت کرنا جائز معلوم ہوتا ہے۔

"وإن استاجر ليكتب له غناء بالفارسية أو بالعربية فالمختار أنه يحل لأن المعصية فى القراءة" (عالمگیریہ، ۴۵۰/۴) (اور اگر اجرت پر لیا کہ اس کے لیے فارسی یا عربی میں گانا لکھ دے تو قول مختار یہ ہے کہ اجرت حلال ہوگی کیونکہ معصیت گانے میں ہے)۔

اور اس لیے کہ حساب کتاب لکھنے سے براہ راست شراب نوشی کا تعاون نہیں ہوتا۔

۳۔ الف۔ سپر مارکیٹ:

ایسی کمپنی یا ادارہ جس کا اصل مقصد حرام کام کرنا نہیں ہے، لیکن ضمناً اس میں محرمات کا کاروبار بھی ہوتا ہے، ایسے کمپنی یا ادارہ میں ملازمت کرنا جائز ہوگا، البتہ ملازم اس حرام کام میں جو ضمناً ہو رہا ہے خود کو اس میں ملوث ہونے سے بچائے گا، اور اس ادارہ میں یا کمپنی میں اس کی اجرت ملازمت جائز ہوگی۔

"وإذا استاجر الذمى من المسلم داراليسكنها فلا بأس بذلك وإن شرب فيها الخمر أو عبدفيها الصليب او ادخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم فى ذلك بأس، لأن المسلم لا يواجرها لذلك إنما آجرها للسكنى كذا فى المحيط" (فتاویٰ عالمگیریہ، ۴۵۰/۴) (اور جب ذمی نے مسلمان سے کوئی مکان اجرت پر رہنے کے لیے لیا تو اس میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ وہ اس میں شراب پئے، یا صلیب کی پوجا کرے یا اس میں خنزیر کو داخل کرے، مسلمانوں کو اس سے کوئی حرج لاحق نہیں ہوگا، کیونکہ مسلمان ان کاموں کے لئے اس کو اجرت پر نہیں دیتا ہے، بلکہ اس کو رہنے کے لیے اجرت پر دیا ہے)۔

ایسے ہی سپر مارکیٹ میں سامان کی فروخت کے لیے ملازمت اختیار کیا ہے، تو ممنوعہ اور حرام اشیاء کی فروخت سے احتراز کرتے ہوئے اس مارکیٹ کی ملازمت اختیار کی جاسکتی ہے اور اگر اس نے شراب یا کسی حرام شے کی فروخت کا ارتکاب کیا تو اس کا گناہ اس پر لازم ہوگا، پھر بھی اس کی اجرت اور تنخواہ جائز اور حلال ہوگی۔

"وكذا فى كل موضع تعلق المعصية بفعل فاعل مختار" (خلاصۃ الفتاوی، ۱۴۹/۳، الفصل العاشر فی الحظر والاباحۃ از حوالہ حاشیہ فتاویٰ محمودیہ، ۵۶۹/۱۶) (اور ایسے ہی ہر اس موقع پر جبکہ معصیت باختیار فاعل کے فعل سے متعلق ہو)۔

لہٰذا ماہانہ اجرت پر سپر مارکیٹ کی ملازمت جائز ہے، اور چونکہ شراب حرام ہے، مال غیر متقوم ہے، اس کے بیچنے والے پر بھی لعنت کی گئی ہے، اس لئے کسی مسلمان کے لئے اس کا بیچنا درست نہیں، اگر اس کی بیع کرے گا تو وعید کا مستحق ہوگا۔

"وإذا كان أحد العوضين أو كلاهما فالبيع فاسد كالبيع بالميتة والدم والخنذير والخمر" (ہدایہ مع فتح القدیر، ۴۳/۶) (اور جب بدلین میں ایک یا دونوں حرام ہوں تو بیع فاسد ہوگی جیسے مردار یا خون یا خنزیر یا شراب کی بیع)۔

ب۔ پیشہ تدریس:

تدریس پر اجرت لینا جائز اور معمول بہا ہے، خواہ قرآن کی تعلیم ہو یا فقہ ودیگر علوم کی، کیونکہ مدت تدریس کی اجرت معلوم ہوتی ہے، مشاہرۃ، اور اس مدت میں اجیر حاضر ہوتا ہے، اور عمل تدریس کو انجام دیتا ہے۔

"ومشائخ بلخ جوز والاستئجار على تعليم القرآن إذا ضرب لذلك مدة وأفتوا بوجوب المسمى وعند عدم الإستئجار اصلا أو عند الإستئجار بدون المدة افتوا بوجوب أجر المثل" (عالمگیریہ، ۴۴۸/۴) (اور مشائخ بلخ نے جائز قرار دیا ہے قرآن کی تعلیم پر اجیر بنانے کو جبکہ متعین کردی جائے اس کے لیے کوئی مدت اور مقررہ اجرت کے وجوب کا فتویٰ دیا ہے، اور اجرت کا معاملہ نہ کرنے پر یا بغیر مدت کے اجرت کا معاملہ کرنے پر اجرت مثل کا فتویٰ دیا ہے)۔

لہٰذا تدریس پر اجرت لینا جائز ہے، البتہ مناسب یہ ہے کہ پڑھنے والے اگر لڑکے ہوں تو ان کے لئے مرد اساتذہ ہوں اور پڑھنے والی لڑکیاں ہوں تو ان کے لیے خواتین اساتذہ ہوں۔

اور اگر پردہ کا نظم ہو تو مرد اساتذہ خواتین طالبات کو درس دے سکتے ہیں اور اس کے برعکس بھی کیونکہ بوقت ضرورت عورتوں سے گفتگو کرنا جائز ہے، امام ابوالعباس القرطبی کا قول ان کی کتاب السماع کے حوالہ سے مذکور ہے:

"ولا يظن من لا فطنة عنده أنا إذا قلنا "صوت المرأة عورة" أنا نريد بذلك كلامها، لأن ذلك ليس بصحيح، فانا نجيز الكلام مع النساء للأجانب ومحاورتهن عند الحاجة إلى ذلك" (ردالمحتار، ۲/۷۹) (اور نہ خیال کرے وہ شخص جس کے پاس سمجھ نہیں ہے کہ ہم جب کہتے ہیں: "صوت المرأة عورة" تو اس سے مراد لیتے ہیں اس کے کلام کو (کہ اس کے لیے بات کرنا درست نہیں) کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ہم ضرورت کے وقت اجنبی شخص کو عورتوں سے گفتگو اور بات کرنے کو جائز کہتے ہیں)۔

نیز حضرت عائشہؓ اور دیگر امہات المومنینؓ کا صحابہ کرام سے حدیثیں بیان کرنا اور صحابہ کرام کا ان کی آواز کا سننا ثابت ہے، اس لیے پردہ کا نظم ہو تو مرد اساتذہ، عورتوں کو، اور خواتین اساتذہ مردوں کو بھی درس دے سکتے ہیں بوقت ضرورت اور بغیر پردہ کے اس طور پر ایک دوسرے کے لیے درس دینا درست اور جائز نہیں کیونکہ اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنا جائز نہیں، اور نہ عورت کے لیے جائز ہے کہ اجنبی مرد کے سامنے بے پردہ ہو، اگرچہ عمل تدریس پر اجرت جائز ہوگی۔

"وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة" (الدرالمختار، ۲/۷۹)

اور جوان عورت مردوں کے درمیان چہرہ کھولنے سے روکی جائے گی اس لیے نہیں کہ چہرہ عورت ہے بلکہ فتنہ کے خوف سے۔

قرآن کریم میں مرد اور عورت دونوں کو حکم ہے کہ اپنی نگاہ نیچی رکھیں۔

"قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم" (سورۂ نور: ۳۰)

(مومنوں سے کہئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں)۔

"وقل للمومنات يغضضن من أبصارهن" (ایضاً، ص/۳۱) (اور مومن عورتوں سے کہئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں)۔

مخلوط تعلیم یعنی ایک ہی کلاس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں بغیر پردہ کے تعلیم حاصل کریں یہ بھی جائز نہیں، اور اگر ایسا نظم ہو کہ درمیان میں پردہ ہو، تو اس طور پر تعلیم اگرچہ جائز ہو سکتی ہے لیکن اس فتنہ کے دور میں احتیاط اولیٰ ہوگی۔

کتب فقہ میں اگرچہ اجنبی عورت کے چہرہ کو دیکھنے کا جواز مذکور ہے لیکن وہ عدم شہوت کے ساتھ مقید ہے۔

"النظر إلى وجه الاجنبية إذا لم يكن عن شهوة ليس بحرام لكنه مكروه" (كذافي السراجيه، فتاویٰ عالمگیریہ، ۵/۳۲۹)

(اجنبی عورت کے چہرہ کی طرف بلا شہوت دیکھنا حرام نہیں ہے لیکن مکروہ ہے)۔

اور اس فتنہ کے دور میں چونکہ شہوت اور فسق میں وقوع کا گمان غالب اور اندیشہ قوی ہے، اس لیے اسے حرام ہی ہونا چاہئے، جیسا کہ گذشتہ صفحہ میں درمختار کے حوالہ سے نقل کیا گیا کہ چہرہ کے ستر نہ ہونے کے باوجود فتنہ کے خوف سے جوان عورت کے اپنے چہرہ کو اجنبی مردوں کے سامنے کھولنے سے روکا جائے گا۔

ج۔ پیشہ وکالت:

معاشرہ میں باہمی نزاع اور خصومات کا وقوع بھی ہوتا ہے جن کے تصفیہ کے لیے عدلیہ ومحکمہ کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی لیے ہر حکومت میں عدالت اور قضاء کا نظام بھی قائم ہوتا ہے، اور بسا اوقات فریقین اپنے مسائل اور قضایا کی ترجمانی پر قادر نہیں ہوتے، اس لیے اس کی خاطر وکیل کئے جاتے ہیں جو اپنے مؤکل (فریق) کی طرف سے اس کیس اور مسئلہ کو دیکھتے ہیں، اور اس کے لیے وہ اپنے مؤکل سے فیس اور اجرت لیتے ہیں، اس طرح مخاصمات میں مدعی ومدعی علیہ دونوں فریق کے لیے یہ جائز ہے کہ اپنا وکیل مقرر کریں۔

"لكل من المدعي والمدعى عليه أن يوكل من شاء بالخصومة ولا يشترط رضا الأخر" (شرح المجله، ماده رقم، ۱۵۱۶)

(مدعی اور مدعی علیہ ہر ایک کے لیے جائز ہے کہ جس کو چاہیں مخاصمت کے لیے وکیل بنائیں اور دوسرے کی رضامندی شرط نہیں ہے)۔

لہٰذا مخاصمات میں وکیل بننا جائز ہوگا، اور وکالت پر اجرت لینا بھی جائز ہے، کیونکہ وکیل اس کے لیے اپنا وقت دیتا ہے اور مقدمات کی تاریخوں پر موجود رہتا ہے، اپنے مؤکل کی طرف سے بحث اور ترجمانی کرتا ہے۔

البتہ وکیل کو اس بات کا لحاظ کرنا ضروری ہے کہ وہ مظلوم کو انصاف دلائے، جان بوجھ کر کسی ظالم کی وکالت نہ کرے، اور نہ کسی ظالم کا تعاون کرے، کیونکہ ظالم شخص کی وکالت کرنا، اور اس کا تعاون کرنا اعانت علی الاثم ہے، اور مظلوم کو نقصان پہنچانا اور حقدار کو اس کے حق سے محروم کرنا ہے۔

حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منقول ہے:

"ملعون من ضار مومنا أو مكر به" (سنن الترمذی، ۴/ ۳۳۲، حدیث ۱۹۴۱) (جو شخص کسی مومن کو ضرر پہنچائے، اور اس کے خلاف سازش کرے اس پر لعنت کی گئی ہے)۔

اور شہادت زور (جھوٹی گواہی) کبائر میں سے ہے، لہٰذا اپنے مؤکل کو جھوٹ بولنے کی تربیت اور ترغیب دینا ہرگز جائز نہیں ہوگا۔

"عن أبي بكرة قال: كنا عند رسول الله فقال: ألا أنبئكم بأكبر الكبائر؟ (ثلاثا) الإشراك بالله وعقوق الوالدين وشهادة الزور (أو قول الزور) وكان رسول الله متكئا فجلس فمازال يكررها حتى قلنا: ليته سكت" (صحیح مسلم، کتاب الایمان حدیث ۱۴۳/ ۸۷) (حضرت ابوبکرہؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، آپ نے ارشاد فرمایا تین مرتبہ: کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہ نہ بتاؤں؟ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا (یا جھوٹی بات کہنا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے تھے (سیدھے) بیٹھ گئے، اور برابر اسے دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم نے بھی کہا کاش آپ خاموش ہوجاتے)۔

د۔ پیشہ طبابت:

طبیب کو امانتداری اور دیانتداری سے کام لینا چاہیے، اس کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ وہ مشورہ چاہنے والے کی مصلحت کو چھپا کر اس کے نقصان کی طرف اس کی رہنمائی کرے، یہ اس کے ساتھ خیانت ہوگی، اور اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا ہوگا، جو "الدین النصیحة" کے خلاف ہے اور خیانت کرنا نفاق کی علامت ہے، اس لیے کسی بھی ڈاکٹر کا بلاضرورت شدیدہ، صرف زیادہ آمدنی کے لیے کسی مریض کے لیے آپریشن، یا ٹیسٹ وچیک وغیرہ تجویز کرنا شریعت اسلامیہ کے خلاف ہوگا، اور ایسا کرنا غش اور خیانت ہوگا اور کسی کے مال کو ناجائز طور پر اس کی رضا کے بغیر کھانا ہوگا جو ممنوع ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے کہ لوگوں کے مال کو غلط طریقہ پر استعمال کیا جائے یا کھایا جائے۔

ایسے ہی معالج پرائیویٹ ملازم ہو، مناسب تو یہ ہے کہ مرد مریض، مرد ڈاکٹر سے اور خاتون مریض خاتون معالج سے علاج کے لئے رجوع کریں، خاص طور سے ایسے امراض کے علاج میں جس کا تعلق قابل ستر حصہ سے ہو، کیونکہ اجنبی مرد اور اجنبی عورتوں کا ایک دوسرے کو دیکھنا یا چھونا درست نہیں، جیسا کہ قرآن کریم کے ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے: "قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم"، نیز "وقل للمؤمنات يغضضن من ابصارهن" لیکن اگر ایسی مجبوری ہے کہ خاتون ڈاکٹر موجود نہیں ہے تو اس صورت میں بقدر ضرورت اجازت دی جاتی ہے۔

''ينظر الطبيب إلى موضع مرضها بقدر الضرورة، إذا الضرورات تتقدر بقدرها'' (الدر المختار، ۹/۵۳۲)
(مرد معالج، مریض کے مرض کی جگہ کو بقدر ضرورت ہی دیکھے گا، کیونکہ ضرورتیں اپنی بقدر ہی مقدر کی جائیں گی)۔

ھ۔ ہوٹل کی ملازمت:

ہوٹل جن کا بنیادی مقصد، معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے، اس کا معاملہ اجارہ درست ہے، جس طرح سے مکان ودوکان کرایہ پر دی جاتی ہیں، اسی کے مثل ہوٹل اور اس کے کمرے وغیرہ بھی ہیں، ان کو بھی کرایہ پر دینا درست ہے، اور جس طرح مکان ودوکان کی ملازمت جائز ہے، اسی طرح ہوٹل کی ملازمت بھی جائز ہے۔

"صح اجارة الدور والحوانيت بلا بيان ما يعمل فيها والقياس أن لا تجوز هذه الإجارة حتى يبين ما يعمل

فیھا" (البحر الرائق، ۸/۱۶) (مکانات اور دوکانوں کو کرایہ پر دینا بغیر اس وضاحت کے کہ اس میں کیا کرے گا صحیح ہے، اور قیاس یہ ہے کہ اس میں عمل کی وضاحت کے بغیر درست نہ ہو)۔

کیونکہ اس میں سکونت وتجارت کے علاوہ دوسرے کام کرنے کا امکان اور صلاحیت بھی ہے، لیکن چونکہ عام طور پر دوکان یا مکان کا کرایہ پر لینا تجارت یا سکونت کے لیے متعارف ہے، اس لیے اس کو بیان عمل کے بغیر بھی جائز کہا گیا ہے، البتہ اس صورت میں کوئی ایسا کام اس میں نہیں کرے گا (کرایہ پر لینے والا) جس سے عمارت خراب اور کمزور ہو۔

"وجه الإستحسان أن العمل المتعارف فيها السكنى والمتعارف كالمشروط. ولأن اجارتها لاتختلف باختلاف العامل والعمل فجاز اجارتها مطلقا" (ایضا)"قال صاحب غاية البيان: ... وله أن يعمل فيها كل شئ لايوهن البناء ولا يفسد" (ایضا) (وجہ استحسان یہ ہے کہ ان میں عمل متعارف سکونت (اور تجارت) ہی ہے، اور معروف مشروط کی طرح ہوتا ہے، نیز اس لیے بھی کہ کام کرنے والے اور کام کے اختلاف سے اسکے اجارہ (یعنی منفعت اور اجرت کے حصول) پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے ان کا مطلقاً اجارہ درست ہے، اور اس کے لیے جائز ہے کہ اس میں ہر وہ کام کرے جو عمارت کو کمزور اور خراب نہ کرے)۔

لہٰذا ان ہوٹلوں میں کمرے کرایہ پر لے کر ان میں قیام کرنے والے اس میں شراب نوشی یا رقص وسرور و دیگر معاصی کے کام بھی کرتے ہیں تو اس سے اجرت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

"وإذا استاجر الذمى من المسلم دار اليسكنها فلا بأس بذلك وإن شرب فيها الخمر أو عبدفيها الصليب أو أدخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم فى ذلك فلابأس لأن المسلم لا يواجر ها لذلك انما آجرها للسكنى كذا فى المحيط" (فتاویٰ عالمگیریہ، ۴/۴۵۰) (اور جب ذمی، مسلمان سے کوئی گھر کرایہ پر لے جس میں وہ رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ وہ اس میں شراب نوشی کرے، یا صلیب کی پوجا کرے یا اس میں خنزیر لے جائے، مسلمان کو اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوگا، کیونکہ مسلمان نے اس کو ان کاموں کے لیے اجرت پر نہیں دیا ہے، بلکہ اس کو سکونت کے لیے اجرت پر دیا ہے)۔

یہی حکم سوئمنگ پول یا ان تمام اشیاء کے اجارہ کا ہوگا جن کا استعمال جائز طور پر ہوسکتا ہے، اگرچہ اس کو بطور معصیت استعمال کی بھی گنجائش ہو، جس طرح دوکان مکان کی تعمیر سکونت وتجارت کے لیے ہوتی ہے، اور انہیں کاموں کے لیے عموماً انہیں کرایہ پر لیا جاتا ہے، اسی طرح ہوٹلوں میں سوئمنگ پول کی تعمیر شناوری وتیراکی کے لیے ہوتی ہے، ان کے غلط استعمال کرنے والے کرایہ داروں کی وجہ سے ان کے مالکین کو ان سے حاصل ہونے والی اجرت پر فرق نہیں پڑے گا، بشرطیکہ ان ہوٹلوں وغیرہ کے مالک ان حرام اشیاء کی فراہمی خود نہ کریں۔

اور اگر ان محرمات کی فراہمی انہیں ہوٹل مالکین کی طرف سے ہوگی تو اس صورت میں یہ بھی گناہگار ہوں گے، اور اس فراہم کرنے کی اجرت لینا ان کے لیے درست نہ ہوگا۔

"ولا تجوز الإجارة على شئى من الغناء والنوح والمزامير والطبل وشىء من اللهو وعلى هذا الحداء وقراءة الشعر وغيره، ولا اجر فى ذلك وهذا كله قول أبى حنيفة وأبى يوسف ومحمد رحمهم الله تعالى كذا فى غاية البيان" (فتاویٰ عالمگیریہ، ۴/۴۴۹) (اور نہیں جائز ہے اجارہ گانے اور نوحے پر اور نہ ڈھول باجے پر اور نہ لہو ولعب کی کسی چیز پر و اراسی طرح حدی خوانی اور اشعار وغیرہ کے پڑھنے پر، ان سب کاموں پر کوئی اجرت نہیں ہے، اور یہ سب قول ہے ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کا)۔

لہٰذا ہوٹلوں میں قیام پر تو اجرت اور کرایہ لینا جائز ہے، مگر ان کے لیے شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام رقص وموسیقی کی وسہولت مہیا کرنا جائز نہ ہوگا، اور نہ ان پر اجرت لینا جائز ہوگا، اور جو ان ہوٹلوں میں ملازم ہوں ان کے لیے بھی جائز نہیں کہ ان محرمات کو ان قیام کرنے والے اشخاص تک پہنچائیں، یہ سب تعاون علی الاثم ہوگا، اور ان کی فراہمی کے لیے وہ ملازمت پر ہیں تو ان کا اجرت لینا بھی درست نہیں، کیونکہ یہ براہ راست تعاون ہوگا، اور صرف قیام کے لیے اجرت پر دینا براہ راست تعاون نہ ہوگا، قیام کرنے والا اپنے طور پر شراب نوشی وغیرہ کرے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا۔

☆☆☆

مختلف سیکٹروں میں ملازمتوں کے شرعی احکام

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی [1]

معاش کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے، اس کا ایک طریقہ ملازمت بھی ہے، بذات خود ملازمت جائز ہے اور شرعی اصول وضوابط کی پابندی کے ساتھ کرنے میں اللہ کی طرف سے اجر کا وعدہ ہے، مسئلہ اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب ہماری ملازمت اور معاشی مشغولیت، شریعت کے بنیادی اصول سے عملی طور پر متصادم ہوجائے اور ربات اعانت علی المعصیۃ یا معصیت تک پہنچ جائے، اسی پس منظر میں اس وقت ہماری گفتگو کا محور ومرکز مختلف النوع ملازمتیں ہیں، خصوصاً ایسی ملازمت جو بادی النظر میں اسلامی اصول اور نصوص کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اور جن میں کبھی کبھی دوران ملازمت خلاف شریعت عمل کا ارتکاب کرنا ہوتا ہے۔

(الف) ان میں سے ایک فوج کی ملازمت ہے، اس کا اصل کام تو ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہے، کبھی غیر معمولی حالات پیدا ہوجائیں تو اندرون ملک بھی امن وامان کے قیام کے لیے ان کی خدمت لی جاتی ہے، امن وامان کا قیام اور وطن کی حفاظت کا کام شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور فقہاء نے جن امور کے لیے قتال کو جائز کہا ہے اس میں وطن کی حفاظت بھی ہے، کیونکہ یہ اصلاً حفظ جان، حفظ مال اور حفظ عرض کے قائم مقام ہے، اس لیے کہ عدم حفاظت کی صورت میں دشمن ملک میں داخل ہوجائیں گے، ایسے میں نہ جان محفوظ رہے گی، نہ مال اور نہ ہی عزت وآبرو۔ قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں بلقیس کا مکالمہ مذکور ہے:

قالت ان الملوك اذا دخلوا قرية إفسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة و كذلك يفعلون (نمل: ۳۴)۔

(کہنے لگی: بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں، اس کو خراب کردیتے ہیں، وہاں کے سرداروں کو بے عزت کرتے ہیں، اور ایسا ہی کچھ وہ لوگ کریں گے)۔

لیکن اس ملازمت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ کبھی ایک مسلمان فوجی کا مقابل مسلمان ہوتا ہے اور اسے اپنے کمانڈر کے حکم پر بالقصد مسلمان فوجی پر گولی چلانی ہوتی ہے، اور اس کے نتیجے میں مؤمن کے قتل عمد کا ارتکاب ہوتا ہے، فوج کی ملازمت میں ایسی صورت حال پیش آتی رہتی ہے، اور اس سے مفر نہیں ہے، مسلمان اگر یہ سوچ کر فوج کی ملازمت سے اپنے کو الگ کرلیں تو معیشت کے وسائل بھی محدود ہوجائیں گے اور بہت سی دفعہ مسلمان کے فوج میں ہونے کی وجہ سے، مسلمان فوج کی زیادتی سے جو بچ جاتے ہیں یہ بھی باقی نہیں رہے گا اور مسلم دشمن ذہنیت کو اس کا پورا پورا موقع ملے گا کہ وہ جس طرح چاہیں کریں، ان حالات میں ہمیں "أهون البليتين" (دو مصیبتوں میں سے آسان) "الضرر يزال" "الضرورات تبيح المحظورات" جیسے فقہی اصولوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

''إذا تعارض مفسدتان، روعي أعظمهما ضرارا بارتكاب أخفهما، وقال الزيلعي: ثم الاصل في جنس هذه المسائل ان من ابتلي ببليتين وهما متساويان، يأخذ بايتهما شاء وان اختلفاه يختار أهونهما، لأن مباشرة الحرام لا تجوز إلا لضرورة'' (۱/ ۲۶۱)۔

(جب دو خرابیاں ٹکرا جائیں تو جس میں کم نقصان ہوگا اسے اختیار کیا جائے گا۔ اور زیلعی ؒ نے فرمایا کہ اس جیسے مسائل میں اصل یہ ہے کہ اگر کوئی دو مصیبتوں میں گھر گیا اور دونوں کے دونوں برابر ہوں، تو ان میں جن کو چاہے اختیار کرے اور اگر وہ دونوں خرابیاں برابر نہ ہوں تو جس میں خرابی ہو

---

[1] نائب ناظم امارت شرعیہ، بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ۔

اس کو اختیار کیا جائے۔ اس لیے کہ حرام کا ارتکاب ضرورتاً ہی جائز ہے)۔

ملکی سرحدوں کی حفاظت اور مسلمانوں کو متوقع ظلم سے بچانا یا ایسی شکلیں پیدا کرنا کہ ظالموں کو ظلم کا حوصلہ نہ ہو، شریعت کی نظر میں پسندیدہ امر ہے، اور مؤمن کا مقابل آنا اور گولیاں اس پر چلانا یقینی اور کثیر الوقوع نہیں ہیں، اس لیے فوج میں ملازمت کی اجازت ہوگی، اور ضرورتاً اقامت فرض کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو جائے تو دوسرے فوجیوں کو نشانہ بنانے کی نیت کرے، جیسا کہ مسلم قیدیوں اور تجار کی موجودگی میں کافروں کے غول پر تیراندازی کی اجازت دی گئی ہے۔

"ولا بأس برميهم بالنبال، وان علموا ان فيهم مسلمين من الاسارى والتجار لما فيه من الضرورة ... ولكن يقصدون بذلك الكفرة دون المسلمين لانه لا ضرورة فى القصد الى قتل مسلم بغير حق" (بدائع الصنائع، ۹/ ۳۰۶)۔

(اور ان کی جانب تیراندازی میں کوئی حرج نہیں اگرچہ معلوم ہو کہ ان میں مسلمان قیدی اور تاجر ہیں، اس لیے کہ یہاں تیراندازی ضرورت کے تحت ہے......لیکن اس تیراندازی میں مقصود کافر ہوں نہ کہ مسلمان، اس لیے کہ مسلمانوں کو ارادۃً ناحق قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے)۔

بدائع میں ہی ایک دوسری شکل یہ ذکر کیا ہے کہ کفار نے مسلم بچوں کو ڈھال بنالیا تاکہ وہ تیر وغیرہ کی زد میں آنے سے بچ جائیں، ایسے میں تیر چلانے کا مطلب مسلم بچوں کی جان کو خطرے میں ڈالنا ہے، لیکن فقہاء نے ضرورتاً اس کی اجازت دی ہے، البتہ نیت اس شکل میں بھی کفار کے قتل کی رکھنی ہوگی، مسلمان بچوں کے قتل کی نہیں اس کے باوجود اگر مسلمان بچے کو تیر لگا اور وہ مر گیا تو تیرانداز پر نہ تو دیت لازم ہوگی اور نہ کفارہ۔

"وكذا إذا تترسوا بأطفال المسلمين فلا باس بالرمى اليهم لضرورة إقامة الفرض، لكنهم يقصدون الكفار دون الاطفال فان رموهم فأصاب مسلما فلادية ولا كفارة۔" (۹/ ۳۰۷)

(اور ایسے ہی اگر مسلمان کے بچوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا تو فریضہ کی ادائیگی کے پیش نظر ان کی جانب تیراندازی درست ہے۔ لیکن اس عمل سے ان کا ارادہ کافروں کی جانب تیراندازی کا ہو نہ کہ مسلم بچوں کا، لہٰذا اگر ان پر تیراندازی ہوئی اور تیر کسی مسلمان کو لگ گئی تو اس پر نہ کوئی دیت ہے اور نہ کفارہ)۔

بڑی پریشانی اس وقت ہوتی ہے جب یقینی طور پر لشکر غیر میں مسلمان ہی مسلمان ہوں، ایسے میں نیت غیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اب اگر احتراز کی کوئی شکل نہ ہو تو یہ سوچ کر کہ یہ ہمارے ملک کے دشمن ہیں اور سرحدوں کی حفاظت ہمارے فرائض منصبی میں داخل ہے، بادل ناخواستہ حملہ کرسکتا ہے اور اس کی حیثیت کمانڈر کے حکم کی وجہ سے جبر و اکراہ کی ہوگی، جس کی وجہ سے شریعت کے بہت سارے احکام بدل جاتے ہیں، اور بہت ساری رخصتیں حاصل ہو جاتی ہیں، البتہ اس صورت میں بھی دل سے برا ماننے کے باوجود کمانڈر کے حکم سے سرتابی کی اجازت نہیں دی جاسکتی، خصوصاً اس شکل میں جب لڑائی وطن کی حفاظت کے لیے ہو، اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے نہیں۔ حضرت عوف بن مالک کی ایک مرفوع حدیث سے اس سلسلے میں استدلال کیا جاسکتا ہے:

"الا من ولى عليه وال فراه ياتى شيئًا من معصية الله فليكره ما ياتى من معصية الله ولاينزعن يدا من طاعته۔" (مسلم، ۳: ۱۲۹)۔

(کسی شخص پر کوئی والی مقرر ہوا تو اس نے اللہ کی نافرمانی کا صدور اس سے دیکھا تو اسے چاہئے کہ معصیت الٰہی کے ارتکاب کو ناپسند کرے البتہ اس کی تابعداری سے باز نہ آئے)۔

(ب) یہی صورت حال پولیس کی ملازمت کا ہے، ہندوستان کے مخصوص حالات میں مسلمان کا پولیس میں ہونا انتہائی ضروری ہے، اصلاً اس کے ذمہ اندرون ملک امن وامان کا قیام ہے اور یہ کار نیک ہے، لیکن کبھی افسروں کے حکم کی تعمیل اور کبھی حالات کی وجہ سے ان کا رخ ظلم کی طرف مڑ جاتا ہے، ملزموں سے سچ اگلوانے اور ڈرانے دھمکانے میں گالی گلوچ اور بدزبانی کی نوبت بھی آتی رہتی ہے، لیکن ظاہر ہے بدسلوکی، تشدد، گالی گلوچ اور بدزبانی

اس ملازمت کے لوازمات میں نہیں ہیں، یہ افراد کی کوتاہی اور غلطی ہے جس کی وجہ سے پورا محکمہ ہی بدنام ہو کر رہ گیا ہے۔ اس ملازمت میں فوج کی ملازمت سے زیادہ صاف ستھرا انداز اختیار کیا جاسکتا ہے، اور ظلم و زیادتی سے بچا جاسکتا ہے، اس لیے پولیس کی ملازمت اختیار کرنی جائز ہے، البتہ مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ ہر حال میں منکرات اور منہیات سے بچیں اور اپنے عہدے کا استعمال حق کی حمایت کے لیے کریں۔

ہمارے زمانہ میں محکمہ پولیس میں عورتوں کی بحالیاں بھی ہو رہی ہیں اور ایس پی، ڈی ایس پی، آئی جی، ڈی آئی جی تک کے عہدوں پر وہ مامور ہیں، گذشتہ چند سالوں میں ٹریفک پولیس میں گاڑیوں کو کنٹرول کرنے میں ان کی مضبوط حصہ داری سامنے آئی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلم عورتوں کے لیے بھی ان محکموں میں ملازمت کی اجازت ہوگی، اس سوال کا سیدھا جواب ہے کہ ان ملازمتوں میں عورتیں شرعی حدود کے ساتھ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتیں، اس لیے عورتیں نہ تو پولیس محکمہ میں اور نہ ہی ٹریفک پولیس میں بحال ہوسکتی ہیں، کیونکہ ان محکموں میں مردوں کے عمومی اختلاط سے بچا نہیں جاسکتا اور نہ ہی پردہ کے ساتھ ان امور کی انجام دہی کی جاسکتی ہے۔

(ج) محکمہ فوج کا ہو یا پولیس کا، امن و امان کے قیام اور مجرموں تک رسائی کے لیے مخبر اور جاسوس کا ہونا ضروری ہے، اور اس میدان میں بھی ملازمت کے بڑے مواقع، بڑی تنخواہ اور نسبتاً زیادہ سہولیات کے ساتھ دستیاب ہیں، اس محکمہ میں کام کرنے والوں کو دو منہیات کا ارتکاب لازماً کرنا ہوتا ہے، ایک غیبت اور دوسرے تجسس کا جب کہ ان دونوں کی ممانعت واضح طور پر قرآن کریم میں موجود ہے: "ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا" (الحجرات) (تجسس میں نہ لگو اور ایک دوسرے کی غیبت مت کرو)۔

فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ملکی سالمیت اور بقاء امن و امان کے لیے یہ کام ضروری ہے، خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات اور سرایا میں جاسوسوں کی مدد لی اور ان کی رپورٹ پر فیصلے فرمائے، اس سے معلوم ہوا کہ تجسس اور غیبت کی ممانعت عمومی نہیں ہے، کسی اہم مقصد کے لیے ان امور کا ارتکاب جائز اور درست ہوگا، یہی وجہ ہے کہ فن اسماء الرجال میں بہت سارے رواۃ کی کمی اور کمزوریوں کو برملا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ حدیث کی صحت کو پرکھنے اور موضوع احادیث سے اجتناب کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا، اس لیے میری رائے ہے کہ جاسوسی اور مخبری کی ملازمت جائز ہے، البتہ اس محکمہ میں بھی عورتوں کو ملازمت کی اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ بسا اوقات اس کام میں جان کو بھی خطرہ ہوتا ہے اور عزت و ناموس کو بھی، مردوں سے اختلاط، اجنبی لوگوں کے ساتھ تنہائی میں ملاقات وغیرہ اس پر مستزاد ہے، اس لیے مسلم عورتوں کو اس شعبے میں ملازمت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

(د) محکمہ پولیس نے جس ملزم کو جاسوس اور مخبروں کی رپورٹ پر گرفتار کیا، اور مقدمہ چلایا، اس کا فیصلہ عدالت میں ہوتا ہے، الزامات ثابت نہ ہوں تو براءت ہوتی ہے اور ثابت ہوگئی تو سزائیں ملتی ہیں، بات مسلم اور اسلامی قانون پر عمل درآمد والے ملک کی نہیں ہے، ہندوستان جیسے غیر مسلم ملک کی ہے، جہاں کے بہت سارے قوانین اسلامی اصولوں اور قوانین سے متصادم ہیں، ان حالات میں اس ملک میں جج کی ملازمت درست ہوگی یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں واضح طور پر ان لوگوں کو جو قرآن و احادیث کے خلاف فیصلے سناتے ہیں، کافر ظالم اور فاسق کہا گیا ہے، گویا جج کی کرسی پر بیٹھ کر قرآن و احادیث کے مخالف فیصلے دینا، اس طاغوتی نظام کا حصہ بننا ہے، جسے شریعت پسند نہیں کرتی۔

لیکن اگر عدلیہ سے مسلمان بالکلیہ الگ ہوجائیں تو یہ پورا محکمہ غیر مسلم قانون پر عمل کرنے اور کرانے والوں سے بھر جائے گا، پہلے ہی عدالت کا رویہ مسلمانوں کے حوالہ سے منصفانہ نہیں ہے، اس صورت میں مسلمانوں کو اور بھی ظلم و جور کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن اگر مسلم جج موجود ہوں تو بجا طور پر ان سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ فیصلہ کرتے وقت اپنے علم کے مطابق ممکنہ حد تک اس بات کی کوشش کریں گے کہ اسلامی اصولوں کو سامنے رکھا جائے اور اسلام سے متصادم قانون کی تطبیق کے سلسلے میں ایسی کوئی شکل نکال لی جائے جس سے اسلامی اصولوں سے براہ راست ٹکراؤ کے امکانات کم سے کم ہوجائیں، موجودہ حالات میں اسے خوش فہمی ہی کہا جائے گا لیکن "ظنوا بالمؤمنین خیرا" کے تحت ہمیں ایک مسلمان جج کے بارے میں اچھی رائے رکھنی چاہئے، تاریخ کا ایک سچ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو آزادی کے بعد جتنا نقصان مسلم ججوں سے پہنچا ہے، دوسروں سے نہیں پہنچا، اس کے باوجود ضرورت ہے کہ عدلیہ کی ملازمت میں اپنی حصہ داری قائم رکھی جائے اور ججوں کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اسلامی تناظر میں فیصلے کا مزاج بنایا

جائے۔

(ھ) حکومت کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ اسے سارے محکموں کو چلانے کے لیے روپے چاہئے، یہ روپے سرکار مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ حاصل کرتی ہے، یہ ٹیکس، انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، ویٹ، روڈ ٹیکس اور دیگر ناموں سے جانے جاتے ہیں، ان ٹیکسوں کی مقدار کئی اعتبار سے زائد معلوم ہوتی ہے اور کئی لوگ اسے ظالمانہ کہتے ہیں، اس کے باوجود اس شعبے میں مسلمانوں کی ملازمت درست ہے، اور اس کام کے لیے نجی معلومات اور دولت کے سلسلے میں جو تجسس کرنا ہوتا ہے، شرعی طور پر اس کی اجازت ہے، رہ گئی بات ٹیکس کی رقم کے حکمرانوں کی عیش کوشی پر خرچ کرنے کی، تو یہ حکمرانوں کا اپنا عمل ہے، اس کی وجہ سے پورے محکمہ سے قطع تعلق کرنا درست نہیں ہوگا۔

اس قسم کے سارے مسائل اور معاملات پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ایسے سارے معاملات اور اعمال جو شریعت کے اصولی وعمومی قوانین وضوابط کے اعتبار سے حرام ہیں، ضرورت اور اضطرار کے وقت شریعت نے ہی نصاً یا اجتہاداً ان قوانین وضوابط کے برعکس عمل کی اجازت دی ہے، مثال کے طور پر اکل میتہ، تناول خمر، بھوک و پیاس کے اعتبار سے اضطرار کی شکل میں اور غصب سے حاصل شدہ مال کا کھانا جبر و اکراہ کی صورت میں جائز ہے حالانکہ یہ سب عام حالات میں جائز نہیں ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اصولی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"البتہ کلام ضرورت میں ہے اور یہی اہم ہے، سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ ضرورت کی دو قسمیں ہیں، ایک تحصیل منفعت، خواہ دینی ہو یا دنیوی، اپنی ہو یا غیر کی، دوسری دفع مضرت اسی تعمیم کے ساتھ، سو تحصیل منفعت کے لیے تو ایسے افعال کی اجازت نہیں......اور دفع مضرت کے لیے اجازت ہے (امداد الفتاویٰ، ۳/ ۴۰۸)۔

آگے لکھتے ہیں:

"مگر اس وقت کلام صرف اس درجہ میں ہے جو محض معصیت اور حرام ہے، پس فی نفسہ حرام ہونے کے بعد ان کو اگر جلبِ منفعت مالیہ یا جاہیہ کی غرض سے اختیار کیا جائے تو کسی حال میں جائز نہیں اور اگر دفع مضرت کی غرض سے اختیار کیا جاوے کہ امت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم و مضرات پہنچے یہ اہل مناصب بقدر امکان ان کو اگر دفع کرسکیں تو اس صورت میں حکم جواز کی گنجائش ہے (امداد الفتاویٰ، ۳/ ۴۰۸)۔

اس سلسلے میں فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دفع مضرت کے لیے عہدے مناصب قبول کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ اس ملازمت کی وجہ سے وہ عند اللہ ماجور بھی ہوگا۔ ردالمحتار میں ہے:

"ویؤجر من قام بتوزیعها بالعدل... بان یحمل کل واحد بقدر طاقته لانه لو ترك توزیعها الی الظالم ربما یحمل بعضهم ما لا یطیق فیصیر ظلما علی ظلم ففی قیام العارف بتوزیعها بالعدل تقلل للظلم فلذا یوجر" (ردالمحتار قبیل باب المصر من کتاب الزکوۃ، ۲/ ۶۲، مکتبہ ماجدیہ پاکستان)۔

(جو شخص عدل کے ساتھ تقسیم کا کام انجام دے اور طاقت کے بقدر ہر ایک پر لازم کرے وہ ماجور ہوگا، اس لیے کہ اگر تقسیم کا کام اس نے ظالم پر چھوڑ دیا تو بسا اوقات وہ کسی پر ان کی طاقت سے زیادہ لازم کردے گا تو یہ ظلم در ظلم ہوگا، پس کسی ایسے آدمی کا ذمہ داری کو قبول کرنا جو عدل کے ساتھ تقسیم کے کام سے واقف ہو، قلت ظلم کا سبب ہوگا، تو یہی ہو جہ اس کے ماجور ہونے کی ہے)۔

۲۔ (الف) ایسے اداروں کی ملازمت جن کا کام بنیادی طور پر محرمات پر مبنی ہے اور بلا واسطہ اس ملازمت کے نتیجے میں حرام کاموں میں شمولیت ہوتی ہے، درست نہیں ہے، مثلاً بینک، بنیادی طور پر سودی لین دین کا کام کرتا ہے، اس کام میں کسی بھی قسم کی شمولیت بحیثیت ملازم جائز نہیں ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

"ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (المائدہ: ۲) (گناہ اور ظلم (کے کاموں) پر مدد نہ کرو)۔

اثم وعدوان کی انہیں قسموں میں بینک کی ملازمت ہے، اس ملازمت کا سیدھا اور صاف مطلب سودی حسابات وغیرہ لکھنا ہے جو ممنوع ہے بلکہ

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانا، کھلانا، سود کے بارے میں لکھنا اور اس کے لیے گواہ بننا سب کو ایک ہی درجہ میں رکھ کر لعنت فرمائی ہے:

''لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا ومؤكله وكاتبه شاهديه وقال: هم سواء'' (صحيح مسلم عن جابر: ۲/ ۲۷ باب الربا)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے، کھلانے والے، سودی معاملات لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ وہ سب برابر ہیں)۔

(ب) اسی طرح انشورنس کمپنیوں کا کاروبار بھی ربا اور قمار پر مبنی ہے، اس لیے اس کا ایجنٹ بننا اور اس کے لیے کام کرنا قطعاً درست نہیں ہے خواہ وہ اختیاری نوعیت کا انشورنس ہو یا جبری نوعیت کا، کیونکہ اختیار اور جبر کا تعلق انشورنس کروانے والے سے ہے، کرنے والے سے نہیں، ان کمپنیوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرنا ہر حال میں اختیاری ہی ہوگا، اس لیے مسلمانوں کو ایسی ملازمت ابتداءً نہیں کرنی چاہئے۔

رہ گئی بات بقاء کی تو معاصر فقہاء ومفتیان کرام کی رائے ہے کہ اگر بہ یک وقت اس قسم کی ملازمت ترک کرنے سے فقر وافلاس اور کسی معصیت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اور حصول معاش کی کوئی دوسری متبادل شکل سامنے نہ ہو، تو اس مجبوری کی وجہ سے اس ملازمت کو جاری رکھنا "الضرورات تبيح المحظورات" نیز "الضرورة تتقدر بقدرها" کے فقہی اصول کے مطابق شرعاً جائز ہوگا، البتہ دل میں پختہ ارادہ ہو کہ متبادل ملتے ہی وہ اس ملازمت کو ترک کردے گا اور جب تک ملازمت میں رہے دل میں کراہت محسوس کرتا رہے اور استغفار کرتا رہے۔

(ج) البتہ اگر کوئی شخص بلاواسطہ اس کام میں ملوث نہیں ہوتا بلکہ بالواسطہ طور پر اس کی خدمت سے ان اداروں کو فائدہ پہنچتا ہے جیسے بینک کے کمپیوٹر اور بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جان بوجھ کر بینک کی تعمیر یا اپنا تعمیر شدہ مکان بینک کو کرایہ پر دینا، شراب کی کمپنیوں کے لیے بوتل بنانا، شراب کی کمپنیوں کے ہاتھ میٹریل کی تجارت کرنا، ان کا حکم بلاواسطہ ملازمت کرنے والوں سے مختلف ہوگا، ایسی ملازمت کا حاصل کرنا اور جاری رکھنا دونوں درست ہوگا۔

اس سلسلے میں ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اعانت علی المعصیۃ کے درجات مختلف ہیں اور ان کے جواز وعدم جواز کا مدار بڑی حد تک نیت پر ہے، الاشباہ والنظائر میں مباحث نیت کے ذیل میں لکھا ہے:

''ان بيع العصير ممن يتخذ خمرا۔ ان قصد به التجارة فلا يحرم وان قصد لاجل التخمير حرم۔''

(ایسے شخص کے ہاتھ جوس فروخت کرنا جو شراب بناتا ہے اگر بیچنے والے کا مقصد تجارت ہے تو یہ عمل حرام نہیں اور اگر اس کا ارادہ شراب کشید کا ہے تو یہ عمل حرام ہے)۔

خلاصہ کے ایک جزئیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

''رجل أجر بيتا ليتخذ فيه بيت نار أو بيعة أو كنيسة أو يباع فيه الخمر فلا باس به وكذا كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار'' (خلاصة، ۴/ ۳۷۷)۔

(ایک شخص نے کوئی گھر کرایہ پر لیا تا کہ اس گھر میں آگ کا چولھا یا گرجا گھر یا چرچ بنائے گا یا اس گھر میں شراب بیچے گا تو کوئی حرج نہیں نیز یہی حکم ہر ایسی شکل کا ہوگا جہاں کسی فاعل مختار کا فعل معصیت سے متعلق ہو)۔

بدائع میں ایک جزئیہ یہ ہے کہ اگر کسی نے حمال کو اجرت پر رکھا کہ وہ اس کے لیے شراب ڈھوئے گا تو امام ابوحنیفہ اس اجارہ کو درست قرار دیتے ہیں اور حمال کے لیے اجرت واجب گردانتے ہیں، صاحبین ؒ کے نزدیک اس قسم کا اجارہ مکروہ ہے، اس لیے اجرت واجب نہیں ہوگی کیونکہ اللہ نے اثم اور عدوان میں تعاون سے منع کیا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے سلسلہ میں جن دس لوگوں پر لعنت فرمائی ہے ان میں حامل اور محمول دونوں ہیں:

''عن انس رضى الله تعالىٰ عنه قال: لعن الله رسول الله تعالىٰ عليه وسلم فى الخمر عشرة: عاصرها ومعتصرها

وشاربها وحاملها ومحمولة اليه وساقيها وبائعها وآكل ثمنها والمشتري لها والمشترى له'' رواه الترمذی وابن ماجه (مشكوة المصابيح، كتاب البيوع، باب الكسب وطلب الحلال، الفصل الثانی ۲۴۲)۔

(حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے سلسلہ میں دس لوگوں کو ملعون قرار دیا ہے: ۱۔شراب بنانے والا، ۲۔جسے شراب دیا جائے، ۳۔شراب پینے والا، ۴۔شراب اٹھانے والا، ۵۔وہ شخص جس کے لیے شراب اٹھا کر پہنچایا جائے، ۶۔شراب پلانے والا، ۷۔بیچنے والا، ۸۔شراب کی قیمت استعمال کرنے والا، ۹۔شراب خریدنے والا، ۱۰۔اور جس کے لیے شراب خریدی جائے)۔

امام ابوحنیفہ نفس حمل کو معصیت نہیں سمجھتے اور نہ معصیت کا سبب گردانتے ہیں، کیونکہ محض حمل ضرورات شرب میں نہیں ہے، شرب کا حصول حمل سے الگ فاعل مختار کے فعل سے سرزد ہوتا ہے اور حدیث میں جو لعنت کا ذکر ہے وہ پینے کی نیت سے لے جانے پر ہے نہ کہ حمال کے اجارہ پر۔

بالواسطہ اور بلاواسطہ اعانت علی المعصیۃ کے حکم میں فرق شامی کے اس جزئیہ سے بھی واضح ہے:

''وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم انه يتخذه خمرا لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغييره'' (ردالمحتار، ۵/۲۸۶)

(انگور کا جوس بیچنا جائز ہے اس شخص کے ہاتھ جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اس سے شراب کشید کرے گا، ایسے شخص کا انگور کا جوس خرید وفروخت کرنا جائز ہے، یہ جواز اس لیے ہے کہ فعل معصیت عین جوس سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ تبدیل کے بعد ہے)۔

۳۔(الف) اور (ہ) یہاں پر بعض ان اداروں کی ملازمت کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جن کا کاروبار اصلاً حرام نہیں ہوتا، لیکن ضمنی طور پر وہاں بعض منکرات اور منہیات کا ارتکاب ہوتا ہے، مثال کے طور پر سپر مارکیٹ یا ہوٹل کے کاروبار کو لیں، سپر مارکیٹ میں ان چیزوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے، جن کا تعلق ضروریات زندگی سے ہے، لیکن اس میں ایک گوشہ شراب کا بھی ہوتا ہے، خنزیر کے گوشت اور بعض حرام اشیاء کی فروختگی بھی کی جاتی ہے، اسی طرح ہوٹل بھی آج سماج کی ضرورت ہے، اور اس نے قدیم سرائے کی جگہ لے لی ہے، سیاحت کے رجحان میں اضافہ اور مسافروں کی رہائش کی ضرورت کی وجہ سے یہ ایک نفع بخش تجارت ہے، بنیادی طور پر ان کا کام معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولت پہنچانا ہے، لیکن ان ہوٹلوں میں رقص وسرود کی محفل بھی سجتی ہے، جام گردش کرتے اور پیمانے چھلکتے ہیں، سن باتھ کے نام پر عریانیت کے مناظر بھی سامنے آتے ہیں اور عیاشی وفحاشی سیون اسٹار اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کی پہچان بن گئے ہیں، ہوٹلوں میں موجود سوئمنگ پول میں تیراکی کا مخصوص لباس پہنے بغیر جایا نہیں جاسکتا اور لوگوں کی بھیڑ میں پردہ اور ستر عورت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، ان حالات میں ان منہیات کے ساتھ ایسے اداروں کی ملازمتیں درست ہوں گی یا نہیں؟

اس مسئلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ملازمت ہوٹل یا سوپر مارکیٹ میں کی جائے اور جو ذمہ داریاں اس کے سپرد ہیں، اس میں ان کاموں کو براہ راست نہ کرنا پڑتا ہو یا بہت کم اس کی نوبت آتی ہو تو ایسی ملازمت جائز ہے، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحبؒ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"آپ کی اصل آمدنی تو جائز تھی، لیکن اب آپ کو اپنی جائز ملازمت میں کچھ ایسا کام بھی کرنا پڑتا ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں، جائز کام کے مقابلے میں اگر دوسرا کام کم ہے تو اپنی ملازمت ترک نہ کریں، اگر جائز کام کم ہو اور دوسرا کام زائد ہو تب بھی فوراً ملازمت ترک نہ کریں مبادا کہ پریشانی کا سامنا ہو جو قابل برداشت نہ ہو، البتہ دوسری جائز کسب معاش تلاش کرتے رہیں، جب وہ میسر آجائے تب اس موجودہ ملازمت کو ترک کردیں، استغفار بہرحال کرتے ہیں، نیز اللہ پاک سے حلال کسب معاش کی دعا میں لگے رہیں، امید ہے اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمائیں گے۔" (فتاویٰ محمودیہ، ۱۷/۱۲۰)۔

اس فتویٰ کی بنیاد اسی اصول پر ہے جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے یعنی "اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضررا بارتكاب اخفهما"

لیکن ان اداروں میں ملازمت میں گانے بجانے، ساقی گری، خنزیر کے گوشت کی فروخت وغیرہ اگر بلاواسطہ اور براہ راست کرنی پڑے تو یہ صورت جائز نہیں ہوگی اور یہ اعانت علی المعصیۃ کی وجہ سے ناجائز ہوگا، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

''ولا تجوز الإجارة على شئی من الغنا و النوح والمزامير والطبل وشئی من اللهو وعلى هذا الحداة وقراءة شعر وغيره لا أجر فی ذالك وهذا كله قول أبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد رحمهم الله تعالىٰ اجمعين'' (كتاب الاجارة ۴/ ۴۴۹ الفصل الرابع فی فساد الاجارة)۔

(گانا گانے، نوحہ کرنے، سارنگی، طبلہ بجانے اور دوسرے لہو ولعب کی خاطر اجارہ درست نہیں ہے، یہی حکم آہ و بکا اور اشعار وغیرہ پڑھنے پر اجارہ کا ہے اس پر کوئی اجرت نہیں ہے، اور یہی امام ابوحنیفہؒ، ابویوسف اور محمدؒ کا قول ہے)۔

حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ لکھتے ہیں:

''جو کام ناجائز ہے اس کام کی نوکری بھی ناجائز ہے، دوسرا ذریعہ معاش تلاش کرے اور نوکری کو چھوڑ دے'' (فتاویٰ محمودیہ، ۱۷/ ۱۲۲، باب الاستیجار علی المعاصی)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

''ولو استاجر لتعليم الغناء او استاجر رجلا ليخصي عبدا لايجوز'' (كتاب الاجارة، ۴/ ۴۴۹)۔

(اور اگر گانے کی تعلیم دینے کی خاطر کسی کو اجرت پر رکھا یا کسی شخص کو اجرت پر اس لیے رکھا کہ وہ کسی غلام کا خصی کرے تو ایسا کرنا درست نہیں ہے)۔

(ب) تعلیم وتدریس کار نبوت ہے اور علم کی ترویج واشاعت کی وجہ سے شریعت میں مطلوب ہے اس کے برعکس کتمان علم حرام ہے، لیکن موجودہ دور میں مخلوط تعلیم (Co Education) نے اس مقدس پیشہ کو بھی جائز وناجائز کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، آج صورت حال یہ ہے کہ گرلز اسکول (Girls School) میں مرد استاذ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور لڑکوں کے لیے مخصوص اسکول کا تصور عنقا ہو چکا ہے، جو اسکول ہیں ان میں مرد وعورت دونوں تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں اختلاط مرد وزن عام ہے اور شرعی حدود کی رعایت ممکن نہیں ہے، ایسے میں ان اسکولوں کی ملازمت کو شرعاً درست نہیں کہا جا سکتا، البتہ اگر نشست گاہ کی ترتیب کچھ ایسی ہو کہ ایک دوسرے کا سامنا نہ ہو اور اختلاط سے بچا جا سکے تو اس صورت میں یہ ملازمت درست ہوگی جیسا کہ بعض مدرسۃ البنات میں مرد اساتذہ تعلیم دیتے ہیں، لیکن لڑکیوں سے ان کا سامنا نہیں ہوتا اور طالبات بھی صرف آواز سنتی ہیں، چلمن کی وجہ سے وہ استاذ کو دیکھ نہیں پاتیں۔

(ج) کسب معاش کا ایک ذریعہ وکالت بھی ہے، اور بہت سارے لوگ اس پیشے سے وابستہ ہیں، ان کا مقصد ظالموں کو سزا دلانا، مظلوم کو عدلیہ سے انصاف دلانے کی جدوجہد کرنا ہوتا ہے، اس لیے اگر وکیل سچے مقدمات کی پیروی کرے اور اجرت متعین کر لے، کوئی کام خلاف شرع نہ کرے، جھوٹ نہ بولے اور نہ گواہوں سے بلوائے تو وکالت کرنا جائز اور اس کی اجرت بھی درست ہے۔

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

''تصح الوكالة بأجر أو بغير أجر؛ لأن النبي ﷺ كان يبعث عماله تقبض الصدقات ويجعل لهم عمولة ... ولأن الوكالة عقد جائز... فيجوز أخذ الاجرة فيها بخلاف الشهادة'' (ج ۵/ ۴۰۵۸، البحث الاول تعريف الوكالة)

(اجرت یا بغیر اجرت کے شئی وکالت صحیح ہے، اس لیے کہ نبی ﷺ اپنے کارندوں کو زکوٰۃ وصدقات کی وصولیابی کے لیے بھیجا کرتے تھے اور ان کے لیے اجرت مقرر کرتے اور اس لیے کہ پیشہ ایک جائز معاہدہ ہے...... اس لیے پیشہ وکالت میں اجرت لینا جائز ہے اس کے برخلاف شہادت میں جائز نہیں)۔

وکالت کی اجرت اس لیے بھی جائز ہے کہ وکیل کو خاص وقت تک خاص دن میں مؤکل کے کام کے لیے کرنا ہوتا ہے، اسی لیے جب کسی مقدمہ میں کئی کئی وکیل ہوتے ہیں تو ایک بحث کرتا ہے اور بسا اوقات بقیہ خاموشی سے بیٹھے رہتے ہیں، اس کے باوجود اجرت دی جاتی ہے، کیونکہ انہوں نے اس کام کے لیے اپنا وقت فارغ کیا۔ حضرت تھانویؒ نے ان توجیہات کے علاوہ ایک اور توجیہ لکھی ہے:

"ان سب سے سہل تر توجیہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ حرمت استیجار مخصوص ہے طاقت مختص بالمسلم کے ساتھ اور نصرت مظلوم من جملہ طاعات عامہ کے ہے، پس اس میں اس حرمت کا حکم نہیں کیا جائے گا، حاصل یہ ہے کہ پیشہ وکالت فی نفسہ جائز ٹھہرا مگر شرط یہ ہے کہ سچے خدمات لیتا ہو"۔(امداد الفتاویٰ، ۳/۳۱۹، کتاب الوکالۃ)۔

حضرت مفتی محمود الحسنؒ لکھتے ہیں:

"جس وکالت میں معصیت پر اجرت لیا جائے، یعنی جھوٹے اور ناحق مقدمہ کی پیروی کی جاوے اور ظالم کی اعانت کی جاوے ایسی وکالت اور اس کی آمدنی ناجائز ہے":

''لا تجوز أخذ الأجرة على المعاصي كالغناء والنوح والملاهي، لأن المعصية لا يتصور استحقاقها بالعقد فلا يجب عليه الأجر وإن اعطاه الأجر أو بعضه لا يحل له ويجب عليه رده'' (مجمع الانهر، ص۳۸۴، فتاویٰ محمودیہ، ج۱۷/ ۴۵۳، کتاب الوکالۃ)۔

(فعل معاصی جیسے گانا بجانا، نوحہ کرنا اور دوسرے لہو ولعب پر اجرت لینا جائز نہیں، کیونکہ فعل معصیت پر معاہدے کی بنا پر استحقاق اجرت متصور نہیں ہے۔اس لیے اجرت واجب نہیں ہوگی اور اگر اس نے پوری اجرت یا بعض حصہ دے دیا تو ان کاموں کے کرنے والوں کے لیے حلال نہیں ہوگا اور اس کا لوٹانا واجب ہوگا، اس کے ساتھ اس کا واپس کرنا اسی کی ذمہ ضروری ہو جائے گا)۔

(د) ہاسپٹل کی ملازمت میں خدمت خلق کا بڑا موقع ہے، ڈاکٹرز، نرس اور دیگر عملہ مریضوں کے دوا علاج، مرض کی تشخیص اور تیمارداری وغیرہ میں لگا رہتا ہے، مناسب تو یہی ہے کہ مرد کا علاج مرد کرے اور عورت کا علاج عورت ڈاکٹرز سے کرایا جائے، لیکن بسا اوقات ایسے اسپیشلسٹ نہیں ملتے تو مرد مریض کا علاج عورت ڈاکٹر سے اور عورت مریض کا علاج مرد ڈاکٹر سے کرایا جاتا ہے اور ستر عورت کے شرعی حدود بھی بعض دفعہ باقی نہیں رہتے، میری رائے میں اس کے باوجود ضرورتاً یہ شکل درست ہے، البتہ اگر مریض کے جنس کے اسپیشلسٹ موجود ہوں تو احتراز کرنا چاہئے۔

اسی طرح غیر ضروری آپریشن اور جانچ سے بھی ممکنہ حد تک بچنے کی کوشش کی جائے لیکن سعی بسیار کے بعد بھی یہ ممکن نہ ہو تو بھی ہاسپٹل کی ملازمت درست ہوگی، لا يكلف الله نفسا إلا وسعها، اگر دوسری ملازمت مل جائے تو ترک کرنا اولیٰ ہوگا۔

....

مختلف اقسام کی ملازمتیں اوران کے احکام

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی[1]

کسی کی ملازمت اختیار کرنا اصلاً تو جائز ہے خواہ ملازمت حکومت کے اداروں میں ہو یا پرائیوٹ کمپنیوں میں یا افراد کے پاس ان کے دکانوں یا گھروں میں ہو، کیونکہ یہ اجارہ کی صورت ہے، اجارہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جائز ودرست ہے، لیکن بعض ملازمتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں بعض وقت خلاف شریعت عمل کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، یا اندیشہ ہوتا ہے کہ اس میں خلاف شریعت عمل کا ارتکاب کرنا پڑے گا تو ان کا کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلے میں چند مختلف قسموں کی ملازمتوں سے متعلق سوالات کے جوابات پیش کیے جارہے ہیں:

۱۔الف: کسی ملک کی فوج کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے، سرحدوں کی نگرانی اور دشمنوں سے مقابلہ اس کا اصل مقصد ہوتا ہے، مخصوص حالات میں ملک کے اندر امن وامان قائم کرنا بھی اس کا فریضہ ہے، شریعت کی نظر میں یہ بہتر اور پسندیدہ کام ہے، اس لیے فوج کی ملازمت دوسرے مفاسد سے خالی ہو تو نہ صرف مباح بلکہ پسندیدہ بھی ہوگی۔

لیکن اس ملازمت میں بعض مفاسد بھی نظر آتے ہیں، مثلاً فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے، جس سے فوجی کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر کمانڈر کے حکم پر وار کرنے کی نوبت آسکتی ہے، اسی طرح ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہو، یہ مفاسد میں ہیں اگرچہ ضروری نہیں ہے کہ ایسا پیش آئے، سوال یہ ہے کہ کیا ان مفاسد کے باوجود فوج کی ملازمت کرنا جائز ہوگا؟

اس سلسلے میں شریعت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امن وامان قائم کرنا اور ملک کی حفاظت کرنا اہم اور بڑا مقصد ہے، مسلمانوں کا فوج میں رہنا اپنی حفاظت کے پیش نظر خود مسلمانوں کے لیے بہت ضروری ہے، اس لیے اس اہم مقصد کے حصول کے لیے کچھ کم درجہ کی خرابیاں برداشت کی جاسکتی ہیں، اور ان خرابیوں سے بچنے کی بھی بقدر امکان کوشش کی جائے، ان کے لیے نظائر وقواعد فقہیہ ہیں جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ بعض چیزوں کا قصداً ارتکاب جائز نہیں ہے لیکن ضمناً ان کو گوارا کرلیا گیا ہے۔

"یغتفر فی الشیء ضمنا مالا یغتفر قصدا" (الاشباہ والنظائر)۔

اسی طرح وہ قواعد ہیں جن میں زیادہ ضرر والی چیزوں کو دور کرنے کے لیے کم ضرر والی چیزوں کو برداشت کرنے کا ذکر ہے، یعنی کسی چیز کے کرنے یا نہ کرنے دونوں میں ضرر ہو تو دیکھا جائے گا کہ کس میں زیادہ ضرر ہے، کم ضرر کو برداشت کرکے زیادہ ضرر کو دور کیا جائے گا۔

"لو کان أحدهما أعظم ضررًا من الآخر فإن الأشد یزال بالأخف" (الاشباہ والنظائر)۔

"إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتکاب أخفهما" (الاشباہ والنظائر)۔

اسی لیے فوج میں ملازمت کرنا جائز اور درست ہے، البتہ جہاں شریعت کے خلاف کام ہو وہاں احتیاط کرنا چاہیے اور ایسے کاموں سے بچنا چاہیے۔

ب۔ پولیس کا مقصد ملک کے اندر امن وامان قائم رکھنا ہے، چوری، ڈاکہ زنی، رہزنی اور اس طرح کے شر سے ملک کے باشندوں کی حفاظت کرنا ہے، ظاہر ہے کہ یہ کام شریعت میں پسندیدہ ہے اور شریعت کا مطلوب ہے، اس لیے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، البتہ اس میں پائے جانے والے مفاسد جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے ان سے جس حد تک بچنا ممکن ہو بچنے کی پوری کوشش کی جائے گی، لیکن اس کی وجہ سے پولیس کی ملازمت کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا ہے، خاص طور سے جب کہ پولیس میں رہنے سے مسلمانوں کا بہت فائدہ ہے، اس کی نظیر بھی وہ فقہی قواعد ہیں جن میں صراحت کی گئی ہے کہ دو خرابیوں میں سے بڑی خرابی کو دور کرنے

---

[1] استاذ المعہد العالی، امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

کے لیے کم درجہ کی خرابی کو برداشت کیا جائے گا۔

"اذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتکاب أخفهما" (الاشباہ النظائر، ص۱۴۸)

"وأن تقديم أرجح المصالح فأرجحها محمود حسن وأن درء أفسد المفاسد فأفسدها محمود حسن وأن تقديم المصالح الراجحة على (المفاسد) المرجوحة محمود حسن وأن درء المفاسد الراجحة على المصالح المرجوحة محمود حسن" (قواعد الاحکام، ص۷)۔

اسی طرح فقہاء کرام تحریر کرتے ہیں کہ ضرر عام کو ختم کرنے کے لیے ضرر خاص کو برداشت کیا جائے گا، چنانچہ اگر جنگ کے وقت دشمن کے لشکر میں مسلم قیدی یا مسلم بچے بھی ہیں تو ان کی وجہ سے جنگ موقوف نہیں کی جائے گی، اسی طرح اگر دشمن لشکر مسلم قیدیوں یا مسلم بچوں کو ڈھال بنا لے تو اس وقت بھی جنگ بند نہیں کی جائے گی، کیونکہ اگر مسلمانوں کی طرف سے جنگ روک دی جائے اور دشمن جنگ کرتے رہیں تو مسلمانوں کو شکست ہو جائے گی، یہ نقصان چند قیدیوں اور بچوں کے قتل سے زیادہ بڑا نقصان ہے، کیونکہ مسلم فوج کی شکست سے بلاد اسلام مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے اور ان پر دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا، اور یہ ضرر عام یعنی بہت شدید نقصان ہے۔

"ولا بأس برميهم وإن كان فيه مسلم أسير أو تاجر لأن في الرمي دفع الضرر العام بالذب عن بيضة الاسلام وقتل الأسير والتاجر ضرر خاص ولأنه قلما يخلو حصن عن مسلم فلو امتنع باعتباره لانسد بابه وإن تترسوا بصبيان المسلمين أو بالأسارى لم يكفوا عن رميهم لما بينا ويقصدون بالرمي الكفار لأنه إن تعذر التمييز فعلا فلقد أمكن قصدا والطاعة بحسب الطاقة" (ہدایہ کتاب السیر باب اکیفیۃ القتال، ۲/ ۵۶۱)۔

اسی طرح پولیس کے محکمہ میں مسلمانوں کے نہ رہنے سے زیادہ ضرر لاحق ہوگا بہ نسبت اس ضرر کے جو اس محکمہ میں رہنے سے ہوگا، اگر چہ اس دوسرے ضرر سے بچنے کی بھی گنجائش ہے، آدمی کوشش کرے تو اس سے بچ سکتا ہے، اس لیے پولیس میں ملازمت کرنا شرعاً جائز و درست ہے، البتہ جہاں غیر شرعی کام ہوں وہاں احتیاط کرے اور ان سے بقدر امکان بچنے کی کوشش کرے۔

ج۔ کسی ملک کے لیے انٹیلی جنس کا شعبہ بہت ہی اہمیت رکھتا ہے، ملک کی داخلی سلامتی میں اس کا بڑا کردار ہوتا ہے، اسی کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات سے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں پر اور مفسدین و جرائم پیشہ لوگوں کی سرگرمیوں پر کنٹرول کیا جاتا ہے، اس لیے اس شعبہ کو ملک کی سلامتی کے لیے لازمی ضرورت سمجھا جاتا ہے۔

جب اس مقصد کے پیش نظر اس شعبہ میں ملازمت اختیار کی جائے تو شریعت اسلامی میں اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، البتہ اس میں کام کرنے والوں کو بعض ایسے امور سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے جن سے شریعت میں ممانعت آئی ہے، وہ تجسس اور غیبت ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک لوگوں کے احوال کا تجسس نہیں ہوگا، اور پوشیدہ طور سے ان کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کی جائیں گی تو کیسے معلوم ہوگا کہ کون لوگ دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں اور کن لوگ ملک میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں، اس لیے اس میں تجسس لازمی چیز ہے، اور ایسے مفسدین اور جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں اعلیٰ حکام کو اطلاع دینا بھی ضروری ہے تاکہ وہ اس کا سد باب کرسکیں، یہ غیبت کی صورت نظر آتی ہے، قرآن کریم میں تجسس اور غیبت دونوں سے منع کیا گیا ہے، ارشاد باری ہے:

"يأيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن إن بعض الظن إثم ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضا أيحب أحدكم أن يأكل لحم أخيه ميتا فكرهتموه واتقوا الله إن الله تواب رحيم" (حجرات: ۱۲)۔

قرآن کریم کے اس حکم کی بنیاد پر عام حالات میں تو تجسس کی ممانعت ہے کہ لوگوں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہ کی جائے، جب تک واضح طور سے کسی میں خرابی نظر نہ آئے، اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے، لیکن اس کے ساتھ ہی شریعت اسلامی نے بعض حالات میں تجسس کی اجازت دی ہے، فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص مضرت پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس شخص کی خفیہ تدبیروں سے واقفیت کے لیے اس کے حالات کا تجسس کرنا یعنی پوشیدہ طور سے اس کے کاموں کا جائزہ لیتے رہنا اور اگر اس میں شرانگیزی پائی جائے تو اس کا سد باب کرنا جائز ہے، علامہ ماوردی شافعیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''وأما مالم یظهر من المحظورات فلیس للمحتسب أن یتجسس عنها ولا أن یهتك الأستار حذرا من الاستتار بها، قال النبی علیه الصلاة والسلام: ''من أتى من هذه القاذورات شیئا فلیستتر بستر الله، فإنه من یبدلنا صفحته نقم حد الله تعالی علیه''، فإن غلب على الظن استسرار قوم بها لأمارات دلت وآثار ظهرت، فذلك ضربان: أحدهما: أن یکون ذلك فی انتهاك حرمة یفوت استدراکها، مثل ان یخبره من یثق بصدقه أن رجلا خلف بامرأة لیزنی بها، أو برجل لیقتله، فیجوز له فی مثل هذه الحالة أن یتجسس ویقدم على الکشف والبحث حذار من فوات مالا یستدرك من انتهاك المحارم وارتکاب المحظورات، وهکذا لو عرف ذلك قوم من المتطوعة جاز لهم الإقدام على الکشف والبحث فی ذلك والإنکار ... والضرب الثانی: ماخرج عن هذا الحد وقصر عن حد هذه الرتبة فلا یجوز التجسس علیه ولا کشف الأستار عنه'' (الأحکام السلطانیة للماوردی، ص ۳۱۴)۔

غیبت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کے بارے میں ایسی بات بیان کی جائے جس کو وہ سنے تو اس کو ناپسند ہو، یہ صرف اس کے اندر موجود ہو لیکن اس کا بیان کرنا اس کے لیے تکلیف دہ ہو۔ (الدر المختار مع الرد، ۵/۲۹۱)۔

کسی کی غیبت کرنا بھی حکم قرآنی کی رو سے حرام ہے، غیبت کو مردہ بھائی کے جسم کے گوشت کھانے جیسے قبیح عمل سے قرآن نے تشبیہ دی ہے، جس سے شدید شناعت اور حرمت ظاہر ہوتی ہے، اس لیے عام حالات میں تو غیبت کے بارے میں یہی حکم ہے کہ وہ ممنوع اور حرام ہے، لیکن بعض مخصوص حالات میں جب غیبت کا ارتکاب دفع مضرت کے لیے کیا جائے تو اس کی اباحت ہے، فقہاء کرام نے اس کی تفصیل تحریر کی ہے کہ کن کن مواقع پر غیبت کی اجازت ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ حصکفی، علامہ شامی اور علامہ آلوسی کے حوالے پیش ہیں۔

''وقد تجب الغیبة لغرض صحیح شرعی لایتوصل إلیه إلا بها وتنحصر فی ستة أسباب، الأول: التظلم، فلمن ظلم أن یشکولمن یظن له قدرة على إزالة ظلمه لاتخفیفه، الثانی: الاستعانة على تغییر المنکر بذکره لمن یظن قدرته على إزالة، الثالث: الاستفتاء فیجوز للمستفتی أن یقول للمفتی: ظلمنی فلان بکذا ... الرابع: تحذیر المسلمین من الشر کجرح الشهود والرواة والمصنفین والمتصدین لإفتاء أو إقراء مع عدم أهلیة، فتجوز إجماعا بل تجب ... الخامس: أن تیجاهر بفسقه کالمکاسبین وشربة الخمر ظاهرا فیجوز ذکره بما تجاهروا به دون غیرہ إلا أن یکون له سبب آخر مما مر، السادس، للتعریف بنحو لقب الأعور و الأعمش فیجوز وإن أمکن تعریفه بغیره ... وأکثر هذه الستة مجمع علیه ویدل لها من السنة أحادیث صحیحة مذکورة فی محلها'' (روح المعانی، سوہ حجرات جزء ۲۶/ ۲۲۱، فتح الباری، کتاب الأدب ۱۰/ ۵۷۸، الدر المختار مع الرد، کتاب الحظر والاباحۃ)۔

ان تفصیلات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر دفع مضرت یا کسی شرعی مقصد کے پیش نظر کسی کی غیبت کی جائے تو اس کی اجازت ہوگی اور نہ صرف اس پر گناہ نہیں ہوگا بلکہ وہ شرعاً پسندیدہ اور مطلوب بھی ہوگی۔

اس لیے تجسس اور غیبت پر مشتمل ہونے کے باوجود انٹیلی جنس میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ہوگا، البتہ اس میں یہ لازم ہوگا کہ کسی بے گناہ اور معصوم شہری کو بلاوجہ پریشان کرنے کے لیے اس کی مخبری نہ کی جائے، یہ صریحاً ظلم اور حرام ہوگا۔

د۔ دنیا میں عدلیہ کے قیام کا اصل مقصد رعایا کو انصاف فراہم کرنا ہے، اس سے باہمی نزاعات کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ انسانی معاشرے میں زمانہ قدیم سے عدلیہ کا نظام قائم ہے، اسلام نے بھی اس کو اہمیت دی ہے، ایسی عدالتوں کا قیام جو اسلامی قانون نافذ کریں اور معاشرے میں انصاف فراہم کریں اسلام کے اہم مقاصد میں سے ہے۔

لیکن ہمارے ملک کا دستور کتاب اللہ اور سنت رسول پر مبنی نہیں ہے، بلکہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے، اس لیے اس کے بہت سے قوانین اسلامی شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں، بلکہ اس سے متصادم بھی ہیں، عدالت میں ملازمت کی صورت میں ان غیر اسلامی قوانین کی تنفیذ میں اور خلاف شریعت فیصلوں میں شرکت لازم آئے گی جو شرعاً جائز نہیں ہے، اس لیے اصولی طور سے اس کی ملازمت درست نہیں ہونی چاہئے۔

"ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئك هم الظالمون" (مائدہ).

لیکن یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ہندوستان اور اس جیسے ممالک میں جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل نہیں ہے یہاں اگر مسلمان مکمل طور سے نظام عدلیہ سے علاحدگی اختیار کرلیں تو مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی مزید بڑھتی جائے گی اور ان کی مظلومیت میں اضافہ ہوتا جائے گا، ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے جو حقوق ہیں وہ بھی مسلمانوں کو نہیں مل پائیں گے۔

اس لیے ان حالات کے پس منظر میں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، کیا اس کی اجازت ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کے قومی مفاد کے پیش نظر عدلیہ کے نظام میں ملازمت کی جائے اور عدلیہ کے اس نظام میں رہتے ہوئے جس حد تک ممکن ہوسکے اسلامی قانون کی تطبیق کی کوشش کی جائے اور مسلمانوں کے مسائل حل کئے جائیں؟

ہمارے سامنے اس سلسلے میں سب سے واضح نمونہ حضرت یوسف علیہ السلام کا بادشاہ مصر (فرعون) کے ایک اہم عہدے پر فائز ہونا ہے جس کے لیے خود انہوں نے ہی پیش کش کی تھی۔

"قال اجعلني على خزائن الارض إني حفيظ عليم" (سورۂ یوسف).

اس لیے بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ ظالم اور غیر مسلم کی طرف سے کسی چیز کی ولایت حاصل کرنا جائز ہے جب مفوضہ ذمہ داریوں میں حق کے مطابق فیصلہ کرے۔

"واختلف لأجل ذلك في جواز الولاية من قبل الظالم، فذهب قوم إلى جوازها إذا عمل بالحق فيما يتولاه، لأن يوسف عليه السلام تولى من قبل فرعون ليكون بعدله دافعا لجوره، وذهبت طائفة أخرى إلى حظرها والمنع من التعرض لها لما فيها من تولى الظالمين والمعونة لهم وتزكيتهم بتقليد أوامرهم، وأجابوا عن ولاية يوسف عليه السلام من قبل فرعون بجوابين، أحدهما: أن فرعون يوسف كان صالحا وانما الطاغي فرعون موسى، والثاني: أنه نظر في أملاكه دون أعماله" (الاحكام السلطانية للماوردی، ص۹۵)۔

"فيه دليل على جواز طلب الولاية والقضاء وإظهار أنه مستعدلها إن كان آمنا على نفسه، وعلى جواز أن يتولى الإنسان عملا من يد سلطان جائز أو كافر إذا علم أنه لا سبيل إلى إقامة الحق وسياسة الخلق إلا بتمكين ذلك الكافر أو الجائر وقد كان السلف من هذه الأمة يتولون القضاء من جهة الظلمة" (التفسير المظهری، ۵/ ۱۷۳، ۱۷۴)

اس لیے اس کے باوجود کہ اصولی اعتبار سے منفعت کے حصول کے لیے ایسی ملازمت جائز نہیں ہے جس میں اسلامی شریعت کے خلاف کام کیا جائے لیکن اگر مسلمانوں سے دفع مضرت کے لیے ایسی ملازمت حاصل کی جائے کہ اس سے مسلمانوں کی خیر خواہی اور انکی بھلائی کی کوشش کی جائے گی تو اس میں جواز کی صورت نکل سکتی ہے، لیکن اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی قوانین کے مقابلہ میں اس ملکی قانون کو دل سے ناپسند کرتا ہو اور اس کو بدرجہ مجبوری گوارا کررہا ہو۔

۵۔ انکم ٹیکس ملکی ضروریات کے لیے رعایا میں سے اہل ثروت افراد سے لیا جاتا ہے، اگر سرکاری خزانہ میں ان ضرویات کے لیے اموال دستیاب نہ ہوں یا کم ہوں تو ایسی صورت میں رعایا سے ملکی مصالح اور ضروریات کے لیے اسی کے بقدر ٹیکس لیا جاسکتا ہے، اس لیے اصولی اعتبار سے انکم ٹیکس ظالمانہ ٹیکس نہیں ہے، اس کی صراحت ہمیں فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔

"وقال أبو جعفر البلخي: ما يضر به السلطان على الرعية مصلحة لهم يصير دينا واجبا وحقا مستحقا كالخراج وقال مشائخنا: وكل مايضربه الإمام عليهم لمصلحة لهم فالجواب هكذا حتى أجرة الحارسين لحفظ الطريق واللصوص ونصب الدروب وأبواب السكك وهذا يعرف ولا يعرف خوف الفتنة ثم قال: فعلى هذاما يؤخذ في خوارزم من العامة لإصلاح مسناة الجيحون أو الربض ونحوه من مصالح العامة دين واجب لايجوز الامتناع عنه وليس بظلم" (ردالمحتار، ۲/ ۶۲، كتاب الزكاة، باب العشر)۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جب عوام اپنے مکانات کا ٹیکس (ہاؤس ٹیکس) ادا کرتے ہیں، تاجر لوگ سیلز ٹیکس ادا کرتے ہیں، اس کے بعد پھر انکم ٹیکس ادا کرنا ایک بڑا بوجھ بن جاتا ہے، اس کی شرحیں بھی ظالمانہ حد تک بڑھی ہوئی ہوتی ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ انکم ٹیکس سے حاصل کردہ آمدنی کا استعمال عوام کی فلاح پر کم ہوتا ہے، اس کا زیادہ حصہ حکمران طبقہ اور پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ارکان کی عیش کوشیوں اور مسرفانہ اخراجات پر ہوتا ہے، حکمراں طبقہ کی عیاشی کے لیے عوام سے اس قدر بھاری ٹیکس وصول کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اس لیے یہ شرعاً ایک ظالمانہ ٹیکس ہے، اس لیے اس شعبہ میں ملازمت ظلم میں تعاون دینے کے مساوی ہوگی جو جائز نہیں ہے۔

البتہ اگر انکم ٹیکس مناسب مقدار میں عوام کی ضروریات اور مصالح کے لیے وصول کیا جائے اور اس کو عوام کی ضروریات میں اور ان کے فلاح میں خرچ کیا جائے تو یہ شرعاً جائز ہوگا، اور اس شعبہ میں ملازمت بھی جائز ہوگی۔

۲۔الف: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سود اسلامی شریعت میں حرام ہے، قرآن کریم اور احادیث میں اس پر شدید وعیدیں آئیں ہیں، اس لیے بینک میں ایسے کام کرنا جس میں سودی لین دین میں تعاون ہوتا ہو حرام اور ناجائز ہے، حدیث میں سودی لین دین کرنے والوں کے ساتھ اس کے لکھنے والوں اور اس پر گواہ بننے والوں پر بھی لعنت فرمائی گئی ہے، اور سب کو گناہ میں برابر بتایا گیا ہے۔

''عن جابر قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء'' (صحيح مسلم، باب الربا، ۲/۲۷)۔

دوسری بات یہ ہے کہ سودی کاروبار معصیت اور حکم الٰہی کی نافرمانی ہے، اس لیے ایسی چیزیں جو اس کاروبار میں معاون اور مددگار ہوں وہ بھی ناجائز ہوں گی، کیونکہ قرآن کریم نے گناہ اور معصیت پر تعاون کرنے سے منع فرمایا ہے۔

"ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (مائدۃ:۲)۔ "فلن أكون ظهيرا للمجرمين" (قصص:۱۷)۔

ایسی چیزیں جو معصیت کا سبب بنتی ہیں ان کا کرنا تعاون علی المعصیۃ ہے، ان کی حرمت قرآن کریم سے ثابت ہے، مثلاً مشرکین کے معبودات کو برا کہنے سے اس وجہ سے منع کیا گیا ہے کہ اس کے جواب میں مشرکین حق تعالیٰ کو برا بھلا کہیں گے، اسی طرح خواتین کو" ولا يضربن بارجلهن "اور" ولا تخضعن بالقول " کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ یہ عمل معصیت کا سبب بن سکتا ہے۔

لیکن تعاون علی المعصیۃ اور تسبب للمعصیۃ کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے، ان کے مختلف درجات ہیں اور درجات کے اختلاف سے ان کے احکام بھی مختلف ہوجاتے ہیں، اگر ان کی تمام صورتوں کو حرام وناجائز قرار دے دیا جائے تو بہت ساری مباح چیزوں پر بھی حرمت کا حکم لگ جائے گا اور معاملہ بہت مشقت اور حرج تک پہنچ جائے گا، مثلاً کسی شخص نے انگور فروخت کیا یا انگور کا عصیر فروخت کیا، خریدنے والے نے اس سے شراب بنالیا، اس صورت میں بھی بائع کسی حد تک معصیت پر تعاون کرنے والا ثابت ہوتا ہے، اسی لیے فقہاء کرام نے اس سلسلے میں کچھ تفصیل کی ہے۔

معصیت کے سبب بننے کی دو صورتیں ہیں: سبب قریب اور سبب بعید، سبب بعید مباح ہے، مثلاً ایک شخص غلہ، سبزی اور پھل کی پیداوار کرتا ہے، اس سے سب نفع اٹھاتے ہیں، نیک وصالح لوگ بھی اس کو استعمال کرتے ہیں اور فاسق وفاجر لوگ بھی اس کو اپنے فسق وفجور میں لگاتے ہیں، اس شخص کا ان چیزوں کی پیداوار کرنا فسق وفجور کے لیے سبب بعید ہے، یہ مباح ہے۔

سبب قریب کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جو گناہ ومعصیت کا باعث ومحرک ہو اور دوسری قسم وہ ہے جو محرک نہ ہو، سبب محرک کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ صورت نہ ہوتی تو اس معصیت کا وہاں پر ارتکاب بھی نہ ہوتا، جیسے معبودان مشرکین کو برا کہنا، خواتین کا ضرب ارجل اور خضوع بالقول، سبب قریب کی اس قسم کا ارتکاب ہی معصیت کا ارتکاب سمجھا جاتا ہے، اس میں قصد وارادہ کی ضرورت نہیں ہے، قصد وارادہ نہ ہو جب بھی یہ معصیت ہے۔

دوسری قسم سبب قریب کی وہ ہے جو سبب قریب تو ہے مگر محرک للمعصیۃ نہ ہے بلکہ معصیت کا صدور کسی دوسرے فاعل مختار کے فعل سے ہوتا ہے، جیسے شراب بیچنے والے سے انگور کا عصیر فروخت کرنا، سبب قریب کی اس قسم کا ارتکاب بغیر قصد وارادہ کے معصیت نہیں ہے، اگر یہ قصد ہو کہ ہم اس شخص سے اسی لیے انگور کا شیرہ فروخت کررہے ہیں کہ یہ اس سے شراب بنالے تو ایسی صورت میں یہ ناجائز ہوگا۔

اب دیکھا جائے کہ بینک کی ملازمت، میں کس حد تک سودی کاروبار کا تعاون ہو رہا ہے، اگر سودی لین دین کا کام ہے، اس کو لکھنے پڑھنے کا کام ہے، اس کے حساب وکتاب کا کام ہے جس میں براہ راست سودی معاملات سے تعلق ہوتا ہے تو یہ حرام وناجائز ہے، اگر سودی کاموں سے اس ملازمت کا تعلق سبب بعید کا ہے مثلاً بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کی حفاظت وغیرہ تو اس کی اباحت ہوگی، قطاع الافتاء والبحوث الشرعیہ کویت کی طرف سے شائع مجموعہ فتاویٰ میں بھی کراہت کے ساتھ اس کی اباحت کا فتویٰ ہے۔

''إن العمل فى البنوك والمؤسسات التى يقوم نظامها الأساسى على الإقراض بفائدة إذا كان فى مجال الوظائف التى يقوم عليها الربا مباشرة من الإقراض والاقتراض وكتابة عقوده ووثائقه والشهادة عليه وكفالته وحسابه وتحصيله واعتماده والمطالبة به قانونيا ونحو ذلك فإنه حرام، أما الأعمال الأخرى التى لاعلاقة لها بالربا مباشرة كالحساب الجارى والشيكات والحوالات وأعمال الحراسة والنظافة والمراسلة فإنها جائزة مع الكراهة وتنصح اللجنة السائل بالبث عن عمل آخر بعيدا عن الشبهة'' (مجموعه الفتاوى الشرعية. كتاب المعاملات. باب البنوك والربا. ۹/ ۱۶۱)۔

بینک کے مکان کی تعمیر سبب قریب تو ہے لیکن یہ سودی کاروبار کے لیے محرم نہیں ہے، اس لیے یہ بغیر معصیت کے ارادہ کے ناجائز نہیں ہوگی، اس لیے اگر کوئی شخص مطلقاً سودی کاروبار کی نیت کے بغیر بینک کے لیے مکان تعمیر کرتا ہے تو یہ جائز ہوگا، اس کی نظیر فقہ کی کتابوں میں موجود ہے، کلیسا کی تعمیر میں کام کرنے کو فقہاء کرام نے جائز قرار دیا ہے۔

''وجاز تعمير كنيسة قال فى الخانية: ولا آجر نفسه ليعمل فى الكنيسة ويعمرها لا بأس به لأنه لا معصية فى عين العمل'' (ردالمحتار كتاب الحظر والاباحة. باب الاستبراء وغيره. ۵/ ۲۷۷)۔

اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا سبب قریب غیر محرک ہے، اگر اس نیت سے دے رہا ہے کہ اس میں سودی کاروبار کیا جائے تو یہ ناجائز ہے، اگر خاص یہ نیت نہیں ہے بلکہ کسی کو کرایہ پر دینا تھا، بینک نے لے لیا تو ایسی صورت میں یہ ناجائز تو نہیں ہوگا مگر کراہت تنزیہی ہوگی۔

''ومن آجربيتا ليتخذ فيه بيت نار أو كنيسة أو بيعة أو يباع فيه الخمر بالسواد فلابأس به وهذا عند أبى حنيفة وقال: لا ينبغى أن يكريه لشىء من ذلك لأنه اعانة على المعصية. وله أن الاجارة ترد على منفعة البيت ولهذا تجب الأجرة. بمجرد التسليم ولامعصية فيه وانما العصية بفعل المستأجر وهو مختار فيه فقطع نسبته عنه.'' (ہدایہ کتاب الكراهية. ۴/ ۴۷۳)۔

ب۔ انشورنس کا کاروبار مکمل طور پر سود اور قمار پر مبنی ہوتا ہے، اس میں ملازمت کرنا شرعاً حرام اور ناجائز ہے، خواہ کمپنی کے آفس میں بیٹھ کر کام کرنا ہو یا ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا ہو، قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ سود اور قمار کو حرام قرار دیا ہے۔

"إنما الخمر والميسر والانصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه" (مائدہ: ۹۰)۔

ج۔ شراب حرام بلکہ ام الخبائث ہے، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے، حضور ﷺ نے شراب کے سلسلے میں متعدد افراد پر لعنت فرمائی ہے، ان میں پینے والا، پلانے والا، بیچنے والا، خریدنے والا، نچوڑنے والا، اس کو لاد کر لے جانے والا، وہ جس کے لیے لاد کر لے جایا جائے، اس کی قیمت کھانے والا سب شامل ہیں۔

''قال رسول الله ﷺ: لعن الله الخمر، وشاربها، وساقيها، وبائعها، ومبتاعها، وعاصرها، ومعتصرها، وحاملها، والمحمولة إليها'' (سنن ابی داؤد، کتاب الاشربة، ص ۵۱۷)۔

اس لیے شراب کی کمپنی میں شراب کی خرید وفروخت کرنے کی ملازمت کرنا حرام ہے، حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہے، اور اس پر لعنت کی گئی ہے، جہاں تک شراب کے لیے بوتل بنانے کا تعلق ہے تو اگر یہ بوتل دوسری چیزوں کے لیے استعمال نہیں ہوتی، صرف شراب کے لیے ہی استعمال ہوتی ہے تو ایسی صورت میں اس کا بنانا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ واضح طور پر تعاون علی المعصیۃ ہے، اگر یہ بوتل دوسرے کاموں کے لیے بھی استعمال

ہوتی ہے تو بنانے والے کی نیت دیکھی جائے گی اگر اس کو شراب رکھنے کی نیت سے بنا رہا ہے تو یہ بھی ناجائز ہوگا، اگر یہ نیت نہیں ہے اس کی بنائی ہوئی بوتلیں دوسرے کاموں میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور شراب کمپنی بھی لے جاتی ہے تو ایسی صورت میں بوتل بنانا ناجائز نہیں ہوگا۔

شراب کی کمپنی کا حساب و کتاب لکھنا بھی تعاون علی المعصیۃ ہے، اس لیے یہ ملازمت بھی جائز نہیں ہوگی، اسی طرح شراب بنانے کے لیے شراب کی کمپنی کو ایسے اجزاء پیش کرنا جس سے شراب بنائی جاتی ہے یہ بھی ناجائز ہے کیونکہ اس میں تعاون علی المعصیۃ ہے اور اس کا ارادہ بھی موجود ہے۔

"وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرا لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغيره وقيل: يكره لإعانته على المعصية ... زاد القهستاني معزيا للخانيه أنه يكره بالاتفاق" (الدر المختار مع الرد المحتار، ۵/ ۲۷۶)۔

"قوله وجاز أى عنده لا عندهما بيع عصير عنب أى معصوره المستخرج منه. فلا يكره بيع العنب والكرم منه بلا خلاف كما فى المحيط. لكن فى الكزانة أن بيع العنب على الخلاف. قهستانى" (ردالمحتار، ۵/ ۲۷۶)۔

۳۔ الف: اس زمانے میں سپر مارکیٹ کا رواج عام ہو رہا ہے، اس سے مراد ایسی بڑی دکان جس میں ضروریات زندگی کی اکثر چیزیں الگ الگ حصوں میں مل جاتی ہیں، ان میں ایک حصہ شراب سے متعلق بھی ہوتا ہے جس میں مختلف قسم کی شرابیں ملتی ہیں، یہ تو واضح ہے کہ شراب کی خرید و فروخت کرنا حرام ہے، اس لیے اس مارکیٹ میں شراب کے حصے میں ملازمت کرنا جہاں شراب فروخت کی جاتی ہے جائز نہیں ہے، کیونکہ اس ملازم کو شراب فروخت کرنا ہوگا جو حرام ہے، البتہ اس مارکیٹ میں ایسی ملازمت جس میں دوسری چیزیں فروخت کرنی ہوں، شراب سے تعلق نہ ہو تو جائز ہے، اسی طرح اس مارکیٹ میں حفاظت، نگرانی اور صفائی وغیرہ کے کام کرنا جائز ہے۔

ب۔ عصری تعلیم گاہوں میں اساتذہ میں خواتین بھی ہوتی ہیں، لڑکیوں کے لیے مخصوص درسگاہوں میں مرد اساتذہ بھی درس دیتے ہیں، اسی طرح لڑکوں کی درس گاہوں میں خواتین اساتذہ بھی درس دیتی ہیں، ایسے میں مرد اساتذہ کا لڑکیوں کو پڑھانا اور خواتین اساتذہ کا لڑکوں کو پڑھانا شرعاً اس وقت جائز ہوگا جب شرعی پردے کا پورا اہتمام ہو، طلبہ اور طالبات بھی شرعی حدود پر قائم ہوں، دونوں کے کلاس الگ الگ ہوں یا دونوں کی سیٹیں الگ ہوں۔

جہاں تک اجنبیہ کے چہرے کو دیکھنے کی ممانعت کا مسئلہ ہے تو اس سلسلہ میں فقہاء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ شہوت کے ساتھ اجنبیہ کے چہرے کو دیکھنا حرام ہے، بلا شہوت کسی حاجت کے بغیر اجنبیہ کو دیکھنا مکروہ ہے، اور کسی حاجت کے پیش نظر دیکھنا مکروہ نہیں ہے، یہاں پر تدریس و تعلیم ایسی حاجت و ضرورت ہے جس کی وجہ سے اس میں کراہت نہیں ہونی چاہئے، لیکن یہ اجازت اسی وقت ہوگی جب طالبات پورے ساتر لباس میں ہوں، اسی طرح لڑکوں کو پڑھانے والی معلمہ بھی باپردہ ہو، اصولی طور سے یہ ہونا چاہیے کہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے مرد اساتذہ مقرر ہوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے خواتین اساتذہ مقرر ہوں، اور دونوں کے کلاس علیحدہ علیحدہ ہوں۔

"فإن خاف الشهوة أو شك امتنع نظره إلى وجهها فحل النظر مقيد بعدم الشهوة والا فحرام وهذا فى زمانهم وأما فى زماننا فمنع من الشابة قهستانى وغيره" (الدر المختار مع الرد، ۵/ ۲۶۱)۔

"قوله مقيد بعدم الشهوة، قال فى التاتار خانية: وفى شرح الكرخى: النظر إلى وجه الأجنبية الحرة ليس بحرام ولكنه يكره لغير حاجة اه وظاهره الكراهة ولو بلا شهوة، قوله وإلا فحرام أى إن كان عن شهوة حرم، قوله وأما فى زماننا فمنع من الشابة لا لأنه عورة، بل لخوف الفتنة كما قدمه فى شروط الصلاة" (ردالمحتار، كتاب الحظر والاباحة، فصل فى النظر والمس، ۵/ ۲۶۱)۔

ج۔ وکالت کی تعلیم حاصل کرنا اور وکالت کا پیشہ اختیار کرنا اصل مقصد کے اعتبار سے جائز و درست ہے، کیونکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی مظلوم کو انصاف دلانے میں تعاون دینا اور ظالم کو اس کے صحیح انجام تک پہنچانے کی کوشش کرنا اور یہ فی نفسہ نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ بھی ہے، مسلمانوں کو بسا اوقات اچھے مسلم وکلاء کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن معاملہ اس وقت نازک نظر آتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وکلاء حضرات کو حق اور ناحق کی کوئی تمیز نہیں ہے، ان کو صرف اپنی فیس سے

مطلب ہے، اس لیے بعض اوقات وہ اپنی وکالت کے لیے جانتے ہوئے بھی مظلوم کو سزا دلوانے اور ظالم کو بری کرانے کی پوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے مؤکلین کو باقاعدہ جھوٹ بولنے کی تربیت دیتے ہیں تو ایسی صورت میں وکالت شرعاً بالکل ناجائز اور حرام ہوگی، اور اس کے جواز کی کوئی شکل نہیں ہے۔

اس لیے اگر وکیل صحیح مقدمات لیتا ہو اور مظلوم کی اعانت اس کے پیش نظر ہو اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہو تو ایسی وکالت جائز ہوگی، جھوٹے مقدمات کی پیروی کرنا اور مجرم کو قانون سے بچا لینا اور بے قصور پر جرم ثابت کرا دینا شدید گناہ کا کام ہے، اور اس پر معاوضہ لینا حرام فعل پر معاوضہ لینا ہے جو جائز نہیں ہے۔

''لایجوز أخذ الأجرة على المعاصي كالغناء والنوح والملاهي، لأن المعصية لايتصور استحقاقها بالعقد فلايجب عليه الأجر وإن أعطاه الأجر وقبضه لا يحل له ويجب عليه رده على صاحبه'' (مجمع الانہر، ۲/ ۵۲۲، باب الاجارۃ الفاسدۃ)۔

د۔ اگر علاج کے لیے ضروری ہو تو طبیب کا مریض کے قابل ستر مقام کو دیکھنا اور اس کا علاج کرنا شرعاً جائز ہے، اس صورت میں ہونا یہ چاہئے کہ مرد مریض کا علاج مرد ڈاکٹر کریں اور خاتون مریض کا علاج خاتون ڈاکٹر کریں، لیکن جہاں یہ صورت نہیں ہو پا رہی ہو تو بہت احتیاط کے ساتھ مرض کے مقام کو دیکھا جا سکتا ہے، مقام مرض کے علاوہ جسم کے دوسرے حصوں پر پردہ ہو۔

''ينظر الطبيب إلى موضع مرضها بقدر الضرورة اذا الضرورات تتقدر بقدرها وكذا نظر قابلة وختان وينبغي أن يعلم امرأة تداويها، لأن نظر الجنس إلى الجنس أخف'' (الدر المختار، كتاب الحظر والاباحة، ۵/ ۲۶۱)۔

''وإن كان في موضع الفرج فينبغي أن يعلم امرأة تداويها فإن لم توجد وخافوا عليها أن تهلك أو يصيبها وجع لاتحتمله يستروا منها كل شيء إلا موضع العلة ثم يداويها الرجل ويغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح۔'' (ردالمحتار، ۵/ ۲۶۲)۔

ھ۔ ہوٹل اپنے مقصد کے لحاظ سے لوگوں کو قیام و طعام کی سہولیات فراہم کرتا ہے، معاشرے میں اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ بالمعاوضہ مسافروں کے قیام اور طعام کا نظم کرتا ہے، یہ معاشرے کی ایک ضرورت بھی ہے اور ایک نفع بخش تجارت بھی، لیکن اس دور میں اس میں مختلف قسم کے منکرات شامل ہو گئے ہیں، جس میں شراب اور حرام غذا کی فراہمی، رقص و موسیقی، سوئمنگ پول میں عریاں غسل اور تیراکی، دیگر فحش چیزیں وغیرہ ہیں، اس لیے مطلقاً ہوٹل کی ملازمت کو سند جواز دے دینا بہت مشکل ہے، اس میں فرق کرنا ضروری ہے، جہاں تک حلال کھانوں کی فراہمی اور قیام کی سہولت کا معاملہ ہے یہ جائز و درست ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، اس لیے اس کی ملازمت بھی درست ہوگی، لیکن گاہکوں کو حرام غذا اور شراب پیش کرنا، رقص و موسیقی کا انتظام کرنا وغیرہ جیسی چیزوں کی شرعاً اجازت نہیں ہے، یہ ناجائز و حرام ہیں، اس لیے ان کاموں کی ملازمت بھی جائز نہیں ہوگی۔

....

مختلف محکموں میں ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

مولانا ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی[1]

۱۔الف۔ مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، کیونکہ عام طور سے فوج کا استعمال اچھے مقاصد کے لیے ہوتا ہے، لہٰذا شاذ و نادر کا اعتبار نہیں، اور فقہی قاعدہ ہے: "یجوز ارتکاب أخف الضررین لدفع اعظمهما" (ابن نجیم المصری ۹۷۰ھ، الاشباہ والنظائر ص ۸۹، طبع دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۸۰ء) (دو ضرر میں سے بڑے ضرر کو دور کرنے کے لیے ہلکے ضرر کا ارتکاب صحیح ہے)، چنانچہ غیر اسلامی فوج کی ملازمت میں کچھ ضرر ہے، لیکن ملازمت ترک کرنے میں بڑا ضرر ہے، کیونکہ اس طرح مسلمان فوجی علوم اور عسکری تربیت سے محروم رہ جائیں گے۔

اسی طرح مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ خود کو یا دوسرے کو ضرر پہنچائیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

"لا ضرر ولا ضرار" (المؤطا حدیث نمبر ۱۴۲۹، سنن ابن ماجہ ۲۳۴۱، مسند احمد حدیث نمبر ۲۸۶۵، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے)

(نہ اپنے ذات کو نقصان پہنچانا درست ہے اور نہ دوسروں کو نقصان پہنچانا جائز ہے)۔

اور مخفی نہیں کہ فوجی ملازمت سے دست بردار ہونے میں خود مسلمانوں کا نقصان ہے، کیونکہ وہ اس طرح خود اپنے سماج میں مساوی حقوق سے محروم ہو جائیں گے، اور باعزت زندگی سے دور ہو جائیں گے۔

نیز فقہی قاعدہ ہے: "المصلحة العامة مقدمة على المصلحة الخاصة" (الاشباہ لابن نجیم ص ۸۷)

(عمومی مصلحت خصوصی مصلحت پر مقدم ہے)، چنانچہ غیر اسلامی فوج کی ملازمت کی صورت میں بعض مسلم افراد کے حق میں کچھ مفاسد کے ارتکاب کا امکان ہے، لیکن اس ملک کے سارے مسلمانوں کی مصلحت کے مقابلہ میں اس کا اعتبار نہیں ہے، کیونکہ فوج میں مسلمانوں کا رہنا اجتماعی لحاظ سے مسلمانوں کے مفاد میں ہے، اس لیے کہ بسا اوقات اس کی وجہ سے مسلمان، فوج کی زیادتی سے بچ جاتے ہیں، نیز یہ روزگار کا ایک وسیع ذریعہ بھی ہے، اس کو چھوڑ دینا مسلمانوں کے لیے معیشت کے وسائل کو محدود کر دینے کے مترادف ہے، جبکہ ان کے حق میں پہلے ہی سے وسائل محدود ہیں۔

نیز جہاد کی تیاری تمام مسلمانوں پر واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم" (الانفال: ۶۰)

(اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے ان کے مقابلہ کے لیے طاقت بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو، جس سے اللہ کے اور تمہارے ان دشمنوں پر تمہاری ہیبت رہے، اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ انہیں جانتا ہے)۔

آلوسی تحریر فرماتے ہیں: "خطاب لكافة المؤمنين لما أن المأمور به من وظائف الكل" (السید محمود الالوسی، روح المعانی، ۵/۲۲۰، طبع دارالکتب العلمیہ، بیروت) (یہ تمام اہل ایمان سے خطاب ہے، کیونکہ جس چیز کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ سب کے وظیفہ میں سے ہے)۔

اور یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ قوت کی تیاری کا بہتر ذریعہ غیر اسلامی ممالک میں فوجی ملازمت ہے، کیونکہ عام طور سے اسلحہ کی ٹریننگ سارے ملکوں میں ممنوع ہے۔

خلاصہ یہ کہ مفاسد جیسے بعض دفعہ فوج کو ظالم و مظلوم کی تحقیق کئے بغیر وار کرنا پڑتا ہے، اور فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے، اسی طرح بعض دفعہ ایک مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہو سکتا ہے، کو نظر انداز کرتے ہوئے مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت کے پیش نظر فوج کی ملازمت درست ہے، لیکن

---

[1] استاذ حدیث و فقہ، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، پٹی کاڈ، مالاپورم، کیرالا۔

ایک مسلمان فوجی کو حتی الامکان ظلم وزیادتی، تعدی اور مظلوم اور خاص طور سے مظلوم مسلم کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے سے بچنا چاہئے، خواہ اس کے لیے اسے نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لزوال الدنیا أھون علی اللہ من قتل رجل مسلم" (سنن النسائی تحریم الدم، باب تعظیم الدم، حدیث نمبر ۳۹۸۶، الترمذی حدیث نمبر ۱۳۴۵، عن عبداللہ بن عمرو بن العاص، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (دنیا کا ختم ہوجانا، اللہ کے نزدیک ایک مسلمان شخص کے قتل سے زیادہ ہلکا ہے)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انما الطاعة فی المعروف" (صحیح البخاری حدیث نمبر ۱۴۵ ۷) (اطاعت تو بھلے کاموں میں ہے)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" (الطبرانی، المعجم الکبیر، حدیث نمبر ۱۴۷۹۵) (خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے)۔

اور سرخسی تحریر کرتے ہیں: "وإن قالوا لھم: قاتلوا معنا المسلمین والاقتلنا کم، لم یسعھم القتال ضدا لمسلمین؟ لأن ذلك حرام علی المسلمین بعینه، فلا یجوز الإقدام علیه بسبب التھدید بالقتل کما لو قال: اقتل ھذا المسلم والا قتلتك" (شمس الائمۃ محمد السرخسی ۴۸۳ھ، شرح السیر الکبیر، باب قتل اہل الاسلام اہل الشرک، ۴/ ۲۲۴، رقم الحدیث ۲۹۷۴)

(اور اگر کفار نے مسلم قیدیوں سے کہا کہ ہمارے ساتھ مسلمانوں سے قتال کرو، ورنہ ہم تمہیں قتل کردیں گے، تو ان کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے خلاف قتال کریں، اس لیے کہ یہ اپنی ذات کے اعتبار سے مسلمانوں پر حرام ہے، لہٰذا قتل کے ذریعہ دھمکی دیئے جانے کے سبب سے اس پر اقدام کرنا جائز نہ ہوگا، جیسا کہ اگر اس سے کہے کہ اس مسلمان کو قتل کرو، ورنہ میں تجھے قتل کردوں گا)۔

ب۔ ایک مسلمان کے لیے شعبہ پولیس میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، چنانچہ فقہی قاعدہ ہے:

"إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمھما ضررا بارتکاب أخفھما" (الاشباہ لابن نجیم، القاعدہ الرابعة، ص ۸۹)
(جب دو فساد امر کا تعارض ہو، تو دونوں میں سے بڑے ضرر کی رعایت ان میں سے ہلکے ضرر کے ارتکاب کے ساتھ کی جائے گی)۔

چنانچہ شعبہ پولیس میں کام کرنے کی صورت میں کچھ ضرر کا اندیشہ ہے، جیسے صحبت کی تاثیر سے بدزبان اور ظلم وجور کا خوگر بننے کا امکان ہے، لیکن ملازمت ترک کرنے کی صورت میں مسلمانوں کو زیادہ نقصان اور انصاف سے محرومی کا قوی امکان ہے، لہٰذا اس شعبہ کی ملازمت درست ہوگی، البتہ ہر ایک مسلم کو خیر امت کا نمائندہ ہونا چاہئے اور حتی الامکان اپنی چھاپ دوسروں پر ڈالنی چاہئے، اور ظلم وجور، بدزبانی، بداخلاقی اور سب وشتم سے پرہیز کرنا چاہئے۔

ج۔ شعبہ مخبری اور انٹیلجنس میں ملازمت کرنا مسلمانوں کے لیے درست ہے، کیونکہ مصلحت کو وجود میں لانے اور باعث فساد امور کو دور کرنے کے لیے تجسس کی گنجائش ہے، جبکہ چھپی ہوئی برائی جس کا ضرر پوری قوم پر نہ پڑتا ہو، اسے ظاہر کرنے کے لیے تجسس حرام ہے، ہدایہ میں ہے:

"وإذا استحلف الوالی رجلا لیعلمنه بکل داعر، أی مفسد خبیث من الدعارة، وھی الخبث والفساد، دخل البلد، کان الاعلام واجبا حال ولایته خاصة" (الہدایہ مع العنایة بہامش الفتح، کتاب الایمان، مسائل متفرقة ۴/۲۶۸، طبع دارالکتب العلمیہ، بیروت)
(اور اگر حاکم کسی شخص کو قسم دلائے کہ وہ اسے ضرور ہر فسادی کے بارہ میں بتائے گا جو شہر میں داخل ہو تو اطلاع دینا خاص طور سے اس کی حکمرانی کی حالت میں واجب ہوگا، "داعر" کے معنی فسادی وشریر کے ہیں، یہ "دعارۃ" سے ماخوذ ہے، اور اس کے معنی شر اور فساد کے ہیں)۔

اور یہ بات مخفی نہیں کہ "فسادی" کا علم تجسس ہی کے ذریعہ ہوگا، اور علامہ "مازہ" تحریر کرتے ہیں:

"قال أصحابنا رحمھم اللہ، لا بأس بالھجوم علی بیت المفسدین، والدخول فیه من غیر استئذان، اذا سمع منه صوت فساد للأمر بالمعروف، والنھی عن المنکر" (محمود بن احمد برہان الدین مازہ المحیط البرہانی، کتاب القضاء، الفصل الحادی عشر: فی العدوی وتمیز الباب ۸/ ۱۷۴، طبع داراحیاء التراث العربی، بیروت) (ہمارے علماء نے کہا ہے کہ مفسدین کے گھر پر ناگہانی میں پہنچنا اور بغیر اجازت طلب کئے ہوئے اس میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، جبکہ اس سے فساد کی آواز سنی جائے، معروف کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ قوی قرینہ کی حالت میں تجسس کی گنجائش ہے، اور رد المحتار میں ہے: "وھجم عمر رضی اللہ عنه علی نائحة فی

منزلها، وضربها بالدرة، حتى سقط خمارها، فقيل له فيه: فقال: لاحرمة لها بعد اشتغالها بالحرام والتحقت بالإماء'' (ردالمحتار، کتاب الحدود، باب التعزیر، مطلب: یکون التعزیر بالقتل، ۶/۱۱۰)

(اور حضرت عمرؓ ایک نوحہ خواں عورت کے گھر اچانک پہنچ گئے اور اسے درہ سے مارا، یہاں تک کہ اس کا دوپٹہ گر گیا، چنانچہ اس سلسلہ میں ان سے پوچھا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ حرام میں مشغول ہونے کے بعد اس کے لیے حرمت نہیں رہی، اور وہ باندی سے جا ملی)۔

اور اس سے بھی ظاہر ہے کہ قوی شبہ کی بنا پر تجسس درست ہے، اور ابن حبیب مالکی کا کہنا ہے کہ

''سمعت ابن الماجشون يقول في اللصوص وقطاع الطريق: أرى أن يطلبوا في مظانهم ويعان عليهم حتى يقتلوا وينفوا من الارض بالهرب'' (ابراهيم بن علي بن محمد ابن فرحون ۷۹۹ھ تبصرة الحكام في اصول الاقضية ومناهج الاحكام، الفصل الثامن في الكشف عن المفسدين ۳۸۹/۴، طبع الشاملة) (میں نے ابن الماجشون کو چوروں اور ڈاکوؤں کے بارہ میں کہتے ہوئے سنا کہ میری رائے ہے کہ بھاگنے کے سبب ان کو ان کی ممکنہ جگہوں میں ڈھونڈا جائے، اور ان کے خلاف مدد دی جائے، یہاں تک کہ قتل کیے جائیں، یا جلاوطن کردیئے جائیں)۔

اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ڈاکوؤں کو ان کی ممکنہ جگہ میں تلاش کرنا تجسس اور مخبری ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

اور ماوردی تحریر کرتے ہیں: ''فإن غلب على الظن استسرار قوم بها لأمارات دلت، وآثار ظهرت، فذلك ضربان: أحدهما: أن يكون ذلك في انتهاك حرمة يفوت استدراكها، مثل أن يخبره من يثق بصدقه ان رجلا خلا بامرأة ليزني بها، أو برجل ليقتله، فيجوز له في مثل هذه الحالة أن يتجسس ويقدم على الكشف والبحث حذارا من فوات مالا يستدرك من انتهاك المحارم وارتكاب المحظورات ... والضرب الثاني ما خرج عن هذا الحد. وقصر عن حد هذه الرتبة. فلا يجوز التجسس عليه، ولا كشف الأستار عنه'' (ابوالحسن علی الماوردی ۴۵۰ھ الاحکام السلطانیہ، الباب العشرون: فی احکام الحسبة، فصل فی علق النهي بالمحظورات ۸/۲، المكتبة الشاملة)

(اگر ممنوعات کو خفیہ طور سے کرنے کا گمان غالب ہو تو قرائن کی وجہ سے جو دلالت کر رہے ہوں، اور آثار کے سبب جو ظاہر ہوں، تو اس کی دو قسمیں ہیں: ا۔ ان دونوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایسا ایسی حرمت کی پامالی کے سلسلہ میں ہو، جس کی تلافی فوت ہو جائے، جیسے اسے وہ خبر دے جس کی صداقت پر اسے بھروسہ ہو کہ ایک مرد ایک عورت کے ساتھ خلوت میں ہے تاکہ اس کے ساتھ زنا کرے، یا کسی آدمی کے ساتھ تنہائی میں ہے تاکہ اسے قتل کردے، تو اس حالت میں اسے تجسس کرنا اور چھان بین پر اقدام کرنا جائز ہے، محارم کی پامالی اور ممنوعات کے ارتکاب کی تلافی کے فوت ہونے سے بچنے کے لیے اور دوسری قسم وہ ہے جو اس حد سے خارج ہو، اور اس مرتبہ کی حد سے باہر ہو، تو اس کے خلاف تجسس کرنا اور اس کے پردہ کو چاک کرنا جائز نہیں ہیں)۔

اور فسادی کے شر سے لوگوں کو بچانے کے لیے اس کی غیبت درست ہے (دیکھئے: ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع، ۵۸۶/۹)

اور فقہی قاعدہ ہے: ''يتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام'' (الاشباہ لابن نجیم، ص ۸۷)

(ضرر عام کو دور کرنے کی وجہ سے ضرر خاص کو برداشت کیا جائے گا)۔

چنانچہ مخبری کے شعبہ سے تمام مسلمانوں کے دور رہنے کی صورت میں غیروں کو ان کے خلاف سازش کا زیادہ موقع ملے گا۔

البتہ شعبہ مخبری میں کام کرنے والے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ محض ادنیٰ شبہ کی وجہ سے شریف شہریوں، خاص طور سے مسلمانوں کے خلاف تجسس کی کارروائی نہ کرے، بلکہ حتی الامکان اس طرح کی کارروائی اس وقت کرے، جبکہ کسی کے خلاف ٹھوس بنیاد اور قوی شبہ ہو، چنانچہ حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''إنك إذا اتبعت عورات الناس أفسدتهم أو كدت أن تفسدهم'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۴۸۸۸، اور یہ صحیح حدیث ہے) (اور تم لوگوں کے عیوب کی ٹوہ میں پڑو گے تو تم انہیں بگاڑ دو گے، یا بگاڑنے کے قریب پہنچ جاؤ گے)۔

اور حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إن الأمير إذا ابتغى الريبة في الناس أفسدهم'' (سنن ابی داؤد حدیث ۴۸۸۹، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (یقیناً اگر حاکم لوگوں کے اندر شک وتہمت کی تلاش میں رہے تو وہ انہیں بگاڑ دے گا)۔

نیز حتی الوسع توریہ وغیرہ سے کام لے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إلا أن تتقوا منهم تقاة" (عمران: ۲۸)

(مگر یہ معاف ہے کہ تم ان کافروں کے شر سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ)۔

اور عمران بن حصینؓ کا قول ہے: "إن فی المعارض لمندوحة عن الکذب" (الادب المفرد للبخاری حدیث نمبر ۸۵۷ وصحیح موقوفا)

(بے شک توریہ میں جھوٹ سے بچنے کی راہ ہے)۔

د۔ غیر شرعی عدالتیں باطل کے قلعے اور حاکمیت میں شرک کے مراکز ہیں، اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اسلام میں حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "إن الحکم الا للہ امر ألا تعبدوا الا ایاہ ذلك الدین القیم، ولکن اکثر الناس لا یعلمون" (یوسف: ۴۰)

(حاکمیت صرف اللہ ہی کی ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إن الحکم الا للہ یقص الحق، وهو خیر الفاصلین" (انعام: ۵۷)

(فیصلہ کرنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہی حق کو واضح کرے گا، اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا یشرك فی حکمه أحدا" (کہف: ۲۶) (اور وہ اپنی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں بناتا)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الکافرون" (مائدہ: ۴۴)

(اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں)۔

اور ارشاد ہے: "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الظالمون" (مائدہ: ۴۵)

(اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی ظالم ہیں)۔

نیز فرمان باری تعالیٰ ہے: "ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فاولئك هم الفاسقون" (مائدہ: ۴۷)

(اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی فاسق ہیں)۔

لیکن اس ضرورت کے پیش نظر کہ اگر عدالتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہو جائے، تو قوی امکان ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کو مظلومیت اور بڑھ جائے گی، چنانچہ مسلمانوں کے لیے عدالتوں میں ملازمت کرنا اس شرط کے ساتھ درست ہے کہ وہ دل سے غیر خدائی قانون کو ناپسند کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم اضطراری حالت میں کام کر رہے ہیں اور دل میں یہ عقیدہ ہو کہ الٰہی قانون کے ساتھ فیصلہ کرنا فرض ہے، اس لئے کہ فقہی قاعدہ ہے: "الضرورات تبیح المحظورات" (الاشباہ لابن نجیم ص ۸۵) (ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں)۔

"الحاجة تنزل منزلة الضرورة، عامة کانت أو خاصة" (الاشباہ لابن نجیم، ص ۹۱)

(حاجت ضرورت کا درجہ لے لیتی ہے، خواہ وہ حاجت عام ہو یا خاص)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إلا من أکره وقلبه مطمئن بالایمان" (نحل: ۱۰۶) (مگر جو مجبور کر دیا گیا ہو، اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو)۔

ھ۔ چونکہ انکم ٹیکس کا بنیادی مقصد عوامی فلاح پر اس کا استعمال ہے، اور یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ انکم ٹیکس کی شرح منصفانہ مقرر کرے، اور ضرورت سے زیادہ لوگوں پر بوجھ نہ ڈالے، اور اس بات کو یقینی بنائے کہ اس کا غلط استعمال نہ ہو، اور اگر ایسا نہ ہو تو ملک کے باشعور افراد اس کے خلاف سنجیدہ عوامی تحریک چلائیں۔ چنانچہ انکم ٹیکس کے شعبوں میں ملازمت کرنا صحیح ہے، اس لیے کہ فقہی قاعدہ ہے: "الامور بمقاصدها" (الاشباہ لابن نجیم ص ۲۷) (معاملات کا اعتبار ان کے مقاصد کے لحاظ سے ہے)، اور اس شعبہ میں کام کرنے والے ملازم کا مقصد عوامی فلاح کے لیے انکم ٹیکس جمع کرنا ہے۔

البتہ اس شعبہ میں ملازمت کرنے والے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ بلا وجہ لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تجسس نہ کریں، اور عدل وانصاف کی پابندی کریں، ظلم اور رشوت ستانی سے دور رہیں، البتہ اگر ظالمانہ شرح ٹیکس اور اس کے غلط استعمال کا کسی کو یقین ہو تو اس کے حق میں یہ ملازمت

درست نہیں ہے۔

۲۔ ہر وہ چیز جو یقین یا گمان غالب کے طور پر معصیت کا سبب بالواسطہ یا بلاواسطہ ہو، وہ حرام ہے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اور مکروہ تحریمی ہے صاحبین کے نزدیک، اور اگر بلاواسطہ معصیت کا سبب ہو تو مکروہ تحریمی ہے، امام صاحب کے نزدیک، اور اگر بالواسطہ سبب ہو تو ان کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے (دیکھئے: سلیمان بن محمد البجیرمی الشافعی ۱۲۱۲ھ، حاشیۃ البجیرمی علی المنہاج، کتاب البیوع، فصل فیما نہی عنہ من البیوع ۷/ ۷، طبع شاملہ، رد المحتار کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع ۹/ ۵۶۰۔ ۵۶۳)

اس مختصر تمہید کے بعد جواب درج ہے:

الف۔ چونکہ بینک کا اصل مقصد سودی لین دین کا کاروبار کرنا ہے، لہٰذا بینک کی ملازمت، بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی چوکیداری و حفاظت، جانتے بوجھتے ہوئے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا، یہ سب ناجائز و حرام ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس شخص پر لعنت کی ہے جس کا سودی کاروبار سے تعلق ہو، چنانچہ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: "لعن رسول الله ﷺ آکل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۹۸) (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے پر اور سود کھلانے والے پر اور سودی معاملہ لکھنے والے اور اس کے گواہ پر لعنت فرمائی، اور فرمایا کہ وہ سب برابر ہیں)۔

البتہ اگر کسی کو فاقہ کشی کی نوبت ہو، تو اضطراری حالت میں بینک کی ملازمت کر سکتا ہے اور اپنی تنخواہ سے صرف اپنے اور اپنے بچوں کی اصلی ضروریات کی حد تک استعمال کر سکتا ہے، باقی کو بغیر صدقہ کی نیت کے حرام مال سے نجات پانے کی غرض سے فقراء کو دے دے، اور جائز عمل کی تلاش میں برابر رہے، اور جیسے ہی جائز عمل ملے اس ملازمت کو ترک کر دے، خواہ جائز ملازمت کی تنخواہ کم ہو، اس لیے کہ "الضرورة تتقدر بقدرها"۔

ب۔ شراب کی کمپنی میں ملازمت ناجائز ہے، خواہ اس کا کام شراب کی خرید و فروخت کرنا ہو، یا کمپنی کے لیے جانتے بوجھتے بوتل بنانا ہو یا شراب کا حساب کتاب لکھنا ہو یا شراب کی کمپنی کو وہ اجزاء پیش کرنا ہو جن سے شراب بنائی جاتی ہے، اس لیے کہ وسائل کے لیے مقاصد کا حکم ہے، چنانچہ حرام تک پہنچانے والا وسیلہ بھی حرام ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اتاني جبريل، فقال: يامحمد! ان الله عزوجل قد لعن الخمر وعاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة اليه وبائعها ومبتاعها وساقيها ومستقيها" (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر ۵۳۵۶، مسند احمد حدیث نمبر ۲۸۹۷ عن ابن عباس، اور شعیب الارنؤوط، کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے) (میرے پاس حضرت جبرئیل آئے، اور بولے اے محمد! بے شک اللہ عز وجل نے لعنت بھیجی ہے، شراب پر اور اس کے نچوڑنے والے اور اپنے لیے نچوڑوانے والے، اور اس کے پینے والے، اور اس کے ڈھونے والے، اور جن کے پاس ڈھو کر لے جایا جائے، اور اس کے بیچنے والے اور اس کے خریدار اور اس کے پلانے والے اور پلانے کی درخواست کرنے والے پر)، اور حضرت عبد اللہ بن عمر کی روایت میں "وأكل ثمنها" (المستدرک للحاکم حدیث نمبر ۲۲۳۵) (اور اس کی قیمت کھانے والے پر) بھی وارد ہے۔

۳۔الف۔ سپر مارکیٹ کی ملازمت کرنا جائز ہے، اگر اس کا کام زندگی کی مختلف ضروریات فروخت کرنا ہو، اور شراب بیچنا نہ ہو، جبکہ منکر و برائی کو دل سے برا سمجھے، لیکن برائی کے مشاہدہ کی جگہ میں ملازمت مکروہ تنزیہی ہے۔

اور اس کا کام دیگر چیزوں کے ساتھ شراب بیچنا بھی ہو تو پھر اس جگہ ملازمت کرنا حرام ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب بیچنے اور ڈھونے اور پلانے والے سب پر لعنت کی ہے (سنن ابی داؤد، کتاب الاشربۃ، باب العنب یعصر للخمر عن ابن عمر، حدیث نمبر ۳۶۷۴)۔

ب۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: "قالت النساء للنبي ﷺ: غلبنا عليك الرجال، فاجعل لنا يوما من نفسك، فوعدهن يوما، لقيهن فيه، فوعظهن وأمرهن..." (صحیح بخاری حدیث نمبر ۱۰۱، مسند احمد حدیث نمبر ۱۱۲۹۶)

(عورتوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ سے استفادہ کے سلسلہ میں مرد ہم پر غلبہ لے چکے ہیں، تو آپ اپنی طرف سے ہمارے لیے ایک دن مقرر کر دیجئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک دن کا وعدہ کیا، جس میں ان سے ملے، ان کو وعظ کہا اور حکم دیا)۔

اور عینیؒ تحریر کرتے ہیں: "فيه سؤال النساء عن أمر دينهن، وجواز كلامهن مع الرجال في ذلك وفيما لهن الحاجة اليه"

(الامام بدرالدین محمود العینی، عمدۃ القاری، ۲/ ۱۸۹، طبع دارالفکر، بیروت ۱۹۹۸)(اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ عورتیں اپنے دین کے معاملات کے سلسلہ میں پوچھ سکتی ہیں، اور اس سلسلہ میں اور جن امور کی ان کو ضرورت ہو، ان کے بارے میں مردوں کے ساتھ ان کی گفتگو جائز ہے)۔

اس تفصیل سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:

۱۔ تعلیم میں اختلاط جائز نہیں، کیونکہ اگر دینی امور کی تعلیم کے لیے اختلاط جائز ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان عورتوں کے لیے الگ سے ایک دن مقرر نہ فرماتے۔

۲۔ چونکہ مخلوط تعلیم گاہوں میں عام طور سے اختلاط کے سبب عشق ومعاشقہ اور دیگر مختلف فتنے رونما ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا ایسی تعلیم گاہ میں دونوں صنفوں کا اجتماع ممنوع ہے، اس لیے کہ حرام کا ترک جس چیز کے بغیر نہ ہو، اس چیز کو چھوڑنا واجب ہے۔

۳۔ مخلوط تعلیم کے نظام کے غلبہ کی بنا پر مخلوط تعلیم گاہوں میں ملازمت حاجت کی بنا پر درست ہے، کیونکہ تدریس ایک معزز پیشہ، اور بڑا ذریعہ معاش ہے، جس سے مسلمانوں کا محروم رہنا بڑے خسارہ کی بات ہے، جبکہ فقہی قاعدہ ہے: "الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة" (الاشباہ، ص ۹۱)، اور تعلیم اپنی اصل کے اعتبار سے ہر ایک کے لیے مباح ہے، البتہ مخلوط تعلیم گاہ میں ملازمت کرنے والے کے لیے درج ذیل شرائط کی پابندی ضروری ہے:

ملازم دیندار ہو، پاکدامن ہو، حتی الامکان نگاہ نیچی رکھے، دوسری صنف سے تعلیم کے علاوہ امور میں بات سے حتی الامکان پرہیز کرے۔

دوسری صنف کے ساتھ خلوت میں ملنے سے پرہیز کرے۔

دونوں صنف کے حق میں فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

اگر ملازم عورت ہے تو حتی الوسع شرعی حجاب کی پابندی کرے۔

ملازم عورت دبی زبان سے بات نہ کرے، اس کے لہجے میں کوئی لوچ نہ ہو، اس کی باتوں میں کوئی لگاوٹ نہ ہو، اور اس کی آواز میں دانستہ کوئی شیرینی گھلی ہوئی نہ ہو، جو سننے والے مرد کے جذبات کو بھڑکائے، اور اسے آگے قدم بڑھانے کی ہمت دلائے، بلکہ عورت کا لہجہ اور انداز گفتگو ایسا ہو جس سے مخاطب مرد کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ گزر سکے کہ اس عورت سے کوئی اور توقع بھی قائم کی جاسکتی ہے۔

ملازمت عورت ہر ایسے تصرف سے پرہیز کرے، جو جذبات کو انگیختہ کرنے والا ہو۔

لڑکیوں کی مخصوص درسگاہوں میں مرد اساتذہ کا کام کرنا درست ہے، ان شرعی شرائط کے ساتھ جو اوپر گذرے ہیں۔

پیچھے ذکر کردہ شرائط کے ساتھ لڑکوں کی درسگاہوں میں خاتون اساتذہ کام کرسکتی ہیں۔

ج۔ ایک مسلمان کے لیے وکالت کے پیشہ کو اختیار کرنا جائز ہے، کیونکہ وہ تو محض دعویٰ کرنا یا اس کا جواب دینا ہے، سرخسی تحریر کرتے ہیں: "وفيه جواز التوكيل بالخصومة" (المبسوط، کتاب الوکالۃ، ۱۹/ ۹)(اس سے خصومت کا وکیل بنانے کا جواز نکلتا ہے)

البتہ ہر ایک مسلمان کو سمجھنا چاہیے کہ وہ بہترین اور افضل امت کا فرد ہے، لہٰذا اسے اس منصب کا نمائندہ ہونا چاہئے، اس لیے اس پر واجب ہے کہ کذب بیانی سے پرہیز کرے، باطل معاملہ میں اپنے موکل کا دفاع نہ کرے، حق کو بیان کرے اور صداقت کا اظہار کرے، چنانچہ ایک مسلمان وکیل پر لازم ہے کہ وہ معاملہ اور کیس پر اچھی طرح غور کرلے، اگر اسے گمان غالب ہوجائے کہ حق اس کے موکل کے ساتھ ہے، تو پھر ایسی ہی صورت میں وہ کیس لے، ورنہ کیس کو چھوڑ دے، اس لیے کہ ظلم وجور اور جرم کا کسی طرح ساتھ دینا درست نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وتعاونوا على البر والتقوى، ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (مائدہ: ۲)(نیکی اور تقویٰ کے کام پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ اور زیادتی کے کام پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "انصر اخاك ظالما او مظلوما، قالو: یارسول الله! هذا ننصره مظلوما، فكيف ننصره ظالما؟ قال: تأخذ فوق يديه" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۴۴۴)(تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ نے اس پر عرض کیا کہ اے اللہ

کے رسول، اس کی مظلوم ہونے کی صورت میں ہم مدد کریں گے، پھر ہم ظالم ہونے کی صورت مین کیسے مدد کریں گے؟ آپ نے فرمایا: تم اس کا ہاتھ پکڑ لو یعنی اسے ظلم سے باز رکھو)۔

چنانچہ ایک مسلمان وکیل کو اگر گمان غالب ہو کہ حق دوسرے فریق کے ساتھ ہے تو وہ ابتداء ہی میں اپنے موکل سے اس بات کی وضاحت کردے اور اسے دعویٰ چھوڑنے کی نصیحت کردے، اور اس مقدمہ و کیس میں داخل نہ ہو۔

د۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" (آل عمران: ۱۱۰) (تم بہترین گروہ ہو، جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔

اور اجارہ کی تعریف ہے: "عقد على منفعة معلومة مباحة" (الاختیار کتاب الاجارۃ، ۲/ ۵۳، طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت ۲۰۰۵ م، وشیخ الاسلام زکریا الانصاری، اسنی المطالب فی شرح روض الطالب، کتاب الاجارۃ ۲/ ۴۰۳، طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت ۲۰۰۰ء) (مباح اور معلوم منفعت کے عقد کو (جو بہ عوض ہو) اجارہ کہتے ہیں)۔

اور علامہ محمد طوری حنفی تحریر کرتے ہیں: "والطبيب إنما يجوز له ذلك إذا لم يوجد امرأة طبيبة، فلو وجدت، فلا يجوز له أن ينظر؛ لأن نظر الجنس إلى الجنس أخف" (تکملۃ البحر الرائق، کتاب الکراہیۃ فصل فی النظر واللمس ۹/ ۳۵۲، ۳۵۳ طبع الہند) (اور طبیب کے لیے اجنبی عورت کے مرض کے حصہ کو دیکھنا اس صورت میں جائز ہے، جبکہ کوئی طبیب عورت موجود نہ ہو، اگر خاتون ڈاکٹر موجود ہو، تو اس کے لیے دیکھنا جائز نہیں، اس لیے کہ ایک صنف کا اپنی صنف کو دیکھنا ہلکا ہے)۔

اور رد المحتار میں "الجوہرۃ النیرۃ" کے حوالہ سے تحریر ہے: "إذا كان المرض في سائر بدنها غير الفرج، يجوز النظر إليه عند الدواء، لأنه موضع ضرورة، وإن كان في موضع الفرج، فينبغي أن يعلم امرأة تداويها، فإن لم توجد، وخافوا عليها أن تهلك، أو يصيبها وجع لاتحتمله يستروا منها لكل شي إلا موضع العلة، ثم يداويها الرجل، ويغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح ... والظاهر ان ينبغي هنا للوجوب" (رد المحتار، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی النظر والمس، ۹/ ۵۳۳) (اگر مرض شرمگاہ کے علاوہ باقی بدن میں ہو تو علاج کے وقت اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے، اس لیے کہ یہ ضرورت کی جگہ ہے، اور اگر مرض شرمگاہ میں ہو تو مناسب ہے کہ کسی عورت کو اس کا علاج سکھادے، اگر کوئی ایسی عورت موجود نہ ہو، اور عورت کے حق میں لوگوں کو اندیشہ ہو کہ وہ ہلاک ہوجائے گی، یا اسے ایسا درد لاحق ہوگا، جسے وہ برداشت نہیں کرسکتی ہے، تو وہ لوگ اس عورت کا ہر حصہ ڈھانک دیں، بیماری کی جگہ کے علاوہ، پھر مرد اس کا علاج کرے، اور جہاں تک ہوسکے اپنی نگاہ نیچی رکھے، سوائے زخم کی جگہ کے......اور ظاہر ہے کہ مناسب ہے، اس جگہ وجوب کے لیے ہے)۔

اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں ظاہر ہوئیں:

۱۔ ہاسپٹل میں ملازمت کرنا درست ہے، اس لیے کہ وہ انسانی خدمت کا ایک اہم ذریعہ ہے، اور انسان کی ایک ضرورت ہے جو کہ مباح ہے۔

۲۔ ہاسپٹل اور اس کی لیبارٹری کی محض آمدنی بڑھانے کے لیے آپریشن یا ٹیسٹ بغیر ضرورت کے لکھنا جائز نہیں ہے، ایسے موقع سے مسلم ڈاکٹر کو خیر امت کے فرد ہونے کی حیثیت سے ہاسپٹل کی انتظامیہ کو انسانیت، ہمدردی، بھلائی کا حکم اور برائی کی ممانعت کرنی چاہئے، اگر انتظامیہ اس کی نصیحت قبول کرلے تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے حرام پر تعاون نہ کرتے ہوئے اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہئے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان (مائدہ: ۲) (اور گناہ اور ظلم وزیادتی کے کام پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یاایها الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل- (نساء: ۲۹) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ)، نیز فرمان الٰہی ہے: "لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون- (بقرہ: ۱۸۸) (کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کرکے ہڑپ سکو، جبکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو)۔

۳۔ ایسے ہاسپٹل میں جو ناجائز طریقہ سے لوگوں کے مال ہڑپ کرتے ہوں ملازمت بدرجہ مجبوری ہی جائز ہے، اور بہتر ملازمت کی تلاش میں رہنا واجب ہے۔

۴۔ مرد ڈاکٹر خاتون مریض کے قابل ستر حصے کا علاج صرف اسی صورت میں کرسکتا ہے جبکہ لیڈی ڈاکٹر دستیاب نہ ہو، یا اس وقت موجود نہ ہو اور تاخیر کی صورت میں اس کی جان کو خطرہ ہو، یا ناقابل برداشت درد سے دوچار ہو، بہرحال ڈاکٹر کا مقصد علاج کرنا ہو، شہوت پرستی اور لذت اندوزی نہ ہو۔

۵۔ خاتون ڈاکٹر مریض مرد کے قابل ستر حصے کا علاج صرف اسی وقت کرسکتی ہے، جبکہ مرد ڈاکٹر موجود نہ ہو، اور تاخیر کی صورت میں مریض کی ہلاکت کا اندیشہ یا برداشت سے باہر درد میں مبتلا ہونے کا گمان غالب ہو۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یاایها الذین آمنوا لا تتبعوا خطوات الشیطان، ومن یتبع خطوات الشیطان، فإنه یأمر بالفحشاء والمنکر" (نور: ۲۱) (اے ایمان والو! تم شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، اور جو شخص شیطان کے نقش قدم پر چلے گا، تو وہ بے حیائی اور برائی ہی کو کہے گا)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشك ان یرتع فیه" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۹۹) (اور جو شبہات میں پڑے گا وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا، جیسے چرواہا جو ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد چرائے تو قریب ہے کہ ممنوعہ چراگاہ میں بھی اس کے جانور چرنے لگیں)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "من کان یؤمن بالله والیوم الآخر فلا یجلس علی مائدة یدار علیها الخمر" (سنن ترمذی حدیث نمبر ۲۸۰۱، مسند احمد حدیث نمبر ۱۲۵ عن عمرؓ، اور یہ حدیث حسن ہے) (جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب کا جام گردش میں ہو)۔

اور "التنویر" میں ہے: "وإن علم أولا" باللعب لایحضر أصلا، سواء کان ممن یقتدی به أولا" (تنویر الابصار مع الدر المختار، کتاب الحظر والاباحۃ، ۹/ ۵۰۲) (اور اگر اسے لہو ولعب کا پہلے سے علم ہو تو ولیمہ میں مطلقاً حاضر نہ ہو، خواہ اس کی پیروی کی جاتی ہو یا نہیں)۔

اور ردالمحتار میں ہے: "ومفاد الحدیث أنه یرجع ولو بعد الحضور" (ردالمحتار، ۹/ ۵۰۲) (اور حدیث پاک سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ لوٹ جائے، خواہ حاضری کے بعد لہو ولعب کا علم ہو)، اور "البحر" میں ہے: "فإن مشاهدة الباطل شرکة فیه" (البحر الرائق، کتاب الشہادات باب الشہادۃ علی الشہادۃ، ومن أقر أنہ شہد زورا...... ۷/ ۲۱۳) (کیونکہ باطل کا مشاہدہ اس میں شرکت ہے)۔

اس تفصیل سے مندرجہ ذیل امور ظاہر ہوئے:

۱۔ ایسے بڑے ہوٹلوں میں جہاں غیر شرعی باتیں پائی جاتی ہیں، جیسے: شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ، اگر ان حرام چیزوں کی فراہمی سے اس کا براہ راست تعلق ہو تو ان میں ملازمت حرام ہے۔

۲۔ اور اگر اس ملازم کا براہ راست تعلق حرام چیزوں کی فراہمی سے نہ ہو، تو ایسی صورت میں ایسے ہوٹلوں میں ملازمت مکروہ تنزیہی ہے، بشرطیکہ دل سے ان منکرات کو برا سمجھے اور شرعی ممنوعات سے دور رہے۔

۳۔ جس صورت میں ملازمت حرام یا مکروہ تحریمی ہے، اس صورت میں ضرورت کی بنیاد پر ہی ملازمت کرسکتا ہے، یعنی اگر یہ ملازمت چھوڑ دے تو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے کھانا، پینا اور رہائش کی بنیادی ضرورت سے محروم ہو جائے گا، اور کوئی دوسرا کام نہ مل رہا ہو، خواہ اس کی تنخواہ ہوٹل سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

خلاصہ بحث:

۱۔ عمل یا ملازمت میں اصل اباحت ہے جبکہ شرعی ضابطے کے دائرہ میں ہو جیسے وہ عمل اپنی ذات کے اعتبار سے مباح ہو، اور آدمی اپنے معاملہ میں شرعی ممنوعات مثلاً، دھوکہ، جھوٹ اور جعل سازی وغیرہ سے بچے۔

۲۔ گناہ پر براہ راست تعاون دینے والے اعمال پر اجارہ درست نہیں ہے۔

۳۔ ہر وہ چیز جو یقین یا گمان غالب کے طور پر معصیت کا سبب بالواسطہ یا بلاواسطہ ہو وہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک حرام ہے، جبکہ صاحبین کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے، اور امام صاحب کے نزدیک اگر بلاواسطہ معصیت کا سبب ہو تو مکروہ تحریمی ہے اور اگر بالواسطہ سبب ہو تو مکروہ تنزیہی ہے۔

☆☆☆
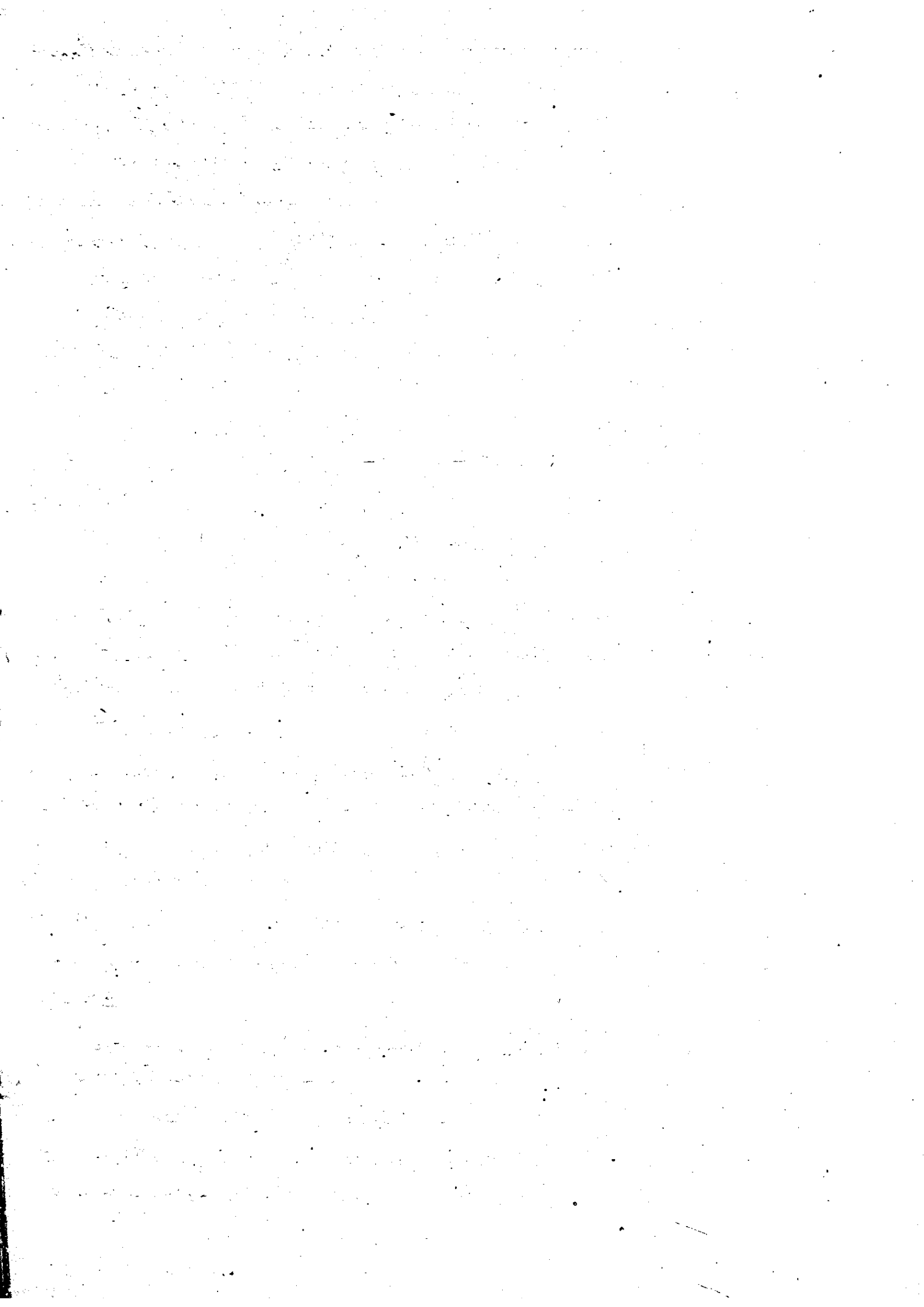
مختلف النوع ملازمتیں اور شرعی احکام ومسائل

مفتی اقبال محمد ٹنکاروی[1]

جواب:۔ ا۔(الف۔ب) چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت کے لیے بڑا مسئلہ جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کے ساتھ ساتھ کچھ معاشی مسائل بھی ہیں، کچھ شعبے ایسے ہیں کہ ان میں بعض دفعہ خلاف شریعت عمل کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، جیسے فوج اور پولیس محکمہ، جہاں حلت وحرمت، منفعت ومضرت جیسے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔

حرمت ومضرت جیسے جور وظلم کرنا اور ظلم ومظلوم کی تحقیق کے بغیر وار کرنا، جس میں بسا اوقات آدمی کا ناحق خون بھی ہوجاتا ہے، اس کی مذمت اور ناحق قتل میں قرآن وحدیث ناطق ہے: قرآن کریم میں فرمایا ہے: "وما کان لمومن ان یقتل مومنا الا خطا، ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاوہ جہنم خلدا فیہا" (النساء: ۹۲، ۹۳) اور حدیث شریف میں ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن لوگوں میں سب سے پہلے خون کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ (مسلم: کتاب القسامۃ، باب المجازاۃ بالدماء فی الآخرۃ) نیز فرمایا: "من سل علینا السیف فلیس منا۔ (مسلم: کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: من حمل علینا السلاح فلیس منا)"۔

(ج) اسی طرح شعبۂ مخبری میں تجسس اور غیبت کا ارتکاب ہوتا ہے؛ حالانکہ اس کی مذمت میں قرآن کریم کا حکم ہے: "ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا۔ (الحجرات: ۱۲) اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں تجسس کرنا اصلاً حرام ہے۔

پھر جب کوئی شخص کافر کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی کرے تو اس کی قباحت اور بڑھے گی، چنانچہ اگر جاسوس مسلمان ہے تو اگر چہ اس کو ذمی یا حربی جاسوس کی طرح قتل نہ کیا جائے پھر بھی اس کو دردناک سزا دی جائے گی اور قید بھی کریں گے، تاکہ وہ اس فعل قبیح سے توبہ کرلے اور باز آجائے، جیسا کہ الموسوعۃ الفقہیہ میں مذکور ہے: "الجاسوس علی المسلمین إما أن یکون مسلما أو ذمیا أو من أھل الحرب ... فإن کانوا من أھل الحرب أو من أھل الذمۃ ممن یؤدی الجزیۃ من الیھود والنصاری والمجوس فأضرب أعناقھم، وإن کانوا من أھل الإسلام معروفین فاوجعھم عقوبۃ واطل حبسھم حتی یحدثوا توبۃ" (مادۃ تجسس: ۱۰/۱۶۵)

(د) اسی طرح محکمۂ عدلیہ میں قرآن وسنت کے خلاف اور دستور ملک کے مطابق قضیے فیصل ہوتے ہیں؛ بلکہ کئی قوانین شریعت اسلامی سے مخالف ہیں، جو مسلمانوں کے حق میں منصفانہ نہیں ہیں، اور اس بارے میں قرآن میں وارد ہے: "وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط، ان اللہ یحب المقسطین" (المائدہ: ۴۲)، اور احکام وفیصلوں میں ظلم وزیادتی اکبر الکبائر ہے: "واما القاسطون فکانوا لجھنم حطبا۔ (الجن: ۱۵)۔

اور حدیث شریف میں ہے: "إن اعی الناس علی اللہ وأبغض الناس إلی اللہ و ابعد الناس من اللہ رجل ولاہ اللہ من أمر أمۃ محمد ﷺ شیئا ثم لم یعدل بینھم"۔ (معین الحکام: الباب الثانی فی فضل القضاء، ص: ۷، ط: دار الفکر)

نیز فرمایا: "عن أبی سعید قال: قال رسول اللہ ﷺ: إن أحب الناس إلی اللہ یوم القیامۃ وأدناھم منہ مجلسا إمام عادل، وأبغض الناس إلی اللہ وأبعدھم منہ مجلسا إمام جائر۔ (ترمذی: کتاب الاحکام، باب ماجاء فی الامام العادل، رقم الحدیث: ۱۳۲۹، ج: ۳، ص: ۶۰۸: مصطفی البابی الحلبی)۔

[1] استاذ تفسیر وفقہ وحدیث ومہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات۔

(ہ) لوگوں کے اموال میں ٹیکس عائد کرنے کی وجہ مصالح عامہ کا قیام ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ فرض کردہ مقدار بقدر ضرورت ہو، اعتدال کے ساتھ لایا گیا ہو، ظالمانہ شرح نہ ہو، تبذیر و اسراف سے بچتے ہوئے اسکو مصالح عامہ میں خرچ کیا جاتا ہو، یہ سب اسلامی اصول ہے، اب ہم ہندوستان میں رائج ٹیکسوں کی کچھ تفصیل دیکھیں۔

ٹیکس مختلف ذرائع سے وصول کیا جاتا ہے، جیسے محصول پیشہ (Professional tax): اگر کوئی شخص کسی شہری حدود میں سال میں ایک مخصوص مدت تک جو کم از کم چھ ماہ ہو کوئی کاروبار کرتا ہے یا جس کام سے اسے آمدنی ہوتی ہے تو انتظامیہ کو اس کا اختیار ہوتا ہے کہ اس شخص سے مذکورہ ٹیکس وصول کرے۔

کسی بھی شخص یا ادارے سے ایک سال میں زیادہ سے زیادہ کتنا محصول پیشہ وصول کیا جاسکتا ہے اس کا تعین دستور ہند کے حوالے سے کیا جاتا ہے، مذکورہ ٹیکس عام طور پر ہر چھٹے ماہ پر وصول کیا جاتا ہے۔

محصول تفریحات (Entertainment tax): سینما، سرکس اور دیگر ویرائٹی شوز تفریح کا وسیلہ ہوتے ہیں اور یہ شہری انتظامیہ کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنتے ہیں، حدود بلدیہ میں ایسی تفریح گاہیں جہاں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہوتا ہے، اس پر مذکورہ ٹیکس عائد کرنے کا اختیار شہری انتظامیہ کو ہوتا ہے، یہ محصول تفریح گاہ میں داخلے کے ٹکٹ کی بنیادی قیمت کے تناسب سے متعین کیا جاتا ہے۔

محصول جائیداد (Property tax): مقامی حکومت، یعنی میونسپل کارپوریشن کا سب سے اہم ذریعہ آمدنی محصول جائیداد ہے، محصول جائیداد زمین کے رقبے اور اس پر تعمیر ڈھانچے کے حساب سے طے کیا جاتا ہے، بڑے شہروں میں جائیداد کا ٹیکس طے کرتے وقت متعلقہ علاقے کی کمرشل ویلیو کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے، اس ٹیکس کی ادائیگی مالک کو ہر سال کرنی پڑتی ہے۔

محصول سواری: ہر مقامی حکومت ان سواریوں پر محصول وصول کرتی ہے جو اسی کی مملکت کے رقبہ میں ہوتے ہیں، لیکن یہ محصول عموماً ریاستی حکومت وصول کرتی ہے اور اس کا ایک حصہ متعلقہ شہری انتظامیہ کو بطور گرانٹ دیتی ہے (جامع اردو انسائیکلوپیڈیا: سماجی علوم، ص: ۳/ ۵۳۸، ۵۳۹؛ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)۔

اور حکومتیں اپنی ضروریات ان ٹیکسوں کے بغیر پوری بھی نہیں کرسکتی، اور چونکہ مرکزی حکومت کے لیے براہ راست آمدنی اول الذکر ٹیکس ہوتا ہے، بقیہ ٹیکسوں کی آمدنی مقامی حکومت میں پہنچتی ہے، اس لئے اول الذکر میں شرح زیادہ رکھی گئی ہے۔

اور مالیات کا صحیح نظام اور آمد و صرف میں توازن ریاست کا اہم عنصر ہے، ارباب سیاست اس سے بخوبی واقف ہیں، اسلام میں یہ مالی نظام ابتدائی زمانہ سے قائم ہے اور جس طرح اسلام نے اس نظام کی سطح بلند کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اسی طرح اس کو ضرورت مندوں اور رفاہی کاموں میں خرچ کرنے میں بھی پس و پیش نہ ہوئے، حتیٰ کہ حاکموں اور گورنروں نے اپنی راحت و عیش کا بھی کوئی خیال نہ کیا۔

اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں پر زائد از ضرورت ٹیکس ظالمانہ شرح کے ساتھ عائد کیا جاتا ہے، پھر مصالح عامہ کے بجائے مصالح خاصہ میں استعمال زیادہ ہے، اور جو کچھ رعیت تک پہنچتا ہے اس میں بھی اپنی پبلی سیٹی کے لیے اور پارٹیوں کے نام سے دیا جاتا ہے جو اسراف و تبذیر سے خالی نہیں ہوتا، اور خود اپنی عیش پرستی میں استعمال کئے جانے سے تو کوئی ناواقف ہی نہیں۔

ہاں! کچھ درجہ میں بذریعۂ گرانٹ لوگوں تک کچھ رقم رفاہی کاموں کے لیے پہنچتی ہے۔

تو یہ تمام مضرتیں اور مشقتیں ان تمام شعبوں میں ہورہی ہے، جب کہ دوسری طرف کچھ فوائد بھی ہیں، جیسے فوج اور پولیس کے محکمہ میں اگر مسلمان ہوں، تو بعض مرتبہ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے بعض اقدامات رو بعمل نہیں ہو پاتے، اور بعض مرتبہ ان محکموں کی طرف سے ہمارے خلاف ہونے والے اقدامات کا قبل از وقت پتہ چل جاتا ہے، اسی طرح شعبۂ مخبری میں بعض مرتبہ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے خفیہ ایجنڈوں سے واقفیت ہوجاتی ہے، نیز مسلمانوں کی ان تمام محکموں میں موجودگی سے بعض مرتبہ ظلم و ستم نہیں ہو پاتا یا کم ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی کچھ فوائد و مصالح ہیں۔

چوں کہ غیر اسلامی ملکوں بالخصوص ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمت کے مواقع محدود ہیں، بڑی انڈسٹریز و کمپنیاں جو ملازمت کے مواقع فراہم کرتی ہیں، وہ بھی غیر مسلموں کے پاس ہے، ملازمت کے مواقع کی محدودیت اور معاشی کفالت کی ضرورت نے مسلمانوں کو بعض ایسی ملازمتوں پر مجبور کیا ہے، جہاں شرعی لحاظ سے ناجائز کاروبار ہوتے ہیں، لہٰذا اصولی طور پر ان مقامات پر مسلمانوں کو ملازمت کرنے کی عام اجازت تو نہیں دی جاسکتی، لیکن دوسری جانب اس کے مقابلہ میں کچھ مصالح ایسے ہیں جن سے بعض مرتبہ پوری ملت اسلامیہ کو فائدہ ہو رہا ہے، انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پھر بھی ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ رزق حلال کے لیے بہتر جگہ اور بہتر ملازمت کا انتخاب کرے اور خدا پر کامل توکل کرے، ہاں! اس کے حاصل کردہ فن کے مطابق مواقع محدود ہیں اور تلاش بسیار کے باوجود اس کو بہتر جگہ ملنا ممکن نہیں ہے، اور وہ سرکاری ملازمتوں کے لیے مجبور ہے، نیز جہاں مسلمان قلیت میں ہیں، وہاں اس بات کی گنجائش ہے کہ اسے ایک کمتر درجہ کی مصیبت سمجھ کر گوارا کریں، اور جیسے ہی مناسب جگہ ملے اسے اختیار کرلے۔

اور اگر وہ اصولی طور پر اس بات کے منوانے کے موقف میں نہیں ہے کہ وہ قرآن وحدیث کو اصل مصدر قانون مان کر ان شعبوں کے قوانین بنائے تو کم از کم اس بات کی کوشش کرے کہ جو قوانین بنائے جائیں، وہ قرآن وحدیث سے متصادم نہ ہو، مثلاً سودی نظام کے خلاف رائے عامہ قائم کرنا، نشہ بندی کے لیے فضاء ہموار کرنا، اس طرح وہ اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق نظام کفر کی مخالفت اور نظام اسلام کی نصرت وحمایت کا فریضہ انجام دینے والے سمجھے جائیں گے۔

لیکن جہاں مسلمان صورت حال کو بدلنے پر قادر نہ ہوں اور کسی نظام وقوانین کی تبدیلی ان کے دائرہ سے باہر ہو تو پھر وہاں دو برائیوں میں سے کمتر برائی گوارا کرلی جائے گی اور مضرت ومصلحت، نیز حاجت وضرورت جیسے اصول پر غور کیا جائے گا۔

ان ملازمتوں میں شرکت کے اس عمل میں دو طرح کے شر یا مفاسد کا تصور کیا جاسکتا ہے: ایک وہ جو شرکت کی بنیاد پر سامنے آتا ہے جیسے ظلم وزیادتی، ناحق خون وقتل، تجسس، غیبت، دوسرا وہ شر ہے جو عدم شرکت کی بنیاد پر سامنے آتا ہے جیسے مسلمانوں کے خلاف ہونے والے ایجنڈوں سے عام واقفیت، شرکت نہ کرنے کی صورت میں مسلمانوں پر کھل کر ظلم وزیادتی، وغیرہ۔

یہ دونوں مفاسد ایک دوسرے سے متعارض ہیں، ایسے میں ضروری ہوگا کہ ان دونوں میں سے جو پہلو غالب ہو اسے ترجیح دی جائے، یعنی جو شر یا مفسدہ زیادہ بڑا، زیادہ دیر تک رہنے والا اور پھیلا ہوا ہو، اسے دور کیا جانا چاہئے اور دوسرے شر یا مفسدہ کو گوارا کرنا چاہئے اور ایسا کرنا مقاصد شریعت کے اسی مذکورہ اہم اور عظیم الشان قاعدے نیز "العبرة للغالب" (غالب پہلو کا اعتبار کیا جائے گا) پر مبنی ہے۔

نیز غیر مسلم ممالک میں مذکورہ ملازمتوں میں شریک ہونے والے مسلمانوں کو بھی کچھ فائدے حاصل ہوجاتے ہیں، لیکن ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ان شعبوں میں موجود خرابیوں کو دل سے برا جانیں اور ہدایات وتعلیمات اسلامی کو اپنے قلوب میں جاگزیں کریں، اسی طرح ان کی نیت وقصد خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، ان ملازمتوں میں شرکت کو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور تشہیر کا ذریعہ نہ بنائے اور مال ودولت اور دنیوی نعمتوں سے سرفراز ہونے کو اپنا مقصد نہ بنائیں، اس کے بجائے اپنی نیتوں کو خالص اور بے آمیز کرنا چاہئے۔

اسی طرح ان ملازمتوں میں شرکت کے نتیجہ میں اکثر مسلمانوں کا فائدہ ہوجاتا ہے اور ظلم وستم میں کمی یا مکمل فائدہ ہوتا ہے۔

اس میں شرکت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصول بھی پیش نظر رکھے، مسلمان ہو یا غیر مسلم، خود کو تو ظلم کرنے سے بچنا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ دوسرا کوئی ظلم وزیادتی کرے تو اس وقت نمایاں کردار ادا کرے، حتی المقدور اصلاح ورہنمائی کا ارادہ کرے اور اس کی کوشش کرے: ان ارید الا الاصلاح ما ستطعت، اور اس اصول کے تحت وہ لوگوں کی اصلاح وہدایت کا ذریعہ بن سکتے ہیں، مفید خیالات کی اشاعت کرے اور لوگوں کے دلوں پر اثر ڈالنے والے اعمال واخلاق اختیار کرے، اس کے نتیجہ میں بہت سے رذائل ومفاسد کا خاتمہ اور پاکیزہ اقدار وفضائل کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

جواب ۔۲: یہ تو سرکاری ملازمتوں پر کچھ وضاحت کی گئی؛ لیکن کچھ ملازمتیں غیر سرکاری ہیں جو محرمات پر مبنی ہیں، وہاں ملازمت کرنا یا کسی طرح کا تعاون

مثلاً اجارہ پر دینا، کمپیوٹر وغیرہ کی مرمت یا اور کسی طرح کا تعاون؛ تو بنیادی طور پر یہ تو ہر ایک جانتا ہے کہ جس پر انسان کی ہر صلاح وفلاح بلکہ خود اس کی زندگی اور بقاء موقوف ہے، وہ مسئلہ ہے باہمی تعاون وتناصر کا، ہر ذی ہوش انسان جانتا ہے کہ اس دنیا کا پورا انتظام انسانوں کے باہمی تعاون وتناصر پر قائم ہے، اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ وہ کتنا ہی عقل مند یا کتنا ہی زور آور یا مالدار ہو، اپنی ضروریات زندگی کو تنہا حاصل نہیں کر سکتا، اکیلا انسان نہ اپنی غذا کے لیے غلہ اگانے سے لے کر کھانے کے قابل بنانے تک کے تمام مراحل طے کر سکتا ہے، نہ لباس وغیرہ کے لیے روئی کی کاشت سے لے کر اپنے بدن کے موافق کپڑا تیار کرنے تک بے شمار مسائل کا حل کر سکتا ہے اور نہ اپنے بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتا ہے، غرض ہر انسان کے مرنے سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک سارے مراحل بھی اسی تعاون کے محتاج ہیں؛ بلکہ اس کے بعد بھی اپنے پیچھے رہنے والوں کو دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا محتاج رہتا ہے۔

حق جل شانہ نے اپنی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ سے جہاں کا ایسا محکم نظام بنایا ہے کہ ہر انسان کو ایک دوسرے کا محتاج بنا دیا، غریب آدمی پیسوں کے لیے مالدار کا محتاج ہے، تو بڑے سے بڑا مالدار بھی محنت ومشقت کے لیے غریب مزدور کا محتاج ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری دنیا کا نظام باہمی تعلق پر قائم ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت: ۲ میں قرآن حکیم نے تعاون وتناصر کا معقول اور صحیح اصول بتلایا ہے: ”تعاونوا علی البر والتقوی، ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ یعنی نیکی اور خدا ترسی پر تعاون کرو، بدی اور ظلم پر تعاون نہ کرو۔

غور کیجیے! اس میں قرآن کریم نے یہ عنوان بھی اختیار نہیں فرمایا کہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ تعاون کرو اور غیروں کے ساتھ نہ کرو؛ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کی جو اصل اور بنیاد ہے، یعنی نیکی اور خدا ترسی کو تعاون کرنے کی بنیاد قرار دیا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف یا ظلم وجور کی طرف چل رہا ہو، تو ناحق اور ظلم پر اس کی بھی مدد نہ کرو، بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ناحق اور ظلم سے اس کا ہاتھ روکو، کیونکہ درحقیقت یہی اس کی صحیح امداد ہے تا کہ ظلم وجور سے اس کی دنیا اور آخرت تباہ نہ ہو۔

(الف)۔ ان غیر سرکاری اداروں میں سے ایک بینک ہے، یہ ایک ایسے تجارتی ادارے کا نام ہے؛ جو لوگوں کی رقمیں اپنے پاس جمع کر کے تاجروں، صنعت کاروں اور دیگر ضرورت مندوں کو قرض فراہم کرتا ہے، آج کل روایتی بینک ان قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں اور اپنے امانت دار کو کم شرح پر سود دیتے ہیں اور سود کا درمیانی فرق بینکوں کا منافع ہوتا ہے۔

(ب)۔ دوسرا ادارہ انشورنس کمپنی ہے، یہ بھی آج کل کاروبار کا بڑا حصہ بن گیا ہے، کوئی بھی بڑی تجارت اس سے خالی نہیں، بیمہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مستقبل میں جو خطرات درپیش ہیں، کوئی انسان یا ادارہ یہ ضمانت لیتا ہے کہ فلاں قسم کے خطرات کے مالی اثرات کی میں تلافی کروں گا۔ (اسلام اور جدید معیشت وتجارت: ۲۴۳/۷، ۲۸۸، ط: فیصل بک ڈپو، دیوبند)

جس خطرات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے، ان خطرات کے لحاظ سے بیمہ کی تین بڑی قسمیں ہیں: (۱) تأمین الاشیاء (Goods Insurance)، (۲) تأمين المسئولية (Third Party Insurance)، (۳) تأمين الحياة (Life Insurance)۔

بیمہ کے طریقہ کار اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے تین قسمیں ہیں:

(۱)۔ التأمين الاجتماعي: گروپ انشورنس (Group Insurance) اس کی بے شمار صورتیں ہیں، اس لیے ان تمام پر اجمالی حکم لگانا مشکل ہے۔

(۲)۔ التأمين التبادلي: (Mutual Insurance) ابتداء بیمہ کی یہی شکل چل رہی تھی، اور شرعاً اس میں کوئی اشکال نہیں، اور جتنے علمائے کرام نے بیمہ پر گفتگو کی ہے، وہ اس کے جواز پر متفق ہیں۔

(۳) التأمين التجاري: (commercial Insurance) بیمہ کی اس قسم کا رواج زیادہ ہے، اسی کا شرعی حکم علمائے کرام کے درمیان زیادہ محل

بحث بنا ہوا ہے، ...... اس وقت علمائے اسلام میں تقریباً تمام مشاہیر علماء کرام اس کی حرمت کے قائل ہیں، البتہ مشاہیر میں سے صرف دو اس کے جواز کے قائل ہے، شیخ مصطفیٰ رزقاء اور شیخ علی الخفیف، جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس میں قمار بھی ہے اور ربا بھی۔ (حوالہ مذکورہ: ۷/ ۲۹۰)۔

اسی طرح کچھ کاروبار میں ضمنی طور پر حرام کام ہوتے ہیں، جیسے وکالت، طبابت وغیرہ کہ اصل مقصد حرام کاروبار نہیں ہے؛ لیکن اس میں کچھ صورتیں ایسی ہے جو حرام ہیں، اب ہم ان تمام کی مذمت میں آیات واحادیث اور عبارات فقہاء ذکر کرتے ہیں، تاکہ مسئلہ کی وضاحت ہوسکے۔

سود کی بابت مختلف احادیث ہیں؛ اس میں سے ایک روایت میں فرمایا:

''عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ ﷺ آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء۔

(مسلم: كتاب المساقاة، (۱۹) باب لعن آكل الربا ومؤكله، رقم الحديث ۱۰۶/ ۱۵۹۸، ص: ۶۹۱، ط: دار ابن حزم، بيروت)''

(ج) شراب کے باب میں بھی مفصل حدیث مذکور ہے: ''عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنه يقول؛ قال رسول اللہ ﷺ: لعنت الخمر على عشرة اوجه: بعينها وعاصرها ومعتصرها وبائعها ومبتاعها وحاملها والمحمولة اليه وآكل ثمنها وشاربها وساقيها۔ (ابن ماجه: كتاب الاشربة، باب التجارة فی الخمر، رقم الحديث: ۳۳۸، ص: ۲/ ۲۱۴، ط: دار الفكر، بيروت)''

مذکورہ بالا احادیث سے ان حرام کاموں میں بواسطۂ تعاون شرکت کرنے والے پر بھی لعنت کی گئی ہے، اور قرآن کریم میں بھی صراحۃً بیان کیا گیا:

"وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (المائدہ: ۲)۔ اس آیت کریمہ میں قرآن حکیم نے ایک ایسے اصولی بنیادی مسئلہ کے متعلق ایک حکیمانہ فیصلہ دیا ہے، جو پورے نظام عالم کی روح ہے، چنانچہ حضرات فقہائے کرام میں سے امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ عدم جواز کے قائل ہیں، "ولا يجوز استئجار كاتب ليكتب له غناء ونوحا؛ لانه انتفاء بمحرم، وقال ابوحنيفة رحمه الله تعالى: يجوز۔"

"ولا يجوز الاستئجار على حمل الخمر لمن شربها ولا على حمل الخنزير، وبهذا قال ابويوسف، ومحمد والشافعي، وقال أبو حنيفة: يجوز، لأن العمل لا يتعين عليه بدليل انه لو حمل مثله جاز (الموسوعة الفقهية: ۱/ ۱۰۷، ۱۰۸، مادة الاجارة، ط: دار الصفوة، مصر، المحيط البرهاني فی الفقه النعماني: كتاب الاجارة، الفصل الخامس عشر فی بيان ما يجوز من الاجارات ومالا يجوز، ص: ۹/ ۱۸۸، ط: احياء التراث العربي، بيروت)"

میری رائے میں بینک میں جو سودی نظام رائج ہے اس کا تعلق بینک کے اسٹاف سے نہیں ہوتا ہے، یہ سودی نظام تو بینک کے کاروبار کا ایک اٹوٹ حصہ ہے، یہ سودی نظام ہمارے پورے معاشی ڈھانچے کا ایسا جزو لاینفک بن چکا ہے کہ اس سے فرار ممکن نہیں، اسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے:

"ليأتينّ على الناس زمان لايبقى منهم أحد إلا أكل الربا فمن لم يأكله أصابه من غباره۔"

لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا جبکہ کوئی ایسا نہیں بچے گا جو سود نہ کھاتا ہو، اگر وہ سود نہیں کھاتا تو اس کی دھول سے نہیں بچ سکتا یعنی کچھ نہ کچھ سود وہ ضرور کھائے گا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

یہ ایسی صورت حال ہے کہ بینک کے کسی اسٹاف کے نوکری چھوڑ دینے سے اس سودی نظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اس پر اثر اس وقت پڑ سکتا ہے جب پورا معاشرہ مل کر اس کے خلاف کچھ کرے، یکبارگی تو اس نظام کو بدلنا ممکن نہیں، البتہ دھیرے دھیرے اس نظام کو بدلنے کی پوری کوشش ہونی چاہئے، اسلام کا قانون بھی یہی کہتا ہے کہ معاشرے میں کسی برائی کی اصلاح دھیرے دھیرے اور بہ تدریج ہو، چنانچہ اللہ نے جب شراب حرام کی تو یکایک حرام قرار نہیں دیا بلکہ بہ تدریج اس کی حرمت کا اعلان کیا۔

بہر حال مسلم معاشرے کے ہوشمند افراد کا فرض ہے کہ سودی نظام کو اسلامی اقتصادی نظام میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور یہ کام کوئی ناممکن بھی نہیں ہے۔

اگر ہم مسلمانوں کو بینک کی نوکری سے منع کردیں۔گے تو صورت حال یہ ہوگی کہ بینک میں یہودی، عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کا غلبہ ہوجائے گا، خصوصاً کسی مسلم ملک کے بینکوں پر غیر مسلموں کا قبضہ ہوجائے تو جو خطرناک نتائج ہوں گے ان کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ بینک میں سارا کا سارا سودی کاروبار ہوتا ہو، بینک میں حلال طریقہ سے تجارت بھی ہوتی ہے، اب تو صورت حال یہ ہے کہ سودی کاروبار کم ہی ہوتا ہے اور بینک کے زیادہ تر کاروبار حلال تجارت پر مشتمل ہوتے ہیں۔

اس لیے میری رائے میں بینک کی نوکری کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے خواہ اس کا ضمیر اس پر مطمئن نہ ہو، البتہ اس بات کا لحاظ رہے کہ بینک میں اپنے فرائض وہ بخوبی انجام دے ایسا نہ کرے کہ ضمیر کی بے اطمینانی کی وجہ سے اپنی ذمے داریوں میں کوتاہی کرے۔

آخر میں میں کہنا چاہوں گا کہ انسان کی زندگی میں ایسے حالات بھی آتے ہیں کہ انسان بہت کچھ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے اور اسلام نے انسانی مجبوری کی مکمل رعایت کی ہے، اسی مجبوری کے تحت بسا اوقات انسان بینک کی نوکری اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے، ایسی حالت میں ہم اسے ایسا کرنے سے منع نہیں کرسکتے، اللہ کا فرمان ہے:

"فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ ان اللہ غفور رحیم" (البقرۃ: ۱۷۳)۔

(پس جو شخص مجبور ہو اس کے لیے لیکن نہ اس کی خواہش رکھتا ہو اور نہ دوبارہ ایسا کرنا چاہتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بیشک اللہ غفور الرحیم ہے)۔

(فتاویٰ یوسف القرضاوی، باب (۱۱) اجتماعی معاملات، ص: ۱/ ۲۹۳-۲۹۵، ط: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی)۔

اسی تفصیل اور ماقبل کی وضاحت کی روشنی میں خلاصۂ بحث میں جوابات عرض کئے جائیں گے۔

جواب۔ ۳: (الف۔ھ) اسلام نے اپنے خاص مزاج کے مطابق اعتدال و توازن قائم کیا ہے اور اس کے لیے دین و مذہب اور عبادت و بندگی کے مفہوم میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر کے انسانیت کو متوازن اور فطرت سے ہم آہنگ تصور حیات عطا کیا ہے، انسانی جسم اللہ کی امانت اور اس کی فطرت خالق کائنات کا عطیہ ہے، اس لیے مناسب حدود میں اس کی رعایت اور حفاظت خالصۃً مذہبی عمل ہے۔

ایک مسلمان مسجد میں ہو یا گھر میں، بازار میں ہو یا کارخانوں میں بہر کیف بہر طور اگر خدا کی مقدر کی ہوئی حلال طیب رزق کی تلاش مقصود ہو اور خدا کے واجب کئے ہوئے حقوق کی ادائیگی پیش نظر ہو اور ہر موقع اور ہر گام پر خدا کے عدول حکمی سے بچتا ہو، اسی کی رزاقیت پر بھروسہ ہو تو وہ عین حالت عبادت میں ہے اور ایک کار دین میں مشغول ہے۔ (حلال وحرام: باب: ۱۰، ص: ۳۳۶، ۳۳۷)۔

لہٰذا مسلمان رزق حلال وطیب کی تلاش کو ترجیح دے، اور حتی المقدور اور حتی الوسع مشتبہ رزق سے بھی بچنے کی کوشش کرے، چونکہ آج کل معاشی اخراجات پورے کرنے کے لیے آدمی مختلف جگہوں پر ملازمت اختیار کرتا ہے تو بعض مرتبہ وہ ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں ناجائز یا حرام امور کی انجام دہی ہوتی ہے، جیسے ہوٹلوں میں؛ کیونکہ بعض ہوٹلوں میں شراب وخنزیر کی خرید وفروخت ہوتی ہے، اسی طرح بعض سپر مارکیٹ، جہاں مختلف ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ شراب کا بھی ایک شعبہ ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ قرآن واحادیث میں اعانت علی المعصیت کو ممنوع قرار دیا ہے، بلکہ بعض احادیث میں اس کی قربت سے بھی منع کیا ہے، جیسے ایک حدیث میں فرمایا: "من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلایقعدن علی مائدۃ یدار علیھا بالخمر" (مسند احمد: ۱/ ۲۰، ۳/ ۳۳۹، ط: دار اصادر)۔

اس سے پہلے شراب کی وجہ سے "۱۰/ قسم کے لوگوں پر لعنت" کی حدیث گذر چکی ہے، اس کی شرح کرتے ہوئے مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں: جب شریعت کی مصلحت شراب کو حرام کرنے اور اس کو گمنام کرنے میں ہے اور اس بارے میں فیصلہ نازل ہوگیا تو اب ضروری ہے کہ ہر اس چیز سے روکا جائے جو اس کے معاملے کو بڑھائے، لوگوں میں اس کو رواج دے اور لوگوں کو اس پر ابھارے؛ کیونکہ اس سلسلہ میں ذرا سی بھی حصہ داری مصلحت شرعی کے مناقض اور حکم شرعی کے ساتھ دشمنی کرنا ہے؛ چنانچہ مذکورہ حدیث میں ایسے تمام حصہ داروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار بھیجی گئی ہے (رحمۃ

اللہ الواسعۃ: معیشت، باب: ۲، مطعومات و مشروبات، ص: ۵ / ۴۹۰، ط: مکتبہ حجاز دیوبند)۔

کچھ ہوٹلوں میں خنزیر اور حرام غذا کا انتظام ہوتا ہے؛ جبکہ قرآن نے اس کے بارے میں فرمایا:

"حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر ... الخ" (المائدۃ: ۳)۔

پھر ہوٹل اور اس جیسی عام جگہوں میں اس طرح کی چیزیں اور موسیقی ورقص نیز گانے کی محافل محض لوگوں کو فریفتہ کرتے ہوئے اپنے دوکانوں میں لانے کے لیے ہوتا ہے، جب کہ عیش وعشرت کا یہ سامان ڈھیروں مال خرچ کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اور مال بھی آسانی سے بدست نہیں آسکتا، بلکہ شب وروز محنت درکار ہوتی ہے، ایسی صورت میں آخرت کی تیاری کے لیے وقت بھی نہیں رہتا، اس لیے ضروری ہے کہ "مغضوب علیھم" کی ان عادات واطوار کی مخالفت کی جائے، رقص وموسیقی کی قباحت بھی سیمینار کے دوسرے سوال میں آچکی ہے۔

لہٰذا اگر یہ ہوٹل، شوپنگ مال، بگ بازار، سپر مارکیٹ وغیرہ مسلمان کا ہے تو اس کے لیے تو یہ چیزیں جائز ہی نہیں؛ بلکہ حرام ہے، حدیث میں ہے:

"عن بن عمر رضی اللہ عنه: الخمر حرام وبیعها حرام وثمنها حرام (مسند الفردوس للدیلمی: باب الخاء، رقم الحدیث: ۲۰۱۷، ص: ۲/ ۲۰۶، ط: دارالباز، مکه مکرمه)۔"

"ولو کان حراما لعینه کبیع الخمر والخنزیر لمنعوا عنه فی المواضع کلها ... لأنه حرام لعینه، ألاتری أنه لووجد من المسلم کان حراما ومعصیة، وهم منعوا عن إظهار المعاصی فی دارالاسلام۔ (المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی: کتاب الاستحسان والکراهیة: الفصل فی معامله اهل الذمة، ص: ۲/ ۱۰۶، ط: داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان)۔"

ہاں! اگر مالک غیر مسلمان ہے تو ان کے لیے یہ اشیاء حرام نہیں ہیں، کیونکہ ان کے لیے شراب ایسا ہی ہے جیسے ہمارے لیے سرکہ، اسی طرح دیگر اشیاء محرمہ۔

ابن نجیمؒ فرماتے ہیں: "والبیع فی الوجه الثانی صحیح، فملك البائع الثمن؛ لأن الخمر مال متقوم فی حق الکافر، فجاز له الأخذ بخلاف المسلم۔" (البحر الرائق: کتاب الکراهیة، فصل فی البیع، ص: ۸/ ۲۰۱، ط: سعید کمپنی، کراچی)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

ایک مسلمان کے لیے غیر مسلم کے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مسلمان شراب پلانے یا خنزیر یا دوسرے محرمات کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے کا عمل نہ کرے، اس لیے کہ شراب پلانا، اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا حرام ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لعن الله الخمر وشاربها وساقیها وبائعها ومبتاعها وعاصرها وحاملها والمحمولة إلیه، (ابوداؤد، کتاب الاشربة، باب العنب یعصر للخمرة، حدیث نمبر: ۳۶۷۴، ص: ۳۲۶، ج: ۳)۔"

امام مسلمؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول مرفوعاً نقل کیا ہے: "ان الذی حرم شربها حرم بیعها۔"

(جس ذات نے شراب پینے کو حرام قرار دیا ہے، اسی ذات نے اس کی خرید وفروخت بھی حرام قرار دی ہے)۔

اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے:

عبدالرحمٰن بن وعلہ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں ہمارے پاس انگور کے باغات ہیں اور ہماری آمدنی کا بڑا ذریعہ شراب ہی ہے، اس کے جواب میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر شراب کی ایک مشک بطور ہدیہ کے پیش کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا: جس ذات نے اس کے پینے کو حرام قرار دیا ہے، اس کی خرید وفروخت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ (مسند احمد، ۱/ ۲۴۴)۔

مندرجۂ بالا احادیث سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ شراب کی تجارت بھی حرام ہے اور اجرت پر اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جانا یا پلانا سب حرام ہے اور حضرت ابن عباسؓ کے فتوی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر کسی علاقے میں شراب بنانے اور اس کی خرید وفروخت کا عام رواج ہو، وہاں بھی کسی مسلمان کے لیے حصول معاش کے طور پر شراب کا پیشہ اختیار کرنا حلال نہیں۔

اور میرے علم کے مطابق فقہاء میں سے کسی فقیہ نے بھی اس کی اجازت نہیں دی (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ص: ۴/ ۴۸-۵۰)۔

لیکن مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے ایک سوال کا جواب تحریر کرتے ہوئے فرق کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ کارخانہ اگر مسلمان کا ہے تو اس کی یہ سب ملازمتیں حرام ہیں، موٹر وغیرہ کے ذریعہ لے جانا اور مزدوری لینا بھی حرام ہے۔

اگر یہ کارخانہ کافر کا ہے تو یہ ملازمتیں مکروہ تحریمی ہیں، شراب کی بیع وملازمت وغیرہ میں مسلم اور کافر کا حکم یکساں نہیں، بلکہ علیحدہ علیحدہ ہے:

"عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: لعن رسول اللہ ﷺ فی الخمر عشرة: عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة الیه وساقیها وبائعها وآکل ثمنها والمشتری لها والمشتری له۔ رواه الترمذی وابن ماجه"

مگر شراب بنانے کی ملازمت بہرحال حرام ہے:

"وجاز حمل خنزیر بنفسه وبدابته بأجر، لاعصرها لقیام العصیة بعینه۔ (درمختار) قال الزیلعی: وهذا عنده؛ وقال: وهو مکروه، زاد فی النهایة: وهذا قیاس، وقولهما استحسان۔ ثم قال الزیلعی: وعلی هذا الخلاف لو آجره دابته ینقل علیه الخمر۔ ولعل المراد ههنا عصر العنب علی قصد الخمریة، فإن عین هذا الفعل معصیة بهذا القصد، ولذا أعاد الضمیر علی الخمر، مع أن العصر للعنب حقیقة، رد المحتار ملخصا" (فتاویٰ محمودیه: بقیة کتاب الاجازة، باب الاستیجار علی المعاصی، ص: ۱۷/ ۱۱۸، سوال نمبر: ۸۲۴۴، ط: ادارۂ صدیق، ڈابھیل)۔

مفتی محمد تقی صاحب نے بیع کے بارے میں ایک جامع اصول بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

حضرت عائشہؓ نے جو کپڑا خریدا تھا اگرچہ اسے دیکھ کر آپ ﷺ نے تصویر کا حکم بیان فرمادیا اور تصویر کے بارے میں ناگواری کا اظہار بھی فرمادیا، لیکن حضرت عائشہؓ نے جو بیع کی تھی اس کو فسخ کرنے کا حکم نہیں دیا، معلوم ہوا کہ جس چیز پر تصویر ہو اس کی بیع ناجائز نہیں، کیوں ناجائز نہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ بیع کے بارے میں یہ اصول ہے کہ جس شئی کا کوئی جائز استعمال ممکن ہو اس کی بیع جائز ہے؛ چاہے وہ چیز عام طور سے ناجائز کام میں استعمال ہوتی ہو، یعنی اب یہ مشتری کا کام ہے کہ اس کو جائز مقصود کے لیے استعمال کرے۔

یہاں جو تصویر والا کپڑا ہے اس کا ایک جائز استعمال بھی ممکن ہے، اس جائز استعمال کی وضاحت اسی حدیث کے بعض طرق میں ہے (جو بخاری میں بھی دوسری جگہوں میں آئی ہے)۔

وضاحت یہ ہے کہ بعد میں حضرت عائشہؓ نے حضور اقدس ﷺ کے ایماء پر اس کپڑے کا گدا بنالیا تھا اور گدے میں اس کو استعمال کیا۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل، ص: ۴/ ۱۷، مکتبہ فیصل دیوبند)۔

(ب)۔ دوسرا شعبہ ان تعلیم گاہوں میں تدریس کا ہے جہاں سے علم وحکمت کے چشمے پھوٹتے ہیں، جہاں روشنی اور تاریکی میں امتیاز کا درس دیا جاتا ہے، جہاں دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے، عزت وعظمت کردار کا سبق پڑھایا جاتا ہے، لیکن دور جدید میں جہاں بہت سی چیزوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے حیرتناک طریقہ پر ترقیاں ہوئی ہیں، وہیں فواحش ومنکرات اور تہذیب واخلاق کے گرتے ہوئے معیار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

آج کل ان عصری تعلیم گاہوں میں مخلوط تعلیم کا نظام ہے، پھر مدرسین ومعلمین کی مخاطب نوجوان، بالغ ومشتہات لڑکیاں ہوتی ہیں؛ اسی طرح بعض مرتبہ نوجوان لڑکوں کی ابتدائی معلمہ نوجوان وبالغہ ہوتی ہے، یہ سب جدید سہولیات کی دین اور سائنسی وذرائع مواصلات کی ترقیات کی مرہون منت

ہے۔

مسلمانوں کا اخلاقی فریضہ یہ ہے کہ وہ اعلیٰ فنی تعلیم کا نظم کریں اور کوشش کریں کہ اپنی ماتحتی میں ایسی عصری تعلیم گاہیں قائم کریں جو ایسے مواصلاتی نظام، اخلاقی، معاشرتی اور تہذیبی گراوٹوں اور لعنتوں سے پاک ہو۔

حدیث میں ہے: "خير صفوف الرجال أولها وشرها آخرها وخير صفوف النساء آخرها وشرها أولها۔(مسلم: كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف واقامتها، ص:۱۸۸، رقم الحديث ۱۳۲، ط: دارابن حزم، وابوداود: كتاب الصلوة، باب صف النساء وكراهية التأخير عن الصف الاول، ص:۱/ ۳۰۹، رقم الحديث: ۶۷۸، ط: دارابن حزم)۔"

جب نماز جیسی اجل العبادات میں اختلاط سے روکتے ہوئے ان کو پیچھے اور مردوں کو صفوف اولیٰ میں رکھا ہے تو دوسرے شعبہ جات میں بات واضح ہے۔

پھر اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ان کی درس گاہیں الگ نہ ہوں تو اسی درسگاہ میں طلبہ آگے اور طالبات پیچھے رہیں۔

رہا مسئلہ ان کی تعلیم وتدریس کا، تو اگر ہم جنس کا انتظام نہ ہو، اور مجبوری نے عورت کے قدم جکڑے ہوئے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرعی پردہ کی مکمل رعایت کرے، لباس مردوں کے لیے باعث کشش نہ ہو، خوشبو کے استعمال سے پرہیز ہو، اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی کی نوبت نہ آئے (ملخصا) (خواتین کی ملازمت اور اسلامی تعلیمات: ص:۱۷، ایفا پبلیکشنز)

نیز وہاں بھی وہ فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ترک نہ کرے، اور زبان میں شیرینی نہ ہو۔

شیخ مصطفیٰ السباعی فرماتے ہیں: "وأما مراقبة السلطة التنفيذية، فإنه لا يخلو من ان يكون أمرا بالمعروف ونهيا عن المنكر، والرجل والمرأة في ذلك سواء في نظر الاسلام، يقول الله تعالى: والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض، يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر۔

... فرعاية الأسرة توجب على المرأة أن تتفرغ لها ولا تشتغل بشئ عنها۔ واختلاط امرأة بالأجانب عنها محرم في الإسلام وبخاصة الخلوة مع الأجنبي، وكشف المرأة من غير ما سمح الله يكشف وهو الوجه واليدان محرم في الاسلام۔

... فنحن لا نتكلم الآن فيمن تضطرها حالتها المادية للعمل خارج بيتها فذلك جائز قطعا بشرط المحافظة على آداب الاسلام في ذلك كأن ... لا تبدى زينتها لهم وأن لا تعطخهم في نفسها بمعسول القول أو مشبوه التصرف" (المرأة بين الفقه والقانون، باب حق النيابة والعمل، ص:۱۲۵، ۱۳۷، ط: دارالوراق، بيروت)۔

نیز مرد کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ضرورت کے بقدر ہی نگاہیں اٹھائے۔

عبدالوہاب عبدالسلام طویلہ فرماتے ہیں: "عند فقد من يعلم من النساء وفقد محرم، وتعذر التعليم من وراء حجاب، يجوز النظر إلى المرأة الأجنبية من أجل تعليم واجب أو مندوب أو علم يحتاج إليه من الصنائع ونحوها؛ شريطة ألا ينتج عن ذلك خلوة كحضور أكثر من امرأة ويكون النظر بقدر الضرورة. [معزيا للانتفاع والسراج الوهاج ومغني المحتاج ونهاية المحتاج]" (فقه الالبسة والزينة: الباب الاول ستر العورة والالبسة المفروضة الفصل الثالث احكام متفرقة تتعلق بالعورة، ص: ۱۰۴، ۱۰۵، ط: دارالسلام القاهره)

(ج) وکالت کے اصل معنی حوالہ کرنے اور دوسرے پر اعتماد کرنے کے ہیں، اسی سے وکیل کا لفظ ماخوذ ہے، اصطلاح میں وکالت یہ ہے کہ آدمی کسی متعین تصرف میں دوسرے شخص کو اپنا قائم مقام بنادے: "إقامة الإنسان غيره مقام نفسه في تصرف المعلوم" گویا وکالت اپنا اختیار

دوسرے کو سونپنے سے عبارت ہے (قاموس الفقہ: مادہ وکالت، ص: ۵/ ۳۰۹، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

چونکہ محکمہ عدلیہ میں قضیے ملک کے دستور قوانین کے مطابق فیصل ہوتے ہیں، اور ہر آدمی اچھی طرح بات کرنے، دفاع و مطالبات پر قادر نہیں ہوتا، اس لیے اب مروجہ طریقہ ہر عدالت میں وکالت کا ہے۔

البتہ وکیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ سچے مقدمات کی پیروی کرے، اور خصوصاً جب اس کو علم ہو جائے کہ اسکا موکل جھوٹا ہے، یا ظالم ہے یا حقیقت امر بیان کرنے میں کذب بیانی سے کام لے رہا ہے، ورنہ وہ آمدنی مشکوک و مشتبہ ہوگی۔

مشہور حسن محمود سلمان تحریر فرماتے ہیں: "ان الدفاع عن الموكل الظالم لعرض ظروف ارتكابه الجريمة ليخفف عنه في الحكم جائز ومشروع، إذا تحققت هذه الشروط:"

(۱) ألا يخالف التخفيف الذى يطالب به المحامى شرعه الله عزوجل۔

(۲) أن يقربما مرمن نوع الخصومة۔

(۳) أن يقربشيي معقول يناسب الدعوىٰ۔

(۴) ألا يقر لشخص بينه وبينه مايوجب التهمة كصديقه، وقريبه أونحو ذلك۔

(۵) أن يبين جنس ما يقربه وقدره لعظم الضرر عند الاطلاق وكثرة الضرر والا فلم يصح۔ هذا هو الحكم الشرعى الراجع في الجواب على هذا السوال۔ والله اعلم۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ فرماتے ہیں: جھوٹے مقدمات کی پیروی سے جو آمدنی حاصل ہوگی، وہ حرام ہے، بشرطیکہ وکیل کو علم جھوٹے ہونے کا ہو، وکیل جو اپنے علم کے موافق سچے مقدمات کی پیروی کرے ایسے پیشے کی حلت میں کچھ شبہ نہیں ہے، بس پیشہ وکالت تو دراصل درست ہے، لیکن جو آمدنی اس میں خلاف شریعت طریق سے حاصل ہوگی وہ آمدنی حرام ہوگی۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: کتاب الاجارات، سوال نمبر: ۱۲۲۷، ص: ۱/ ۶۳۸، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند)۔

حضرت حکیم الامت مجدد ملت فرماتے ہیں: سب سے سہل تر توجیہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ حرمت استیجار مخصوص ہے، طاعت مختصہ بالمسلم کے ساتھ، اور نصرت مظلوم منجملہ طاعات عامہ کے ہے، بس اس میں اس حرمت کا حکم نہ کیا جاوے گا، حاصل یہ ہے کہ پیشۂ وکالت فی نفسہ جائز ٹھہرا، مگر شرط یہ ہے کہ سچے مقدمات لیتا ہو۔ (امداد الفتاویٰ: کتاب الحوالہ، ص: ۳/ ۳۲۰، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند)۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جس طرح دیگر شعبہ جات میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، اسی طرح پیشہ وکالت میں بھی کافی تبدیلیاں آئیں اور اخلاقی انحطاط کا اثر اس شعبہ پر بھی بہت زیادہ پڑا، اس کا محرک اس پیشہ میں پائی جانے والی بدعنوانیاں بھی تھیں کہ جس کے نتیجے میں عوام کا اعتماد اس پیشہ سے اٹھ گیا، اور جس پیشہ کی بدولت دنیا میں خدمت خلق، انصاف کا قیام اور ظالم کی پکڑ جیسے عناصر شامل تھے وہ سب آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے چلے گئے۔

لہٰذا ایک وکیل کی اخلاقی و دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے پیشہ میں ان باتوں کو ضرور مدنظر رکھے:

(۱) (اگر موکل ظالم ہے، لہٰذا اس کی سزا میں) ظالم موکل کی جانب سے وکالت کرنا کہ اس کی سزا میں تخفیف کی جائے چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے ورنہ جائز نہ ہوگا:

(الف) ایسی تخفیف کا مطالبہ نہ ہو جو شریعت کے خلاف ہو، لہٰذا ضروری ہے کہ وکیل اپنے تئیں سچا و مخلص ہو۔

(ب) جو جرم کیا ہے اس کا اقرار کرتا ہو۔

(ج) دعویٰ و مقدمہ سے متعلق اگر کوئی مناسب حقیقت پیش کی جائے اور وہ معقول بھی ہو تو اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہ کرتا ہو۔

(د) وکیل کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملزم اور اس کے رشتہ دار دوست وغیرہ سے متعلق کسی ایسی چیز کا اقرار نہ کرے جو تہمت انہیں بھی متہم بنا سکتی ہو۔

(ھ) ملزم نے جس چیز کا اقرار کیا اس کی جنس اور قدر کو واضح کرے، کہ اس کی وجہ سے ہونے والے نقصان کا اندازہ لگایا جاسکے۔

(۲) جس طرح ایک مسلمان شخص مسلمان کا وکیل بن سکتا ہے اسی طرح غیر مسلم شخص بھی مسلمان کا وکیل بن سکتا ہے، یعنی دین کا متحد ہونا وکالت کی صحت میں ضروری نہیں ہے، البتہ ایک قابل مسلمان وکیل کے ہوتے ہوئے غیر مسلم کو ترجیح دینا بہتر نہیں ہوگا۔

(۳) چونکہ ایک وکیل اپنی صلاحیتوں اور وقت کو کسی امر کے لیے خرچ کرتا ہے، لہٰذا اس کے لیے اپنے موکل سے فیس لینا جائز ہے؛ لیکن اس میں وکیل کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ دیانتداری اور تعاون علی البر کو مدنظر رکھ کر فیس طے کرے، تاکہ نظام انصاف میں خلل نہ پڑے۔

اب یہ دیکھیں کہ مقصد وکالت کے بدل جانے کی وجہ سے اس پر مرتب ہونے والے حکم میں بھی تبدیلی آجاتی ہے؛ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

(الف) وکیل اپنے موکل کا دفاع کررہا ہو جبکہ اسے پتہ ہو کہ وہ جھوٹا ہے اور فریق مخالف ہی حق پر ہے، ایسی صورت میں وکالت کرنا حرام ہوگا۔

(ب) موکل ایسا شخص ہو جو اپنی کذب بیانی، دھوکہ دہی وغیرہ میں مشہور ہو، تو ایسے شخص کی طرف سے وکالت کرنا جائز نہیں ہوگا، ورنہ جائز ہوگا۔

(ج) موکل ایسا شخص ہو جو اپنے دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جھوٹی دستاویزات یا جعلی گواہوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو، تو ایسے شخص کی جانب سے بھی وکالت کرنا درست نہیں ہوگا۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اگر وکیل کو اطمینان ہو کہ اس کیس میں یہ شخص جھوٹا نہیں ہے، یا یہ کہ گواہ و دستاویزات پر وہ مطمئن ہو تو ایسی صورت میں وکالت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(د) اسی طرح اگر وکیل کسی کیس میں شریف و معزز افراد کو محض ہتک عزت کی نیت سے عدالت میں طلب کرتا ہو، تو یہ بھی جائز نہیں ہوگا، ہاں! جرح کے سلسلہ میں طلب کیا جانا اس سے مستثنیٰ ہے۔

(ھ) ذاتی عداوت کی بنا پر کسی شخص کو عدالت میں بلانا اور اس طریقہ سے اسے ذلیل کرنا بھی وکیل کے لیے جائز نہیں ہے۔

(و) مقدمہ کو محض طول یا موکل سے مزید فیس حاصل کرنے کی غرض سے کیس کو بالقصد ملتوی کرتے رہنا بھی جائز نہیں ہوگا۔

الغرض کہ اسلام نے عدل وانصاف کے قیام کو جو اہمیت دی ہے اس میں آڑ بننے والی ہر چیز کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا اخلاقی، دینی فریضہ ہے، اور جو لوگ اس شعبہ سے بلا واسطہ منسلک ہیں، ان کی ذمہ داری تو اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ انصاف کے قیام کی جدوجہد میں حتی الوسع کوشش کریں اور ظلم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو مروڑ کر اس کے ناپاک اثرات سے عوام کو بچائیں کہ منجملہ تمام نیکیوں کے یہ بھی ایک بڑی نیکی ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ تعلیم اور علاج نے ایک زبردست کاروبار کی صورت اختیار کرلی ہے اور بدقسمتی سے یہ شعبہ بھی کچھ برائیوں کا شکار ہوگیا ہے، جیسے جن امراض کا علاج دواؤں کے ذریعہ ممکن ہو، ان میں بھی آپریشن کا مشورہ دیا جاتا ہے، تاکہ علاج گراں بار ہو جو معالج کے لیے ارزانی کے ساتھ ساتھ ہسپتال اور لیبارٹری کی آمدنی بڑھا سکے، اللہ تعالیٰ ایسی آمدنی کے بارے میں فرماتے ہیں: "ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" (البقرہ:۱۸۸) اس میں باطل طریقہ پر مال کھانے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حرام طریقہ پر کسب معاش سے اپنا دامن بچائے۔

اسی طرح آپریشن اور معالجہ میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ طبیب کو خاتون مریض اور ممرضہ کو مرد مریض کے مستور حصہ کے علاج پر مجبور کیا جاتا ہے، لیکن مریض و مریضہ ایسے دواخانہ اور ہسپتال کا انتخاب کرے جس میں مریضہ کے لیے ممرضہ اور مریض کے لیے طبیب کا انتخاب ہو، اور ڈاکٹروں خصوصاً مسلمان ڈاکٹرز کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مقدس فریضۂ خدمت کی اہمیت کے پیش نظر مریض کے لیے طبیب اور عورتوں کے لیے نرس اور ممرضہ کا انتخاب کرے، بلکہ عورتوں کے علاج و معالجہ کے طور وطریق نرسوں کو سکھادے۔

اگر کسی ہسپتال میں یہ صورت حال نہیں ہے اور کسی مریض کا علاج نرس اور مریضہ کا علاج مرد کرتا ہے اور یہ بدرجۂ مجبوری ہے تو پھر قاعدۂ فقہیہ اس

سے پہلے گذر چکا ہے: "الضرورات تبیح المحظورات" لیکن یہ مطلق نہیں ہے، بلکہ اس محظور و منہی عنہ میں اباحت صرف ازالہ ضرر کے پیش نظر بقدر ضرورت ہوگی، اسی لیے فقہاء نے قاعدہ بیان کیا: "ما ابیح للضرورۃ یقدر بقدرھا" (القواعد الفقہیہ ص: ۱۲۳، ۱۵۱، ط: دار الحدیث، القاہرہ)

لہٰذا مرض اگر موضع مخصوص کو چھوڑ کر جسم کے کسی بھی حصہ میں ہو، ضرورت کے پیش نظر علاج کرے گا، اگر موضع مخصوص میں ہے تو کسی ہم جنس کا انتخاب کرے، اور اگر ہم جنس نہ مل پائے تو خلاف جنس بھی علاج کر سکتا ہے، جبکہ ہلاکت یا زیادتی مرض کا اندیشہ ہو، پھر دوران علاج بھی موضع مرض ہی کو کھولے، باقی جسم مستور ہو، نگاہیں جھکائے رکھے، صرف ضرورت کی جگہ بقدر ضرورت نگاہ رکھے، اور مریضہ کے علاج کے وقت اس کا محرم بھی اس کے ساتھ رہے۔

شیخ ابن عثیمین فرماتے ہیں: "ان ذهاب المرأة إلى الطبيب عند عدم وجود الطبيبة لا باس به، وقد ذكر أهل العلم أنه لا بأس به، ويجوز ان يكشف للطبيب كل ما كان يحتاج النظر اليه، إلا أنه لا بد ان يكون معها محرم وبدون خلوة من الطبيب بها؛ لأن الخلوة محرمة، وهذا من باب الحاجة۔ (فتاوى علماء البلد الحرام: (۱۹) باب النساء، الفصل الحجاب والزينة، رقم السوال: ۳۸، ص: ۱۸۵۲، ط: مؤسسة الجريسى، الرياض)"

شیخ عبدالوہاب طویلہ فرماتے ہیں: "يجوز للطبيب أن ينظر إلى المواضع التى يحتاج إليها فى المداواة ويلمسها، فإذا كان بموضع ما من العورة قرح أو جرح أو نحو ذلك مما وقعت الحاجة إلى مداواته جاز للطبيب النظر والمس، وعليه أن يستر كل عضو من العورة سوى موضع المرض، وليغض بصره عن غيره ما استطاع، لأن ماثبت للضرورة يقدر بقدرها۔ ونظر الطبيبة من الأجنبى كنظر الطبيب من الأجنبية للضرورة، ويجوز للخاتون والقابلة النظر إلى الفرج ومداواته بعد ذلك، دفعا للحاجة۔

وينبغى للطبيب أن يعلم امرأة إن أمكن، لأن نظر الجنس أخف، فإن لم يوجد امرأة تعلم، ولا امرأة تتعلم وخيف البلاء أو الوجع، يجوز للطبيب أن يداويها ضمن الشروط التالية:

(۱) أن يكون الطبيب مسلما امينا، فلا يعدل إلى غيره مع وجوده، فان كان ثمة طبيب يجوز له النظر كزوج ومحرم فلا يعدل عنه۔

(۲) حضور محرم أوزوج او على الأقل امرأة ثقة۔

(۳) أن يكشف بقدر الحاجة، ويغض بصره عن غيره إن كشف بدون قصد۔

وصفوة القول فى هذا: يقدم الجنس على غيره، والمحرم على غيره، ومن نظره أكثر على غيره وعند اتحاد النظر يقدم الجنس على غيره، ثم المحرم على غيره، الموافق فى الدين على غيره، فاذا فقد ذلك عالج الأجنبى بشروطه، معزيا بفتح العلام۔ (فقه الالبسه والزينة: الباب الاول فى ستر العورة والألبسة المفروضة، الفصل الثالث فى احكام متفرقة تتعلق بالعورة، ص: ۱۰۳، ۱۰۴، ط: دار السلام القاهره)

. . . .

مختلف پیشے اور ان کے شرعی احکام

مولانا اشتیاق احمد اعظمی [1]

۱۔ الف: فوج کے شعبہ میں ملازمت:

غیر مسلم حکومتی اداروں یا کفار کے یہاں ملازمت کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، حتیٰ کہ ایٹمی توانائی کی انڈسٹری یا فوجی اور اسٹراٹیجک معاملات کے اداروں کی ملازمت کو بھی سند جواز حاصل ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

''لا بأس بأن يتوظف الرجل عملًا فى دوائر وازارات الحكومة الأمريكية أو غيرها من حكومات البلاد الكافرة وكذلك لا بأس بقبول مثل هذه الأعمال فى محالات الصناعة الذرية أو الدراسات الاستراتيجية'' (۴۵۔ ۳۴۴، بحوث فى قضايا فقهيه معاصره)۔

ہندوستان جیسے ملک میں فوجی ملازمت جس کا اہم مقصد سرحدوں کی حفاظت، غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان کا قیام ہوا کرتا ہے، ظاہر ہے کہ فی نفسہ یہ بہتر مقاصد ہیں، ان مقاصد کے حصول کی نیت سے اس ملازمت کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے ملازمت کے مواقع کو تنگ کیا جاسکتا ہے۔ ہاں ظالم ومظلوم کی تحقیق کئے بغیر وار کرنا یا مسلمان فوجی کا اپنے ہم مذہب شخص پر حملہ کرنا، شریعت اسلامیہ اس کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی، کیونکہ نصوص شرعیہ میں اس سے صراحۃً منع کیا گیا ہے۔

''لقوله عليه السلام: لا يحل دم امرئ مسلم إلا باحدى ثلث: زنى بعد إحصان فانه يرجم ورجل خرج محاربًا لله ولرسوله فانه يقتل أو يصلب أو ينفى من الأرض أو يقتل نفسًا فيقتل بها۔ (ابو داود، بحواله مشكاة مع التعليق الصبيح، ۴۲/ ۶۱۔ ۱۶۰)۔

قوله عليه السلام: أنصر أخاك ظالمًا أو مظلومًا، قالوا: يارسول الله، هذا ننصره مظلومًا فكيف ننصره ظالمًا؟ قال: تأخذ فوق يديه (بخارى مع فتح البارى، ۵/ ۹۸، طبعه دار المعرفة، كويت)۔

خلاصہ یہ کہ فی نفسہ فوجی ملازمت تو حد جواز میں آسکتی ہے، لیکن ایسے حالات سامنے آئیں کہ مسلمان فوجی کو مسلمان فوجی یا مسلم عوام پر حملہ کی نوبت آئے تو مسلمان فوجی کو ایسے کام میں شریک ہونا حرام ہوگا حتیٰ کہ اگر وہ مکرہ بھی ہو تو بھی اس کے لیے مسلمان پر حملہ کرنا حد جواز میں نہیں آسکتا۔'' حيث لم يجز أحد من أهل العلم قط لأحدٍ من المسلمين أن يقاتل مسلما أو يقتله بغير حق ولو أكره على ذلك وأتى الإكراه على نفسه لأن نفس المكره ليست بأولى بالعصمة من نفس المسلم الذى يكرهونه على قتله'' (۷۷ تاملات فی مسیرۃ العمل الاسلامی) (کیونکہ کسی بھی عالم نے کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان سے قتال کرنے یا اسے ناحق قتل کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، بھلے ہی اسے اسی پر مجبور کیا جائے اور نہ کرنے کی صورت میں اسے خود قتل کی دھمکی دی جائے (تب بھی دوسرے کو قتل کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہوگا)، کیونکہ مکرہ کی جان، اس دوسرے مسلمان کی جان سے جس کے قتل پر اسے مجبور کیا جارہا ہے، معصوم ومحفوظ ہونے میں زیادہ بہتر اور اولیٰ نہیں ہے)۔

۱۔ ب: پولیس محکمہ میں ملازمت:

فوجی محکمہ ہی سے ملتا جلتا دوسرا شعبہ پولیس کا ہے، جس کا بنیادی مقصد اندرون ملک امن وامان قائم رکھنا ہوتا ہے۔ حدود شرع میں رہ کر اس شعبہ میں بھی

[1] دار العلوم مئو (یوپی)۔

ملازمت ایک مسلمان کے لیے جائز ہے۔رہی یہ بات کہ مظلوموں پر گولی چلانا تو جان بوجھ کر ایک مسلمان، بحیثیت مسلمان، یہ کام کر ہی نہیں سکتا، کیونکہ ظلم تو نہ صرف شریعت اسلامیہ بلکہ وضعی قوانین کی رو سے بھی صحیح نہیں۔

مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذا رسانی کا ارتکاب بھی مذموم عمل اور ناجائز ہے، جبکہ اس کام کے لیے دھمکی وغیرہ اور دوسرے وسائل بروئے کار لائے جاسکتے ہیں، اور آج کے دور میں جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ مختلف مثلاً نارکوٹیکس کرا کر مجرم کے جرائم کا پتہ لگایا جاسکتا ہے اور ہمارے ملک میں بھی پتہ لگایا جارہا ہے اور یہ اتنا مضبوط اور قابل اعتبار ذریعہ ہے کہ ایذا رسانی کے ذریعہ تو بسا اوقات مجرم، بغیر قصور کے بھی ایذا کے خوف سے اقرار کرلیا کرتا ہے، لیکن نارکوٹیکس میں جو حقیقت ہوگی وہ سامنے آجائے گی،

اس لیے پولیس محکمہ میں رہ کر ایک مسلمان حدود شرع کی پابندی کرکے اس ملازمت کو انجام دے سکتا ہے، رہا اس شعبہ میں رہ کر دوسروں کی صحبت سے متاثر ہو اور بدزبانی اور دیگر عادات سیئہ کا خوگر ہوجائے تو یہ اس ملازمت کا لازم نہیں ہے، کتنے لوگ اس محکمہ سے باہر رہ کر بھی بدزبانی، گالیاں اور مغلظات بکنا اور فحائش اور بے حیائی کا ارتکاب جیسے امور سے گریز نہیں کرتے اور کتنے پولیس محکمہ میں کام کرنے والے صوم وصلوٰۃ کے پابند اور اخلاقی قدروں کو پامال نہ کرنے والے ملا کرتے ہیں، یہ امور آدمی کی اپنی فطری صلاحیت پر منحصر ہیں کہ وہ اپنے نفس پر کس قدر قابو رکھتا ہے اور غلط سوسائٹی سے متاثر نہیں ہوا کرتا، بلکہ مسلمانوں کو تو اسلامی اخلاق وکردار کا آئینہ دار ہونا چاہئے اور اسے دوسروں کو اپنے اعمال واخلاق وکردار سے متاثر کرنا چاہئے، نہ کہ برے لوگوں سے متاثر ہوکر برا بن جانا چاہئے، اس لیے اس قسم کے مفروضہ حالات کو سامنے رکھ کر اسی محکمہ کی ملازمت کو ناجائز نہیں کیا جاسکتا۔

ا۔ج: مخبری اور انٹلیجنس (جاسوسی) کے محکمہ کی ملازمت:

حکومت کا ایک اہم شعبہ مخبری اور انٹلیجنس کا بھی ہے، ملک کی سلامتی، امن وامان کے قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے یہ ناگزیر ضرورت ہے، اس شعبہ میں ملازمت مسلمانوں کے لیے جائز ہے، رہا تجسس اور غیبت کا ارتکاب تو یہ تو بالکل واضح ہے کہ عام حالات میں یہ امور ناجائز اور حرام ہیں، کیونکہ قرآن کریم میں فرمان الٰہی موجود ہے: "ولا تجسسوا" (اور تجسس نہ کیا کرو)، تجسس کا لغوی معنی ہے: تتبع الاخبار (خبروں کے پیچھے پڑنا) "ومنہ الجاسوس لأنہ یتبع الأخبار ویفحص عن بواطن الأمور" (موسوعہ فقہیہ کویتیہ، ۱۰/۱۶۱)۔ (اور اسی لفظ "تجسس" سے "جاسوس" بنا ہے کیونکہ وہ خبروں کی تلاش میں رہا کرتا ہے اور معاملات کی تہ میں پہنچنے کی کوشش کیا کرتا ہے)۔

اس قرآنی آیت کی روشنی میں: "تجسس" حرام ہے، بلکہ مسلمان کی پردہ پوشی دوسری نصوص کی روشنی میں واجب اور ضروری ہے لیکن بعض حالات میں فقہاء کرام نے "تجسس" کو واجب قرار دیا ہے، مثلاً چوروں اور ڈاکوؤں کا تجسس کہ ان کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے اور یہ کام بغیر تجسس کے ناممکن ہے، اسی بارے میں "تبصرۃ الحکام" میں یہ عبارت مذکور ہے: "وقد یکون التجسس واجبًا فقد نقل عن الماجشون انہ قال: اللصوص وقطاع الطریق أری أن یطلبوا فی فسطاطہم ویعان علیہم حتی یقتلوا او ینفوا من الارض بالهرب وطلبهم لا یکون إلا بالتجسس علیهم وتتبع اخبارهم" (بحوالہ موسوعہ فقہیہ کویتیہ، ۱۰/۱۶۲)۔

نیز دوران جنگ یا اس سے پہلے بھی مسلمان جاسوس کو دشمن کے خیموں میں بھیج کر ان کی تعداد، اسلحے اور دیگر امور کا جائزہ لیا جانا ایک امر مباح ہے۔ (۱۰/۱۶۲، موسوعہ فقہیہ)۔

اسلامی حکومت میں ایک شعبہ "حسبہ" کا ہوا کرتا ہے، جس کا مقصد ہی معاصی کے مرتکبین کا پتہ چلانا اور ان کو راہ راست پر لانا ہوا کرتا ہے:

"وللمحتسب أن یکشف علی مرتکبی المعاصی، لأن قاعدۃ ولایۃ الحسبۃ الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر" (۱۶۲/۱۰، موسوعہ فقهیه)۔

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ بعض حالات میں "تجسس" واجب ہوا کرتا ہے، چونکہ یہی کام انٹلیجنس کے محکمہ میں ہوا کرتا ہے کہ تجسس کا مقصد ملک میں امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام ہے، اسی لیے اس سلسلے میں تجسس کئے بغیر یہ مقاصد پورے ہی نہیں ہوسکتے، اس لیے ان مقاصد کے حصول کے لیے "تجسس" نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ واجب ہوگا تاکہ ملک میں لا اینڈ آرڈر کا نظام درست رہ سکے۔ بدامنی اور فتنہ وفساد کا قلع قمع ہوسکے۔ مجرموں، غنڈوں، اچکوں اور لٹیروں کو پکڑ کر ان کے کیفر کردار تک ان کو پہنچایا جاسکے۔

دوسری چیز جس کا مخبری کے شعبہ میں ارتکاب کرنا پڑتا ہے، وہ غیبت ہے اور غیبت بھی بنص قرآنی حرام ہے، فرمان باری ہے: "ولا یغتب بعضکم بعضاً- (حجرات: ۱۲) (اور تم میں کا بعض بعض کی غیبت نہ کرے) غیبت کا مفہوم: "ذکرك اخاك بما یکرهه" ہے (تمہارا اپنے مسلمان بھائی کو اس کی ناپسندیدہ چیز سے یاد کرنا) فعل غیبت بھی اگرچہ حرام اور گناہ کبیرہ میں داخل ہے، لیکن فقہاء کرام نے بعض مواقع میں اسے مباح قرار دیا ہے، کیونکہ بعض شرعی مقاصد کا حصول اس کے بغیر ناممکن ہوا کرتا ہے، اس لیے ان جیسے مقاصد کے حصول کے لیے اس امر حرام کو بھی مصلحۃً مباح قرار دیا گیا ہے۔

فقہاء کرام نے چھ (۶) ایسے مقامات ذکر فرمائے ہیں، جہاں غیبت کی گنجائش ہے ان میں سے چند امور درج ذیل ہیں:

۱۔ مظلوم کا ظالم کی غیبت کرنا، حاکم وقت یا قاضی کے سامنے جائز ہے۔

"منها: التظلم: "یجوز للمظلوم أن یتظلم إلى السلطان أو القاضی أو غیرهما"۔

۲۔ منکر کو روکنے اور گناہ گار کو راہ راست پر لانے کے لیے "الاستعانة علی تغییر المنکر ورد العاصی الی الصواب"۔

۳۔ مسلمانوں کو برائی سے بچانے اور ڈرانے کے لیے (تحذیر المسلمین من الشر) اس کے ذیل میں علامہ نوویؒ نے پانچ امور ذکر فرمائے ہیں: اسی ضمن میں گواہوں اور رواۃ کی جرح بھی داخل ہے۔

۴۔ شادی اور منگنی کے موقع پر صحیح صورتحال سے باخبر کرنا مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس دو آدمیوں نے شادی کا پیغام بھیجا ہے (میں اس سلسلے میں کیا کروں) تو حضور ﷺ نے جواب مرحمت فرمایا: "اما معاویة فإنه صعلوك لا مال له وأما ابوجهم فإنه ضراب للنساء لا یرفع عصاه عن عاتقه" (موسوعہ فقہیہ ۳۱/۳۶-۳۳۵) حضور اکرم ﷺ نے دو آدمیوں، معاویہ اور ابوجہم کے عیب کو اس عورت کے سامنے کھول کر بیان کر دیا تاکہ وہ مغالطہ میں پڑ کر شادی نہ کرے اور پھر زندگی اس کی اجیرن نہ بن جائے۔

مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں انٹیلیجنس کے محکمہ کے افراد کے لیے ملکی امن وامان اور سلامتی کے قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے "تجسس" اور "غیبت" کی گنجائش نکلتی ہے۔ لیکن محض شبہ کی بنیاد پر ان چیزوں کا ارتکاب جائز نہیں معلوم ہوتا۔

ہندوستانی عدالت (غیر مسلم حکومت کی عدالت) میں مسلمان کی ملازمت:

معاصر فقہاء کرام کی اس سلسلے میں چند آراء ہیں:

۱۔ کچھ حضرات نے اسے ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ:

الف۔ یہ ما أنزل اللہ کے علاوہ کے ذریعہ فیصلہ کرنا ہے جو براہ راست نص قرآنی سے حرام ہے: لقولہ تعالیٰ: "ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئك هم الکافرون"- (مائدہ: ۴۴) (اور جو شخص ما انزل اللہ کی روشنی میں فیصلہ نہ کرے تو وہی لوگ کافر ہیں)۔

ب۔ ایسا کرنے میں قضاء وحکم کے معاملہ میں کفار کی اعانت لازم آتی ہے، (ما یتضمنه علی اعانتهم علی باطلهم فی الحکم والقضاء) (۶۵ نوازل فقہیہ علی الساحۃ الامریکیۃ/صلاح الفتاوی)۔

ج۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے نظریاتی طور پر طاغوت کے رد وانکار پر مامور ہے، اگر مسلمان، غیر شرعی قوانین کا سہارا لے کر فیصلہ کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ عملی طور پر طاغوتی اوامر واحکام کا نفاذ کر رہا ہے، حالاں کہ وہ نظریاتی طور پر اس کا منکر تھا یعنی اس کے عقیدہ وعمل میں تضاد ہوگا۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں کچھ فقہاء کرام غیر مسلم حکومت کی عدالت میں ملازمت اور منصب قضا کے قبول کرنے کے عدم جواز کے قائل ہیں۔

۲۔ فقہاء کرام کی ایک دوسری جماعت نے بعض مصالح کے حصول اور بعض مفاسد کی تقلیل کو سامنے رکھ کر جواز کا قول کیا ہے، کیونکہ:

اس قسم کے مواقع میں مسلمانوں کا ملازمت نہ کرنا، اس بات کا موجب ہوگا کہ ایسے تمام مناصب پر فجار وفساق کا غلبہ اور تسلط ہو جائے اچھے اور صالح لوگوں سے یہ میدان بالکل خالی ہو جائے، جو مسلمانوں کے حق میں کوئی اچھی چیز نہ ہوگی، "لان ترك هذه المواقع یعنی خلوها من الصالحین

وتمكين الفجار والاشرار من رقاب المسلمين "(۶۵ نوازل فقہیہ)۔

ب۔ اس فیلڈ میں مسلمانوں کا عمل اور ان کی ملازمت، قضاء کے باب میں مشق وممارست کا سبب ہوگی، بوقت ضرورت اسلامی مملکت کے قیام کے بعد، ایک قسم کے تجربہ اور خیر کی جانب ایک اہم پیش رفت مانی جائے گی، اس لیے اس مجال میں عمل مباح ہوگا۔

ج۔ مسلمانوں سے مظالم کے دفاع میں مدد ملے گی، عدالتوں میں جو مفاسد درآئے ہیں، اس میں تخفیف کی سمت ایک اہم قدم ثابت ہوگا، اگرچہ مفاسد کا کلیۃ خاتمہ نہ ہوسکے: "ما يتضمنه من دفع الظلم عن المسلمين، وتقليل مفاسد القضاء ما أمكن۔"

د۔ مسلمان جج ہونے کی صورت میں خصومت کے موقعہ پر جج کو اسلامی شریعت کی تطبیق کی طرف دعوت دینے کا موقع فراہم ہوسکے گا:

"ما يتضمنه من دعم الدعوه إلى تطبيق الشريعة في مواجهة الخصومة" (۶۶/نوازل فقهيه)۔

۳۔ فقہاء کرام کی ایک جماعت نے اس مسئلہ میں تفصیل کی ہے، وہ یہ کہ جن صورتوں میں معصیت کا لزوم واضح ہوتو وہاں عمل حرام ہوگا اور جن مواقع میں قاضی اور جج کے اجتہاد کی گنجائش ہوگی اس میں عمل کی گنجائش ہوگی۔

ترجیح اسی تیسرے قول کو حاصل ہوگی کیونکہ حکم بما أنزل اللہ واجب ہے اور بغیر ما انزل اللہ والا حکم ناجائز اور حرام ہوگا۔ ہمارے سلف صالحین تو قوانین شرعیہ کی روشنی میں تصفیہ کرنے کو قبول نہیں کیا کرتے چہ جائیکہ وضعی قوانین کو سامنے رکھ کر فیصلہ صادر فرمانے کا تصور کرتے۔

اسی لیے غیر مسلم عدالتوں میں منصب قضاء کا قبول کرنا بہر حال احتیاط کے خلاف ہے، اولی اور احوط یہی ہے کہ وضعی قوانین کی اسلامی شریعت کے مقابلہ میں بالادستی قبول نہ کی جائے۔

ا۔ ۵: عوامی ٹیکس، انکم ٹیکس کے محکمہ میں ملازمت:

حکومتیں جو ٹیکس عوام سے وصول کرتی ہیں تاکہ حکومتوں کے اخراجات وضروریات پوری ہوسکیں، اگر وہ ٹیکس مقبول انداز کا ہو جس کی بنا پر ٹیکس دہندگان پر نہ تو غیر معمولی بوجھ پڑتا ہو اور نہ ہی اسے ناجائز طور پر خرچ کیا جاتا ہو تو اس قسم کے ٹیکس کا عوام سے وصولنا بھی جائز ہوگا اور اس شعبہ میں مسلمان کا ملازمت کرنا بھی حد جواز میں داخل ہوگا: "واخذ الضرائب من الرعية لتلبية الحاجات الملحة جائزة اذا كانت موارد الدولة لاتفي بحاجات البلاد من الحراسة والادوية والتعليم واصلاح الطرق ...... والمرافق وإعانة المسؤلين عن الأمن" (ص: ۲۷، حکم الضرائب للشیخ ابن جبرین)۔

دوسری جگہ شیخ ابن جبرین نے فرمایا: وأما العمل في هذه الضرائب فلا بأس به (۲۷)۔

(عوام سے ٹیکسوں کا لینا جبکہ حکومت کی اہم ضروریات کی تکمیل کی راہ میں ملک کی آمدنی ناکافی ہو، جائز ہے، مثلاً حکومت اور ملک کی حفاظت، دواؤں کا نظم، تعلیم کا نظم، راستوں اور بندرگاہوں کی اصلاح ومرمت اور دیگر خدمات، امن وسلامتی کے محافظین کی اعانت وغیرہ کے سلسلے میں خرچ کے لیے عوامی ٹیکس کی وصولی جائز ہے) شیخ ابن جبرین نے دوسری جگہ فرمایا کہ: (اس ٹیکس کے شعبہ میں کام اور [illegible] مت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

یہ عبارت فقہیہ بھی قابل غور ہے: "وليس في الخزانة ما يكفي للدولة فلأولى الأمر أن يفرض ماهو مناسب ... وفي تلك الحالة يجوز العمل في إدارتها" (۳۰، المهن والوظائف في بعض المجالات المالية، ص ۳۰) (حکومت کے خزانے میں اتنی دولت نہیں ہے جو ملکی ضروریات کی کفالت کرسکے تو ولی امر کو حق ہے کہ جو مناسب ٹیکس ہو، عوام پر لگائے...... اور اس حالت میں اس شعبہ میں ملازمت جائز ہوگی)۔

مذکورہ فقہی عبارتوں کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ حکومت کی واقعی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے جو مناسب ٹیکس عوام پر عائد کیا جائے تو وہ حد جواز میں ہے لیکن جب ہندوستان میں انکم ٹیکس کی وصولیابی پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں معاملہ دوسرا نظر آتا ہے، اس کی شرحیں یقیناً ظالمانہ ہیں کہ اگر کوئی تاجر حقیقی ٹیکس ادا کرے تو شاید اس کی دولت کا خاصا حصہ حکومت کے خزانہ میں جائے گا اور تاجر کو اپنی کمائی کا بہت معمولی حصہ ہی ہاتھ لگے گا۔ پھر یہ بات بھی عیاں ہے کہ ٹیکس کی مد میں حاصل ہونے والی آمدنی ٹھیک طور پر عوامی فلاح وبہبود پر استعمال نہیں کی جاتی بلکہ اس کا بڑا حصہ حکمرانوں کی عیش کوشی اور ان کو دی گئی غیر معمولی سہولتوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کے پس منظر میں علماء معاصرین وفقہاء ہم عصر کی رائے میں اس قسم کا ٹیکس لینا حرام ہے اور ایسے محکمہ اور شعبہ میں ملازمت بھی درست نہیں، الا فی بعض الاحوال۔ ان علماء کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ قولہ علیہ السلام: "لا یدخل الجنة صاحب مکس" (ابوداؤد و مسند احمد) (ناجائز ٹیکس لینے والا جنت میں نہیں جائے گا)۔

۲۔ اس قسم کے ٹیکس کی وصولیابی "أخذ اموال الناس بدون حق" میں شامل ہے، اور "أكل أموال الناس بالباطل" شرعاً منہی عنہ ہے اور یہ ایک ظلم ہے اور ظلم حرام ہے۔

۳۔ اس قسم کے ٹیکس کی بڑی رقم حکام کی عیش کوشی اور ناجائز امور میں صرف ہوا کرتی ہے: "ان بعض الحصيلة تنفق على ملذات الحكام وفي غير ما أحل الله" اس لیے اس محکمہ کی ملازمت، اعانت علی الحرام کی بنیاد پر خود حرام ہوگی "وبالتالي فان العمل في الضرائب اعانة على الحرام وما كان كذلك فهو حرام" (المهن الوظائف في بعض المحالات المالية، ص۲۸)۔

ان دلائل کی روشنی میں ہماری ناقص رائے میں انکم ٹیکس محکمہ میں ملازمت درست نہیں معلوم ہوتی۔

۲۔ الف: سودی بینک میں خارجی امور کی ملازمت:

بینک اصل میں سودی لین دین کا بنیادی طور پر کاروبار کرتا ہے، اگر ایک شخص پیسہ کے لین دین، سودی حسابات کے لکھنے پڑھنے کا کام نہ کرتا ہو، کوئی اور کام کرتا ہو، جیسے بینک کے کمپیوٹر کی مرمت اس کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا، ان صورتوں میں ملازمت کا کیا حکم ہے؟

سودی بینکوں میں ملازمت کے جواز وعدم جواز کے بارے میں فقہاء معاصرین کی دو آراء سامنے ہیں:

(۱) بعض فقہاء کرام علی الاطلاق سودی بینکوں میں ملازمت کو ناجائز کہتے ہیں، والادلۃ علی ذلک فی ما یلی:

الف: وہ نصوص شرعیہ جن میں سودی لین دین، اس کی کتابت وگواہی سے منع کیا گیا ہے یا وہ نصوص جن میں اثم وعدوان پر تعاون سے عمومی طور پر منع کیا گیا ہے، اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ آج کل بینکوں میں سودی لین دین اس طرح کارفرما ہے جیسے انسانی رگوں میں دوران خون۔

ب: ان بینکوں میں ملازمت اختیار کرنے والوں کو جو تنخواہ یا اجرت ملتی ہے، وہ سود ہی کی رقم سے ہوا کرتی ہے جو کسب خبیث ہے اور سودی بینکوں کی اکثر وبیشتر کمائی سود ہی پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔

"كون الأجر الذي يحصل عليه العامل في هذه البنوك من الكسب الخبيث مصدره وهو الربا الذي يمثل النسبة الغالبية على ارباح البنوك" (۷۰، نوازل فقهيه)۔

ج: سودی بینکوں کا نظام، طاغوتی مصالح کی ہمت افزائی پر مشتمل ہے اور ایک مسلمان ایسے مصالح کو کچلنے کا مکلف ہے نہ کہ اس میں تعاون کرنے کا۔

(۲) کچھ فقہاء کرام اس قسم کے بینکوں کی ملازمت کو جائز قرار دیتے ہیں، بدلیل ما یاتی:

الف: بینک میں ملازمت ایک عمل ہے اور اعمال میں اصل حلت ہے، رہی سودی لین دین کی بات یا اس کی کتابت وگواہی، تو ایک مسلمان ان جیسے اعمال سے اپنے آپ کو دور رکھ سکتا ہے، ان امور کے علاوہ بینک میں دوسرے بہت سے کام ہوا کرتے ہیں، جن کو مسلمان ملازم بلا کسی حرج کے انجام دے سکتا ہے۔

ب: بینکوں کی آمدنی، صرف سود ہی پر مشتمل ہو، یہ ضروری نہیں، بلکہ سودی آمدنی کے سوا بینک کے پاس دیگر آمدنی کے ذرائع بھی ہوا کرتے ہیں جن سے کافی کمائی ہوا کرتی ہے، اس لیے بینک کی آمدنی کو صرف سود ہی میں منحصر کر کے حرمت ملازمت کا قول درست اور صحیح نہیں ہے۔

فریقین کی آرا اور ان کے دلائل میں غور وخوض کے بعد نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ:

۱۔ سودی لین دین سے براہ راست جن امور کا تعلق ہو وہ حرام ہوں گے، مثلاً سودی لین دین کی کتابت اور اس کی گواہی۔

۲۔ ملازم کو یقینی طور پر معلوم ہو کہ اسے تنخواہ یا اجرت میں سودی رقم ہی دی جاتی ہے، تو وہ مال خبیث ہونے کی وجہ سے حرام ہونی چاہئے اور تنخواہ یا اجرت کا غیر سودی رقم سے ہونا یقینی ہو تو اس کا لینا مباح ہوگا۔

۳۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ملازم کی تنخواہ یا اجرت، کس رقم سے ادا کی جاتی ہے، سودی رقم سے یا غیر سودی سے، بلکہ دونوں سے مخلوط ہے تو ایسی صورت میں غالب کے اوپر حکم لگے گا، غالب سودی رقم ہوگی تو حرام اور غیر سودی رقم غالب ہوگی تو حلال ہوگی اور اگر معاملہ مجہول ہو تو یہ تشابہات کے قبیل سے ہوگا۔

۴۔ جن اعمال کا تعلق سودی لین دین، کتابت وشہادت کے قبیل سے بالکل نہ ہو بلکہ بینک کی عمومی خدمات سے ہو مثلاً بینک کی حفاظت ونگہبانی اس کے کمپوٹر یا ایئر کنڈیشن وغیرہ کی مرمت، تو علماء کرام کی ایک بڑی جماعت، بوقت ضرورت اس قسم کی ملازمت یا اجرت پر کام کرنے کی رخصت دیتی ہے اور جب ضرورت نہ ہو تو اس سے بھی احتیاط کرنا مطلوب ہوگا:

مالم يتصل بهذه العقود بوجه من الوجوه كالعمل فى مجال تغيير العملة او تقديم الخدمات العامة للبنك، كالحراسة والصيانة ونحو ذلك فالسواد الأعظم من المفتين على الترخص فى ذلك عند الحاجة والتورع عند انعدامها (ص:۸۷)۔ رہا بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا اور یہ کچھ دانستہ طور پر ہو تو یہ امور مکروہ تحریمی اور ناجائز ہوں گے۔

۲۔ج۔ شراب کی کمپنی میں ملازمت:

شراب کی کمپنی میں کچھ لوگ شراب کی خرید وفروخت کرتے ہیں، کچھ لوگ کمپنی کے لیے بوتل بناتے ہیں، کچھ لوگ شراب کے لین دین میں نہیں رہتے، لیکن حساب کتاب لکھتے ہیں، یا شراب کی کمپنی کو وہ اجزا پیش کرتے ہیں جن سے شراب بھی بنائی جاتی ہے، تو شراب کی کمپنی کے ان مختلف کاموں میں ملازمت کا حکم کیا ہوگا؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ شریعت محمدیہ چونکہ قیامت تک رہنے والی شریعت ہے، اس لیے اس کی حفاظت کا خاص اہتمام کیا گیا کہ جرائم ومعاصی تو حرام تھے ہی، ان اسباب وذرائع کو بھی حرام قرار دیا گیا جو عادت غالبہ کے طور پر ان جرائم تک پہنچانے والے ہیں، مثلاً شراب نوشی کو حرام کیا گیا تو شراب بنانے، بیچنے، خریدنے اور کسی کو دینے کو بھی حرام قرار دیدیا گیا، سود کو حرام کرنا تھا تو سود سے ملتے جلتے معاملات کو بھی ناجائز کر دیا گیا، زنا کو حرام قرار دیا تو اس کے اسباب قریبہ اور ذرائع کو بھی محرمات میں داخل کر دیا گیا۔

اسباب وذرائع کا قریب وبعید کا ایک طویل سلسلہ ہے، اگر دور تک اس سلسلہ کو روکا جائے تو زندگی دشوار ہو جائے اور عمل میں بڑی تنگی پیش آجائے اور ماجعل عليكم فى الدين من حرج کے پیش نظر مزاج شریعت کے خلاف لازم آئے، اس لیے اسباب وذرائع کے معاملے میں یہ حکیمانہ فیصلہ کیا گیا کہ جو افعال واعمال، کسی معصیت کا ایسا سبب قریب ہوں کہ عام عادت کے اعتبار سے، اس کا مرتکب، اس معصیت میں ضرور مبتلا ہو ہی جاتا ہے، ایسے اسباب قریبہ کو شریعت نے اصل معصیت کے ساتھ ملحق کر کے ان کو بھی حرام قرار دیا اور جو اسباب بعیدہ ہیں کہ ان کے عمل میں لانے سے معصیت میں مبتلا ہونا عادۃً لازم وضروری نہیں، مگر معصیت میں کچھ نہ کچھ دخل ضروری ہے، ایسے اسباب کو مکروہ قرار دیا اور جو اسباب ان سے زیادہ ابعد ہیں کہ معصیت میں ان کا دخل شاذ ونادر ہے، ان کو نظر انداز کر کے مباحات میں داخل کر دیا۔

پہلے کی مثال شراب فروشی ہے کہ شراب نوشی کا سبب قریب ہے، اس کو بھی شریعت نے اسی طرح حرام قرار دیا، جس طرح شراب نوشی حرام ہے، دوسرے کی مثال یہ ہے کہ انگور ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جائے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ اس سے شراب ہی بناتا ہے، اس کا پیشہ یہی ہے، یا اس نے صراحۃً کہہ دیا ہے کہ میں شرب بنانے ہی کے لیے انگور خرید رہا ہوں، یہ اگرچہ شراب فروشی کے درجہ میں تو حرام نہیں مگر مکروہ وناجائز یہ بھی ہے، یہی حکم سینما گھر بنانے یا سودی بینک چلانے کے لیے زمین ومکان کرایہ پر دینے کا حکم ہے کہ معاملہ کے وقت جب معلوم ہو کہ یہ اس مکان کو ناجائز کام کے لیے لے رہا ہے تو کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی اور ناجائز ہوگا۔

تیسرے کی مثال یہ ہے کہ عام لوگوں کے ہاتھ انگور فروخت کیے جائیں، جن میں یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سے شراب کشید کرے مگر نہ اس نے اس کا اظہار کیا، نہ ہمارے علم میں وہ ایسا شخص ہے جو شراب کشید کرتا ہے تو شرعاً اسی طرح کی بیع وشراء مباح قرار دی۔ (معارف القرآن، ۷/۲۰۷، بتغیر یسیر)۔

تفصیلات بالا کی روشنی میں شراب کی کمپنی میں حساب کتاب لکھنے یا کمپنی کو وہ اجزا پیش کرنے کی بابت، جن سے شراب بھی بنائی جاتی ہے، حکم مسئلہ کا طے ہونا آسان ہے وہ یہ کہ مسئولہ صورتیں، دوسری مثال کے ضمن میں داخل ہیں، ظاہر ہے شراب کی کمپنی میں حساب کتاب شراب کا لکھا جائے گا، اور شراب کی کمپنی ایسے میٹریل خریدتی ہے، جن سے شراب بھی بنائی جاتی ہے تو کمپنی اس سے شراب ہی بنائے گی تو یہ صورتیں بھی گو شراب فروشی کی طرح حرام نہ ہوں تاہم مکروہ و ناجائز تو ضرور ہوں گی۔

۲۔ب: انشورنس کمپنی میں ملازمت:

انشورنس کی بعض شکلیں، جن کے بارے میں کچھ اہل علم جواز کے قائل ہیں مثلاً میڈیکل انشورنس یا جبری انشورنس وغیرہ تو انشورنس کمپنی کی اس قسم کی پالیسیوں کے لیے اگر ملازمت اختیار کی جاتی ہے تو جن علماء کے نزدیک، انشورنس کی جو بعض صورتیں جائز ہیں، ان کی ملازمت بھی حد جواز میں داخل ہوگی۔

لیکن بعض علماء انشورنس کی تمام صورتوں کو قمار یا ربا پر مبنی مان کو حرام قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک انشورنس کمپنی کی ملازمت علی الاطلاق جائز نہ ہوگی جب کمپنی کی ملازمت جائز نہیں تو انشورنس کمپنی کے لیے بحیثیت ایجنٹ کام کرنا بھی جائز نہ ہوگا، کیونکہ کمپنی کا تمام کاروبار قمار اور ربا پر مشتمل ہے تو ربا کا لینا دینا اس کے لیے واسطہ بننا، کتابت کرنا وغیرہ وغیرہ تمام متعلقہ امور عدم جواز کی حدود میں آئیں گے۔

۳۔الف: سپر مارکیٹ کی ملازمت:

سپر مارکیٹ جس میں زندگی کی مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں، اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے، ایسے سپر مارکیٹ کی ملازمت، مسلمان کے لیے اسی شرط کے ساتھ جائز ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو شراب والے گوشہ سے بالکل علیحدہ رکھے، اگر اس گوشہ سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوئی سبیل نہیں ہے تو پھر شراب سے متعلق کوئی بھی کارروائی اس کے لیے حلال نہیں، نہ شراب کا اٹھانا، نہ بیچنا، نہ اس کی بل بنانا وغیرہ، اس جیسے تمام امور ممنوعات میں داخل ہوں گے، ان روایات ونصوص کے پیش نظر جن کا ذکر جز ۳ میں آرہا ہے۔

۳۔ب۔جنس مخالف یا مخلوط درسگاہوں میں تدریسی ملازمت:

تدریس ایک معزز پیشہ ہے، جس کا انسانی شخصیت کی تعمیر سے گہرا تعلق ہے، لیکن موجودہ دور میں اولاً تو مخلوط تعلیم کے نظام کا غلبہ ہے اور استاذ کو بعض اوقات اس طرح تدریس کا فریضہ انجام دینا ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب لڑکے بھی ہوتے ہیں اور لڑکیاں بھی۔ اسی طرح لڑکیوں کی مخصوص درسگاہوں میں مرد اساتذہ بھی کام کرتے ہیں اور لڑکوں کی درسگاہوں میں خاتون اساتذہ بھی کام کرتی ہیں، اس طرح کی ملازمت میں جواز وعدم جواز کا مسئلہ پردہ کے مسئلہ سے مربوط ہے۔

عورتوں کو مردوں سے پردہ کا واضح حکم، نصوص کتاب وسنت میں موجود ہے اور مردوں کو بھی اجنبیہ کی طرف دیکھنے سے روکا گیا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

اولاً: کتاب اللہ:

۱۔ قولہ تعالیٰ: "یا ایها النبی قل لأزواجك وبناتك ونساء المومنين يدنين عليهن من جلا بيبهن" (احزاب:۵۹)۔

(اے نبی! آپ اپنی ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کو اور عام مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیں کہ اپنی جلباب (لمبی چادریں) استعمال کریں)۔

۲۔ قولہ تعالیٰ: "وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن" (نور:۳۱)۔

(اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجیے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں)۔

۳۔ قولہ تعالیٰ: "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى" (احزاب:۳۳)۔

(اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں اور نہ دکھلاتی پھرو جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں)۔

۴۔ قولہ تعالیٰ: "فلا تخضعن بالقول فيطمع الذى فى قلبه مرض" (احزاب:۳۲)۔ (تو تم (نامحرم مردسے) بولنے میں (جبکہ بضرورت بولنا پڑے) نزاکت مت کرو کہ ایسے شخص کو (طبعا) خیال (فاسد پیدا) ہونے لگتا ہے، جس کے قلب میں خرابی (اور بدی) ہے)۔

ثانیا: سنۃ رسول اللہ:

۱۔ عن أم سلمة رضی اللہ عنہا قالت: کنت عند رسول اللہ ﷺ وعندہ میمونة فأقبل ابن أم مکتوم وذلك بعد أن أمرنا بالحجاب فقال النبی ﷺ: احتجباعنہ، فقلنا: یارسول اللہ! ألیس ھو أعمی، لایبصرنا ولایعرفنا؟ فقال النبی ﷺ: أفعمیا وان انتما الستما تبصرانہ؟(ریاض الصالحین:۵۰۶)۔

(ام سلمہؓ سے روایت ہے، کہتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی اور حضرت میمونہؓ بھی تھیں کہ عبداللہ بن ام مکتومؓ آگئے اور یہ واقعہ حجاب کے فرض ہونے کے بعد کا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: تم دونوں چھپ جاؤ ان سے، ہم دونوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! کیا وہ نابینا نہیں ہیں کہ وہ ہم کو نہ تو دیکھ سکتے ہیں اور نہ پہچان سکتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو کیا تم دونوں بھی اندھی ہو، کیا تم دونوں انہیں نہیں دیکھ رہی ہو)۔

۲۔ عن عائشة ان النبی ﷺ دخل علیھا وعندھا رجل فکأنہ کرہ ذلك فقالت: إنہ أخی، فقال: أنظرن من إخوانکن فانما الرضاعة من المجاعة (مشکاۃ، ۲/۲۷۳)۔ (حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کے یہاں تشریف لائے تو اس وقت ان کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، آنحضور ﷺ کو اس کی موجودگی ناگوار گزری تو عائشہؓ نے عرض کیا کہ یہ میرے (رضاعی) بھائی ہیں، حضور نے فرمایا: یہ غور کرو کہ کون تمہارا بھائی ہوسکتا ہے، کیونکہ رضاعت کا اعتبار بھوک کے وقت ہے)۔

مذکورہ بالا آیات واحادیث نبویہ کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ عام حالات میں ایک اجنبی مرد اجنبی عورت کو نہ تو دیکھ سکتا ہے، نہ خلوت میں بات چیت کرسکتا ہے، مرد کے لیے اجنبیہ کو قصداً دیکھنا اور اس پر نگاہ ڈالنا حرام وممنوع ہے، پہلی نگاہ جو بلا قصد وارادہ اچانک پڑجایا کرتی ہے وہ تو معاف ہے، لیکن بالقصد اس کی طرف نگاہ ڈالنا حرام ہے۔

عورت کا اصل مقام یہ ہے کہ وہ گھر کی چہار دیواری میں رہے، بوقت ضرورت گھر سے باہر نکلے تو جلباب (لمبی چادر) یا برقع میں ملبوس نکلے، راستہ دیکھنے کے لیے آنکھ پر جالی لگا کر کھول سکتی ہے، ایک روایت میں وارد ہے: "أقرب ما تکون من وجہ ربھا وھی فی قعر بیتھا" (معارف القرآن، ۷/۲۱۶) (عورت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتی ہے، جب وہ اپنے گھر کے بیچ میں مستور ہو)۔

ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہیں۔ عورت اگر بوقت ضرورت گھر سے باہر نکلے تو سر سے پاؤں تک مستور ہو کر نکلے، چہرہ بھی بجز ایک آنکھ کے چھپا ہونا چاہئے، باہر نکلنے کی یہ اجازت بھی چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے:

- ۱۔ خوشبو لگا کر نہ نکلے۔ ۲۔ بجنے والا زیور پہن کر نہ نکلے۔ ۳۔ راستے کے کنارے پر چلے۔ ۴۔ مردوں کے ہجوم میں داخل نہ ہو۔ (معارف القرآن، ۷/۲۱۷)۔

کچھ فقہاء کرام کے یہاں چہرہ اور ہتھیلیاں حجاب سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ انہوں نے قرآن کی آیت: "إلا ما ظھر منھا" کی تفسیر، چہرہ اور ہتھیلیوں سے کی ہے (کما ھو مروی عن ابن عباس) اور جن حضرات علماء نے چہرہ اور ہتھیلیوں کو حجاب میں داخل مانا ہے، ان کے نزدیک "إلا ما ظھر منھا" سے مراد، جلباب اور برقع وغیرہ ہے (کما ھو مروی عن عبد اللہ بن مسعود)۔

جنھوں نے چہرہ اور ہتھیلیوں کو حجاب سے مستثنیٰ مان کر ان دونوں کے کھولنے کو جائز کہا ہے، انہوں نے بھی یہ شرط لگائی ہے کہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو، مگر چونکہ عورت کی زینت کا سارا مرکز اس کا چہرہ ہی ہے، اس لیے اس کو کھولنے میں فتنہ کا خطرہ نہ ہو، شاذ ونادر ہے، اسی لیے انجام کار، عام حالات میں ان کے نزدیک بھی چہرہ وغیرہ کو کھولنا جائز نہیں۔ (معارف القرآن، ۷/۲۱۷)

پوری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ عورت کو اجنبی مردوں سے پردہ کرنا لازمی اور ضروری ہے اور مرد کو بھی اجنبیہ کی طرف دیکھنا عام حالات میں حرام اور ناجائز ہے، اسی لیے مخلوط تعلیم کا نظام اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہوسکتا، اور نہ ہی خاتون استاذ کا قصداً لڑکوں کو پڑھانا اور نہ ہی مرد استاذ کا لڑکیوں کو پڑھانا جائز ہوسکتا ہے۔

ہاں خاتون استاذ کی کمی کی صورت میں، مرد استاذ، لڑکیوں کو پردہ کے پیچھے سے درس دے سکتا ہے، الا من وراء حجاب کو سامنے رکھتے ہوئے، اور ایسے ہی

خاتون استاذ بوقت ضرورت لڑکوں کو پردے کے پیچھے سے درس دے سکتی ہے، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ مرد، لڑکوں کو اور عورت، لڑکیوں کو تعلیم دے۔ ملت کے دردمند حضرات اس کے نظم کی فکر کریں۔

اگر عورت تدریس کا پیشہ اختیار کرتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مدرسہ جاتے وقت پورے شرعی پردہ کا اہتمام کرے اور ساتھ ہی مذکورہ بالا چاروں شرطوں کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے گھر کی چہار دیواری سے باہر تدریس، طبابت یا دیگر ذرائع معاش کے اختیار کے لیے جانے کی گنجائش بوقت ضرورت نکل سکتی ہے۔

۳۔ج۔ وکالت کا پیشہ:

وکالت کا پیشہ ایک مسلمان کے لیے اختیار کرنا جائز ہے، وکالت کی اجرت اور حق المحنت لینا بھی جائز ہے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا اجارہ ہے۔ اجارہ کے جواز کے لیے کتب فقہ میں جو شرائط مذکور ہیں، ان کا لحاظ رکھنا یہاں بھی ضروری ہوگا۔

فقہاء نے وکیل بالخصومۃ (Advocate) کے لیے چند شرائط خاص طور سے ذکر فرمائی ہیں جن کا وکالت کا پیشہ اختیار کرنے والے میں پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ وکیل متعین ہونا چاہئے، مبہم نہیں، اگر کوئی آدمی وکلاء کی جماعت سے یوں کہے کہ: وکلت واحدا منکم فإن هذه الوکالة لاتصح تو اس طرح کی مبہم وکالت صحیح نہ ہوگی۔

۲۔ أن یکون أهلیة التصرف (تصرف کا اہل ہو) اس شرط میں کئی شرطیں مندرج ہیں:

الف۔ وکیل عاقل ہو اور جو معاملہ اسے سپرد کیا جارہا ہے، اس سے خوب واقف کار ہو۔

ب۔ وکیل عادل ہو، فاسق، خائن نہ ہو۔

ج۔ خصومت میں امین ہو کہ اپنے مؤکل کی طرف سے دفاع میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔

د۔ دلائل کے پیش کرنے اور اقامۃ حجت میں چھوٹے بڑے، کمزور وقوی، نادار و مالدار کے درمیان امتیاز نہ برتے، کیونکہ قانون کی نظر میں سب یکساں ہیں۔

ہ۔ مؤکل کے خلاف در پردہ کوئی سازش نہ کرے کہ مدمقابل سے رشوت لے کر حقائق کو سامنے نہ لائے، اور در پردہ مخالف سے ملا رہے،

لقوله تعالی: إن الله لایحب الخائنین (الانفال:۵۸)

(ولقوله علیه السلام: من أعان علی خصومة بظالم أو یعین علی ظلم لم یزل فی سخط الله حتی ینزع"

د۔ مؤکل کے راز کا افشانہ کرنے والا ہو۔

۳۔ پیشۂ وکالت سے اس کا مقصد حق وانصاف کو واضح کرنا ہو، ظالم کو ظلم سے روکنا، اور مظلوم کی فریاد رسی کرنا ہو، بنابریں ناجائز امور میں اور ظالم اور باطل کی طرف سے وکالت ناجائز ہوگی۔

لقوله تعالی: "ولا تکن للخائنین خصیما" (نساء:۱۰۵)۔

لقوله تعالی: "ولا تجادل عن الذین یختانون انفسهم" (نساء:۱۰۷، نیز دیکھئے، المحاماة فی الشریعة الاسلامیة، سیداحمد العطافی، ص ۸۳۔ ۸۴۔ ۵۸۲)

مذکورہ شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی وکالت کا پیشہ اختیار کرتا ہے تو مسلمانوں کے اجتماعی وانفرادی مسائل کے حل میں اس سے کافی تعاون مل سکتا ہے، لیکن اگر کوئی وکیل دیانت وصداقت کو بالائے طاق رکھ کر ہر قسم کے قضایا میں ہاتھ ڈال دیا کرتا ہو، اور یہ نہیں دیکھتا ہو کہ اس کا مؤکل حق پر ہے یا نہیں تو ایسی وکالت شرعاً درست نہیں۔

ظالم وغاصب مؤکل کے کیس لے کر اور جھوٹی قسمیں وگواہیاں دلا کر فیصلہ مؤکل کے حق میں کرا بھی دے، تو صاحب حق کا حق باطل نہیں ہوگا، اور نہ ہی ظلم

وناانصافی پر مبنی فیصلہ عنداللہ وعندالرسول قابل قبول اور معتبر ہوگا۔ایک حدیث میں ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ: حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إنما أنا بشر و إنکم تختصمون إلی و لعل بعضکم أن یکون الحن بحجته من بعض فاقضی له علی نحو ما أسمع منه فمن قضیت له بشئ من حق أخیه فلا یاخذنه فانما انا أقطع له قطعة من النار'' (۲/۳۲۷، مشکاۃ)۔

(میں ایک انسان ہوں، اور تم اپنے معاملے لے کر میرے پاس آتے ہو، ممکن ہے کوئی تم میں سے اپنے دلائل پیش کرنے میں دوسرے سے زیادہ فصیح و بلیغ بیان کا حامل ہو اور میں اسی کا مدلل بیان سن کر اس کے مطابق فیصلہ کردوں، تو جس شخص کے لیے میں نے اس کے بھائی کے حق میں فیصلہ کردیا ہے تو وہ اس کو ہرگز نہ لے کیونکہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے)۔

۳۔د......پیشۂ طبابت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی خدمت کا ایک اہم ذریعہ علاج اور پیشۂ طبابت ہے، اور اس پیشہ کو دینی و دنیاوی دونوں لحاظ سے کافی اہمیت حاصل ہے، لیکن فی زمانہ بدقسمتی سے اس پیشہ میں بہت سی خرابیاں اور برائیاں گھس چکی ہیں جو کم از کم مسلمان اطباء اور ڈاکٹروں میں نہ ہونی چاہئیں، بلکہ یہ دیکھا جارہا ہے کہ بعض امور منکرہ میں مسلمان ڈاکٹر، غیر مسلم ڈاکٹروں سے بھی آگے جارہے ہیں مثلاً فیس بڑھانے اور گھٹیا دواؤں کی کھپت اور بلاضرورت ڈروپ لگوانے وغیرہ میں مسلمان ڈاکٹر غیر مسلم ڈاکٹروں اور مسلم ہاسپیٹل غیر مسلم ہاسپیٹلوں سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔

اس قسم کے غلط رجحانات کی آبیاری میں صرف خوف خدا کا فقدان یا اس کی کمی ہی کا دخل ہوا کرتا ہے۔

بلاضرورت آپریشن یا بلاضرورت طبی ٹیسٹ کروانا نہ قانونا درست ہے اور نہ ہی شرعاً، پرائیویٹ ڈاکٹر تو خود اس کا ذمہ دار ہے، لیکن پرائیویٹ ہاسپیٹل یا سرکاری ہاسپیٹل میں اگر کوئی مسلم ڈاکٹر ملازمت کرتا ہے، تو اس کے لیے انتظامیہ کے دباؤ میں محض انکم بڑھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ آپریشن کرنا اور ٹیسٹ لکھنا ہرگز درست نہ ہوگا، وہ انتظامیہ سے دوٹوک کہہ دے کہ مجھ سے آپ کی مرضی کے مطابق اس قسم کے غلط امور کا ارتکاب نہ ہوسکے گا، خواہ مجھے اس کی پاداش میں ملازمت سے ہاتھ ہی دھونا پڑجائے تو یہ منظور ہے، لیکن بلاضرورت نہ آپریشن کے کیس بناؤں گا اور نہ ہی بلاضرورت ٹیسٹ وغیرہ لکھوں گا۔

مرد کا علاج مرد ڈاکٹر اور خاتون کا علاج خاتون ڈاکٹر سے: اس کی بابت کچھ شرعی حدود وضوابط:

۱۔ مرد کے علاج کے لیے مرد ڈاکٹر مقدم ہوں گے، اور خواتین کے علاج کے لیے خواتین ڈاکٹر مقدم ہوں گے، ایک خاتون مریضہ کے علاج وتشخیص کے لیے مسلمان خاتون ڈاکٹر مقدم ہوگی، پھر غیر مسلم خاتون ڈاکٹر، پھر مسلمان مرد ڈاکٹر، اور سب سے اخیر میں غیر مسلم مرد ڈاکٹر کے پاس جانے اور علاج کرانے کی گنجائش ہوگی۔

۲۔ تشخیص مرض کے لیے جس حصہ بدن کو دیکھنے کی ضرورت ہوگی، صرف اسی مقام کو دیکھنا جائز ہوگا، اس سے تجاوز ہرگز درست نہ ہوگا، اور مقام مستور کی تشخیص کے لیے حتی الوسع نگاہ کو پست رکھے گا۔

۳۔ اگر بیماری کے علاج میں صرف بیان مرض سے کام چل سکتا ہو تو ستر کھلوا کر دیکھنا جائز نہ ہوگا، اور مقام مرض کو دیکھنے سے کام چل سکتا ہو تو چھونا درست نہ ہوگا، اگر کسی حائل کے ذریعہ علاج ممکن ہو تو بلا حائل چھونا جائز نہ ہوگا۔

۴۔ عورت کا علاج اگر مرد ڈاکٹر کے پاس ہی ہونا ہے تو تنہائی میں نہ ہونا چاہئے بلکہ عورت کے ساتھ یا تو اس کا شوہر ہو یا کوئی اور محرم یا کوئی معتمد عورت ہو۔

۵۔ ڈاکٹر امین ہو، دیانت واخلاق کے معاملے میں غیر متہم ہو۔

۶۔ ستر کے معاملے میں ''عورت غلیظہ'' اور ''غیر غلیظہ'' کے اعتبار سے حکم میں تشدید اور عدم تشدید کا لحاظ ہوگا۔

۷۔ بغرض علاج ستر کو کھولنا یا دکھانا انہی حالات میں درست ہوگا، جہاں واقعۃً علاج کی حقیقی ضرورت ہو فقط توہم کی بنیاد پر یہ تحسینی علاج کے لیے کشف عورت اور نظر إلی العورۃ درست نہ ہوگا۔

۸۔ مذکورہ بالا تمام ضوابط کے ساتھ علاج اسی وقت درست ہوگا جبکہ مریضہ و مریض اور معالج (فریقین) میں فتنے سے امن و شہوانی جذبہ کارفرما نہ ہو۔ (تفصیل

کے لیے دیکھئے: الفتاوی الشرعیۃ فی المسائل الطبیۃ للشیخ عبداللہ للجبرین، ص: ۲/۷۵ تا ۷۷)۔

۳۔ ھ: ایسے ہوٹل کی ملازمت جس میں حرام اشیاء پیش کی جاتی ہوں:

ذرائع مواصلات کی ترقی، سیاحت کے رجحان میں اضافہ اور مسافر کی ضرورت کے لحاظ سے "ہوٹل" موجودہ سماج کی ضرورت کا اہم حصہ بن گئے ہیں، اور یہ اس وقت ایک نفع بخش تجارت بھی ہے، ہوٹلوں کا بنیادی مقصد تو معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے، لیکن بڑے ہوٹلوں میں بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں جو شرعاً جائز نہیں، جیسے شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ۔

اس قسم کے ہوٹلوں میں ایک مسلمان کے لیے ملازمت کی اجازت اس شرط پر دی جاسکتی ہے کہ وہ خود شراب کی فراہمی، خنزیر اور دوسری حرام غذاؤں کے نظم اور پیش کرنے میں کسی طرح کا معاون نہ ہو۔

فرمان باری ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۃ المائدۃ: ۲)۔

شراب کے معاملہ میں تو حدیث پاک میں نص صریح موجود ہے، جس کی رو سے خود شراب، اس کے پینے پلانے والے، بیچنے خریدنے والے، نچوڑنے اور نچوڑوانے والے، ڈھونے اور ڈھولائی کرنے والے، سبھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ملعون قرار دیئے گئے ہیں، اور جس چیز پر شریعت میں لعنت وارد ہوئی ہے وہ حرام کے زمرہ میں آتی ہے۔

ترمذی شریف میں انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ "قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الخمر عشرة: عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة إليه وساقيها وبائعها وآكل ثمنها والمشتری لها والمشتراة له" (ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی بیع الخمر والنهی عن ذلك، حدیث ۱۲۱۳)۔

مسلم شریف میں ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

"إن الذی حرم شربها حرم بيعها" (جس ذات نے پینا حرام کیا ہے، اسی نے اس کو بیچنا بھی حرام کیا ہے) (مسلم شریف، حدیث ۴۱۲۸)۔

مذکورہ بالا نصوص سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شراب کی تجارت، اس کا ڈھونا، پینا، پلانا، بالاجرۃ یا بلا اجرت سب حرام ہے، اس لیے ایسے ہوٹلوں میں ملازمت جہاں ان امور محرمہ سے بچنا ممکن نہ ہوگا، جائز نہ ہوگا اور نہ ایسا ہوٹل چلانا جائز ہوگا جس میں اس قسم کی حرام غذائیں، رقص وسرود کی محفلیں اور فحاشی کے اڈے ہوں۔

بدائع میں ہے: "وعلى هذا يخرج الاستيجار على المعاصی أنه لا يصح لأنه استيجار على منفعة غير مقدورة الاستيفاء شرعًا كاستيجار الانسان للعب واللهو وكاستيجار المغنية والنائحة للغناء والنوح" (بدائع، ۴/۳۹، مکتبہ زکریا)۔

درمختار میں ہے: "لا تصح الإجارة ...... لأجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی" (۹/۷۵، درمختار مع الرد، زکریا)۔

☆☆☆

ملازمتوں کے مختلف اقسام اوران کے شرعی احکام

مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی[1]

۱۔ پہلا سوال حکومت کی ملازمتوں سے متعلق ہے، اس میں پانچ شقیں ہیں:

الف: فوج کی ملازمت:

راست جواب دینے سے پہلے آیئے ذرا غور کریں کہ فوج کی ملازمت سے مسلمانوں کو کیا نقصانات ہیں، اور کیا فوائد ہیں، اور کون سے حرام کام کرنے پڑتے ہیں۔

فوج کی ملازمت کرنے میں مسلمانوں کو کئی ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جو اسلامی قوانین واحکام کے خلاف ہیں، مگر ان میں دو اہم ہیں، جن کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ فوج کی ملازمت میں کمانڈر کے حکم سے ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر وار کرنا پڑتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس طرح کے وار کا کیا حکم ہے؟

"والطاعة على المرء المسلم فيما أحب، وكره مالم يؤمر بمعصية. فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة" (البخاری، رقم الحدیث ۵۴ ۵۳ علی حسب ترقیم فتح الباری جلد ۸/ ۸۱، دار الشعب قاہرہ طبع ۱۴۰۷ھ)۔

والیان امر کی اطاعت کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تک کہ معصیت کا حکم نہ دیا جائے اس وقت تک مرد مسلمان پر (والیان امر) کی سمع وطاعت واجب ہے، جب معصیت کا حکم دیا جائے تو کوئی سمع وطاعت نہیں۔

۲۔ فوج کی ملازمت میں جو دوسرے سب سے بڑے گناہ کی نوبت آتی ہے یا آسکتی ہے وہ مسلمانوں سے مقابلہ ہے۔

جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے، سورہ نساء میں ہے:

"ومن يقتل مؤمنا متعمدا فجزاءه جهنم خالدا فيها وغضب الله عليه ولعنه وأعد له عذابا عظيما" (سورہ نساء: ۹۳)۔

(جس نے کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کیا تو اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہو اور اس کو لعنت کی اور اللہ نے اس کے واسطے بڑا عذاب تیار کیا)۔

مسلمانوں سے مقابلے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، بلکہ اجمالاً یہی دو صورتیں ہوتی ہیں:

۱۔ مدمقابل مسلمان اپنے مطالبے اور دعوے میں حق پر ہے، اور اس نے کوئی ظلم نہیں کیا، اس صورت میں مسلمان مدمقابل سے لڑنا جائز نہیں ہے، اس کی دلیل وہی ہے جو اوپر بیان ہوئیں۔

۲۔ مدمقابل نے تعدی اور ظلم کیا ہے، مثلاً پاکستان یا بنگلہ دیش کے فوجیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس صورت میں مدمقابل مسلمان سے لڑنا جائز ہے۔

"اذا تعرض شخص الإنسان يريد الإعتداء على نفسه أو أهله أو ماله فإن أمكنه رده بأسهل طريقة ممكنة فعل ذلك وإن لم يمكن رده إلا بالقتال قاتله، فإن قتل المعتدى عليه فهو شهيد، وإن قتل المعتدى فلا قصاص

[1] جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم پٹیکاڈ، ضلع ملپورم، کیرالہ۔

ولادیہ'' (موسوعہ فقہیہ، ۲۲/۲۱۸، کویت ۱۴۲۵ھ)۔

''من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون دمه شهيد، ومن قتل دون أهله فهو شهيد'' (البخاری رقم الحدیث ۲۴۸۰ علی حسب ترتیب فتح الباری جلد ۳/ ۱۷۹، دارالشعب قاہرہ طبع ۱۴۰۷ھ)۔

(جب کوئی شخص کسی انسان سے تعرض کرے اور وہ اس کی جان اہل یا مال پر حملہ کرنا چاہتا ہو تو اگر ممکن ہو تو اس کا سب سے آسان طریقے سے اس کا دفاع کرے اور اپنے اوپر حملہ کرنے سے روک دے اور اگر اس سے دفاع قتال سے ہی ممکن ہو تو اس سے قتال کرے، پھر اگر معتدی علیہ (جس پر حملہ کیا گیا) مارا جائے تو وہ شہید ہے، اور اگر حملہ آور مارا جائے تو اس کے خون کے بدلے میں نہ کوئی قصاص ہے اور نہ کوئی دیت)۔

اس مسئلے میں اصل حضور ﷺ کا ارشاد ہے: جو اپنے مال کی خاطر مارا گیا وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی خاطر مارا گیا وہ شہید ہے جو اپنے خون کی خاطر مارا گیا وہ شہید ہے، اور جو اپنے اہل کی خاطر مارا گیا وہ شہید ہے۔

فوج کی ملازمت کے فوائد:

۱۔ فوج روزگار کا ایک وسیع ذریعہ ہے ہندوستانی حکومت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مسلمان اس ملک میں ساڑھے تیرہ فیصد ہیں، ایک اندازے کے مطابق ہندوستان کے فوجیوں کی تعداد تقریباً بیس لاکھ ہے، ان فوجیوں میں مسلم فوجیوں کی تعداد شاید دو فیصد سے بھی زائد نہیں ہے، جبکہ جمہوری اصولوں کے مطابق بھی فوج میں مسلمانوں کا حق ساڑھے تیرہ فیصد یعنی ہندوستان کی بیس لاکھ فوج میں دو لاکھ ستر ہزار مسلمان ہونے چاہئیں۔

ایک آدمی اوسطاً کم از کم چھ آدمیوں کا کفیل ہوتا ہے، وہ خود اس کی کم از کم ایک بیوی ماں، باپ کم از کم دو بچے۔

دو لاکھ ستر ہزار مسلمانوں کو ملازمت ملنے کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم چودہ لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کے قیام و طعام اور تعلیم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

۲۔ فوج میں جس قدر سچے اور پکے مسلمان ہوں گے ہماری فوج اس قدر زیادہ محافظ وطن اور انصاف پسند ہوگی، اس لیے کہ اسلام وطن سے محبت کرنے اور انصاف کی تعلیم دیتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "من قتل دون ماله فهو شهيد" (بخاری، رقم الحدیث ۲۴۸۰ علی حسب ترتیب فتح الباری جلد ۳/ ۱۷۹ دار الشعب قاہرہ طبع ۱۴۰۷) (جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے)۔

۳۔ فوج میں مسلمانوں خاص طور سے حقیقی مسلمانوں کی موجودگی سے فوج کے دوسرے غیر مسلم افراد کو بھی اسلام کے اعلیٰ اور افضل ترین تعلیمات سے قریب آنے، انہیں سیکھنے اور انہیں قبول کرنے کا موقعہ ملے گا۔

اس طرح ایک فوج دعوت الی اللہ کا کام بھی کر سکتا ہے اور دعوت الی اللہ سے بہتر تو کوئی کام ہی نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ومن أحسن قولا ممن دعا إلى الله وعمل صالحا، وقال إنني من المسلمين" (حم السجدۃ: ۳۳)

(اور اس سے بہتر کس کی بات ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک کام کیا اور کہا کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں)۔

۴۔ اگر ہندوستان کی فوج میں ساڑھے تیرہ فیصد دین دار با کردار اور با اخلاق مسلمان ہوں، وہ ایمانداری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو پوری کرنے والے ہوں، حتی الامکان حرام کاموں سے بچنے والے ہوں، شراب نوشی سے پرہیز کرنے والے ہوں تو غیر مسلم فوجیوں میں ہر اعتبار سے اس کا اثر پڑے گا۔

۵۔ ہندوستان میں سکھ مذہب کے ماننے والے اس ملک کی تیسری اقلیت اور ملک کی آبادی کا دو فیصد بھی نہیں ہیں، مگر وہ فوج میں مسلمانوں سے زیادہ ہیں، اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، فوج اور اس جیسے دیگر اداروں میں ان کی موجودگی اور گرفت ان کی عزت و احترام کا ایک اہم سبب ہے، حکومت ان سے ڈرتی ہے اور ان کی ہر طرح سے ناز برداری کرتی ہے، اگر مسلمان اپنی فیصد کے برابر بھی فوج اور اس جیسے دیگر اداروں میں اپنی سیٹیں سنبھال لیں تو کسی حکومت کو بھی یہ جرأت نہیں ہوگی کہ ان کے ساتھ ناانصافی کرے، قوت حاصل کرنا اور ہلاکت سے بچنا تو خدائی حکم ہے:

"وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة" (انفال: ۶۰) (اور ان سے لڑائی کے واسطے جتنی قوت بھی جمع کر سکو اتنی قوت جمع کرو)۔

"ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة" (بقرہ: ۱۹۵) (اور اپنی جان کو ہلاکت میں مت ڈالو)۔

خلاصہ یہ ہے کہ فوج میں مسلمانوں کی موجودگی کے بہت سارے فوائد ہیں، بعض فوائد ظاہری ہیں، بعض دوررس نتائج والے ایسے باطنی فوائد ہیں جن کا ذکر ہم برسرعام نہیں کرسکتے، مگر وہ لوگ ان فوائد کو بخوبی سمجھتے ہیں، جو مسلمانوں کے مسائل سے واقف ہیں۔

فوج کی ملازمت نہ کرنے کے نقصانات:

۱۔ اگر فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہو اور مسلمان فوج میں ملازمت کا اپنا ساڑھے تیرہ فیصد حق چھوڑ دیں تو مندرجہ ذیل نقصانات ہیں:

۱۔ چودہ لاکھ بیس ہزار مسلمان، قیام وطعام اور تعلیم وغیرہ کی سہولت سے دور رہ گئے۔

۲۔ وطن کی خاطر قربانی دینے سے مسلمانوں کی جو نیک نامی ہوسکتی تھی اس سے مسلمان محروم ہوگئے۔

۳۔ دعوت الی اللہ یا تقریب الی الاسلام والمسلمین والاعمال الصالحہ کا دائرہ تنگ ہوتا چلا گیا۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ مجموعی طور سے فوج کی ملازمت مسلمانوں کے لیے مفید ہے، اور یہ دعوت الی اللہ کا ایک اہم میدان ہے، اس لیے فوج میں ملازمت نہ صرف جائز ہے، بلکہ باکردار، بااخلاق اور دین دار مسلمانوں کا فوج میں شامل ہونا مستحسن ہے، تاکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی صحیح تصویر غیر مسلم فوجیوں کے سامنے پیش کرسکیں، البتہ ان پر ضروری ہے کہ وہ حتی الامکان بے قصوروں پر گولی چلانے سے پرہیز کریں، بڑی حکمت کے ساتھ اپنے دین اور اپنی ملت کے مفاد کے لیے کام کریں۔

ب۔ پولیس کی ملازمت:

پولیس کی ملازمت میں بھی مسلمان کئی غلط اور ناجائز کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، مگر ان ناجائز کاموں میں سے دو اہم ہیں:

۱۔ اعلیٰ افسر کے حکم سے مظلوموں پر گولیاں چلانا۔

۲۔ مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذارسانی کا ارتکاب کرنا، مظلوموں پر گولیاں چلانا، انہیں زخمی کرنا یا مار ڈالنا بہت بڑا گناہ ہے، اور یہ حرام ہے۔

دلائل

"من قتل نفسا" (مائدہ: ۳۲)۔

"السمع والطاعة" (البخاری، رقم الحدیث ۵۲۵۴، تفصیل کے لیے دیکھئے: ص ۸۔۷)

مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذارسانی کا ارتکاب کرنا بھی جائز نہیں ہے اور ایذارسانی کا ارتکاب ظلم ہے، شریعت میں جرم کا ثبوت کن چیزوں سے ہوتا ہے، ان کے متعلق "الفقہ الاسلامی وادلتہ" میں علامہ وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

"ويلاحظ أن العلماء إتفقوا على جواز إثبات جرائم القصاص في القتل والجرح العمد بالإقرار أو شهادة رجلين وعدد الشهود إثنان إلا في الزنا، فلا بدفيه من أربعة شهود لقوله تعالى: لولا جاء واعليه بأربعة شهداء، (النور) واختلفوا في جواز اثبات الجرائم بالقرائن والنكول عن اليمين والقسامة" (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ص ۵۸۰۶۔ ۵۷۹۷)۔

اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ علماء نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ جان بوجھ کر زخمی کرنے اور قتل جیسے قصاص کے جرائم میں جرم کا ثبوت اقرار سے ہوگا یا دو مردوں کی گواہی سے ہوگا۔

جرائم کے ثبوت میں دو گواہ ضروری ہیں، مگر زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "کیوں نہ

لائے اس بات پر چار شاہد"۔(النور:۱۳)۔

قرائن کے نکول عن الیمین اور قسامت کے ذریعہ جرم کے ثبوت پر علماء کا اختلاف ہے۔

پولیس کی ملازمت کے فوائد ونقصانات:

پولیس کی ملازمت کے فوائد ونقصانات تقریباً وہی ہیں جو فوج کی ملازمت کے ہیں اور جنہیں میں گذشتہ صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔

پولیس کی ملازمت کا حکم:

اس ملازمت میں اگر چہ بعض ناجائز کام کرنے پڑتے ہیں، مگر مسلمانوں کے وسیع تر مفاد کا تقاضہ یہی ہے کہ مسلمان اس اہم شعبے سے دور نہ رہیں، جہاں اس میں وسیع روزگار کے مواقع ہیں وہیں اس شعبے میں مسلمانوں کو تحفظ کا احساس دلاتی ہے، مسلمانوں کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر اس شعبہ کی ملازمت بھی جائز ہے۔

ج۔ شعبہ مخبری اور انٹیلیجنس کی ملازمت:

انٹیلی جنس کی ملازمت میں بھی کئی ناجائز کام کرنے پڑتے ہیں، ان ناجائز کاموں میں دو اہم ہیں:

۱۔ غیبت، ۲۔ تجسس

غیبت اور تجسس کے بارے میں ارشاد باری ہے: "ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضا أيحب أحدكم أن يأكل لحم أخيه ميتا فكرهتموه" (حجرات:۱۲) (اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو کیا تمہیں اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند ہے؟ ظاہر ہے مردہ بھائی کا گوشت کھانا تمہیں پسند نہیں ہوگا)۔

بعض حالات میں غیبت کی اجازت ہے۔

"امور تباح فيها الغيبة۔ الاصل في الغيبة التحريم للأدلة الثابتة في ذلك ومع هذا فقد ذكر النووي وغيره من العلماء أمور ستة تباح فيها الغيبة لما فيه من المصلحة"۔

"ومن هذه الأمور الستة"

"الاستعانة على تغيير المنكر"

"تحذير المسلمين من الشر" (موسوعه فقهيه، ۲۱/ ۳۳۵، كويت ۱۴۲۵ھ)۔

کن چیزوں میں غیبت جائز ہے۔

اصل یہ ہے کہ ثابت دلائل کی وجہ سے غیبت حرام ہے، مگر علامہ نووی اور دیگر علماء نے چھ صورتوں میں مصلحت کی وجہ سے غیبت کو جائز کہا ہے، اوران چھ صورتوں میں مندرجہ ذیل دوصورتیں بھی ہیں:

۱۔ منکر کو بدلنے کے لیے غیبت کرنا، ۲۔ مسلمانوں کو شر سے بچانے کے لیے غیبت کرنا۔

تجسس:

تجسس ایک بہت ہی مذموم فعل ہے، اور اولیاء امور کو خاص طور سے اس سے منع کیا گیا ہے۔

"ويتاكد ذلك في حق ولي الأمر بورود نصوص خاصة، تنهى أولياء الأمور عن تتبع عورات الناس، منها ماروله معاوية أن رسول الله ﷺ قال له: إنك إن اتبعت عورات الناس أفسدتهم أو كدت أن تفسدهم" فقال أبو الدرداء كلمة سمعها معاوية من رسول الله ﷺ نفعه الله بها، وعن أبي أمامة مرفوعا إلى النبي ﷺ إن الأمير إذا ابتغى

الريبة في الناس أفسدهم'' (اخرجه ابوداود،۵/ ۱۹۹، طبع عزت عبيد دعاس، واسناده صحيح، عون المعبود ۴/ ۴۲۲، دارالكتاب العربي موسوعه فقهيه، ۱۰/ ۱۶۷- ۱۶۶ کویت)۔

ان خاص نصوص کی وجہ سے جن میں اولیاء امور کو لوگوں کے عیوب کی ٹوہ میں لگنے سے منع کیا گیا ہے، اولیائے امور کے لیے یہ بات زیادہ ثابت ہوتی ہے کہ وہ تجسس نہ کریں۔

ان روایات میں ایک روایت وہ ہے جسے حضرت معاویہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم لوگوں کے عیوب کے ٹوہ میں لگو گے تو تم انہیں بگاڑ دو گے یا بگاڑ کے قریب کر دو گے۔

حضرت ابوالدرداءؓ نے (اس حدیث اور حضرت معاویہ کے طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے) فرمایا: یہ ایک ایسا کلمہ ہے جسے معاویہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نفع پہنچایا۔

اور حضرت ابوامامہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "امیر جب عوام میں شک تلاش کرتا ہے تو انہیں بگاڑ ڈالتا ہے۔"

یعنی امیر کو ہمیشہ اپنے عوام سے خیر کی امید کرنی چاہئے اور ان کا ذکر اچھے الفاظ سے کرنا چاہئے، تاکہ عوام اس سے خوش رہے اور ہمت وحوصلہ کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

تجسس کے جواز کی صورتیں:

''ولكن للحاكم أن يتجسس على رعيته إذا كان في ترك التجسس انتهاك حرمة يفوت استدراكها، مثل أن يخبره من يثق بصدقه أن رجلا خلا برجل ليقتله أو إمرأة ليزني بها، فيجوز له في هذا الحال أن يتجسس ويقدم على الكشف والبحث حذرا من فوات مالا يستدرك من انتهاك المحارم ارتكاب المحظورات'' (موسوعه فقهيه، ۱۰ /۱۶۷، کویت ۱۴۲۵ھ)۔

(لیکن حاکم کے لیے اپنے رعیت کا تجسس جائز ہے، جب وہ یہ محسوس کرے کہ تجسس نہ کرنے میں کسی ایسی حرمت کی پامالی ہوگی جس کی تلافی ممکن نہیں، جیسے اس کے کسی قابل اعتماد شخص نے اسے یہ خبر دی کہ فلاں آدمی کو قتل کرنے کے لیے تنہائی میں لے گیا ہے یا زنا کرنے کے لیے کسی عورت کو تنہائی میں لے گیا ہے، تو اس حال میں حاکم کو جائز ہے کہ وہ تجسس کرے، اور انکواری اور تحقیق کرے، تاکہ ان محارم کی پامالی سے بچا جائے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے، اور ناجائز کاموں کے ارتکاب سے بچایا جائے)۔

مندرجہ بالا عبارتوں سے یہ بات کھل کر واضح ہوتی ہے کہ منکرات اور فساد سے بچنے کے لیے غیبت وتجسس کا ارتکاب جائز ہے، انٹیلی جنس کے لوگ بھی اپنے ملک کے امن وامان اور سلامتی کی غرض سے ہی غیبت وتجسس کا ارتکاب کرتے ہیں، تجربے سے یہ بات ثابت ہے کہ جس ملک کی انٹیلی جنس جس قدر مضبوط ہوتی ہے وہ ملک اسی قدر اپنے پروگراموں میں کامیاب ہوتا ہے، امریکہ اور اسرائیل کی انٹیلی جنس اس کی مشہور مثالیں ہیں۔

شعبہ مخبری میں ملازمت کے فوائد ونقصانات:

اس شعبہ میں ملازمت کے فوائد ونقصانات تقریباً وہی ہیں جو فوج کی ملازمت کے ہیں، بلکہ اس شعبہ کی ملازمت مسلمانوں کے لیے دوسرے تمام سرکاری اداروں سے زیادہ مفید ہے، اور دوررس نتائج کا حامل ہے، اس طرح اس شعبہ سے دوری مسلمانوں کے لیے تمام سرکاری اداروں کی دوری سے زیادہ نقصان دہ ہے، کسی کو جمہوریت نواز کی سرٹیفکیٹ دینا اور کسی کو اسلامی دہشت گرد کی سرٹیفکیٹ دینا، اس طرح کے تمام کام شعبہ مخبری ہی کرتی ہے، شعبہ مخبری میں مسلمانوں اور اسلام پسندوں کا جس قدر عمل دخل ہوگا اسی قدر مسلمانوں کو راحت پہنچے گی۔

مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں مسلمانوں کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر اس شعبہ میں ملازمت جائز ہے۔

عدلیہ کی ملازمت:

ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے بہت سے قوانین شریعت اسلامی سے متصادم ہیں، اس کے باوجود ہم اسی ملک میں رہنے پر مجبور ہیں، یہ دور جمہوریت کا ہے اور یہاں فیصلے اکثریت کی بنیاد پر ہوتے ہیں، ہم اپنی طاقت کا صحیح استعمال کریں تو کسی نہ کسی حد تک حکومت کے تمام فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

عدالتوں سے دور رہ کر ہم ان لوگوں کو مزید مواقع فراہم کریں گے جو اسلام دشمن ہیں، اور جو ہندوستان کے دستور کی تشریح اپنے متعصبانہ، مشرکانہ اور ملحدانہ افکار وخیالات کے تناظر میں کرنا چاہتے ہیں اور ان میں سے بعض کر رہے ہیں، بابری مسجد کے متعلق ہائی کورٹ کے فیصلے سے انصاف پسند اور مسلم دیندار ججوں کی کمی کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے، بے شک ہمیں نام کے صبغۃ اللہ خان سے کوئی فائدہ نہیں، بلکہ ہمیں حقیقی صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا) کی ضرورت ہے، بابری مسجد کا فیصلہ کرنے والے جج ہمارے یہ صبغۃ اللہ خاں بھی کم از کم اپنی ایک تہائی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں اور اپنے ساتھ ایک غیر مسلم جج کو ملا کر بابری مسجد کی کل آراضی کا ایک تہائی حصہ مسلمانوں کو دینے کا فیصلہ کیا ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ انہیں یہ فیصلے کرنے میں کیا دقتیں پیش آئیں، مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسلام کا صحیح مطالعہ کیا ہوتا، انصاف کے اصولوں کو ذہن میں مستحضر رکھا ہوتا تو ان کا فیصلہ سب سے الگ ہوتا، ان کے انصاف پر مبنی فیصلے سے نہ صرف ہندوستانی جمہوریت کی شان رہ جاتی، بلکہ وہ اربوں انصاف پسند لوگوں اور مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن جاتے، ان کی دنیا میں بھی نیک نامی ہوتی اور عقبی بھی سنور جاتی۔

عدلیہ کی ملازمت کا حکم:

مسلمانوں کے وسیع تر مفاد اور بہت سارے نقصانات سے بچنے کی تدبیر کے طور پر عدلیہ کی ملازمت جائز ہے، بلکہ اس شعبے میں حقیقی مسلمانوں کا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ عدالتوں کا ایک ایک فیصلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کے بڑے دور رس نتائج ہوتے ہیں، اور بقول ایک سابق وزیر ججوں کی اکثریت رشوت خور ہے، ایسے حالات میں دیندار مسلمانوں پر ضروری ہے کہ ان احکام خداوندی پر عمل کریں۔

"وأقسطوا إن الله يحب المقسطين" (حجرات:۹) (اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں)۔

"يا أيها الذين آمنوا كونوا قوامين لله شهداء بالقسط" (المائدہ:۸) (اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو)۔

انکم ٹیکس کی ملازمت:

شعبہ انکم ٹیکس میں تین اہم خرابیاں ہیں:

۱۔ انکم ٹیکس کی شرحیں بہت زیادہ اور ظالمانہ ہیں۔ ۲۔ انکم ٹیکس کو ٹھیک طور پر عوامی فلاح پر استعمال نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ آمدنی کا بڑا حصہ حکمرانوں کی عیش کوشی اور انہیں دی گئی غیر معمولی سہولتوں پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ ۳۔ انکم ٹیکس کے حصول کے لیے نجی معاملات اور دولت کے سلسلے میں تجسس کیا جاتا ہے۔

گویا اس ملازمت میں، ظلم اور تجسس دو بڑے گناہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

انکم ٹیکس کی ملازمت کا حکم:

مسلمانوں کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر اس شعبہ کی ملازمت بھی مسلمانوں کے لیے جائز ہے، مگر اس کے ساتھ مسلمانوں پر یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علم وفن اور اثر ورسوخ کا استعمال کر کے انکم ٹیکس کی شرحوں کو کم سے کم کرانے کی کوشش کریں، اور انکم ٹیکس کے صحیح استعمال کی طرف بھی حکام کو متوجہ کرتے رہیں۔

۲۔الف: بینک اصل میں سودی لین دین کا بنیادی طور پر کاروبار کرنے کا نام ہے، اور سود اسلام میں حرام ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أحل الله البيع وحرم الربوا" (بقرہ: ۲۷۵)۔

"يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربوا إن كنتم مؤمنين، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله" (بقرہ: ۲۷۹-۲۷۸)

جو لوگ بھی بینک کی ملازمت کرتے ہیں وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ ایک حرام کام، یعنی سودی کاروبار کا تعاون کرتے ہیں، سودی کاروبار کا بلاواسطہ تعاون کرنے والے وہ لوگ ہیں جو سودی حسابات لکھتے ہیں اور بینک میں منیجروں اور کلرکوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

اور سودی کاروبار کا بالواسطہ تعاون وہ لوگ کرتے ہیں جو بینک کے کمپیوٹروں اور ایئر کنڈیشن وغیرہ کی مرمت کرتے ہیں، بینک کی حفاظت کرتے ہیں یا جانتے بوجھتے بینک کے مکان کی تعمیر کرتے ہیں، یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (مائدہ: ۲)۔

بینک کے کمپیوٹروں کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے ہوئے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا، یہ تمام صورتیں سودی معاملات کے تعاون میں شمار کی جائیں گی اور اس نوعیت کی کوئی بھی ملازمت یا تعاون جائز نہیں ہوگا۔

ب۔ انشورنس کی وہ صورتیں جو ربا اور قمار پر مبنی ہیں وہ حرام ہیں، اور ان میں ملازمت بھی جائز نہیں، اس لیے کہ یہ "تعاون علی الاثم والعدوان" ہے۔ البتہ وہ صورتیں جن میں ربا اور قمار نہیں ہے، اور کسی کمپنی کی یہ صورتیں بالکل مستقل ہیں، یعنی ربا اور قمار سے خالی انشورنس کی صورتوں کے ملازموں کا ربا اور قمار والی صورتوں سے کوئی تعلق نہ ہو تو انشورنس کی ان جائز صورتوں میں ملازمت جائز ہوگی، اس لیے کہ اصل اشیاء میں حلت ہے: "الأصل في الأشياء الاباحة" (الاشباہ والنظائر، ص ۶۶، دار الکتب العربیہ بیروت لبنان طبع ۱۴۰۰ھ)۔

ج۔ شراب فی نفسہ حرام ہے، اور اس کی حرمت نص قطعی قرآن سے ثابت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے شراب کو ناپاک کہہ کر اس سے بچنے کا حکم فرمایا ہے، اس لیے شراب سے مکمل اجتناب ضروری ہے، لہٰذا شراب کی کمپنی کی کوئی بھی ملازمت جائز نہیں ہوگی، شراب کی خرید وفروخت کا حرام ہونا تو اظہر من الشمس ہے، شراب کی بوتلیں بنانا، شراب کی حرام تجارت کا حساب کتاب لکھنا، یا شراب کی کمپنی کی وہ چیزیں بیچنا جن سے شراب بنتی ہو، یہ سب صورتیں تعاون علی الاثم میں شامل ہیں، شراب کی تیاری میں کسی طرح کا بھی تعاون صرف ایک حرام کام میں تعاون نہیں، بلکہ شراب کے نشے میں وقوع پذیر ہونے والے بہت سارے حرام کاموں اور اسراف جیسے ایک بہت بڑے حرام فعل میں بھی تعاون ہے۔

۳۔الف۔شراب کے گوشے والی سپر مارکیٹ کی ملازمت:

ایسے سپر مارکیٹ جس میں شراب کی دکان یا گوشہ بالکل الگ ہو اور اس کا حساب کتاب بھی بالکل الگ تھلگ ہو، شراب کی اس دکان یا گوشے کا سپر مارکیٹ کی دوسری دکانوں یا گوشوں سے کوئی تعلق نہ ہو تو ایسے سپر مارکیٹ کے ان دکانوں یا گوشوں میں ملازمت جائز ہے جہاں حلال چیزیں بیچی جاتی ہیں۔ اس لیے سپر مارکیٹ کے متعدد اور مختلف گوشے حکومت کے متعدد اور مختلف شعبوں کی طرح ہیں، جس طرح حکومت کے وہ شعبے جو فی نفسہ جائز کاموں اور لوگوں کی خدمت کے لیے ہیں ان میں ملازمت جائز ہے، اسی طرح سپر مارکیٹ کے ان گوشوں میں بھی ملازمت جائز ہے جو جائز کاموں اور لوگوں کی خدمت کے لیے ہیں، اور ان گوشوں کا حرام گوشوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، آج کل سپر مارکیٹوں کا چلن ساری دنیا میں بڑھ رہا ہے ایک ایک سپر مارکیٹ میں سینکڑوں دکانیں ہوتی ہیں، اگر ہم علی الاطلاق یہ کہیں کہ یہ جس سپر مارکیٹ میں بھی شراب کا گوشہ ہو اس میں ملازمت جائز نہیں تو اس سے حرج عظیم واقع ہوگا۔

اور اگر سپر مارکیٹ ایسی ہے جس میں شراب کے گوشے اور دیگر حلال گوشوں کا حساب کتاب ایک ہی ہو یا حلال گوشے کے ملازمین کو شراب کے گوشے یا دیگر حرام گوشے میں بھی کام کرنا پڑتا ہو تو ایسے سپر مارکیٹ کی ملازمت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے۔

ب۔ اس سوال کا جواب پردے اور خلوت کے طویل بحث سے متعلق ہے، مختصراً عرض یہ ہے کہ اگر وہ مرد ہے تو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ مخلوط

درسگاہ یا لڑکیوں کے درسگاہ میں پڑھانا جائز ہے۔

ا۔ وہ بغیر ضرورت کے عورتوں اور لڑکیوں کو نہ دیکھے۔ ۲۔ عورتوں اور لڑکیوں کو شہوت کی نظر سے ہرگز نہ دیکھے، اگر کبھی دل میں کوئی برا خیال آئے تو یہ فرض کرے کہ یہ سب میری بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔ ۳۔ خلوت میں ملاقات سے بالکلیہ اجتناب کرے، ۴۔ بقدر استطاعت ان کو پردے کی اہمیت بتائے، اور کم از کم پردے کے تیسرے درجے پر عمل کی ترغیب دے، یعنی چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ سارے بدن کو ڈھانکنے کی ترغیب دے۔

خواتین اساتذہ کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ مخلوط درسگاہ یا لڑکوں کے درسگاہ میں پڑھانا جائز ہے۔

ا۔ خود خاتون استاذ مکمل شرعی پردے میں ہو، لباس دبیز اور مکمل ساتر ہو، لباس اس قدر بھڑکیلا نہ ہو کہ مردوں کے لیے کشش کا باعث بنے، خوشبو کے استعمال سے اجتناب ہو، پایل یا چھلوں کے پہننے سے بچیں، جن لڑکوں اور مردوں کو وہ پڑھا رہی ہیں ان کو بلا ضرورت اور شہوت کی نظر سے نہ دیکھیں، ان کو اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے برابر سمجھیں، ان کے سامنے ناز و انداز نہ دکھائیں، ادارے کا ماحول ایسا ہو جس میں عزت کو خطرہ نہ ہو۔

ج۔ وکالت کے پیشے کا حکم:

وکالت کا پیشہ فی نفسہ جائز ہے اور یہ بڑا آزاد پیشہ ہے، اگر انسان ایماندار اور دولت کا حریص نہ ہو تو اس پیشے کے ذریعہ مظلوموں کی خدمت کر کے اپنی عاقبت سنوار سکتا ہے، چونکہ اسلام عدل و انصاف کی تعلیم دیتا ہے، ایمانداری اور دیانتداری کی تعلیم دیتا ہے، اس لئے حقیقی مسلمانوں کے اس پیشے میں آنے سے اس پیشے میں موجود جھوٹ کے دبدبے کا انشاء اللہ خاتمہ ہو جائے گا، اور سچ کا بول بالا ہوگا۔

د۔ کرپٹ ہاسپیٹل کی ملازمت:

ڈاکٹروں کے لیے تو ایسے اسپتالوں میں ملازمت کرنا تو کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے اور ڈاکٹروں کی کوئی مجبوری بھی نہیں ہے، وہ جہاں بھی بیٹھ جائیں ان کی دکان چلتی رہے گی، بلکہ ڈاکٹروں پر لازم ہے کہ وہ ایسے اسپتالوں کے خلاف آواز اٹھائیں اور ایسے اسپتالوں کا مکمل بائیکاٹ کریں، البتہ دیگر ملازمین کے لیے بدرجہ مجبوری ایسے اسپتالوں کی ملازمت جائز ہوگی، مگر ان پر بھی لازم ہے کہ وہ حتی الامکان ناجائز کاموں مین شرکت سے پرہیز کریں۔

ھ۔ حرام کام کرنے والے ہوٹلوں کی ملازمت:

جن ہوٹلوں میں شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص و موسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ ہوں، ایسے ہوٹلوں کی تین قسمیں بنائی جا سکتی ہیں۔

ا۔ وہ ہوٹل جس کا بنیادی مقصد قیام وطعام کی سہولت فراہم کرنا ہو، شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام اور دیگر غیر اسلامی اعمال اس ہوٹل کے بنیادی مقاصد میں شامل نہ ہوں، نیز شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کے انتظام اور دیگر غیر اسلامی اعمال سے ہونے والی آمدنی کا حساب کتاب بھی الگ ہو اور اس طرح کے حرام کاموں کی تجارت ہوٹل کی اکثری تجارت نہ ہو، تو ایسے ہوٹلوں کے جائز کاموں کے شعبوں میں ملازمت جائز ہے، اس لیے کہ اصل اشیاء میں حلت ہے، اور جس چیز کا حساب کتاب الگ ہو وہ ایک الگ شعبے کے مانند ہے، اور جس طرح غیر اسلامی حکومت کے جائز شعبوں میں ملازمت جائز ہے اسی طرح ایک ہوٹل کو ایک حکومت کی مانند مان کر اس کو حلال وحرام دو شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور حلال شعبے مین کام کرنا جائز قرار دیا جائے اور حرام شعبے میں کام کرنا حرام قرار دیا جائے، تاکہ تعاون علی الاثم والعدوان سے بچا بھی جا سکے اور روزگار کے ذرائع بہت زیادہ محدود بھی نہ ہوں۔

۲۔ وہ ہوٹل جس کا بنیادی مقصد بظاہر قیام وطعام کی سہولت فراہم کرنا ہو، مگر شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام یا دیگر ناجائز اعمال ہی اس ہوٹل کی اکثری تجارت کے ذرائع ہوں، یا حلال کاموں اور حرام کاموں کی تجارت کا الگ الگ حساب کتاب نہ ہو، تو ایسے ہوٹلوں کی ملازمت جائز

نہیں ہے اوراس کے ناجائز ہونے کی دو وجہیں ہیں:

ہوٹل کی اکثری تجارت حرام ہے۔

حرام وحلال کاموں کے حسابات ایک ہونے سے حلال کمائی اور حرام کمائی میں تمیز مشکل ہوگیا ہے۔اور فقہ کا قاعدہ ہے: "إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام علی الحلال" (الاشباہ والنظائر، ۹، دارالکتب العلمیہ، بیروت لبنان، ۱۴۰۵ھ)

۳۔ وہ ہوٹل جس کا بنیادی مقصد قیام وطعام کی سہولت فراہم کرنا ہو، اور شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام یا دیگر ناجائز اعمال اس ہوٹل کی اکثری تجارت نہ ہو، مگر جائز اعمال اور ناجائز اعمال کا حساب کتاب الگ الگ نہ ہو تو ایسے ہوٹل میں بھی ملازمت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ "جب حلال وحرام جمع ہو جائیں تو حرام حلال پر غالب آجاتا ہے۔" (الاشباہ والنظائر/ ۹)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہوٹل میں شراب کی فراہمی یا دیگر حرام کاموں کی ملازمت تو کسی حال میں جائز نہیں ہوگی، البتہ ہوٹل کے جائز کاموں کی ملازمت مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہوگی:

۱۔ حرام کاموں کا حساب کتاب الگ ہو، جائز کام کرنے والوں کا حرام کاموں سے کوئی تعلق نہ ہو۔

۲۔ اس ہوٹل کی اکثری تجارت حرام کاموں کے ذریعہ نہ ہو۔

۳۔ اس ہوٹل کا بنیادی مقصد حرام کاموں کی تجارت نہ ہو۔

☆☆☆

حکومت کے مختلف اداروں میں ملازمت کا شرعی حکم

مولانا سلمان پالنپوری قاسمی[1]

ملازمت کی بعض صورتوں کا ذکر:

۱۔ ایسے کاموں کی ملازمت جو فی نفسہ جائز ہو، مگر اس کی وجہ سے گناہ کے کام کے لیے سبب یا اس میں تعاون کرنا لازم آتا ہو، ناجائز ہے، البتہ اجرت اور تنخواہ حرام نہیں۔

۲۔ ایسے کام کی ملازمت جو فی نفسہ جائز ہو، مگر اس کی انجام دہی کے لیے ماحول کی خرابی یا اس شعبہ کی بدنظمی کی وجہ سے مرتکب معصیت ہونا پڑتا ہے، ناجائز ہے، یہ ملازمت صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جو معصیت کے ارتکاب کے بغیر کار مفوضۃ کو انجام دے سکتا ہو، البتہ اجرت اور تنخواہ بہر صورت حلال ہے، کیونکہ یہ جائز کام کا اجارہ ہے، معصیت کی نہیں۔

۳۔ معصیت اور گناہ کے کام کی ملازمت اور اجرت ناجائز اور حرام ہے۔

ملازمت شرعی احکام کے دائرہ میں رہ کر کرنی چاہئے، ملازمت کی وجہ سے عام حالات میں دین کے کسی معمولی سے معمولی حکم یا تقاضے کو بھی قربان کرنا جائز نہیں ہے، البتہ خصوصی حالات اور مجبوری کے احکام جداگانہ ہیں، جس درجہ کی مجبوری ہوتی ہے اس درجہ کی اس کے لیے احکام میں سہولت بھی ہوتی ہے، حتیٰ کہ جان بچانے کے لیے مردار کھانے اور دفع ضرر کے لیے غیبت کی بھی اجازت ہوتی ہے، سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک صاحب سے سوال کیا کہ علم کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ شر کے مقابلہ میں خیر کو جاننا "معرفة الخیر من الشر" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی، کیونکہ ظاہر ہے کہ جب ایک طرف شر اور دوسری طرف خیر ہو تو خیر کا انتخاب کیا جائے گا، اور شر کو چھوڑ دیا جائے گا، پھر فرمایا کہ علم نام ہے دو شر میں سے ایسی چیز کے جاننے کا جو نسبتاً بہتر ہو، "معرفة خیر الشرین" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم، ۱/ ۸۹)، یہ نہایت اہم بات ہے جو کتاب وسنت کے مختلف احکام سے ثابت ہیں۔

زیر بحث ملازمتوں میں سے بعض ملازمتیں ایسی ہیں کہ جن کو اختیار کرنا اور اختیار کرنے سے پہلوتہی برتنا، دونوں ہی صورتیں شر اور ضرر سے خالی نہیں، ایسے موقع پر فقہ کا مشہور ضابطہ اور اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بڑے شر اور ضرر سے بچنے کے لیے کمتر درجہ کے شر اور ضرر (خیر الشرین) کو گوارا کیا جائے، چنانچہ فقہاء نے اس طرح کے اصول وقواعد کو مختلف الفاظ اور تعبیرات میں بیان کیا ہے۔

"إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتکاب اخفهما" (سابق حوالہ)
(جب دو برائیاں درپیش ہوں تو کمتر برائی کو گوارا کر کے بڑی برائی کو روکا جائے گا)۔

"لو کان أحدهما أعظم ضررًا من الآخر فإن الأشد یزال بالأخف" (سابق حوالہ، ۱/ ۹۰)
(اگر دو ضرر درپیش ہوں اور ان میں سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑا ہو تو کمتر ضرر کو گوارا کر کے بڑے ضرر سے بچا جائے گا)۔

"من ابتلی ببلیتین وهما متساویان، یأخذ بأیتهما شاء، وإن اختلفتا یختار أهونهما" (حوالہ سابق)
(کوئی شخص دو نقصانوں میں مبتلا ہو، اور دونوں نقصان مساوی ہوں، تو جس نقصان کو گوارا کرنا چاہے کر سکتا ہے اور اگر دونوں نقصان باہم متفاوت ہوں تو کمتر درجہ کے نقصان کو اختیار کر کے بڑے نقصان سے بچے گا)۔

---

[1] مفتی مدرسہ جامعہ خلیلیہ ماہی، شمالی گجرات۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ کفار مسلمانوں سے جنگ کی صورت میں مسلم قیدیوں یا بچوں کو ہی ڈھال بنائیں، اور ان ہی کو آگے رکھیں، پھر اسلامی لشکر تیر چلاتے وقت مسلمان قیدیوں یا بچوں کو نشانہ بنانے کی نیت نہ کرے، بلکہ کافروں کو نشانہ بنانے کی نیت کرے، تو تیر چلانا درست ہوگا ورنہ حرام ہوگا، گو اس ضمن میں مسلمان قیدی یا بچے مارے جائیں گے، کیونکہ بعض مسلم قیدی یا بچے کا قتل ہونا اسلامی ملک کے مصالح کے مقابلے میں اخف اور کمتر ضرر ہے جو گوارا کیا جائے گا۔ (الاشباہ والحموی، ۱/ ۱۰۷۔ ۲۵۶)۔

اسی طرح شرعی قباحتوں کے باوجود دفع ضرر یا تقلیل ضرر کی نیت سے وہ سرکاری ملازمتیں اختیار کرنے کی گنجائش ہوگی جن سے کنارہ کش ہونے کی صورت میں بڑے ضرر کا قوی اندیشہ ہو۔

مذکورہ بالا تمہیدی اصولی باتوں کے بعد جوابات پیش خدمت ہیں:

ا۔ بعض وہ ملازمتیں جن کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے، لیکن اندیشہ ہوتا ہے کہ اس میں بعض دفعہ خلاف شریعت عمل کا ارتکاب کرنا پڑے گا۔

الف، ب: فوج اور شعبہ پولیس میں ملازمت:

حکومت کا ایک اہم شعبہ فوج ہے جس کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے، اور دوسرا شعبہ پولیس کا ہے جس کا بنیادی مقصد ہی اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے، ظاہر ہے کہ فی نفسہ یہ بہتر مقاصد ہیں، لیکن بعض دفعہ فوج کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کے بغیر وار کرنا پڑتا ہے اور اسی طرح ایک مسلمان فوجی کا بدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص بھی ہوسکتا ہے اور پولیس کو بھی بعض اوقات مظلوموں پر گولی چلانی پڑتی ہے، مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذا رسانی کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے جو عام حالات میں شرعاً درست نہیں، البتہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ فوج اور شعبہ پولیس میں مسلمانوں کا رہنا اجتماعی لحاظ سے ضروری اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے، بہت سی دفعہ اس کی وجہ سے مسلمان فوج اور پولیس کے ظلم وزیادتی سے بچ سکتے ہیں، اگر فوج اور پولیس میں مسلمان نہ ہوں تو اس سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان اور کئی جانوں کا ضیاع اور انصاف سے محرومی کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے جیسا کہ ماضی کے حالات وفسادات شاہد ہیں، اس لیے فوج اور شعبہ پولیس میں ملازمت اختیار کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ فقہ کا مشہور ضابطہ ہے:

"اذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتکاب اخفهما" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم، ۱/۸۹)

(اگر دو مفاسد سامنے ہوں اور دونوں سے بچنا ممکن نہ ہو تو پھر کمتر درجہ کے مفسدہ کو گوارا کیا جاسکتا ہے)۔

چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: اس وقت مسلمانوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ ایسی حکومتیں (اور عہدے) قبول کرلیا کرے اور یہ اس قاعدے میں داخل ہے کہ اشد المفسد تین کو دفع کرنے کے لیے اخف المفسد تین (یعنی بڑے مفسدہ اور نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹے مفسدہ اور چھوٹے نقصان کو) اختیار کرلیا جاتا ہے اور ہے تو یہ بھی برا (اور غلط) لیکن دوسرے مفسدہ کی بہ نسبت پھر بھی اخف (ہلکا) ہے اور وہ بڑا مفسدہ یہ ہے کہ ہماری قوم (مسلمان) بالکلیہ دوسروں سے مغلوب نہ ہوجائے، کیونکہ اگر ہم بھی حاکم ہوں گے، تو ہم پر ظلم کم ہوگا، پس اس نیت سے اگر عہدہ لے لے (تو اس میں بڑی) مصلحت ہے (حسن العزیز ۳/ ۱۵۸) (الغرض اس قسم کے عہدوں کو) اگر مضرت کو دفع کرنے کی غرض سے اختیار کیا جائے تاکہ امت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم اور مضرتیں پہنچتی ہیں اہل مناصب بقدر امکان اگر ان کو دفع نہ کرسکیں تو کم ازکم تقلیل وتخفیف کرسکیں گے تو اس صورت میں جواز کی گنجائش ہے (صاىب الکلام، بوادر النوادر/ص ۷۹۸، اسلامی حکومت ودستور مملکت حضرت تھانوی/ص ۲۳۸)۔

مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اگر آپ ملازمت کے بہت اور اونچے اور ایسے کلیدی عہدے پر فائز ہیں کہ آپ کے ذریعہ سے عام مسلمانوں کے جان ومال کا تحفظ رہتا ہے یا ان کو قانونی نفع وحق ملتا رہتا ہے اور عام طبقہ وتعدی سے محفوظ رہتا ہے تو اس حالت میں آپ کے لیے ملازمت چھوڑ دینے کا حکم شرعاً نہ ہوگا، بلکہ احتیاط برتتے ہوئے قوم مسلم کے جائز مفادات کی خاطر ملازمت باقی رکھئے بشرطیکہ آپ میں واقعی حمایت مسلم کا جذبہ موجود ہو" (فتاوی نظامیہ، ص ۴۱۹)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فوج اور شعبہ پولیس میں دو شرطوں کے ساتھ ملازمت اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

فوج اور شعبہ پولیس میں ملازمت اختیار نہ کرنے کی صورت میں ضرر شدید لاحق ہونے کا خطرہ ہو۔

دفع ضرر یا تقلیل ضرر کی نیت سے ملازمت اختیار کی جائے، لیکن ہر حال میں جہاں تک ممکن ہو خلاف شرع عمل کے ارتکاب سے بچنے کی کوشش کرے اور استغفار کرتا رہے۔

ج۔ شعبہ مخبری میں ملازمت:

حکومت کا ایک اہم شعبہ مخبری اور انٹیلیجنس ہے جس میں تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، حالانکہ قرآن کریم میں دونوں کی حرمت مصرح ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا" (حجرات)۔

تجسس کی ممانعت کا یہ حکم صرف افراد ہی کے لیے نہیں بلکہ حکومت کے لیے بھی ہے، شریعت نے نہی عن المنکر کا جو فریضہ حکومت کے سپرد کیا ہے اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ جاسوسی کا ایک نظام قائم کرکے لوگوں کی چھپی ہوئی برائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور ان پر سزا دے، بلکہ اسے صرف ان برائیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنی چاہئے جو ظاہر ہو جائیں، رہی مخفی خرابیاں تو ان کی اصلاح کا راستہ جاسوسی نہیں ہے، بلکہ تعلیم، وعظ وتلقین، عوام کی اجتماعی تربیت اور ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہے، اس سلسلے میں حضرت عمر کا یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا آپ کو شک گزرا اور دیوار پر چڑھ گئے تو دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی آپ نے پکار کر کہا: اے دشمن خدا! کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا، اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟ اس نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین جلدی نہ کیجیے، اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کیے ہیں، اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا، اللہ نے حکم دیا تھا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ، اور آپ دیوار پر چڑھ آئے، اللہ نے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اجازت لیے بغیر نہ جاؤ، اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے، یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے اور اس کے خلاف آپ نے کوئی کارروائی نہ کی، البتہ اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے۔ (تفسیر انوار القرآن، ۱۰/ ۳۹۴)۔

اس سے معلوم ہوا کہ افراد ہی کے لیے خود اسلامی حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے راز ٹٹول ٹٹول کر ان کے گناہوں کا پتہ چلائے اور پھر انہیں پکڑے، یہی بات ایک حدیث میں بھی ارشاد ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ان الأمیر اذا ابتغی فی الناس ریبة افسدھم" (ابوداؤد شریف، حدیث نمبر ۴۸۸۹) (حکمران جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگے تو وہ ان کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے)۔

اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ مخصوص حالات ہیں جن میں تجسس کی فی الحقیقت ضرورت ہو مثلاً کسی شخص یا گروہ کے رویہ میں بگاڑ کی کچھ علامات نمایاں نظر آ رہی ہوں اور اس کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا ہے تو حکومت اس کے حالات کی تحقیق کر سکتی ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ رقم طراز ہیں:

سوال: خفیہ پولیس کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس نیت سے جائز ہے کہ میں لوگوں کو نقصان سے بچاؤں گا یا اس نیت سے کہ دوسرا جو نقصان پہنچاتا ہے اس سے کم پہنچے گا، یعنی اس کے مقابلہ میں مجھ سے نقصان کم پہنچے گا، دوسروں سے زیادہ پہنچے گا۔ (اسلامی حکومت ودستور مملکت، حضرت تھانوی، ص ۲۳۸)۔

۔ عدالت میں ملازمت:

انصاف کی فراہمی، ظلم وحق تلفی کی روک تھام اور نزاعات کے طے کرنے کے لیے عدلیہ کا نظام قائم ہے اور ہر مہذب معاشرہ کے لیے اس نظام کا وجود ناگزیر ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کا دستور یا قانون کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر مبنی نہیں ہے، بلکہ بہت سے قوانین شریعت اسلامی سے متصادم بھی ہیں، نیز وکلاء میں جھوٹ اور غلط مقدمات کی پیروی ایک عام سی بات ہو گئی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی

نسبت سے عدالت کے رویہ کو بھی منصفانہ نہیں کہا جاسکتا ہے، اگر عدالتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہوجائے تو قوی اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی مظلومیت اور بڑھ جائے گی، اور ضرر عظیم لاحق ہوگا، اس لیے اس اہم تر مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے "یتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام" کے ضابطہ کی بنا پر عدالتوں میں ملازمت اختیار کرنے کی گنجائش ہے، البتہ دل میں اس غیر اسلامی نظام کی طرف سے ایک چبھن اور اس پر بے اطمینانی رہنی چاہئے اور موجودہ حالات کو ایک مجبوری کے طور پر گوارا کرتے رہنا چاہئے، ہاں وہ برائیاں جن سے بچنا انسان کے اختیار میں ہے وہ کسی حال میں جائز نہیں، چنانچہ حضرت تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

جواب: قاعدہ شرعیہ ہے کہ اشد الضررین کے دفع کے لیے اخف الضررین کو گوارا کرلیا جاتا ہے اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ حصول نفع کے لیے دینی ضرر کو گوارا نہیں کیا جاتا، اس بنا پر اس مسئلہ میں تفصیل ہوگی کہ جو لوگ ان حکومتوں اور عہدوں کو اختیار کرتے ہیں، دیکھنا چاہئے کہ ان کے قبول نہ کرنے سے خود ان کو یا عامہ اہل اسلام کو کوئی ضرر شدید لاحق ہونا غالب ہے یا نہیں؟ پہلی صورت میں تو (یعنی جبکہ ضرر شدید کا خطرہ ہو) ان حکومتوں کا قبول کرنا جائز ہے اور دوسری صورت میں دیکھنا چاہئے کہ آیا اس شخص کی نیت اس ضرر کے دفع کی ہے یا کوئی مالی یا جانی نفع حاصل کرنے کی، اول صورت میں جواز کی گنجائش ہے اور دوسری صورت میں ناجائز، پس کل تین صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں جواز کی گنجائش ہوئی (یعنی جب ضرر شدید لاحق ہونے کا خطرہ بھی ہو اور دفع ضرر کی صورت سے اس کو حاصل کیا جائے) اور اس صورت میں آیت (مذکورہ فی السوال) کا محمل بقیہ دو صورتیں ہوں گی (یعنی جبکہ ضرر شدید کا خطرہ نہ ہو یا ہو تو لیکن دفع ضرر کی نیت سے نہیں، بلکہ محض حصول نفع کی نیت سے حاصل کرے، تو ناجائز ہے) خصوصاً اگر جائز یا مستحسن سمجھے تو کفر ہے، البتہ اگر دو ناجائز صورتوں میں بھی سلطنت کی طرف سے مجبور کیا جائے اور عذر قبول نہ کیا جائے تو پھر ان میں بھی گنجائش ہے، لیکن ہر حال میں جہاں تک ممکن ہو خلاف شریعت سے بچنے کی کوشش کرے۔ (امداد الفتاویٰ، ۳/ ۴۳۰، اسلامی حکومت و دستور مملکت، ص ۲۳۶)۔

ھ۔ شعبہ انکم ٹیکس میں ملازمت:

شریعت نے ٹیکس کو حرام قرار دیا ہے اور ٹیکس وصول کرنے والے کے لیے سخت وعید ہے، لہٰذا محکمہ مذکورہ کی ملازمت عام حالات میں ناجائز ہے، چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک سوال میں فرماتے ہیں:

جواب: جو قواعد شریعت نے مقرر کئے ہیں، جن کو باب العاشر نے ضبط کیا ہے، چونکہ محکمہ مذکور کے قواعد ان پر منطبق نہیں ہیں اس لیے ما انزل اللہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر مشروع ہوئے اور حسب ارشاد الٰہی "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" اس کی اعانت بھی معصیت ہوئی، لہٰذا محکمہ مذکور کی ملازمت ناجائز ہے، مگر جو تنخواہ ملتی ہے وہ اس وجہ سے کہ حاکم غیر مسلم کا استیلاء اموال پر موجب تملیک ہوجاتا ہے اور حاکم غیر مؤمن جو مال برضائے خود کسی مؤمن کو دیں خواہ کسی عنوان سے ہو مباح ہے، اس لیے وہ تنخواہ حلال ہے، غرض من وجہ غیر مشروع اور من وجہ مشروع ہے، پس عامل کو صرف عمل کا گناہ ہوگا اور غیر عامل جو اس تنخواہ سے منتفع ہو مثلاً اس کے اہل وعیال یا مہمان اور احباب ان لوگوں کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ، ۳/ ۳۹۵)۔

البتہ اگر مسلمانوں کے انکم ٹیکس کے شعبہ سے کنارہ کش اور سبکدوش ہوجانے کی صورت میں مسلمانوں پر ظلم وزیادتی اور ان کے اموال پر ناحق دست درازی کا قوی اندیشہ ہو، تو دفع شر یا تقلیل شر کی نیت سے اہون البلیتین اختیار کرنے کے ضابطے کی بنیاد پر اس شعبہ میں ملازمت کی گنجائش ہوگی۔

احکام القرآن للتھانوی میں ہے:

"وحاصل کلامه فيه أن اختيار هذه المناصب المخولة لجلب المنفعة لنفسه أو لغيره حرام كما هو حقيقة هذه المناصب الا أن أريد به دفع المضرة عن نفسه وعن المسلمين فيرجى ان لا يلحقه به اثم لكونه اختيار الأهون البليتين واخف الضررين كما هو معروف في قواعد الأشباه والنظائر" (احکام القرآن للتھانوی، ۳/ ۸۳)۔

(اس سلسلے میں ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ اپنے یا دوسروں کے فائدہ کے لیے ان ناجائز عہدوں (ملازمتوں) کو قبول کرنا حرام ہے جیسا کہ

ان عہدوں کی یہی حقیقت ہے، البتہ اگر ان کے ذریعہ اپنے اور مسلمانوں سے دفع مضرت مقصود ہے تو پھر امید ہے کہ ان کو اختیار کرنا موجب معصیت نہ ہوگا، کیونکہ یہ اہون البلیتین اور اخف الضررین کو اختیار کرنا ہے، جیسا کہ الاشباہ والنظائر کے قواعد میں یہ بات مشہور ہے)۔

۲۔ بعض وہ ملازمتیں جن کا سرکاری ہونا ضروری نہیں، لیکن وہ بنیادی طور پر محرمات پر مبنی ہیں:

الف۔ بینک میں ملازمت:

سود میں خود کو ملوث کرنا ہی گناہ نہیں ہے، بلکہ اس کے کاروبار میں مدد ومعاون ہونا بھی معصیت ہے، یوں تو تمام گناہ کے کاموں میں اعانت ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" لیکن خصوصیت سے سود کے متعلق آپ ﷺ کی صراحت موجود ہے، حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ"لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربوا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال: هم سواء"(صحیح مسلم عن جابر باب الربا ۲/ ۲۷) (رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کے کاتب نیز گواہوں سبھی پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ وہ سبھی (گناہ میں) برابر ہیں۔)

یہاں سود کے لکھنے والوں اور گواہوں پر حضور ﷺ کی لعنت سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں آدمی کسی ذمہ دارانہ عہدہ پر فائز ہو یا سودی معاملات لکھنے پڑتے ہوں، جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی حیثیت ربوا کے کاتبین اور گواہوں کی ہوگی اور ان کو حضور ﷺ نے نہ صرف یہ کہ ملعون قرار دیا ہے بلکہ سود خوروں کے مساوی قرار دیا ہے، ہاں ایسی ذمہ داریاں جن کا تعلق براہ راست سودی کاروبار سے نہ ہو، بلکہ وہ بینک کے دوسرے کام یا اس کی حفاظت پر ملازم ہو تو یہ ملازمت جائز ہے، البتہ ایسی ملازمت سے بھی احتراز بہتر ہے، مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:"بینک کی ایسی ملازمت جو جائز ہو، جائز ہے، اسکی ہر ملازمت ناجائز نہیں"(منتخبات نظام الفتاویٰ، ۱/ ۱۹۳۔ ۲۲۵، نیز دیکھئے: اسلام اور جدید معاشی مسائل، ۴/ ۱۳۵۔ ۱۳۶)

بینک کے لیے مکان کرایہ پر دینا:

بینک ایک سودی کاروبار کا مرکز ہے، اس مقصد کے لیے مکان کرایہ پر دینا صاحبینؒ کے قول کے مطابق جائز نہیں۔

کیونکہ یہ معصیت میں ایک طرح کا تعاون ہے، جس کی ممانعت اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں"ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" سے فرمائی ہے، اور امام صاحب کے قول سے جواز معلوم ہوتا ہے کہ مکان کرایہ پر دینا گناہ نہیں، گناہ مستاجر کے فعل اختیاری سے ہے، مگر فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے کہ اعانت کا گناہ ہے، اور بینک کے مکان کی تعمیر اور بینک کے کمپیوٹر کی مرمت بھی کراہت سے خالی نہیں کیونکہ اس میں بھی ایک تعاون علی المعصیت ہے۔

ب۔ انشورنس کمپنی میں ملازمت:

انشورنس کمپنی میں جو کام ہوتا ہے وہ سود اور قمار دونوں سے مرکب ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ سود اور قمار دونوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حرام، ناجائز اور گناہ فرمایا ہے، اس لیے بیمہ کا کام کرنے پر ملازمت جائز نہیں، اور یہ حکم انشورنس کی تمام صورتوں کے لیے ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اہل علم نے بعض صورتوں میں ضرورتاً بیمہ کرانے کی اجازت دی ہے، لیکن فقہ کا اصول ہے:"ما ابیح للضرورة یقدر بقدرها"، یعنی جو چیز ازراہ ضرورت جائز قرار دی جاتی ہے وہ بقدر ضرورت ہی جائز رہتی ہے اور ضرورت انشورنس کرانے سے پوری ہو جاتی ہے، نہ تو ضرورت کی تکمیل انشورنس کمپنی میں ملازمت پر موقوف ہے اور نہ ہی انشورنس کمپنی میں ملازمت کے جواز کے لیے کوئی ضرورت شرعیہ موجود ہے، اس لیے انشورنس کمپنی میں ملازمت کے جواز کے لیے کوئی ضرورت شرعیہ موجود نہیں ہے، اس لیے انشورنس کمپنی میں بیمہ کا کام کرنے پر ملازمت جائز نہیں، البتہ انشورنس کمپنی میں کسی جائز کام کی ملازمت مثلاً چوکیداری کرنا یا چپراسی رہنا وغیرہ تو یہ ملازمت جائز ہے، جیسا کہ بینک میں جائز کام کی ملازمت جائز ہے، کما مر، البتہ ایسی ملازمتوں سے بھی حتی الامکان احترازہ بہتر ہے، یہ شان مسلم کے مناسب نہیں۔

انشورنس کمپنی میں ایجنٹ بن کر کام کرنا:

انشورنس کمپنی میں جو کام ہوتا ہے وہ سود اور قمار دونوں سے مرکب ہوتا ہے اور سود اور جوا کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حرام اور گناہ فرمایا ہے، اس کام کا ایجنٹ بننا کھلی ہوئی معصیت ہے، ایجنٹ کا کام لوگوں کو بیمہ کرانے کی اشاعت کرنا اور ترغیب دلانا اور کمپنی کا ممبر بنانا ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں سود اور جوا کے کام میں شریک بنانے کا کام کرتا ہے، لہٰذا سود اور جوا جس طرح حرام ہے اس کی تشہیر واشاعت اور اس کی ترغیب دینا، اس کا ممبر بنانا بھی حرام ہے۔

ج۔ شراب کی کمپنی میں ملازمت:

شراب کی کمپنی اگر مسلمان کی ہے تو اس کی یہ سب (سوال میں ذکر کردہ مختلف کاموں کی) ملازمتیں ناجائز ہیں، اور اگر شراب کی کمپنی کافر کی ہے تو بھی شراب بنانے، خرید وفروخت اور پلانے کی ملازمت جائز نہیں، دوسرے کام کے لیے کافر کی شراب کی کمپنی میں بکراہت ملازمت کی گنجائش ہے، چنانچہ مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب احسن الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"شراب کی خرید وفروخت اور پلانے کی ملازمت جائز نہیں، کسی دوسرے کام کے لیے کافر کی شراب کے کاروبار میں ملازمت کی گنجائش ہے، لیکن اس میں بھی کئی دینی خطرات ہیں، اس لیے احتراز ہی بہتر ہے۔" (احسن الفتاوی، ۷/ ۳۳۲)۔

اور فتاویٰ محمودیہ میں ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ: یہ کارخانہ اگر مسلمان کا ہے تو اس کی یہ سب ملازمتیں حرام ہیں، موٹر وغیرہ کے ذریعہ لے جانا اور مزدوری لینا بھی حرام ہے، اگر یہ کارخانہ کافر کا ہے تو یہ ملازمتیں مکروہ تحریمی ہیں، شراب کی بیع وملازمت وغیرہ میں مسلم وکافر کا حکم یکساں نہیں، بلکہ علاحدہ علاحدہ ہے...... مگر شراب بنانے کی ملازمت بہرحال حرام ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ، جدید ترتیب، ۱۷/ ۱۱۸)۔

۳۔ بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں کاروبار کا اصل مقصد حرام کام کرنا نہیں ہے، لیکن ضمنی طور پر وہاں حرام کام بھی کئے جاتے ہیں۔

الف۔ سپر مارکیٹ میں ملازمت:

سپر مارکیٹ جس میں زندگی کی مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں، اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے، ایسے سپر مارکیٹ میں ملازمت کرنے کی صورت میں شراب کی فروخت میں ملوث ہونا پڑتا ہے جو مسلمان کے لیے جائز نہیں، لہٰذا ایسے سپر مارکیٹ میں مسلمان کے لیے ملازمت کرنا جائز نہیں، جبکہ شراب کا گوشہ بھی اس سے متعلق ہو، لیکن یہ ملازمت خالص ناجائز ملازمت سے غنیمت ہوگی، چنانچہ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اس قسم کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر پریس مشینوں میں دوسری جائز چیزیں بھی چھاپی جائیں اس کے ساتھ تصویریں بھی ہوں اور جائز چیزیں زائد ہوں تو ایسی آمدنی کو ناجائز نہیں کہا جائے گا، نیز جو شخص ایسی ملازمت کرے گا اس کی پوری ملازمت کو بھی ناجائز نہیں قرار دیا جائے گا، اس کی ملازمت جائز ملازمت سے کمتر وادنی ہوگی اور خالص ناجائز ملازمت سے غنیمت ہوگی" (فتاویٰ محمودیہ، جدید ترتیب، ۱۹/ ۴۷۸)

ب۔ مخلوط تعلیم کے نظام میں تدریس کا فریضہ انجام دینا:

اسلام نے مردوں اور عورتوں کے اختلاط اور بے حجابانہ اور بے تکلفانہ گفتگو سے سختی سے منع فرمایا ہے، مقصد یہ ہے کہ کسی فتنہ کا اندیشہ باقی نہ رہے، یہ مخلوط تعلیم کا نظام بے خدا قوموں کا ایجاد کردہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مرد، مرد نہ رہیں اور عورتیں، عورتیں نہ رہیں، آج کل اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو بے پردگی اور بے حیائی اور لڑکوں اور لڑکیوں کا آزادانہ اختلاط ہو رہا ہے، اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا ہے، اگر استاذ غیر محرم ہے تو اس کے لیے بھی وہی احکام ہیں جو دوسرے غیر محرموں کے لیے ہیں، اس لیے کسی مرد کا بے پردہ بالغ لڑکیوں کو تعلیم دینا یا عورت کا بے پردہ

بالغ لڑکوں کو تعلیم دینا جائز نہیں، البتہ اگر تدریسی ملازمت حدود شرعیہ کے اندر رہ کر کی جائے یعنی پردہ کے احکام پر عمل کیا جائے، کسی غیر محرم کے ساتھ تنہائی یا غیر محرموں کے ساتھ بلاضرورت گفتگو اور اختلاط کی نوبت نہ آئے، نیز دیگر مواقع فتنہ سے بچنے کا اہتمام کیا جائے تو ان امور کی رعایت کے ساتھ تدریسی ملازمت کی اجازت ہے، لیکن آج کل کے عصری تعلیمی اداروں میں بے پردگی، بے حیائی اور آزادانہ اختلاط کے پیش نظر مذکورہ امور کی رعایت عنقا معلوم ہوتی ہے۔

ج۔ پیشہ وکالت:

ایک اہم پیشہ وکالت کا ہے، وکیل کا مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے، مسلمانوں کے اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل کے لیے وکیل کی ضرورت پڑتی ہے اور بہت سے مواقع پر اچھے مسلمان وکلاء کی کمی محسوس کی جاتی ہے، لہٰذا اگر سچے مقدمات میں باقاعدہ کام اور اجرت متعین کر کے وکالت کی جائے اور خلاف شرع امور سے اجتناب کیا جائے، تو مسلمان کے لیے پیشہ وکالت اختیار کرنا درست ہے، چنانچہ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"اگر سچے مقدمہ میں باقاعدہ کام اور اجرت متعین کر کے وکالت کی جائے اور کوئی بھی کام خلاف شرع اس میں نہ کیا جائے تو نفس وکالت اور اس کا اجرت کا روپیہ اور اس کا کھانا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ، جدید ترتیب، ۱۶/ ۴۵۰)

البتہ وکلاء کا مظلوم کو انصاف سے محروم کر دینا، اپنے موکل کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے انہیں جھوٹ بولنے کی باضابطہ ترغیب دینا وغیرہ خلاف شرع کام کرنا جائز نہیں۔

د۔ پیشہ طبابت:

انسانی خدمت کا ایک اہم ذریعہ علاج اور پیشہ طبابت ہے، طبیب بوقت ضرورت مریض یا ولی کی اجازت سے آپریشن کر سکتا ہے، لیکن محض روپئے بٹورنے کے لیے بلاضرورت آپریشن کرنا یا ٹیسٹ لکھنا گھٹیا درجہ کی بداخلاقی اور مریضوں کے ساتھ زبردست خیانت اور دوسروں کا پیٹ چیر کر اپنا پیٹ بھرنے کا گورکھ دھندا ہے جو ہرگز جائز نہیں، لیکن بدقسمتی سے اس شعبہ میں بھی بعض برائیاں در آئی ہیں جیسے آپریشن مجبوری کی حالت میں کیا جانا چاہئے، اس کے باوجود ہاسپیٹل کی انتظامیہ، ڈاکٹروں کو تاکید کرتی ہے کہ وہ ہر ماہ کم سے کم اتنی مقدار میں آپریشن یا ٹیسٹ لکھے تاکہ ہاسپیٹل کی اور اس کی لیبارٹری کی آمدنی بڑھ سکے، ان حالات میں ایسے ہاسپٹلوں میں ملازمت کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر یہ ہاسپیٹل مسلم آبادی والے علاقہ میں واقع ہوں اور ان میں بغرض علاج آنے والے مریضوں کی معتدبہ تعداد مسلمانوں کی ہو اور مسلمان طبیبوں کے ایسے ہاسپیٹلوں کی ملازمت سے کنارہ کش ہونے کی صورت میں دور حاضر کے عصبیتی ماحول کی وجہ سے قوی اندیشہ ہو کہ آپریشن یا ٹیسٹ کی وہ مقدار جو ہاسپیٹل کی انتظامیہ کو مطلوب ہے کل یا اکثر مسلمان مریضوں سے مکمل کی جائے گی، تو دفع ضرر یا تقلیل ضرر کی نیت سے ایسے ہاسپیٹلوں میں ملازمت کی گنجائش ہے ورنہ نہیں۔

بغرض علاج اعضاء مستورہ کو دیکھنا یا چھونا شرعاً کیسا ہے؟

شرح تنویر میں عورت کے علاج کے سلسلہ میں ہے کہ بقدر ضرورت مرد طبیب عورت کی مرض والی جگہ کو دیکھ سکتا ہے، کیونکہ ضرورت کو مقدار ضرورت میں محدود رکھا جاتا ہے، دائی، نائی اور ختنہ کرنے والے کا بھی یہی حکم ہے کہ بقدر ضرورت دیکھ سکتے ہیں، بہتر ہے کہ عورت کو عورت کے علاج کا طریقہ سکھایا جائے، کیونکہ عورت کا عورت کے حصہ مستور کو دیکھنا بہر حال اخف ہے، شامیہ میں جوہرہ کے حوالہ سے ہے کہ جب شرمگاہ کے علاوہ عورت کے کسی حصہ بدن میں مرض ہو تو مرد طبیب بغرض علاج بقدر ضرورت مرض کی جگہ کو دیکھ سکتا ہے، اگر شرمگاہ میں بیماری ہو تو کسی خاتون کو اس کا طریقہ علاج سمجھا دے، اگر ایسی کوئی عورت نہ ملے یا اس مریضہ کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو یا ایسی تکلیف کا اندیشہ ہو کہ وہ تحمل نہ کر سکے گی تو ایسی صورت میں مرد طبیب پورا بدن ڈھانپ کر بیماری والی جگہ کا علاج کر سکتا ہے، مگر باقی بدن کو نہ دیکھے، حتی الوسع غض بصر کرے۔

ان تصریحات سے مندرجہ ذیل امور مستفاد ہوئے:

۱۔ طبیب کے لیے عورت کا علاج ضرورت کی بنا پر جائز ہے۔

۲۔ اگر کوئی معالج عورت مل سکے تو اس سے علاج کرانا ضروری ہے۔

۳۔ اگر کوئی عورت نہ مل سکے تو مرد کو چاہئے کہ اعضائے مستورہ خصوصاً شرمگاہ کا علاج کسی عورت کو بتادے خود نہ کرے۔

۴۔ اگر کسی عورت کو بتانا بھی ممکن نہ ہو، اور مریضہ عورت کی ہلاکت یا نا قابل برداشت تکلیف کا اندیشہ ہو تو لازم ہے کہ تکلیف کی جگہ کے علاوہ تمام بدن ڈھک دیا جائے اور معالج کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو زخم کی جگہ کے علاوہ باقی بدن سے غض بصر کرے۔

شرائط مندرجہ بالا کے ساتھ مرد عورت کا علاج کرسکتا ہے، اسی طرح عورت بھی مرد کا علاج کرسکتی ہے، عصر حاضر میں تہذیب جدید کے تسلط اور تدین کی کمی کی وجہ سے ان امور کی رعایت نہیں کی جاتی ہے اور بلا تکلف مرد عورت کے اعضائے مستورہ کا علاج کرتا ہے اور عورت مرد کے اعضائے مستورہ کا علاج کرتی ہے، نیز بلا ضرورت اور ضرورت سے زیادہ کشف ستر کیا جاتا ہے جو شرعاً و عقلاً قبیح ہے۔

ایسے ہاسپٹلوں میں جہاں مرد ڈاکٹر کو بلا ضرورت عورت کے اعضائے مستورہ کے علاج پر اور عورت ڈاکٹر کو مرد کے اعضائے مستورہ کے علاج پر مجبور کیا جاتا ہو تو اس نیت سے کہ دوسرے ڈاکٹروں سے مریضوں کی جو بے پردگی ہوگی اس کے مقابلہ میں مجھ سے بے پردگی کم ہوگی یعنی تقلیل شر کی نیت سے ملازمت کی گنجائش ہے، واضح رہے کہ یہ بات نیت ہی تک ممکن ہو خلاف شرع امور سے بچنے کی کوشش کی جائے خصوصاً قلب ونظر کی حفاظت کرے اور استغفار کرتا رہے، محض دنیا کمانے کی غرض سے ایسے ہاسپٹلوں میں ملازمت کی اجازت نہیں۔

۵۔ ہوٹل میں ملازمت:

ذرائع مواصلات کی ترقی، سیاحت کے رجحان میں اضافہ اور مسافر کی ضرورت کے لحاظ سے ہوٹل موجودہ سماج کی ضرورت بن گئے ہیں، اور یہ اس وقت ایک نفع بخش تجارت بھی ہے، ہوٹلوں کا بنیادی مقصد تو معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولت فراہم کرنا ہے، لیکن بڑے ہوٹلوں میں بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں جو شرعاً جائز نہیں ہیں جیسے شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ، ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان کا حرام چیزوں کی فراہمی اور خلاف شرع امور کی انجام دہی سے براہ راست تعلق ہو یا بعض دفعہ ان کی فراہمی یا انجام دہی کرنی پڑتی ہو تو ایسی ملازمت کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح گناہ کے لیے سبب اور ذریعہ بننا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے، ملازمت شرعی احکام کے دائرہ میں رہ کر کرنی چاہئے، ملازمت کی وجہ سے تمام حالات میں (خصوصی حالات مستثنیٰ ہیں)، دین کے کسی معمولی سے معمولی حکم یا تقاضے کو قربان کرنا جائز نہیں ہے، مسلمان کو حلال اور طیب روزی کی فکر کرنی چاہئے، اور اگر مسلمان ملازم کا حرام چیزوں کی فراہمی سے بالکل تعلق نہ ہو اور کوئی خلاف شرع کام کی انجام دہی کی ذمہ داری اس پر نہ ہو تو پھر ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کرنا جائز ہے، لیکن ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کرنے میں کئی دینی خطرات ہیں اس لیے احتراز بہتر ہے۔

☆☆☆

مختلف ملازمتوں کے شرعی احکام

مولانا محمد فاروق

ملازمت کی بنیادی شرطیں:

حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے صحتِ اجارہ کے لیے بہت سی شرطیں تحریر کی ہیں جن میں بعض نفس عقد، بعض عاقد، اور بعض معقود علیہ سے متعلق ہے، اور یہ سب تفصیلیں کتب فقہیہ میں موجود ہیں، یہاں جس بنیادی شرط کو ذکر کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ نوکری و ملازمت خواہ جس نوع کی ہو نفیس ہو، یا خسیس، ضروری ہے کہ معصیت یا معصیت تک پہنچانے والی نہ ہو، اور نہ اس میں معین و مددگار ہو، لہٰذا ان امور کی طرف غور کرتے ہوئے مسئلہ کی چند صورتیں نکلتی ہیں۔

عین معصیت کی ملازمت، جیسے نوحہ کرنے، گانا گانے، طبلہ بجانے وغیرہ، تو ان امور کی ملازمت و نوکری صریح قرآن و حدیث سے حرام ہے۔ اور اگر ملازمت ایسے امر کی ہے جو فی نفسہ جائز ہے، لیکن عملِ اجیر کے بعد کسی فاعل مختار کے تغیر و تبدل سے معصیت بن جاتا ہے، جیسے کسی نے شیرۂ انگور نچوڑنے کے لیے مزدوری کی تو یہ عمل، فی نفسہ جائز ہے، البتہ اس سے شراب بنانا ایک دوسرا عمل ہے۔ جو فاعلِ مختار کے فعل سے ہے، تو اس صورت میں اگر ملازم شراب بنانے کی نیت سے ملازمت نہیں کرتا، اور نہ مستقبل میں اس سے شراب بنائے جانے کا علم ہے، تو ایسی ملازمت بلا کراہت جائز ہے، جیسا کہ درمختار اور ردالمحتار کی عبارت سے واضح ہے:

''فی العلائی، جاز حمل خمر ذمی بأجر لاعصرها لقیام المعصیة بعینه، اھ وفی الشامیة، ولعل المراد هنا عصر العنب علی قصد الخمریة: فان عین هذا الفعل معصیة بهذا القصد فلا ینافی ما مر من جواز بیع العصیر واستجاره علی عصر العنب اھ''

''ذمی کے شراب کو بعوض اجرت اٹھا کر لے جانا جائز ہے، اس کو نچوڑنا جائز نہیں، اس کی عین کے ساتھ قیام معصیت کی وجہ سے اور شامی میں ہے، کہ انگور نچوڑنے سے مراد شراب بنانے کے ارادہ سے نچوڑنا ہے، کیونکہ اس ارادہ سے یہ فعل معصیت لعینہ ہے، لہٰذا یہ جزئیہ گزشتہ شیرہ کے بیع کے جواز اور انگور نچوڑنے پر استجارہ کے جواز کے، جزئیہ کے منافی نہیں)۔

نیز علامہ شامی نے علائی کے حسب ذیل قول ''وجاز بیع عصیر'' الخ کے ذیل میں فرماتے ہیں: اس میں اشارہ ہے کہ اگر شیرہ سے خمر بنانے کا علم نہ ہو تو شیرہ فروخت کرنا جائز ہے۔

اور اگر ملازم کو معلوم ہے کہ ہمارے نچوڑے ہوئے شیرہ سے شراب بنائی جائے گی، پھر بھی وہ نچوڑنے کی ملازمت کرتا ہے تو اس صورت میں حضرت امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے مابین اختلاف ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے، اور حضرات صاحبین کے نزدیک درست نہیں، البتہ حضرت علامہ شامی نے نہایہ سے نقل فرمایا ہے کہ امام کا قول مبنی بر قیاس ہے اور حضرات صاحبین کا قول مبنی بر استحسان ہے، اس سے حضرات صاحبین کے قول کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، لہٰذا بلا ضرورت ملازمت کی یہ صورت مکروہ ہوگی۔

''وفی الشامیة: زاد فی النهایة، وهذا قیاس، وقولهما استحسان'' (شامی، ۹/ ۴۷۸)۔

اور اگر ملازمت ایسے امر کی ہے جس میں ثبوتِ معصیت کے لیے کسی فاعل مختار کے تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ جیسے شراب بیچنے یا اہل فتنہ سے ہتھیار وغیرہ بیچنے کی نوکری کرنا، اور معلوم بھی ہے کہ خریدنے والا غلط جگہوں پر استعمال کرے گا، تو ایسی نوکری جائز نہیں، بلکہ مکروہ تحریمی ہے، علامہ علاء الدین حصکفی فرماتے ہیں: ''ویکره تحریما، بیع السلاح من أهل الفتنة إن علم، لأنه إعانة علی المعصیة'' (درمختار شامی: ۹/ ۴۷۷)۔

خلاصہ یہ کہ نوکری کسی بھی نوع کی ہو، جواز وعدم جواز میں مذکورہ تفصیلات کی رعایت ضروری ہوگی۔

سرکاری ملازمت:

سرکاری ملازمت کی دو نوعیتیں ہیں: (۱)۔ مسلم حکومت کی ملازمت۔ (۲)۔ غیر مسلم حکومت کی ملازمت

مسلم حکومت کی ملازمت میں جہاں نفسِ عمل کا جائز ہونا ضروری اور شرط ہے، جیسا کہ "بنیادی شرطوں" کے ذیل میں بات آچکی ہے وہیں ملنے والی تنخواہ کا حلال ہونا بھی ضروری ہے، چنانچہ اگر ملازم کو معلوم ہے کہ حکومت ظلماً ٹیکس وغیرہ لے کر تنخواہ دے رہی ہے تو وہ تنخواہ حلال نہیں، کیونکہ مسلم حکومت اس قسم کے مال کا خود مالک نہیں بن سکتی، تو دوسرے کو کب مالک بنا سکتی ہے۔

البتہ اگر ملازم کو معلوم نہیں ہے، کہ تنخواہ کس فنڈ سے مل رہی ہے، تو اس صورت میں گنجائش ہے۔ جیسا کہ علامہ شامی (۷/ ۲۲۳) فرماتے ہیں:

اور بعض حنفیہ سے جو یہ بات منقول ہے کہ حرام دو ذموں تک متعدی نہیں ہوتا، تو میں نے اس سلسلے میں شہاب بن شلبی سے دریافت کیا، تو انہوں نے کہا کہ یہ اس صورت پر محمول ہے جبکہ اس مال کے حرام ہونے کا علم نہ ہو۔ لیکن اگر کسی نے ٹیکس افسر کو کسی سے ٹیکس وصول کرتے ہوئے دیکھا، پھر اس افسر نے وہ مال کسی دوسرے کو دے دیا، پھر دیکھنے والے نے اس دوسرے آدمی سے وہ مال لے لیا، تو یہ حرام ہے۔ اور ذخیرہ میں ہے کہ فقیہ ابوجعفر سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا، جس نے اپنا مال امراء سلطان اور حرام تاوان وغیرہ سے حاصل کیا ہے، کہ کیا جس شخص کو اس مال کے حرام ہونے کا علم ہے وہ اس کا کھانا وغیرہ کھا سکتا ہے؟ فرمایا: میرے نزدیک اس کی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ نہ کھائے، اور اگر وہ کھانا غصب یا رشوۃ کا نہ ہو تو حکماً اس کے لیے گنجائش ہے۔

اسی لیے حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:

"اسلامی ریاستوں کی نوکری سے غیر اسلامی ریاستوں کی نوکری کو اچھا سمجھتا ہوں کیونکہ یہ شرعاً مالک ہو گئے، اور وہ مالک نہیں ہوئے" (مال و دولت کی اہمیت: ۴۷)۔

معلوم ہو گیا کہ مسلم حکومت ظلماً اور ناجائز طریقہ سے لیے ہوئے مال کی مالک نہیں بنتی، لہٰذا اس مال کا تنخواہ وغیرہ میں نہ تو دینا جائز اور نہ جانتے ہوئے لینا جائز ہے۔

غیر مسلم حکومت کی ملازمت:

غیر مسلم حکومت کی ملازمت میں بھی مذکورہ شرائط کے مطابق عمل کا ہونا ضروری ہے، لیکن ملنے والی تنخواہ، خواہ جس نوع کے مال سے دی گئی ہو، حلال ہے، کیونکہ غیر مسلم حاکم کا کسی مال پر استیلاء وغلبہ موجب ملک ہے، اور جب وہ مالک ہو گیا تو اپنی رضامندی سے کسی مومن کو جونسا بھی مال دیدے وہ حلال ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وللفقراء الذين أخرجوا من ديارهم وأموالهم الخ''۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ نسفی مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں:

''فيه دليل على أن الكفار يملكون بالاستيلاء على أموال المسلمين، لأن الله تعالى سمى المهاجرين فقراء مع أنهم كانت لهم ديار وأموال'' (حاشیہ علی الجلالین: ۴۵۵)

(اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ کفار اموال المسلمین کا استیلاء کے ذریعہ مالک ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کا فقراء نام رکھا ہے، جبکہ ان کے پاس مکانات اور اموال موجود تھے)۔

اسی لیے حضرت تھانوی قدس سرہ غیر اسلامی ملک کے محکمہ چنگی میں افسر، چپراسی وغیرہ کی ملازمت اور تنخواہ سے متعلق فرماتے ہیں:

شریعت نے جو قواعد اموال پر محصول لینے کے مقرر فرمائے ہیں، جن کو فقہاء نے باب العاشر میں ضبط کیا ہے چونکہ اس محکمہ کے قواعد ان پر منطبق نہیں ہیں، اس لیے خلاف ما انزل اللہ ہونے کی وجہ سے غیر مشروع اور ناجائز ہیں، اور حسب ارشاد الٰہی "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" اس کی اعانت بھی

معصیت ہوگی، لہٰذا اس محکمہ کی ملازمت ناجائز ہے، مگر جو تنخواہ ملتی ہے وہ اس وجہ سے جائز ہے کہ غیر مؤمنین حاکم کا کسی مال پر استیلاء موجب تملک
اور غیر مؤمن حاکم جو مال اپنی رضامندی سے کسی مؤمن کو دیں خواہ کسی عنوان سے ہو وہ مباح ہے، اس لیے تنخواہ حلال ہے اھ (امداد الفتاویٰ، ۳/ ۳۹۱)۔

اسی طرح کچہری اور بینک کی ملازمت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

سود کے مضامین کی نقل کرنا یہ سود کی اعانت ہے یہ تو ناجائز ہے، لیکن اس کام کی تنخواہ ایک فقہی قاعدہ کی بنا پر حلال ہے، وھی إباحة مال غير المسلم
والذمي برضاه في غير دار الاسلام، یعنی اس وجہ سے تنخواہ حلال ہے کہ غیر دار السلام میں غیر مسلم اور ذمی کا مال اس کی رضامندی سے مباح ہو
ہے (امداد الفتاویٰ، ۳/ ۳۹۹)۔

معلوم ہو گیا کہ غیر اسلامی حکومت میں نوکری کے لیے کام کا جائز ہونا تو ضروری ہے، لیکن اگر نوکری ناجائز امور کی ہے تو گناہ کے ساتھ
ہے۔

غیر اسلامی حکومت میں ناجائز عہدوں کا حکم:

بنیادی شرطوں کے ذیل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ملازمت کے جواز کے لیے اس کا مشروع ہونا ضروری ہے، لیکن آج غیر اسلامی
مسلمانوں کی تعداد کھانے میں نمک کے برابر ہے، اور اکثر محکمہ کی بالادستی اہل وطن کے سپرد ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو غیر معمولی پریشانیوں کا
ہے، اور مسلمانوں کی فریاد، مطالبۂ حقوق، اور صدائے بازگشت کے مترادف ہے، ایسے موقع پر اگر کچھ مسلمان عہدہ دار ہوں تو مکمل فائدہ تو نہیں
پڑتا ہے، اور اس سے مسلمانوں کا وہاں تک پہنچنا آسان ہوتا ہے، اس لیے اشد المفسدین کو دفع کرنے کے لیے اخف المفسدین کو اختیار کرنے
جس کا حاصل یہ ہے کہ ناجائز عہدہ کو اختیار کرنا اگرچہ گناہ اور دینی نقصان ہے، لیکن مسلمان کا غیر مسلموں کی جانب سے جور و ظلم اور مصائب
بننا اور مختلف الانواع پریشانیوں میں مبتلا ہونا، اشد مفسدہ ہے، جس کا دفعہ کرنا، ناجائز عہدہ کی مضرت سے زیادہ اہم ہے۔

لہٰذا عام مسلمانوں کو کافروں کے نرغہ سے نکالنے اور انہیں جور و ظلم کا تختۂ مشق بننے سے بچانے کے لیے ناجائز عہدہ کو بھی اختیار کرنے
کہ علامہ ابن نجیمؒ الاشباہ والنظائر میں فرماتے ہیں:

''إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما'' (الاشباہ لابن نجیم: ۲۱۹)۔

نیز علامہ فخر الدین زیلعیؒ فرماتے ہیں:

''من ابتلی ببلیتین وهما متساویان یاخذ بأیتهما شاء، وان اختلفا یختار أهونهما، لأن
لاتجوز إلا لضرورة ولا ضرورة في حق الزيادة (تبیین الحقائق، ۱/ ۲۵۹، مکتبہ باز)۔

نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غیر اسلامی حکومت کے ناجائز عہدہ کو اختیار کرنا حقیقتاً ایک لطیف حیلہ ہے، جس سے امت مسلمہ کو مضرتوں
جیسا کہ کعب بن اشرف یہودی کے قتل کے لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن سلمہ کو اپنے سلسلے میں کچھ شکوہ شکایت، اور عیب جوئی کی
مضرت کو برداشت کر کے بڑی مضرتوں سے نجات پائیں، جیسا کہ اس واقعہ کے تحت حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں:

''كأنه استاذنه أن يفتعل شيئا يحتال به، (الی قوله) وقد ظهر من سياق ابن سعد للقصة،
يشكوا منه ويعيبوا'' (فتح الباری، ۷/ ۴۲۹)۔

(گویا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حیلہ و تدبیر کرنے کے ارادہ سے کچھ کرنے کی اجازت طلب کی تھی، اور ابن سعد کے سیاق قصہ
انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکایت کرنے اور آپ کی رائے میں عیب لگانے کی اجازت لی تھی)۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ ناجائز منصب کو اختیار کرتے ہیں، دیکھنا چاہئے کہ عہدہ قبول نہ کرنے سے خود ان کو یا عام مسلمانوں کو، کوئی شدید نقصان
ہے یا نہیں؟

اگر کوئی نقصان پہنچنے کا ظن غالب نہیں ہے، تو ایسے ناجائز عہدہ کو قبول کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ اس کو اختیار کرنے کی کوئی شرعی ضرورت

اور اگر عدم قبول سے نقصان کا ظن غالب ہے تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں:

آیا اس شخص کی نیت اس نقصان کو دفع کرنے کی ہے یا محض مال وجاہ حاصل کرنے کی۔

اگر نیت مسلمانوں سے نقصانات کو دفع کرنا ہے، تو جائز ہے، اس لیے کہ ایسے عہدہ کی قبولیت کے لیے شرعی ضرورت موجود ہے، اور وہ اخف المفسدین کو برداشت کرکے اشد المفسدین کو دفع کرنا ہے۔

اور اگر صرف مال وجاہ حاصل کرنے کی نیت سے اس قسم کے عہدہ کو اختیار کر رہا ہے تو بالکل ناجائز وحرام ہے۔

مسلمانوں پر فائرنگ کرنا:

غیر اسلامی حکومت کے عہدوں میں سے ایک عہدہ فوج کا بھی ہے، اس لیے سب سے پہلے اسلامی فوج کے اختیارات کو جاننے کی ضرورت ہے، تاکہ اس کے ذریعہ غیر اسلامی حکومت میں فوجی عہدہ کے جائز وناجائز اختیارات معلوم ہوسکے۔

چنانچہ اسلامی فوج کا اہم کردار یہ ہے کہ اس کے بندوق سے نکلنے والی ایک ایک گولی فتنۂ کفر کے دفعیہ، اظہار اسلام، اور نصرت اہل حق کے لیے ہو، اور یہی اعلاء کلمۃ اللہ کا مصداق ہے، اسی لیے مسلمانوں کے لیے یہ بالکل گنجائش نہیں ہے کہ وہ اہل شرک کے شانہ بشانہ ہوکر دوسرے مشرکین سے قتال کرے، کیونکہ یہ دونوں فریق شیطان کے مصداق اور قابل خسران ہیں، اس لیے ان کی تعداد میں اضافہ کرکے، یا ان سے دفاع کرکے ان کی مدد کرنا درست نہیں، جیسا کہ شرح السیر میں موجود ہے۔

"لاینبغی للمسلمین أن یقاتلوا، أهل الشرك، مع أهل الشرك، لأن الفئتین حزب الشیطن، وحزب الشیطان هم الخاسرون" (اعلاء السنن، ۱۰/ ۴۷۰۹)

(مسلمانوں کے لیے اہل شرک کی معیت میں دوسرے مشرکین سے قتال کرنا مناسب نہیں، کیونکہ دونوں ہی جماعت شیطان کے گروہ ہیں، اور شیطان کے گروہ ہی ٹوٹے میں ہیں)۔

حتی کہ اگر مشرکین کسی مسلمان کو یوں دھمکی دے کہ تم ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے قتال کرو، ورنہ ہم تم کو قتل کردیں گے، تو اس صورت میں بھی مسلمان کے لیے روا نہیں کہ وہ مسلمانوں سے قتال کرے، کیونکہ مسلمانوں سے قتال کرنا اور اس کے لیے تیار ہونا حرام لعینہ ہے، جس پر تہدید قتل کے باوجود اقدام کرنے کی اجازت نہیں، شرح السیر میں ہے:

"وان قالوا لهم: قاتلوا معنا المسلمین وإلا فقتلنا كم، لم یسعهم القتال مع المسلمین لأن ذالك حرام علی المسلمین بعینه فلا یجوز الإقدام علیه بسبب التهدید بالقتل" (اعلاء السنن، ۱۰/ ۴۷۱۰)۔

(اور اگر کافروں نے مسلمانوں سے کہا تم لوگ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے قتال کرو، ورنہ ہم لوگ تم لوگوں کو قتل کردیں گے، تو ان کے لیے مسلمانوں کے ساتھ قتال کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، کیونکہ مسلمانوں کے لیے یہ عمل بالکل حرام ہے، لہٰذا تہدید قتل کی وجہ سے اس پر اقدام کرنا جائز نہیں)۔

اسی لیے حضرت مولانا ظفر صاحب تھانویؒ، اعلاء السنن میں فرماتے ہیں کہ سرزمین ہند میں، آزادی وطن کی خاطر اہل ہنود کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا قتل وقتال کرنا درست نہیں، اس لیے کہ یہاں مشرکین کا غلبہ ہے، تو مسلمانوں کا یہ قتال ان کے تعاون کے لیے ہوگا، لہٰذا مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں کہ کافروں کا تعاون کرے اور اس کی طاقت کو مضبوط بنائے۔ ہاں اگر خود اپنی جان کا خطرہ ہو، یا اعزاز دین مقصود ہو تو اس وقت گنجائش ہوگی۔

"وهذه النصوص تعرب لنا عن حكم محاربة المسلمین حكومة الهند مع الهنود المشركین لإعتاق الوطن واستخلاصها عن سلطة الأجانب، فإن الحكم الظاهر فی هذه المحاربة للمشركین كما هو ظاهر (الی قوله) فلا رخصة فی ذالك، إلا لقصد اعزاز الدین أو الدفع عن نفسه" (ایضاً، ۱/ ۴۷۱۰)

(نصوص مذکورہ سے حکومت ہند میں مشرکین ہندوؤں کے ساتھ مل کر اجنبی حکومت سے وطن کو چھوڑنے اور آزاد کرنے کے لیے مسلمانوں کے جنگ کرنے کا حکم واضح ہوگیا، لہٰذا اس جنگ میں ظاہراً مشرکین کی مدد ہے، جس کی اجازت نہیں، ہاں اگر اعزاز دین، یا اپنی ذات سے دفع کرنے کے لیے جنگ ہو تو اس کی

اجازت ہے)۔

البتہ ناگزیر حالت میں کبھی مسلمانوں پر بھی فائرنگ کرنے کی اجازت ہوتی ہے، جیسے کہ کفار، مسلمانوں کے بچوں کو اپنی حفاظت کے لیے ڈھال بنالے، یا کافروں کے ساتھ مسلمانوں کی آبادی مخلوط ہو، اور اسلامی لشکر کو ان کے بارے میں امتیازی علم نہ ہو تو اس صورت میں کفار کو قتل کرنے کے ارادہ سے فائرنگ کی اجازت ہوگی، خواہ مسلمان کیوں نہ زد میں آجائے جیسا کہ امام ابوبکر جصاص رازی احکام القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

''قال أبو حنيفة وأبو يوسف وزفر ومحمد والثوري: لاباس برمي حصون المشركين وإن كان فيها أسارى وأطفال من المسلمين (الى قوله) وكذالك أن تترس الكفار بأطفال المسلمين رمي المشركين وإن أصاب أحدا من المسلمين في ذلك'' (احكام القرآن للرازي، ۳/ ۵۲۵)۔

(حضرت امام ابوحنیفہ، ابویوسف، زفر، محمد اور ثوری رحمہم اللہ فرماتے ہیں: کہ مشرکین کے قلعوں میں تیر اندازی کرنے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ وہاں قیدی، اور مسلمانوں کے بچے ہوں، اسی طرح اگر کفار مسلمانوں کے بچوں کو ڈھال بنالے، تو مشرکین کو نشانہ بنایا جائے گا گو مسلمانوں کے کسی بچہ پر کیوں نہ جائے)۔

معلوم ہوا کہ جہاں ظالم و مظلوم کے مابین فرق کرنا متعذر رہو اور فائرنگ نہ کرنے سے ظالم کا حوصلہ بلند ہوتا ہو وہاں فائرنگ کی اجازت ہے، خواہ اس کی زد میں مظلوم کیوں نہ آتے ہوں، جیسا کہ علامہ ابوبکر رازی کی حسب ذیل عبارت صریح کے درجہ میں ہے:

اور یہ بات معلوم ہے کہ جو بھی اسلامی لشکر ان کفار پر حملہ کرے گا، تو ان کے بچے اور عورتیں جن کا قتل ممنوع ہے، وہ بھی زد میں آئیں گے، اسی طرح جب وہاں مسلمان ہوں تو وہ بھی شکار ہوں گے، تو ضروری ہے کہ یہ امر ان کفار پر ہر طرف سے حملہ کرنے اور تیر اندازی کرنے سے مانع نہ ہو، گو مسلمانوں کو لگنے کا اندیشہ ہو۔

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ ہندوستان جیسے ملک میں مسلمانوں کے لیے نیتِ خیر کے ساتھ فوج کی نوکری جائز ہے، اور کبھی ظالم و مظلوم کی تحقیق کے بغیر وار کرنا، اگر عدمِ تمیز اور سدا لباب الفتنہ ہو تو اس کی گنجائش ہے، تاکہ معاملہ فرو ہوجائے، اور باہم قتل و قتال کی مزید نوبت نہ آئے۔

اور بعض دفعہ ایک مسلمان فوج کا ہم مذہب سے مقابل ہونا ایک وہمی امر ہے جو نہ غالبی ہے اور نہ ضروری، اس لیے واقعی فائدہ کے ہوتے ہوئے، صرف امر وہمی کی وجہ سے ملازمت کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا، تاہم اگر صرف ہم مذہب شخص کو گولی چلانے کا حکم ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔ کما مر التفصیل۔

اسی طرح پولیس کی نوکری اگرچہ بہت سی خرابیوں کا ذریعہ ہے، تاہم اس کی بہت سی خرابیوں میں اپنے اختیار کا بڑا دخل ہے، لہٰذا ایسے مسلمان جنہیں صبر و ضبط اور تحمل کا مادہ حاصل ہو، مسلمانوں کی حفاظت و صیانت کے ارادہ سے اگر نوکری کرے تو جائز ہے، مابقیہ حملہ سے متعلق حکم کی تفصیل فوج کے ذیل میں مذکور ہوئی۔

جاسوسی و مخبری کا حکم:

شریعت غرا نے کسی بھی انسان کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ کسی کے رازِ بستہ کا انکشاف کرے، قرآن و حدیث اور آثار صحابہ، اس کی ممانعت سے پُر ہیں:

خداوند قدوس کا ارشاد ہے:

"ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضًا" (اور سراغ مت لگایا کرو، اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے)، اور صحیحین کی روایت میں ہے: "ولا تجسسوا ولا تحسسوا ولا تناجشوا" (مشکوۃ شریف، ۴۲۷)۔

اور ایک روایت میں ہے:

"ولا تتبعوا عوراتهم فإن من اتبع عوراتهم يتبع الله عورته، ومن يتبع الله عورته يفضحه في بيته" (مشکوۃ شریف: ۴۲۹)۔

(تم لوگوں کے عیوب کے پیچھے مت پڑو، کیونکہ جو لوگوں کے عیوب کے پیچھے پڑے گا، اللہ تعالیٰ ان کے عیب کے پیچھے پڑیں گے، اور جس کے عیب کے

پیچھے اللہ تعالیٰ پڑ جائے تو اس کو گھر رہتے ہوئے رسوا کردے)۔

معلوم ہوا کہ عام حالات میں کسی کے ٹوہ میں پڑنا اور اس کے راز پر مطلع ہونے کی کوشش کرنا، جائز نہیں، البتہ ضرورت کی جگہیں جہاں عدم تجسس و تحقیق سے جرائم بڑھ سکتے ہیں، امن وامان پاش پاش ہوسکتے ہیں، وجوب شرعیہ فوت ہوسکتے ہیں تو وہاں اس کی گنجائش ہے، چنانچہ حضرت ملا علی قاری ایک حدیث پاک "من استمع الی حدیث قوم وهم له کارهون" کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"وهذا الوعيد إنما هو فی حق من یستمع لأجل النمیمة ومایترتب علیه من الفتنة، بخلاف من استمع حدیث قوم لیمنعهم عن الفساد او لیمتنع عن شرورهم اھ"(مرقاۃ:۷/ ۲۷۵)۔

(یہ وعید ان لوگوں کے حق میں ہے جو چغلخوری کرنے اور فتنہ پروری کرنے کے لیے سنتے ہیں، برخلاف ان لوگوں کے جو کسی قوم کی بات اس غرض سے سنے کہ ان کو فساد سے منع کرے، یا ان کی برائیوں سے اپنی حفاظت کرے، (تو ان کے لیے جائز ہے))۔

اسی لیے اس قسم کی تحقیق و تجسس کے سلسلے میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے لکھتے ہیں کہ:

اس سلسلے میں قول مجمل یہ ہے کہ جہاں تحقیق نہ کرنے سے کوئی واجب شرعی فوت ہوتا ہو، وہاں واجب ہے، مثلاً سلطان نے سنا کہ فلاں شخص کو قتل کرنا چاہتا ہے تو چونکہ بوجہ سلطان ہونے کے حفاظت رعایا کی اس کے ذمہ واجب ہے، اس لیے اس کی تحقیق وانتظام واجب ہے، اور جہاں تحقیق نہ کرنے سے کوئی واجب فوت نہیں ہوتا ہو اور تحقیق کرنے سے اس مبلغ عنہ کا بھی کوئی ضرر نہیں ہوتا تو وہاں تحقیق جائز ہے، اور اگر تحقیق کرنے سے اپنی کوئی دفع مضرت نہیں اور اس سے دوسرے کو ناگواری ہے تو تحقیق حرام ہے، اھ مخلصًا (بیان القرآن، ۱۱/ ۴۳)۔

نیز علامہ تمرتاشی فرماتے ہیں، جب کوئی آدمی صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو، لیکن اپنی زبان اور ہاتھ پاؤں سے لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہو، تو اس کے ان عیوب کا تذکرہ غیبت کے خانہ میں داخل نہیں، اور اگر کوئی زجر وتوبیخ کی غرض سے بادشاہِ وقت تک مخبری کردے تو وہ گنہگار نہ ہوگا۔

"وإذا كان الرجل يصوم ويصلي ويضر الناس بيده ولسانه فذكره بما فيه ليس بغيبة لو اخبر السلطان بذلك ليزجره، لا اثم عليه" (تنوير الابصار على الشامي، ۹/ ۴۹۹)۔

معلوم ہوگیا کہ افساد وفتنہ پروری کے ارادہ سے مخبری ناجائز ہے، لیکن ضرورت کی وجہ سے احوال پر مطلع ہوکر ذمہ داروں کو اطلاع دینا، تاکہ جرائم پیشہ لوگوں کی روک تھام ہوسکے، اور امن وامان قائم رہ سکے جائز ہے، لہٰذا مذکورہ شرطوں کے ساتھ ایسے امور کی ملازمت بھی جائز ہوگی۔

محکمہ عدالت کی ملازمت:

محکمۂ عدالت کا قیام جہاں ایک دیندار، عادل بادشاہ کی طرف سے ہوتا ہے، وہیں ظالم وجابر، فاسق وفاجر حکمراں کی جانب سے بھی ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس کا قیام ایک برسرِ اقتدار کافر کی جانب سے بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ ہر دور کی مثالیں کتب تاریخ وسیر میں موجود ہیں، لیکن یہ قیام جس کی بھی جانب سے ہو، ضروری ہے کہ اس محکمہ سے جور وظلم کا صدور نہ ہو، اور وہ اپنے اظہارِ حق کی ذمہ داری سے عاجز نہ ہو، لہٰذا اگر اس محکمہ کے ملازم وذمہ دار کو ظن غالب ہو کہ وہ اظہار حق سے عاجز رہے گا، اور فیصلہ میں جور وظلم ہوجانے کی وجہ سے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرسکے گا تو ان کے لیے اس عہدہ کو اختیار کرنا جائز نہیں، علامہ شامی فرماتے ہیں:

"فلو كان غالب ظنه أنه يجور فی الحكم فينبغي أن يكون حراما" (شامی، ۸/ ۴۰)۔

(اگر اس کا ظن غالب یہ ہے کہ وہ حکم میں جور کرے گا تو مناسب یہ ہے کہ ایسے عہدہ کو اختیار کرنا حرام ہو)۔

اسی طرح اگر کوئی حاکم محکمۂ عدالت کی اظہارِ حق سے روکتا ہو، اور حق کے مطابق فیصلہ کرنے سے مانع ہو، تو اس صورت میں بھی اس محکمہ کو اختیار کرنا، اور ملازمت کرنا جائز نہیں، جیسا کہ علامہ علاء الدین فرماتے ہیں:

"ويجوز تقلد القضاء من السلطان (الی قوله) إلا إذا كان يمنعه عن القضاء بالحق فيحرم" (ایضًا، ۸/ ۴۱)۔

(اور بادشاہ کی جانب سے قضاء کا عہدہ سنبھالنا جائز ہے مگر جبکہ بادشاہ برحق فیصلہ سے منع کرتا ہو تو ایسا عہدہ حرام ہے)۔

لیکن یہ ساری باتیں وہاں کے لیے ہیں جہاں احکام شرعیہ کی تنفیذ ممکن بھی ہو، البتہ ایسے ممالک جہاں اقتدار اعلیٰ کافروں کے ہاتھ میں ہو، اور باضابطہ شریعت کے مطابق ان کے قوانین نہ ہوں، اور نہ ممکن ہوں بلکہ مسلمانوں کے بہ نسبت ان کا رویہ کچھ علیحدہ ہی ہوگا تو ایسی جگہ پر من کل الوجوہ شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا تو بہت دور کی بات ہے، تصور بھی مشکل ہے، ایسے مقام پر مسلمانوں کی اگر شرکت، حاکم ہونے کی حیثیت سے نہ ہو تو وہ حکومت اپنے فاجر و فاسق فیصلہ کرنے والے کو بحال کرے گی اور مسلمانوں کے عدم شرکت کی کچھ بھی پرواہ نہیں کرے گی، پھر مسلمانوں کو بہت سے مواقع پر نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اس لیے ایسے موقع پر کثرت کے ساتھ مسلمانوں کی بحالی ہونی چاہئے، اور حتی المقدور انہیں صاحب حق کو حق دلانے کی عملی کوشش کرنی چاہئے، مولانا ظفر صاحب تھانویؒ ائمہ جور وظلم کے دور میں اس قسم کے محکمہ میں اہل ورع وتقویٰ کو دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

نظر وعقل کا مقتضی یہ ہے کہ اہل علم وصلاح پر ائمہ عدل کے بہ نسبت ائمہ جور کی جانب سے عہدۂ قضاء کو سنبھالنا زیادہ واجب وضروری ہو، تاکہ فساد کم سے کم ہو، اور بندوں کو راحت زیادہ سے زیادہ ہو، کیونکہ ائمہ عدل اپنے منصب عدل کے لیے شر پسندوں اور مفسدوں کا استعمال نہیں کرتے، اور ائمہ جور اپنے عمل کے لیے بالکل پرواہ نہیں کرتے کہ اس کا عمل کون کرے، تو اگر نیک لوگوں نے عہدۂ قضا کو نہیں سنبھالا تو وہ جور وظلم کرنے والے مفسدین کو استعمال کریں گے۔ (اعلاء السنن، ۱۴/ ۶۶۲۱)۔

اس لیے ہندوستان جیسے ملک کے محکمۂ عدالت میں حتی المقدور حق دلانے اور جور وظلم کا سد باب کرنے کے لیے ملازمت کرنا درست ہے، الا یہ کہ ظن غالب ہو کہ اس سے جور کا صدور ہوگا یا حکومت اظہار حق سے مانع ہوگی تو پھر اجازت نہیں۔

انکم ٹیکس دفتروں کی ملازمت:

اکثر ارباب افتاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انکم ٹیکس کی جو شرحیں رکھی گئی ہیں وہ ظلم محض ہے، لہٰذا حق تو یہ ہونا چاہئے کہ تمام لوگ مل کر اس جور وظلم کو دفع کریں، جیسا کہ درمختار اور ردالمحتار میں ہے:

''دفع النائبة ای ماینوب من جهة السلطان من حق أو باطل، او غیره والظلم عن نفسه اولیٰ'' (درمختار علی الشامی، ۳/ ۲۵۳)۔

لہٰذا اس قسم کے ادارہ کی ملازمت، حقیقۃً اس کے جور وظلم کی اعانت ہے، جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں، بلکہ شریعت نے اس طرح کے جور وظلم کے خوگر لوگوں کی مجالست، اور مصاحبت سے بھی منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا ترکنو، إلی الذین ظلموا فتمسکم النار الخ"۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظلمین" حضرت علامہ ابوبکر جصاص الرازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

یہ اہل ملت، اور اہل شرک میں سے تمام ظالموں کے ساتھ مجالست کی ممانعت میں عام ہے کیونکہ ظالم کا نام تمام کو شامل ہے، خواہ یہ لوگ اس وقت ظلم وقبائح کو ظاہر کررہے ہوں یا نہ ظاہر کرتے ہوں۔ (احکام القرآن للجصاص، ۳/ ۳)۔

نصوص مذکورہ سے معلوم ہوگیا کہ انکم ٹیکس کی ملازمت جائز نہیں۔

حرمت پر مبنی ملازمت (بینک سے متعلق):

تمہید میں بات گذر چکی ہے کہ ملازمت کی صحت کے لیے اس کا جائز ہونا ضروری ہے، اور چونکہ بینک کی بنیاد سودی لین پر ہے، لہٰذا اس کی ملازمت جائز نہیں۔

البتہ بینک کے کمپیوٹر اور ییر کنڈیشن کی مرمت حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہوگی، کیونکہ ان مشینوں کا بینک کے لیے استعمال کیا جانا فاعل مختار کے فعل سے ہے، خود یہ مشینیں معصیت نہیں ہیں، لیکن حضرات صاحبین کے نزدیک جائز نہیں، اس لیے کہ جب معلوم ہے کہ یہ چیزیں بینک ہی کی ہیں، اور اسی کے پیسے کے لین دین میں معین ومددگار ہیں تو اس کی مرمت بھی تعاون علی المعصیت ہوگی۔

اور یہی اختلاف بینک کی حفاظت، مکان کی تعمیر، یا مکان کے کرایہ پر دینے سے ہے، حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک جائز ہے، کیونکہ یہ سب چیزیں فی نفسہ معصیت نہیں، اور حضرات صاحبین کے نزدیک جائز نہیں، جیسا کہ تفصیل وترجیح ابتداء میں گزر چکی ہے، لہٰذا بلا ناگزیر حالت کے ان امور کی

ملازمت جائز نہیں۔

انشورنس سے متعلق:

چونکہ انشورنس کمپنی کا پورا نظام سود وقمار پر ہے، اور یہ دونوں چیزیں نص قطعی سے حرام ہیں، اس لیے اس کمپنی کی ملازمت کرنا یا ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے کام کرنا دونوں حرام ہے۔

شراب کمپنی سے متعلق:

"عن انس بن مالك لعن رسول الله ﷺ فى الخمر عشرة: عاصرها، ومعتصرها، وشاربها وعاملها، والمحمول اليه، وساقيها، وبائعها وأكل ثمنا، والمشترى لها، والمشتراة له۔"

(حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے شراب کے سلسلے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے، اس کے نچوڑوانے والے، اس کے نچوڑنے والے، اس کے پینے والے، اس کے اٹھانے والے، اور جس کے پاس اٹھا کر لے جائی گئی، اس کے پلانے والے، اس کے ثمن کھانے والے اور اس کے خریدنے والے، اور جس کے لیے وہ خریدی گئی)۔

ایک کمپنی کے لیے بوتل بنانا، یا ایسے اجزاء پیش کرنا جن سے شراب بھی بنائی جاتی ہے، حضرت ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مختلف فیہ ہے، حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے اور حضرات صاحبین کے نزدیک ناجائز ہے، اور یہی قول راجح ہے، البتہ ضرورت کے وقت حضرت امام ؒ کے قول کے مطابق اجازت ہے۔

اسی طرح شراب کمپنی میں حساب و کتاب لکھنے کی ملازمت بھی حضرت امام ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک جائز ہوگی، کیونکہ نفس حساب و کتاب لکھنا معصیت نہیں، بلکہ شراب پینا، پلانا اور اس کو خریدنا بیچنا یہ معصیت ہے جو فاعل مختار کا فعل ہے، لیکن حضرات صاحبین ؒ کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز ہوگی، اس لیے کہ شراب کمپنی کا اس میں بھی تعاون ہے جس سے تعاون علی المعصیۃ کا لزوم ہوتا ہے۔

ضمنی حرمت پر مبنی ملازمت:

وکالت سے متعلق:

وکالت کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ مؤکل کو اس کے معاملہ میں قانونی مشورہ دیدے، اور اس کے مقدمہ سے متعلق جو بھی قانونی نشیب وفراز آسکتے ہیں اس کی رہنمائی کردے، اور ظاہری بات ہے کہ صرف مشورہ دیدینا اور رہنمائی کردینا کوئی مال متقوم نہیں ہے کہ اس کی اجرت، واجب ہو، چنانچہ علامہ شامی صرف رہنمائی اور اشارہ کردینے کو قابلِ اجرت عمل قرار دینے سے انکار فرماتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ اس سے رہنمائی کرنے والا مستحق اجرت نہیں ہوتا۔

"رجل ضل له شئ، فقال من دلنى على كذا فله كذا، فهو على وجهين: إن قال ذالك على سبيل العموم بأن قال: من دلنى فالإجارة باطلة لأن الدلالة والإشارة ليست بعمل يستحق به الأجر" (شامی، ۹/ ۱۱۱)۔

(ایک آدمی جس کی کوئی چیز گم ہوگئی، تو اس نے کہا: جو میری گم شدہ چیز پر رہنمائی کرے گا اس کے لیے اتنا اتنا مال ہوگا، تو اس کی دو صورتیں ہیں: اگر اس نے یہ علی سبیل العموم کہا، بایں طور کہ "جو میری رہنمائی کرے گا" تو اجارہ باطل ہے، اس لیے کہ رہنمائی واشارہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ اس کے عوض میں اجرت کا مستحق ہو)۔

نیز جبکہ مؤکل اگر مظلوم ہو، اور مشورہ کے لیے وکیل کے پاس آیا ہو، تو اس صورت میں مظلوم کی رہنمائی اور فریادرسی واجب، ہوجاتی ہے، چی جائیکہ وہ اس پر اجرت لے، جیسا کہ علامہ عینی عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

"قال العلماء: نصر المظلوم فرض واجب على المؤمنين على الكفاية" (عمدة القارى، ۶/۱۱۰)۔

لہٰذا مذکورہ نظریہ سے معلوم ہوا کہ وکالت کی اجرت جائز نہیں۔

لیکن آج کل وکیل صرف قانونی مشورہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ عدالت میں جانا اور ضرورت پڑنے پر بحث ومباحثہ کرنا ضروری سمجھتا ہے، جس میں

اس کے اوقات کا ایک بڑا حصہ صرف ہوتا ہے، لہٰذا جس طرح سے قاضی وحاکم محبوس فی امور العامۃ ہونے کی وجہ سے مستحق نفقہ ہوتے ہیں، اسی طرح وکیل بھی ہو سکتے ہیں۔

البتہ اس کے جواز کے لیے ضروری ہے کہ عمل یا وقت اور اجرت متعین ہو، نیز وہ مقدمہ از قبیل معصیت نہ ہو، اور نہ ایسی طاعت ہو جو صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہو، لہٰذا اگر مقدمہ معصیت پر مبنی ہو، یا طاعتِ مخصوصہ بالمسلم ہو تو اس کی اجرت جائز نہیں، جیسا کہ حضرت علامہ شامی فرماتے ہیں:

''الأصل أن كل طاعة يختص بها المسلم لايجوز الاستئجار عليها عندنا'' (شامی، ۹/ ۶۵)۔

سپر مارکیٹ سے متعلق:

ایسی سپر مارکیٹ جہاں مختلف ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ شراب بھی فروخت ہوتی ہے اس کی ملازمت میں حسب ذیل تفصیل ہے:

اگر اس میں خاص شراب ہی فروخت کرنے کی ملازمت ہو تو جائز نہیں۔

اور اگر عقد میں یہ بھی شرط ہو کہ دیگر امور کے ساتھ شراب بھی فروخت کرنا ہوگی تب بھی ملازمت جائز نہیں کیونکہ عقد مخلوط بالمعصیت ہے۔

اور اگر عقدِ ملازمت مطلق ہو، اس میں شراب بیچنے کی صراحت نہ ہو تو جائز ہے، اس لیے کہ اس صورت میں ارتکاب معصیت یا اس پر تعاون متعین نہیں، بلکہ موہوم ہے۔

تدریس سے متعلق:

مخلوط تعلیم کی تدریسی خدمات کے حکماً مختلف جہات ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

- اگر لڑکے لڑکیاں مخلوط ہوں اور دونوں نابالغ اور نا قابل شہوت ہوں تو ان کے لیے خواہ مرد مدرس ہوں یا عورت، دونوں کے لیے گنجائش ہے، ''وفی الشامية: فقد أعطوها حكم البالغة من حين بلوغ الشهوة۔ ''(شامی، ۲/ ۷۴)

- اور اگر بچے بچیاں دونوں بالغ ہوں یا نابالغ و بالغ مخلوط ہوں، اور لڑکیاں شرعی برقع میں پیچھے بیٹھتی ہوں تو اس صورت میں بھی مرد، مدرس بن سکتے ہیں، ''وفی القنية: يجوز الكلام المباح مع امرأة اجنبية، كما فى الشامى ''(ایضاً، ۹/ ۴۵۰)۔

- اور اگر دونوں مخلوط ہوں، اور بچیاں شرعی پردہ میں نہ ہوں، اور اتنے قریب بیٹھتی ہوں کہ خیالات پراگندہ اور شہوت بھڑک سکتی ہو، اور خود غض بصر کی تاب نہ ہو تو اس صورت میں ملازمت جائز نہیں۔ قال فی التاتارخانیۃ۔

''وفى شرح الكرخى: النظر الى وجه الأجنبية ليس بحرام، ولكنه يكره بغير حاجة، (الى قوله) وان كان عن شهوة حرم'' (ايضا، ۹/ ۴۵۱)۔

(اجنبیہ کی طرف دیکھنا حرام نہیں ہے، لیکن بغیر ضرورت کے مکروہ ہے، اور اگر شہوت کی وجہ سے ہو تو حرام ہے، اور ہمارے زمانہ میں جوان عورتوں کو دیکھنا ممنوع ہے، اس وجہ سے نہیں کہ وہ عورت ہے بلکہ اندیشہ فتنہ کی وجہ سے)۔

- اور اگر لڑکیوں کی مخصوص درس گاہوں میں اساتذہ پردہ کے پیچھے سے پڑھاتے ہوں، جیسا کہ گجرات کے مدرسۃ البنات کا نظام ہے تو ایسی ملازمت جائز ہے۔

- اسی طرح بالغ لڑکوں کی درسگاہوں میں شرعی پردہ کے ساتھ بڑی بوڑھی عورتیں کام کر سکتی ہیں، جوانوں کو اجازت نہیں، ''أما إذا كانت عجوزًا لاتشتهى فلا بأس بمصافحتها ومس يدها لانعدام خوف الفتنة ''(ہدایہ، ۴/ ۴۵۹)۔

طبابت سے متعلق:

ڈاکٹروں کی حیثیت اپنے مریض کے سامنے ایک شفیق امانت دار مربی کی ہے، جب کوئی مریض اس کے پاس آتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے

جسمانی امور میں خیر خواہی طلب کرتا ہے، اسی لیے ڈاکٹر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اس کے جسم کا معائنہ کر کے کوئی دوا تجویز کرے، یا اس سے خیر خواہی کی بات کرے۔

لہذا اگر اس کے علم کے مطابق جو کچھ کیفیات سامنے آئی اس کو بعینہ بتادی، یا اس کے مطابق دوا تجویز کردی، تو اس نے مریض کے حق کی ادائیگی کی، اور اپنی امانت کی حفاظت کی، اور اگر اس کے خلاف کیا، تو اس نے اپنی ذمہ داری میں دانستہ کوتاہی، اور امانت میں خیانت کی۔

لہذا اگر انتظامیہ نے ہر ماہ مقدار متعین آپریشن یا جانچ کی شرائط لگائی اور ڈاکٹروں کی امانت پر نہیں چھوڑا تو یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے فاسد ہوگی، اور ایسی ملازمت درست نہیں ہوگی۔

"الفاسد ماعرض علیه من الجهالة، أو اشترط شرط لایقتضیه العقد، کمافی الشامیه" (شامی، ۹/ ۵۲)۔

بات رہی خلاف جنس مریض کے قابل ستر حصے کو دیکھنے کی تو اس سلسلے میں اصل تو یہ ہے کہ موافق جنس کو اس مرض کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اس کا علاج کر سکے، لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو اور مرض مہلک یا ناقابل تحمل ہو تو موضع مرض کے علاوہ تمام جگہوں کو ڈھانک دے اور اس سے حتی المقدور غض بصر کرتے ہوئے صرف موضعِ مرض کو دیکھے، اور اس کا علاج کرے، جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

"إن کان المرض فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها، فإن لم توجد خافوا علیها أن تهلك أو یصیبها وجع لا تحتمله یستروا منها کل شئ الا موضع العلة، ثم یداویها الرجل، ویغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح" (ایضًا، ۹/ ۳۵۲)۔

(اگر مرض شرمگاہ کی جگہ پر ہو تو مناسب یہ ہے کہ کسی ایسی عورت کو علاج کی تعلیم دے دے جو اس کا علاج کر سکے، اور اگر ایسی کوئی عورت موجود نہ ہو اور اس پر ہلاکت یا ناقابلِ تحمل درد پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کے موضع بیماری کے علاوہ تمام جگہوں کو چھپادیں، پھر مرد اس کا علاج کرے، اور حتی المقدور موضع علاج کے علاوہ سے غض بصر کرے)۔

معلوم ہوا کہ شرط مذکور کے ساتھ خلاف جنس کا علاج کیا جاسکتا ہے اور اسی حدود وقیود کے ساتھ اس کی ملازمت بھی جائز ہے۔

ہوٹلوں سے متعلق:

جب ہوٹلوں کا بنیادی مقصود معاوضہ لے کر قیام وطعام کا انتظام ہے، اور شراب کی فراہمی بھی اس کا ایک جزء ہے تو اس کی ملازمت کے سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ:

اگر ہوٹلوں میں خلاف شرع امور کے برانچ الگ ہیں، اور ان کے ملازم بھی الگ ہیں، جیسا کہ عام طور سے ایسے ہی ہوتے ہیں، تو خاص اس برانچ میں ملازمت جائز نہیں، اور دوسرے برانچ کی ملازمت جائز ہے۔

اور اگر برانچ الگ نہیں، لیکن ملازموں کی علیحدہ علیحدہ تقسیم ہے، جیسا کہ ہوٹلوں میں ہر کام کے لیے الگ الگ نوع کے ملازم ہوتے ہیں، تو اس صورت میں بھی خلاف شرع امور کے لیے ملازمت کرنا جائز نہیں، البتہ اس کے علاوہ امور کی ملازمت جائز ہے۔

تاہم تقوی اور احتیاط یہی ہے کہ ایسے ہوٹلوں کی ملازمت سے اجتناب کریں، اس لیے کہ ایسی جگہوں پر خلاف شرع امور کا اگرچہ ارتکاب نہیں، لیکن ناجائز کرنے والوں کی مخالطت ومجالست ضرور لازم آتی ہے، جس سے مبتلا گناہ ہوجانا بہت ممکن ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام، کالراعی یرعی حول الحمی یوشك أن یرتع فیه" (کذا فی المشکوۃ، ۲۴۱)۔

☆☆☆

حکومت کے محکموں میں ملازمتوں کے شرعی احکام

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی [1]

اس زمانے میں حلال روزی کا حصول اس قدر دشوار ہوگیا ہے کہ کوئی ارادہ بھی کرتا ہے تو معاش کے مباح دروازے بند نظر آتے ہیں؛ معصیت کا ارتکاب، سود وقمار کا رواج، ننگا پن وعریاں مزاج ومذاق کا کھلا اظہار، عدل وانصاف کا فقدان اور ظلم وعدوان کا بے جاد باؤ اتنا عام ہوگیا کہ معاشی مسئلے کا اسلامی سسٹم پامال ہوکر رہ گیا۔

دوسری طرف تمام ذرائع معاش کو چھوڑ کر ملازمت ونوکری پر انحصار کرلیا گیا خواہ اس کے اسباب وعوامل کچھ بھی ہوں تو نتیجہ ہوا کہ شرعی حدود کا احترام ذہن ودماغ سے محو ہوگیا اور تلاش بسیار کے بڑھتے رجحان نے پاکیزہ روح اور صاف ستھرے باطن کو میلا کردیا، اب شریعت کے مطابق جینے میں، نیز حدود میں رہتے ہوئے کسی پیشہ کو اختیار کرنے میں وقت والجھن محسوس کی جانے لگی، حالانکہ معاملہ ایسا نہیں، شریعت اسلامی کی جامع تعلیمات میں ساری دقتوں کا حل ہے بشرطیکہ ہمت وحوصلہ سے کام لیا جائے، اور عمل کرنے کا پختہ عزم کیا جائے، کسب معاش تو مطلوب شرعی ہے بغیر اس کے زندگی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی، لیکن شریعت کی جانب سے اس کے کچھ ضابطے مقرر ہیں، انہی ضابطوں کی پابندی کرکے صحیح راہ کی یافت ہوسکتی ہے اس سلسلہ کی سب سے اہم ہدایت یہ ہے کہ وہ "معاش" بذات خود شریعت کی پاکیزہ روح سے ہم آہنگ ہو، نیز اس میں کسی کی حق تلفی یا ظلم وزیادتی کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو، اسی طرح کسی معصیت کی حوصلہ افزائی یعنی معاونت نہ ہو رہی ہو، قرآن کریم کی آیت کریمہ "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان "نیز حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح پرور دعاء "رب بما انعمت على فلن أكون ظهيرا للمجرمين "اس کی تائید وتوثیق کے لیے کافی ہے۔

معاملات کے باب کی احادیث کا معتد بہ حصہ اس نکتہ پر بھی مرکوز ہے، حرمت خمر کی حدیث جس میں دس افراد پر لعنت کی گئی ہے، شراب کا مجرم تو شخص واحد ہے باقی جتنے ہیں سب کا تعلق تعاون وتسبب سے ہے۔

حرمت ربا کی حدیث "لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء"

(ربا کھانے والا، کھلانے والا، لکھنے والا، اور گواہی دینے والے پر حضور ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، اور فرمایا کہ سب برابر ہیں (معصیت میں))

(مسلم شریف: ۲/ ۲۷، کتاب البیوع، باب الربا، طبع: دیوبند)۔

اس میں بھی ایک کے سوا باقی معاونت کے ہی مرتکب ہیں۔

سب کا حاصل یہی ہے کہ حرمت کا تعلق جس طرح مباشر سے ہے، معاون سے بھی ہے۔

اکابر واسلاف کا طرز عمل بھی اسی طرف مشیر ہے، اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

حضرت عبیداللہ بن الولید رصافی نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے اپنے بھائی کے متعلق دریافت کیا:

"إن أخي ليس له من أمور السلطان شئ إلا أنه يكتب له بقلم مايدخل وما يخرج. فإن ترك قلمه صار عليه دين واحتاج، وإن أخذ به كان له فيه غني قال: لمن يكتب؟ قال: لخالد بن عبدالله القسري، قال: ألم تسمع إلى ما قال العبد الصالح: رب بما أنعمت على فلن أكون ظهيرا للمجرمين، فلا يهتم أخوك بشئ وليرم بقلمه، فإن الله تعالى سياتيه برزق" (أحكام القرآن مولانا ظفر احمد عثمانی، ۲/ ۷۴، تفسير قصص، مكتبه كراچی)۔

---

[1] استاذ مدرسہ حسینیہ، کایم کلم، کیرالا۔

(میرے بھائی سے متعلق شاہی خدمات میں سے صرف یہ ہے کہ وہ حساب وکتاب لکھتا ہے، اگر لکھنا بند کردے تو اس پر قرض کا بوجھ ہو جائے گا اور محتاج ہو جائے گا، اگر لکھتا ہے تو غنی رہتا ہے، حضرت عطا نے پوچھا: کس کے لیے لکھتا ہے؟ حضرت عبید اللہ نے فرمایا: خالد بن عبداللہ قسری کا کاتب ہے، حضرت عطاء نے فرمایا: کیا تم نے عبد صالح کی دعا نہیں سنی، رب بما أنعمت علی ... الخ کیا تیرے بھائی کو کچھ پرواہ نہیں ہے اس کو چاہئے کہ قلم پھینک دے، اللہ رزق دے گا) اور بھی متعدد واقعات ہیں جو اس "نکتہ" کی تائید کرتے ہیں۔

معاونت کے قریب قریب "تسبب" ہے، شریعت نے ہر ایسی صورت کو بھی ممنوع کر دیا ہے جو کسی فسق وفجور کا سبب بن رہی ہے، قرآن میں ہے:

من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها۔

پھر ایسا بھی نہیں کہ ہر تعاون اور ہر سبب ناجائز ہے، اگر ایسا ہو تو انگور کی کاشت کرنے والا بھی حرمت کا مرتکب ہوگا، اس لیے کہ وہ بھی کسی نہ کسی درجے میں شراب کا سبب بن رہا ہے اس لیے کچھ تفصیل کرنی ہوگی۔

تسبب وتعاون کے مابین فرق:

تسبب وتعاون میں فرق بھی ہے، سبب میں نیت کا اعتبار نہیں جبکہ تعاون میں نیت وقصد معتبر ہے، یہی وجہ ہے کہ تعاون کی تین صورتوں کو "حرام تعاون" باور کیا گیا ہے جن میں نیت وقصد یا تو حقیقتاً ہے یا حکماً۔

(۱) اعانت کرنے والا اس معصیت کا قصد کرے۔ (۲) صلب عقد میں ارتکاب معصیت مشروط ہو۔ (۳) وہ محل، معصیت کے علاوہ کسی اور خیر کو قبول کرنے والا ہی نہ ہو، پس پہلی صورت میں قصد وارادہ حقیقتہً ہے جبکہ آخر دونوں صورتوں میں حکماً ہے، لہٰذا حرمت کے لیے حقیقتاً یا حکماً نیت کا ہونا ضروری ہے۔

اس کے برخلاف "سبب" میں نیت کا اعتبار نہیں، بدون قصد بھی تسبب ممنوع ہوگا، لیکن سبب سے مراد سبب قریب جالب ومحرک ہے، حضرت عثمانی نے اچھی تفصیل فرمائی ہے، خلاصہ اس کا یہی ہے کہ: ہر سبب نہ تو محمود ہے اور نہ مبغوض، بلکہ سبب کی دو قسمیں ہیں: قریب وبعید، سبب قریب بعض تو محرک ہے اور بعض غیر محرک، سبب محرک کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یہ سبب نہ ہوتا تو اس شئ کا وجود نہ ہوتا، اسی کو فقہاء واصولیین "سبب فی معنی العلۃ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

علامہ شامی نے بھی اجمالی طور پر اس پر روشنی ڈالی ہے، ہتھیار کی خرید وفروخت پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ويكره تحريما بيع السلاح من أهل الفتنة إن علم، لأنه إعانة على المعصية، وبيع مايتخذ منه كالحديد ونحوه يكره لأهل الحرب لا لأهل البغي (زيلعي)۔

قلت: وأفاد كلامهم أن ما قامت المعصية بعينه يكره تحريمًا وإلا فتنزيهًا (كذا في النهر، شامی: ۴/ ۲۶۸، كتاب البغاة، مطلب في كراهية بيع ماتقوم المعصية بعينه، طبع: کراچی)۔

(اگر جانتا ہو تو اہل فتنہ سے ہتھیار کو فروخت کرنا مکروہ تحریمی ہے، اس لیے کہ یہ اعانت علی المعصیت ہے، لوہے وغیرہ جس سے ہتھیار بنایا جاتا ہے، اس کی بیع کافر سے مکروہ ہے نہ کہ باغی سے) (زیلعی)۔

فقہاء کے کلام کا مفاد یہ ہے کہ جس کے عین سے معصیت کا قیام ہو (اس کی بیع) مکروہ تحریمی ہے ورنہ تنزیہی ہے۔

بہرحال نہ تو ہر سبب ممنوع ہے نہ ہر اعانت ناجائز ہے، بلکہ اعانت وہ ممنوع ہے جس میں معصیت کا قصد یا تو حقیقتہً ہو یا حکماً، اسی طرح جو سبب محرک معصیت ہے وہ بھی ممنوع ہے۔

فقہائے کرام نے قرآن وحدیث سے بعض اہم اصول بھی مستنبط کیا ہے، ان اصول کو زیر بحث مسئلہ میں مد نظر رکھنا چاہئے مثال کے طور پر:

(الف) قد تراعى المصلحة لغلبتها على المفسدة (اشباہ: ۱/ ۱۲۶، قاعدہ ۱، ۵ الفن الاول مطبوعہ: پاکستان)۔ کبھی مصلحت غالبہ کی مفسدہ کے مقابلہ میں رعایت کی جاتی ہے۔

(ب) ما أبيح للضرورة يقدر بقدرها (اشباہ، ۱۹/ ۱۱۹، قاعدہ خامسہ، مطبوعہ: پاکستان)۔ (ضرورت کی بنا پر مباح کو بقدر ضرورت ہی اختیار

کیا جاتا ہے)۔

(ج) المشقة تجلب التيسير (اشباہ:۱/۱۰۵، قاعدہ رابعہ مطبوعہ: پاکستان)۔(مشقت آسانی پیدا کرتی ہے)۔

(د) الأمور بمقاصدها (اشباہ:۱/۴۲، پاکستان)۔(کاموں کا اعتبار ان کے مقاصد کے لحاظ سے ہوتا ہے)۔

(ھ) يتحمل الضرر الخاص لأجل دفع الضرر العام (اشباہ:۱/۷۶، پاکستان)۔(ضرر عام کو دفع کرنے کے لیے ضرر خاص کو برداشت کرلیا جاتا ہے)۔

(ر) الكذب محظور إلا في القتال للخدعة، وفي الصلح بين اثنين، وفي إرضاء الأهل وفي دفع الظالم من الظلم (عالمگیری: ۵/۴۳۲، کتاب الکراہیۃ، باب الغناء واللہو مطبوعہ: بیروت)۔(کذب ممنوع ہے مگر جنگ میں دھوکہ دینے کے لیے، دو شخصوں کے مابین صلح کرنے کے لیے، بیوی کو خوش کرنے کے لیے، اور ظالم کو ظلم سے روکنے کے لیے)۔

انہی اصول وضوابط کو سامنے رکھتے ہوئے دور حاضر کی مختلف ملازمتوں کا حکم تلاش کیا جاسکتا ہے۔

(۱) فوجی ملازمت کا حکم:

فوجی ملازمت کو ذریعہ معاش بنانے میں اعانت علی المعصیت ضرور ہے، مگر اسی وقت ممنوع ہوگی جبکہ حقیقتاً یا حکماً اس کا قصد ہو، لہٰذا ایسی فوج میں بھرتی ہونا جس کا مقصد مسلمانوں سے لڑنا ہو خواہ لڑائی کی نوبت آئے یا نہ آئے، جائز نہیں ہے۔

یا پھر تقرری کے وقت ہی ظلم وزیادتی کو مشروط کردیا جائے تو بھی جائز نہیں ہے، ورنہ اگر معصیت کی نیت نہیں ہے تو فوجی ملازمت میں کچھ حرج نہیں ہے، بلکہ اگر نیت ظلم وجور کو دفع کرنا ہو تو اس میں ثواب بھی ہے، شامی کی ایک عبارت سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

قوله: يؤجر من قام بتوزيعها بالعدل، أي بالمعادلة كما عبر في القنية، أي: أن يحمل كل واحد بقدر طاقته؛ لأنه لو ترك توزيعها إلى الظالم ربما يحمل بعضهم مالا يطيق فيصير ظلما على ظلم. ففي قيام العارف بتوزيعها بالعدل تقليل للظلم فلذا يؤجر (شامی، ۲/ ۳۳۶، کتاب الزكاة، هل يجب العشر على المزارعين في الأراضي السلطانية، کراچی)۔

(جو شخص اس (سلطانی ناحق ٹیکس) کو ٹھیک ٹھیک تقسیم کرے گا ماجور بھی ہوگا، یعنی ہر شخص کو اس کی طاقت کے بقدر مکلف کرے، اس لیے کہ اگر اس کی تقسیم ظالم کے حوالہ ہوگئی تو طاقت سے زیادہ بار ڈال دے گا تو ظلم بالائے ظلم ہوجائے گا، لہٰذا عارف کے انصاف کے ساتھ تقسیم کرنے میں ظلم کی تقلیل ہے تو ماجور ہوگا)۔

مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ کا فتوی بھی اسی نوع کا ہے:

ظالموں سے ملک کی حفاظت کے لیے فوج میں ملازمت کرنا درست ہے، اگر کسی ظالم نے چڑھائی کی اور دفاع کرتا ہوا قتل ہوگیا تو ان شاء اللہ شہید ہوگا، "من قتل دون ماله، من قتل دون دمه، ومن قتل دون غرضه" ان سب کو شہید فرمایا گیا ہے (فتاوی محمودیہ: ۲۵/ ۱۵۰، سوال: ۹۱۴۸، بترتیب جدید)۔

(۲) محکمۂ پولیس کی ملازمت:

اس محکمہ کا اصل مقصد امن وامان کا قیام ہے، ظلم وزیادتی قانوناً بھی ممنوع ہے، لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اس میں شامل ہونے والا بدمعاش، بدقماش اور بدفطرت بن جاتا ہے، جو انسان کا ذاتی فعل ہے اس کی حوصلہ افزائی تو نہیں کی جاسکتی، لیکن اصل مقصود کی نیت سے اس پیشے کے قبول کرنے کو ناجائز بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام کے قصہ سے استیناس کیا جاسکتا ہے۔

البتہ کسی کو اپنے بارے میں ظن غالب ہے کہ اسلامی حدود کی پاس داری اس کے بس میں نہیں رہ پائے گی تو اس کے لیے ایسے عہدے سے اجتناب لازم ہے۔

جواز کی صورت میں بھی اپنے آپ کو ظلم وزیادتی سے دور رکھے۔

(۳) محکمہ انٹیلیجنس کی نوکری:

محکمہ انٹیلیجنس میں ملازمت سے بھی انسانوں کا مفاد متعلق ہے، گو اس کی اصل تجسس ہے جو غیبت کے زمرے میں آتا ہے لیکن ہر غیبت ممنوع نہیں ہے، فقہاء نے بعض مواقع کا استثناء بھی کیا ہے، اس لیے ایسی نوکری انہی مستثنیٰ مواضع میں شمار ہوگی اور جائز ہوگی۔

تجسس وغیبت بعض اوقات غرض صحیح کی بنا پر جائز بلکہ مستحسن وواجب ہوجاتی ہے، علامہ قرانی وحافظ ابن حجر نے ان مواضع کی نشان دہی کی ہے، دوسرے علماء نے بھی اتفاق کیا ہے، حافظ کی عبارت درج ذیل ہے:

''قال الغلماء: تباح الغيبة في كل غرض صحيح شرعاً حيث يتعين طريقًا إلى الوصول إليه بها كالتظلم والاستعانة على تغيير المنكر، والاستفتاء، والمحاكمة، والتحذير من الشر، ويدخل فيه تجريح الرواة والشهود، وإعلام من له ولاية عامه بسيرة من هو تحت يده، وجواب الاستشارة في النكاح أو عقد من العقود ... الخ'' (فتح الباري: ۱۰/ ۵۴۷، كتاب الادب، باب مايجوز من اغتياب اهل الفساد والريب: ۶۰۵۴:۶، كتاب الفروق للعراق: ۴/ ۲۵۹، فرق: ۲۵۳، مطبوعه: بیروت ۱۴۱۸)۔

(علماء نے فرمایا: غیبت ہر شرعی غرض صحیح کے لیے جائز ہے مثلاً جہاں مقصود تک پہنچنے کے لیے یہی طریقہ متعین ہو، جیسے شکایت ظلم، منکر کی تغییر کے لیے استعانت، استفتاء، فیصلہ کرانا، لوگوں کو شر سے متنبہ کرنا، اسی میں راویوں اور گواہوں کی جرح ہے، نیز ولی کو اس کے ماتحت کے حالات سے باخبر کرنا، نکاح میں یا عقد میں مشورہ دینا داخل ہے)۔

اسی طرح تجسس کی قرآن وحدیث میں ممانعت آئی ہے، لیکن بعض نظائر ایسے بھی ہیں جہاں تجسس کی اجازت ہی نہیں بلکہ حکم ہے۔ گواہوں کے تزکیہ کی ایک صورت سری تزکیہ کی ہے، اس میں بھی خفیہ طور پر تجسس کیا جاتا ہے۔ (فتح القدیر: ۷/ ۳۵۳، کتاب الشہادات، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

حضرت امام ابو یوسف جس زمانے میں عہدۂ قضا پر فائز تھے "نصاب الاحتساب" کے مطابق بعض اوقات بعض شبہ کی بنا پر تجسس کا حکم دیتے تھے، البتہ علامہ ماوردی نے محتسب کے لیے مطلقاً تجسس کو ممنوع قرار دیا ہے، لیکن حق وہ معلوم ہوتا ہے جو "تکملہ فتح الملہم" میں لکھا گیا ہے:

''والذي يظهر أن المستتر بتعاطي المحرم من المحرمات إن كان لايتعدى ضرره إلى غيره فلا حاجة للمحتسب أن يتجسس في أمره، وأما إذا تعدى إلى أحد غيره او المجتمع بصفة عامة فإنه يجوز للمحتسب أو لموظف آخر منصوب من قبل الحكومة لهذا الغرض أن يهجم عليه'' (تكملة فتح الملهم: ۵/ ۳۶۰، كتاب البر والصلة والادب، باب: تحريم الظن والتجسس، مطبوع کراچی)۔

(ظاہر یہ ہے کہ جو شخص خفیہ طور پر کسی محرم کا مرتکب ہے، اگر اس کا ضرر دوسروں تک متجاوز نہیں تو تجسس کی حاجت نہیں اور اس کا ضرر دوسروں تک متعدی ہو تو محتسب یا حکومت کے کسی بھی کارندے کے لیے اس غرض سے تجسس جائز ہے)۔

(۴) کورٹ کچہری کی ملازمت:

غیر اسلامی عدالت کی ملازمت بھی جائز ہے، اس کا اصل مقصد انصاف دلانا ہے نہ کہ ظلم کرنا، ظلم وعدوان قانون ملکی کی خلاف ورزی ہے، جو گرفت میں آنے پر بڑے بڑے عہدے سے سبکدوش کردیا جاتا ہے، اس لیے اصل مقصود انصاف کی فراہمی ہے جو نیک مقصد ہے، الامور بمقاصدہا۔

لہٰذا اس نیت سے یہ محض کسب معاش کی غرض سے ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا، البتہ خلاف اسلامی قانون برتنا جائز نہ ہوگا، بلکہ ہر ایسے مرحلے پر دوسرے کسی غیر مسلم عہدے دار کو سپرد کردیا کرے وہی اس قانون کو نافذ کرے تاکہ کسی مسلم کی طرف سے معاونت نہ پائی جائے۔ صاحب درمختار فرماتے ہیں:

"يجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو كافرًا" (درمختار مع ردالمحتار: ۵/ ۳۶۸، کتاب القضاء، قبيل: مطلب في حكم تولية القضاء، في بلاد تغلب فيها الكفار، مطبوعہ: پاکستان)۔

(بادشاہ سے منصف ہو یا ظلم پرور، خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو قضاء قبول کرنا جائز ہے)۔

ہاں اگر ظن غالب ہے کہ اس پیشہ کو قبول کرنے سے وہ غیر اسلامی قانون اختیار کرنے پر مجبور ہوگا تو پھر جائز نہیں کہ اس پیشہ کو اختیار کرے۔

"فلو كان غالب ظنه أنه يجور في الحكم ينبغي أن يكون حرامًا" (شامی:۵/ ۳۶۷، کتاب القضاء پاکستان)۔

(اگر ظن غالب ہے کہ ظلم وجور کرے گا تو حرام ہے)۔

(۵) آئی ٹی او کی ملازمت:

ٹیکس دراصل ذاتی ملکیت میں جبری تصرف ہے جو اصل کے لحاظ سے تو ممنوع ہے، لیکن بہت سے علماء نے ملکی مفاد کی خاطر اس کی اجازت بھی دی ہے، صاحب ردالمحتار لکھتے ہیں: "قال أبو جعفر البلخي: مايضر به السلطان على الرعية مصلحة لهم يصير دينا واجبًا وحقًا مستحقًا كالخراج۔"

"وقال مشائخنا: وكل مايضر به الإمام عليهم لمصلحة لهم فالجواب هكذا" (شامی: ۲/ ۳۳۷، کتاب الزکاۃ، مطلب: ہل یجب العشر علی المزارعین، مطبوعہ: کراچی)۔

(ابوجعفر بلخی نے فرمایا: بادشاہ، رعایا پر عوام کی خاطر جو ٹیکس متعین کرتا ہے وہ خراج کی طرح واجب قرض اور حقِ مستحق ہو جاتا ہے۔

مشائخ علیہم الرحمہ نے فرمایا: ہر وہ ٹیکس جو امام کی طرف سے عوامی مصلحت کے لیے ہو اس کا حکم بھی یہی ہے)۔

لیکن اس وجوب وتنفیذ کے لیے شرط ہے کہ وہ ضرورت کی بنا پر ہو اور عوام کے رفاہی کاموں میں خرچ کیا جائے۔

شیخ وہبہ زحیلی ایک سمینار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"نص فقهاء الإسلام كالغزالي والشاطبي والقرطبي على مشروعية طرح ضرائب جديدة على الأغنياء والغلات والثمار وغيرهما بقدر مايكفي حاجات البلاد العامة" (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۹/ ۵۰۰۲، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان)۔

(امام غزالی، علامہ شاطبی اور علامہ قرطبی جیسے فقہائے اسلام نے مالداروں، آمدنیوں اور پھلوں وغیرہ پر ملکی حاجات عامہ کے بقدر کچھ نئے ٹیکس کی مشروعیت کی صراحت کی ہے)۔

پھر حاشیہ پر اس کے شرائط کی وضاحت کرتے ہوئے تیسری شرط بیان کی ہے:

"واشترط لجواز فرض الضريبة أربعة شروط: الثالث: أن تصرف الضريبة في المصالح العامة للأمة" (حوالہ بالا)

(تیسری شرط یہ ہے کہ وہ ٹیکس عوام کے مفاد عامہ میں صرف کیا جائے)۔

لہٰذا اگر حکومت ٹیکس وصول کرے لیکن صحیح مصرف میں خرچ نہ کرے تو ایسے ادارے سے انسلاک تعاون علی المعصیت ہے، اس کو برداشت اسی وقت کیا جاسکتا تھا جبکہ مفاد عامہ کے حق میں ہوتا، لیکن یہ مفاد عامہ کے حق میں نہیں، اس لیے ایسی ملازمت جائز نہیں۔

لیکن یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ وہ عیش کوشی پر خرچ ہوتا ہے خیال واقعی ہے یا فرضی۔

(۲) بینک کی ملازمت:

سود کی حرمت قرآن وحدیث میں منصوص ہے، حضور نے چار شخصوں پر لعنت کی ہے: "لعن رسول اللہ ﷺ آكل الرباء ومؤكله وكاتبه وشاهدية" (مسلم: ۲/ ۲۷، کتاب البیوع، باب الربا)۔

(حضور ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور گواہی دینے والوں پر لعنت کی ہے) اس لیے معاملہ شدید ہے، اس کی ہر قسم کی معاونت سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے، لیکن اس دور پُرفتن میں اپنے آپ کو سودی اثرات سے بالکلیہ محفوظ رکھنا محال تو نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن مشکل ضرور ہے،

پھر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مذکور چاروں شخص ایسے ہیں جن کا براہ راست تعلق سودی معاملات سے ہے، اس لیے خیال یہ ہوتا ہے کہ ان چار معاملات کے علاوہ ذمہ داریاں جائز ہونی چاہئے، لہٰذا کیشیر، چپراسی، کمپیوٹر ٹھیک کرنے والے، ایئر کنڈیشن ٹھیک کرنے والے کی ملازمت تعاون علی المعصیت میں نہیں آتی ہے۔

اسی طرح بینک کے لیے مکان کرایہ پر دینا، معماری کا کام اس کے لیے کرنا بھی تعاون کی اس فہرست میں نہیں ہے جو کہ حرام ہے۔ مفتی محمود صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے (دیکھئے: فتاویٰ محمودیہ: ۲۵/ ۲۶۰، سوال: ۹۲۵۲، جدید ایڈیشن بترتیب جدید)۔

صاحب بحر لکھتے ہیں: ''جاز إجارة البيت لكافر ليتخذ معبدا أو بيت نار للمجوس، أو يباع فيه خمر في السواد، وهذا قول الإمام، وقالا: يكره كل ذلك لقوله تعالى: وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان۔

وله: أن الإجارة على منفعة البيت ولهذا تجب الأجرة بمجرد التسليم ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار فيه، فقطع نسبة ذلك إلى المؤجر'' (البحر الرائق: ۸/ ۲۰۲، كتاب الكراهية، فصل في البيع، مطبوعہ: کراچی)۔

(کسی کافر کو مندر بنانے کے لیے، یا مجوسی کو آتش کدہ بنانے کے لیے، یا دیہات میں شراب کی بیع کے لیے گھر کرایہ پر دینا جائز ہے، حضرت امام اعظم کے نزدیک، حضرات صاحبین مکروہ فرماتے ہیں: آیت "تعاونوا على البر ... الخ" کی وجہ سے۔

حضرت امام اعظم فرماتے ہیں کہ یہ کرایہ (سکونت) بیت کی منفعت کا ہے، یہی وجہ ہے کہ محض حوالہ کرنے سے ہی اجرت واجب ہو جاتی ہے، اور اس میں معصیت نہیں ہے۔ معصیت تو مستاجر کے فعل سے ہے اور وہ خود مختار ہے، لہٰذا اس کی نسبت موجر کی طرف نہیں ہوگی)۔

اعلاء السنن کی عبارت اور بھی واضح ہے:

شراب بنانے والے سے انگور بیچنے کی نظیر ذمی کی شراب اجرت پر اٹھانا ہے جو کہ جائز ہے جبکہ معصیت کا ارادہ نہ ہو، اس لیے کہ اٹھانا صرف شرب کے لیے نہیں ہوتا ہے، اسی طرح گرجا گھر اور چرچ کی تعمیر (میں کچھ حرج نہیں) جبکہ معصیت کا قصد نہ ہو، اس لیے کہ یہ دونوں (کنیسہ وبیعہ) حقیقت میں گھر ہیں جو عبادت کے لیے مخصوص نہیں، عبادت کے لیے مختص کرنا انسان کا اپنا اختیاری فعل ہے، اسی طرح ذمیوں کو گھر کرایہ پر دینا جبکہ معصیت مقصود نہ ہو، اس لیے کہ گھر معصیت کے لیے نہیں بنایا گیا اور نہ موجر نے اس کا قصد کیا ہے بلکہ معصیت ذمہ کے برے اختیار کی وجہ کو شامل ہوگئی، (اعلاء السنن: ۱۷/ ۷۴۴، باب: بیع العصیر والعنب ممن یعلم أن یتخذ خمرا، مطبوعہ: بیروت: ۱۴۱۸ھ)۔

اس عبارت کا مقتضی تو یہی ہے کہ ایسے مکان کی تعمیر کی گنجائش ہے جس میں نتیجۃً معصیت ہی معصیت کا صدور ہوگا، جبکہ بینک میں صرف سودی معاملات ہی انجام نہیں پاتے ہیں بلکہ بہت سے امور ہیں جو جائز بھی ہیں تو اس مخلوط عمل کے لیے کرایہ پر دینا، تعمیر کرنا وغیرہ کیوں کر جائز نہ ہوگا۔

امداد الاحکام کے ایک جواب استفتاء سے معلوم ہوتا ہے کہ بینک کی ملازمت جس میں سودی معاملات لکھنے کی ضرورت پڑے اور خطرہ ہو کہ اگر کوئی مسلمان اس عہدے کو نہیں لے گا تو ہندو آ جائے گا، ایسے وقت میں ایسی ملازمت بھی جائز ہے۔

"اگر سب رجسٹراری میں سودی دستاویز کی رجسٹری کرنا لازم ہو تو یہ ملازمت حرام ہے، البتہ اگر اندیشہ ہو کہ مسلمان اس ملازمت کو ترک کر دے گا تو اس عہدے پر ہندو آ جائے گا تو مسلمانوں سے تعصب کرے گا تو اس صورت میں عام اہل اسلام کی نفع رسانی کی غرض سے اس ملازمت کو اختیار کرنا بعض کے نزدیک جائز ہے، اور ہر شخص اپنی نیت کو دیکھ لے کہ واقعی یہی قصد ہے، یا قصد تو مال وجاہ ہے اور یہ محض حیلہ ہے" (امداد الاحکام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، کتاب الاجارات ۳/ ۵۲۲، مطبوعہ کراچی)۔

بہر حال نیت مال ہی اگر ہے تو براہ راست سود کا جن معاملات سے تعلق ہے، ایسی ملازمت جائز نہیں، باقی کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

انشورنس کمپنی کی ملازمت:

انشورنس کی تمام ہی صورتوں میں غرر یا قمار پایا جاتا ہے اس وجہ سے ناجائز ہے، لیکن حاجت شدیدہ کی وجہ کو "حادثہ بیمہ" "میڈیکل بیمہ اور قانونی جبر کی وجہ کو بعض تھرڈ پارٹی انشورنس کو علمائے عصر نے جائز قرار دیا ہے، ہر چند کہ اس کا متبادل نظم میوچل انشورنس (Mutual Insuranne) کی شکل میں تجویز بھی کیا

گیا ہے جو عقد معاوضہ کے بجائے عقد تبرع پر مشتمل ہوتا ہے جس میں غرر یا جہالت مضر نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک یہ نظام پوری دنیا میں رائج نہیں ہوسکا، بعض عرب ملکوں ہی تک محدود ہے، لہٰذا میڈیکل بیمہ، یا تھرڈ پارٹی بیمہ کے علاوہ چارۂ کار نہیں ہے، لیکن محض ضرورت کی بنا پر ہے، نیز "ما ابیح للضرورة تقدر بقدرها" کا تقاضا یہ ہے کہ اس قسم کی ملازمت سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔

البتہ عام مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے بدرجۂ مجبوری جائز انشورنس کا ایجنٹ بننے کی گنجائش ہے، اس لیے کہ "إن ضرر الخاص يتحمل لدفع ضرر العام" (اشباہ: ۱/ ۱۲۱، پاکستان) (ضرر عام کو دفع کرنے کے لیے ضرر خاص کو برداشت کیا جاسکتا ہے)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: "وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدًا، لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز، فجوزه لحاجة الناس" (شامی: ۶/ ۶۳، کتاب الاجارۃ، مطلب فی اجرۃ الدلال، مطبوعہ: پاکستان)۔

(حاوی میں ہے: محمد بن سلمہ سے دلالی کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ لاباس بہ ہے، اگر چہ اصل کے لحاظ سے فاسد ہے۔ کثرت تعامل کی وجہ سے ان میں سے زیادہ ناجائز ہے، لہٰذا لوگوں کی حاجت کی بنا پر اس کو جائز قرار دیا گیا ہے)۔

خلاصہ یہ کہ مطلق دلالی بھی حاجت کی وجہ کر روا ہے، صورت مسئولہ میں بھی مسلمانوں کی خیر خواہی اور ضرورت جمع ہیں۔

شراب کمپنی کی ملازمت:

شراب کی ایسی کمپنی جس میں صرف شراب ہی کا کاروبار ہوتا ہے اس کی ملازمت تعاون علی الاثم ہے اور حرام ہے، البتہ کوئی شخص ایسی کمپنی میں کام کرتا ہے جس میں شراب کے اجزاء و بوتل وغیرہ تیار ہوتے ہیں تو دیکھنا ہوگا کہ ان اجزاء کا کوئی جائز استعمال بھی ہے یا نہیں، اگر صرف شراب کے لیے ہی استعمال ہے تو یہ بھی تعاون علی الاثم ہے، ہاں اس کا کوئی اور جائز مصرف بھی ہے تو صحتِ نیت کے ساتھ گنجائش ہوگی، ملازمت کی اور بھی بہت سی پاکیزہ شکلیں ہیں ان ہی کو اختیار کرنا چاہیے۔

''وإذا استأجر ذمي مسلمًا ليحمل له خمرًا ولم يقل يشرب أو قال: ليشرب جازت الإجارة في قول أبي حنيفة خلافًا لهما'' (عالمگیری: ۴/ ۴۴۹، کتاب الاجارۃ، باب الاجارۃ علی المعاصی، مطبوعہ: رشیدیہ پاکستان)۔

(کوئی کافر، کسی مسلم کو شراب اٹھانے کے لیے اجرت پر لے، اس سے پینے کی بات کرے یا نہ کرے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اجارہ جائز ہے، برخلاف حضرات صاحبین کے)۔

جواز کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس سے کمایا ہوا روپیہ اس کے لیے حلال ہے، اس لیے کہ اٹھانا صرف پینے کے لیے ہی نہیں ہوتا ہے دوسرے مقاصد بھی ہوتے ہیں۔

''جاز بيع العصير من خمار لأن المعصية لاتقوم بعينه بل بعد تغيره ... ولأن العصير يصلح الأشياء كلها جائزة شرعًا فيكون الفساد إلى اختياره'' (البحر الرائق: ۸/ ۲۰۲، کتاب الکراهية، فصل فی البیع، مطبوعہ کراچی)۔

(شراب بنانے والے سے شیرہ کی بیع جائز ہے، اس لیے کہ معصیت کا قیام عین شیرہ سے نہیں بلکہ تغیر کے بعد ہے اور اس لیے کہ شیرہ بہت سی مباح چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے تو فساد کی نسبت اس کے اختیار کی جانب ہوگی)۔

سپر مارکیٹ کی ملازمت:

سپر مارکیٹ یقیناً انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بنائی جاتی ہے، اس میں زندگی گزارنے کے لیے ہر جائز وناجائز ضرورت فراہم ہوتی ہے، اب دیکھنا ہوگا کہ زیادہ جائز اشیاء ہیں یا حرام اشیاء، اگر ناجائز اشیاء کی کثرت ہے تو ملازمت جائز نہیں، اس لیے کہ اس وقت وہ مارکیٹ حقیقت میں حرام اشیاء کی ہی مارکیٹ سمجھی جائے گی۔

"ما اجتمع الحلال والحرام إلا غلب الحرام" فقہی ضابطہ کا محمل اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہے۔

ہاں کثرت جائز اشیاء کی ہے تو پھر ملازمت میں کچھ حرج نہیں ہے، لیکن حرام اشیاء کے لین دین سے اپنے آپ کو الگ رکھے، گاہک کو کہہ دے کہ تم خود لے لو، اگر لین دین بھی اسی سے متعلق ہو نیز یہ عند العقد مشروط بھی ہو تو تعاون علی الاثم ہونے کی وجہ سے ملازمت ناجائز لیکن تنخواہ حلال ہوگی۔ (البحر الرائق، ۸/ ۲۰۳)۔

مخلوط تعلیمی ادارے اور تدریسی خدمات:

تدریسی امور کی انجام دہی بڑی سعادت ہے، لیکن یہ سعادت بھی اب معصیت کی نذر ہوگئی ہے۔

دور حاضر کا تعلیمی ڈھانچہ چاہی نہ چاہی اسباب وعوامل کی وجہ کو بے پردگی اور اختلاط مرد و زن کی بھینٹ چڑھ کر بالکل تباہ ہو چکا ہے، دوسری طرف تعلیم کے بغیر زندگی کو استوار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ اب تو بعض ملکوں کے حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ بغیر تعلیم شہریت کا حق بھی نہیں مل پاتا، تعلیمی نظریات وخیالات کی صورت حال بھی اچھی نہیں، کیڑے مکوڑے کی طرح باطل قوتوں کی کثرت ہے جو پوری قوت کے ساتھ اپنے افکار کے پھیلانے کے درپے ہیں۔

قبل ازیں "مدورائی" کے اٹھارہویں سمینار میں عورتوں کی ملازمت کی بابت تجویز پاس ہو چکی ہے، لیکن مسئلہ مردوں کا ہے، کیا وقت کے رنگ میں رنگ جائے اور آنکھ بند کر کے ایسے تعلیمی ادارے کی ملازمت کو ترجیح دے دے جو عورتوں کی نیرنگیوں سے لبریز ہوں، یا پھر اپنے آپ کو ایسے اداروں سے دور رکھ کر معاشی کش مکش سے دوچار ہوتا رہے۔

ظاہر بات ہے بالکل آزاد بھی نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی بالکل پابندی کی جکڑبندیوں میں جکڑا جاسکتا ہے۔

بوقت ضرورت فقہاء نے اجنبیہ کو دیکھنے کی گنجائش بھی رکھی ہے لیکن ضرورت کا تحقق ہے یا نہیں یہ ہر علاقے اور خطے کے حالات اور ہر ملازم کے شخصی احوال پر منحصر ہے، اس لیے حتی الامکان اسلامی حدود وقیود کو باقی رکھتے ہوئے ناگزیر حالات میں ضرورۃً اجازت دینی چاہیے، کوئی جامع حکم تو نہیں لگایا جاسکتا مقامی حالات الگ الگ ہیں ان کے مناسب احوال الگ الگ حکم بھی ہوسکتا ہے۔

پھر جواز کی صورت میں بھی آنکھوں اور دوسرے اعضاء کو جس قدر ممکن ہو گناہوں کی آلودگیوں سے بچانا لازم ہے۔

پیشۂ وکالت:

وکالت کا پیشہ دراصل اجارہ ہے جو فی نفسہ جائز ہے، ممانعت وقباحت خارجی اسباب کی بنا پر ہے، اس لیے کذب وافتراء سے بچتے ہوئے کوئی اس پیشہ کو اختیار کرتا ہے تو کچھ حرج نہیں ہے۔

اگر اس کا مؤکل واقعتاً مظلوم ہو اور فریق ثانی ظالم، نیز خطرہ بلکہ اندیشہ قوی ہے کہ ظالم کا وکیل اپنی چرب زبانی یا حیلہ سازی کر کے اس کے حق واجب کو دبالے گا تو اس کے لیے جھوٹ بولنے کی بھی گنجائش ہے، علامہ عینی، حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے قصۂ ہجرت (جس میں انہوں نے ایک ظالم بادشاہ کے سامنے ہذہ اختی کہا، پھر سارہ کو بھی تاکید کی کہ اس کے خلاف نہ کہے)، والی حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وفيه الحيل في التخلص من الظلمة، بل إذا علم أنه لا يتخلص إلا بالكذب جاز له الكذب الصراح، وقد يجب في بعض الصور بالاتفاق كونه ينجي نبيا أو وليا ممن يريد قتله أو لنجاة المسلمين من عدوهم۔

وقال الفقهاء: لو طلب ظالم وديعة لإنسان ليأخذها غصبًا وجب عليه الانكار والكذب في انه لا يعلم موضعها" (عمدة القاری، ۱۲/ ۳۶، كتاب البيوع، باب شراء المملوك من الحربي وهبته وعتقه، مطبوعه رشيديه، كوئٹه)

(اس حدیث میں ظالموں سے رہائی کے لیے حیلہ کا جواز ہے، بلکہ اگر معلوم ہو کہ کذب کے بغیر چھٹکارا نہیں ہوسکتا ہے تو کذب صریح بھی جائز ہے، بعض صورتوں میں تو بالاتفاق واجب ہے جیسے کسی نبی یا ولی کو قاتل سے بچانا ہو یا مسلمانوں کو دشمنوں سے نجات دلانا ہو۔

فقہاء نے فرمایا کہ اگر ظالم کسی شخص کی امانت طلب کرتا ہے تاکہ غصب کرلے تو انکار وکذب واجب ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے)۔

اسپتال کی ملازمت:

ہاسپیٹل انسانی خدمت کے لیے ہے، دنیوی قانون کی رو سے بھی خدمت ہی مطلوب ہے، لیکن خدمت کے بجائے ظلم وعدوان کا پیشہ اختیار کرنا انسان کا ذاتی فعل ہے، ہاں بعض اوقات انتظامیہ کی طرف سے ایسی زیادتیوں کی تاکید یا پابند کیا جاتا ہے، اسے موقع پر یہ تعاون علی العدوان ہو کر ممنوع ہوگا ورنہ تو کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ اگر ظن غالب سے معلوم ہے کہ اس شخص کی شمولیت کی وجہ سے ظلم وعدوان میں تخفیف ہوگی تو بھی اس نیت سے اس ملازمت کی اجازت ہوگی، جیسا کہ شامی کی باب العشر کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

جہاں تک عورتوں کے آپریشن یا قابل ستر جگہ کے مس ونظر کا مسئلہ ہے تو یہ مجبوری کی صورت ہے جس کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔

”امرأة اصابتها قرحه فی موضع لایحل للرجل أن ینظر إلیه، لایحل أن ینظر إلیها لکن تعلم امرأة تداویها فإن لم یجدوا امرأة تداویها ولا امرأة تتعلم ذلك إذا علمت، وخیف علیها البلاء أو الوجع أو الهلاك فإنه یستر منها كل شئ إلا موضع تلك القرحة ثم یداویها الرجل ویغض بصره ما استطاع إلا عن ذلك الموضع“ (عالمگیری: ۵/ ۴۰۷، کتاب الکراهیة فیما یحل للرجل النظر، مطبوعہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)۔

(ایک خاتون جس کو کوئی زخم قابل ستر جگہ میں ہو جائے تو اس کو دیکھنا جائز نہیں ہے، لیکن کسی اور خاتون کو طریقہ علاج سکھایا جائے، اگر کوئی عورت نہ ملے یا کوئی عورت سیکھانے پر نہ سیکھے نیز مریض کے سلسلے میں خوف مصیبت، بیماری یا ہلاکت کا ہو تو موضع مرض کے علاوہ کو مستور کر کے مرد اس کا علاج کرے، نیز جہاں تک ممکن ہو اس جگہ کے ماسوا سے غض بصر کرے)۔

بحر میں ہے: ”والطبیب إنما یجوز له ذلك إذا لم یوجد امرأة طبیبة فلو وجدت فلا یجوز له أن ینظر، لأن نظر الجنس إلی الجنس أخف، وینبغی للطبیب أن یعلم امرأة إن أمكن، وإن لم یمكن ستر كل عضو منها سوی موضع الوجع ثم ینظر، ویغض بصره عن غیر ذلك الموضع إن استطاع لأن ما ثبت للضرورة یتقدر بقدرها“ (البحر الرائق: ۸/ ۱۹۲، کتاب الکراهیة، فصل فی النظر والمس، مطبوعہ کراچی)۔

(ڈاکٹر کے لیے جائز ہے جبکہ خاتون ڈاکٹر نہ ہو اور اگر موجود ہو تو دیکھنا جائز نہیں، اس لیے کہ ہم جنس کا ہم جنس کو دیکھنا زیادہ سہل ہے، ڈاکٹر کے لیے مناسب ہے کہ کسی عورت کو اگر ہو سکے تو سکھا دے ورنہ متاثر جگہ کے علاوہ کو مستور کر کے دیکھے، اس جگہ کے علاوہ سے غض بصر کرے، اس لیے کہ جو چیز ضرورت کی وجہ سے ثابت ہوتی ہے، وہ بقدر ضرورت ہی ہوتی ہے)۔

ہوٹلوں کی ملازمت:

ہوٹلوں کا اصل مقصد رہائش کی سہولت فراہم کرنا ہے، حرام چیزوں کی فراہمی ان کے مقاصد میں سے نہیں، اس لیے فی نفسہ اس کی ملازمت جائز ہے جبکہ حرام چیزوں کی فراہمی اس کے ذمہ نہ ہو، اس لیے کہ حرام اشیاء کا استعمال جس طرح حرام ہے دوسرے کو دینا بھی جائز نہیں ہے فقہ کا قاعدہ ہے: ”ما حرم أخذه حرم إعطاؤه“ (اشباہ: ۱/ ۱۸۹، قاعدہ: ۱۴، مطبوعہ پاکستان)۔

عالمگیری میں ہے:

”ولا یسقی أباه الكافر خمرًا ولا یناوله القدح“ (عالمگیری، ۵/۴۲۰، کتاب الکراهیة، باب الکراهیة فی الاكل، بیروت ۱۴۲۱)۔

(اپنے کافر باپ کو نہ تو شراب پلائے، اور نہ ہی جام دے)۔

”وقال أصحابنا: لایجوز الانتفاع بالمیتة علی أی وجه ولا یطعمها الكلاب والجوارح“ (عالمگیری، ۵/۴۲۳، کتاب الکراهیة، باب الهدایا والضیافات، بیروت، ۱۴۲۱ھ)۔

(مشائخ نے فرمایا: میتہ سے انتفاع کسی طرح جائز نہیں ہے، کتوں وغیرہ کو نہ کھلائے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں ایسے ہوٹلوں کی خدمت جائز نہیں، جن میں حرام اشیاء کے ارتکاب پر جبر ہو، واللہ اعلم۔

مختلف شعبوں میں ملازمتیں اوران کے شرعی احکام

مولانا شمس الدین مظاہری[1]

ا۔الف: شریعت اسلامیہ عقل سلیم اور معتدل مزاج کے ہم آہنگ ہے، یہ انسان کو الف ومحبت، اخوت و بھائی چارگی اور امن وامان کی طرف بلاتی ہے، یہ ظلم و جور اور ہر قسم کی برائی سے زوردار انداز سے روکتی ہے، لہٰذا اگر کسی کام میں ظلم وجور، وحشت وبربریت اور کسی قسم کی برائی ہو تو اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ شریعت اسلامیہ کے احکام واقعی اور یقینی چیزوں کی بنیاد پر نافذ ہوتے ہیں، محض وہم وگمان پر کوئی حکم نافذ نہیں ہوتا، چنانچہ قاعدہ ہے:
"لا عبرة بالتوهم" (قواعد الفقہ، ۱۰۷) وہم کا اعتبار نہیں ہے۔

اس سے بھی انکار نہیں کہ شعبۂ فوج میں ملازمت اختیار کرنے سے بعض دفعہ ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر وار کرنے کی نوبت آسکتی ہے، لیکن یہ وہمی ہے یقینی نہیں ہے، لہٰذا اس میں ملازمت کے سلسلہ میں حکم لگانے سے پہلے اس کے بنیادی اغراض ومقاصد کے بارے میں غور وخوض کرنا ہوگا، چنانچہ فقہی قاعدہ ہے:
"العبرة في العقود للمقاصد والمعاني دون الالفاظ والمباني" (قواعد الفقہ، ۹۱)۔

(عقود میں اغراض ومقاصد کا اعتبار ہے نہ کہ الفاظ وعبارات کا)۔

جب ہم شعبۂ فوج کے بنیادی اغراض ومقاصد کے سلسلہ میں غور کرتے ہیں تو درج ذیل باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ا۔ شعبۂ فوج کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے، نیز ملک کو ہر قسم کے شرور وفتن سے بچانا ہے، ظاہر ہے کہ یہ فی نفسہ بہتر مقاصد ہیں اور نیک کام ہے تو اس میں ملازمت اختیار کرنا نیک کام میں تعاون کرنا ہوگا جس کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے فرمایا ہے: "تعاونوا على البر والتقوى" (سورہ مائدہ: ۲) (نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو)۔

۲۔ شریعت مطہرہ نے انسان کی زندگی کی بقاء کے لیے حلال رزق تلاش کرنے اور کھانے کی تلقین کی ہے، چنانچہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:
"طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة" (مشکوٰۃ شریف، ۱/ ۲۴۲) (حلال کمائی تلاش کرنا دیگر فرائض کے بعد ایک فرض ہے)۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "كلوا من طيبت ما رزقناكم" (سورۂ اعراف: ۱۶۰)۔ (ہمارا دیا ہوا پاکیزہ رزق کھاؤ)، ایک اور حدیث میں ہے:
"إذا سبب الله لأحدكم رزقا فلا يدعه" (مشکوٰۃ شریف، ۱/ ۲۴۳)۔ (جب اللہ تعالیٰ نے تم میں سے کسی کے لیے ذریعہ معاش پیدا کردے تو اس کو نہ چھوڑے)۔

اور شعبۂ فوج میں ملازمت اختیار کرنا روزگار کا ایک ذریعہ ہے، اس کو چھوڑنا مسلمانوں کے لیے معیشت کے وسائل کو محدود کردینے کے مترادف ہوگا جس سے ضرر وحرج لاحق ہوگا، جبکہ قرآن کریم کا صاف اعلان ہے: "ما جعل عليكم في الدين من حرج" (سورہ حض: ۷۸) (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھا)۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: "يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (سورہ بقرہ: ۱۸۵)، (اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی کا ارادہ کرتے ہیں اور تنگی کا ارادہ نہیں کرتے ہیں)، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "الدين يسر" (بخاری شریف، ۱/ ۱۰) (دین آسان ہے)۔

۳۔ عصر حاضر میں مسلمانوں کا حال حد سے زیادہ بدتر ہے، ہر قوم، ہر مذہب اور ہر معاشرہ کے لوگ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں نیز غیر مسلم کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم وزیادتی ہورہی ہے، ایسی حالت میں شعبۂ فوج میں مسلمانوں کا رہنا اجتماعی لحاظ سے مسلمانوں کے مفاد میں ہے، بہت سی دفعہ اس کی وجہ سے

---

[1] جامعہ اسلامیہ جلالیہ، آسام۔

مسلمان فوج کی زیادتی سے بچ سکتا ہے، اس لیے اگر کسی کے مقاصد میں فساد نہ ہو اور گناہ کے ارتکاب سے بچنے کا عزم مصمم ہو تو مذکورہ اغراض ومقاصد کی بنیاد پر شعبہ فوج میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

ب: پولیس کے شعبہ میں بعض اوقات ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر گولی چلانی پڑتی ہے، مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذا رسانی کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، نیز بعض دفعہ خلاف شریعت عمل کرنے کی نوبت آسکتی ہے، یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اچھا انسان اس شعبہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی صحبت کی وجہ سے بدزبان اور ظالم بن جاتا ہے اور خلاف شریعت عمل کرتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ان چیزوں کا وقوع حتمی اور یقینی نہیں ہے بلکہ وہمی اور محض وہم وگمان کی بناء پر شریعت مطہرہ احکام جاری نہیں کرتی ہے، چنانچہ قاعدہ ہے: "لاعبرة بالتوهم" (قواعد الفقہ: ۱۰۷) (گمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے)۔

لہٰذا اس شعبہ کے اغراض ومقاصد کے بارے میں غور وخوض کرنا ہوگا، جیسا کہ قاعدہ ہے: "العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی دون الالفاظ والمبانی" (قواعد الفقہ، ۹۱) (عقود میں اغراض ومقاصد کا اعتبار ہے نہ کہ الفاظ وعبارات کا)۔

جب ہم اس کے اغراض ومقاصد پر غور وخوض کرتے ہیں تو درج ذیل باتیں ہمارے سامنے واضح ہوجاتی ہیں:

۱۔ شعبۂ پولیس کا بنیادی مقصد اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے اور ملک کو شریر ومفسد قسم کے لوگوں سے حفاظت کرنا ہے، نیز مظلوموں کا تعاون کرنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اغراض ومقاصد فی نفسہ بہتر ہیں اور یہ کار خیر ہیں، ایسی صورت میں اس شعبہ میں ملازمت اختیار کرنا کار خیر میں تعاون کرنے کے مترادف ہے قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے: "تعاونوا علی البر والتقوی." (سورۂ مائدہ: ۲) (نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو)۔

اور مظلوم کے تعاون کے سلسلہ میں ارشاد نبوی ہے: "ونصر المظلوم" (بخاری شریف، ۱/۳۲۱)۔ حضور ﷺ نے سات چیزوں کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک، ونصر المظلوم ہے یعنی مظلوم کے تعاون کا حکم دیا ہے۔

۲۔ یہ روزگار کا ایک ذریعہ ہے اور حلال رزق تلاش کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے موافق ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: "کلوا من طیبت ما رزقناکم" (سورہ اعراف: ۱۶۰) (ہمارا دیا ہوا پاکیزہ رزق کھاؤ)۔

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة" (مشکوٰۃ شریف، ۱/۲۴۲) (حلال کمائی تلاش کرنا دیگر فرائض کے بعد ایک فرض ہے)۔

دوسری حدیث میں مذکور ہے: "إذا سبب الله لأحدکم رزقا من وجه فلا یدعه" (مشکوٰۃ شریف، ۱/۲۴۳) (جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے لیے رزق کا کوئی ذریعہ پیدا کردے تو اس کو نہ چھوڑے)۔

۳۔ موجودہ دور میں ہر طرف سے مسلمانوں پر ظلم وزیادتی ہو رہی ہے، اور مسلمان اپنے حقوق سے محروم ہو رہے ہیں ایسی حالت میں اگر شعبۂ پولیس میں مسلمان نہ ہو تو مسلمانوں کو زیادہ نقصان لاحق ہونے اور انصاف سے محروم رہنے کا قوی اندیشہ ہے اور مسلمانوں کو بہت زیادہ ضرر وحرج لاحق ہوگا، حالانکہ اسلام میں ضرر وحرج نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "ماجعل علیکم فی الدین من حرج" (سورہ حج: ۷۸) (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی پیدا نہیں کی)۔

اور فقہی قاعدہ ہے: "الضرر یزال" (قواعد الفقہ، ۸۸)۔ (ضرر کو دور کیا جاتا ہے)۔

لہٰذا اگر کسی کی نیت میں فساد نہ ہو اور خلاف شریعت عمل کے ارتکاب سے اجتناب کا پختہ ارادہ ہو، نیز ملک میں امن وامان قائم کرنے کا ارادہ ہو تو ایسی صورت میں مذکورہ اغراض ومقاصد کی بنیاد پر شعبۂ پولیس میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

ج۔ غیبت اور چغلخوری جائز نہیں ہے، چنانچہ قرآن کریم کا صاف اعلان ہے: "ولا یغتب بعضکم بعضا" (حضرات: ۱۲) (تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے)۔

اور حدیث شریف میں بھی اس سلسلہ میں وعید آئی ہے، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "الغیبة أشد من الزنا" (مشکوۃ شریف: ۲/۴۱۵) (غیبت زنا سے بھی سخت ہے)۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شعبۂ مخبری اور انٹلیجنس کے بنیادی اغراض ومقاصد میں سے غیبت کرنا نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی آدمی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اس شعبہ میں کام کرنا چاہے تو غیبت کے بغیر اس شعبہ میں کام کرسکتا ہے۔

لہٰذا اس شعبہ میں ملازمت کو ناجائز کہنے سے پہلے اس کے بنیادی اغراض ومقاصد کے بارے میں غور وفکر کرنا ہے، جب ہم اس کے بنیادی اغراض و مقاصد کے سلسلہ میں غور وفکر کرتے ہیں تو درج ذیل باتیں ہمارے سامنے واضح ہوجاتی ہیں:

۱۔ ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے اس شعبہ میں کام کرنے کی شدید ضرورت ہے، اس کے بغیر امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام ممکن نہیں ہے اور امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام فی نفسہٖ بہتر مقاصد میں سے ہے، اس میں ملازمت کرنا نیک کام میں تعاون کرنا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "تعاونوا علی البر والتقوی" (سورہ مائدہ: ۲) (نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو)۔

۲۔ یہ روزگار کا ایک ذریعہ ہے جس کے لیے قرآن وحدیث میں تاکید آئی ہوئی ہے، چنانچہ قرآن میں ہے: "کلوا من طیبت ما رزقناکم" (سورۂ اعراف: ۱۶۰) (ہمارا دیا ہوا پاکیزہ رزق کھاؤ)۔ اور حدیث شریف میں ہے: "إذا سبب الله لأحدکم رزقا فلا یدعه" (مشکوۃ شریف، ۱/۲۴۳) (جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے لیے رزق کا ذریعہ پیدا کردے تو اس کو نہ چھوڑے) اور اس شعبہ کی ملازمت کو چھوڑنے سے معیشت کے اسباب کو محدود کرنا لازم آئے گا۔

۳۔ موجودہ دور میں مسلمانوں پر جو ظلم وزیادتی ہورہی ہے یہ کسی پر مخفی نہیں ہے، اب اگر مسلمان ان شعبوں میں ملازمت اختیار نہیں کرے گا تو ظلم وزیادتی میں اور اضافہ ہوگا جس سے مسلمانوں کو ضرر وحرج لاحق ہوگا، اور زندگی میں مختلف قسم کی پریشانیوں سے دوچار ہونا ہوگا، حالانکہ اللہ فرماتے ہیں: "ما جعل علیکم فی الدین من حرج" (حج: ۷۸) (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھا)۔ دوسری آیت کریمہ میں موجود ہے: "یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (بقرہ: ۱۸۵) اور فقہی قاعدہ ہے: "المشقة تجلب التیسیر" (الاشباہ والنظائر، ۱۴۰) (مشقت آسانی لاتی ہے)۔

دوسرا قاعدہ ہے: "الضرورات تبیح المحظورات" (قواعد الفقہ، ۸۹) (ضرورت کی وجہ سے ممنوع چیز مباح ہوجاتی ہے)۔

لہٰذا اگر نیت صحیح ہو اور غیبت وغیرہ سے باز رہنے کا عزم مصمم ہو، خلاف شریعت عمل کے ارتکاب سے بالکلیہ اجتناب ہو تو مذکورہ اغراض ومقاصد کی بنیاد پر شعبۂ مخبری اور انٹلیجنس میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

د۔ تمام مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اپنے نزاعات واختلافات میں شریعت مطہرہ کے قانون کو حکم بنائیں اور غیر اللہ کے حکم کی تعمیل سے اجتناب کرکے اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کریں، اور کتاب وسنت کا جو فیصلہ ہو اس کو ماننے میں دل سے تنگی محسوس نہ کرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "فلا وربك لایؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لایجدوا فی أنفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما" (سورۂ نساء: ۶۵) (قسم ہے آپ کے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ کو ہی حکم بنائیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے، اور آپ کے فیصلہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کرے اور خوشی سے قبول کریں)۔

اسی لیے فقہاء کرام نے یہ واجب قرار دیا ہے کہ اگر مسلمان ایسے ملک میں ہوں جہاں غیر مسلموں کا غلبہ ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر منتخب کریں اور یہ امیر ان کے باہمی مقدمات اور نزاعات کے فیصلہ کے لیے قاضی مقرر کرے تاکہ فیصلہ کتاب وسنت کے مطابق ہو اور کتاب وسنت سے متصادم فیصلہ ماننے کی ضرورت نہ رہے، اس سے معلوم ہوا کہ کتاب وسنت سے متصادم فیصلہ ماننا اور کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ انصاف کی فراہمی، ظلم وجور کی روک تھام اور نزاعات کو طے کرنے کے لیے عدلیہ کا نظام ہر مہذب معاشرہ کے لیے ضروری ہے۔

یہ امر بھی مسلم ہے کہ مسلمانوں کی نسبت سے عدالت کے رویہ کو منصفانہ نہیں کیا جاسکتا، اور عام طور پر ایسا فیصلہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو مسلمان کے

خلاف ہو۔

نیز اس دور میں مسلمانوں پر جس قدر ظلم وزیادتی ہورہی ہے یہ بھی کسی پر مخفی نہیں ہے، اگر عدالت میں مسلمان ملازمت اختیار نہیں کریں گے تو ایسی صورت میں مسلمانوں پر ظلم وجور کی زیادتی کا قوی اندیشہ ہے اور ان کی قدروقیمت میں کمی آجائے گی، اور اس میں ملازمت اختیار کرنا مسلمانوں کے وقار اور ان کی قدر وقیمت کو برقرار رکھنے کے مترادف ہے، تو اس میں ملازمت اختیار کرنا "تعاونوا علی البر والتقوی" (سورہ مائدہ:۲) (نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو) کے مترادف ہوگا۔

اس سے بھی انکار نہیں کہ عدالت میں ملازمت اختیار کرنا روزگار کا ایک ذریعہ ہے جو ضروریات زندگی میں سے ہے، اگر اس قسم کی ملازمت کو ناجائز کہا جائے تو معیشت کے وسائل کو محدود کردینے کے مترادف ہوگا جس سے تنگی اور مشقت ہوگی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے دار الاسلام ہونا چاہئے، دار الاسلام کے علاوہ دوسرے ملک دار الحرب وغیرہ میں اسلامی قوانین مکمل طور پر جاری نہیں ہوسکتے جیسا کہ حدود وغیرہ نافذ نہیں ہوتے، اس لیے کہ جرم سے باز رکھنے والا ماحول مہیا نہیں ہے، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "ورکنہ إقامة الإمام او نائبه فی الاقامة"۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر مسلم لوگ عدالت میں ملازمت اختیار کریں گے تو ممکن حد تک فیصلے اسلامی قوانین کے مطابق ہوں گے، اگر مسلمان نہیں رہیں گے تو تمام فیصلے اسلامی قوانین کے خلاف ہوسکتے ہیں اور ہونے کی قوی امید ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ اگر تمام چیزوں کا حصول ممکن نہ ہو تو جس قدر حصول کا امکان ہے اس کو ترک نہ کیا جائے "ان لم یدرك الكل لم يترك الكل"۔

ہمارا ملک چوں کہ اسلامی ملک نہیں ہے اور ہمارے قدرت میں تمام اسلامی احکام وقوانین کے اجراء کا اختیار بھی نہیں ہے، اس لیے جتنے احکام اسلام کے مطابق عمل کرنا ممکن ہے اتنی مقدار کو چھوڑنا ہمارے لیے مناسب نہیں ہوگا۔

لہٰذا مذکورہ امور وجوہات کی بناء پر اگر نیت میں فساد نہ ہو، ممکن حد تک اسلامی قوانین کے مطابق عمل کرنے کا پختہ ارادہ ہو، شریعت مطہرہ کے خلاف عمل کے ارتکاب سے اجتناب کی پوری پوری کوشش ہو اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا عزم ہو تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے عدالتوں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

۵۔ حکومت کی ضروریات کی تکمیل کے لیے عوامی ٹیکس کی بہت ضرورت ہے، اور ٹیکس کی ایک صورت انکم ٹیکس کی ہے، انکم ٹیکس کے شعبہ میں ملازمت اختیار کرنے کے جواز یا عدم جواز کے سلسلہ میں حکم لگانے سے پہلے اس کے اغراض ومقاصد پر غور وخوض کرنا ہے جیسا کہ قاعدہ ہے: "العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی دون الالفاظ والمبانی" (قواعد الفقہ) (عقود میں اغراض ومقاصد کا اعتبار ہے نہ کہ الفاظ وعبارات کا)۔

اور اس شعبہ کے اغراض ومقاصد کے سلسلہ میں غور وخوض کرنے سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ انکم ٹیکس کا بنیادی مقصد حکومت کی ضروریات کی تکمیل اور عوامی فلاح ہے جو فی نفسہ بہتر مقاصد میں سے ہے، ایسی صورت میں اس شعبہ میں ملازمت اختیار کرنا کار خیر میں تعاون کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کار خیر میں تعاون کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "تعاونوا علی البر والتقوی" (سورۂ مائدہ:۲) (نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو)۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ روزگار کا ایک ذریعہ ہے اور حلال طریقہ سے رزق تلاش کرنے اور استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ فرمایا:

"إذا سبب الله لأحدكم رزقا من وجه فلا يدعه" (مشکوۃ شریف، ۱/۲۴۳)

(جب اللہ تعالیٰ تیں سے کسی کے لیے کوئی رزق کا ذریعہ نکال دے تو وہ اس کو نہ چھوڑے)۔

دوسری حدیث شریف میں ہے: "طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة" (مشکوۃ شریف، ۱/۲۴۲)۔ (حلال کمائی تلاش کرنا دیگر فرائض کے بعد ایک فرض ہے)۔

۲۔ الف: شریعت مطہرہ نے سودی لین دین کو حرام قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أحل الله البيع وحرم الربوا" (سورہ بقرہ:۲۷۵)۔ (اللہ

تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا اور سود کو حرام قرار دیا)۔ دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: "یا ایها الذین امنوا لاتاکلوا الربوا اضعافا مضاعفة واتقوا الله لعلكم تفلحون"۔ (سورہ آل عمران:۱۳۹)۔ (اے ایمان والو! مت کھاؤ سود دونے پر دونا اور ڈرو اللہ سے تاکہ تمہارا بھلا ہو)۔

مذکورہ دلائل سے واضح ہوا کہ سودی لین دین حرام ہے اور استعمال ربا جائز نہیں ہے، بینک کی بنیاد ربا اور حرام چیزوں پر ہے، لہٰذا بینک میں ملازمت اختیار کرنا گناہ اور حرام چیزوں میں شریک ہونا ہے، اور حرام چیزوں میں اشتراک درست نہیں ہے، لہٰذا بینک کی ملازمت اختیار کرنا عام حالات میں جائز نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی پیسہ کے لین دین اور سودی حسابات کو نہ لکھے، کوئی اور کام کرے جیسے بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دیدے تو یہ صورت بھی سودی معاملات کے تعاون میں شمار کی جائیں گے، اس لیے کہ یہ چیزیں بینک کے ذرائع اور وسائل میں سے ہیں اور شریعت مطہرہ میں ذرائع اور وسائل کو عین شئی کا حکم دیا جاتا ہے جیسا کہ زنا حرام ہے تو اس کا ذریعہ نظر اجنبیہ بھی ناجائز اور حرام ہے، چنانچہ علامہ شامی اپنی کتاب میں رقمطراز ہے: "وما كان سبب المحظور فهو محظور" (شامی، ۶/۳۵۰) (جو ممنوع کا سبب ہو وہ بھی ممنوع ہے)۔

اور مفتی رشید احمد صاحبؒ اپنی کتاب "احسن الفتاویٰ" میں بنکاری کے لیے مکان کرایہ پر دینے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں: بیما یا بنکاری وغیرہ کے لیے مسلمان کو مکان کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی ہے، البتہ کافر کو کرایہ پر دینے میں کراہت تنزیہہ ہے۔ (احسن الفتاویٰ، ۷/۳۰۵)، اور جواہر الفقہ میں مذکور ہے: "واجارة البيت ممن يبيع الخمر فيه ...... فكله مكروه تحريما" (جواہر الفقہ، ۲/۴۵۳) اور ایسے آدمی کو مکان کرایہ پر دینا جو اس میں شراب کی خرید وفروخت کرتا ہے...... یہ سب مکروہ تحریمی ہے)۔

ان وجوہات کی بنیاد پر بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا یا اس جیسی ملازمت اختیار کرنا شریعت مطہرہ میں کراہت سے خالی نہیں ہے، لہٰذا ایسی ملازمت سے ہر ایک مسلمان کو احتیاط کرنا چاہئے۔

البتہ اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کے گزر بسر کے لیے مذکورہ امور کے علاوہ اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور ان چیزوں کے بغیر زندگی کی بقاء دشوار ہو تو اس کے لیے مذکورہ چیزوں میں ملازمت اختیار کرنے کی گنجائش ہے، چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں حدیث مذکور ہے: "إذا سبب الله لأحدكم رزقا من وجه فلا يدعه" (مشکوٰۃ شریف، ۱/۲۴۳) (جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے لیے رزق کا کوئی ذریعہ مہیا کردے تو اس کو نہ چھوڑے)، اور فقہی قاعدہ ہے: "الضرورات تبيح المحظورات" (الاشباہ والنظائر، ۱۴۰) (ضرورت کی وجہ سے ممنوعات مباح ہوجاتی ہیں) دوسرا قاعدہ ہے "المشقة تجلب التيسير" (الاشباہ والنظائر، ۱۴۰)، (مشقت سے آسانی ہوتی ہے)۔ اور "البحر الرائق" میں مذکور ہے: "امرأة حامل ماتت فاضطرب الولد في بطنها فان كان أكبر ظنه أنه حي يشق بطنها" (البحر الرائق، ۸/۳۷۶) (اگر حاملہ عورت کی وفات ہوجائے اور بچہ پیٹ میں حرکت کرے، اگر ظن غالب ہو کہ زندہ ہے تو اس کا پیٹ پھاڑا جائے گا)۔

یہ بھی واضح رہے کہ ضرورت کی وجہ سے جو چیز جائز ہوتی ہے، وہ ضرورت کی حد تک محدود رہتی ہے چنانچہ قاعدہ ہے: "الضرورة تقدر بقدرها" (قواعد الفقہ، ۸۹)۔

لہٰذا ایسے امور میں ملازمت اختیار کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ کسی دوسرے حلال رزق اور جائز ذریعہ معاش تلاش کرے، جب تک جائز اور حلال رزق کا موقع میسر نہ ہو اس وقت تک ایسی ملازمت اختیار کرکے زندگی بسر کرے، جب دوسرا ذریعہ معاش مل جائے، تو اس کو چھوڑ دے۔

(ب) انشورنس کمپنی کا کاروبار اگرچہ ربا اور قمار پر مبنی ہے، لیکن یہ انشورنس کی تمام شکلوں میں نہیں ہے بلکہ ربا اور قمار بعض معاملہ سے خارج ہے جس کا اصل مقصد باہمی تعاون ہے، لہٰذا انشورنس کمپنی میں ملازمت کے سلسلے میں جواز اور عدم جواز کا حکم لگانے سے پہلے اس کی شکلیں اور اقسام کے بارے میں غور وخوض کرنا ہوگا۔

چنانچہ انشورنس کی مختلف شکلیں ہیں بعض تو جبری نوعیت کی ہے جیسا کہ سرکاری انشورنس ہے حکومت جبراً تنخواہ کا ایک حصہ وضع کرلیتی ہے اور اخیر میں پنشن اور وظیفہ کے ساتھ کچھ رقم زیادہ دیتی ہے، یہ صورت جائز ہے اس لیے کہ اس میں ربا اور قمار نہیں ہے بلکہ حکومت کی طرف سے تبرع اور احسان ہوتا ہے، جب ربا اور قمار نہیں تو اس میں ملازمت اختیار کرنا اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہے۔

اسی طرح ایک صورت ہے تعاون پر مبنی انشورنس، اس میں نفع مقصود نہیں ہوتا بلکہ افراد واشخاص کا ایک گروہ طے شدہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں مصیبت زدہ شخص کی مدد کرتا ہے اور کسی کی مدد کرنا تبرعات میں سے ہے، لہٰذا اس صورت میں بھی چوں کہ ربا اور قمار نہیں ہے ملازمت اختیار کرنا اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہے۔

ایک اور صورت ہے حادثہ کے انشورنس کی جو قتل خطاء کے دائرے میں آتا ہے جس کے لیے اسلام نے نظام "معاقلہ" رکھا ہے اس میں بھی ربا اور قمار نہیں ہے، اس لیے اس میں ملازمت اختیار کرنا اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہے۔

اس قسم کی جو بھی شکل ہوگی، اگر ربا اور قمار سے خالی ہو تو اس میں ملازمت اختیار کرنے کی گنجائش ہے، اس لیے کہ اس کی حرمت ربا اور قمار ہی کی وجہ سے ہے، جب ربا اور قمار نہیں رہے گا تو ناجائز بھی نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ معاش کا ذریعہ ہے اور انسان کے لیے حلال طریقہ سے رزق کمانے اور کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ رسول کریم ﷺ کی حدیث ہے: "إذا سبب الله لأحدكم رزقا من وجه فلا يدعه" (مشکوٰۃ شریف، ۱/ ۲۴۲) (جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے لیے رزق کا کوئی وسیلہ مہیا کردے تو اس کو نہ چھوڑے)۔

دوسری حدیث میں ہے: "طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة" (مشکوٰۃ شریف، ۱/ ۲۴۲) (حلال کمائی تلاش کرنا دیگر فرائض کے بعد ایک فرض ہے)۔

لہٰذا حلال طریقہ سے اگر مال وغیرہ کا حصول ممکن نہ ہو تو اس کو ناجائز کہنا لوگوں کو مشقت اور تنگی میں ڈالنا ہوگا حالانکہ اسلام میں یہ پسندیدہ چیز نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ شکلیں بذات خود معصیت نہیں ہے اور گناہ تو وہ ہے جو بذات خود معصیت ہو چنانچہ فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے: "لا يكره بيع الجارية المغنية ... لأنه ليس عينها منكرا" (فتاویٰ محمودیہ، ۱۶/ ۱۳۳) (گانے والی لونڈی کی بیع مکروہ نہیں ہے...... اس لیے کہ یہ بذات خود منکر نہیں ہے)۔

اور ایک شکل ہے تجارتی انشورنس، اس کی بھی مختلف شکلیں ہیں، لائف انشورنس اور املاک کی انشورنس چوں کہ یہ عام حالات میں جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں ربا اور قمار پایا جاتا ہے، اسی طرح جو بھی شکل ہوگی جس میں ربا اور قمار پایا جاتا ہو اس میں ملازمت کرنا اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا "تعاون علی الاثم" میں شمار ہوگا اور تعاون علی الاثم جائز نہیں ہے، لہٰذا اس میں ملازمت اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ بذات خود معصیت ہے اور جو چیز بذات خود معصیت ہو اس میں اشتراک اور تعاون جائز نہیں ہے، چنانچہ جواہر الفقہ میں مذکور ہے: "بيع أشياء ليس لها مصرف إلا في المعصية ... ففي جميع هذه الصور قامت المعصية بعين هذا العقد والعاقدان كلاهما أثمان" (جواہر الفقہ، ۲/ ۴۴۸) (ایسی چیزوں کی بیع جن کے لیے معصیت کے علاوہ کوئی اور مصرف نہ ہو...... تو ان تمام صورتوں میں معصیت نفس عقد کے ساتھ قائم ہے تو عاقدان گناہ گار ہیں)۔

لہٰذا ایسی صورت میں ملازمت اختیار کرنا اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز نہیں ہے۔

ج۔ شراب کی حرمت نص سے ثابت ہے، اس لیے شراب کی کمپنی میں شراب کی خرید وفروخت کرنا، حساب لکھنا، صرف شراب ہی کے لیے استعمال ہونے والی بوتل بنانا اور شراب بنائے جانے والے اجزاء کمپنی کو دینا جائز نہیں اور ان کاموں میں ملازمت کرنا تعاون علی الاثم میں شمار ہوگا جس سے قرآن کریم نے منع کیا ہے "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲) (اور گناہ اور معصیت کے کام میں تعاون نہ کرو)۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے: رسول اللہ ﷺ نے شراب کے سلسلہ میں دس (قسم کے لوگوں) پر لعنت کی ہے: (۱) شراب کشید کرنے والا (۲) شراب کشید کرانے والا (۳) شراب پینے والا (۴) شراب اٹھانے والا (۵) شراب اٹھوانے والا (۶) شراب پلانے والا (۷) شراب بیچنے والا (۸) شراب کی قیمت کھانے والا (۹) شراب خریدنے والا (۱۰) شراب خریدوانے والا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے: "إنه سمع رسول الله ﷺ يقول عام الفتح وهو بمكة ان الله ورسوله حرم بيع الخمر"

(مشکوۃ شریف، ۱/ ۲۴۲) (حضرت جابرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح مکہ کے سال حضور کے مکہ میں رہنے کی حالت میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب کی بیع کو حرام قرار دیا)۔

علامہ شامی: "ردالمحتار" میں تحریر فرماتے ہیں: "وما كان سببا لمحظور فهو محظور" (ردالمحتار، ۶/ ۳۵۰) (جو ممنوع چیز کا ذریعہ ہو وہ بھی ممنوع ہے)۔

اور فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے: اگر یہ بوتلیں صرف شراب ہی کے لیے استعمال ہوتی ہیں، اور کسی کام میں استعمال نہیں ہوتیں تو ان کو فروخت کرنا ایک حیثیت سے شراب فروخت کرنے والوں اور خریدنے والوں کی اعانت ہے اور حدیث شریف میں شراب بیچنے والے پر بھی لعنت آئی ہے، خریدنے والے پر بھی لعنت آئی ہے اگر چہ وہ اسکو نہ پیتا ہو، اس لیے اس سے پرہیز کیا جائے (فتاویٰ محمودیہ، ۱۶/ ۱۳۳)۔ ان وجوہات کی بناء پر شراب کی خرید وفروخت، حساب کتاب لکھنا، شراب ہی کے لیے استعمال ہونے والی بوتل بنانا اور شراب بنائے جانے والے اجزاء کمپنی کو دینے کی ملازمت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

البتہ اگر بوتلیں ایسی ہوں کہ ان کو دوسرے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہو یا کمپنی کو ایسے اجزاء دیے جاتے ہوں جن سے دوسری جائز اور حلال چیزیں بھی بنائی جاتی ہوں اور یہ اجزاء صرف شراب ہی کے لیے استعمال نہ ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں ان چیزوں کا کاروبار کرنا اور ان کاموں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، اس لیے کہ اس سے تعاون علی الاثم ثابت نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ چیزیں بذات خود معصیت نہیں ہے اور جو چیزیں بذات خود معصیت نہ ہو ان میں اشتراک اور تعاون جائز ہے، چنانچہ جواہر الفقہ میں مذکور ہے: لیکن تعاون اس وقت ہوگا جبکہ معصیت اعانت کے بارے میں کہنے یا اس چیز کا اس فعل کے استعمال میں متعین ہونے سے اس حیثیت سے کہ غیر معصیت کا احتمال نہ رکھے۔ (جواہر الفقہ، ۲/ ۳۵۰)

نیز فتاویٰ محمودیہ میں ہے: "لا يكره بيع الجارية المغنية... لأنه ليس عينها منكرا" (فتاویٰ محمودیہ، ۱۶/ ۱۳۳) (گانے والی لونڈی بیچنا مکروہ نہیں ہے...... اس لیے کہ عین شئی میں خرابی نہیں ہے)۔

لہٰذا اگر نیت میں فساد نہ ہو اور معصیت میں اعانت کا اردہ نہ ہو تو ان چیزوں کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

۳-الف: اگر سپر مارکیٹ میں ملازمت اختیار کرنے سے حرام کام یعنی شراب وغیرہ بیچنے کی نوبت آئے یا ناجائز چیزوں سے تعلق قائم کرنے کی ضرورت پڑے تو سپر مارکیٹ میں ملازمت کرنا حرام کام میں اشتراک یا تعاون کرنا لازم آئے گا اور حرام کا ارتکاب کرنا یا اس میں تعاون کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه" (سورہ مائدہ: ۹۰)

(شراب اور جوا اور بت اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے سو ان سے بچتے رہو)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے: "إن الله ورسوله حرم بيع الخمر" (مشکوۃ شریف، ۱/ ۲۴۲) (اللہ اور اس کے رسول نے شراب کی بیع کو حرام قرار دیا ہے)۔

البتہ اگر ایسی صورت ہے کہ سپر مارکیٹ میں ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں صرف مباح اور جائز چیزوں سے تعلق رکھنے کی نوبت آئے گی، حرام چیزوں سے تعلق رکھنے کی نوبت نہیں آئے گی اور ناجائز چیزوں میں تعاون کی ضرورت بھی نہیں ہوگی تو نفس خرید وفروخت حلال ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "احل الله البيع" (حوالہ سابق)۔

دوسری بات یہ کہ خرید وفروخت سے لوگوں کی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے اور لوگوں کی ضروریات کی تکمیل نیک کام ہے تو اس میں ملازمت اختیار کرنا کار خیر میں تعاون کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "تعاونوا على البر والتقوى" (سورہ مائدہ: ۲)۔

ایسی صورت میں جبکہ سپر مارکیٹ میں ملازمت اختیار کرنے کی وجہ سے حرام کام میں اشتراک اور تعاون کی نوبت نہ آئے تو سپر مارکیٹ میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

ب: شریعت مطہرہ میں لوگوں کو فتنہ وفساد اور گناہ ومعصیت کے کاموں سے منع کیا گیا ہے تاکہ معاشرہ میں امن وامان قائم ہو اور الفت ومحبت کے ساتھ لوگ

زندگی گزار سکیں، چونکہ اختلاط اجنبیہ سے فتنہ کا اندیشہ ہے، اس لیے شریعت مطہرہ نے پردہ کا حکم دیا چنانچہ قرآن کریم میں ہے: "قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم" (سورہ نور: ۳۰) ((آپ محمدؐ) ایمان لانے والوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی کرے اور اپنے شرمگاہ کی حفاظت کرے)۔

اور حدیث میں ہے: "لعن الله الناظر والمنظور إليه" (مشکوۃ شریف، ۱/ ۲۷۰) (دیکھنے والے اور جس کو دیکھا جائے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے)۔

لہٰذا اگر تعلیم مخلوط ہو، لڑکے اور لڑکی میں پردہ کا اہتمام نہ ہو تو مخلوط تعلیم جائز نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تعلیم کے درجات مختلف ہیں، چنانچہ فرائض وواجبات کی تعلیم تو فرض ہے اور حسن معاشرہ اور روزگار پیشہ وہنر وغیرہ کی تعلیم درجات کے مطابق مستحب ومباح ہے۔

جو تعلیم وتدریس مستحبات کے قبیل سے ہو اس میں ملازمت اختیار کرنا اور پردہ کی رعایت نہ کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ مستحب کے لیے فرض کو چھوڑنا جائز نہیں ہے، چنانچہ فقہی قاعدہ ہے: "الفرائض أفضل من النفل" (قواعد الفقہ، ۹۵) (فرائض نفل سے افضل ہیں)۔

دوسرا قاعدہ ہے: "فرض العين لا يترك بالنافلة أوبما هو من فروض الكفاية" (قواعد الفقہ، ۹۵) (فرض عین نفل یا فرض کفایہ کی وجہ سے چھوڑنا صحیح نہیں ہے)۔

لہٰذا محض حسن اخلاق ومعاشرہ اور روزگار پیشہ وہنر وغیرہ کے لیے پردہ کو چھوڑنا اور لڑکے اور لڑکی کے مخلوط درسگاہوں میں درس دینا اسی طرح لڑکوں کے مخصوص درسگاہوں میں بغیر پردہ کے لڑکی کا درس دینا یا صرف لڑکیوں کے درسگاہوں میں بغیر پردہ کے لڑکوں کا درس دینا جائز نہیں ہے۔

تعلیم کے سلسلہ میں الاشباہ والنظائر للسیوطی میں ہے: "جواز النظر منها للتعليم فيما يجب تعلمه وتعليمه كالفاتحة" (الاشباہ والنظائر للسیوطی، ۱۸۱)۔ (جس چیز کی تعلیم وتعلم واجب ہے جیسا کہ فاتحہ اس میں اجنبیہ کی طرف دیکھنے کی گنجائش ہے)۔

نیز مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اپنی کتاب "کفایت المفتی" میں تحریر فرمایا ہے: "اجمالا یہ کہ لڑکیوں کے اسکول صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص ہونے چاہئے اور ان کے لیے اسکولوں میں جمع ہونے اور آمدورفت کے ایسے طریقے اختیار کیے جائیں کہ فتنہ کا احتمال باقی نہ رہے، نیک کردار اور پاکدامن عورتوں کو تعلیم وتربیت کی خدمت کے لیے مقرر کیا جائے، اگر معلمات نہ مل سکیں تو مجبوراً نیک اور صالح قابل اعتماد مردوں کو معین کیا جائے اور ان کی کڑی نگرانی کی جائے"۔

مذکورہ باتوں کی بنیاد پر اگر نیت میں فساد نہ ہو اور خلاف شریعت عمل کا ارتکاب نہ ہو تو ایسی ملازمت اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

ج: مظلوموں کے تعاون اور اس کی نصرت کے سلسلہ میں اسلام نے اتنا زور دیا ہے کہ اس کی مثال کسی اور مذہب میں نہیں مل سکتی، چنانچہ اشعث بن سلیم کی روایت میں ہے: "أمرنا النبي ﷺ بسبع ونهانا عن سبع فذكر عيادة المريض... ونصر المظلوم" (بخاری شریف، ۱/ ۳۳۱) (ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات چیزوں کا حکم دیا اور سات چیزوں سے منع کیا ان میں سے عیادت مریض...... اور ایک ہے مظلوم کو تعاون کرنا)۔

اور مظلوم کے تعاون کے لیے اور ظالم کے ظلم کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے وکلاء کی ضرورت پڑتی ہے اور آج کل وکلاء کی کثیر تعداد ظالم اور مظلوم میں فرق نہیں کرتی بلکہ بہت سی دفعہ وہ مظلوم کو انصاف سے محروم کردیتی ہے، اور اکثر اوقات وکلاء اپنے مؤکل کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے انہیں جھوٹ بولنے کی باضابطہ تربیت دیتے ہیں، حالانکہ شریعت اسلامیہ ان برائیوں کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتی، اس لیے پیشہ وکالت جائز نہ ہونا چاہئے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ چیزیں وکلاء کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں، نیز یہ کہ وکلاء کے بنیادی اغراض ومقاصد میں شامل بھی نہیں ہے، اگر وکلاء ان سب برائیوں سے پرہیز کرنا چاہے تو کر سکتے ہیں، لہٰذا ہمیں ان کے بنیادی اغراض ومقاصد کے سلسلہ میں غور وفکر کرنا چاہئے۔

جب ان کے بنیادی اغراض ومقاصد میں سے ظالم کے ظلم کو ختم کرنا اور مظلوم کو انصاف دلانا ہے جو شریعت اسلامیہ کے عین مطابق ہے، ایسی صورت میں اس پیشہ کو اختیار کرنا کار خیر میں تعاون کرنے کے مترادف ہے جس کے بارے میں قرآن اعلان کرتا ہے...... "تعاونوا على البر والتقوى" (سورہ مائدہ: ۲) (نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو)۔

۲۔ مسلمانوں کے اجتماعی اور انفرادی مسائل کے لیے وکیل کی ضرورت پڑتی ہے اور بہت سے مواقع پر اچھے مسلمان وکلاء کی کمی محسوس کی جاتی ہے، نیز مسلم

وکیل نہ ہونے کی وجہ سے بہت سارے مسائل کا صحیح حل نہیں ہوتا ہے، اس لیے مسلم وکیل کی بہت ضرورت ہے اور قاعدہ ہے:"الضرورات تبیح المحظورات"(قواعد الفقہ، ۸۹)(ضرورت کی وجہ سے ممنوعات مباح ہوجاتی ہیں)۔

۳۔ بہت سی دفعہ مسلم وکیل نہ ہونے کی وجہ سے ضرر اور مشقت لاحق ہوتی ہے اور مشقت کی وجہ سے احکام میں تخفیف پیدا ہوتی ہے، چنانچہ فقہی قاعدہ ہے:"المشقة تجلب التيسير"(الاشباہ والنظائر، ۱۴۰)۔دوسرا قاعدہ ہے:"الضرر يزال"(قواعد الفقہ، ۸۸)۔

۴۔ "ولأن الوكالة عقد جائز لايجب على الوكيل القيام فتجوز أخذ الاجرة فيها"(فتاویٰ محمودیہ، ۱۶/۴۵۱، بحوالہ الفقہ الاسلامی، ۵/۴۵۸)۔(اور وکالت جائز عقد ہے، وکیل پر وکالت کرنا واجب نہیں ہے، لہٰذا وکالت میں اجرت لینا جائز ہے)۔

۵۔ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:"وکالت ایک عقد اجارہ ہے اگر اجارہ میں عمل یا وقت اور اجرت کی تعیین ہوجائے نیز وہ عمل معصیت نہ ہو اور ان طاعات میں سے بھی نہ ہو جن پر اجرت لینا ناجائز ہے تو اجارہ درست ہے، اسی طرح اگر وکالت میں امور مذکورہ کا لحاظ رکھا جائے تو وکالت کی آمدنی حلال ہوگی۔(فتاویٰ محمودیہ، ۱۶/۴۵۳)۔

لہٰذا اگر سچ مقدمات ہوں، کام اور اجرت متعین ہوجائے اور خلاف شرع عمل کا ارتکاب نہ ہو تو ایسی صورت میں مذکورہ اغراض ومقاصد کی بنا پر مسلمانوں کے لیے اس پیشہ کو اختیار کرنا جائز ہے۔

د۔ عام حالات میں انسانی خدمت اور کار خیر میں تعاون کی بناء پر ناجائز چیزیں جائز نہیں ہوتی ہیں، البتہ حاجات اور ضروریات کی بناء پر احکام میں تغیر آسکتا ہے، پیشہ طبابت اور ذریعہ علاج کے سلسلہ میں غور وفکر کرنے سے درج ذیل باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔

۱۔ اس کے ذریعہ انسانی خدمت ہوتی ہے، دنیا دار الاسباب ہے اس میں اسباب ووسائل کی کافی اہمیت ہے، اگر پیشہ طبابت نہ ہو تو ظاہری اعتبار سے زندگی کی بقاء دشوار ہونے کا خطرہ ہے ایسی صورت میں پیشہ طبابت اختیار کرنا انسان کی ضرورت کی تکمیل کرنے کے مترادف ہے، اور یہ کار خیر ہے، اس لیے اس میں ملازمت اختیار کرنا کار خیر میں تعاون کرنے کے مترادف ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:"تعاونوا على البر والتقوى"(سورۂ مائدہ:۲)(نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو)۔

۲۔ پردہ کی رعایت ہوتی ہے، اگر غیر مسلم اس میں رہیں گے تو پردہ کی رعایت نہیں کریں گے، اگر مسلم لوگ اس میں رہیں گے تو حتی الامکان پردہ کی رعایت کریں گے۔

اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ عورتوں کے علاج کے لیے عورتوں کے علاج کرنے والی عورتیں یا مردوں کے علاج کے لیے مرد ملازمین ہوں اور اگر یہ نہ ہوں تو ضرورۃ ایسے ہاسپٹلوں میں ملازمت کرنا انسان کی ضرورت کی تکمیل اور کار خیر میں تعاون کرنا ہوگا جس کے بارے میں قرآن کریم نے اعلان کیا ہے:"تعاونوا على البر والتقوى"(سورۂ مائدہ:۲)(نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو)۔

البتہ ملازمین کے لیے ضروری ہے کہ جن اعضاء کا تعلق قابل ستر حصے سے ہے ان میں پردہ کی رعایت کریں اور جس عضو کو دیکھنا ضروری اور ناگزیر ہو صرف اسی حصہ کی طرف نظر کرے، بقیہ اعضاء کی طرف نہ دیکھے چنانچہ فقہی قاعدہ ہے:"الضرورة تقدر بقدرها"(قواعد:۸۹)(ضرورت کی وجہ سے بقدر ضرورت ہی جائز ہوتی ہے)۔

نیز شامی میں مذکور ہے:"ولايجوز النظر إليه بشهوة أي إلا لحاجة ... أو مداواتها إلى موضع المرض بقدر الضرورة"(شامی:۹/۷۹، ۸۰)(اور اس کی طرف دیکھنا جائز نہیں مگر ضرورت کی وجہ سے یا تو مرض کی جگہ میں علاج کیلئے بقدر ضرورت (دیکھنے کی گنجائش ہے)۔

اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے:"ويجوز النظر إلى الفرج... وللطبيب عند المعالجة يغض بصره ما استطاع"(فتاویٰ ہندیہ، ۵/۳۳۰)۔

۵- اگر کسی ہوٹل میں قیام وطعام کی سہولیات کے ساتھ ناجائز چیزیں جیسے شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت اور پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ ہو، اور ایسے ہوٹل میں رہنے اور ملازمت کرنے والے ملازم کا براہ راست ان چیزوں سے تعلق ہو تو ایسے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تعاون علی الاثم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے: "لا تعاونوا علی الاثم" (سورہ مائدہ: ۲) (گناہ میں تعاون نہ کرو)۔

دوسری بات اصول فقہ کا قاعدہ ہے: "درء المفاسد اولی من جلب المنافع" (قواعد الفقہ: ۵۵) (منفعت کے حصول سے مفاسد کو دور کرنا اولیٰ ہے)۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر حلال اور حرام کا اجتماع ہوتا ہے تو حرمت کو ترجیح ملتی ہے چنانچہ قاعدہ ہے: "إذا اجتمع الحلال والحرام والمحرم والمبیح غلب الحرام والمحرم" (قواعد الفقہ: ۵۵) (جب حلال اور حرام یا محرم اور مبیح کا اجتماع ہو جائے تو حرام اور محرم غالب ہو جاتا ہے)۔

البتہ اگر حرام اشیاء کی فراہمی سے ہوٹل میں ملازمت کرنے والے کا براہ راست تعلق نہ ہو تو چوں کہ نفس ہوٹل میں کوئی معصیت نہیں ہے اور اس کے بنیادی اغراض ومقاصد مسافرین اور دوسرے لوگوں کے لیے معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے، ظاہر ہے نفس مقصد میں کوئی معصیت نہیں ہے بلکہ کار خیر ہے تو ایسی صورت میں اس میں ملازمت اختیار کرنا "تعاونوا علی البر والتقوی" (سورۂ مائدہ: ۲) میں شمار ہوگا۔

نیز نفس ہوٹل میں کوئی معصیت نہیں ہے اور ناجائز وہ چیز ہوتی ہے جو بذات خود معصیت ہو جیسا کہ جواہر الفقہ میں مذکور ہے: "لکن المعصیة هی ما قامت المعصیة بعین فعل المعین ولا یتحقق إلا بنیة الإعانة أو التصریح بها أو تعینها فی استعمال هذا الشئ بحیث لا یحتمل غیر المعصیة" (جواہر الفقہ، ۲/ ۳۵۰) (لیکن معصیت وہ ہے جو اعانت کرنے والے کے عین فعل میں معصیت ہو اور یہ متحقق نہیں ہوگا مگر اعانت کی نیت سے یا اس کی صراحت کرنے سے یا اس چیز کے لیے استعمال متعین ہونے کی وجہ سے اس طور پر کہ غیر معصیت کا احتمال نہ رکھے)۔

لہٰذا اگر کسی ملازم کو حرام اشیاء کی فراہمی سے براہ راست تعلق نہ ہو تو اس کے ایسے ہوٹلوں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

☆☆☆

حکومت کے مختلف اداروں میں ملازمت کرنے کا شرعی حکم

مولانا عبدالرشید قاسمی[1]

فوج اور پولیس میں ملازمت کا حکم:

اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول ہماری بہترین رہنمائی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں: "لایکون الرجل فقیھا حتی یعرف أھون الشرین" کہ آدمی فقیہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اس کو "أھون الشرین" (دو برائیوں میں سے ہلکی برائی) کی معرفت نہ ہو۔

فوج اور پولیس کی ملازمت میں بھی یہی صورت حال ہے کہ ملازمت کرنے میں جتنا ضرر ہے، ترک کرنے میں اس سے زیادہ ضرر ہے جیسا کہ سوالنامے سے بھی ظاہر ہے کہ "بعض دفعہ فوج کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر وار کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے اور بسا اوقات مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہوتا ہے لیکن اگر اس چھوٹے ضرر کی رعایت میں فوج و پولیس میں حصہ نہ لیا گیا تو اس سے زیادہ بڑا ضرر لاحق ہوگا۔ تجربات اس پر شاہد ہیں۔ کیوں کہ ان شعبوں میں مسلمانوں کی موجودگی کی وجہ سے مسلمان ان کی زیادتی سے بچ سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس سے مسلمانوں کی معیشت مضبوط ہوگی، اور ان شعبوں میں حصہ نہ لینے کی شکل میں روزگار کے وسائل محدود کرنے کے مترادف ہوگا۔" اس طرح کی ملازمتوں میں اگر تھوڑی دیر استحکام معیشت سے صرف نظر بھی کرلیا جائے تب بھی اہون الشرین یہی ہے کہ مذکورہ وجوہ کی وجہ سے ملازمت میں حصہ لے لیا جائے تاکہ شر کو کم سے کم کیا جاسکے چہ جائے کہ ان میں استحکام معیشت بھی ہے یہ گویا جواز کی مزید تائید ہوگی۔

فقہ اسلامی میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ "مجموعۃ الفتاویٰ" میں لکھتے ہیں:

"إن الشریعة جاءت بتحصیل المصالح وتکمیلھا وتعطیل المضار وتقلیلھا فإنھا ترجح خیر الشرین، وشر الشرین وتحصل أعظم المصلحتین بتثبیت أدناہ وترفع أعظم المفسدین باحتمال أدناہ۔" (یعنی شریعت مصالح کی تحصیل اور اس کی تکمیل کے لیے آئی ہے اور مفاسد کو ختم کرنے یا اس کو کم کرنے کے لیے آئی ہے، چنانچہ اگر دو خیر ہیں اور دو خیر میں سے ایک ہی ہم کو مل سکتا ہے تو جو بہتر خیر ہوگا اسی کو ہم ترجیح دیں، اس تعلق سے شریعت حکم دیتی ہے۔ اور جہاں دو شر ہیں ایک ہی شر سے ہم بچ سکتے ہیں تو بڑے شر سے ہم بچنے کی کوشش کریں) (مقاصد شریعت: ۲۲۲)۔

اگر ایک حاملہ عورت ہو اور جنین کو ساقط نہ کئے جانے کی صورت میں عورت کی موت کا یقین ہو تو یہاں دو ہی صورتیں ہیں یا تو جنین کی موت ہوگی یا ماں کی موت ہوجائے گی۔ اگر ماں کی موت ہوگی تو بچہ کی پرورش کون کرے گا؟ بیشتر فقہاء کہتے ہیں کہ ایسے صورت میں جنین کے اسقاط میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر جسم کا کوئی عضو بے کار ہوجائے تو شدید تر ضرر کو دور کرنے کے لیے خفیف تر ضرر کو برداشت کرتے ہوئے اس عضو کو کاٹ دیا جائے گا۔ اسی طرح مسئلہ تترس کا ہے۔ یعنی اگر دشمن نے اپنی فوج کے سامنے مسلمانوں کو کھڑا کرکے انسانی ڈھال بنالیا ہے، اگر مسلمان حملہ کریں گے تو پہلے یہ مسلمان قیدی نشانہ بنیں گے، اور ان مسلم جانوں کو تلف کرنا پڑے گا۔ تو یہاں بھی دشمن کے حملے سے بچنے کے لیے اس چھوٹے نقصان کو گوارہ کیا جائے گا۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جہاں اہون الشرین پر عمل کا حکم دیا گیا ہے۔

تاہم اگر یہ بات تسلیم بھی کرلی جائے کہ ان شعبوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی مظالم سرزد ہوجاتے ہیں تو بھی مصالح عامہ کی وجہ سے اس ضرر کو گوارہ کرلیا جائے گا۔ "یختار أھون الشرین"، "إذا تعارضت مفسدتان، روعی أعظمھما ضررا"، "بارتکاب أخفھما"، "الضرر

---

[1] مفتی مدرسہ جامعہ العلوم جامع مسجد، پٹکاپور، کانپور (یوپی)۔

الأشد یزال بالضرر الأخف" (الاشباہ والنظائر ۱۱۲، بحوالہ مجلۃ المجمع الفقہی الاسلامی، ۱۴۸)۔

مخبری اور انٹیلیجنس میں ملازمت:

ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام ایک ناگزیر اور عام ضرورت ہے اور اس سلسلے میں جن امور غیر شرعیہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے ان کی حیثیت جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے عمومدد کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھار ایسا کرنا پڑتا ہے اور یہاں پر بھی جیسا کہ فوج اور پولیس کی ملازمت میں ذکر کیا گیا ذاتی طور پر بچا بھی جاسکتا ہے تاہم اگر غیبت اور تجسس کرنا بھی پڑے تو اس کی اجازت ہے۔ قاضی کو تزکیہ شہود کے لیے اس کی ضرورت پڑتی ہے علامہ حصکفی فرماتے ہیں: "یزکی الشهود سرًا وعلنًا" (درمختار مع الشامی ۸:۲۰۸، طبع زکریا) (قاضی گواہوں کی تحقیق خفیہ اور علانیہ کراسکتا ہے)۔ اس سے تجسس بھی کرنا پڑے گا اور گواہوں کے عیوب بیان کرنے کی بھی نوبت آئے گی۔ اسی طرح روایت حدیث میں جرح وتعدیل اور فن اسماء الرجال میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ محدثین نے راویوں کے حالاتِ زندگی بیان کرنے میں کوئی رعایت نہیں کی، دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کردیا، حضرت مفتی شفیع صاحبؒ آیت: "ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا" کے تحت فرماتے ہیں: "بیان القرآن میں ہے کہ چھپ کر کسی کی باتیں سننا، یا اپنے کو سوتا ہوا بنا کر باتیں سننا بھی تجسس میں داخل ہے، البتہ کسی سے مضرت پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا دوسرے کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے مضرت پہنچانے والے کی خفیہ تدبیروں اور ارادوں کا تجسس کرے تو جائز ہے" (معارف القرآن، ۸/۱۲۱، طبع ربانی) آگے فرماتے ہیں کہ "بعض روایات سے ثابت ہے کہ آیت میں جو غیبت کی عام حرمت کا حکم ہے یہ مخصوص البعض ہے یعنی بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہوتی ہے کہ مثلاً کسی شخص کی برائی کسی ضرورت یا مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں، بشرطیکہ وہ ضرورت اور مصلحت شرعاً معتبر ہو جیسے کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو ظلم کو دفع کرسکے، یا کسی کی اولاد وبیوی کی شکایت اس کے باپ اور شوہر سے کرنا جو ان کی اصلاح کرسکے، یا کسی واقعہ کے متعلق فتوی حاصل کرنے کے لیے صورت واقعہ کا اظہار، یا مسلمانوں کو کسی شخص کے دینی ودنیوی شر سے بچانے کے لیے کسی کا حال بتلانا، یا کسی معاملہ کے متعلق مشورہ لینے کے لیے اس کا حال ذکر کرنا، یا جو شخص سب کے سامنے کھلم کھلا گناہ کرتا ہے اور اپنے فسق کو خود ظاہر کرتا پھرتا ہے اس کے اعمال بد کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں مگر بلاضرورت اپنے اوقات ضائع کرنے کی بنا پر مکروہ ہے (یہ سب مسائل بیان القرآن میں بحوالہ روح المعانی بیان کئے گئے ہیں) اور ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کی برائی اور عیب ذکر کرنے سے مقصود اس کی تحقیر نہ ہو بلکہ کسی ضرورت ومجبوری سے ذکر کیا گیا ہو"۔ (معارف القرآن، ۸/۱۲۳، طبع ربانی)۔

شبہ کی بنیاد پر بھی محدود کارروائی کا ثبوت کتب فقہ میں ملتا ہے۔ ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کے روک تھام کے لیے اس شعبہ (مخبری وانٹیلیجنس) کا قیام وقت کی ضرورت ہے، لہٰذا ضرر عام سے بچنے کے لیے ضرر خاص کو گوارا کرتے ہوئے اس شعبے میں ملازمت کی اجازت ہوگی۔ بس کسی سے ذاتی پرخاش نہ نکالی جائے اور کسی کو بلاوجہ غلط طریقے سے نہ پھنسایا جائے۔

فقہی قاعدے بھی اس کی تائید کرتے ہیں: "یختار اھون الشرین" (دوضرروں میں ہلکا ضرر اختیار کیا جائے گا)۔ "إذا تعارضت مفسدتان روعی أعظمهما ضررًا" (جو دو مفسدہ آپس میں ٹکرا جائیں تو ہلکے ضرر اور فساد کو اختیار کرکے بڑے مفسدے سے بچنے کی سعی کی جائے گی) "الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف" (ہلکے ضرر کو اختیار کرکے بڑے ضرر کو زائل کیا جائے گا)۔

ایسے بھی ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ جس حکومت میں رہتا ہے اور اس سے جو معاہدے ہوئے ہیں ان کا پاس ولحاظ رکھے۔ کسی بھی ملک کو رہنے والا شخص اس چیز کا پابند ہوتا ہے کہ وہ خود ملک کے امن وامان اور سلامتی کے لیے خطرہ نہ بنے، اور اگر کوئی خطرہ بن رہا ہے تو وہ حکومت کو اس کی اطلاع دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "یاایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود" (المائدہ:۱) (اے ایمان والو! پورا کرو عہدوں کو) "واوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا" (بنی اسرائیل:۳۴) (عہد کو پورا کرو کیوں کہ عہد کے بارے میں قیامت کے روز باز پرس ہوگی)۔

جاسوسی کی ملازمت کو بھی اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ امور شرکیہ، کفریہ وغیرہ شرعیہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: سوال: خفیہ پولیس کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس نیت سے جائز ہے کہ میں لوگوں کو نقصان سے بچاؤں گا۔ یا اس نیت سے کہ دوسرا جو نقصان پہنچاتا ہے اس سے کم پہنچے گا (یعنی اس کے مقابلہ میں مجھ سے نقصان کم پہنچے گا، دوسروں سے زیادہ پہنچے گا) (اسلامی حکومت ودستور مملکت: ۲۳۸)۔

عدالتوں میں ملازمت کا حکم:

مثل مشہور ہے: "مالا یحصل کله لایترك کله" (جس چیز کو پورے طور پر حاصل نہ کیا جاسکتا ہو اس بالکلیہ چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے)۔ ہندوستان میں ہمارا پرسنل لا (Personal Law) خصوصاً عائلی مسائل میں محفوظ ہے اگر چہ اس پر عمل درآمد کرانے میں بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ایسی صورت حال میں اگر مسلم کو وکلاء و ججز ہوتے ہیں تو شریعت کا کچھ نہ کچھ پاس ولحاظ رکھ ہی لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہم پیش کرتے ہیں: شاہ بانو کیس کے حوالہ سے کسی عورت کی عدت کے بعد بھی وجوب نفقہ میں گیند جج کے پالے میں ہوتی ہے۔ بعض ججز مسلم پرسنل لا کے مطابق فیصلہ دے دیتے ہیں اور بعض انڈین ایکٹ کے مطابق خلاف شرع فیصلہ دیتے ہیں، اگر مسلم جج ہو تو شاید شریعت کا کچھ پاس ولحاظ رکھ لے۔

اسی طرح صوبہ اتر پردیش میں لڑکیوں کو کھیت کھلیان میں ترکہ کا مسئلہ۔ یہاں بھی گیند جج کے پالے میں ہوتی ہے، چنانچہ باپ کے مرنے کے بعد اگر لڑکیاں کھیت کھلیان میں اپنا حق وصول کرنا چاہیں اور اس کے لیے انہیں عدالت کا رخ کرنا پڑے تو انہیں ان ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ ججز مسلم پرسنل لا کے مطابق فیصلہ دیتے ہیں جبکہ کچھ اس کے خلاف۔ غرض دونوں جگہ لنگڑے لولے قانونوں کا سہارا لے کر ججز اپنا کھیل کھیلتے ہیں اب اگر مسلم ججز ہوں گے تو شاید ملی غیرت آجائے۔

اسی پر وکالت کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، لہٰذا سوالنامے میں جو خدشات وخطرات ظاہر کیے گئے ہیں کہ "مسلمانوں کی نسبت سے عدالت کے رویہ کو منصفانہ نہیں کہا جاسکتا، اگر عدالتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ختم ہو جائے تو اندیشہ ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بڑھ جائے گی" بالکل بجا ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: "سوال ۹ ۴۳ فی زمانہ جو مسلمان منجانب سرکار مقدمات فیصل کرتے ہیں وہ احکام شریعت کے مطابق نہیں ہوتے مثلاً (اور پھر سائل کے دلائل پیش کئے ہیں کہ کیوں مقدمات کا حل احکام شریعت کے مطابق نہیں ہوتا، طوالت سے بچنے کی غرض سے ہم سوال کے اس حصے کو حذف کررہے ہیں ناقل) ان سب کے باوجود مقدمات کے فیصلہ کرنے کے عہدے قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور آیت "ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئك هم الظالمون" کی کیا تعبیر ہے؟

جواب: "قاعدہ شرعیہ ہے کہ اشد الضررین کے دفع کے لیے اخف الضررین کو گوارہ کرلیا جاتا ہے، اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ حصول نفع کے لیے دینی ضرر کو گوارہ نہیں کیا جاتا۔

اس بنا پر اس مسئلہ میں تفصیل ہوگی کہ جو لوگ ان حکومتوں (اور عہدوں کو اختیار کرتے ہیں، دیکھنا چاہئے کہ ان کے قبول نہ کرنے سے خود ان کو یا عامہ اہل اسلام کو کوئی ضرر شدید لاحق ہونا غالب ہے یا نہیں۔ پہلی صورت میں تو (یعنی جب کہ ضرر شدید کا خطرہ ہو) ان حکومتوں اور عہدوں کا قبول کرنا جائز ہے۔ اور دوسری صورت میں دیکھنا چاہئے کہ آیا اس شخص کی نیت اس ضرر کے دفع کی ہے یا کوئی مالی یا جاہی نفع حاصل کرنے کی۔ اول نیت میں جواز کی گنجائش ہے اور دوسری نیت میں ناجائز۔

پس کل تین صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں جواز کی گنجائش ہوئی (یعنی جب ضرر شدید لاحق ہونے کا خطرہ بھی ہو اور دفع ضرر کی نیت سے اس کو حاصل کیا جائے) اور اس صورت میں آیت (مذکورہ فی السوال) کا محمل بقیہ دو صورتیں ہوں گی (یعنی جب کہ ضرر شدید کا خطرہ نہ ہو، یا ہو تو لیکن دفع ضرر کی نیت سے نہیں بلکہ محض حصول نفع کی نیت سے حاصل کرے تو ناجائز ہے) خصوصاً اگر جائز یا مستحسن سمجھے تو کفر ہے۔

البتہ اگر دو ناجائز صورتوں میں بھی سلطنت کی طرف مجبور کیا جائے اور عذر قبول نہ کیا جائے تو پھر ان میں بھی گنجائش ہے لیکن ہر حال میں جہاں تک ممکن ہو خلاف شریعت سے بچنے کی کوشش کرے اور صرف اس خیال سے خلاف شریعت فیصلہ نہ کرے کہ آگے جاکر یہ منسوخ ہو جائے گا۔ البتہ جہاں جرم قانون اور عتاب شاہی کا اندیشہ ہو صرف وہاں ہی گنجائش ہوگی۔ ایک صورت میں تو بلا جبر بھی اور دو صورتوں میں بجبر" (امداد الفتاوی، ۳/ ۴۳۰-۴۳۱، بحوالہ اسلامی حکومت و دستور مملکت، ۲۳۶-۲۳۷)۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے یہ جواب اس وقت تحریر فرمایا تھا جب انگریزوں کی حکومت تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ حکومتیں مسلمانوں کے تئیں عدل وانصاف کے فقدان اور ظلم وزیادتی میں ان سے آگے ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی "غیر اسلامی حکومت میں کلیدی عہدے" سے متعلق فرماتے ہیں: "ایک اہم سوال یہ ہے کہ غیر اسلامی مملکت کے کلیدے عہدوں، صدارت، وزارت، تحفظ ودفاع، عدلیہ اور رکنیت پارلیمنٹ پر فائز ہونا جائز ہوگا یا نہیں؟ جب کہ ایسی ملازمتوں میں سیکولر اور غیر مذہبی ریاست ہونے کے لحاظ سے اسلامی قانون اور منصوص احکام کے خلاف فیصلوں میں شریک ہونا اور اس کی تنفیذ کا ذریعہ بننا پڑے گا۔

اصولی طور پر ظاہر ہے کہ یہ بات جائز نہ ہوگی۔ اس لیے کہ کسی صیغہ کی محض ملازمت سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ کسی گنہگارانہ اور خلاف شرع فیصلہ کا اور اس کے نفاذ اور ترویج کا ذریعہ بنے اور عملاً حاکمیت الٰہی کا انکار کرے۔

مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر مسلمان ایسی ملازمتوں سے یکسر کنارہ کش اور سبکدوش ہوجائیں تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اسلام کے بچے کھچے آثار اور مسلمانوں کے دینی، وتہذیبی اور قومی مفادات کا تحفظ دشوار ہوجائے گا اور مسلمان اس مملکت میں سیاسی اعتبار سے مفلوج، تہذیبی اور مذہبی لحاظ سے مجبور اور اچھوت شہری بن کر رہ جائیں گے۔ اس لیے اس اہم تر مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے عہدوں کو بھی قبول کیا جائے گا۔ بلکہ مصلحتاً ان کے حصول کی کوشش کی جائے گی، البتہ دل میں اس غیر اسلامی نظام کی طرف سے ایک چبھن، اس پر بے اطمینانی اور اسلام کی بالاتری کا احساس تازہ رہنا چاہئے اور موجودہ حالات کو ایک مجبوری کے طور پر گوارہ کرتے رہنا چاہئے۔

اس کی نظیر حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون مصر کے خزانہ کی وزارت کی ذمہ داری قبول کرنا بلکہ اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے۔" (جدید فقہی مسائل: ۹/۷۹، ۳/۳۸۰)

اس لیے عدالتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ضروری معلوم ہوتی ہے اور "درء المفاسد مقدم من جلب المنافع" (الفقہ الاسلامی، ۱/۱۲۴) کے تحت عدالتوں کی ملازمت مسلمانوں کے لیے جائز ہوگی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جج عموماً خود بھی بچ سکتے ہیں، انہیں ظلم یا خلاف انصاف کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا الا ماشاء اللہ، جن کی حیثیت شاذ کی ہے۔

شعبۂ انکم ٹیکس و دیگر سرکاری عہدوں میں ملازمت کا حکم:

اس سلسلے میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کا یہ اقتباس ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ حضرت نے ماضی میں بھی مستقبل کے خطرات اپنی دوررس بیں نگاہوں سے دیکھ لیے تھے۔ فرماتے ہیں: اور اس وقت مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ وہ ایسی حکومتیں (اور عہدے) قبول کرلیا کریں، اور یہ اس قاعدہ میں داخل ہے کہ أشد المفسد تین کو دفع کرنے کے لیے أخف المفسد تین (یعنی بڑے مفسدے اور نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا مفسدہ اور چھوٹے نقصان کو) اختیار کرلیا جاتا ہے۔ اور ہے تو یہ بھی برا (اور غلط) لیکن دوسرے مفسدے کے بہ نسبت پھر بھی اخف (ہلکا) ہے۔ اور وہ بڑا مفسدہ یہ ہے کہ ہماری قوم (مسلمان) بالکلیہ دوسروں سے مغلوب نہ ہوجائے، پس اس نیت سے اگر عہدے لے لے (تو اس میں بڑی مصلحت ہے)۔

(الغرض اس قسم کے عہدوں کو) اگر مضرت (نقصان) کو دفع کرنے کی غرض سے اختیار کیا جائے تاکہ امت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم اور مضرتیں، مصیبتیں ودشواریاں پہنچتی ہیں اہل مناصب (یعنی یہ عہدیدار) بقدر امکان اگر ان کو رفع نہ کرسکیں تو کم از کم تقلیل وتخفیف (یعنی کم تو کرسکیں گے) تو اس صورت میں جواز کی گنجائش ہے" (اسلامی حکومت ودستور مملکت: ۲۳۸)۔

اس سے پولیس، فوج، جج، وکلاء، انکم ٹیکس کے افسران اور دیگر شعبوں کی ملازمت، سبھی چیزوں کے بارے میں رہنمائی ملتی ہے۔ درحقیقت ماتحتی میں انسان اپنے اختیار سے باہر کی چیزوں میں آلہ کے مانند ہوتا ہے جیسے قاضی جلاد کو حکم دے کہ اس مجرم کو نوے کوڑے مارنا ہے اور فرض کیجئے کہ واقعی سزا اس کی اسی (۸۰) کوڑے ہو تو بے چارہ جلاد تو حکم کا پابند ہے وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دس (۱۰) کوڑے اس پر ظلماً مارے جارہے ہیں لیکن مارے گا۔ یہاں بھی کچھ صورت حال ایسی ہے۔ اوپر سے حکم ہوتا ہے کہ تمہیں اتنی وصول کرنا ہے اب ماتحت افسر بے چارہ مجبور ہوجاتا ہے اس لیے دیگر ملکوں میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً "الأمور بمقاصدها" کے تحت مذکورہ شعبوں میں ملازمت نہ صرف جائز بلکہ حصول کی کوشش کرنا چاہئے۔

انشورنس کمپنی، بینک یا اس سے متعلق امور میں ملازمت ودیگر کام کاج کا حکم:

بینک میں کسی بھی طرح کی ملازمت کو عموماً علماء ناجائز لکھتے ہیں:

مفتی رشید احمد صاحب احسن الفتاوی میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: سوال: "بینک، بیمہ کمپنی اور محکمہ انکم ٹیکس، جس میں ٹیکس کی تشخیص وتحصیل کا کام ہوتا ہے اسی طرح کسٹم آبکاری وغیرہ ان محکموں میں ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: بینک اور بیمہ ربوا ہے، اور ٹیکسوں کی تشخیص کا طریق مروج ظلم ہے، ان کے مصارف بھی صحیح نہیں ہیں۔ اس لیے ان میں ملازمت جائز نہیں" قال الله تعالی: ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔" (احسن الفتاوی، ۸/۹۱)

مفتی تقی صاحب عثمانی نے ایک فرق ضرور کیا ہے کہ بینک کے علاوہ دیگر کاروبار میں سود کے معاملہ کو لکھنے والے کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو معاملہ میں معین بھی ہے اور ایک وہ جو صرف لکھتا ہے، عقد میں معاونت نہیں کرتا جیسے اکاونٹنٹ اور آڈٹ کرنے والا۔ اور حافظ ابن حجر کے حوالہ سے تفصیل بیان کی ہے کہ "کاتب سود سے مراد وہ شخص ہے جو کہ عقد سود کے وقت سود وغیرہ کا حساب لکھ کر عاقدین کی اس عقد میں معاونت کرتا ہے وہ سود کی وعید میں داخل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص عقد سود کے انعقاد کے وقت یہ حساب و کتاب نہیں لکھتا بلکہ عقد کے بعد جب وہ پچھلے عرصے کے تمام حسابات اور کارگزاری اور رپورٹ وغیرہ لکھتا ہے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہوگا...... اگر اس تفصیل کو پیش نظر رکھا جائے تو اس سے ان حضرات کی الجھنیں دور ہوسکتی ہیں جن کا کام بینک کے علاوہ دیگر سودی کاروبار میں اکاؤنٹس اور آڈٹ وغیرہ کا ہے" (درس ترمذی، ۴/۳۹)۔

لیکن بینک کے ملازموں کو پھر بھی کوئی راحت نہیں ملی کیوں کہ وہاں تو ساری عمارت ہی سودی بنیادوں پر قائم ہے اور تنخواہوں کی ادائیگی بھی سود ہی سے ہوتی ہے۔ خواہ وہ ادنی چپراسی ہو یا بڑا بابو اور افسر۔ چنانچہ مفتی تقی صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں:

"البتہ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ بینک کی ملازمت کیوں حرام ہے؟ اس لیے کہ آج کل تو ہر جگہ پیسہ بینک ہی کے واسطے سے آتا ہے۔ کوئی بھی چیز سود سے پاک نہیں ہے، لہذا پھر تو ہر چیز حرام ہونی چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ہر چیز کی حد مقرر کردی ہے کہ اس حد تک جائز ہے اور اس حد سے آگے ناجائز ہے، لہذا بینک کی ملازمت کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بینک کے اندر سودی لین دین ہوتا ہے اور جو شخص بھی بینک میں ملازم ہے وہ کسی نہ کسی درجہ میں سودی لین دین میں تعاون کررہا ہے اور کسی بھی گناہ کے کام میں تعاون کرنا قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حرام ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: "وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔" (المائدہ: ۲) اس وجہ سے بینک کی ملازمت حرام ہے" (درس ترمذی، ۴/۳۹)۔

سود پر وعید کے پیش نظر ہم بھی کسی رعایت کے حق میں نہیں ہیں اور نہ ہی اس میں قیاس یا اجتہاد کی گنجائش پاتے ہیں، البتہ موجودہ حالات کے اعتبار سے مشروط رخصت کے حق میں ہیں کہ ہر مبتلی بہ اپنے ذاتی احوال کو کسی خدا ترس عالم کے سامنے رکھ کر اپنے بارے میں حکم حاصل کرلے۔

بعض علماء نے بینک کی ان ملازموں کے درمیان جو براہ راست سودی لین دین میں ملوث ہوتے ہیں اور ان ملازموں کے درمیان جو براہ راست ملوث نہیں ہوتے (جیسے چپراسی و دربان وغیرہ) فرق کیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ چوں کہ چپراسی سودی لین دین میں ملوث نہیں ہے اس لیے اس کی اجرت درست ہوگی۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔ ملازمت محض ملازمت کوئی چیز نہیں بلکہ نتیجہ اور مقصد تنخواہ ہوتی ہے اور تنخواہ میں دونوں برابر ہیں، جو براہ راست ملوث ہے اسے بھی تنخواہ بینک کے کمائے ہوئے اضافی سود سے ملتی ہے اور چپراسی و دربان کی تنخواہ بھی اسی سودی مد سے ہوتی ہے۔ پھر فرق کی وجہ کیا ہے؟ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاونت کے اعتبار سے چپراسی بہ نسبت بابو کے کم معین ہے یا معین نہیں ہے۔ لیکن آخر تنخواہیں کہاں سے آتی ہیں؟ تنخواہوں کا معاملہ تو یکساں ہے۔ کیوں کہ تنخواہیں سب کی بینک ہی دیتا ہے نہ کہ حکومت۔ اور بینک کے منافع سوائے سود کے اور نہیں ہوتے۔

یہ پوچھے جانے پر کہ اگر بینک دیوالیہ ہوجائے تو ملازمین کی تنخواہیں کون دیتا ہے بینک کے ملازمین نے بتایا کہ بینک کے دیوالیہ ہوجانے کی صورت میں بھی تنخواہوں کا نظم حکومت کے ذمہ نہیں ہوتا بلکہ دیوالیہ شدہ بنک کو اس سے بڑی شاخاؤں میں ضم کرکے تنخواہوں کا نظم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہوجائے کہ تنخواہوں کا نظم حکومت کے خزانے سے ہوتا ہے بینک کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں، تو ایسی صورت میں چپراسی دربان وغیرہ کی تنخواہیں درست ہوجائیں گی ورنہ نہیں۔

جہاں تک تعلق انشورنس کا ہے تو اس میں ربوا کے ساتھ قمار کی بھی آمیزش ہوتی ہے، اب جو انشورنس جائز نہیں ہیں ان میں ملازمت بھی درست نہ ہوگی۔ اور انشورنس کی جو شکلیں جائز ہیں خواہ جبری ہوں جیسے بعض سرکاری ملازمتوں وغیرہ یا جبری نہ ہوں لیکن مصلحت انشورنس کی ہو ایسی شکل میں اس کی ملازمت کی بھی گنجائش ہونی چاہئے۔ کیونکہ جب بعض شکلوں میں انشورنس کی اجازت ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے لیے کسی غیر مسلم ایجنٹ کو ڈھونڈا جائے، اور اگر وہاں نہ

ملے تو وہ تلاش کرتا ہوا ادھر ادھر کا سفر کرے۔ حاصل یہ کہ جب انشورنس کی تمام صورتوں کا حکم یکساں نہیں ہے تو اس کی ملازمت کے عدم جواز کا حکم بھی یکساں نہ ہوگا۔ بلکہ حادثہ انشورنس، جبری انشورنس جو بعض سرکاری ملازمتوں میں یا پرائیویٹ ملازمتوں میں (Labour Law) کے تحت ہوتا ہے، یا انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے انشورنس ہو، اس طرح کے انشورنس کو چوں کہ اکثر علماء نے جائز قرار دیا ہے، لہٰذا ان کی ایجنسی بھی "الشيئ إذا ثبت، ثبت بلوازمه" کے تحت جائز ہونا چاہئے۔

اس موقع پر یہ بات قابل غور ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات" میں جس ضرورت کا ذکر ہے اور فقہاء کرام جس کی تشریح "اضطرار" سے کرتے ہیں وہ درحقیقت ایک انفرادی صورت حال ہے، عمومی احوال میں رخصت پر عمل کرنے کے لیے ضرورت بمعنی اضطرار نہیں بلکہ صرف حاجت کافی ہے جیسا کہ ضرورت اور حاجت کی بحث میں تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے اور آج کسب معاش کے سلسلے میں اکثر افراد کو یہ حاجت متحقق ہے، نیز حاجت کی تشریح اور ضروریات زندگی بھی بدل چکی ہیں جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: "الا إن أهل العلم قد نصوا على أن الحاجة قد تاخذ حكم الضرورة فقالوا: ان الحاجة تنزل منزلة الضرورة: عامة كانت أو خاصة" (الاشباہ والنظائر للسیوطی ۱۱۷، بحوالہ مجلۃ المجمع الفقهی الاسلامی ۱۵۱)۔

(اہل علم نے صراحت کی ہے کہ حاجت کبھی ضرورت کا درجہ لے لیتی ہے، حاجت عام ہو یا خاص ہو) "إن التسهيلات التشريعية الاستثنائية لاتقتصر على حالات الضرورة الملجئة، بل حاجات الجماعة، والافراد، ممادون الضرورة، توجب التسهيلات والاستثنائية ايضا" (شرح القواعد الفقهيه، ۲/۹۹۷)۔ (شرعی استثنائی سہولیات کا انحصار صرف ضرورت ملجئہ پر ہی ہے بلکہ یہ شرعی رخصت، ضرورت سے کم درجہ کی اجتماعی یا انفرادی حاجت پر بھی مل جاتی ہے)۔

"فاذا كانت هناك حاجة عامة للجماعة المسلمة او خاصة بشخص من افرادها، نزلت هذه الحاجة منزلة الضرورة، في جواز الترخيص لأجلها" (الوجیز فی ایضاح قواعد الفقہ الکلیہ ۲۴۲) (جماعت المسلمین کو یا خاص کسی فرد کو اگر کوئی حاجت عامہ پیش آجائے تو یہ حاجت رخصت کے جواز کے سلسلے میں ضرورت کا درجہ لے لیتی ہے)۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رخصت کے حصول کے لیے صرف "ضرورت" بمعنی "اضطرار" ہی ضروری نہیں بلکہ بسا اوقات "حاجت" پر بھی رخصت حاصل ہو جاتی ہے بشرطیکہ حاجت عامہ ہو، اور کسب معاش کے سلسلے میں اس وقت جو صورت حال ہے خصوصاً ہمارے ملک میں مسلمانوں کے لیے وہ حاجت عامہ میں داخل ہے۔

اباحیت کا دروازہ نہ کھل جائے اور لوگ اس کا غلط استعمال نہ کرنے لگیں، اس لیے اس موقع پر ضروری ہے کہ حاجت کے ضرورت شرعیہ کا درجہ لے لینے کی مزید تحدید و تشریح کر دی جائے۔ چنانچہ الدکتور ناصر بن محمد بن شری الغامدی وکیل کلیۃ الشریعہ جامعۃ أم القری فرماتے ہیں:

حاجت کب ضرورت کا درجہ لے لیتی ہے، اہل علم نے چند شرطیں لگائی ہیں، جن میں اہم یہ ہیں: (۱) وہ مشقت جس نے بندے کو حاجت کے وقت عام شرعی حکم کی مخالفت پر آمادہ کیا ہو، وہ مشقت ایسی ہو کہ مبتلی بہ کو غیر معتاد مشقت اور حرج تک پہنچا دے۔ (۲) حاجت متعین ہو اور عادۃً دوسرا کوئی شرعی طریقہ ایسا نہ بچا ہو جو غرض مقصود تک پہنچا دے (۳) حاجت کے جانچنے پرکھنے میں عام حالات میں ایک متوسط آدمی کی حالت کا اعتبار ہوگا، خاص حالات کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ (۴) اس حاجت کے معتبر ماننے کے لیے کسی شرعی قاعدے کی تائید حاصل ہو، اور اس کے جنس کی کوئی شرعی نظیر موجود ہو۔ (مجلۃ المجمع الفقهی الاسلامی، ۱۵۱، ۱۵۲)۔

مذکورہ بالا عبارتیں یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ دور حاضر میں مذکورہ ملازمتوں کی رخصت صرف اسی وقت نہیں ہوگی جبکہ انسان بھکمری کا شکار ہو جائے بلکہ اس وقت زندگی گزارنے میں جو پیچیدگیاں آرہی ہیں انہیں حل کرنے کے لیے بھی اس کی گنجائش ہوگی۔

شراب کی کمپنی میں ملازمت کا حکم:

یہ بات بیان محتاج نہیں کہ گناہ کے درجات ہوتے ہیں، ایک شخص نے کسی کو بندوق دی، ایک نے راستہ بتلایا اور ایک نے قتل کر دیا، ظاہر ہے اس قتل میں تینوں مجرم ہیں لیکن تینوں کے جرم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس کو دلیل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی اعتبار سے شراب کے کمپنی کے مسلم ملازمین کا حکم ہوگا، البتہ اس سلسلے میں فقہاء نے ایک ضابطہ بیان کیا ہے جس سے اس مسئلہ کو حل کرنے میں کافی رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ کہ اگر ممنوعہ چیز ایسی ہے جس کی ذات سے معصیت کا قیام ہے تو اس کا بیچنا یا تعاون کرنا مکروہ ہے۔ جیسے "بيع أمرد ممن يلوط به وبيع سلاح من أهل الفتنة، لأن المعصية تقوم بعينه" (درمختار مع الشامی ۹/۵۶۱، طبع زکریا) امرد کا بیچنا لوطی سے، اور ہتھیار کا بیچنا اہل فتنہ سے، کیوں کہ معصیت کا قیام بعینہ اس چیز سے ہے) یہ مسئلہ اتفاقی ہے۔

اور اگر اس کی ذات سے معصیت کے قیام کا تعلق نہیں تو امام صاحبؒ کے یہاں جائز ہے جیسے "وجاز بيع العصير وعنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرًا، لأن المعصية لاتقوم بعينه بل بعد تغيره" (درمختار مع الشامی ۹/۵۶۰، طبع زکریا) (شیرۂ انگور، اور انگور ایسے شخص سے بیچنا جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ شراب بنائے گا، جائز ہے کیوں کہ معصیت کا قیام اس کے عین سے نہیں بلکہ تغیر کے بعد ہے) "وجاز تعمير الكنيسة وحمل خمر ذمي" (درمختار مع الشامی ۹/۵۶۲، طبع زکریا) (چرچ کی تعمیر کرنا، ذمی کی شراب اٹھانا جائز ہے کیوں کہ اجیر کے عمل میں معصیت نہیں ہے)۔

البتہ صاحبین کے یہاں اس کی دو قسمیں ہیں، صاحب معاملہ کو یہ معلوم ہے یا نہیں، اگر معلوم ہے تو مکروہ ورنہ نہیں۔ گویا صاحبین کے یہاں اس سلسلے میں قصد وارادہ اور علم پر کراہت کا دارومدار ہے۔

علامہ شامیؒ اور علامہ حصکفیؒ نے اس موقع پر بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں لیکن ہم آج کے نامور فقیہ علامہ وہبہ زحیلی کی زبانی اس مسئلہ کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد اس سوال کے اجزاء پر کلام کریں گے۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی اپنی معرکۃ الآراء کتاب "الفقہ الاسلامی وادلتہ" میں مذہب احناف کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"يجوز لشخص عند ابي حنيفة ان يوجر نفسه او سيارته او دابته باجر لتعمير كنيسة، او لحمل خمر ذمي، لا لعصرها؛ لانه لا معصية فى الفعل عينه، لان عقد الاجارة على الحمل ليس بمعصية ولا سبب لها، وانما تحصل المعصية باختيار الشارب، وقد يكون حملها للاراقة او التخليل

اما عصرها بقصد الخمرية كمعاصر الخمور فى بلادنا او فى امريكا مثلا لمسلم فيحرم، لان المعصية فى الفعل عينه، وأجاز ابو حنيفة أيضا إجارة بيت لاتخاذه كنيسة او لبيع الخمر فيه فى بلاد غالب اهلها اهل الذمة؛ لأن الإجارة تقع على منفعة البيت، ولهذا تجب الأجرة بمجرد التسليم، ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستاجر، وهو المختار فيه۔

ولا تجوز تلك الاجارة فى بلاد غالب اهلها الإسلام؛ لأن اهل الذمة لا يمكنون من اتخاذ الكنائس واظهار بيع الخمور ونحو ذالك فى الأصح۔

وقال الصاحبان والأئمة الثلاثة: لا ينبغى كل تلك الإجارة، وهى مكروهة، لأنها إعانة على المعصية، ولأنه عليه السلام لعن فى الخمر عشرة، وعدمنها "حاملها"۔

واعتبر أبو حنيفة الحديث محمولا على الحمل المقرون بقصد المعصية وعلى كل حال فرأيه قياس، ورأي الصاحبين استحسان" (الدرالمختار ۵/۲۷۷، بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۲۶۸۸)، (امام ابوحنیفہؒ کے یہاں ایک شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو یا اپنی گاڑی کو یا اپنے جانور کو چرچ وغیرہ کی تعمیر، یا کافر کی شراب اٹھانے کے لیے اجرت پر دے دے، نہ کہ شراب کو نچوڑنے کے لیے، اس لیے کہ نفس فعل میں کوئی معصیت نہیں ہے، کیوں کہ شراب کے اٹھانے پر عقد اجارہ کرنا نہ معصیت ہے، اور نہ سبب معصیت، بلکہ معصیت تو شارب کے اختیار سے ہے اور ممکن ہے کہ شراب کا اٹھانا اسے پھینکنے یا سرکہ بنانے کی غرض سے ہو۔ بہرحال شراب بنانے کی غرض سے عرق کشید کرنا جیسا کہ ہمارے دیار میں یا مثلاً امریکہ میں عرق کشید کرنے والے، تو یہ فعل مسلمان کے لیے حرام ہے، کیوں کہ یہاں معصیت نفس فعل میں ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ نے اپنے گھر کو چرچ بنانے یا شراب بیچنے کے لیے اجرت پر دینے کو جائز قرار دیا ہے ایسے ملکوں میں جہاں کفار کی کثرت ہو، کیوں کہ اجارہ گھر کی منفعت پر واقع ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اجرت محض گھر حوالہ کردینے سے واجب ہوجاتی ہے اور اس میں کوئی معصیت نہیں ہے بلکہ معصیت تو فعل مستاجر میں ہے اور وہ اس میں خودمختار ہے، البتہ اپنے گھر کو

اس کام کے لیے اجرت پر دینا مسلم اکثریت ممالک میں تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ صحیح قول کے مطابق ذمیوں کو چرچ وغیرہ بنانے، اور کھلے عام شراب وغیرہ بیچنے کا اختیار نہیں دیا جائے گا۔صاحبین اور ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اجارات درست نہیں ہیں، بلکہ متروک ہیں کیوں کہ اس میں "اعانت علی المعصیة" ہے۔ آپ علیہ السلام نے شراب سے متعلق دس لوگوں پر لعنت فرمائی ہے اور شراب اٹھانے والے کو بھی انہیں میں شمار کیا ہے، امام ابوحنیفہؒ نے حدیث شریف کا محمل اس اٹھانے کو قرار دیا ہے جس میں معصیت کا قصد ہو۔ بہرکیف امام صاحب کی رائے قیاس ہے، اور صاحبین کی رائے استحسان)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کے مذہب پر عمل کرنے میں بڑی راحت بلکہ وقت کا تقاضہ ہے اور اس قول کو چھوڑنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے جو ملازم بنفس نفیس شراب کی خرید وفروخت میں ملوث ہیں ان کی ملازمت درست نہ ہوگی، لیکن جو لوگ کمپنی کے لیے شراب کی بوتل بناتے ہیں (بشرطیکہ بوتل میں شراب کا نام یا اڈورٹیزمنٹ (Advertisement) نہ ہو) یا شراب کی کمپنی کو وہ اجزاء (Raw Material) فروخت کرتے ہیں جن سے شراب بنائی جاتی ہے تو ان کا یہ عمل اور ملازمت درست ہوگی۔ کیوں کہ اجزاء (Raw Material) فروخت کرنا، یا پیش کرنا بہرحال شیرۂ انگور بیچنے سے کم درجہ رکھتا ہے اور امام صاحب کے نزدیک شیرۂ انگور ایسے شخص سے بھی بیچنا جائز ہے جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ شراب بنائے گا۔ اس طرح کمپنی کے لیے شراب کی پیٹیاں، گتے (Carton) رکھنا، اٹھانا، ادھر سے ادھر منتقل کرنا یہ بھی جائز ہوگا جیسا کہ "جاز حمل خمر ذمی" سے معلوم ہوا۔ کیوں کہ اٹھانے اور منتقل کرنے میں اراقۃ الخمر کا بھی احتمال ہے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کمپنی کے وہ کام جن میں براہ راست شراب کا پینا، پلانا، بیچنا خریدنا نہ ہو اس میں ملازمت ودیگر کام کاج کی اجازت ہوگی۔

سپر مارکیٹ وغیرہ میں ملازمت کا حکم:

سپر مارکیٹ کی نوعیتیں الگ الگ ہوتی ہیں، اسی اعتبار سے حکم لگے گا مثلاً ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ بہت ساری دوکانیں اور شوروم الگ الگ ہوتے ہیں اور ہر مکان وشوروم میں جدا جدا سامان ملتا ہے، مالک (Owners) سب کے کبھی مختلف ہوتے ہیں اور کبھی متحد ایسی صورت میں جس دوکان اور شوروم میں صرف شراب فروخت ہو اس میں ملازمت جائز نہ ہوگی۔ کیوں کہ وہ من وجہ بیچنے والا ہوا اگر چہ یہ مالک کا وکیل ہے اور یہ بیچنا مالک کی طرف سے ہے لیکن بیع میں وکیل ہی اصل کے درجہ میں ہوتا ہے، اس لیے شکلاً بیع پائی گئی اور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، تو صریح نص کے ہوتے ہوئے قیاس درست نہ ہوگا اور اس لیے یہ ملازمت جائز نہ ہوگی۔

سپر مارکیٹ کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ بہت بڑی دوکان یا شوروم ہے اور اس میں ایک ساتھ چھوٹی بڑی بہت ساری اشیاء دستیاب ہیں پھر اس کی بھی دو شکلیں ہیں ایک یہ کہ خریدار سامان ٹرالی از خود لے کر سامان، ٹرالی میں جمع کرتا رہتا ہے اور پھر آخر میں آکر کیش کاؤنٹر (Cash counter) پر قیمت ادا کرکے بل لے لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس شوروم یا دوکان میں سیلس مین، کسٹمر کے مطالبہ پر سامان دیتا ہے اور مالک پیسے وصول کرتا ہے۔ آخر الذکر دونوں صورتوں میں پہلی صورت بے غبار معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہاں سیلس مین اور ملازم نہ بیچنے والا ہے، نہ اٹھانے والا، بس کیشیر (Cashier) کی طرح کام کررہا ہے یا نگرانی وغیرہ دوسری ڈیوٹیاں انجام دے رہا ہے، ایسی صورت میں سب کچھ صحت وسقم مالک کی گردن پر ہوگا اگر وہ مسلمان ہے، اور اگر غیر مسلم ہے تو اس کے یہاں تو شراب کی خرید وفروخت شرعاً بھی جائز ہے۔ اور آخر الذکر دونوں صورتوں کی دوسری صورت میں جس میں اس دکان یا شوروم میں بہت سارا سامان ملتا ہے اور ایک سامان شراب بھی ہے ایسی صورت میں "للاکثر حکم الکل" کے ضابطے سے گنجائش معلوم ہوتی ہے کیوں کہ جملہ اشیاء کے مقابلہ میں شراب بمنزلہ جزء کے ہے اور سیلس مین سے کبھی کبھار اس کا (یعنی کسٹمر کو شراب دینے) کا ارتکاب ہوتا ہے، لہٰذا غالب پر حکم لگاتے ہوئے گنجائش ہونا چاہئے۔

یہ حکم عام حالات میں ہے البتہ معاش سے بدحال شخص کے لیے مذکورہ تین شکلوں میں پہلی شکل سے اجتناب لازم ہے، "ومن يتق الله يجعل له مخرجًا" (اگر اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ضرور کوئی راہ پیدا کردے گا) نیز اس شکل سے بچنا ممکن بھی ہے۔ اور آخر الذکر دونوں شکلوں میں اس کے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔

سپر مارکیٹ میں دکان وشوروم کی سیلز مینی کے علاوہ ملازمت کے درجنوں شعبے ہوتے ہیں، چپراسی سے لے کر منیجر تک، ان تمام شعبوں میں ملازمت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مخلوط تعلیم یا خلاف جنس کو تعلیم دینے والے اداروں میں تدریسی ملازمت کا حکم:

جہاں تک تعلق مخلوط تعلیم کی تدریس کا ہے تو اس میں فتنہ کم، بدنگاہی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے، پڑھانے والا مرد ہو یا عورت جب اپنے مخالف جنس (Opposite Sex) کو تعلیم دیتے ہیں تو چوں کہ کلاس روم وغیرہ میں ایک سے زائد لڑکے یا لڑکیاں ہوتی ہیں اس لیے ایسی خلوت نہیں ہو پاتی جو باعث فتنہ ہو سوائے بدنظری کے، اب اگر اس کی وجہ سے یہ ملازمت نہ جائز قرار دی جائے تو حرج لازم آئے گا اور معیشت کے وسائل تنگ کرنے کے مترادف ہوگا، لاکھوں پروفیسر، ریڈرس، ٹیچرس، اور بورڈ کے اداروں میں پڑھانے والے مولوی وفاضل وغیرہ ملازمت کے ناجائز ہونے کی وجہ سے بے روزگار ہو جائیں گے کتنے ہی لوگ ہیں جو فی نفسہ شرافت اور تدین باقی رکھتے ہوئے بڑی بڑی یونیورسٹیوں، جامعات، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھاتے ہیں جہاں مخلوط تعلیم ہوتی ہے۔ اگر اسے مکروہ بھی قرار دیا جائے تو "اہون البلیتین" کے پیش نظر گنجائش دینا ہوگا۔

اس سلسلے میں حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے واقعے سے بھی رہنمائی ملتی ہے۔ واقعہ مشہور ہے" کہ ایک خاتون حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا خط لے کر مکہ جا رہی تھی جس میں اہل مکہ کو اس خبر سے آگاہ کیا گیا تھا، کہ مدینہ کے دس ہزار فوجی مکہ فتح کرنے آرہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ کو مخفی رکھنا چاہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ نے اس خاتون کو راستہ میں پکڑ لیا، اور اس سے خط طلب کیا، اس نے خط کا انکار کیا، انھوں نے محسوس کیا کہ اگر یہ خط مکہ چلا گیا اور اہل مکہ نے خبر پا کر پہلے مدینہ پر حملہ کر دیا تو یہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ حملہ میں شہید ہو سکتے ہیں، مدینہ کی حرمت پامال ہوگی اور عرب کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ یہ لوگ ماہ حرام میں جنگ کر رہے ہیں، ایک طرف اتنی بڑی مصلحت تھی، چنانچہ انھوں نے عورت کو دھمکی دی کہ یا تو خط نکالو ورنہ ہم تمھیں ننگا کر دیں گے، وہ خط چھپائے تھی، اتنی بڑی مصلحت اور بڑے نقصان سے بچنے کے لیے انھوں نے اس چھوٹے نقصان کو گوارہ کرنا چاہا کہ عورت اگر خط نہیں دیتی ہے تو اس کے کپڑے نکال کر خط حاصل کر لیا جائے۔" (مقاصد شریعت، ۲۵۹)۔

اس طرح یہاں بھی اتنے کثیر افراد کے ترک ملازمت کی وجہ سے مالی نقصان ہوگا، اور یہ سبب بنے گا جانی نقصان کا، اور دینی نقصان کا (کاد الفقران یکون کفرا)۔

نیز بات جب اختلاط اور بدنگاہی کی آتی ہے تو فقط تدریس ہی کیوں؟ کون سی ایسی جگہ ہے جہاں یہ اختلاط پایا نہ جاتا ہو، سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتوں میں مردوں کے روبرو عورتیں بھی ہوتی ہیں اور وہاں اختلاط تدریس کے مقابلہ زیادہ ہوتا ہے، وسائل گناہ بھی زیادہ ہوتے ہیں، مواقع بھی کثیر ہوتے ہیں اور پابندیاں بھی کم ہوتی ہیں، تو پھر کیا ان شعبوں میں ملازمت چھوڑ دی جائے؟ بلکہ آگے بڑھ کر محنت مزدوری کرنے والے لوگ بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ آج کل لیبر (Labour) اور مزدور طبقہ خواہ مکانات کی تعمیر ہو یا سڑکوں، پلوں اور دیگر تعمیراتی کام (Construction) میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں تو کیا ایسی جگہوں سے لوگ اپنے آپ کو ملازمت و مزدوری سے کھینچ لیں؟ ایک قدم اور آگے بڑھایئے، کاس میٹیک (Cosmetic) کی دوکانوں میں خریداری کے لیے عورتیں ہی بھری رہتی ہیں، اور دن بھر عورتوں سے ہی گفتگو اور اختلاط رہتا ہے، تو پھر یہ کام کرنے والے لوگ کیا کریں؟ آج کل گارمنٹس (سلے ہوئے کپڑوں) کی خریداری بھی عموماً عورتیں کرتی ہیں تو اس طرح کے دوکاندار کیا کریں؟ الغرض اگر خلاف جنس (Opposite sex) سے اختلاط کی بنیاد پر تدریس کے عدم جواز کا حکم لگایا گیا تو پھر یہ سلسلہ تھمنے کے بجائے وسائل روزگار کو بند کر کے ہی دم لے گا، بلکہ اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بازار اور مارکیٹ جانا بھی تو دشوار ہو جائے گا، ہر جگہ عورتوں کی کثرت ہے اور کسی نہ کسی درجہ میں اختلاط ہوتا ہے، لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ اب لوگ دوکانوں اور شوروموں میں سیلس مین کے ساتھ ساتھ سیلس لیڈی بھی رکھتے ہیں، اب بے چارے چھوٹی موٹی ملازمت کرنے والے کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ اس لیے بات صرف مخلوط تعلیمی اداروں میں تدریس کی نہیں بلکہ بہت سارے شعبے متاثر ہو جائیں گے۔

وکالت کا پیشہ:

وکالت کے بارے میں تھوڑا بہت ہم سوال نمبر (۱) کی شق نمبر (د) کے ضمن میں عرض کر آئے ہیں، مزید یہ کہ وکالت میں وکیل کے لیے غلط مقدمات کی پیروی جائز نہیں ہے اور یہاں ایسی کوئی حاجت بھی نہیں کہ وہ اپنا پیشہ چلانے کے لیے غلط کیس کی وکالت کرے اور ظالم کی مدد کرے بلکہ تجربات یہ ہیں کہ جو وکلاء صاف ستھرے اور صحیح کیس لیتے ہیں وہ ترقی کرتے ہیں، یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ایک وکیل اپنی وکالت میں اگر ظالم ومظلوم کا فرق کرے گا اور صرف وہی کیس لے گا جس میں مظلوم کی حمایت ہو تو اسے اپنے پیشے سے ہاتھ دھونا پڑے گا، ایسا نہیں ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، رہا جھوٹ بلوانے کا مسئلہ تو اگر یہ

حق کی وصولیابی کے لیے ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جھوٹ بولنا بلاشبہ گناہ ہے لیکن مقصد درست ہو تو جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، کون نہیں جانتا کہ وہ جھوٹ جس سے دو جھگڑے والے ل جائیں ہزار درجہ بہتر ہے اس سچ سے جس میں سر پھٹول ہو، ٹھیک اسی طرح یہاں "الامور بمقاصدھا" کے تحت اگر کسی کا حق، جھوٹ بول کر مل رہا ہے تو ایسے جھوٹ سے کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً ایک ظالم، دبنگ مقروض، اپنے کمزور قرض خواہ سے کہتا ہے کہ اگر تم اقرار کر لو گے کہ میرے ذمہ تمہارا کوئی حق نہیں ہے تو میں تم کو تمہاری رقم واپس کر دوں گا ورنہ نہیں، ظاہر ہے یہاں اس جھوٹے اقرار سے جس میں اسے اس کا حق مل رہا ہے کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

بہر کیف وکالت کا پیشہ درست ہے، لیکن غلط مقدمات کی پیروی کرنا بالکل جائز نہیں ہے، اور رہی بات جھوٹ بولنے کی تربیت دینا تو اس کا مدار نیت پر اور "الامور بمقاصدہا" پر ہے۔

پیشہ طبابت:

وکالت کی طرح یہاں بھی ایک ڈاکٹر اور طبیب کو اپنے پیشے میں ایسی کوئی ضرورت متحقق نہیں ہوتی کہ ہاسپٹل کے انتظامیہ کے اس طرح کے مطالبات کو قبول کرے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں ہاسپیٹل کم، ڈاکٹرس خود اپنے کمیشن کے چکر میں زیادہ رہتے ہیں، اسی لیے وہ غیر ضروری آپریشن اور بے ضرورت ٹیسٹ کرانے پر مریض کی غلط رہنمائی کرتے ہیں، ایسا سننے میں نہیں آیا کہ کسی ڈاکٹر کو صرف اس وجہ سے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا ہو کہ وہ بلاوجہ آپریشن اور بلاوجہ ٹیسٹ کیوں نہیں لکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر کی ذاتی دلچسپی اور نفع ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس طرح کے غیر اخلاقی اور غیر شرعی امور پر ذرا بھی نہیں شرماتا، زوال ملازمت یا پیشہ کم چلنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اکثر ڈاکٹر پچاس یا سو روپے لے کر جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ لکھ دیتے ہیں جبکہ کچھ ڈاکٹر ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے اپنے کلینک میں تختیاں ٹنگوا دی ہیں کہ ہمارے یہاں فرضی اور جھوٹے سرٹیفکیٹ نہیں دیے جاتے، دیکھنے میں آتا ہے کہ آخر الذکر قسم کے ڈاکٹر ہر اعتبار سے زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔

سوال کا یہ جزء کہ "سرکاری یا سپیٹلوں کے علاوہ پرائیویٹ ہاسپیٹل میں بھی مرد ڈاکٹر کو خاتون مریض اور خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے ایسے علاج پر بعض اوقات مجبور کیا جاتا ہے جس کا تعلق قابل ستر حصے سے ہے۔" اس سوال سے ہم اتفاق نہیں کرتے، یا ہم سوال سمجھ نہیں سکے، کیوں کہ آج کل اسپتال بالکل کمرشل (Commercial) ہو گئے ہیں، وہ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے احتراز کرتے ہیں جس سے ان کا کسٹمر ناراض ہو، اگر سوال میں مثال بھی دے دی جاتی کہ آخر کون سی وہ شکل ہے جس میں یہ نوبت پیش آتی ہے تو بہتر ہوتا، ہم نے ڈاکٹروں سے اور اسپتال جا کر معلوم کیا، جواب یہی ملا کہ ہمیں کیا غرض ہے کہ ہم ایسا کریں یا ہم تو خود مریض کی ایماء دیکھتے ہیں، پہلے اس میں مشورہ کرتے ہیں، بلکہ مریض مرد ہو یا عورت، وہ خود یا اس کے اہل خانہ ڈاکٹر کا انتخاب کرتے ہیں کہ ہم کو فلاں ڈاکٹر سے اپنا کیس کرانا ہے اور پھر اس اعتبار سے اسپتال والے ڈاکٹر کا انتظام کرتے ہیں۔ پرائیویٹ اسپتالوں میں تو ایسا نہیں ہوتا ممکن ہے سرکاری اسپتالوں میں ایسا ہوتا ہو۔

اس موقع پر بحث کا ایک پہلو اور ہے وہ یہ کہ عورتوں کے ولادت کے مسائل (Delivery Case) میں اگر نوبت آپریشن کی آتی ہے یا دل کی بائی پس سرجری اور پیٹ سے متعلقہ امراض میں اگر نوبت آپریشن کی آتی ہے (عورتوں کا سارا بدن ہی قابل ستر ہے) تو احتیاطی تدابیر کے پیش نظر مرد ڈاکٹر کی موجودگی لازم تصور کی جاتی ہے بلکہ مرد ہی آپریشن کرتے ہیں، لیڈی ڈاکٹر بھی وہاں موجود رہتی ہیں، آپریشن کے وقت بے ہوش کرنے والا ڈاکٹر الگ ہوتا ہے، جب تک آپریشن ہوتا ہے اس کی موجودگی بھی ضروری ہوتی ہے، اگر تیماردار یا مریض راضی نہ ہو تو اسپتالوں کو کیا پڑی ہے کہ مردوں کے آپریشن کے لیے عورتوں کو اور عورتوں کے آپریشن کے لیے مردوں کو مجبور کریں، ہاں مجبوری کے احکام الگ ہیں، کانپور جیسے بڑے شہر میں اسپتالوں اور نرسنگ ہوموں سے معلومات فراہم کیں لیکن ایسا پتہ نہیں نکلا، اور جہاں تک تعلق سرکاری اسپتالوں کا ہے تو وہاں ڈیوٹیاں متعین ہوتی ہیں، جس کی ڈیوٹی میں جو آیا اسے وہ کیس دیکھنا ہے۔

لیکن اگر بالفرض ایسا ہوتا ہے تو یہ غور کرنا ہوگا کہ کیا ڈاکٹر کو ایسی کوئی حاجت متحقق ہے جس کی وجہ سے وہ مجبور ہوں؟ اگر حاجت متحقق نہیں ہے اور وہ حلال طریقے سے اپنی ضروریات کا تکفل کر سکتے ہیں تو فوراً ایسے اسپتالوں کو چھوڑ دیں، ان کے لیے اس طرح کی ملازمت جائز نہ ہوگی۔

فائیو اسٹار، سیون اسٹار ہوٹلوں میں ملازمت کا حکم:

اس طرح کے ہوٹلوں میں ملازمت کے درجنوں شعبے ہوتے ہیں، ادنیٰ چپراسی سے لے کر اعلیٰ منیجر تک، پھر ہوٹلوں میں کچھ چیزیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ اصلاً

وہ چیزیں مباح ہوتی ہیں، جواز اور عدم جواز کا حکم فاعل مختار کے اپنے طرز استعمال پر موقوف ہوتا ہے جیسے سوئمنگ پول (Swimming Pool) میں نہانا، اچھے ہوٹلوں میں یہ فیسیلیٹی بھی ہوتی ہے، ایسا اگر سارے نہانے والے مرد ہوں، بے ستری نہ ہو، تنہا میاں بیوی ہوں تو جیسے چاہیں نہا سکتے ہیں، البتہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا استعمال اور فراہمی دونوں ناجائز ہیں جیسے شراب اور خنزیر کی فراہمی اور ان کا استعمال، پھر یہ دونوں چیزیں اگر ہوٹل غیر مسلم کا ہے تو خرید و فروخت بھی اس کے لیے جائز ہے، اس طرح کے ہوٹلوں میں صرف ایک دو شعبے ایسے ہیں جہاں براہ راست ملازم کو حرام چیزوں کی فراہمی سے تعلق ہوتا ہے اور فاعل مختار کے علاوہ فراہم کرنے والے کا بھی تعلق ہوتا ہے جیسے کھانا کھلانے کے وقت سروس کرنے والے لڑکے اور ویٹر انہیں کھانے کے ساتھ ساتھ کھانے والوں کی میز پر شراب یا خنزیر بھی لگانا پڑسکتا ہے، لہٰذا ایک مسلمان کے لیے ہوٹل کے اس شعبے میں ملازمت درست نہ ہوگی، اس کے علاوہ دیگر شعبوں میں ملازمت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر چہ ان شعبوں میں شراب وغیرہ ادھر ادھر سے منتقل کرنا پڑے کیوں کہ امام صاحب کے یہاں شراب ونجاست وغیرہ کے منتقل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، صاحب بدائع فرماتے ہیں: "ومن استاجر حمالا يحمل له الخمر فله الأجر في قول ابي حنيفة...... وذكر في "الجامع الصغير" انه يطيب له الأجر في قول أبي حنيفة" (بدائع ۴ /۱۴۱، طبع دار الکتب) (جس نے قلی کو اجرت پر لیا کہ وہ اس کے لیے شراب اٹھائے تو قلی اجرت کا مستحق ہے، جامع صغیر میں ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق اس کے لیے اجرت طیب اور پاک ہے)۔

ہوٹلوں میں اگر شراب کی بوتلوں، کارٹونوں یا لحم خنزیر وغیرہ ادھر سے ادھر منتقل کرنا پڑے تو "اراقۃ شراب" پر احتمال کی وجہ سے امام صاحب کے قول کے مطابق کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن کھانا کھلانے کی سروس میں چوں کہ کھانے کی میز پر شراب لگانا پڑتا ہے اور یہاں شراب پلانے کے سوا کوئی دوسرا احتمال بھی نہیں پایا جاتا اس لیے صریح حدیث کے پیش نظر عام حالات میں اس طرح کی ملازمت جائز نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ بقیہ شعبوں میں ملازمت درست ہوگی، ڈاکٹر وہبہ زحیلی فرماتے ہیں: "للمسلم إذ لم يجد عملاً مباحًا شرعًا، العمل في مطاعم الكفار بشرط ألا يباشر بنفسه سقي الخمر او حملها او صناعتها او الاتجار بها، وكذلك الحال بالنسبة لتقديم لحوم الخنازير ونحوها من المحرمات" (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۷ /۵۱۱۰)، (ایک مسلمان کے لیے جب وہ کوئی شرعاً مباح روزگار نہ پائے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی کافر کے ہوٹل میں ملازمت کرلے، بشرطیکہ اسے براہ راست شراب پلانے، اٹھانے، بنانے، یا بیچنے وخریدنے وغیرہ کا عمل نہ کرنا پڑے، یہی لحم خنزیر اور دیگر محرمات کا حکم ہوگا)۔

یعنی اگر براہ راست اسے ان اشیاء کو کھانا پلانا، بنانا یا خرید وفروخت کرنا پڑے تو ان شعبوں میں ملازمت جائز نہ ہوگی، ہوٹل کے بقیہ شعبہ جات میں ملازمت جائز ہوگی، ڈاکٹر صاحب نے یہاں اٹھانے اور منتقل کرنے کو بھی عدم جواز کے دائرے میں ذکر کیا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بدائع کے حوالہ سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ذکر کیا ہے کہ نفس اٹھانے اور منتقل کرنے کی گنجائش ہے، لہٰذا ایسے ہوٹلوں میں اگر شراب یا لحم خنزیر کھلانا، پلانا یا خرید وفروخت کرنا پڑے تب تو اس شعبہ میں ملازمت درست نہ ہوگی اس کے علاوہ دیگر شعبوں میں ملازمت درست ہوگی اگر چہ اس کو شراب اور لحم خنزیر ادھر سے ادھر منتقل کرنا پڑے۔

اسی پر قیاس کرتے ہوئے ان ہوٹلوں میں ملازمت کا حکم معلوم ہوگیا جہاں رقص اور موسیقی ہوتی ہے کہ اس طرح کے عریاں اور بے حیا شعبوں میں بحیثیت ملازم ان پروگراموں کا انتظام وانصرام کرنا اس کے لیے جائز نہ ہوگا اور اس شعبہ میں ملازمت درست نہ ہوگی، کیونکہ وہ براہ راست ملوث ہوگا اور اس کے لیے حظ نفس بھی ہوگا۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے ہوٹلوں میں جن شعبوں میں ملازمت کی گنجائش یا اجازت ہے، تنخواہیں تو ہوٹل کے آمدنی سے دی جائیں گی اور ہوٹل کی آمدنی مشتبہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً ہوٹلوں کی غالب آمدنی (اگر چہ ہوٹلوں میں مذکورہ چیزیں ہوتی ہیں) جائز ہوتی ہے، لہٰذا تنخواہوں میں وصول ہونے والی رقم بھی ملازم کے لیے درست ہوگی۔

بہر حال اس طرح کے ہوٹلوں میں جہاں براہ راست حرام چیزوں کے ساتھ ملوث ہو وہاں ملازمت جائز نہ ہوگی، اس کے علاوہ ان شعبوں میں جہاں براہ راست ملازم ملوث نہ ہو وہاں ملازمت درست ہوگی۔

....

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

مولانا محمد نورالدین بھاگل پوری[1]

۱۔(الف):

بلا شبہ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور ملک میں امن وامان قائم کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے اس کے بغیر ملک میں امن وامان قائم نہیں ہوسکتا، البتہ اس شعبہ میں ملازمت اختیار کرنے کی شکل میں مسلمان فوجیوں کو بعض مرتبہ خلاف شرع امور کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اس جہت سے اس ملازمت میں کچھ مفاسد پائے جاتے ہیں، لیکن دوسری جہت سے اس میں بہت سی مصلحتیں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً فوج کی ملازمت امن وامان کے قیام کا ایک قوی اور موثر ذریعہ ہے جو شرعاً مطلوب ہے۔ حدود وقصاص اور تعزیرات کی مشروعیت اسی مقصد کے پیش نظر ہوئی ہے، فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی کی وجہ سے مسلمان فوج کی زیادتی اور فرقہ پرستوں کی ظلم وبربریت سے بچ سکتے ہیں، نیز یہ معاش کا بھی ایک بڑا ذریعہ ہے گویا اس میں مفاسد اور مصالح دونوں پائے جاتے ہیں، البتہ مصالح غالب ہے اور مفاسد مغلوب ہے اور قاعدہ ہے، جب مصالح اور مفاسد دونوں پائے جائیں مفاسد کو برداشت کرکے مصالح کو حاصل کیا جائے گا جیسا کہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے:

"وقد تراعی المصلحة لغلبتها علی المفسده" (الاشباہ والنظائر: ۱۴۸)۔

(۲) فوج میں مسلمانوں کی ملازمت یقیناً شرعی اعتبار سے کچھ مضرتوں کو شامل ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا لیکن مسلمانوں کی عدم نمائندگی ان سے کہیں شدید مضرتوں کے متضمن ہیں، اگر فوج میں مسلمان نہ ہو تو مسلمان فرقہ پرستوں بلکہ خود فوج کی زیادتی کا شکار ہونا پڑے گا جیسا کہ بعض فرقہ وارانہ فسادات میں اس کا مشاہدہ بھی کیا جاچکا ہے۔ خصوصاً ہندوستان میں موجودہ پُرخطر حالات میں جب کہ فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہیں، ہندوستان کو ہندو راشٹر بنادینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے فوج کی ذہن سازی بھی کی جارہی ہے، ایسے حالات میں اگر مسلمان قابل قدر تعداد میں اس ملازمت کو اختیار نہیں کریں گے تو نہ صرف ان سے جان ومال بلکہ اسلامی اقدار وروایات کو بھی شدید خطرہ لاحق ہوجائے گا۔

(۳) اس طرح جواز کی شکل میں پایا جانے والا ضرر خاص ہے اور عدم جواز کی شکل میں پایا جانے والا ضرر "ضرر عام" ہے اور قاعدہ ہے: "یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام" کہ ضرر عام سے بچنے کے لیے ضرر خاص کو برداشت کیا جاتا ہے۔ (الاشباہ والنظائر: ۱۴۲)۔

لہٰذا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ میں ملازمت کرنا درست ہے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہے۔

(ب) شعبۂ پولیس میں ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں مسلمان پولیسوں کو بعض اوقات مظلوموں پر گولی چلانی پڑتی ہے، مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذا رسانی کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، اس جہت سے اس ملازمت میں کچھ خرابی پائی جاتی ہیں جو کہ خلاف شرع ہیں، لیکن دوسری جہت سے اس میں بہت سی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً پولیس کی ملازمت حوادث وجرائم کے روک تھام، چوری، ڈکیتی اور بلاوجہ ایک دوسرے کو قتل کے انسداد کا ایک بہترین ذریعہ ہے جو شرعاً مطلوب ہیں۔ پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کی وجہ سے مسلمان پولیس کی ظلم وزیادتی سے محفوظ رہ سکتے ہیں، اگر پولیس میں مسلمان نہ ہو تو مسلمانوں کو بہت سی پریشانیوں اور آفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خاص طور سے موجودہ دور میں جب کہ دشمنان اسلام مسلمان کے خلاف طرح طرح کی سازشیں رچ رہے ہیں، مدارس ومکاتب اور مساجد پر حملے ہورہے ہیں، ایسے حالات میں اگر مسلمان اس ملازمت کو اختیار نہیں کریں گے تو نہ صرف جان ومال بلکہ اسلامی روایات پر دھچکا لگے گا، جہاں تک اس شعبہ میں مفاسد کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں معلوم ہونا چاہئے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ بعض افعال ایسے

---

[1] المعہد العالی، پھلواری شریف، پٹنہ، بہار۔

ہیں کہ شرعی کلی قانون سے حرام ہیں لیکن ضرورت میں شرعًا اس کی اجازت دیدی جاتی ہے چنانچہ اصولیین کا قاعدہ ہے: "الضرورات تبیح المحظورات"۔

"وأن تقديم أرجح المصالح فأرجحها محمود حسن وان درء المفاسد محمود حسن وأن تقديم المصالح الراجحة على المرجوحة محمود حسن وأن درء المفاسد الراجحة على المصالح المرجوحة محمود حسن" (قواعد الاحکام:۷)۔

اسی طرح اگر اس شعبہ میں ملازمت کو ناجائز قرار دے دیا جائے تو مسلمان حرج میں پڑ جائیں گے، تنگی اور پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے جب کہ شریعت میں حرج اور تنگی کو دور کیا گیا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "إنما يريد الله بكم اليسر" اسی طرح اصولیین کا قاعدہ ہے: "الحرج مدفوع" اسی طرح اگر اس شعبہ میں ملازمت کی اجازت نہ دی جائے تو معیشت کا ایک وسیع ذریعہ مسدود ہو کر رہ جائے گا، لہٰذا مسلمانوں کے لیے پولیس کی ملازمت جائز ہے۔

(ج) امن وامان کے قیام کی غرض سے مخبری شرعًا مطلوب ہوگا۔ اسی طرح ضروریات دین پانچ ہیں: تحفظ دین، نفس، عرض، مال، عقل ان میں سے تین نفس، عرض اور مال کے تحفظ کے لیے مخبری معین بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ اس اعتبار سے مخبری ایک مطلوب عمل ہے، البتہ اس شعبہ میں ملازمت کی صورت میں تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ تجسس اور غیبت علی الاطلاق شریعت میں ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کی بعض شکلیں مباح ہیں تجسس کے سلسلے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "اگر کسی سے مضرت پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے اس مضرت رساں کی تدبیروں اور ارادے کا تجسس کرے تو جائز ہے۔ (بیان القرآن:۹۹٦)۔

اسی طرح غیبت کی کچھ شکلیں جائز ہیں، چنانچہ غیبت کے سلسلے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ غیبت والی آیت عام مخصوص البعض ہے، یعنی اگر برائی ذکر کرنے کی کوئی ضرورت ہو یا مصلحت جو شرعًا معتبر ہو تو وہ غیبت میں داخل نہیں جیسے ظالم کی شکایت ایسے شخص کے سامنے جو ظلم کو دفع کر سکے یا مستفتی صورت واقعہ بیان کرنے کی غرض سے کسی کا ذکر کرے یا مسلمانوں کو کسی شر دنیوی یا دینی سے بچانے کے لیے کسی کا حال بتلا دے یا کسی معاملہ کے متعلق اس سے مشورہ لینے کے وقت اس کا حال ظاہر کر دے۔ ومثل ذلک یا جو شخص اپنے فسق کو خود آشکارا کرتا ہو اس کے اعمال بد کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں۔ (بیان القرآن:۹۹٦)۔

اسی طرح صاحب روح المعانی نے بھی غیبت کے مباح ہونے کی چھ شکلیں بیان فرمائی ہیں: "قد تجب الغيبة لغرض صحيح شرعي لايتوصل إليه إلا بها تنحصر في ستة أبواب۔"

الاول: التظلم فلمن ظلم ان يشكو لمن يظن له قدرة على إزالة ظلمه لا تخفيفه۔

الثانی: الإستعانة على تغيير المنكر بذكره لمن يظن قدرته على إزالته۔

الثالث: الإستفتاء فيجوز للمستفتي ان يقول للمفتي ظلمني فلان كذا۔

الرابع: تحذير المسلمين من الشر كجرح الشهود والرواة والمصنفين والمتصدين لإفتاء مع عدم أهلية فتجوز إجماعا بل تجب۔

الخامس: أن يتجاهر بفسقه كالمكاسين وشربه الخمر ظاهرًا فيجوز ذكره بما تجاهروا فيه دون غيره إلا أن يكون له سبب آخر۔

السادس: للتعريف بنحو لقب كالأعور والأعمش فيجوز وان أمكن تعريفه لغيره۔ (روح المعانی،۱۴/۲۴۱)۔

مخبری میں غیبت اسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔

جب امن وامان کی غرض سے مخبری مطلوب ہے اور اس کے لیے جس قسم کے تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے وہ مباح ہے اور دوسرا کوئی مانع نہیں ہے

توظاہر ہے کہ اس شعبہ میں ملازمت کرنا مسلمانوں کے لیے جائز ہوگا۔

ٹیکس جو حکومت عوام سے وصول کرتی ہے وہ دوطرح کے ہیں بعض منصفانہ ہیں اور خود اسلام میں ان کی گنجائش ہے مثلاً پانی، روشنی، سڑک، ہسپتال وغیرہ سہولتوں کے بدلے حکومت جو ٹیکس لیا کرتی ہے اس کا فائدہ محسوس طور پر ہماری طرف لوٹا دیتی ہے چنانچہ فقہاء کے یہاں اس کی نظیر موجود ہے:

''فان أريد بها ما يكون بحق ككرى النهر المشترك وأجر الحارس والمؤظف لتجهيز الجيش وفداء الأسارى وغيرها جازت الكفالة بها على الاتفاق'' (ہدایہ ۳/۱۰۹)۔

دوسری قسم کے ٹیکس ایسے ہیں جن کو غیر منصفانہ اور ناواجبی کہا جاسکتا ہے اور ہمارے ملک میں انکم ٹیکس کی جو شرحیں رکھی گئیں ہیں وہ ظالمانہ ہیں، مثلاً انکم ٹیکس بسا اوقات اسّی فیصد تک پہنچ جاتا ہے، شرعی اعتبار سے غیر منصفانہ ہونے کے علاوہ اس قسم کے ٹیکس غیر معقول بھی ہیں کہ ایک شخص اپنے گاڑھے پسینہ سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس کا بڑا حصہ حکومت وصول کرتی ہے، اسی طرح ان کے مصارف صحیح نہیں ہے یعنی اس کو ٹھیک طریقہ پر عوام کے فلاح و بہبود پر استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ آمدنی کا وافر مقدار حکمراں کی عیش کوشی اور غیر معمولی سہولتوں پر خرچ کیا جاتا ہے اور اس میں لوگوں کی حیثیت کا لحاظ نہیں کیا جاتا صرف آمدنی کا لحاظ کیا جاتا ہے مصارف کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا جو شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے۔''وان اخذ العشر والخراج على خلاف ماورد به الشرع يكون ظالما واخذ المستحل له كافر وأمراء زماننا فاسقون ظالمون لأنهم أخذوا الخراج والعشر والجزية وصرفوه على خلاف ماورد به الشرع'' (حاشیۃ الطحطاوی، ۲/۴۶۱)۔

لہٰذا پہلی قسم کے انکم ٹیکس کے شعبوں میں ملازمت جائز ہے اور اس میں ملنے والی تنخواہ حلال ہے اور مذکورہ سوال میں جس نوعیت کے ٹیکس کا ذکر ہے وہ بالکل ایک ناواجبی اور ظالمانہ ٹیکس ہے یہاں تک کہ ایسے ٹیکس کے وصول کے لیے بعض اوقات لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تحقیق کرنی پڑتی ہے اور لوگوں پر ظلم کیا جاتا ہے جو شریعت میں کسی طرح روا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے اموال کی دو قسمیں کردی اموال ظاہرہ، اموال باطنہ اور اموال باطنہ کے زکوٰۃ نکالنے کا اختیار مالکوں کو دے دیا تا کہ لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تحقیق کر کے پریشانی میں نہ ڈالے، لہٰذا اس طرح کے شعبوں میں ملازمت کرنا گویا اعانت علی المعصیۃ ہے۔ اور جس طرح خود گناہ کے کاموں میں ملوث ہونا حرام ہے اسی طرح ناجائز کاموں میں مدد کرنا بھی حرام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا تعاونوا على الاثم والعدوان''۔

۲۔(الف):

سود میں خود ملوث ہونا ہی گناہ نہیں ہے بلکہ اس کے کاروبار میں مدد و معاون ہونا بھی معصیت ہے، یوں تو تمام ہی گناہ کے کاموں میں اعانت ناپسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لا تعاونوا على الاثم والعدوان'' لیکن خاص طور سے سود کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صراحت موجود ہے چنانچہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے: ''لعن رسول الله ﷺ اكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء'' (الصحیح لمسلم، ۲/۲۸)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کے کاتب نیز گواہوں سبھی پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ وہ سبھی برابر ہیں)۔ اس حدیث میں اللہ کے رسول نے سود کے لکھنے والوں اور گواہوں پر لعنت فرمائی ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں آدمی کسی ذمہ دارانہ عہدہ پر فائز ہو یا سودی معاملات لکھنے پڑتے ہوں تو جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی حیثیت ربوا کے کاتبین اور گواہوں کی ہوگئی اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ ملعون قرار دیا ہے بلکہ سود خوروں کے مساوی قرار دیا ہے ہاں ایسی ذمہ داری جن کا تعلق براہ راست سودی کاروبار سے نہ ہو بلکہ وہ بینک کے دوسرے امور پر فائز ہو مثلاً واچ مین وغیرہ کے کام پر ملازم ہوں تو ان کے لیے اس ملازمت کو اختیار کرنا جائز ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص بینک میں ملازمت کر رہا ہو اور ان کو کوئی دوسری ملازمت نہ مل رہی ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اسی میں ملازم رہتے ہوئے دوسری ملازمت تلاش کرے اور جب مل جائے تو اس کو چھوڑ دے۔

''إن العمل في البنوك والمؤسسات التي يقوم نظامها الأساسي على الاقراض بفائدة إذا كان في مجال الوظائف التي يقوم عليها الربا مباشرة من القراض والاقتراض وكتابة عقوده ووثائقه والشهادة عليه وكفالته، وحسابه وتحصيله واعتماده والمطالبة به قانونيا ونحو ذلك فانه حرام، أما الأعمال الأخرى التي لا علاقة لها بالربا مباشرة كالحساب الجاري والشيكات والحوالات وأعمال الحراسة، والنظافة والمراسلة فانها جائزة مع الكراهة'' (مجموعة

الفتاوی الشرعیة، ۱۶۱/۸)۔

اسی کی اندر بینک کے کمپیوٹر کی مرمت اور بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت داخل ہے کہ اس طرح کی ملازمت کرنا درست ہے کیوں کہ یہ کام بذات خود معصیت نہیں ہے، اسی طرح بینک کے مکان کی تعمیر میں کام کرنا درست ہے کیوں کہ یہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق براہ راست سودی کاروبار سے نہیں ہے، لہٰذا یہ اعانت علی المعصیة میں داخل نہیں ہوگا،

- ''ولو اجر نفسه ليعمل فى الكنيسة ويعمرها لا باس به لانه لا معصية فى عين الفعل'' (البحر الرائق، ۸/۳۷۲)۔

اسی کے ذیل میں ایک مسئلہ آتا ہے کہ بینک کے لیے اپنا مکان کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں تو اس سلسلے میں معلوم ہونا چاہئے کہ بینک ایک سودی کاروبار ہے، اس لیے اگر پہلے سے اس کو علم ہے کہ یہ شخص مکان کو کرایہ پر لے کر بینک بنائے گا تو خالص اس مقصد کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ معصیت میں ایک طرح کا تعاون ہے، ہاں اگر اس کو پہلے سے علم نہ ہو تو پھر اس کے لیے مکان کا کرایہ پر دینا بلا کراہت جائز ہے۔

"لاباس بان يواجر المسلم دارًا من الذى يسكنها فان شرب فيها الخمر او عبد فيها الصليب او ادخل فيها الخنازير لم يلحق للمسلم اثم فى شئ من ذلك، لأنه لم يواجرها لذلك والمعصية فى فعل المستاجر دون قصد رب الدار فلا اثم على رب الدار فى ذلك" (المبسوط: ۱۰/ ۳۰۹)۔

"واجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر او يتخذها كنيسة او بيت نار وامثالها فكله مكروه تحريما بشرط ان يعلم به البائع والاجر من دون الصريح به باللسان. فإن لم يعلم كان معذورًا وان علم وصرح كان داخلًا فى الاعانة المحرمة" (جواہر الفقہ، ۲/ ۴۴۵)۔

۲۔ب: کسی شخص کا انشورنس کمپنی میں ملازمت کرنا یا ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہے یا نہیں، تو جاننا چاہئے کہ یہ جائز نہیں ہے اس لیے کہ اگر چہ انشورنس کو از راہ ضرورت علماء نے جائز قرار دیا ہے، لیکن فقہاء کا اصول یہ ہے کہ جو چیز ضرورتاً جائز قرار دی جاتی ہے وہ بقدر ضرورت ہی جائز رہتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود مسلمان ہی اس کی کمپنی میں ملازمت کریں اور اس کا ایجنٹ بنیں اس لیے کہ اس کی کمپنی میں ملازمت کرنا یا ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا اعانت علی المعصیة کے قبیل سے ہے اور اعانت علی المعصیة کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے: "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان"، اس لیے اس کی کمپنی میں ملازمت کرنا اور اس میں ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا اور اس کو ذریعہ معاش بنانا جائز نہیں ہے۔

(سوال۔۲) اگر کوئی شخص شراب کی کمپنی میں ملازمت کرتا ہے اور اس کی خرید فروخت کرتا ہے تو ایسی ملازمت حرام ہے۔

''ابن عمر يقول قال رسول الله ﷺ: لعن الله الخمر وشاربها وساقيها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة إليه'' (سنن ابی داؤد، ۲/۵۱۷)۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی شخص شراب کی کمپنی میں شراب کی بوتل بنانے کی ملازمت کرتا ہے اور یہ بوتلیں صرف شراب ہی کے لیے استعمال ہوتی ہیں اور کسی کام میں استعمال نہیں ہوتیں تو پھر اس شخص کے لیے اس کمپنی میں ملازمت کرنا حرام ہے کیوں کہ یہ اعانت علی المعصیة میں داخل ہے اور وہ اس طرح سے کہ جب کمپنی والے نے اس کو ملازم رکھا تو اس نے اس بات کی صراحت کردی کہ تمہیں شراب کی بوتلیں بنانا پڑے گا گویا اس کی مثال یوں ہوئی کہ جیسے اگر صلب عقد میں متعاقدین کی طرف سے یہ صراحت آجائے اور یوں کہے کہ اس مکان کو کرایہ پر دے تاکہ میں اس میں شراب بیچوں پھر اس نے کہا میں نے اس کو کرایہ پر دیا اس صراحت کی وجہ سے نفس عقد معصیت کو متضمن ہوگیا اور یہ حرام ہے، اس طرح یہاں بھی یہ ملازمت اعانت علی المعصیة کو متضمن ہے لہٰذا اس کے لیے ایسی ملازمت کرنا حرام ہے۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص شراب کی کمپنی میں حساب وکتاب کرنے کی ملازمت کرتا ہے تو ایسی ملازمت حرام ہے جس طرح سود کے لکھنے کی ملازمت حرام ہے کیوں یہ اعانت علی المعصیة ہے۔

البتہ اگر کوئی شخص شراب کی کمپنی کو ایسے اجزاء پیش کرتے ہیں جس سے شراب بغیر کسی تغیر وتبدیلی کے بنائی جاتی ہے تو یہ مکروہ تحریمی ہے اور اگر تغیر کے بعد اس سے شراب بنائی جاتی ہے تو وہ مکروہ تنزیہی ہے۔

"وان كان سببا بعيدا بحيث لاتفضي إلى المعصية على حالته الموجودة بل يحتاج إلى احداث صنعة فيه كبيع الحديد من اهل الفتنة وامثالها فتكره تنزيها۔" (جواہر الفقہ، ۲/۴۵۵)۔

۳۔(الف):

سپر مارکیٹ میں ملازمت کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں، کیوں کہ اس طرح کے مارکیٹ میں مختلف شعبے ہوتے ہیں جس میں ضروریات زندگی کی مختلف چیزیں فروخت کی جاتی ہیں، مثلاً اشیاء خوردنی کے سامانوں کا شعبہ، کپڑوں کا شعبہ، میڈیکل کا شعبہ اسی طرح اس کے ایک حصے میں شراب کا بھی شعبہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس طرح کے مارکیٹ میں ملازمت کرتا ہے تو اس میں ملازمت کرنے کی مختلف صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ ایسی ملازمت کررہا ہے جو پورے مارکیٹ کو محیط ہے یعنی کہ پورے مارکیٹ کا حارس ہے یا پورے مارکیٹ کے آمد وخرچ کا حساب کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسی ملازمت کررہا ہے جن کا تعلق صرف ایک شعبہ سے ہے مثلاً وہ کپڑوں کے شعبے میں کپڑا فروخت کرنے کی ملازمت کرتا ہے، یا میڈیکل کے شعبہ میں دوا فروخت کرنے کی ملازمت کرتا ہے یا اس کے علاوہ کسی دوسرے خاص شعبے میں ملازمت کرتا ہے، ان تمام ملازمتوں کے حکم کی اصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح کے مارکیٹ میں شراب یا حرام اشیاء سے احتراز کرتے ہوئے جائز ضروریات زندگی کی فروخت کرنے کی یا حساب وکتاب کرنے کی ملازمت کرتا ہے اور اس شخص کا حرام اشیاء کے فروخت کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر ان کے لیے اس مارکیٹ میں ملازمت کرنا درست ہے۔ جہاں تک یہ بات ہے کہ اس مارکیٹ میں ملازمت کرنے کی صورت میں من جملہ شراب بیچنے والوں کو تقویت ملے گی تو اتنی سی تعاون کی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت یوسف کے فرعون کے وزارت خزانہ کو قبول کرنے کی صورت میں ظاہراً کافروں کے ساتھ تعاون ہورہا تھا لیکن جس طرح وہاں اتنی سی تعاون کو برداشت کیا گیا اسی طرح یہاں ضمناً تعاون کو برداشت کیا جائے گا۔ البتہ شراب کے شعبہ میں شراب فروخت کرنے کی ملازمت کرنا حرام ہے، کیوں کہ شراب بیچنے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے: "لعن رسول الله في الخمر عشرة عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة إليه وساقيها وبائعها واكل ثمنها والمشترى لها والمشتراة"۔

۳۔(ب):

بلاشبہ تدریس ایک معزز پیشہ ہے، جس کا انسانی شخصیت کی تعمیر سے گہرا تعلق ہے، لیکن موجودہ دور میں اولاً تو مخلوط تعلیم کے نظام کا غلبہ ہے جو مستحسن نہیں ہے اس لیے کہ شریعت کا اصل حکم یہ ہے کہ نامحرم مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے پرہیز کیا جائے خاص طور پر ایسی ملازمت اختیار کرنا جس میں نامحرم خواتین کے ساتھ مستقل میل جول ہو بغیر ضرورت کے جائز نہیں، لہٰذا حکومت اور مسلم معاشرہ کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ مخلوط تعلیم کے بجائے لڑکوں کے لیے الگ اور لڑکیوں کے لیے الگ تعلیمی ادارے قائم کریں اور مناسب یہ ہے کہ دونوں کے اساتذہ ان ہی کے جنس سے ہوں لیکن چونکہ موجودہ دور میں مخلوط تعلیم اتنا عام ہو چکا ہے، وہ ایک ضرورت بن کررہ گیا ہے اس لیے اگر مرد اساتذہ کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ ہو تو مرد اساتذہ کے لیے اس شرط کے ساتھ تعلیم دینا جائز ہے کہ حتی الامکان اپنے آپ کو بے پردہ نامحرم خواتین سے دور رکھیں اور پڑھاتے وقت اپنی نگاہ کو نیچی رکھیں اور اپنی نگاہ اور اپنی دل کی حفاظت کریں۔

"وينبغي أن يكون القائم بتعليم الإناث امراة صالحة لهذه المهنة فاذا تعذر ذلك فلا بأس بالرجل الكفوء الامين التقي الورع، لأن وجود الرجل مع جماعة النساء لايتحقق به الخلوة المحرمة شرعا ان النبي ﷺ وعظ النساء وكان معه بلال وقد جاء في صحيح البخاري "أن رسول الله خرج ومعه بلال فظن أنه لم يسمع النساء فوعظهن وأمرهن بالصدقة فجعلت المرأة تلقي بالقرط والخاتم، وبلال ياخذ في طرف ثوبه۔"

وفي صحيح مسلم ان النبي ﷺ قال: لايخلون رجل بامراة إلا ومعها ذومحرم قال الامام النووي في شرح هذا الحديث ...... وكذا لو اجتمع رجال بامراة اجنبية فهو حرام، بخلاف مالو اجتمع رجل بنسوة اجانب فان الصحيح جوازه" (المفصل فی احکام المراۃ، ۲۵۷، ۲۵۶)۔

اسی طرح لڑکوں کی مخصوص درسگاہوں میں مرد اساتذہ ہی تعلیم کا فریضہ انجام دیں لیکن اگر مرد اساتذہ نہ مل رہے ہوں اور اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ ہوں اور خواتین اساتذہ تعلیم دیں تو اس شرط کے ساتھ تعلیم کا فریضہ انجام دے سکتی ہیں کہ وہ اس طور پر حدود شرعیہ میں رہے کہ اس کی عزت وعفت پر داغ نہ آئے اور حجاب شرعی کے آداب کی رعایت کرتے ہوئے وہ تدریس کی خدمت انجام دے رہی ہو تو پھر اس کا یہ عمل اور ملازمت درست ہوگا ورنہ نہیں نیز وہ حصہ کھلنے نہ پائے

جن کا اجنبی مردوں کا دیکھنا حرام ہے۔

’’ویجوز للمرأة ان تتولی تعلیم الرجال الاجانب بشرط عدم وجود البدیل من الرجال وبشرط التزامها الحجاب والادب الشرعی فی تعلیم الرجال الاجانب والله اعلم ولا فرق بین الحقیقة والصورة من حیث کشف مالا یجوز النظر إلیه من الرجال الأجانب‘‘ (مجموعة الفتاوی الشرعیه، ۸/ ۳۴۹)۔

۳۔(ج):

وکالت ایک عقد اجارہ ہے، اگر اجارہ میں عمل یا وقت اور اجرت کی تعیین ہوجائے، نیز وہ عمل معصیت نہ ہو اور ان طاعات میں سے بھی نہ ہو جن پر اجرت لینا ناجائز ہو تو اجارہ درست ہے، اسی طرح اگر وکالت میں امور مذکورہ کا لحاظ کیا جائے یعنی اگر سچے مقدمات میں باقاعدہ کام اور اجرت معین کرکے وکالت کی جائے اور کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب نہ کیا جائے تو اس طرح سے وکالت کا پیشہ اختیار کرنا جائز ہے، اور جس وکالت میں معصیت پر اجر لیا جائے یعنی چھوٹے اور ناحق مقدمہ کی پیروی کی جائے اور ظالم کی اعانت کی جاوے ایسی وکالت اور اس کی آمدنی ناجائز ہے: ”لا یجوز أخذ الاجرة علی المعاصی کالغناء والنوح والملاهی؛ لأن المعصیة لایتصور استحقاقها بالعقد فلا یجب علیه الاجر، وان إعطاء الاجر او بعضه، لایحل له ویجب علیه رده۔ (مجمع الانھر، ۱/ ۳۸۴)۔“

لہٰذا اب اگر کوئی شخص مظلوم کو انصاف دلانے کے مقصد سے اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانے کا ارادہ ہو تو اس شخص کے لیے وکالت کا پیشہ اختیار کرنا جائز ہے تاکہ مسلمانوں کی وکالت ہوسکے۔”الاصل فی الوکالة الاباحة قد تصح مندوبة إن کانت إعانة علی مندوب وقد تصیر مکروهة إن أعانت علی مکروہ وقد تکون حراما إن أعانت علی حرام وقد تکون واجبة إن دفعت ضررًا عن المؤکل۔

تصح الوکالة بأجر وبغیر أجر، لأن النبی ﷺ کان یبعث عماله لقبض الصدقات، ویجعل لهم عمولة ولهذا قال له أبناء عمه لو بعثنا علی هذه الصدقات، فنؤدی مایؤدی الناس ونصیب مایصیب الناس، أی العمولة، ولأن الوکالة عقد جائز لایجب علی الوکیل القیام فیجوز أخذ الاجرة فیها بخلاف الشهادة“ (الفقه الاسلامی وادلته، ۵/ ۴۰۵۸)۔

(۳) اگر سچ مقدمات لیتا ہو اور کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب اس میں نہ کرنا پڑتا ہو تو پیشہ وکالت جائز ہے اور جو آمدنی خلاف شرع طریقہ پر حاصل کی جائے گی وہ حرام ہوگی (فتاویٰ محمودیہ، ۱۳/ ۴۰۲)۔

اس طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے وکالت کے جواز کے ایک لمبے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا جس کا حاصل یہ ہے وکالت کا پیشہ فی نفسہ جائز ٹھہرا، مگر شرط یہ ہے کہ سچے مقدمات لیتا ہو۔(امداد الفتاویٰ، ۳/ ۳۲۰)۔

(د) انسان کے وجود کے بارے میں اسلام کا تصور ہے کہ وہ خود ایک امانت ہے اس کے لیے اپنے جسم میں وہی تصرف جائز اور درست ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہو وہ اپنے منشاء و مزاج کے مطابق خود اپنے جسم کو نقصان پہنچانے یا اس میں تغیر و تبدل کرنے کا مزاج نہیں، اپنے آپ کی حفاظت اس کا شرعی فریضہ ہے اور صحت جسمانی کو برقرار رکھنے کی امکان بھر سعی تقاضاء امانت کے تحت اس کی ذمہ داری ہے اور انسان پر اپنے جسم کی حفاظت شرعی فریضہ ہے تو دوسرے لوگوں کے جسم کی حفاظت کی ذمہ داری تو بدرجہ اولیٰ ہوگی اور فن طب چوں کہ ایک ایسا فن ہے جن کو علماء اسلام نے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا اور اطباء چوں کہ صحت انسانی کی حفاظت جیسا اہم فریضہ اور عظیم الشان خدمت انجام دیتے ہیں اس لیے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک ہیں۔ ہمدردی و بہی خواہی صبر و حلم، اجتماعی مفادات کا خیال اور اپنے فن میں بصیرت مندی و حاضر دماغی، مریضوں سے اچھا برتاؤ، خدمت خلق کا جذبہ اور شریعت کی قائم کی ہوئی حدود پر استقامت طبیب کے لیے متاع اولین کا درجہ رکھتے ہیں اور جب طبیب کی اتنی بڑی ذمہ داری ہے تو اب ایسے ہاسپٹلوں میں پیشہ طبابت اختیار کرنا جہاں بلاوجہ آپریشن یا ٹیسٹ لکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے کیوں کر درست ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب واقعی آپریشن کی ضرورت ہو بھی تو ڈاکٹر کے لیے اس وقت تک آپریشن کرنا جائز نہیں ہے جب تک کہ خود وہ یا اس کے اولیاء اجازت نہ دے دیں چنانچہ اگر کسی ڈاکٹر نے بلا اجازت آپریشن کیا یا کوئی ایسا طریقہ علاج اختیار کیا جو امکانی طور پر ہلاکت کا باعث ہوسکتا ہے اور مریض کی جان چلی گئی یا اس کا کوئی عضو جاتا رہا تو معالج پر اس کی ذمہ داری ہوگی۔تو پھر ایسے شخص کے لیے آپریشن یا ٹیسٹ لکھنا جن کو

آپریشن کی ضرورت نہ ہو کیسے درست ہوسکتا ہے۔

اسی طرح آج کل ہاسپیٹلوں میں مرد ڈاکٹر کو خاتون مریض اور خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے ایسے علاج پر مجبور کیا جاتا ہے جس کا تعلق قابل ستر حصے سے ہے تو ایسے ہاسپیٹلوں میں پیشہ طبابت جائز ہے یا نہیں تو جاننا چاہئے کہ اصل یہ ہے کہ اگر ماہر فن خاتون ڈاکٹر موجود ہو تو اسی کے ذریعہ بیمار خاتون کا علاج ضروری ہوگا، اگر وہ موجود نہ ہو تو قابل اعتماد غیر مسلم خاتون ڈاکٹر سے علاج کرایا جائے گا، وہ بھی نہ ہو تو مسلم مرد ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے گا، وہ بھی اگر موجود نہ ہو تو غیر مسلم مرد ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی جائیں گی، البتہ مرض کی تشخیص اور علاج میں صرف اسی قدر حصہ دیکھنا درست ہوگا جس قدر ضروری ہو، اس سے زائد حصہ کھولنے کی اجازت نہیں ہوگی، بہ قدر استطاعت نگاہ نیچی رکھنا بھی ضروری ہوگا نیز مرد ڈاکٹر کے ذریعہ خاتون مریض کے علاج کے وقت مریضہ کے کسی محرم، یا شوہر یا کسی معتمد شخص کی موجودگی ضروری ہوگی، تاکہ خلوت کا خدشہ نہ رہے۔

''ویجوز للطبیب ان ینظر الی موضع المرض منها اما اذا کان المرض فی سائر بدنها عند الفرج فانه یجوز له النظر الیه عند الدواء لانه ضرورة وان فی موضع الفرج .... فینبغی ان یعلم امراة تداویها فإن لم یوجد امراة تداویها خافوا علیها ان یهلك او یصیبها بلاء او وجع لایحتمل ستروا منها کل شئ إلا موضع العلة ثم یداویها الرجل ویغض بصره ما استطاع الا من موضع المرض وکذلك نظر القابلة والختان'' (الجوهرة النیرة، ۴/ ۱۶۸)۔

لہٰذا ایسے ہاسپیٹلوں میں جہاں مرد ڈاکٹر کو خواتین مریض یا خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے علاج پر مجبور کیا جاتا ہو درست نہیں ہے، کیوں کہ مرد کا عورتوں کے قابل ستر حصے کو دیکھنا یا عورت کا مرد کے شرمگاہ کو دیکھنا حرام ہے اور چوں کہ اس میں کوئی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ وہ اس طرح کی ملازمت چھوڑ کر اپنا کلینک کھول سکتا ہے اور اس میں اس عظیم الشان خدمت کو انجام دے سکتا ہے۔

۳۔ موجودہ سماج میں ہوٹل ایک ضرورت بن گئی ہے تاکہ مسافروں کی ضرورت پوری ہوسکے لیکن آج کل بڑے بڑے ہوٹلوں میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو شرعاً حرام ہیں۔ مثلاً شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام وغیرہ اب اگر کوئی شخص اس طرح کے ہوٹل میں ملازمت کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ یہ شخص مسافروں کو شراب کی بوتل لاکر پیش کرتا ہے یا حرام غذا مسافروں کے سامنے رکھتا ہے یا ان کے علاوہ دوسری حرام چیزوں کی فراہمی کرتا ہے جس سے اس شخص کا براہ راست تعلق ہے تو پھر اس شخص کے لیے ایسی ملازمت کرنا حرام ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص ایسے ہوٹلوں میں واچ مین کا کام کرتا ہے صفائی کا کام کرتا ہے یا ان کے علاوہ دوسرا کام جس کا تعلق براہ راست حرام چیزوں کی فراہمی سے نہیں ہے تو پھر اس کے لیے ملازمت کرنا درست ہے، کیوں کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور اصولیین کا قاعدہ ہے: "الاصل فی الأشیاء الإباحة" کہ اشیاء میں اصل مباح ہونا ہے اور چوں کہ اس ملازمت میں کوئی مانع نہیں ہے لہٰذا یہ ملازمت جائز ہے۔ اسی طرح تفریح امر مطلوب ہے اور ہوٹل امر مطلوب کا ذریعہ ہے لہٰذا یہ بھی مطلوب ہوگا اور جب مطلوب شئ ہے تو پھر اس میں ملازمت جائز ہے جب کہ مانع نہ پایا جائے۔

....

مختلف شعبوں میں ملازمتوں کے شرعی احکام

مولانا محمد جاوید کوثر[1]

ا۔(الف):

فوج کا اصل کام ملک کی حفاظت اور امن وامان کو قائم رکھنا ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے۔ حدود وقصاص اور تعزیرات کی شروعیت اسی مقصد کے پیش نظر ہوئی ہے۔ اس جہت سے فوج کی ملازمت فی نفسہ نہ صرف مباح، بلکہ مطلوب ہے، لیکن جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ فوج کی ملازمت میں کچھ مفاسد بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً بعض اوقات فوج کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کئے بغیر وار کرنا پڑتا ہے، بعض دفعہ ایک مسلمان فوجی کا مد مقابل مسلمان ہی ہوتا ہے تو کیا ان مفاسد کے باوجود ایک مسلمان کے لیے فوج کی ملازمت جائز ہوگی؟ تو ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ غور طلب بن جاتا ہے، لیکن شریعت کے مزاج اور درج ذیل فقہی قواعد ونظائر کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کیلئے حصول مال وزر کے بجائے قیام امن وامان اور تحفظ جان ومال کے ارادے سے اس ملازمت کو اختیار کرنا جائز ہونا چاہئے:

ا۔ فقہ کا قاعدہ ہے: "کم من شئی یثبت ضمنا لا یثبت قصدا" (عینی حاشیہ ہدایہ ثالث ۵۲)، "یفتقر فی الشئی ضمنا مالا یفتقر قصدا" (الاشباہ والنظائر ۱۸۶)۔

یعنی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا ارتکاب قصداً تو جائز نہیں، مگر دوسرے امر مقصود کے ضمن میں اگر بطور لزوم ارتکاب کرنا پڑے تو گوارا کرلیا جاتا ہے، فقہ میں اس کے بہت سے نظائر پائے جاتے ہیں۔

اس فقہی قاعدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر فوج کی ملازمت سے اصل مقصد امن وامان کا قیام ہو، مال وزر کا حصول نہ ہو تو اصل مقصود کے شرعاً مطلوب ہونے کی بنا پر اس کی اجازت ہونی چاہئے۔

۲۔ فوج کی ملازمت یقیناً کچھ مضرتوں کو شامل ہے، لیکن مسلمانوں کا اس ملازمت سے کنارہ کش ہوجانا ان سے کہیں شدید تر مضرتوں کا باعث ہے، کیونکہ اگر فوج میں مسلم نمائندگی نہیں ہوگی تو جہاں ایک طرف مسلمانوں کے لیے معاش کی ایک بڑی راہ مسدود ہوجائے گی وہیں دوسری طرف انہیں فرقہ پرستوں، بلکہ خود فوج کی زیادتی وبربریت کا شکار ہونا پڑے گا، بعض فرقہ وارانہ فسادات میں اس کا مشاہدہ بھی کیا جاچکا ہے، خصوصاً ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہیں اور اس ملک کو ہندوراشٹر بنادینا چاہتے ہیں، جس کے لیے دیگر شعبے کے افراد کے ساتھ ساتھ فوج کی بھی ذہن سازی کی جارہی ہے۔ اگر مسلمانوں کی معتد بہ تعداد اس ملازمت کو اختیار نہیں کرے گی تو نہ صرف ان کے جان ومال، بلکہ اسلامی اقدار وروایات کو بھی شدید خطرہ لاحق ہوجائے گا اور فقہ کا قاعدہ ہے:

"لو کان أحدهما أعظم ضررا من الآخر فان الاشد یزال بالأخف" (الاشباہ والنظائر ۱۴۵)۔

"وان تقديم المصالح الراجحة على (المفاسد) المرجوحة محمود حسن وأن درأ المفاسد الراجحة على المصالح المرجوحة محمود حسن" (قواعد الاحکام، ۷)۔

لہٰذا ان قواعد کی بنیاد پر ضرر اشد کو دور کرنے کے لئے ضرر اخف کو برداشت کرتے ہوئے فوج کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہونا چاہئے۔

سوال: ا۔(ب):

پولیس کا بنیادی مقصد اپنے متعلقہ علاقہ کی دیکھ بھال، وہاں امن وامان قائم رکھنا، مظلوموں کی اعانت اور ظالموں کو ظلم سے روکنا ہے، اگر کہا جائے کہ آپ

---

[1] متعلم المعهد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جامع ارشاد "انصر أخاك ظالما أو مظلوما" کے ذریعہ جس عمل کی تعلیم دی ہے وہی پولیس کا اصل کام ہے تو شاید بے جانہ ہوگا، اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے پولیس کی ملازمت اختیار کرنا فی نفسہ نہ صرف مباح، بلکہ مطلوب ہوگا، جہاں تک یہ خیال ہے کہ اس ملازمت کی وجہ سے اچھا انسان بھی بدزبان اور ظلم وجور کا خوگر بن جاتا ہے تو یہ کوئی لازمی شئی نہیں ہے، بہت سی ایسی مثالیں بھی ہیں جو اس خیال کی تردید کرتی ہیں، البتہ کچھ دوسرے مفاسد جن میں سے بعض کا ذکر سوال میں موجود ہے ضرور پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ سوال سامنے آتا ہے؟ مسلمانوں کیلئے اس شعبے کی ملازمت جائز ہوگی یا نہیں؟ لیکن درج ذیل دلائل کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ظلم وجور کی روک تھام اور امن وامان کے قیام کی غرض سے اس ملازمت کو اختیار کرنا جائز ہونا چاہئے۔

۱۔ پولیس کا اصل مقصود شرعاً مطلوب ہے، اس امر مطلوب کے ضمن میں بعض مفاسد کا ارتکاب بطور لزوم کرنا پڑتا ہے اور فقہ کا قاعدہ ہے کہ اگر امر مطلوب کے ضمن میں کچھ امور کا ارتکاب بطور لزوم کرنا پڑے تو اسے گوارہ کرلیا جاتا ہے: "كم من شئی يثبت ضمنا لا يثبت قصدا" (عینی حاشیہ ہدایہ ثالث ۱۸۶)۔

۲۔ بہت سے ایسے مقامات پر جہاں پولیس میں افراد نہیں تھے یا نہ کے برابر تھے وہاں پولیس کا غیروں کی پشت پناہی کرنا بلکہ ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی جان واملاک کو تباہ کرنا، بہت سے کیس میں بے قصور مسلمانوں کو محض تعصب کی بنیاد پر مورد الزام ٹھہرانا اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ مسلمانوں کا پولیس کے شعبے سے کنارہ کش ہوجانا ایسے مفاسد اور نقصانات کا باعث ہے جو ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں پائے جانے والے مفاسد ونقصانات سے عام بھی ہیں اور شدید تر بھی اور اصول یہ ہے: "يتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام" "اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما"۔

لہٰذا ان اصول وقواعد کی روشنی میں جبر وتشدد کی روک تھام اور امن وامان کے قیام کی غرض سے مسلمانوں کے لیے پولیس کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا، البتہ ضروری ہوگا کہ خلاف شرع امور کے ارتکاب سے حتی المقدور پرہیز کریں، جن امور کا ارتکاب بدرجہا مجبوری کرنا پڑے انہیں دل سے برا سمجھیں اور اللہ سے توبہ واستغفار کرتے رہیں۔

ج۔ مخبری کا نفس جواز خود حدیث سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ مکہ میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سازشوں کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔

اس جہت سے بھی مخبری کا جواز ثابت ہوتا ہے کہ اہم مقاصد دین پانچ ہیں: (۱) تحفظ دین (۲) تحفظ نفس (۳) تحفظ عقل (۴) تحفظ عرض (۵) تحفظ مال۔ ان میں سے اکثر کیلئے مخبری معین، بلکہ ایک حد تک ضروری ہے، جہاں تک یہ سوال ہے کہ اس ملازمت میں تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہاں تجسس شبہ مضرت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور شبہ مضرت کی بناء پر تجسس جائز ہے، مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

البتہ اگر کسی سے مضرت کے پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے اس مضرت رساں کی تدبیروں اور ارادوں کا تجسس کرے تو جائز ہے۔ (بیان القرآن سورہ حجرات)۔

اسی طرح غیبت کا ارتکاب دفع مضرت کی غرض سے کیا جاتا ہے اور اس کی بھی شرعاً اجازت ہے، علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

"إذا كان الرجل يصوم ويصلي ويضر الناس بيده ولسانه فذكره بما فيه ليس بغيبة حتى لو اخبر السلطان بذلك ليزجره لا اثم عليه" (الدر المختار مع الرد، ۹/ ۵۸۵)۔

"قال العلماء: تباح الغيبة في كل غرض صحيح شرعا حيث يتعين طريق إلى الوصول إليه بها كالتظلم ... واعلام من له ولاية عامة بسيرة من هو تحت يده" (فتح الباری کتاب الادب، ۱۰/ ۵۲۸)۔

جب نفس مخبری کا جواز حدیث سے ثابت ہے اور جس قسم کے تجسس وغیبت کا ارتکاب اس میں کرنا پڑتا ہے شرعاً اس کی اجازت ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس شعبے کی ملازمت ناجائز ہو، اس لیے مخبری اور انٹیلیجنس کے شعبہ کی ملازمت جائز ہوگی۔

د۔ عدالتوں کے قیام کا اصل مقصد انصاف کی فراہمی، ظلم وحق تلفی کی روک تھام اور نزاعات کو فیصل کرنا ہے، لیکن ہمارے ملک کا دستور سیکولر ہے، اس کے بہت

سے قوانین شریعت اسلامی سے متصادم ہیں، عدلیہ کی ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں ان قوانین کی تطبیق دیتے ہوئے بہت سے منصوص احکام کے خلاف فیصلوں میں شریک اوران کی تنفیذ کا ذریعہ بننا پڑے گا، اس لحاظ سے اصولی طور پر یہ ملازمت درست نہیں ہوگی، لیکن مسلمانوں کی نسبت سے عدلیہ کے رویے کو دیکھتے ہوئے اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اگر مسلمان اس ملازمت سے کنارہ کش ہوجائیں گے تو اسلام کے موجودہ آثار واقدار اور مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی اور قومی مفادات کو شدید خطرات لاحق ہوجائیں گے اوران کا تحفظ انتہائی دشوار ہوجائے گا اور مسلمان اس ملک میں ہر اعتبار سے مفلوج ومجبور ہوکر رہ جائیں گے، اس لیے اس اہم تر مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے دفع مضرت کی غرض سے عدلیہ کی ملازمت نہ صرف جائز ہوگی، بلکہ اس کے حصول کی کوشش کی جائے گی، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصلحت کے پیش نظر حکومت کافرہ کی وزارت کو طلب فرمایا تھا۔

کتب فقہ میں بھی اس کے نظائر ملتے ہیں، مثلاً درمختار میں ہے: "ویوجر من قام بتوزیعها بالعدل وإن کان الأخذ باطلا" (الدر مع الرد، ۳/۲۸۰)۔

علامہ شامی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے: قوله "ویوجر من قام بتوزیعها بالعدل" أی بالمعادلة کما عبر فی القنیة أی بأن یحمل کل واحد بقدر طاقته، لأنه لو ترك توزیعها إلی الظالم ربما یحمل بعضهم جمالا یطیق فیصیر ظلما علی ظلم ففی قیام العارف بتوزیعها بالعدل تقلیل للظلم فلذا یوجر" (رد المحتار باب العشر، ۳/۲۸۰)۔

جس طرح اس مسئلہ میں طریق وصولیابی کے باطل ہونے کے باوجود تقلیل ظلم کے پیش نظر تقسیم کی ذمہ داری کو قبول کرنے کی اجازت دی گئی ہے، بلکہ اسے قابل اجر قرار دیا گیا ہے اسی طرح عدلیہ کی ملازمت بھی مفسدہ کے باوجود دفع مضرت کی غرض سے جائز ہوگی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، عدلیہ کی مختلف ملازمتوں سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

پس فی نفسہ حرام ہونے کے بعد ان کو اگر جلب منفعت مالیہ یا جاہیہ کی غرض سے اختیار کیا جاوے تو کسی حال میں جائز نہیں اور اگر دفع مضرت کی غرض سے کیا جاوے کہ امت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم ومضرات پہنچے یہ اہل مناصب بقدر امکان ان کو اگر دفع کرسکیں تو اس صورت میں حکم جواز کی گنجائش ہے۔ (امداد الفتاویٰ، ۳/۴۰۹، ۴۰۸)۔

البتہ ضروری ہے کہ دل میں غیر اسلامی قانون کی طرف سے نفرت اور اسلام کی برتری کا کامل یقین ہو اور شریعت سے متصادم قوانین کی تطبیق وتنفیذ کو مجبوری کے طور پر گوارہ کیا جائے۔

ھ۔ ہمارے ملک میں انکم ٹیکس کا فیصد بہت زیادہ ہے، یہ بسا اوقات ۸۰ فیصد تک پہنچ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایک شخص کی کمائی کا اتنا بڑا حصہ اجتماعی مفاد کے نام پر وصول کرلینا جبکہ وہ شخص سیل ٹیکس، بلدیہ کا ٹیکس وغیرہ علیحدہ ادا کرتا ہو سراسر ظلم ہے، پھر اس وصول شدہ رقم کا بڑا حصہ عوامی فلاح پر صرف کرنے کے بجائے حکمرانوں کی بے جا عیش پرستی کی نذر کردینا ظلم بر ظلم ہے اور اس شعبے کی ملازمت اختیار کرنا تعاون علی الظلم ہے جو کہ نص قطعی "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (مائدہ: ۲) اور "فلن أکون ظهیرا للمجرمین" (سورۂ قصص) کی رو سے حرام ہے۔

مزید یہ کہ انکم ٹیکس کے لیے بسا اوقات لوگوں کے ذاتی معاملات واملاک کے سلسلے میں تجسس کرنا پڑتا ہے اور تجسس بھی نص قرآن "ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا" (الحجرات: ۱۲) کی بنیاد پر حرام ہے اور ظاہر ہے کہ اس ملازمت کے حوالے سے کسی قسم کی ضرورت وحاجت نہیں پائی جاتی، اس لیے اس شعبے کی ملازمت تعاون علی الظلم اور تجسس حرام پر مبنی ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے۔

۲۔ (الف) اگلے کئی سوالوں کا تعلق اعانت علی المعصیت اور تسبب للمعصیہ سے ہے جو نص قرآنی سے حرام ہے۔

"ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (المائدہ: ۲) "فلن أکون ظهیرا للمجرمین" (القصص: ۱۷)۔

لیکن اعانت اور تسبب کے مختلف درجات ہیں، اگر حرمت کا حکم ان تمام کو عام رکھا جائے تو اکثر مباحات اس کی زد میں آجائیں گے اور معاملہ شدید تنگی، حرج، بلکہ تکلیف مالا یطاق تک پہنچ جائے گا، حضرت مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں:

"لا یخفی ان العون والاعانة والتسبب بشئی أمر واسع، یضیق عنه نطاق الحصر وله درجات متفاوتة قربا

وبعدا فاطلاق الحرمة على جميعها مطلقا يلتحق بتكليف مالا يطاق، فإن مكاسب الإنسان كلها ينتفع بها كل إنسان برا كان أو فاجرا لا يمكن التحرز عنه" (احکام القرآن، ۳/ ۷۵)۔

اس لیے پہلے اس اعانت وتسبب کی وضاحت ناگزیر ہے جو مذکورہ بالا نصوص کا مصداق ہیں اور شرعاً حرام ہیں، اس سلسلے میں اس تحقیق کا خلاصہ نقل کرتا ہوں جس کو مفتی شفیع صاحب نے اپنے رسالہ "تفصیل الکلام فی مسئلۃ الاعانۃ علی الحرام" میں فقہاء کی تصریحات کو سامنے رکھ کر تحریر فرمایا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جو اعانت شرعاً حرام ہے وہ ہے جس میں معصیت کا قصد وارادہ حقیقتاً یا حکماً پایا جاتا ہو۔ حقیقتاً کا مفہوم یہ ہے کہ احد المتعاقدین نے صلب عقد میں ہی معصیت کی تصریح کردی یا تصریح تو نہ کی ہو، لیکن معصیت پر اعانت کا ارادہ کر رکھا ہو اور حکماً کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عمل ایسا ہو جس معصیت کیلئے متعین ہو، جیسے آلات موسیقی وغیرہ کا بنانا اور بیچنا، اگر معصیت کا ارادہ نہ حقیقتاً پایا جائے اور نہ حکماً تو پھر عنایت علی المعصیۃ کا تحقق نہیں ہوگا (تفصیل الکلام فی مسئلۃ الاعانۃ علی الحرام ملحق بجواہر الفقہ، ۲/ ۴۴۷)۔

اعانت سے قریب قریب ایک دوسری چیز تسبب، یعنی معصیت کا سبب اور ذریعہ بننا ہے، تسبب کی تفصیل یہ ہے کہ سبب کی اولاً دو قسمیں ہیں: (۱) سبب قریب (۲) سبب بعید، پھر سبب قریب کی دو قسمیں ہیں (۱) سبب قریب محرک (۲) سبب قریب موصل، گویا سبب کی کل تین قسمیں ہوگئیں۔

(۱) سبب قریب محرک: ایسا سبب جو معصیت کا باعث ہو کہ اگر یہ سبب نہ ہوتا تو بظاہر معصیت کا صدور ہی نہ ہوتا، جیسے معبودانِ باطلہ کو برا بھلا کہنا معبود حقیقی پر کفار کی زبان درازی کا سبب محرک ہے۔

(۲) سبب قریب موصل: ایسا سبب جو معصیت کے لیے محرک وداعی تو نہ ہو، لیکن معصیت تک پہنچانے والا ہو اور اس کا تعلق معصیت سے براہ راست ہو، اس طرح کہ اس سے معصیت کے متعلق ہونے کے لیے کسی دوسرے عمل کی ضرورت نہ ہو، جیسے مسلمانوں سے برسرِ پیکار دشمنوں کے ہاتھوں ہتھیار فروخت کرنا، علم کے باوجود ایسے سبب کا ارتکاب کرنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر لاعلمی میں صدور ہوجائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

(۳) سبب بعید: ایسا سبب جو اپنی حالت پر باقی رہتے ہوئے موصل الی المعصیۃ نہ ہو، بلکہ اس سے معصیت کے متعلق ہونے کیلئے کسی دوسرے عمل کی ضرورت پڑے۔ جیسے انگور کی بیع ایسے شخص سے جو اس سے شراب تیار کرے، ایسا معاملہ بلا کراہت جائز ہے، البتہ معصیت کے علم کے بعد مکروہ تنزیہی ہے (تفصیل الکلام فی مسئلۃ الاعانۃ علی الحرام ملحق بجواہر الفقہ ۲/ ۴۴۴۔۴۴۶)۔

اور ایسے امور جن کا تعلق معصیت سے انتہائی دور دراز کا ہے انہیں برتنا بلا کراہت جائز ہے۔

"فالقسم الثالث أهدرتها الشريعة عن الاعتبار إلا اذا الحق به نية الاعانة فى المعصية أو صراحته فى صلب العقد" (احکام القرآن، ۳/ ۴۸۰)۔

اس تفصیل کے بعد اصل جواب یہ ہے کہ بینک کی ملازمت کے جواز وعدم جواز کا مدار اس پر ہے کہ اس ملازمت کا علاقہ سودی کاروبار سے ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس نوعیت کا ہے، لہٰذا بینک کی ایسی ملازمتیں جو سودی کاروبار پر تعاون یا سبب قریب محرک کے زمرے میں آتی ہیں وہ حرام ہیں، جو سبب قریب موصل کے درجے میں آتی ہیں وہ مکروہ تحریمی ہیں اور جو سبب بعید کے درجہ رکھتی ہیں وہ مکروہ تنزیہی ہیں اور جو ملازمتیں ان میں سے کسی بھی درجے میں نہیں آتیں بلکہ ان کا تعلق سودی کاروبار سے انتہائی دور دراز کا ہے وہ بلا کراہت مباح ہیں۔

مثلاً بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت ایسے امور ہیں جن کا سودی کاروبار سے مذکورہ تفصیل کے مطابق نہ تو تعاون کا علاقہ ہے اور نہ تسبب حرام کا جب تک کہ معصیت کا قصد وارادہ نہ کیا جائے، اس لیے یہ ملازمتیں جائز ہوں گی۔

"قطاع الافتاء والبحوث الشرعيه کویت" نے بھی اس طرح کی ملازمت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے:

"ان العمل فى البنوك والمؤسسات التى يقوم نظامها الأساسى على الاقراض بفائدة إذ كان فى مجال الوظائف التى يقوم عليها الربا مباشرة من الاقراض والاقتراض وكتابة عقوده ووثائقه والشهادة عليه وكفالته وحسابه وتحصيله واعتماده والمطالبة به قانونيا ونحو ذلك فإنه حرام، أما الأعمال الأخرى التى لا علاقة لها بالربا

مباشرة كالحساب الجارى والشيكات والحوالات وأعمال الحراسة والنظافة والمراسة فإنها جائزة مع الكراهة"(مجموعة الفتاوی الشرعیہ،۹/۱۶۱)۔

اسی طرح بینک کے مکان کی تعمیر کا کام بھی سودی کاروبار کے لیے قصد وارادہ کے بغیر تعاون یا تسبب کا درجہ نہیں رکھتا، اس لیے یہ ملازمت بھی جائز ہوگی اس کی نظیر یہ ہے کہ فقہاء نے کنیسہ کی تعمیر کی ملازمت کو جائز قرار دیا ہے۔"عیون المسائل فی الفروع الحنفیہ" میں ہے:

''ولو ان رجلا اجر نفسه ليعمل فى الكنيسة فيعمرها بالأجر فلا باس به۔''

اسی طرح شامی میں ہے:

''وجاز تعمير كنيسة قال فى الخانية: ولو أجر نفسه ليعمل فى الكنيسة ويعمرها لا بأس به؛ لأنه لامعصية فى عين العمل''(ردالمحتار،۹/ ۵۶۲)۔

البتہ سودی کاروبار کے قیام وبقاءاور فروغ کے ارادے سے ان ملازمتوں کو اختیار کرنا تعاون علی المعصیۃ ہونے کی بناپر حرام ہوگا۔

اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا سودی کاروبار کیلئے سبب قریب موصل کا درجہ رکھتا ہے، اس لیے جانتے بوجھتے بینک کو مکان کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی ہوگا اور اگر اس کے ساتھ قصد وارادہ بھی داخل ہوگیا تو حرام ہوگا، جیسا کہ مفتی شفیع صاحب نے شراب کی خرید وفروخت یا کنیسہ وغیرہ بنانے کے واسطے مکان کرایہ پر دینے کو سبب قریب موصل شمار کرتے ہوئے یہی تفصیل ذکر کی ہے:

''وان لم يكن محركا وداعيا بل موصلا محضا وهو مع ذلك سبب قريب بحيث لا يحتاج فى اقامة المعصية به إلى إحداث صنعة عن الفاعل كبيع السلاح عن اهل الفتنة ...... وإجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر أو يتخذها كنيسة أو بيت نار وأمثالها، فكله مكروه تحريما بشرط أن يعلم به البائع والأجر من دون تصريح به باللسان، فإنه إن لم يعلم كان معذورا وإن علم صرح كان داخلا فى الإعانة المحرمة''(جواهر الفقه،۲/ ۴۴۷)۔

ویسے شراب کی خرید وفروخت یا کنیسہ وغیرہ کے لیے مکان کرایہ پر دینے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، امام صاحب کے نزدیک جائز ہے اور صاحبین کے نزدیک ناجائز ہے۔

لیکن اس مسئلہ میں امام صاحب کا قول قیاس پر مبنی ہے اور صاحبین کا قول استحسان پر جیسا کہ "حاشیہ زیلعی چلپی" میں مرقوم ہے:"قول الامام قياس وقول صاحبيه استحسان"اور قیاس واستحسان میں ٹکراؤ کی صورت میں استحسان کو ترجیح ہوتی ہے، لہٰذا اصولی طور پر صاحبین کا قول راجح ہوا اور جس طرح سے شراب کی خرید وفروخت وغیرہ امور معصیت کے لیے اپنا مکان کرایہ پر دینا ناجائز ہے، اسی طرح سے بینک کو اپنا مکان کرایہ پر دینا(جو کہ سودی کاروبار کرتا ہے) ناجائز ہوگا۔

۲۔(ب): شراب کمپنی کی مختلف ملازمتوں کا حکم بھی اعانت علی المعصیہ اور تسبب للمعصیہ ہونے یا نہ ہونے پر موقوف ہے، اس لیے اعانت وتسبب کی سابقہ وضاحت کی روشنی میں جواب نقل کیا جاتا ہے۔

شراب کمپنی میں شراب کی خرید وفروخت کی ملازمت اختیار کرنا شراب کی بیع وشراء کے لیے وکیل بننا ہے اور شراب کی بیع وشراء حرام ہے۔

''ولا يجوز بيع الخمر والخنزير لقوله عليه السلام فيه أن الذى حرم شربها حرم بيعها وأكل ثمنها''(الهداية، ۳/ ۱۰۲)۔

اور حرام امور کی وکالت بھی حرام ہوتی ہے۔

''الاصل فى الوكالة الاباحة...... وقد تكون حراما إن أعانت على حرام''(الفقه الاسلامى وادلته، ۵/ ۴۰۶۱)۔

اس لیے شراب کمپنی میں بیع وشراء کی ملازمت اختیار کرنا حرام ہوگا، کمپنی میں بوتل بنانے کی ملازمت جائز ہے، کیونکہ بوتلیں بنانا نہ تو شراب کے کاروبار پر تعاون ہے اور نہ اس کیلئے تسبب جب تک کے قصد وارادہ یا صراحت نہ پائی جائے، ہاں اگر معصیت کی صراحت کردی گئی ہو یا اس کی نیت ہی شراب کے کاروبار پر تعاون کی ہو تو پھر تعاون علی المعصیۃ ہونے کی بنا پر یہ ملازمت بھی حرام ہوگی۔

اسی طرح شراب سے متعلق حساب وکتاب لکھنا شراب کی اشاعت پر تعاون ہے، اس لیے شراب سے متعلق حساب وکتاب کی ملازمت بھی حرام ہوگی۔

شراب کی کمپنی کو ایسے اجزاء پیش کرنے کے سلسلہ میں جن سے شراب بھی بنائی جاتی ہے اور دوسری چیزیں بھی بنائی جاسکتی ہیں تفصیل کی جائے گی، لہٰذا سب سے پہلے ان اجزا کو دیکھا جائے گا اگر وہ اجزاء ایسے ہیں جن سے اسی حالت میں شراب بنائی جاسکتی ہے جیسے انگور کا رس تو یہ مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ یہ اتخاذ مسکر کے لیے سبب قریب موصل ہے۔

''وان لم یکن محرکا وداعیا بل موصلا محضا ...... کبیع السلاح من اهل الفتنة وبیع العصیر ممن یتخذه خمرا... فکله مکروه تحریما بشرط أن یعلم به البائع'' (تفصیل الکلام فی مسئلة الاعانة علی الحرام ملحق بجواهر الفقه ۴۳۲)۔

اور اگر ایسے اجزاء ہیں جن سے تبدیلی کے بغیر شراب نہیں بنائی جاسکتی، جیسے انگور تو ایسے اجزاء پیش کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔

''واما السبب البعید کبیع الحدید من اهل الفتنة وبیع العنب ممن یتخذ خمرا... وأمثالها إذا علم فتکره تنزیها'' (بحواله سابقه)۔

یہ سب اس وقت ہے، جبکہ اس نے شراب بنائے جانے کے ارادے سے یہ اجزاء پیش نہ کیے ہوں اور نہ اس کی صراحت کی گئی ہو، اگر اس کا ارادہ بھی ہو یا اس کی صراحت کردی گئی ہو تو پھر تعاون علی المعصیہ ہونے کی بنا پر یہ عمل حرام ہوگا۔

سوال ۳۔(الف):

سپر مارکیٹ کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ مختلف ضروریات زندگی سے متعلق مختلف گوشے ہوتے ہیں، ایک گوشہ شراب کا بھی ہوتا ہے، اس مارکیٹ میں بعض ملازمین شراب کے گوشے پر مامور ہوتے ہیں، بعض دیگر اشیاء ادویات، کپڑے وغیرہ کے گوشے پر اور بعض کی ملازمت کا تعلق پوری مارکیٹ سے ہوتا ہے، جیسے منیجر، سلیس مین اور چپراسی وغیرہ۔

سپر مارکیٹ کی ایسی ملازمتیں جن کا تعلق خاص شراب کے گوشے سے ہے وہ ناجائز ہیں، کیونکہ جناب رسول کریم ﷺ نے شراب کے بیچنے والے، خریدنے والے، پینے والے، پلانے والے اس کو لانے ولیجانے والے سب پر لعنت فرمائی ہے اور ظاہر ہے کہ آپ کا مقصد حصر نہیں ہے بلکہ شراب کے معاملے کیلئے کسی بھی طرح سے ذریعہ اور واسطہ بننے سے منع کرنا ہے اور ایسی ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں شراب کی بیع وفروخت کیلئے ذریعہ بننا لازم آتا ہے۔

نیز اس گوشے کے ملازم کو خریدار کے مانگنے پر شراب دینی ہوتی ہے اور سیل ہونے کے بعد وہاں دوسری شراب لاکر رکھنی ہوتی ہے، جبکہ آپ ﷺ نے صراحتاً اس سے منع فرمایا ہے۔

شراب کے لانے و لے جانے کے جواز وعدم جواز کے سلسلے میں گو کہ امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے۔

''وجاز تعمیر کنیسة وحمل خمر ذمی بنفسه او دابته بأجر. قوله: (وحمل خمر ذمی) قال الزیلعی: وهذا عنده وقالا هو مکروه، لانه علیه الصلاة والسلام لعن فی الخمر عشرة وعدمنها حاملها'' (شامی ۹/ ۵۶۲)۔

لیکن نہایہ کے حوالے سے علامہ شامی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کا قول قیاس پر مبنی ہے اور صاحبین کا قول استحسان پر''وزاد فی النهایة وهذا قیاس وقولهما استحسان''(بحوالہ سابقہ)۔

اور ترجیح استحسان کو ہوتی ہے، اس لیے صاحبین کا قول راجح ہوگا اور شراب کا لانا اور لیجانا ناجائز ہوگا اور سپر مارکیٹ کے شراب کے گوشے کی ملازمت چونکہ اس کو شامل ہے، اس لیے یہ ملازمت ناجائز ہوگی۔

اسی طرح پوری سپر مارکیٹ سے تعلق رکھنے والی ایسی ملازمتیں جن کا تعلق ہر طرح کے اشیاء کی خرید وفروخت سے ہوتی ہے، جیسے منیجر کی ملازمت ناجائز ہوگی کیونکہ یہ ملازمت درحقیقت وکالت للبیع ہے اور اشیاء میں شراب بھی ہے، اس لیے ایسی ملازمت کا اختیار کرنا شراب کی بیع وشراء کیلئے وکیل بننا ہوگا اور یہ وکالت علی الحرام ہونے کی بناپر شرعاً ناجائز ہے۔

''الاصل فی الوکالة الاباحة...... وقد تکون حراما إن أعانت علی حرام'' (الفقه الاسلامی وادلته، ۵/ ۴۰۶۱)۔

البتہ دیگر اشیاء کے شعبے کی ملازمت یا ایسی عمومی ملازمت جس کا تعلق بیع وشراء سے نہیں ہے، جیسے حراست اور صفائی وغیرہ کی ملازمت درست ہوگی، کیونکہ عدم جواز کی دلیل نہیں پائی جاتی۔

سوال۔ ۳(ب):

فتنے سے امن کی صورت میں بوقت ضرورت مردوزن کا ایک دوسرے سے کلام کرنا اور ایک دوسرے کو دیکھنا درست ہے۔

''فإن خاف الشهوة او شك امتنع نظره إلی وجهها فحل النظر مقید بعدم الشهوة وإلا فحرام هذا فی زمانهم وأما فی زماننا فمنع من الشابه۔''.

''قال الشامی؛ قوله: ''مقید بعدم الشهوة'' قال فی التاتارخانیه، وفی شرح الکرخی النظر إلی وجه الأجنبیة الحرة لیس بحرام، ولکنه یکره بغیر حاجة وظاهره الکراهة ولو بلاشهوه ...... قوله ''وأما فی زماننا فمنع من الشابة'' لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة کما قدمه فی شروط الصلاة'' (شامی ۹/ ۵۳۲)۔

اسی طرح بوجہ حاجت عدم خلوت، عدم ملامست اور حدود شرع کی رعایت کی شرط کے ساتھ عورتوں اور مردوں کا اختلاط بھی درست ہے۔

''یختلف حکم اختلاط الرجال بالنساء بحسب موافقته لقواعد الشریعة او عدم موافقته فیحرم الاختلاط اذا کان فیه'':

(الف) الخلوة بالأجنبیة والنظر بشهوة إلیها۔

(ب) تبذل المرأة وعدم احتشامها۔

(ج) عبث ولهو وملامسة للأبدان...

''ویجوز الاختلاط اذا کانت هناك حاجة مشروعة مع مراعاة قواعد الشریعة'' (الموسوعة الفقهیة، ۲/ ۲۹۰۔ ۲۹۱)

اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عصری تعلیم بھی آج قومی وملی ضرورت بن چکی ہے اور جس طرح سے ان علوم کا حصول ضرورت وحاجت ہے، اسی طرح سے ان درسگاہوں میں ملازمت اختیار کرنا بھی ایک حاجت ہے، کیونکہ اگر مسلمان ان درسگاہوں میں ملازمت نہیں کریں گے تو فساد وبگاڑ مزید بڑھ جائے گا، اس لیے ایسی درسگاہوں کی ملازمت جائز ہوگی بشرطیکہ پردے اور دیگر شرعی حدود کی رعایت کی جائے اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

''قطاع البحوث والافتاء کویت'' نے بھی عورتوں کے مردوں کو تعلیم دینے اور مردوں کے عورتوں کو تعلیم دینے کے سلسلے میں مذکورہ شرائط کے ساتھ جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

''یجوز للمرأة ان تتولی تعلیم الرجال الاجانب بشرط عدم وجود البدیل من الرجال وبشرط التزامها الحجاب والأدب الشرعی فی تعلیم الرجال الأجانب'' (مجموعة الفتاعی الشرعیه، ۸/ ۳۹۵)۔

''ان تدریس الرجل لنساء الأجنبیات جائز بشرط ان لاتکون هناك خلوة وتنتفی الخلوة بوجود رجل

آخر أو امرأة أو بقاء الباب مفتوحا أو نحو ذلك مما لا يؤمن معه دخول ثالث ويجب على الدراسات التزام اللباس الشرعي والأداب الإسلاميه وعلى المدرس اجتناب النظر المحرم'' (بحوالہ سابقہ)۔

لیکن زمانے کے فساد و بگاڑ کے پیش نظر مسلمانوں کو اجتماعی کوششوں سے ایسے ادارے قائم کرنے چاہئے جہاں عورتوں اور مردوں کی الگ الگ تعلیم کا نظم کیا جائے۔

سوال ۳۔ (ج):

وکالت کا پیشہ فی نفسہ جائز ہے:

''تصح الوكالة بأجر وبغير اجر'' (الفقه الاسلامى وادلته ۴۰۵۸۵)۔

لیکن مروجہ پیشہ وکالت کے دو رخ ہیں، پہلا رخ تو یہ ہے کہ اس کا اصل مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے جو کہ ایک مستحسن عمل ہے اور امور مستحسنہ کی وکالت بھی مستحسن ہوا کرتی ہے۔

''الاصل فى الوكالة الإباحة وقد تصبح مندوبة إن كانت اعانة على مندوب'' لث (الفقه الاسلامى وادلته ۵/ ۴۰۶۱)۔

اس جہت سے پیشہ وکالت کی اباحت میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آج پیشہ وکالت میں حقائق سے چشم پوشی، دروغ گوئی، اپنے مؤکل کی بے جا حمایت اور جانتے بوجھتے مظلوم کو انصاف سے محروم کردینا، جیسے، بہت سے منکرات پائے جاتے ہیں اور اصولی بات یہ ہے کہ جب کسی مباح یا مستحب عمل میں عام طور پر منکرات پائے جاتے ہوں تو ''سد الذرائع'' اس سے بالکل منع کردیا جاتا ہے، گرچہ بعض اوقات وہ منکر سے خالی ہو۔ (احکام القرآن، ۲۵۳/۳)۔

اس کا تقاضا یہ ہے کہ پیشہ وکالت کو بالکل ممنوع قرار دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے لیے وکیل کی ضرورت پڑتی ہے، اگر مسلم وکلاء نہیں ہوں گے تو مقدمات کی پیروی غیر مسلموں کو سونپی جائے گی، بہت ممکن ہے کہ وہ مذہبی جذبات سے مغلوب ہوکر عدالت میں سنجیدہ بحث نہ کریں، خصوصاً اس وقت جبکہ معاملہ مسلم پرسنل لا یا اسلامی شعائر سے متعلق ہو، اس طرح بہت سے مسائل میں یا تو مسلمانوں کو انصاف سے محروم ہونا پڑے گا یا بہت تاخیر سے انصاف مل پائے گا جو یقیناً دشواری اور مشقت کا باعث ہوگا، اس لیے اس کو بالکلیہ ممنوع نہیں کہا جاسکتا ہے۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں رخ کی رعایت کرتے ہوئے اس شرط کے ساتھ پیشہ وکالت کو جائز قرار دیا جائے کہ وکلاء حتی الوسع شرعی حدود کی پاسداری کریں، حقائق کو ملحوظ رکھیں اور کذب بیانی سے گریز کریں، چنانچہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

حاصل یہ ہے کہ پیشہ وکالت جائز ٹھہرا مگر شرط یہ ہے کہ سچے مقدمات لیتا ہو۔ (امداد الفتاویٰ، ۳۲۰/۳)

سوال ۳۔ (د):

ہاسپیٹل انتظامیہ اور اس کی لیبارٹری کی آمدنی بڑھانے کی غرض سے ڈاکٹروں کو بلاضرورت آپریشن اور ٹیسٹ لکھنے اور مریض کے سامنے ضرورت کا اظہار کرنے پر مجبور کرنا غدر، کذب اور مصیبت زدہ پر سراسر ظلم ہے جو نہ صرف اسلام، بلکہ تمام شرائع میں حرام ہیں، ایسے ہاسپیٹلوں کی ملازمت اختیار کرنا حرام پر تعاون اور ظالموں کی اعانت ہے جو کہ نص قطعی ''ولا تعاونوا على الاثم والعدوان'' (المائدہ: ۲) اور ''فلن أكون ظهيرا للمجرمين'' (القصص: ۱۷) سے حرام ہے اور متبادل کے پائے جانے کی بناء پر ایسی ملازمتوں کی ضرورت بھی نہیں پائی جاتی اس لیے یہ ملازمت ناجائز ہوگی۔

البتہ جن ہاسپیٹلوں میں بلاضرورت آپریشن یا ٹیسٹ لکھنے پر مجبور نہ کیا جاتا ہو، لیکن مرد ڈاکٹر کو خاتون مریض اور خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے ایسے علاج پر بعض اوقات مجبور کیا جاتا ہو جس کا تعلق قابل ستر حصے سے ہے ان کی ملازمت کی محدود اور مشروط اجازت دی جاسکتی ہے کیونکہ اعضاء مستورہ کو دیکھنا منہی لغیرہ ہے اور غیر فتنے میں پڑنے کا اندیشہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے بچے جن کی طرف سے فتنے کا اندیشہ نہیں ان کے پردے کو ماں باپ پر لازم قرار نہیں دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاہدین زنا کیلئے زانی اور زانیہ کی شرمگاہوں کی طرف دیکھنے کی اجازت ہے حالانکہ وہاں کوئی ضرورت نہیں پائی جاتی۔

''الا یری أنه یجوز النظر إلیه لتحمل الشهادة علی الزنا ولا ضرورة'' (الاختیار، ۴/ ۱۵۴)۔

اور منہی لغیرہ کی اجازت غیر کے منتفی ہونے کی صورت میں دی جاسکتی ہے، اس لیے ایسے ہاسپٹلوں کی ملازمت درج ذیل شرائط وحدود کے ساتھ دی جاسکتی ہے: (۱) (فتنے کا خوف نہ ہو) (۲) خلوت کا تحقق نہ ہونے پائے اس طرح کے اپنے چیمبر میں کسی تیسرے شخص کو بھی موجود رکھے اور پردے کی آڑ میں مریض کا معائنہ کرے (۳) مرض زدہ عضو کے علاوہ دیگر قابل ستر حصے کے پردے کا اہتمام کرے۔ (۴) ضرورت سے زائد حصے کو دیکھنے اور چھونے سے حتی الامکان پرہیز کرے۔

''فإن لم توجد وخافوا علیها أن تهلك أو یصیبها وجع لا یحتمله یستروا فیها كل شئی إلا موضع العلة ثم یداویها الرجل ویغض بصره ما استطاع الا عن موضع الجرح'' (الشامی، ۹/ ۵۳۳)۔

سوال ۳۔ (ھ):

ہوٹلیں موجودہ زمانہ میں ایک نفع بخش اور وسیع ذریعہ معاش بن چکے ہیں، ہوٹلوں کا بنیادی مقصد تو معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولت فراہم کرنا ہے، لیکن آج کے بڑے ہوٹل عموماً منکرات سے خالی نہیں ہوتے، ان کی ملازمت کو علی الاطلاق جائز قرار دینا منکرات پر تعاون کی اجازت دینے کے مترادف ہوگا، جبکہ اس سے علی الاطلاق روکنا تنگی کا باعث ہوگا، اس لیے ان ہوٹلوں کی ایسی ملازمتیں جن کا تعلق براہ راست حرام امور سے ہو، جیسے شراب لانے، پیش کرنے، خنزیر اور دیگر حرام غذا کے لانے، بنانے، پیش کرنے، رقص وموسیقی وغیرہ کی ملازمت ناجائز ہوگی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب لانے اور پیش کرنے والوں کے بارے میں وعید منقول ہے۔

''قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لعن الله الخمر وشاربها وساقیها ... وحاملها والمحمولة الیه'' (سنن ابی داود کتاب الاشربه ۵۱۷)۔

رقص اور موسیقی کے لیے عقد اجارہ کی عدم صحت پر بھی فقہاء کی عبارتیں دلالت کرتی ہیں:

(لا تصح الاجارة لعسب التیس ... ولا لأجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی ولو أخذ بلا شرط یباح) وفی المنتقی: امرأة نائحة أو صاحبة طبل أو زمر اكتسبت مالا ردته علی أربابهم إن علموا والا تتصدق به، وإن من غیر شرط فهو لها قال الامام الاستاذ: لا یطیب والمعروف كالمشروط۔ قلت: وهذا مما یتعین الأخذ به فی زماننا لعلمهم أنهم لا یذهبون الا باجر البتة'' (شامی، ۹/ ۷۵۔ ۷۶)

اور اصل یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں تعاون علی الاثم کو شامل ہیں جو کہ نص قرآنی سے حرام ہے۔

ایسی ملازمتیں جن کا تعلق براہ راست حرام چیزوں سے نہیں ہے، جیسے حلال اشیاء کے لانے اور پیش کرنے آنے والوں کا استقبال کرنے اور صفائی وغیرہ کی ملازمت..... گرچہ ان میں تعاون علی الاثم کا شبہ ہوتا ہے، اس جہت سے کہ یہ ایسے ہوٹلوں کی ملازمت ہے جس میں منکرات پائے جاتے ہیں، لیکن یہ شرعاً معتبر نہیں ہے اور حرمت کی کوئی اور وجہ نہیں پائی جاتی، اس لیے "الأصل فی الأشیاء الإباحة" کی بنیاد پر یہ ملازمتیں جائز ہوں گی۔

☆☆☆

تیسرا باب: مختصر تحریریں

مختلف ملازمتوں کے احکام

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی[1]

موجودہ دور کے حالات نے دارالکفر، دارالحرب اور دارالاسلام کے مفاہیم کو بدل کر رکھ دیا ہے...... ہماری پرانی کتب فقہ میں جس طرح کفر اور اسلام کی بنیاد پر ایک ملک کو دوسرے ملک سے الگ کیا گیا ہے، اب اس انداز میں ان کو متعین کرنا ناممکن سا ہو گیا ہے، ایک اسرائیل کو چھوڑ کر غالباً کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کو دارالحرب کا نام دیا جاسکے۔

دنیا کے کتنے ہی ملک ہیں جن میں مسلمان اقلیت کے طور پر آباد ہیں اور دیانت داری کے ساتھ دیکھا جائے تو مسلم اقلیتوں کے لیے اس وقت جمہوری یا ڈیموکریٹک نظام حکومت کا کوئی بدل نہیں ہے۔

سیکولر نظام حکومت جس کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ نہ کسی مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے اور نہ کسی کی جانب داری کرتا ہے بلکہ مذہبی غیر جانبداری کو بطور نظام فکر اپناتا ہے یہ اقلیتوں کے لیے موجودہ وقت میں سب سے بڑی نعمت ہے...... لادینی جمہوریت میں مذہب کی آزادی، صحافت کی آزادی، نظام قضا کی خودمختاری، اقلیتوں کے حقوق وہ چیزیں ہیں جو قوموں کی شریفانہ زندگی کے لیے مطلوب ہیں۔

اب جو مسلمان ڈیموکریسی کی بات کرتا ہے وہ اس اعتبار سے کرتا ہے کہ وہ حکومت کی ایک شکل ہے اور وہ اس لیے اپناتا ہے کہ اس کے ذریعہ عدل وانصاف قائم ہو سکے، شورائی نظام وجود میں آئے، حقوق انسانی کا احترام ہو اور ظلم وزیادتی سے روکا جائے۔

اصل مسئلے پر کچھ عرض کرنے سے پہلے بطور تمہید چند باتیں سامنے رہنی چاہئیں تا کہ اصل مسئلے کو سمجھنے اور سوالات کا شریعت کی روشنی میں حل نکالنے میں مدد مل سکے۔

پہلی یہ ہے کہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی طرح اس کا جینا صرف جینے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کی زندگی کا ایک خاص اور اہم مقصد ہے اور وہ ہے معروفات کو قائم کرنا اور منکرات سے سوسائٹی کو پاک وصاف کرنا جیسا کہ ارشاد ہوا:

"کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" (آل عمران: ۱۱۰)۔

اسی مضمون کو سورہ توبہ میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"الأمرون بالمعروف والنهون عن المنكر والحافظون لحدود الله" (سورۂ توبہ: ۱۱۲)۔

قرآن مجید کے ان ارشادات سے یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ امت مسلمہ اپنی ترکیب، اپنے مزاج اور مقاصد کے اعتبار سے دوسری قوموں سے مختلف ہے۔

دوسری بات جو قرآن مجید سے ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے برائی کی ہر شکل سے تعاون کرنے سے روکا ہے اور حکم دیا ہے کہ تمہارے ہاتھ مدد کے لیے آگے بڑھیں، تو صرف نیکی کے لیے، فرمایا:

"وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (مائدہ: ۲)۔

تیسری بات یہ کہ برائی کے ساتھ صرف اتنا ہی نہیں کہ تعاون نہ کیا جائے بلکہ برائی کے ساتھ سمجھوتہ بھی نہ کیا جائے، بلکہ اپنی طاقت اور قوت وحیثیت کے مطابق برائی کا مقابلہ کیا جائے اور آخری درجہ یہ ہے کہ دل سے برائی کو برا سمجھا جائے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] دارالسلام اسلامی مرکز، مالیر کوٹلہ (پنجاب)۔

''من رأى منكم منكرا فليغيره بيده إن لم يستطع فبلسانه وإن لم يستطع فبقلبه'' (تم میں سے کوئی شخص اگر کسی برائی کو دیکھے اگر طاقت ہے تو ہاتھ سے، طاقت نہیں تو زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں ہے تو دل سے اس کو برا جانے)۔

ان چند اصولی اور تمہیدی باتوں کے بعد ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مغربی طرز کا سیکولر جمہوری نظام جو ہندوستان سمیت دنیا کے زیادہ تر غیر مسلم ملکوں میں رائج ہے وہ کوئی آئیڈیل نظام حکومت نہیں ہے اور اس میں اخلاقیات اور خاص طور پر اسلامی اخلاقیات کے لیے گنجائش نہیں ہے، ایسے نظام حکومت میں جو غیر اسلامی ہو اہل ایمان کے لیے تین راہیں ہوتی ہیں: ا۔ ہجرت، ۲۔ جہاد، ۳۔ دعوت۔

ہجرت کا معاملہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہو چکی ہے، حقیقی طور پر ایک بھی ایسی مسلم مملکت موجود نہیں ہے جو ان تمام مسلمانوں کو اپنی حدود میں جگہ دے سکے جو غیر مسلم حکومتوں کے سائے میں رہتے ہیں، ایسے حالات میں دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کی بات کرنا غیر حقیقی ہے۔

رہی بات جہاد کی تو جہاد کی آخری صورت قتال اس کے لیے جو شرائط ہیں اور جو حالات ہیں وہ بھی اس وقت زیر بحث لانا ہوا میں گرہ باندھنا ہے، جزوی طور پر بعض حصوں میں جہاد کی تحریکیں چل رہی ہیں وہ بھی بحث کی طالب ہیں، اور صحیح بات یہ ہے کہ مسلم ملکوں کی بے حسی اور عیش پوشی کو دیکھتے ہوئے سخت دشوار ہے کہ ان کے بارے میں کوئی رائے زنی کی جائے، مثلاً فلسطین کا معاملہ کھلا ظلم اور جارحیت ہے لیکن بین الاقوامی حالات ابھی تک ایسے نہیں ہیں کہ فلسطین کے بارے میں خوشگوار امیدیں قائم کی جا سکیں، آزادی کی وہ تصورات جن میں ہندوستان میں ریشمی رومال کی تحریک یا حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد اٹھی تھی، بین الاقوامی حالات بدل جانے سے وہ از سر نو غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں، ابھی تک تو اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ اقوام متحدہ کے طرز پر مسلم ملکوں کی کوئی فیڈریشن وجود میں آئے اور ایسا اتحاد قائم ہو سکے جو کم سے کم یہ ثابت کر دے کہ۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا کے اندرون بیرون دریا کچھ نہیں

تیسرا معاملہ دعوت کا ہے، بے شک اس کے مواقع آج پہلے سے کہیں زیادہ ہیں، ہندوستان میں مذہب تبلیغ کی آزادی ہے اور اس کا اپنا مقصد بنا کر ہمیں اپنی ملی زندگی کا نظام قائم کرنا چاہئے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ مغربی طرز کا سیکولر جمہوری نظام حکومت کوئی آئیڈیل نظام نہیں ہے، لیکن اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ بھارت کا آئین ایک فیڈرل سسٹم ہے اس لیے اس نظام حکومت میں مسلمانوں کے لیے حصہ لینا اس صورت میں جائز ہوگا کہ وہ دیانت، امانت، اخلاق اور ان تمام حدود کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے حکومت سازی میں حصہ لیں، مگر ان تمام گراوٹوں سے بچتے رہیں، جو بے ایمانی، دھاندلی بازی اور بدعہدی کی صورت میں سیاست کا ایک حصہ بنتی جا رہی ہیں، مسلمانوں کو اپنے مقام اور حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نیت کے ساتھ حکومت اور ملازمت میں شرکت کرنی جائز ہوگی کہ وہ اس کے ذریعہ خیر امت کے فرائض آسانی کے ساتھ ادا کر سکیں۔

ان تمہیدی اور اصولی باتوں کے بعد اب ہم ان سوالات کا جائزہ لیتے ہیں اور کتاب وسنت کی روشنی میں ان پر غور کرتے ہیں تا کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے دین پر عمل کرتے ہوئے رزق حلال حاصل کرنے کی جائز صورتیں نکل سکیں:

ا۔ الف: اس سوال کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو مجموعی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے یہی کہا جائے گا کہ مسلمانوں کو فوج کی ملازمت سے گریز نہیں کرنا چاہئے، فوج میں ہر ایک کے مذہب کا احترام کیا جاتا ہے، اس کے لیے عبادت گاہیں اور معلم مقرر کئے جاتے ہیں اور ایک مسلمان کے لیے قولی اور عملی دعوت اسلام کا بہت اچھا موقع ہوتا ہے اور وہ اپنے کردار و عمل سے دین کا مبلغ اور اس کا داعی بن سکتا ہے، ہمیں اس کی ایک مثال حبشہ میں مسلمانوں کے قیام کی صورت میں ملتی ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: سیرت ابن ہشام، ۱/ ۱۸۳، البدایہ والنہایہ، ۳/ ۸۷، مطبوعہ قاہرہ، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل، مولانا اختر امام عادل، ص ۸۱۔ ۸۲)۔

مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے پیش نظر فوج کی ملازمت درست ہوگی، البتہ اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے جو اسلام کی واضح تعلیمات سے متصادم ہو تو اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے گی اور جمہوریت میں اس کی گنجائش موجود ہے۔

ب۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی حکومت کے زمانے میں پولیس کا شعبہ بہت بدنام رہا ہے اور برطانوی حکومت نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں پولیس کو لوگوں

پر ظلم ڈھانے اور ان کے اخلاق بگاڑنے کے لیے استعمال کیا ہے، حالانکہ خود برطانیہ میں پولیس کا شعبہ بڑا ذمہ دار اور ڈسپلن کا پابند بلکہ عوام کا خادم سمجھا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد آہستہ آہستہ اس شعبے میں بڑی اصلاحات ہوئی ہیں، تعلیم یافتہ لوگ پولیس میں آئے ہیں اور عوام کے ساتھ ان کے رویئے میں اب پہلی جیسے دھاندلی نہیں رہی ہے، آہستہ آہستہ اس شعبے کی تطہیر کا کام کیا جارہا ہے، اس لیے مسلمانوں کو بھی اور خاص طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس شعبے میں آنا چاہئے اور اپنے حسن کردار سے لوگوں کے دل جیتنے چاہئیں بلکہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں مسلمان اپنے قول وعمل کے اعتبار سے بہتر مظاہرہ کریں اور حسن اخلاق سے اس شعبے کے لوگوں کو اور عوام کو فائدہ پہنچائیں، کسی پر ظلم اور زیادتی سے پرہیز کریں، انصاف سے کام لیں، رشوت سے پرہیز کریں تو امید یہ ہے کہ بہت اچھے اثرات سامنے آسکتے ہیں۔

ج۔ مخبری یہ حکومت کی ضرورت ہے جس کا تعلق امن وامان، ملک کی سلامتی اور جرائم کی روک تھام سے ہے، اس میں جو لوگ کام کرتے ہیں اور چھان بین کے لیے جستجو کرتے ہیں ان کا یہ کام چونکہ ضرورت کے تحت ہے اس لیے وہ تجسس اور غیبت کے گناہ گار نہیں ہیں، "لا تجسسوا" (ٹوہ مت لگاؤ) کی ممانعت اس صورت میں ہے جب آدمی دوسرے کا بھید لے کر اس کو رسوا کرے، اسی طرح "لا یغتب بعضکم بعضا" کا حکم اس صورت میں ہے جب دوسرے کا عیب ظاہر کر کے اس کو رسوا کیا جائے لیکن شعبہ مخبری میں چونکہ اجتماعی مفاد کے لیے ایسا کیا جاتا ہے، اس لیے اس شعبے میں ملازمت کرنے والے لوگ اپنے اس فعل کی وجہ سے گنہگار نہ ہوں گے، لیکن اگر کوئی بے قصور کو پھنسانے کے لیے اس کے خلاف فرضی رپورٹیں کرتا ہے تو وہ شرعاً، اخلاقاً، قانوناً مجرم ہے اور ایک مسلمان سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ اپنے فرائض کو بھول کر ایسی غلطی کرے گا۔

د۔ انصاف کی فراہمی اور جرم اور حق تلفی کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کو عدلیہ میں شریک ہونا چاہئے بلکہ ان کو ملکی قانون کے ساتھ شرعی قانون کی بھی اچھی واقفیت ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنے فیصلوں میں اسلامی قوانین کے حوالے سے اسلامی قانون کے منصفانہ اور عادلانہ نظام کو بطور حوالہ پیش کرسکیں، عدالتوں کے فیصلوں میں اسلام سے انحراف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام طور پر جج اسلامی قوانین سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے، ہمارے وکیل اور جج اگرچہ مسلم پرسنل لاء بطور مضمون کے پڑھتے ہیں مگر ان کے سامنے جو کتابیں ہوتی ہیں وہ اسلامی قانون کے مزاج کی صحیح نمائندگی نہیں کرپاتیں چونکہ یہ لوگ اصل ماخذ عربی سے واقف نہیں ہوتے اور ان کا ذریعہ انگریزی ہوتا ہے اس لیے ہمیں انگریزی میں ان کو ایسی کتابیں فراہم کرنی چاہئیں جو صحیح طور پر اسلام کو سمجھانے والی ہوں، اس سے امید ہے کہ کافی حد تک ان کے فکر میں تبدیلی آسکے گی۔

ھ۔ حکومت کے دوسرے شعبوں کی طرح انکم ٹیکس کے محکمے میں بھی ملازمت کرنا درست ہوگا، اگر انکم ٹیکس کی شرح زیادہ ہے تو اس کو ملکی پیمانے پر اٹھایا جاسکتا ہے، اور پارلیمنٹ میں یہ مسئلہ زیر بحث لایا جاسکتا ہے کہ کتنی شرحیں مناسب ہیں، اور ان کا استعمال کسی طرح ملک کے فائدے کے لیے اور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہونا چاہئے، کیونکہ جمہوریت میں عوامی نمائندگی اگر مناسب ہو اور وہ بیدار ہو تو اس طرح کے مسائل پر گرفت کرسکتی ہے، خاص طور پر مسلم نمائندوں کو آگے بڑھ کر ان معاملات پر اظہار خیال کرنا چاہئے اور انصاف کی راہیں ہموار کرنی چاہئیں۔

پرائیویٹ ملازمت:

الف۔ بینک میں ایسے کام کی ملازمت کرنا جو جائز ہو جائز ہے، اس کی ہر ملازمت ناجائز نہیں ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"ولو استاجر الذمی مسلما لیبنی له بیعة أو کنیسة جاز ویطیب له الاجر کذا فی المحیط" (فتاویٰ ہندیہ، کتاب الاجارۃ)

(اور غیر مسلم کسی مسلمان سے گرجا یا کنیسا اجرت پر تعمیر کرنے کو کہے تو جائز ہے اور اجرت بھی حلال وطیب ہے)۔

مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ نے اس کی صراحت کی ہے کہ بینک کی ہر ملازمت ناجائز نہیں ہے، ایسے کام کی ملازمت کرنا جو جائز ہو جائز ہے (نظام الفتاویٰ، ص ۲۱۳، شائع کردہ اصلاحی کتب خانہ دیوبند)۔

ب۔ لائف انشورنس کے بارے میں علماء کا متفقہ فتویٰ ہے کہ لائف انشورنس خواہ کسی قسم کا ہو اس میں سود تو ضرور ہی ہوگا اور اکثر قمار بھی ہوگا اور ربوا اور جوا دونوں شریعت میں حرام اور ناجائز ہیں۔

البتہ شرعی مجبوری کی بات دوسری ہے، مثلاً قانوناً لازم ہو جائے...... یا کسی مقام کے حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ بغیر انشورنس کے جان ومال کی حفاظت

مشکل ہو جائے یا مثلاً ملازمت نہ ملے یا ملازمت برقرار اور بحال نہ رہے اور بغیر ملازمت کے گزارہ مشکل ہو یا معاشرہ قائم نہ رہے تو بوجہ مجبوری کے محض مجبوری کے بقدر گنجائش نکل سکے گی، مگر شرط یہ ہوگی کہ جمع کی ہوئی رقم سے زائد جو رقم ملے، ثواب کی نیت کیے بغیر بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے محتاج غربا اور مساکین کو دے دی جائے اور استغفار و دعا کا معمول رکھا جائے (نظام الفتاویٰ، ص ۳۲۷، ۳۲۸)۔

بینک کی طرح لائف انشورنس کی ملازمت کا بھی حکم یہی ہوگا کہ جو کام جائز ہیں ان کی ملازمت جائز ہوگی، انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا درست نہ ہوگا۔

ج۔ شراب کی کمپنی میں بھی ملازمت کا وہی حکم ہوگا جو بینک یا لائف انشورنس کا ہے کہ وہ کام جو فی نفسہ جائز ہیں ان میں ملازمت کرنی جائز ہوگی، جیسے الیکٹریشن کی ملازمت، اے سی وغیرہ کے کام یا چوکیداری، یہ کام بذات خود جائز ہیں، لہٰذا ان کی اجرت بھی جائز ہوگی۔

۳۔ الف: شیئر مارکیٹ کا کاروبار فی نفسہ جائز ہے اور اس میں ملازمت کرنا بھی جائزہ، اگر اس میں شراب کا بھی کوئی گوشہ ہو تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس سے پرہیز کرنا چاہئے، اور عام طور پر کمپنی والے یا مالکان اس طرح کی چیزوں میں رعایت بھی دے دیتے ہیں، بلکہ ان پر اس کا اچھا اثر مرتب ہوتا ہے اگر ان کو بتایا جائے کہ اسلام میں شراب حرام ہے تو امید یہ ہے کہ وہ اس حکم کا احترام کریں گے اور اس مسلمان ملازم کو اس خدمت سے مستثنیٰ رکھیں گے۔

ب۔ مخلوط تعلیم اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے اور اس کی خرابیاں بھی سامنے آتی رہتی ہیں لیکن ایک مسلمان ٹیچر کو اپنے کردار و عمل سے اس کا مظاہرہ کرنا چاہئے جو اسلام نے عورت اور مرد کے تعلق سے احتیاط کی تعلیم دی ہے، غض بصر کرتے ہوئے حتی الامکان اس سے بچنا چاہیے کہ خلوت میں کسی لڑکی اور خاص طور پر بالغ لڑکی کو تعلیم نہ دی جائے، اسی طرح خاتون اساتذہ کو بھی اس بات کا دھیان رکھتے ہوئے مجبوراً اس کو گوارا کرلینا چاہئے لیکن کوشش یہی ہونی چاہئے کہ مرد اساتذہ لڑکوں کے اسکول میں اور خاتون اساتذہ لڑکیوں کے اسکول میں تعلیم دیں، اگر مجبوراً ایسی صورت پیش آئے تو ہر طرح سے محتاط رہیں۔

ج۔ مادیت کے غلبے نے زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا ہے اور اس کی لپیٹ میں وہ معزز پیشے بھی آگئے ہیں جن کو سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، وکالت کا پیشہ بھی انہیں میں سے ایک ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اندھیرے میں بھی کہیں نہ کہیں روشنی کی چمک نظر آتی ہے، اور ایسے وکیل بھی ہیں جو دولت کی ہوس میں اپنے اصولوں کو قربان نہیں کرتے اور آج بھی ان کی قدر کی جاتی ہے۔

ایسے لوگ اہل اسلام میں ہی نہیں بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی موجود ہیں، لیکن ایک مسلمان سے بجا طور پر یہ امید ہوتی ہے کہ وہ اپنے ایمان پر قائم رہتے ہوئے اس پیشے کی توقیر اور بڑھائے گا، اس لیے مسلمانوں کو یہ پیشہ ضرور اختیار کرنا چاہئے اور ہماری کچھ سماجی اور مذہبی ایسی تنظیمیں ہونی چاہئیں جو ان لوگوں تک رسائی حاصل کرکے ان کی اخلاقی تربیت کا بندوبست کریں، اور اس کے ساتھ ان کو اسلامی قوانین سے بھی آگاہ کریں اور اس کی حکمتیں ان کو سمجھائیں، اس طرح امید ہے کہ اس پیشے میں بھی ہمیں اچھے مسلمان وکیل دیکھنے کو ملیں گے۔

د۔ جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے اسے ہر حال میں شرعی حدود کا حتی الامکان لحاظ رکھنا چاہئے، مگر اصلاح کے لیے یہ طریقہ درست نہ ہوگا کہ ہم ہسپتالوں کی ملازمت اس لیے چھوڑ دیں کہ وہاں برائیاں داخل ہوگئی ہیں، بلکہ ہمیں ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور اصل بات تو وہی ہے کہ مادہ پرستی نے ذہنوں کو گندہ کردیا ہے اور انسان کو بے راہ روکردیا ہے، معاشرہ کا ہر قضیہ اصلاح کے قابل ہے۔

ھ۔ جہاں تک ہوٹلوں کی ملازمت کا تعلق ہے فی نفسہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، ہوٹلوں میں جو چیزیں شرعاً ناجائز ہیں جہاں تک ہوسکے ان سے پرہیز کرنا چاہئے اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی ملازمت کے کام کو دیانت اور صداقت کے ساتھ انجام دینا چاہئے۔

زندگی کے ہر شعبے میں خرابیاں اس درجہ گھس چکی ہیں کہ اگر تمام جزئیات کو سامنے رکھا جائے تو انسان کے لیے بہت دشواریاں پیدا ہوں گی، اس لیے اضطرار کی حالت میں عمومی حالت پر قیاس نہ کرنا چاہئے۔

....

مختلف ملازمتوں کے احکام ومسائل

مولانا اختر امام عادل قاسمی[1]

اللہ پاک نے انسانوں کے مختلف طبقات بنائے ہیں، ان میں ایک طبقہ وہ ہے جو اپنی ذہنی یا جسمانی صلاحیتوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے، اور اس فائدہ پر مالی معاوضہ وصول کرتا ہے، نظام عالم کی بقاء میں اس طبقہ کا بڑا حصہ ہے، ریاستوں اور حکومتوں کی بنیاد اس پر قائم ہے، یہی چیز انسان کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے، بندہ کے ادھورے پن کا احساس جگاتی ہے، اسی سے ہر ایک کی انفرادیت قائم ہوتی ہے، اللہ نے انسان کی فطرت بھی ایسی بنائی ہے کہ ایک دوسرے کے کام آکر فرحت محسوس ہوتی ہے، کسی کی مدد کر کے دل کو سکون ملتا ہے، کسی کی ضرورت پوری کر کے خود کو کسی لائق محسوس کرتا ہے، انسان کسی کا کام کر کے اس کی اجرت نہ لے تو یہ تعاون باہمی اور اگر اجرت لے تو یہ ملازمت ہے۔

بنیادی ہدایات:

البتہ ضروری ہے کہ کوئی بھی کام شریعت کے دائرہ میں رہ کر انجام دیا جائے اور ہر ایسے کام سے پرہیز کیا جائے جو گناہ کے دائرہ میں آتا ہو یا گناہ تک لے جاتا ہو، ایک مومن کو ہر چیز سے پہلے اس پر دھیان دینا ضروری ہے، اس سلسلے میں شریعت نے جو بنیادی ہدایات دی ہیں وہ ہمہ وقت پیش نظر رہنا چاہئے۔

''تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان'' (مائدہ:۲)۔

''رب بما أنعمت علي فلن أكن ظهيرا للمجرمين'' (قصص:۱۷)۔

مزید قرآن اس امت کے منصبی فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے:

''كنتم خير أمة أخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر'' (آل عمران:۱۱۰)۔

کئی ایسے کام ہیں جن کے کرنے یا ان کی اجرت لینے سے محض اس لیے روکا گیا کہ وہ معصیت ہیں یا معصیت تک لے جانے والے ہیں، مثلاً:

''عن أبي جحيفة أن النبي ﷺ نهى عن ثمن الدم وثمن الكلب وكسب البغي ولعن آكل الربوا وموكله والواشمة والمستوشمة والمصور رواه البخاري'' (مشكوة باب الكسب وطلب الحلال، ۲۴۱)۔

(حضرت ابوجحیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خون اور کتا کی قیمت اور بدکاری کی اجرت سے منع فرمایا ہے، سود کھانے اور کھلانے والے پر لعنت فرمائی ہے، بدن گوندھنے والی اور گوندھوانے والی عورت اور تصویر سازی کرنے والے شخص پر لعنت فرمائی ہے)۔

حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے سال شراب، مردار، خنزیر، اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا۔ (بخاری ومسلم بروایت حضرت جابرؓ مشکوۃ:۲۴۱)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے کتا اور بلی کی خرید وفروخت سے منع فرمایا۔ (مسلم مشکوۃ:۲۴۱)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے گانے بجانے کی کمائی سے منع فرمایا ہے۔ (شرح السنۃ، مشکوۃ:۲۴۲)۔

آپ ﷺ نے ایسی باندیوں کی خرید وفروخت سے بھی منع فرمایا جو گانے بجانے کا پیشہ رکھتی ہوں اور ان کی کمائی کو حرام قرار دیا۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ:۲۴۲)۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کے تعلق سے دس ایسے لوگوں پر لعنت فرمائی ہے جو اس معصیت میں مددگار بنتے ہیں۔

---

[1] ناظم جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار۔

(ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ، ۲۴۲)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکوک اور مشتبہ کمائی سے بھی منع فرمایا اور اس کو چھوڑ دینے کی تلقین فرمائی۔ (نسائی، دارمی، مشکوۃ: ۲۴۲)۔

فقہاء لکھتے ہیں:

''لایجوز الاستیجار علی شئی من الغناء والنوح والمزامیر ولا اجرلھم'' (فتاوی عالمگیری، ۴/ ۴۴۹)۔

(مزامیر، نوحہ خوانی اور گانے بجانے وغیرہ کاموں کے لیے کسی کو اجرت پر رکھنا جائز نہیں، اور نہ ان کاموں پر کوئی شخص اجرت کا حقدار ہوگا)۔

ان تعلیمات وہدایات سے اسلام کے مزاج ومذاق کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اسلام ہر معصیت کا سر کچل دینا چاہتا ہے اور ہر ایسے عمل کی حوصلہ شکنی کرتا ہے جس سے معاشرہ کی صالح قدریں متزلزل ہوں، معروف کے بجائے منکر کا فروغ ہو، اور انسان شعوری طور پر رحمٰن کے بجائے شیطان کا آلہ کار بن کر رہ جائے۔

بعض مخصوص حالات:

البتہ یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرنا مناسب نہیں کہ کبھی انسان ایسے حالات سے بھی دوچار ہوتا ہے جس میں وہ معصیت کے کسی کام کے لیے اپنے کو مجبور محسوس کرتا ہے، ایسے حالات میں شریعت کا مزاج درج ذیل نصوص وقواعد سے سمجھ میں آتا ہے:

''الا من أکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان'' (نحل:۱۰۶)۔

(یعنی مجبور کے لیے گنجائش ہے، بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو)۔

''ما جعل علیکم فی الدین من حرج'' (حج:۷۸)۔

(تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی گئی)۔

"یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (بقرہ:۸۵)۔ (اللہ پاک تمہاری آسانی چاہتے ہیں، تمہاری دشواری نہیں چاہتے)۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''بعثت بالحنفیۃ السمحۃ'' (مسند احمد عن ابی امامۃ، ۵/ ۲۶۶)۔ (مجھے آسان اور سیدھا دین دے کر بھیجا گیا ہے)۔

''إنما بعثتم میسرین ولم تبعثو امعسرین'' (بخاری باب صب الماء علی البول فی المسجد)۔

(تمہیں اس لیے بھیجا گیا کہ تم آسانی کا معاملہ کرو نہ کہ تنگی کا)۔

''یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا'' (بخاری کتاب العلم)۔

(آسانی پیدا کرو تنگی میں لوگوں کو نہ ڈالو، خوش خبری سناؤ، نفرت پیدا نہ کرو)۔

مشہور فقہی ضابطہ ہے:

''الضرورات تبیح المحظورات'' (قواعد الفقہ)۔ (ضرورتیں ناجائز کو مباح کر دیتی ہیں)۔

''المشقۃ تجلب التیسیر'' (قواعد الفقہ)۔ (مشقت آسانی پیدا کرتی ہے)۔

''ما ابیح للضرورۃ یقدر بقدرھا'' (قواعد الفقہ)۔

(جو چیز ضرورت کی وجہ سے مباح کی جاتی ہے وہ بقدر ضرورت ہی جائز رہتی ہے)۔

ان نصوص وقواعد سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اگر مجبوری کے حالات میں وقتی طور پر دل کی ناگواری کے ساتھ کسی معصیت میں مبتلا ہو یا بالواسطہ اس کو تعاون فراہم کرے، تو اس کی کسی درجہ میں گنجائش ہے، بشرطیکہ:

۱۔ وہ کام ایسا نہ ہو جس کا مقصد ہی گناہ ہو جیسے بت فروشی، بت گری، فلمی گانوں اور فحش تصاویر کی خرید و فروخت وغیرہ۔

۲۔ یا عمل تو درست ہو اور نیت بھی خیر ہو مگر ایسے قرائن موجود ہوں جن سے پتہ چلتا ہو کہ اس کے اس کام سے گناہ کو تقویت حاصل ہوگی تو یہ کراہت سے خالی نہ ہوگا، جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسے شخص کے ہاتھ غلام فروخت کرنا جو لواطت کا مریض ہو یا ایسے ملک کے ہاتھ اسلحہ بیچنا جو مسلمانوں سے حالت جنگ میں ہو وغیرہ (شامی، ۵/۳۸۷)۔

۳۔ یا درست کام کے پس پردہ غلط نیت چھپی ہوئی ہو اور اس بات کا اسے علم ہو تو ایسے کام میں بھی شامل ہونا تعاون علی المعصیت ہے مثلاً فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مکان اس لیے کرایہ پر لے کہ اس میں وہ شراب کا کاروبار کرے گا تو صاحبین کے مسلک کے مطابق اس کو مکان کرایہ پر دینا درست نہیں، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے یہاں اس کی گنجائش ہے۔ (المبسوط، ۱۶/۳۸)۔

اس ضمن میں فقہاء نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ایسا کام جس سے کسی معصیت کا براہ راست تعاون نہ ہوتا ہو یا بہت دور کے واسطوں سے تعاون ہوتا ہو تو یہ تعاون ناجائز نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص کسی مزدور سے شراب کے مٹکے اٹھوائے یا انگور کا رس نچوڑنے پر متعین کرے تو یہ معاملہ درست ہوگا، اور اس سے حاصل ہونے والی اجرت بھی امام ابوحنیفہؒ کے یہاں حلال ہوگی، اس لیے کہ شراب اٹھانے کا مقصد پینا پلانا ہی ضروری نہیں اسی طرح انگور کا رس سرکہ کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ (بدائع الصنائع، ۴/۱۹۰)۔

اس تفصیل کی روشنی میں اس ضمن میں اٹھنے والے سوالات کا حل ڈھونڈا جاسکتا ہے، مثلاً:

بعض سرکاری ملازمتیں:

۱۔ حکومت کا ایک اہم شعبہ فوج ہے، جس کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان قائم رکھنا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بہتر مقاصد ہیں لیکن بعض دفعہ فوج کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر وار کرنا پڑتا ہے اور فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے، اسی طرح کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ ایک مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہو، اس کے باوجود کسی غیر مسلم ملک میں فوج کی ملازمت درست ہے، کیونکہ:

☆ بنیادی طور پر اس شعبہ کے مقاصد جائز اور درست ہیں، مفاسد اس کا لازمی حصہ نہیں ہیں، بلکہ محض اتفاقات ہیں، اور حکم کا مدار وہ چیزیں بنتی ہیں جن پر شے کی اساس قائم ہو۔

☆ فوج میں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد کا رہنا مسلمانوں کے لیے اجتماعی طور پر مفید ہے اس کے ذریعہ بہت سے سیاسی اور اخلاقی مقاصد کا حصول ممکن ہے وغیرہ۔

☆ یہ روزگار کا وسیع ذریعہ ہے، ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کے لیے مناسب ملازمتوں کا حصول بہت مشکل ہوتا جارہا ہے، فوج کی ملازمت سے روک دینا معاش کے ایک بڑے دروازے کو بند کرنے کے مترادف ہوگا، وغیرہ۔

۲۔ یہی حکم پولیس کے شعبہ کا ہے، اس شعبہ کا بنیادی مقصد اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے، مگر پولیس کو بھی بعض اوقات مظلوموں پر گولی چلانی پڑتی ہے، مجرموں سے اقرار جرم کرانے کے لیے ایذارسانی کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ اچھا انسان بھی اس شعبہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی صحبت کی وجہ سے بدزبان اور ظلم وستم کا خوگر بن جاتا ہے، وغیرہ، لیکن اپنے اصل بنیادی مقاصد کی وجہ سے پولیس کی ملازمت درست ہے، اور جو خرابیاں ہیں وہ باہر سے آئی ہیں، شعبہ کا لازمی جز نہیں ہیں، وہ اصلاح طلب ہیں، ان کو دور کیا جانا چاہئے۔

نیز اگر پولیس میں مسلمان نہ ہوں تو اس سے مسلمانوں کو نقصان اور انصاف سے محرومی کا اندیشہ زیادہ ہے، علاوہ ازیں ایک بڑے ذریعہ رزق سے محرومی اختیار کرنا ہے۔

۳۔ شعبہ مخبری اور انٹلیجنس کا بھی یہی حکم ہے، اس شعبہ کا مقصد ملک کی سلامتی، امن وامان اور جرائم کی روک تھام کے لیے جدوجہد کرنا ہے، کسی بھی ملک کی یہ ناگزیر ضرورت ہے، اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے ناجائز نہیں ہیں، البتہ اس شعبہ میں کام کرنے والوں کو تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور کبھی محض شبہ کی بنیاد پر شریف شہریوں کے خلاف نازیبا کارروائی کرنی پڑتی ہے، جو اس شعبہ کا منفی رخ ہے، مگر بنیادی مقاصد کے پیش نظر اس شعبہ کی

ملازمت درست ہے، علاوہ ازیں غیبت وتجسس ہر حال میں ناجائز نہیں ہے، بلکہ بعض دفعہ کسی اہم ترین مقصد کے حصول کے لیے علماء نے غیبت وتجسس کی محدود اجازت دی ہے۔

بلکہ جنگی اور اجتماعی مفادات کے لیے فقہاء نے وقتی طور پر ناجائز حلیہ اختیار کرنے کو بھی جائز کہا ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ تحریر فرماتے ہیں:

''ویکفر . . . بوضع قلنسوۃ المجوس علی رأسہ علی الصحیح إلا لضرورۃ دفع الحر أو البرد وبشد الزنار فی وسطہ إلا إذا فعل ذلک فی الحرب وطلیعۃ للمسلمین'' (البحر الرائق باب المرتدین، ۵/ ۱۲۳)۔

(اگر کوئی شخص اپنے سر پر مجوس والی ٹوپی پہن لے تو صحیح قول کے مطابق اس کو کافر قرار دیا جائے گا، الا یہ کہ سردی یا گرمی سے بچنے یا اسی طرح کی کسی اور ضرورت کے لیے کوئی ایسا کرے، یہی حکم زنار باندھنے کا بھی ہے، الا یہ کہ مسلمانوں کے لیے جاسوسی یا جنگی تدبیر کے طور پر ایسا کیا جائے تو گنجائش ہے)۔

۴۔ اسی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے عدالتوں میں ملازمت اختیار کرنا بھی درست ہے، اگرچہ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ ہمارے ملک کا دستور یا قانون اسلامی اصولوں پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ قوانین شریعت اسلامیہ سے بھی متصادم ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی نسبت سے عدالت کا رویہ پوری طرح منصفانہ نہیں ہے، لیکن اپنے اصل اور مجموعی مصالح کے تحت یہ ملازمت درست ہے، شریعت سے متصادم قوانین کی تعداد غیر متصادم قوانین کے مقابلے میں بہت کم ہے، علاوہ ازیں مخصوص مسائل کے لیے مسلم پرسنل لا کا منظور شدہ آئین موجود ہے، اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ اگر عدالتوں میں مسلمانوں کی قابل لحاظ نمائندگی موجود نہ ہو تو مسلمانوں کے لیے بحیثیت اجتماع زیادہ مضرت کا اندیشہ ہے، اس لیے دفع ضرر کے لیے بھی اس شعبہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ضروری ہے۔

۵۔ انکم ٹیکس کے محکمہ کا بھی یہی حال ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی شرحیں ظالمانہ ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ فلاحی مقاصد کے لیے اس کا استعمال صحیح طور پر نہیں ہوتا، بعض اوقات لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلے میں تجسس بھی کرنا پڑتا ہے، ان مفاسد کے باوجود ملک کی معیشت کی بنیاد اس پر قائم ہے، ملک کی ترقی اس پر منحصر ہے، مفاسد اصلاح طلب ہیں، مگر ان کی بنا پر اس شعبہ کی افادیت واہمیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ مسلمانوں کو اس وسیع ذریعہ رزق سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

بعض نجی ملازمتیں:

بعض ملازمتیں ایسی ہیں جن کا سرکاری ہونا ضروری نہیں لیکن وہ بنیادی طور پر محرمات پر مبنی ہیں، مثلاً:

۶۔ بینک کے کاروبار کی اصل بنیاد سودی لین دین ہے، اس لیے اس میں کسی ذمہ دارانہ عہدہ کی ملازمت، یا حساب کتاب، لین دین، رقوم کی نقل وحمل وغیرہ کے شعبوں میں ملازمت عام حالات میں جائز نہیں، اس لیے کہ یہ سودی کاروبار کی کھلی اعانت ہے، جس کی صریح ممانعت آئی ہے (مسلم شریف باب الربا بروایت جابرؓ ۲/ ۲۷، وغیرہ)۔

البتہ ایسا شخص جس کے پاس بینک کی ملازمت کے سوا کوئی پاک ذریعہ رزق میسر نہ ہو، اور اس ملازمت کے ترک کردینے سے وہ اور اس کے زیر کفالت افراد سخت معاشی مشکلات سے دوچار ہوسکتے ہیں، ایسی حالت میں اس شخص کے لیے پاک رزق میسر آنے تک بادل ناخواستہ بینک کی ملازمت سے جڑے رہنے کی گنجائش ہے، لیکن لازم ہے کہ وہ شخص کسی دوسری جائز رزق کی تلاش میں فکر مند رہے، اور متبادل ذریعہ رزق ملتے ہی بینک کی ملازمت سے دستبردار ہوجائے، فقہاء نے ضرورت وحاجت کے وقت حفظ جان کے لیے ممنوعات کی بقدر ضرورت اجازت دی ہے۔

البتہ بینک میں ایسا کام جس کا تعلق سودی لین دین سے نہ ہو بلکہ دوسرے امور سے ہو مثلاً بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، ایئر کنڈیشن کی مرمت، سیکورٹی کی خدمات، بینک کے مکان کی تعمیر، اپنا مکان بینک کے لیے کرایہ پر دینا وغیرہ، یہ صورتیں دور کے تعاون کے ذیل میں آتی ہیں جن سے بچنا آج کے حالات میں بہت مشکل ہے، اس لیے ان کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، خاص طور پر حضرت امام ابوحنیفہؒ کے یہاں اس باب میں بہت لچک ہے (المبسوط، ۱۶/ ۳۸)، موجودہ حالات میں ابتلائے عام کی بنا پر امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینا لوگوں کے لیے باعث سہولت ہوگا۔

۷۔ انشورنس کمپنی خالص ربا اور قمار پر مبنی ہے، اس لیے اس میں ملازمت کا بھی وہی حکم ہوگا جو بینک میں کام کا ہے، البتہ انشورنس کی جو صورتیں جائز

نوعیت کی ہیں ان میں ملازمت بھی جائز ہونی چاہئے، مگر انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا درست نہیں ہوگا، یہ کھلم کھلا ربا وقمار میں مبتلا ہونا بلکہ اس کی دعوت دینا ہے، مجبور کن حالات میں حفظ جان کے لیے طبعی ناگواری کے ساتھ حرام رزق استعمال کرنے کی تو اجازت دی جاسکتی ہے، مگر گناہ کی دعوت کو تشہیر کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی، قرآن کریم میں معصیت پھیلانے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہے۔ (نور: ۲۱، بقرہ: ۱۶۸، آل عمران: ۱۱۴، توبہ: ۶۷)۔

۸۔ شراب کی کمپنی میں ملازمت جائز نہیں، اس لیے کہ شراب ام الخبائث ہے، اس کے اثرات دور تک پہنچتے ہیں، اسی لیے اس ذیل میں پورے دس لوگوں پر احادیث میں لعنت آئی ہے، اس لیے اس کا تعاون کرنا جائز نہیں، جائز رزق کی کوئی اور صورت تلاش کرنی چاہئے۔

وہ صورتیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے جائز ہیں:

بعض صورتیں ایسی ہیں جو حلال کاروبار پر مبنی ہیں مگر ضمنی طور پر وہاں حرام کام بھی کئے جاتے ہیں مثلاً:

۹۔ سپر مارکیٹ، جس میں زندگی کی مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں اور اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے، ایسے سپر مارکیٹ میں ملازمت جائز ہے، بشرطیکہ اس کا کام شراب یا اس جیسے کسی ناجائز حصے سے متعلق نہ ہو۔

۱۰۔ تدریس ایک معزز اور اہم ترین پیشہ ہے، اور اس کے لیے سرکاری وغیر سرکاری درسگاہوں میں ملازمت کرنا درست ہے بشرطیکہ جائے ملازمت پر کوئی شرعی قباحت موجود نہ ہو، مثلاً عورت ومرد کا مخلوط نظام تعلیم نہ ہو، مشترکہ ماحول نہ ہو وغیرہ، ورنہ ملازمت جائز نہ ہوگی، لیکن اس قباحت کے باوجود اگر کوئی ملازمت کرے تو اس سے حاصل شدہ کمائی حلال ہوگی، اس لیے کہ اجرت کا تعلق اس کی محنت وعمل سے ہے، اور قباحت کا تعلق خارج سے ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی معاملہ کی بنیاد ناجائز عقد پر ہو اور اس سلسلے میں کی جانے والی محنت پر اجرت حاصل ہو تو اجارہ فاسد ہونے کے باوجود کمائی اس کے لیے جائز ہوگی:

"وان استاجرها ليزني بها ثم اعطاها مهرها او ما شرط لها لا باس باخذه لانه اجارة فاسدة فيطيب له وان كان السبب حراما" (البحر الرائق، ۸/ ۱۹)۔

۱۱۔ ایک اہم پیشہ وکالت کا ہے، وکیل کا مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے، یہ بہت پاک مقصد ہے، اور مسلمانوں کے لیے یہ پیشہ اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ مظلوم کے مقابلے میں ظالم کا تعاون نہ ہو، کذب وفریب سے اس کا معاملہ پاک ہو، اور صرف حق کی خاطر اس پیشہ کو اختیار کیا جائے۔

۱۲۔ انسانی خدمت کا ایک اہم ذریعہ علاج وطبابت ہے، اس شعبہ میں سرکاری اور غیر سرکاری ہاسپیٹلوں میں ملازمت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ ان برائیوں سے حتی الامکان اپنے آپ کو محفوظ رکھے جو آج کل بعض طبی اداروں میں در آئی ہیں، مثلاً محض آمدنی بڑھانے کے لیے مختلف جانچ کے لیے مریضوں کو مجبور کرنا، بلاضرورت آپریشن کیس بنانا، بلاضرورت مرد ڈاکٹر کو عورت کے علاج کے لیے اور خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے علاج کے لیے مقرر کرنا وغیرہ۔

۱۳۔ ذرائع مواصلات کی ترقی، سیاحت کے بڑھتے رجحان، اور مسافروں کی ضرورت کے لحاظ سے "ہوٹل" موجودہ دور کی ضرورت بن گئے ہیں، اور یہ اس وقت ایک نفع بخش تجارت بھی ہے، ہوٹلوں کا بنیادی مقصد معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے، لیکن بڑے ہوٹلوں میں بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں جو شرعا جائز نہیں ہیں: جیسے شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کرنا جائز ہے بشرطیکہ ان برائیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے، بصورت دیگر ایسے ہوٹلوں میں کام کرے جو ان قباحتوں سے پاک ہوں۔

....

مختلف قسم کی ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

مولانا محمد ظفر عالم ندوی [1]

مختلف قسم کی ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام پر گفتگو کرنے سے قبل موجودہ ہندوستان اور اس میں بسنے والے مسلمانوں کے حالات اور مسائل کی طرف ہم اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، تا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر احکام شرعی کا صحیح انطباق اور تعین ہو سکے، ہم سب یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان اس وقت دارالاسلام نہیں ہے، اور نہ یہاں اسلامی قانون کو بالادستی حاصل ہے بلکہ یہاں کے قوانین اور ان کو نافذ کرنے والے حکمراں اسلامی قوانین اور اسلامی سلطنت کے اصول اور ڈھانچوں سے یکسر جدا ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس وقت طرح طرح کے پیچیدہ مسائل اور سخت مشکلات سے دوچار ہیں، ان کے لیے اسلامی شریعت پر عمل کرنے کے مواقع تو درکنار بلکہ طرح طرح کی رکاوٹیں خود حکومت اور اکثریتی طبقہ کی طرف سے مسلسل کھڑی کی جاتی ہیں، جن کی وجہ سے انہیں اپنا دینی، ملی اور تہذیبی تشخص بچانا دشوار ہو رہا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان تعلیمی، معاشی، سیاسی، تجارتی اور روزگار کے دیگر تمام میدانوں میں دن بدن پیچھے جارہے ہیں اور ان کے مجموعی حالات کافی تشویشناک اور مایوس کن ہو چکے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حالات جیسے بھی ہوں اسلامی عقیدے کے حامل انسان کے لیے دین وشریعت کا پابند ہو کر ہی زندگی گزارنا ضروری ہے، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: "المسلم ملتزم باحکام الاسلام حیث ما کان" (مسلمان جس مملکت اور جن حالات میں بھی رہتے ہوں انہیں احکام شرع کا پابند رہنا ہے)، مسلمانوں کی اصل شناخت بھی یہی ہے کہ زندگی کے کسی مرحلہ میں شریعت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

البتہ ایسے وقت میں فقہاء اسلام کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ حالات کا جائزہ لے کر امت کے مسائل پر احکام کی ایسی تطبیق وتشریح کریں کہ ان کے لیے ان احکام پر چلنا اور ان کا پابند رہنا آسان ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس جانب کھلی رہنمائی فرما کر ایک ٹھوس قانونی اساس بھی فراہم کردیا ہے، اس کا فرمان ہے: "لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" (سورۂ بقرہ) گویا حکیم مطلق نے فقہاء اسلام کے لیے امت کے مسائل حل کرنے کی ایک شاہ کلید دے دی ہے کہ ہر زمانہ میں امت کی حالت اور ان کی طاقت کے مطابق ان کو احکام کا پابند بنایا جائے، پھر اولین فقہاء کرام نے کتاب وسنت کی روشنی اور شریعت کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے اصول وقواعد مرتب فرما دیئے ہیں جن کی روشنی میں ہم ہر ملک اور ہر قسم کے حالات میں امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

اس تمہیدی کلام کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ موجودہ ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے کہ ہم سارے احکام من وعن دارالاسلام کے یہاں نافذ کرسکیں بلکہ فقہاء کے یہاں مختلف دور کے احکام ملتے ہیں جن میں حالات کے پیش نظر واضح فرق موجود ہیں۔

اس وقت مسلمان ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ اقلیت کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں، اور زندگی کے تمام شعبوں میں ان کے ساتھ کافی امتیازی سلوک بھی برتے جارہے ہیں۔

اس پس منظر میں اگر مسلمانوں کو کوئی عہدہ اور ملازمت ملتی ہے تو خود ان کے لیے اور ان کے دینی بھائیوں کے لیے یہ بہت بڑا سہارا ہے، تاہم قرآنی اصول: "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (مائدہ) پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں زندگی کے میدان میں اترنا

---

[1] استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

چاہئے ،ان چند کلمات کے بعد اب جوابات ترتیب وار درج ذیل ہیں:

ا۔الف: فوج کی ذمہ داری اصل ظالموں سے ملک کی حفاظت کرنا ہوتا ہے،اور اسی کا ان سے معاہدہ ہوا کرتا ہے اور کبھی کبھی ہنگامی حالات میں اندرون ملک میں شورشوں اور فسادات پر کنٹرول کا کام بھی لیا جاتا ہے، بلاشبہ یہ دونوں کام ایسے ہیں کہ شریعت اسلامی نہ صرف ان کی اجازت دیتی ہے، بلکہ اگر نیک نیتی کے ساتھ انسانیت کی خدمت اور ملک کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا جائے تو اسے کار ثواب بھی سمجھتی ہے۔

اس لیے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کو فوج میں رہنا ملکی مفاد کے علاوہ خود مسلمانوں کے لیے مفید ہے، یہاں مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت اختیار کرنا درست اور کار ثواب ہے۔

اس مسئلہ میں ماضی قریب میں مفتی محمود صاحبؒ نے بہت ہی واضح انداز میں جواز کا فتویٰ دیا ہے:

سوال (۹۱۴۸) اپنے ملک ہندوستان میں فوج میں مسلمانوں کو ملازمت کرنا کیسا ہے؟ نیز جو مسلمان فوج میں بھرتی ہے اور جبکہ اپنے ملک ہندوستان کا کسی مسلم یا غیر مسلم ملک سے مقابلہ ہو جائے اور جنگ شروع ہو جائے اور یہ مسلم فوجی شخص اپنے ملک ہندوستان کی طرف سے جنگ میں ختم ہو جائے تو اس مسلم مرحوم فوجی کو درجہ شہادت کا مستحق سمجھا جائے گا یا نہیں؟

جواب: ظالموں سے ملک کی حفاظت کے لیے فوج میں ملازمت کرنا درست ہے، اگر کسی ظالم نے چڑھائی کردی اور یہ دفاع کرتا ہوا قتل ہو گیا تو انشاءاللہ قتیل شہید ہوگا،"من قتل دون ماله ومن قتل دون دمه ومن قتل دون عرضه" ان سب کو شہید فرمایا گیا ہے۔

غلط کام کے لیے ملازمت کرنا اور لڑنا جائز نہیں اس پر شہادت کی امید رکھنا بھی غلط ہے شہادت تو کیا ملتی ہے بعض صورتوں میں ایمان کا سلامت رہنا بھی دشوار ہے۔(فتاویٰ محمودیہ، ۱۵۰، ۱۴۹)۔

اس فتویٰ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں کسی مسلمان کے لیے فوج کی ملازمت کرنا درست ہے، البتہ صحیح طور پر جنگ کی تو اس کا اجر ملے گا اور اگر غلط طریقہ اختیار کیا تو بجائے ثواب کے عقاب کا مستحق ہوگا۔

ب۔ پولیس کی بھی ذمہ داری دراصل ملک کے اندر امن وامان قائم رکھنے اور ظلم وفساد روکنے کی نیت سے جو مسلمان پولیس کی ملازمت کرے گا تو یہ ملازمت جائز اور وہ شخص ثواب کا مستحق ہوگا اس میں کوئی شک نہیں کہ پولیس کی زیادتیاں ہمارے ملک میں عام ہیں اور یہ زیادتیاں عموماً مسلمانوں کے ساتھ ہوا کرتی ہیں، اگر اس شعبہ میں فرض شناس مسلمانوں کی معتد بہ تعداد آجاتی ہے تو یہ صرف ملازمت ہی نہیں بلکہ ملک اور انسانیت کی خدمت کا بہترین میدان ہے۔

ج۔ جاسوسی اور مخبری اگر نیک جذبہ کے ساتھ ظالم ومظلوم کی شناخت کرنے، ملک میں امن وامان قائم رکھنے اور جرائم کی روک تھام کے لیے کی جائے تو یہ بھی ایک بہتر فریضہ کی انجام دہی ہے، اس لیے اگر کوئی مسلمان "تعاون علی البر والتقوی" کے جذبہ سے مخبری اور انٹیلی جنس کی ملازمت کرے تو یہ درست ہے۔

دشمنوں کا حال معلوم کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات کے موقع سے بعض صحابہ کرامؓ سے مخبری کا کام لیا ہے اس لیے صالح مقاصد کی خاطر اس کی اجازت ہوگی، البتہ اگر کوئی مسلمان غلط تجسس اور غیبت کا مرتکب ہوا تو اس کا گناہ یقیناً ہوگا اور عنداللہ مواخذہ بھی ہوگا تاہم اس کی ملازمت درست ہوگی۔

د۔ موجودہ ہندوستانی عدالتوں کے مسلمانوں کے تعلق سے جو رویے ہیں اور مسلمان اس ملک میں جن حالات سے گزر رہے ہیں اس پس منظر میں اگر کوئی مسلمان کسی عدالت میں عدل اور انصاف قائم کرنے کی نیت سے ملازمت اختیار کرنا یا جج کی کرسی تک پہنچتا ہے تو شرعاً اس کی اجازت ہوگی اور یہ بھی "تعاونوا علی البر والتقوی" کے دائرہ میں آئے گی۔

ھ۔ انکم ٹیکس کی شرحیں بلاشبہ زیادہ ہوا کرتی ہیں عام طور پر لوگ اس کو جبر محسوس کرتے ہیں، لیکن چونکہ حکومت اپنی ضروریات کی خاطر اور عوامی فلاح کی غرض سے لیتی ہے، اس لیے اس میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنے میں کوئی حرج نہیں عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی ہے، شرحوں کا زیادہ ہونا یہ حکومت کی زیادتی تو تصور کی جائے گی لیکن اہم ضروریات کے پیش نظر یہ ٹیکس لیا جاتا ہے اس لیے اس میں جواز کے بھی پہلو ہیں، لہٰذا اس محکمہ میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ سود کی حرمت کتاب وسنت میں بہت ہی واضح الفاظ میں آئی ہے اللہ تعالیٰ نے "حرم الربا" کہہ کر اس کی حرمت کی صراحت کردی ہے، ساتھ ہی الٹی میٹم بھی دے دیا کہ جو باز نہیں آئے وہ خدا سے جنگ کے لیے تیار رہے، "فاذنوا بحرب من الله" حدیث نبوی میں اس کی سخت شناعت آئی ہے، ترمذی میں سود کھانے کھلانے والوں کے علاوہ اس کے گواہوں اور کاتبوں پر بھی لعنت آئی ہے۔

''لعن رسول الله ﷺ أكل الربوا وموكله وشاهديه وكاتبه'' (ترمذی، ۱/۲۲۳، ابواب البیوع)۔

اس روایت میں کاتب پر لعنت کی صراحت ہونے کی وجہ سے علماء نے ان تمام لوگوں کی ملازمت کو ناجائز کہا ہے جو بنک میں حسابات کا کام کرتے ہیں، ان کے علاوہ دیگر لوگ جو بینک کے کاروبار میں جس طرح بھی براہ راست تعاون کرتے ہیں ان کی ملازمت کو بھی ناجائز قرار دیا ہے اور آیت قرآنی "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (مائدہ:۲) کے زمرہ میں شامل فرمایا ہے، لہٰذا بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے ہوئے بینک کی مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا وغیرہ بھی ممنوع ہوگا، اگرچہ یہ کام براہ راست تعاون کے زمرہ میں نہیں ہے، لیکن بالواسطہ بینک کا تعاون کر کے سودی لین دین ہی میں تعاون کرنا ہے، اس مسئلہ میں مفتی محمد شفیع صاحب کی تحقیقی تحریر (جواہر الفقہ، ۲/ ۴۵۱ تا ۴۵۶) میں موجود ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مکان بینک کو بغیر علم کے کرایہ پر دیا گیا تو یہ ناجائز نہیں، لیکن علم کے باوجود دیا گیا تو یہ اجرت کراہت سے خالی نہیں، بلکہ بینک کی ضرورت کے مطابق کمرے وغیرہ بنا کر دیا ہے تو یہ مکروہ تحریمی ہے۔

مفتی صاحب مرحوم لکھتے ہیں: اگر کسی کو یہ علم نہ ہو کہ اجارہ پر لینے والا اس میں بینک بنائے گا تب تو بلا کراہت جائز ہے اور اگر علم ہے تو مکروہ ہے، البتہ کراہت تحریمی وتنزیہی کا معاملہ محل غور ہے، اگر یہ دیکھا جائے کہ بنانے والے نے بینک کی مناسبت سے کمرے بنوائے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کراہت تحریم ہے اور اگر یہ سمجھا جائے کہ ایسے کمرے صرف بینک کے لیے ہی نہیں دوسرے کاموں اور دفاتر کے لیے بنتے ہیں تو کراہت تنزیہ کہا جاسکتا ہے (جواہر الفقہ، ۲/ ۴۵۶)۔

ب۔ انشورنس کمپنی کا کاروبار بنیادی طور پر سود اور قمار پر مبنی ہے، مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کا اس پر واضح فیصلہ مستند اہل علم وفقہ اور ارباب افتاء کے دستخط کے ساتھ موجود ہے، البتہ سرکاری یا غیر سرکاری ملازموں کو جبری طور پر مجبوراً اس میں ملوث ہونا پڑتا ہے، وہ حرمت کے حکم سے یقیناً مستثنیٰ ہیں، اور اس کی گنجائش ہے تاہم اس طرح کی کمپنیوں میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بھی سود اور قمار کے معاملہ میں تعاون کرنا ہے جو "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" کے دائرہ میں ہے، اسی طرح انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ یہ سود وقمار کے معاملہ میں تعاون کرنا ہے۔

ج۔ چونکہ شراب کی حرمت بھی آیت قرآنی میں صراحۃً ہے، اس لیے شراب کے کاروبار اور لین دین میں کسی طرح کا تعاون کرنا تعاون علی الاثم والعدوان ہے اور اس کی ملازمت بھی درست نہیں ہے، خواہ براہ راست تعاون والی ملازمت ہو یا بالواسطہ والی ملازمت، ترمذی کی روایت ہے: "لعن رسول الله ﷺ في الخمر عشرة عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة اليه وساقيها وبائعها وأكل ثمنها والمشتري لها والمشتري له" (ترمذی، ۱/ ۲۴۳)، یہ اور اس طرح کی دوسری روایتوں اور فقہی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محکمہ شراب کے کسی شعبہ میں ملازمت درست نہیں ہے، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے۔

۳۔الف: سپر مارکیٹ میں غالب کاروبار جائز اور مباح سے متعلق ہیں، اگرچہ اس کے ضمن میں قانونی مجبوری کی وجہ سے بعض ممنوع چیزیں بھی ہوتی ہیں، اس لیے غالب کا اعتبار کرتے ہوئے اس طرح کے مارکیٹ میں ملازمت کرنا درست ہوگا۔

ب۔ عصری درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کا رواج ہے وہاں تدریسی فریضہ انجام دینا خود انجام دینے والے کے تقویٰ پر مبنی ہے اگر ان کو لڑکوں کو بھی پڑھانے کی مجبوری ہے تو اپنے قلب و دماغ اور نظر کو کسی طرح کے گناہ کی پر چھائیوں سے محفوظ رکھتے ہوئے پڑھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاہم اگر ممکن ہو تو لڑکیوں کو پردے کے احکام پر عمل کرنے پر آمادہ کیا جائے اور پردے کے ساتھ پڑھایا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے، لیکن مجبوری میں کامل پردہ نہ کرنے والی طالبات کو پڑھانے میں اپنے کو محفوظ رکھتے ہوئے کوئی حرج نہیں ہے، یہی حکم لڑکیوں کے مخصوص اداروں کی تعلیم کا بھی ہے، خواتین اساتذہ پردہ کے ساتھ بالغ لڑکوں کو پڑھا سکتی ہیں، لیکن بے پردگی کے ساتھ اجازت نہ ہوگی اگر کوئی ادارہ بغیر پردہ کے پڑھانے پر مجبور کرے تو پھر وہاں ملازمت خواتین کے لیے درست نہ ہوگی اور آپ پر آیات حجاب کے احکام پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

ج۔ مسلمانوں کے لیے وکالت کا پیشہ اختیار کرنا جائز ہے، البتہ وکیل کے اپنے عمل پر جواز اور عدم جواز کا حکم موقوف ہوگا، اگر وہ مظلوم کی مدد کر رہا ہے اور ظالم کو سزا دلوانے کی کوشش کر رہا ہے تو ان کی یہ کوشش درست اور ذریعہ اجر و ثواب ہوگی لیکن اگر ظالم کو بری کرنے کی وکیل کوشش کرتا ہو تو شرعاً یہ کوشش یا ظالم کی مدد نا جائز اور عند اللہ مواخذہ کا سبب بنے گا۔

د۔ طبابت کا پیشہ اپنی اصل کے اعتبار سے درست ہے، اور اگر طبیب اچھی نیت اور خدمت خلق کے جذبہ سے علاج و معالجہ کر رہا ہو تو یہ باعث اجر و ثواب ہے اگر محض روپے کمانے اور ذخیرہ اندوزی کے جذبہ سے طبیب علاج کر رہا ہو تو یہ ممنوع اور قابل مواخذہ ہے، اسی طرح ہاسپیٹلوں میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنا درست ہے، لیکن وہاں بھی وہی شرعی حدود ہیں، جو عام مقامات پر ہیں، طبیب کے لیے مریض کے قابل ستر حصہ کو بربنائے ضرورت علاج دیکھنے کی اجازت ہوگی، بلاضرورت اس کی اجازت نہ ہوگی۔

ھ۔ ایسے ہوٹل جہاں شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام اور رقص و موسیقی کی سہولت اور بے پردہ سوئمنگ پول ہوں وہاں کسی مسلمان کے لیے ملازمت کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ کوئی ایسی ملازمت نہیں ہے جس کے بغیر بقاء حیات نہ ہو اور نہ ہی اس سے مسلمانوں کا دینی و ملی مفاد وابستہ ہے، بلکہ ملازمت کے لیے ایسے متبادل ہوٹل یقیناً مل جائیں گے جہاں یہ مفاسد نہ ہوں، اس لیے جن ہوٹلوں میں منکرات ہوتے ہوں وہاں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

ملازمتوں کے اقسام واحکام

ڈاکٹر بہاء الدین ندوی[1]

۱۔ فوج کی ملازمت کے بارے میں ہمارا ملاحظہ یہ ہے کہ چونکہ ہندوستان اسلامی ملک نہیں ہے، لہٰذا یہاں اسلام کا نظام نافذ نہیں کر سکتے، لیکن اگر کوئی ہم پر زیادتی کرتا ہے تو اس کا دفاع کرنے کا حق ہمیں ہے، اس لحاظ سے ایک آدمی فوج میں ملازم ہوسکتا ہے، بشرطیکہ غیر اسلامی عمل کا مرتکب نہ ہو، فقہاء لکھتے ہیں:

''یجوز للشخص دفع کل صائل مسلم و کافر مکلف وغیرہ علی معصوم من نفس أو طرف او منفعة'' (فتح المعین مع اعانة الطالبین، ۴/ ۲۶۲)۔

۲۔ پولیس کی ملازمت کے بارے میں بھی غور طلب بات یہ ہے کہ پولیس کی ڈیوٹی فی الحقیقت کیا ہے، عام طور پر پولیس لوگ حکومت کے اوامر کو نافذ کرنے والے ہیں، اس لحاظ سے ایک پولیس کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی فرصت ملتی ہے، لہٰذا اسلامی طور طریقہ پر عمل کرتے ہوئے پولیس میں کام کرنا جائز ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی عدالت میں ملازمت صرف اس صورت میں جائز ہوسکتی ہے کہ وہ کسی بھی غیر اسلامی عمل کا مرتکب نہ ہو، مثلاً جھوٹ بولنا حرام ہے، لیکن توریہ کی حیثیت سے جھوٹ کو جواز بنا سکتے ہیں، اور کبھی کبھی جھوٹ بولنا جائز بھی ہوتا ہے، فقہاء لکھتے ہیں:

''الکذب حرام... وقد یجوز، کما لا یتم مقصود حرب واصلاح ذات البین وارضاء زوجته'' (فتح المعین)۔

۴۔ چونکہ بینک اصل میں سود کی جگہ ہے، لہٰذا بینک کی ملازمت بھی حرام ہے، حدیث میں ہے:

''لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا ومؤکله وکاتبه وشاھدیه''۔

امام نووی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''ھذا تصریح بتحریم کتابة المبایعة بین المترابیین والشھادة علیھما وفیه تحریم الاعانة علی الباطل واللہ اعلم''

۵۔ بینک کی کمپیوٹر وغیرہ کی مرمت کرتے وقت تحقیق طلب بات یہ ہے کہ بینک اس کو اجرت کس رقم سے دیتا ہے، اگر سود کی رقم سے دیتا ہے تو حرام ہے، ورنہ حرام نہیں، کیونکہ ایک ایسے آدمی سے جس کے پاس حلال مال بھی ہے اور حرام بھی معاملہ کرنے کے بارے میں فقہاء لکھتے ہیں:

''ویکرہ معاملة من بیدہ حلال و حرام وان غلب الحرام الحلال، نعم ان علم بتحریم ما عقد به حرم وبطل'' (فتح المعین)۔

۶۔ مرد ڈاکٹر عورت کو اور عورت ڈاکٹر مرد کو علاج کے لیے چند شرائط ہیں، فقہاء لکھتے ہیں: ''ویباحان ای المس والنظر لفصد وحجامة وعلاج للحاجة الی ذلك ولیکن ذلك بین یدی الرجل والمرأة بحضور محرم أو زوج، ویشترط أن لا توجد امرأة تعالج المرأة أو رجل یعالج الرجل وأن لا یکون ذمیا مع وجود مسلم'' (شرح المنہاج للمحلی، ۳/ ۲۱۲)۔

۷۔ ایک اجنبی مرد کا اجنبی عورت کو تعلیم دینے کے بارے میں شافعی فقہاء لکھتے ہیں:

''ویباح النظر للوجه فقط لمعاملة وشھادة وتعلیم لأمرد وأنثی کما صرح به السیاق... وانما یظھر فیما یجب تعلمه وتعلیمه کالفاتحة وما یتعین فیه ذلك من الصنائع المحتاج الیھا بشرط فقد جنس ومحرم صالح وتعذرہ من وراء حجاب ووجود مانع خلوة أخذا مما مر فی العلاج'' (تحفة المحتاج، ۷/ ۲۰۲)۔

---

[1] دار الہدیٰ اسلامک یونیورسٹی، کیرالا۔

حکومت کے بعض اداروں میں ملازمت کرنے کا شرعی حکم

مفتی عبداللہ کاودی [1]

۱۔الف: حکومت کا ایک شعبہ فوج ہے جس کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور غیر معمولی حالات میں اندرون ملک امن وامان قائم رکھنا ہے، ظاہر ہے کہ فی نفسہ یہ بہتر مقاصد ہیں، لیکن بعض دفعہ فوج کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کیے بغیر وار کرنا پڑتا ہے، اس نئے زمانہ میں ٹیکنالوجی آلات کی وسعت کی بناء پر اپنے وطن کی حفاظت کے لیے جب دوسرے ملک پر حملہ کرنا پڑتا ہے، ایسی صورت میں اپنے مدمقابل کو پہچاننا بڑی مشقت کی بات ہے، ایسی صورت میں ظالم ومظلوم کی پہچان نہیں ہوسکتی اور فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے کہ جیسا کہ تاتارخانیہ میں ہے:

"وإذا أمر الأمير العسكر بشئى كان على العسكر ان يطيعوه فى ذلك" (تاتارخانیہ، ۴/۱۰۸)۔

لیکن جہاں پر مسلمانوں اور ہندوؤں کی بستی الگ الگ ہو اور معلوم بھی ہو کہ ہندو ظالم ہیں اور مسلمان مظلوم ہیں پھر بھی اگر کمانڈر حکم دے کہ مسلمانوں کی بستی میں جاؤ اور جو ملے اسے پکڑ کر لاؤ اور اُسے جیل خانہ میں بند کردو تو ایسی صورت میں کمانڈر کے حکم کو ماننا ضروری نہیں ہے کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے: "لا طاعة لمخلوق فى معصية الخالق" اگر مخلوق کی اطاعت کرنے میں خالق کی معصیت ہوتی ہو تو ایسی صورت میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی اور اسی طریقہ سے تمام معصیت کی جگہوں میں کمانڈر کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

اسی طرح بعض دفعہ ایک مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہوتا ہے اگر چہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو ایک مسلمان فوجی کو چاہئے کہ حتی الامکان لڑائی نہ کرے لیکن اگر مدمقابل حملہ کرتا ہے اور وہ رکتا نہیں ہے تو وطن کی حفاظت کے خاطر اس پر حملہ کرے، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان اور ہندو میں جنگ ہوتی ہے تو ہندو مسلمان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو آگے کردیتے ہیں تا کہ مسلمان حملہ نہ کریں لیکن اجتماعی مصلحت کے پیش نظر ہندوؤں کی نیت کرتے ہوئے ان پر حملہ کرے۔

ان تمام احکام کی پابندی کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے فوج کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔

ب۔ فوج ہی سے قریب دوسرا شعبہ پولیس کا ہے، جس کا بنیادی مقصد اندرون ملک امن وامان کو قائم رکھنا ہے، پولیس کو بھی بعض اوقات مظلوموں پر گولی چلانی پڑتی ہے، لیکن وہ مجبوراً چلانی پڑتی ہے، اور حالات کو سازگار بنانے کے لیے چلانی پڑتی ہے، اور وہ بھی اپنے بڑے افسر کے حکم سے چلانی پڑتی ہے، مجرموں سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے ایذارسانی کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب مجرم اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتا، لیکن جو شخص اپنے جرم کا اقرار کرلیتا ہے اس کو ایذارسانی نہیں کرنی پڑتی ہے، بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم واقعہ میں مجرم نہیں ہوتا ہے، پھر بھی زبردستی اس سے اقبال جرم کرایا جاتا ہے، یہ سراسر ظلم ہے، قیامت میں اس کا حساب لیا جائے گا۔

اور خیال کیا جاتا ہے کہ اچھا انسان بھی اس شعبہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی صحبت کی وجہ سے بدزبان اور ظلم وجور کا خوگر بن جاتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں مسلمان پولیس کو ایسے ساتھیوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہئے، البتہ شریعت کے احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے اور مسلمانوں کی مدد کرنے کے ارادے سے اس شعبہ میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، بلکہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

ج۔ حکومت کا ایک اہم شعبہ مخبری اور انٹیلیجنس بھی ہوتا ہے، ملک کی سلامتی، امن وامان کا قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ اس شعبہ میں ملازمت کرتے ہیں، انہیں تجسس اور غیبت کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات محض شبہ کی وجہ سے شریف شہریوں کے خلاف بھی ایسی کارروائی کی ضرورت پڑجاتی ہے، ان حالات میں کیا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ میں ملازمت کرسکتا ہے، جبکہ اس میں تجسس اور غیبت بھی کرنی پڑتی

---

[1] دارالعلوم کنتھاریہ، بھروچ، گجرات۔

ہے مگر یہ تجسس اور غیبت ملک کی سلامتی اور امن وامان کی خاطر ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ اس کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے، کیونکہ ایک جنگ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو دشمنوں میں تجسس کے لیے بھیجا تھا اور حضرت عمر فاروقؓ بھی ملک کے امن وامان کے خاطر تجسس کیا کرتے تھے، اور معارف القرآن میں ہے کہ مثلاً کسی شخص کی برائی کسی ضرورت یا مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں، بشرطیکہ وہ ضرورت اور مصلحت شرعاً معتبر ہو، جیسے کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو ظلم کو دفع کر سکے، خلاصہ یہ ہے کہ کسی کی برائی اور عیب کرنے سے مقصد اس کی تحقیر نہ ہو بلکہ کسی ضرورت ومجبوری سے کیا گیا ہو (معارف القرآن، ۸/ ۱۲۳)، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک کی حفاظت اور امن وامان کو قائم رکھنے کے لیے اگر مخبر کو غیبت کرنی پڑے تو جائز ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت کے احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے اس شعبہ میں ملازمت کرنا جائز ہے۔

د۔ انصاف کی فراہمی ظلم وحق تلفی کی روک تھام اور نزاعات کو طے کرنے کے لیے عدلیہ کا نظام قائم ہے اور ہر مہذب معاشرہ کے لیے اس نظام کا وجود ناگزیر ہے، عدالتیں بنیادی طور پر دستور کی تشریح اور تصفیہ طلب واقعات میں ان کی تطبیق کا کام کرتی ہیں اور یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہمارے ملک کا دستور یا قانون، کتاب اللہ اور سنت رسول پر مبنی نہیں ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اگر کوئی مسلمان اس نیت سے اس میں نوکری کرے کہ میں مسلمانوں کی مدد کروں گا اور ان کی رہنمائی کروں گا ویسے ہی مسلمانوں کا کوئی حامی نہیں ہوتا ہے اور ہر طرح سے ان کے کیس کو آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا ہے، ان کو پھنسایا جاتا ہے تو اگر کوئی مسلمان کی مدد کے ارادے سے اس شعبہ میں نوکری کرے تو جائز ہے، فقہ کا قاعدہ ہے: الامور بمقاصدھا، اس قاعدے کی رو سے بھی اس میں نوکری کرنا جائز ہے۔

ھ۔ کوئی حکومت عوامی ٹیکس کے بغیر اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتی، ٹیکس کی ایک صورت وہ ہے جسے انکم ٹیکس کہا جاتا ہے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں انکم ٹیکس کی جو شرحیں رکھی گئی ہیں وہ ظالمانہ ہیں، تو ایسی صورت میں حکومت کے ایسے محکمہ میں نوکری کرنا ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے: "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق" (اللہ کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی)، لیکن فقہ کا ایک دوسرا قاعدہ بھی ہے: "الأمور بمقاصدها" تو اگر کوئی مسلمان اس نیت سے اس میں نوکری کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کرے گا اور مسلمانوں سے جتنا ہو سکے گا کم ٹیکس وصول کرے گا اور ٹیکس سے بچنے کی صورتیں ان کو بتائے گا تو اس نیت سے اس محکمہ میں نوکری کرنا ایک مسلمان کے لیے جائز ہے، لیکن ایک سوال یہ ہے کہ انکم ٹیکس کے لیے بعض اوقات لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تجسس بھی کرنا پڑتا ہے تو اگر حکمران عادل ہو اور ان کا مقصد عوامی فلاح پر پیسے خرچ کرنا ہے، اپنی عیش کوشی اور سہولتوں پر خرچ کرنا نہیں ہے تو عمومی فائدے کے تحت لوگوں کے نجی معاملات اور دولت کے سلسلہ میں تجسس کرنا صحیح ہے، لیکن اگر ان کا مقصد ضرر رساں ہے تو فقہ کا قاعدہ ہے: "لاضرر ولاضرار" تو اس قاعدے کی رو سے تجسس کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔الف: بینک اصل میں سودی لین دین کا بنیادی طور پر کاروبار کرتا ہے، لیکن اگر ایک شخص ہبہ کا لین دین اور سودی حسابات کو نہ لکھتا ہو اور کوئی کام کرتا ہو، جیسے بینک کے کمپیوٹر کی مرمت، بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت، بینک کی حفاظت، جانتے بوجھتے ہوئے بینک کے مکان کی تعمیر یا اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دینا، یہ تمام صورتیں سودی معاملات کے تعاون میں شمار نہیں کی جائے گی، اور اس نوعیت کی ملازمت جائز ہوگی، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لعنت فرمائی ہے وہ سود کے لینے والے، دینے والے، لکھنے والے، اور اس کے گواہان اور اس کے واسطہ بننے والے پر، "عن جابر قال: لعن رسول الله ﷺ: أكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء" (بخاری)، اور مندرجہ بالا جو کام شمار کئے گئے ہیں وہ ان میں شامل نہیں ہیں، یہ چیزیں نفس عمارت کی حفاظت وغیرہ پر مامور ہیں (کتاب الفتاویٰ، ۵/ ۳۹۰)۔

ب۔ انشورنس کمپنی کا کاروبار ربا اور قمار پر مبنی ہے، البتہ انشورنس کی ایسی شکلیں جس میں واقعہ پیش نہ آنے کی صورت میں پالیسی ہولڈر کو رقم نہ ملتی ہو، جیسے میڈیکل انشورنس یا حادثہ انشورنس، یا جو انشورنس جبری نوعیت کا ہو، بعض اہل علم اس کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن یہ اس صورت میں جبکہ کوئی شخص کسی کمپنی میں کام کرتا ہے اور حکومت کے قانون کی وجہ سے مجبور ہے اور انشورنس کروانا ضروری ہے تو ایسے حالات میں وہ انشورنس تو کروائے لیکن جو رقم اس کو ملے گی تو جتنی رقم اس نے جمع کی ہے اتنی مقدار تو لے لے یا اس کے لیے جائز ہے اور جو زائد ہے اس کو صدقہ کر دینا واجب ہے۔

انشورنس کمپنی میں ملازمت جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ قمار اور ربا پر مبنی ہے، انشورنس کی تمام صورتوں کے لیے ایک ہی حکم ہے، اس لیے کہ اس میں ربا اور قمار

ہے، لیکن بعض حالات میں جائز ہے، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے: "المشقة تجلب التيسير، الضرورات تبيح المحظورات"، ان دو قاعدوں کی رو سے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ایسی جگہ دوکان ومکان ہے جہاں پر فسادات ہوتے رہتے ہیں اور جان ومال کا خطرہ رہتا ہے تو ایسی صورت میں فقہاء کرام نے انشورنس کو جائز قرار دیا ہے، لیکن جتنا اس کو نقصان ہوا ہے اسی کے بقدر رقم لینا جائز ہے، ہاں مگر اس کو لیتے وقت کراہت کا اظہار بھی کرے، کیونکہ اصل میں یہ سود اور قمار ہے، البتہ اس کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا درست نہیں ہے کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے، اور تعاون علی الاثم جائز نہیں ہے۔

ج۔ شراب کی کمپنی میں خرید وفروخت اور شراب کی بوتل بنانا اور حساب کتاب یا شراب کی کمپنی کو وہ اجزاء پیش کرنا جن سے شراب بنائی جاتی ہے یہ تمام صورتیں جائز نہیں ہیں، اس لیے کہ قرآن کریم کی آیت ہے: "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" اور ایک دوسری آیت ہے: "انما الخمر والميسر والانصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان"۔ ان دو آیات کی بناء پر شراب کی خرید وفروخت کرنا حرام ہے اور جو چیز اس کے معاون ومددگار بنے وہ بھی حرام ہے، ہاں ایسی چیزیں جن سے شراب بھی بنتی ہو، اور دوسری چیزیں بھی بنتی ہوں تو ان چیزوں کا کمپنی کو بیچنا حرام نہیں ہے، ان مختلف کاموں میں ملازمت کا حکم یکساں رہے گا کیونکہ یہ تمام کام تعاون علی الاثم میں داخل ہے۔

۳۔الف: سپر مارکیٹ جس میں زندگی مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں اور اس میں ایک گوشہ شراب کا بھی ہے تو ایسے شراب کا بھی ہے تو ایسے سپر مارکیٹ میں نوکری کرنا جائز ہے، البتہ شراب کے اس گوشہ میں نوکری کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے: "الضرورات تبيح المحظورات، الضرر يزال" اگر صرف شراب کی وجہ سے سپر مارکیٹ میں نوکری کرنے کو ناجائز قرار دیا جائے تو ایسا کرنے میں حرج لازم آئے گا اور اس کی وجہ سے مسلمان نوکری سے محروم ہوجائیں گے، کیونکہ اس زمانہ میں اکثر جگہ سپر مارکیٹ بنائے جارہے ہیں، اگر نوکری کو ناجائز قرار دیا جائے تو ایک بڑا طبقہ مسلمانوں کا نوکری سے محروم ہوجائے گا، اس لیے اوپر جو قاعدہ بیان کیا گیا اس کی رو سے مسلمانوں کا سپر مارکیٹ میں نوکری کرنا جائز ہے۔

ب۔ تدریس ایک معزز پیشہ ہے جس کا انسانی شخصیت کی تعمیر سے گہرا تعلق ہے، لیکن موجودہ دور میں اولاً تو مخلوط تعلیم کے نظام کا غلبہ ہے، اور استاذ کو بعض اس طرح تدریس کا فریضہ انجام دینا پڑتا ہے کہ اس کے مخاطب لڑکے بھی ہوتے ہیں اور لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، اسی طرح لڑکیوں کی مخصوص درسگاہوں میں مرد اساتذہ بھی کام کرتے ہیں، اور لڑکوں کی درسگاہوں میں خاتون اساتذہ بھی کام کرتی ہیں تو ایسی صورت میں اگر لڑکے لڑکیاں بالغ ہیں اور دونوں ایک ساتھ ہوں تو ایسی صورت میں مرد اساتذہ اور خاتون اساتذہ دونوں کا پڑھانا درست نہیں ہے، کیونکہ ایسی صورت میں دونوں طرف سے بے پردگی ہوگی، اور صرف لڑکیوں کو مرد اساتذہ کا پڑھانا اور صرف لڑکوں کو خاتون اساتذہ کا پڑھانا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں بھی بے پردگی ہوگی جبکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم ويحفظوا فروجهم، وقل للمومنات يغضضن من ابصارهن ويحفظن فروجهن يا ايها النبي قل لازواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن"۔

ان آیات میں اللہ نے پردے کے احکام کو نازل فرمایا ہے، اور عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم فرمایا ہے، اور اگر اس طرح کی مخلوط تعلیم ہو تو اس سے بہت سے فواحش وجود میں آئیں گے اور تعلیم کا مقصد فوت ہوجائے گا۔

لیکن اگر لڑکے لڑکیاں نابالغ ہوں تو ان کو پڑھانے میں کوئی حرج نہیں، اور اسی طریقہ سے اگر لڑکیاں پردے میں ہوں تو مردوں کا ان کو پڑھانا درست ہے، اور خاتون اساتذہ پردے کے ساتھ ہوں تو ان کا بالغ لڑکوں کو پڑھانا درست ہے، اور اسی طریقہ سے اس وقت پڑھانا درست ہے جب فواحش کا اندیشہ نہ ہو اور اجنبی مرد وعورت کی خلوت نہ ہو اور بلاضرورت بات چیت نہ ہو، اگر اس کو ناجائز قرار دیا جائے تو حرج لازم آئے گا، کیونکہ ہندوستان میں مخلوط تعلیم کا نظام عام ہوچکا ہے، اس سے احتراز ممکن نہیں ہے۔

ہاں مگر ہمارے امراء کو چاہئے کہ جداگانہ تعلیم کا نظام عام کرے کیونکہ مخلوط تعلیم کے جو نقصانات ہیں وہ بالکل ظاہر وباہر ہے۔

ب۔ ایک اہم پیشہ وکالت کا ہے، وکیل کا مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوتا ہے، مسلمانوں کے اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل کے لیے وکیل کی ضرورت پڑتی ہے، اور بہت سے مواقع پر اچھے مسلمان وکلاء کی کمی محسوس کی جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے اکثر وکلاء کے یہاں ظالم اور مظلوم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا بلکہ بہت سی دفعہ وہ مظلوم کو انصاف سے محروم کردیتا ہے، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر اوقات وکلاء اپنے موکل کے حق میں

فیصلہ کرانے کے لیے انہیں جھوٹ بولنے کی باضابطہ تربیت دیتے ہیں، تو اس طرح کی وکالت کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: "الظلم ظلمات یوم القیامة" ظلم قیامت میں اندھیروں میں ہوگا تو جو شخص ظالم کی مدد کرے گا تو وہ "تعاون علی الاثم" میں داخل ہوگا، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر وکلاء اپنے موکل کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے انہیں جھوٹ بولنے کی باضابطہ تربیت دیتے ہیں، تو اس طرح کی وکالت کرنا جس سے مظلوم کو اپنا حق نہ ملے اور ساتھ ساتھ جو ظالم ہے وہ جھوٹ بولے اور وکیل بھی انصاف سے کام نہ لے تو اس طرح کی وکالت بے انصافی ہوگی، اور جھوٹ کے متعلق حدیث میں آیا ہے: "الصدق ینجی والکذب یھلك" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اگر وکیل اپنے موکل کو جھوٹ بولنے کی تربیت دے تو یہ بھی ایک طرح کی ہلاکت ہے۔

لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے اس دور میں مسلمان وکلاء کا ہونا بہت ضروری ہے، اس لیے کہ آج کے زمانہ میں ہم نگاہ اٹھاتے ہیں تو مسلمان کا کوئی حامی اور مددگار نہیں ملتا ہے، مسلمانوں کو طرح طرح کے مقدموں میں پھنسایا جاتا ہے، اور انہیں قید خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص شرعی قوانین کی رعایت کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے مدد کے ارادہ سے اگر کوئی وکیل بنتا ہے تو اس کو وکیل بننا ثواب سے خالی نہیں، فقہ کا قاعدہ ہے: "الامور بمقاصدھا" تو اس نیک نیتی کے ارادہ سے وکیل بننا جائز ہے۔

د۔ انسانی خدمت کا ایک ذریعہ علاج اور پیشۂ طبابت ہے، لیکن بدقسمتی سے اس شعبہ میں بعض برائیاں در آئی ہیں، جیسے آپریشن مجبوری کی حالت میں کیا جانا چاہئے، لیکن ہاسپٹل کی انتظامیہ ڈاکٹروں کو تاکید کرتی ہے کہ وہ ہر ماہ کم سے کم اتنی مقدار میں آپریشن یا ٹیسٹ لکھے: تاکہ ہاسپٹل کی اور اس کی لیبارٹری کی آمدنی بڑھ سکے: تو اس طریقہ سے کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ ایسا کرنا مریض کے ساتھ ایک قسم کا دھوکہ ہے، اور ایک طریقہ سے جبراً مال وصول کرنا ہے، لہٰذا اس طریقہ سے آپریشن یا ٹیسٹ لکھنا اور اپنی لیبارٹری کی آمدنی بڑھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ سب کچھ مریض کو دھوکہ میں رکھ کر کیا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من غشنا فلیس منا"، اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس حدیث کے تحت داخل ہیں، اسی طرح سرکاری ہاسپٹلوں کے علاوہ پرائیویٹ ہاسپٹلوں میں بھی مرد ڈاکٹر کو خاتون مریض اور خاتون ڈاکٹر کو مرد مریض کے ایسے علاج پر بعض اوقات مجبور کیا جاتا ہے جس کا تعلق قابل ستر حصے سے ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے کا ستر دیکھنے سے منع فرمایا ہے، اور ستر کو دیکھنا حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت ہو، لیکن جہاں پر کسی خاص مرض کا خاص ڈاکٹر مرد ہی ہو اور عورت نہ ہو تو ایسی صورت میں مرد ڈاکٹر کو مریض خاتون کا ستر دیکھنا پڑے تو گنجائش ہے، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے: "الضرورات تبیح المحظورات" تو اس قاعدہ کے تحت فقہاء کرام نے اجازت دی ہے، اسی طرح اگر کوئی ماہر ڈاکٹر خاتون ہو اور اس کے علاوہ نہ ہو تو ایسی صورت میں خاتون ڈاکٹر کو مرد کا ستر دیکھنا پڑے تو گنجائش ہے، اور ایسے اسپتال میں ملازمت کرنے کی گنجائش ہے، اور ملازمین کے لیے کچھ شرعی حدود ہیں وہ یہ کہ غیر محرموں کا آپس میں اختلاط نہ ہو، تنہائی نہ ہو، اسی طریقہ سے پردہ کا برابر اہتمام کیا جاوے اور بلا ضرورت" کے آپس میں باتیں نہ کریں ان شرعی حدود کی رعایت ملازمین پر لازم ہوں گی۔

ھ۔ ذرائع مواصلات کی ترقی، سیاحت کے رجحان میں اضافہ اور مسافر کی ضرورت کے لحاظ سے "ہوٹل" موجودہ سماج کی ضرورت بن گئے ہیں اور یہ اس وقت ایک نفع بخش تجارت بھی ہے، ہوٹلوں کا بنیادی مقصد تو معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے، لیکن بڑے ہوٹلوں میں بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں، جو شرعاً جائز نہیں ہیں، جیسے: شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص وموسیقی کی سہولت، پردہ کی رعایت کے بغیر سوئمنگ پول وغیرہ، ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ہوٹل کا جو اصل مقصد ہے وہ فوت ہورہا ہے اور جو چیزیں ناجائز تھیں ان کو اصل مقصد بنالیا ہے، اگر حرام چیزوں کی فراہمی کا تعلق براہ راست ہو تو وہ بدرجہ اولیٰ ناجائز ہیں، اگر براہ راست تعلق نہ ہو تو وہ ولاتعاونوا علی الاثم کے تحت ناجائز ہیں۔

ہاں مگر وہ ہوٹلیں جن میں غیر شرعی چیزوں کا انتظام نہ ہو، شرعی امور کی رعایت کی جاتی ہو تو ایسی ہوٹلیں چلانا جائز ہے۔

....

مختلف محکموں میں ملازمتوں کے شرعی احکام

مفتی رضوان الحسن مظاہری[1]

ا۔ (الف) شعبہ فوج:

ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ریاست ہونے کے لحاظ سے اس ملک کے کلیدی عہدوں پر فائز ہونا جیسے فوج کا محکمہ ہے یا پولیس ہے یا پارلیمنٹ یا عدلیہ کا عہدہ ہے وغیرہ وغیرہ یہ تمام شعبے ایسے ہیں جہاں بعض دفعہ نہیں بلکہ اکثر اور ہمیشہ اسے اسلامی قانون اور منصوص احکام کے خلاف فیصلوں میں شریک ہونا اور اس کی تنفیذ کا ذریعہ بننا پڑتا ہے، لہذا اصولی طور پر یہ بات جائز نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ کسی گنہگارانہ اور خلاف شرع بات کا اور اس کے نفاذ وترویج کا ذریعہ ہے، مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر مسلمان ایسی ملازمتوں سے یکسر کنارہ کش اور سبکدوش ہوجائیں تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اسلام کے بچے کھچے آثار اور مسلمانوں کے دینی تہذیب اور بنیادی مفادات کا تحفظ دشوار سے دشوار ترین ہوجائے گا اور مسلمان خاص طور سے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے مفلوج، تہذیبی اور مذہبی لحاظ سے مجبور اور اچھوت سے اچھوت ترین شہری بن کر رہ جائیں گے جس کا سماج اور معاشرے میں رہنا مشکل سے مشکل ترین ہوجائے گا۔ لوگ مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ اسلام کو بھی بدنام کریں گے اس لیے اس عظیم تر مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے عہدوں کو ضرور بالضرور قبول کیا جائے گا بلکہ مصلحتاً مسلمانوں کو ان کے حصول کی سعی کرنی چاہئے، ہاں مگر دل میں غیر اسلامی نظام کی طرف سے ایک چبھن ہو، اس میں بے اطمینانی اور اسلام کی بالاتری کا احساس ہمیشہ دل میں تازہ رہنا چاہئے اور موجودہ حالات کو ایک مجبوری کے طور پر گوارہ کرتے رہنا چاہئے اس کی دلیل حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون مصر کے خزانے کی وزارت کی ذمہ داری قبول کرنا بلکہ اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے قرآن کہتا ہے:

"اجعلني على خزائن الأرض اني حفيظ عليم" (سورہ یوسف:۶)
(مجھے مقرر کروز مین کی پیداواروں پر میں نگرانی کرنے والا اور علم والا ہوں)۔

ج۔ حکومت کا ایک اہم شعبہ مخبری کا اور انٹیلیجنس بھی ہوتا ہے...... الخ۔ کیا مسلمانوں کے لیے اس شعبہ میں ملازمت درست ہے؟

جواب: جس نوکری یا ملازمت میں پابندی اجراء احکام غیر شرعیہ اور اجراء احکام ظلم وغیرہ کی ہوں اور اس میں اکثر اوقات جھوٹ اور غیبت کا سہارا لینا پڑتا ہو تو مسلمانوں کے لیے ایسی نوکری جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الظالمون" (اور جو لوگ ان کی اطاعت کریں اور خلاف شرع احکام جاری کریں وہ ظالم ہیں)۔

۵۔ عدالتوں میں ملازمت: اس سوال کا جواب راقم کے سوال نمبر (الف) کے جواب کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

(ھ) کوئی بھی حکومت عوامی ٹیکس کے بغیر اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتی ہے، تو کیا انکم ٹیکس کے پیشوں میں مسلمان ملازمت کرسکتے ہیں؟

جواب: ٹیکس جو حکومت عوام سے وصول کرتی ہے دو طرح کے ہیں: بعض تو ان میں منصفانہ ہیں اور خود اسلام میں ان کی گنجائش ہے۔ مثلاً پانی، روشنی، سڑک، لائبریری، وغیرہ کے سہولتوں کے بدلے میں بلدیہ جو ٹیکس لیا کرتی ہے وہ اس کا فائدہ محسوس طور پر ہماری طرف لوٹا دی جاتی ہے،

---

[1] مدرسہ کرن، نہار اشترا۔

دوسرے قسم کی ٹیکس ایسے ہیں جن کو غیر منصفانہ اور ناواجبی کہا جاتا ہے جیسے انکم ٹیکس ہے یہ شرعی اعتبار سے غیر منصفانہ ہونے کے علاوہ اس قسم کے ٹیکس غیر معقول بھی ہیں کہ ایک شخص اپنے گاڑھے پیسے سے جو کچھ حاصل کرتے حکومت جبراً اس سے اس کی کمائی کی ٹیکس وصول کرے یہ ظلم ہے، اس لیے انکم ٹیکس کے شعبوں میں ملازمت بھی تعاون علی الظلم ہوگا، اس لیے کہ ایک ہے گناہ کرنا اور گناہ کے کام میں اعانت اور تعاون کرنا دونوں ناجائز ہے، یہ تو اصل حکم ہے، لیکن ایسے شخص کے لیے جو معاشی اعتبار سے بالکل مفلوج ہو کوئی دوسری ذریعہ معاش حاصل نہ ہو اور وہ اگر ملازمت ترک کردے تو فاقہ کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے بہتر ہے کہ موجودہ ملازمت پر قانع ہونے کی بجائے کوئی دوسرا بہتر اور پاک ذریعہ معاش کو خوب تلاش کرتا رہے، موجودہ ملازمت سے دل میں کراہت محسوس کرے، اور جب تک متبادل نظم نہ ہو جائے ایک مجبوری کے طور سے کرتے رہے۔ (جدید فقہی مسائل)۔

۲۔ ایسی چیزوں کی ملازمت جائز نہیں ہے جو معصیت اور گناہ ہوں، اس لیے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح گناہ کے لیے سبب اور ذریعہ بننا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے، اور جو جس درجہ کا گناہ ہو اس میں تعاون بھی اسی درجہ کا گناہ ہوگا چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں: "لا یجوز الاستیجار علی شئی من الغنا والنوح والمزامیر ولا اجرلھم" (فتاویٰ عالمگیری، ۴/۴۴۹)۔ مزامیر، نوحہ اور گانے بجانے وغیرہ کے کاموں میں کسی کو اجیر رکھنا درست نہیں ہے اور اجرت کے حقدار بھی نہیں ہوتے، چنانچہ سود میں خود ملوث ہونا اور مبتلا ہونا ہی صرف گناہ نہیں ہے بلکہ اس کے کاروبار میں ممد و معاون ہونا بھی معصیت ہے، یوں تو تمام ہی گناہ کے کاموں میں اعانت ناپسندیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لا تعاونوا علی الاثم والعدوان" لیکن خصوصیت سے سود کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: "آکل الربوا ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء" (صحیح مسلم عن جابر ۲/ ۲۴، باب الربوا) رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کے کاتب نیز گواہ سب پر لعنت کی ہے۔ اور فرمایا: سبھی برابر ہیں، یہاں سود کے لکھنے والوں اور گواہوں پر حضور ﷺ کی لعنت سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں آدمی کسی ذمہ دارانہ عہدے پر فائز ہو یا سودی معاملات لکھنے پڑتے ہوں جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی حیثیت ربوا کے کاتبین اور گواہوں کی ہوگی اور ان کو حضور ﷺ نے نہ صرف یہ کہ ملعون قرار دیا ہے بلکہ سود خوروں کے مساوی قرار دیا ہے ہاں ایسی ملازمتیں یا ایسی ذمہ داریاں جن کا تعلق براہ راست سودی کاروبار سے نہ ہوں بلکہ وہ بینک کے دوسرے کام یا اس کی حفاظت پر ملازم ہوں تو اس ملازمت کو جاری رکھنا یا ایسی ملازمت کا حاصل کرنا جائز ہوگا، لہٰذا بینک میں کمپیوٹر کی مرمت اور بینک کے ایئر کنڈیشن کی مرمت کی اجازت ہوگی۔ (المستفاد جدید فقہی مسائل)۔

البتہ بینک کے لیے مکان کا کرایہ پر دینا فقہاء نے منع کیا ہے ملاحظہ ہو جدید فقہی مسائل، بینک کا ایک سودی کاروبار ہے اگر پہلے سے مقصد معلوم ہو تو خاص اس مقصد کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا، اس لیے اس صورت کا تعاون بھی معصیت ہے ہاں اگر یوں ہی کرایہ پر مکان لے لیا اور بعد میں اس کو بینک میں تبدیل کردیا تو اب اس صورت میں کرایہ دینے والے پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

مسلمان ذمی کو کوئی مکان رہائش کے لیے دے تو اس میں مضائقہ نہیں پھر اگر وہ اس میں شراب پیئے یا صلیب کی پرستش کرے یا سور داخل کرے تو مسلمان کو ان کا کوئی گناہ نہیں۔ اس لیے کہ اس نے اس مقصد کے لیے نہیں دیا ہے، گناہ کرایہ دار کا عمل ہے اور اس کے اس عمل میں صاحب مکان کے ارادے کو کوئی داخل نہیں اس لیے اس پر کوئی گناہ نہیں (مبسوط، ۱۶/ ۲۰۹)۔ لیکن بعض فقہاء کرام کے اقوال سے بینک کاری کے لیے مکان کو کرایہ پر دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے، مگر شریعت کا مزاج اسے قبول کرتا نظر نہیں آرہا ہے (جدید فقہی مسائل، ۱/ ۴۱۰)۔

ب: انشورنس کی صورت حال اور اس کی پالیسیوں میں اس قدر تنوع پیدا ہو چکا ہے اور آئے دن اس کی ایسی نئی نئی شکلیں پیدا کی جارہی ہیں کہ ان تمام صورتوں کا احاطہ دشوار ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم اور مروج (ایل آئی سی) تھی لائف انشورنس (Life Insurance) اور املاک کا انشورنس ہے اس میں انشورنس کمپنی اور انشورنس کرانے والے کے درمیان ایک مخصوص مدت کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اس مدت میں وہ اپنی رقم بالاقساط کمپنی کو ادا کرے گا، یہ انشورنس کبھی املاک کا ہوتا ہے مثلاً کارخانہ اور اسی طرح دکان وغیرہ کا، اگر لائف انشورنس کرایا گیا اور مدت معاہدہ کی تکمیل سے پہلے ہی اس شخص کا انتقال ہو گیا، یا کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو چاہے اس نے چند ہی قسطیں کیوں نہ دی ہوں اس پوری رقم کا وہ حقدار ہوتا ہے، اسی طرح اگر وہ

املاک ضائع ہوگئیں تو کمپنی اس کی تلافی کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اگر اس نے معاہدہ کے مطابق پوری رقم ادا کردی اور وہ خود بیمہ کردہ محفوظ رہا تو اب اصل رقم منافع کے ساتھ واپس ملتی ہے جس کو بونس سے موسوم کیا جاتا ہے، ان تمام صورتوں میں بنیادی طور پر دو مفاسد پائے جاتے ہیں، ایک ربوا دوسرے قمار، ربوا تو ہر صورت میں ہے، اس لیے کہ اس جمع شدہ رقم کی حیثیت قرض کی ہے، اور منافع گویا اس مہلت کا معاوضہ ہے۔ جو قرض کی واپسی کے لیے دی گئی ہے، اسی کا نام ربوا ہے، جو لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سود صرف تجارت میں ہوتا ہے قرض میں نہیں ہوتا ہے وہ بدترین قسم کی تحریف میں مبتلا ہیں۔

البتہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر قریب قریب علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے جان و مال کا انشورنس کرانا جائز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انشورنس کمپنی کی ملازمت کرنا یا انشورنس کمپنی کی ایجنسی لینا یا اس کو ذریعہ معاش بنانا جائز ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں فقہاء کرام کا اصول تو یہی ہے کہ جو چیز از راہ ضرورت جائز قرار دی جاتی ہے وہ بقدر ضرورت ہی جائز رہتی ہے۔

ج۔ جس طرح خود کسی ناجائز اور خلاف شرع کام کرنا درست نہیں۔ اسی طرح ایسے کاموں میں ملازمت اور تعاون درست نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شراب پینے والے کی طرح شراب نچوڑنے والے، شراب پینے والے، شراب اٹھانے والے اور وہ جس کے لیے اٹھا کر لے جائی جائے، پلانے والے اس کی فروخت کرنے والے، اس کی قیمت کھانے والے، خریدنے والے اور جس کے لیے خریدی جائے، ان سب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے (دیکھئے ابن ماجہ باب لعنۃ الخمر علی عشرۃ اوجہ رقم الحدیث ۳۳۸۰)، اس لیے ایسی جگہوں پر ملازمت جائز نہیں ہے۔ محدثین کا رجحان یہ ہے کہ شراب بنانے والے شخص سے انگور وغیرہ کا شیرہ بیچنا ناجائز ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے لیے رس نچوڑنے والے کو بھی ملعون قرار دیا ہے۔ (ابوداؤد، ۲/ ۵۱۷)۔

فقہائے احناف کے یہاں اس مسئلہ میں اگر شراب بنانے والے کو شراب بنانے کی منشا سے انگور یا اور کسی پھل کا رس فراہم کیا جائے تو جائز نہیں ہے اور اگر نفس تجارت کی غرض سے ہو تو جائز ہے۔ (الاشباہ والنظائر)۔

۳۔ بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں کاروبار کا اصل مقصد حرام کرنا نہیں ہے لیکن ضمنی طور پر وہاں کام بھی کئے جاتے ہیں جیسے:

الف: سپر مارکیٹ ہے جس میں زندگی کے مختلف ضروریات فروخت کی جاتی ہیں، اس میں شراب کا بھی ایک گوشہ ہے ایسے سپر مارکیٹ میں ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: وہ سپر مارکیٹ جس کا آج کل بہت رجحان بڑھ گیا ہے ایسے مارکیٹ تقریباً ہر بڑے شہر میں ایک زینت کے طور پر بنایا جا رہا ہے، جہاں زندگی کے ہر ضروریات کی چیزیں فراہم ہوتی ہیں، جس میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو حرام ہیں، ایسے مارکیٹ میں ملازمت کرنا کچھ تفصیل کے ساتھ جائز ہے:

الف: ملازمت کرنے والا شخص بالواسطہ یا بلاواسطہ اس حرام کام میں مشغول نہ ہوں۔

ب: ملازمت کرنے والا شخص اس حرام کام کی تشہیر نہ کرتا ہو۔

ج: وہ خود اس کی حرام کاموں میں مددگار ہوں۔

اس لیے کہ ملازمت ایسے کاموں میں تعاون علی الاثم ہے، جو ناجائز ہے اور اگر دوسرے حلال کاموں میں رہ کر اپنے آپ کو اس سے بچالے تو ملازمت درست ہے۔

ب: تدریس ایک معزز پیشہ ہے، جس کا انسانی شخصیت کی تعمیر سے گہرا تعلق ہے موجودہ دنوں میں اولاً تو مخلوط تعلیم کے نظام کا غلبہ ہے......الخ۔

جواب: تدریس واقعی ایک معزز پیشہ ہے اور رہے گا جس کا انسانی شخصیت کی تعمیر سے گہرا تعلق ہی نہیں بلکہ انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری اور لازمی ہے جو انسانی ارتقا اور اس کو بلندی تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے جس کو اسلام نے بہت سراہا ہے اور اس کو حاصل کرنے والے کو حوصلہ افزائی کی اور درس وتدریس دینے والے کو خیر الناس کے لقب سے نوازا ہے، بدقسمتی سے اس شعبہ میں جدت پسندی کی ایک نہیں کئی برائیاں شامل ہیں جو مغربی ممالک کی غلامی کی ایک علامت بن گئی ہے، وہ ہے مخلوط تعلیمی نظام جہاں کردار کے بجائے کردار کشی کی تعلیم، اخلاقیات کے بجائے غیر اخلاقی تعلیم، تعمیر کے بجائے تخریب وغیرہ وغیرہ یہ سب مخلوط تعلیم کا دین ہے۔ بہرحال ان حالات میں اپنے آپ کو برائی سے بچا کر امانت داری سے کام کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو نبھاتے رہے، مثلاً لڑکیوں کو تعلیم دیتے ہوئے بدکاری سے بچے، خود ان لڑکیوں کو اس کی تعلیم دے وغیرہ وغیرہ، جو ملازمہ ہیں ان سے بھی حد درجہ غیر محتاط نہ ہوں، ان ذمہ داریوں میں تو ملازمت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ج: ایک اہم پیشہ وکالت کا ہے وکیل کا مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوتا ہے۔

جواب: وکالت کا مقصد مظلوم کو انصاف دلانا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے جس میں اپنے موکل کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا ہوتا ہے اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ جھوٹ کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی بھرپور کوشش ہوتی ہے اور حقیقت کو جھوٹ میں تبدیل کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور بدقسمتی سے اکثر وکلاء کے یہاں ظالم اور مظلوم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ بہت سی مرتبہ مظلوم کو انصاف سے محروم ہونا پڑتا ہے، اس لیے اکثر فقہاء نہیں بلکہ تمام فتوؤں کی کتابوں میں اس کے ناجائز ہونے کے فتوے دیئے گئے ہیں اور اس کی اجرت کو حرام اجرت سے موسوم کیا گیا ہے، حتیٰ کہ ان کے یہاں کھانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ (دیکھئے احسن الفتاوی، ۷/ ۳۱۱، فتاوی رحیمیہ، فتاوی محمودیہ)۔

لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی ہمارے سامنے ہونے چاہئے کہ اس دور میں مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی تمام مسائل میں وکیل کی ضرورت ہے، اس لیے کہ کوئی مظلوم اپنی فریاد لیکر خود کورٹ میں جج کے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا ہے، جب تک کہ کسی وکیل کو اپنا نائب نہ بنائے۔

ہاں رہی بات جھوٹ کی تو اس کی تصریح فقہاء کی تحریروں سے ملتی ہے کہ اپنا حق وصول کرنے کے لیے کئی موقع پر جھوٹ کی اجازت دی جاتی ہے۔

شامی کی عبارت ہے جو دفع ظلم اور جلب مصلحت کے لیے لکھی ہے:

اپنے حق کو حاصل کرنے اور اپنے سے ظلم کو دفع کرنے کے لیے جھوٹ بولنا مباح ہے۔ مگر یہاں جھوٹ سے مراد تعریض ہے، کیوں کہ عین جھوٹ تو حرام ہے یہی بات حق ہے اور علامہ شامیؒ حاشیہ میں لکھتے ہیں: جاننا چاہئے کہ کبھی جھوٹ بولنا مباح ہوتا ہے، کبھی واجب ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں ایک ضابطہ ہے، جیسا کہ تبیین المحارم وغیرہ میں ہے، جس کو احیاء العلوم سے نقل کیا ہے کہ ہر ایسا محمود مقصود جس کا حصول سچ اور جھوٹ دونوں طرح ممکن ہو تو اس میں جھوٹ بولنا حرام ہے اور اگر صرف جھوٹ ہی کے ذریعہ وہ مقصود حاصل کیا جاسکتا ہو تو اب اگر وہ مقصود مباح ہے تو جھوٹ بولنا بھی مباح ہوگا اور اگر وہ مقصود واجب ہے تو اب وہاں جھوٹ بولنا بھی واجب اور ضروری ہوگا...... الخ۔ (رد المحتار، ۶/ ۲۷)۔

شامی کی اس مفصل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف تعریض بلکہ کذب صریح بھی خاص خاص صورتوں میں جائز ہے، ان عبارتوں کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حقوق واجبہ کو حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بھی مباح ہے اور کبھی جھوٹ بولنا بھی واجب ہوتا ہے، اس لیے راقم التحریر اس سے متعلق یہ ضرور کہنا چاہتا ہے کہ پیشہ وکالت جس کی آج مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طور سے ضرورت ہے، سنجیدگی سے سوچ کر فتوی دینا چاہئے اور اس پیشہ کو مطلق حرام نہ کیا جائے، البتہ ضروری منکرات سے بچنے کی تلقین کی جائے اور کچھ شرائط کے ساتھ اس کے جواز کا فتوی ہونے چاہئے۔

د- انسان کے وجود کے بارے میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ وہ خود ایک امانت ہے اس کے لیے اپنے جسم میں وہی تصرف جائز اور درست ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے آدمی اپنے منشا ومزاج کے مطابق خود اپنے جسم کو نقصان پہنچانے یا اس میں تغیر وتبدل کرنے کا بھی مجاز نہیں،

اپنے آپ کی حفاظت اس کا فریضہ ہے، فن طب چوں کہ ایک ایسا فن ہے جو خالق تعالیٰ کے اس مقصد کو پورا کرتا ہے۔

چنانچہ اطباء چوں کہ صحت انسانی کی حفاظت جیسا اہم فرض اور عظیم انسانی خدمت انجام دیتے ہیں، اس لیے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک ہیں، ہمدردی وبہی خواہی، صبر وحلم، بردباری، شخصی کمزوریوں اور دوسروں کی حفاظت اجتماعی مفادات کا خیال اور اپنے فن میں بصیرت مندی وحاضر دماغی، خدمت خلق کا جذبہ اور شریعت کی قائم کی ہوئی حدود پر استقامت اس راہ کے مسافر کے لیے متاع اولین کا درجہ رکھتے ہیں۔ خواتین کے لیے جہاں تک ممکن ہوں وہ خواتین ڈاکٹروں سے ہی اپنا علاج کرائیں تاکہ پردہ کی زیادہ سے زیادہ رعایت ہو اور اگر کوئی خاتون ماہر ڈاکٹر نہ ہو تو بدرجہ مجبوری مرد ڈاکٹروں سے اپنا علاج کرا سکتی ہے اور اگر ستر کا مسئلہ ہو تو خواتین اپنے عضو کے اتنے ہی حصہ کو کھولے جس سے کام چل سکے، اس لیے کہ فقہا نے یہ حالت مجبوری بغرض علاج اس کی اجازت دی ہے، لہٰذا مرد کے لیے بھی ضرورت کی وجہ سے عورت کے صرف اس حصہ کا دیکھنا درست ہوگا جس کا علاج مطلوب ہے، نیز یہی حکم آپریشن کا ہے، ڈاکٹر صرف مریض کے اس حصہ کو کھولے جس کا آپریشن کرنا ہے۔ اس سے زیادہ درست نہیں۔ ملازمت کرنے والے ملازمین کے لیے بھی یہی ضروری ہے، بلاضرورت کسی کی ستر وغیرہ کو نہ دیکھے، چوں کہ یہ مجبوری کی حالت ہے، لہٰذا مجبوری کی بنا پر کر سکتے ہیں: "الضرورات تبیح المحظورات" جس قدر ضرورت ہو اس کی اجازت ہے۔

ھ۔ ذرائع مواصلات کی ترقی، سیاحت کے رجحان میں اضافہ اور مسافر کی ضرورت [illegible] سے ہوٹل موجودہ سماج کی ضرورت بن گئے ہیں اور یہ اس وقت ایک نفع بخش تجارت بھی ہے، کیا ایسے ہوٹلوں میں جہاں غیر شرعی امور بھی انجام دیئے جاتے ہیں، ایسے ہوٹلوں کی ملازمت کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: اصل میں ہوٹلوں کا بنیادی مقصد تو معاوضہ لے کر سہولتوں کی فراہمی ہے، آنے والے مسافروں کے لیے جو ایک خدمت خلق ہے بلاتفریق قیام وطعام کی سہولت، لیکن ملازمت کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری اور لازمی ہے کہ مخلوق کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی نہ ہو جائے، اس لیے یاد رہے کہ جس طرح کسی ناجائز اور خلاف شرع کام کرنا درست نہیں اسی طرح ایسے کاموں میں ملازمت بھی جس میں براہ راست غیر شرعی کاموں سے تعلق ہو یا براہ راست تعلق تو نہ ہو مگر اس میں معاون ہو حرام ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے متعلق کئی لوگوں پر لعنت فرمائی ہے، اس لیے ایسے ہوٹلوں کی ملازمت یا قحبہ خانوں کی ملازمت درست نہیں ہے، ہاں البتہ ایسی ملازمت کی جا سکتی ہے جہاں براہ راست اس کاروبار سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، جیسے ہوٹل کی عمارت کی نگرانی یا ہوٹل کی مرمت وغیرہ۔

☆☆☆

مختلف ملازمتوں کے شرعی احکام

مولانا محمد قمر عالم قاسمی

۱۔ فوج و پولیس کی ملازمت فی نفسہ جائز ہے، البتہ ملازم بننے کے بعد ظلم کرنا جائز نہیں اور ظلم میں اپنے کمانڈرو پولیس کے اعلیٰ افسر کی اطاعت ضروری نہیں، ”لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق“۔

۲۔ انصاف کی فراہمی، ظلم وحق تلفی کی روک تھام اور نزاعات کو طے کرنے کے لیے عدالتوں میں ملازمت کرنا جائز ہے۔

۳۔ انکم ٹیکس کے شعبوں میں بھی مسلمان ملازمت کرسکتا ہے۔

۴۔ مسلمان وکالت کے پیشہ کو اختیار کرسکتا ہے، وکیل اگر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرے تو یہ اس کا ذاتی عمل ہے اور کسی کے ذاتی عمل سے وکالت کے پیشے میں قباحت نہیں آئے گی وہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا اور آخرت میں اس سے مواخذہ ہوگا۔

۵۔ ہوٹلوں میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے جبکہ حرام چیزوں کی فراہمی سے براہِ راست اس کا تعلق نہ ہو اور حرام چیزوں کی فراہمی جیسے شراب وخنزیر وغیرہ کا تعلق اس ملازم سے ہو تو ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

”لأن النبی ﷺ لعن فی الخمر عشرة وعد منها حاملها“ (فتاوی شامی، ۵/ ۳۴۵)۔

۶۔ عورتوں کے لیے بالغ لڑکوں کو باقاعدہ درس وتدریس کے طور پر پڑھانا جائز نہیں ہے کبھی بھی فتنہ ہوسکتا ہے، اسی طرح مرد کے لیے بالغ لڑکیوں کو پڑھانا جائز نہیں اس میں بھی فتنہ اور برائی میں ابتلاء کا قوی امکان ہے۔ نیز بالغ لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم شرعاً جائز نہیں، اس لیے کہ کبھی بھی لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان ناجائز تعلقات پیدا ہوجانے کا خطرہ موجود ہے، (جیسا کہ آئے دن اس طرح کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں مشاہدہ ہورہا ہے)، لہٰذا موجودہ دور میں مخلوط تعلیمی نظام کا غلبہ ہوجانے کی وجہ سے ناجائز چیز جائز نہ ہوگی، کیوں کہ خلاف شرع رواج کا شریعت وسنت میں اور قرآن وحدیث میں کوئی اعتبار نہیں ہے کما قال تعالیٰ فی کلامه المجید:

قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم ويحفظوا فروجهم إلى قوله: وقل للمؤمنت يغضضن من ابصارهن ويحفظن فروجهن (سورۃ النور: ۳۰، ۳۱) ... وقال تعالیٰ: وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى (سورۃ الاحزاب: ۳۳)۔

عن أنس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الشيطان يجرى من الانسان مجرى الدم متفق عليه (مشکوۃ: ۱۸، باب الوسوسہ)۔

وقال النبی ﷺ: النظر سهم مسموم من سهام ابليس (مستدرك حاكم، ۴/ ۳۱۴)۔

وقال النبی ﷺ: المرأة عورة فإذا خرجها استشرفها الشيطان

اور صاحب رسم المفتی نے لکھا ہے: ”العمل بالعرف ما لم يخالف الشريعة“ (رسم المفتی: ۹۸)۔

....

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

مولانا عبدالتواب اناوی

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى اله واصحابه اجمعين۔ اما بعد!

فقال الله تبارك وتعالى: تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان (المائدہ)۔

(تم نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کیا کرو اور ظلم وزیادتی اور گناہ کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون مت کرو)۔

"وقال تعالى: الذى قدر فهدى" (الاعلیٰ) (وہ ذات جس نے مقدر ٹھہرایا پھر راہ دکھلائی)۔

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ انسانی ضروریات کی تکمیل اس طرح فرماتے ہیں کہ ہر انسان کے ذہن ودماغ میں نظام دنیا کی الگ الگ ضروریات اور اس کے الگ الگ کاموں کی طلب پیدا فرمادیتے ہیں پھر مطلوب تک رسائی کے راستے بھی پیدا فرمادیتے ہیں جس سے دنیا کا ہر چھوٹا، بڑا کام اور ہر نفیس وخسیس پیشے نیز چھوٹے بڑے عہدے لوگ اپنی چاہت سے قبول کرتے ہیں اور خوشی کے ساتھ اس پر کاربند رہتے ہیں۔

پھر تعاون کی دو قسمیں ہیں: (۱) تعاون علی الخیر (۲) تعاون علی المعصیۃ، تعاون علی الخیر، بہرحال مطلوب ہے اور تعاون علی المعصیۃ گناہ ہے۔

پھر تعاون علی الخیر کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) تعاون بالعوض۔ (۲) تعاون بلاعوض۔ تعاون بالعوض کی بہت سی اقسام ہیں جن میں سے ایک قسم "اجارۃ" ہے۔

اجارہ کی تعریف:

"هى عقد على المنافع بعوض" (اجارہ ایسا عقد ہے جو صرف نفع پر عوض کو مشروع کرتا ہے) (فتاویٰ ہندیہ، کتاب الاجارۃ، ۴/۴۰۹۔ دیوبند)۔

اجارہ عوض کے بدلے نفع کے مالک ہونے کا نام ہے۔ (ردالمحتار، ۹/۶، دیوبند)۔

''الاجارة عقد يرد على المنافع بعوض لان الاجارة فى اللغة بيع المنافع''

(اجارہ نفع پر عوض لینے کے لیے مشروع ہے، کیونکہ لغت میں اجارہ منفعت کو بیچنے کا ہی نام ہے) (ہدایہ، کتاب الاجارۃ، ۳/۲۹۳)۔

مذکورہ عبارات دال ہیں اس بات پر کہ اجارہ کسی شئ سے مستفاد ہونے والے نفع کو مبیع تصور کرتے ہوئے متاجر سے ثمن حاصل کرنا خواہ وہ شئ جس سے حاصل ہونے والے نفع پر اجارہ کیا جارہا ہے جاندار ہو جیسے، انسان، جانور، یا غیر جاندار ہو جیسے گھر، دکان، زمین اور دنیا کے تمام ساز وسامان۔

اجرۃ علی العمل کی چار صورتیں ہیں: (۱) الاجرۃ معلوم والعمل معلوم (۲) الاجرۃ معلوم والعمل مجہول (۳) العمل معلوم والاجرۃ مجہول (۴) الاجرۃ مجہول والعمل مجہول۔

فقہاء کرام نے اول اور ثانی کو جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ عمل بھی جائز ہو۔ ثالث کو اجارۂ فاسد اور رابع کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یعنی اجرت معلوم ہو، عمل معلوم ہو اور عمل جائز ہو تو اجارہ کی یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور ضرورۃ معاشرہ کے حق میں مطلوب بھی، اجرت معلوم عمل مجہول، فقہاء اس کو جائز کہتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ عمل مجہول عمل جائز بھی ہو۔

پھر عمل معلوم اور عمل مجہول کی دو صورتیں ہوں گی: (۱) عمل جائز، عمل ناجائز پر غالب ہوگا (۲) عمل ناجائز، عمل جائز پر غالب ہوگا۔ الاعتبار للغالب۔

اگر ناجائز عمل، جائز عمل پر غالب ہے تو اجارہ کی یہ صورت بالاتفاق علماء عظام کے نزدیک ناجائز ہے، البتہ اگر ناجائز عمل پر جائز عمل غالب ہے تو فقہاء کے

یہاں اس صورت میں اختلاف ہے، امام صاحب یعنی امام ابوحنیفہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں اور صاحبین ناجائز۔

ملازمت خواہ کسی نوع کی ہو اجرۃ علی العمل کے ہی زمرہ میں ہے، لہٰذا مذکورہ صورتوں کے اعتبار سے ملازمت کی بھی صورتیں جداگانہ ہوں گی اور جس ملازمت کی شکل، مذکورہ صورت میں سے جس صورت کی ہم شکل ہوگی یا اس کے مشابہ ہوگی اس پر اسی صورت کا حکم جاری کیا جائے گا۔

الف۔فوج:

یہ ایک حقیقت ہے کہ فوج کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور بسا اوقات اندرون ملک امن وامان کا قائم رکھنا ہے۔ جیسا کہ سوال نامہ میں بھی درج ہے، اور یہ بات تمام ملکوں کے ساتھ عام ہے خواہ ملک میں حکومت اسلامیہ ہو یا غیر اسلامیہ، ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور اندرون ملک امن وامان کی بحالی کا کام فوج سے لیا جاتا ہے اور یہ موجودہ دور کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اسلام سے قبل اور ابتداء اسلام میں بھی یہ صورت موجود تھی۔

رہی بات یہ کہ بعض دفعہ فوج کو ظالم ومظلوم کی تحقیق کئے بغیر وار کرنا پڑتا ہے اور فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا پابند ہوتا ہے تو یہ صورت کبھی کبھار واقع ہوتی ہے جن کی مقدار اصل کام کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے۔

فوجی اپنے وار میں کمانڈر کے حکم کا تابع ہوتا ہے اور کمانڈر ملک کی سرحدوں کو محفوظ اور اندرون ملک فساد کو ختم کر کے امن کے قیام کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور یہ ذمہ داری ملک کی تعمیر اور حفاظت کا حصہ ہے۔ اسلام نے بھی ملک کی تعمیر وترقی اور اس کی حفاظت کا حکم دیا ہے جس کی ایک نوع ملک کی سرحدوں پر فوج کے دستوں کا قیام ہے۔

دوسری طرف ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر فوج میں مسلمان شامل نہ ہوں تو یقینی طور پر وہ فوج مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگی نیز مسلمان معاشی لحاظ سے ایک بڑے ذریعہ معاش سے محروم ہوں گے جو مسلم معاشرہ کو تنزلی کی طرف لے جائے گا۔

لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ مسلمانوں کا فوج میں حصہ نہ لینا یقینی طور پر مسلمانوں کے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔ اولاً: مسلم معاشرہ میں معیشت کی تنگی اور وسائل معیشت محدود کردینے کے مترادف ہوگا، ثانیاً: غیر مسلم افواج مسلمانوں پر ظلم وجور کی انتہاء کردیں گی اور مسلمان اس طرح مظلومیت کے ایک بڑے غار میں محبوس ہوکر رہ جائیں گے، جبکہ یہ بات واضح ہے کہ اگر مسلمان فوج میں حصہ لیں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کو کبھی اپنے ہی بھائی پر وار کرنے کا موقع آئے چنانچہ سوال نامہ میں بھی یہی مذکور ہوا ہے کہ بعض دفعہ ایک مسلمان فوجی کا مدمقابل اسی کا ہم مذہب شخص ہوتا ہے، یا فوج کو ظالم مظلوم کی تحقیق کئے بغیر وار کرنا پڑتا ہے اور فوجی اپنے کمانڈر کے حکم کا تابع ہوتا ہے، اگرچہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ صرف شک وشبہات کے درجہ کی چیز ہے اور ضابطہ ہے "الاحکام لاتتغیر من الشبہات" شک وشبہات سے احکام میں تبدیلی واقع نہیں کی جاتی، چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: ویکرہ بیع السلاح فی ایام الفتنة۔ معناه ممن یعرف أنه من أهل الفتنة لأنه تسبب إلى المعصية۔ وإن كان لايعرف أنه من أهل الفتنة فلا يكره بالشك (ہدایہ، ۴/۴۵٦) یعنی ایام فتنہ میں اس شخص کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا مکروہ ہے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ شخص فتنہ گروں میں سے ہے اور جس کے بارے میں یہ وضاحت نہ ہو اس سے اسلحہ فروخت کرنا ایام فتنہ میں مکروہ نہیں ہے۔

اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کو شعبۂ فوج میں ملازمت کرنا جبکہ وہ اس بات کا مکمل خیال رکھیں کہ ان مذکورہ ظنیہ امور میں سے کسی امر کے وقوع کے وقت اپنی ممکنہ حد تک احتراز کا پہلو غالب رکھیں گے تو جواز کو مشروع ہونا چاہئے۔

ب۔پولیس:

شعبۂ پولیس میں مسلمانوں کو ملازمت کرنا بھی تقریباً اسی حکم کا متقاضی ہے جو حکم فوج میں مسلمانوں کی ملازمت کا ہے، کیونکہ احکام تقریباً یکساں ہیں، البتہ مسلمان پولیس ملازم کو چاہئے کہ بدزبانی اور بدکلامی نیز شرعی احکام کی پامالی سے احتراز کرے، ورنہ یہ امر یقینی ہے کہ غیر مسلم پولیس مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور انہیں ظلم وجور کا تختۂ مشق بنالے گی اور کوئی مسلمان پولیس کی ظالمانہ گرفت سے باہر نہ ہوگا، نیز مسلمانوں کو اگر پولیس محکمہ میں ملازمت کرنے کا جواز فراہم کیا جائے تو دیگر مسلمانوں کو اپنے باہمی معاملات نزاعیہ میں عدل وانصاف کی توقع بھی ہوسکتی ہے، کیونکہ ضابطہ ہے: "الجنس يميل الى الجنس" کہ جنس

جنس کی طرف مائل ہوا کرتی ہے، لہٰذا اگر مسلمان احکام شرعیہ کی ادائیگی اور منہیات شرع سے احتراز کرتے ہوئے پولیس ملازمت اختیار کرنے کا خواستگار ہے تو ارباب افتاء کو اسے ملازمت کی اجازت دیدینی چاہئے۔

ج۔ مخبری:

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: "ولا یغتب بعضکم بعضا" (یعنی تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے)۔

نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "الغیبة اشد من الزنا" (غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت ہے)۔

قرآن وحدیث میں غیبت کو بہت ہی سخت ترین گناہ قرار دیا گیا ہے، بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ غیبت کرنا اپنے مردار بھائی کے گوشت کھانے کے مترادف ہے، چنانچہ بے شمار حدیثیں اس باب میں موجود ہیں۔

لیکن کیا شعبۂ مخبری میں جو تجسس اور غیبت کا ارتکاب ہوتا ہے یہ اور یونہی عوام الناس میں جو غیبت اور تجسس پھیلا ہوا ہے، دونوں کا ایک ہی حکم ہے! اگر دونوں کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھا جائے تو دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔

غیبت کے دو اہم پہلو ہیں:

(۱) کسی آدمی کی برائی (بری عادت وغیرہ) لوگوں پر ظاہر کرنا اس مقصد کے تحت کہ سماج میں اس کی بے عزتی ہو، کسی کے سامنے جانے میں اس کو شرمندگی ہو، اس کا وقار گھٹ جائے، شریعت نے اسی کو حرام کہا ہے اور درحقیقت اسی کا نام غیبت ہے۔

(۲) کسی آدمی کی برائی (یعنی بری عادت وغیرہ) لوگوں پر یا عدلیہ محکمہ پر ظاہر کرنا اس مقصد کے تحت کہ اس کی اصلاح ہو جائے اور معاشرہ میں فساد پڑنے سے بچ جائے اور مجرم کو سزا مل جائے اور لوگ اس کی سزا کو دیکھ کر یا سن کر عبرت پکڑیں تو اسلام نے اس تجسس کو غیبت کا حکم نہیں دیا بلکہ ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، مثلاً ایک آدمی چوری کرتا ہے جس کے چوری کرنے کا علم کسی پر ظاہر نہیں ہوتا، ایک آدمی نے اسے دیکھ لیا لیکن وہ اسے چوری سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا، تو اسلام کا حکم ہے کہ وہ یہ خبر عدلیہ تک پہنچائے تاکہ عدلیہ اسے پکڑ کر سزا دے اور تمام معاشرہ اس سے عبرت پکڑے، نیز معاشرہ میں کوئی فساد پڑ گیا لیکن فسادی کا پتہ نہیں چلتا تو اس کے پکڑنے کے لیے اور پکڑ کر سزا دے کر معاشرہ کو فساد سے بچانے کے لیے مجرم کی نظروں سے چھپ کر مجرم کو پکڑنے کی اسلام نے بھی اجازت دی ہے اور اسی کا نام تجسس ہے جس کے لیے آج باضابطہ ملکی سطح پر شعبہ جات قائم ہیں تو اگر اس شعبہ میں مسلمان ملازمت نہ کریں تو یہ امر یقینی ہے کہ غیر مسلم مخبر اور تجسس بے گناہ مسلمانوں کو ناحق مجرم بنا کر ظلم وجور کا کھلا مظاہرہ کریں گے اور مسلمانون کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنا پڑے گی، نیز اگر مسلمان بھی اسی شعبہ میں ملازم ہوں گے تو اس صورت میں بہت سے مسلمان ظلم وجور سے بچ سکتے ہیں اور اگر کوئی ناحق پھنس بھی گیا تو تفتیشی حالات میں کچھ رعایت روا رکھنے کی توقع بھی کی جا سکتی ہے، اس لیے حصول منفعت اور سد اللضر ر مسلمانوں کے حق مین اس شعبہ میں بھی ملازمت کرنے کی گنجائش بلکہ اجازت ہونی چاہئے۔

د۔ عدالت:

شریعت اسلامیہ عوام الناس میں پھیلے نزاعی معاملات کے فیصلوں کے لیے جگہ جگہ نظام عدالت اور ان میں فیصلہ کرنے کے لیے قاضی مقرر کرتی ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں باہمی نزاع کو دور کرتی ہے اور مسلمان خدا کے فرمان "فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ إلی اللہ" کے تحت ان صادر شدہ فیصلوں کو بسروچشم قبول کرتے ہیں۔

لیکن کیا غیر مسلم حکومت کی عدالتوں میں بھی یہ تصور ممکن ہے؟ ظاہر ہے کہ غیر مسلم حکومت میں جو عدلیہ قائم ہیں ان کو انصاف کے لیے اسلامی اصول واحکام کی پاسداری ضروری نہیں، البتہ اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ عدلیہ کو قائم ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ مظلوم کو مظلومیت سے نکالا جائے اور ظالم کو سزا دی جائے اور محروم الحق کو حق دلایا جائے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ انصاف اور فیصلہ احکام اسلام کے مطابق ہو۔ غیر مسلم عدالتوں میں بہت سے فیصلے ان قوانین پر بھی ہوتے ہیں جو قانون اسلام کے مغائر اور متصادم ہیں، لیکن عدلیہ کے تمام قوانین احکام اسلام کے خلاف ہوں ایسا بھی نہیں بلکہ کچھ قوانین عدلیہ قوانین اسلام کے موافق ہیں اور کچھ مخالف بلکہ اکثر موافق ہیں اور بعض غیر موافق اور جمہوریت کے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان غیر موافق اسلامی قوانین کو اسلامی قوانین کے موافق تبدیل کردیں۔ اب مسلمانوں کے حق میں یہ رہ گیا کہ یا تو وہ موجودہ اسی نظام کے تحت ملازمت کریں یا اپنے گھر بیٹھیں۔

دوسرا پہلو:

اگر مسلمان نظام عدالت میں ملازمت نہ کریں اور اس بناء پر کہ عدالت میں چونکہ بہت سے اصول وقوانین اسلامی قوانین کے مغائر ہیں لہٰذا مسلمانوں کے لیے ایسی عدلیہ میں ملازمت درست نہیں ہے اور ایسی ملازمت سے دست برداری اختیار کرلیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عدلیہ شاید ہی کوئی فیصلہ حق وانصاف پر کرے اور کچھ بعید نہیں کہ جو قوانین ابھی تک احکام اسلام کے موافق ہیں ان کو بھی اپنے دستور سے خارج کردیں اور پھر مسلمانوں کا کوئی ایک بھی فیصلہ حق پر نہ ہو بلکہ وہ ہر اعتبار سے ظلم واستبداد کا شکار ہوجائیں۔

اس تناظر میں اگر مسلمانوں کو عدلیہ میں ملازمت کی اجازت دے دی جائے تو یہ امر متوقع ہے کہ عدالت کے دستور میں جو قوانین اصول شریعت کے موافق ہیں کم از کم ان میں تبدیلی متصور نہیں ہوگی، نیز عدالت میں جو فیصلے غیر مسلم ملازمین مسلمانوں کے حق میں ناحق کرنا چاہیں گے مسلمان ملازمین کی موجودگی مین وہ ایسا نہ کرسکیں گے۔ نیز مسلم معاشرہ کا معاشی پہلو بھی اس سے وابستہ ہے یہ وہ نقاط ہیں جن کے پیش نظر" الضرر یزال "اور" الضرورات تبیح المحظورات " کے قاعدے سے نظام عدلیہ میں بھی مسلمانوں کو ملازمت کی اجازت ہونی چاہئے۔

۵۔ انکم ٹیکس:

یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست اور مسلم ہے کہ کوئی حکومت عوامی ٹیکس کے بغیر اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتی خواہ حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی ہر کسی کے یہاں ٹیکس اور خراج کی صورت رہی ہے خواہ اس کی شرحیں کچھ رہی ہوں۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت سے ٹیکس حکومت کی طرف سے نافذ کئے گئے ہیں، انہیں میں سے ایک انکم ٹیکس ہے یہاں پر بھی دو باتیں قابل غور ہیں: (۱) انکم ٹیکس حکومت کا نافذ کردہ ہے جس کو ہمیں بہر صورت ادا کرنا ہوگا، (۲) انکم ٹیکس کے محکمہ میں غیر مسلم ملازمین ظلماً مسلمانوں کی انکم سے زیادہ انکم ٹیکس نافذ کرسکتے ہیں اور وہ مسلمان جو واقعۃً انکم ٹیکس سے قانونی طور پر بچے ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح یہ ظلم ان پر بھی روا سمجھا جاسکتا ہے جو ظلم پر ظلم ہوگا، نیز اگر اس محکمہ میں مسلمان بھی ملازم ہوں گے تو اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ مسلمانوں پر قانوناً ہی سہی بقدر منفعت ٹیکس لاگو کیا جائے گا نیز وہ مسلمان جو قانوناً انکم ٹیکس کے زمرہ میں نہیں آتے وہ اس ظلم سے بچے رہیں گے، اس لحاظ سے اگر دفع ظلم اور دفع حرج کے حوالے سے مسلمانوں کو شعبہ انکم ٹیکس میں ملازمت کی اجازت ہوجائے تو مسلم معاشرہ کا یقیناً نفع آور ہی سودا ہوگا۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

آپ کو اپنی جائز ملازمت میں کچھ ایسا کام بھی کرنا پڑتا ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں، تو جائز کام کے مقابلہ میں اگر دوسرا کام کم ہے تو اپنی ملازمت ترک نہ کریں (فتاویٰ محمودیہ، ۱۳/ ۴۰۱)۔

الف۔ بینک: بینک اصولی درجہ میں سودی لین دین کا کاروبار کرتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: "یا ایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربا" (اے ایمان والو! سود مت کھاؤ)، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سود لینا، سود دینا، سودی حساب وکتاب لکھنا، سود پر گواہ بننا یا دیگر صورتوں سے سود کو فروغ دینا اس کا تعاون کرنا یہ سب حرام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے "احل اللہ البیع وحرم الربا" میں حرمت ربا کا اعلان کردیا ہے جو اس کے تمام متعلقات کو بھی شامل ہے، اس لحاظ سے بینک کے بنیادی کاموں مین تو ملازمت جائز نہ ہوگی کیوں کہ بینک کے جو بنیادی کام ہیں اس کی حرمت پر نص قطعی موجود ہے، البتہ بینک کے غیر بنیادی کام مثلاً بینک کی صفائی، اس میں موجود برقی نظام کی مرمت، اس کی رنگائی پتائی، اس کی حفاظت، اس کیلئے مکان کی تعمیر یا اس کے لیے دیئے گئے مکان کی اجرت وغیرہ، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق نہ سودی لین دین سے ہے اور نہ سودی معاملات میں بظاہر انکا کوئی تعاون ہے، لیکن درحقیقت ان سب کا تعاون کسی نہ کسی درجہ میں بینک کو پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء کے یہاں اس سلسلے میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایسے اداروں میں ملازمت کرنا جائز ہے اور صاحبین فرماتے ہیں کہ چونکہ درپردہ یہ تعاون علی الربا ہی ہے، اس لیے ان کی اجرت عمل جائز نہ ہوگی، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

''إذا استاجر الذمی من المسلم بیتا لیبیع فیه الخمر جاز عند ابی حنیفة خلافا لهما'' (ہندیہ کتاب الاجارۃ، ۴/ ۴۹۳، دیوبند)۔

ایک کافر نے مسلمان سے شراب بیچنے کے لیے ایک گھر کرایہ پر لیا۔ امام صاحب کے نزدیک یہ اجارہ جائز اور صاحبین ناجائز کہتے ہیں: "ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا باس به لأنه لا معصية في عين العمل" (ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع، ۹/ ۴۷۷)۔

ب۔ انشورنس:

انشورنس کمپنی کا کاروبار ربا اور قمار پر مبنی ہے جس کی حرمت قطعی ہے اور انشورنس کے کسی بھی شعبہ میں ملازمت تعاون علی المعصیت ہے، اس کی تمام صورتوں کا حکم یکساں ہے، انشورنس کمپنی کی ملازمت مطلقاً جائز نہیں خواہ ایجنٹ کی حیثیت سے ہو یا کسی اور طرح سب ناجائز ہے۔

ج۔ شراب:

قرآنی آیات واحادیث کی روشنی میں یہ بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ شراب کی کمپنی میں شراب سے متعلق جتنے بھی کام ہیں وہ سب ملعون ہیں، ان میں سے کسی ایک کام کی بھی شرعاً اجازت نہیں ہے، البتہ کمپنی کو بوتل بنا کر دینا اگر وہ بوتل مخصوص شراب کے لیے کسی اور کام میں صرف نہیں ہوتیں تو ان کا یہ عمل نادرست معلوم ہوتا ہے ورنہ نہیں، نیز حساب وکتاب لکھنا اور کمپنی کو وہ اجزاء فراہم کرنا جس سے شراب بھی بنائی جاتی ہے کسی حد تک گنجائش طلب ضرور ہے، اسی طرح کمپنی کے ان کاموں میں ملازمت کرنا جن کا براہ راست شراب سے تعلق نہیں ہے جائز ہونا چاہئے۔

الف۔ سپر مارکیٹ:

سپر مارکیٹ میں اکثر اشیاء پاک اور جائز ہوتی ہیں اور انہیں کی اکثر خرید وفروخت ہوتی ہے اگر صرف اتنا ہی ہے تو ملازمت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن چونکہ اس میں ایک گوشہ شراب کی بھی خرید وفروخت کا ہے تو ملازمت میں شبہ ہوگیا اس شبہ کی وجہ سے حکم یہ ہوگا کہ اگر تمام ملازمین پر ضروری ہے کہ وہ مارکیٹ کی تمام اشیاء کے ساتھ شراب بھی فروخت کریں یا خرید کرلائیں تب تو ملازمت درست نہ ہوگی اور اگر یہ قید نہ ہو بلکہ اگر کوئی ملازم اپنے آپ کو شراب سے بچانا چاہے تو بچا سکتا ہو تو شراب سے احتراز کرتے ہوئے سپر مارکیٹ کی ملازمت درست قرار دیا جانا چاہئے۔

ب۔ جس ادارے میں مخلوط تعلیم ہوتی ہے حجاب کی کوئی قید نہیں ہے خواہ یہ صورت استاد اور استانیوں کے درمیان ہو یا طلبہ اور طالبات کے درمیان بے پردگی جائز نہیں ہے، البتہ جہاں تک ملازمت کا مسئلہ ہے وہ اجرت علی العمل ہے اور عمل جائز ہے، اس لیے ملازمت جائز ہوگی، البتہ جس درجہ میں بے پردگی ہوگی اس درجہ کا گناہ بھی ہوگا لیکن اجرت جائز ہوگی۔

ج۔ وکالت کے پیشہ میں اصلاً کوئی قباحت نہیں وکیل خود اپنے طور پر اس میں جھوٹ بول کر یا دوسرے محرمات اختیار کر کے خرابی پیدا کرتا ہے، اگر کوئی وکیل محرمات اختیار نہ کرے بلکہ سچائی کے ساتھ وکالت کرے تو اس کی وکالت مسترد نہیں کی جائے گی بلکہ ان کی حیثیت میں اضافہ ہوگا اور اسے اصول پسند اور حقیقت پسند وکیل کہا جائے گا، اس لیے مسلمان اگر وکالت کا پیشہ مسلمانوں کو ان کے حقوق دلانے اور عدل وانصاف کے فروغ کے لیے کرتا ہے تو اسے جائز کہا جائے گا۔

د۔ جن ہاسپیٹلوں میں اپنی آمدنی میں اضافہ کی غرض سے آپریشن کی ضرورت نہ ہونے والے مریضوں کے بھی آپریشن کرتے ہیں نیز مرض سمجھنے کے باوجود ٹیسٹ لکھتے ہیں یہ کھلا ہوا ظلم ہے اور دوسروں کے مال سے جبراً اپنا پیٹ بھرنا ہے جو شرعاً حرام ہے۔ اسی طرح مرد کو عورت کا قابل ستر حصہ کے آپریشن کرنے اور عورتوں کو مردوں کے قابل ستر حصہ کے آپریشن کرنے پر مجبور کرنا یہ بھی ہاسپیٹل انتظامیہ کا کھلا ہوا ظلم ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ رہا ایسے ہاسپیٹلوں میں ملازمت کا حکم تو اگر ملازم کے سپرد مذکورہ ظالمانہ کام نہ ہوں بلکہ دوسرے جائز کام ہوں تو ملازمت جائز ہونی چاہئے۔

ھ۔ سیر وسیاحت کے لیے ہوٹل یقیناً ایک لازمی ضرورت ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اور ہوٹلوں میں جو ناجائز امور انجام پار ہے ہیں وہ حرام ہیں رہی ملازمت، تو اگر انہیں ناجائز امور کی ملازمت ہے تو مطلقاً حرام ہے اور اگر جائز امور سے ملازم کا کوئی تعلق نہیں تو ملازمت بلا کراہت درست ہوگی اور اگر ملازمت اصلاً جائز امر کی ہے لیکن کچھ کام ناجائز بھی کرنا پڑے تو ملازمت جائز ہوگی، لیکن ناجائز امور کے کرنے کا گناہ ہوگا اور اگر جائز امور کی مقدار ناجائز امور سے گھٹ جائے تو ملازمت ناجائز قرار دی جائے گی۔

....

مختلف قسم کی ملازمت سے متعلق شرعی احکام

مولانا محمد منصف بدایونی[1]

ا۔الف، ب: فوج اور پولیس دونوں کا بنیادی مقصد امن وامان کا قیام، ظالم کو ظلم سے روکنا اور مظلوم کی مدد کرنا ہے علاوہ ازیں اس شعبہ میں مسلمان کا ہونا یقینا مسلمانوں کے لیے مفید اور ظلم وزیادتی سے بچنے میں معین ہے، اب رہا کہ فوج یا پولیس کو کبھی تحقیق کئے بغیر کمانڈر کے حکم پر گولی چلانی پڑتی ہے ان میں اگر مسلمان یہ ارادہ کرلے کہ فسادیوں اور ظالموں کو دفع کرنے کے لیے میں یہ گولی چلا رہا ہوں تو "الامور بمقاصدها" (الاشباہ والنظائر ص ۵۳) کے تحت اس کی اجازت ہے، اس قاعدہ کے تحت ایک جزئیہ بھی نقل کیا ہے "الكافر اذا تترس بمسلم ... الخ" کہ کافر اگر کسی مسلمان کو ڈھال بنالے تو کافر کو قتل کرنے کے ارادہ سے قتل کرنا جائز ہے اور پولیس کا بدزبان ہونا یا ظالم بن جانا یہ ان کی کوئی مجبوری نہیں ہے، حتی الامکان اس سے بچنا لازم ہے اور اگر یہ ان کی مجبوری ہو یا کہیں کسی موقع پر اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو ضرر عام کو دفع کرنے کے لیے اس ضرر خاص کو برداشت کیا جاسکتا ہے، قاعدہ ہے: "يتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام وعليه فروع كثيرة منها الحجر على الطبيب الجاهل والمفتى الماجن دفعا للضرر العام" (الاشباہ النظائر ص ۱۴۳)۔

لہٰذا ان دونوں محکموں میں ملازمت کی اجازت ہوگی۔

ج۔ مخبری اور تجسس اگر ضرر سے بچنے، جرائم کو روکنے اور حق والے کو اس کا حق دلانے کے لئے کیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے (ابوداؤد باب فی الرجل یتاسر، ۲/ ۲۶۰) پر روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر دس صحابہ کو جاسوسی کے لیے بھیجا تھا اور حضرت عاصم بن ثابت کو ان پر امیر مقرر فرمایا تھا، اسی طرح بنو قریظہ کی جاسوسی کے لیے حضرت زبیرؓ کو بھیجا تھا (بخاری، ۱/ ۵۲۷)، جاسوسی کے دوران جھوٹ اور غیبت کے بغیر کام چلتا ہو تو ہرگز غیبت نہ کرے اور نہ جھوٹ بولے، امن وامان کے قیام اور دفع جرائم کے مقصد سے اگر جھوٹ بولے یا غیبت کرے تو اس کی اجازت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ليس الكذاب الذى يصلح بين الناس ويقول خيرا و ينمى خيرا" (متفق علیہ، مشکوۃ، ص ۴۱۲)۔

د۔ خلاف شریعت فیصلہ کرنا یا اس کے نفاذ وترویج کا ذریعہ بننا ظاہر بات ہے کہ ناجائز ہے، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں (جس کا نظام جمہوری ہے) یہ کہہ کر کہ اس کا نظام عدل قرآن وسنت کے موافق نہیں ہے یا قرآن وسنت سے متصادم ہے مسلمان اگر دور ہوجائیں تو حکومت کا رویہ تو پہلے ہی مسلمانوں کے تئیں منصفانہ نہیں ہے، ایسی شکل میں مسلمانوں کی مظلومیت کا بڑھ جانا امر یقینی ہے، اس لیے مقصد اگر عدل وانصاف کے ساتھ صحیح فیصلے کرنا اور حق والے کو حق دلانا ہو تو اس محکمہ کی ملازمت جائز ہوگی بلکہ اس میں کوشاں رہنا چاہئے تاکہ مسلمانوں کی مظلومیت کم سے کم کی جاسکے۔

اس کی نظیر حضرت یوسف علیہ السلام کا امانت ودیانت کے ارادہ سے غیر اسلامی حکومت میں عہدے کا مطالبہ ہے، اگر کوئی شخص عدل کے ساتھ کسی کام کو انجام دینے کی امید رکھتا ہو تو اس کے لیے اس کام کو قبول کرنا باعث اجر وثواب قرار دیا گیا ہے تاکہ ظلم سے حفاظت ہوسکے۔

"ويوجر من قام بتوزيعها بالعدل... لانه لو ترك توزيعها الى الظالم ربما يحمل بعضهم مالا يطيق فيصير ظلما على ظلم ففى قيام العارف بتوزيعها بالعدل تقليل للظلم فلذا يوجر" (رد المحتار كتاب الزكوة قبيل باب المصرف)۔

(وہ شخص جو عدل کے ساتھ اس کو تقسیم کرے وہ اجر کا مستحق ہوگا، اس لیے کہ اگر اس کی تقسیم ظالم کے سپرد کردی جائے تو بسا اوقات وہ بعض لوگوں پر ان کی طاقت سے زیادہ لازم کرے گا تو یہ ظلم ہوجائے گا، لہٰذا عدل وانصاف کے ساتھ تقسیم کی ذمہ داری قبول کرنے میں ظلم کو کم کرنا ہے اس لیے اس کو اجر دیا جائے گا)۔

ہ۔ انکم ٹیکس ایک ظالمانہ اور غیر معقول ٹیکس ہے جس کی شریعت اسلامیہ اجازت نہیں دیتی ایک شخص خون پسینہ سے کماتا ہے اور بسا اوقات اس پر ساٹھ ستر فیصد

---

[1] استاذ الحدیث والافتاء جامعہ اسلامیہ عربیہ، جامع مسجد، امروہہ اتر پردیش۔

سے بھی زیادہ ٹیکس لگادیا جاتا ہے، جو سراسر ظلم ہے، اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (مائدہ: ۲) (کہ تم گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو)۔

۲۔ الف: بینک میں بنیادی طور پر سودی کاروبار ہوتا ہے اور سود کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں پر لعنت فرمائی ہے "عن جابر قال: لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال: هم سواء" (صحیح مسلم، ۲/۲۷) (اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے (لینے والے) اور کھلانے والے (دینے والے) اور سود کا معاملہ لکھنے والے اور سود کی گواہی دینے والوں پر لعنت فرمائی ہے)، حدیث مذکور میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب اور شاہدین کو گناہ میں سود خور کے مساوی قرار دیا ہے۔

نیز بینک میں دو طرح کے اعمال ہوتے ہیں: ۱۔ وہ اعمال جو سود کے معاملہ میں مدو معاون ہوں۔ ۲۔ وہ اعمال جن کا تعلق سود کے معاملہ سے نہ ہو پہلے اعمال کی ملازمت کسی طرح بھی جائز نہیں ہے، اور دوسرے قسم کے اعمال مثلاً کمپیوٹر، ایئر کنڈیشن کی مرمت یا ان کے علاوہ وہ تمام اعمال جن کا تعلق سودی معاملہ سے نہ ہو ان کی ملازمت جائز ہوگی، بشرطیکہ اس بینک کا اصل سرمایہ سودی رقم سے زیادہ ہو کیونکہ بینک کی ملازمت دو وجہوں سے حرام ہے: ۱۔ "تعاون علی الاثم" ۲۔ "اخذ الاجرة من المال الحرام" تو اگر بینک کا اصل سرمایہ سودی رقم سے زیادہ نہ ہو تو دوسری قسم کے اعمال کی ملازمت بھی جائز نہ ہوگی، اس لیے کہ اس میں دوسری وجہ "اخذ الاجرة من المال الحرام" پائی جارہی ہے، مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس شرط کا اضافہ کیا ہے:

"ومن هنا ظهر ان التوظف فی البنوك الربوية لا يجوز فان كان عمل الموظف فی البنك ما يعين علی الربا كالكتابة او الحساب فذلك حرام لوجهين؛ الاول اعانة علی المعصية، والثانی، اخذ الاجرة من المال الحرام فان معظم دخل البنوك حرام مستجلب بالربا وأما اذا كان العمل لا علاقة له بالربا فانه حرام للوجه الثانی فحسب فاذا وجد بنك معظم دخله حلال جاز فيها التوظف للنوع الثانی من الاعمال" (تکمله فتح الملهم، ۱/ ۵۷۵)۔

مکان بینک کو کرایہ پر دینا:

بالقصد والارادہ مکان بینک کو کرایہ پر دینا ناجائز ہے اس لیے کہ یہ تعاون علی الاثم ہے اور اگر پہلے مطلق ایک شخص کو مکان کرایہ پر دیا ہو بعد میں وہ شخص اس میں بینک کا کام شروع کردے یعنی سودی کاروبار شروع کردے تو اس کا گناہ مالک مکان کو نہیں ہوگا۔

"ولا باس بان يواجر المسلم دارا من الذمی ليسكنها فان شرب فيها الخمر او عبد فيها الصليب او دخل فيها الخنازير لم يلحق المسلم اثم فی شئی من ذلك، لأنه لايواجرها لذلك فالمعصية فی فعل المستاجر وفعله دون قصد رب الدار فلا اثم علی رب الدار فی ذلك" (مبسوط ۶، / ۳۹، باب الاجارة الفاسدة مطبع السعاده بجوار محافظة مصر)

ب۔ انشورنس کمپنی کا کاروبار ربوا اور قمار پر مبنی ہوتا ہے اور ان دونوں کی حرمت منصوص علیہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "احل الله البيع وحرم الربوا" وغير ذلك من الآيات والاحاديث الشريفه۔

اور قمار کہتے ہیں کہ جانبین سے مال ہو اور مال کی ملکیت کو کسی ایسے امر پر معلق کرنا جس کا وجود وعدم دونوں کا احتمال ہو اور وجود وعدم کی صورت میں جانبین میں سے کوئی ایک اس کا مالک بن جائے، "عرفوه بانه تعليق الملك علی الخطر والمال فی الجانبين" (التعریفات الفقہیہ ص ۴۳۴) قمار کی حرمت بھی منصوص علیہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "انما الخمر والميسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه" (سورۂ مائدہ: ۹۰)۔

اس لیے انشورنس (جان کا ہو یا مال کا) اصل حکم یہ ہے کہ وہ ناجائز ہے، البتہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ فرقہ پرست عناصر منصوبہ بند طریقہ سے مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچاتے رہتے ہیں اور حکومت کی ان کو پشت پناہی ہوتی ہے یا حکومت محض خاموش تماشائی بنی رہتی ہے، حالانکہ جان ومال کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے۔

ان مخصوص حالات میں وہ مقام جہاں ہر وقت جان ومال کو خطرہ لاحق ہو وہاں انشورنس کی اجازت ہوگی، نیز جان کے مقابلہ میں املاک کو خطرہ زیادہ ہوتا

ہے، اس لیے اس میں گنجائش بھی زیادہ ہوگی، "الضرورات تبیح المحظورات" (الاشباہ والنظائر، ص ۱۴) کے تحت یہ اجازت ہے۔

ہاں جہاں یہ ضرورت نہیں پائی جائے گی یعنی جن مقامات پر جان ومال کو خطرات لاحق نہ ہوں وہاں اس کی اجازت بھی نہ ہوگی۔

اسی طرح یہ ضرورت انشورنس کمپنی میں ملازمت کے بغیر پوری ہوجاتی ہے تو اس میں ملازمت یا ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ ضرورت کو بقدر ضرورت ہی مانا جاتا ہے: "ما ابیح للضرورة یتقدر بقدرها" (الاشباہ والنظائر، ص ۱۴)۔

ج۔ شراب کے سلسلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی لوگوں پر لعنت فرمائی ہے، "قال رسول اللہ ﷺ: لعن اللہ الخمر وشاربها وساقیها بائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة الیه"، حدیث شریف شراب سے متعلق کسی بھی طرح کے تعاون کے ناجائز ہونے پر دلالت کررہی ہے، مزید اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے: "انما الخمر والمیسر والانصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه" (سورۂ مائدہ: ۹۰) کہ شراب اور جوا اور بت اور تیر گندگی ہے، شیطانی کام ہیں، لہٰذا ان سے بچو۔

معلوم ہوا کہ شراب کی کمپنی ہی اگر بوتل وغیرہ بناتی ہے تو اس کا مقصد ہی شراب کے لیے بوتل تیار کرنا ہے۔

البتہ اگر بوتل دوسری کمپنی تیار کرتی ہے، وہ شراب کی کمپنی کے ہاتھ فروخت کرے یا شراب کے اجزاء شراب بنانے والی کمپنی کے ہاتھ فروخت کئے جائیں اور شراب میں تعاون کرنا مقصد نہ ہو بلکہ مقصد صرف تجارت ہو، اسی طرح حساب وکتاب لکھنے میں صرف مقصد حساب وکتاب کی درستگی ہو، ایسے کاموں کی ملازمت امام صاحبؒ کے نزدیک جائز ہے، لیکن صاحبین نے ان کو بھی مکروہ کہا ہے، وحاملها کے تحت شیخ گنگوہیؒ نے لکھا ہے: "ان المراد الحامل للشرب فالاجیر الحمال لذمی لایدخل فیه ... الخ" (بذل المجہود، ۱۱/۲۰۸، مطبع البحوث اعظم گڑھ)، "ومن حمل الذمی خمرا فانه یطیب له الاجر عند ابی حنیفة وقال ابویوسف ومحمد: یکره ذلك کله ... الخ" (ہدایہ، ۳/۴۷۳، کتاب الکراہیۃ) اور الاشباہ والنظائر (۱۱۳)، الفن الاول پر ہے "ان بیع العصیر ممن یتخذه خمرا ان قصد به التجارة فلا یحرم وان قصد به لاجل التخمیر حرم وکذا غرس الکرم علی هذا" اور یہ جزئیہ "الامور بمقاصدها" کے تحت ہے، معلوم ہوا کہ ان کاموں کی حلت و حرمت میں ارادہ کو دخل ہے اگر یہ کام شراب کی کمپنی میں ہی کئے جائیں تو شراب میں تعاون کے علاوہ دوسرا مقصد نظر نہیں آتا اور یہ تعاون علی الاثم ہے، لہٰذا شراب کی کمپنی کے تحت ان کاموں کی ملازمت ناجائز ہوگی۔

نیز مذکورہ کاموں کی اجازت شراب کی کمپنی سے باہر رہتے ہوئے ہوگی، تاہم احتیاط صاحبین کے قول میں ہے، اور قاعدہ بھی ہے: "اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام" کہ حلال اور حرام جب دونوں جمع ہوجائیں تو غلبہ حرام کو دیا جائے گا۔ (الاشباہ والنظائر، ص ۱۷۰)۔

۳۔الف: سپر مارکیٹ کے ملازم کا شراب کے گوشہ سے لین دین کا کوئی تعلق نہ ہو یا اگر ہو تو صرف جمالی (یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے) کا ہو "ومن حمل الذمی خمرا فانه یطیب له الاجر عند ابی حنیفة ... الخ" (ہدایہ، ۴/۴۷۳) تو اس کی ملازمت جائز ہے خاص اس گوشہ کی ملازمت جائز نہ ہوگی۔

ب۔ مرد اساتذہ کے لیے لڑکیوں کو تعلیم دینا اور خواتین استانیوں کے لیے لڑکوں کو تعلیم دینا مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

۱۔ پردہ شرعی کی مکمل رعایت ہو، یعنی عورت کے مکمل بدن کے ساتھ چہرہ پر بھی نقاب ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "قل للمؤمنین یغضوا من ابصارهم" (سورۂ نور: ۳۰)، وقال تعالیٰ: "قل للمؤمنات یغضضن من ابصارهن" (سورۂ نور: ۳۱)۔

۲۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ نہ بیٹھیں بلکہ بیچ میں پردہ حائل ہو۔

۳۔ اگر دنیاوی اعلیٰ تعلیم دی جارہی ہو تو اس میں مخرب اخلاق یا اسلامی عقائد پر مضر اثرات ڈالنے والا کوئی مضمون نہ پڑھایا جائے۔

لیکن اسکولوں اور کالجوں کا مروجہ طریقہ تعلیم حدود شرعی اور حدود اخلاق دونوں سے متجاوز ہے، اور کورس میں کچھ ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو اسلامی عقائد واخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس مروجہ طریقہ پر تعلیم دینا شرعاً جائز نہ ہوگا۔

"وسئل رحمه الله ما حکم تعلیم النساء الکتابة ... فأجاب ... ان النبی ﷺ قال: لا تنزلوهن فی الغرف ولا

تعلموهن الكتابة يعني النساء ... وحينئذ فيكون فيه اشارة الى علة النهى عن الكتابة وهى ان اذا تعلمتها توصلت بها الى اغراض فاسدة وامكن توصل الفسقة اليها على وجه اسرع وابلغ واخدع من توسلهم اليها بدون ذلك" (الفتاوى الحديثيه، ص۱۱۹ مطلب يكره تعليم النساء الكتابة قديمي بحواله فتاوىٰ محموديه. ۲/ ۲۷۵ مکتبہ ڈابھیل)۔

ج۔ وکالت کا پیشہ ایک اچھا پیشہ ہے اسے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ وکیل کا مقصد انصاف دلانا، ظالم کو اس کے کیفر کردار تک پہنچانا ہے اگر وکیل اپنے مؤکل کو اس کے واقعی حق کو دلانے کے لیے جھوٹ سکھائے تو شرعاً اس کی اجازت ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ليس الكذاب الذى يصلح بين الناس ويقول خيرا وينمى خيرا" (مشکوۃ المصابیح ص ۴۱۲)۔

ظالم کے لیے وکالت کرنا اور حق والے کو حق سے محروم کرنے کے لیے وکالت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان"۔

د۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو مکرم و محترم بنایا ہے، ارشاد خداوندی ہے: "ولقد كرمنا بنى آدم" (بنی اسرائیل: ۷۰)، وقال تعالىٰ: "لقد خلقنا الانسان فى احسن تقويم" (سورۂ تین: ۴)۔

بلکہ حدیث شریف میں تو مردہ انسان کو بھی توڑنے، زندہ انسان کی ہڈیوں کو توڑنے کے مانند قرار دیا ہے، یعنی گناہ ہے، "كسر عظم المسلم ميتا ككسره وهو حى قال مالك: تعنى فى الاثم" (مؤطا امام مالک، ص ۸۳، باب ماجاء فی الاختفاء وھوالنبش مطبع یاسر ندیم اینڈ کمپنی) اور فقہاء کرام نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ آدمی کا بدن مکرم ہے چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو۔

اس لیے بلاضرورت وبلاوجہ آپریشن کرنا جائز نہیں، بلکہ مریض کو یہ جتانا کہ آپریشن ضروری ہے مریض کو دھوکا دینا ہے اور دھوکا دینا بھی جائز نہیں۔

مرد ڈاکٹر خواتین کے قابل ستر حصہ کا علاج نہ کریں اور نہ ہی خاتون ڈاکٹر مردوں کے قابل ستر مقام کا علاج کرے۔

خواتین کے علاج کے لیے خاتون ڈاکٹر اور مردوں کے علاج کے لیے مرد ڈاکٹر اگر مہیا نہ ہوں تو ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہوگی۔

لیکن محل مرض کے علاوہ دوسرے مقام کو کھولنا اور دیکھنا جائز نہیں ہوگا، یعنی جن اعضاء کو کھولے بغیر کام چل سکتا ہو تو ان کو ہرگز نہ کھولا جائے، اس لیے کہ ضرورت کو بقدر ضرورت ہی مانا جاتا ہے، "ويحرم النظر الى العورة الا عند الضرورة كالطبيب والخاتن... ولا يتجاوز قدر الضرورة وفى التبيين وينبغى للطبيب ان يعلم امرأة اذا كان المريض امرأة ان امكن لان نظر الجنس الى الجنس اخف وإن لم يمكن يستر كل عضو منها سوى موضع المرض... لان ما يثبت للضرورة يتقدر بقدرها" (مجمع الانہر مع شرح ملتقی الابحر، ۴/ ۹۹، ۲۰۰ مکتبہ فقیہ الامت، تبیین الحقائق، ۷/ ۴۰ زکریا بک ڈپو، شامی، ۹/ ۵۳۳ زکریا) مذکورہ تفصیل کے ساتھ ہسپتالوں میں ملازم جائز ہوگی۔

لیکن جن ہسپتالوں میں بلاضرورت آپریشن اور بلاوجہ ٹیسٹ کرائے جاتے ہوں اور اسی طرح بلاضرورت مرد ڈاکٹروں سے خواتین کے قابل ستر جسم کا علاج اور خاتون ڈاکٹروں سے مردوں کے قابل ستر حصہ کا علاج کرایا جائے اور ان کو اس پر مجبور کیا جائے ان میں ملازمت جائز نہ ہوگی۔

ھ۔ مسافروں کی سہولت کے لیے اعلیٰ قسم کے ہوٹل جن میں قیام وطعام کی تمام تر سہولیات مہیا ہوں یہاں تک کہ تو ضرورت سمجھ میں آتی ہے لیکن شراب اور حرام غذاؤں کی فراہمی اور رقص وموسیقی کی سہولت ضرورت میں داخل نہیں ہے، لہٰذا ملازم کا اگر ان سے براہ راست تعلق ہو تو اس کی ملازمت کی حرمت میں تو کوئی شک ہے ہی نہیں، البتہ وہ ملازمت جس کا تعلق مذکورہ حرام اشیاء کی فراہمی اور اس میں تعاون سے نہ ہو نیز ملازم کے اس ماحول میں فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہو تو وہ ملازمت جائز ہوگی۔

"قد جاء فى رواية الديلمى عن معاذ: اتقوا الدنيا واتقوا النساء فان ابليس طلاع رصاد" الحديث (مرقاة المفاتيح كتاب النكاح الفصل الاول، ۶/ ۲۴۳)۔

....

چوتھا باب: اختتامی امور

مناقشہ

مختلف النوع ملازمتیں اور ان کے شرعی احکام

مولانا الیاس نعمانی:

مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ فوج میں ملازمت سے متعلق ہے، عرض مسئلہ اور تلخیص مقالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مقالہ نگار تقریباً اس بات پر متفق ہیں کہ فوج کی ملازمت میں چونکہ ایک فوجی کو ظلم کرنا پڑتا ہے اس لیے اس کا اصل حکم تو حرمت ہے لیکن ان حضرات نے دو بنیادوں کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے، ایک بنیاد تو یہ ہے کہ فوج میں مسلمانوں کی شمولیت، امت مسلمہ کی حفاظت کا ذریعہ بنے گی، یہ ایک اجتماعی مصلحت ہوئی، اور دوسری وجہ ان حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے اقتصادی منفعت حاصل ہوگی، جس کو انفرادی مصلحت سے بھی شاید تعبیر کر سکتے ہیں، ان حضرات کے ان دلائل پر یا یہ جو وجوہ جواز بیان کر رہے ہیں اس پر ذرا سا غور کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ کیا عام فوجی کو کسی مصلحت کے حصول کا اختیار بھی ہوتا ہے، آج کل کی جو فوجیں ہیں اس میں عام فوجی کی مثال مردہ بدست زندہ کی ہے، وہ اپنے اوپر کا ایسا تابع اور مجبور ہوتا ہے کہ وہ خود کسی بھی فیصلہ میں مختار نہیں ہوتا، اور یہاں تک کہ اس کو اپنے اوپر کے فیصلے سے اختلاف کے نتیجے میں بسا اوقات بغاوت کے مقدمہ کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے، جس کا مقدمہ فوجی عدالت میں چلتا ہے اور اس کی سزا قتل ہے، فوجی عدالت میں۔

دوسری بات یہ کہ جو دوسری وجہ بیان کی گئی ہے وہ اقتصادی منفعت ہے، شاید اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ اگر کسی فرد کے لیے صورت حال وہ نہ ہو کہ جس میں ضرورت شرعیہ کی سی کیفیت ہو تو کیا کوئی اقتصادی منفعت کسی حرام کام کے لیے وجہ جواز بن سکتی ہے، خیال رہے کہ میں نے یہ دونوں باتیں صرف اس لیے عرض کی ہیں کہ عام طور پر مقالہ نگار کی جو رائیں ذکر کی گئی ہیں ان سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اگرچہ حقیقت میں یہ ظلم ہے لیکن یہ اس کے لیے وجہ جواز ہے۔

ایک اور بات عرض کرنی ہے، بہت مختصر الفاظ میں کہ ہمارے یہاں جو مقالہ نگاروں کی رائیں آئیں ان میں ظلم کو تعبیر کیا گیا ہے ہم مذہب سے قتال پر، شاید یہ ذرا غیر محتاط تعبیر ہے، محتاط تعبیر میں ظلم کو مطلق ہونا چاہئے، خواہ وہ ہم مذہب پر ہو یا غیر مذہب والے پر ہو، وہ یکساں طور پر حرام ہے۔

مولانا شاہد علی قاسمی:

اکثر مقالہ نگار نے عدالت کی ملازمت کو جائز قرار دیا ہے، میرے خیال میں بھی عدالت کی ملازمت تو جائز ہوگی، لیکن ایک وضاحت یہ مطلوب ہے کہ اگر مسلمان جج کے سامنے زیر تصفیہ مسئلہ کا حکم شریعت کے حکم سے بالکل متصادم ہو، تو مسلم جج کو کیا کرنا چاہئے، کیا ایسا ممکن ہے کہ وہ ایسے معاملہ کی ابتدائی کارروائی میں شریک رہے، لیکن جب فیصلہ کا وقت آئے تو وہ دوسرے جج کے حوالہ کردے، تاکہ مسلم جج بالکلیہ حرام کا مرتکب نہ ہو۔

مولانا مفتی محمد شاہ نذر:

سوال نمبر (۱) کے متعلق عرض کرنا ہے کہ فوج میں نوکری کرنے کے متعلق کہا گیا ہے کہ جائز ہے، چونکہ ہندوستان کے اندر تمام کام رشوت سے کیے جاتے ہیں، رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا، تو فوج میں جو ملازمت کی جاتی ہے مشاہدہ یہ ہے کہ رشوت میں خطیر رقم دے کر ملازمت کی جاتی ہے تو رشوت میں رقم دے کر اس طرح کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا یا ناجائز؟ چونکہ رشوت دینا تعاون علی المعصیۃ ہے، تو تعاون علی المعصیۃ کی وجہ سے فوج میں نوکری کرنا ناجائز ہونا چاہئے۔

مولانا جنید پالنپوری:

شعبہ انکم ٹیکس کے اندر بعض حضرات نے اس کی ملازمت کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے، جبکہ علامۃ فقہاء کرام نے اس کو صراحۃ ظلم سے تعبیر کیا ہے کہ انکم ٹیکس کو وصول کرنا ظلم ہے، لہٰذا اس کی اجازت کیسے درست ہو سکتی ہے؟ "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کے بھی خلاف ہے، "ولا تجسسوا" کے بھی

خلاف ہے، "ولا تجوز أجرة۔۔۔" کے عین مترادف، لہٰذا اس کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

مفتی زاہد علی خان:

عدالت کے بارے میں جو بات فرمائی گئی ہے، دستور ہند کے مطابق ذیلی عدالتیں تو دستور کی پابند ہیں اور ساتھ ساتھ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے فیصلوں کی بھی پابند ہیں، پھر بھی ان کو کچھ نہ کچھ اختیارات ہوتے ہیں جن کا وہ استعمال کر کے اور کسی حد تک وہ فیصلے کر سکتے ہیں، لیکن ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ میں اس کو بہت زیادہ آزادی ہوتی ہے، حتیٰ کہ وہ دستور میں جو دی ہوئی بعض چیزیں ہیں اس کے خلاف بھی بسا اوقات فیصلہ کرتے ہیں، اور اس کی قانونی حیثیت ہوتی ہے، اس اعتبار سے مطلقاً عدالت کی ملازمت یا جج وغیرہ بننے کو یکساں قرار دینا یہ درست نہیں ہوگا، البتہ بعض مسلمان ججوں نے خود جو دی ہوئی چیزیں ہیں قانونی طور پر مثلاً ہمارے یہاں قانون جو ہے دستوری طور پر ہمارے یہاں فنڈامنٹل رائٹ جو کہلاتا ہے یعنی جس کو بنیادی حقوق کہتے ہیں اس کی حیثیت دستور میں دی ہوئی چیزوں سے برتر قرار دی جاتی ہے قانوناً، لیکن مذہب کے بارے میں شرط یہ لگائی گئی ہے کہ وہ مذہب کا لازمی حصہ ہو، اب ایک مسلمان جج صاحب نے غیر مسلم جج کے ساتھ ایک مسلمان کی دو شادیاں ایک بہن پہلے سے تھی اور دوسری بہن سے اور شادی کر لی اس کے باوجود انہوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ چونکہ اسلام اجازت دیتا ہے ایک سے زائد شادی کرنے کی مرد کو، لہٰذا دونوں شادی درست ہے، اس شخص کا یہ فیصلہ نہ یہ کہ صرف دستور کے بھی خلاف ہے، اسلام کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ اس میں "أن تجمعوا بين الأختين" ہے، یعنی اسلام کا ایک لازمی امتیاز یہ ہے کہ اسلام نے جمع بین الزوجات کے باوجود یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس طرح کے اس کے محرمین اس کے درمیان جمع نہ ہوں، بالخصوص بہنوں کے بارے میں صراحت کی ہے، تو اس کی غلطی دستور پر ڈالنا یا عدالت پر ڈالنا زیادتی ہوگی۔

دوسری بڑی اہم بات یہ ہے اس کے علاوہ کہ فوج کے سلسلہ میں بھی یہی بات ہے کہ نفاذ کا سارا اختیار دستوری طور پر جو آتا ہے، جو ہاؤس اسٹیشن آفیسر ہوتا ہے یعنی SHO اس پر آتا ہے، باقی افسران اس کو پابند کرتے ہیں کہ وہ اس کے مطابق چلے، جوان کو باقاعدہ پولیس ایکٹ کے قانون کے تحت پابند بنایا جاتا ہے، وہ براہ راست اس میں مداخلت نہیں کر سکتے، جب تک صریح کوئی ظلم نہ دکھائی دے، ورنہ بڑے افسر اس میں مداخلت نہیں کر سکتے، اس کو آرڈر دیتے ہیں، لہٰذا اس کو بھی یکساں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب ہم نے دستور پر دستخط کئے تو ہم دستور کے شریک ہو گئے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دستور کی عام دفعات، اسلام کے جو قانون عدل و انصاف ہے اس سے ٹکراتی نہیں ہے، لہٰذا اس کو مطلقاً نادرست قرار دینا اور ظلم قرار دینا فوج کی ملازمت کے مقابلہ میں خاصہ مختلف ہوگا۔

تیسری بات یہ کہ پولیس کی ملازمتیں بھی دو طرح کی ہیں ایک وہ جو براہ راست عوام سے متعلق ہوتے ہیں دوسرے وہ جو ریزرو لوگ رہتے ہیں صرف حالات کے خراب ہونے پر یا الیکشن اور ہنگامی حالات میں ان کو استعمال کیا جاتا ہے تو اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

بینک کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس میں غیر مسلموں کے لیے چونکہ سود کا حکم اسلام کے جو فروعی احکام ہیں، امام صاحب کا واضح قول ہے، امام شافعیؒ کی رائے مختلف ہے، وہ غیر مسلموں پر نہیں لگائی جا سکتی تو جن کے مذہب میں سود لینے کی ممانعت نہیں تو یہ طریقہ ظالمانہ ہے، یہاں کا نہ کہ اصلاً سود کا نظام، چنانچہ ...... ممالک کے اندر عام طور پر تین فیصد وہ سود دیتے ہیں اور ساڑھے تین فیصد لیتے ہیں یا سوا تین فیصد دیتے ہیں، ساڑھے تین فیصد دیتے ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں ہے، صرف چوتھائی فیصد کے اندر سارا نظام چلاتے ہیں، اور جب ہم عاملین کو اجازت دیتے ہیں اسلام میں کہ باوجود یہ کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہو لیکن چونکہ وہ اس کے اندر ملازمت کا حصہ ہیں اس اعتبار سے ہم غیر مسلموں سے ان کے حقوق چھیننے کی بات نہیں کر سکتے، ہم کو کوئی ایسا نظام پیش کرنا چاہئے کہ ہم اسے بدل سکیں، اور وہ متبادل ہمارا نظام ہو، لیکن اگر مسلمان کہیں مجبور ہیں تو ان کو اس کی بنیاد پر کہ وہ بالکل تعاون اس کے اندر کر رہے ہیں اور وہ استحصال و استغلال کے اندر آتا ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس کو استحصال اور استغلال وہاں قرار دیا جا سکتا ہے، جہاں ہماری حیثیت بہت برائے نام ہے اور ہم اس سے ہٹ جائیں، تو ہمارے لیے خود ملازمتوں کے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

آپ نے عاملین زکوٰۃ اور عاملین ربوا کو بالکل ایک درجہ میں رکھ دیا، ہندوستان کا جو بینکنگ قانون ہے اس میں بینک کو براہ راست بزنس کرنے کی اجازت نہیں ہے، اسی لیے تو یہاں اسلامک بینکنگ کے قائم کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے، بہر حال بہت چشم کشا بحث کی آپ نے۔

مفتی محمد ساجد:

شراب فیکٹری میں جو ملازمت کرنے سے متعلق سوال آیا ہے اس میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو گاڑیاں شراب ڈھوتی ہیں ان کے ڈرائیور اور خلاصی کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟ کیا مالک کی تابعداری کرتے ہوئے وہ اپنی گاڑیوں سے شراب وغیرہ ڈھو سکتے ہیں، یا وہ غلہ جن کے ذریعہ سے شراب بنائی جاتی ہے ان کو فیکٹری تک پہنچا سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ آئی تھی کہ شراب کمپنی شراب کے علاوہ کوئی اور چیز بناتی ہے سرکہ وغیرہ تو اس کے اندر بوتلیں وغیرہ پہنچانا کیا اس کے اجزاء وغیرہ کے پہنچانے کی اجازت ہوگی اس سے متعلق میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "للاکثر حکم الکل" کے تحت زیادہ تر یہ فیکٹریاں جو شراب بناتی ہیں اگر اس طرح کی اجازت دے دی گئی کہ وہ کچھ اجزاء اور بھی بنائے تو پھر اس طرح کے تھوڑے، بہت کاموں کو شروع کر کے اور مزید شراب بنانے کو تقویت ملے گی، اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی:

ملازمتوں کے تعلق سے جو سوال آیا ہے اس میں شاید میں سمجھتا ہوں کہ یہ گوشہ نہیں آیا ہے یا غالباً میں سن نہیں سکا، ملازمتیں کمپنیوں میں جو ہوتی ہیں یا سرکاری اداروں میں جو ملازمتیں ہوتی ہیں ان کے تعلق سے بہت سی باتیں آئی ہیں، ایک چیز جس کا مشاہدہ ہوتا ہے اور عملی طور پر بہت زیادہ کہ حجامت بنانے کے پیشہ سے ہندوستان میں مسلمان ہی زیادہ تر جڑے ہیں، تو اگر کوئی آدمی دوسرے کی دوکان پر کام کرتا ہے خود اس کے لیے اس کی اجرت کا کیا حکم ہوگا؟ اسی طریقہ سے اگر کسی کی دوکان ہے تو اس میں بال اور داڑھی بنانے دونوں کی جو اجرت ہوتی ہے وہ ایک ساتھ رکھی جاتی ہے اب اگر وہ کسی دینی کام میں تعاون کرنا چاہے تو آیا اس کا تعاون فی نفسہ جائز ہے یا ناجائز ہے، یہ تو ایک دوسرا سوال ہے لیکن بہر حال اگر ملازمت کے تعلق سے غور کر لیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان شاء اللہ مناسب ہوگا۔

مولانا محمد خالد حسین نیموی:

خواتین کی ملازمت برائے تدریس کے حوالہ سے عرض ہے کہ اسلام نے استثنائی حالت کو چھوڑ کر عورت پر سرے سے کوئی معاشی بوجھ نہیں ڈالا ہے اور موجودہ زمانے میں یونیورسٹیوں کالجوں اور اسکولوں میں بے حجابی، عریانیت اور فیشن پرستی کے جس خطرناک صورت حال کا ماحول ہے اس کے پیش نظر خواتین کی ملازمت بے شمار معاشرتی برائیوں کو جنم دے گی، لہٰذا عملی طور پر ناممکن شرطیں عائد کر کے اس ملازمت کی اجازت دینا مناسب نہیں ہے، حالانکہ اس عنوان پر باضابطہ سمینار کا انعقاد ہو چکا ہے، لیکن بحث کی مزید ضرورت ہے اس لیے کہ کو ایجوکیشن کے تباہ کن اثرات پورے معاشرہ کو تباہ کر رہے ہیں، اسی مسئلہ کا شاخسانہ ہمارے سامنے جداگانہ خاندانی نظام کا مسئلہ بھی سر ابھار رہا ہے کہ نام نہاد فیشن پرست خواتین بزرگوں کا احترام یا ان سے مزاج کی ہم آہنگی کو برداشت نہیں کر پاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ مرد حضرات خواتین سے کیوں ملازمت کروانا چاہتے ہیں، اور ان میں سے بعض حضرات اس کے جواز کے لیے راہیں تلاش کر رہے ہیں ضرورت کی بنیاد پر، حالانکہ یہ بنیاد ہی مخدوش ہے، اس پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔

مولانا مفتی محمد مقصود فرقانی:

جیسا کہ ابھی دو حضرات نے فرمایا کہ شراب لے جانے کا مسئلہ اور حجام کے تعلق سے، تو مولانا نے فرمایا کہ کتابوں کے اندر حضرات امام اعظم ابوحنیفہؒ اور آپ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ کے درمیان یہ مسئلہ تفصیل سے فتح القدیر اور شامی وغیرہ کے اندر مذکور ہے، تعاون علی الاثم کا مسئلہ ہے، بعض حضرات نے اس کو تعاون علی الاثم مانا ہے اور بعض حضرات نے اس کو نہیں مانا ہے، حجام کا مسئلہ القواعد الفقہیہ کے اندر یہ ہے کہ اس کا تعلق مباشر کی طرف ہو یا مسبب کی طرف یہ بھی اس میں مذکور ہے، صرف اتنی بات میں عرض کر دوں کہ آج کے تعلق سے بعض ہمارے علماء حضرات یہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کمزور ہے اس لیے اگر بینک میں وہ مسلمان جن کی اقتصادی حالت کمزور ہے ملازمت کریں تو کچھ گنجائش ہے بعض مفتیان کرام کا یہ تصور ہے، حالانکہ جیسا کہ ابھی آپ حضرات نے سنا کہ شریعت مطہرہ نے جو سود کے لکھنے والے پر، گواہی دینے والے پر، کھانے والے، کھلانے والے پر جو تاکید اور اس پر وعید کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے تو ہاں یا نا کا جواب ہونا چاہیے، کہ آخر بینک وغیرہ جہاں سودی کاروبار ہوتے ہیں مسلمانوں کو ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں اب اس میں تاویلات یا پہلوؤں کی گنجائش نکالنا تو اس تاکید اور وعید کے پیش نظر ہماری اکیڈمی کو یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔

مولانا محمد سعید قاسمی:

مجھے جن دو باتوں پر کچھ کہنا تھا وہ مولانا شاہد اور مولانا ساجد صاحبان نے کہہ دی ہیں اس لیے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

مولانا محمد منصف بدایونی:

مجھے بھی دو باتیں عرض کرنی ہیں: ایک تو فوج اور پولیس کے تعلق سے کہ چونکہ ان کا بنیادی کام امن وامان بحال کرنا، ظالم کو ظلم سے روکنا اور مظلوم کی مدد کرنا ہوتا ہے، اس لیے الامور بمقاصدھا کے تحت اس کی اجازت تو بہر حال ہونی چاہئے، رہا اقتصادی معاملہ تو وہ ثانوی درجہ ہے، اس کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا، اور دوسری چیز انکم ٹیکس سے متعلق ہے کہ انکم ٹیکس جب ایک سراسر ظلم ہے اور اس کی شرحیں بھی پہلے سے متعین ہیں کم و بیش تو ہوسکتی ہیں لیکن بہر حال متعین ہے تو پھر اس محکمہ میں ملازمت کی اجازت زیر غور ہونی چاہئے۔

مولانا ظفر الاسلام صدیقی:

مجھے سوال نمبر ۳ سے متعلق ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ جو مخلوط اور غیر مخلوط دونوں تعلیم سے وابستہ ہے، وہ یہ کہ کبھی کبھی بچوں کو امراض لاحق ہوتے ہیں تو انہیں وہ دوا یہ کہہ کر دی جاتی ہے کہ اسے اللہ کا نام لے کر کھالو اور اس دوا کی ڈیٹ ایکسپائر ہوتی ہے، جب فائدہ نہیں ہوتا تو دوسری بات یہ کہہ کر دی جاتی ہے کہ وشنو کا نام لے کر کھالو اور وہ دوا سود مند ہوجاتی ہے کیونکہ اس کی ڈیٹ ایکسپائر نہیں ہوتی، جب فائدہ ہوجاتا ہے تو ان بچوں کو اسلام کی بابت شک وشبہ ہوتا ہے، پھر اس طرح کے مسائل جن کی میں نے ایک مثال دی ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا اشرف عباس قاسمی:

عارض محترم نے جو عرض پیش کیا ہے،...... اور اس کی دلیل کے طور پر اسے ذکر کیا گیا ہے کہ اگر ہم عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں تو اس سے جو سودی نظام ہے اس نظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، ظاہر ہے سود کے سلسلہ میں جو آیات اور احادیث ہیں اس کی حرمت بالکل منصوص ہے اور بینک میں بہت سے عہدے ایسے ہیں کہ جن پر ان حرمتوں کی تطبیق میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی ہے، اس لیے اور علت جس کو ذکر کیا گیا ہے اس کو علت ماننا بھی محل نظر ہے، یہاں بینک کی ملازمت کے عدم جواز کا جو لوگ فتویٰ دیتے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں کہ ہمارے اس فیصلہ کی وجہ سے سودی نظام ہی دنیا سے ختم ہوجائے گا، یہ مقصد نہیں ہے دوسرے نصوص ہمارے پیش نظر رہے اور ایک ایسے وقت میں جبکہ سودی نظام کی تباہ کاریاں دنیا کے سامنے آرہی ہیں، اور اسلامک بینکنگ کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے، اس لیے ہمیں ہر طرح سے کسی بھی سودی نظام سے وابستہ......

مولانا خورشید انور اعظمی:

بہت سی ملازمتوں میں جزئی یا کلی بہت ساری قباحتیں ہیں لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ آج جو صورتحال ہے ان ملازمتوں میں ہماری موجودگی کا، اسلامی ذہن، اسلامی فکر، اور اسلامی سوچ کے لوگ اس میں موجود رہیں تاکہ صحیح وکالت کرسکیں اسلامی ذہن وفکر کی، بہت سے مواقع ایسے بھی پیش آتے ہیں کہ ہماری صحیح ترجمانی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں پر صحیح بات نہیں ہوپاتی، دوسرے مسئلہ کے بارے میں میں چاہوں گا کہ یہاں پر موجود اصحاب فقہ وافتاء کے سامنے اس کی وضاحت ہوجائے کہ انکم ٹیکس کو ظالمانہ ٹیکس کہا جاتا ہے، ٹیکس جو حکومتیں لگاتی ہیں، وہ اپنے نظام کو چلانے کے لیے لگاتی ہیں، تجارت کے تعلق سے بھی حکومت کے بہت سارے تعاون ہوتے ہیں، تو کیا ان سارے تعاون کے باوجود حمل ونقل کے ذرائع اور دوسرے بہت سے تعاون ہوتے ہیں تو ایسے مواقع پر اس انکم ٹیکس کو ظالمانہ ٹیکس کہنے کی جو بنیادیں ہیں اگر اس کی وضاحت بھی سامنے آجائے تو میرا خیال ہے کہ بہتر ہوگا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہ تو آپ نے بہت مشکل سوال کردیا، اس کی وضاحت تو آدمی کو پھنسا دے گی، ہمارے یہاں ارباب افتاء کی کتابوں میں موجود ہے کہ رفاہی ضرورتوں کے ٹیکس لگانے کی اجازت ہے، لیکن ہمارے یہاں جو حدود ہیں اس کی وہ بہت زیادہ ہیں، اور پھر جن مصارف میں خرچ کئے جاتے ہیں اس

کو تو دیکھئے، میں نے دو سال پہلے یہ سنا تھا کہ ہماری پارلیمنٹ جب چلتی تو اس کے فی منٹ کا خرچہ ایک کروڑ روپئے کا ہے، مجموعی خرچ جو ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اور یہ دیکھیں کہ ماشاء اللہ کتنی نفیس بحثیں ہوتی ہیں، کس تہذیب اور شائستگی کے ساتھ لوگ ایک دوسرے پر وار کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ آزماتے ہیں تو یہ اس بنیاد پر کہا جاتا ہے، جو شرح ہمارے یہاں انکم ٹیکس کی ہے تقریباً وہی شرحیں مغربی ملکوں میں بھی ہیں، برطانیہ، امریکہ وغیرہ، لیکن ان مغربی ممالک میں حکومت کی ذمہ داری یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ بے روزگاروں کو روزگار دے ورنہ وظیفہ روزگار دے، ہر آدمی کے لیے مکان فراہم کرے، یہاں تک کہ بعض جگہ اگر مکان حکومت نے فراہم نہیں کیا تو کرایہ دینا حکومت کی ذمہ داری ہے، بیماروں کے علاج کا نظم کرے، ہماری حکومت کا مسئلہ یہ ہے کہ ٹیکس لیتی ہے مغربی ممالک کے طرز پر، لیکن جو سہولتیں وہ ممالک اپنے یہاں فراہم کررہے ہیں اس سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتی ہے، جن حضرات نے اس ٹیکس کو ظالمانہ ٹیکس کہا ہے وہ میں سمجھتا ہوں کہ اس معنی میں کہا ہے۔

مولانا محمد عمر عابدین قاسمی:

ایک مقالہ نگار نے مخلوط تعلیم کے سلسلہ میں قرآن کریم کی آیت "وقرن فی بیوتکن" سے استدلال کیا، لیکن وجہ استدلال انہوں نے بیان نہیں کی، حالانکہ آیت کا تقاضا یہ ہے کہ سرے سے ان کی تعلیم ہی درست نہ ہو، تو وجہ استدلال کو تو ضرور ذکر کرنا چاہئے، اور دوسری بات یہ ہے کہ ابھی آپ واقف ہیں کہ پوری دنیا معاشی بحران کا شکار ہے اور لاکھوں لوگ بے روزگار ہو چکے ہیں، اور مقاصد شرعیہ میں خود مقصد ہے حفظ جان ومال، تو اس سلسلہ میں ہمیں سد ذریعہ کا جو چوتھا ذریعہ ہے اس سلسلہ میں کثرت اور اکثریت والے مسئلہ میں جو یسر کا پہلو ہے اسے اگر اختیار کیا جائے تو کیا یہ قومی وملی سطح پر مفید ہوگی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں جب قحط پڑا تھا اس موقع پر کچھ اجتہادی فیصلے کئے تھے، تو اس قحط کے دور سے متاثر ہو کر آج کے حالات میں بھی اسی طرح کی سنتوں اور صحابہ کے عمل کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا مناسب ہوگا۔

اور ایک بات یہ کہ جن احادیث سے یہاں عام طور پر استدلال کیا جاتا ہے چونکہ یہ سب علماء اور اہل تحقیق ہیں تو خوب اس کی صحت کے بارے میں غور کر لینا چاہئے، مثال کے طور پر "حب الوطن من الایمان" تمام محدثین جن کا اعتبار کیا جاتا ہے جرح وتعدیل میں اور احادیث کی تصحیح وتوثیق میں وہ سب اس کے عدم صحت کے قائل ہیں، کسی نے اس کو مرفوع تسلیم نہیں کیا ہے تو اس طرح کی احادیث اگر اس سے علماء وفقہاء استدلال کریں جبکہ علامہ عبدالحئی لکھنویؒ نے اور حافظ ابن حجر اور تمام محدثین نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ صحیحین کے علاوہ دیگر کتابوں سے اگر حدیث نقل کریں تو اس میں اس کا حکم ذکر کرنا ضروری ہے، تو ان چیزوں کا ملاحظہ رکھا جانا چاہئے، کیونکہ ان ہی پر آپ کی تجاویز مبنی ہوتی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ قاسمی:

"وقرن فی بیوتکن" کی عبارۃ النص سے تو اختلاط کی ممانعت شاید ثابت نہ ہو لیکن اشارۃ النص سے ثابت ہوتی ہے کیونکہ ان کو کیوں استقرار فی البیوت کا حکم دیا گیا۔

مولانا عمر عابدین قاسمی:

میرا مقصد اختلاط کی طرف اشارہ نہیں ہے، مقالہ نگار نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اختلاط منع ہے، لیکن اس سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے، آیت کے ظاہر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ نکلے ہی نہیں گھر سے، پھر تعلیم بھی درست نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

نہیں مقصد یہ ہے نہ کہ نکلنے کی ممانعت دوسرے نصوص کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نکلنے کی ممانعت بمواقع فتنہ ہے اور فتنہ کی ایک شکل اختلاط بھی ہے تو گویا اس آیت کے اشارہ النص میں یہ بات بھی داخل ہے۔

☆☆☆